تفسیر قرطبی مترجم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی ○ پاکستان
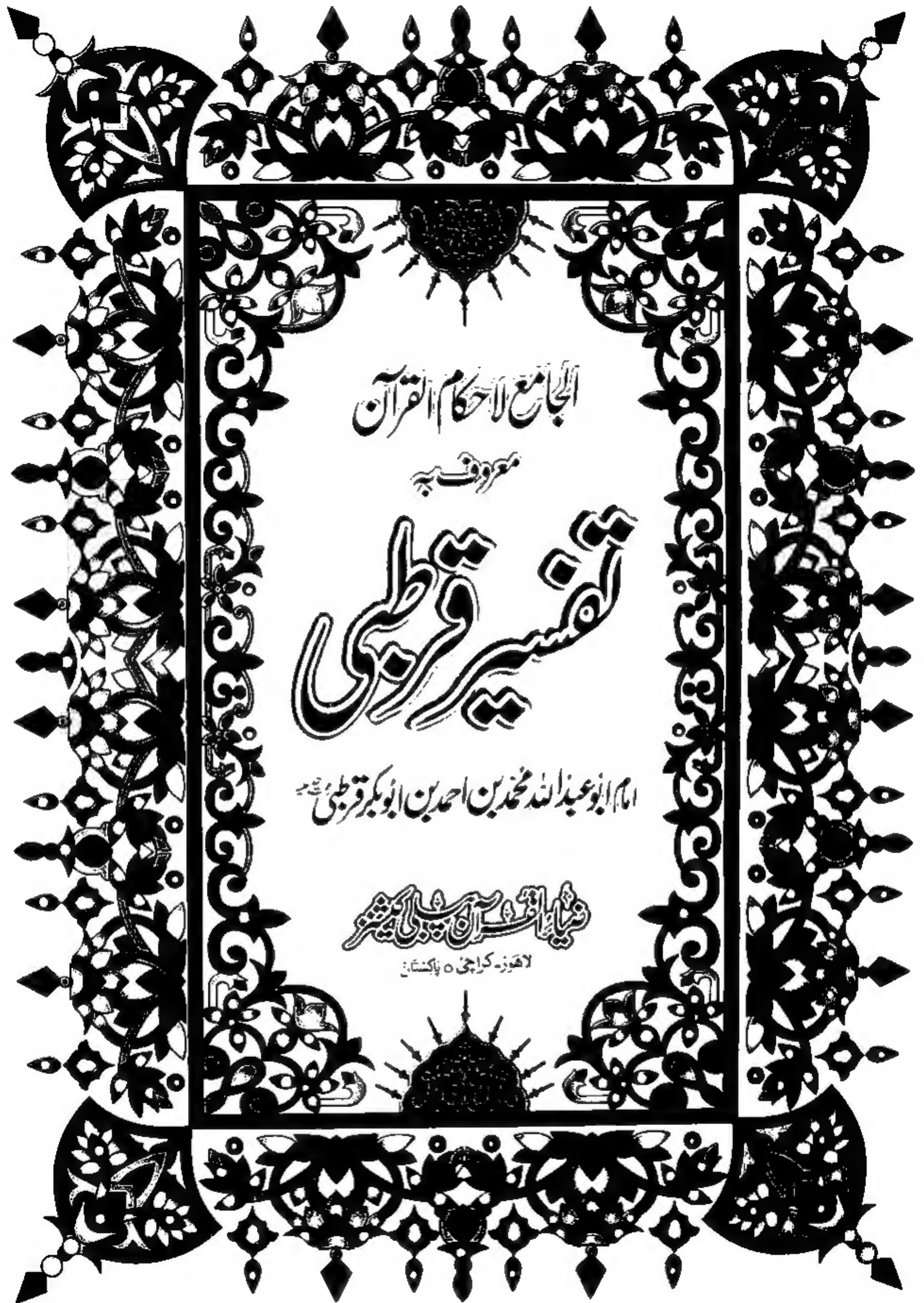
الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی

جلد پنجم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد پنجم)
مفسر	امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ
متن قرآن کا ترجمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
	مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی
	من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
زیراہتمام	ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اکتوبر 2012ء، باراول
کمپیوٹر کوڈ	QT54

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

سورۂ رعد

سورۃ الحجر کی تفسیر — 403

سورۂ ہود

آیاتہا ۱۲۳ ۱۱ سورۃ ھود مکیۃ ۵۲ رکوعاتہا ۱۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور جابر کے قول کے مطابق یہ مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا کہ سوائے ایک آیت کریمہ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ کے باقی مکی ہے۔ ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں حضرت کعب سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھو" (1)۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ھود، الواقعۃ، المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا (2)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس میں سے کچھ حصہ مرسل روایت کیا گیا ہے۔ ترمذی حکیم ابو عبداللہ نے "نوادر الاصول" (3) میں اس کو روایت کیا ہے کہ ہمیں سفیان بن وکیع نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن بشر نے علی بن صالح عن ابی اسحق عن ابی جحیفہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ ابو عبداللہ نے کہا کہ خوف بوڑھا کر دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف نفس کو کمزور کر دیتا ہے اور جسم کی رطوبت کو خشک کر دیتا ہے۔ ہر بال کے نیچے ایک چشمہ ہوتا ہے اس سے پسینہ پھوٹتا ہے جب خوف اس کی رطوبت کو خشک کرتا ہے تو وہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں پس بال بھی خشک ہو کر سفید ہو جاتے ہیں۔ جس طرح آپ کھیتی کو سیرابی کی وجہ سے شاداب دیکھتے ہیں اور جب اس کی سیرابی ختم ہوتی ہے تو وہ خشک ہو کر سفید ہو جاتی ہے پس بوڑھے آدمی کے بال اس کی رطوبت خشک ہونے کی وجہ سے سفید ہو جاتے ہیں اور اس کی جلد خشک ہو جاتی ہے۔ پس نفس اللہ کی وعید اور ان خوفوں کی وجہ سے جن کے بارے میں اللہ کی طرف سے خبر آئی ہو کمزور ہو جاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ وہ وعید اور اس کے ساتھ آنے والا خوف اس کے پانی کو خشک کر دیتا ہے پس اس کے سبب بڑھاپا آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبَا ۟ (المزمل) پس وہ خوف کی وجہ سے بوڑھے ہو گئے۔ اور جہاں تک سورۃ "ہود" کا تعلق ہے تو اس میں کئی امتوں کا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے جو انہیں جلدی لاحق ہوا اس کا ذکر ہے۔ لہٰذا اہل یقین جب اس کی تلاوت کرتے ہیں تو اس کی بادشاہی، سلطانی اور دشمنوں کو اس کی پکڑ جیسے معاملات ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اگر خوف کے سبب وہ مر جائیں تو ان کا حق ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا اسم گرامی ان اوقات میں ان

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب فضائل القرآن، صفحہ 189، وزارت تعلیم
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ واقعہ، جلد 2، صفحہ 162
3۔ نوادر الاصول، باب الفزع یورث الشیب، صفحہ 224

پر مہربانی فرماتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے کلام کو پڑھتے ہیں۔

اور جہاں تک سورۂ ہود جیسی سورتوں کا تعلق ہے تو اس سے مراد وہ سورتیں ہیں جو سورۂ ہود کے مشابہ ہیں جیسے اَلْحَآقَّةُ، سَاَلَ سَآىِٕلٌ، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور اَلْقَارِعَةُ وغیرہ۔ پس ان سورتوں میں ایسی چیزیں ہیں جو عارفین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے عذاب کو واضح کرتی ہیں تو ان کی وجہ سے نفوس کمزور ہوتے ہیں اور انہیں کے سبب سروں میں بڑھاپا آتا ہے۔ میں (قرطبی) نے کہا کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورۂ ہود میں سے جس چیز نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ جس کا بیان انشاء اللہ بعد میں آئے گا۔ یزید بن اَبان نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپ کے سامنے سورۂ ہود پڑھی جب میں نے اس کو ختم کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے یزید بن اَبان یہ قراءت ہے تو رونا کہاں ہے''۔

ہمارے علماء نے کہا کہ جعفر نحاس نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہود ہے بغیر تنوین کے اس بنیاد پر کہ یہ سورت کا نام ہے کیونکہ اگر آپ کسی عورت کا نام زید رکھیں تو وہ منصرف نہ ہوگا۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر کہتے ہیں کہ یہ ''ہودٌ'' ہے تنوین کے ساتھ اس وجہ سے کہ یہ سورت کا نام ہے اسی طرح اگر آپ کسی عورت کا نام زید رکھیں تو بھی، کیونکہ جب اس کا درمیانی حرف ساکن ہو تو وہ خفیف ہو جاتا ہے تو منصرف ہو جائے گا اور اگر آپ لفظ سورۃ کو حذف کرنا چاہیں تو تمام کے نزدیک منصرف ہوگا۔ پس میں نے کہا: یہ ہود ہے اور آپ اس سے مراد سورۂ ہود لیتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: اس پر دلیل یہ ہے کہ آپ ھذہ الرحمٰن کہتے ہیں، اگر آپ اس سے ھذہ سورۃ الرحمٰن مراد نہ لیتے تو یہ نہ کہتے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

''الف۔ لام۔ را۔ یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہیں جس کی آیتیں، پھر ان کی وضاحت کر دی گئی ہے بڑے دانا اور ہر چیز سے باخبر (خدا) کی طرف سے کہ تم نہ عبادت کرو مگر صرف اللہ کی، بے شک میں تمہیں اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (صدق دل سے) متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف وہ لطف اندوز کرے گا تمہیں زندگی کی راحتوں سے اچھی طرح مقرر معیاد تک اور عطا کرے گا ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو اس کی زیادہ نیکی (کا ثواب) اور اگر تم (یونہی) روگرداں رہے تو میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الٓرٰ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ كِتٰبٌ سے مراد ھذا کتاب ہے۔ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یہ محل

رفع میں ہے کتاب کی صفت ہے۔ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ کے معنی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے عمدہ قول حضرت قتادہ کا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سارے کے سارے کو محکم بنا دیا گیا ہے نہ اس میں کوئی خلل ہے اور نہ ہی یہ باطل ہے۔ الاحکام سے مراد کلام کا فساد سے محفوظ ہونا ہے یعنی اس کی نظم، نظم محکم ہے نہ اس میں تناقض ہے اور نہ کوئی خلل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس سے مراد ہے کہ کسی کتاب نے اس کو منسوخ نہیں کیا بخلاف تورات اور انجیل کے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس کی بعض آیات کو اس طرح مضبوط بنا دیا گیا ہے کہ وہ ناسخ تو ہیں منسوخ نہیں۔ اس بارے میں گفتگو پہلے ہو چکی ہے (ایتہ سے بعض آیات مراد لینے کی وضاحت کرتے ہیں) بعض اوقات اسم جنس کا اطلاق نوع پر بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: اکلت طعام زید تو اس سے مراد زید کا بعض کھانا ہوتا ہے۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا کہ اس کی آیات کو امر اور نہی کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ ثُمَّ فُصِّلَتْ یعنی وعدے، وعید، ثواب اور عقاب کے ساتھ اس کی وضاحت بیان کی گئی۔ قتادہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے باطل سے اس کو (محفوظ کر کے) پختہ کیا پھر حلال و حرام کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی (1)۔ مجاہد نے کہا: اس کو مکمل طور پر مضبوط کیا گیا پھر توحید، نبوت، بعث بعد الموت اور دیگر عقائد پر حسب ضرورت دلیل کو ایک ایک آیت کر کے بیان کیا گیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوح محفوظ میں اس کو جمع کیا گیا پھر نزول میں تفریق کی گئی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ فُصِّلَتْ سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایک ایک آیت کر کے نازل کیا گیا تاکہ اس میں غور و فکر کیا جا سکے۔ عکرمہ نے اس کو فُصِلَتْ بصورت تخفیف پڑھا ہے۔ اس سے مراد ہوگا حکمت بالحق۔

مِنْ لَّدُنْ، لَّدُنْ بمعنی عند ہے۔ حَكِيْمٍ سے مراد امور کو پختہ کرنے والی ذات ہے اور خَبِيْرٍ سے مراد وہ ذات ہے جو باخبر ہے ہر اس کام سے جو ہو چکا اور جو نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ کسائی اور فراء نے کہا کہ اَلَّا اصل میں باَنْ لا ہے یعنی اس کو پختہ کیا گیا پھر اس کی تفصیل بیان کی گئی اس کے ساتھ کہ تم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو۔ زجاج نے کہا کہ یہ لئلا ہے یعنی اس کو پختہ کیا گیا پھر اس کی تفصیل بیان کی گئی تاکہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو ارشاد فرمائیں کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ، مِّنْهُ کی ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی اللہ سے۔ نَذِيْرٌ یعنی اس کی نافرمانی کرنے والے کو اس کے عذاب اور اس کی سطوت سے ڈرانے والا۔ بَشِيْرٌ اس کی اطاعت کرنے والے کو رضا اور جنت کی خوشخبری سنانے والا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اول و آخر اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں سے ہے یعنی تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بے شک میں تمہیں اس سے ڈرانے والا ہوں، مراد یہ ہے کہ اللہ تمہیں غیر کی عبادت سے ڈرانے والا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (آل عمران: 28) اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ پہلے پر اس کا عطف ہے۔ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ یعنی اللہ کی طرف لوٹو اطاعت اور عبادت کے ساتھ۔ فراء نے کہا: یہاں ثُمَّ واؤ کے معنی میں ہے یعنی تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ کیونکہ استغفار ہی توبہ ہے اور توبہ ہی استغفار

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 11، صفحہ 207-206

ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ تم اپنے پہلے گناہوں سے استغفار کرو اور نئے گناہ سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرو جب تم سے سرزد ہو۔ بعض صلحاء نے کہا کہ گناہ کو چھوڑے بغیر استغفار کرنا یہ جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے۔ یہ معنی مکمل طور پر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور سورۂ بقرہ میں وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرہ: 231) کے تحت گزر چکا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کے ذکر کو مقدم فرمایا ہے کیونکہ مغفرت غرض مطلوب ہے اور توبہ اس کا سبب ہے پس مغفرت مقصود میں اوّل ہے جب کہ سبب میں آخر۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ تم صغیرہ گناہوں سے استغفار کرو اور کبیرہ گناہوں سے توبہ کرو۔

یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا یہ استغفار اور توبہ کا ثمر ہے یعنی وہ تم کو رزق کی وسعت اور زندگی کی خوشحالی سے منافع کے ذریعے لطف اندوز کرے گا اور تمہیں عذاب کے ذریعے جڑ سے نہیں اکھیڑے گا جس طرح اس نے ان کے ساتھ کیا جن کو اس نے تم سے پہلے ہلاک کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یُمَتِّعْكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تم کو عمر دے گا۔ الامتاع کی اصل لمبا کرنا ہے (طوالت دینا) ہے۔ اس سے أمتع اللہ بك و متع بہ (درازی عمر کی دعا) ہے۔ سہل بن عبداللہ نے کہا کہ المتاع الحسن مخلوق کو ترک کرنا اور حق کی طرف توجہ دینا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد موجود پر قناعت کرنا اور مفقود پر پریشانی کو ترک کرنا ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ایک قول یہ ہے کہ اَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد موت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے جب کہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد جنت کا داخلہ ہے۔ اس بنیاد پر المتاع الحسن سے مراد قبر اور اس کے علاوہ قیامت کی ہولناکیوں اور قیامت میں خوف دلانے والے امور اور ہر ناپسندیدہ چیز سے بچانا ہو گا۔ پہلا معنی (یعنی موت) زیادہ ظاہر ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ یہ (معاملہ) موت کی وجہ سے ختم ہو گا اور یہی اجل مسمی ہے۔ واللہ اعلم۔

مقاتل نے کہا کہ انہوں نے انکار کیا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف دعا کی وہ سات سال قحط میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے جلی ہوئی ہڈیاں، گندگی، مردار اور کتوں کو کھایا۔

وَّ یُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ یعنی وہ نیک اعمال میں سے ہر صاحب عمل کو اس عمل کی جزا دے گا۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ بندہ جس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر فضیلت پا گئیں اس کو وہ اپنا فضل یعنی جنت دے گا اور یہی اللہ کا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَضْلَهٗ میں ہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ مجاہد نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کلام میں سے جو وہ اپنی زبان سے کرتا ہے یا عمل میں سے جو وہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کے ذریعے کرتا ہے جس کو شمار کرتا ہے یا اپنے مال میں سے جس کو بطور صدقہ دیتا ہے پس وہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ اس کو (اس کا اجر) دیتا ہے اگر وہ ایمان لائے اور اس کو وہ اس کی طرف سے قبول نہیں کرتا اگر وہ کافر ہو تو وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ۔ یَوْمٍ كَبِیْرٍ سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یہ دن بڑا ہو گا اس میں واقع ہونے والی ہولناکیوں کی وجہ سے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم بدر (1) اور اس کے علاوہ (غزوات کے ایام) ہیں۔ وتولوا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہو گا

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 150

کہ اگر وہ روگرداں رہے تو آپ ان کو فرمادیں کہ میں تم پر اندیشہ کرتا ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مضارع کا صیغہ ہو اور اس کی ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ان کو فرمادیں کہ اگر تم نے روگردانی کی تو میں تم پر اندیشہ کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ یعنی موت کے بعد، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی ثواب اور عقاب میں سے ہر چیز پر وہ قادر ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ ۙ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"سنو! وہ دہرا کر رہے ہیں اپنے سینوں کو تاکہ وہ چھپالیں اللہ تعالیٰ سے (اپنے دلوں کا بغض) سنتے ہو! جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں بلاشبہ وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (پوشیدہ) ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَآ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے ساتھ مشرکین کے رویے کی خبر دی اور وہ (مشرکین) یہ گمان کرتے کہ ان کے حالات اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ ہیں یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی عداوت و دشمنی کے جذبات کو لپیٹتے (یعنی چھپاتے) ہیں اس میں علی عداوۃ المسلمین کے الفاظ حذف ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ اپنے سینوں میں موجود بغض اور دشمنی کو چھپاتے ہیں اور اس کے برعکس ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ ایک شیریں لسان اور شیریں کلام آدمی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسندیدہ طریقے سے ملتا اور آپ کے لیے اپنے دل میں موجود برے جذبات کو چھپالیتا(1)۔

مجاہد نے کہا کہ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ کہ وہ اپنے سینوں کو دہرا کر لیتے شک اور شبہ کی وجہ سے۔ اور حسن نے کہا کہ وہ اپنے سینوں میں موجود کفر کو چھپالیتے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت بعض منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرتے تو بعض منافقین اپنا سینہ اور اپنی پیٹھ دہری کر لیتے، اپنے سر کو جھکا لیتے اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ کر ایمان کی دعوت نہ دے دیں اس کا معنی عبداللہ بن شداد نے بیان کیا ہے۔ مِنْهُ میں ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ منافقین نے کہا کہ جب ہم اپنے دروازے بند کرلیں گے، اپنے کپڑے خوب اوڑھ لیں گے اور اپنے سینے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر دہرے کرلیں گے تو ہمیں کون جانے گا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اپنے بدنوں کو ڈھانپ کر عبادت کرتے اور آسمان کے نیچے اپنے بدنوں کو ظاہر نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عبادت تو وہ ہے جس پر ان کے دل قائم ہیں عقیدت میں سے اور جس کو وہ اپنے قول اور عمل کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ ابن جریر نے محمد بن عباد بن جعفر سے روایت بیان کی ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اَلَآ اِنَّهُمْ تَثْنُوْنِیْ صُدُوْرُهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ کہ وہ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 191

آسمان کی طرف کھلے ہونے کی حالت میں نہ اپنی بیویوں سے جماع کرتے اور نہ ہی پیشاب کرتے (1)، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ محمد بن عباد کے علاوہ (کسی اور نے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ یہ الا انهم تثنون صدورهم یعنی واو کے بعد بغیر نون کے ہے تنطوی کے وزن پر۔ تثنوی کا معنی اور آخری دونوں قرائتیں قریب قریب ہیں، کیونکہ وہ خود تو دہرا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس (سینہ) کو دہرا نہ کریں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں پر طعن کرتے ہوئے سرگوشیاں کرتے تو ایک دوسرے پر جھک جاتے اور اپنی جہالت کی وجہ سے یہاں تک پہنچ گئے کہ وہ یہ سمجھتے کہ ان کا یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی مخفی ہے۔ یستخفوا سے مراد ہے کہ تا کہ وہ اس سے چھپالیں یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یا اللہ تعالیٰ سے۔

اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ یعنی وہ اپنے کپڑوں کے ذریعے اپنے سروں کو ڈھانپتے۔ قتادہ نے کہا کہ بندے کی سب سے زیادہ پوشیدگی والی حالت تب ہوتی ہے جب وہ اپنی پیٹھ کو جھکائے، اپنے کپڑے اوڑھ لے اور اپنے دل میں اپنے غم کو چھپالے (2)۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

"اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو، ہر چیز روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس میں ما نافیہ ہے اور من زائدہ ہے اور دابۃ محل رفع میں ہے تقدیر عبارت میں وما دابۃ ہے۔ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا، علی بمعنی من ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق ہے اس پر مجاہد کا قول دلالت کرتا ہے کہ رزق میں سے جو کچھ بھی آیا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے (3)۔ ایک قول یہ ہے کہ علی اللہ سے مراد اللہ کے فضل کے طور پر ہے نہ کہ اس سے وجوب مراد ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی طرف سے سچے وعدے کے طور پر ہے۔ اس معنی کا بیان "سورۃ النساء" میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کوئی چیز واجب نہیں۔ رِزْقُهَا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جب کہ کوفیوں کے نزدیک صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ آیت کا ظاہر عموم پر دلالت کر رہا ہے جب کہ اس کا معنی مخصوص ہے، کیونکہ (دواب) جانداروں میں سے بہت سارے رزق دیے جانے سے پہلے ہی ہلاک ہو گئے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عام ہے ہر ایک کے بارے میں ہے اور ہر وہ جاندار جس کو ایسا رزق نہ دیا گیا جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا تو اس کی روح کو تو رزق دیا گیا۔ اور ماقبل کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کے رزق کی خبر دی اور وہ ذات اس چیز کی تربیت سے غافل نہیں تو اے گروہ کفار! تمہارے حالات اس پر کیسے مخفی ہو سکتے ہیں اس حال

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 677
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 212
3۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 5

میں کہ وہ تمہیں رزق دیتا ہے؟ الدابۃ سے مراد ہر وہ حیوان ہے جو رینگ کر چلتا ہے اور حقیقت میں رزق وہ ہے جس کے ذریعے زندہ کو غذا دی جاتی ہے اور اس میں اس کی روح کی بقا اور اس کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے۔ رزق کا معنی ملک ہونا صحیح نہیں کیونکہ جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے جب کہ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ اپنے چارے کے مالک بھی ہیں۔

اسی طرح بچوں کو دودھ بطور رزق دیا جاتا ہے مگر یہ نہیں کہا جاتا کہ پستان میں جو دودھ ہے وہ بچے کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (الذاریات: 22) کہ آسمان میں تمہارا رزق ہے حالانکہ آسمان میں ہماری کوئی ملکیت نہیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ رزق اگر ملکیت ہوتا تو جب کوئی آدمی کسی غیر کی ملکیت میں سے کھاتا تو وہ کسی غیر کے رزق میں سے کھاتا حالانکہ یہ محال ہے، کیونکہ بندہ صرف اپنا ہی رزق کھاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ والحمدللہ۔ کسی آدمی کو کہا گیا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: جس نے چکی کو پیدا کیا ہے وہ اسے پیسنے کے ذریعے دیتا ہے اور وہ ذات جس نے وادیوں کے کناروں کو وسیع کیا وہی رزق پیدا کرنے والا ہے۔

ابو اُسید کو کہا گیا کہ تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: پاک ہے اللہ کی ذات اور اللہ سب سے بڑا ہے! اللہ تعالیٰ کتے کو رزق دیتا ہے تو کیا وہ ابو اُسید کو رزق نہیں دے گا۔ حاتم الاصم کو کہا گیا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: اللہ کی طرف سے، اس کو کہا گیا: اللہ تمہارے لیے آسمان سے دراہم اور دینار اتارتا ہے؟ تو اس نے کہا: گویا اس کا صرف آسمان ہے یا یہ زمین بھی اس کی ہے اور آسمان بھی اس کا ہے۔ پس اگر وہ آسمان سے مجھے میرا رزق نہ دے تو وہ اسے زمین میں سے میرے لیے بھیج دیتا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا۔

وكيف أخاف الفقرَ والله رازقي ورازقُ هذا الخلقِ في العسر واليُسرِ
تكفّلَ بالأرزاقِ للخلقِ كلِّهم وللضَّبِّ في البيداءِ والحوت في البحرِ

اور مجھے فقر کا کیا خوف اس حال میں کہ اللہ میرا رازق ہے اور وہ اس مخلوق کا رازق ہے تنگی اور خوشحالی میں۔ وہ ساری مخلوق کے رزق کا کفیل ہے، وہ گوہ کے رزق کا کفیل ہے اس کے بل میں اور مچھلی کے رزق کا کفیل ہے سمندر میں۔

حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" (1) میں اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اشعریوں کی ایک جماعت جو حضرت موسیٰ، حضرت ابو مالک اور حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھی۔ جب انہوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ سفر میں جو کھانا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کا سوال کرنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا جب وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو انہوں نے ایک آدمی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اس شخص نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشعریوں کی بہ نسبت چوپایوں کو رزق دینا زیادہ آسان تو نہیں ہے۔ وہ واپس آ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گیا اور اس نے اپنے اصحاب سے کہا: تم کو خوشخبری ہو تمہارے پاس مدد آنے

1۔ نوادر الاصول، باب ابو موسیٰ، صفحہ 253

والی ہے۔ اس کے اصحاب نے یہی سمجھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا ہوگا اور آپ نے کھانا بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہوگا، اسی دوران دو آدمی ان کے پاس برتنوں میں کھانا لے کر آ گئے جن میں گوشت کا سالن اور روٹیاں تھیں۔ انہوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا، پھر اس شخص نے اپنے بعض اصحاب سے کہا: تم یہ کھانا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤ کیونکہ ہم پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں، پھر جب وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے ہمارے لیے جو کھانا بھیجا تھا اس سے عمدہ اور لذیذ کھانا ہم نے کبھی نہیں کھایا۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے تو تمہیں کوئی کھانا نہیں بھیجا''۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے کیا کیا تھا اور اپنے اصحاب سے کیا کہا تھا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم کو اللہ نے یہ رزق دیا تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا یعنی زمین میں سے جہاں اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ وَ مُسْتَوْدَعَهَا یعنی وہ جگہ جس میں مرے گا اور اس کو دفن کیا جائے گا۔ یہ بات مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہی ہے۔ اور ربیع بن انس نے کہا کہ مُسْتَقَرَّهَا سے مراد اس کی زندگی کے دن ہیں (1)۔ وَ مُسْتَوْدَعَهَا سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ مرے گا اور جہاں سے اٹھایا جائے گا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ مُسْتَقَرَّهَا سے مراد رحم (مادر) ہے۔ وَ مُسْتَوْدَعَهَا سے مراد صلب (باپ) ہے۔ اور ایک قول یہ ہے یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا سے مراد جنت یا دوزخ میں (ان کا ٹھکانہ ہے) اور مُسْتَوْدَعَهَا سے مراد قبر میں (ٹھکانہ ہے) اہل جنت اور اہل دوزخ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝ (الفرقان) اور سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝ (الفرقان) اس (معنی) پر دلالت کرتا ہے۔ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ یعنی لوح محفوظ میں۔

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

''اور وہی (خدا) ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا (زمین اور آسمان پیدا کیے) تا کہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا ہے عمل کے لحاظ سے اور اگر آپ (انہیں) کہیں کہ یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ اس کا بیان ''سورۂ اعراف'' میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عرش اور پانی کی تخلیق، زمین اور آسمان کی تخلیق سے پہلے ہے (2)۔ حضرت کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت پیدا فرمایا پھر جلال کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 6-7　2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 8

کے خوف سے کانپتا ہوا پانی ہو گیا۔ اس وجہ سے ابھی تک پانی مضطرب رہتا ہے اگر چہ وہ رکا ہوا ہی ہو، پھر الله تعالیٰ نے ہوا کو پیدا فرمایا اور پانی کو ہوا کی پشت پر رکھ دیا پھر عرش کو پانی پر رکھ دیا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا: ان سے الله تعالیٰ عزوجل کے ارشاد وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: پانی کس چیز پر تھا؟ تو آپ نے فرمایا: ہوا کی پشت پر۔

امام بخاری نے حضرت عمران بن حصین (1) سے روایت کیا: انہوں نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو تمیم کے لوگ آئے۔ آپ نے فرمایا: ”اے بنو تمیم! بشارت کو قبول کرو“۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں بشارت تو دے چکے ہیں اب ہم کو عطا فرمائیں۔ (یہ مکالمہ دو بار ہوا) پھر اہل یمن میں سے کچھ لوگ آئے، آپ نے فرمایا: ”اے اہل یمن! بشارت کو قبول کرو اگر چہ بشارت کو بنو تمیم نے قبول نہیں کیا“۔ انہوں نے کہا: ہم نے قبول کر لیا، ہم آئے تا کہ ہم دین کے بارے میں سمجھیں اور تا کہ ہم آپ کے پاس اس امر (دنیا) کے متعلق پوچھیں کہ وہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: الله تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا پھر اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور ذکر (لوح محفوظ) میں اس نے ہر چیز لکھ دی۔ پھر میرے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا: اے عمران! اپنی اونٹنی پکڑ وہ تو چلی گئی ہے۔ میں اس کی تلاش میں نکلا تو وہ میرے سامنے والے سراب کو عبور کر چکی تھی اور الله کی قسم! میں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ چلی گئی اور میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے) نہ اٹھوں۔

الله تعالیٰ کا فرمان: لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یعنی الله تعالیٰ نے اس کو پیدا فرمایا تا کہ وہ اپنے بندوں کو اپنی قدرت کے کمال اور بعث بعد الموت پر استدلال اور نصیحت کے ذریعے آزمائے۔ قتادہ نے کہا: اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا معنی ہے تم میں سے از روئے عقل کے کون زیادہ کامل ہے؟ حضرت حسن اور سفیان ثوری نے کہا: تم میں سے دنیا میں سب سے زیادہ زہد والا کون ہے؟ اور بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک سوئے ہوئے آدمی کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے سونے والے اٹھ اور عبادت کر، اس نے کہا: اے روح الله! میں عبادت کر چکا۔ آپ نے فرمایا: تم نے کس طرح عبادت کی؟ اس نے کہا: میں نے دنیا کو اس کے اہل کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: تو سو جا تو نے عبادت گزاروں پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ ضحاک نے کہا: تم میں سب سے زیادہ شکر ادا کرنے والا کون ہے؟ مقاتل کے نزدیک تم میں سے الله سے زیادہ ڈرنے والا کون ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے الله تعالیٰ کی اطاعت میں سب سے زیادہ عمل کرنے والا کون ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کی تلاوت فرمائی۔ آپ نے فرمایا: ”تم میں سے از روئے عقل کے کون بہتر ہے، الله تعالیٰ کے محارم سے کون زیادہ بچنے والا اور الله تعالیٰ کی اطاعت میں کون سب سے زیادہ جلدی کرنے والا ہے (2)؟ تمام تاویلات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ ان شاء الله ”سورۂ کہف“ میں بھی آئے گا۔ جب کہ ابتلا کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بعث بعد الموت پر رہنمائی فرمائیں۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، وفد بنی تمیم، جلد 2، صفحہ 626　　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 460

بعث بعد الموت کو مشرکین کے سامنے ذکر کریں تو وہ کہیں گے: یہ جادو ہے۔ انکم میں ان مکسور ہے کیونکہ یہ قول کے بعد واقع ہے اور سیبویہ نے فتحہ بیان کیا ہے (یعنی انکم) لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا، لَيَقُولَنَّ لام مفتوح ہے کیونکہ یہ ایسا فعل مقدم ہے جس میں ضمیر نہیں ہے اور اس کے بعد لَيَقُولَنَّ ہے کیونکہ اس میں ضمیر ہے۔ وسحر یعنی غرور اور باطل ان کے نزدیک جادو کے باطل ہونے کی وجہ سے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ پڑھا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کنایۃ۔

وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۟۸ ع

''اور اگر ہم ملتوی کر دیں ان سے عذاب کچھ عرصہ تک تو (ازراہ مذاق) کہیں گے کہ کس چیز نے روک دیا ہے اس عذاب کو۔ وہ کان کھول کر سن لیں جس دن عذاب آجائے گا ان پر تو نہیں پھیرا جاسکے گا ان سے اور گھیر لے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا وہ تمسخر اڑایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ، لَئِنْ میں ''لام'' قسم کا ہے اور لَيَقُوْلُنَّ کا ''لام'' جواب قسم ہے۔ اِلٰٓى اُمَّةٍ کا معنی ہے معدود مدت اور معلوم زمانے تک (1)، یہاں اُمَّةٍ کا معنی مدت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ اور جمہور مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اور اُمَّةٍ کی اصل جماعت ہے اور حین اور سنین کو اُمَّةٍ کے ساتھ تعبیر کیا گیا کیونکہ اُمَّةٍ اس میں ہوتی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا مضاف الیہ حذف ہے اور معنی ہے الی مجیء امۃ جس میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان لاتا پس وہ ہلاکت کے مستحق ہو جاتے یا الی انقراض امۃ یعنی ایسی امت کے گزرنے تک جس میں وہ ہے جو ایمان لاتا ہے پس اس کے گزرنے کے بعد جو ایمان لاتا وہ باقی نہ رہتا۔ اور امت اسم مشترک ہے اس کی آٹھ صورتیں بنتی ہیں۔

امت جماعت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ (القصص: 23) اس پر اس نے لوگوں کی جماعت کو پایا۔ اور امت انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کو بھی کہتے ہیں، امت سے مراد بھلائی کا وہ جامع آدمی ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا (النحل: 120) بے شک ابراہیم ایک امت تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار۔ امت سے مراد دین اور ملت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ (الزخرف: 22) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا۔ امت سے مراد حین اور زمان ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ اور اگر ہم ملتوی کر دیں عذاب کچھ عرصہ تک اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف: 45)

امت سے مراد قد وقامت بھی ہے اس سے مراد انسان کی لمبائی اور اس کی بلندی ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: فلان حسن الامۃ یعنی فلاں اچھی قامت والا ہے۔ اور امت سے مراد وہ آدمی بھی ہے جو اپنے دین میں منفرد ہو اس میں کوئی بھی اس کا شریک نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا يُبْعَثُ زَيْدُ بْنُ عَمْرِو بْنُ نُفَيْلٍ اُمَّةً وَحْدَهٗ (2) زید بن عمرو بن نفیل کو اکیلا اٹھایا جائے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 11
2۔ المستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 496

گا۔ امت سے مراد ماں (الام) ہے کہا جاتا ہے: ھذہ امۃ زید یعنی زید کی ماں۔ لَیَقُوْلُنَّ مَا یَحْبِسُهٗ یعنی عذاب۔ انہوں نے یہ یا تو اس عذاب کی تکذیب کرتے ہوئے کہا ان سے اس عذاب کے موخر ہونے کی وجہ سے یا پھر جلدی کرتے ہوئے اور استہزا کرتے ہوئے کہا، اس سے مراد یہ ہے: کس چیز نے ہم سے اس کو روکے رکھا۔ اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْهِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ کہا گیا ہے: یہ غزوۂ بدر میں مشرکین کا قتل ہے، اور جبرئیل کا قتل کرنا ہے ان مذاق کرنے والوں کو جس طرح کہ بعد میں آئے گا۔ وَ حَاقَ بِهِمْ یعنی وہ نازل ہوا اور اس نے احاطہ کیا۔ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ یعنی جزا اس کی جس کا وہ مذاق کیا کرتے تھے۔ اس میں مضاف محذوف ہے۔

وَ لَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَیَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ۝

''اور اگر ہم چکھائیں کسی انسان کو اپنی طرف سے رحمت (کا مزہ) پھر ہم چھین لیں اس رحمت کو اس سے تو وہ بڑا مایوس (اور) ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر ہم چکھائیں اسے کوئی نعمت اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ دور ہو گئیں سب تکلیفیں مجھ سے۔ بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا، اترانے والا ہے۔ مگر وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے کم ظرف نہیں ہوتے) وہی ہیں جن کے لیے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً، الْاِنْسَانَ تمام کفار کے بارے میں جنس کے لیے مشترک نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں انسان سے مراد ولید بن مغیرہ ہے اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی۔ رَحْمَةً یعنی بطور نعمت۔ ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ یعنی ہم اس (نعمت) کو اس سے سلب کر لیں گے۔ اِنَّهٗ لَیَـُٔوْسٌ یعنی رحمت سے مایوس ہونے والا۔ كَفُوْرٌ یعنی نعمتوں کا انکار کرنے والا۔ ابن اعرابی نے یہ کہا ہے۔ نحاس نے کہا: لیؤوس، یئس ییأس سے ہے۔ سیبویہ نے کہا: یئس ییأس اور یأس ییئس ہے اور بعض کہتے ہیں: یئس ییئس ہے۔ کلام عرب میں سوائے ان چار حروف کے سالم سے فَعِلَ یَفْعِلُ کے وزن پر کوئی اور صیغہ نہیں جانا گیا اور ان میں سے ایک میں اختلاف ہے اور وہ ہے یئس ویئوس کثرت کے طور پر جس طرح مبالغہ کے لیے فخور آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ یعنی صحت، خوشحالی اور رزق میں وسعت بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ یعنی نقصان، فقر اور شدت کے بعد۔ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ یعنی وہ غلطیاں جو غلطی کرنے والے کو بری لگتی ہیں نقصان اور فقر میں سے۔ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ یعنی وہ خوش ہوتا ہے اور وسعت میں سے جو کچھ اس کو ملا اس کی وجہ سے فخر کرتا ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا بھول جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل فاخر جب وہ فخر کرے اور فخور مبالغہ کے لیے ہے۔ یعقوب القاری نے کہا: بعض اہل مدینہ نے لفرُح پڑھا ہے را کے ضمہ کے ساتھ جس طرح کہا جاتا ہے: رجل فطنٌ وحذرٌ وندسٌ۔ اور ان دونوں لفظوں کو

ساکن کرنا بھی جائز ہے ضمہ اور کسرہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا یعنی مومنین، اللہ تعالیٰ نے شدائد پر صبر کی وجہ سے ان کی تعریف فرمائی اور یہ محل نصب میں ہے۔ اخفش نے کہا: یہ استثنا ہے مگر پہلے میں سے نہیں، یعنی لیکن وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نعمت اور محنت دونوں حالتوں میں نیک عمل کیے۔ فراء نے کہا: یہ ولئن اذقناہ سے استثنا ہے یعنی انسان سے پس انسان بمعنی ناس (لوگ) ہے۔ اور الناس کافر اور مومن دونوں کو شامل ہے پس یہ استثنا متصل ہے اور یہ عمدہ ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ وَّ اَجْرٌ معطوف ہے۔ كَبِیْرٌ اس کی صفت ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌؕ﴿۱۲﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴿۱۳﴾

''پس کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ چھوڑ دیں کچھ حصہ اس کا جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور تنگ ہو جائے اس کے ساتھ آپ کا سینہ (اس اندیشہ سے) کہ کافر کہیں گے کہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ کیا کفار کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن خود) گھڑ لیا ہے، آپ فرمائیے: (اگر ایسا ہے) تو تم بھی لے آؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی اور بلا لو (اپنی مدد کے لیے) جس کو بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم (اس الزام تراشی میں) سچے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ یعنی شاید آپ ان کی طرف سے جو کفر اور تکذیب دیکھتے ہیں اس کو بڑا خیال کریں اور یہ گمان کریں کہ وہ آپ کو وحی کے بعض حصہ سے ہٹا دیں گے۔ ایک قول یہ ہے: جب انہوں نے کہا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ آپ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ کلام کا معنی استفہام ہے یعنی کیا آپ چھوڑ دیں گے جو قرآن میں ان کے بتوں کو برا بھلا کہا گیا ہے جس طرح کہ وہ آپ سے سوال (مطالبہ) کرتے ہیں؟ اور آپ پر تبلیغ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے امر کو اور زیادہ پختہ فرما دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ: 67) اے رسول! تبلیغ کیجئے اس کی جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: کلام کا معنی نفی مع استبعاد ہے (اس بات کو بعید خیال کرنا) یعنی آپ کی طرف سے ایسا نہیں ہوگا بلکہ آپ کی طرف جو نازل کیا گیا آپ اس کو (جوں کا توں) پہنچا دیں گے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ مشرکین مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: اگر آپ ہمارے لیے کوئی ایسی کتاب لے آئیں جس میں ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہا گیا ہو تو ہم آپ کی اتباع

کریں گے، تو نبی کریم ﷺ نے ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنا ترک کرنے کا ارادہ فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ، تَارِكٌۢ پر اس کا عطف ہے اور صَدْرُكَ اس کی وجہ سے مرفوع ہے۔ بِهٖ کی ہ ضمیر کا مرجع ما ہے یا بعض ہے یا تبلیغ ہے یا پھر تکذیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ضَآئِقٌ فرمایا ضَیِّقٌ نہ فرمایا تاکہ یہ تَارِكٌۢ جو کہ اس سے پہلے ہے اس کا ہم شکل (ہم وزن) ہو جائے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ضَآئِقٌ عارض ہے جب کہ ضیق اس سے زیادہ لازم ہے۔ اَنْ يَّقُوْلُوْا محل نصب میں ہے یعنی اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ کہیں گے یا اس سے مراد ہے لئلا یقولوا تاکہ وہ یہ نہ کہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) یہاں اَنْ تَضِلُّوْا سے مراد لئلا تضلوا ہے یا پھر یہ لأن یقولوا ہے۔ لَوْلَاۤ سے مراد ہے ھلا یعنی کیوں نہ۔ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ جو اس کی تصدیق کرتا، عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی نے یوں کہا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد ﷺ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ یعنی آپ پر ان کو ڈرانا ہے نہ یہ کہ آپ ان کے لیے لائیں ایسی آیات جن کی وہ تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ یعنی حفاظت کرنے والا اور نگہبان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ، ام بمعنی بل ہے۔ یہ ''سورۂ یونس'' میں گزر چکا ہے یعنی آپ کی نبوت کے بارے میں ان کے اشکال اور ان کے اعتراضات اس قرآن کے ذریعے ختم ہو گئے اور آپ نے اس کے ذریعے ان پر حجت قائم کر دی۔ پس اگر وہ کہیں: تو نے اس کو گھڑ لیا ہے یعنی تو نے خود اس کو تخلیق کر لیا ہے۔ پس وہ اپنے گمان کے مطابق اس جیسا گھڑا ہوا لے آئیں۔ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کاہنوں اور مددگاروں میں سے جس کو بلا سکتے ہیں بلا لیں۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۴

''پس اگر وہ نہ قبول کر سکیں تمہاری دعوت تو پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ پس کیا (اب) تم اسلام لے آؤ گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ یعنی معارضت (چیلنج) کے بارے میں اور یہ اس کے لیے تیار نہیں تو ان پر حجت قائم ہو چکی کیونکہ وہ بلیغ لغت اور فصیح زبان والے ہیں۔ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ یعنی تم محمد ﷺ کی سچائی کو جان لو۔ اور جان لو وَ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ استفہام بمعنی امر ہے اس آیت کے معنی کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور یہ کہ قرآن معجز ہے (مقدمہ کتاب میں) والحمد للہ

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ فَاْتُوْا اور اس کے بعد فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ (اس میں لَكُمْ کے بجائے) لك نہیں کہا۔ ایک قول یہ ہے: یہ مخاطب کو بطور تعظیم و تفخیم مفرد سے جمع کی طرف پھیرنا ہے۔ بعض اوقات رئیس کو (ایسے الفاظ کے ساتھ) خطاب کیا جاتا ہے جن کے ذریعے جماعت کو مخاطب ہوا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے لَكُمْ اور فَاعْلَمُوْۤا میں ضمیر تمام کے لیے ہے یعنی سب کو جان لینا چاہیے کہ اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ مجاہد نے یوں کہا ہے، اور ایک قول یہ ہے لَكُمْ اور فَاعْلَمُوْۤا میں ضمیر مشرکین

کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا اگر وہ جن کو تم نے معاونت کی دعوت دی وہ تمہاری دعوت کا جواب نہ دیں اور تمہارے لیے مقابلہ ممکن نہ ہو۔ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ تو پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے لَكُمْ میں ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور فَاعْلَمُوْۤا میں مشرکین کے لیے ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝

''جو طلب گار ہیں دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے تو ہم پورا بدلہ دیں گے انہیں ان کے اعمال کا اس زندگی میں اور انہیں اس میں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان مَنْ كَانَ میں كَانَ زائدہ ہے، اسی وجہ سے جواب (شرط) مجزوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نُوَفِّ اِلَيْهِمْ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مَنْ كَانَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے اور اس کا جواب نُوَفِّ اِلَيْهِمْ ہے اس سے مراد من تکن یرید ہے۔ لفظ پہلا ماضی ہے اور دوسرا مضارع جس طرح زہیر نے کہا:

ومن هابَ أسبابَ المنية يَلْقَها　　ولو رامَ أسبابَ السماء بسلم

جو موت کے اسباب سے بھاگا وہ اس کو ملے گا اگرچہ سیڑھی کے ذریعہ آسمان کے اسباب کا ہی قصد کیوں نہ کرے۔

استشہاد (اس میں ''هاب'' ماضی ہے جب کہ یلقها مضارع)

اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے یہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ ضحاک نے کہا ہے اور نحاس نے اس کو اختیار کیا ہے اس کے بعد آنے والی آیت کی دلیل کی وجہ سے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ یعنی ان میں سے جس شخص نے صلہ رحمی اور صدقہ کیا ہم اس کو دنیا میں ہی جسمانی صحت اور کثرت رزق کے ذریعے اس کا بدلہ دیں گے لیکن آخرت میں اس کے لیے کوئی نیکی نہیں۔ ''سورۂ براۃ'' میں یہ معنی مکمل طور پر گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے آیت سے مراد مومنین ہیں، یعنی جس نے اپنے عمل کے ذریعے دنیا کے ثواب کا ارادہ کیا اسے جلدی ثواب دیا جائے گا اور دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں کی جائے گی اور آخرت میں اس کے لیے عذاب ہوگا کیونکہ اس کا ارادہ صرف دنیا کا تھا اور یہ (ایسے ہی ہے) جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''(1)۔

پس بندے کو اس کے ارادے کے سبب اور اس کے ضمیر کے فیصلے پر عطا کیا جاتا ہے اور یہ ہر ملت میں تمام قوموں میں متفق علیہ بات ہے۔ ایک قول یہ ہے یہ ریا کاروں کے لیے ہے(2)، حدیث طیبہ میں ہے کہ ریا کاروں کو کہا جائے گا: ''تم نے روزہ رکھا، تم نے نماز پڑھی، تم نے صدقہ کیا، تم نے جہاد کیا اور تم نے تلاوت کی تاکہ تمہیں ایسا کہا جائے پس یہ کہہ دیا گیا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک یہ پہلے لوگ ہوں گے جن پر آگ جلائی جائے گی'' (دوزخ میں ڈالے جائیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، کیف کان بدأ الوحی، جلد 1، صفحہ 2　　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 18

گے) اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا پھر آپ بہت زیادہ روئے اور کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا (1)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا اور آپ نے دو آیتیں پڑھیں۔

امام مسلم نے اس کو اس کے معنی کے ساتھ اپنی صحیح (مسلم) میں روایت کیا اور ترمذی نے بھی روایت کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت ہر اس آدمی کے بارے میں عام ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی نیت کرتا ہے وہ مومن ہو یا نہ ہو۔ مجاہد اور میمون بن مہران نے یوں کہا ہے، اس جانب حضرت معاویہ گئے ہیں اور میمون بن مہران نے کہا: کوئی بھی آدمی اچھا عمل کرے تو اس کا پورا پورا ثواب دیا جاتا ہے پس اگر مخلص مسلمان ہو تو دنیا و آخرت (دونوں) میں (ثواب) دیا جاتا ہے اور اگر وہ کافر ہو تو دنیا ہی میں پورا بدلہ دے دیا جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں دنیا چاہتا ہے تو وہ اس کو دے دی جاتی ہے یعنی غازیوں والا اجر پورا دے دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی (اس معنی کے اعتبار سے) یہ مخصوص ہے جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عموم ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت کا معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: انما الاعمال بالنیات ہے یعنی اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے رمضان میں رمضان کے علاوہ (کوئی اور) روزہ رکھا تو وہ رمضان کا روزہ نہیں ہوگا اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے ٹھنڈک (کے حصول) اور نظافت کی خاطر وضو کیا تو وہ نماز کی طرف سے بطور قربت واقع نہ ہوگا اور اسی طرح ہر وہ حکم جو اس معنی میں ہو (اس کا یہی حکم ہے) (عندالمالکیہ)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت مطلق ہے اور اس طرح سورۃ الشوریٰ والی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا الایۃ (الشوریٰ: 20) اس طرح وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ سورۂ سبحان میں موجود آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ سے مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: 18 تا 20) کے ارشاد تک نے اس کی قید اور تفسیر بیان کی ہے۔ اللہ سبحانہ نے خبر دی کہ بندہ نیت اور ارادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا کے بارے میں روایت کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ (بنی اسرائیل: 18) کے ذریعے منسوخ ہے اور صحیح وہ ہے جو ہم (قرطبی) نے ذکر کیا ہے اور اس کا تعلق مطلق اور مقید کی بحث سے ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) بھی ہے اس کا ظاہر تو یہ ہے کہ ہر حال میں ہمیشہ ہر پکارنے والے کے جواب کے متعلق خبر ہے حالانکہ اس طرح نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: 41) کی وجہ سے۔ اور اخبار میں نسخ جائز نہیں ہوتا کیونکہ واجبات عقلیہ کی تبدیلی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ محال ہے،

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ، جلد 2، صفحہ 61

جہاں تک احکام شرعیہ کے متعلق اخبار کا تعلق ہے تو ان کا نسخ جائز ہے اس میں اختلاف ہے جس طرح کہ اصول میں مذکور ہے اور اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

''یہ وہ لوگ ہیں نہیں ہے جن کے لیے آخرت میں مگر آگ اور اکارت گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا اور (در حقیقت) مٹ جانے والا تھا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ میں ہمیشہ (جہنم میں) رہنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ مومن ہمیشہ (جہنم میں) نہیں رہے گا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ الآیۃ (النساء: 116) بے شک اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ معاف فرمادے گا۔ پس اس کو اس ریاکار کی کفر پر وفات ہونے پر محمول کیا جائے گا۔ ایک قول یہ ہے لیس لھم الا النار کا معنی یہ ہے کہ وہ معلوم دن آگ میں رہیں گے پھر ان کو نکال لیا جائے گا یا تو شفاعت کے ذریعے یا مٹھی بھرنے کے ذریعے (یعنی پکڑ کر) اور آیت کریمہ ایمان کو سلب کرنے کے ذریعے وعید کا تقاضا کرتی ہے اور گزشتہ (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی) حدیث میں کفر اور بالخصوص ریا مراد ہے، کیونکہ یہ بھی شرک ہے جس طرح کہ سورۃ النساء میں اس کا بیان گزر چکا ہے اور سورۃ الکہف کے آخر میں بھی آئے گا۔ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: ھا کو حذف کر دیا گیا ہے، نحاس نے کہا: اس کو حذف کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے یعنی وباطل عملہ کہ اس کا عمل باطل ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبداللہ کے حرف میں وباطلا ما کانوا یعملون، ما زائدہ ہوگا یعنی وکانوا یعملون باطلا کہ وہ باطل کام کیا کرتے تھے۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

''تو کیا وہ شخص (انکار کر سکتا ہے) جس کے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس کے پیچھے ایک سچا گواہ بھی آ گیا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس سے قبل کتاب موسیٰ بھی آ چکی ہو جو امام اور سراپا رحمت ہے؟ (قطعاً نہیں بلکہ) یہ لوگ تو ایمان لائیں گے اس پر اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں میں سے تو آتش (جہنم) ہی اس کے وعدہ کی جگہ ہے پس (اے سننے والے!) نہ پڑ جا شک میں اس کے متعلق۔ بلاشبہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یعنی کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں

میں سے وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہے اور اس کے پاس وہ فضل ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بیان فرماتا ہے وہ اپنے علاوہ کسی ایسے آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جو دنیوی زندگی اور اس کی زینت کو چاہتا ہے؟ یہ علی بن حسین اور حسن بن ابی الحسن سے مروی ہے۔ اور اسی طرح ابن زید نے بھی کہا ہے۔ بے شک جو روشن دلیل پر ہے وہ وہ ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ یعنی اللہ کی طرف سے، اور وہ (شاہد) (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کلام اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ کی طرف راجع ہے یعنی کیا وہ شخص جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان ہو، قرآن کی طرح کا معجزہ ہو، اس کے ساتھ جبریل کی طرح کا گواہ ہو۔ جس طرح کہ آئے گا۔ اور گزشتہ کتب اس کو اس کی خوشخبری سنا چکی ہوں، تبلیغ کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو سکتا ہے؟ اور وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں چھوڑے گا۔ اور رَّبِّهٖ کی ہ ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ کے بارے میں عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ وہ جبریل ہیں۔ یہی مجاہد اور نخعی کا قول ہے۔ مِّنْهُ کی ہ ضمیر اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہے۔ یعنی بیان اور برہان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ آ گیا ہے، مجاہد نے کہا: شاہد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ ہے جو اس (کتاب) کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو مضبوط کرتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ نے کہا: شاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ حضرت محمد بن علی بن حنفیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو کہا: کیا آپ شاہد ہیں؟ تو انہوں نے کہا: میں پسند کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں، لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ ایک قول یہ ہے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ انہوں نے کہا: وہ حضرت علی بن ابی طالب ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: قریش میں سے کوئی آدمی نہیں مگر اس کے بارے میں ایک یا دو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ تو کسی آدمی نے آپ کو کہا: آپ کے بارے میں کیا نازل ہوا ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ۔ ایک قول یہ ہے شاہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت، آپ کا چہرہ اور آپ کی ہیئت وصورت ہے، کیوں کہ جس شخص کو عقل وفضل حاصل ہو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھے تو وہ جان لے گا کہ آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس صورت میں مِّنْهُ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوگی ابن زید اور ان کے علاوہ کے قول کے مطابق۔

ایک قول یہ ہے: شاہد قرآن ہے اپنی نظم، اپنی بلاغت اور ایک لفظ کے کثیر معانی میں۔ حسین بن فضل نے یوں کہا ہے۔ مِّنْهُ کی ضمیر (اس صورت میں) قرآن پاک کے لیے ہوگی۔ فراء نے کہا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ سے مراد انجیل ہے اگرچہ یہ قرآن سے پہلے ہے مگر تصدیق میں قرآن سے پیچھے ہے، (اس صورت میں) مِّنْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگی۔ اور ایک قول یہ ہے بَیِّنَةٍ اللہ تعالیٰ کی وہ معرفت ہے جو دلوں کو روشن کرتی ہے اور شاہد جو اس کے پیچھے آتا ہے وہ وہ عقل ہے جو اس کے دماغ میں ترکیب پاتی ہے اور اپنے نور کے ذریعے اس کے سینے کو روشن کرتی ہے۔ وَمِنْ قَبْلِهٖ یعنی انجیل سے پہلے كِتٰبُ مُوْسٰٓى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا کہ معنی یہ ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 21

کی کتاب اس کے پیچھے آئی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کتاب موسیٰ میں موصوف ہیں۔ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف: 57) وہ اس کو اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ ابو حاتم نے بعض سے بیان کیا کہ انہوں نے اس کو وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى پڑھا ہے نصب کے ساتھ۔ مہدوی نے کلبی سے اس کو بیان کیا اس کا یَتْلُوْهُ کی ہٗ ضمیر پر عطف ہے اور معنی یہ ہوگا، جبریل علیہ السلام کتاب موسیٰ علیہ السلام کو تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی یہ ہوگا اس سے پہلے جبریل نے کتاب موسیٰ کو موسیٰ علیہ السلام پر تلاوت کیا۔ وہ بھی درست ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا۔ کتاب مرفوع ہوگی اس بنیاد پر کہ اس کا معنی یہ ہوگا اس سے پہلے کتاب موسیٰ بھی اسی طرح ہے، یعنی جبریل نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تلاوت کیا جس طرح اس نے قرآن کو حضرت محمد ﷺ پر تلاوت کیا۔ اِمَامًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے وَّ رَحْمَةً معطوف ہے اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ ایمان لاتے ہیں اس بشارت پر جو تورات میں آپ کے متعلق ہے اور ان کے بعد میں آنے والوں نے آپ کا انکار کر دیا، پس یہی ہیں آتش (جہنم) جن کے وعدہ کی جگہ ہے، قشیری نے اس کو بیان کیا ہے۔ بِهٖ میں ضمیر قرآن کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کے لیے ہو۔ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ یعنی جو بھی کفر کرے قرآن کا یا نبی کریم ﷺ کا۔ مِنَ الْاَحْزَابِ یعنی تمام ملتوں میں سے۔ قتادہ سے ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا: الْاَحْزَابِ سے مراد تمام ادیان والے ہیں، کیونکہ ان کے دل اور اعمال مشابہت رکھتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ قریش اور ان کے حلیف ہیں۔ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ یعنی وہ دوزخیوں میں سے ہیں۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے شعر کہا ہے:

أوردتموها حياضَ الموتِ ضاحية فالنّارُ موعدُها والموتُ لاقيها

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا۔ یہ لوگ پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور کہیں گے گواہ، یہی وہ (گستاخ) ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا۔ خبردار! اللہ کی پھٹکار ہو ظالموں پر جو بدنصیب روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور چاہتے ہیں کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں''۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۔ یعنی ان لوگوں سے زیادہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کسی اور کی طرف منسوب کیا اور یہ گمان کیا کہ وہ اس کا شریک

اور بیٹا ہے۔ اور بتوں کے بارے میں کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے سفارشی ہیں۔ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ۔ یعنی وہ ان کے اعمال پر ان کا محاسبہ کرے گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو یونس رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت ہے: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے میرے بارے میں کسی یہودی اور نصرانی نے سنا پھر وہ میری تعلیمات پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا''۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ، شک میں نہ ہو جاؤ۔ مِّنْهُ ضمیر سے مراد قرآن کریم ہے۔ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ مقاتل نے کہا۔ کلبی نے کہا: معنی یہ ہوگا کہ کافر کے دوزخ میں ہونے میں شک نہ کرو۔ اِنَّهُ الْحَقُّ، مراد قول حق ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد تمام مکلفین ہیں۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ یعنی حفاظت کرنے والے فرشتے مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ سفیان نے کہا: میں نے اعمش سے اشہاد کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے کہا: اس سے مراد ملائکہ ہیں۔ ضحاک نے کہا: وہ انبیاء و مرسلین ہیں، ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ (النساء) ہے۔ اور ایک قول کے مطابق وہ فرشتے اور انبیاء ہیں اور وہ علماء ہیں جنہوں نے رسالت کی تبلیغ کی۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس سے مراد ساری مخلوق ہے۔ صحیح مسلم میں صفوان بن محرز عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: جہاں تک کفار اور منافقین کا تعلق ہے تو لوگوں کے سامنے ان کے بارے میں یہ صدا لگائی جائے گی کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر کذب و افتراء سے کام لیا ہے۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یعنی جن لوگوں نے عبادت کو ایسے مقام پر رکھا جو عبادت کے لیے نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان پر اپنا غضب نازل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ الَّذِيْنَ، الظّٰلِمِيْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محل رفع میں ہو یعنی هم الذين اور ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب کی ابتدا ہے، یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو ایمان اور اطاعت سے روکتے ہیں وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی اس طریقے سے وہ لوگوں کو گناہ اور شرک کی طرف لے جاتے ہیں۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ، هُمْ ضمیر کا اعادہ تاکیداً کیا گیا ہے

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝

''یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں تھے زمین میں اور نہ ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار تھا۔ دوگنا کر دیا جائے گا ان کے لیے عذاب نہ وہ (آواز حق) سن سکتے تھے اور نہ وہ (نور حق) دیکھ سکتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے بچنے والے نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: وہ مجھے اس بات سے عاجز نہیں کر سکتے کہ میں زمین کو حکم دوں کہ وہ ان کو نگل لے۔ وَمَا كَانَ لَهُمْ

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ اولیاء سے مراد مددگار ہیں اور من زائدہ ہے اور ایک قول کے مطابق ما بمعنی الذی ہے اور تقدیر عبارت یہ ہوگی: اولئك لم يكونوا معجزين لاهم ولا الذين كانوا لهم من اولياء من دون الله یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ یعنی ان کے کفر اور ان کی نافرمانیوں سے دوگنا۔ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ، ما اس بنیاد پر محل نصب میں ہے کہ اس کا معنی ہوگا مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (1) یعنی وہ اسے حق کو سننے اور اسے دیکھنے میں استعمال نہیں کرتے۔

اور عرب اس طرح کلام استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً وہ جس طرح جزيته ما فعل کہتے ہیں اسی طرح جزيته بما فعل بھی کہتے ہیں۔ بعض اوقات با کو حذف کر دیتے ہیں اور بعض اوقات اسے ثابت رکھتے ہیں سیبویہ نے شعر پڑھا ہے:

أمرتكَ الخيرَ فافعل ما أمِرتَ به فقد تركتكَ ذا مالٍ و ذا نَشَبِ

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما ظرفیہ ہو اور معنی ہو: ان کے لیے ہمیشہ دوگنا فرمائے گا، یعنی ان کے (آواز حق) کو سننے اور (نور حق) کو دیکھنے کی ان کی استطاعت کے وقت، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں جہنم میں ڈالے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما نافیہ ہو اور اس کا کوئی محل نہ ہو، کیونکہ کلام اس سے پہلے مکمل ہو چکا ہے۔ اور الْعَذَابُ پر وقف کافی ہے، اور معنی یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں ایسا سننے کی استطاعت نہیں رکھتے جو انہیں نفع دے، اور نہ ہی ایسا دیکھ سکتے ہیں جو ہدایت یافتہ کا دیکھنا ہو۔ فراء نے کہا: وہ سننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لوح محفوظ سے خارج کر دیا ہے۔ زجاج نے کہا: ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دشمنی اور عداوت کی وجہ سے آپ سے نہ سن سکتے تھے اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ کلام عرب میں معروف ہے کہ جب کسی کے لیے دوسرے کو دیکھنا ثقل کا باعث ہو تو کہا جاتا ہے فلاں، فلاں کو دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝

''یہی وہ (بدقسمت) لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو اور گم ہو گئیں ان سے وہ باتیں جو وہ تراشا کرتے تھے۔ یقیناً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی ان سے ان کی بہتان تراشی ضائع اور گم ہو گئی۔

قولہ تعالیٰ: لَا جَرَمَ علماء کے اس کے بارے میں کئی اقوال ہیں، خلیل اور سیبویہ نے کہا: لَا جَرَمَ بمعنی حق ہے۔ ان دونوں کے نزدیک فلا جرم ایک ہی کلمہ ہے، اور ان ان کے نزدیک محل رفع میں ہے۔ یہ فراء اور محمد بن یزید کا قول ہے۔ اور نحاس نے اس کو بیان کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: خلیل سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی لابد اور لا محالة ہے یہ بھی فراء کا قول ہے۔ ثعلبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور زجاج نے کہا: یہاں لا نافیہ ہے، اور یہ ان کے اس قول کا رد ہے کہ بت انہیں نفع دیں گے،

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 29

گویا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں نفع نہیں دیں گے، اور جَرَمَ بمعنی کسب ہے، یعنی اس فعل نے ان کے لیے خسارہ کمایا اور کسب کا فعل مضمر ہے اور ان جرم کی وجہ سے منصوب ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: کسب جفاءك زیدا غضبه علیك شاعر نے کہا:

نَصبنا رأسه فی جِذعِ نَخْلٍ　　بما جَرَمَتْ یداہ وما اعتدینا(1)

شعر میں بما جرمت کا معنی بما کسبت ہے۔ کسائی نے کہا: لا جرم کا معنی لا صد ولا منع ہے ایک قول کے مطابق معنی لا قطع قاطع ہے کثرت استعمال کی وجہ سے فاعل کو حذف کر دیا گیا اور الجرم سے مراد القطع ہے۔ جرم النحل واجترمه سے مراد ضرمه ہے اسی طرح قوم جرم اور جرام اور هذا زمن الجرام والجرام استعمال ہوتا ہے اور جرمت صوف الشاۃ کا مطلب ہے میں نے بکری کی اون کو کاٹا۔ اور جرمت منه یعنی اخذت منه ہے جیسے جلمت الشیٔ جلما یعنی میں نے کاٹا۔ اور اگر آپ اس کی ہڈیوں سے گوشت کو اتار لیں تو جلمت الجزور اجلمها جلما کہا جاتا ہے اور اخذت الشیء بجلمته لام ساکن بولا جاتا ہے جب آپ اس باری کو لے لیں اور هذه جلمة الجزور لام کی حرکت کے ساتھ کا معنی ہے اس کا سارا گوشت، یہ جوہری کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: کسائی کا خیال ہے کہ اس کی چار لغتیں ہیں۔ لا جرم لا عن ذا جرم، لا ان ذا جرم اور کسائی نے کہا، بنی فزارہ کے لوگ کہتے ہیں: لا جرانهم یعنی بغیر میم کے پڑھتے ہیں۔ اور فراء نے اس کے بارے میں دو اور لغتیں بیان کی ہیں اس نے کہا: بنو عامر لا ذا جرم کہتے ہیں اور عرب کے کچھ لوگ لا جرم پڑھتے ہیں جیم کے ضمہ کے ساتھ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

"بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور عجز و نیاز سے جھک گئے اپنے پروردگار کی طرف۔ یہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، الَّذِیْنَ، اِنَّ کا اسم ہے اور اٰمَنُوْا صلہ ہے یعنی انہوں نے تصدیق کی۔ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ صلہ پر عطف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اَخْبَتُوْۤا کا معنی ہے وہ جھک گئے۔ مجاہد نے کہا: انہوں نے اطاعت کی۔ حضرت قتادہ نے کہا: انہوں نے خشوع و خضوع کیا۔ مقاتل نے کہا: انہوں نے اخلاص کا مظاہرہ کیا(2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اخبات سے مرد دل میں موجود خوف کی وجہ سے اختیار کیا جانے والا خشوع ہے اور اخبات کی اصل استواء ہے، یہ خبت سے مشتق ہے اور اس سے مراد کھلی اور ہموار زمین ہے، لہٰذا اخبات سے مراد خشوع، اطمینان یا مکمل طور پر مسلسل اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جھکاؤ ہے۔ اِلٰى رَبِّهِمْ فراء نے کہا: اِلٰى رَبِّهِمْ اور لربهم دونوں ایک ہی ہیں اور اس کا معنی ہوگا انہوں نے اپنے جھکاؤ کا مرکز اپنے رب کو بنایا۔ اُولٰٓىِٕكَ یہ ان کی خبر ہے۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 464　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 465-464

''ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو۔ کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال کیا تم (اس مثال میں) غور وفکر نہیں کرتے''۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ یہ مبتدا ہے اور كَالْاَعْمٰى اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی کمثل الاعمی ہے۔ نحاس نے کہا: تقدیر عبارت: مثل فریق الکافر کالاعمی والاصم ہے اور مثل فریق المومن کالسمیع و البصیر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ يَسْتَوِيٰنِ اس کو فریقین کی طرف لوٹایا گیا اور وہ دو ہیں۔

اس کا معنی حضرت قتادہ اور دیگر سے مروی ہے۔ ضحاک نے کہا: الاعمی والاصم کافر کے لیے مثال ہے اور السَّمِيْعِ اور الْبَصِيْرِ مومن کے لیے (1)۔ اور ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں، اور کیا بہرا اور سننے والا برابر ہیں۔ مثلاً تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کیا تم ان دونوں وصفوں میں غور وفکر نہیں کرتے اور نہیں دیکھتے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾

''اور بیشک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (انہوں نے کہا: اے قوم) میں تمہیں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں کہ تم نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ تعالیٰ کے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آجائے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انبیاء علیہم السلام کے قصص کو ذکر کیا تا کہ آپ کفار کی اذیتوں پر صبر کو لازم پکڑیں اور اللہ تعالیٰ ان کے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی ہو جائے گا۔ انی یعنی حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: انی یعنی میں، کیونکہ ارسال میں قول کا معنی موجود ہے۔

ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے انی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ارسلناہ بانی لکم نذیر مبین۔ (2) انہ نہیں فرمایا کیونکہ غیب سے حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم کو خطاب کی طرف رجوع فرمایا۔ جس طرح وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ فرمایا اور پھر فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ (الاعراف: 145) فرمایا یعنی پہلے غیب اور پھر مخاطب کے صیغے۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ یعنی بتوں کو چھوڑ دو، ان کی عبادت نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ جو یکتا ہے اس کی اطاعت کرو، اور جس نے انی کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اسے کلام میں جملہ معترضہ بنایا ہے، اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اس کو بھیجا تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ یعنی میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آجائے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 162 2۔ ایضاً

بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝

''تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا (اے نوح) ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر انسان اپنے جیسا اور ہم نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل (اور) ظاہر بین ہیں اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ہے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَقَالَ الْمَلَاُ ابو اسحاق زجاج نے کہا: الْمَلَاُ سے مراد سردار ہیں، یعنی وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے ذریعے وہ بھر دیتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا بشر سے مراد آدمی ہے۔ مِّثْلَنَا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مِّثْلَنَا معرفہ کی طرف مضاف ہے اور یہ نکرہ ہے تنوین اس میں مقدر ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

یا رُبَّ مِثْلِكِ فِی النِّسَاءِ غَرِیرَۃٍ

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا، اراذل، أرذل کی جمع ہے اور أرذل رذل کی جمع ہے (1)۔ جس طرح کلب کی جمع اکلب اور اکلب کی جمع اکالب آتی ہے۔

اور ایک قول کے مطابق: اراذل، أرذل کی جمع ہے جس طرح اساود، اسود کی جمع ہے جس کا معنی سانپ ہے اور رذل سے مراد کسی چیز کا گھٹیا حصہ ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ جو آپ کی اتباع کرتے ہیں وہ ہم میں سے گھٹیا، حقیر اور رسوا لوگ ہیں۔ زجاج نے کہا: انہوں نے انہیں پیشہ کی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ پیشوں کا دیانت میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نحاس نے کہا: اراذل سے مراد وہ فقراء اور وہ لوگ ہیں جن کا کوئی حسب نہیں اور گھٹیا پیشہ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''وہ جولا ہے اور حجام ہیں''۔ اور یہ ان کی طرف سے جہالت تھی کیونکہ انہوں نے اللہ کے نبی پر ایسا عیب لگایا جوان میں نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام پر تو دلائل و براہین اور آیات کو لانا لازم ہوتا ہے ان پر ہیئتیں اور صورتیں تبدیل کرنا تو لازم نہیں ہوتا اور انہیں تمام لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی گھٹیا آدمی ایمان لے آئے تو اس وجہ سے انہیں کوئی نقص لاحق نہیں ہوتا، کیونکہ ان پر تو ہر اسلام قبول کرنے والے کے اسلام کو قبول کرنا لازم ہوتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اراذل سے یہاں مراد فقراء اور ضعفاء ہیں، جس طرح ہرقل نے ابوسفیان کو کہا تھا کہ لوگوں میں سے اشراف اس (نبی) کی پیروی کرتے ہیں یا ضعفاء؟ تو ابوسفیان نے کہا: ان میں سے ضعفاء (ایمان لائے ہیں) تو ہرقل نے کہا: یہی لوگ انبیاء کے پیروکار ہوتے ہیں (2)۔ ہمارے علماء نے کہا: اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اشراف پر ریاست و حکومت غالب ہوتی ہے اور ان کا اس سے علیحدگی اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے، اور غیر کی اطاعت کرنا ان کے لیے ذلت کا باعث ہوتا ہے، جب کہ فقیر ان موانع سے خالی ہوتا ہے، لہٰذا وہ بات کو قبول کرنے اور اطاعت کرنے میں تیزی کرتا ہے، اور یہ اہل

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 465

2۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 4، صفحہ 1787

دنیا کے اکثر حالات ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا گھٹیا پن کی تعیین میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مبارک نے سفیان سے ذکر کیا ہے کہ گھٹیا لوگ وہ ہیں جو بادشاہوں کے آنے کے وقت لہو ولعب کی اصناف کے ذریعے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اور قاضیوں اور بادشاہوں کے دروازوں پر حاضری کے لیے آتے ہیں۔ ثعلب نے ابن اعرابی سے نقل کرتے ہوئے کہا: گھٹیا لوگوں سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دین کے ذریعے دنیا حاصل کرتا ہے، انہیں کہا گیا کہ پھر گھٹیا ترین کون ہوا؟ تو انہوں نے کہا: وہ آدمی جو اپنے دین کی بربادی کے ذریعے کسی کی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گھٹیا پن کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ان سے مراد ایسے لوگ ہیں کہ جو اگر اکٹھے ہو جائیں تو غالب آ جائیں اور اگر جدا جدا ہوں تو پہچانے بھی نہ جائیں۔ حضرت مالک بن انس سے ان کے بارے میں پوچھا گیا کہ گھٹیا لوگ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: جو صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اراذلون سے مراد جولاہے اور حجام ہیں۔ یحییٰ بن اکثم نے کہا: ان سے مراد ایسے غیر عرب لوگ ہیں جو کھالیں رنگ کرتے اور صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب عورت اپنے شوہر کو یا سفلہ کہے اور مرد اسے کہے: اگر میں ان میں سے ہوں تو تجھے طلاق۔ نقاش نے بیان کیا کہ ایک آدمی امام ترمذی کے پاس آیا اس نے کہا: میری بیوی نے مجھے یا سفلہ کہا ہے تو میں نے اسے کہا: اگر میں سفلہ ہوں تو تجھے طلاق، امام ترمذی نے کہا: تیرا پیشہ کون سا ہے؟ اس نے کہا: مچھیرا، تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم سفلہ۔

میں (قرطبی) نے کہا کہ جس طرح حضرت ابن مبارک نے سفیان سے ذکر کیا ہے اس طرح تو اسے طلاق واقع نہیں ہو گی، اسی طرح امام مالک اور ابن اعرابی کے قول کے مطابق بھی اسے کوئی چیز واقع نہیں ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: بَادِیَ الرَّاْیِ اس سے مراد رائے کا ظاہر ہے اور ان کا باطن اس کے خلاف ہے

جب کوئی چیز ظاہر ہو تو اس وقت بدا یبدو کہا جاتا ہے۔ جس طرح کسی نے کہا:

فالیوم حین بَدَوْن للنُّظار

صحرا کو بھی ظاہر ہونے کی وجہ سے بادیۃ کہا جاتا ہے اور بدالی ان أفعل کذا کا مطلب ہوتا ہے کہ میرے لیے پہلی رائے کے علاوہ رائے ظاہر ہوئی ہے۔ ازہری نے کہا: اس کا معنی رائے میں سے جو کچھ ہمارے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ ہے۔ ہوسکتا ہے بادی الرای، بدأ یبدأ سے مشتق ہو اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہو۔ ابو عمرو نے ہمزہ کو ثابت کرتے ہوئے بادئ الرای پڑھا ہے یعنی پہلی رائے، یعنی وہ لوگ تیری پیروی کرتے ہیں جب وہ پہلی نظر سے تمہیں دیکھتے ہیں، اگر انہوں نے گہری نظر و فکر سے کام لیا ہوتا تو وہ تیری اتباع نہ کرتے، یہاں پھر ہمزہ کے ساتھ اور ہمزہ کے بغیر معنی میں کوئی فرق نہیں اور اس کی نصب فی کے حذف کی وجہ سے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ (الاعراف: 155) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ یعنی اس کی اتباع میں اور یہ ان کی طرف سے آپ کی نبوت کا انکار ہے۔ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ یہ حضرت نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ان کا خطاب ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

”آپ نے فرمایا: اے میری قوم! بھلا یہ بتاؤ اگر میرے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا فرمائی ہو مجھے خاص رحمت اپنی جناب سے پھر پوشیدہ کر دی گئی ہو تم پر (اس کی حقیقت) تو کیا ہم جبراً مسلط کریں تم پر یہ دعوت درآنحالیکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ اور اے میری قوم! میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی مال۔ نہیں میرا اجر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور میں (تمہیں خوش کرنے کے لیے) ان کو نکالنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں البتہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم ایسی قوم ہو جو (حقیقت سے) ناواقف ہے اور اے میری قوم! کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اگر میں نکال دوں اہل ایمان کو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں خود بخود جان لیتا ہوں غیب کو۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتی ہیں کہ ہرگز نہیں دے گا انہیں اللہ تعالیٰ کچھ بھلائی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے (اگر میں ایسا کر دوں تو) میں بھی ہو جاؤں گا ظالموں سے“۔

قولہ تعالیٰ: **قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ** یعنی یقین پر، یہ ابو عمران جونی کا قول ہے (1)۔ اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ معجزہ پر سورۂ انعام میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ **وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ** رحمت سے مراد نبوت و رسالت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ (نبوت و رسالت) مخلوق پر رحمت ہے۔

اور ایک قول کے مطابق رحمت سے مراد دلائل کے ساتھ اللہ کی طرف ہدایت دینا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ایمان اور اسلام ہے (2)۔ **فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ** یعنی رسالت اور ہدایت تم سے پوشیدہ ہو گئی ہو اور تم اسے نہ سمجھ سکے ہو۔ عمیت عن کذا اور عمی علی کذا کہا جاتا ہے یعنی میں اسے نہ سمجھ سکا۔ اور معنی رحمت کا پوشیدہ ہونا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ قلب ہے کیونکہ رحمت پوشیدہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے پوشیدہ یا اندھا ہوا جاتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے آپ کا قول ادخلت فی القلنسوۃ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 466-465　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 466

راسی یعنی میں نے ٹوپی میں اپنا سر داخل کیا اور موزا میرے پاؤں میں داخل ہوا۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے اسے فعمیت عین کے ضمہ اور میم کی شد کے ساتھ مجہول پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے اوپر پوشیدہ کر دیا۔ ابی کی قراءت بھی اسی طرح ہے۔ فعماھا اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا ایک قول کے مطابق اس دعوت سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ہا ضمیر رحمت کی طرف راجع ہے۔ اور ایک قول کے مطابق یہ بینتکی طرف راجع ہے، یعنی کیا ہم اس کو قبول کرنے پر تمہیں مجبور کریں اور اس کو تمہارے اوپر لازم کریں؟ یہ استفہام انکار ہے۔ یعنی مجھے اس بات پر قدرت نہیں دی گئی کہ میں تمہیں اس کی معرفت پر مجبور کروں۔ اس قول کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی تردید کرنے کا قصد فرمایا ہے۔ کسائی اور فراء نے اسے اَنُلْزِمْكُمُوْهَا پہلی میم کے سکون کے ساتھ حکایت کیا ہے اور سیبویہ نے ایسا جائز قرار دیا ہے۔ اس نے شعر پڑھا:

فالیوم اشرب غیر مستحقب　　اثما من الله ولا واغل

نحاس نے کہا: حضرت یونس علیہ السلام کے قول کے مطابق قرآن کے علاوہ انلزمکمھا بھی جائز ہے مضمر کو مظہر کی جگہ رکھتے ہوئے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں انلزمکم ذالك، وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ یعنی تمہارا اسے ناپسند کرتے ہوئے قبول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام استطاعت رکھتے ہوتے تو ضرور اسے اپنی قوم پر لازم کرتے، لیکن وہ اس کے مالک نہ تھے۔

دعوت اور اس پر ایمان لانے پر اجر یعنی 'مالا'' مال (کا تم سے سوال نہیں کرتا) کہ تم پر بوجھ کا سبب بنے۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ یعنی تبلیغ رسالت میں میرا ثواب اللہ کے ذمہ کرم میں ہے۔ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا انہوں نے آپ کو کہا کہ آپ ان گھٹیا لوگوں کو نکال دیں جو آپ پر ایمان لائے، جس طرح قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ غلاموں اور فقیروں کو نکال دیں۔ جس طرح سورۃ الانعام میں اس کا بیان گزر چکا، تو آپ نے ان کو اپنے اس قول کے ساتھ جواب دیا: وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کو عظیم قرار دیتے ہوئے یہ کہا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علی وجہ الاختصام (بطور جھگڑا) یہ کہا۔ یعنی اگر میں ایسا کروں تو وہ اللہ کے ہاں میرے ساتھ جھگڑیں گے پس وہ ان کو ان کے ایمان پر جزا دے گا اور وہ اسے بھی جزا دے گا جس نے ان کو نکال دیا۔

وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ۝ ان کو گھٹیا سمجھنے میں اور ان کے نکال دینے کا مطالبہ کرنے میں میں نے تمہیں جاہل قوم سمجھا (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ فراء نے کہا: یعنی جو اس کے عذاب کو مجھ سے روکے گا۔ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ یعنی ان کے ایمان کی وجہ سے اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تا کو ذال میں مدغم کیا گیا۔ اس کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ آپ نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی عاجزی اور

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 466　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 467

تواضع کی خبر دی اور جو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ان کے پاس نہیں اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اور یہ اللہ کا انعام ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اور یہ کہ وہ غیب نہیں جانتے کیونکہ غیب کو وہ نہیں جانتے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ یعنی میں نہیں کہتا کہ لوگوں کے ہاں میرا مقام فرشتوں جیسا ہے اور علماء نے کہا: کلام میں اس بات پر دلالت ہے کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں اطاعت میں ان کے دوام اور قیامت تک ان کی عبادت کے اتصال کی وجہ سے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ سورۃ البقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ یعنی جن کو تمہاری آنکھیں بوجھ سمجھتی ہیں اور حقیر جانتی ہیں اور اصل میں تزدریھم تھا اور میم کو اسم کی طوالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور دال تاء سے بدلی ہوئی ہے کیوں کہ تزدری میں اصل تززتری ہے، مگر ''زا'' کے بعد تا کو دال سے بدل دیا گیا، کیونکہ ''زا'' مجہورہ ہے اور تا مہموسہ پس تا کو اس کے ہم مخرج حرف مجہور کے ساتھ بدل دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: اَزْرَیتُ علیہ جب تو اس کو عیب لگائے اور زَریتُ علیہ (کہا جاتا ہے) جب تو اس کو حقیر خیال کرے۔ فراء نے شعر پڑھا:

یُباعِدُہُ الصدیقُ و تَزْدَرِیہِ حَلِیلتُہُ وَینْھَرُہُ الصَّغیرُ (1)

دوست اس کو دور کرتا ہے اور اس کی بیوی اسے حقیر سمجھتی ہے اور چھوٹا اس کو جھڑکتا ہے۔ (وجہ استشہاد تزدریہ ہے)

لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا یعنی تمہارا ان کو حقیر سمجھنا ان کے اجروں کو باطل نہیں کرتا یا ان کے ثواب کو کم نہیں کرتا، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ، پس وہ ان کو اس پر جزا دے گا اور اس وجہ سے ان کا مواخذہ فرمائے گا (2)۔ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ یعنی اگر میں وہ کہوں جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اِذًا، ملغیٰ عن العمل ہے، کیونکہ یہ درمیان کلام میں ہے۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾

''وہ (برافروختہ ہو کر) بولے: اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا (اس مباحثہ کو رہنے دو) اور لے آؤ ہمارے پاس جس (عذاب) کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس اگر چاہے گا اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے۔ اور نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی، اگرچہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہو کہ تمہیں گمراہ کر دے، وہ پروردگار ہے تمہارا۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے خود

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 468

2۔ ایضاً

گھڑلیا ہے اسے؟ آپ فرمایئے: اگر میں نے خود گھڑا اسے تو مجھ پر ہوگا وبال میرے جرم کا۔ اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا یعنی تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور جھگڑے کو طول دیا اور اس میں مبالغہ کیا۔ جدل کلام عرب میں جھگڑے میں مبالغہ کے لیے (استعمال ہوتا) ہے۔ الجدل سے مشتق ہے اور یہ رسی کو مضبوطی سے بنانا (بٹنا) ہے۔ شکرے کو بھی اجدل کہا جاتا ہے اڑنے میں اس کی سختی کی وجہ سے (1)۔ یہ معنی سورۃ الانعام میں اس سے زیادہ واضح طریقے سے گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا پڑھا ہے، نحاس نے اس کو ذکر کیا۔ دین میں جدال کرنا محمود ہے۔ اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں سے جدال کیا یہاں تک حق غالب ہو جائے پس جس نے اس کو قبول کیا وہ کامیاب اور کامران ہو گیا اور جس نے اس کو رد کیا وہ ناکام اور نامراد ہو گیا اور ناحق جدال کرنا تاکہ باطل کو غلبہ ہو مذموم ہے اور ایسا جدال کرنے والا دنیا و آخرت میں ملامت کیا جاتا ہے۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ یعنی عذاب سے (2)۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی اپنے قول میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ یعنی اگر اس نے تمہاری ہلاکت کا ارادہ کیا تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ اس معجزین کا معنی فائتین ہے۔ ایک قول یہ ہے تم اپنی کثرت کی وجہ سے غالب نہیں ہو، کیونکہ اس وجہ سے تکبر کرتے تھے، انہوں نے زمین کے میدانوں اور پہاڑوں کو بھر دیا تھا جس طرح کہ بعد میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ یعنی میری تبلیغ اور کوشش تمہارے ایمان میں۔ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ یعنی اس وجہ سے کہ تم اس کو بطور نصیحت قبول نہیں کرتے۔ سورۂ براءۃ میں نصح کا لغوی معنی گزر چکا ہے۔

اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ یعنی یہ کہ وہ تمہیں گمراہ کرے، اور یہ معتزلہ قدریہ اور ان کے موافق مذہب رکھنے والے کے مذہب کے بطلان پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ کوئی نافرمانی کرنے والا نافرمانی کرے، کفر کرنے والا کفر کرے اور کوئی گمراہ گمراہی کرے اور جو ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ نہیں فرماتا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے ان کی تردید فرما دی کہ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں اور اس کے علاوہ (دیگر سورتوں) میں گزر چکا ہے، اور ان کے شیخ لعین ابلیس نے اپنی گمراہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فبما اغویتنی کے ذریعے کر کے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے ارشاد: اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے تو ان کے لیے کوئی مفر ہی نہیں کہ آپ نے ان کی گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا، کیونکہ وہی ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا ہے جو کچھ منکر اور ظالم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بہت بڑا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں ہلاک کرے گا، کیونکہ گمراہی ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ طبری نے کہا: اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 166 2۔ ایضاً

ہلاک کرے گا اپنے عذاب کے ذریعے، طبّیؔ سے بیان کیا گیا: أصبح فلان غاویا یعنی فلاں مریض ہو گیا اور أغویته سے مراد ہے میں نے اس کو ہلاک کر دیا(1)، اور اسی سے ہے فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (مریم) هُوَ رَبُّكُمْ پس اسی کی طرف سے گمراہی ہے اور اسی کی طرف سے ہدایت وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ اس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لیتے ہیں، افتری باب افتعال ہے۔ یعنی اس نے قرآن اپنی طرف سے بنا لیا ہے(2)، اور جو اس کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے متعلق خبر دی ہے (وہ بھی اپنی طرف سے بنالی ہے) مقاتل نے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے لیے محاورہ ہے۔ اور یہی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ اس سے پہلے اور بعد صرف حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم ہی کا ذکر ہے، پس خطاب انہی کی طرف سے اور ان کے لیے ہے۔ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ یعنی اگر میں وحی اور رسالت کو (اپنی طرف سے) بنالوں۔

فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ تو میرے جرم کی سزا مجھ پر ہے اور اگر میں اپنی گفتگو میں سچا ہوں تو تم پر میری تکذیب کی سزا ہو گی۔ الاجرام، اجرم کا مصدر ہے اور اس سے مراد گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہے: میرے جرم اور میرے عمل کی جزا مجھ پر ہے اور جرم اور أجرم کا ایک ہی معنی ہے۔ نحاس اور اس کے علاوہ سے ہے انہوں نے کہا:

طَرِيدُ عَشِيرَةٍ وَرَهِينُ جُرْمٍ بِمَا جَرَمَتْ يَدِي وَ جَنَى لِسَانِي(3)

جس نے أجرامي ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ اس جانب گیا ہے کہ یہ جرم کی جمع ہے، نحاس نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ یعنی کفر اور تکذیب میں سے۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور وحی کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے اس لیے آپ غمگین نہ ہوں اس سے جو وہ کیا کرتے ہیں۔ اور بنایئے ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کیجئے مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا وہ ضرور غرق کر دیئے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ، اَنَّهٗ محل رفع میں ہے۔ اُوْحِيَ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محل نصب میں ہو۔ اَنَّهٗ اور اٰمَنَ، يُّؤْمِنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہوں اور کلام کا مطلب ان کے ایمان سے مایوسی اور ان کے کفر کا دوام چاہنا ہے اور مقصد ان پر وعید کے نزول کو ثابت کرنا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 40 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 46

3۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 167

ضحاک نے کہا: جب (اللہ) نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے ان پر بددعا(1) کی عرض کیا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (نوح) دو آیتیں (تلاوت کیں) اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ ایک قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے آدمی نے اپنے بیٹے کو اپنے کندھے پر اٹھایا۔ بچے نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے باپ سے کہا: مجھے پتھر دو اس نے اس کو پتھر دیا اور اس نے یہ پتھر حضرت نوح علیہ السلام کو مارا تو اس نے آپ کو زخمی کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ۔

فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ یعنی ان کی ہلاکت کی وجہ سے آپ غمگین نہ ہوں یہاں تک کہ آپ غمزدہ نہ ہو جائیں۔ بائسا یعنی غمگین ہونے والا اور البوس کا معنی ہے الحزن(2)۔ اسی سے شاعر کا قول ہے۔

وکم مِن خلیل أوحمیم رُزِئتہ فلم أبتئس والرُّزءُ فیہ جَلِیلُ(3)

ابتأس الرجل کہا جاتا ہے جب اس کو کوئی ناپسندیدہ خبر پہنچے اور الابتئاس، عاجزی میں غم کو (کہا جاتا) ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا یعنی کشتی بنا تا کہ آپ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے اس میں سوار ہوں۔ بِاَعْيُنِنَا یعنی ہماری طرف سے نگرانی کے ساتھ اور اس طرح کہ ہم تجھے دیکھیں۔ ربیع بن انس نے کہا: ہماری طرف سے تمہاری حفاظت کے ساتھ ایسے شخص کی حفاظت کی طرح جو تجھے دیکھ رہا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہماری حفاظت کے ساتھ، معنی ایک ہی ہے۔ پس رؤیت کو اعین کے ساتھ تعبیر کیا گیا کیونکہ رؤیت اسی کے ساتھ ہوتی ہے(4)۔ اعین کو جمع ذکر کرنا عظمت کے لیے ہے نہ کہ کثرت کے لیے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ (المرسلات) فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ (الذاریات) اور وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ (الذاریات) (ان تمام میں قادرون، ماہدون اور موسعون کو اظہار عظمت کے لیے جمع ذکر کیا گیا ہے)

اس آیت کریمہ میں اور اس کے علاوہ میں الاعین کا معنی عین کے معنی کی طرف راجع ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ (طٰہٰ) اور یہ سارے کا سارا عبارت ہے ادراک اور احاطہ کرنے سے اور وہ حواس، تشبیہ اور کیفیت سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ایک قول یہ ہے: بِاَعْيُنِنَا کا معنی ہے یعنی ہمارے ان فرشتوں کی نگرانی میں جن کو ہم نے تمہاری حفاظت اور معاونت (5) پر آنکھوں (کی مثل) بنادیا ہے۔ اس کثرت کی بنیاد پر جمع اپنے باب پر ہوگی۔ ایک قول یہ ہے بِاَعْيُنِنَا یعنی ہمارے علم کے ساتھ، یہ مقاتل نے کہا ہے۔ ضحاک اور سفیان نے کہا: بِاَعْيُنِنَا یعنی ہمارے حکم کے ساتھ۔ ایک قول ہے ہماری وحی کے ساتھ، ایک قول ہے اس کے بنانے پر ہماری مدد کے ساتھ تمہارے لیے(6)۔ وَوَحْيِنَا یعنی اس کے بنانے کے لیے جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اس کے مطابق وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ یعنی ان کے لیے مہلت نہ مانگو، میں ان کو غرق کرنے والا ہوں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 469 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470-469 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

وَ يَصۡنَعُ الۡفُلۡكَ ۗ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيۡهِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ سَخِرُوۡا مِنۡهُ ؕ قَالَ اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡكُمۡ كَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ؕ﴿۳۸﴾ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَ يَحِلُّ عَلَيۡهِ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ وَ اَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلٌ ﴿۴۰﴾

''اور نوح کشتی بنانے لگے اور جب بھی گزرتے ان کے پاس سے ان کی قوم کے سردار (تو) آپ کا مذاق اڑاتے۔ آپ کہتے: اگر تم مذاق اڑاتے ہو ہمارا تو (ایک روز) ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو۔ سو تم جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو رسوا کر دے گا اسے اور (کون ہے) اترتا ہے جس پر عذاب ہمیشہ رہنے والا۔ یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم اور ابل پڑا تنور تو ہم نے (نوح کو) فرمایا: سوار کر لو کشتی میں ہر جنس سے نر و مادہ دو دو اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور (سوار کر لو) جو ایمان لا چکے ہیں اور نہیں ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ مگر تھوڑے لوگ''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ يَصۡنَعُ الۡفُلۡكَ یعنی آپ بنانے لگے۔ زید بن اسلم نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام سو سال درخت لگاتے رہے، ان کو کاٹتے رہے اور خشک کرتے رہے (1)، اور سو سال ان میں کام کرتے رہے (کشتی بناتے رہے) ابن قاسم نے ابن اشرس عن مالک روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: مجھ تک خبر پہنچی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے زمین کو بھر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے میدانوں اور پہاڑوں کو بھر دیا، پس وہ (پہاڑ والے) ان (میدان والوں) کی طرف نہیں اتر سکتے تھے اور نہ یہ (میدان والے) ان (پہاڑ والوں) کی طرف چڑھ سکتے تھے، پس حضرت نوح علیہ السلام سو سال کشتی بنانے کے لیے درخت لگاتے رہے، پھر ان کو جمع کیا سو سال تک خشک کرتے رہے اور آپ کی قوم مذاق اڑاتی رہی، اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے آپ کو یہ (کشتی) بناتے ہوئے دیکھا حتیٰ کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے تھا جو کچھ تھا، عمرو بن حارث سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے دمشق کے علاقے میں کشتی بنائی اور اس کی لکڑی لبنان کے پہاڑ سے کاٹی۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو نکالا جو مومنین کے اصلاب اور ارحام میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اَنَّهٗ لَنۡ يُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ، فاصنع الفلك آپ نے عرض کیا: اے رب! میں بڑھئی نہیں ہوں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: ہاں بے شک یہ میری نگرانی میں ہوگا آپ نے کلہاڑا اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ کا ہاتھ صحیح صحیح کام کرنے لگا۔ پس انہوں نے آپ کے پاس سے گزرنا شروع کر دیا اور کہتے: یہ ہے وہ جو گمان کرتا ہے کہ یہ نبی ہے،

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470

(اب) بڑھئی بن گیا ہے۔ پس آپ نے اس (کشتی) کا کام چالیس سال میں کیا۔

ثعلبی اور ابونصر قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے دو سال میں کشتی بنائی۔ ثعلبی نے (اس میں یہ) اضافہ کیا، اور یہ اس وجہ سے کہ آپ کو پتہ نہ تھا کہ کشتی کیسے بنتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ اس کو پرندے کے سینے کی طرح بناؤ، حضرت کعب نے کہا: آپ نے اس کو تیس سال میں بنایا۔ واللہ اعلم

مہدوی نے کہا: حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ ملائکہ آپ کو سکھاتے تھے کہ آپ اس کو کس طرح بنائیں۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی کے بارے میں (علماء نے) اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ذراع، چوڑائی پچاس ذراع اور بلندی تیس ذراع تھی (1) اور یہ ساکھو کی لکڑی سے (بنائی گئی) تھی۔ اور اسی طرح کلبی، قتادہ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ذراع تھی اور ذراع کندھے تک ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کشتی کی لمبائی ایک ہزار دو سو ذراع اور چوڑائی سات سو ذراع ہے۔ ثعلبی نے اس کو کتاب ''العرائس'' میں بیان کیا ہے۔ علی بن زید نے یوسف بن مہران سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (ان کے) حواریوں نے کہا: اگر آپ ہمارے لیے کسی ایسے آدمی کو اٹھائیں جس نے کشتی کو دیکھا ہو تو وہ ہمارے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کرے۔ آپ ان کے ساتھ چل پڑے یہاں تک کہ آپ مٹی کے ایک ڈھیر کے پاس رکے۔ اس مٹی میں سے مٹھی بھر لی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ حام بن نوح کی کہنی ہے۔ انہوں نے کہا: آپ نے اپنا عصا اس ریت کے ٹیلے کو مارا اور فرمایا: اللہ کے اذن سے اٹھ، پس وہ اپنے سر سے مٹی جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور وہ بوڑھا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا: کیا تو اسی طرح ہلاک ہوا تھا؟ اس نے کہا: نہیں بلکہ میں مرا تو جوانی کی حالت میں تھا لیکن میں نے سمجھا کہ یہ قیامت ہے پس اس وجہ سے بوڑھا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ہمیں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے بارے میں خبر دے۔ اس نے کہا: اس کی لمبائی ایک ہزار دو سو ذراع اور چوڑائی سات سو ذراع تھی اور اس کی تین منزلیں تھیں، ایک منزل میں چوپائے اور وحشی جانور، ایک منزل میں انسان اور ایک منزل میں پرندے تھے (2)۔ انہوں نے باقی حدیث کو ذکر کیا جس طرح کہ اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کلبی نے کہا جو اس کو نقاش نے بیان کیا: اس میں چار ذراع پانی داخل ہوا، اس کے تین دروازے تھے، ایک دروازے میں درندے اور پرندے، ایک دروازے میں وحشی جانور اور چوپائے اور ایک دروازے میں مرد اور عورتیں تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تین منزلیں بنائی ہیں۔ نیچے والی منزل وحشی جانوروں، درندوں اور چوپاؤں کے لیے، درمیانی کھانے پینے کے لیے اور اوپر والی منزل میں آپ خود سوار ہوئے۔ اور اپنے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کو مردوں اور عورتوں کے درمیان چوڑائی کی صورت میں اٹھایا، پھر بعد میں بیت المقدس میں ان کو دفن کر دیا اور شیطان ان کے ساتھ کشتی کے پچھلے حصے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 44

میں تھا۔ کہا گیا: سانپ اور بچھو کشتی میں داخل ہونے کے لیے آئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں تم دونوں کو سوار نہیں کروں گا، کیونکہ تم دونوں نقصان اور مصیبت کا سبب ہو، تو انہوں نے کہا: ہمیں سوار کر لیجئے، ہم آپ کو ضمانت دیتے ہیں کہ ہم کسی بھی ایسے شخص کو نقصان نہیں دیں گے جو آپ کو یاد کرے گا۔ پس جس نے بھی ان سے نقصان کے خوف کے وقت سلام علی نوح فی العالمین پڑھا تو انہوں نے اسے کوئی نقصان نہ دیا۔ قشیری اور ان کے علاوہ نے اس کو ذکر کیا۔ حافظ ابن عساکر (1) نے اپنی تاریخ میں حضرت ابی امامہ کی حدیث سے مرفوعاً ذکر کیا انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے شام کے وقت صَلَّى اللهُ عَلَى نُوحٍ وَعَلَى نُوحٍ السَّلَامُ کہا تو اس رات بچھو اس کو نہیں ڈسے گا“۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد كُلَّمَا ظرف ہے۔ مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ اخفش اور کسائی نے کہا کہ سخرت به و منه کہا جاتا ہے (یعنی سخر کا صلہ ب اور من دونوں ہو سکتے ہیں) اور ان (کفار) کے مذاق کے بارے میں دو قول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آپ کو خشکی میں کشتی بناتے ہوئے دیکھتے تھے تو آپ کا تمسخر اڑاتے اور استہزا کرتے تھے اور کہتے: اے نوح! تو نبوت کے بعد بڑھئی بن گیا۔ دوسرا۔ جب انہوں نے آپ کو کشتی بناتے ہوئے دیکھا جب کہ اس سے قبل انہوں نے کشتی بنتی نہیں دیکھی تھی تو انہوں نے کہا: اے نوح! تو کیا بنا رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا، تو وہ آپ کی بات سے حیران ہوئے اور آپ کا تمسخر اڑایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: طوفان (نوح) سے پہلے زمین پر کوئی نہر اور دریا نہیں تھا پس اس وجہ سے انہوں نے مذاق کیا، اور دریاؤں کا پانی یہ طوفان کا ہی باقی ماندہ ہے۔ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا یعنی جس نے کشتی بناتے وقت آج ہمارے ساتھ (مذاق) کیا۔ فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ کل غرق کے وقت (ہم تم سے مذاق کریں گے) اور یہاں مذاق سے مراد حقیر سمجھنا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم ہمیں حقیر سمجھو گے تو ہم تمہیں حقیر سمجھیں گے جس طرح تم ہمیں حقیر سمجھتے ہو (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ (یہ) دھمکی (ہے) اور مَنْ، سوف تعلمون کی وجہ سے متصل ہے۔ تَعْلَمُوْنَ یہاں متعدی ہے۔ یعنی فسوف تعلمون الذی یاتیہ العذاب، تم جان لو گے اس عذاب کو جو آئے گا، یہ بھی جائز ہے کہ من استفہامیہ ہو، یعنی ہم میں سے کس پر وہ عذاب آتا ہے؟ ایک قول یہ ہے: من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور یاتیہ خبر ہے اور یخزیہ عذاب کی صفت ہے۔ کسائی نے بیان کیا کہ اہل حجاز میں سے کچھ لوگ سوف تعلمون کہتے ہیں اور انہوں (کسائی) نے کہا کہ جس نے ستعلمون کہا ہے اس نے واؤ اور فا دونوں کو ساقط کر دیا ہے۔ کوفیوں نے سَفَ تعلمون بیان کیا ہے، اور بصری سوائے سوف تفعل اور ستفعل کے (کوئی اور صورت) نہیں جانتے یہ دو لغتیں ہیں ان میں سے ایک دوسری میں سے نہیں۔ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ یعنی (کون ہے) جس پر ثابت ہوتا ہے اور اترتا ہے عَذَابٌ مُّقِيْمٌ یعنی ہمیشہ رہنے والا مراد آخرت کا عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ علماء (کا) تنور کے بارے میں اختلاف ہے (اس کے بارے میں) سات اقوال ہیں۔

1۔ تاریخ مدینہ دمشق لابن العساکر، جلد 62، صفحہ 256

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 471

پہلا: کہ یہ زمین کی اوپر والی سطح ہے (1)، عرب زمین کی اوپر والی سطح کو تنور کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، زہری اور ابن عیینہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ آپ (حضرت نوح علیہ السلام) کو کہا گیا: جب آپ زمین کی سطح پر پانی دیکھیں تو آپ اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ سوار ہو جائیں۔

دوسرا: یہ وہ روٹی والا تنور ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے یہ تنور پتھر سے (بنا) ہوتا تھا اور یہ حضرت حواء کا تھا یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہو گیا آپ کو کہا گیا: جب آپ پانی کو تنور سے ابلتا ہوا دیکھیں تو آپ اور آپ کے اصحاب (دوست) سوار ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ نے تنور سے پانی کو جاری فرمایا، پس آپ کی بیوی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے کہا: اے نوح علیہ السلام! پانی تنور سے ابل پڑا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: میرے رب کا وعدہ آ گیا جو کہ سچا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے، مجاہد اور عطیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول بیان کیا ہے۔

تیسرا: یہ کشتی میں پانی جمع ہونے کی جگہ تھی، حسن رضی اللہ عنہ سے بھی (یہی منقول ہے)۔

چوتھا: یہ فجر کا طلوع ہونا اور صبح کی روشنی ہے، ان (عربوں) کے اس قول سے نور الفجر تنویرا یعنی فجر روشن ہو گئی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا ہے۔

پانچواں: یہ کوفہ کی مسجد ہے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے یہ مجاہد کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تنور کی سمت کوفہ میں تھی، انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے کوفہ کی مسجد کے درمیان میں کشتی بنائی اور تنور باب کندہ سے متصل اندر دائیں جانب تھا اور اس سے پانی کا نکلنا حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ان کی قوم کی ہلاکت کی نشانی اور دلیل تھی۔ شاعر نے کہا جو کہ امیہ ہے:

فار تنورُهم جاش بماءٍ صار فوق الجبالِ حتّٰی علاها(2)

ان کا تنور ابل پڑا اور پانی کے ذریعے جوش میں آ گیا۔ تو آپ (حضرت نوح علیہ السلام) پہاڑوں کے اوپر ہو گئے یہاں تک کہ آپ ان پر چڑھ گئے۔

چھٹا: یہ زمین کی بلندی ہے اور زمین میں سے بلند مقامات (کو تنور کہا جاتا ہے) یہ قتادہ کا قول ہے۔

ساتواں: یہ وہ چشمہ ہے جو "عین الوردۃ" کے جزیرہ میں ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ حضرت آدم علیہ السلام کا (تنور) چشمہ تھا اور یہ شام کے ایک مقام پر تھا جس کو "عین الوردۃ" کہا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام کا تنور ہند میں ابل پڑا (3)۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں کوئی تناقض نہیں، کیونکہ اللہ نے ہمیں خبر دی ہے کہ پانی آسمان اور زمین (دونوں) سے آیا (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ (القمر) پس ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے موسلا دھار بارش سے۔ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا (القمر:12) اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیئے۔ پس یہ سارے اقوال اس بات کو جامع ہیں کہ یہ (تنور کا ابلنا عذاب کی) علامت تھا۔ فوران سے مراد ابلنا، جوش کھانا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 171 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 472 3۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 343

ہے، تنور عجمی نام ہے جس کو عربوں نے عربی بنالیا ہے اور یہ فعل کے وزن پر ہے، کیونکہ اس کی بنا کی اصل تنر ہے اور کلام عرب میں را سے پہلے نون نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے فار التنور کا معنی عذاب کے آجانے کے لیے بطور تمثیل ہے جس طرح عربوں کا قول حمی الوطیس (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب جنگ سخت ہو جائے۔ الوطیس سے مراد التنور ہے، کہا جاتا ہے: فارت قدر القوم (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب ان کی جنگ سخت ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

تركتم قِدْرَكم لاشئ فيها وقِدْرُ القوم حامِيَةٌ تَفُورُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یعنی مذکر اور مونث، (مرد اور عورت) طوفان کے بعد نسل کی اصل کو باقی رکھنے کے لیے۔ حفص نے من کلٍّ زوجین اثنین پڑھا ہے۔ کل کی تنوین کے ساتھ یعنی ہر چیز میں سے جوڑا جوڑا۔ دونوں قراء تیں ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتی ہیں (یعنی) ایک چیز جس کے ساتھ دوسری ایسی چیز ہو جس سے وہ مستغنی نہ ہو ایسی دو چیزوں کے بارے میں "هما زوجان" کہا جاتا ہے۔ جس میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی سے مستغنی نہ ہو پس ان دونوں میں سے ہر ایک کو زوج کہتے ہیں، کہا جاتا ہے له زوجا نعل جب اس کے پاس دو جوتے ہوں، اور اسی طرح (کہا جاتا ہے) "عنده زوجا حمام" اس کے پاس دو حمام ہیں اور علیه زوجا قیود اس پر دو قیود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ۝ (النجم) اس نے جوڑا یعنی مذکر اور مونث کو پیدا فرمایا۔

عورت کو کہا جاتا ہے: یہ مرد کا زوج ہے جب کہ مرد کو کہا جاتا ہے: یہ اس (عورت) کا زوج ہے۔ اور بعض اوقات دو کے بارے میں کہا جاتا ہے: هما زوج یعنی وہ دونوں زوج ہیں اور بعض اوقات زوجین بمعنی ضربین اور صنفین ہوتا ہے اور ہر قسم کو زوج کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ۝ (الحج) یعنی ہر رنگ اور صنف میں سے۔ اعشیٰ نے کہا:

وكل زوج من الدِّيباجِ يَلْبَسه أبو قُدامة محبوٌ بذاك مَعاً

اس نے ہر قسم اور رنگ مراد لیا، مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ، احْمِلْ کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اثْنَيْنِ (اس کی) تاکید ہے۔ وَ اَهْلَكَ یعنی اور آپ اپنے گھر والوں کو سوار کریں۔ اِلَّا مَنْ سَبَقَ، مَنْ استثنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ عَلَیْهِ الْقَوْلُ ان میں سے یعنی ہلاکت کا، اور وہ آپ کا بیٹا کنعان اور آپ کی بیوی واعلۃ ہے جو دونوں کافر تھے۔ وَ مَنْ اٰمَنَ۔ ضحاک اور ابن جریج نے کہا: یعنی تو سوار کر اس کو جو مجھ پر ایمان لایا یعنی جس نے آپ کی تصدیق کی۔ پس منا، احمل کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی قوم کے اسی انسان ایمان لائے (1)۔ ان میں سے تین آپ کے بیٹے سام، حام اور یافث تھے اور تین ان کی بیویاں تھیں، جب وہ کشتی سے نکلے تو انہوں نے ایک گاؤں بنایا، وہ آج بھی موصل کے نواح میں "قریۃ الثمانین" اسی اشخاص کا گاؤں کہلاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کشتی میں آٹھ آدمی تھے، حضرت نوح علیہ السلام آپ کی بیوی۔ سزا یافتہ بیوی کے علاوہ، آپ کے تین بیٹے اور ان کی بیویاں۔ یہ قتادہ، حکم بن عتیبہ، ابن جریج

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 472

اور محمد بن کعب کا قول ہے: حام نے کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کر لیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کے نطفے کو تبدیل کر دے تو اس نے سیاہ رنگ والے کو جنم دیا(1)۔

عطا نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے حام کے خلاف دعا کی کہ اس کی اولاد کے بال ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھیں اور یہ کہ وہ جہاں ہوں اس کی اولاد سام اور یافث کی اولاد کی غلام ہو کر رہے۔ اعمش نے کہا: وہ سات تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، تین ان کے بیٹوں کی بیویاں اور تین بیٹے، انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کو ساقط کر دیا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: ان کی عورتوں کے علاوہ وہ دس تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، آپ کے بیٹے سام، حام اور یافث چھ آدمی ان لوگوں میں سے جو آپ پر ایمان لائے تھے اور ان سب کی بیویاں اور قَلِيْلٌ، اٰمَنَ (کا فاعل ہونے) کی وجہ سے مرفوع ہے۔ استثناء کی وجہ سے اس کو نصب دینا جائز نہیں کیونکہ اس سے پہلے کلام مکمل نہیں ہوتا مگر یہ کہ "الا" اور "ما" کے دخول میں فائدہ ہے کیونکہ آپ کہیں آپ کے ساتھ فلاں فلاں ایمان لایا تو ممکن ہے ان کے علاوہ بھی ایمان لائے ہوں اور جب آپ "الا" اور "ما" لگاتے ہیں تو جو "الا" کے بعد ہیں وہ ثابت ہو جائیں گے اور ان کے علاوہ کی نفی ہو جائے گی۔

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ا۟بْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"اور نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں، اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے۔ بے شک میرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔ اور وہ چلنے لگی انہیں لے کر ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں اور پکارا نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو اور وہ (ان سے) الگ تھا۔ بیٹا سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ اور نہ ملو کافروں کے ساتھ۔ بیٹے نے کہا: (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں پناہ لے لوں گا کسی پہاڑ کی جو بچا لے گا مجھے پانی سے۔ آپ نے کہا: (بیٹا!) آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مگر جس پر وہ رحم کرے اور (اسی اثنا میں) حائل ہو گئی ان کے درمیان موج پس ہو گیا وہ ڈوبنے والوں سے اور حکم دیا گیا: اے زمین! نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان! تھم جا۔ اور اتر گیا پانی اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا اور ٹھہر گئی کشتی جودی (پہاڑ) پر اور کہا گیا: ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لیے"۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 473

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَالَ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا سوار ہونے کا حکم ہے۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم کو ہو۔ رکوب کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کی پشت پر بلند ہونا۔ کہا جاتا ہے: ر کبہ الدین دین اس پر سوار ہوا۔ اور کلام میں حذف ہے یعنی ار کبوا الماء فی السفینۃ کشتی میں پانی پر سوار ہو جاؤ۔ ایک قول یہ ہے (اس کا) معنی ''ار کبوھا'' ہے یعنی اس پر سوار ہو جا۔ اور فی تاکید کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنۡ كُنۡتُمۡ لِلرُّءۡيَا تَعۡبُرُوۡنَ ۞ (یوسف) (لِلرُّءۡيَا میں لام تبیین کے لیے ہے) اور فی کا فائدہ یہ ہے کہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ کشتی کے پیٹ میں (اندر) ہو جائیں نہ کہ اس کی پشت پر۔ عکرمہ نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی دس محرم کو جودی (پہاڑ) پر رکی۔ تو یہ چھ ماہ ہیں، یہ قول قتادہ نے کیا اور اس نے (اس بات کا) اضافہ کیا اور وہ یوم عاشورہ ہے۔ پس آپ (نوح) نے اپنے ساتھیوں کو کہا: جو روزہ دار ہے وہ اپنا روزہ پورا کرے اور جو روزہ دار نہیں وہ روزہ رکھے (1)۔ طبری نے اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام رجب کی یکم کو کشتی میں سوار ہوئے اور پورا مہینہ روزہ رکھا کشتی یوم عاشورہ تک ان کو لے کر چلی اور اس (یوم عاشورہ) (2) میں جودی (پہاڑ) پر رکی، تو حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے اس دن کا روزہ رکھا۔

طبری نے ابن اسحاق سے جو ذکر کیا ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپ پانی پر ایک سال تک مقیم رہے، کشتی بیت اللہ کے پاس سے گزری تو اس نے اس کے سات چکر لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس (بیت اللہ) کو غرق نہ ہونے دیا۔ پھر کشتی یمن کی طرف گئی اور جودی (پہاڑ) کی طرف واپس ہوئی پس اس پر ٹھہر گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖٮٰهَا وَ مُرۡسٰٮهَا اہل حرمین اور اہل بصرہ نے ان دونوں کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا سوائے اس آدمی کے جو جدا ہو گیا، اس معنی پر کہ اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا ہے۔ پس مَجۡرٖٮٰهَا اور مُرۡسٰٮهَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو (اس صورت میں) تقدیر عبارت ہوگی: اللہ کے نام سے اس کے چلنے کا وقت ہے۔ پھر وقت کو حذف کر دیا گیا اور مَجۡرٖٮٰهَا کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے ''بسم اللہ مجریھا'' میم کے فتحہ کے ساتھ اور مرساھا میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یحییٰ بن عیسیٰ نے اعمش عن یحییٰ بن وثاب بسم اللہ مجراھا و مرساھا دونوں میں میم کے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس بنیاد پر کہ یہ مصدر ہے جرت تجری جریا و مجری اور رست رسؤا و مَرۡسیٰ سے جب وہ لنگر انداز ہو جائے۔ مجاہد، سلمان بن جندب، عاصم جحدری اور ابو رجاء نے ''بسم اللہ مجریھا و مرسیھا'' پڑھا ہے اللہ عزوجل کی صفت کے طور پر محل جر میں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا مضمر ہونے کی بنیاد پر یعنی ھو مجریھا و مرسیھا حال ہونے کی وجہ سے بھی نصب جائز ہے۔ ضحاک نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام جب بسم اللہ مجراھا کہتے تو وہ چل پڑتی اور جب بسم اللہ مرساھا کہتے تو وہ رک جاتی۔ مروان بن سالم نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے انہوں نے حضرت حسین بن علی سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 473
2۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 58-57

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کے لیے غرق سے امان ہے جب وہ کشتی پر سوار ہوں (اور یہ پڑھیں) اللہ کے نام سے جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے (1)۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ (الزمر) بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (ہود) اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے پاک ہے وہ ہر عیب سے اور برتر ہے لوگوں کے شرک سے۔

اس آیت میں ہر کام کی ابتداء کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ کے ذکر پر دلیل ہے، جیسا کہ ہم (قرطبی) نے اس کو بِسْمِ اللّٰهِ میں بیان کر دیا۔ والحمدللہ۔

اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی کشتی والوں کو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب گوبر اور گندگی زیادہ ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ ہاتھی کی دم کو ہاتھ سے ٹٹولو۔ تو اس سے خنزیر اور خنزیرہ گرے تو وہ دونوں گوبر کی طرف آئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اگر میں اس خنزیر کی دم ٹٹولوں: پس آپ نے ایسا کیا تو اس سے چوہا اور چوہیا نکلے جب وہ دونوں گرے تو کشتی اور اس کی رسی کی طرف آئے۔ اس (چوہیا) نے اس کو کاٹا اور اس نے سامان اور زادراہ کو کاٹا یہاں تک کہ ان (کشتی والوں) کو کشتی کی رسیوں کے بارے میں خطرہ لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ شیر کی پیشانی پر ہاتھ پھیرو تو آپ نے اس کو ہاتھ پھیرا، تو اس سے دو بلیاں نکلیں انہوں نے چوہیا کو کھالیا۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے شیر کو کشتی میں سوار کیا تو عرض کیا: اے رب! میں اس کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں عنقریب اس کو مشغول کردوں گا۔ تو اس کو بخار نے آلیا تو وہ سارا زمانہ (ہمیشہ) بخار زدہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بہائم میں سے سب سے پہلے جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے سوار کیا وہ بطخ ہے جب کہ جس کو سب سے آخر میں سوار کیا وہ گدھا ہے۔ انہوں نے کہا: شیطان اس (گدھے) کی دم سے لٹک گیا۔ اور اس (گدھے) کی اگلی ٹانگیں کشتی میں داخل ہو چکی تھیں جب کہ پچھلی ٹانگیں باہر تھیں، تو گدھا اچھلنے لگا اور داخل نہ ہوسکا، حضرت نوح علیہ السلام نے بلند آواز سے کہا: داخل ہو، تیرے لیے ہلاکت ہو، تو وہ اچھلنے لگا، آپ نے فرمایا: داخل ہو تیرے لیے ہلاکت ہو، اگرچہ تیرے ساتھ شیطان ہی کیوں نہ ہو، یہ کلمہ غلطی سے آپ کی زبان پر جاری ہوگیا۔ (گدھا) داخل ہوا اور شیطان جھپٹا اور داخل ہوگیا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی میں گانے گاتے ہوئے دیکھا تو اس کو کہا: اے لعنتی! تجھے میرے گھر میں کس نے داخل کر دیا؟ اس نے کہا: آپ نے مجھے اجازت دی اس نے (واقعہ) آپ کے سامنے ذکر کیا، آپ نے اس کو فرمایا: اٹھ نکل جا۔ اس نے کہا: آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ اٹھائیں۔ پس ان کے گمان کے مطابق وہ کشتی کی پشت پر تھا۔

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 220

حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پتھر کے دو چمک دار نگینے تھے۔ ایک سورج کی جگہ اور دوسرا چاند کی جگہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے ایک دن کی سفیدی کی طرح سفید تھا اور دوسرا رات کی سیاہی کی طرح سیاہ تھا۔ آپ ان کے ذریعے نماز کے اوقات کو پہچانتے تھے۔ جب شام ہوتی اس کی سیاہی دوسرے کی سفیدی پر غالب آجاتی اور جب وہ صبح کرتے تو اس کی سفیدی دوسرے کی سیاہی پر غالب آجاتی اوقات کے حساب سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ، مَوْجٍ، موجة کی جمع، اس سے مراد وہ (لہریں ہیں) جو ہوا کی شدت کے وقت زیادہ پانی سے اٹھتی ہیں۔ کاف تشبیہ کے لیے ہے۔ یہ موج کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ تفسیر میں آیا ہے کہ پانی ہر چیز سے پندرہ ذراع تجاوز کر گیا۔ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ ایک قول ہے: وہ کافر تھا اور اس کا نام کنعان تھا، ایک قول ہے: یام۔ سیبویہ کے قول کے مطابق وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ لفظوں میں ابنه سے واؤ کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے اور اس نے شعر پڑھا:

لَهُ زَجَلٌ كَاَنَّهُ صَوتُ حَادٍ

اور جہاں تک وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ کا تعلق ہے تو یہ قراءت شاذہ ہے یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ ابو حاتم نے گمان کیا کہ یہ جائز ہے اس بنیاد پر کہ اس سے ان کی مراد ابنها ہے۔ الف کو حذف کر دیا گیا جس طرح آپ ابنه کہتے ہیں۔ پس آپ واؤ کو حذف کر دیتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اور یہ جو ابو حاتم نے کہا ہے یہ سیبویہ کے مذہب کے مطابق درست نہیں کیونکہ الف خفیف ہے اس کو حذف کرنا جائز نہیں جب کہ واؤ ثقیل ہے اس کا حذف کرنا جائز ہے۔ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ یعنی اپنے باپ کے دین سے۔ ایک قول ہے: کشتی سے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پتہ نہ تھا کہ ان کا بیٹا کافر ہے جب کہ ان کا گمان تھا کہ وہ مومن ہے، اسی وجہ سے آپ نے اسے فرمایا: وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ اس کا بیان آئے گا۔ یہ ندا قوم کو غرق ہونے کے یقین اور ناامیدی کی صورت سے پہلے تھی، بلکہ یہ تنور کے پھوٹنے اور حضرت نوح علیہ السلام کے لیے علامت کے ظاہر ہونے کے آغاز میں تھی۔ عاصم نے يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اس کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یابنی کی اصل یہ ہے کہ یہ تین یا کے ساتھ ہو۔ یا تصغیر، یا فعل اور یا اضافت۔ یا تصغیر کو فعل کے لام کلمہ میں مدغم کر دیا گیا، یا اضافت کی وجہ سے فعل کے لام کلمہ کو کسرہ دیا گیا اور یا اضافت کو تنوین کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا، یا اس کے اور را کے ساکن ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ یہ یا کی کسرہ کے قراءت کی اصل ہے اور یہی (اس جگہ پر) فتح کی قراءت کی اصل بھی ہے، کیونکہ یا اضافت کو الف کے خفیف ہونے کی وجہ سے الف کے ساتھ بدل دیا گیا پھر الف کے حذف ہونے والے حرف کے عوض میں آنے کے سبب یا الف اور را کے ساکن ہونے کے سبب حذف کر دیا گیا۔ نحاس نے کہا: جہاں تک عاصم کی قراءت کا تعلق ہے تو یہ مشکل ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس سے مراد یا بنیاہ ہے پھر الف اور ہا کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ ان کا نقطہ نظر اس کے عدم جواز کا تھا، کیونکہ الف خفیف ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: مجھے معلوم نہیں کہ نحویوں میں سے سوائے ابو اسحاق کے کسی نے اس کلام کو جائز

قرار دیا ہو۔ پس اس نے یہ گمان کیا ہے کہ فتحہ دو جہتوں سے ہے اور کسرہ بھی دو جہتوں سے ہے۔ پس فتحہ اس صورت میں (ہوگا) کہ وہ یا کو الف سے بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا: یاویلتا جس طرح کہ شاعر نے کہا:

فیاعجبًا من رَحلِها المتحمَّلِ

پس وہ یا بنتیا مراد لیتے ہی پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا، جس طرح آپ کہتے ہیں: جاء عبداللہ تثنیہ کے بارے میں۔

اور دوسری جہت یہ ہے کہ الف کو حذف کر دیا جائے کیونکہ نداء مقام حذف ہوتا ہے۔ اور کسرہ اس بنیاد پر ہوگا کہ ندا کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا جائے اور دوسری جہت یہ ہے کہ اس کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ سَاٰوِیْۤ یعنی میں لوٹ جاؤں گا اور مل جاؤں گا۔ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ یعنی وہ مجھے بچالے گا۔ مِنَ الْمَآءِ پس میں غرق نہیں ہوں گا۔ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی کوئی بچانے والا نہیں، پس یہ دن ■■ ہے جس میں کفار پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔ عاصم منصوب ہوگا۔

یہ بھی جائز ہے کہ ''لا عاصم الیوم میں لا بمعنی لیس'' ہو۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ یہ محل نصب میں ہے پہلے سے استثنا ہے، یعنی لیکن اللہ تعالیٰ جس پر رحم فرمائے پس وہ اس کو بچالے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اس بنیاد پر کہ عاصم بمعنی معصوم ہو، جس طرح ماء دافق میں دافق بمعنی مدفوق ہے۔ اس صورت میں استثنا متصل ہوگی، شاعر نے کہا:

بطئُ القیامِ رخیمُ الکلامِ　　أَمسٰی فؤادِی بہ فَاتِنَا

اس میں فاتن بمعنی مفتون ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

دَعِ المکارِمَ لا تَنْهَضْ لبغیتها　　واقعدْ فإنّك أنتَ الطاعمُ الکاسی

یعنی ''المطعوم المکسو''۔ نحاس نے کہا: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ من محل رفع میں ہے، معنی ہوگا۔ آج اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے رحم فرمانے والے کے یعنی سوائے اللہ کے، یہ طبری کا اختیار کردہ (موقف) ہے (1)۔ اور یہ عمدہ ہے اس اعتبار سے کہ آپ کو نہ تو عاصم بمعنی معصوم کرنا پڑے گا (2) کہ آپ اس کو اس کے باب سے ہی خارج کر دیں اور نہ ہی الا بمعنی لکن کرنا پڑے گا۔

وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان (3)۔ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ کہا گیا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار تھا تو اس نے اپنی شخصیت پر غرور کیا اور اس کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو گیا، جب اس نے دیکھا کہ پانی آگیا ہے تو اس نے کہا: اے میرے باپ! تنور ابل پڑا، تو اس کے باپ نے اسے کہا: اے بیٹے! سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ، ■■ واپس نہ لوٹا تھا کہ ایک بڑی موج آئی تو اس نے اس کو اور اس کے گھوڑے کو نگل لیا اور وہ اس کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان حائل ہو گئی پس وہ غرق ہو گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس نے اپنے لیے شیشے کا ایک ایسا گھر بنایا تھا جس میں پانی (کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 55　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 175　　3۔ ایضاً

عذاب) سے اس نے پناہ لینی تھی۔ پس جب تنور ابلا تو وہ اس میں داخل ہو گیا اور اندر سے اس کو تالا لگا دیا اس میں غوطے کھاتا رہا اور پیشاب کرتا رہا یہاں تک کہ اسی کے سبب غرق ہو گیا۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ پہاڑ جس کی اس نے پناہ لی تھی وہ طور سینا ء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ یہ مجاز ہے کیونکہ وہ (زمین، آسمان) موات (جن میں زندگی نہ ہو) ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ان میں وہ قوت رکھ دی گئی ہے جس کے ذریعے امتیاز ہو سکتا ہے اور جس نے کہا کہ یہ مجاز ہے اس نے کہا ہے: اگر عرب و عجم کے کلام کو تلاش کر کے اس میں غور و فکر کیا جائے تو اس آیت کا حسن نظم اس کی بلاغت اور اس میں موجود معانی کے حوالے سے کوئی کلام اس کا مثل نہیں ہے۔

حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ زمین کو سال یا دو سال میں بارش سے خالی نہیں چھوڑتا اور اس نے آسمان سے کبھی بھی پانی نازل نہیں فرمایا مگر ایک ایسے فرشتے کی حفاظت میں جو اس کا ذمہ دار ہوتا ہے سوائے طوفان (نوح) کے پانی کے کہ یہ آسمان سے بغیر کسی فرشتے کی حفاظت کے نازل ہوا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ (الحاقہ) کشتی ان کو لے کر چلی یہاں تک کہ (کفار کی ہلاکت اور مومنین کی نجات) کا امر پورا ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آسمان سے موسلا دھار بارش کے پانی کو رکنے اور زمین کو پانی نگلنے کا کلمہ ارشاد فرمایا، کہا جاتا ہے: بلع الماء يبلعه، منع يمنع باب سے اور بلع، يبلع، حمد، يحمد باب سے یہ دو لغتیں ہیں جو کسائی اور فراء نے بیان کیا۔ اور ایسی جگہ جو پانی پیتی ہو اس کو بالوعة کہا جاتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: دونوں پانی جو زمین میں تھا اور جو آسمان سے نازل ہوا، جمع ہو گئے اس امر کی وجہ سے جو مقدر کر دیا گیا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اترنے والے پانی کو تھمنے کا حکم دیا، اس میں سے زمین نے ایک قطرہ بھی جذب نہ کیا اور زمین کو صرف وہی پانی نگلنے کا حکم دیا جو اس سے نکلا تھا، یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی جدا جدا فرمائے پس جو زمین کا پانی تھا تو اس کو حکم دیا کہ تو اس کو نگل جا اور آسمان کا پانی دریا (سمندر) بن گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ غِيْضَ الْمَآءُ یعنی وہ کم ہو گیا، کہا جاتا ہے: غاض الشيء وغضته أنا جس طرح کہا جاتا ہے: نقص بنفسه و نقصه غيره کہ وہ خود بخود کم ہو گیا اور کسی اور نے اسے کم کر دیا۔ اس کو غیض غین کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی صحیح ہے۔ وقضى الأمر یعنی اس نے مضبوطی سے کیا اور اس سے فارغ ہو گیا۔ یعنی اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو مکمل طور پر اور مضبوطی سے ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عورتوں کے رحموں کو غرق سے چالیس سال پہلے بانجھ کر دیا تھا، پس جو ہلاک ہوئے ان میں کوئی چھوٹا نہ تھا اور صحیح بات یہ ہے کہ اس نے طوفان کے ذریعے بچوں کو بھی ہلاک کیا جس طرح پرندے اور درندے ہلاک ہوئے، اور یہ غرق بچوں، جانوروں اور پرندوں کے لیے بطور سزا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنی طبعی موت کے سبب مرے۔ حکایت بیان کی گئی ہے کہ جب گلیوں میں پانی زیادہ ہو گیا تو ایک بچے کی ماں بچے کے بارے میں ڈر گئی، وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی، وہ اس کو لے کر پہاڑ کی طرف نکلی حتیٰ کہ پہاڑ کے تیسرے حصے تک پہنچ گئی جب پانی وہاں پہنچا، وہ نکلی حتیٰ کہ اس کے دو تہائی تک پہنچ گئی، جب پانی وہاں پہنچا تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی، جب پانی اس کی گردن تک

پہنچا تو اس نے اپنے بچے کو ہاتھ پر اوپر اٹھالیا حتی کہ پانی اس کو بہا کر لے گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی ایک پر رحم فرماتا تو اس بچے کی ماں پر رحم فرماتا (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ان کے لیے ہلاکت ہے۔ جودی، موصل کے قریب ایک پہاڑ ہے، اس پر وہ (کشتی) محرم کی دس یعنی یوم عاشورہ کو رکی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھا اور اپنے سب ساتھیوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لوگوں، وحشی جانوروں، پرندوں، چوپاؤں اور ان کے علاوہ نے بھی روزہ رکھا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: وہ دن جمعہ کا تھا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی طرف وحی فرمائی کہ کشتی ان میں سے کسی ایک پر رکے گی تو انہوں نے تکبر کیا، اور جودی باقی بچ گیا جس نے تکبر نہ کیا اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتے ہوئے تو کشتی اس پر رکی اور اسی پر اس کی لکڑیاں باقی رہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس (کشتی) کی کوئی چیز باقی رہ گئی جس کو اس امت کے ابتدائی لوگوں نے پایا ہے''۔ مجاہد نے کہا: پہاڑ بلند ہوئے اور انہوں نے تکبر کیا تاکہ غرق ان کو نہ پہنچ سکے، پس پانی ان سے پندرہ ذراع بلند ہو گیا اور جودی نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے خشوع وخضوع اختیار کیا تو وہ غرق نہ ہوا اور کشتی اس پر رک گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ جودی ہر پہاڑ کا نام ہے۔ اسی سے زید بن عمرو بن نفیل کا قول ہے:

سُبحانه ثم سُبحاناً يَعودُ لَهُ و قَبْلَنا سَبَّحَ الجُوديُّ والجَمَدُ (2)

کہا جاتا ہے کہ جودی جنت کے پہاڑوں میں سے ہے اس لیے وہ (کشتی) اس پر رکی، کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے تین آدمیوں کی وجہ سے تین پہاڑوں کو عزت بخشی، جودی کو حضرت نوح علیہ السلام، طور سینا کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حرا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے۔

مسئلہ: جب جودی نے تواضع اور خضوع اختیار کیا (تو اللہ تعالیٰ نے) اسے عزت دے دی اور جب اس کے علاوہ (دیگر پہاڑ) بلند ہوئے اور انہوں نے بلندی کو چاہا تو اس نے انہیں ذلت دی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے اپنی مخلوق کے بارے میں، وہ اٹھاتا ہے جو خشوع کرے اور گراتا ہے جو بلندی چاہے۔ کہنے والے نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

واذا تذللتِ الرّقابُ تخشُّعا مِنّا اِليكَ فعِزُّها فی ذُلِّها

''اور جب ہم میں سے لوگوں نے ڈرتے ہوئے تیری بارگاہ میں تذلل اختیار کیا تو ان (لوگوں) کی عزت ان کے تذلل میں ہے''۔

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (3) انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا، اس سے سبقت نہ لی جا سکتی تھی، ایک اعرابی اپنی سواری پر آیا تو وہ اس سے سبقت لے گیا تو مسلمانوں کو

1۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 254 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 474

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، ناقۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 402

اس سے بہت زیادہ رنج ہوا۔ انہوں نے کہا: عضباء پیچھے رہ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے اپنے اوپر یہ لازم کرلیا ہے کہ جس چیز کو دنیا میں سربلند کرتا ہے اس کو (ایک بار) سرنگوں بھی کرتا ہے''۔

امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی (1) جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے لی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا اور معافی مانگنے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ کرتا ہے اور جو شخص بھی اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سربلند کرتا ہے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا (2): ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تم تواضع کرو حتی کہ کوئی شخص دوسرے پر ظلم نہ کرے اور کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے''۔ اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ۔ اس میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کا ان کی قوم کے ساتھ واقعہ ذکر کریں گے اور کشتی کا کچھ ذکر کریں گے۔ حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا** (العنکبوت:14) اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ایک ہزار سال ٹھہرے مگر پچاس سال۔

اور ان میں گناہ گار اور جابر لوگ بہت زیادہ تھے اور انہوں نے بہت زیادہ تکبر کیا، حضرت نوح علیہ السلام ان کو رات، دن مخفی طور پر اور اعلانیہ طور پر دعوت دیتے رہے، آپ بہت زیادہ صبر کرنے والے بردبار تھے، انبیاء میں سے کسی پر اتنی سختیاں نہیں آئیں جتنی کہ حضرت نوح علیہ السلام پر آئیں۔ وہ لوگ آپ کے پاس آتے تو آپ کا گلہ دباتے یہاں تک کہ ادھ موا کر کے چھوڑتے، مجالس میں وہ آپ کو مارتے اور مجالس سے باہر نکال دیتے، آپ ایسا کرنے والے پر بددعا نہ فرماتے بلکہ ان کے لیے دعا کرتے اور کہتے: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما پس یہ نہیں جانتے۔ یہ چیز ان پر کسی قسم کا اضافہ نہ کرتی سوائے ان (حضرت نوح علیہ السلام) سے فرار کے حتیٰ کہ اگر آپ ان میں سے کسی آدمی سے گفتگو کرتے تو وہ اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتا اور اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتا تاکہ وہ آپ کے کلام میں سے کچھ بھی نہ سن سکے۔ پس اُس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد (دلالت کرتا) ہے۔ **وَ اِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ** (نوح:7) اور میں جب بھی انہیں دعوت دیتا ہوں تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنے کپڑے لپیٹ لیتے ہیں (3)۔

مجاہد اور عبید بن عمیر نے کہا: وہ آپ کو مارتے حتی کہ آپ پر غشی طاری ہوتی جب آپ کو افاقہ ہوتا تو آپ کہتے: اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما پس یہ نہیں جانتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کو مارا جاتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب فی البر والصلۃ والادب، استحباب العفو، جلد 2، صفحہ 321

2۔ صحیح مسلم، کتاب فی کتاب الجنۃ، الصفات التی یعرف بھا الدنیا اھل الجنۃ واھل النار، جلد 2، صفحہ 385

3۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 244

پھر کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا اور آپ کو اپنے گھر میں پھینک دیا جاتا وہ (یہ) خیال کرتے کہ آپ فوت ہو گئے ہیں پھر آپ نکلتے اور ان کو دعوت دیتے، حتی کہ آپ اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ ایک آدمی آپ کے پاس آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا وہ شخص عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھا، اس آدمی نے کہا: اے میرے بیٹے! دیکھ یہ شیخ تمہیں دھوکہ نہ دے، اس (بیٹے نے) کہا: اے باپ! عصا مجھے دیجئے، اس نے اس کو عصا دیا اس (لڑکے) نے عصا لیا پھر کہا: مجھے زمین پر چھوڑ دو اس کے (باپ) نے اسے چھوڑ دیا وہ عصا کے ساتھ آپ کی طرف چلا تو اس نے آپ کو مارا اور آپ کے سر میں موضحہ (جس میں سر کی ہڈی ظاہر ہو جاتی ہے) زخم لگایا اور خون بہنے لگا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اے رب! تو دیکھ رہا ہے جو تیرے بندے میرے ساتھ کرتے ہیں پس اگر تیرے بندوں میں تیرے لیے کوئی بہتری ہے تو تو ان کو ہدایت نصیب فرما اور اگر (ان میں) اس کے علاوہ ہو تو تو مجھے صبر دے یہاں تک کہ تو فیصلہ فرمائے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی اس حال میں کہ آپ اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ مردوں کی صلبوں میں اور عورتوں کے رحموں میں کوئی مومن باقی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ یعنی آپ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا آپ نے عرض کی: اے رب! لکڑی کہاں (سے لوں)؟ فرمایا: درخت لگا۔ کہا: بیس سال آپ نے ساکھو کا درخت لگایا، دعوت دینے سے رک گئے اور وہ استہزا سے رک گئے حالانکہ وہ آپ کا تمسخر اڑایا کرتے تھے، جب درخت نے اپنے رب کے امر کو پالیا تو آپ نے اسے کاٹا اور خشک کیا۔ عرض کیا: اے رب! میں اس گھر کو کیسے بناؤں؟ اللہ نے فرمایا: اس کو تین صورتوں پر بناؤ، اس کا سر مرغ کے سر کی طرح، اس کا سینہ پرندے کے سینہ کی طرح اور اس کی دم مرغ کی دم کی طرح بناؤ۔ اور اس کی منزلیں بناؤ اور ان کے پہلوؤں میں ان منزل کے لیے دروازے رکھو اور آپ نے اس کو میخوں کے ساتھ مضبوط کیا۔ دسر سے مراد لوہے کے کیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیجا تو اس نے آپ کو کشتی بنانا سکھائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کا گھر دمشق میں تھا آپ نے اپنی کشتی لبنان کی لکڑی سے زمزم، رکن (یمانی) اور مقام (ملتزم) کے درمیان بنائی۔ جب مکمل ہو گئی تو اس میں درندے اور چوپائے پہلے دروازے میں سوار کیے۔ وحشی جانور اور پرندے دوسرے دروازے میں سوار کیے اور ان دونوں کے دروازے بند کر دیئے۔ اور اولاد آدم، چالیس مرد اور چالیس عورتوں کو سب سے اوپر والے دروازے میں سوار کیا اور ان پر دروازہ بند کر دیا اور چھوٹی چیونٹیوں کو ان کے کمزور ہونے کی وجہ سے سب سے اوپر والے دروازے میں اپنے ساتھ سوار کیا تا کہ چوپائے ان کو روند نہ ڈالیں (1)۔

زہری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا پس اس نے درندے، پرندے، وحشی جانور اور چوپاؤں میں ہر جوڑے کو کشتی میں سوار کر دیا۔ جعفر بن محمد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیجا اس نے ان کو جمع کر دیا، پھر جبریل نے جوڑے پر اپنے ہاتھ پھیرے۔ اس کا دایاں ہاتھ مذکر پر اور بایاں مونث پر ہوتا۔ پس ان کو اس نے کشتی میں داخل کر دیا۔ حضرت زید بن ثابت

1۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 248

نے کہا: ماعزۃ (وہ بھیڑ جو بغیر دم اور لاٹ کے ہوتی ہے) کا کشتی میں داخل کرنا حضرت نوح علیہ السلام پر مشکل ہو گیا تو آپ نے اس کی دم میں ہاتھ ڈال کر اس کو دھکیلا، اسی وجہ سے اس کی دم ٹوٹ گئی تو وہ مڑی ہوئی ہو گئی اور اس کا حیا (دبر اور فرج) ظاہر ہو گیا۔ نعجۃ (لاٹ یا چکی والی بھیڑ) چلی گئی حتی کہ داخل ہو گئی تو آپ نے اس کی دم پر ہاتھ پھیرا تو اس کا حیا (دبر اور فرج) مستور ہو گیا۔ اسحاق نے کہا: ہمیں ایک اہل علم نے خبر دی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی والوں کو سوار کیا اور اس ہر چیز کا جوڑا جوڑا رکھا تو ہدہد کا بھی جوڑا سوار کیا، ہدہدۃ (مونث) زمین ظاہر ہونے سے پہلے ہی کشتی میں مرگئی۔ ہدہد نے اس کو اٹھالیا، اس کو لے کر دنیا کا چکر لگایا تا کہ اس کے لیے جگہ پالے لیکن اس نے کوئی مٹی وغیرہ نہ پائی، تو اس کے رب نے اس پر رحم فرمایا اس کے لیے اس (نر) کی گدی میں قبر کھود دی تو اس نے اسے اس میں دفن کر لیا، پس ہدہد کی گدی میں اگنے والے بال قبر کی جگہ ہے۔ اس وجہ سے ہدہد کی گدی ابھری ہوئی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت نوح علیہ السلام (1) نے کشتی میں اپنے ساتھ تمام درخت لادے اور عجوۃ (کا درخت) جنت میں سے کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ تھا''۔ صاحب کتاب ''العروس'' وغیرہ نے ذکر کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب چاہا کہ زمین کے بارے میں خبر لانے کے لیے وہ کسی کو بھیجیں تو مرغ نے کہا: میں (لاؤں گا) آپ نے اس کو پکڑا اور اس کے پر پر مہر لگا دی اور اس کو کہا: تو میری مہر کی وجہ سے مختومہ ہے تو کبھی بھی نہیں اڑ سکے گا۔ تجھ سے میری امت نفع اٹھائے گی۔ آپ نے کوے کو بھیجا تو اس نے مردار پالیا تو اس پر بیٹھ گیا اور دیر کر دی تو آپ نے اس پر لعنت کی، اسی وجہ سے حل و حرم میں اس کو قتل کر دیا جاتا ہے اور آپ نے اس کے خلاف خوف کی بددعا کی، اسی وجہ سے یہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ کبوتری کو بھیجا تو اس نے قرار نہ پایا، سیناء کی زمین میں ایک درخت پر بیٹھی اور زیتون کے درخت کا پتہ اٹھا لیا اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرف لوٹ آئی تو آپ جان گئے کہ یہ زمین میں قرار حاصل نہیں کر سکے گی۔ پھر اس کو اس کے بعد بھیجا، یہ اڑی یہاں تک کہ حرم کی وادی میں پہنچ گئی تو کعبہ کے مقامات سے پانی جذب ہو چکا تھا اور اس کی مٹی سرخ تھی، وہ اس کی ٹانگوں میں لگ گئی پھر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئی اور کہا: میرے لیے آپ کی طرف سے خوشخبری ہے کہ آپ نے مجھے میری گردن میں طوق ہبہ کر دیا اور میری ٹانگ میں خضاب اور میں حرم میں رہوں گی۔ تو آپ نے اس کی گردن اور طوق پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اس کی ٹانگوں میں اس کو سرخی ہبہ کر دی اور اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے برکت کی دعا کی۔

ثعلبی نے ذکر کیا کہ آپ نے کوے کے تدارج کو بھیجا اور یہ مرغ کی جنس میں سے تھا۔ اس کو کہا: معذرت کرنے سے بچنا، تو اس نے شادابی اور فراخی کو پا لیا۔ اور واپس نہ لوٹا اور اپنی اولاد کو قیامت تک آپ کے پاس رہن رکھ دیا۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ

1۔ تاریخ مدینہ دمشق، جلد 62، صفحہ 261

مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَ تَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۞

''اور پکارا نوح نے اپنے رب کو اور عرض کی: اے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میری اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں (کیونکہ) اس کے عمل اچھے نہیں پس نہ سوال کیا کرو مجھ سے جس کا تجھے علم نہ ہو میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نہ ہو جانا نادانوں سے۔ عرض کرنے لگے: میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ میں سوال کروں تجھ سے ایسی چیز کا جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں ہو جاؤں گا زیاں کاروں سے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ یعنی اس نے اس (اللہ) سے دعا کی۔ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ یعنی میرے ان اہل میں سے جن کے غرق سے نجات کا تو نے وعدہ فرمایا ہوا ہے، پس کلام میں حذف ہے۔ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ یعنی سچا۔ ہمارے علماء نے کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے بیٹے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاَهْلَكَ کی وجہ سے سوال کیا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کو ترک کر دیا۔ جب ان کے نزدیک وہ انکے اہل سے تھا تو عرض کیا: رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ اس بات پر ان کا قول وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۞ دلالت کرتا ہے، یعنی تو ان میں سے نہ ہو جا جن سے تو نہیں ہے، کیونکہ وہ آپ کے گمان کے مطابق مومن تھا اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے رب کو اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ کہنے والے نہیں تھے مگر وہ ان کے نزدیک ایسا ہی تھا، کیونکہ یہ تو محال ہے کہ آپ کفار کی ہلاکت کا سوال کریں پھر ان میں سے بعض کی نجات کا بھی سوال کریں، آپ کا بیٹا کفر کو چھپاتا اور ایمان کو ظاہر کرتا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو خبر دی جو علم غیب میں سے اس کے ساتھ خاص تھی یعنی میں تمہارے بیٹے کی حالت کو جانتا ہوں جو تو نہیں جانتا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ منافق تھا اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے لیے دعا مانگنے کو جائز سمجھا۔ اور ان ہی سے روایت ہے: یہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا، اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے کہ ونادی نوح ابنهلہ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے یعنی تو نے ایک قوم کی نجات اور ایک قوم کے غرق کا حکم فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یعنی یہ تیرے ان اہل میں سے نہیں جن کی نجات کا میں نے ان سے وعدہ فرمایا، یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے۔ جمہور نے کہا: یہ تیرے دین اور نہ ہی تیری ولایت کا اہل ہے(1)، تو یہ (ترجمہ) مضاف کے حذف کی صورت میں ہوگا (یعنی اهل دینك وولایتك) اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476

دین میں متفق ہونے کا حکم نسب کے حکم کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ حضرت ابن عباس، حضرت عروہ، عکرمہ، یعقوب اور کسائی نے اس کو "انه عَمِلَ غَيْرَ صالح" پڑھا ہے۔ یعنی کفر اور تکذیب وغیرہ۔ ابوعبید نے اسی کو اختیار کیا ہے اور باقی لوگوں نے عَمَلٌ پڑھا ہے یعنی تیرا بیٹا غیر صالح عمل والا ہے ابنك ذو عمل غیر صالح مضاف کو حذف کر دیا گیا، یہ زجاج اور دیگر کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

تَرْتَعُ مَا رَتَعَتْ حَتّٰى إِذَا ادَّكَرَتْ فَإِنَّمَا هِيَ إِقْبَالٌ وَ إِدْبَارٌ(1)

یعنی ذات اقبال و ادبار، یہ قول اور جو اس سے قبل ہے ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ انہ کی ضمیر سوال کے لیے ہو یعنی بے شک تیرا مجھ سے اس کی نجات کا سوال کرنا عمل غیر صالح ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: عمل غیر صالح کا معنی یہ ہے کہ یہ پیدا آپ کے فراش میں ہوا، حالانکہ آپ کا بیٹا نہیں، اور یہ ناجائز شادی کا تھا، مجاہد کا بھی یہی قول ہے(2)۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ میں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! وہ ان کا بیٹا نہ تھا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے خبر دی کہ انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ تو انہوں (حسن) نے کہا: آپ (نوح) نے "منی" نہیں کہا اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ یہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا کسی اور خاوند سے، تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت نوح علیہ السلام سے حکایت کیا کہ انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ، وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ اور اہل کتاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ان کا بیٹا تھا، تو حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: کون شخص اہل کتاب سے اپنا دین لیتا ہے، وہ تو جھوٹے ہیں اور انہوں نے پڑھا فخانتاھما (کہ ان دونوں نے خیانت کی)

ابن جریج نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو بلایا اور ان کا گمان یہ تھا کہ یہ ان کا بیٹا ہے اور وہ آپ کے فراش پر پیدا ہوا اور اس معاملے میں ان کی بیوی نے ان کے ساتھ خیانت کی۔ اسی وجہ سے فرمایا: فخانتاھما۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا(3): کسی نبی کی بیوی نے کبھی بھی بغاوت (بدکاری) نہیں کی، وہ آپ کا اصلی بیٹا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر کو کہا گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں: اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ کیا وہ آپ کے اہل سے تھا؟ کیا وہ آپ کا صلبی بیٹا تھا؟ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی لمبی تسبیح کی پھر فرمایا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام فرماتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا ہے، اور تو کہتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا نہیں۔ ہاں وہ ان کا بیٹا تھا، لیکن وہ نیت، عمل اور دین میں مخالف تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ قول کرنے والے کی جلالت کی وجہ سے اس باب میں زیادہ صحیح ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یہ ان اقوال میں سے نہیں جن کے ذریعے اس کے ان کا بیٹا ہونے کی نفی کی جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فخانتاھما یعنی دین میں (خیانت کی) نہ کہ فراش میں، اور یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو بتاتی تھی کہ یہ مجنون ہے، اور اس وجہ سے کہ اس نے آپ کو کہا: کیا تیرا رب تیری مدد کرے گا؟ آپ نے اسے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: کب؟ آپ نے فرمایا جب تنور ابل پڑے گا، تو وہ اپنی قوم کو یہ کہتے ہوئے نکل کھڑی ہوئی: اے قوم! اللہ کی قسم یہ مجنون ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 177 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476 3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 62

یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا رب اس تنور کے ابل پڑنے سے اس کی مدد کرے گا۔ پس یہ اس کی خیانت ہے اور دوسری خیانت یہ ہے کہ وہ مہمانوں کے خلاف رہنمائی کرتی تھی جس طرح کہ عنقریب آئے گا اگر اللہ نے چاہا تو۔ واللہ اعلم۔ ایک قول یہ ہے ولد بعض اوقات عمل کو بھی کہتے ہیں جس طرح کہ کسب کو کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تمہاری اولاد تمہارے کسب سے ہے'' (1)۔ قشیری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں مخلوق کو ان کی اولادوں کے فساد کے بارے میں تسلی دینا (مقصود) ہے اگرچہ وہ (خود) نیکوکار ہی کیوں نہ ہوں۔ روایت ہے کہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ اوپر سے اترے اور آپ کے پاس ایک حمام تھا جس نے آپ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ راوی نے کہا کہ حضرت مالک کو پتہ چل گیا کہ لوگ اس کو سمجھ گئے ہیں، تو حضرت مالک نے کہا: ادب اللہ کا ادب ہے نہ کہ والدین کا ادب اور بھلائی اللہ کی بھلائی ہے نہ کہ آباء اور امہات کی بھلائی۔

اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ بیٹا اہل اور اہل بیت میں سے ہے لغوی اور شرعی طور پر، پس جس نے اپنے اہل کے لیے وصیت کی تو اس میں اس کا بیٹا بھی داخل ہوگا اور وہ بھی داخل ہوگا جس کو اس کا گھر اپنے اندر لیے ہوئے ہو، اس حال میں کہ وہ اس کے عیال میں ہو۔ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ (الصافات) فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ (الانبیاء) وہ تمام لوگ جن کو ان کا گھر اپنے اندر لیے ہوئے تھا ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کا اھل فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حسن، مجاہد اور ان کے علاوہ کے قول کے مطابق آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچہ فراش کے لیے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے جو کچھ کہا فراش کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سفیان بن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبید بن عمیر کو کہتے ہوئے سنا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی وجہ سے فیصلہ فرمایا کہ بچہ فراش کے لیے ہے (2)، اس کو ابو عمر نے کتاب ''التمہید'' میں ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بچہ فراش کے لیے ہے اور زانی کے لیے حجر ہے''۔ حجر سے مراد ناکامی و نامرادی ہے، اور کہا گیا: (اس سے مراد) پتھر سے رجم کرنا ہے۔ عروۃ بن زبیر نے پڑھا۔ ونادی نوح ابنهااس سے مراد آپ (نوح) کی بیوی کا بیٹا ہے، اور یہ آپ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی گزشتہ قراءت کی تفسیر ہے۔

اور یہ حسن اور مجاہد کے لیے حجت ہے مگر یہ قراءت شاذہ ہے اس کی وجہ سے ہم متفق علیہ قراءت کو ترک نہیں کریں گے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ یعنی میں تجھے اس سوال سے روکتا ہوں اور تم کو ڈراتا ہوں کہ تم نہ ہو جاؤ (جاہلین میں سے) یا (اس بات کو) ناپسند کرتے ہوئے کہ آپ ہو جائیں جاہلین یعنی گناہ گاروں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاحکام، ما جاء ان الولد ان یأخذ من مال والدہ، جلد 1، صفحہ 162

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، الولد للفراش، جلد 1، صفحہ 471

میں سے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا (النور: 17) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ڈراتا ہے اور روکتا ہے۔ کہا گیا: معنی یہ ہے کہ میں تمہیں اس بات سے بلند کر دوں گا کہ تو جاہلین میں سے ہو (1)۔

ابن عربی نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ اور نصیحت ہے جس کے ذریعے وہ حضرت نوح علیہ السلام کو جاہلین کے مقام سے اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے ان کو علماء اور عارفین کے مقام پر بلند فرماتا ہے۔ پس حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ اور یہ انبیاء کے ذنوب ہیں۔ تو آپ نے اپنے تذلل اور تواضع کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کیا۔ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِيْ جو سوال کی وجہ سے زیادتی ہو۔ تَرْحَمْنِيْٓ یعنی توبہ کے ذریعے۔ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ یعنی از روئے اعمال کے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"ارشاد ہوا اے نوح! (کشتی سے) اتریئے امن و سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ جو آپ پر ہیں اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں اور (آئندہ) کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں پھر پہنچے گا انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا یعنی آپ کو فرشتوں نے کہا، یا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کشتی سے زمین کی طرف اتریئے یا پہاڑ سے زمین کی طرف (اتریے) پس اس نے پانی کو نگل لیا اور خشک ہو گئی۔ بِسَلٰمٍ مِّنَّا یعنی سلامتی اور امن کے ساتھ۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سلام ہے وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ یعنی ثابت شدہ نعمتیں۔ یہ بروك الجمل سے مشتق ہے اور یہ اس کا ثابت ہونا اور اس کا قائم ہونا ہے۔ اور اسی سے البرکۃ (حوض) ہے اس میں پانی کے ٹھہرنے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام آدم اصغر ہیں، اب ساری مخلوق آپ کی نسل میں سے ہے۔ قتادہ وغیرہ کے قول کے مطابق کشتی میں مردوں اور عورتوں میں آپ کے ساتھ سوائے آپ کی اولاد کے کوئی سوار نہ تھا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تنزیل میں وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ (الصافات) ہے۔ اور ہم نے ان کی اولاد کو بنایا کہ وہی باقی رہنے والے ہیں۔ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں۔ کہا گیا ہے: اس میں قیامت تک (آنے والا) ہر مومن داخل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ میں قیامت تک (آنے والا) ہر کافر داخل ہے (2)، یہ محمد بن کعب سے روایت کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر تقدیر عبارت یہ ہو گی، وعلی ذریة امم معك و ذرية امم سنمتعهم، وامم کو اس وجہ سے رفع دیا گیا کہ اس کا معنی ہے وتکون امم۔ اخفش سعید نے کہا کہ جس طرح تم کہتے ہو کلمت زیدا وعمرو جالس میں نے زید سے کلام کیا اور عمر بیٹھنے والا ہے۔ فراء نے غیر قراءت میں واممًا پڑھنے کی اجازت دی اور اس کی تقدیر ہو گی: ونمتع أمما اور علی کو أمم کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا گیا کیونکہ عَلَيْكَ کی کاف ضمیر پر اس کا عطف ہے اور ضمیر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 67

مجرور ہے اور سیبویہ وغیرہ کے قول کے مطابق ضمیر مجرور پر حرف جار کے اعادہ کے بغیر عطف نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النساء: 1) وَالْاَرْحَامَ کے جر کے ساتھ اس کا بیان مکمل طور پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بسلام میں با محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ حال کی جگہ ہے یعنی اهبط مسلما علیك اور منا محل جر میں محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ برکات کی صفت ہے۔ وعلی امم اسی کے متعلق ہے جس کے متعلق علیك ہے کیونکہ کاف پر عطف کی وجہ سے اس کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مِّمَّنْ مَّعَكَ میں من محذوف کے متعلق ہے کیونکہ یہ محل جر میں اُمم کی صفت ہے اور معك فعل محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ من کا صلہ ہے یعنی فمن استقر معك (جو آپ کے ساتھ ٹھہرا) یا آمن معك (جو آپ پر ایمان لایا) یا رکب معك (جو آپ کے ساتھ سوار ہوا)

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

''یہ قصہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم وحی کر رہے ہیں آپ کی طرف نہ آپ جانتے تھے اسے اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے پس آپ صبر کریں یقیناً نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ یعنی جو خبریں، اور ایک اور مقام پر ذالك ہے یعنی خبروں میں سے وہ خبریں اور قصص جو آپ سے غیب ہیں (1)۔ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ یعنی تاکہ آپ ان سے آگاہ ہو جائیں۔ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ یعنی وہ طوفان کے معاملہ سے ناواقف تھے حالانکہ مجوسی اب اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد ان کا حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے قصے سے ناواقف ہونا ہے اگرچہ من جملہ انہوں نے طوفان کا معاملہ سن رکھا ہے۔

فَاصْبِرْ صبر کر رسالت کی مشقتوں اور قوم کی اذیتوں پر جس طرح نوح علیہ السلام نے صبر کیا، یعنی اے محمد! اللہ کے امر اور اپنی رسالت کی تبلیغ کے ذریعے قیام پر صبر کیجئے اور جو عرب کفار کی طرف سے آپ کو اذیت ملتی ہے اس پر اس طرح صبر کیجئے جس طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر صبر کیا۔

اِنَّ الْعَاقِبَةَ دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی (کا انجام) لِلْمُتَّقِيْنَ شرک اور گناہوں سے (بچنے والوں کے لیے ہے)۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 179

اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٥٥﴾ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَي اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٦﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٥٧﴾ وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ڐ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٥٩﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿٦٠﴾

''اور عاد کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی ہود کو بھیجا آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا معبود اس کے سوا، نہیں تم مگر افترا پرداز۔ اے میری قوم! نہیں مانگتا میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت، نہیں ہے میری اجرت مگر اس (ذات پاک) کے ذمہ جس نے مجھے پیدا فرمایا۔ کیا تم (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے؟ اے میری قوم! مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اور بڑھا دے گا تمہیں قوت میں تمہاری پہلی قوت سے اور نہ منہ موڑو (اللہ تعالیٰ سے) جرم کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا: اے ہود! نہیں لے آیا تو ہمارے پاس کوئی دلیل اور نہیں ہیں ہم چھوڑنے والے اپنے خداؤں کو تمہارے کہنے سے اور نہیں ہیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ مبتلا کر دیا ہے تجھے ہمارے کسی خدا نے دماغی خلل میں۔ ہود نے کہا: میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو اس کے سوا، پس سازش کرلو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو بلاشبہ میں نے بھروسہ کرلیا اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔ بےشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے، پھر اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تمہاری طرف اور جانشین بنا دے گا میرا رب کسی اور قوم کو تمہارے علاوہ اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ بےشک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ بوجہ اپنی رحمت کے اور ہم نے نجات دے دی انہیں سخت عذاب سے۔ اور یہ قوم عاد (کی داستان) ہے انہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی اور پیروی کرتے رہے ہر متکبر منکر حق کے حکم کی اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی۔ سنو! عاد

نے انکار کیا اپنے رب کا، سنو! ہلاکت و بربادی ہو عاد کے لیے جو ہود کی قوم تھی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی اور ہم نے بھیجا۔ اَرْسَلْنَا نُوْحًا پر اس کا عطف ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ان (قوم عاد) کا بھائی کہا گیا ان میں سے ہونے کی وجہ سے، قبیلہ نے ان کو جمع کر دیا تھا، جس طرح آپ کہتے ہیں: یا اخا تمیم ایک قول یہ ہے ان کو ان کا بھائی کہا گیا کیونکہ وہ (ہود علیہ السلام) اولاد آدم علیہ السلام سے ہیں جس طرح کہ وہ (قوم عاد) اولاد آدم سے ہے۔ یہ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور وہ بتوں کے پجاری تھے۔ کہا گیا ہے: عاد (نام کی) دو (قومیں) تھیں عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ۔ تو یہ عاد اولیٰ ہے، رہے عاد ثانیہ تو وہ شداد اور لقمان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد ارم ذات العماد میں مذکور ہیں۔ عاد ایک آدمی کا نام ہے پھر اس کی طرف منسوب ایک قوم پر اس کا اطلاق ہوا۔ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔ غیرہ لفظاً مجرور اور غیرہ محلاً مرفوع اور غیرہ استثنا کی بنیاد پر منصوب اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ یعنی تم غیر کو معبود بنانے میں اس (اللہ تعالیٰ عز و جل) پر جھوٹ بولنے والے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ اور فطرت (سے مراد) مخلوق کی ابتدا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اس کو جو قوم نوح پر جاری ہوا جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ سورت کی ابتداء میں یہ گزر چکا ہے۔ یُرْسِلِ السَّمَآءَ، یرسل مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب ہے اور اس میں جزا کا معنی ہے۔ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس میں کثرت کا معنی ہے، یعنی آسمان موسلا دھار بارش برسائے گا(1)۔ اور عرب مفعال میں نسب کی صورت میں ہا کو حذف کر دیتے ہیں۔

اکثر اوقات مفعال کا وزن افعل باب افعال سے آتا ہے جب کہ یہاں فعل سے آیا ہے کیونکہ یہ درّت السماء تدِر اور تدُر سے مشتق ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم یعنی قوم عاد باغوں، کھیتوں اور عمارتوں والی قوم تھی اور ان کی رہائش گاہیں شام اور یمن کے درمیان والے ٹیلے تھے جس طرح کہ سورۂ اعراف میں گزر گیا۔

وَّ یَزِدْكُمْ یرسل پر اس کا عطف ہے۔ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ مجاہد نے کہا: (قوت سے مراد) شدت ہے۔ ضحاک نے کہا: شادابی، علی بن عیسیٰ کے نزدیک: عزت۔ اور عکرمہ کے نزدیک: اولاد ہے(2)۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سال ان سے بارش روک لی اور رحموں کو بانجھ کر دیا پس ان کا کوئی بچہ پیدا نہ ہوا، تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں کہا: اگر تم ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہارے شہروں کو زندہ (آباد) کر دے گا اور تمہیں مال اور اولاد عطا فرمائے گا۔ پس یہی قوت ہے۔ زجاج نے کہا: معنی یہ ہے کہ وہ قوت کا اضافہ فرما دے گا نعمتوں میں۔ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ یعنی تم اس سے اعراض نہ کرو جس کی طرف میں تم کو دعوت دیتا ہوں اور کفر پر قائم نہ ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ یعنی واضح حجت۔ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ان کی طرف سے کفر پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 477   2۔ ایضاً

اصرار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ یعنی تجھے مبتلا کر دیا ہے۔ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا اس سے مراد بت ہیں۔ بِسُوْٓءٍ یعنی جنون نے آپ کا ان کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہ مروی ہے، کہا جاتا ہے: عراہ الامر واعتراہ جب کوئی اس میں مبتلا ہو جائے۔ اور اسی سے ہے: وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج: 36)

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ یعنی اپنی ذات پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں۔ وَاشْهَدُوْٓا یعنی میں تم کو گواہ بناتا ہوں، اس وجہ سے نہیں کہ وہ اہل شہادت میں سے تھے بلکہ یہ تقریر کی انتہا ہے، یعنی اس لیے کہ تم پہچان لو۔ اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ یعنی ان بتوں کی پوجا سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا یعنی تم اور تمہارے بت میری دشمنی اور مجھے نقصان دینے میں مکر کریں۔ ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ یعنی تم مجھے مہلت نہ دو۔ دشمنوں کی کثرت کے باوجود یہ قول اللہ تعالیٰ کی مدد پر کامل بھروسہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ نبوت کی علامات میں سے ہے کہ رسول اکیلا اپنی قوم کو کہتا ہے: فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو کہا اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ الآیۃ (یونس: 71) تم اپنا معاملہ اور اپنے شرکاء کو جمع کر لو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ یعنی میں اس کے حکم پر راضی ہوں اور اس کی مدد کے بارے میں پر امید ہوں۔ مَا مِنْ دَآبَّةٍ یعنی وہ نفس جو زمین پر رینگتا ہے۔ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ ہر وہ چیز جس میں روح ہو اس کو داب یا دابۃ کہا جاتا ہے اور اس دابۃ میں ہا مبالغہ کے لیے ہے۔ فراء نے کہا: (اس سے مراد ہے کہ وہ) اس کا مالک اور اس پر قادر ہے۔ قتبی نے کہا: وہ اس پر غالب ہے، کیونکہ جس بندے کی پیشانی کو تو پکڑ لے تو (گویا) تو اس پر غالب آ گیا ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ اس کو پیدا کرتا ہے پھر اس کو مارتا ہے، اور معنی قریب قریب ہے اور ناصیۃ سے مراد سر کے اگلے حصے کے بال ہیں۔ نصوت الرجل انصوہ نصواً (کہا جاتا ہے) جب تم اس کی پیشانی کو کھینچو۔

ابن جریج نے کہا: اس کو ناصیۃ کے ساتھ خاص کیا کیونکہ عرب یہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی آدمی کی صفت عاجزی اور خضوع کے ساتھ بیان کی جائے۔ پس وہ کہتے ہیں: فلاں کی پیشانی فلاں کے ہاتھ میں ہے یعنی وہ اس کا مطیع ہے جس طرح چاہے وہ اس میں تصرف کرے۔ اور (عرب) جس کسی قیدی کو گرفتار کرتے اور پھر اس پر احسان کر کے اس کو آزاد کرنا چاہتے تو وہ اس کے پیشانی کے بالوں کو پکڑتے تاکہ اس طرح وہ اس پر فخر کا اظہار کریں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب فرمایا ایسے محاورہ کے ذریعے جس کو وہ اپنے کلام میں جانتے تھے۔ ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اعمال کے مقادیر مقرر فرمائے پھر ان کی طرف دیکھا پھر انسان کی تخلیق فرمائی اور نگاہ قدرت ان کی تخلیق سے پہلے ہی ان کے ان اعمال سے پار ہو گئی جو وہ کرنے والے تھے پس جب ان کو پیدا فرمایا تو اس نظر کے نور کو ان کی پیشانیوں میں لکھ دیا پس یہ نور ان کی پیشانیوں کو پکڑنے والا ہے۔ یہ انہیں ان اعمال کی طرف لے جاتا ہے جو مقادیر والے دن ان پر مقرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مقادیر کو زمین

وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے پیدا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے اسے روایت کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ تعالیٰ نے مقادیر کو زمین وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مقرر فرمایا" (1)۔ اسی وجہ سے رسولوں کو تقویت ملی اور وہ اولوالعزم میں سے ہو گئے کیونکہ انہوں نے پیشانیوں کے نور کو ملاحظہ فرمایا اور انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اس کی ساری مخلوق ان انوار کے سبب اتباع کر رہی ہے جہاں تک اعمال میں سے ان میں اس کی بصارت پار ہو چکی ہے، پس ان میں سے جو مشاہدہ کے اعتبار سے زیادہ ہیں وہ عزم میں زیادہ پختہ ہیں، اسی وجہ سے اللہ کے نبی حضرت ہود علیہ السلام اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ یہاں تک کہہ دیا: فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا پس سازش کر لو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو بلاشبہ میں نے بھروسہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔

اس کو ناصیۃ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اعمال غیب الغیب سے ظاہر ہوئے اور مقادیر میں منصوص ہو گئے، خالق کی بصارت مخلوق کی تمام حرکات سے قدرت کے ذریعے پار ہو گئی، پھر زمین پر چلنے والے ہر حیوان کی حرکت اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان اس کی پیشانی میں رکھ دی گئی، پس اس کی اس جگہ کو ناصیۃ کہہ دیا گیا، کیونکہ وہ تقدیر کے مطابق بندوں کی حرکات کو ظاہر کرتی ہے، ناصیۃ ان حرکات کے اظہار سے ماخوذ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کرنے سے پہلے دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے ابوجہل کی پیشانی کے بارے میں نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ (العلق) فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ پیشانیوں میں کاذبۃ اور خاطئۃ بھی ہوتی ہیں۔ ان کی بیان کردہ تاویل کے مطابق ناصیۃ کو کذب اور خطا کی طرف منسوب کرنا محال ہے۔

اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ نحاس نے کہا: صراط کا لغوی معنی واضح راستہ ہے، معنی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اگرچہ ہر چیز پر قادر ہے مگر بغیر حق کے وہ لوگوں کو نہیں پکڑتا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی تدبیر میں کوئی خلل نہیں اور اس کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں وہ پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِنْ تَوَلَّوْا محل جزم میں ہے۔ اس وجہ سے اس میں سے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور یہ اصل میں تتولوا تھا اجتماع تائین کی وجہ سے تا کو حذف کر دیا گیا۔ فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ اس کا معنی ہے کہ میں نے تمہارے لیے بیان کر دیا ہے۔ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دے گا اور وہ ان کو پیدا فرمائے گا جو تمہاری نسبت زیادہ اس کی اطاعت کرنے والے ہوں گے وہ اس کی وحدانیت کا اعلان کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے۔ وَيَسْتَخْلِفُ یہ ماقبل سے مقطوع ہے اس وجہ سے مرفوع ہے۔ فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ کے ارشاد میں فا کے بعد جو ثابت ہو رہا ہے یہ اس پر معطوف ہے۔ حفص سے روایت کی گئی ہے انہوں نے عاصم سے روایت کی وَيَسْتَخْلِفْ جزم کے ساتھ فا کی جگہ اور اس کے مابعد پر محمول کرتے ہوئے جس طرح وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (الاعراف)

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، حجاج آدم موسیٰ علیہما السلام، جلد 2، صفحہ 335

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا یعنی تم اپنی روگردانی اور اعراض کے ذریعے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ یعنی ہر چیز کا نگہبان علی بمعنی لام ہے۔

پس ▫ میری حفاظت فرماتا ہے اس سے کہ تم مجھے کوئی برائی پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا یعنی جب آیا ہمارا عذاب قوم عاد کی ہلاکت کے ذریعے۔ نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا کیونکہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر نجات نہیں پاتا اگرچہ اسے نیک اعمال ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ صحیح مسلم، صحیح بخاری اور دیگر (کتب) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دے سکتا''۔ انہوں نے عرض کیا: اور نہ آپ کو یا رسول اللہ؟ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا: ''اور نہ مجھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے'' (1)۔ ایک قول یہ ہے کہ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے اس ہدایت کو بیان کر دیا جو رحمت ہے۔ اور وہ چار ہزار تھے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ یعنی قیامت کے دن کے عذاب (سے) اور کہا گیا ہے: وہ سخت آندھی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات وغیرہ میں ذکر فرمایا اور اس کا بیان آئے گا۔ قشیری ابو نصر نے کہا: وہ عذاب جس کے ذریعے نبی اپنی امت کو دھمکی دیتا ہے جب آ جائے تو اللہ نبی اور اس کے ساتھ مومنین کو اس سے نجات عطا فرماتا ہے۔ ہاں! اللہ کا نبی اور اس کی قوم کو مبتلا کرنا بعید (از قیاس بات) نہیں پس وہ ان کو آزمائش میں مبتلا فرمائے تو وہ کافروں کے لیے سزا ہو گی اور مومنوں کے لیے آزمائش، جب یہ اس میں سے نہ ہو نبی نے جس کی دھمکی دی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَتِلْكَ عَادٌ مبتدا اور خبر ہے۔ کسائی نے بیان کیا کہ عربوں میں سے جو عاد کو منصرف نہیں بناتا پس وہ اس کو قبیلہ کا نام بنا دیتا ہے۔ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ یعنی انہوں نے معجزات کی تکذیب کی اور ان کا انکار کیا۔ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ یعنی صرف حضرت ہود علیہ السلام کا، کیونکہ ان کی طرف سوائے آپ کے کوئی اور رسول نہ بھیجا گیا۔ اس کی مثال (یعنی جمع بول کر واحد مراد لینا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ (المومنون: 51) (الرُّسُلُ سے مراد) صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے علاوہ کوئی رسول نہ تھا۔ اور یہاں جمع ہے کیونکہ جس نے ایک رسول کی تکذیب کی تو (گویا) اس نے سب رسولوں کی تکذیب کی۔ اور ایک قول یہ ہے: انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام اور آپ سے پہلے رسولوں کی تکذیب کی، اور وہ اس طرح تھے کہ اگر ان کی طرف ہزار رسول بھی بھیجے جاتے تو وہ سب کا انکار کر دیتے۔ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ یعنی ان کے کمتر لوگوں نے اپنے رئیسوں کی اتباع کی۔

جبار سے مراد تکبر کرنے والا ہے اور عنید سے مراد وہ سرکش ہے جو حق کو قبول نہیں کرتا اور نہ اس کا اقرار کرتا ہے۔ ابو عبید نے کہا: عنید، عنود، عاند اور معاند سے مراد مخالفت کی وجہ سے اعراض کرنے والا ہے۔ اور اسی سے اس رگ کو عاند کہا جاتا ہے جو خون کے ذریعے بہہ پڑتی ہے۔ زاجر نے کہا:

إنّي كبيرٌ لا أطيقُ العُنَّدا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب تمنی المریض الموت، جلد 2، صفحہ 957

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً یعنی ان کو اس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی ان کے پیچھے لگائی جائے گی قیامت کے دن اس کی مثل پس یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پر تمام ہو رہی ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ فراء نے کہا: یعنی انہوں نے اپنے رب کی نعمت کا انکار کیا، اس نے کہا: کفرتہ اور کفرت بہ کہا جاتا ہے جس طرح شکرتہ اور شکرت لہ کہا جاتا ہے (یعنی یہ با کے صلہ کے ساتھ اور صلہ کے بغیر دونوں طرح آتا ہے) اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دور رہیں گے اور بعد سے مراد ہلاکت ہے اور بعد بھلائی سے دوری کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: بعد یبعد بعد جب وہ پیچھے رہ جائے اور دور ہو جائے۔ اور بعد یبعد بعدا (کہا جاتا ہے) جب وہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا:

لَا يَبْعَدَنْ قومي الذين هُمُ		سَمُّ العُدَاةِ وآفَةُ الجُزُرِ

نابغہ نے کہا:

فلا تَبْعَدَنْ إنّ المنية مَنْهَلٌ		وكلُّ امرئٍ يومًا به الحالُ زائلُ

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝

''اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی صالح کو بھیجا آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں تمہارا کوئی معبود اس کے سوا اس نے پیدا فرمایا تمہیں زمین سے اور بسا دیا تمہیں اس میں۔ پس مغفرت طلب کرو اس سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بے شک میرا رب قریب ہے (اور) التجائیں قبول فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰى ثَمُوْدَ یعنی ہم نے ثمود کی طرف بھیجا۔ اَخَاهُمْ یعنی نسب میں ان کا بھائی صٰلِحًا یحییٰ بن وثاب نے اِلٰى ثَمُوْدٍ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حسن سے بھی اسی طرح روایت کیا گیا ہے اور تمام قراء نے پورے قرآن میں اس میں اختلاف کیا ہے پس انہوں نے کسی جگہ اس کو منصرف پڑھا ہے اور کسی جگہ غیر منصرف۔ ابوعبیدہ نے گمان کیا کہ اگر جماعت کی مخالفت نہ ہو تو مناسب صرف کو ترک کرنا ہے، کیونکہ اس میں تانیث غالب ہے۔ نحاس نے کہا: جو ابوعبید نے کہا۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ کہ اس پر تانیث غالب ہے (یہ) کلام مردود ہے، کیونکہ ثمود امحلے کو بھی کہا جاتا ہے اور قبیلہ کو بھی اور اس پر قبیلہ غالب نہیں، بلکہ سیبویہ کے نزدیک معاملہ اس کے برعکس ہے اور جس کے بارے میں بنوفلاں نہ کہا گیا ہو اس میں سیبویہ کے نزدیک عمدہ اس کو منصرف پڑھنا ہے جس طرح قریش، ثقیف اور جوان دونوں کے مشابہ ہو، اسی طرح ثمود بھی ہے۔ اس میں علت یہ ہے کہ جب مذکر اصل ہے اور اس کا مذکر اور مونث (دونوں) ہوں تو اصل اخف اولی ہے اور تانیث عمدہ اور حسن ہے۔ سیبویہ نے تانیث میں شعر کہا:

غَلَبَ المساميحَ الوليدُ سَماحةً		وكفَى قريشَ المعضلاتِ وسادَهَا

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ گزر چکا ہے۔
هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی زمین سے اور یہ اس وجہ سے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین سے پیدا کیا گیا جس طرح کے "سورۂ بقرہ" اور "سورۃ الانعام" میں گزر چکا ہے۔ اور لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیے گئے۔ ایک قول یہ ہے اس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا۔ غیرہ کی ھو کی ھا میں ادغام جائز نہیں سوائے اس شخص کی لغت کے جس نے ادراج کی صورت میں واؤ کو حذف کر دیا ہو۔ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا یعنی اس نے تمہیں اس کا آباد کرنے والا اور رہائشی بنایا۔ مجاہد نے کہا: اسْتَعْمَرَكُمْ کا معنی ہے اعمرکم یعنی اس نے تمہیں عمر بھر (زمین میں) رکھا، جیسے اعمر فلان فلانا دارہ یعنی فلاں نے فلاں کو اپنا گھر عمر بھر کے لیے دیا پس یہ عمر بھر اس کا ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس نے تمہیں اس میں آباد کیا، ان دونوں قولوں کے مطابق استفعل بمعنی افعل ہوگا جیسے استجاب بمعنی اجاب۔ ضحاک نے کہا: اس نے تمہاری عمروں کو دراز کیا اور ان کی عمریں تین سو سے ہزار (سال) تک تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک معنی ہے: اس نے تمہیں اس میں زندہ رکھا۔ زید بن اسلم کے نزدیک اس نے تمہیں حکم دیا اس میں رہائش گاہوں کی تعمیر اور درخت لگانے میں سے جس کی تمہیں ضرورت ہو اس کے بنانے کا (2)۔ اور ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ اس نے کھیتی باڑی، درخت لگانا اور نہروں کی کھدوائی وغیرہ میں سے اس کی آبادی کا تمہیں الہام کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا (3) کہ بعض شافعی علماء نے کہا: استعمار سے مراد طلب عمارت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلق مطالبہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ قاضی ابوبکر نے کہا: استفعل کا کلمہ عربوں کی زبان پر کئی معانی کے لیے آتا ہے ان میں سے ایک استفعل بمعنی طلب فعل ہے جس طرح کسی کا قول استحملته یعنی میں نے اس سے لادنے کا مطالبہ کیا، اور بمعنی اعتقد بھی ہے جس طرح ان کا قول: استسهلت هذا الامر یعنی میں نے اس کے آسان ہونے کا اعتقاد رکھا یا میں نے اس کو آسان پایا اور استعظمته یعنی میں نے اس کے عظیم ہونے کا اعتقاد رکھا اور اس کو عظیم پایا، اور اسی سے استفعلت بمعنی اصبت ہے جس طرح ان کا قول: استجدته یعنی میں نے اس کو عمدہ پایا، اور اسی سے بمعنی فعل ہے جس طرح اس کا قول قربی المکان واستقر یعنی وہ مکان میں قرار پذیر ہوا اور اس نے قرار چاہا، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یستھزؤن اور یستسخرون اسی قبیل سے ہے پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا (کا معنی ہوگا) اس نے تمہیں اس کی آبادی کے لیے پیدا فرمایا۔ استجدته اور استسهلته کے معنی پر نہیں یعنی میں نے اسے عمدہ اور سہل طریقے سے پالیا۔ یہ خالق کی طرف سے محال ہے تو یہ اس طرف راجع ہوگا کہ اس نے پیدا فرمایا، کیونکہ یہ (پیدا کرنا) اس کا فائدہ ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو مجازاً اس کے فائدہ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی آبادی کی طلب ہے کیونکہ یہ لفظ اس (اللہ تعالیٰ کی ذات) کے حق میں جائز نہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے اس کی آبادی کو چاہا پس وہ استفعل کے لفظ کے ذریعے اسے لایا۔ اور یہ قول کے ذریعے اپنے سے کم مرتبہ ذات سے فعل کی استدعا ہے جب کہ یہ امر ہو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 478 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 479 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1059

اور جب ادنیٰ کی طرف سے اعلیٰ سے عقل کا مطالبہ ہو تو وہ رغبت ہوتی ہے۔

میں نے کہا: استفعل بمعنی افعل ذکر نہیں کیا گیا جس طرح کے استوقد بمعنی اوقد ہے اور ہم نے اسے ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں اسکان اور عمری پر دلیل ہوگی۔ سورۂ بقرہ میں سکنی اور رقبیٰ کے بارے میں قول گزر گیا ہے۔ جہاں تک عمریٰ کا تعلق ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے جس کے بارے میں تین اقوال ہیں (۱) کہ یہ معمر (عمریٰ کرنے والا) کی زندگی میں گردن (ذات) کے منافع کا مالک بنانا ہے اس کی عمر کی مدت میں پس اگر وہ اس کی انتہا کو ذکر نہ کرے اور معمر فوت ہو جائے تو یہ اسی کے پاس واپس آ جائے گا جس نے اس کو دیا تھا یا اس کے ورثاء کے لیے ہوگا، یہ قاسم بن محمد، یزید بن قسیط اور لیث بن سعد کا قول ہے۔ یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے اور امام شافعی کے اقوال میں سے ایک ہے، اس قول کی دلیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

2۔ یہ گردن (ذات) اور اس کے منافع کا مالک بنانا ہے اور یہ نافذ شدہ ہبہ ہے جو واہب کی طرف واپس نہ ہو سکے گا یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی ان دونوں کے اصحاب، ثوری، حسن ابن حی، امام احمد بن حنبل، ابن شبرمۃ اور ابو عبید کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: جس نے عمریٰ کیا کسی بندے کو اس کی زندگی کا تو یہ اس کی زندگی میں اس کا ہوگا اور اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کے لیے ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی گردن کا مالک بن چکا ہے اور دینے والے کا زندگی اور عمر کی شرط لگانا باطل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمریٰ جائز ہے''، اور ''عمریٰ اس کے لیے ہے جس کو ہبہ کیا گیا'' (1)۔ (۳) اگر اس نے ''عمرت'' کہا اور اس کے جانشین کا ذکر نہ کیا تو یہ پہلے قول کی طرح ہے اور اگر اس نے عمرك لعقبك کہا تو یہ دوسرے قول کی طرح ہے۔ یہی زہری، ابو ثور، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن اور ابن ابی ذئب نے کہا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا اور یہی مؤطا میں ان کے قول کا ظاہر ہے۔ آپ سے اور آپ کے اصحاب سے (جس کے لیے عمریٰ کیا گیا) معروف یہ ہے کہ معمر کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جب معمر کی اولاد ختم ہو جائے اگر معمر (عمریٰ کرنے والا) زندہ ہو ورنہ اس کی طرف جو اس کے ورثاء میں سے زندہ ہو اور اس کی میراث کا لوگوں میں زیادہ حق دار ہو۔ امام مالک اور آپ کے اصحاب کے نزدیک معمر (جس کے لیے عمریٰ کیا گیا) عمریٰ کے لفظ کے ذریعے اشیاء میں سے کسی چیز کی گردن کا مالک نہیں بنے گا، عمریٰ کے لفظ سے وہ منفعت کا مالک ہوگا نہ کہ گردن کا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے وقف شدہ چیزوں کے بارے میں بھی کہا ہے: جب کسی نے کوئی چیز کسی آدمی کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے وقف کی تو وہ اس کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور اگر کسی معین آدمی کے لیے اس کی زندگی میں وقف کیا تو وہ رجوع کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح عمریٰ بھی ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے یہی مؤطا کا ظاہر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی نے کسی آدمی اور اس کی اولاد کے لیے عمریٰ کیا، اس نے کہا یہ میں نے تجھے اور تیری اولاد کو دیا جو تم میں سے بچ گیا تو یہ اس کے لیے ہوگا جس کو عطا کیا گیا اور یہ (عمریٰ) اپنے مالک کی طرف نہیں لوٹے گا اس وجہ سے کہ اس نے یہ ایسی عطا کی ہے جس میں وراثت واقع ہوگی'' (2)، اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الھبۃ، ما قیل العمریٰ والرقبیٰ، جلد 1، صفحہ 357　2۔ صحیح مسلم، کتاب الھبۃ، العمریٰ، جلد 2، صفحہ 38

انہی سے ہے کہ انہوں نے کہا: وہ عمریٰ جس کو رسول اللہ ﷺ نے جائز قرار دیا وہ یہ ہے کہ وہ کہے: یہ تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے ہے اور اگر اس نے کہا: یہ تیرے لیے ہے جب تک تو زندہ رہے تو یہ (عمریٰ) اپنے مالک کے پاس لوٹ جائے گا۔ معمر نے کہا اس پر زہری فتویٰ دیا کرتے تھے (1)۔

میں (قرطبی) نے کہا: قرآن کا معنی دوسرے قول والوں کے ساتھ چلتا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: وَاسْتَعْمَرَكُمْ یعنی اعمرکم پس نیک آدمی نے اس میں اپنی زندگی کی مدت نیک عمل اور اپنی موت کے بعد ذکر جمیل اور عمدہ تعریف کے ذریعے عمریٰ کیا اور فاجر آدمی نے اس کے برعکس (عمریٰ کیا) پس دنیا ان دونوں کے لیے زندگی اور موت کے اعتبار سے ظرف ہے۔ کہا جاتا ہے: بے شک عمدہ تعریف اولاد کے قائم مقام ہے۔ تنزیل میں وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (الشعراء) سے مراد عمدہ تعریف ہے، کہا گیا ہے، وہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (الصافات) اور ہم نے بنا دیا فقط ان کی نسل کو باقی رہنے والا اور فرمایا: وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (الصافات) اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاسْتَغْفِرُوْهُ یعنی اس سے بتوں کی عبادت سے مغفرت کا سوال کرو۔ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ یعنی اس کی عبادت کی طرف رجوع کرو۔ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ یعنی جواب دینے کے قریب اس آدمی کے لیے جو اس سے دعا مانگے، سورۂ بقرہ میں اللہ کے ارشاد فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (البقرہ: 186) میں گفتگو گزر چکی ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝

"انہوں نے کہا: اے صالح! تم ہی ہم میں (ایک شخص) تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں اس سے پہلے۔ کیا تم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الھبۃ، العمریٰ، جلد 2، صفحہ 38

روکتے ہو ہمیں اس سے کہ ہم عبادت کریں ان (بتوں) کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا۔ اور بے شک ہم اس امر کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا کی ہو مجھے اپنی جناب سے خاص رحمت تو کون ہے جو بچائے گا مجھے اللہ (کے عذاب سے) اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم تو نہیں زیادہ کرنا چاہتے میرے لیے سوا نقصان کے۔ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اسے کھاتی پھرے اللہ تعالیٰ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب بہت جلد۔ پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح نے فرمایا: لطف اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن تک یہ (اللہ کا) وعدہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے بچا لیا صالح کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ اپنی رحمت سے نیز (بچا لیا) اس دن کی رسوائی سے۔ بے شک (اے محبوب!) تیرا رب ہی بہت قوت والا بہت عزت والا ہے اور پکڑ لیا ظالموں کو ایک خوفناک کڑک نے اور صبح کی انہوں نے اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے گرے پڑے تھے۔ (انہیں یوں نابود کر دیا گیا) گویا وہ یہاں کبھی آباد ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے انکار کیا اپنے رب کا۔ سنو! بربادی ہو ثمود کے لیے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ یعنی اس سے پہلے ہم امید کرتے تھے کہ آپ ہی ہم میں سے سردار ہوں گے، یعنی آپ کے دعویٰ نبوت سے پہلے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام ان کے معبودوں کو عیب کی طرف منسوب کرتے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ اور وہ آپ سے انہی کے دین کی طرف لوٹنے کی امید کرتے تھے، پس جب آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا تو انہوں نے کہا: ہماری تم سے وابستہ امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ اَتَنْهٰىنَآ استفہام ہے جس کا معنی انکار ہے۔ اَنْ نَّعْبُدَ یعنی (عن ان نعبد) اس بات سے کہ ہم عبادت کریں۔ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا، ان محل نصب میں ہے عن حرف جر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے۔ وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ سورۂ ابراہیم میں وانا ہے اور اصل میں واننا ہے تین نون ثقیل ہوئے پس تیسرے نون کو ساقط کر دیا۔ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ، خطاب حضرت صالح علیہ السلام کو ہے۔ سورۂ ابراہیم میں تدعوننا ہے کیونکہ مخاطب تمام رسول صلوات اللہ وسلامہ علیہم ہیں۔ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ یہ اربتہ فأنا أریبہ سے ہے جب تو کوئی ایسا کام کرے جو تیرے پاس بے چینی کو ثابت کر دے۔ ہذلی نے کہا:

كنتُ إذا أتوتُه من غَيْبِ يَشُمُّ عِطْفِي و يَبُزُّ ثَوْبِي
كأنما أربتُه بِرَيْبِ

اللہ تعالیٰ کا فرمان: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً اس کا معنی حضرت نوح علیہ السلام کے قول میں گزر چکا ہے۔ فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ استفہام ہے جس کا معنی نفی ہے یعنی کوئی بھی اس کی طرف سے میری مدد نہیں کرے گا اگر میں نے اس کی نافرمانی کی۔ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ یعنی گمراہی اور بھلائی سے دور۔ فراء کا

یہی قول ہے اور نقصان ان (کفار) کے لیے ہے نہ کہ آپ علیہ السلام کے لیے گویا کہ آپ نے یوں کہا: سوائے تمہارے لیے نقصان کے نہ کہ میرے لیے۔ اور کہا گیا: اپنے خسارے کو دیکھے بغیر اپنے آباء کے دین کے ذریعے حجت پکڑنے میں تم میرے لیے زیادہ نہیں کرتے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ مبتدا اور خبر ہے۔ لَكُمْ اٰيَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور عامل ھذہ میں تنبیہ یا اشارہ کا معنی ہے۔ اور کہا گیا: نَاقَةُ اللّٰهِ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس (اونٹنی) کو ان کے لیے پہاڑ سے نکالا ان کے مطالبہ پر، اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائیں گے۔ ایک قول یہ ہے: حجر کے ایک طرف صماء کی منفرد چٹان سے اللہ تعالیٰ نے اسے نکالا جس کو کاثبہ کہا جاتا ہے، جب اونٹنی نکلی ان کے مطالبہ پر تو ان کو اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً، فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ، امر اور جواب امر ہے، فَذَرُوْهَا سے نون کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ یہ امر ہے اور وذر اور واذر نہیں کہا جاتا مگر شاذ اور نحویوں کے اس میں دو قول ہیں، سیبویہ نے کہا: (واو) کو چھوڑ کر اس سے مستغنی ہو گئے اور کسی اور نے کہا: جب واؤ ثقیل تھی اور کلام میں اس کے معنی کا فعل بھی تھا جس میں واؤ نہیں تو انہوں (نحویوں) نے اس کو لغو کر دیا، ابو اسحاق زجاج نے کہا: تاکل، کا رفع بھی جائز ہے حال اور جملہ مستانفہ ہونے کی بنیاد پر۔ وَلَا تَمَسُّوْهَا نہی کی وجہ سے مجزوم ہے۔ بِسُوْٓءٍ فراء نے کہا: کونچ کاٹنے کے ذریعے۔ فَيَاْخُذَكُمْ نہی کا جواب ہے۔ عَذَابٌ قَرِيْبٌ یعنی اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹنے کے قریب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ۔ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَعَقَرُوْهَا اس کی کونچیں تو ان میں سے بعض نے کاٹیں اور اس کو تمام کی طرف منسوب کر دیا گیا کیونکہ یہ باقی لوگوں کی رضامندی سے تھا۔ اور اس کی کونچوں کے کاٹنے کے بارے میں سورۂ اعراف میں کلام گزر گیا ہے اور آئے گا بھی۔ فَقَالَ تَمَتَّعُوْا یعنی ان کو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: تم لطف اندوز ہو لو، یعنی عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ عزوجل کی نعمتوں کے ذریعے۔ فِيْ دَارِكُمْ، فی بلادکم مراد ہے یعنی اپنے شہر میں، اگر آپ دار سے گھر مراد لیتے تو آپ دورکم فرماتے۔ ایک قول یہ ہے: یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے گھر اور اپنی رہائش گاہ میں لطف اندوز ہو لے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر: 67) یعنی ہر ایک بچہ۔ اور زندگی کے ساتھ لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کو تعبیر کیا، کیونکہ میت نہ لذت حاصل کرتی ہے اور نہ کسی چیز کے ساتھ لطف اندوز ہوتی ہے۔ بدھ کے دن کونچیں کاٹی گئیں، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے دن وہ رہے اور اتوار کے دن ان پر عذاب آیا۔ وہ تین دن مقیم رہے، کیونکہ اس اونٹنی نے تین بار آواز نکالی تھی جیسا کہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ پہلے دن ان کے رنگ زرد ہو گئے، پھر دوسرے دن سرخ ہو گئے اور پھر تیسرے دن سیاہ ہو گئے اور چوتھے دن وہ ہلاک ہو گئے، سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء مالکیہ نے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم سے تین دن اللہ کے عذاب کو مؤخر کرنے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جب مسافر چار راتوں کی اقامت نہ کرے تو وہ قصر کرے گا، کیونکہ تین دن اقامت کے حکم سے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 480

خارج ہیں، اس سلسلہ میں علماء کے جو اقوال ہیں وہ سورۂ نساء میں گزر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ یعنی مکذوب بمعنی کذب ہے ایک قول یہ بھی ہے: غیر مکذوب فیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا یعنی ہمارا عذاب نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا یہ گزر چکا ہے۔ وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ یعنی اور ہم نے ان کو نجات دی اس دن کی رسوائی سے، یعنی اس کی رسوائی اور ذلت سے۔ کہا گیا ہے: واؤ زائدہ ہے یعنی ''نجيناهم من خزی يومئذ'' ہے کہ ہم نے ان کو اس دن کی رسوائی سے نجات دی۔ سیبویہ اور اہل بصرہ کے نزدیک اس کو زائد کرنا جائز نہیں اور کوفیوں کے نزدیک لما اور حتی کے ساتھ اس کو زائد کرنا جائز ہے ان کے علاوہ نہیں۔ نافع اور کسائی نے یومئذ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یوم کی اذ کی طرف اضافت کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: ہم سے ابوزید نے ابوعمرو سے بیان کیا کہ اس نے ومن خزی یومئذ پڑھا یعنی اس نے یا کو یا میں ادغام کیا اور مضاف کیا اور یومئذ میں میم کو کسرہ دیا۔ نحاس نے کہا: جس کو سیبویہ اور ان کے قریب قریب والے نحوی ابوعمرو سے اس قسم کی قراءت روایت کرتے ہیں وہ اخفاء ہے جہاں تک ادغام کا تعلق ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ التقاء ساکنین ہے اور زا کا کسرہ جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ یعنی چوتھے دن میں ان پر چنگھاڑ ہوئی تو وہ مر گئے اور (اخذ) کو مذکر ذکر کیا کیونکہ الصحیۃ اور الصیاح ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ جبریل امین کی چیخ تھی۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ آسمان سے ایک چنگھاڑ آئی تھی جس میں ہر بجلی کی کڑک اور زمین کی ہر چیز کی آواز تھی پس ان کے دل پھٹ گئے اور وہ مر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فرمایا اور سورۃ اعراف میں فاخذتهم الرجفة فرمایا، اس کا بیان وہاں گزر چکا ہے۔ تفسیر میں ہے، جب انہیں عذاب کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ایک دوسرے کو کہا: اگر اچانک عذاب آ گیا تو تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا پھر ہم کیا کریں گے؟ پس انہوں نے اپنی تلواریں، نیزے اور اپنے جتھے لے لیے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ ہزار قبیلے تھے، ہر قبیلہ میں بارہ ہزار جنگجو تھے۔ وہ راستوں اور چوراہوں پر کھڑے ہو گئے، ان کا گمان تھا کہ وہ عذاب سے لڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو حکم دیا جو سورج کے ساتھ موکل ہے کہ وہ ان کو اپنی گرمی کا عذاب دے پھر ان پر اس کا کم از کم عذاب یہ تھا کہ ان کے ہاتھ جل گئے اور پیاس سے ان کی زبانیں ان کے سینوں پر لٹک گئیں اور جو جانور وغیرہ ان کے پاس تھے وہ مر گئے اور چشموں کا پانی جوش سے ابلنے لگا یہاں تک کہ وہ آسمان تک پہنچ گیا، وہ جس چیز پر گرتا اس کو اپنی گرمی کی شدت سے ہلاک کر دیتا۔ اسی طرح جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ وہ ان کی روحوں کو قبض نہ کرے ان کو عذاب دینے کے لیے یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے (1)۔ وہ مٹی کے ساتھ اس پرندے کی طرح چمٹ گئے جو اپنا سینہ زمین پر لگا دے۔ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 481

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ۝

"اور بلاشبہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتہ) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر انہوں نے کہا: (اے خلیل!) آپ پر سلام ہو۔ آپ نے فرمایا: تم پر بھی سلام ہو۔ پھر آپ جلدی لے آئے (ان کی ضیافت کے لیے) ایک بچھڑا بھنا ہوا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے، فرشتوں نے کہا: ڈریئے نہیں، ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف۔ اور آپ کی اہلیہ (سارہ پاس) کھڑی تھیں وہ ہنس پڑیں تو ہم نے خوشخبری دی سارہ کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى یہ حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ ہے اور وہ قرابت کے لحاظ سے حضرت ابراہیم کے چچا کے بیٹے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں شام کے نواح میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بستیاں فلسطین کے شہروں میں تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کو اتارا تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرے اور ان کے پاس مہمان بنے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو بھی مہمان بنتا آپ اس کی ضیافت بہت اچھے طریقے سے کرتے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت لے کر گزرے تو آپ نے انہیں مہمان سمجھا۔ جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: یہ نو فرشتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ گیارہ فرشتے تھے جو نہایت خوبصورت اور روشن چہروں والے جوانوں کی شکل میں تھے۔

بِالْبُشْرٰى ایک قول یہ ہے: بچے کی (خوشخبری) ایک قول یہ ہے: قوم لوط کی ہلاکت کی خوشخبری اور ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کو خوشخبری دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں (2)، اور یہ کہ آپ پر کوئی خوف نہیں۔ قَالُوْا سَلٰمًا یہ منصوب ہے اس پر فعل کے واقع ہونے کی وجہ سے، جس طرح آپ کہتے ہیں: قالوا خیرا انہوں نے اچھی بات کہی۔ یہ طبری کا اختیار کردہ قول ہے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ (الکہف: 22) کا تعلق ہے، اس میں ثلاثۃ اسم ہے مقولہ نہیں۔ اور اگر دونوں کو رفع دیا جائے یا دونوں کو نصب دیا جائے قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ تو لغت عرب میں جائز ہے۔ ایک قول یہ ہے: مصدر ہونے کی وجہ سے نصب دی گئی۔ ایک قول یہ ہے: قَالُوْا سَلٰمًا یعنی انہوں نے آپ کو صحیح قول کے ذریعے مخاطب کیا۔ جس طرح فرمایا: وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ (الفرقان) یعنی صحیح بات۔ پس سلاماً ان کے قول کا معنی ہے نہ کہ اس کا لفظ، ابن عربی نے اس کو اس کا معنی کہا اور اسی کو اختیار کیا۔ ابن عربی نے کہا (3): کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے جب لفظ کے ذکر کا ارادہ فرمایا تو بعینہ یہ فرمایا پس فرشتوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد: 24) سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ (الزمر: 73) اور کہا گیا ہے: انہوں نے آپ کے لیے دعا کی اور معنی ہوگا سلمت سلاما، قَالَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 482
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1060

سَلٰمٌ اس کے رفع کی دو وجہیں ہیں: ایک مبتدا کے مضمر ہونے کے طور پر یعنی ھو سلام اور امری سلام اور دوسری (وجہ یہ ہے کہ) بمعنی سلام علیکم ہے جب اس کو تحیۃ کے معنی میں لیا جائے پس خبر کو مضمر کر دیا گیا اور سلام کو کثرت استعمال کی وجہ سے نکرہ ذکر کرنا جائز ہے۔ الف لام کو حذف کر دیا گیا جس طرح اللھم میں الف لام کو حذف کیا جاتا ہے اور سلم بھی پڑھا گیا ہے، فراء نے کہا: السلم اور السلام ایک ہی معنی میں ہیں جس طرح الحل اور الحلال (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ اَنْ بمعنی حتی ہے یہ بڑے بڑے نحویوں کا قول ہے، ابن عربی نے اسے بیان کیا۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی فما لبث حتی جاء یعنی بچھڑے کو لانے میں آپ نے سستی نہ کی۔ پس جب حرف جر کو حذف کیا گیا تو ان محل نصب میں باقی رہا۔ اور لبث میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کی ہے اور ما نافیہ ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور فراء نے کہا: فما لبث مجیئه یعنی اس کا آنا سست نہ ہوا۔ پس ان محل رفع میں ہے اور لبث میں کوئی ضمیر نہیں جب کہ ما نافیہ ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ما بمعنی الذی ہو اور لبث میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہو (یعنی اس کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں) اور ان جاء، ما کی خبر ہو یعنی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جلدی کی او وہ آپ کا بھنے ہوئے بچھڑے کو لانا ہے اور حنیذ بھنا ہوا۔ ایک قول یہ ہے: وہ پتھر کی گرمی کے ذریعے بھنا ہوا تھا آگ کا اس کو چھوئے بغیر۔

کہا جاتا ہے: حننت الشاۃ احنذھا حنذا یعنی میں نے اسے بھونا، اور میں نے اس کے اوپر گرم پتھر رکھا تاکہ وہ اسے بھون دے پس وہ بھنا ہوا ہے۔ اور حننت الفرس أحنذہ (کہا جاتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ تو اسے ایک یا دو چکر دوڑائے پھر اس کو دھوپ میں جل ڈال دے تاکہ اسے پسینہ آئے تو وہ محنوذ اور حنیذ کہلائے گا اور اگر اسے پسینہ نہ آئے تو اسے کبا کہا جائے گا۔ حنذ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے حنیذ سے مراد بال صاف کیا ہوا، بھنا ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر نے کہا: حنیذ سے مراد پکا ہوا گوشت ہے اور حنیذ بمعنی محنوذ ہے اور آپ بچھڑا لائے کیونکہ آپ کے مال میں گائے زیادہ تھیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں مہمان کے آداب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی ضیافت میں جلدی کی جائے پس جو اس وقت موجود اور میسر ہو وہ پیش کر دیا جائے پھر اس کے بعد اس کے علاوہ پیش کر دیا جائے اگر اس کو پیش کرنا ضروری ہو تو اسے اس چیز کا مکلف نہ بنایا جائے جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ ضیافت مکارم اخلاق، آداب اسلام اور انبیاء و صلحاء کے اخلاق میں سے ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے آدمی ہیں جنہوں نے ضیافت کی جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر گیا۔

عام اہل علم کے نزدیک یہ واجب نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ "ضیافت تین دن ہے اور اس کا جائزہ ایک دن اور ایک رات ہے جو اس کے بعد ہے تو وہ صدقہ ہے" (2) اور جائزہ سے مراد عطیہ اور وہ صلہ ہے جس کی اصل استحباب ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کی عزت کرنی چاہیے اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 82　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حق الضیف، جلد 2، صفحہ 906

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے"(1)۔ اور پڑوسی کا اکرام واجب نہیں تو ضیافت بھی اسی طرح ہوگی۔ واللہ اعلم۔ لیث اس کے وجوب کی طرف گئے ہیں نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے دلیل پکڑتے ہوئے لیلۃ الضیف حق (2) اور دیگر احادیث سے استدلال کرتے ہوئے۔

اس سلسلہ میں جو ہم نے اشارہ کیا وہ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔ ابن عربی نے کہا (3): یہ بہت سارے لوگوں کا قول ہے: ضیافت کا وجوب ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہوگیا۔ یہ ضعیف ہے، کیونکہ وجوب ثابت نہیں اور ناسخ وارد ہی نہیں ہوا۔ انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اس میں فاستضفناھم فابوا ان یضیفونا فلدغ سید ذالک الحیی (4) الحدیث کے الفاظ ہیں یعنی ہم نے ان کا مہمان بننا چاہا تو انہوں نے ہمیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا تو اس گاؤں کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ روایت اس بات میں ظاہر ہے کہ اگر ضیافت لازم ہوتی تو نبی کریم ﷺ ضیافت سے انکار کرنے والے لوگوں کو ضرور ملامت فرماتے اور ان کے سامنے اس کو ضرور بیان فرماتے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے؟ امام شافعی اور محمد بن عبد الحکیم اس جانب گئے ہیں کہ اس کے مخاطب شہری اور دیہاتی لوگ ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: شہری لوگوں پر ضیافت نہیں۔ سحنون نے کہا: ضیافت صرف دیہاتیوں پر ہے جہاں تک شہریوں کا تعلق ہے تو شہروں میں مسافر ہوٹلوں میں آتے ہیں۔

انہوں نے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دلیل پکڑی انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ضیافت دیہاتی لوگوں پر ہے اور شہریوں پر نہیں"۔ یہ حدیث صحیح نہیں، ابراہیم بن اخی عبد الرزاق متروک الحدیث اور جھوٹ کی طرف منسوب ہے اور یہ روایت ان روایات میں سے ہے جن کو اس نے اکیلا روایت کیا ہے اور اس کی وضع کی طرف منسوب ہے۔ یہ ابو عمر بن عبد البر کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: ضیافت درحقیقت فرض کفایہ ہے، کسی آدمی نے کہا: یہ دیہاتوں میں واجب ہے جہاں کوئی کھانا اور ٹھکانا نہیں ہوتا، بخلاف شہروں کے کیونکہ یہ تو ٹھکانوں اور کھانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان کریم ہے اور ضیافت کرامت ہے، پس اگر وہ اجنبی ہو تو یہ فرض ہوگی (5)۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت تھوڑی تھی پس حبیب نے حبیب کی طرف سے اس کا شکر ادا کیا۔ یہ قطعیت کے مقام پر ظنیت اور نقل کی جگہ قیاس کے ذریعے فیصلہ ہے، ان کو کہاں سے پتہ چلا کہ وہ تھوڑی تھی؟ بلکہ مفسرین نے نقل کیا کہ فرشتے تین تھے، جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام اور تین کی خاطر بچھڑا تو بہت زیادہ ہے، پس کتاب اللہ کی یہ تفسیر رائے کے ساتھ کیسی ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی امانت کی قسم! یہی وہ تفسیر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حق الضیف، جلد 2، صفحہ 906

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، ما جاء فی الضیافۃ، جلد 2، صفحہ 170 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1061

4۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، ما یعطی فی الرقیۃ علی احیاء، جلد 1، صفحہ 304 5۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 1062

مذموم ہے پس اس سے اجتناب کرو، پس تم نے اس کو جان لیا(1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ سنت یہ ہے کہ جب مہمان کو کھانا پیش کیا جائے تو پیش کرنے والا کھانے میں جلدی کرے پس مہمان کی تکریم پیش کرنے میں جلدی کرنا ہے اور گھر والے کی تکریم اس کے قبول کرنے میں جلدی کرنا ہے۔ پس جب انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اجنبی خیال کیا، کیونکہ وہ عادت سے نکل گئے اور انہوں نے معمول کی مخالفت کی۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی ناپسندیدہ بات ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں موجود (نوک اور پر کے بغیر) تیروں کے ذریعے غور و فکر کرتے ہوئے گوشت کو کرید رہے تھے اور ان کے ہاتھ گوشت تک نہیں پہنچ رہے تھے تو آپ نے جب ان کی طرف سے یہ دیکھا تو **نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً** یعنی دل میں، اور ایک قول ہے: آپ نے محسوس کیا، وجوس سے مراد دخول ہے۔ شاعر نے کہا:

جاء البريدُ بقرطاسٍ يَخُبُّ به　　　فأوجسَ القلبُ من قرطاسهٖ جزعًا(2)

خِيْفَةً یعنی دہشت زدہ ہونا اور وہ جب مہمان کو نہ کھاتے ہوئے دیکھتے تو اس کو برا سمجھتے تھے تو فرشتوں نے کہا: **لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ** ڈریے نہیں ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف۔

مسئلہ نمبر 6۔ کھانے کے آداب میں سے ہے کہ میزبان کو اپنے مہمان کے بارے میں دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ کھا رہا ہے یا نہیں؟ یہ کام توجہ اور اچٹتی نظر ڈالنے سے ہونا چاہیے نہ کہ نظر گاڑ دینے سے، بیان کیا گیا ہے کہ ایک بدوی نے سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ کھانا کھایا، سلیمان نے بدوی کے لقمے میں بال دیکھ لیا تو اسے کہا: بال کو اپنے لقمے سے ہٹایئے۔ اس (بدوی) نے کہا: کیا تو میری طرف اس آدمی کی طرح دیکھ رہا ہے جو میرے لقمے میں بال کو دیکھتا ہے؟ (یعنی اتنی توجہ سے دیکھ رہا ہے) اللہ کی قسم میں تیرے ساتھ نہیں کھاؤں گا۔

میں (قرطبی) نے کہا: ذکر کیا گیا ہے کہ یہ قصہ ہشام بن عبدالملک کے ساتھ ہوا نہ کہ سلیمان کے ساتھ اور بدوی اس کے پاس سے یہ کہتا ہوا نکلا:

وللموتُ خيرٌ من زيارة باخلٍ　　　يلاحظُ أطرافَ الأكيلِ على عَمْدِ

''موت بہتر ہے ایسے بخیل کی زیارت سے جو کھانے والے کی اطراف کو جان بوجھ کر ملاحظہ کرتا ہے''۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ**، نکر بمعنی انکر ہے یعنی آپ نے ان کو نہ جانا، آپ کہتے ہیں: نکرتك وانكرتك واستنكرتك جب آپ اسے وعدہ خلافی پر پائیں۔ شاعر نے کہا:

وأنكرتني وما كان الذي نكرتْ　　　من الحوادث إلا الشيبَ والصَّلَعَا

دونوں لغتوں کو جمع کر دیا گیا اور نکرت اس کے لیے ہے جسے تو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھے اور انکرت اس کے لیے ہے جسے تو اپنے دل کے ساتھ دیکھے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 1063　　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 283

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ مبتدا اور خبر ہے۔ یعنی وہ کھڑی فرشتوں کو دیکھ رہی تھی، کہا گیا ہے: وہ پردے کے پیچھے تھی۔ ایک قول یہ ہے: وہ فرشتوں کی خدمت کر رہی تھی اور آپ (ابراہیم علیہ السلام) بیٹھے تھے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: وہ کھڑی نماز پڑھ رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں (1)۔ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ و ھو قاعد ہے (یعنی آپ کی بیوی کھڑی تھی اور آپ بیٹھے تھے)

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَضَحِكَتْ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس کو حیض آیا (2)، حالانکہ وہ آیسہ تھی، بشارت کو ثابت کرنے کے لیے، اس پر لغویوں نے شعر پڑھا:

وإنی لآتی العِرسَ عند طُهورها وأهجُرها یوماً إذا تَكُ ضاحِكَا

دوسرے نے کہا:

وضِحْكُ الأرانبِ فوق الصَّفَا كمثْلِ دمِ الجوفِ یوم اللِّقاء(3)

اور عرب کہتے ہیں: ضحکت الأرنب جب اسے حیض آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ سے روایت ہے کہ یہ عربوں کے قول ضحکت الکافورة سے لیا گیا ہے۔ اور یہ اس گابھے کا چھلکا ہے جب وہ پھٹ جائے۔

بعض لغویوں نے کلام عرب میں ضحکت بمعنی حاضت ہونے کا انکار کیا ہے اور جمہور نے کہا: یہ ضحک معروف ہے اور اس میں ان کا اختلاف ہے۔ ایک قول ہے: وہ تعجب کا ہنسنا ہے ابو ذؤیب نے کہا:

فجاءَ بمزجٍ لم یَرَ النَّاسُ مثلَه هو الضَّحْكُ إلا أنه عمل النَّحْلِ(4)

مقاتل نے کہا: وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف سے ہنسی اور تین آدمیوں کی جماعت کے سبب آپ سے لرز اٹھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے سو آدمی کے قائم مقام تھے۔ اس نے کہا: لغت میں ضحک سے مراد حیض لینا درست نہیں، ابو عبید اور فراء نے اس کا انکار کیا، فراء نے کہا: میں نے یہ کسی ثقہ آدمی سے نہیں سنا، یہ صرف کنایہ ہے۔ روایت میں ہے کہ فرشتوں نے بچھڑے پر ہاتھ پھیرا۔ آپ علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنی ماں کے پاس چلے گئے، اس وقت حضرت سارہ ہنسیں تو انہوں نے آپ (حضرت سارہ) کو اسحاق کی خوشخبری دی۔ کہا جاتا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے مہمانوں کی تکریم کا ارادہ کیا تو سارہ کو ان کی خدمت کے لیے کھڑا کیا، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ ہے یعنی وہ ان کی خدمت کے سلسلہ میں کھڑی ہوئی اور کہا جاتا ہے: قَآىِٕمَةٌ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی وجہ سے۔ فَضَحِكَتْ یعنی ان کے قول لَا تَخَفْ کی وجہ سے امن کی وجہ سے خوش ہوتے ہوئے ہنسی۔ فراء نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی یہ ہے: پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوشخبری دی تو وہ ہنس پڑی یعنی بچے کی وجہ سے خوش ہوتے ہوئے ہنسی اس حال میں کہ وہ بوڑھی تھی، اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ (ہنسنا) کس وجہ سے تھا۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں کئی اقوال ہیں: ان میں سے سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ جب انہوں نے نہ کھایا آپ علیہ السلام نے ان کو نہ پہچانا اور ان سے خوف زدہ ہوئے پھر جب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 484 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

انہوں نے کہا: آپ نہ ڈریئے اور انہوں نے آپ کو خبر دی کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں تو آپ اس وجہ سے خوش ہوئے، پس آپ کی بیوی بھی آپ کی خوشی کی وجہ سے خوش ہو کر ہنسی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس (سارہ) نے آپ کو کہا تھا میرا گمان ہے کہ یہ لوگ عنقریب ان پر عذاب لے کر آئیں گے پس وہ حضرت لوط علیہ السلام کو آپ سے ملا دے گا، پس جب فرشتے وہ لے آئے جو اس نے کہا تو وہ اس کی وجہ سے خوش ہوئی اور ہنس پڑی۔ نحاس نے کہا: اگر اس کی سند صحیح ہے تو یہ حسن ہے۔ ضحاک دانتوں کا ظاہر ہونا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضحک چہرے کا روشن ہونا ہو آپ کہتے ہیں: رایت فلانا ضاحکا تو اس سے مراد ہے مشرقا اور أتيت على روضة تضحك یعنی مشرقة، حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ بادلوں کو بھیجتا ہے فیضحك احسن الضحك نبی کریم ﷺ نے بجلی سے اس کے روشن ہونے کو ضحک بنا دیا۔ یہ کلام مستعار ہے۔ (اس میں استعارہ ہے) مکہ کے قراء میں سے ایک آدمی سے روایت ہے جس کو محمد بن زیاد اعرابی کہا جاتا ہے۔ فضحكت حا کے فتحہ کے ساتھ۔ مہدوی نے کہا: فضحكت میں حا کا فتح غیر معروف ہے اور ضَحِكَ يَضْحَكُ، ضَحْكًا و ضِحكًا و ضِحِكًا و ضَحِكًا چار لغتیں ہیں اور الضُّحْكَة سے مراد ایک مرتبہ کا ہنسنا ہے۔ اسی سے کثیر کا قول ہے:

غَلِقَت لضَحْكَتِهِ رِقابُ المالِ

یہ جوہری نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام مسلم نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ابو اسید ساعدی نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی شادی کے ولیمہ میں دعوت دی۔ اس کی بیوی اس دن ان کی خدمت کرنے والی تھی حالانکہ وہ دلہن تھی۔ حضرت سہل نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو کیا پلایا؟ کیا اس نے آپ ﷺ کے لیے رات کے وقت کھجوروں کا رس نکالا تو ر (برتن جس میں عربی پیتے تھے) میں، پس جب آپ نے تناول فرمایا تو اس نے وہی رس آپ کو پلایا(1)۔ امام بخاری نے اس کو روایت کیا ہے(2) اور اس کا عنوان باندھا باب قيام المراة على الرجال في العرس وخدمتهم بالنفس ہمارے علماء نے کہا: اس میں بیوی کا اپنی شادی کے موقع پر اپنے شوہر اور اس کے دوستوں کی خدمت کا جواز ہے۔ اور اس میں یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنے اہل (بیویاں) کو اپنے نیک دوستوں کے سامنے پیش کرے اور ان سے ان (دوستوں) کی خدمت لے، یہ احتمال بھی ہے کہ یہ پردہ کے نزول سے پہلے ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ طبری نے ذکر کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بچھڑا پیش کیا تو انہوں نے کہا: ہم کھانا بغیر قیمت کے نہیں کھاتے۔ تو آپ نے ان کو کہا: اس کی قیمت یہ ہے کہ تم اس کی ابتدا میں اللہ کا ذکر کرو اور اس کے آخر میں اس کی حمد کرو۔ جبریل امین نے اپنے اصحاب کو کہا: حق کی قسم اللہ نے اس کو خلیل بنایا(3)۔ ہمارے علماء نے کہا: انہوں نے نہ کھایا کیونکہ فرشتے نہیں کھاتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لیے اس بات کو آسان بنا دیا ہے کہ وہ جسم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، اباحة النبيذ، جلد 2، صفحہ 168
2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حق اجابة الوليمه، جلد 2، صفحہ 778
3۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 86

اور ہیئت کے اعتبار سے آدمی کی شکل اختیار کرلیں اس نے ان کے لیے کھانا کھانا بھی آسان بنا دیا ہو، مگر یہ کہ علماء کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو آدمی کی صفت پر بھیجا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ضیافت کا مکلف بنایا یہاں تک کہ جب آپ نے توقف کو دیکھا اور ڈر رہے تو اچانک وہ آپ کے پاس خوشخبری لے آئے۔

مسئلہ نمبر 12۔ یہ (آیت) اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کھانے کی ابتدا میں بسم اللہ اور اس کے آخر میں الحمد للہ ہم سے پہلی امتوں میں بھی مشروع رہا، اسرائیلیات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے کھانا تناول نہیں فرماتے تھے، جب کھانا حاضر ہوتا تو آپ کسی کو بھیجتے جو پوچھتا کہ آپ کے ساتھ کون کھانا کھائے گا؟ تو وہ ایک دن ایک آدمی کو ملا، جب وہ آپ کے ساتھ کھانے پر بیٹھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے فرمایا: بسم اللہ پڑھو، آدمی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ اللہ کون ہے؟ آپ نے اسے فرمایا: میرے کھانے سے نکل جا، جب وہ نکل گیا تو آپ پر جبرئیل امین نازل ہوئے، اس نے آپ کو کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ اس کو اس کی ساری عمر اس کے کفر کے باوجود رزق دیتا رہا اور آپ نے ایک لقمہ کا بخل کیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پریشان حال نکلے اس حال میں کہ اپنی چادر کو کھینچ رہے تھے اور فرمایا: لوٹ آ، اس نے کہا: میں نہیں لوٹوں گا یہاں تک کہ تو مجھے خبر دے کہ تو مجھے بغیر کسی سبب کے کیوں واپس لوٹا رہا ہے؟ آپ نے اس کو معاملہ کے بارے میں خبر دی۔ تو اس نے کہا: یہ کریم پروردگار ہے، میں اس پر ایمان لایا، اور وہ داخل ہوا اور اس نے بسم اللہ پڑھی اور حالت ایمان میں کھانا کھایا۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ جب حضرت ہاجرہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا پیدا ہوا تو حضرت سارہ نے خواہش کی کہ اس کا بھی بیٹا ہو اور وہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے مایوس ہو چکی تھی، تو انہوں نے ایسے بیٹے کی خوشخبری دی جو نبی ہوگا اور نبی کو پیدا کرے گا، تو یہ اس (سارہ) کے لیے خوشخبری تھی کہ وہ اپنے پوتے کو دیکھے گی۔

مسئلہ نمبر 14۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ حمزہ اور عبد اللہ بن عامر نے یعقوب نصب کے ساتھ پڑھا اور باقیوں نے اس کو مرفوع پڑھا۔

رفع اس معنی کی بنیاد پر ہوگا: ویحدث لھا من وراء اسحق یعقوب یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل کی وجہ مرفوع ہو جو من میں عامل ہے گویا کہ معنی یہ ہوگا: وثبت لھا من وراء اسحق یعقوب یہ جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، اور یہ حال کے مقام پر ہو، یعنی بشرھا باسحق مقابلا لہ یعقوب اور نصب اس معنی پر ہوگی: ووھبنا لھا من وراء اسحق یعقوب، کسائی، اخفش اور ابوحاتم نے اس بات کو جائز قرار دیا کہ یعقوب محل جر میں ہو اس معنی کی بنیاد پر وبشرناھا من وراء اسحق بیعقوب۔ فراء نے کہا: جر جائز نہیں مگر حرف جر کے اعادے کے ساتھ، سیبویہ نے کہا اگر آپ کہیں مررت بزید أول من أمس وأمس عمرو تو یہ قبیح اور غلط ہوگا کیونکہ آپ نے مجرور اور جو اس کے ساتھ شریک ہے اور وہ واؤ ہے اس میں تفریق کردی جس طرح آپ جار اور مجرور کے درمیان تفریق کرتے ہیں، کیونکہ جار اور مجرور کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی جار اور واؤ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝

''سارہ نے کہا: وائے حیرانی! کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے میاں ہیں یہ بھی بوڑھے ہیں، بلاشبہ یہ تو عجیب وغریب بات ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰوَیْلَتٰۤی زجاج نے کہا: اس کی اصل یا ویلتی ہے۔ یا کو الف سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ یا اور کسرہ سے زیادہ خفیف ہے، اس نے ویل کے ساتھ اپنے لیے بددعا کا ارادہ نہیں کیا بلکہ یہ ایک کلمہ ہے جو عورتوں کی زبان پر آتا ہے جب ان پر کوئی ایسی چیز طاری ہو جس سے وہ حیران ہوں، اور (سارہ) اس کی ولادت اور اپنے میاں کے بوڑھے ہونے کی وجہ سے حیران ہوئیں کیونکہ یہ عادت کے خلاف تھا، اور ہر وہ کام جو عادت سے خارج ہو وہ عجیب وغریب سمجھا جاتا ہے (1)۔ اور ءَاَلِدُ یہ استفہام ہے اس کا معنی تعجب ہے۔ وَاَنَا عَجُوْزٌ یعنی بوڑھی۔ ولقد عجزت تعجز عجزا و عجزت تعجیزا یعنی وہ بڑھاپے میں داخل ہوئی۔ اور عجوزۃ بھی کہا جاتا ہے۔ اور عجزت المراۃ جیم کے کسرہ کے ساتھ، (کہا جاتا ہے) جس کی سرین بڑھ جائے یہ عُجُزا اور عَجَزا دونوں طرح آتا ہے۔

مجاہد نے کہا: وہ ننانوے سال کی تھیں، ابن اسحاق نے کہا: وہ نوے سال کی تھیں، اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هٰذَا بَعْلِیْ یعنی میرا شوہر، شَیْخًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور اس میں عامل تنبیہ یا اشارہ ہے۔ وَهٰذَا بَعْلِیْ مبتدا اور خبر ہے اخفش نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی کی قراءت میں وهذا بعلی شیخ ہے۔ نحاس نے کہا: جس طرح آپ کہتے ہیں: هذا زید قائم۔ تو زید، هذا سے بدل ہے اور مبتدا کی خبر کے قائم مقام ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ هذا مبتدا اور زید قائم دونوں خبریں ہوں، سیبویہ نے حکایت کیا: هذا حلو حامض اور کہا گیا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک سو بیس سال کے تھے، ایک قول یہ ہے: سو سال کے تھے۔ مجاہد کے قول کے مطابق آپ حضرت سارہ سے ایک سال زائد عمر کے تھے، ایک قول یہ ہے کہ اس نے اپنے قول وَهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا کے ذریعے عذر پیش کیا حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی اور ہاران بن ناحور بن شاروع بن ارغو بن فالغ کی بیٹی تھی، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی تھی۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ یعنی جس کی تم نے مجھے بشارت دی یہ عجیب وغریب بات ہے۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

''فرشتے کہنے لگے: کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ کے حکم پر؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے ابراہیم کے گھرانے والو! بے شک وہ ہر طرح تعریف کیا ہوا بڑی شان والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ جب اس نے کہا: وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 486

اور حیران ہوئی تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے امر یعنی اس کی قضا اور تقدیر سے اس کے تعجب کو ناپسند کیا، یعنی اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو بچہ عطا فرمائے اور وہ حضرت اسحاق ہے۔ اس آیت سے بہت سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہ حضرت اسحاق سے عمر میں بڑے ہیں، کیونکہ حضرت سارہ کو بشارت دی گئی کہ اسحاق زندہ رہیں گے یہاں تک کہ ان سے یعقوب پیدا ہوں گے۔ عنقریب اس بارے میں گفتگو آئے گی اور اس کا بیان سورۃ صافات میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ مبتدا ہے اور خبر علیکم ہے۔ سیبویہ نے اس کو عَلَيْكُمْ کاف کے کسرہ کے ساتھ بیان کیا ہے یا کی مجاورت کی وجہ سے۔ کیا یہ خبر ہے یا دعا؟ اس کا خبر ہونا زیادہ شرافت وفضیلت کا باعث ہے، کیونکہ یہ ان کے لیے رحمت اور برکت کے حصول کا تقاضا کرتی ہے، معنی یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور برکت تم پر بھیجی اے اہل بیت، اور اس کا دعا ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ ایسا امر ہے جس کی امید کی جاتی ہے اور بعد میں حاصل نہ ہوا۔ اَهْلَ الْبَيْتِ کی نصب اختصاص کی وجہ سے ہے۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے، ایک قول یہ ہے کہ ندا کی وجہ سے (منصوب ہے)

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی کی بیوی اہل بیت میں سے ہے، اس نے اس بات پر دلالت کی کہ انبیاء کی ازواج اہل بیت میں سے ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ (الاحزاب: 33) اور عنقریب یہ آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ سلام کی انتہاء وَبَرَكٰتُهٗ پر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے بارے میں خبر دی۔ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ برکت سے مراد بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ ان برکات میں سے یہ بات ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین حضرت ابراہیم و سارہ کی اولاد تھے۔ مالک نے وہب بن کیسان ابی نعیم عن محمد بن عمرو بن عطا روایت کیا انہوں نے کہا: میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس اہل یمن میں سے ایک آدمی آیا، اس نے کہا: السلام علیك و رحمة الله وبركاته، پھر اس نے اس کے ساتھ کچھ اور اضافہ کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اور اس وقت آپ کی بصارت چلی گئی تھی۔ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: وہ یمنی جس نے آپ کو چھپا دیا تھا، لوگوں نے آپ کو اس کا تعارف کرایا، تو آپ نے فرمایا: بے شک سلام برکت پر ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) انہوں نے فرمایا: میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے صحابہ کی جماعت میں تھا، میں نے کہا: السلام علیکم، آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمة الله بیس میرے لیے اور دس تیرے لیے۔ انہوں نے کہا: میں دوبارہ داخل ہوا، تو میں نے کہا: السلام علیکم و رحمة الله، آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمة الله و برکاته تیس میرے لیے اور بیس تیرے لیے۔ میں تیسری دفعہ داخل ہوا تو میں نے کہا، السلام علیکم و رحمة الله و برکاته تو آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمة الله و برکاته تیس میرے لیے اور تیس تیرے لیے۔ میں اور آپ سلام میں برابر

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، کیف السلام، جلد 2، صفحہ 350

ہیں۔ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ یعنی تعریف کیا گیا شان والا۔ ان دونوں کو ہم (قرطبی) نے اسماء حسنیٰ میں بیان کر دیا ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

''پھر جب دور ہو گیا ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف اور مل گیا انہیں مژدہ تو وہ ہم سے جھگڑنے لگے قوم لوط کے بارے میں۔ بے شک ابراہیم بڑے بردبار، رحم دل (اور) ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اے ابراہیم! اس بات کو رہنے دیجئے، بے شک آ گیا تیرے رب کا حکم۔ اور ان پر آ کر رہے گا عذاب جو پھیرا نہیں جا سکتا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ یعنی خوف، ارتاع عن کذا کہا جاتا ہے جب وہ خوف زدہ ہو۔ نابغہ نے کہا:

فارتاعَ من صَوتِ کَلّاب فبات لهٗ طوعَ الشَّوامتِ من خوفٍ و من صَرَدِ

وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یعنی اسحاق اور یعقوب کی۔ قتادہ نے کہا: انہوں نے اس کو بشارت دی کہ وہ قوم لوط پر عذاب لائیں گے اور یہ کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں۔ یُجَادِلُنَا یعنی یجادل رسلنا وہ ہمارے فرشتوں سے جھگڑنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی کیونکہ وہ اس کے حکم سے اترے۔ اس مباحثہ کو حمید بن ہلال نے جندب عن حذیفہ روایت کیا ہے اور یہ اس لیے تھا کہ جب ان (فرشتوں) نے کہا: اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ (العنکبوت: 31) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر اس میں پچاس مسلمان ہوں تو تم ان کو ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں آپ نے کہا: چالیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: تیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: بیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: اگر اس میں دس ہوں یا پانچ؟ حمید کو شک ہوا۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ قتادہ نے کہا، اسی کے قریب۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وہ قوم جس میں دس مسلمان بھی نہ ہوں اس میں کوئی بھلائی نہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر اس (قوم) میں ایک مسلمان ہو تو تم اسے ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بے شک اس میں لوط ہے۔ انہوں نے کہا: ہم جانتے ہیں جو اس میں ہے ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو بچالیں گے سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ عبدالرحمن بن سمرہ نے کہا وہ چار لاکھ تھے۔ ابن جریج نے کہا: قوم لوط کی بستیوں میں چالیس لاکھ لوگ تھے۔ اخفش اور کسائی کا موقف یہ ہے کہ یُجَادِلُنَا (مضارع) جادلنا (ماضی) کی جگہ میں واقع ہے۔ نحاس نے کہا: جب یہ لما کے جواب میں ہے تو لازم تھا کہ ماضی ہوتا، تو مضارع کو ماضی کے قائم مقام بنا دیا گیا جس طرح شرط کو مضارع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا واجب ہوتا ہے تو

ماضی کے صیغہ کو اس کے قائم مقام بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کا ایک اور جواب بھی ہے کہ یُجَادِلُنَا حال کی جگہ ہو یعنی اقبل یجادلنا یہ فراء کا قول ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ، ''لاواہ حلیم'' کا معنی سورۂ براءت میں گزر چکا ہے اور منیب کا معنی لوٹنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اناب جب وہ لوٹے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے: الاواہ سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اس بات پر افسوس کرتے ہوئے جو قوم لوط کے ایمان میں سے فوت ہو چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی قوم لوط کے بارے میں بحث کو چھوڑیئے۔ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ یعنی اس کا عذاب ان کے لیے۔ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ یعنی ان پر نازل ہونے والا ہے۔ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ یعنی ان سے نہ ٹلنے والا اور نہ اس کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ۝ وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ۝ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ۝ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ۝

''اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط (علیہ السلام) کے پاس وہ دلگیر ہوئے ان کے آنے سے اور بڑے پریشان ہوئے ان کی وجہ سے اور بولے آج کا دن بڑی مصیبت کا دن ہے اور (مہمانوں کی خبر سنتے ہی) آئے ان کے پاس ان کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اور اس سے پہلے ہی وہ کیا کرتے تھے برے کام۔ لوط نے کہا: اے میری قوم! (دیکھو) یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں پاک اور حلال ہیں تمہارے لیے تم خدا کا خوف کرو اور مجھے رسوا نہ کرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں، کیا تم میں ایک بھی سمجھدار آدمی نہیں؟ کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو ہمیں تمہاری (قوم کی) بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ لوط نے (بصد حسرت) کہا: اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی۔ فرشتوں نے کہا: اے لوط! ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں

گے پس آپ لے کر نکل جایئے اپنے اہل وعیال کو جب رات کا کچھ حصہ گزر جائے اور پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی نہ دیکھے، مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جایئے۔ بے شک وہی (عذاب) اسے بھی پہنچے گا جو ان (دوسرے مجرموں) کو پہنچا۔ ان پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا نہیں صبح (بالکل) قریب؟ پھر جب آ پہنچا ہمارا حکم تو ہم نے کر دیا اس کی بلندی کو اس کی پستی اور ہم نے برسائے ان پر پتھر آگ میں پکے ہوئے پے در پے، جو نشان زدہ تھے آپ کے رب کی جانب سے اور نہیں (لوط کی) بستی (مکہ کے) ظالموں سے کچھ دور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ جب فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے نکلے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بستی کے درمیان چار فرسخ (بارہ شرعی میل) کا فاصلہ تھا۔ (قوم) لوط کی دو بیٹیوں نے فرشتوں کو دیکھا اور وہ دونوں پانی بھر رہی تھی۔ اور ان دونوں نے خوبصورت شکل کو دیکھا۔ تو انہوں نے کہا: تم کون ہو؟ اور کہاں سے تم آئے؟ انہوں نے کہا: فلاں جگہ سے، ہم اس گاؤں کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اس کے رہنے والے فحش (کام کرنے والے) لوگ ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیا اس میں وہ شخص ہے جو ہمیں پناہ دے گا؟ انہوں نے کہا: ہاں، یہ شیخ ہے اور انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے ان کی ہیئت دیکھی تو آپ کو ان پر اپنی قوم (کی زیادتی) کا اندیشہ ہوا۔ سِیْٓءَ بِهِمْ یعنی ان کی آمد نے آپ کو پریشان کیا۔ کہا جاتا ہے: ساء یسوء تو یہ لازم ہوگا اور ساءہ یسوءہ تو یہ متعدی ہوگا۔ اور اگر آپ چاہیں تو سین کو ضمہ دے دیں کیونکہ اس کی اصل ضمہ ہے اور اصل میں یہ سوء سے سوی بھم ہے، واؤ کی حرکت سین کی طرف منتقل کر دی گئی اور واؤ کو یا سے بدل دیا گیا اور اگر آپ ہمزہ کو شد نہ دیں تو اس کی حرکت یا کو دے دیں اور کہیں: سی بھم تخفیف کے ساتھ اور تشدید کے ساتھ بھی ایک شاذ لغت ہے۔ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا یعنی ان کے آنے کے سبب آپ کا دل تنگ ہوا اور آپ نے اسے ناپسند کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: آپ کی وسعت اور طاقت تنگ ہوگئی۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اونٹ چلتے وقت اپنے اگلے پیروں سے اپنے قدموں کی گنجائش کی پیمائش کرے اور جب اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بار لادا جائے تو وہ اس سے تنگ ہوتا ہے کمزور ہوتا ہے اور اپنی گردن کو کھینچتا ہے۔ پس ضیق الذرع، ضیق الوسع سے عبارت ہوگا۔ اور کہا گیا: یہ ذرعه القئی سے ہے یعنی وہ غالب آگئی یعنی وہ کسی ناموافق چیز کو اپنے اندر روکنے سے تنگ ہو گیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا دل اس وجہ سے تنگ ہوا کہ آپ نے ان (فرشتوں) کی خوبصورتی کو دیکھا اور اس وجہ سے کہ آپ اپنی قوم کے فسق کو جانتے تھے۔ وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ یعنی شر میں سخت۔ شاعر نے کہا:

وأنك إلّا ترضَ بكرَ بن وائلٍ　يكنْ لكَ يومٌ بالعراقِ عصيبُ

"اور تو اگر بکر بن وائل کے ساتھ راضی نہ ہوا تو عراق میں تیرا دن بہت سخت ہوگا"۔

اور دوسرے نے کہا:

يومٌ عصيبٌ يعصِبُ الأبطالا　عَصْبَ القوِيّ السَّلَمَ الطِّوالا

اور کہا جاتا ہے: عَصِیْبٌ اور عَصَبْصَبٌ کسی چیز کی کثرت کو ظاہر کرنا، یعنی ناگوار شر کا مجموعہ اور قد عصب (کہا جاتا ہے)

یعنی عصب بالشئ عصابۃ (جس سے مراد جماعت ہے) اس سے عصبۃ اور عصابۃ کہا جاتا ہے یعنی کلمہ کو جمع کرنے والے مراد اپنی ذات میں جمع کرنے والے ہیں۔ اور عصبۃ الرجل سے مراد اس کے ساتھ نسب میں جمع ہونے والے ہیں اور تعصبت لفلان یعنی میں اس کے عصبہ کی طرح ہو گیا۔ اور رجل معصوب سے مراد وہ آدمی ہے جس میں خلقت کا اجتماع ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ حال واقع ہو رہا ہے۔ يُهْرَعُوْنَ سے مراد یسرعون ہے یعنی وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ کسائی، فراء اور دیگر اہل لغت نے کہا: اھراع سے مراد ایسی تیزی ہے جس کے ساتھ خوف کی وجہ سے لاحق ہونے والی کپکپی ہو۔ کہا جاتا ہے: أھرع الرجل اھراعا یعنی اس نے جلدی کی سردی، غصے یا بخار سے کپکپی میں (1)، وھو مھرع۔

مہلہل نے کہا:

فجاءوا يُهْرَعون وهُمْ أسارَى　نَقودُهُمْ على رَغْمِ الأُنوفِ

ایک اور شاعر نے کہا:

بمعجلاتٍ نحوهٔ مَهارِعِ

اور یہ اسی طرح ہے جیسے أُولِع فلان بالأمر، أرعِد زید اور زُھی فلان ہے یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ أھرع سے مراد اھرعہ حِرصُہ ہے یعنی اس کے لالچ نے اس میں جلدی کی۔ اس بنیاد پر یھرعون سے مراد ہے کہ وہ اس پر ابھارتے ہیں اور جس نے پہلے قول کے مطابق بات کی ہے اس نے کہا: اس کو سوائے اھرع الرجل یعنی اسرع کے سنا ہی نہیں گیا، یعنی اس کو مجہول ہی بیان کیا گیا ہے۔ ابن قوطیہ نے کہا: ھُرِع الانسان ھرَعا، وأُھرِع یعنی وہ چلا اور اس نے جلدی کی۔ ہروی نے کہا: ھُرِع الرجل و أُھرِع کہا جاتا ہے یعنی اسے ابھارا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور سدی نے کہا: یھرعون بمعنی یھرولون ہے۔ ضحاک نے کہا: یسعون کے معنی میں ہے۔ ابن عیینہ نے کہا: گویا کہ وہ دفاع کر رہے تھے۔ شمر بن عطیہ نے کہا: یہ تیز چلنے اور تیز دوڑنے کی درمیانی چال ہے۔ حسن نے کہا: دو چالوں کے درمیان کی چال ہے اور معنی قریب قریب ہے۔ ان کی تیزی کا سبب یہ تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ تھی جب اس نے مہمانوں کو دیکھا اور ان کی خوبصورتی اور جمال کو دیکھا تو وہ نکلی یہاں تک کہ اپنی قوم کی مجلس میں آ گئی اور ان کو کہا کہ لوط علیہ السلام کے پاس آج رات ایسے نوجوان مہمان ہیں خوبصورتی میں ان جیسا نہیں دیکھا گیا وغیرہ وغیرہ۔ تو اس وقت وہ تیز تیز آپ کی طرف آئے۔ اور ذکر کیا جاتا ہے کہ جب فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے شہر پہنچے تو انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو کھیتی باڑی میں مصروف پایا۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کی بیٹی کو نہر سدوم سے پانی بھرتے ہوئے پایا انہوں نے اس بیٹی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو ان کی ضیافت کرے بیٹی نے ان کی ہیئت کو دیکھا اور ان کے بارے میں قوم لوط سے ڈر گئی بیٹی نے کہا تم یہیں ٹھہرو، پھر اپنے باپ کی طرف گئی اور اسے خبر دی۔ تو انہوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آج رات آپ ہماری میزبانی کریں، آپ نے ان کو کہا: کیا تم نے اس قوم کے عمل کے بارے میں نہیں سنا؟

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 99

انہوں نے کہا: ان کا عمل کیا ہے؟ آپ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ زمین میں بدترین قوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمادیا تھا کہ انہیں عذاب نہ دینا یہاں تک کہ حضرت لوط علیہ السلام چار مرتبہ ان کے خلاف گواہی دیں۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے یہ گفتگو کی۔ جبریل علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو کہا: یہ ایک (مرتبہ گواہی) ہے اور کلام ان کے درمیان چلاحتی کہ حضرت لوط علیہ السلام نے چار مرتبہ گواہی کو مکرر فرمایا پھر ان کو لے کر شہر میں داخل ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مِنْ قَبْلُ یعنی فرشتوں کے آنے سے پہلے۔ ایک قول یہ ہے: حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے۔ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی مردوں کے ساتھ بدفعلی ان کی عادت تھی۔ جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ کے مہمانوں کا قصد کیا تو حضرت لوط علیہ السلام دفاع کرتے ہوئے ان کی طرف گئے اور فرمایا: هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ آپ کے قول هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے: آپ کی تین صلبی بیٹیاں تھیں، ایک قول ہے: دو بیٹیاں تھیں۔ زیتا اور زعوراء۔ ایک قول یہ ہے: ان کے دو سردار تھے جن کی اطاعت کی جاتی تھی آپ نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نکاح ان کے ساتھ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: اس حالت میں آپ نے ان کو نکاح کا کہا اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ (ان کی شریعت میں) کافر کا نکاح مومن عورت کے ساتھ جائز تھا۔ یہ آغاز اسلام میں بھی جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے فرمایا وحی سے پہلے اور وہ دونوں کافر تھے۔ اور ایک گروہ، جس میں مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر ہیں نے کہا: آپ نے اپنے قول بناتی کے ذریعے تمام عورتوں کی طرف اشارہ کیا، کیونکہ قوم کا نبی ان کا باپ ہوتا ہے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے تقویت ملی ہے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب: 6) و هو أب لهم یعنی نبی مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی ازواج (مطہرات) ان کی مائیں ہیں اور وہ (نبی) ان کا باپ ہے۔ ایک گروہ نے کہا: یہ کام مدافعانہ تھا اور آپ نے اس کو نافذ کرنے کا ارادہ نہ فرمایا تھا، یہ قول ابو عبیدہ سے مروی ہے جس طرح اس آدمی کو کہا جاتا ہے جسے غیر کا مال کھانے سے روکا جاتا ہے، خنزیر تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ حلال ہے۔ عکرمہ نے کہا: آپ نے ان پر اپنی اور اپنی امت کی بیٹیاں پیش نہیں کی تھیں بلکہ یہ انہیں اس لیے کہا تھا تا کہ وہ واپس لوٹ جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی میں تمہاری ان سے شادی کر دیتا ہوں، جو تم چاہتے ہو اس میں سے وہ تمہارے لیے طاہر ہیں یعنی حلال ہیں۔ تطہر سے مراد ایسی چیز سے بچنا ہے جو حلال نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی قوم کے سرداروں نے آپ کی بیٹیوں کے لیے پیغام نکاح دیا تو آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

اطھر میں الف تفضیل کے لیے ہے کہ یہ وہم پیدا ہو کہ مردوں کے ساتھ نکاح کرنا طاہر ہے بلکہ یہ آپ کے اس قول کی طرح ہے: اللہ اکبر و أعلی و أجل یعنی اللہ سب سے بڑا، سب سے بلند اور سب سے اجل ہے اگرچہ یہ ازروئے تفضیل کے نہیں، یہ جائز ہے اور کلام عرب میں عام ہے اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے بڑا نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ بڑا ہو۔ ابو سفیان بن حرب نے غزوۂ احد والے دن کہا: اعل هبل اعل هبل یعنی ہبل (بت کا نام) بہت بڑا ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کہہ دو اللہ تعالیٰ اعلیٰ اور اجل ہے(1)۔ اور ھبل کبھی بھی بلند اور جلیل نہیں ہوا''۔ عام قراء نے را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن اور عیسی بن عمرو نے ھن اطھر پڑھا حال کی وجہ سے نصب کے ساتھ ھن ضمیر عماد (فصل) ہے۔ خلیل، سیبویہ اور اخفش نے یہاں ھن کے عماد ہونے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ ضمیر عاد اس صورت میں ہوتی ہے جس میں کلام اس کے مابعد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا جیسے کان زید ھو أخالتا کہ اس کے ذریعے یہ استدلال کیا جا سکے کہ الاخ صفت نہیں۔ زجاج نے کہا: اور اس کے ذریعے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ کان کو خبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نے کہا: اس کے ذریعے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ خبر معرفۃ ہوتی ہے یا جو معرفۃ کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ یعنی تم میری توہین نہ کرو اور تم مجھے ذلیل نہ کرو۔ اسی سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ شعر ہے۔

فأخزاكَ ربي يا عتيبَ بن مالِكٍ　　ولقاكَ قبل الموت إحدى الصَّواعق

مددتَ يمينًا للنبي تَعمُّدًا　　ودَمَّيتَ فاهُ قُطِعتْ بالبَوارق

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خزایۃ سے ہو جس کا معنی حیا اور شرم ہے۔ ذوالرمۃ نے کہا:

خزاية أدركته بعد جولتِهِ　　من جانبِ الحبلِ مخلوطا بها الغضب

دوسرے شاعر نے کہا:

من البيضِ لا تَخزى إذا الريحُ ألصقتُ　　بها مِرطَها او زايلَ الحَلْيُ جِيدَهَا

ضیف کا اطلاق واحد ہونے کے باوجود تثنیہ اور جمع پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

لا تَعدمي الدهرَ شِفار الجازِرِ　　لِلضيفِ والضيفُ أحقّ زائر

اس میں تثنیہ اور جمع بھی جائز ہے اور پہلا اکثر آتا ہے جس طرح کہ تیرا قول: رجال صوم و فطرٍ و زورٍ روزہ دار آدمی، افطار کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے۔

اور خزی الرجل خزایۃ یعنی اس نے حیا کیا جس طرح کہ وہ ذلیل ہوا اور حقیر ہوا اور خزی خزیا کہتے ہیں جب کوئی رسوا ہو جائے، ان دونوں صورتوں میں مضارع تخزی ہی آتا ہے۔ پھر ان کو اپنے اس ارشاد کے ذریعے جھڑکا۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ یعنی سخت آدمی جو نیکی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو، ایک قول یہ ہے: رشید، سے مراد ہدایت والا ہے۔ یا رشید بمعنی راشد یا بمعنی مرشد ہے یعنی صالح یا مصلح۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: (اس سے مراد) مومن (ہے) ابو مالک نے کہا: برائی سے روکنے والا۔ ایک قول ہے: رشید بمعنی الرشد ہے۔ الرشد اور الرشاد سے مراد ہدایت اور استقامت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بمعنی مرشد ہو جس طرح حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ احد، جلد 2، صفحہ 579

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ روایت ہے کہ قوم کے لوگوں نے آپ علیہ السلام کی بیٹیوں سے منگنی کی پس آپ نے ان کو رد کر دیا، اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جس عورت کی منگنی کو رد کر دیا ہو وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ مروی ہے کہ قوم لوط نے آپ کی بیٹیوں کے لیے پیغام نکاح بھیجا تو آپ نے انہیں رد کر دیا۔ پس کلام کی توجیہہ یہ ہوگی ہمارا تیری بیٹیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہم نے ان کا قصد کیا ہے اور نہ ہی یہ ہماری عادت ہے کہ ہم اس کا مطالبہ کریں۔ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ مہمانوں کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً جب آپ نے ان کی گمراہی میں استمرار، اپنی کمزوری اور ان کے دفاع پر قادر نہ ہونے کو دیکھا تو تمنا کی کاش آپ ان کو روکنے کے لیے کسی مددگار کو پا لیتے، تو آپ نے گھبراہٹ اور عجز کے طور پر کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً یعنی انصار اور مددگار ہوتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے آپ نے بیٹے کا ارادہ فرمایا۔ اور ان فعل مضمر کی وجہ سے محل رفع میں ہے جس کی تقدیر لو اتفق یا وقع ہے، اور یہ لو کے تابع آنے والے ان میں عام (قاعدہ) ہے۔ لو کا جواب محذوف ہے، یعنی لرددت اهل الفساد، یعنی میں فساد کرنے والوں کو ضرور ہٹا دیتا اور ان کے اور ان کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا۔ اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ یعنی میں پناہ لیتا اور مل جاتا۔ اَوْ اٰوِیَ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ قوة پر عطف کرتے ہوئے گویا کہ آپ نے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیَ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ۝ یعنی ان آوی ہے۔ ان مضمرہ کے ساتھ یہ منصوب ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی رکن سے مراد خاندان اور کثرت کے ساتھ رکاوٹ اور دفاع کرنے والے ہیں۔ ان کے فعل کی قباحت نے آپ کو اس قول تک پہنچا دیا اس کے باوجود کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت سے واقف تھے۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ فرشتوں نے جب ان کلمات کے کہتے وقت آپ علیہ السلام پر (رنج و غم) کو پایا تو انہوں نے کہا: بے شک تیری پناہ گاہ بڑی مضبوط ہے۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک وہ رکن شدید کی پناہ کی خواہش کرتے تھے''(1)۔ الحدیث۔

سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو روایت کیا ہے(2) اور اس میں یہ اضافہ کیا ''اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر ان کی قوم کی ثروث میں''۔ محمد بن عمرو نے کہا: ثروت سے مراد کثرت اور قوت ہے، یہ حدیث حسن ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام پر ان کی قوم غالب آ گئی اور انہوں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اس حال میں کہ آپ اس کو روکے ہوئے تھے (اس وقت) فرشتوں نے آپ کو کہا: آپ دروازے سے ہٹ جائیے، آپ ہٹ گئے اور دروازہ کھل گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا تو ان کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھے ہو گئے اور الٹے پاؤں بھاگے یہ کہتے ہوئے: بچاؤ بچاؤ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَیْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْیُنَهُمْ (القمر: 37) اور انہوں نے لوط کے مہمانوں کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام نے اپنا دروازہ بند کر دیا اور فرشتے آپ کے ساتھ گھر میں تھے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 478 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 139

آپ اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور دروازے کے پیچھے سے انہیں قسمیں دلا رہے تھے اور وہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے، جب فرشتوں نے ان کی طرف سے ملنے والی آپ علیہ السلام کی محنت، کرب اور تھکاوٹ کو دیکھا تو انہوں نے کہا: اے لوط! بے شک تیری پناہ گاہ بڑی مضبوط ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آنے والا ہے، اور ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں، دروازہ کھول دیجئے اور ان کو اور ہم کو چھوڑ دیجئے۔ آپ نے دروازہ کھول دیا تو جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا جس طرح کہ گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے: جبریل علیہ السلام نے مٹھی بھر مٹی لی اور اس کو ان کے چہروں پر ڈال دیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کو قریب اور دور والوں کی آنکھوں تک پہنچا دیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں (بصارت) کو مٹا دیا، وہ رستے کو نہ پہچان سکے اور اپنے گھروں تک راہ نہ پا سکے اور کہنے لگے: بچاؤ بچاؤ بے شک لوط کے گھر ایسے دن ہیں جو روئے زمین پر سب سے زیادہ جادوگر ہیں۔ انہوں نے ہمارے اوپر جادو کر دیا اور ہماری آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ اور کہنے لگے: اے لوط! جس طرح تو ہے یہاں تک کہ ہم صبح کر لیں تو تو دیکھ لے گا، وہ آپ کو دھمکیاں دینے لگے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ جب فرشتوں نے آپ علیہ السلام کی پریشانی، بے چینی اور مدافعت کو دیکھا تو انہوں نے آپ کو اپنا تعارف کرایا، پس جب آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ نے اپنی قوم کو داخلہ دے دیا۔ جبریل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر مارا پس وہ اندھے ہو گئے اور ان کے ہاتھوں پر مارا تو وہ خشک ہو گئے۔ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ یعنی کسی برائی کے ساتھ۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ اس کو فاسر بھی پڑھا گیا ہے یعنی ہمزہ وصلی اور قطعی دونوں طرح، دونوں فصیح لغتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ (الفجر) اور فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى (بنی اسرائیل: 1) (پہلی آیت میں ہمزہ وصل جب کہ دوسری میں قطعی ہے)

نابغہ نے کہا: اس نے دونوں لغتیں جمع کر دی ہیں:

أسرت عليه من الجوزاء سارية　　تزجي الشمالُ عليه جامدَ البَرَدِ

ایک اور شاعر نے کہا:

حَیِّ النَّضيرةَ ربّةَ الخِدْرِ　　أسرتْ إليكَ ولم تَكُن تَسْرِي

یہ بھی کہا گیا ہے: فاسر ہمزہ قطعی کے ساتھ جب کوئی ابتدائی رات میں چلے اور سری جب کوئی رات کے آخری حصہ میں چلا ہو اور دن میں چلنے کے لیے صرف ساری آتا ہے۔ لبید نے کہا:

إذا المرءُ أسْرَى ليلةً ظنَّ أنَّهُ　　قَضَى عملاً والمرءُ ما عاشَ عامِلُ

جب آدمی رات کے ابتدائی حصہ میں چلتا ہے تو اس کا گمان ہوتا ہے کہ اس نے کام پورا کر لیا حالانکہ آدمی جب تک زندہ ہے کام کرنے والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

عند الصَّباحِ يَحْمَدُ القومُ السُّرَى　　و تَنْجلِي عنهم غَيَاباتُ الكَرَى

بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رات کا کچھ حصہ (1)۔ ضحاک نے کہا: رات کا بقیہ حصہ۔ قتادہ نے کہا: رات کا ابتدائی حصہ گزر جانے کے بعد کا حصہ۔ اخفش نے کہا: رات کے آجانے کے بعد۔ ابن اعرابی نے کہا: رات کی کسی گھڑی میں۔ ایک قول یہ بھی ہے: رات کی تاریکی میں۔ ایک قول یہ ہے: رات کے سکون کے بعد۔ ایک قول ہے: رات کا حصہ، یہ تمام قریب قریب ہیں، ایک قول یہ ہے: یہ رات کا نصف حصہ ہے، یہ قطعه نصفین سے ماخوذ ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ونائحةٍ تَنُوحُ بِقِطعِ لیلٍ　　علی رجلٍ بِقارعةِ الصَّعیدِ

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سری کہتے ہیں رات کے وقت چلنے کو تو بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ نہ فرمایا ہوتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ یہ رات کے ابتدائی حصے میں ہوتا۔ وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ یعنی تم میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے نہ دیکھے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہے۔ علی بن عیسیٰ نے کہا: تم میں سے کوئی بھی مال و اسباب میں سے جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے اس میں مشغول نہ ہو۔ اِلَّا امۡرَاَتَکَ منصوب اور یہی قراءت معنی کے اعتبار سے واضح ہے، یعنی آپ رات کے وقت اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جایئے سوائے آپ کی بیوی کے فَاَسۡرِ بِاَهۡلِکَ...... اِلَّا امۡرَاَتَکَ اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے فَاَسۡرِ بِاَهۡلِکَ..... اِلَّا امۡرَاَتَکَ پس اہل سے اس کی استثنا ہے، اسی وجہ سے وہ آپ کے ساتھ نہ نکلی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۳۳﴾ (العنکبوت) یعنی باقی رہ جانے والوں میں سے۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے اِلَّا امۡرَاَتُکَ، اَحَدٌ سے بدل کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ ایک جماعت نے اس قراءت کا انکار کیا ہے جن میں سے ایک ابو عبید ہیں۔ انہوں نے کہا یہ صرف یلتفت کے رفع کے ساتھ صحیح ہے اور یہ صفت ہے کیونکہ ابدال اور جزم کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عورت کی طرف توجہ اور التفات مباح ہے حالانکہ معنی اس طرح نہیں۔ نحاس نے کہا: ابو عبید اور ان کے علاوہ ابو عمرو جیسے لوگوں کی جانب ان کی جلالت شان اور عربی میں ذی مرتبہ ہونے کے باوجود ایسا ہونا ضروری نہیں۔

اَحَدٌ سے بدل ہونے کی وجہ سے اس کو مرفوع پڑھنا صحیح ہے، اس کی تاویل وہ ہوگی جو محمد بن ولید نے محمد بن یزید سے بیان کی ہے کہ جس طرح آدمی اپنے دربان کو کہتا ہے: لا یخرج فلان، فلاں نہ نکلے، تو نہی کا لفظ تو فلاں کے لیے ہے جب کہ اس کا معنی مخاطب کے لیے ہے اس کا مطلب یہ ہوگا لا تدعه یخرج یعنی تو اس کو اس حال میں نہ چھوڑ کہ وہ نکلے۔ اس کی مثل آپ کا یہ قول بھی ہے: لا یقم احد الا زید اس کا معنی یہ ہوگا: میں نے ان کو کھڑا ہونے سے منع کیا سوائے زید کے، تو اس طرح نہی تو حضرت لوط علیہ السلام کو ہے جب کہ اس کے الفاظ دیگر لوگوں کے لیے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے ان کو اس بات سے روکا ہے کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہے سوائے آپ کی بیوی کے، یہ بھی جائز ہے کہ اس کی استثنا التفات کی نہی سے ہو کیونکہ یہ مکمل کلام ہے پھر معنی یہ ہوگا: تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ پیچھے دیکھے گی اور ہلاک ہو جائے گی۔ اور حضرت لوط علیہ السلام اسے لے کر نکلے تو آپ نے رات کے وقت اپنے ساتھ نکلنے والے ساتھیوں کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 111

پیچھے مڑ کر دیکھنے سے منع فرمادیا، تو سوائے آپ کی بیوی کے کسی نے بھی پیچھے نہ دیکھا، اس نے جب عذاب کی سخت آواز کو سنا تو پیچھے دیکھا اور کہا: واقوماہ! پس ایک پتھر اسے آلگا اور اس نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا یعنی عذاب سے۔ اِنَّهٗ کی ضمیر سے مراد الامر اور الشان ہے یعنی فان الامر والشان والقصة، مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ جب فرشتوں نے کہا: اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ (العنکبوت: 31) کہ ہم اس گاؤں کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: ابھی ابھی، یعنی اپنی قوم پر اپنے غصے کی وجہ سے ان سے جلدی عذاب کا مطالبہ کیا، تو انہوں نے کہا: اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ کیا صبح قریب نہیں ہے۔ عیسیٰ بن عمرو نے اس کو الیس الصبح پڑھا ہے۔ ب کے ضمہ کے ساتھ، یہ بھی ایک لغت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح کو ان کی ہلاکت گاہ بنایا ہو، کیونکہ اس (صبح کے وقت) میں زیادہ ٹھہرے ہوئے اور جمع ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام طلوع فجر کے وقت اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر نکلے تو آپ کے ساتھ ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو فرشتوں نے آپ کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ گاؤں فرشتوں کے سپرد فرمادیا ہے جن کے ساتھ بادلوں کے گرجنے کی آواز، بجلی کا کوندنا اور بادلوں کے گرجنے کی سخت آوازیں ہیں اور ہم نے ان کو کہہ دیا ہے کہ عنقریب حضرت لوط علیہ السلام نکلیں گے لہٰذا تم انہیں تکلیف نہ دینا اور اس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ پیچھے نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی ان کی بیٹیاں پیچھے دیکھیں گی لہٰذا (اے لوط) جو کچھ آپ دیکھیں وہ آپ کو خوف میں مبتلا نہ کرے۔ پس حضرت لوط علیہ السلام نکلے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر زمین کو لپیٹ دیا یہاں تک کہ آپ نے نجات حاصل کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا، اَمْرُنَا سے مراد عذابنا ہے، یعنی ہمارا عذاب۔ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا اور یہ اس طرح ہوا کہ جبریل علیہ السلام نے قوم لوط کی بستیوں کے نیچے اپنے پر داخل فرمائے۔ اور وہ (بستیاں) پانچ تھیں، سدوم، یہ سب سے بڑی بستی تھی۔ عامورا، دادوما، وضعوہ اور قتم۔ تو ان (بستیوں) کو زمین کی سرحدوں سے اتنا اوپر اٹھالیا کہ وہ آسمان کے بالکل قریب ہو گئیں، یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے گدھوں کی رینگ اور ان کے مرغوں کی اذان سن لی، نہ کوئی گھڑا الٹا اور نہ کوئی برتن ٹوٹا پھر وہ اپنے سروں کے بل الٹے کر دیئے گئے اور ان پر پتھر برسائے۔ مقاتل نے کہا: چار (بستیوں) کو ہلاک کر دیا گیا اور ضعوہ بچ گئی۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے ان جیسا فعل کیا اس کا حکم رجم ہے، سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ تفسیر میں ہے اَمْطَرْنَا عذاب کے لیے اور مطرنا رحمت کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک کلام عرب کا تعلق ہے تو اس میں مطرت السماء اور أمطرت السماء۔ دونوں طرح مستعمل ہے۔ اس کو ھروی نے بیان کیا۔ سجیل کے بارے میں اختلاف ہے، نحاس نے کہا: سجیل (کا معنی) شدید اور کثیر ہے۔ سجیل اور سجین (دونوں ایک ہیں) لام اور نون اختین ہیں، ابوعبیدہ نے کہا: سجیل سے مراد شدید ہے (1)، اس نے شعر کہا:

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 228

فَرْبًا تَوَاصَی بِہِ الْأَبْطَالُ سِجِّینًا

نحاس نے کہا: عبداللہ بن مسلم نے اس کو رد کیا اور کہا: یہ سجین ہے جب کہ وہ سجیل ہے تو اس کے ذریعے کیسے استشہاد کیا جا سکتا ہے؟ نحاس نے کہا: یہ رد لازم نہیں آتا کیونکہ ابوعبیدہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک دوسرے کے قرب کی وجہ سے لام، نون سے بدلا ہوا ہے، البتہ ابوعبیدہ کے قول کا ایک اور طریقہ سے رد کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر یہ آپ کے قول کے مطابق ہوتا تو پھر حجارۃ سجیلا ہوتا کیونکہ حجارۃ من شدید نہیں کہا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ شدید اصفت ہے۔ ابوعبیدہ نے فراء سے بیان کیا کہ ارحاء کے پتھر کو سجیل کہا جاتا ہے۔ محمد بن جہم نے ان سے حکایت کیا کہ سجیل ایسا کیچڑ ہے جسے پکایا جاتا ہے حتی کہ وہ اَرحاء کی طرح ہوتی ہے۔ ایک گروہ جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور ابن اسحاق ہیں نے کہا کہ سجیل غیر عربی لفظ ہے جس کو معرب بنایا گیا ہے، اس کی اصل سنج وجیل ہے اس کو ''سنک وکیل'' بھی کہا جاتا ہے یعنی جیم کی جگہ کاف کے ساتھ، اور یہ دونوں فارسی میں پتھر اور مٹی ہیں۔ عربوں نے ان کو معرب بنایا اور ان دونوں کو ایک ہی نام بنا دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: سجیل سے مراد مٹی ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ (الذاریات) حضرت حسن نے کہا: پتھروں کی اصل مٹی تھی پھر وہ سخت کر دیئے گئے۔ عربوں کے نزدیک ہر سخت چیز سجیل ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد پکی اینٹیں ہیں۔ ابن زید نے کہا: ایسی مٹی جس کو پکایا گیا ہو حتی کہ وہ پکی ہوئی اینٹ کی طرح ہو جائے۔ انہی سے روایت ہے کہ سجیل آسمان دنیا کا نام ہے۔ اس کو مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی نے ابوالعالیہ سے اس کو بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے، کیونکہ منضود کے ساتھ اس کی صفت کا آنا اس کو رد کر دیتا ہے، عکرمہ سے ہے کہ یہ آسمان اور زمین کے درمیان ہوا میں معلق سمندر ہے جس سے پتھر نازل ہوئے۔ ایک قول یہ ہے: یہ آسمان میں پہاڑ ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے اشارہ فرمایا: وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (النور: 43) ایک قول یہ ہے کہ یہ سجل سے مشتق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دیا جو ان کو پہنچے گا۔ پس یہ سجین کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (مطففین) یہ زجاج کا مختار قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ اسجلتہ سے فعیل کا وزن ہے جس کا معنی ہے میں نے اسے چھوڑ دیا، گویا کہ وہ ان پر چھوڑی گئی چیز کی مثل تھے۔ اور ایک قول یہ ہے یہ اسجلتہ سے مشتق ہے جب آپ کسی کو کوئی چیز عطا کریں (تو یہ بولا جاتا ہے) گویا کہ یہ عذاب تھا جو ان کو دیا گیا تھا، (شاعر) نے کہا:

مَنْ يُسَاجِلْنِي يُسَاجِلْ مَاجِدًا   يَمْلَأُ الدَّلْوَ إِلَى عَقْدِ الْكَرَبْ

اہل معانی نے کہا: پتھر اور مار میں سے جو چیز سخت ہو اسے سجیل اور سجین کہتے ہیں۔ ابن مقبل نے کہا:

وَرَجْلَةٍ يَضْرِبُونَ الْبَيْضَ ضَاحِيَةً   ضَرْبًا تَوَاصَى بِهِ الْأَبْطَالُ سِجِّينًا

مَّنْضُوْدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: (اس کا معنی ہے) پے در پے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے کسی چیز کا ایک دوسرے کے اوپر رکھنا۔ ربیع نے کہا: ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھا گیا یہاں تک کہ وہ ایک جسم ہو گئی۔ عکرمہ نے کہا:

(منضود بمعنی) مصفوف ہے، بعض نے کہا: بمعنی مرصوص ہے دونوں کا معنی قریب قریب ہے۔ نضدت المتاع واللبن فھو منضود ونَضِیدٌ ونَضَدٌ کہا جاتا ہے جب آپ کسی چیز کو دوسری چیز پر رکھیں۔ (شاعر نے) کہا:

ورفَّعَتهُ إلى السَّجْفَيْنِ فالنَّضَدِ

ابوبکر ہذلی نے کہا: (اس سے مراد) تیار شدہ ہے یعنی یہ اس عذاب میں سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ظالم دشمنوں کے لیے تیار فرما رکھا ہے۔ مُّسَوَّمَةً یعنی نشان زدہ یہ سیما سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، یعنی ان پر مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک قول یہ ہے: ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کو اس نے مارنا تھا۔ یہ زمین کے پتھروں سے مشابہت نہ رکھتے تھے۔ فراء نے کہا: انہوں نے گمان کیا کہ سفیدی میں ان پتھروں پر سرخ اور سیاہ خطوط بنے ہوئے تھے پس یہی ان کی تسویم تھی۔ کعب نے کہا، ان پر سفید اور سرخ نشان لگے ہوئے تھے۔ شاعر نے کہا:

غلامٌ رماہ اللہُ بالحسنِ یافعًا لہ سِیمیَا لا تَشُقُّ علی البَصَر

مُّسَوَّمَةً، حِجَارَةً کی صفت ہے اور مَّنضُودٍ، سِجِّيلٍ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: عِنْدَ رَبِّكَ میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ زمین کے پتھروں میں سے نہیں تھے۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ اس سے مراد قوم لوط ہے یعنی یہ سزا ان سے دور نہ تھی۔ مجاہد نے کہا: اس سے کفار قریش کو ڈرایا ہے معنی یہ ہوگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پتھر (سزا) تیری قوم کے ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد اس امت کے ظالم ہیں۔ قسم بخدا ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ نے کسی ظالم کو نہ بچایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے کہ مرد مردوں سے جنسی لذت حاصل کریں گے اور عورتیں عورتوں سے اور جب ایسا ہو تو تم قوم لوط کے عذاب کا انتظار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ان پر سجیل کی کنکریاں برسائے گا''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی: وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ ایک اور روایت میں ہے۔ ''دن اور رات کا سلسلہ چلتا رہے گا حتی کہ اس امت کے مرد، مردوں کی پشت کو حلال کرلیں گے جیسا کہ انہوں نے عورتوں کی پشت کو حلال کر لیا ہے پھر امت کے ان لوگوں پر تیرے رب کی طرف سے سنگ باری ہوگی''۔ ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ یہ بستیاں ظالموں سے دور نہیں ہیں اور یہ شام اور مدینہ کے درمیان ہیں۔ ببعید اس وجہ سے مذکر آیا ہے کہ یہ بمکان بعید کے معنی میں ہے۔ پتھر برسانے کے بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھایا تو ان پر پتھر برسائے گئے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پتھر ان لوگوں پر برسائے گئے جو اس وقت بستیوں میں نہ تھے بلکہ بستیوں سے باہر تھے۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا
أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ
أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۖ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ﴿٨٧﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ
إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ
إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَن يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَا
أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾ وَ
اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿٩٠﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ
كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنتَ
عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ
ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ
سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ
رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ
الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا
بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

''اور اہل مدین کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر اور نہ کمی کیا کرو ناپ اور تول میں، میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم خوشحال ہو اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر اس دن کا عذاب نہ آجائے جو ہر چیز کو گھیر نے والا ہے۔ اور اے میری قوم! پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے جو بچ رہے اللہ تعالیٰ کے دیئے سے وہی بہت ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان دار ہو۔ اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان، قوم نے کہا: اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں (از راہ تمسخر بولے) بس تم ہی ایک دانا (اور) نیک چلن رہ گئے ہو۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خود

تمہارے خلاف کرنے لگوں اس امر میں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں (نیز) نہیں چاہتا ہوں مگر (تمہاری) اصلاح (اور درستی) جہاں تک میرا بس ہے اور نہیں میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم! ہرگز نہ اکسائے تمہیں میری عداوت (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر) مبادا پہنچے تمہیں بھی ایسا عذاب جو پہنچا تھا قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور نہیں اور مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بے شک میرا رب بڑا مہربان (اور) پیار کرنے والا ہے۔ وہ بولے: اے شعیب! ہم نہیں سمجھ سکتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے اور اگر تمہارے کنبہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا اور نہیں ہو تم ہم پر غالب۔ آپ نے فرمایا: اے میری قوم! کیا میرا کنبہ زیادہ معزز ہے تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ سے۔ اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت۔ بے شک میرا رب جو عمل تم کرتے ہو (اس کو اپنے علم سے) احاطہ کیے ہوئے ہے اور اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر (اور) میں (اپنے طور پر) عمل پیرا ہوں۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے؟ اور تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور جب آپہنچا ہمارا حکم (یعنی عذاب) تو ہم نے بچا لیا شعیب کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے اور آلیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے تو صبح کی انہوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے پڑے تھے۔ گویا کبھی وہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ہلاکت ہو مدین کے لیے جیسے ہلاک ہو چکے تھے ثمود"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا یعنی وارسلنا الی مدین ہم نے مدین کی طرف بھیجا، مدین حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مدین کہا گیا ہے جب کہ مراد بنو مدین ہیں۔ جس طرح مضر کہا جاتا ہے اور مراد بنو مضر ہوتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ان کے شہر کا نام ہے اس لیے اس کی طرف ان کو منسوب کر دیا گیا۔ نحاس نے کہا: مدین غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ شہر کا نام ہے، سورۂ اعراف میں یہ معنی گزر چکا ہے اور کچھ اس سے زیادہ بھی۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اس کی تفسیر) گزر چکی ہے۔ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ وہ اپنے کفر کے ساتھ کم تولنے والے تھے جب ان کے پاس کوئی کھانے کا سامان وغیرہ بیچنے والا آتا تو زائد وزن کے ساتھ اس سے لیتے، اپنی استطاعت کے مطابق وہ انتہائی وزن پورا کرتے اور ظلم کرتے تھے اور اگر کوئی کھانے کا سامان خریدنے کے لیے آتا تو وہ اس کو کم وزن کے ساتھ بیچتے اور اس کے ساتھ بخل کرنے میں انتہائی کوشش کرتے، تو انہیں شرک کا قلع قمع کر کے ایمان لانے اور کم تولنے سے روک کر پورا وزن دینے کا حکم دیا گیا۔ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ رزق میں وسعت اور نعمتوں کی کثرت مراد ہے۔ حضرت حسن نے کہا: ان کا بھاؤ سستا تھا (1)۔ وَ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 119

عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ اللہ تعالیٰ نے یوم کی صفت احاطہ کے ساتھ بیان فرمائی حالانکہ اس دن کی احاطہ کے ساتھ صفت سے مراد ان (کفار) کا احاطہ ہے، کیونکہ عذاب کا دن جب ان کا احاطہ کرے گا تو عذاب ان (کفار) کا احاطہ کرلے گا یہ آپ کے قول یوم شدید کی طرح ہے یعنی وہ دن جس کی گرمی سخت ہوگی۔ اس عذاب کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے یہ آخرت میں جہنم کا عذاب ہے اور ایک قول ہے کہ یہ دنیا میں استیصال کا عذاب ہے(1) جب کہ ایک قول ہے کہ بھاؤ بلند ہو جانے (کا عذاب) ہے اس کا یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے "ناپ اور تول میں جس قوم کا بھی کمی کرنا ظاہر ہوا اللہ تعالیٰ نے ان کو قحط اور مہنگائی میں مبتلا کردیا"(2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ کم تولنے سے روکنے کے بعد تاکیداً پورا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ ایفا سے مراد پورا کرنا ہے۔ بِالۡقِسۡطِ یعنی عدل اور حق کے ساتھ اور مقصود یہ ہے کہ ہر حصہ دار کو اس کا حصہ مل جائے کیل یا وزنی چیز کو پورا کرنا مراد نہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا: اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بلکہ مراد یہ ہے کہ معہود اور معین چیز کے حجم کو کم نہ کرو اسی طرح صنجات ہے۔

وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ یعنی جتنی چیز کے لوگ مستحق ہیں تم ان کو اس سے کم نہ دو۔ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ ناپ، تول میں خیانت کرنا زمین میں فساد برپا کرنے تک پہنچادیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس سے کچھ مزید گزر چکا ہے۔ اور ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ یعنی عدل کے ساتھ حقوق کو پورا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کو باقی رکھا ہے وہ از روئے برکت کے زیادہ ہے اور ظلم و جبر کے ذریعے ناپ تول میں کمی کر کے جو کچھ تم اپنے لیے بچا لیتے ہو اس سے انجام کے اعتبار سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کا یہ معنی طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ سے مراد اس کی اطاعت ہے(3)۔ ربیع نے کہا: (اس سے مراد) اللہ کی وصیت ہے۔ فراء نے کہا: اللہ کی نگرانی (مراد ہے) ابن زید نے کہا: اللہ کی رحمت، قتادہ اور حضرت حسن نے کہا: تمہارے رب کی طرف سے تمہارا حصہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے(4)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کا رزق تمہارے لیے بہتر ہے(5)۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ یہ شرط لگائی گئی کیونکہ وہ اس کی صحت کو تبھی جان سکتے ہیں جب وہ ایماندار ہوں۔ ایک قول یہ ہے: یہ احتمال بھی ہے کہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے تو ان کو یہ خطاب فرمایا: وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ یعنی ایسا نگران جو تمہارے ناپ تول کے وقت تمہاری نگرانی کرتا ہو یعنی تمہاری طرف سے ہونے والے ہر معاملہ کو دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں حتی کہ میں حق کو پورا کرنے کے لیے تمہیں پکڑوں۔

ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ میں اس بات پر تیار نہیں ہوں کہ تمہاری نافرمانی کی وجہ سے تمہارے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمتوں کو زائل ہونے سے بچالوں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 199 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 121 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 199

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ اس کو اَصَلٰوتُكَ مفرد بھی پڑھا گیا ہے۔ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ، ان محل نصب میں ہے۔ کسائی نے کہا: با کے مضمر ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے (1) اور عبادات پر مواظبت اختیار کرنے والے تھے خواہ فرائض ہوں یا نوافل اور آپ کہتے: نماز تمہیں بے حیائی کے کاموں اور گناہ سے روکتی ہے، جب آپ نے ان کو حکم دیا اور ان کو روکا تو انہوں نے نماز کی کثرت پر آپ کے استمرار کو دیکھ کر نکتہ چینی کی اور آپ کا مذاق اڑایا، انہوں نے کہا: اللہ نے ان کے بارے میں خبر نہیں دی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں صلاۃ بمعنی قراءت ہے (2)۔ یہ سفیان نے اعمش سے نقل کیا ہے، یعنی تیری قراءت تجھے حکم دیتی ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ کافر تھے۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا نماز اور زکوٰۃ کو اس پر فرض کیا ہے (3)۔ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ فراء کا گمان ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہے: ''او تنهانا ان نفعل فی اموالنا ما نشاء'' سلمی اور ضحاک بن قیس نے أو ان تفعل فی اموالنا ما تشاء دونوں فعلوں میں تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: اے شعیب جو تو چاہتا ہے۔ نحاس نے کہا: اس قراءت کے مطابق أو أن کا پہلے أن پر عطف ہوگا۔ زید بن اسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع فرمایا وہ ان دراہم کو کناروں سے کاٹنا ہے (4)۔

ایک قول یہ ہے: اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا معنی یہ ہے جب ہم کم تولنے پر باہم رضامند ہیں تو تو ہمیں اس سے کیوں روکتا ہے؟ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ان کی مراد یہ ہے کہ بزعم خویش (تم دانا اور نیک چلن ہو) ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ (الدخان) میں ابوجہل کی صفت بھی اسی کی مثل ہے یعنی بزعم خویش۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کو یہ از راہ استہزاء و تمسخر کہا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ اسی (قبیل) سے ہے ان کا حبشی کو، ابوالبیضاء کہنا (سفیدی کا باپ) اور سفید رنگ والے کو ابوالجون (سیاہی کا باپ) کہنا۔ اور اسی سے جہنم کے داروغوں کا ابوجہل کے لیے یہ قول ہے۔ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ (الدخان)

سفیان بن عیینہ نے کہا: عرب بعض اوقات کسی چیز کو اس کی ضد کے ساتھ متصف کرتے ہیں بدشگونی اور فال پکڑنے کے لیے۔ جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم اور فلاۃ (صحرا) کو مفازۃ (جنگل)، ایک قول یہ ہے: یہ تعریض ہے اس سے ان کی مراد گالی تھی۔ اور ان سب میں بہترین (تاویل) جس کی صحت پر ماقبل بھی دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ تم حقیقتاً دانا اور نیک چلن ہو تو تم ہمیں کیسے حکم دیتے ہو کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اس پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ جب انہوں نے آپ کی عبادت اور نماز کی کثرت کو دیکھا اور اس بات کو دیکھا کہ آپ دانا اور نیک چلن ہیں تو انہوں نے اس بات کا انکار کر دیا کہ آپ کو ان (بتوں) کو چھوڑ دینے کا حکم دیں گے جن کی عبادت ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ اور اس کا مابعد بھی اسی پر دلالت کرتا ہے یعنی قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا یعنی کیا میں تمہیں گمراہی سے نہ روکوں؟ یہ سارے کا سارا اس بات

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 200 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 123

پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے یہ حقیقتاً کہا اور وہ آپ کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ معنی بنو قریظہ کے یہودیوں کی اس بات کی طرح ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہی جب آپ نے ان کو یا اِخوۃ القردۃ (1) (اے بندروں کے بھائیو) کہا، تو انہوں نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم آپ کو جاہل نہیں سمجھتے تھے۔

مسئلہ۔ اہل تفسیر نے کہا: ان کو دراہم و دنانیر کو کاٹنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا (2)۔ اور اسی کام سے انہیں منع کیا گیا تھا وہ صحیح (دراہم و دنانیر) کی اطراف کو قینچی سے کاٹ لیتے تھے تاکہ کٹا ہوا حصہ ان کو بچ جائے۔ صحیح (دراہم و دنانیر) کے ساتھ گن کر جب کہ کٹے ہوؤں سے وزن کر کے باہم معاملات کرتے تھے اور وزن میں کمی کر دیتے تھے۔ ابن وہب نے کہا کہ امام مالک نے کہا ہے: وہ دراہم و دنانیر کو توڑتے تھے (3)۔ متقدمین مفسرین کی ایک جماعت نے بھی یوں ہی کہا ہے (4) جن میں حضرت سعید بن مسیب اور حضرت زید بن اسلم وغیرہ ہیں اور ان دونوں (دراہم و دنانیر) کا توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت علقمہ بن عبد اللہ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا اس نے کہا: بغیر حرج کے مسلمانوں میں چلنے والے سکے کو توڑنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا، کیونکہ جب تک یہ صحیح ہو تب تک اس کا مقصود بھی موجود ہے اور اس کا فائدہ بھی ظاہر ہے اور جب اس کو توڑ دیا جائے تو یہ سامان (کی طرح) بن جاتا ہے اور اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے پس یہی چیز لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے لہٰذا یہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ كَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (النمل) کی تاویل میں کہا گیا ہے کہ وہ دراہم کو توڑتے تھے۔ یہ زید بن اسلم کا قول ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: لوگوں کا گمان ہے کہ مدینہ میں محمد بن کعب قرظی کے بعد حضرت زید بن اسلم سے زیادہ تاویل قرآن کو جاننے والا کوئی نہیں تھا۔

مسئلہ۔ اصبغ نے کہا حضرت عبد الرحمٰن بن قاسم بن خالد بن جنادہ (5) جو زید بن حارث عتقی کا غلام تھا نے کہا: جس نے اس (دراہم) کو توڑا اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور اگر اس نے جہالت کا عذر پیش کیا تو یہ اس کا عذر نہ ہوگا اور یہ محل عذر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا کہ جہاں تک ان کے قول: لم تقبل شهادته (6) (اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی) کا تعلق ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اور کبیرہ گناہ عدالت کو ساقط کرتے ہیں جب کہ صغیرہ گناہ عدالت کو ساقط نہیں کرتے اور رہا ان کا قول کہ اس سلسلہ میں جہالت کا عذر قابل قبول نہیں تو یہ تو ایک واضح معاملہ ہے جو کسی پر بھی مخفی نہیں اور عذر تو صرف اس صورت میں قابل قبول ہوتا ہے جس میں صدق ظاہر ہو یا صدق کا سبب پوشیدہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ تو اس کو بندے کی نسبت زیادہ جانتا ہے جس طرح کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا۔

مسئلہ۔ جب یہ (قطع دراہم) ایسی نافرمانی اور فساد ہے جس کی وجہ سے شہادت رد کر دی جاتی ہے تو جو شخص ایسا کرے اس کو سزا بھی دی جائے گی۔ حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جسے کوڑے مارے گئے تو آپ

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 35 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 122
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1063 4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1064 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

نے کہا: یہ کیا ہے؟ آدمی نے کہا: یہ دنانیر اور دراہم کو کاٹتا ہے، حضرت ابن مسیب نے کہا: یہ تو زمین میں فساد ہے(1) اور آپ نے اس کی کوڑوں (کی سزا) کا انکار نہ کیا، اسی طرح کا واقعہ سفیان سے بھی مروی ہے، ابو عبدالرحمٰن تجیبی نے کہا: میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا وہ اس وقت امیر مدینہ تھے تو آپ کے پاس ایک ایسا شخص لایا گیا جو دراہم کو کاٹتا تھا اس کے خلاف شہادت قائم ہو چکی تھی تو آپ نے اس کو مارا، اس کا حلق کیا اور اسی حالت میں اس کو چکر لگوانے کا حکم دیا اور یہ حکم بھی دیا کہ (چکر لگوانے والا) یہ کہے: یہ ہر اس آدمی کی سزا ہے جو دراہم کو کاٹتا ہے، پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کو آپ کے پاس واپس لایا جائے، تو آپ نے فرمایا: مجھے تیرا ہاتھ کاٹنے میں صرف یہ مانع ہے کہ آج کے دن سے پہلے میں نے اس سلسلہ میں کوئی کارروائی نہیں کی، اس سلسلہ میں اب میں نے پہل کر دی ہے پس جو چاہے قطع ید بھی کرے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا(2): کوڑے کے ذریعے آپ کے ادب سکھانے میں تو کوئی کلام نہیں جہاں تک حلق کرنے کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ میں اپنی ولایت کے زمانے میں مارتا تھا اور حلق کرتا تھا اور میں ہر اس آدمی کے ساتھ ایسا کرتا رہوں گا جو اپنے بالوں کو نافرمانی پر معاون اور فساد کے سلسلہ میں ان کے ذریعے خوبصورتی کے حصول کا ذریعہ سمجھے گا۔ اور یہ (بالوں کا) کاٹنا نافرمانی کے ہر اس طریقے میں لازم ہے جو بدن میں غیر موثر ہو اور جہاں تک اس کا ہاتھ کاٹنے کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے چوری کے باب سے لیا ہے اور یہ سزا دراہم کو کاٹنے کی وجہ سے ہو نہ کہ ان کو توڑنے کی وجہ سے کیونکہ توڑنا تو وصف میں فساد پیدا کرنے کے مترادف ہے جب کہ کاٹنا اس کی مقدار میں کمی کرنے کے مترادف ہے۔ تو یہ خفیہ طور پر مال لینا ہی ہوگا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے: کیا قطع ید کے سلسلہ میں حرز اصل نہیں؟ تو ہم نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خیال کرتے ہوں کہ مخلوق کے درمیان دینار یا درہم میں فرق کرنے کے لیے ان کی بناوٹ ہی ان کے لیے حرز ہے۔ اور ہر چیز کا حرز اس کی حالت کے مطابق ہوتا ہے اس کو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے نافذ کیا اور آپ نے دنانیر اور دراہم کو کاٹنے کی وجہ سے ایک آدمی کا ہاتھ کاٹا۔ ہمارے مالکی علماء نے کہا(3): بے شک دنانیر و دراہم پر اللہ تعالیٰ کے نام کی مہریں ہیں اگر اہل تاویل کے قول کے مطابق اللہ کی مہر کو توڑنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو وہ اس کا اہل تھا اور جس نے بادشاہ کے نام والی مہر کو توڑا تو اسے تادیبا سزا دی جائے گی۔

ابن عربی نے کہا: میرا خیال ہے کہ قطع ید دراہم کو کاٹنے کے سبب سے ہوگا ان کو توڑنے کی وجہ سے نہیں۔ میں اپنی ولایت کے زمانے میں یہی کرتا رہا ہوں مگر یہ کہ میں جہال کے ساتھ گھر ا رہا۔ میں نے گمراہ حاسدین کی گفتگو کے سبب اس میں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا پس اہل حق میں سے جو ایسا کر سکتا ہے اس کو اللہ سے اجر و ثواب کی امید کرتے ہوئے ایسا کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ یہ گزر چکا ہے۔ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا یعنی کھلا اور حلال۔ حضرت شعیب علیہ السلام کثیر المال شخص تھے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے۔ ایک قول یہ ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1064　　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1065　　3۔ ایضاً

اس سے مراد ہدایت و توفیق اور علم و معرفت ہے۔ کلام محذوف بھی ہے، یعنی افلا انھکم عن الضلال (کیا میں تمہیں گمراہی سے نہ روکوں) ایک قول یہ ہے: اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ کا معنی یہ ہے کہ کیا میں گمراہی کی اتباع کروں؟ ایک قول یہ ہے: اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ کا معنی ہے کہ کیا تم مجھے کم تولنے اور کسی کا حق گھٹانے کے سلسلہ میں نافرمانی کا حکم دیتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے غنی فرمادیا ہے؟ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ، اُرید کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ یعنی میں ایسا نہیں کرتا کہ تم کو کسی کام سے روکوں اور خود اس کا ارتکاب کروں جس طرح میں اس کام کو چھوڑتا نہیں ہوں جس کو کرنے کا تمہیں حکم دوں۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ یعنی میں اصلاح کے کام کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ (میں یہ چاہتا ہوں) کہ تم عدل کے ذریعے اپنی دنیا کی اور عبادت کے ذریعے اپنی آخرت کی اصلاح کرلو۔

اللہ تعالیٰ نے مَا اسْتَطَعْتُ فرمایا کیونکہ کوئی کام سرانجام دینے کی شرط استطاعت ہے صرف ارادہ نہیں۔ ما مصدر یہ ہے یعنی میں اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق اصلاح چاہتا ہوں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ یعنی میری ہدایت، توفیق سے مراد ہدایت ہے اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میں نے بھروسا کیا۔ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ یعنی اپنے اوپر یہ تمام مصائب آنے کی صورت میں (اسی کی طرف) لوٹتا ہوں۔ ایک قول یہ ہے: آخرت میں اسی کی طرف لوٹوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ انابت سے مراد دعا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ اسی کی خاطر میں دعوت دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَیٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ یحییٰ بن وثاب نے یُجْرِمَنَّكُمْ پڑھا ہے۔ شِقَاقِیْۤ محل رفع میں ہے۔ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ محل نصب میں ہے، یعنی میری دشمنی تمہیں ایمان کو ترک کرنے پر نہ ابھارے ورنہ تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا جو تم سے پہلے کفار کے ساتھ ہوا یہ حضرت حسن اور قتادہ کا قول ہے۔

یَجْرِمَنَّكُمْ کا معنی سورۂ مائدہ، شقاق اور سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ عداوت کے معنی میں ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ اسی سے اخطل کا یہ قول ہے:

اَلَا مَنْ مُبْلِغٌ عَنِّیْ رسولا فکیف وجدتُمْ طَعْمَ الشِّقَاقِ

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ شقاقی کا معنی اضراری ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی (فراقی) میری جدائی ہے۔ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قوم لوط کی ہلاکت کے زمانے کے قریب تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ قوم لوط کے گھر تم سے دور نہیں (1) اصل میں بمکان بعید ہے اسی وجہ سے بعید کو واحد ذکر کیا گیا۔ کسائی نے کہا: یعنی ان کے گھر تمہارے گھروں میں (سے دور نہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ یہ اللہ سبحانہ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ہم (قرطبی) نے ان کو اپنی کتاب الاسنی فی شرح الاسماء الحسنی میں بیان کیا ہے۔ جوہری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 202

نے کہا: جب آپ کسی کے ساتھ محبت کریں تو کہتے ہیں "وددت الرجل اودہ ودا" اور الودود سے مراد محبت کرنے والا ہے الوَد، الوِد، الوُد اور المودۃ کا معنی محبت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ جب شعیب علیہ السلام کا ذکر ہوتا تو آپ فرماتے: "وہ انبیاء کے خطیب ہیں" (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ یعنی ہم نہیں سمجھتے، کیونکہ آپ بعث بعد الموت اور دوبارہ اٹھائے جانے میں سے غائب امور پر ہمیں ابھارتے ہیں اور آپ ہمیں ایسی نصیحتیں کرتے ہیں جیسی نصیحتوں کا ہمارے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے آپ کا کلام سننے سے اعراض برتتے ہوئے اور اسے حقیر سمجھتے ہوئے یہ بات کہی، فقه، یفقه کہا جاتا ہے جب کوئی فقہ کو سمجھے۔ کسائی سے فَقُهَ فَقْهًا اور فَقِهَا حکایت کیا گیا ہے جب کوئی فقیہ بن جائے۔

وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہ نے کہا کہ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی بصارت کو مسئلہ تھا (2)۔ امام ثوری نے کہا: کہ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی نظر کمزور تھی (3)، ان سے نحاس نے حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہ کے قول کی مثل قول بیان کیا۔ نحاس نے کہا: اہل زبان نے بیان کیا ہے کہ حِمیر اندھے کو ضعیف کہتے ہیں یعنی اس کی بصارت جانے کی وجہ سے وہ ضعیف ہو گیا، جس طرح کہ اس کو ضریر کہا جاتا ہے یعنی اس کی بینائی جانے کے سبب اس کا نقصان ہو گیا۔ اسی طرح اس کو مکفوف بھی کہا جاتا ہے یعنی بینائی جانے کی وجہ سے وہ دیکھنے سے رک گیا۔ حضرت حسن نے کہا: اس کا معنی ضعیف البدن ہے یہ معنی علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ سدی نے کہا: ضعیفا کا معنی وحیدا ہے یعنی اکیلا یعنی آپ کے پاس وہ لشکر اور معاون نہیں جن کے ذریعے آپ ہماری مخالفت کر سکیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد دنیا کے مصالح اور اہل دنیا کی سیاست کی معرفت کی کمی ہے۔ ضَعِیْفًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، آدمی کے رہط سے مراد وہ خاندان ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے اور جن کے ذریعے اسے تقویت ملتی ہے۔ اسی سے الراھطاء ہے جو کہ چوہے کے بل کو کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے وہ اعتماد حاصل کرتا ہے اور اسی میں اپنے بچوں کو چھپاتا ہے۔ لَرَجَمْنٰكَ یعنی ہم رجم کے ذریعے آپ کو قتل کر دیں گے وہ جب کسی آدمی کو قتل کرتے تو اسے پتھروں کے ساتھ رجم کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے رہط ان کی ملت کے لوگ تھے ایک قول یہ ہے: لَرَجَمْنٰكَ کا معنی ہے کہ ہم آپ کو برا بھلا کہیں گے۔ اس سے جعدی کا یہ قول ہے:

تَراجَمْنا بمُرّ القول حتی نصیر کأننا فرسا رِهانِ

رجم کا معنی لعنت بھی ہے اسی وجہ سے شیطان کو رجیم کہا جاتا ہے۔

وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ یعنی آپ ہمارے اوپر غالب آنے والے نہیں نہ ہی جبر کرنے والے اور نہ روکنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ، اَرَهْطِیْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور معنی یہ ہوگا کہ کیا تمہارے دلوں میں میرا قبیلہ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اللہ سے زیادہ معزز ہے، زیادہ عزت والا اور زیادہ برتر ہے حالانکہ وہ تمہارا مالک ہے؟

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 568 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 202 3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 126

وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا یعنی اللہ کے احکام میں سے (1) جو میں تمہارے پاس لایا ہوں انہیں تم نے پس پشت ڈال دیا ہے، تم نے انہیں اپنی پیٹھوں کے پیچھے ڈال دیا ہے، اور میری قوم کے ڈر سے تم مجھے قتل کرنے سے رک گئے ہو۔ جب کوئی آدمی کسی کام میں کوتاہی کرے تو جعلت أمرہ بظھرہ کہا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ان کے کرتوتوں سے مراد کفر اور معصیت وغیرہ ہیں۔ مُحِيْطٌ، مُحِيْطٌ بمعنی علیم ہے یعنی وہ جاننے والا ہے ایک قول کے مطابق محیط بمعنی حفیظ حفاظت کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ دھمکی اور وعید ہے۔ سورۃ الانعام میں یہ ارشاد گزر چکا ہے۔ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ یعنی کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے ہلاک کر دے گا؟ من محل نصب میں ہے جیسے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرہ: 220) وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ معطوف علیہ ہے اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ عنقریب تم جان لو گے کہ ہم میں سے جھوٹا کون ہے؟ ایک قول یہ ہے: یہ محل رفع میں ہے، تقدیر عبارت یہ ہے يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ اور ایک قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے: من ھو کاذب فسیعلم کذبہ ویذوق وبال امرہ جو جھوٹا ہے عنقریب اپنے جھوٹ کو جان لے گا اور اپنے معاملے کے وبال کا مزہ چکھ لے گا۔ فراء کا خیال یہ ہے کہ وہ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ میں هُوَ ضمیر کو اس لیے لائے ہیں کیونکہ وہ من قائم نہیں کہتے بلکہ وہ من قام، ومن یقوم کہتے ہیں اور اگر من قائم کہنے کی ضرورت ہو تو من القائم کہتے ہیں، پس انہوں نے ھو کا اضافہ اس لیے کر دیا تا کہ جملہ فعل یفعل کے قائم مقام ہو جائے۔ نحاس نے کہا: اس کے خلاف شاعر کا یہ شعر دلالت کرتا ہے:

مَنْ رَسُوْلِي اِلَى الثُّرَيَّا بِاَنِّيْ ضِقْتُ ذَرْعًا بِهَجْرِهَا وَالْكِتَابِ

وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ یعنی عذاب اور ناراضگی کا انتظار کرو، پس میں مدد اور رحمت کا منتظر ہوں۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا ایک قول یہ ہے: جبریل نے ایک چیخ ماری (2) تو ان کی روحیں ان کے جسموں سے باہر نکل آئیں۔ نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ چیخ سے مراد جبریل علیہ السلام کی چیخ ہے اور أخذت فعل مونث الصیحۃ کی وجہ سے لایا گیا ہے، جب کہ حضرت صالح علیہ السلام کے قصہ میں وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود: 67) میں فعل کی تذکیر الصیحۃ بمعنی الصیاح کی صورت میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سوائے حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوموں کے دو قوموں کو ایک عذاب سے ہلاک نہیں فرمایا، ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے کڑک کے ذریعے ہلاک فرمایا، صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو نیچے سے کڑک نے آلیا جبکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو اوپر سے۔ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ ابو عبدالرحمن سلمی نے كَمَا بَعُدَتْ ثَمُوْدُ عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں معروف یہی ہے کہ جب کوئی ہلاکت ہو جائے تو بَعِدَ يَبْعَدُ بَعَدًا و بُعْدًا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 129 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 130

کہا جاتا ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے بعدت میں عین کو مضموم پڑھا تو یہ لغت خیر اور شر دونوں میں مستعمل ہے اور اس کا مصدر البعد ہے جب کہ بعدت بالخصوص شر میں استعمال ہوتا ہے۔ البعد جماعت کی قراءت کے مطابق لعنت کے معنی میں آتا ہے، بعض اوقات دو لغتوں کا معنی، معنی میں قربت کی وجہ سے جمع ہو جاتا ہے، تو یہ اس لفظ میں ہوتا ہے جس کا مصدر علی غیر لفظہ آتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

”اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور صریح غلبہ کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے پیروی کی فرعون کے حکم کی اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا۔ وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا روز قیامت اور لا ڈالے گا انہیں آتش (جہنم) میں۔ بہت بری داخل ہونے کی جگہ ہے جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ اور ان پر بھیجی جاتی رہے گی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی بہت برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا“۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَا اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اس نے نبی کو حجت قائم کرنے اور ہر قسم کی علت کو ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ بِاٰیٰتِنَا یعنی تورات کے ذریعے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد معجزات ہیں۔ وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یعنی واضح حجت کے ساتھ اس سے مراد عصا ہے۔ سورۂ آل عمران میں سلطان کا معنی اور اس کا اشتقاق گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ، اَمْرَ فِرْعَوْنَ سے مراد اس کی شان اور حالت ہے حتی کہ انہوں نے اسے معبود بنالیا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ یعنی مضبوط حکم نہیں تھا کہ جو صحیح اور حق کی طرف لے جاتا۔ اور ایک قول کے مطابق برشید سے مراد بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے، یعنی وہ بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔

یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی وہ انہیں دوزخ میں لے کر جائے گا اور خود ان کا رئیس ہوگا۔ جب کوئی آگے آگے ہو تو قدمهم يقدمهم قدما وقدوما کہا جاتا ہے۔ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ یعنی وہ انہیں دوزخ میں داخل کرے گا۔ لفظ ماضی ذکر کیا گیا مگر معنی مضارع کا مراد ہے یعنی فیوردھم النار اور ایسا ہوتا رہتا ہے کیونکہ جس چیز کا وجود ثابت اور متحقق ہو وہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہو چکی ہے، لہٰذا مستقبل کو ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ، الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ سے مراد المدخل المدخول ہے یعنی کتنی بری ہے داخل ہونے کی جگہ جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ اور بئست اس لیے نہیں کہا گیا کیونکہ کلام المورود کی طرف راجع تھا، اور یہ ایسے ہی ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: نعم المنزل دارك اور نعمت المنزل دارك اور المورود سے مراد وہ پانی ہے جس پر وارد ہوا جاتا ہے اور اسی طرح وہ مقام جس پر وارد ہوا جاتا ہے، یہ معنی مفعول ہے۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً یعنی دنیا میں (1) وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی ولعنۃ یوم القیٰمۃ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ کسائی اور ابوعبیدہ نے رَفَدْتُهٗ اَرْفِدُ رَفْدًا حکایت کیا ہے یعنی میں نے اسے عطا کیا اور عطیہ کا اسم الرفد ہے، یعنی کتنی بری عطا اور اعانت ہے۔ اور الرفد بڑے برتن کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے، تقدیر عبارت ہوگی بئس الرفد رفد المرفود ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ الرفد را کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی برتن ہوتا ہے اور الرفد را کے کسرہ کے ساتھ ہو تو برتن میں جو شراب وغیرہ ہوتی ہے وہ مراد لی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ اصمعی سے نقل کیا ہے، گویا کہ وہ جہنم میں پینے کے لیے طلب کریں گے اس کے ذریعے اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے الرفد سے مراد زیادتی ہے۔ مراد یہ ہوگی کہ غرق ہونے کے بعد دوزخ کتنا برا اضافہ ہے جس میں وہ جائیں گے، یہ کلبی کا قول ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىٕمٌ وَّ حَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰی وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؕ﴿۱۰۴﴾ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ۙ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

''یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں آپ سے ان میں سے کچھ ہیں اور کچھ کٹ گئی ہیں اور نہیں ظلم کیا ہم نے ان پر بلکہ انہوں نے خود زیادتی کی تھی اپنی جانوں پر۔ پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے (جھوٹے) خداؤں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی جب آ گیا حکم آپ کے رب کا۔ ان دیوتاؤں نے تو فقط ان کی بربادی میں ہی اضافہ کیا اور یونہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو درآنحالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک (اور) سخت ہوتی ہے۔ بے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 133

شک ان واقعات میں (عبرت کی) نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے عذاب آخرت سے یہ وہ دن ہے جس دن اکٹھے کیے جائیں گے سب لوگ اور یہ وہ دن ہے جب سب کو حاضر کیا جائے گا اور ہم نے نہیں مؤخر کیا ہے اسے مگر ایک مقرر مدت تک جو گنی ہوئی ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو (اس کی ہیبت سے) کوئی شخص نہیں بول سکے گا بجز اس کی اجازت کے، بعض ان میں سے بدنصیب ہوں گے اور بعض خوش نصیب۔ سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا پروردگار بے شک آپ کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور وہ جو خوش نصیب ہیں تو وہ (نعیم) جنت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا رب۔ یہ وہ عطا ہے جو ختم نہیں ہوگی۔ تو (اے سننے والے!) نہ ہو جا تو شک میں ان کے متعلق جن کی یہ پوجا کرتے ہیں۔ وہ نہیں پوجتے مگر ایسے ہی جیسے پوجتے تھے ان کے باپ دادا اس سے پہلے۔ اور ہم یقیناً پورا پورا دینے والے ہیں انہیں ان کا حصہ جس میں ذرا کمی نہیں ہوگی"۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ، ذٰلِكَ مبتدا کے مضمر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی الامر ذالك اور اگر آپ چاہیں تو اسے مبتدا ہونے کی حیثیت سے بھی مرفوع بنا سکتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا: یہ گزشتہ خبر ان بستیوں کی بعض خبروں میں سے جو ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں۔ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ حضرت قتادہ نے کہا (1): قائم سے مراد وہ ہیں جو برباد ہو چکی ہیں اور ان کے نشانات ہیں جب کے حصید سے مراد وہ ہیں جن کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے: قائم سے مراد آباد ہیں (2) جب کہ حصید سے مراد بے آباد اور برباد ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: قائم سے مراد وہ ہیں جو اپنے ساز و سامان سمیت برباد ہو چکی ہیں اور حصید سے مراد کھیتی کی طرح کٹی ہوئی ہیں۔ شاعر نے کہا:

والنّاس فی قَسْم المنیّة بینهم　کالزرع منه قائِمٌ و حَصِیدٌ

لوگ اپنے اندر موت کی تقسیم میں کھیتی کی طرح ہیں اس میں سے کچھ ہے اور کچھ کٹی ہوئی ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا:

اِنّما نحنُ مثلُ خامَةِ زَرْعٍ　فمتی یَأنِ یَأتِ مُحْتَصِدُهٗ

اخفش سعید نے کہا: حصید سے مراد محصود ہے یعنی فعیل بمعنی مفعول اور اس کی جمع حصدی اور حصاد آتی ہے جیسے مرضی اور مراض۔ اخفش ہی نے کہا: ذوی العقول کے لیے جمع حصدی آتا ہے جیسے قتیل اور قتلی۔ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ لغت میں ظلم کی اصل کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہے جو اس کا مقام نہ ہو۔ سورۂ بقرہ میں یہ تفصیلاً گزر چکا ہے۔

وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یعنی کفر اور گناہوں کے ذریعے۔ اور سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ ظلم ایاك کہا جاتا ہے۔ فَمَاۤ اَغْنَتْ یعنی نہ دور کیا۔ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ کلام میں حذف ہے، یعنی التی کانوا یدعون اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 134　2۔ ایضاً

یدعون کا معنی یعبدون ہے یعنی وہ عبادت کرتے تھے۔ لَمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ، کا معنی خسارہ اور بربادی ہے(1)، یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ لبید نے کہا:

فقد بَلِيتُ وكلُّ صاحبِ جِدّةٍ لِبِلًى يَعودُ و ذاكُمُ التَّتْبِيبُ

تَتْبِيْبٍ کا معنی ہلاکت، خسران اور بربادی ہے۔ آیت میں اضمار ہے، یعنی ما زادتهم عبادة الاصنام غیر تتبیب مضاف کو حذف کر دیا گیا مراد یہ ہے کہ ان کے بتوں کی پوجا کرنے نے آخرت کے ثواب کو ضائع کر دیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى یعنی جس طرح قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیوں کو پکڑ لیا گیا اسی طرح تمام ان بستیوں کو پکڑا جائے گا جن کے باسی ظالم ہیں۔

عاصم جحدری اور طلحہ بن مصرف نے وكذالك اَخَذَ رَبُّكَ إذ اخذ القریٰ پڑھا ہے اور جحدری سے جماعت کی قراءت کی طرح وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى بھی مروی ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے وكذالك اَخَذَ رَبُّكَ إذ اخذ پڑھا ہے تو یہ گزشتہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کے سلسلہ میں جو عادت ہے اس کے متعلق خبر ہو گی اور معنی یہ ہو گا: اور اسی طرح تیرے رب نے ہلاک ہونے والی قوموں میں سے جس کو بھی پکڑا اسے پکڑا۔ اور جماعت کی قراءت اخذ کے مصدر ہونے کی بنیاد پر ہے اور معنی یہ ہے: اسی طرح تیرا رب جسے ہلاک کرنا چاہے اس کی پکڑ ہوتی ہے جب بھی وہ اسے پکڑ لے۔ اذ گزشتہ زمانے کے لیے آتا ہے جب کہ اذا مستقبل کے لیے آتا ہے۔ وَهِيَ ظَالِمَةٌ یعنی اس کے اہل ظالم ہیں۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا جیسے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) مراد واسأل اهل القریة ہے۔ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ یعنی مشرکین کو اس کی طرف سے ملنے والی سزا دردناک اور سخت ہے۔ صحیح مسلم اور ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے حتیٰ کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا'' (2)۔ پھر آپ نے كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى کی تلاوت فرمائی۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً آیت سے مراد عبرت اور نصیحت ہے۔ لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ اس کے لیے جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ ذٰلِكَ يَوْمٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ مَّجْمُوْعٌ یوم کی صفت ہے۔ لَّهُ النَّاسُ مجموع کا نائب فاعل ہے، اسی وجہ سے مجموعون نہیں فرمایا گیا۔ اگر آپ الناس کو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع مانیں اور مجموع له کو بطور خبر تو پھر مجموعون ہونا چاہیے، کیونکہ له فاعل کے قائم مقام ہے اور جمع سے مراد حشر ہے یعنی اس دن کے لیے جمع کیے جائیں گے۔ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ یعنی نیک اور بدکار اس کی گواہی دیتا ہے اور آسمان والے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اور ہم (قرطبی) نے یہ دونوں اسماء اور ان کے علاوہ قیامت کے دیگر اسماء کو کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور ان دونوں کی وضاحت کی ہے۔ والحمد للہ

قولہ تعالیٰ وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ یعنی اس دن کو ہم مؤخر نہیں کریں گے اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ یعنی اس مدت کے لیے جس کے متعلق

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 135

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138۔ صحیح مسلم، تحریم الظلم، جلد 2، صفحہ 320

ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ ہمارے نزدیک معدود ہے۔

یومریاتی اس کو یَوۡمَ یَاۡتِ بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ جب یا کا ماقبل مسکور ہو تو یا کو حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے آپ لا ادر کہتے ہیں۔ اس کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ، ابوعمرو اور کسائی نے ادراج کی صورت میں یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور وقف کی صورت میں اسے حذف کر دیا ہے۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے وقف و وصل دونوں صورتوں میں یومریاتی یا کے اثبات کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ اعمش اور حمزہ نے وقف و وصل میں بغیر یا کے یومریات پڑھا ہے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر وقف نہ کیا جائے اور یا کے اثبات کے ساتھ وصل کیا جائے۔ کیونکہ نحویوں کی ایک جماعت نے کہا ہے: یا کو حذف نہ کیا جائے اور بغیر جازم کے کسی چیز کو جزم نہ دی جائے، جہاں تک بغیر یا کے وقف کی بات ہے تو اس میں کسائی کا قول ہے۔ س نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل سالم پر مجزوم کی طرح وقف کیا جاتا ہے لہٰذا یا کو حذف کر دیا جائے گا جس طرح ضمہ کو حذف کر دیا جاتا ہے اور جہاں تک حمزہ کی قراءت کا تعلق ہے تو وصل وقف میں یا کے حذف پر ابوعبید نے دو دلیلیں ذکر کی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کو بغیر یا کے دیکھا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حکایت کی ہے کہ یہ ہذیل کی لغت ہے وہ ما ادر کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: ان کی جو مصحف عثمان رضی اللہ عنہ والی دلیل ہے یہ تو ایسی دلیل ہے جس کو اکثر علماء نے رد کیا ہے۔ حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: میں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو مجھے کہا گیا کہ وہ تو چلا گیا ہے اور جہاں تک ما ادر کے ان کے قول کے ذریعے دلیل پکڑنے کی بات ہے تو اس میں کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس حذف کو تو قدیم نحویوں نے حکایت کیا ہے، اس کی علت بھی ذکر کی ہے اور اس پر اس کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ فراء نے یا کے حذف پر شعر بھی پڑھا ہے:

كَفَّاكَ كَفٌّ مَا تُلِيقُ درهما　　جودًا وأخرى تُعْطِ بِالسَّيْفِ الدَّمَا

اس میں تعط اصل میں تعطی ہے اور سیبویہ اور خلیل نے حکایت کی کہ عرب لا ادر کہتے ہیں یا کو حذف کرتے ہیں اور کسرہ کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں مگر ان کا خیال یہ ہے کہ یہ کثرت استعمال کی وجہ سے ہے۔ زجاج نے کہا: نحو میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ یا کو ثابت رکھا جائے۔ انہوں نے کہا: جو اس کو مصحف کا اتباع اور قراء کا اجماع خیال کرتا ہے، (تو اس اعتبار سے بھی) کیونکہ قراءت سنت ہے اور اس طرح بھی کلام عرب میں وارد ہوا ہے۔ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اصل تتکلم ہے تخفیفاً ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کلام میں اضمار ہے، یعنی لا تتکلم فیه نفس الا بالما ذون فیه من حسن الکلام اور ایک قول یہ ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی دلیل کے بارے میں گفتگو کر سکے گا اور نہ ہی شفاعت کے متعلق۔

ایک قول یہ ہے کہ حشر میں اس کی اجازت کے بغیر ان کے لیے ایک ایسا وقت ہوگا جس میں اس کی اجازت کے بغیر ان پر کلام کرنے کی ممانعت ہوگی۔ اور یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں دین میں ملحد اکثر سوال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۙ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ (المرسلات) کیوں کہا گیا ہے حالانکہ قیامت کے ذکر میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الصافات) کہ وہ

ایک دوسرے کی طرف ملامت کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (النحل: 111) جس دن ہر نفس اپنے بارے میں جھگڑتے ہوئے آرہا ہوگا۔ وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ (الصافات) اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی۔

فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ (الرحمٰن) تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ وہ ایسی حجت کے بارے میں نہیں بولیں گے جو انہیں لازم ہوگی بلکہ صرف اپنے گناہوں کے اقرار، ایک دوسرے کو ملامت کرنے، اور ایک دوسرے پر گناہ کا الزام ڈالنے کے حوالے سے گفتگو کریں گے البتہ انہیں حجت اور دلیل کے متعلق گفتگو اور کلام کی اجازت نہیں ہوگی۔

اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے ایک آدمی اکثر آپ کو مخاطب کرتا ہو اور اس کا خطاب حجت و دلیل سے خالی ہو تو اسے آپ کہتے ہیں: تو نے کوئی کلام کیا ہی نہیں، تو بولا ہی نہیں۔ لہٰذا جو آدمی بغیر حجت و دلیل کے بولا اسے کہا گیا کہ وہ بولا ہی نہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: وہ دن بہت لمبا ہوگا اور اس میں ٹھہرنے کے لیے کئی مقامات ہوں گے، جن میں سے بعض میں گفتگو کی ممانعت ہوگی اور بعض مقامات میں اجازت ہوگی۔ پس یہ صورت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کوئی نفس اس کی اجازت کے بغیر کلام نہیں کرے گا۔ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ یعنی نفوس میں سے یا لوگوں میں سے کچھ بدنصیب ہیں اور کچھ سعادت مند۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کو اپنے ارشاد یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ میں ذکر فرمایا ہے۔ شقی وہ ہے جس پر بدنصیبی لکھ دی گئی ہو اور سعید وہ ہے جس پر سعادت لکھ دی گئی ہو۔ لبید نے کہا:

فمنهم سعیدٌ آخذ بنصیبه ومنهم شقیٌّ بالمعیشة قانع

ان میں سے کوئی سعادت مند ہے جو اپنا حصہ وصول کر رہا ہے اور کوئی بدنصیب ہے زندگی پر قناعت کرنے والا ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: جب یہ آیت فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! ہم کس چیز کے مطابق عمل کرتے ہیں؟ کیا اس کے مطابق جن کاموں سے فراغت ہو گئی ہے یا جن سے فراغت نہیں ہوئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلکہ جس چیز سے فراغت ہو گئی ہے(1)، اے عمر اس کے مطابق قلم لکھ چکے ہیں لیکن جس کے لیے بندے کو پیدا کیا گیا ہے وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے"۔ ھذا حدیث حسن غریب من ھذا الوجه۔ ہم اس کو صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہی جانتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں یہ گزر چکی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا یہ مبتدا ہے۔ فَفِی النَّارِ یہ محل خبر میں ہے اور اسی طرح لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ابو العالیہ نے کہا: زفیر سینے سے (نکلی ہوئی آواز) ہے(2) اور شہیق حلق سے (نکلی ہوئی آواز) ہے۔ انہیں سے اس کے برعکس بھی مروی ہے۔ زجاج نے کہا: زفیر رونے کی شدت میں سے ہے اور شہیق بہت زیادہ بلند آواز سے رونے کی آواز ہے۔ زجاج نے

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138، حدیث نمبر 3036، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139

نے کہا ہے: کوفی اور بصری اہلِ لغت کا خیال یہ ہے کہ زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز ہے اور شہیق اس کی آخری آواز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے برعکس ارشاد فرمایا ہے: آپ نے فرمایا زفیر سخت آواز جب کہ شہیق کمزور آواز ہے(1)۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا: زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز کی طرح ہے اور شہیق اس کی آخری آواز ہے جب وہ ہینگنا ختم کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

حَشْرَجَ فِي الجَوفِ سَحِيلًا أو شَهَقْ حتّٰى يُقَالَ نَاهِقٌ وما نَهَقْ

سحیل اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھے کے سینے میں گھومتی ہے اور شہق حلق سے نکلی ہوئی آواز ہے۔

ایک قول یہ ہے: زفیر سانس کا نکلنا ہے اور وہ یہ ہے کہ پیٹ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے تو سانس کے ذریعے وہ نکلتا ہے اور شہیق اس کا واپس لوٹانا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: زفیر شدت غم سے سانس کو لوٹانا ہے یہ زفر سے ماخوذ ہے اور یہ پیٹھ پر بوجھ ہے اور شہیق لمبا کھنچا ہوا سانس ہے۔ یہ عربوں کے قول جبل شاھق سے ماخوذ ہے، یعنی لمبا اور بلند پہاڑ اور زفیر اور شہیق دونوں پریشان لوگوں کی آوازوں میں سے ہیں(2)۔

قولہ تعالیٰ: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ، مَا دَامَتِ ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ مراد دوام السموات والارض ہے اور تقدیر وقت ذالك ہے یعنی اس کا وقت آسمانوں اور زمین کا دوام ہے۔ اس کی تاویل میں اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا جس میں ضحاک بھی ہیں: معنی یہ ہے کہ جب تک جنت و دوزخ کے آسمان اور ان کی زمینیں ہیں۔ السماء ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تیرے اوپر ہے اور تیرے اوپر سایہ کیے ہوئے ہیں اور الْاَرْض جس پر تیرے قدم قرار حاصل کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے: وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ (زمر: 74) اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: ان سے مراد دنیا کے آسمان و زمین ہی ہیں اور عربوں کی عادت کے مطابق کسی چیز کے دوام اور ابدیت کے متعلق خبر دی جا رہی ہے۔ جس طرح ان کا قول: میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا جب تک رات ہے، یا پانی بہہ رہا ہے، جب تک رات اور دن کا اختلاف ہے، جب تک کبوتری کی آواز ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں، اور اس جیسے دیگر جملے جن سے وہ لا متناہی اور لمبا وقت مراد لیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آسمانوں اور زمین کے زوال کے ذریعے خبر دی مگر کفار کے ہمیشہ اس میں رہنے کی خبر دے دی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پیدا ہونے والی تمام چیزوں کی اصل عرش کے نور سے ہے(3)، اور آخرت میں آسمان اور زمین اسی نور کی طرف واپس لوٹ جائیں گے جس نور سے انہیں لیا گیا تھا، لہٰذا یہ دونوں عرش کے نور میں ہمیشہ دائمی ہیں۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یہ محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ استثنا منقطع ہے، اس کے بارے میں دس اختلافی اقوال ہیں۔ پہلا قول

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 208

یہ ہے کہ یہ فَفِي النَّارِ سے استثنا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سوائے اس کے کہ تیرا پروردگار کسی قوم سے اس کو موخر کرنا چاہے۔ اس قول کو ابونضرہ نے حضرت ابوسعید خدری یا حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے من شاء نہیں فرمایا کیونکہ مراد تعداد ہے اشخاص نہیں، جس طرح نکاح کے باب میں ما طاب لکم فرمایا جتنی تمہیں پسند آئیں۔ ابونضرہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے۔ ''مگر جن کو چاہے اللہ تعالیٰ داخل نہ کرے اگرچہ وہ نافرمانی کی وجہ سے بدنصیب ہی کیوں نہ ہوں''۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ استثنا نافرمان مومنین کے لیے ہے کہ انہیں دوزخ میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد نکال لیا جائے گا۔ اس اعتبار سے فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا کفار اور نافرمان مومنوں کے لیے عام حکم ہوگا اور خالدین سے ہی استثناء ہوگی۔ یہ حضرت قتادہ، ضحاک اور ابوسنان وغیرہ کا قول ہے۔ صحیح میں حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے(1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے حتی کہ جب وہ راکھ اور کوئلہ ہو جائیں گے تو انہیں اس سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ جہنمی ہیں''۔ سورۃ النساء میں یہ گزر چکا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ استثنا زفیر اور شہیق سے ہے، یعنی ''لهم فيها زفير و شهيق الا ما شاء ربك'' ان کے لیے زفیر اور شہیق ہے مگر جتنا تیرا پروردگار چاہے گا ان کے لیے عذاب کی وہ اقسام ہوں گی جن کو اللہ نے ذکر نہیں کیا، اسی طرح اہل جنت کے لیے وہ نعمتیں ہوں گی جن کا اس نے ذکر کیا اور جن کا ذکر نہیں کیا۔ اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے۔

چوتھا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اس میں نہ وہ مریں گے(2)، اور نہ ہی انہیں اس سے نکالا جائے گا۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اور وہ یہ ہے کہ وہ آگ کو حکم دے گا تو وہ انہیں کھا جائے گی اور فنا کر دے گی، پھر اللہ تعالیٰ دوبارہ نئے سرے سے ان کی تخلیق فرمائے گا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ قول کافر کے ساتھ خاص ہے اور اس کے لیے کھانے اور نئی تخلیق میں استثنا ہے۔

پانچواں: الا بمعنی سوی ہے جس طرح آپ کلام میں کہتے ہیں: ما معی رجل إلا زيد اور لی علیك الفا درهم الا الالف التی لی علیك میرے ساتھ کوئی آدمی نہیں سوائے زید کے اور میرا تیرے اوپر دو ہزار درہم ہے سوائے اس ایک ہزار کے جو میرا تیرے اوپر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تک آسمان اور زمین ہیں سوائے اس کے کہ جتنا تیرا رب خلود میں سے چاہے گا۔

چھٹا: یہ اخراج سے استثنا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ انہیں جہنم سے نکالے، جس طرح آپ گفتگو میں کہتے ہیں: أردتُ أن أفعل ذالك إلا إن شاء غیرہ اور حال یہ ہے کہ آپ اس فعل پر قائم ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر اس نے انہیں نکالنا چاہا تو وہ انہیں نکال لے گا لیکن اس نے انہیں بتا دیا ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ دو قول زجاج نے اہل لغت سے نقل کر کے ذکر کیے ہیں، اور کہا کہ اہل معانی کے دو اور قول بھی ہیں: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یعنی ان کی قبروں کے سرہانے پر ان کے موقف کی مقدار میں سے اور محاسبہ کے لیے، اور دنیا اور برزخ میں ان کے ٹھہرنے کی مقدار اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 505　　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 142

حساب کے لیے وقوف کی مقدار میں سے جتنا تیرا پروردگار چاہے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ استثنا کا وقوع نعمت اور عذاب پر زیادتی میں ہے تقدیر یہ ہوگی: وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا تیرا پروردگار چاہے گا اہل جنت کے لیے نعمتوں کی زیادتی اور اہل دوزخ کے لیے عذاب کی زیادتی میں سے۔

میں (قرطبی) نے کہا: دنیا میں آسمان اور زمین کے ہونے کی مدت کی مقدار خلود سے زیادتی میں یہ استثنا ہے اور اس کو ترمذی حکیم ابو عبداللہ محمد بن علی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی آسمان اور زمین کے دوام کی مقدار وہ جہنم میں رہیں گے، اور یہ دنیا کی موت ہے جب کہ آسمان اور زمین کے لیے ایسا وقت بھی ہے جس میں یہ تبدیل ہو جائیں گے، اللہ کا ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ (ابراہیم: 48) اس دن زمین دوسری زمین سے تبدیل کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی اور ان کے عامل پیدا کیے، ان میں سے کچھ کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خریدا، اور اس پر میثاق والے دن ان سے عہد لیا، جس نے عہد پورا کیا اس کے لیے جنت ہے، اور جو اپنی جان لے کر چلا گیا وہ دوزخ میں آسمان اور زمین کے دوام کی مقدار رہے گا، یہ دونوں معاملہ کے لیے رہیں گے، اسی طرح اہل جنت کا جنت میں خلود اس کی مقدار کے مطابق ہوگا، جب یہ معاملہ مکمل ہو جائے گا تو سارے کے سارے اللہ کی مشیت میں آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (الانبیاء) مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (الدخان: 39)

پس جنت و دوزخ دونوں کے باسی آسمان و زمین کے دوام کی مقدار رہیں گے، اس مقدار کے ساتھ یہ حق ربوبیت ہے، پھر ان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ یہی دونوں دار لازم فرما دے گا اور یہ حق احدیت کی وجہ سے ہے، پس جو اس کی احدیت کی وجہ سے موحد ہو کر اسے ملا تو وہ ہمیشہ اپنے دار میں باقی رہے گا، اور جو اس کی احدیت کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک ٹھہراتے ہوئے اسے ملا وہ ہمیشہ قید میں باقی رہے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خلود کی مقدار کے بارے میں بتا دیا، تو فرمایا: اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یعنی مدت کی اس زیادتی کے بارے میں جو اللہ چاہے گا جس زیادتی کا ادراک انسانی قلوب و اذہان کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ اس کی کوئی انتہا اور غایت نہیں۔ اعتقادی اعتبار سے ہمیشہ کے لیے دارین میں ان کا خلود دائمی ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الا بمعنی واؤ ہے۔ یہ فراء اور بعض اہل نظر کا قول ہے اور یہی آٹھواں قول ہے۔ معنی یہ ہوگا (1): دنیا میں آسمان و زمین کے دوام کی مدت پر خلود میں اضافے اور زیادتی میں سے جتنا تیرا رب چاہے گا۔ قرآن مجید میں الا بمعنی واؤ استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (الطور: 47) یعنی والذین ظلموا اور شاعر نے کہا:

وکلُّ　أخٍ　مفارقُه　أخوه　لعَمْرُ　أبيكَ　إلّا　الفَرقدان (2)

یہاں بھی الا الفرقدان بمعنی و الفرقدان ہے۔ ابو محمد مکی نے کہا: بصریوں کے نزدیک یہ بڑے دور کی بات ہے کہ الا بمعنی واؤ ہو۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے اس کا معنی ہے کما شاء ربك یعنی جس طرح تیرا رب چاہے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 22) یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 143　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 507

کماقد سلف یہ نواں قول ہے۔

دسواں: دسواں قول یہ ہے کہ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ میں استثنا کا استعمال صرف ایسے ہی ہے جیسا کہ ہر کلام میں اس کا استعمال مستحب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیۡنَ (الفتح: 27) اب یہ واجب میں استثناء ہے، اور یہ استثناء اسی طرح شرط کے حکم میں بھی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان شاء ربك اور اس کی صفت نہ متصل سے اور نہ ہی منقطع سے بیان کی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: عَطَآءً غَیۡرَ مَجۡذُوۡذٍ اس کی تائید کرتا ہے اور اسے تقویت دیتا ہے اور اس قسم کی دلیل ابوعبید سے بھی منقول ہے اس نے کہا: اس سے پہلے دارین میں فریقین کے خلود کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کی عزیمت گزر چکی ہے، فوراً بعد استثنا کا لفظ وارد ہو گیا ہے، جب کہ عزیمت خلود میں گزر چکی ہے۔ ابوعبید نے پھر کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیۡنَ (الفتح: 27) کی طرح ہے کہ یہ بات معلوم ہے کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر داخل ہوں گے۔ لہٰذا ان دونوں مقامات پر استثنا خیار کو ثابت نہیں کرتی، کیونکہ دارین میں خلود کے بارے میں اور مسجد حرام میں دونوں کے بارے میں مشیت عزیمت کے ساتھ گزر چکی ہے، فراء سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ اور گیارہواں قول یہ ہے کہ اشقیاء ہی سعداء ہیں اور سعداء ہی اشقیاء ہیں ان کے علاوہ نہیں، دو مقامات پر استثنا انہیں کی طرف راجع ہے، اور اس کی وضاحت اور بیان یہ ہے کہ ما بمعنی من ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والوں میں سے استثناء ان لوگوں کی کی ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے اپنے ایمان کی وجہ سے ان جہنمیوں میں سے نکل جائیں گے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہوں گے پھر دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائیں گے پس یہی لوگ ہیں جن پر دوسری استثنا واقع ہوئی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہو گا وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جس کو آپ کا پروردگار چاہے گا تو اسے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رکھے گا، یعنی فَاَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ لَهُمۡ فِیۡهَا زَفِیۡرٌ وَّشَهِیۡقٌ ۝ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ (ہود: 107) الا یخلدہ فیہا اور یہ وہ لوگ ہیں جو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اپنے ایمان اور محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکلیں گے۔ لہٰذا جہنم میں ان کے داخل ہونے کی وجہ سے انہیں شقی اور بدنصیب کہا گیا اور جنت میں ان کے داخلہ کی وجہ سے سعید اور خوش نصیب کہلائے، جس طرح ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: جو لوگ خوش بخت اور سعادت مند ہیں وہ دوزخ میں داخل ہونے کی وجہ سے بدنصیب اور شقی ہو گئے پھر دوزخ سے نکلنے اور جنت میں داخل ہونے کی وجہ سے سعادت مند ہو گئے۔

اعمش، حفص، حمزہ اور کسائی نے وَاَمَّا الَّذِیۡنَ سُعِدُوۡا سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے کہا: اس کے سعدوا ہونے پر دلیل یہ ہے کہ پہلا شقوا ہے اشقوا نہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ وہ کسائی کی قراءت سعدوا پر تعجب کا اظہار کرتے حالانکہ کسائی عربی کو جانتے تھے، اگر یہ بولنے کی طرز تھی تو درست نہیں، کیونکہ سعد فلان و أسعدہ اللہ، و أسعد بروزن امرض کہا جاتا ہے، کسائی نے ان کے قول مسعود سے استدلال کیا ہے حالانکہ اس میں ان کے لیے کوئی

حجت نہیں، کیونکہ مکان مسعود فیہ کہا جاتا ہے پھر اس میں سے فیہ کو حذف کر دیا جاتا اور مسعود نام بن گیا۔ مہدوی نے کہا: جس نے سعدوا کی سین کو ضمہ دیا تو اس صورت میں یہ عربوں کے قول مسعود پر محمول ہوگا، اور یہ شاذ اور قلیل ہے، کیونکہ سعدہ اللہ نہیں کہا جاتا بلکہ صرف "أسعدہ اللہ" کہا جاتا ہے۔ ثعلبی نے کہا: سعدوا سین کے ضمہ کے ساتھ کا مطلب ہے رزقوا السعادۃ کہ انہیں سعادت عطا فرمائی گئی۔ سعد اور اسعد ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ باقی لوگوں نے سعدوا کو شقوا پر قیاس کرتے ہوئے سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

جوہری نے کہا: سعادت، شقاوت کے خلاف ہے۔ آپ سعد الرجل فھو سعید کہتے ہیں جیسے سلم اور سلیم ہے اور سعد فھو مسعود اس میں مسعد نہیں کیا جاتا، گویا وہ مسعود کے ذریعے اس سے مستغنی ہو گئے۔

ابو نصر عبد الرحیم قشیری نے کہا: سعدہ اللہ فھو مسعود اور أسعدہ اللہ فھو مسعد بھی وارد ہوا ہے، یہ کوفیوں کے قول کو تقویت دیتا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جس طرح شقی فلان نہیں کہا جاتا اسی طرح سعد فلان بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ متعدی نہیں۔ "عطاء غیر مجذوذ، غیر مجذوذ" سے مراد غیر مقطوع ہے (1) یعنی نہ ختم ہونے والی عطا، یہ جَذَّ یَجُذُّ سے ہے جس کا معنی ہے اس نے کاٹا، نابغہ نے کہا:

تَجُذُّ السَّلُوقِیَّ المضاعَفَ نَسْجُهُ ... وتُوقِدُ بالصُّفَّاحِ نارَ الحُبَاحِبِ

تَجُذُّ کا معنی ہے وہ کاٹتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تَكُ نہی کی وجہ سے مجزوم ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے نون کو حذف کر دیا گیا ہے۔ فِيْ مِرْيَةٍ یعنی شک میں۔ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ یعنی اے سننے والے! جن معبودوں کی یہ عبادت کرتے ہیں ان کے باطل ہونے میں تو شک میں مبتلا نہ ہو جا۔ اور اس سے بھی خوبصورت اور عمدہ بات یہ ہے۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس آدمی کو فرما دیجئے جو شک میں ہے: فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات کا حکم نہیں دیا۔ پس یہ ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباء و اجداد نے ان کی عبادت کی تو یہ ان کی تقلید کرتے ہیں۔ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ان کے بارے میں تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ رزق میں ان کا حصہ مراد ہے (2)۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عذاب میں ان کا حصہ مراد ہے (3)۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ خیر اور شر میں سے جن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے وہ مراد ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب پھر اختلاف کیا جائے گا اس میں اور اگر ایک بات پہلے طے نہ کر

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 145
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 507
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 146

دی گئی ہوتی آپ کے پروردگار کی جانب سے تو فیصلہ کر دیا گیا ہوتا ان کے درمیان اور بے شک وہ ایسے شبہ میں ہیں اس کے متعلق جو بے چین کر دینے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ قیامت تک ان سے عذاب کو مؤخر کر دیا جائے کیونکہ اسی میں صلاح اور بہتری معلوم ہوتی ہے، اگر یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان ان کی اجل کا فیصلہ ہو جاتا کہ مومن کو ثواب دیا جائے اور کافر کو سزا، ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ مراد ہے یا اس صورت میں وہ مصدق اور مکذب کے درمیان تھے۔ ایک قول یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی ذات کے بارے میں ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان اگر عقاب میں جلدی کے بارے میں فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو عذاب نازل کر دیا جاتا لیکن اس امت سے قیامت تک عقاب کی تاخیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر حکم لگاتے ہیں یعنی یہ کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں شک میں تھے تو یہ قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾

''اور یقیناً ان سب (اختلاف کرنے والوں) کو پورا پورا بدلہ دے گا انہیں آپ کا رب ان کے کرتوتوں کا، بے شک اللہ تعالیٰ جو کام وہ کرتے ہیں ان سے خوب آگاہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ یعنی وہ تمام قومیں جنہیں ہم نے شمار کیا ہے اپنے اعمال کی جزاء کو دیکھ لیں گی۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح آپ کی قوم بھی دیکھ لے گی۔ وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل حرمین، نافع، ابن کثیر اور ان کے ساتھ ابو بکر نے وان کلا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے ان مثقلہ سے مخففہ مُعْمَلہ بنایا ہے۔ خلیل نحوی اور سیبویہ نے بھی اسے ذکر کیا ہے، سیبویہ نے کہا: ہمیں ایک ایسے آدمی نے بیان کیا ہے جس پر میں اعتماد کرتا ہوں کہ اس نے عربوں کو اِنْ زیدًا لَمنطلقٌ کہتے سنا ہے۔ اور شاعر کا شعر بھی بطور استدلال اس نے پڑھا:

كَاَنْ ظَبِیَةً تَعْطُو اِلٰی وَارِقِ السَّلَمْ

اس کی مراد کانہا ظبیة ہے یعنی اس کو مخفف کر دیا اور مابعد کو نصب دے دی، بصری أن مشددہ کو عاملہ بناتے ہوئے بھی اس کی تخفیف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جب کہ کسائی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا: میں نہیں جانتا کہ کس بنیاد پر وان کلا پڑھا گیا ہے اور فراء کا خیال یہ ہے کہ جس نے تخفیف کی ہے اس نے کلا کو لَیُوَفِّیَنَّهُمْ کی وجہ سے نصب دی ہے وان لیوفینهم کلا جب کہ تمام نحویوں نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے: یہ بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے۔ کسی کے نزدیک بھی زیدا لاضربنه جائز اور صحیح نہیں ہے اور باقیوں نے ان کو مشدد پڑھا اور کلا کو اس کی اصل کے مطابق اس کے ذریعے نصب دی ہے۔ اور عاصم، حمزہ اور ابن عامر نے لما کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ان کلا لیوفینهم کے معنی پر اسے مخفف پڑھا ہے،

اور ما کو انہوں نے صلہ بنایا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے یہ ان دو لاموں کے درمیان فاصلہ کرنے کے لیے آیا ہے جو قسم پر آتی ہیں، اور وہ دونوں مفتوح ہیں تو ان کے درمیان ما کے ذریعے فاصلہ کیا گیا۔ زجاج نے کہا: لما کی لام تو ان کی وجہ سے ہے جب کہ ما زائدہ مؤکدہ ہے، جیسے آپ ان زیدا لمنطلق کہتے ہیں۔ ان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اسم یا خبر پر لام داخل ہو جیسے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (التوبہ) اور اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى (ق: 37) اور لَیُوَفِّیَنَّهُمْ میں موجود لام وہ ہے جس کے ذریعے قسم کے ساتھ ملا جاتا ہے، یہ فعل پر داخل ہوتی ہے اور اسے نون مشددہ یا مخففہ لازم کر دیتی ہے اور جب دو لامیں جمع ہو گئیں تو ان کے درمیان ما کے ذریعے فاصلہ کیا گیا اور ما زائدہ مؤکدہ ہے۔ فراء نے کہا: ما بمعنی من ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ (النساء: 72) میں ہے یعنی وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ اور لَیُوَفِّیَنَّهُمْ میں لام قسم کے لیے ہے۔ اس کا معنی زجاج کے قول کے مطابق ہے البتہ یہ فرق ہے کہ زجاج کے نزدیک ما زائدہ ہے جب کہ فراء کے نزدیک ما بمعنی من اسم ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ زائدہ نہیں، بلکہ یہ اسم ہے اور اس پر لام تاکید داخل ہوئی اور یہ ان کی خبر ہے جب کہ لَیُوَفِّیَنَّهُمْ جواب قسم ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: وان کلا خلق لیوفینهم ربك أعمالهم یقیناً سب کے سب مخلوق ہیں تیرا رب ضرور انہیں ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اور ایک قول کے مطابق ما بمعنی من ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: 3) میں ما بمعنی من ہے۔ اور یہ سارے کا سارا بعینہ فراء کا قول ہے۔ اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے لما اور ان دونوں کو مشدد یعنی وانّ کلا لمّا پڑھا ہے۔ اور وہ حمزہ اور اس کی موافقت کرنے والے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ ایک لہجہ ہے، جو محمد بن زید سے منقول ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ ان زیدا الا لاضربنه نہیں کہا جاتا اور نہ ہی ان زیدا لمّا لضربته کہا جاتا ہے اور کسائی نے کہا: اس قراءت کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کسائی اور ابوعلی فارسی نے یہ بھی کہا ہے: ان دونوں کو مشدد پڑھنا مشکل ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا: نحویوں کے اس بارے میں کئی اقوال ہیں۔

پہلا: اس کی اصل لمن ما ہے نون کو میم سے بدلا، تین میمیں جمع ہو گئیں تو درمیان والی کو حذف کر دیا گیا تو لما بن گیا اس قول کے مطابق ما بمعنی مَن ہے اور اس کی تقدیر وان کلا لمن الذین ہے، جس طرح کہ ان کا یہ قول:

وانّي لمّا أصدِرُ الأمرَ وجهَهُ إذا هو أعْيَا بالسَّبيلِ مَصادِرُه

اس شعر میں لما کی یہی صورتحال ہے۔

زجاج نے اس قول کو نا کارہ قرار دیا ہے اور کہا: من دو حرفوں پر مشتمل ایک اسم ہے لہٰذا اس کا حذف جائز نہیں۔

دوسرا: اصل لمن ہے اجتماع میمات کی وجہ سے میم مکسورہ کو حذف کر دیا گیا، تقدیر عبارت وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: لما، لم کا مصدر ہے اور وصل کو وقف پر محمول کرتے ہوئے بغیر تنوین کے آیا ہے، اس بنیاد پر یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر) کی طرح ہے اکلا لما سے مراد مال ماکول کو جامع ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت: وانّ کلا لیوفینهم ربك أعمالهم توفیة لمّا ہو گی۔ اور معنی ہو گا: ان سب کے اعمال کو جامع، اور یہ آپ کے قول:

قیاماً اور قومن کی طرح ہے۔ اور زہری نے اس معنی کی بنیاد پر لمّا تشدید اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔

تیسرا: لمّا، اِلّا کے معنی میں ہے اہل لغت نے حکایت کیا ہے: سالتك بالله لما فعلت یعنی اِلّا فعلت اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ﴿﴾ (الطارق) اسی کی طرح ہے یعنی الا علیہا حافظ تو آیت کا معنی یہ ہوگا: ان میں سے کوئی بھی نہیں مگر وہ انہیں ضرور پورا پورا بدلہ دے گا۔ ماکل واحد منهم الا لیوفینهم۔ قشیری نے کہا: زجاج نے اس قول کو اس بنیاد پر ناکارہ قرار دیا ہے کہ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا میں نفی ہے ہی نہیں کہ اِلّا کو مقدر مان لیا جائے اس پر دلیل یہ ہے کہ ذهب الناس لما زید، تو نہیں کہا جاتا (یعنی بغیر نفی کے الا نہیں آتا)۔

چوتھا: ابوعثمان مازنی نے کہا: اصل میں وَاِنَّ كُلًّا لَمَا، لَمَّا کی تخفیف کے ساتھ ہے پھر اس پر شد ڈال دی گئی، جس طرح کہ یہ شعر ہے:

لقد خَشِيتُ أنْ أرى جِدَبَّا ... فی عامِنَا ذا بعدَ ما أخْصَبَّا

اس میں جدبا، لقد اخصبا اصلاً بغیر شد کے ہیں بعد میں ان کو مشدد کر دیا گیا ہے۔

ابواسحاق زجاج نے کہا: یہ غلط ہے: مثقل کو تو مخفف بنایا جاتا ہے مگر مخفف کو مثقل نہیں بنایا جاتا۔

پانچواں: ابوعبید قاسم بن سلام نے کہا: ہوسکتا ہے کہ تشدید عربوں کے اس قول کے قبیل سے ہو: لَمَمْتُ الشیءَ أَلُمُّهُ لَمًّا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ اس چیز کو جمع کر لیں، پھر اس سے فعلی کا وزن بنا لیا گیا ہو جس طرح ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا (المومنون: 44) پڑھا جاتا ہے، یہ تنوین اور بغیر تنوین دونوں طرح آتا ہے، اس بنیاد پر الف تانیث کا ہوگا، اصحاب امالہ کے نزدیک اس قول پر امالہ کیا جائے گا۔

ابواسحاق نے کہا: وہ بات کہ جس کے علاوہ میرے نزدیک کوئی اور جائز ہی نہیں وہ یہ ہے کہ یہ مخففہ من مثقلہ ہو اور ما کے معنی میں ہو جس طرح اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ﴿﴾ (الطارق) ہے اور اسی طرح اپنی اصل کے مطابق یہ مشدد بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں بھی یہ بمعنی ما ہوگا اور لما بمعنی الا ہوگا۔ یہ خلیل، سیبویہ اور تمام مصریوں سے منقول ہے۔ اور لما بمعنی الا استعمال ہوتا رہتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ قول جس کو زجاج نے پسند کیا ہے اسے زجاج سے نحاس وغیرہ نے بیان کیا ہے، اسی جیسا قول اور زجاج کا اسے ضعیف قرار دینا گزر چکا ہے البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اس قول میں ان نافیہ ہے اور وہاں مخففہ من مثقلہ ہے پس دونوں میں فرق ہے۔ اب دو قراءتیں باقی رہ گئیں۔ ابوحاتم نے کہا: ابی کے حرف میں وان کل الا لیوفینهم ہے اور اعمش سے وَاِنۡ كُلٌّ لَّمَّا مروی ہے یعنی ان کی تخفیف کل کے رفع اور لما کی تشدید کے ساتھ۔ نحاس نے کہا: یہ قراءتیں جماعت کے مخالف ہیں اس میں ان بمعنی ما ہوگا اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی، کیونکہ جماعت کے مخالف سوائے اس طریقے کے پڑھنا جائز نہیں۔ اِنَّهٗ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

فَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَمَنۡ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطۡغَوۡا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۱۲﴾

"پس آپ ثابت قدم رہیے جیسے حکم دیا گیا ہے آپ کو اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جو تائب ہو کر آپ کے ہمراہ ہیں اور سرکشی نہ کرو بے شک جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے خوب دیکھ رہا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر لوگوں کو خطاب ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: استقم یعنی میں اللہ تعالیٰ سے دین پر قائم رہنے کی گزارش کرتا ہوں اور اس سے اس بات کا سوال کرتا ہوں لہٰذا استقم کی سین سوال کی سین ہوگی۔ جس طرح آپ استغفر اللہ کہتے ہیں یعنی میں مغفرت طلب کرتا ہوں۔ دائیں، بائیں کی طرف سے کوئی چیز لیے بغیر صرف ایک ہی جہت میں استمرار اختیار کرنا استقامت کہلاتا ہے، یعنی اللہ کے امر کی بجا آوری پر ثابت قدم رہیے۔ صحیح مسلم میں حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی سے روایت ہے انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتائیے جس کے متعلق میں آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں؟ آپ نے فرمایا: قل اٰمنتُ باللہ ثم استقم کہہ دو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم ہو جا(1)۔

ابو محمد دارمی نے عثمان بن حاضر ازدی سے اپنی مسند میں روایت بیان کی ہے اس نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا تو میں نے کہا: مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ کا تقویٰ اور استقامت کو لازم پکڑ، اتباع کر اور بدعت اختیار نہ کر۔ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ یعنی آپ بھی ثابت قدم رہیں اور جو آپ کے ساتھ تائب ہو کر آئے ہیں ان سے مراد آپ کے وہ صحابہ ہیں، جنہوں نے شرک سے توبہ کی اور ان کے بعد آپ کی امت میں سے جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی بھی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی جو آپ پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شدید ہو، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ نے جب آپ کو عرض کی کہ آپ پر بڑی تیزی سے بڑھاپا آ گیا ہے تو آپ نے انہیں فرمایا: "مجھے (سورت) ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ سورت کے آغاز میں یہ گزر چکا ہے۔

ابو عبد الرحمن سلمی سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے ابو علی سری کو کہتے ہوئے سنا ہے: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "مجھے ہود نے بوڑھا کر دیا"۔ آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ میں نے آپ کو عرض کیا: اس میں سے کس چیز نے آپ کو بوڑھا کیا؟ انبیاء کے قصص نے یا امتوں کی ہلاکت نے؟ آپ نے فرمایا: "نہیں، اللہ کے ارشاد فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے"۔ وَلَا تَطْغَوْا سرکشی سے نہی ہے۔ طغیان، حد کو تجاوز کرنا ہے، اسی سے اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) ہے جب پانی نے حد سے تجاوز کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ کسی پر بھی جبر نہ کرو۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 48

''اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ورنہ چھوئے گی تمہیں بھی آگ، اور (اس وقت) نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْٓا، رکون کی حقیقت کسی چیز سے سکون حاصل کرنا، اس پر اعتماد کرنا، اس کی طرف جھکنا اور اس پر راضی ہونا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت نہ کرو اور ان کی اطاعت نہ کرو (1)۔ ابن جریج نے کہا: ان کی طرف جھکاؤ اختیار نہ کرو۔ ابو العالیہ نے کہا: ان کے اعمال کو پسند نہ کرو (2)۔ یہ تمام کے تمام قریب قریب ہیں۔ ابن زید نے کہا: یہاں رکون سے مراد مداہنت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر ان کے کفر کو وہ ناپسند نہ کرے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور نے تَرْكَنُوْٓا کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو نے کہا: یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ طلحہ بن مصرف، قتادہ اور دیگر لوگوں نے تَرْكُنُوْٓا کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، فراء نے کہا: یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔ اور بعض لوگوں نے رَكِنَ يَرْكَنُ بروزن مَنَعَ يَمْنَعُ کو بھی جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مشرکین ہیں جب کہ ایک قول کے مطابق اس سے مراد عام کافر اور نافرمان لوگ ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا الآیۃ (الانعام: 68) ہے۔ اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے گا جو ہماری آیتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کے معنی میں یہی صحیح ہے اور یہ کفار اور بدعتیوں میں سے نافرمان لوگوں کو چھوڑنے پر دلالت کرتی ہے۔ یقیناً ان کی صحبت کفر یا معصیت ہے، کیونکہ صحبت صرف محبت ہی سے ہوتی ہے، ایک حکیم نے کہا ہے:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرينه　　فكلُّ قرينٍ بالمقارن يقتدي

آدمی کے بارے میں نہ پوچھ، ان کے دوست کے بارے میں پوچھ، ہر دوست اپنے دوست کی اقتدا کرتا ہے۔

اور اگر صحبت صرف ضرورت یا تقیہ کی بنیاد پر ہو تو اس کے بارے میں سورۂ آل عمران اور المائدہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اور مجبوری کی حالت میں تقیہ پر ظالم کی صحبت نہی سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی ان کے ساتھ ملنے، صحبت اختیار کرنے، ان کے اعراض کے باوجود ان کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے اور ان کے معاملات میں ان کی موافقت کرنے کی وجہ سے آگ تمہیں بھی جلائے گی۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝

''اور قائم کیجئے نماز دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات کے حصوں میں، بے شک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو، یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1066　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 508

اس میں چھ مسائل ہیں:۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ اہل تاویل میں سے کسی نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا کہ اس آیت میں نماز سے مراد فرض نمازیں ہیں۔ اور ان کو بالخصوص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایمان کی ثانی ہیں اور مشکلات میں انہیں کی پناہ تلاش کی جاتی ہے، نبی کریم ﷺ جب بھی کوئی مصیبت و پریشانی آتی تو آپ نماز کی پناہ لیتے تھے۔ صوفیاء کے شیوخ نے کہا ہے: اس آیت سے فرض اور نفل عبادت میں اپنے سارے اوقات کو صرف کرنا مراد ہے (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے، یقیناً امر اس بات کو شامل نہیں حتیٰ کہ نہ واجب کو اور نہ ہی نفل کو شامل ہے۔ اوراد معلوم ہیں اور وہ اوقات جن میں نوافل کی ترغیب دی گئی ہے وہ محدود ہیں، ان کے علاوہ جتنے اوقات ہیں وہ مستحب اوقات ہیں بدل کی بنا پر نہ کہ عمومیت کی بنا پر اور یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: طَرَفَيِ النَّهَارِ مجاہد نے کہا: پہلی طرف صبح کی نماز ہے (2)، اور دوسری طرف ظہر اور عصر کی نماز ہے۔ اس کو ابن عطیہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ دو طرفیں صبح اور مغرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت حسن ہی سے مروی ہے: دوسری طرف صرف عصر ہے اور حضرت قتادہ و ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: دو طرفیں ظہر اور عصر ہیں۔ اور زلف سے مغرب، عشاء اور صبح مراد ہے۔ گویا اس کہنے والے نے قراءت کے جہر کی رعایت کی ہے۔ ماوردی نے بیان کیا ہے کہ طرف اوّل بالاتفاق صبح کی نماز ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس اتفاق کو اس سے پہلے والا قول توڑ دیتا ہے اور طبری نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ دو طرفوں سے مراد صبح اور مغرب ہے اور یہ ظاہر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ مغرب اس میں داخل نہیں کیونکہ یہ رات کی نماز ہے۔ ابن عربی نے کہا: طبری سے تعجب ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کو دو طرفیں خیال کر لیا ہے حالانکہ یہ دونوں رات کی طرفیں ہیں۔

فقلب القوس ر کوۃ وحاد عن البرجاس غلوۃ

طبری نے کہا: اس پر دلیل تمام لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو طرفوں میں سے ایک صبح ہے، تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ دوسری طرف مغرب ہے، اور اس بات پر ان کے ساتھ کوئی بھی جمع نہیں ہوا۔

میں (قرطبی) نے کہا: رد کے سلسلہ میں یہ ابن عربی کی طرف سے ایک تکلیف وہ بات ہے جو انہوں نے اپنے ذمے لے لی ہے کہ اس بات پر ان کے ساتھ کوئی بھی جمع نہیں ہوا، ہم نے مجاہد سے ذکر کیا کہ طرف اوّل صبح کی نماز ہے، اس بات پر اتفاق ہے کہ جس نے طلوع فجر کے بعد کھا لیا یا جماع کر لیا تو اس کا وہ دن فطر کا دن ہوگا، اور اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ اور یہ جان بوجھ کر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب طلوع فجر کے بعد والا وقت دن کا حصہ ہو۔ تو صبح کے سلسلہ میں تو جو طبری نے کہا یہ اس کی صحت پر دال ہے، اب اس پر صرف مغرب کا اعتراض باقی ہے اور اس سلسلہ میں اس کی تردید پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1069
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1068

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ یعنی رات کے حصے میں اور زلف سے مراد وہ گھڑیاں ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ اس سے مزدلفہ کا نام مزدلفہ ہے، کیونکہ وہ عرفہ کے بعد ایک ایسا مقام ہے جو مکہ کے قریب ہے۔ ابن قعقاع اور ابن ابی اسحاق وغیرہ نے وزلفالام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے زلیف کی جمع کہا ہے، کیونکہ یہ زلیف کے ساتھ بولا جاتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا واحد زلفۃ ہو جیسے بسر، کا اور بسرۃ اس آدمی کی لغت کے مطابق ہوگا جو سین کو ضمے کے ساتھ پڑھتا ہے۔ ابن محیصن نے وَ زُلۡفًا مِّنَ الَّيۡلِ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور واحد زلفۃ ہے جیسے درۃ اور در، اور برۃ اور بر۔ اور مجاہد اور ابن محیصن نے زلفی بروزن قربیٰ بھی پڑھا ہے اور باقیوں نے وزلفالام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے غرفۃ اور غرف۔ ابن اعرابی نے کہا: زلف سے مراد ساعات ہے، اس کا واحد زلفۃ ہے اور ایک قوم نے کہا ہے: زلفۃ سورج کے غائب ہونے کے بعد رات کے پہلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں زلف اللیل سے مراد رات کی پہلی تہائی کی نماز یا عشاء کی نماز ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔ ایک قول کے مطابق مغرب، عشاء اور صبح ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اخفش نے کہا: اس سے رات کی نماز مراد ہے البتہ معین نہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ صحابہ و تابعین میں سے جمہور مفسرین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہاں حسنات سے مراد پانچ نمازیں ہیں (1)۔ مجاہد نے کہا: حسنات سے مراد آدمی کا سبحان اللہ، والحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: نیکیوں میں یہ مثال کے طریقہ پر ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اس چیز کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ لفظ حسنات میں عام ہے اور سیئات میں خاص، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تو نے کبائر سے اجتناب نہیں کیا“ (2)۔

میں (قرطبی) نے کہا: سبب نزول جمہور کے قول کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ انصار کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، ایک قول کے مطابق وہ ابوالیسر بن عمرو تھا۔ ایک قول یہ ہے: اس کا نام عباد تھا، اس نے کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار کی، اسے بوسہ دیا اور فرج کے علاوہ اس نے اس کے ذریعہ لطف حاصل کیا۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: میں نے مدینہ کے کنارے میں ایک عورت کو گرا لیا اور میں نے جماع کے سوا اس کے ساتھ سب کچھ کر لیا اور اب میں حاضر ہوں آپ میرے بارے میں جو چاہیں فیصلہ فرما دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: اللہ نے تیری پردہ پوشی کی تھی، تو بھی اپنے اوپر پردہ ڈال لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب ارشاد نہیں فرمایا۔ وہ آدمی چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے بندہ بھیج کر اسے بلوایا، اور اس کے سامنے وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ ۞ کی تلاوت فرمائی۔ قوم میں سے ایک شخص نے کہا: کیا یہ حکم اس کے ساتھ خاص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں بلکہ یہ تمام لوگوں کے لیے ہے“ (3)۔ ترمذی نے کہا: حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ ایک آدمی نے ایک عورت کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1070
2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139
3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139۔ ایضاً، حدیث نمبر 3037، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بوسہ لے لیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے کفارہ کے متعلق پوچھنے کے لیے آیا تو وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آدمی نے کہا: کیا یہ حکم میرے لیے ہی ہے اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے لیے اور میری امت میں سے جس نے بھی یہ کام کیا''۔ ترمذی نے کہا: ہذا حدیث حسن صحیح۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے کہا: میرے پاس ایک عورت کھجور خریدنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا: کمرے میں اس سے زیادہ عمدہ کھجور پڑی ہے تو وہ میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اسے بوسہ دے دیا، میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے بھی فرمایا: اپنے اس واقعہ کو چھپا، توبہ کر اور کسی کو اس کے بارے میں خبر نہ دے پس مجھ سے صبر نہ ہوسکا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی غازی کے گھر والوں کی اس کی غیر حاضری میں خبر گیری کی ہے''(1)۔ حتیٰ کہ میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میں اس وقت اسلام لایا ہوتا اور میں نے یہ گمان کیا کہ میں دوزخیوں میں سے ہوں۔ راوی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر جھکا کر بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ وحی نازل فرمائی: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ۝ حضرت ابوالیسر نے کہا: میں آپ کے پاس آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ میرے سامنے پڑھی تو آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا یہ صرف ان کے لیے خاص ہے یا تمام لوگوں کے لیے عام حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام لوگوں کے لیے عام ہے''(2)۔ حضرت ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے، وکیع وغیرہ نے قیس بن ربیع کو ضعیف قرار دیا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توجہ ہٹالی اور عصر کی نماز ادا کی گئی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور فرمایا: ''کیا تم ہمارے ساتھ نماز میں حاضر تھے''(3)؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''جا یہ تیری کارروائی کا کفارہ ہوگیا ہے''(4)۔ اور روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی تو فرمایا: ''اٹھو اور چار رکعت ادا کرو''(5)۔ واللہ اعلم۔

اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ''نوادر الاصول'' میں بیان کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے پرانے گناہ کے لیے نئی نیکی سے از روئے طلب کے زیادہ خوبصورت اور ادراک کے اعتبار سے زیادہ تیز کوئی چیز نہیں دیکھی (6)۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ۔

مسئلہ نمبر 5۔ یہ آیت کریمہ بمعہ ان احادیث کے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حرام بوسہ اور حرام لمس کی صورت میں حد واجب نہیں ہوتی۔ اور اس کے ذریعے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں پر کوئی حد اور تادیب نہیں ہوگی

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139۔ ایضاً، حدیث نمبر 3039، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 3040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1070

4۔ ایضاً۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　5۔ ایضاً　　6۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 120

اگرچہ وہ دونوں ایک ہی کپڑے میں پائے گئے۔ یہ ابن منذر کا مختار مسلک ہے، کیونکہ جب اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کیا گیا تو اس حدیث کو اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ذکر کر دیا جائے گا کہ ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، اور سورۂ نور میں اس کی تفصیل آئے گی کہ علماء نے اس کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نماز کو رکوع، سجود، قیام، قراءت اور اسماء سمیت اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ، الایۃ نماز قائم کرو۔ فرمایا اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الایۃ (الاسراء: 78) سورج کے ڈھلتے وقت نماز قائم کرو۔ فرمایا: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ (الروم) شام کے وقت اور صبح کے وقت اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝ (الروم) اور آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہے اور عشاء کے وقت اور ظہر کے وقت اس کی تسبیح بیان کرو۔ فرمایا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ: 130) اپنے رب کی تسبیح بیان کر سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔ فرمایا: رکوع کرو اور سجدہ کرو یعنی ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا (الحج: 77) فرمایا: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ (البقرہ) اور اللہ کی خاطر ڈرتے ہوئے قیام کرو۔ فرمایا: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔ اور فرمایا وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا (الاسراء: 110) یعنی نماز میں بلند آواز سے قراءت نہ کر اور نہ ہی انتہائی پست آواز میں قراءت کرو۔ یہ سارے کا سارا اجمال ہے اور اس کی وضاحت اور بیان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا، اور ارشاد فرمایا: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44) اور ہم نے آپ پر ذکر (یعنی قرآن) اتارا تاکہ جو ان کی طرف اتارا گیا آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت صلوٰۃ، رکعات اور سجدوں کی تعداد، پوری نماز کا طریقہ، اس کے فرائض، سنتیں اور فرائض میں سے جن کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں اور جو اس میں سنن اور فضائل وغیرہ میں سے مستحبات ہیں انہیں بیان فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''صلوا کما رأیتمونی أصلی'' (1) اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اور آپ سے مکمل تفصیلات منقول ہوئیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے پہلے لوگوں کی ضرورت کے جملہ معاملات کو بیان فرما دیا۔ دین مکمل ہو گیا، اور آپ نے راستہ واضح فرما دیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: 3) آج تمہارے لیے میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند کر لیا۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ یعنی قرآن نصیحت اور توبہ ہے اس آدمی کے لیے جو نصیحت حاصل کرے۔ اور نصیحت حاصل کرنے والوں کو قرآن کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور الذکری مصدر ہے جو الف تانیث کے ساتھ آیا ہے۔

وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 88

أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور آپ صبر کیجئے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکوں کے اجر کو۔ تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان امتوں میں جو تم سے پہلے گزری ہیں ایسے زیرک لوگ ہوتے جو روکتے زمین میں فتنہ وفساد برپا کرنے سے مگر وہ قلیل تھے جنہیں ہم نے نجات دی تھی ان سے اور پیچھے پڑے رہے ظالم اس عیش وطرب کے جس میں وہ تھے اور وہ مجرم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اصْبِرْ یعنی نماز پر صبر کیجئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ: 132) اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر کریں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! آپ کو جو تکلیف اور اذیت ملے اس پر صبر کیجئے۔ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ، محسنین سے مراد نماز قائم کرنے والے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: فَلَوْلَا كَانَ، لولا بمعنی ھلا ہے۔ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ، قرون سے مراد امتیں اور قومیں ہیں یعنی ان امتوں میں سے جو تم سے پہلے تھیں۔ أُولُوْا بَقِيَّةٍ یعنی اطاعت، دین، عقل اور بصیرت والے لوگ (1)۔ يَّنْهَوْنَ اپنی قوموں کو روکتے۔ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ یعنی اس عقل کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھی اور انہیں اپنی نشانیاں اور آیات دکھائی تھیں۔ یہ کفار کے لیے زجر وتوبیخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں لولا نفی کے لیے ہے، یعنی ما کان من قبلکم سے پہلے نہیں تھے۔ جیسے اللہ کا ارشاد فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ (یونس: 98) یعنی ما کانت قریۃ آمنت کوئی بستی نہیں جو ایمان لائی ہوتی۔ إِلَّا قَلِيْلًا استثنا منقطع ہے اس سے مراد لکن قلیلا ہے۔ مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ کہ وہ زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ ایک قول یہ ہے: یہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ (یونس: 98) فرمایا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ انبیاء کے متبعین اور اہل حق ہیں۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی انہوں نے شرک کیا اور نافرمانی کی۔ مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ یعنی مال اور لذات میں مشغول رہنے میں سے اور ان چیزوں کو آخرت پر ترجیح دینے جیسے کاموں میں پڑے رہے۔ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ اور وہ مجرم تھے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کر دے بستیوں کو ظلم سے حالانکہ ان میں بسنے والے نیکوکار ہوں۔ اور اگر چاہتا آپ کا رب تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک ہی امت (لیکن حکمت کا یہ تقاضا نہیں اس لیے) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ اس فتنہ سے محفوظ رہیں گے) اور اسی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 510

(رحمت) کے لیے انہیں پیدا فرمایا ہے اور پوری ہوگئی آپ کے رب کی (یہ) بات کہ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جن وانسان (دونوں) سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کر دے بستیوں یعنی بستیوں والوں کو۔ القری سے مراد اھل القری ہے۔ بِظُلْمٍ یعنی شرک اور کفر سے وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ یعنی ان کے درمیان حقوق کی باہم ادائیگی ہو رہی ہو، یعنی ایسا نہیں کہ وہ انہیں صرف کفر کی وجہ سے ہلاک کرے یہاں تک کہ اس کے ساتھ ساتھ فساد بھی برپا ہو جائے، جس طرح مثلاً اس نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو کم تولنے کی وجہ سے ہلاک کیا اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو لواطت کی وجہ سے ہلاک کیا، اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا میں شرک کی نسبت نافرمانی اور گناہ ہلاکت و بربادی کے عذاب تک پہنچانے میں زیادہ کردار ادا کرتے ہیں، اگرچہ آخرت میں شرک کا عذاب زیادہ مشکل ہوگا۔ صحیح ترمذی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''لوگ جب ظالم کو دیکھتے ہیں اور اپنے سامنے اسے نہیں پکڑتے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے سب پر عذاب کو عام کر دے''(1)۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو برباد کر دے، حالانکہ ان میں رہنے والے مسلمان ہوں وہ تو ان کی طرف سے کیے جانے والے ظلم اور حقوق کی پامالی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، یعنی اس نے اعذار اور انذار کے بعد ہی کسی قوم کو ہلاک اور برباد کیا ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ آپ کا رب ایسا نہیں کہ وہ کسی کو اس طرح ہلاک کرے کہ وہ اس پر ظلم کر رہا ہو، اگرچہ وہ اصلاح وہدایت کی انتہاء پر ہے، کیونکہ اس نے اپنی ملکیت میں تصرف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کسی پر ظلم نہ کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا (یونس: 44) یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ وہ انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دے جب کہ وہ مخلص ہوں۔ مصلحون سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو ایمان میں مخلص ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ظلم سے مراد معاصی اور گناہ ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا(2): اُمَّةً وَّاحِدَةً سے مراد صرف ملت اسلامیہ ہے یعنی اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو صرف ملت اسلامیہ بنا دیتا۔ ضحاک نے کہا(3): اس سے مراد ایک دین والے ہیں یعنی سب کو گمراہ کر دیتا یا پھر سب کو ہدایت یافتہ بنا دیتا۔ وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ یعنی مختلف ادیان پر رہیں گے۔ یہ مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ یہ استثنا منقطع ہے، یعنی جس پر تیرے رب نے ایمان اور ہدایت کے ذریعے رحمت فرمائی تو اس نے اختلاف نہیں کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مختلفین فی الرزق ہیں(4) یعنی رزق میں اختلاف کرتے رہیں گے یا مختلف ہوں گے، یعنی یہ کہیں گے کہ یہ غنی ہے اور یہ فقیر، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ مگر وہ

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، ما جاء فی نزول العذاب، جلد 2، صفحہ 39۔ ایضاً، حدیث نمبر 2094، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 511 3۔ ایضاً 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1071

لوگ جن پر تیرے رب نے قناعت عطا فرما کر رحم کیا، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ حضرت حسن، مقاتل اور عطا نے کہا: یہ اختلاف کی طرف اشارہ ہے (1)، یعنی الله نے انہیں اختلاف کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا (2): اس سے مراد یہ ہے کہ الله نے اپنی رحمت کے لیے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اور الرحمۃ کے مونث ہونے کے باوجود وَلِذٰلِكَ فرمایا ولتلك نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصدر ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رحمۃ کی تانیث حقیقی نہیں تو اسے فضل کے معنی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ذالک کے ساتھ اختلاف اور رحمت دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض اوقات ذلك کے ذریعے دو متضاد چیزوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے، جس طرح الله تعالیٰ کے ارشاد لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ (البقرہ: 68) میں ہے، بَيْنَ ذٰلِكَ فرمایا ہے بين ذينك ولا تينك نہیں فرمایا۔ اور ایک اور مقام پر فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان) پھر فرمایا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) اور اسی طرح الله تعالیٰ کا ارشاد قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (یونس: 58) (ان سب ارشادات میں دو متضاد چیزوں کی طرف ذالك کے ذریعے اشارہ کیا گیا مثلاً فارض اور بکر، اسراف اور بخل، جہر اور سر اور آخری آیت میں فضل اور رحمت (مذکر اور مونث) کی طرف بھی ذالك کے ذریعے ہی اشارہ کیا گیا ہے)

اور یہ سب اقوال سے بہتر قول ہے، کیونکہ یہ عام ہے۔ اس کی طرف حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے جسے آپ سے اشہب نے روایت کیا: اشہب نے کہا: میں نے اس آیت کے متعلق امام مالک سے پوچھا تو انہوں نے کہا: الله تعالیٰ نے انہیں اس لیے پیدا فرمایا ہے تاکہ ایک فریق جنت میں ہو اور ایک فریق دوزخ میں، یعنی اہل اختلاف کو اختلاف کے لیے پیدا فرمایا اور اہل رحمت کو رحمت کے لیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: الله نے انہیں دو فریقوں میں پیدا فرمایا، ایک فریق پر وہ رحم فرماتا ہے اور ایک فریق پر رحم نہیں فرماتا۔ مہدوی نے کہا: اس تقدیر کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی اصل کلام یوں ہے: ولا يزالون مختلفين إلا من رحم ربك و تمت كلمة ربك لأملأن جهنم من الجنة والناس اجمعين، ولذالك خلقهم اور ایک قول کے مطابق یہ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ کے ارشاد کے متعلق ہے یعنی ولشهود ذلك القوم خلقهم اس دن کے شہود کے لیے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ کے متعلق ہے یعنی سعادت اور شقاوت کے لیے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے (3)۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ، تَمَّتْ کا معنی ثبت ہے، یعنی جس طرح اس نے ازل میں مقدر فرمایا اور خبر دی وہ ثابت ہو گیا، اور کلمے کے تمام سے مراد اس کا تغیر و تبدیل کو قبول کرنے سے ممتنع ہونا ہے۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ، من بیانِ جنس کے لیے ہے۔ یعنی لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ تاکید ہے، جس طرح الله تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ جہنم کو بھرے گا اسی طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس کے ذریعے یہ خبر بھی دی ہے کہ وہ جنت کو بھرے گا آپ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1071 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 511

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ایک کو تمہیں میں سے لوگوں کے ذریعے بھرے گا''، اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ گزر بھی چکی ہے۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور یہ سب جو ہم بیان کرتے ہیں آپ سے پیغمبروں کی سرگزشتیں یہ اس لیے ہیں کہ پختہ کریں ان سے آپ کے قلب (مبارک) کو اور آیا ہے آپ کے پاس اس سورہ میں حق اور یہ نصیحت اور یاد دہانی ہے اہل ایمان کے لیے''۔

قولہ تعالیٰ: **وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ**، **كُلًّا**، نقص کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہوگا ہر وہ جس کو رسولوں کی خبروں کی ضرورت ہو تو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں۔ اخفش نے کہا: کلا حال مقدم ہے۔ جس طرح آپ کا قول کلا ضربت القوم، **مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ** یعنی ان کی خبریں اور اپنی قوم کی اذیتوں پر ان کا صبر۔ **مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ** تاکہ ان کے ذریعے آپ کے قلب مبارک کو اداء رسالت اور اس سلسلہ میں آپ کو ملنے والی اذیتوں پر صبر پر پختہ کر دیں۔ ایک قول یہ ہے: اس کے ذریعے ہم آپ میں پختگی اور یقین میں اضافہ کر دیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے ذریعے آپ کے قلب مبارک کو ہم مضبوط کر دیں۔ ابن جریج نے کہا: ان کے ذریعے آپ کے دل کو ہم بہت زیادہ صبر کرنے والا بنا دیں تاکہ آپ جزع فزع نہ کریں۔ اہل معانی نے کہا: ہم طیب و پاک کریں۔ تمام کا معنی قریب قریب ہے۔ ما، کلا سے بدل ہے معنی ہوگا: **نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ**۔

وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ، **هٰذِهِ** سے مراد ھذہ السورۃ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر سے مروی ہے کہ اس سورت کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انبیاء، جنت اور دوزخ کی خبریں ہیں (1)۔

ایک قول یہ ہے: اس سورت کا بالخصوص ذکر تاکید اً ہے ورنہ حق تو پورے کے پورے قرآن میں ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن نے کہا: ھذہ الدنیا ہے اور مراد نبوت ہے۔ **وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ**، **مَوْعِظَةٌ** سے مراد گزشتہ امتوں کی ہلاکت اور جھوٹی اور برباد ہونے والی قوموں کے واقعات میں سے جن کے ذریعے نصیحت حاصل کی جاتی ہے، اور یہ اس سورت کی شرافت ہے، کیونکہ اس کے علاوہ دیگر سورتوں میں بھی حق، نصیحت اور یاد دہانی ہے مگر ان میں بالخصوص اس طرح نہیں کیا گیا جس طرح اس کے بارے میں ہے۔

وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی وہ ہلاک و برباد ہونے والوں کے اوپر نازل ہونے والی مصیبت کو یاد کرتے ہیں تو توبہ کر لیتے ہیں، اور مومنین کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کے واقعات کو ان کے ذریعے ہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 512

وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۟ۙ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۟ وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۟۠

''اور آپ فرما دیجئے انہیں جو ایمان نہیں لائے کہ تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر اور ہم (اپنے طور پر) عمل پیرا ہیں۔ اور تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں اور اللہ ہی کے لیے ہیں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام، تو آپ بھی اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ کیجئے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو تم لوگ کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ دھمکی اور وعید ہے۔ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۟ۙ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ دوسری دھمکی ہے اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی زمین و آسمان کے غیب اور ان کی شہادت اللہ ہی کے لیے ہے۔ شہادت کو معنی کی دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد آسمان اور زمین کے خزانے ہیں۔

ضحاک نے کہا: اس سے آسمانوں اور زمین کی جو چیزیں بندوں سے غائب ہیں وہ ساری مراد ہیں۔ باقیوں نے کہا: غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے عذاب کا آسمان سے نزول اور زمین سے طلوع مراد ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا: لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے مراد ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں غائب ہے اس کو اللہ جانتا ہے۔ غیب کو مضاف کیا اور یہ مفعول کی طرف مضاف ہے تو اس کی اضافت توسعاً ہے، کیونکہ حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں: غبت فی الارض وغبت ببلد کذا میں زمین میں غائب ہوا اور میں فلاں شہر میں غائب ہوا۔ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ یعنی قیامت کے دن سارے کام اسی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ مخلوق کو تو اس کے اذن کے بغیر امر کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ نافع اور حفص نے یرجع یاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی لوٹائے جائیں گے۔ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ یعنی اس کی پناہ لو اور اس پر بھروسہ و اعتماد کرو۔ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔ اہل مدینہ، اہل شام اور حفص نے تعملون تا کے ساتھ مخاطب کے صیغے کے طور پر پڑھا ہے۔ جب کہ باقیوں نے بطور خبر یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اخفش سعید نے کہا: تعملون ہوگا بشرطیکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مخاطب نہ ہوں، اس نے کہا: بعض نے تعملون تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے اور فرمایا: آپ ان کو کہہ دیجئے وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۟۔ کعب احبار نے کہا: تورات کا خاتمہ ہی سورت ہود کا خاتمہ ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے لے کر سورۃ کے آخر تک سورت ہود مکمل ہوئی اور اس کے بعد سورۂ یوسف علیہ السلام ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 176

سورۂ یوسف

آیاتہا ۱۱۱ ۱۲ سُوْرَۃُ یُوْسُفَ مَکِّیَّۃٌ ۵۳ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یہ پوری سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: سوائے چار آیات کے یہ مکی ہے روایت ہے کہ یہود نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو یہ سورت نازل ہوئی۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا۔ حضرت سعد بن اَبی وقاص نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو نازل فرمایا تو آپ نے ایک لمبا عرصہ اس کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے کہا: اگر آپ ہمارے سامنے قصہ بیان کرتے (1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ۔ تو آپ نے ایک لمبا عرصہ لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے کہا: اگر آپ کوئی بات بیان کرتے، تو اللہ نے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (الزمر:23) نازل فرمائی۔ علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انبیاء کے قصص کو ذکر فرمایا۔ اور بلاغت کے درجات کے اعتبار سے مختلف الفاظ کے ساتھ، مختلف طریقوں سے ایک ہی معنی میں ان کا تکرار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قصہ یوسف کو ذکر فرمایا اور اس کا تکرار نہیں فرمایا تو کوئی مخالف نہ تو تکرار والے قصص کا مقابلہ کر سکا اور نہ ہی قصہ غیر متکررہ کا مقابلہ کر سکا۔ جس نے بھی اس میں غور و فکر کیا اس کے لیے اس میں اعجاز ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۱

''الف۔ لام۔ را۔ یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی''۔

الٓرٰ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

قولِ تعالیٰ: الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہاں تقدیر عبارت: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ہے۔ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ الٓرٰ سورت کا نام ہے یعنی یہ سورت جس کا نام الٓرٰ ہے یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی، کتاب مبین سے مراد قرآن مبین ہے یعنی جس کا حلال، حرام (2)، اس کی حدود، اس کے احکام، اس کی ہدایت اور اس کی برکت واضح ہے۔ ایک قول یہ ہے: یعنی یہ وہ آیات ہیں جن کا تمہارے ساتھ تورات میں وعدہ کیا گیا تھا۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲

''بے شک ہم نے اتارا اسے یعنی قرآن عربی کو تا کہ تم (اسے) خوب سمجھ سکو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے: انا انزلنا القرآن عربیا (یعنی ہ ضمیر سے مراد قرآن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 219
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 5

ہو) قُرْءٰنًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا یعنی سارا قرآن (عربی ہے) اور عَرَبِیًّا، قُرْءٰنًا کی صفت ہوگا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قُرْءٰنًا بطور تمہید و تاکید حال ہو جیسے مررت بزید رجلا صالحا اور عَرَبِیًّا ضمیر سے حال ہوگا، یعنی اے گروہ عرب اس کو تمہاری زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ أعرب سے مراد بین ہے اسی سے الثَّیِّبُ تُعرِب عن نفسها (1) ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ یعنی تاکہ تم اس کے معانی کو جانو اور جو کچھ اس میں ہے اسے سمجھو۔ بعض عرب لعل کے ساتھ أن لاتے ہیں عسی کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے لعل میں لام تاکید کے لیے زائد ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

یا أَبَتَا عَلَّکَ أَوْ عَسَاکَا

اس میں لعل کے بجائے علّ ہے۔

ایک قول یہ ہے لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ سے مراد یہ ہے لتکونوا علی رجاء من تدبرہ یعنی تاکہ اس کے غور وفکر سے تم پر امید ہو جاؤ، پس شک کا معنی ان کفار کی طرف راجع ہوگا نہ کہ کتاب اللہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اور ایک قول یہ ہے: اَنْزَلْنٰهُ کا معنی ہے کہ ہم نے خبر یوسف علیہ السلام کو نازل کیا (2)۔ نحاس نے کہا: یہ معنی کے زیادہ مشابہ ہے کیونکہ روایت ہے کہ یہود نے کہا: اس (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھو کہ آل یعقوب شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے؟ اور اس سے یوسف کی خبر کے بارے میں سوال کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت مکہ میں نازل فرمائی ان تعلیمات کے مطابق جو تورات میں تھیں۔ اور اس میں ان کے پاس موجود خبروں کی نسبت کچھ زیادہ خبریں تھیں۔ پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے ہی تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردہ کو زندہ کرنا کیونکہ آپ نے ان کو خبر دی حالانکہ آپ کبھی بھی کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ کتاب والی جگہ میں تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝۳

"ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ایک بہترین قصہ اس قرآن کے ذریعہ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے، اگرچہ آپ اس سے پہلے غافلوں میں سے تھے"۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ مبتدا اور خبر ہے۔ اَحْسَنَ الْقَصَصِ یہ مصدر کے معنی میں ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: قصصنا أحسن القصص۔ قصص کی اصل کسی چیز کے پیچھے چلنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّیْهِ (القصص: 11) ہے یعنی اس کے نشان قدم کی اتباع کر۔ پس قصہ گو آثار کی اتباع کرتا ہے اور ان کے متعلق خبر دیتا ہے۔ اور حسن قصص کی طرف لوٹتا ہے نہ کہ قصہ کی طرف۔ کہا جاتا ہے فلان حسن الاقتصاص للحدیث یعنی اس کا سیاق عمدہ ہوتا ہے۔

ایک قول یہ ہے: قصص مصدر نہیں بلکہ یہ اسم کے معنی میں ہے جس طرح کہا جاتا ہے: اللہ رجاء نا یعنی مرجونا۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا: ہم آپ کو عمدہ خبروں کے ذریعے خبر دیتے ہیں۔ بِمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ یعنی ہماری وحی کے ذریعے پس ما فعل کے ساتھ مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب استئمار البکر والثیب، حدیث نمبر 1861، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 6

هٰذَا الْقُرْاٰنَ، القران هذا کی صفت ہونے کی وجہ سے یا اس سے بدل ہونے کے سبب یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے فراء نے اس کی جر کو بھی جائز کہا ہے۔ اس نے کہا: تکریر کی بنیاد پر مجرور ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک ما سے بدل کی بنیاد پر ہے۔ ابو اسحاق نے مبتدا کے مضمر ہونے کی بنیاد پر اس کے رفع کو بھی جائز کہا ہے۔ وہ سائل تھا اس نے آپ سے وحی کے متعلق پوچھا تو اس کو کہا گیا: هو القران۔ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ یعنی جو ہم نے آپ کو بتایا اس سے غافلیں میں سے۔

مسئلہ۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کو باقی تمام قصص میں سے احسن القصص کیوں کہا گیا؟ ایک قول یہ ہے: کیونکہ قرآن میں کوئی ایسا قصہ نہیں جس میں وہ عبرتیں اور حکمتیں ہوں جو اس قصہ میں ہیں۔ اور اس کا بیان اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے بھائیوں کو درگزر کرنے، ان کی اذیتوں پر آپ کے صبر، ان کا آپ کو کنویں میں لٹکانے کے بعد آپ کا ان کو معاف کرنا اور ان کو معاف کرنے میں آپ کے کرم کے حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام احسن القصص رکھا ہے حتیٰ کے آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ ایک قول یہ ہے: کیوں کہ اس میں انبیاء، صالحین، فرشتوں، شیاطین، جن، انسان، جانور، پرندے، بادشاہوں کی سیرت، مختلف ممالک، تاجر، علماء، جاہل، مردوں، عورتوں اور ان کے حیلوں اور فریبوں کا ذکر ہے اور اس میں توحید، فقہ، بین الاقوامی قانون، خوابوں کی تعبیر، سیاست، معاشرت، تدبیر معاش کا اور ان تمام فوائد کا ذکر ہے جو دین و دنیا کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: کیوں کہ اس میں حبیب، محبوب اور ان دونوں کی سیرت کا تذکرہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں اَحْسَنَ بمعنی أعجب ہے۔ بعض اہل معانی نے کہا: اَحْسَنَ الْقَصَصِ اس وجہ سے ہے کہ ہر وہ شخص جس کا اس میں ذکر ہے اس کا انجام سعادت تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو، آپ کے باپ، آپ کے بھائیوں اور عزیز مصر کی بیوی کو دیکھو۔ اور ایک قول یہ ہے: بادشاہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے اسلام لایا اور اس کا اسلام عمدہ تھا۔ اور خوابوں کی تعبیر چاہنے والا ساقی اور گواہ ان تمام کا معاملہ بھلائی پر ہی مبنی تھا۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝

"(یاد کرو) جب کہا یوسف نے اپنے والد سے کہ اے میرے (محترم) باپ! میں نے (خواب میں) دیکھا ہے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو میں نے انہیں دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ، اِذْ ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی انہیں یاد کراؤ جب یوسف نے کہا۔ عام قراء کی قرأت سین کے ضمیر کے ساتھ ہے۔ طلحہ بن مصرف نے یوسف پڑھا ہے، ہمزہ اور سین کے فتح کے ساتھ عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عربی ہے۔ ابو الحسن الاقطع جو کہ حکیم تھا اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا: لغت میں أسف حزن کو کہتے ہیں اور أسیف کا معنی بندہ ہے اور یہ دونوں چیزیں حضرت یوسف علیہ

السلام میں جمع تھیں اس وجہ سے آپ کو یوسف کہا گیا۔ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اَبو عمرو، عاصم، نافع، حمزہ اور کسائی کی قرأت ''تا'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک تانیث کی علامت ہے، بالخصوص ندا میں اَب پر یا اضافت کے بدلے داخل ہوتی ہے۔ بعض اوقات مذکر پر علامت تانیث داخل ہوتی ہے پس کہا جاتا ہے: رجل نکحۃ و ھزَاۃ۔

نحاس نے کہا: جب آپ يٰۤاَبَتِ تا کے کسرہ کے ساتھ کہتے ہیں تو اس میں ''تا'' سیبویہ کے نزدیک یا اضافت کے بدلے میں ہے۔ سیبویہ کے قول کے مطابق ھا کے بغیر وقف جائز نہیں اور ان کے پاس اپنے قول پر کئی دلائل موجود ہیں جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کا قول: یاابہ، یاأبی کا معنی دیتا ہے اور يٰۤاَبَتِ صرف معرفہ کی صورت میں کہا جا سکتا ہے جاءنی أبت نہیں کہا جا سکتا۔ اور عرب اس کو بالخصوص ندا میں ہی استعمال کرتے ہیں یا أبتی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ''تا'' ''یا'' کا بدل ہے لہٰذا دونوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اور فراء کا گمان یہ ہے کہ جب کوئی آدمی يٰۤاَبَتِ کہے تو اس کا کسرہ ''یا'' پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ اس وقت نیت میں ''یا'' موجود ہے اَبواسحاق کا گمان یہ ہے کہ یہ غلط ہے اور صحیح بات وہ ہے جو اس نے کی کہ ''یا'' نیت میں کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ یا أبتی نہیں کہا جا سکتا۔ اَبوجعفر، اعرج اور عبداللہ بن عامر نے یا أبت، تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

بصریوں نے کہا: ان قراء کی قرأت اصل میں یا أبتی یا کے ساتھ ہے پھر ''یا'' کو الف کے ساتھ بدل دیا گیا تو یا أبتا ہو گیا تو الف کو حذف کر دیا گیا اور ''تا'' پر فتح باقی رہ گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اصل کسرہ ہے، پھر کسرہ کو فتحہ سے بدل دیا گیا جس طرح ''یا'' کو الف سے بدل دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: یاغلاما أقبل۔ فراء نے یا أبتُ تا کے ضمہ کے ساتھ بھی قرأت کو جائز قرار دیا ہے۔ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا نحویوں کے درمیان: جاءنی احد عشر رایت و مررت باحد عشر، اسی طرح ثلاثۃ عشر، تسعۃ عشر اور ان دونوں اعداد کے درمیان والوں کا اس طرح پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں، انھوں نے کہا: دونوں اسموں کو ایک اسم بنا دیا اور ان دونوں کو خفیف ترین حرکات کے ساتھ اعراب دیا۔ سہیلی نے کہا: ان ستاروں کے اسماء کا ذکر مستند روایت میں آیا ہے جس کو حرث بن أبی اُسامہ نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: بستانہ۔ جو کہ اہل کتاب میں سے ایک آدمی ہے۔ آیا، اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان گیارہ ستاروں کے بارے میں پوچھا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حرثان، طارق، ذیال، قابس، مصبح، ضروح، ذوالکنفات، ذوالقرع، فلیق، وثاب اور عمودان (1)۔ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا''۔ حضرت ابن عباس (2) اور حضرت قتادہ نے فرمایا: کواکب سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی، شمس سے مراد آپ کی ماں اور قمر سے مراد آپ کے باپ ہیں۔ حضرت قتادہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ شمس سے مراد آپ کی خالہ ہے، کیونکہ آپ کی ماں تو فوت ہو چکی تھی اور آپ کی خالہ آپ کے باپ کے نکاح میں تھی۔ رَاَيْتُهُمْ تاکید ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ھم ضمیر مذکر آئی ہے۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک بات یہ ہے کہ جب آپ نے ان اشیاء کے بارے میں اطاعت اور سجدے کی خبر دی اور یہ دونوں فعل ذوی العقول کے ہیں تو ان کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 180　　2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 181

بارے میں اس طرح خبر دے دی جس طرح ذوی العقول کے بارے میں خبر دی جاتی ہے۔ یہی معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ (الاعراف: 198) میں گزر چکا ہے اور عرب جب غیر ذول العقول کو ذوی العقول کے مقام پر لے آئیں تو اس کی جمع ذوی العقول کی طرح لاتے ہیں اگرچہ یہ خارج الاصل ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''آپ نے فرمایا: اے میرے بچے! نہ بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں سے ورنہ وہ سازش کریں گے تیرے خلاف، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا یعنی وہ آپ کو ہلاک کرنے کی سازش کریں گے، کیونکہ اس کی تاویل ظاہر ہے بعض اوقات شیطان ان کو آپ کے ساتھ برائی پر ابھارتا ہے لک میں لام تاکید کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝ (یوسف) میں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ خواب ایک شریف حالت اور بلند مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد مبشرات میں سے صرف سچے، نیک خواب باقی رہ گئے ہیں جن کو نیک آدمی دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں''(1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو از روئے خواب کے زیادہ سچا ہوگا وہی از روئے کلام کے بھی زیادہ سچا ہوگا''(2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کے بارے میں حکم بیان فرمایا کہ یہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق: ''نبوت کے ستر اجزاء میں سے (چھیالیسواں حصہ ہے)''(3)۔ حضرت ابن عمر کی حدیث کے مطابق: ''چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق: ''نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''(4)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق: ''چھبیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''نبوت کے چوالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے'' ان میں سے صحیح چھیالیس والی حدیث ہے۔ اس کے بعد صحت میں حدیث سبعین (ستر والی حدیث) ہے۔ امام مسلم نے سوائے ان دو حدیثوں کے اور کوئی نقل نہیں کی، جہاں تک ان سب احادیث کا تعلق ہے تو یہ شیوخ کی احادیث میں سے ہیں یہ ابن بطال کا قول ہے۔ ابو عبد اللہ مازری نے کہا: محدثین کے نزدیک اکثر اور اصح من ستة واربعین ہے(5)۔ (چھیالیس والی حدیث) طبری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ ساری احادیث یا ان میں سے اکثر صحیح ہیں، اور ان میں سے ہر حدیث کا مخرج معقول ہے، جہاں تک انها جزء من سبعین جزأ من النبوة کا تعلق ہے تو یہ ہر سچے اور نیک خواب کے بارے میں اور ہر مسلمان کے بارے میں جو اس خواب کو اپنی نیند کی حالت میں دیکھے اس

1۔ شعب الایمان، جز 4، صفحہ 185　2۔ صحیح مسلم، باب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 242
4۔ جامع ترمذی، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 52　5۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241

کے لیے عام بات ہے خواہ وہ مسلمان جس بھی حالت میں ہو، جبکہ أنها من أربعين أو ستة وأربعين اس سے مراد اس آدمی کا خواب ہے جس کی حالت کا ذکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس ہوا یعنی جو سخت سردیوں میں وضو کو انتہائی عمدہ طریقے سے کرنے والا ہو، ناپسندیدہ باتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صبر کرنے والا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنے والا ہو تو اس کا نیک خواب اگر اللہ نے چاہا تو نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ اور جس آدمی کی حالت ان دونوں حالتوں کے درمیان ہو اس کا سچا خواب بھی ان دونوں اجزاء کے درمیان والی کیفیت میں ہوگا یعنی چالیس سے ستر تک کے درمیان۔ ستر سے کم نہیں ہوگا اور چالیس سے زیادہ ہوگا۔ اسی معنی کی طرف ابو عمر بن عبد اللہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: خواب کے اجزاء کی تعداد کے بارے میں آثار میں پایا جانے والا اختلاف میرے نزدیک کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ خواب دیکھنے والا شخص جس طرح کلام کے صدق، امانت کی ادائیگی، دین متین اور حسن یقین کی قوت سے لبریز ہوگا اسی قدر اس کا خواب نبوت کے مختلف اجزاء کی تعداد کے مطابق ہوگا۔ پس جس قدر بندے کی نیت اپنے رب کی عبادت میں خالص ہوگی اس کا یقین پختہ ہوگا اور اس کا کلام سچا ہوگا اسی قدر اس کا خواب زیادہ سچا اور نبوت کے زیادہ قریب ہوگا۔ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو باہمی فضیلت حاصل ہوتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ** (الاسراء: 55) ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ تاویل بہت ساری احادیث کو جامع ہے اور یہی تاویل بہتر ہے بنسبت بعض کی بعض کے ساتھ تفسیر کرنے اور بعض کو چھوڑ دینے کے۔ أبو سعید الاسفاقیسی نے بعض اہل علم سے جزء من ستة وأربعين جزأ من النبوة کا یہ معنی ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں تئیس سال تک وحی فرمائی ہے جس طرح کہ عکرمہ اور عمرو بن دینار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے تو اگر ہم تئیس سال کے عرصے کو چھ ماہ کے حساب سے تقسیم کریں تو اس کے چھیالیس اجزاء بن جائیں گے۔ اسی قول کی طرف مازری نے اپنی کتاب "المعلم" میں اشارہ کیا ہے اور اس کو القونوی نے اپنی تفسیر میں "سورۂ یونس" کی آیت کریمہ **لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (یونس: 64) کے تحت اختیار کیا ہے مگر یہ مؤقف دو اعتبار سے فاسد ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ أبو سلمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ مدت بیس سال تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کے آخر میں ہوئی پھر دس سال آپ نے مکہ میں قیام فرمایا یہ عروہ، شعبی، ابن شہاب، حسن، عطا خراسانی اور سعید بن مسیب کے مختلف اقوال سے ثابت ہے اور یہی ربیعہ اور ابو غالب کی روایت ہے حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے پس اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو پھر یہ تاویل باطل ہو جائیگی۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ پھر اجزاء مختلفہ کے بارے میں وارد تمام احادیث بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

مسئلہ نمبر 3۔ صرف خواب نبوت کے اجزاء میں سے تھا کیوں کہ اس میں ایسی چیزیں ہیں جو عاجز کرتی ہیں اور مانع ہوتی ہے جس طرح کہ پرواز کرنا، ایمان کو بدل دینا اور علم غیب میں سے کسی چیز پر مطلع ہونا، جیسا کہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''نبوت کی مبشرات میں سے سوائے نیند کے سچے خواب کے کوئی شے باقی نہیں رہی (1)۔ الحدیث المختصر سچا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور نبوت کے اجزاء میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواب اللہ کی طرف سے ہے اور پریشان خواب شیطان کی طرف سے'' (2)۔ اس بات کی تصدیق حق ہے اور اس کی عمدہ تاویل ہے اور بعض اوقات بعض چیزوں کی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور خواب میں اللہ تعالیٰ کے بدیع ہونے اور اس کی مہربانی کے ایسے دلائل ہوتے ہیں جو بندہ مومن کے ایمان میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں اہل دین اور اہل حق میں سے اہل رائے اور محدثین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور سوائے معتزلہ میں سے ملحد اور بے دین لوگوں کے خواب کا کوئی بھی منکر نہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: جب سچا خواب نبوت کے اجزاء میں سے ہے تو پھر کافر، جھوٹا اور غلط ملط کرنے والا اس کا اہل کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بعض کفار اور دیگر ایسے لوگوں سے جن کا دین پسندیدہ نہیں ان سے بھی صحیح اور سچے خواب کا ظہور ہوا ہے جس طرح اس بادشاہ کا خواب جس نے خواب میں سات گائیں دیکھیں، قید خانے میں دونوں جوانوں کے خواب، بخت نصر کا وہ خواب جس کی تعبیر دانیال نے اس کی بادشاہت کے جانے کے ساتھ کی، ظہور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کسریٰ کا خواب اور عاتکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کا آپ کے بارے میں خواب حالانکہ وہ کافرہ تھی اسی طرح امام بخاری نے باب رؤیا اھل الجن کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر، فاسق، فاجر اور جھوٹے آدمی کا خواب اگرچہ بعض اوقات وہ سچا بھی ہوتا ہے وہ وحی اور نبوت میں سے نہیں ہے، کیونکہ ہر وہ آدمی جس کی غیب کی بات سچی ہو اس کی بات اور خبر نبوت میں سے نہیں ہوتی اس کی تفصیل ''سورۃ الانعام'' میں گزر چکی ہے کہ کاہن اور دیگر لوگ بعض اوقات سچی خبر دیتے ہیں لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے تو اس طرح ان کے خوابوں کی بھی کیفیت ہوتی ہے۔ مہلب نے کہا: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ عنوان صرف اس لیے قائم کیا ہے تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ مشرکین کے خواب بھی سچے ہو سکتے ہیں جس طرح کہ دونوں جوانوں کے خواب سچے تھے مگر یہ درست نہیں کہ مومنین کے خوابوں کی طرح ان کے خوابوں کی نسبت نبوت کی طرف کی جائے، کیونکہ ہر وہ بات جس کی سچی تاویل کرنا ممکن ہو اس کا نبوت کے اجزاء میں سے ہونا ضروری نہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے والے خواب وہ ہوتے ہیں جو پریشانی اور وہم سے خالی ہوں اور ان کی تاویل لوح محفوظ میں مرقوم تقدیر کے موافق ہو۔ وہ خواب جو اضغاث کی خبر میں سے ہوں وہ پریشان کن افکار ہیں جن کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ شیطان کی طرف منسوب ہوتے ہیں انہیں کو ضغث کہا جاتا ہے، کیوں کہ ان میں متضاد چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کا معنی مہلب نے بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں جو ہر قائل کے قول سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''خواب تین ہیں ان میں سے ایک شیطان کے احوال ہیں تاکہ وہ ابن آدم کو پریشان کرے اور ان میں سے کچھ خواب وہ ہوتے ہیں کہ جو حالات حالت بیداری میں بندے کو درپیش ہوتے ہیں انہی کو وہ خواب میں دیکھتا ہے اور کچھ وہ خواب ہیں جو نبوت کے

1۔ شعب الایمان، جز 4، صفحہ 185　2۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241

چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہیں"(1)۔ سننے والے نے کہا کہ میں نے کہا: آپ نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ الایۃ۔ الرؤیا، رأی فی المنام سے مصدر ہے، رؤیا فعلی کے وزن پر ہے سقیا اور عشریٰ، اس کا الف تانیث کا ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ علماء کا رؤیا کی حقیت میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ ایسے اجزا کا ادراک ہے جن کو آفت نہیں آتی جس طرح متفرق نیند وغیرہ۔ اسی وجہ سے نیند کے غلبہ کی قلت کے سبب اکثر خواب رات کے آخری حصہ میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خواب دیکھنے والے کے لیے علم ناشی پیدا فرماتا ہے اور دیکھنے والے کے لیے اس کے مشاہدے کے مطابق اس کو پیدا فرماتا ہے تاکہ ادراک صحیح ہو جائے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: خواب میں صرف وہی دکھایا جاتا ہے جس کا ادراک حالت بیداری میں صحیح ہو(2)۔ اسی وجہ سے خواب میں کوئی آدمی کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے کسی حالت میں نہیں دکھایا جاتا اور صرف معتاد چیزیں ہی دکھائی جاتی ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو سونے والے کے محل مدرک میں دیکھی جانے والی چیزیں پیش کرتا ہے اور پھر اس کو محسوس صورتوں کی تمثیل دیتا ہے۔ کبھی وہ صورتیں پائی جانے والی چیزوں کے موافق تمثیلی صورت اختیار کرتی ہیں اور کبھی وہ عقل کے ذریعے سمجھے جانے والے غیر محسوس معانی کی صورت اختیار کرتی ہیں، البتہ دونوں حالتوں میں وہ بشارت دینے والی یا ڈرانے والی ہوتیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے، صحیح مسلم اور دیگر کتب میں: "میں نے سیاہ پراگندہ سر (عورت) کو دیکھا جو مدینہ سے مہیعۃ (جحفہ کا مقام جو اہل شام کا میقات ہے) تک نکلتی ہے پس میں نے اس کی تعبیر بخار کے ساتھ کی ہے"(3)۔ اور "میں نے اپنی تلوار کو دیکھا جس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اور گائے کو دیکھا جس کا نحر کیا جاتا ہے تو میں نے ان دونوں کی تعبیر یہ کی ہے کہ میرے اہل بیت کے آدمی کو شہید کیا جائے گا اور گائے میرے صحابہ کی ایک جماعت ہے جن کو شہید کیا جائے گا"(4)، اور "میں نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک محفوظ ذرع میں داخل کیا ہے تو اس کی تعبیر میں نے مدینہ سے کی ہے۔" اور "میں نے اپنے ہاتھ میں دو کنگن دیکھے تو ان دونوں کی تعبیر میں نے دو کذابوں سے کی جو میرے بعد نکلیں گے"(5)۔ علاوہ ازیں ایسے خواب جن کی تمثیل ہو سکتی ہے۔ اور ان میں سے کچھ خواب وہ ہوتے ہیں جن کے معنی پہلے ہی ظاہر ہوتے ہیں اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کے معنی غور و فکر کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر سالوں سے کی اور آپ نے گیارہ ستارے، سورج اور چاند کو دیکھا تو ان کی تعبیر اپنے بھائیوں اور اپنے والدین سے کی۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: حضرت یوسف علیہ السلام اپنی خواب کے وقت چھوٹے تھے اور صغیر کے فعل پر کوئی حکم نہیں لگایا جاتا تو آپ کا خواب ایسا کس طرح ہو گیا کہ جس پر حکم لگایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ آپ کے والد نے فرمایا: لَا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1073۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب تعبیر الرؤیا، باب الرؤیا ثلاث، حدیث نمبر 3896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1074

3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1042

4۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 244

5۔ جامع ترمذی، تعبیر الرؤیا، جلد 2، صفحہ 53

تَقۡصُصۡ رُءۡيَاكَ عَلٰۤى اِخۡوَتِكَ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خواب ایک حقیقت کا ادراک ہے جس طرح کہ پہلے بیان ہوا تو یہ صغیر سے بھی ہوسکتا ہے جس طرح اس سے حالت بیداری میں ادراک حقیقی ممکن ہے اور جب وہ اپنی دیکھی ہوئی چیز کی سچی خبر دے تو یہی کیفیت ہوگی جب وہ ایسی چیز کی خبر دے جس کو اس نے حالت خواب میں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب کے بارے میں خبر دی اور یہ خواب آپ کے مشاہدہ کے مطابق پایا بھی گیا تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔

مسئلہ نمبر 8۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ خواب غیر شفیق اور غیر مخلص آدمی کے سامنے بیان نہ کیا جائے اور نہ ہی ایسے آدمی کے سامنے اس کو بیان کیا جائے جو خواب کی تعبیر عمدہ طریقے سے نہیں کرسکتا۔ ابورزین عقیلی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے اور خواب پرندے کی ٹانگ کے ساتھ تب تک معلق رہتا ہے جب تک کہ خواب دیکھنے والا اس کو بیان نہ کرے اور جب وہ اس کو بیان کرے تو وہ واقع ہو جاتا ہے سو تم سوائے عقلمند، محبت کرنے والے اور مخلص آدمی کے کسی کے سامنے اس کو بیان نہ کرو''(1)۔ امام ترمذی نے اس کو روایت کیا اور اس کے بارے میں آپ نے کہا: حدیث حسن صحیح۔ ابورزین کا نام: لقیط بن عامر ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کیا ہر ایک خواب کی تعبیر کرسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا نبوت کے ساتھ کھیلا جاسکتا ہے؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کوئی آدمی خواب کی تعبیر نہ کرے سوائے ایسے آدمی کے جو عمدہ طریقے سے تعبیر کرسکتا ہے۔ اگر اس میں کوئی بھلائی دیکھے تو اس کی خبر دے اور اگر اس میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو یا تو اچھی بات کرے یا پھر خاموشی اختیار کرے۔ ایک قول یہ ہے: کیا تعبیر کرنے والا اس کی اچھی تعبیر کرسکتا ہے حالانکہ اس کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں پھر آپ نے کہا: خواب نبوت کا حصہ ہے لہٰذا نبوت کے ساتھ نہ کھیلا جائے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ کسی مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی کو کسی خوفناک چیز سے ڈرانا مباح ہے اور یہ غیبت کے معنی میں داخل نہیں کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے ڈرایا کہ وہ اپنی سازش کریں گے۔ اور اس آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ جس آدمی کو اپنے خاندان میں سے کسی آدمی سے حسد اور سازش کا ڈر ہو اس کے سامنے نعمت کا اظہار نہ کرنا جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی ضروریات کو چھپانے کے ذریعے مدد طلب کرو کیونکہ ہر نعمت والے آدمی کے ساتھ حسد کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کو جاننے پر بھی واضح دلیل ہے۔ پس انہوں نے اس کی تعبیر کو جان لیا کہ عنقریب وہ تعبیر ان کے سامنے ظاہر ہوگی اور آپ نے اپنے دل میں اس کی پرواہ نہ کی۔ آدمی یہ بات تو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے بہتر ہوگا مگر بھائی اپنے بھائی کے بارے میں یہ نہیں چاہتا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں حسد و بغض کو محسوس کرلیا تھا تو آپ نے ان کو ان کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 52۔ ایضاً، حدیث نمبر 2204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے خواب بیان کرنے سے روک دیا اس خوف سے کہ ان کے سینے اس کے حسد میں جلنے نہ لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کے بارے میں سازش کرنے لگیں۔ یہ وجہ اور ان (بھائیوں) کی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کاروائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اس وقت نبی نہیں تھے۔ ابن زید کی کتاب الطبری میں ہے کہ وہ انبیاء تھے مگر یہ بات دنیوی حسد، والدین کی نافرمانی، مومن کی ہلاکت پر ابھارنے اور مومن کے قتل کا کسی کو حکم دینے سے انبیاء کے محفوظ ہونے کے عقیدے کو قطعی رد کرتی ہے لہٰذا جس آدمی نے ان کے انبیاء ہونے کی بات کی ہے اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے۔ عقل نبی کی لغزش کو محال نہیں سمجھتی البتہ اگر وہ لغزش کبیرہ گناہ کو جامع ہو تو مسلمان کا ان سے انبیاء کے معصوم ہونے پر اجماع ہے، جبکہ صغیرہ گناہوں کے بارے میں مسلمان کا اختلاف ہے جس طرح کہ پہلے بیان ہوا اور بعد میں بھی اس کا بیان آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1) انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''نبوت میں سے سوائے مبشرات کے کوئی چیز باقی نہیں رہی'' انہوں نے کہا: مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نیک خواب''۔ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خواب مطلقاً بشارت ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ بے شک سچا خواب بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا ہے۔ اسے دیکھنے والا خوش نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ مومن کو ایسا خواب اس کے ساتھ مہربانی اور رحمت کرتے ہوئے دکھاتا ہے تاکہ مصیبت سے پہلے اس کے نزول کے لیے بندہ تیاری کر لے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مصر میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں خواب دیکھا جو ان کی محنت پر دلالت کرتا تھا تو آپ نے ان کی طرف یہ خواب لکھا تاکہ وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں۔ ''سورۂ یونس آیت 64'' میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر گزر چکی ہے کہ اس سے مراد ''نیک خواب ہے'' یہ اور امام بخاری کی حدیث کا مخرج اکثر و اغلب ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ امام بخاری نے ابوسلمہ سے روایت کیا انہوں نے کہا: میں نے خواب دیکھا تو اس نے مجھے بیمار کر دیا حتیٰ کہ میں نے ابوقتادہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: میں خواب دیکھا کرتا تھا تو وہ مجھے بیمار کر دیتا یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جب تم میں سے کوئی کسی پسندیدہ چیز کو دیکھے تو اس کو صرف اسی کے سامنے بیان کرے جس کے ساتھ وہ محبت کرتا ہے اور جب وہ کسی ناپسندیدہ بات کو دیکھے تو اسے اس بات کے شر سے اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے۔ اور اسے تین مرتبہ تھوکنا چاہیے اور وہ کسی کو بھی وہ خواب بیان نہ کرے تو اس کو کوئی نقصان نہیں دے گا'' (2)۔ ہمارے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس خواب سے استعاذہ کو اس سے اذیت کے اٹھ جانے کا باعث بنایا ہے۔ کیا آپ نے ابوقتادہ کا قول نہیں دیکھا: میں خواب دیکھا کرتا تھا یہ مجھ پر پہاڑ سے زیادہ بوجھل ہوتا۔ جب میں نے یہ حدیث سنی تو میں اس کو کوئی چیز شمار نہیں کرتا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت میں اضافہ کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اسے تین مرتبہ اپنے بائیں جانب تھوکنا چاہیے تین

1۔ صحیح بخاری، مبشرات، جلد 2، صفحہ 1035
2۔ ایضاً، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 1043

مرتبہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے اور جس پہلو پر ہو اس سے اس کو پہلو بدل لینا چاہیے"(1)۔ حضرت ابوہریرہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے آپ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اٹھے اور نماز پڑھے"(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ سارے کا سارا باہم متعارض نہیں، یہ معاملہ صرف جگہ بدلنے کا ہے اور نماز کا اس میں اضافہ ہے تو خواب دیکھنے والے پر یہ سارے کام کرنا لازم ہیں اور نماز کے لیے اٹھنا ان تمام افعال کو شامل ہے کیونکہ جب نماز پڑھے گا تو نماز کے لیے اس کا عمل تمام امور کو شامل ہوگا کیونکہ جب نماز کے لیے اٹھے گا تو وہ پہلو کو بدلے گا، جب منہ میں پانی ڈالے گا تو تھوکے گا اور جب نماز شروع کرے گا تو تعوذ پڑھے گا، دعا کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس معاملے میں تضرع کرے گا کہ وہ خواب کے شر سے اس کو کافی ہوگا اس کی یہ زاری ایسی حالت میں ہوگی جو قبولیت کے زیادہ قریب ہے اور یہ رات میں صبح سے تھوڑا سا پہلے ہوگا۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۠ ﴿۶﴾

"اور اسی طرح چن لے گا تجھے تیرا رب اور سکھادے گا تجھے باتوں کا انجام (یعنی خوابوں کی تعبیر) اور پورا فرمائے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر جیسے اس نے پورا فرمایا اپنا انعام اس سے پہلے تیرے دو بھائیوں ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر، یقیناً تیرا پروردگار سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے"۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ میں کاف ضمیر محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ میں کاف اور ما کافہ ہے۔ ایک قول یہ ہے: وَ كَذٰلِكَ یعنی جس طرح اس نے خواب کے ذریعے تجھے عزت عطا فرمائی پس اسی طرح وہ تجھے چن لے گا اور خواب کو سچا ثابت کر کے تیرے اوپر احسان فرمائے گا۔ مقاتل نے کہا: تیرے لیے سجدوں کے ذریعے (تجھے چن لے گا) حضرت حسن نے کہا: نبوت کے ذریعے، اجتباء سے مراد مجتبیٰ کے لیے امور کی بلندی کو اختیار کرنا ہے۔ اس کی اصل جبیت الشیئ ہے یعنی میں نے اس کو حاصل کرلیا۔ اسی سے جبیت الماء فی الحوض ہے، یہ نحاس کا قول ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی تعدید ہے جس طرح زمین میں اقتدار دینا اور خوابوں کی تعبیر کی تعلیم اور علماء کا اجماع ہے کہ یہ انتخاب خوابوں کی تعبیر کے سلسلہ میں ہے۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تفسیر چالیس سال بعد ہوئی۔ اور یہ خواب کی انتہاء ہے۔

الاحادیث سے مراد وہ ہے جو لوگ خواب میں دیکھتے ہیں اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے پس اس میں آپ کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 1037
2۔ جامع ترمذی، تعبیر الرؤیا، جلد 3، صفحہ 52

غلطی لاحق نہ ہوئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام خوابوں کی تعبیر کو لوگوں میں سے سب سے زیادہ جانتے تھے۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح تھے، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں میں اس کے سب سے زیادہ تعبیر بتانے والے تھے، ابن سیرین کو اس میں بہت زیادہ تقدم طبع اور احسان حاصل ہوا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ ان جیسے یا ان کے قریب تھے۔ اپنے قول کی تاویل کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ یعنی قوموں اور کتابوں کی گفتگو اور دلائل توحید' یہ نبوت کی طرف اشارہ ہے یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ سے مقصود ہے یعنی نبوت کے ذریعے (وہ اپنی نعمت تیرے اوپر مکمل فرمائے گا) ایک قول یہ ہے: تیرے بھائیوں کا تیری طرف نکلنے کے ساتھ۔ اور ایک قول یہ ہے: تجھے ہر ناپسندیدہ کاروائی سے نجات عطا فرمانے کے ذریعے۔ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ خلت اور آگ سے ان کو نجات عطا فرمانے کے ذریعے وَ اِسْحٰقَ نبوت کے ذریعے۔ ایک قول یہ ہے: ذبح کے ذریعے۔ یہ عکرمہ کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ کے ذریعے آپ کو اس بات سے آگاہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ تمام بنی یعقوب کو نبوت عطا فرمائے گا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ اس کو جاننے والا ہے جو کچھ وہ تجھے عطا فرمائے گا: حَكِيْمٌ تیرے ساتھ اپنے فعل میں (حکمت والا ہے)۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۝ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝

"بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصہ) میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں دریافت کرنے والوں کے لیے جب بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے حالانکہ ہم ایک (مضبوط) جتھ ہیں، یقیناً ہمارے والد (ایسا کرنے میں) کھلی غلطی کا شکار ہیں۔ قتل کر ڈالو یوسف کو یا دور پھینک آؤ اسے کسی علاقے میں (یوں) تنہا ہو جائے گا تمہاری طرف تمہارے باپ کا رخ اور ہو جانا اس کے بعد (توبہ کر کے) نیک قوم"۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ یعنی جس نے ان کی گفتگو کے بارے میں پوچھا۔ اہل مکہ نے آیۃ واحد پڑھا ہے اور ابو عبیدہ نے اٰيٰتٌ جمع کو اختیار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ خیر کثیر ہے۔ نحاس نے کہا: یہاں "آیۃ" عمدہ قرات ہے یعنی جن لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر کے بارے میں ان کو ان کے بارے میں جو خبر دی گئی اس میں ان کے لیے نشانی ہے، کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور آپ مکہ میں تھے انہوں نے کہا: ہمیں انبیاء میں سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں خبر دیجیے جو شام میں تھا، اس کے بیٹے کو مصر لے جایا گیا تو وہ اس پر رویا یہاں تک کہ نابینا ہو گیا؟ اور مکہ میں اہل کتاب میں سے کوئی نہیں تھا اور نہ ہی انبیاء کی خبر کو کوئی جانتا تھا۔ یہودی مدینہ سے متوجہ ہوئے اور آپ سے انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف یکبارگی نازل فرما دی، اس میں وہ سب کچھ ہے جو تورات میں تھا اور اس

سے کچھ زائد بھی، تو یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اسی طرح نشانی تھی جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ اسلام کے لیے مردہ کو زندہ کرنا۔ اٰیٰتٌ سے مراد نصیحت ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد عبرت ہے۔ ایک روایت کے مطابق بعض مصاحف میں عبرۃ ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد بصیرت ہے۔ ایک قول کے مطابق: عجیب۔ جس طرح کہا جاتا ہے۔ فلان آیت فی العلم و الحسن یعنی فلاں آدمی علم وحسن میں عجب ہے۔ ثعلبی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: جب خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں تک پہنچا تو انہوں نے آپ کے ساتھ حسد کیا۔ ابن زید نے کہا: وہ انبیاء تھے اور انہوں نے کہا: کیا اسے یہ بات پسند ہے کہ اس کے بھائی اسے سجدہ کریں حتیٰ کہ اسے اس کے والدین سجدہ کریں! تو انہوں نے عداوت کے سبب آپ سے بغاوت کر دی۔ اس قول کا رد پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اوران کے اسماء: روبیل یہ ان میں سے سب سے بڑا تھا، شمعون، لاوی، یہوذا، زیالون، یشجر ان کی ماں لیا بنت لیان تھی یہ حضرت یعقوب کی خالہ کی بیٹی تھی آپ کے چار بیٹے دو کنیزوں میں سے تھے۔ دان، نفتالی، جاد اور آشر۔ پھر لیا فوت ہو گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کی بہن راحیل سے شادی کر لی، تو آپ کے بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ سہیلی نے کہا: حضرت یعقوب کی ماں کا نام رفقا تھا اور راحیل بنیامین کے نفاس میں فوت ہو گئی اور لیان بن ناہر بن آزر حضرت یعقوب کی خالہ تھی۔ ایک قول یہ ہے: دونوں لونڈیوں کے نام لیا اور تلتا تھا۔ ان میں ایک راحیل اور دوسری اس کی بہن لیا تھی یہ دونوں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہبہ کی گئیں تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں کو اپنے پاس جمع کیا اور آپ کے بعد یہ کسی کے لیے بھی حلال نہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 23) کے سبب جو کچھ ابن زید نے کہا اس کی تردید پہلے گزر چکی ہے۔ والحمدللہ۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ، یوسف، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ لام تاکید کے لیے ہے۔ یہ وہ لام ہے جس کے ذریعے قسم اٹھائی جاتی ہے یعنی واللہ لیوسف، وَاَخُوْهُ اس پر اس کا عطف ہے۔ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا اس کی خبر ہے اس کا تثنیہ آتا ہے اور نہ جمع کیونکہ یہ فعل کے معنی میں ہے۔ انہوں نے یہ صرف اس وجہ سے کہا کہ ان تک خواب کی خبر پہنچ گئی تو انہوں نے سازش شروع کی۔ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ یعنی جماعت اور وہ دس تھے۔ عصبہ ایک سے لے کر دس تک کے درمیان (بولا جاتا ہے) ایک قول ہے: پندرہ تک۔ ایک قول ہے: اس سے چالیس کے درمیان۔ اور لفظوں میں اس کا واحد نہیں جس طرح کہ نفر اور رھط (کا واحد نہیں ہوتا) اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اس سے ان کی مراد دین کی گمراہی نہیں کیونکہ اگر وہ یہ مراد لیتے تو وہ کافر ہو جاتے، بلکہ ان کی مراد تدبیر کے رستے سے ہٹ جانا ہے اس طرح کہ اس پر دو کو ترجیح دے دی باوجود ان کے ساتھ نسبت کی برابری کے۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف اور ان کے بھائی کو ہمارے اوپر ترجیح کے ذریعے واضح غلطی میں ہونے کی وجہ سے۔

اقْتُلُوْا يُوْسُفَ کلام میں حذف ہے یعنی ان میں سے کہنے والے نے کہا: اقْتُلُوْا يُوْسُفَ یوسف کو قتل کر دو تاکہ یہ امر کے مادہ کو ہی ختم کرنے والا ہو جائے۔ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یعنی زمین میں فی حرف جر کو حذف کر کے اَرْضًا کو نصب دے دی گئی فی کے حذف کے حوالے سے سیبویہ نے شعر بطور استشہاد پیش کیا ہے۔

لَدُنْ بِهَزِّ الكَفِّ يَعْسِلُ مَتْنُهُ فِيهِ كَمَا عَسَلَ الطَّرِيقَ الثَّعْلَبُ

مقام استشہاد عسل الطریق ہے جو کہ اصل میں عسل فی الطریق تھا۔

نحاس نے کہا: آیت کریمہ میں بہت سارے حسن ہیں کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ ان دو میں سے ایک حرف ہے پس جب حرف کو حذف کر دیا گیا تو فعل اس کی طرف متعدی ہو گیا۔ یہ (قتل اور پھینکنے کی) بات کہنے والے کے بارے میں ایک قول یہ ہے: وہ شمعون تھا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ کعب احبار نے کہا: دان۔ مقاتل نے کہا: روبیل۔ واللہ اعلم۔ اور اَرْضًا سے مراد ایسی زمین ہے جو ان کے باپ سے دور ہو۔ اس میں اضمار ضروری ہے کیونکہ وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) اپنے باپ کے پاس بھی تو زمین ہی میں تھے۔ یَخْلُ مجزوم ہے جواب امر ہونے کی وجہ سے اس کا معنی ہے: خالص ہو جائے اور صاف ہو جائے لَکُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ پس وہ مکمل طور پر تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گا۔ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ اور تم ہو جانا اس کے بعد یعنی گناہ کے بعد، ایک قول یہ ہے: یوسف کے بعد قَوْمًا صٰلِحِیْنَ یعنی توبہ کرنے والے لوگ یعنی اس عمل کے بعد توبہ کر لینا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ کو قبول فرمائے گا۔ اس مین اس بات پر بھی دلیل ہے کہ قاتل کی توبہ بھی قابل قبول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے آنے والی اس بات کا انکار اور رد نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: صٰلِحِیْنَ سے مراد ہے یعنی بغیر کسی ترجیح اور فضیلت کے تمہارے معاملات تمہارے باپ کے نزدیک درست ہو جائیں گے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝

"(یہ سن کر) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ نہ قتل کرو یوسف کو (بلکہ) پھینک دو اسے کسی گہرے کنوئیں کی تاریک تہہ میں اٹھا لیں گے اسے کوئی راہ چلتے مسافر اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے"۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ کہنے والا یہوذا ہے، یہ حضرت یعقوب کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ روبیل ہے [1] اور یہ آپ کی خالہ کا بیٹا ہے یہ وہی ہے جس نے فلن ابرح الارض کہا۔ ایک قول یہ ہے: وہ شمعون ہے۔ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ اہل مکہ، اہل بصرہ اور اہل کوفہ نے فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ پڑھا ہے جبکہ اہل مدینہ نے فی غیابات الجب پڑھا ہے ابو عبید کے نزدیک مختار واحد ہے کیونکہ اس سے مراد وہ ایک ہی مقام ہے جہاں انہوں نے آپ کو پھینکا تھا اس وجہ سے انہوں نے جمع کا انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ لغت میں تنگی لانے کے مترادف ہے۔ اس کو جمع یعنی غیابات پڑھنا دو اعتبار سے جائز ہے۔ سیبویہ نے سیر علیه عشیانات و اصیلانات حکایت کیا ہے اور اس سے مراد عشیة و اصیلا ہے تو اس نے اس میں سے ہر وقت کو عشیة اور اصیلا بنا دیا ہے تو اسی طرح ہر وہ جگہ جہاں کوئی چیز چھپائی جائے وہ غیابة ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ گہرے کنوئیں میں کئی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ اور کہا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 184

جاتا ہے۔ غاب یَغِیبُ غَیْبًا وَغَیَابَةً جس طرح شاعر نے کہا ہے:

أَلَا فَالبِثَا شهرین أو نصفَ ثالثٍ　　الی ذَاکُما قد غَیَّبَتِی غِیَابِیَا

ہروی نے کہا: غیابۃ حوض یا کنوئیں کی وہ ایک طرف جس کو پانی کھا جاتا ہے یا پانی کے اوپر کنوئیں میں موجود طاق کے مشابہ ہے جو آنکھ سے کسی چیز کو چھپا لیتا ہے۔ ابن عزیر نے کہا: ہر وہ چیز جو آپ سے کسی چیز کو چھپا لے وہ غیابہ ہے۔ میں (قرطبی) نے کہا: اسی سبب سے قبر کو غیابہ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فإن أنا یومًا غَیَّبَتنی غَیَابَتِی　　فَسِیرُوا بِسَیْرِی فی العَشِیرَةِ والأَهلِ

اس شعر میں غیابتی سے مراد میری قبر ہے۔

اور ''جب'' سے مراد وہ حوض ہے جسے پتھروں سے نہ بنایا گیا ہو اور اگر اسے پتھروں سے بنایا جائے تو وہی کنواں کہلائے گا اعشیٰ نے کہا:

لئن کنتَ فی جبٍّ ثمانین قامةً　　وَرُقِّیتَ أسبابَ السَّماءِ بِسُلَّمِ

اس کو ''جب'' اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زمین میں ایک ٹکڑا کاٹا جاتا ہے اور ''جب'' کی جمع جببۃ وجباب واجباب آتی ہے۔ اس آیت میں غیابہ اور جب دونوں کو جمع کر دیا گیا کیونکہ اس سے کہنے والے کی مراد یہ تھی کہ اس کو کنوئیں کی کسی تاریک جگہ میں پھینکو تاکہ دیکھنے والے کی نظر اس تک نہ پہنچ سکے۔ ایک قول کے مطابق: یہ بیت المقدس کا کنواں ہے(1)، ایک قول یہ ہے: وہ اردن میں ہے یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ مقاتل کا قول ہے: یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر سے تین فرسخ کے فاصلے پر تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ مجاہد، ابو رجاء، حسن اور قتادہ نے تلتقطہ ''تا'' کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ اس معنی پر محمول ہوگا کہ بعض گزرنے والے سیارہ ہوتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: سقطت بعض أصابعه یعنی سقطت کو مؤنث استعمال کیا ہے۔ اس پر اس نے شعر پڑھا:

وتَشْرَقُ بالقولِ الذی قد أذعتَه　　کما شَرِقَتْ صَدْرُ القَنَاةِ من الدَّمِ

ایک اور شاعر نے کہا:

أرَی مَرَّ السِّنِینَ أَخَذْنَ مِنِّی　　کَمَا أَخَذَ السِّرَارُ من الهِلَالِ

شاعر نے شرق اور أخذت نہیں کہا۔ اور سیارہ سے مراد وہ جماعت ہے جو راستہ میں سفر کے لیے چلی ہے۔ کہنے والے نے یہ صرف اس وجہ سے کہا تاکہ انہیں آپ کو دور کسی جگہ لے جانے کی ضرورت بھی نہ پڑے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ پس گزرنے والوں میں سے جو آپ کو اٹھائے گا وہ آپ کو دور دراز مقام پر لے جائے گا تو گویا یہ ان کی تدبیر کی صورت تھی تاکہ ان کو بذات خود کوئی حرکت نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ ان کے والد ان کو اجازت نہ دیتے اور یہ بھی ہو سکتا تھا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 185

کہ وہ ان کے ارادے سے آگاہ ہو جاتے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نہ اس واقعہ سے پہلے نبی تھے اور نہ ہی بعد میں کیونکہ انبیاء کسی مسلمان کے قتل کا منصوبہ نہیں بناتے البتہ وہ مسلمان تھے۔ انہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا پھر توبہ کر لی۔ ایک قول یہ ہے: وہ انبیاء تھے، عقلا نبی کی لغزش محال نہیں تو یہ ان کی لغزش تھی، ان کا یہ فعل اس عقیدے کی تردید کرتا ہے کہ انبیاء گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس وقت وہ نبی نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے آگاہ فرمایا اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن وہب نے کہا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکا گیا تو اس وقت وہ بچے تھے۔ اسی طرح ابن قاسم نے بھی آپ سے روایت کیا ہے، یعنی اس وقت آپ چھوٹے تھے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ ہے آپ نے کہا کہ اٹھایا تو چھوٹے کو ہی جا سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ یہ چیز بھی بچوں کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ الالتقاط راستے سے کسی چیز کو اٹھانا ہے اسی طرح سے اللقیط اور اللقطہ ہے، ہم (قرطبی) ان کے وہ احکامات جن پر آیت اور حدیث دلالت کرتی ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ اہل علم اور اہل لغت نے کہا ہے ذکر کرتے ہیں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: التقاط سے مراد بغیر طلب کے کسی چیز کا پالینا ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ ہے یعنی وہ ان کو پالیں گے بغیر اس کے کہ وہ گزرنے والی جماعت آپ کی تلاش میں ہو۔ علما کا لقیط کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے: اس کی اصل آزادی ہے کیونکہ آزاد، غلاموں پر غالب ہیں۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے لقیط کے آزاد ہونے کا فیصلہ دیا، اور وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (یوسف: 20) کی تلاوت فرمائی اسی جانب اشہب گئے ہیں جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی ہیں اور یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک پوری جماعت سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے اس کی غلامی کی نیت کی تو وہ مملوک ہوگا۔ اور اگر اس نے اجر و ثواب کی نیت کی تو وہ آزاد ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے موطا میں لکھا ہے: ہمارے نزدیک لقیط کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آزاد ہے اور اس کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی، وہی اس کے وارث ہوں گے اور وہی اس کے عاقلہ بھی ہیں۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: وانما الولاء لمن أعتق (1)، ولاء صرف اسی کی ہے جس نے آزاد کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر معتق سے ولاء کی نفی کر دی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان دونوں کے اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ لقیط کسی کا وارث نہیں بنے گا۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اصحاب اور اکثر کوفیوں کا قول ہے: جو چاہے لقیط کا والی بن سکتا

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفرائض، جلد 2، صفحہ 34

ہے اور جو اس کا والی بنے گا وہی اس کا وارث ہوگا اور اس کی طرف سے دیت بھی ادا کرے گا؛ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی ولاء کے ساتھ جہاں چاہے منتقل ہوسکتا ہے جب تک کہ جو اس کا والی بنا اس نے اس کی طرف سے دیت ادا نہ کی ہو اور اگر اس نے اس کی طرف سے دیت ادا کی ہے تو یہ کبھی بھی اپنی ولاء کے ساتھ منتقل نہیں ہوسکتا۔ ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے: لقیط آزاد ہے۔ اگر وہ اس کا والی بننا چاہے جس نے اس کو اٹھایا تو وہ اس کا ولی بن جائے اور اگر وہ اس کے علاوہ اس کا والی بننا پسند کرتا ہے تو کسی اور کا والی بن جائے، اسی قسم کی بات حضرت عطا سے منقول ہے یہی ابن اشہاب رحمۃ اللہ علیہ اور اہل مدینہ کے ایک گروہ کا قول ہے، کہ لقیط آزاد ہے۔ ابن عربی نے کہا (1) کہ لقیط کی اصل آزادی ہے غلام پر آزاد لوگوں کے غلبہ کی وجہ سے، لہٰذا غالب اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا جس طرح کہ غلبہ ظن کی بنیاد پر اس کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، پس اگر وہ ایسے گاؤں میں تھا جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں ہیں تو ابن قاسم نے کہا: جو زیادہ اکثریت میں ہے اس پر اس کا حکم لگایا جائے گا، اگر اس پر یہودیوں کا لباس ہے تو وہ یہودی ہے۔ اگر اس کا لباس نصاریٰ والا ہے تو یہ نصرانی ہے۔ ورنہ وہ مسلمان ہوگا مگر یہ کہ اکثر گاؤں والے اگر اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر ہوں (تو پھر اس کے مسلمان ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا) کسی اور آدمی کا قول ہے، اگر اس گاؤں میں ایک بھی مسلمان ہو تو لقیط کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، اسلام کے اس حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کہ وہ غالب ہوتا ہے اور اس پر غلبہ نہیں پایا جاسکتا۔ اشہب کے قول کا مقتضیٰ بھی یہی ہے: وہ ہمیشہ مسلمان ہوگا کیونکہ میں اس کو ہر حال میں مسلمان ہی بناتا ہوں جس طرح کہ میں اس کو ہر حال میں آزاد بناتا ہوں۔ فقہاء کا ایسے لقیط کے بارے میں اختلاف ہے بینہ جس کی غلامی پر دلالت کرے۔ اہل مدینہ کے گروہ نے کہا ہے: اس سلسلہ میں بینہ کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی جانب اشہب بھی گئے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی وجہ سے: وہ آزاد ہے، اور جس کی آزادی کا فیصلہ کر دیا گیا اس کی غلامی کی بینہ کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ابن قاسم نے کہا: اس معاملہ میں بینہ کو قبول کیا جائے گا، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کوفی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لقیط کے بارے میں کہا: اگر ملتقط نے لقیط پر کچھ خرچ کیا ہو پھر کسی آدمی نے لقیط کے بارے میں بینہ پیش کر دی کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو اگر لقیط کے باپ نے جان بوجھ کر اس کو پھینکا تھا تو ملتقط باپ کی طرف رجوع کرسکتا ہے اور اگر پھینکنا نہ پایا جائے بلکہ وہ اس سے گم ہوگیا ہو تو پھر باپ پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ملتقط نفقہ کے سلسلہ میں متطوع شمار کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر اس نے لقیط پر کچھ خرچ کیا تو وہ متطوع (فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا) ہوگا مگر یہ کہ حاکم نے اسے اس پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہو۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر وہ آدمی جس نے کسی ایسے آدمی پر خرچ کیا جس پر خرچ کرنا اس پر لازم نہ تھا تو یہ اس پر خرچ کردہ رقم کے ساتھ رجوع کرسکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر لقیط کا مال نہ ہو تو اس کا نفقہ بیت المال پر ہوگا مال نہ ہونے کی صورت میں دو قول ہیں: ایک قول اس کے اپنے ذمہ میں اس کے لیے قرض لیا جائے گا اور دوسرا قول...... بغیر کسی عوض کے مسلمانوں پر قسط باندھی جائے گی۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079

مسئلہ نمبر 7۔ لقطہ اور ضوال (گمشدہ چیز) کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: لقطہ اور ضوال دونوں معنی میں برابر ہیں اور ان دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہے یہ موقف امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، انہوں نے ابوعبید قاسم کے اس قول کا انکار کیا ہے کہ گمشدگی صرف حیوان میں ہوتی ہے جبکہ لقطہ حیوان کے علاوہ دیگر چیزوں میں ہوتا ہے۔ اور فرمایا کہ یہ قول غلط ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان أمکم ضلت قلادتھا کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ تمہاری ماں سے اس کا قلادہ گم ہو گیا۔ اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قلادہ پر مطلقاً ضالہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ لقطہ کے بارے میں علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر وہ بالکل کوئی معمولی چیز ہو یا ایسی چیز ہو جو باقی نہیں رہ سکتی تو پھر پورا سال اس کا اعلان کیا جائے گا۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر اس چیز کا مالک آ گیا تو وہ ملتقط کی نسبت اس کا زیادہ حق دار ہو گا بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہی اس کا مالک ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر سال گزرنے کے بعد ملتقط اس چیز کو کھا گیا اور مالک اس کو اس کا ضامن بنانا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اگر ملتقط نے اسے صدقہ کر دیا ہو تو پھر مالک کو ضامن بنانے اور اس کا اجر و ثواب حاصل کرنے دونوں کا اختیار ہے ان دونوں میں سے جس کو مالک اختیار کرے اس کے لیے بالاجماع ایسا کرنا درست ہو گا۔ صدقہ کرنے کے سبب لقطہ میں ملتقط کا قبضہ نہیں چلے گا اور نہ ہی وہ سال سے قبل تصرف کر سکتا ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ گمشدہ ریوڑ میں سے جس کا ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس کا کھانا ملتقط کے لیے جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ فقہاء کا لقطہ کو اٹھا لینے یا چھوڑ دینے کی افضلیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں حدیث طیبہ میں لقطہ کو اٹھانے اور گمشدہ چیز کو لینے کے مباح ہونے پر دلیل ہے بشرطیکہ وہ اونٹ نہ ہو۔ بکری کے بارے میں آپ نے فرمایا: ''تمہارے لیے یا تمہارے بھائی کے لیے یا بھیڑیے کے لیے'' (1)۔ اس میں آپ نے لقطہ کو اٹھانے پر ابھارا ہے اور کسی چیز کے بارے میں بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ ضائع ہو جائے یا اس کا مالک آ جائے۔ اگر لقطہ کو چھوڑ دینا افضل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم ارشاد فرماتے جس طرح آپ نے اونٹ کی گمشدگی کے بارے میں فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے مذہب میں اس معاملہ میں گنجائش ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس کو اٹھا لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، یہ اسماعیل بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے کہا: میں کسی کے لیے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ لقطہ کو پانے کی صورت میں اس کو چھوڑ دے بشرطیکہ وہ اس پر امین ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لقطہ کا تھوڑا ہونا یا اس کا زیادہ ہونا (اس سلسلہ میں) برابر ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ نے حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، انہوں نے کہا: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ سے لقطہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''لقطہ کی تھیلی اور رسی کے بارے میں پہچان کرواپھر سال بھر اس کا اعلان کرا گر اس کا مالک آ جائے تو صحیح ورنہ اس کے بارے میں تمہارا فیصلہ'' (2) (صحیح ہو گا) پوچھنے والے نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گمشدہ بکری؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے لیے، تیرے بھائی کے لیے یا

1۔ صحیح بخاری، باب فی ضالۃ الغنم، جلد 1، صفحہ 328

2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 78

بھیڑیئے کے لیے''(1)۔ اس نے کہا: گمشدہ اونٹ؟ آپ نے فرمایا: ''تیرے لیے نہیں اور اس کے لیے ہے جس کے ساتھ اس کا مشکیزہ اور اس کے جوتے ہوں وہ پانی پر چلا جائے گا اور درخت کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے گا''(2)۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تو اس کی تعداد، برتن اور رسی کی حفاظت کر اگر اس کا مالک آجائے تو صحیح ورنہ اس سے نفع حاصل کر''(3)۔ اس حدیث طیبہ میں تعداد کا لفظ زیادہ ہے۔ اس کو مسلم وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ لقطہ کی تھیلی اور رسی اس کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ اور اس پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ جب لقطہ کا مالک اس کے تمام اوصاف کو بیان کردے گا تو لقطہ اس کے سپرد کردیا جائے گا؟ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کو دینے پر اٹھانے والے کو مجبور کیا جائے گا؛ اور اگر کوئی ایسا مستحق آگیا جو بینہ یعنی گواہی کی وجہ سے اس کا مستحق ٹھہرا ہے تو ملتقط کسی چیز کا ضامن نہیں ہوگا۔ اور کیا وہ آدمی اوصاف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قسم اٹھائے گا یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں پہلا قول اشہب کا ہے اور دوسرا ابن قاسم کا۔ امام مالک آپ کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کے نزدیک بینہ اسے لازم نہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی نے فرمایا: یہ اس کے سپرد تب تک نہیں کیا جائے گا جب تک وہ اس بات پر بینہ پیش نہیں کرتا کہ یہ اسی کی ہے۔ اور یہ حدیث کی نص کے خلاف ہے، کیونکہ اگر حوالے کرنے میں بینہ شرط ہو تو پھر تھیلی، رسی اور عدد کے ذکر کا کوئی معنی نہیں، پس وہ بینہ کے ذریعے تو ہر حال میں اس کا مستحق ہو جائے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے خاموشی اختیار فرمانا درست نہیں، لہٰذا یہ ضرورت کے وقت سے بیان کی تاخیر ہوگی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ حدیث طیبہ اونٹ اور ریوڑ پر نص ہے اور حدیث نے ان دونوں کے حکم کو بیان کردیا ہے اور ان کے علاوہ جتنے حیوان ہیں ان کے بارے میں حدیث میں سکوت ہے۔ ہمارے (قرطبی) علماء میں گائے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیا یہ اونٹ کے ساتھ ملحق ہوگی یا ریوڑ کیساتھ؟ اسی طرح گھوڑے خچر اور گدھے کے التقاط کے بارے میں بھی ہمارے ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا ظاہر یہ ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا اور اشہب اور ابن کنانہ نے کہا ہے: نہیں اٹھایا جائے گا۔ ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ صحیح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے: ''اپنے مومن بھائی کی گمشدہ چیز کی حفاظت کرو''۔

مسئلہ نمبر 12۔ علماء کا ضوال (گمشدہ چیز) پر خرچ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے کہا: اگر ملتقط نے چوپائیوں اور اونٹ وغیرہ پر خرچ کیا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ لقطہ کے مالک پر نفقہ کیساتھ رجوع کرے خواہ اس نے اس پر حاکم کی اجازت کے ساتھ خرچ کیا یا اس کی اجازت کے بغیر آپ نے فرمایا: ملتقط کے لیے جائز ہے کہ جو کچھ اس نے خرچ کیا اس نفقہ کے بدلے میں اس کو اپنے پاس روکے رکھے اور یہ اس کا زیادہ حق دار ہے جس طرح کہ رہن ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جب گمشدہ چیز کو لینے والے نے اس پر خرچ کیا تو وہ

1۔ صحیح بخاری، باب فی ضالۃ الغنم، جلد 1، صفحہ 328　　2۔ ایضاً، ضالۃ الابل، جلد 1، صفحہ 327

3۔ ایضاً، اللقطۃ، جلد 1، صفحہ 327

متطوع (فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا) ہوگا ربیع نے یہ مسئلہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت کیا ہے۔ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے کہا ہے: جب حاکم نے اسے اس پر خرچ کرنے کا حکم دیا تو وہ دین ہوگا۔ اور جتنے کا اس نے دعویٰ کیا اس کی طرف سے قبول کیا جائے گا بشرطیکہ اتنا خرچ ہو جاتا ہو۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب اس نے لقطہ اور اونٹ پر قاضی کی اجازت کے بغیر خرچ کیا تو متطوع ہوگا اور اگر قاضی کی اجازت کے ساتھ خرچ کیا تو یہ لقطہ کے مالک پر دین ہوگا جب بھی وہ آیا اور ملتقط کے لیے جائز ہے کہ جب اس کا مالک آئے تو اس کو اپنے پاس روک لے اور تین دن یا اس کے لگ بھگ وہ اس پر خرچ کرے یہاں تک کہ قاضی بکری یا اس کی مثل چیز کو بیچنے کا حکم دے اور اس کے نفقہ کا فیصلہ کر دے۔

مسئلہ نمبر 13۔ لقطہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں تعریف کے بعد ایسے الفاظ نہیں ہیں جو تملیک پر اور لقطہ کے مالک کے آنے کے بعد ملتقط سے ضمان کے ساقط ہونے پر دلالت کریں مثلاً: واستمتع بہا تم اس سے لطف حاصل کرو (1) فشأنك بہا پس اس کے ساتھ تمہارا معاملہ (2) فھی لك پس وہ تمہارے لیے ہے (3)۔ فاستنفقہا پس تم اسے خرچ کرو (4)۔ ثم کلہا پھر تم اسے کھاؤ (5)، فھو مال اللہ یؤتیہ من یشاء پس وہ اللہ کا مال ہے وہ جس کو چاہے دے دے (6)۔ جس طرح کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے: ''پس اگر تو اس کا اعلان نہ کرے تو اس کو خرچ کر لے اور وہ تیرے پاس ودیعت بن جائے گی اور اگر زمانہ میں کبھی بھی اس کا مالک آ گیا تو وہ اس کو ادا کرے''۔ ایک روایت میں ہے: ''پھر تو اس کو کھا لے اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کو وہ ادا کرے'' (7)۔ اس کو امام مالک، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ جب بھی اس کا مالک آ گیا وہ اس کا زیادہ حق دار ہوگا سوائے داؤد ظاہری کے ان کا موقف یہ ہے کہ ملتقط تعریف کے بعد لقطہ کا مالک بن جائے گا ان ظواہر کی بنیاد پر، مگر ان کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی ایک تو اس وجہ سے کہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فأدھا الیہ کی وجہ سے کہ ''تو اس کو وہ ادا کر دے''۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

''(یہ طے کرنے کے بعد) انہوں نے (آ کر) کہا: اے ہمارے باپ! کیا ہوا آپ کو کہ آپ اعتبار ہی نہیں کرتے ہم پر یوسف کے بارے میں حالانکہ ہم تو اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ آپ بھیجئے اسے ہمارے ساتھ کل تاکہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے کودے اور (کوئی فکر نہ کیجئے) ہم اس کے نگہبان ہیں''۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا مومن حسد کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تجھے بنی یعقوب کا معاملہ کیوں بھول گیا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: باپ بہت زیادہ چلانے والا ہے اور بھائی بہت زیادہ چھیننے

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطۃ، جلد 2، صفحہ 79 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 78 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 79 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً، کتاب اللقطۃ، جلد 1، صفحہ 329

والا ہے۔ اس وقت وہ ایک حیلہ کے ذریعے باپ، بیٹے کو جدا کرنے پر جمع ہوئے اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا: قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ ایک قول یہ ہے: جب انہوں نے باہم بات چیت کی اور متکلم ثانی کی رائے پر جدا جدا ہوئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس واپس لوٹ کے گئے اور یہ بات کہی، اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے ساتھ نکلنے کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا مگر آپ نے انکار فرمایا جس طرح کہ آئے گا۔ یزید بن قعقاع، عمرو بن عبید اور زہری نے لَا تَاْمَنَّا کو ادغام اور بغیر اشام کے پڑھا ہے اور یہی قیاس ہے کیونکہ ادغام کا طریقہ یہ ہے کہ جس کا ادغام کیا جائے وہ ساکن ہو۔ طلحہ بن مصرف نے لَا تَاْمَنُنَا اصل پر رکھتے ہوئے دونوں نونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور ابورزین نے لاتیمنا تا کے کسرہ کے پڑھا ہے یہ لغت تمیم ہے اور اعمش سے روایت ہے وہ کہتے ہیں أنت تضرب یہ پہلے گزر چکا ہے، تمام لوگوں نے اسے ادغام اور اشام کے ساتھ پڑھا ہے، تاکہ یہ ادغام سے پہلے حرف کی حالت پر دلالت کرے۔ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ یعنی ہم اس کی حفاظت میں (مخلص ہیں) حتیٰ کہ ہم اسے آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔ مقاتل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ کو کہا: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا الایہ اس کو کل ہمارے ساتھ بھیجیے، تو اس وقت ان کے باپ نے کہا: اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ تو اس وقت انہوں نے ان کی بات کے جواب میں کہا: مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ الایہ۔ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یعنی اس کو کل ہمارے ساتھ بھیجیے صحراء کی طرف، یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ، غدا ظرف ہے سیبویہ کے نزدیک اصل غدو ہے بعض اوقات اس کو اصل کے مطابق بھی بولا جاتا ہے۔ نضر بن شمیل نے کہا: فجر اور صبح کی نماز کے درمیان کے وقت کو غدوہ کہا جاتا ہے اسی طرح اس وقت کو بکرۃ بھی کہا جاتا ہے۔ نرتع و نلعب نون اور عین کے سکون کے ساتھ اہل بصرہ کی قرأت ہے۔ اہل مکہ کی قرأت میں سے معروف نرتع نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اہل کوفہ کی قرأت یرتع و یلعب یا اور عین کے سکون کے ساتھ ہے اور اہل مدینہ کی قرأت یا اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ بہتر قرأت عربوں کے قول رتع الانسان والبصیر کے مطابق ہے۔ (یہ اس وقت بولتے ہیں) جب انسان اور اونٹ جس طرح چاہیں کھائیں۔ اور معنی یہ ہوتا ہے: ہم شادابی میں وسیع ہیں؛ اور ہر شاداب وادی خوشگوار ہے۔

شاعر نے کہا: فارعی فزارۃ لا ھناك المرتع۔ المرتع معنی چراہ گاہ ہے

ایک اور شاعر نے کہا:

ترتع ما غفلت حتی إذا ادكرت فإنما هي إقبال وإدبار

یہاں بھی ترتع اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا:

أكفرا بعد ردّ الموت عنّي وبعد عطائك المائة الرتاعا (1)

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 187

الرتاعا کا بیان بھی اسی معنی کو بیان کر رہا ہے۔ یعنی الرتاعا سے مراد الراتعۃ ہے۔
معمر نے قتادہ سے نرتع روایت کیا ہے یعنی تسعی۔ نحاس نے کہا: انہوں نے انا ذھبنا نستبق سے اسے اخذ کیا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے: ہم دوڑ میں اس کی معینہ انتہا میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح عین کے سکون کے ساتھ یرتع بھی ہے، البتہ یہ اکیلا حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ہے اور یَرْتَعْ عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد وہ ہے جس نے ریوڑ کو چرایا یعنی یہ اس بات کی مشق اور تجربہ بھی کریں پس کبھی جی بھر کر کھائیں گے اور کبھی بچپن کی وجہ سے کھیلیں گے۔ قتبی نے کہا: یَرْتَعْ یعنی ہم چوکیداری کریں گے اور حفاظت کریں گے اور ہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے۔ اس صورت میں یہ آپ کے قول: رعاك الله سے ہوگا جس کا معنی ہے اللہ تیری حفاظت کرے۔ اور نلعب لعب سے ہوگا۔ ابوعمرو بن علا کو کہا گیا: انہوں نے نلعب کیسے کہا حالانکہ وہ انبیاء ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: اس وقت وہ انبیاء نہیں تھے۔ ایک قول یہ ہے: لعب سے مراد خوشی ومسرت میں سے جو مباح ہے وہ ہوگا نہ کہ وہ ممنوع کھیل مراد ہے جو حق و سچ کی ضد ہے، اسی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے نلعب کے قول کو رد نہیں فرمایا۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فھلا بکرا تلاعبھا و تلاعبك ہے (1) پس کیوں نہ باکرہ عورت کے ساتھ تو نے شادی کی تو اس کے ساتھ ملاعبت کرتا اور وہ تیرے ساتھ ملاعبت کرتی (اس حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعب کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں) مجاہد اور قتادہ نے یَرْتَعْ بمعنی یرتع مطیۃ پڑھا ہے۔ مفعول کو حذف کر دیا گیا وَ یَلْعَبْ کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور معنی ہوگا: وہ اس میں سے تھا جو کھیلتا ہے۔ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہر اس چیز سے جس کا آپ کو اس پر خوف ہے۔ پھر یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سوار ہو کر نکلے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیدل تھے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس وقت تک اپنے کندھوں پہ اٹھائے رکھا جب تک حضرت یعقوب علیہ السلام ان کو دیکھ رہے تھے پھر جب وہ آپ کی آنکھوں سے غائب ہوئے تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تکلیف دینے کے لیے اتار دیا تا کہ آپ ان کے ساتھ دوڑیں۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

"آپ نے فرمایا: بے شک مجھے غمزدہ بناتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ کھا نہ جائے اس کو بھیڑیا اور تم (سیر و تفریح کے باعث) اس سے بے خبر ہو۔ کہنے لگے: اگر کھا جائے اسے بھیڑیا حالانکہ ہم ایک مضبوط جتھہ ہیں بلاشبہ ہم تو بڑے زیاں کار ہوئے"۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ محل رفع میں ہے یعنی تمہارا اس کے ساتھ جانا، آپ نے اپنی عدم موجودگی کے سبب اپنی پریشانی سے باخبر کیا۔ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام پر حملہ آور ہوا تو آپ کو یہ خوف لاحق ہوا یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے خواب دیکھا کہ آپ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، شراء الدواب والحمیر، جلد 1 صفحہ 282

پہاڑ کی چوٹی پر ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام بطن وادی میں۔ اتنے میں دس بھیڑیوں نے آپ کو وحشت میں مبتلا کر دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام کو کھانا چاہتے تھے تو ایک آدمی نے آپ سے ان کو زور سے دھکیلا پھر زمین پھٹ گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام تین دن تک اس میں چھپ گئے پس وہ دس آپ کے بھائی تھے جب وہ آپ کے قتل کی طرف مائل ہوئے تو جس نے آپ سے ان کو ہٹایا وہ آپ کا بڑا بھائی یہوذا تھا اور زمین میں آپ کا چھپنا وہ تین دن آپ کا کنوئیں میں قیام تھا۔ اور ایک قول یہ ہے: آپ نے صرف اس لیے کہا کہ آپ کو ان کی طرف سے حضرت یوسف پر خوف تھا اور آپ نے بھیڑیے کے ذریعے وہ مراد لیے پس آپ کا خوف ان کی طرف سے آپ کا قتل تھا تو آپ نے ان کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے بھیڑیے کے ذریعے کنایۃً ان سے بات کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ نے ان کو بھیڑیا کہا۔ ایک قول یہ ہے: آپ علیہ السلام کو ان کی طرف سے کوئی خوف نہ تھا ورنہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ نہ بھیجتے اور آپ نے بھیڑیے سے صرف اس لیے ڈرایا کہ صحراؤں میں اکثر ان سے خوف رہتا ہے۔ الذِّئْبُ، تذاءبت الريح سے مشتق ہے جب وہ من کل وجہ آ جائے اسی طرح احمد بن یحییٰ نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا: الذئب مہموز ہے کیونکہ یہ من کل وجہ آتا ہے۔ ورش نے نافع سے الذیب بغیر ہمزہ کے روایت کیا ہے۔ جب ہمزہ ساکن ہو اور اس کا ماقبل مکسور ہو تو وہ مخفف ہو کر یا بن جاتا ہے۔ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ یعنی تم کھانے پینے میں مشغول رہو گے۔

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ یعنی ایسی جماعت جو بھیڑیئے کو دیکھے گی اور اسے آپ سے دور نہ ہٹائے گی۔ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ اپنے ریوڑ کی حفاظت کے سلسلہ میں یعنی جب ہم اپنے بھائی سے بھیڑیئے کو نہیں ہٹا سکیں گے تو اپنے ریوڑ سے اس کو دور کرنے میں تو اس سے بھی زیادہ عاجز ہوں گے۔ ایک قول یہ ہے: لَّخٰسِرُوْنَ سے مراد ہے کہ اپنے حق سے ناواقف ہوں گے، جب کہ ایک قول یہ ہے: عاجز ہوں گے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''پھر جب (بڑے اصرار سے) اسے لے گئے اور سب نے یہی طے کر لیا کہ ڈال دیں اسے کسی گہرے کنوئیں کی تاریک تہہ میں اور (عین اس وقت) ہم نے اس کی طرف وحی کی (گھبراؤ نہیں) تم ضرور انہیں آگاہ کرو گے ان کے اس فعل پر اور وہ (تیرے رتبہ عالی کو) نہیں سمجھتے''۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ، ان محل نصب میں ہے یعنی علی أن یجعلوہ فی غیابۃ الجب اس قصہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب نے جب آپ کو ان کے ساتھ بھیجا تو ان سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ ضرور اس کی حفاظت کریں گے اور آپ کو روبیل کے سپرد کیا اور فرمایا: اے روبیل! یہ چھوٹا ہے اور اے میرے بیٹے تو اس پر میری شفقت کو جانتا ہے اگر اسے بھوک لگے تو اس کو کھانا کھلانا اور اگر پیاس لگے تو پانی پلانا یہ اگر تھک جائے تو اٹھا لینا پھر اس کو میرے پاس واپس لانے میں جلدی کرنا۔ انہوں نے آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا شروع کیا ایک نہ اتارتا تھا کہ دوسرا اٹھا لیتا اور حضرت یعقوب علیہ

السلام کئی میل ان کے پیچھے چلے پھر واپس لوٹ گئے جب وہ اپنے باپ کی نظروں سے اوجھل ہوئے تو جس نے آپ کو اٹھایا ہوا تھا اس نے آپ کو زمین پر دے مارا حتیٰ کہ ہڈیاں ٹوٹنے کے قریب ہوگئیں تو آپ نے دوسرے کے پاس پناہ لی مگر ہر ایک کی طرف سے دوسرے سے زیادہ غصہ اور تکلیف ملی تو آپ نے روبیل سے مدد طلب کی اور کہا: تو میرا بڑا بھائی ہے میرے والد کے بعد میرا نگران ہے میرے بھائیوں میں میرے سب سے زیادہ قریب ہے۔ مجھ پر اور میری کمزوری پر رحم کر'۔ تو اس نے آپ کو بہت سخت تھپڑ مارا اور کہا: میرے اور تیرے درمیان کوئی قرابت نہیں ان گیارہ ستاروں کو بلا جو تجھے ہم سے بچائیں تو آپ کو پتا چل گیا کہ ان کا حسد خواب کی وجہ سے ہے تو آپ اپنے بھائی یہوذا کے ساتھ چمٹ گئے اور کہا: اے میرے بھائی! میری کمزوری، عاجزی اور کمسنی پر رحم کر اور اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کے دل پر رحم کھا، کتنی جلدی تم اس کی وصیت کو بھول گئے اور اس کے عہد کو تم نے توڑ دیا، تو یہوذا کا دل نرم ہوا اور اس نے کہا: اللہ کی قسم جب تک میں زندہ ہوں یہ تمہارے کبھی بھی قریب نہ آسکیں گے تو اس نے کہا: اے میرے بھائیو! جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہوا اس کا قتل بہت بڑی غلطی ہے پس اس بچے کو اس کے باپ کے پاس واپس چھوڑ آؤ اور ہم اس کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ یہ اپنے باپ کو اس واقعہ میں سے کچھ بھی نہیں بتائے گا، تو اس کے بھائی نے کہا: اللہ کی قسم تو فقط یعقوب علیہ السلام کے نزدیک اپنا مقام بنانا چاہتا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو ہم اس کے ساتھ تجھے بھی قتل کر دیں گے، تو اس نے کہا: اگر تمہیں یہ بات پسند نہیں تو لو یہ تاریک اور خوفناک کنواں ہے جو سانپوں اور کیڑے مکوڑوں کی پناہ گاہ ہے۔ اسے اس میں پھینک دو اگر اسے ان میں سے کسی چیز نے آلیا تو یہی اس کی مراد ہوگی اور تم اس کے خون سے محفوظ رہو گے اور اگر یہ گزرنے والی کسی جماعت کے ہاتھ لگ گیا تو وہی اس کی قسمت ہوگی تو یہ معاملہ ان کے نزدیک طے ہو گیا یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ، لما کا جواب محذوف ہے یعنی فلما ذهبوا به واجمعوا على طرحه في الجب عظمت فتنتهم۔ ایک قول یہ ہے: لما کا جواب ان کا یہ قول ہے: قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ۔ ایک قول کے مطابق: تقدیر عبارت یوں ہے فلما ذهبوا به من عند ابيهم واجمعوا في غيابة الجب جعلوه فيها یہ بصریوں کے مذہب کے مطابق ہے۔ جہاں تک کوفیوں کا قول ہے تو ان کے نزدیک اس کا جواب اَوْحَيْنَاۤ ہے واو مقحمہ ہے ان کے نزدیک ''واؤ'' لما اور حتی کے ساتھ زائدہ ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) یعنی (اصل میں) فتحت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (ہود: 40) یعنی فار۔ امری القیس نے کہا:

فلما أجزنا ساحة الحي وانتحى

یہاں بھی واؤ زائدہ ہے یعنی اصل میں صرف انتحی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (الصافات) ہے وَ نَادَيْنٰهُ (مریم: 52) یعنی نَادَيْنٰهُ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ میں اس وقت میں آپ کی نبوت پر دلیل ہے حضرت حسن، مجاہد، ضحاک اور حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حال میں نبوت عطا فرمائی کہ آپ تاریک کنویں میں پانی کے اوپر اٹھے ہوئے پتھر پر تھے۔ کلبی نے کہا: جس وقت آپکو کنوئیں میں پھینکا گیا اس وقت

آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی، اور آپ چھوٹے نہ تھے اور جس نے کہا ہے کہ آپ چھوٹے تھے تو عقلاً یہ بات بھی بعید نہیں کہ چھوٹے بچے کو بھی خبر دے دی جائے اور اس کی طرف وحی کر دی جائے۔ ایک قول یہ ہے: وحی دراصل الہام تھا۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ (النحل: 68) تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف الہام کیا۔ ایک قول یہ ہے: آپ خواب میں تھے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ جبرائیل امین آپ کے پاس وحی لے کر آئے۔

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ عنقریب انہیں اپنے کیے کی سزا مل جائے گی اس صورت میں وحی آپ کے دل کی تقویت اور سلامتی کی خوشخبری کے طور پر آپ کے کنویں میں پھینکے جانے کے بعد ہوئی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ وحی فرمائی جو آپ کے بھائی آپ کے ساتھ کرنے والے تھے اس صورت میں وحی آپ کے کنوئے میں پھینکے جانے سے پہلے آپ کو بروقت خبردار کرنے کے لیے ہوئی۔ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ یہ شعور نہیں رکھتے کہ آپ یوسف ہیں۔ اور یہ اس وقت ہے جب مصر میں حکومت آپ کے سپرد کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنے باپ اور بھائیوں کو اپنے مکان کے بارے میں آگاہ نہ کریں، ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کے بارے میں جو وحی فرمائی (اس کا شعور نہیں) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے اور ایک قول یہ ہے ''ھا'' حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں بذریعہ وحی اس سے آگاہ فرما دیا کہ جو کچھ انہوں (آپ کے بھائیوں) نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا، اور عنقریب اللہ کے حکم سے آپ انہیں اس کے بارے میں بتائیں گے اور وہ (بھائی) اس بات کا شعور نہیں رکھتے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی۔ واللہ اعلم، حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کردہ قصہ جس کو سدی اور دیگر لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ جب آپ کو گہرے کنوئیں میں پھینکا گیا۔ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو کنوئیں میں لٹکا دیا تو آپ کنوئیں کی منڈیر کے ساتھ لٹک گئے تو انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیے اور آپ کی قمیص اتار دی۔ تو آپ نے کہا: اے میرے بھائیو! مجھے میری قمیص واپس کر دو تا کہ اس کنوئیں میں اس کے ذریعے چھپ جاؤں پس اگر میں مر گیا تو وہ میرا کفن ہوگی اور اگر میں زندہ رہا تو اس کے ذریعے میں اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لوں گا۔ تو انہوں نے کہا: سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو بلا وہ تمہارے سر کو ڈھانپیں اور تجھے کپڑے پہنائیں۔ آپ نے فرمایا: میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا، پس انہوں نے آپ کو کنوئیں میں لٹکا دیا یہاں تک کہ جب آپ اس کے نصف تک پہنچ گئے تو انہوں نے آپ کو اس ارادے کے ساتھ پھینک دیا کہ آپ گریں گے اور مر جائیں گے۔ کنوئیں میں پانی تھا، آپ اس میں گرے پھر آپ نے ایک چٹان کی پناہ لی اور اس پر کھڑے ہو گئے۔ ایک قول یہ ہے: شمعون نے اس کو یہ چاہتے ہوئے کاٹا کہ وہ آپ کو چٹان پر ٹکڑے ٹکڑے کر دے، جبکہ جبرئیل امین ساق عرش کے نیچے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ میرے بندے تک پہنچ۔ جبرئیل نے فرمایا: میں نے بہت زیادہ تیزی کی اور زمین پر اترا یہاں تک کہ میں رسی اور وقوع کے درمیان حائل ہو گیا اور میں نے آپ کو صحیح سلامت چٹان پر بٹھا دیا وہ کنواں شیروں کی پناہ گاہ تھا، آپ چٹان پر کھڑے ہوئے اور رونے لگے تو انہوں نے آپ کو آواز دی آپ نے اس آواز کو اپنے اوپر ایسی رحمت سمجھا جس نے انہیں (بھائیوں کو) پکڑ لیا

ہے۔ تو آپ نے انہیں جواب دیا۔ انہوں نے آپ کو چٹان سے گرانا چاہا مگر یہوذا نے انہیں روکا، یہوذا آپ کے پاس کھانا لایا کرتا تھا، جب آپ ننگے ہو گئے تو جبرئیل آپ کے پاس پہنچا اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ننگا آگ میں ڈالا گیا تو جبرائیل ریشم کی ایک قمیص لے کر آئے اور اس نے آپ کو پہنا دی وہ حضرت براہیم علیہ السلام کے پاس تھی پھر حضرت اسحاق علیہ السلام اس کے وارث بنے پھر حضرت یعقوب علیہ السلام وارث بنے جب حضرت یوسف علیہ السلام بڑے ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس قمیص کو ایک تعویز میں ڈال کر آپ کے گلے میں ڈال دیا حضرت یوسف علیہ السلام اس کو علیحدہ نہیں کرتے تھے، جب آپ کو ننگا کنوئیں میں ڈالا گیا تو جبریل علیہ السلام نے وہ قمیص نکال کر آپ کو پہنا دی۔ وہب نے کہا: جب آپ چٹان پر کھڑے ہوئے تو آپ نے کہا: اے بھائیو! ہر میت کی کوئی نہ کوئی وصیت ہوتی ہے۔ میری وصیت کو سنو، انہوں نے کہا: وہ کیا ہے؟ آپ نے کہا: جب تم سارے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے مانوس ہو رہے ہو گے تو میری غربت کو یاد کرنا اور جب تم کسی نوجوان کو دیکھو گے تو میری جوانی کو یاد کرنا، جبریل نے کہا: اے یوسف! اس (وصیت) کو چھوڑو اور دعا میں مشغول ہو جاو، دعا کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا مقام ہے پھر جبریل علیہ السلام نے آپ کو دعا بتائی تو آپ نے عرض کیا: اے اللہ! اے ہر اجنبی کے مؤنس! اے ہر تنہا کے ساتھی! اے ہر خوف زدہ کے ملجا! اے ہر مصیبت کو دور کرنے والے! اے ہر سرگوشی کو جاننے والے! اے ہر شکوہ کی انتہا اور اے ہر اجتماع کے حاضر! اے زندہ! اے زندہ رکھنے والے! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنی امید میرے دل میں ڈال دے یہاں تک کہ میرے نزدیک تیرے سوا نہ کوئی غم اور نہ کوئی مصروفیت رہے، اور میرے لیے میرے معاملہ میں وسعت اور نکلنے کی راہ پیدا فرما دے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، فرشتوں نے کہا: اے ہمارے معبود! ہم آواز اور دعا سنتے ہیں، آواز بچے کی ہے اور دعا نبی کی۔ ضحاک نے کہا: جبریل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام پر اس حال میں اترے کہ آپ گہرے کنوئیں میں تھے تو جبریل علیہ السلام نے کہا: کیا میں آپ کو ایسے کلمات نہ سکھاوں کہ جن کو اگر تم کہو تو اللہ تعالیٰ جلدی تمہیں اس کنوئیں سے نکال لے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے ہر مصنوع کو بنانے والے، اے ہر ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کرنے والے، اے ہر راز کے شاہد، اے ہر اجتماع کے حاضر، اے ہر مصیبت کو دور کرنے والے، اے ہر اجنبی کے دوست اور اے ہر تنہا کے مونس! میرے لیے کشادگی اور امید کو لا اور اپنی امید میرے دل میں ڈال دے یہاں تک کہ میں تیرے سوا کسی کی امید نہ کروں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس دعا کو اس رات بار بار دہرایا تو اللہ تعالیٰ نے اس دن صبح آپ کو اس کنوئیں سے نکالا (1)۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً، عِشَآءً سے مراد لیلاً ہے یعنی رات کے وقت یہ ظرف ہے اور حال کی جگہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1063

میں ہے، وہ رات کے وقت آئے تا کہ تاریکی میں زیادہ بہتر انداز میں عذر گھڑ سکیں، اسی وجہ سے کہا گیا ہے: رات کے وقت حاجت نہ مانگو، بے شک حیا دونوں آنکھوں میں ہے اور دن کے وقت گناہ سے عذر نہ کر تو عذر کرنے میں شرمندگی محسوس کرے گا۔ روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی گریہ زاری کو سنا تو فرمایا (1): تمہیں کیا ہوا؟ ریوڑ میں کوئی مسئلہ بن گیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: یوسف کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہم دوڑ لگانے گئے تو بھیڑیا اسے کھا گیا، آپ روئے اور چیخے اور فرمایا: اس کی قمیص کہاں ہے؟ جس طرح کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

سدی اور ابن حبان نے کہا: جب انہوں نے کہا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے تو انہوں نے آپ پر پانی ڈالا مگر آپ نے کوئی حرکت نہ کی اور انہوں نے آوازیں دیں مگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا، وہب نے کہا: یہوذا نے اپنا ہاتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے منہ اور ناک پر رکھا تو اس نے سانس کی حرکت کو بھی محسوس نہ کیا اور نہ ہی آپ کی نبض چلی، تو یہوذا نے انہیں (دیگر بھائیوں کو) کہا: قیامت کے دن کے مالک کی طرف سے ہمارے لیے ہلاکت و بربادی ہو! ہم نے اپنے بھائی کو ضائع کر دیا، اور اپنے باپ کو قتل کر دیا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو سحری کی ٹھنڈک سے کچھ افاقہ ہوا، آپ کو افاقہ ہوا تو آپ کا سر روبیل کی گود میں تھا، آپ نے فرمایا: اے روبیل! کیا میں نے تجھے اپنے بیٹے پر امین نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا؟ اس نے کہا: اے میرے باپ! اپنے رونے کو مجھ سے روکو، میں آپ کو بتاتا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رونا روکا تو اس نے کہا: اے میرے باپ: **اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ** ہم ذرا دوڑ لگانے گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ آدمی کا رونا (2) اس کی گفتگو کی سچائی پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ تصنع کر رہا ہو، تو مخلوق میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا، کہا گیا ہے: بناوٹی آنسو نہیں چھپ سکتا، جس طرح کہ حکیم نے کہا ہے:

إذا اشتبكتْ دموعٌ في خُدودٍ　　تَبَيَّنَ مَنْ بَكَى مِمَّنْ تَبَاكَى

جب آنسو رخساروں پر رہتے ہیں تو جو واقعی رو رہا ہو بناوٹی رونے والے سے واضح ہو جاتا ہے۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

''انہوں نے کہا باوا جی! ہم ذرا گئے کہ دوڑ لگائیں اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس (ہائے افسوس) کھا گیا اس کو بھیڑیا، اور آپ نہیں مانیں گے اگرچہ ہم سچے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ نَسْتَبِقُ باب افتعال ہے: مسابقہ (باہم دوڑ لگانا) سے، ایک قول ہے: یعنی ہم نیزہ بازی کر رہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 193　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1075

تھے اسی طرح حضرت عبداللہ کی قراءت میں انا ذھبنا نتنتضل ہے یہ بھی دوڑ کی ایک قسم ہے یہ زجاج کا قول ہے۔ ازھری نے کہا: نضال، تیروں میں ہوتا ہے اور رھان گھوڑے میں ہوتا ہے جبکہ مسابقہ کا لفظ ان دونوں کو جامع ہے۔ قشیری ابونصر نے کہا: نَسْتَبِقُ یعنی تیر اندازی میں، یا گھوڑے پر یا پھر دوڑنے میں، دوڑنے میں مسابقہ سے مقصود دشمن کے خلاف سانس کی مشق ہے کیونکہ دشمن کے قتال میں اور ریوڑ سے بھیڑیے کو بھگانے میں یہ بھی ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سدی اور ابن حبان نے کہا: نَسْتَبِقُ سے مراد ہے کہ ہم نے دوڑ میں بہت زیادہ شدت اختیار کی تاکہ ہم دیکھیں کہ ہم سے کون زیادہ آگے بڑھتا ہے؟ ابن عربی نے کہا: سابقہ شریعت میں ایک طریقہ، عمدہ خصلت اور جنگ میں مددگار ہے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ایسا کیا اور اپنے گھوڑے کے ذریعے بھی مقابلہ فرمایا، اور آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ فرمایا تو آپ ان سے آگے نکل گئے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے (سن رسیدہ) ہو گئے تو آپ نے ان کے ساتھ مقابلہ کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ سے سبقت لے گئیں تو آپ نے فرمایا: ''یہ اس کا بدلہ ہے'' (2)۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے ذی قرد سے مدینہ طیبہ کی طرف واپسی پر ایک آدمی کیساتھ مقابلہ کیا اور حضرت سلمہ بن اکوع سبقت لے گئے۔ (خرجہ مسلم)

مسئلہ نمبر 2۔ مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضمار شدہ گھوڑوں کے درمیان حفیاء سے لے کر ثنیۃ الوداع تک مقابلہ کرایا اور جن کو اضمار نہیں کیا گیا تھا ان کا مقابلہ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک کرایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کے درمیان مقابلہ کرایا گیا۔

اس باب میں یہ حدیث اپنے ضمن میں تین شرائط کو لیے ہوئے ہے جن کے بغیر مقابلہ جائز نہیں۔ ایک یہ کہ مقابلہ کی مسافت معلوم ہونی چاہیے۔ دوسری یہ کہ گھوڑے مساوی صفت کے ہونے چاہئیں۔ تیسری یہ کہ مضمر گھوڑے کا مقابلہ غیر مضمر کے ساتھ ایک ہی مسافت اور ایک ہی مقصد کے لیے نہیں ہونا چاہیے، مقابلہ کی یہ سنت جن گھوڑوں میں ہوگی وہ وہ گھوڑے ہیں جن کو دشمن کے ساتھ جہاد کے لیے تیار کیا گیا ہو نہ کہ فتنوں میں مسلمانوں کے باہمی قتال کے لیے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نیزہ بازی اور اونٹ میں دوڑ کا مقابلہ کرانے کے متعلق امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا ہم ایک مقام پر رکے ہم میں سے کوئی چھپن چھوڑ کھیلنے لگا اور کوئی نیزہ بازی کرنے لگا اور انہوں نے حدیث کا ذکر کیا۔ نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیزہ بازی، اونٹوں کی دوڑ اور گھوڑوں کی دوڑ کے سوا کوئی مقابلہ نہیں''۔ نیزہ بازی کا ذکر ابن ابی ذئب عن نافع بن ابی نافع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔ اس کو نسائی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی حجاز اور عراق

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1075

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی السبق علی الرجل، جلد 1، صفحہ 348

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب حسن المعاشرۃ (روایت بالمعنی)، حدیث نمبر 1968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے فقہاء کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا وہ کبھی مقابلہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی تھی (حمید نے لا تسبق کے بعد أولا تكاد تسبق کے الفاظ بیان کیے ہیں)۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی ایک اونٹ پر آیا اور وہ اس سے آگے نکل گیا تو مسلمانوں کو اس بات سے رنج ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ جو چیز بھی دنیا میں سربلند ہو وہ اس کو سرنگوں کر دے" (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ سوائے اونٹ، گھوڑے اور نیزہ بازی کے مقابلہ جائز نہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ان تین کے علاوہ میں مقابلہ جوا ہے۔ ابو البختری قاضی نے الخف والحافر والنصل والی حدیث میں أوجناح کے الفاظ کی زیادتی کی ہے۔ یہ لفظ اس نے رشید کی خاطر بڑھائے علماء نے اسی وجہ سے اور اس کی دیگر موضوعات کی وجہ سے اس کی حدیث کو چھوڑ دیا ہے۔ علماء کسی بھی صورت میں اس کی حدیث کو نہیں لکھتے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: گھوڑے اور نیزہ بازی کے علاوہ کسی چیز میں مقابلہ نہیں کیونکہ یہی اہل حرب کے خلاف قوت ہیں۔ اور کہا: ہمارے نزدیک نیزہ بازی کی نسبت گھوڑے کا مقابلہ زیادہ پسندیدہ ہے۔

بعض علماء نے سوائے گھوڑے کے مقابلہ کے باقی ہر چیز میں شرط لگانے سے منع کیا ہے، کیونکہ عربوں کی یہی عادت تھی کہ وہ صرف گھوڑے میں ہی شرط لگاتے تھے۔ عطا سے روایت ہے کہ ہر چیز میں شرط لگانا جائز ہے اور ان کے قول کی یہ تاویل کی جاتی ہے کیونکہ ان کا اس کو عموم پر محمول کرنا تو جوئے کی اجازت کا سبب بنے گا حالانکہ یہ تو بالاتفاق حرام ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ گھوڑے اور اونٹ میں مقابلہ صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جب مسافت اور اس کی انتہا معلوم ہو جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح نیزہ بازی میں مقابلہ جائز نہیں مگر جب اس کی غایت معلوم ہو اور کمان بھی معلوم ہو، اور ٹارگٹ کی صورت کا علم ہو، اس ٹارگٹ کو پار کرنے کی شرط لگائی گئی ہو یا بغیر شرط کے پار ہو جائے۔ دوڑ میں سبقت کی تین صورتیں ہیں: حاکم یا حاکم کے علاوہ کوئی اور آدمی اپنے پاس سے رقم دے اور سبقت لے جانے والے کے لیے معلوم رقم کو مختص کر دے اب جو بھی سبقت لے گا وہ رقم لے لے گا۔ دو آدمی مقابلہ کریں، دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک رقم نکالے جبکہ دوسرا رقم نہ دے اگر دوسرا آدمی سبقت لے گیا تو وہ اس رقم کو حاصل کر لے گا۔ مقابلے کی تیسری صورت میں اختلاف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ہر ایک برابر برابر رقم دیں اور یہ شرط لگالیں کہ جو بھی سبقت لے گیا وہ ساری رقم لے لے گا۔ پھر جو سبقت لے گیا اس نے دونوں کی رقم لے لی۔ یہ صورت جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دونوں اپنے درمیان ایک ایسے محلل کو داخل کریں جس سے ان دونوں کو یہ خطرہ ہو کہ وہ ان سے سبقت لے جا سکتا ہے پس اگر محلل سبقت لے گیا تو وہ ان دونوں کی رقم حاصل کر لے گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی نے سبقت لی تو جس نے بھی سبقت لی وہ دونوں کی رقم لے لے گا۔ اور محلل کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی چیز دینی ہوگی اور اگر دوسرے نے صرف تیسرے پر سبقت حاصل کی تو گویا اس نے کسی پر بھی سبقت حاصل نہیں کی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ابو علی بن خیران نے کہا: محلل گھوڑے کا حکم یہ ہے کہ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 447

اس کی دوڑ کے بارے میں معلوم نہ ہو اور اس کو محلل اس وجہ سے کہتے ہیں کیونکہ وہ دو مقابلہ کرنے والوں کے مقابلہ کو حلال کرتا ہے یا خود اپنے مقابلے کو حلال کرتا ہے۔ اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان محلل نہ ہو اور دو مقابلہ کرنے والوں نے یہ شرط لگائی ہو کہ جس نے بھی سبقت لی وہ اپنی رقم اور دوسرے کی رقم لے لے گا تو یہ صراحتاً جوا ہے اور جائز نہیں ہے۔ سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، آپ نے فرمایا: ''جس آدمی نے دو گھوڑوں کے درمیان ایک گھوڑا اڑالا جس کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ وہ سبقت لے جائیگا تو یہ جوا نہیں اور اس نے ایسا گھوڑا اڑالا جس کے بارے میں سبقت لے جانے کا خطرہ نہیں تھا تو یہ جوا ہے''۔

موطاء میں حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے انہوں نے کہا: گھوڑوں کی دوڑ میں شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان میں محلل داخل ہو پس اگر وہ سبقت لے جائے تو انعام حاصل کرلے گا اور اگر دوسرے گھوڑے سبقت لے جائیں تو اس محلل پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور اہل علم کا قول ہے۔ اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، ایک قول یہ ہے کہ گھوڑوں میں محلل کو لانا لازم نہیں اور ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کو نہیں لیتے، پھر آپ نے کہا: محلل کے بغیر مقابلہ جائز نہیں، آپ کا یہی قول زیادہ عمدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ گھوڑے اور اونٹ کے مقابلے میں صرف نوجوان (بالغ) آدمی کو ہی سوار کیا جائے گا، اور اگر گھوڑوں کے مالک خود سوار ہوں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: مقابلہ میں گھوڑوں پر صرف ان کے مالک ہی سوار ہوں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مقابلہ کی کم از کم صورت یہ ہے کہ وہ گردن سے آگے بڑھے یا اس کے بعض حصے سے آگے بڑھے، یا پھر اس کے پچھلے حصے یا اس کے بعض سے آگے بڑھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نیزہ بازی کے مقابلہ کی بھی یہی صورت ہوگی۔ امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ مقابلہ کیا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پہنچے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے کے دھڑ کے قریب تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھوڑا تیسرے نمبر پر تھا۔

وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا یعنی اپنے کپڑوں اور سامان کے پاس نگرانی کے لیے۔ **فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ** جب انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: **وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ** مجھے خوف ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے تو انہوں نے اس وجہ سے یہی کہا کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پائے جانے والے اندیشوں میں یہ زیادہ ظاہر تھا۔ **وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا** مومن سے مراد تصدیق کرنے والا۔ **وَلَوْ كُنَّا** یعنی ان کنا یہ مبرد اور ابن اسحاق کا قول ہے۔ **صٰدِقِيْنَ** یعنی اپنی بات میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی تصدیق اس وجہ سے نہ کی کہ آپ کے سامنے ان کی طرف سے کہی جانے والی باتوں کے خلاف بہت سے دلائل ظاہر ہو چکے تھے جس طرح کہ ان کا بیان آئے گا۔ ایک قول یہ ہے: **وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ** یعنی اگر ہم آپ کے نزدیک سچے اور قابل اعتماد بھی ہوتے پھر بھی آپ ہم پر جھوٹ کی تہمت لگاتے اور آپ ہماری تصدیق نہ کرتے کیونکہ آپ

کو یوسف سے شدید محبت ہے۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸

''اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر، آپ نے فرمایا: (غلط کہتے ہو یوں نہیں) بلکہ آراستہ کر دکھایا تمہیں تمہارے نفسوں نے اس (سنگین جرم) کو، (اس جانکاہ حادثہ پر) صبر جمیل کروں گا اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا اس پر جو تم بیان کرتے ہو''۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بِدَمٍ كَذِبٍ مجاہد نے کہا: وہ بکری یا بھیڑ کے بچے کا خون تھا (1) جس کو انہوں نے ذبح کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ ہرن کا خون تھا وجاءو اعلی قمیصہ بدم مکذوب فیہ دم کی صفت مصدر کیساتھ لگائی گئی تو تقدیر عبارت یوں ہوگی: بدم ذی کذب جیسے واسال القریہ بعض اوقات فاعل اور مفعول دونوں کا نام مصدر کے ذریعے رکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذا ضرب الامیر یعنی مضروبہ، اسی طرح ماء سکب یعنی مسکوب، ماء غور یعنی غائر اور رجل عدل یعنی عادل۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بدم کذب پڑھا ہے دال کیساتھ یعنی تازہ خون کے ساتھ، تازہ خون کو الکذب کہا جاتا ہے، اور انہوں نے یہ بھی حکایت کیا ہے کہ تبدیل ہوا خون ہے۔ یہ شعبی کا قول ہے۔ اور الکذب اس سفیدی کو بھی کہتے ہیں جو احداث کے ناخنوں میں نکلتی ہے؛ تو ہو سکتا ہے کہ قمیص میں خون اس سفیدی کے مشابہ ہو جو رنگوں کے اختلاف کی صورت میں ناخن میں نکلتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا: جب انہوں نے خون کو اپنی سچائی کی علامت بنانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے علامت کو اس کے معارض علامت بنا دیا اور وہ ہے قمیص کا پھٹنے سے محفوظ رہنا، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام کو پھاڑے اور آپ نے قمیص پہنی ہوئی ہو اور قمیص پھٹنے سے محفوظ رہی۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص میں غور و فکر کیا اور اس میں کوئی پھٹن اور اثر نہ پایا تو اس کے ذریعے آپ نے ان کے جھوٹ پر استدلال کیا اور انہیں کہا: یہ بھیڑیا حکیم کب کا بن گیا ہے کہ یوسف کو کھاتا ہے اور قمیص نہیں پھاڑتا (2)؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر کا قول ہے۔ اسرائیل نے سماک بن حرب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: خون بکری کے بچے کا تھا۔ سفیان نے سماک عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا آپ نے کہا: جب آپ (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اس کی طرف دیکھا تو فرمایا: تم نے جھوٹ بولا، اگر بھیڑیے نے کھایا ہوتا تو ضرور قمیص پھٹتی۔ ماوردی نے حکایت کی کہ قمیص کے بارے میں تین نشانیاں ہیں (3)۔ جب وہ اس پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے، جس وقت پیچھے سے آپ کی قمیص کو پھاڑا گیا اور جس وقت آپ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 194 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1077

کے باپ کے چہرے پر اسے ڈالا گیا اور بینائی لوٹ آئی۔

میں نے کہا: یہ مردود ہے، پس وہ قمیص جس پر وہ خون لگا کر لائے وہ اس کے علاوہ تھی جس کو پھاڑا گیا اور جس کے ذریعے خوشخبری لائی گئی۔ ایک قول یہ ہے: وہ قمیص جس کو پھاڑا گیا وہ وہی تھی جس کو لانے کی وجہ سے بینائی واپس آ گئی جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ سورت کے آخر میں آئے گا، ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا: بلکہ چوروں نے اسے قتل کیا ہے، ان کے قول مختلف ہو گئے تو آپ نے ان پر الزام لگایا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو کہا: تم یہ گمان کرتے ہو کہ بھیڑیے نے اسے کھا لیا ہے، اگر اس نے اسے کھایا ہوتا تو اس کی جلد تک پہنچنے سے پہلے اس کی قمیص ضرور پھٹ گئی ہوتی حالانکہ مجھے قمیص میں کوئی پھٹن دکھائی نہیں دے رہی اور تمہارا یہ گمان ہے کہ چوروں نے اسے قتل کر دیا ہے، اگر وہ اسے قتل کرتے تو وہ اس کی قمیص ضرور لے لیتے وہ تو کپڑے ہی لیتے ہیں، تو اس وقت انہوں نے کہا: وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ حضرت حسن اور دیگر سے ہی روایت ہے یعنی اگر ہم سچائی کے ساتھ موصوف بھی ہوں تب بھی آپ ہم پر ضرور الزام لگائیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ فقہاء نے اس آیت کے ذریعے فقہ کے مسائل میں نشانیوں کو عمل میں لانے پر استدلال کیا ہے جس طرح قسامت وغیرہ، اور اس پر اجماع ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص کے صحیح ہونے کے ذریعے ان کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اسی طرح اگر علامات میں تعارض واقع ہو جائے تو دیکھنے والے کو علامات اور نشانیوں کو دیکھنا چاہیے اور ان میں سے جو ترجیح پا جائیں جانب ترجیح کے ذریعے فیصلہ دینا چاہیے اور یہ الزام کی قوت ہے اور اس کے ذریعے فیصلہ دینے میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ابن عربی کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو انہوں نے کہا: فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ آپ نے انہیں کہا: کیا بھیڑیے نے اس کا کوئی عضو نہیں چھوڑا وہ میرے پاس لے آؤ تا کہ میں اس کے ذریعے انس حاصل کروں؟ کیا اس نے میرے لیے کوئی کپڑا نہیں چھوڑا جس میں میں اس کی خوشبو سونگھوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! یہ اس کی قمیص ہے جو اس کے خون میں لت پت ہے، یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام روئے اور اپنے بیٹوں کو کہا: اس کی قمیص مجھے دکھاؤ، انہوں نے قمیص دکھائی آپ نے اس کو سونگھا اور چوما، پھر آپ اس کو الٹ پلٹ کرنے لگے تو اس میں کوئی سوراخ اور پھٹن دکھائی نہ دیا تو آپ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! میں نے آج تک ایسا مضبوط بھیڑیا نہیں دیکھا وہ میرے بیٹے کو کھا گیا اس نے اسے قمیص سے ایسے نکال لیا ہے کہ قمیص کو بالکل پھاڑا ہی نہیں اور آپ کو پتا چل گیا کہ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے کہا ہے اور یہ معلوم ہو گیا کہ بھیڑیے نے اسے نہیں کھایا، آپ نے ناراض شخص کی طرح ان سے اعراض کر لیا اس حال میں کہ آپ پریشان بھی تھے اور رو بھی رہے تھے اور کہا: اے میرے بیٹوں کی جماعت! میرے بیٹے کی طرف میری رہنمائی کرو اگر وہ زندہ ہوا تو میں اسے اپنے پاس لے

آؤں گا اور اگر مردہ ہوا تو میں اس کا کفن دفن کروں گا۔ تو اس وقت انہوں نے کہا: ہمارے باپ کو دیکھو کس طرح ہماری گفتگو کی تکذیب کرتا ہے؟ آؤ اسے کنویں سے نکالیں، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں اور اپنے باپ کے پاس اس کا کوئی عضو لے آئیں تاکہ یہ ہماری گفتگو کی تصدیق کرے اور اس کی امید ختم ہو، یہوذا نے کہا: اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو میں جب تک زندہ رہوں گا تمہارا دشمن بن جاؤں گا اور تمہارے باپ کو تمہاری بری کاروائی سے آگاہ کروں گا، انہوں نے کہا: اگر تو ہمیں اس کام سے روکتا ہے تو آؤ ہم کسی بھیڑیے کا شکار کریں، اس نے کہا: انہوں نے بھیڑیے کا شکار کیا اسے خون میں لت پت کیا اور رسیوں کے ساتھ باندھ دیا پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: اے ہمارے باپ! یہ وہ بھیڑیا ہے جو ہمارے ریوڑ کا نقصان کرتا ہے ان کی چیر پھاڑ کرتا ہے اور شاید یہ وہی ہے جس نے ہمارے بھائی کو قتل کر کے ہمیں اذیت دی ہے ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں اور یہ اس پر اس کا خون بھی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اس کو چھوڑو، انہوں نے اسے چھوڑ دیا تو بھیڑیا آپ کی خاطر اپنی دم ہلانے لگا اور آپ کے قریب ہونے لگا حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے کہا: قریب آ، قریب آ یہاں تک کہ آپ نے اس کے رخسار پر اپنا رخسار رکھ دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے کہا: اے بھیڑیے! تو نے مجھے میرے بیٹے کی وجہ سے کیوں تکلیف پہنچائی اور مجھے لمبی پریشانی کا وارث بنادیا؟ پھر کہا: اے اللہ! اسے قوت گویائی دے، تو اللہ نے اسے قوت گویائی دے دی، اس نے کہا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو نبی چن لیا ہے نہ میں نے اس کا گوشت کھایا، نہ میں نے اس کے کپڑے پھاڑے اور نہ ہی میں نے اس کا کوئی بال بیکا کیا، اور اللہ کی قسم! اور نہ ہی مجھے آپ کے بیٹے کے بارے میں کوئی خبر ہے، میں تو ایک اجنبی بھیڑیا ہوں مصر کے نواحی علاقے سے اپنے گمشدہ بھائی کی تلاش میں آیا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ پھر آپ کے بیٹوں نے مجھے شکار کر کے باندھ دیا ہے، بے شک انبیاء کے گوشت مجھ پر اور تمام وحشی جانوروں پر حرام ہیں، اور اللہ کی قسم! میں ایسے شہروں میں نہیں رہتا جن میں انبیاء کی اولاد یں جانوروں پر جھوٹے الزام لگائیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا: اللہ کی قسم! تم تو اپنے خلاف میرے پاس حجت لائے ہو، یہ بھیڑیا ایک جانور ہے جو اپنے بھائی کی تلاش میں اس کے پیچھے نکلا ہوا ہے اور تم نے اپنے بھائی کو ضائع کردیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھیڑیا اس الزام سے بری ہے جس میں پکڑ کے تم اسے لائے ہو۔ بَلْ سَوَّلَتْ یعنی مزین کردیا لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایسا معاملہ جو اس کے علاوہ ہے جس کو تم بیان کرتے ہو اور جس کا تم تذکرہ کرتے ہو۔ پھر آپ نے اپنی تسلی کے لیے فرمایا: فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ۔

مسئلہ نمبر 2۔ زجاج نے کہا: یعنی میرا مقام اور جس کا میں عقیدہ رکھتا ہوں فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ہے۔ قطرب نے کہا: یعنی میرا صبر، صبر جمیل ہے ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ صبر جمیل میرے لیے زیادہ مناسب ہے، یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صبر جمیل کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: "صبر جمیل وہ ہے (1) جس کے ساتھ شکوہ نہ ہو"۔ انشاء اللہ اس کا بیان سورت کے آخر میں آئے گا۔ ابوحاتم نے کہا: عیسیٰ بن عمر نے سہل بن یوسف

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 197

کے گمان کے مطابق فصبرًا جمیلًا پڑھا ہے۔ اس نے کہا: اور اسی طرح اشہب عقیلی نے پڑھا ہے، اسی طرح مصحف انس اور ابی صالح میں ہے۔ مبرد نے کہا: فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ رفع کے ساتھ پڑھنا نصب کی نسبت زیادہ بہتر ہے کیونکہ معنی یہ ہے: قال رب عندی صبر جمیل اس نے کہا: نصب صرف مصدر کی بنیاد پر ہے، یعنی فلأ صبرن صبرا جمیلا، (شاعر نے) کہا:

شکا إلیّ جملی طولَ السُّرَی صَبْرًا جمیلا فکِلَانَا مُبْتَلَی

صبر جمیل وہ ہے جس میں نہ جزع ہو اور نہ شکوہ ہو۔ ایک قول یہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ غمگین چہرے اور پیشانی پر بل ڈال کر نہیں رہوں گا بلکہ میں تمہارے ساتھ جس حالت میں پہلے تھا اسی حالت میں رہوں گا، اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آپ نے انہیں مواخذہ سے معاف کر دیا تھا۔ حبیب بن ابی ثابت سے روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھنویں ان کی دونوں آنکھوں پر گر گئی تھیں اور کسی کپڑے کے ساتھ انہیں اٹھاتے تھے۔ آپ کو کہا گیا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: زمانے کی طوالت اور پریشانیوں کی کثرت، تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: اے یعقوب علیہ السلام! کیا مجھ سے شکوہ کرتا ہے؟ تو آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! یہ غلطی ہے جو مجھ سے سرزد ہو گئی پس تو مجھے معاف فرما (1)۔ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ یہ مبتدا اور خبر ہے عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ یعنی اس احتمال پر جو تم کذب میں سے بیان کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن ابی رفاعہ نے کہا: اہل رائے کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے گمان کے وقت (ایک مرتبہ آپ کا گمان درست تھا جبکہ دوسری دفعہ درست نہیں تھا) اپنی رائے کو درست کرنا چاہیے۔ جب آپ کے بیٹوں نے آپ کو کہا: اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ تو آپ نے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ تو یہاں آپ کا گمان درست تھا۔ پھر انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ (یوسف) آپ نے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا تو یہاں آپ کا گمان درست نہ تھا۔

وَ جَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور (تھوڑی دیر بعد) ایک قافلہ آیا تو اہل قافلہ نے (پانی لانے کے لیے) آبکش بھیجا، اس نے لٹکایا اپنا ڈول، وہ پکار اٹھا: مژدہ باد! (تو کتنا من موہنا) بچہ ہے۔ اور انہوں نے چھپا دیا اسے متاع (گرانبہا) سمجھتے ہوئے، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَآءَتْ سَيَّارَةٌ یعنی گزرنے والا قافلہ جو شام سے مصر کی طرف چل رہا تھا وہ راستہ بھول گئے اور تھک گئے یہاں تک کہ انہوں نے کنویں کے قریب پڑاؤ ڈالا اور کنواں آبادی سے دور صحراء میں تھا۔ وہ چرواہوں کے لیے تھا اور اس کا پانی کھاری تھا لیکن جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تو وہ میٹھا ہو گیا۔ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا گیا کیونکہ اگر لفظوں کا اعتبار ہوتا تو فارسلت واردھم ہوتا جس طرح کہ وَ جَآءَتْ ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 198

وارد سے مراد وہ شخص ہے جو پانی کے پاس جاتا ہے تاکہ لوگوں کو پانی پلائے اس کا نام مالک بن دعر تھا وہ عرب عاربہ سے تھا۔ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ یعنی اَرسلہ ادلی دلوہ کہا جاتا ہے جب وہ اس (ڈول) کو ڈالے تاکہ وہ اسے پانی سے بھرے۔ اور ''دلاھا'' سے مراد ہے کہ اس نے اسے نکالا۔ اصمعی وغیرہ سے منقول ہے: دلا یدلو دلوا سے مراد جَذَبَ اور اَخرَجَ ہے اسی طرح ادلی ہے جب وہ اسے پھینکے، اور جب یہ ثقیل ہو جائے تو پھر یہ واوی کے بجائے یائی ہو جاتا ہے کیونکہ یا، واو کی نسبت زیادہ خفیف ہے یہ کوفیوں کا قول ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: جب یہ تین حروف سے تجاوز کر جائے تو یائی ہو جاتا ہے۔ مستقبل کی اتباع کرتے ہوئے دلو کی جمع قلت اَدل آتی ہے اور جب کثرت بنانی ہو تو ''دُلِیّ اور دِلِیّ آتی ہے پس واو کو یا سے بدل دیا جاتا ہے۔ البتہ جمع کا باب مختلف ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ واحد اور جمع میں فرق کیا جائے اور دلاء بھی آتی ہے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام رسی کے ساتھ چمٹ گئے جب باہر نکلے تو آپ چودھویں کے چاند کی طرح حسین بچے تھے اور عام بچوں کی نسبت زیادہ خوبصورت تھے۔ صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث اسراء میں فرمایا: ''تو میں یوسف کے پاس تھا جن کو حسن کا ایک حصہ عطا فرمایا گیا ہے'' (1)۔ کعب احبار نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام خوبصورت چہرے والے، گھنے بالوں والے، موٹی آنکھوں والے، معتدل تخلیق والے، سفید رنگ والے، سخت کلائیوں اور پنڈلیوں والے، دبلے پیٹ والے اور چھوٹی ناف والے تھے، جب آپ مسکراتے تو آپ کی مسکراہٹ سے روشنی دکھائی دیتی اور جب آپ گفتگو کرتے تو آپ کے کلام میں آپ کے دانتوں سے سورج کی شعاع دیکھتا، کوئی آدمی بھی اس صورت کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور آپ کا حسن رات کے وقت دن کی روشنی کی طرح تھا۔ جس دن حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا اور ان میں اپنی روح پھونکی اس دن جو کیفیت آپ کی تھی آپ سے خطا سرزد ہونے سے پہلے پہلے تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کی اس حالت کے مشابہ تھے۔ ایک قول یہ ہے: آپ کو یہ خوبصورتی اپنی جدہ حضرت سارہ سے وراثت میں ملی تھی ان کو حسن کا چھٹا حصہ عطا کیا گیا تھا۔ جب مالک بن دعر نے آپ کو دیکھا تو کہا: يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ یہ اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قرات ہے سوائے ابن ابی اسحاق کے کہ اس نے یٰبُشْرٰیَ هٰذَا غُلٰمٌ پڑھا۔ اس نے الف کو یا سے بدل دیا کیونکہ یا ماقبل کو کسرہ دیتی ہے اور جب الف کو کسرہ دینا جائز نہیں تو اس کے عوض اسے ''یا'' سے بدل دیا گیا، جبکہ اہل کوفہ نے ''یا بشرای'' پڑھا ہے بغیر اضافت کے اس کے معنی کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ...... یہ بچے کا نام ہے۔ اور دوسرا...... اے بشری یہ تیرا زمانہ اور تیرا مقام ہے۔

قتادہ اور سدی نے کہا: جب ڈول والے نے اپنا ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لپٹ گئے تو اس نے کہا: يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ۔ قتادہ نے کہا: اس نے اپنے دوستوں کو خوشخبری دی کہ اس نے غلام پا لیا ہے۔

سدی نے کہا: اس نے ایک آدمی کو پکارا جس کا نام بشری تھا (2)۔ نحاس نے کہا: قتادہ کا قول زیادہ بہتر ہے، کیونکہ قرآن میں بہت کم کسی کا نام آیا ہے، بلکہ قرآن میں کنایۃً ذکر آتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (الفرقان: 27) اس سے مراد عقبہ بن معیط ہے اس کے بعد فرمایا: يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ (الفرقان) یہ امیہ بن

1۔ صحیح مسلم، حدیث الاسراء، جلد 1، صفحہ 91　　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 199

خلف ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ بشری کی ندا کا معنی ہے: جو حاضر ہے اس کے لیے خوشخبری ہے۔ اور یہ تبشرات کے قول سے زیادہ مؤکد ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: یا عجباہ، یعنی یا عجب ھذا من أیامک وأیاتک، فاحضر، یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اسی طرح سہیلی نے کہا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اس طرح ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: وا سرورداہ! البشری۔ یہ الاستبشار سے مصدر ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اگر یہ اسم علم ہوتا تو ضمیر کی طرف مضاف نہ ہوتا۔ اس صورت میں بشری محل نصب میں ہوتا، کیونکہ یہ ندا مضاف ہے اور ندا کا معنی بیان تنبیہ ہے یعنی انتبھوا لفرحتی وسروری، اور سدی کے قول کے مطابق یہ محل رفع میں ہوگا جس طرح آپ کہتے ہیں: یا زید ھذا غلام۔ اس کا محل نصب میں ہونا بھی ممکن ہے جس طرح: یا رجلا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (یٰسین: 30) البتہ بشری منون نہیں کیونکہ یہ غیر منصرف ہے۔

وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً، ہ ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام سے کنایہ ہے جبکہ واو جمع آپ کے بھائیوں سے کنایہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ان تاجروں سے کنایہ ہے جنہوں نے آپ کو خریدا تھا۔ ایک قول یہ ہے: یہ کنوئے پر وارد ہونے والے آدمی اور اس کے دوسرے دوستوں سے کنایہ ہے۔ بِضَاعَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مجاہد نے کہا: مالک بن دعر اور اس کے دوستوں نے آپ کو ان تاجروں سے چھپایا جو ان کے ساتھ اس جماعت میں تھے۔ انہوں نے انہیں کہا: یہ سامان ہے اہل شام میں سے کسی نے یا اس پانی والوں میں سے کسی نے یہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم اسے مصر پہنچا دیں۔ اور انہوں نے یہ بات صرف اس خوف سے کی کہ کہیں وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک نہ ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کو (قیمتی) سامان سمجھ کر چھپا لیا جب آپ نے کنوئے سے نکلنا چاہا۔ اس قول کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: تم نے کتنا برا کام کیا ہے، یہ تو ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اور انہوں نے عبرانی زبان میں حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: یا تو ہماری غلامی کا اقرار کرو تو ہم تمہیں ان کے ہاتھوں بیچ دیں گے یا ہم تجھے لے لیں گے اور قتل کر دیں گے۔ تو آپ نے کہا: میں تمہاری غلامی کا اقرار کرتا ہوں۔ آپ نے ان کی غلامی کا اقرار کیا تو انہوں (بھائیوں) نے آپ کو ان (قافلے والوں) کے ہاتھوں بیچ دیا: ایک قول یہ ہے: آپ کے بھائی یہوذا نے آپ کو کہا کہ آپ اپنے بھائیوں کی غلامی کا اعتراف کر لیں ورنہ مجھے ڈر ہے کہ یہ آپ کو قتل کر دیں گے۔ تو اس طرح شاید اللہ تعالیٰ آپ کے لیے نکلنے کی کوئی راہ بنا دے اور آپ قتل سے نجات پالیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے قتل کے خوف سے اپنی حقیقی صورتحال چھپالی۔ مالک نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! یہ غلام کی نشانی نہیں ہے۔ انہوں (بھائیوں) نے کہا: اس نے ہماری گود میں پرورش پائی ہے۔ ہمارے اخلاق سے مزین ہوا ہے اور ہمارے آداب سیکھے ہیں۔ تو اس نے کہا: اے بچے تو کیا کہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا ہے، میں نے ان کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور ان کے اخلاق سے مزین ہوا ہوں، تو مالک بن دعر نے کہا: اگر تم اسے میرے ہاتھ بیچو تو میں اسے تم سے خرید لیتا ہوں۔ تو انہوں نے آپ کو اس کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب ہے۔

وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۟

''اور انہوں نے بیچ ڈالا یوسف علیہ السلام کو حقیری سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اور وہ (پہلے ہی) اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ شَرَوْهُ، شریت بمعنی اشتریت ہے۔ اسی طرح شریت بمعنی بعت بھی ہے یعنی (خریدنا اور بیچنا دونوں معنی میں یہ مستعمل ہے) شاعر نے کہا:

وشَرَيْتُ بُرْدًا لَيْتَنِي مِنْ بَعْدِ بُرْدٍ كنتُ هَامَهْ (1)

اس میں شریت بمعنی بعت ہے یعنی میں نے چادر بیچی

دوسرے شاعر نے کہا:

فلما شَرَاها فاضتِ العينُ عبرةً وفی الصَّدرِ حُزّازٌ من اللَّوْمِ حَامِزُ

اس میں بھی شراہا سے مراد بیچنا ہے۔

بِثَمَنٍ بَخْسٍ یعنی تھوڑی قیمت۔ یہ یہاں مصدر ہے جسے اسم کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے، یعنی اصل میں ہے باعوہ بثمن مبخوس یعنی منقوص۔ آپ کے بھائی آپ کی قیمت کے ذریعے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ اپنے باپ سے دور ہو جائیں۔ ایک قول یہ ہے: آپ کے بھائی یہوذا نے دور سے دیکھا کہ یوسف کو کنوئے سے نکالا گیا ہے تو اس نے دوسرے بھائیوں کو بتایا، وہ آئے اور انہوں نے آپکو آبکش کے ہاتھوں بیچ دیا، جبکہ ایک قول یہ ہے: نہیں بلکہ وہ تین فرلانگ کے فاصلہ سے خبر کی تصدیق کرنے کیلئے واپس آئے تو انہوں نے قافلہ کے نشانات دیکھے تو وہ ان کے پیچھے گئے اور انہیں کہا: یہ ہمارا غلام ہے جو ہم سے بھاگا ہوا ہے تو اس طرح انہوں نے آپکو اس کے ہاتھ بیچا۔ قتادہ نے کہا: بخس بمعنی ظلم ہے۔ ضحاک، مقاتل، سدی اور ابن عطا نے کہا: بخس بمعنی حرام ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کا کوئی خاص معنی نہیں بلکہ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری قیمت نہیں لگائی (2)، کیونکہ اگر آپ کے بھائیوں نے آپ کو بیچا تو وہ آپ کی قیمت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے بلکہ وہ تو صرف آپ کو باپ کے سامنے سے دور کرنا چاہتے تھے۔ اور اگر وارد ہونے والوں نے آپ کو بیچا تو انہوں نے آپ کو اپنا بناتے ہوئے مخفی رکھا، یا انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا: ہمارے ساتھ کچھ سامان بھیجو تو انہوں نے سوچا کہ انہیں اس کے بدلے میں کوئی ثمن ادا نہیں کیے گئے اور جو کچھ انہوں نے اس میں سے لیا ہے وہ سارے کا سارا منافع ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: ابن عربی کا قول وانما الاشارۃ فیہ الی انہ لم یستوف ثمنہ بالقیمۃ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر وہ آپ کی پوری قیمت وصول کرتے تو پھر یہ بیع جائز ہوتی حالانکہ ایسا نہیں۔ یہ بات سدی وغیرہ کی بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے ایسی ذات پر بیع کی ہے جس کو بیچنا ہی جائز نہیں تھا پس اسی لیے ان کے لیے اس کی قیمت

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 202
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079

حلال نہ تھی۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: بخس کا معنی ہے قلیل یعنی تھوڑا(1)۔ ابن حیان نے کہا: اس کا معنی زیف یعنی کھوٹا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ کو بیس درہموں میں فروخت کیا اور آپ کے بھائیوں میں سے ہر ایک نے دو درہم لیے اور وہ کل دس تھے۔ یہی قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے کہا: بائیس درہموں میں (انہوں نے آپ کو فروخت کیا) اور وہ کل گیارہ تھے ہر ایک نے دو دو درہم لیے۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: چالیس درہم کے بدلے آپ کو بیچا گیا۔ لیکن جو کچھ صحابہ سے مروی ہے وہ زیادہ اولیٰ ہے۔ اور بخس یہ ثمن کی صفت ہے۔ دراہم یہ ثمن کا بدل اور اس کی تفسیر ہے۔ اور کہا جاتا ہے دراہم اس بنیاد پر ہے کہ یہ درہام کی جمع ہے۔ اور بعض اوقات یہ اسم جمع بھی ہوتا ہے سیبویہ کے نزدیک۔ اور سیبویہ کے نزدیک ہی مد کسرہ کی وجہ سے یا بن جاتی ہے مگر یہ مد مقصور کی طرح نہیں کیونکہ بصریوں کے نزدیک مد مقصور جائز نہیں نہ شعر میں اور نہ ہی غیر شعر میں، نحویوں نے اس پر شعر بھی پیش کیا ہے:

تَنْفِي يداها الحصى في كلّ هاجرة   نَفْيَ الدَّراهِيم تَنْقَادُ الصَّيَارِيفِ

اس میں بھی دراہم کے بجائے الدارھیم ہے۔

مَعْدُوْدَةٍ یہ صفت ہے۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ ان کے ہاں ثمن گن کر دیئے جاتے تھے نہ کہ وزناً۔ ایک قول یہ ہے۔ یہ قلت ثمن سے عبارت ہے، کیوں کہ دراہم اتنے نہ بنتے تھے کہ ان کا وزن کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''اوقیہ'' سے کم کا وزن نہیں کرتے تھے اور اوقیہ سے مراد چالیس درہم ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے: نقدین کی اصل تو وزن ہے(2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تبیعو الذھب بالذھب ولا الفضتہ بالفضۃ إلا وزنًا من زاداو ازداد فقد اربی(3) تم سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر وزن کر کے جس نے زیادتی کی یا زیادتی چاہی تو اس نے سودی کام کیا۔

اور وزن کا فائدہ سوائے مقدار کے اور کوئی نہیں، جہاں تک عین وزن کا تعلق ہے تو اس میں تو کوئی منفعت نہیں، مگر اس میں عدد کو جاری کر دیا گیا کثرت معاملہ کی وجہ سے لوگوں سے تخفیف کرتے ہوئے، تو اس وجہ سے پھر وزن کرنا ختم ہو گیا، یہاں تک کہ اگر مثقال یا درہم بنائے جائیں تو ان کی ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز ہوگی بشرطیکہ اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور نہ ہی ایک دوسرے سے راجح ہوں۔ پس اگر اس میں نقصان ہو تو پھر معاملہ وزن کے ساتھ ہوگا، اسی وجہ سے اس کو توڑنا یا کاٹنا فساد فی الارض میں سے ہے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا دراہم و دنانیر کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ معین ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں امام مالک سے بھی مختلف روایات ہیں۔ اشہب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ معین نہیں یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر قول ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ ابن قاسم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ معین ہے۔ اس نے یہ کرخی سے حکایت کیا ہے۔ یہی امام شافعی کا قول بھی ہے۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم کہیں گے کہ یہ معین نہیں ہوتے تو اس صورت میں جب کوئی آدمی کہے گا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 205 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079 3۔ صحیح مسلم، باب الربا، جلد 2، صفحہ 24

بعتك هذه الدنانير بهذه الدراهم کہ میں نے تجھے یہ دینار ان دراہم کے بدلے میں بیچے تو اس صورت میں تو دینار، دینا روالے کے ذمے ہو جائیں اور دراہم، دراہم والے کے ذمے اور معین ہوں پھر ضائع ہو جائیں تو ان دونوں کے ذمے کوئی شے نہیں ہوگی اور جس طرح عروض وغیرہ میں سے اعیان کی بیع باطل ہو جاتی ہے اسی طرح یہ عقد بھی باطل ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لقیط کے بارے میں فیصلہ کیا کہ وہ آزاد ہے اور وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ پڑھا، اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے بھائی ہیں۔ ایک قول کے مطابق: قافلہ والے ہیں۔ ایک قول کے مطابق: آبکش مراد ہے۔ جو بھی مراد ہے یہ ان کے نزدیک قابل رشک نہیں تھے۔ نہ ہی بھائیوں کے نزدیک؛ کیونکہ ان کا مقصد مال کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف باپ کی آنکھوں سے ان کو اوجھل کرنا مقصود تھا۔ اور نہ ہی قافلہ والوں کے نزدیک کیونکہ انہیں آپ کے بھائیوں نے کہا تھا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اور زھد سے مراد قلت رغبت ہے۔ اور نہ ہی آبکش کے نزدیک کیونکہ اس کو دوسرے دوستوں کی شراکت داری کا خوف تھا۔ اور ان کا خیال ہے کہ ثمن میں سے قلیل انفراد میں اولیٰ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں کسی بڑی چیز کو انتہائی تھوڑی قیمت کے بدلے میں خریدنے کے جواز پر دلیل ہے اور یہ بیع بھی لازم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: کسی نے اگر کوئی بہت بڑا درہ ایک درہم کے بدلے بیچا پھر کہا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ درہ ہے، میں نے تو اسے مخشلبہ (موتی کی شکل کا سفید کچ) سمجھا تو اسے بیع لازم ہو جائے گی اور اس کی گفتگو کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جائے گی۔ ایک قول یہ ہے: وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ سے مراد ہے کہ وہ آپ کے حسن میں رغبت نہ رکھتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا نصف حصہ عطا فرمایا مگر آپ کی عزت و تعظیم کے طور پر قوم کے نفوس کی رغبت کو آپ سے پھیر دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے: وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ آپ کے مقام و مرتبہ کو نہ جانتے تھے (1)۔ سیبویہ اور کسائی نے بیان کیا: زَهِدت و زَهَدت یعنی ھاء کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ۔

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۫ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اور کہا اس شخص نے جس نے یوسف کو خریدا تھا اہل مصر سے اپنی بیوی کو عزت و اکرام سے اسے ٹھہراؤ شاید یہ ہمیں نفع پہنچائے یا بنالیں ہم اسے اپنا فرزند اور یوں (اپنی حکمت کاملہ سے) ہم نے قرار بخشا یوسف کو (مصر کی) سرزمین میں اور تاکہ ہم سکھا دیں اسے خوابوں کی تعبیر، اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے ہر کام پر لیکن اکثر لوگ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 207

(اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ ایک قول یہ ہے: یہاں الاشتراء یعنی الاستبدال ہے کیونکہ یہ عقد نہیں تھا۔ جس طرح: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ: 16) ہے یعنی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدا (تبدیل کیا)

ایک قول یہ ہے: انہوں نے ظاہری حالت میں اس کو خریداری گمان کیا، تو ظاہر گمان کے مطابق اس لفظ کو جاری کر دیا۔ ضحاک نے کہا: وہ آدمی جس نے آپ کو خریدا وہ مصر کا بادشاہ تھا اور اس کا لقب عزیز ہے۔ سہیلی نے کہا: اس کا نام قطفیر ہے ابن اسحاق نے کہا: اطفیر بن روحب نے اپنی بیوی راعیل کے لیے اسے خریدا (1)۔ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: اس کا نام زلیخا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عزیز (مصر) کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت ڈال دی تھی تو اس نے اس کی وصیت اپنے اہل خانہ کو کی۔ اس بات کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اس (عزیز مصر کی بیوی) کے نام کے بارے میں ثعلبی وغیرہ نے دو قول ذکر کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کو مصر کے بادشاہ کے وزیر قطفیر نے خریدا اور وہ ریان بن ولید تھا (2)۔ ایک قول کے مطابق: ولید بن ریان اور یہ عمالقہ کا ایک آدمی تھا، جبکہ ایک قول کے مطابق: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک قول کی وجہ سے کہ: وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ (غافر: 34) اور اس نے چار سو سال زندگی گزاری۔ ایک قول یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کی اولاد میں سے تھا جس طرح کہ اس کا بیان سورۂ غافر میں آئے گا اور یہ عزیز جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کے خزانوں پر (نگرانی کے لیے) خریدا اس نے مالک بن دعر سے حضرت یوسف کو بیس دینار کے عوض خریدا اور اس کے ساتھ ایک حلہ اور نعلین زائد دیے۔ ایک قول یہ ہے: اس نے آپ کو قافلہ والوں سے خریدا۔ ایک قول کے مطابق: انہوں نے آپ کی قیمت میں اتنی زیادتی کر لی کہ آپ کے وزن کے دو گنا وزن کے برابر مسک، عنبر، ریشم، چاندی، سونا، موتی اور جواہر تھے جنکی قیمت سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ قطفیر نے مالک بن دعر سے اس قیمت کے عوض آپ کو خرید لیا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ وہب نے اس کے علاوہ بھی ایک بات کی ہے: جب مالک بن دعر نے حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں سے خریدا تو ان کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا: یہ جس کو مالک بن دعر نے بنی یعقوب میں سے بیس درہم کے عوض خریدا ہے اور وہ فلاں فلاں ہیں ان کا غلام ہے۔ اور انہوں نے یہ شرط رکھی کہ یہ بھاگا ہوا ہے اور یہ اس کو بغیر قید اور بیڑیوں کے نہیں رکھے گا اور اس نے ان کو اس بات پر اللہ تعالیٰ کا عہد دیا۔ اس نے کہا: اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں الوداع کہا اور آپ کہہ رہے تھے: اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے اگرچہ تم نے مجھے ضائع کر دیا، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے اگرچہ تم نے مجھے رسوا کیا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحم کرے اگرچہ تم نے میرے اوپر رحم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: اس الوداع کی شدت کے سبب ریوڑ نے اپنے پیٹوں میں موجود تازہ خون باہر پھینک دیا۔ انہوں نے آپ کو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 19

2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 208

اونٹ کے ایسے پالان پر بٹھایا جس پر کوئی فرش اور بچھونا وغیرہ نہیں تھا اور آپ کو قید کر کے بیڑیاں پہنا دیں۔ آپ آل کنعان کے قبرستان کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنی ماں کی قبر کو دیکھا اور ایک سیاہ فام حبشی ان کے پہرے پر مامور تھا وہ غافل ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو اپنی والدہ کی قبر پر گرا دیا اور ان کی قبر پر لوٹ پوٹ ہونے لگے اور ان کی قبر سے گلے لگ گئے اور اضطراب سے کہنے لگے: اے میری ماں! سر اٹھا کر اپنے بیٹے کو دیکھ۔ وہ کس طرح زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے گلے میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے انہوں نے میرے والد اور میرے درمیان جدائی ڈال دی ہے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو اپنی رحمت کے مستقر میں جمع کر دے، بے شک وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جب اس حبشی نے حضرت یوسف کو پالان پر نہیں دیکھا تو وہ پیچھے دوڑا تو آپ ایک قبر پر تھے اس نے غور کیا تو وہ آپ ہی تھے تو اس نے اپنے پیر سے خاک پر ٹھوکر ماری اور آپ کو لوٹ پوٹ کر دیا اور آپ کو دردناک مار لگائی، تو آپ نے اسے فرمایا: ایسا مت کرو! اللہ تعالیٰ کی قسم! میں بھاگا ہوا نہیں، جب میں اپنی ماں کی قبر کے پاس سے گزرا تو میں نے چاہا کہ میں اپنی ماں کو الوداع کہوں اور میں ایسا کام دوبارہ نہیں کروں گا جو تم کو ناپسند ہو۔ حبشی نے کہا: اللہ کی قسم! تو بہت برا غلام ہے تو کبھی اپنے باپ کو پکارتا ہے اور کبھی اپنی ماں کو تو نے اپنے مالکوں کے سامنے ایسا کیوں نہیں کیا؟ آپ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور عرض کی: اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میرے یہ کام خطا ہیں تو میں اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے اور مجھ پر رحم فرما، تب آسمان کے فرشتوں نے چیخ و پکار کی اور حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: اے یوسف: اپنی آواز کو پست رکھیں، آپ نے تو آسمان کے فرشتوں کو رلا دیا ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں زمین کو الٹ پلٹ کر دوں اس کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دوں؟ آپ نے فرمایا: اے جبریل ٹھہرو! اللہ تعالیٰ حلیم ہے جلدی نہیں کرتا۔ تو جبریل نے زمین پر اپنا پر مارا تو زمین پر اندھیرا چھا گیا اور گرد و غبار اڑنے لگا اور سورج کو گہن لگ گیا اور قافلہ ایسا تھا کہ کوئی آدمی دوسرے کو نہیں پہچان رہا تھا، قافلہ کے سردار نے کہا: تم میں سے ضرور کسی نے ایسا کام کیا ہے جو پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ میں اتنے لمبے عرصہ سے اس علاقہ میں سفر کر رہا ہوں، اور میرے ساتھ کبھی اس قسم کا معاملہ پیش نہیں آیا۔ تو اس حبشی نے کہا: میں نے اس عبرانی غلام کو تھپڑ مارا تب اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کچھ ایسا کلام کیا جس کو میں نہیں جانتا، کوئی شک نہیں کہ اس نے ہمارے خلاف دعا کی۔ سردار نے ان سے کہا: تو نے ہمیں ہلاک کرنا چاہا، اس (غلام) کو ہمارے پاس لاؤ۔ وہ آپ کو لایا، سردار نے آپ کو کہا: اے لڑکے! اس نے تم کو تھپڑ مارا جس کے نتیجہ میں ہم پر وہ عذاب آیا جس کو تم نے دیکھا، اگر تم بدلہ لینا چاہو تو تم جس سے چاہو بدلہ لے لو اور اگر تم معاف کر دو تو تم سے یہی توقع ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اس امید پر اس کو معاف کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف فرما دے گا تو گرد و غبار چھٹ گیا اور سورج ظاہر ہو گیا اور مشرق و مغرب میں روشنی پھیل گئی اور وہ تاجر صبح شام آپ کی زیارت کرنے لگا اور آپ کی تعظیم و تکریم کرنے لگا یہاں تک کہ آپ مصر پہنچ گئے اور آپ نے دریائے نیل میں غسل کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے سفر کی تھکاوٹ دور کر دی اور آپ کا حسن و جمال لوٹا دیا وہ سردار آپ کو دن کے وقت لے کر شہر میں داخل ہوا اس حال میں کہ آپ کے چہرے

کا نور شہر کی دیواروں میں پڑ رہا تھا۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدنے کے لیے پیش کیا تو بادشاہ کے وزیر قطفیر نے آپ کو خرید لیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو گزر چکا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ بادشاہ مرنے سے پہلے آپ پر ایمان لے آیا تھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دین کی اتباع کی پھر جن دنوں میں حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے خزانوں پر مامور تھے وہ بادشاہ مر گیا تو اس کے بعد قابوس بادشاہ بنا، وہ کافر تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے اس کا انکار کر دیا۔ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ یعنی اس کی منزل اور اس کے مقام کو کھانے اور اچھے لباس کی عمدگی کے ذریعے۔ یہ ثوی بالمکان سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے أقام بہ سورۂ آل عمران وغیرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ یعنی جب بالغ ہوگا تو ہماری مہمات میں ہمیں کافی ہوگا۔ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ نامرد تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی، اسی طرح امام ابن اسحاق نے کہا: قطفیر عورتوں کی مقاربت نہیں کرتا تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے: اس نے اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا کیسے کہہ دیا حالانکہ وہ بادشاہ تھا اور غلامی کے ساتھ اسے بیٹا بنانا تو دو متضاد چیزیں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا: وہ اسے آزاد کرے گا اور پھر منہ بولا بیٹا بنا لے گا اور منہ بولا بیٹا بنانا ان کے ہاں ایک مروج اور معلوم امر تھا۔ اور اسی طرح ابتداء اسلام میں بھی یہ عام تھا جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ الاحزاب میں آئے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: فراست کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے اچھے تین آدمی تھے (1)۔ ایک عزیز مصر جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے سعادت کے آثار بھانپ لیے اور کہا: عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا شاید یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں۔ (دوسری) حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شرافت کے آثار دیکھ کر اپنے باپ سے کہا تھا: اسْتَاْجِرْهُ ٝ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۶﴾ (القصص) اے ابا جان! آپ انہیں اجرت پر رکھ لیں۔ بے شک جن کو آپ اجرت پر رکھیں ان میں بہترین شخص وہ ہے جو طاقتور اور ایماندار ہو (تیسرے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ ابن عربی نے کہا: اس خبر کو نقل کرنے پر اتفاق کر لینے میں مفسرین پر تعجب ہے (2) فراست عجیب و غریب علم ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورۃ "الحجر" میں آئے گا اور ان کی نقل کردہ اس بات میں، یہ یوں نہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا والی بنایا تو یہ اعمال میں تجربہ، صحبت میں مواظبت اور طوالت، اور ان کی طرف سے علم و احسان کا مشاہدہ کر لینے کے بعد تھا اور یہ فراست کے طریقہ پر نہیں ہے، جہاں تک حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا تعلق ہے تو اس کے پاس بھی واضح علامات موجود تھیں جس طرح کہ سورۃ القصص میں آئے گا، البتہ عزیز مصر کے معاملہ کو فراست بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس کوئی ظاہری علامت نہیں تھی۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ کاف ضمیر محل نصب میں ہے، یعنی جس طرح ہم نے اس (یوسف) کو اس کے بھائیوں سے اور کنویں سے نکالا اسی طرح ہم نے اسے قرار بخشا؛ یعنی وہ بادشاہ جس نے اسے خریدا اس کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1080 2۔ ایضاً

دل ہم نے اس پر مہربان کر دیا یہاں تک کہ وہ بادشاہ کی حکومت والے شہر میں امر اور نہی پر قادر ہو گیا۔ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ہم نے اسے قرار بخشا تا کہ ہم اپنی طرف سے کلام کے ذریعے اس کی طرف وحی کریں اور اسے اس کی تاویل و تفسیر سکھا دیں اور خوابوں کی تعبیر اور کلام کی اتمام سکھا دیں۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر غالب نہیں بلکہ وہ خود اپنے امر پر غالب ہے جس کام کا ارادہ فرماتا ہے کہہ دیتا ہے: ہو جا، پس ہو جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ یوسف کے معاملہ پر غالب ہے اس کی تدبیر کرتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو کسی اور کے سپرد نہیں کرتا یہاں تک کہ اس تک کوئی فرد بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی اس کے غیب پر مطلع نہیں ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اَكْثَرَ سے مراد تمام لوگ ہیں کیونکہ کوئی بھی (خود بخود) غیب نہیں جانتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ اپنے ظاہر پر جاری ہے، کیونکہ بعض اوقات وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بعض غیب پر مطلع کر دیتا ہے اور ایک قول یہ ہے: وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ کا معنی یہ ہے اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے اور وہ مشرک ہیں اور وہ لوگ ہیں جو تقدیر پر ایمان نہیں رکھتے۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ کے بارے میں حکماء نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو تو اللہ تعالیٰ کا امر غالب آیا یہاں تک کہ آپ نے خواب بیان کر دیا، پھر آپ کے بھائیوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ کا امر غالب آیا یہاں تک کہ آپ بادشاہ بن گئے اور انہوں نے آپ کے سامنے سجدہ کیا۔ پھر بھائیوں نے چاہا کہ وہ اپنے باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیں تو اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ ان کے باپ کا دل ان کے بارے میں تنگ ہو گیا۔ اور ستر یا اسی سال کے بعد انہوں نے سوچا تو کہا: يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ (یوسف: 84) پھر انہوں نے غور و فکر کیا کہ اس کے بعد وہ نیک لوگ ہو جائیں۔ یعنی توبہ کرنے والے ہو جائیں، پس اللہ تعالیٰ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ وہ گناہ بھول گئے اور انہوں نے اس پر اصرار کیا یہاں تک کہ ستر سال کے بعد اس معاملہ کے آخر میں انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اپنے باپ کو کہا: اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿﴾ (یوسف) ہم غلطی پر تھے۔ پھر انہوں نے چاہا کہ رونے کے ذریعے اور قمیص کے ذریعے اپنے باپ کو دھوکہ دیں تو اللہ کا امر غالب آیا اور وہ دھوکہ نہ دے سکے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یعنی تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے یہ معاملہ آراستہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کوشش کی کہ اپنے باپ کے دل سے اس (یوسف) کی محبت کو زائل کریں تو اللہ تعالیٰ کا حکم غالب آیا اور ان کے دل میں محبت اور شوق اور زیادہ ہو گیا۔ پھر عزیز کی بیوی نے تدبیر کی کہ وہ عزیز مصر سے شکایت کرنے میں پہل کرے گی اور آپ پر غالب آ جائے گی لیکن اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ عزیز مصر نے کہا: وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿﴾ اپنے گناہ سے توبہ کر و بیشک تو خطا کاروں میں سے ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی کے ذکر کے ذریعے قید خانے سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کی مگر اللہ کا امر غالب آیا ساقی بھول گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کئی سال تک قید خانے میں ٹھہرے رہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿﴾

''اور جب وہ پہنچے اپنے پورے جوبن کو تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم اور یونہی ہم نیک جزا دیتے ہیں اچھا کام کرنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ سیبویہ کے نزدیک اَشُدَّهٗ جمع ہے اور اس کا واحد شِدَّةٌ ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا واحد شد ہے (1)۔ جس طرح کہ شاعر نے کہا۔

عَهْدِي بِهٖ شَدَّ النَّهَارِ كَاَنَّمَا　خُضِبَ اللَّبَانُ وَرَاْسُهٗ بِالْعِظْلِمِ

شَدَّ النَّهَارِ سے مراد دن کا جوبن اور عروج ہے۔

ابوعبید کا گمان ہے کہ عربوں کے نزدیک لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے (2)۔ اور اس کا معنی قوت کا کمال چاہنا ہے پھر اس کے بعد نقصان ہوتا ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: الاشد'' تینتیس سال کی عمر ہے (3)۔ حضرت ربیعہ، حضرت زید بن اسلم اور حضرت مالک بن انس نے کہا: الاشد نوجوان کی بلوغت کی عمر ہے (4)۔ اس سلسلہ میں سورۃ ''النساء'' اور الانعام میں علماء کے مکمل اقوال گزر چکے ہیں۔ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ایک قول یہ ہے: ہم نے اس کو حکومت کا والی بنا دیا۔ اور وہ بادشاہ کی سلطانی میں فیصلہ کرتے تھے ہم نے ان کو فیصلہ کا علم دیا۔ مجاہد نے کہا: (اس سے مراد) عقل، فہم اور نبوت ہے۔ ایک قول یہ ہے: حکم سے مراد نبوت اور علم سے مراد علم دین ہے۔ ایک قول کے مطابق: خواب کی تعبیر کا علم (مراد ہے) اور جس نے کہا: آپ کو بچپن میں نبوت دے دی گئی تھی اس نے کہا کہ جب آپ جوبن کو پہنچے تو ہم نے ان کی سمجھ اور علم میں اضافہ کر دیا۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اس سے مراد مومنین ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مصائب پر صبر کرنے والے ہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ طبری نے کہا: اس آیت کریمہ میں اگرچہ ظاہراً ہر محسن ہو سکتا ہے مگر اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؛ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جس طرح میں نے تمام کارروائی کے بعد یوسف کے ساتھ کیا پھر اسے عطا کیا جو کچھ عطا کیا اسی طرح میں آپ کو بھی آپ کی قوم کے ان مشرکوں سے نجات دوں گا جو آپ کے ساتھ دشمنی کا ارادہ رکھتے ہیں اور زمین میں تجھے قرار بخشوں گا۔

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝

''اور بہلانے پھسلانے لگی انہیں وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب براری کرے اور (ایک دن) اس نے تمام دروازے بند کر دیے اور (بصد ناز) کہنے لگی: بس آ بھی جا۔ یوسف (پاکباز) نے فرمایا: خدا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1081
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 211
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1081

کی پناہ! (یوں نہیں ہو سکتا) وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے بڑی عزت سے ٹھیرایا ہے۔ بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے اور اس عورت نے تو قصد کر لیا تھا ان کا اور وہ بھی قصد کرتے اس کا اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی (روشن) دلیل، یوں ہوا تا کہ ہم دور کر دیں یوسف سے برائی اور بے حیائی کو، بے شک وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو چن لیے گئے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وہ عزیز مصر کی بیوی ہے(1) اس نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ اس سے مطلب براری کریں۔ المراودۃ کی اصل نرمی اور مہربانی کیساتھ ارادہ اور طلب ہے۔ اور الرود اور الریاد سے مراد کسی چیز کو بار بار طلب کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ رویدا سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یمشی رویدا یعنی فلاں نرمی سے چلتا ہے۔ مراودۃ سے مراد طلب میں نرمی ہے۔ مرد کے بارے میں کہا جاتا ہے: راودھا عن نفسھا اور عورت کے بارے میں: راودتہ عن نفسہ اور الرود سے مراد التأنی ہے۔ کہا جاتا ہے: أرودنی یعنی اس نے مجھے مہلت دی۔ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ غلق کثیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ غلق الباب نہیں کہا جاتا۔ جبکہ اغلق کثیر و قلیل دونوں کے لیے آتا ہے، جس طرح فرزدق نے ابوعمرو بن العلاء کے بارے میں کہا:

مازلتُ أُغلق أبوابًا و أفتحُها حتى أتيتُ أبا عمرو بن عمّارِ

میں دروازے بند کرتا رہا اور انہیں کھولتا رہا یہاں تک کہ میں ابوعمرو بن عمار کے پاس پہنچ گیا۔

اس میں أغلق کئی دروازوں کے لیے استعمال ہوا۔

کہا جاتا ہے: وہ سات دروازے تھے اس نے ان کو بند کر دیا پھر آپ کو اپنی طرف دعوت دی۔ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ یعنی هلم أقبل اور تعال آگے بڑھو۔ اس کا نہ کوئی مصدر ہے اور نہ ہی اس کی کوئی گردان ہو سکتی ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں سات قرائتیں جائز ہیں۔ اس سلسلہ میں از روئے اسناد کے صحیح وہ ہے جسے اعمش نے أبی وائل سے روایت کیا انہوں نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو هَیْتَ لَكَ پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے کہا: تو میں نے کہا: بعض لوگ اس کو هیتَ لك پڑھتے ہیں تو آپ (حضرت عبداللہ بن مسعود) نے کہا: میں اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مجھے سکھایا گیا ہے(2)۔ ابوجعفر نے کہا: بعض لوگ عن عبداللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں، کیونکہ ان کا قول: میں اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مجھے سکھایا گیا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مرفوع ہے۔ اور یہ قرأت تا اور ھا کے فتحہ کے ساتھ ہے یہی حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد اور عکرمہ کی قرأت میں سے صحیح قرأت ہے اور یہی ابوعمرو بن علاء، عاصم، اعمش، حمزہ اور کسائی نے پڑھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن میں تقطیع نہ کرو؛ پس یہ تمہارے قول هلم اور تعال کی طرح ہے۔ ابن ابی اسحاق نحوی نے قالت هَیْتِ لَكَ پڑھا ہے یعنی ھا کے فتحہ اور تا کے کسرہ کے ساتھ۔

طرفہ نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 212 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقراءات، حدیث نمبر 3491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لیس قومي بالأبعدين إذا ما قال داعٍ من العشيرة هَيتُ(1)

طرفہ کے اس شعر میں محل استشہاد هَيتُ ہے اس میں ھا کے فتحہ اور تا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

پس یہ تین قراءتیں ہیں ان میں ھا مفتوح ہے۔ ابو جعفر، شیبہ اور نافع نے وَقَالَتْ هِيتَ لَكَ پڑھا ہے یعنی ھا کے کسرہ اور تا کے فتحہ کے ساتھ۔ یحییٰ بن وثاب نے وَقَالَتْ هِيتُ لَكَ پڑھا ہے ھا کے کسرہ اس کے بعد ساکن اور تا مضموم کے ساتھ۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور عکرمہ سے وَقَالَتْ هِئْتُ لَكَ روایت ہے۔ ھا کے کسرہ کے بعد ہمزہ ساکن اور تا مضمومہ کے ساتھ۔ ابن عامر اور اہل شام سے وَقَالَتْ هِئْتَ منقول ہے ھا کے کسرہ اور تا کے فتحہ کے ساتھ؛ ابو جعفر نے کہا: هَيتَ لَكَ التقائے ساکنین کی وجہ سے تا کے فتحہ کیساتھ کیونکہ یہ ایک آواز ہے جس طرح مَهٔ اور صَهٔ وغیرہ ضروری ہے کہ یہ معرب نہ ہو۔ اور فتحہ خفیف حرکت ہے کیونکہ تا سے پہلے یا ہے جیسے این اور کیف اور جس نے تا کو کسرہ دیا اس نے اس وجہ سے اس کو کسرہ دیا کیونکہ اصل کسرہ ہی ہے کیونکہ ساکن کو جب حرکت دی جائے تو کسرہ کے ساتھ حرکت دی جاتی ہے۔ اور جس نے ضمہ دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غایت کا معنی پایا جاتا ہے؛ یعنی اس (عورت) نے کہا: تیرے لیے میری پکار۔ جب اضافت کو حذف کیا گیا تو اس کو مبنی برضمہ پڑھا گیا ہے، جیسے حیث اور بعد وغیرہ۔ اس کے بارے میں اہل مدینہ کی قراءت کے دو قول ہیں: ایک التقائے ساکنین کی وجہ سے فتحہ جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ یہ فعل ہو هَاءَ يَهِي جیسے جاء یجی پس هِئْتَ کی صورت میں معنی ہوگا حسنت هیئتك یعنی تیری ہیئت عمدہ ہے اور لك الگ کلام ہوگا جس طرح آپ کہتے ہیں! لكَ أعني اور جس نے ہمزہ اور تا کا ضمہ پڑھا تو اس صورت میں یہ فعل ہوگا تهيات لك کے معنی میں ہوگا۔ اسی طرح جس نے هِئْتُ لَكَ پڑھا۔ اور ابو عمرو نے اس قراءت کا انکار کیا ہے۔ ابو عبیدہ۔ معمر بن المثنی نے کہا: ابو عمرو سے اس آدمی کی قراءت کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ھا کے کسرہ اور تا کے ضمہ کے ساتھ اس کو مہموز پڑھا تو ابو عمرو نے کہا: باطل ہے۔ اس نے اس کو تهيات سے بنایا ہے! جا پورے عرب سے تعرض کر یہاں تک کہ یمن تک پہنچ جا کیا تو کسی ایک آدمی کو بھی پہچان لے گا جو یوں کہے؟ کسائی نے بھی کہا: هِئْتُ عربوں سے حکایت نہیں کیا گیا۔ عکرمہ نے کہا: هِئْتُ لَكَ یعنی تهيات لك و تزينت و تحسنت، اور یہ ناپسندیدہ قراءت ہے، کیونکہ یہ عربی میں سنی ہی نہیں گئی۔ نحاس نے کہا: یہ بصریوں کے نزدیک عمدہ ہے کیونکہ کہا جاتا ہے: هَاءَ الرجل يَهاء ويَهِيء هيأة پس هاء يهيء، جاء یجیٔ کی طرح ہے اور هِئْتُ جئت کی طرح ہے۔ اور هيت میں ھا کا کسرہ ایسے لوگوں کی قراءت ہے جو ھا کے فتحہ پر اس کے کسرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عمدہ ترین قراءت هَيْتَ لك ھا اور تا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ طرفہ نے کہا:

لیس قومي بالأبعدين إذا ما قال داعٍ من العشيرة هَيتَ(2)

اس شعر میں طرفہ نے هيت ھا اور تا کے فتحہ کیساتھ ہی پڑھا ہے۔

شاعر نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 216 2۔ ایضاً

أَبلغْ　أمير　المؤمنينَ　أخا　العراقِ　إذا　أَتيتَا
إنّ　العراقَ　وأهلَهُ　سِلْمٌ　إليك　فَهَيْتَ　هَيْتَا (1)

اس شعر میں بھی هَيْتَ ہی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہما نے کہا: هيت یہ سریانی زبان کا کلمہ ہے اس کے ذریعے وہ اپنی طرف بلاتے ہیں۔ سدی نے کہا قبطی زبان میں اس کا معنی هلم لك ہے۔ ابو عبید نے کہا: کسائی کہا کرتا تھا: یہ اہل حوران کی لغت ہے۔ جو اہل حجاز میں آگئی اس کا معنی تعال ہے۔ ابو عبید نے کہا: حوران کے ایک بوڑھے عالم سے میں نے پوچھا تو اس نے ذکر کیا کہ یہ ان کی لغت ہے۔ یہ عکرمہ نے بھی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ عربی لغت ہے اس کے ذریعے وہ اپنی طرف بلاتے ہیں اور یہ اشیاء پر آنے اور ابھارنے کا کلمہ ہے۔ جوہری نے کہا: جب کوئی آدمی چیخے اور کسی کو بلائے تو اس وقت هَوَّتَ به اور هَيَّتَ به کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا:

قد رَابَنِي أَنَّ الكَرِيَّ أَسْكَتَا　لو كان مَعْنِيًا بها لَهَيَّتَا

جوہری نے هيت کے ثبوت پر یہ شعر پڑھا جس میں لهيتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ وہ چیخا، دوسرے نے کہا:

يَحْدو بها كُلُّ فتىً هَيَّاتِ

اس مصرعہ میں بھی هيات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور جس طرف تو نے مجھے بلایا ہے اس سے اللہ کی امان طلب کرتا ہوں۔ یہ مصدر ہے یعنی أعوذ بالله معاذاً فعل کو حذف کر دیا گیا ہے اور فعل محذوف کے سبب مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا جاتا ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: مررتُ بزيدٍ مرورَ عمرٍو یعنی مروری بعمرو۔ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ یعنی اس (عورت) کا شوہر یعنی وہ میرا سردار ہے اس نے میری تکریم کی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کروں گا۔ یہ سدی، ابن اسحاق اور مجاہد کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک اللہ میرا رب ہے اس نے اپنی مہربانی سے مجھے والی بنایا، پس میں اس کام کا ارتکاب نہیں کروں گا جس کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ حدیث میں ہے (2) کہ اس نے آپ کو کہا: اے یوسف! تیرے چہرے کی صورت کتنی خوبصورت ہے! آپ نے جواب دیا: رحم میں میرے پروردگار نے میری تصویر بنائی، اس نے کہا: تیرے بال کتنے خوبصورت ہیں! آپ نے جواب دیا: میری قبر میں سب سے پہلے مجھ سے جدا ہوں گے۔ اس نے کہا: اے یوسف! تیری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں! آپ نے جواب دیا ان کے ساتھ میں اپنے پروردگار کو دیکھوں گا۔ اس نے کہا: اے یوسف! اپنی نگاہ کو اٹھاؤ اور میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ آپ نے جواب دیا: میں اپنی آخرت میں اندھا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ اس نے کہا: اے یوسف! میں تیرے قریب ہوتی ہوں اور تو مجھ سے دور ہوتا ہے۔ آپ نے کہا: میں اس طریقے سے اپنے پروردگار کا قرب چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: اے یوسف! میں نے تیری خاطر علیحدہ کمرہ بنا دیا ہے پس میرے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ آپ نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 212　　2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 218

فرمایا: کمرہ مجھے میرے پروردگار سے نہیں چھپا سکتا۔ اس نے کہا: اے یوسف! ریشم کا بستر میں نے تیری خاطر بچھا دیا ہے۔ اٹھو اور میری حاجت پوری کرو۔ آپ نے فرمایا: تب تو جنت میں سے میرا حصہ جاتا رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے گفتگو کی اور آپ اس کا جواب دیتے رہے یہاں تک کے آپ اس کی طرف مائل ہوئے (*)۔ بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف شہوت کے ساتھ مائل ہوتی رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبوت کی ہیبت ڈال دی بعد ازاں جس نے بھی آپ کو دیکھا اس کو اس ہیبت نے آپ کے حسن سے مشغول رکھا۔ آپ کے ھم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس عورت کا ھم نافرمانی تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام مائل ہوتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لیکن جب آپ نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھ لیا تو آپ نے قصد نہ کیا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ عصمت انبیاء لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ اس صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ هم بها ہے

ابو حاتم نے کہا: میں غریب القرآن ابو عبیدہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا جب میں وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا پر پہنچا تو ابو عبیدہ نے کہا: اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ گویا کہ وہ یہ مراد لے رہے تھے کہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لهم بها اگر آپ اپنے رب کی طرف سے (روشن) دلیل نہ دیکھ لیتے تو آپ بھی ضرور اس کا قصد کرتے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: یعنی زلیخا نے نافرمانی کا قصد کیا اس حال میں کہ وہ اس پر مصر تھی اور حضرت یوسف مائل ہوئے مگر جس طرف آپ مائل ہوئے اس میں واقع نہیں ہوئے لہٰذا دونوں کے ارادے میں فرق ہے۔ یہ دونوں قول ہروی نے اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ جمیل نے کہا:

هَمَمْتُ بِهَمٍ من بُثَيْنَةَ لو بَدَا شَفَيْتُ غُلَيلاتِ الهَوى من فُؤَادِيَا

دوسرا

هَمَمْتُ ولم أفعلْ وكدتُ وليتني تَركتُ على عثمان تبكي حلائله

یہ ساری نفس کی گفتگو ہے بغیر عزم کے۔ ایک قول یہ ہے: هَمَّ بِهَا سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اس کی زوجیت کا قصد کیا۔ ایک قول یہ ہے: هَمَّ بِهَا سے مراد ہے آپ نے اس کو مارنے اور اپنے آپ سے دور کرنے کا قصد کیا اور رب کی دلیل نے مارنے سے روک لیا، کیونکہ اگر آپ اس کو مارتے تو یہ وہم پیدا ہو جاتا کہ آپ نے حرام کا قصد کیا اور اس نے اس سے روک دیا پس اس وجہ سے آپ نے اسے مارا۔ اور ایک قول یہ ہے: یوسف کا قصد بھی معصیت تھا اور وہ اس کے پاس اس طرح بیٹھے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پاس بیٹھتا ہے۔ اس قول کی طرف اکثر و عام مفسرین مائل ہوئے ہیں، جن میں سے قشیری ابو نصر، ابن الانباری، نحاس اور ماوردی وغیرہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ نے سروال کا بندھن کھولا اور اس کے پاس

---

* روایت کے آخری الفاظ کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یوسف: 24) پس برہان کے پائے جانے کی وجہ سے آپ کے ارادہ کا پایا جانا ممتنع ہے۔

خاتن کے بیٹھنے کی طرح بیٹھے (1)۔ آپ سے ہی روایت ہے: وہ (زلیخا) اپنی گدیوں پر چت لیٹی اور آپ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھے اور آپ نے اپنے کپڑے اتارے، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے اپنی سروال کا بندھن کھولا (2)۔ مجاہد نے کہا: آپ نے سروال کو کھولا یہاں تک کہ آپ الیتین تک پہنچ گئے اور اس کے پاس اس طرح بیٹھے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پاس بیٹھتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اور جب آپ نے کہا: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (یوسف: 52) یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ جان لے کہ میں نے چھپ کر خیانت نہیں کی۔ تو جبریل نے آپ کو کہا: اور نہ ہی اس وقت جب آپ نے قصد کیا تھا اے یوسف علیہ السلام؟ تو اس وقت آپ نے فرمایا: وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي (یوسف: 53) اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں کہتا۔ مفسرین نے کہا: اس حالت میں (غلط کاری سے) رک جانا اخلاص پر دلالت کرتا ہے اور ثواب کے حصول کے لیے بہت بڑا کام ہے (☆)۔

میں (قرطبی) نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو حضرت ذوالکفل کی تعریف کی ہے اس کا یہی سبب ہے جس کا بیان انشاء اللہ سورۂ ص میں آئے گا۔ اس بنیاد پر ''لولا'' کا جواب محذوف ہے؛ یعنی اگر آپ نے اپنے رب کی روشن دلیل کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ آپ کر گزرتے جس کا آپ نے قصد کیا تھا۔ اور اسی کی طرح كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ (تکاثر) ہے اور اس کا جواب لن تنافسوا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اسلاف کی ایک جماعت سے مروی ہے؛ انہوں نے کہا: اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ گنہگاروں کے لیے مثال بن جائیں تاکہ وہ دیکھیں کہ ان کی توبہ کا انجام بھی اللہ تعالیٰ کی معافی اور عفو و درگزر ہے جس طرح اس آدمی کی توبہ کا انجام معافی ہوا جو ان سے بہتر ہے (یعنی حضرت یوسف کی توبہ) اور گناہ کے قرب نے ان کو ہلاک نہیں کیا۔ یہ ساری صورتحال اس صورت میں ہوگی جس طرح اس گروہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصد یہاں تک پہنچ گیا کہ آپ زلیخا کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے اور ازار بند کو کھولنا شروع کر دیا اور وہ زلیخا ان کے لیے چت لیٹ گئی اس کو طبری نے بیان کیا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا قصد کیا۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کتاب کی تاویل کو زیادہ جانتے ہیں، اسی طرح انبیاء کی بہت زیادہ تعظیم کرنے والے ہیں اور بغیر علم کے ان کے بارے میں گفتگو کرنے والے نہیں۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معاصی کو اس لیے ذکر نہیں کیا کہ ان کے ذریعے ان پر عار نہ لگے بلکہ ان کا ذکر اس لیے کیا تاکہ تم توبہ سے مایوس نہ ہو۔ غزنوی نے کہا: انبیاء علیہ السلام کی لغزش میں کئی حکمتیں ہیں، مثلاً خوف کی زیادتی، شرمندگی کی وجہ سے حیاء کی شدت، عجیب عمل سے خالی ہو جانا، امید کے بعد عفو و درگزر کی نعمت سے لطف اندوز ہونا اور ان کا لغزش والے لوگوں کی امیدوں کا امام ہونا وغیرہ۔ ابو نصر قشیری نے کہا: ایک قوم نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے قصد کا ظہور ہوا اور ان کا یہ قصد طبعی تھا اور اس میں وہ فعل کرنے کا عزم مصمم نہیں تھا۔ اور جو قصد اس قبیل سے ہو اس کی وجہ سے بندے پر کوئی سزا نہیں ہوتی، جس طرح بعض اوقات ایک روزہ دار کے دل

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 219 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 220 ☆ یہ سب روایات قرآن حکیم کی صریح نص کے خلاف ہیں۔

میں ٹھنڈا پانی پینے اور لذیذ کھانا کھانے کی سوچ پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اس نے نہ کھایا، نہ پیا اور نہ ہی کھانے پینے کا عزم مصمم کیا تو دل میں پیدا ہونے والے اس کلام کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اب رب کی روشن دلیل نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس قصد سے پھیر دیا تو وہ عزم مصمم نہ رہا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ عمدہ بات ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس آیت کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت یوسف کا نبی ہونا صحیح نہیں اور نہ ہی اس حوالے سے روایات ظاہر ہیں۔ اور اگر معاملہ یوں ہو تو پھر آپ ایک بندہ مومن ہیں آپ کو سلطنت اور علم عطا کیا گیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ قصد جو فقط کسی کام کے کرنے کا ارادہ ہے اور اس میں فعل کا وقوع نہیں اس کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں خطا کا دل کے اندر ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ اور اگر ہم اس وقت آپ کو نبی فرض کریں تو پھر میرے نزدیک سوائے اس قصد کے جو صرف دل کے اندر کھٹکتا ہے کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔ اس صورت میں جو یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنا ازار بند کھولا وغیرہ یہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ نبوت کے ساتھ تو عصمت (لازمی) ہوتی ہے۔ اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ کو کہا گیا: تکون فی دیوان الانبیاء و تفعل فعل السفہاء تو اس کا معنی اس واقعے کے بعد انبیاء میں شمار ہونا ہوگا۔

میں (قرطبی) نے کہا: انہوں نے اس تفصیل میں سے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نبی تھے جس طرح ہم نے ذکر کیا اور یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور آپ نبی تھے تو پھر قصد سے مراد وہ ہوگا جو دل میں کھٹکتا ہے اور سینے میں ثابت نہیں ہوتا؛ اور یہی وہ چیز ہے جس پر مواخذے کو اللہ نے مخلوق سے اٹھا لیا ہے (یعنی وسوسہ) کیونکہ اس کو انسان دور نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (یوسف: 53) اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے۔ لیکن معنی یہ ہے کہ اس قصد سے میرا نفس بری نہیں یا پھر آپ کا یہ قول تواضع اور اعتراف عجز کے طور پر ہوگا کیونکہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاک کیا آپ کا نفس اس کی مخالفت کر رہا تھا؛ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بلوغت کے وقت آپ کے حال کی خبر دی اور ارشاد فرمایا: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا جس طرح کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کی خبر سچی، اس کا وصف صحیح اور حق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے زنا اور اس کے مقدمات کی حرمت، سردار، پڑوسی اور اجنبی کے ساتھ خیانت کی حرمت وغیرہ میں سے جو کچھ سکھایا آپ نے اس پر عمل کیا۔ اور آپ نے عزیز مصر کی بیوی سے اعراض برتا۔ اور اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس سے پیٹھ پھیر لی اور اس سے بھاگے یہ ایسی حکمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص کیا اور حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے مقتضیٰ پر آپ کا عمل تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فرشتوں نے عرض کیا: اے پروردگار! یہ تیرا بندہ ہے جو برائی کرنا چاہتا ہے، حالانکہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اس کی نگرانی کرو اگر اس نے برائی کی تو اس کی مثل اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو اور اگر اس نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کے حق میں نیکی لکھ دو پس اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78

نے صرف میری خاطر برائی کو چھوڑ دیا''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کی طرف سے خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''جب میرا بندہ کوئی برائی کرنے کا قصد کرتا ہے اور پھر کرتا نہیں تو میں اس کی نیکی لکھ دیتا ہوں''۔ پس اگر بندہ برائی کا قصد کرے تو اس کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے نہ کہ گناہ۔ صحیح میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کی دل میں پیدا ہونے والے وسوسے کا گناہ اٹھالیا ہے جب تک کہ بندہ اس پر عمل نہ کرے یا اس کے بارے میں گفتگو نہ کرے''۔ ابن عربی نے کہا: مدینہ السلام میں صوفیاء کے اماموں میں سے کوئی امام تھا جو ابن عطا کے نام سے معروف تھا؛ اس نے ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کی یہاں تک کہ اس نے آپ کی طرف منسوب ناپسندیدہ باتوں سے آپ کی برأت کا تذکرہ کیا؛ اس کی مجلس میں ایک آدمی اٹھا جو تمام لوگوں کے نزدیک مبغوض تھا اس نے کہا: اے شیخ: اے ہمارے سردار: تب تو یوسف نے قصد کیا البتہ اس نے پورا نہ کیا؟ امام نے کہا: ہاں! کیونکہ وہاں (رب کی بارگاہ) سے مہربانی تھی۔ عالم اور متعلم دونوں کی مٹھاس کو دیکھو، سوال کرنے والے کے بارے میں ایک عام آدمی کی ذہانت اور عالم نے جو جواب دیا اس کے اختصار اور مکمل ہونے کو دیکھو؛ اسی وجہ سے علماء صوفیہ نے کہا: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا کے ارشاد کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت وعلم غلبہ شہوت کو جدا کرنے کے لیے دیا تا کہ یہ ان کی عصمت کا سبب اور ذریعہ بن جائے۔

میں (قرطبی) نے کہا: جب اللہ نے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کی اس کی وجہ سے ان کی عصمت وبرأت پختہ ہوگئی تو جو مصعب بن عثمان نے کہا ہے وہ صحیح نہ ہوا۔ مصعب نے کہا: سلیمان بن یسار لوگوں میں خوبصورت ترین آدمی تھا۔ ایک عورت اس کی مشتاق ہوگئی اور اس عورت نے اپنا آپ اس کے سپرد کر دیا مگر وہ رک گیا اور اسے نصیحت کی اس عورت نے کہا: اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیری مشہوری کروں گی تو وہ نکلا اور اس نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔ تو اس نے خواب میں حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا: آپ یوسف ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں وہ یوسف ہوں جس نے قصد کیا تھا۔ اور تو سلیمان ہے جس نے قصد ہی نہ کیا؟ یہ واقعہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ولایت کا درجہ نبوت کے درجے سے بلند ہو حالانکہ یہ محال ہے۔ اگر ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ فرض کر لیں کہ وہ نبی نہیں تھے تو آپ کا درجہ بھی ولایت ہوا۔ پھر تو آپ کو بھی اسی کی طرح محفوظ ہونا چاہیے؛ اور اگر سلیمان پر دروازے بند کر دیے جاتے اور لمبی دیر تک گفتگو اور خطاب کے ذریعے اور کلام وجواب کے ذریعے متوجہ کیا جاتا تو اس پر بھی فتنہ اور بہت بڑے ابتلاء کا اندیشہ ضرور تھا۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ، اَنْ محل رفع میں ہے یعنی لولا رؤیۃ برھان ربہ اگر اپنے رب کی دلیل کی رؤیت نہ ہوتی۔ اور سامع کو معلوم ہونے کی وجہ سے جواب محذوف ہے یعنی لکان ما کان پھر ہوتا جو کچھ بھی ہوتا۔ یہ دلیل قرآن میں مذکور نہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زلیخا گھر کے کونے میں پڑے یاقوت اور جواہرات سے ڈھکے بت کی طرف گئی اور اسے کپڑے کے ساتھ ڈھانپ دیا تو آپ نے کہا: تو کیا کر رہی ہے؟ اس نے کہا: مجھے اپنے اس معبود سے حیاء آتی ہے کہ یہ مجھے اس صورت میں دیکھ لے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں زیادہ اس بات کا حقدار ہوں کہ میں اللہ سے حیاء کروں۔ اس سلسلہ میں کی گئی گفتگو میں یہ عمدہ ترین بات ہے کیونکہ اس میں دلیل کا قائم کرنا ہے۔ ایک

قول یہ ہے: آپ نے گھر کی چھت میں وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) لکھا ہوا دیکھا۔ (اور تم زنا کے قریب مت جاؤ یہ فحش کام ہے اور برا راستہ ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس پر اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ (الانفطار) لکھا ہوا تھا۔ (اور بے شک تم پر نگران ہیں) بعض لوگوں نے کہا: آپ نے اللہ تعالیٰ کا عہد اور میثاق یاد کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: ندا دی گئی کہ اے یوسف: آپ کا نام انبیاء علیہم السلام کے دیوان میں لکھا ہوا ہے اور آپ بے وقوفوں کا سا عمل کر رہے ہو؟ ایک قول یہ ہے: آپ نے دیوار پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ان کی انگلیوں کو پکڑ کر دھمکی دے رہے تھے تو آپ رک گئے اور آپ کی انگلیوں سے آپ کی شہوت نکل گئی۔ یہ قتادہ، مجاہد، حسن بصری، ضحاک، ابو صالح اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعمش نے مجاہد سے روایت کیا: آپ نے اپنی سروال اتاری تو حضرت یعقوب علیہ السلام مثالی صورت میں آپ کے سامنے آئے اور فرمایا: اے یوسف! علیہ السلام تو آپ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سفیان نے ابو حصین سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے سامنے مثالی صورت میں آئے اور آپ کے سینے پر ہاتھ مارا تو آپ کی شہوت آپ کی انگلیوں سے نکل گئی۔ مجاہد نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہر ایک کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے ان کے صرف دو بیٹے پیدا ہوئے اور اس شہوت کی وجہ سے آپ کی اولاد کم ہوئی۔ اس کے علاوہ اقوال بھی ہیں (☆)۔ المختصر: وہ برھان اللہ کی آیات میں ایک آیت تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دکھائی یہاں تک کہ آپ کا ایمان مضبوط ہوا اور نافرمانی سے رک گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ کذلک میں کاف ضمیر محل رفع میں بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی، تقدیر عبارت ہوگی: البراھین کذلک اور یہ مصدر محذوف کی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی أریناہ البراھین رؤیۃ کذلک، السُّوْٓءَ سے مراد شہوت ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد مباشرت ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد بری تعریف ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد زنا ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد اپنے صاحب سے خیانت کرنا ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد فاحشہ عورت پر سوار ہونا ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد عزیز مصر کی سزا ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے الْمُخْلِصِيْنَ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی اطاعت کو خالص کیا، جبکہ قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لیے چنا ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام میں یہ دونوں صفات موجود تھیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مخلص تھے اور اللہ تعالیٰ کی رسالت کے لیے چنے گئے تھے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

☆ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ ضیاء القرآن میں یہاں امام رازی، ابو حیان اور دوسرے محققین کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں، یہ اقوال آپس میں اتنے متضاد ہیں اور ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں کہ انہیں صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا نیز یہ کسی مستند روایت سے ان اسلاف سے ثابت نہیں۔

''اور دونوں دوڑ پڑے دروازے کی طرف اور اس عورت نے پھاڑ ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور (اتفاق ایسا ہوا کہ) ان دونوں نے کھڑا پایا اس کے خاوند کو دروازے کے پاس۔ جھٹ بول اٹھی: (میرے سرتاج! بتایئے) کیا سزا ہے اس کی جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا بجز اس کے کہ اسے قید کر دیا جائے یا (اسے) دردناک عذاب دیا جائے''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاسْتَبَقَا الْبَابَ کے بارے میں علماء نے کہا: یہ قرآن معجز کے ان اختصارات میں سے ہے جن میں بہت سے معانی جمع ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھا تو اس عورت سے بھاگے تو دونوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ اس لیے دوڑی تا کہ آپ کو اپنی طرف واپس لوٹا لے اور آپ اس لیے تیز دوڑے کہ اس سے بھاگ جائیں تو اس نے آپ کے نکلنے سے پہلے آپ کو پا لیا۔ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ اور اس عورت نے پیچھے سے آپ کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ مِنْ دُبُرٍ، مراد من خلفه، ہے۔ اس نے قمیص کو اوپر سے پکڑا (1) تو قمیص گردن کے پاس سے پھٹی اور وہ پھٹن قمیص کے نیچے تک پہنچ گئی الاستباق سے مراد کسی چیز کی طرف سبقت کو طلب کرنا ہے، اسی سے سباق ہے اور قد سے مراد کاٹنا ہے اور اکثر طور پر لمبائی میں کاٹنے کے لیے یہ استعمال ہوتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

تَقُدُّ السَّلُوْقِيَّ الْمُضَاعَفَ نَسْجُهٗ   وَتُوْقِدُ بِالصُّفَّاحِ نَارَ الْحُبَاحِبِ

محل استشہاد تَقُدُّ ہے یعنی قَدَّ یَقُدُّ سے جس کا معنی ہے کاٹنا۔

جبکہ القط طاء کے ساتھ چوڑائی میں کاٹنے کیلئے استعمال ہوتا ہے مفضل بن حرب نے کہا: میں نے ایک مصحف میں فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ عُطَّ مِنْ دُبُرٍ پڑھا ہے عط کا معنی ہے پھٹنا۔ یعقوب نے کہا: القط سے مراد صحیح جلد اور صحیح کپڑے میں پھٹن ہے۔

اسْتَبَقَا میں الف اور اس کے بعد لام کے ساکن ہونے کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا جس طرح تثنیہ کی صورت میں جاءنی عبداللہ کہا جاتا ہے۔ اور عربوں میں جاءنی عبداللہ بھی کہتے ہیں یعنی بغیر ہمزہ کے الف کو ثابت کر کے دونوں ساکنوں کو جمع کرتے ہیں کیونکہ دوسرا مدغم ہے جبکہ پہلا حرف مد و لین ہے۔ اور بعض ''عبداللہ'' کہتے ہیں یعنی الف اور ہمزہ دونوں کو ثابت رکھ کے جس طرح وقف کی صورت میں کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ آیت میں قیاس اور اعتبار پر بھی دلیل ہے اسی طرح عرف و عادت پر عمل کرنے پر بھی دلیل ہے اس کی وجہ قمیص کے آگے اور پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے۔ اور یہ ایسا معاملہ ہے جو صرف مالکیوں کی کتابوں میں ہے۔ اور یہ اس لیے کہ جب قمیص کو پیچھے سے کھینچا جائے تو اس طرف سے پھٹتی ہے اور جب سامنے سے کھینچی جائے تو اس طرف سے پھٹتی ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے۔ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ یعنی ان دونوں نے عزیز مصر کو دروازے پر پایا اور سَيِّدَ سے مراد خاوند لیا گیا ہے۔ اور قبطی خاوند کو سید کہتے ہیں اور الفاه، صادفه، وارطه، اور لاطه تمام ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جب اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 235

(زلیخا) نے اپنے خاوند کو دیکھا تو بہانہ بنانے کے لیے اس نے اس کی توجہ مبذول کروانا چاہی اور کہنے لگی: قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اس کی کیا سزا ہے جو تیرے گھر والوں کے ساتھ زنا کرنا چاہے؟ سُوْٓءًا سے مراد زنا ہے۔ اِلَّآ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ضرب کی صفت وجیع بیان کی جاتی ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں یضرب ضربا وجیعا اور مَا جَزَآءُ مبتدا ہے اور اَنْ یُّسْجَنَ اس کی خبر ہے۔ جب کہ اَوْ عَذَابٌ، اَنْ یُّسْجَنَ پر معطوف ہے کیونکہ اَنْ یُّسْجَنَ کا معنی الا السجن ہے اس کو عَذَابٌ اَلِیْمٌ پڑھنا بھی جائز ہوگا اس صورت میں عبارت ہوگی او یعذب عذابا الیما یہ کسائی کا قول ہے۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿٢٩﴾

"آپ نے (جوابا) فرمایا: (میں نے نہیں بلکہ) اس نے بہلانا چاہا ہے مجھے کہ مطلب براری کرے اور گواہی دی ایک گواہ نے جو اس عورت کے خاندان سے تھا (کہ دیکھو) اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے سچ کہا، وہ جھوٹوں میں سے ہے اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہوئی ہو پیچھے سے تو پھر اس نے جھوٹ کہا اور یوسف سچوں میں سے ہے، پس جب عزیز نے دیکھا پیراہن یوسف کو کہ پھٹا ہوا ہے پیچھے سے تو بول اٹھا: یہ سب تم عورتوں کا فریب ہے، بے شک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے۔ اے یوسف! (پاکباز) اس بات کو جانے دو اور (اے عورت) اپنے گناہ کی معافی مانگ، بے شک تو ہی قصورواروں میں سے ہے"۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا: جب اس عورت نے اپنے آپ کی برأت ظاہر کر دی تو پتہ چلا وہ محبت میں سچی نہ تھی کیونکہ محب کی شان تو محبوب کو ترجیح دینا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے بہتان اور جھوٹ کے مقابلے میں سچ بیان کیا۔ نوف شامی وغیرہ نے کہا ہے: گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس واقعہ سے پردہ نہ اٹھایا اور جب اس نے آپ سے بغاوت کی تو آپ کو غصہ آیا اور آپ نے سچ کہہ دیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا کیونکہ جب ان دونوں کے قول میں تعارض واقع ہوا تو بادشاہ کو گواہ کی ضرورت پڑی تاکہ وہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کر سکے تو اس عورت کے گھر کے آدمی نے گواہی دی یعنی اس کے گھر کے آدمی نے فیصلہ کر دیا، کیونکہ یہ اس کی طرف سے فیصلہ تھا نہ کہ شہادت۔ اس گواہ کے بارے میں چار مختلف اقوال ہیں۔ پہلا: وہ بچہ تھا (1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 236

گود میں اس نے کلام کیا۔ سہیلی نے کہا: یہ صحیح ہے۔ اس حدیث طیبہ کی وجہ سے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لم یتکلم فی المهد الا ثلاثة (1) گود میں سوائے تین بچوں کے اور کسی نے کلام نہیں کیا۔ ان میں آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ کا ذکر بھی فرمایا۔ ابونصر قشیری نے کہا: اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گھر میں گود میں ایک بچہ تھا اور وہ زلیخا کی خالہ کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: ''بچپنے میں چار نے کلام کیا'' (2)۔ اور آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی ایک قول ہے۔ دوسرا: کہ گواہ اصل میں قمیص کا پھٹنا تھا۔ اس کو ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے۔ اور یہ لغوی اعتبار سے صحیح مجاز ہے۔ کیونکہ زبان حال زبان مقال کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتی ہے اور بعض اوقات عرب کلام کو جمادات کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس کی صفات کی خود اسی کے بارے میں خبر دیتے ہیں اور یہ ان کے اشعار اور کلام میں بہت زیادہ ہے اور اس سلسلہ میں کسی کا بڑا خوبصورت قول ہے: دیوار نے کیل کو کہا کہ تو نے مجھے کیوں چیرا؟ اس نے اسے کہا: اس سے پوچھ اس نے مجھے کیوں گاڑا؟ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مِّنْ اَهْلِهَا اس کے قمیص ہونے کو باطل قرار دے دیتا ہے۔

تیسرا: وہ اللہ کی مخلوق میں سے مخلوق ہے نہ تو انسان، نہ ہی جن۔ یہ بھی مجاہد کا قول ہے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مِّنْ اَهْلِهَا رد کر دیتا ہے۔

چوتھا: وہ عقلمند اور حکیم آدمی تھا۔ وزیر اپنے معاملات میں اس سے مشورہ لیتا تھا اور وہ عورت کے اہل میں سے تھا اور رہتا اس کے خاوند کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا: میں نے دروازے کے پیچھے سے کھینچنے، خود کو ترجیح دینے اور قمیص کے پھٹنے کے بارے میں سنا یہ معلوم نہیں کہ تم میں سے کون آگے تھا؟ پس اگر قمیص کی پھٹن اس (یوسف) (3) کے آگے کی طرف سے ہے تو تو سچی ہے اور وہ اس کے پیچھے سے ہے تو پھر وہ سچا ہے۔ پھر ان سب نے قمیص کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ حضرت حسن بصری، عکرمہ، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ سدی نے کہا: یہ اس کے چچا کا بیٹا تھا اور اس نے یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس باب میں یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسرائیل عن سماک عن عکرمہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ داڑھی والا آدمی تھا۔ سفیان عن جابر عن ابن ابی ملیکہ عن ابن عباس کہا کہ آپ نے فرمایا: وہ بادشاہ کے خاص آدمیوں میں سے تھا۔ عکرمہ نے کہا: وہ بچہ نہیں تھا البتہ ایک حکیم آدمی تھا۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے: وہ ایک آدمی تھا۔ ابوجعفر نحاس نے کہا کہ وہ عقلمند اور حکیم آدمی تھا بادشاہ نے اس سے مشورہ لیا تو اس نے یہ دلیل پیش کی؟ اگر وہ بچہ ہوتا تو اس کی شہادت تو عادت کو بطور دلیل پیش کرنے سے مستغنی کر دیتی کیونکہ بچے کا کلام کرنا تو معجزہ و کرامت ہے اور یہ عادت سے استدلال کرنے کی نسبت زیادہ واضح تھا۔ یہ بات نبی کریم ﷺ کی حدیث۔ تکلم أربعة وهم صغار، منهم صاحب يوسف، (4) کے مخالف بھی نہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 489
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1084
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 233
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1084

کیونکہ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صغیر تھا، بوڑھا نہ تھا۔ اور اس سلسلے میں ایک اور دلیل بھی ہے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے اور یہ روایت بھی متواتر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا گواہ بچہ نہیں تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن جبیر، ہلال بن یساف اور ضحاک سے روایت ہے کہ وہ بچہ تھا گود میں۔ اگر وہ بچہ ہوتا تو اس کا صرف کلام کر دینا ہی دلیل ہوتا اور قمیص کے ذریعے استدلال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور اس صورت میں یہ خلاف عادت اور معجزہ کی ایک قسم بنتی۔ واللہ اعلم، ان شاء اللہ سورۂ ''البروج'' میں ان بچوں کا بیان آئے گا جنہوں نے پنگھوڑے میں گفتگو کی۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب ہم یہ بات کہیں کہ وہ شاید چھوٹا بچہ تھا تو اس میں نشانیوں پر عمل کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ بڑا آدمی ہو تو پھر لقطہ اور بہت سے مقامات پر علامت کے ذریعے کیے جانے والے فیصلہ کا حجت ہونا صحیح ہو جائے گا۔

حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے چوروں کے بارے میں کہا: جب ان کے پاس سامان ہو اور بہت سارے لوگ آ کر اس کا دعویٰ کر دیں جب کہ ان کے پاس کوئی بینہ نہ ہو تو سلطان اس سلسلہ میں غور و فکر اور تدبر کرے گا اور اگر ان کے علاوہ دیگر لوگ نہ آئیں تو وہ سامان وہ ان کے سپرد کر دے گا۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر گھر کے سامان میں مرد اور عورت کا اختلاف ہو گیا تو وہ مال جو مردوں کا ہو سکتا ہے وہ مرد کا ہوگا اور جو عورتوں کا ہو سکتا ہے وہ عورت کا ہوگا اور جو مرد اور عورت دونوں کا ہو سکتا ہے وہ مرد کا ہوگا۔ شریح قاضی اور ایاس بن معاویہ فیصلہ کے سلسلہ میں علامات پر ہی عمل کرتے تھے اور اس سلسلہ میں دلیل یہی آیت ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ، كَانَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ اور نحوی اعتبار سے اس میں اشکال ہیں کیونکہ حرف شرط ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں لیکن یہ قانون كَانَ میں جاری نہیں ہوتا۔ مبرد محمد بن یزید نے کہا: یہ کان میں پائی جانے والی قوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعے تمام افعال کو تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ زجاج نے کہا: اِنْ كَانَ کا معنی ان یکن ہے یعنی ان یعلم اگر پتہ چل جائے اور علم کا وقوع ہوا نہیں (کہ اسے ماضی کہیں) تو اسی طرح کون (کا وقوع بھی نہیں ہوا) کیونکہ یہ علم کی طرف لے جاتا ہے۔

قُدَّ مِنْ قُبُلٍ یہ فعل ماضی کے ذریعے كَانَ کے بارے میں خبر ہے۔

جس طرح زہیر نے کہا:

وكان طَوَى كَشْحًا على مُسْتَكِنَّةٍ فلا هو أبداها ولم يَتَقَدَّمِ

اس شعر میں فلا ھو ابداھا ولم یَتَقَدَّمِ ماضی ہے جو کہ کان کی خبر ہے۔

یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق نے مِنْ قُبُلٍ قاف، با اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح دُبُرٍ۔ زجاج نے کہا: ان دونوں کو غایت بنایا جائے گا جس طرح قبل اور بعد۔ گویا کہ اس نے کہا: من قبلہ و من دبرہ (1)۔ اور جب مضاف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 236

الیہ کو حذف کر دیا گیا جو مراد تھا تو مضاف خود اپنی غایت بن گیا اس کے بعد کہ مضاف الیہ اس کی غایت تھی۔ اور غیر مضاف کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے مِنْ قُبُلِ اور مِنْ دُبُرِ یعنی لام اور را کے فتحہ کا ساتھ بھی جائز ہے۔ اور محبوب نے ابوعمرو سے مِنْ قُبُلِ اور مِنْ دُبُرِ بھی روایت کیا ہے، یعنی مخفف اور مجرور۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر نے زلیخا کو اس کے اس قول مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا کے وقت کہا۔ ایک قول کے مطابق: گواہ نے اسے کہا۔ كَيْد کا معنی مکر اور بہانہ ہے۔ سورۃ ''الانفال'' میں یہ گزر چکا ہے۔ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ اس نے عظیم کہا ان کے فتنہ اور کسی مشکل سے نکلنے کے لیے ان کے حیلہ کے بڑے ہونے کی وجہ سے۔ مقاتل نے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے بڑا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (النساء) اور اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کرو اور اسے چھپاؤ، پھر زلیخا کی طرف اس نے توجہ کی اور کہا: اور تو وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اپنے گناہ کی معافی مانگ یعنی اپنے شوہر سے اپنی غلطی کی معافی مانگ تا کہ وہ مجھے سزا نہ دے۔ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ اس نے من الخاطئات نہیں کہا کیونکہ اس نے مذکر اور مونث دونوں کے متعلق خبر دینے کا قصد کیا ہے اور مذکر کو اس نے غلبہ دیا ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا: من الناس الخاطئین یا من القوم الخاطئین جیسے انہا کانت من قوم کافرین، وکانت من القانتین ایک قول یہ ہے: یوسف کو اَعْرِضْ اور زلیخا کو اسْتَغْفِرِيْ کہنے والا اس کا شوہر تھا۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک: کہ وہ غیرت مند نہیں تھا، اس وجہ سے وہ ساکن رہا اور مصریوں میں سے اکثر میں غیرت موجود نہیں ہے۔

دوسرا: کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی غیرت کو سلب کر لیا اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام پر مہربانی تھی یہاں تک کہ اس کا غصہ ختم ہو گیا اور اس نے زلیخا کو معاف کر دیا۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝

''اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی بہلاتی ہے اپنے (نوجوان) غلام کو تا کہ اس سے مطلب براری کرے، اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اس کی محبت، ہم دیکھ رہی ہیں اسے کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ پس جب

زلیخا نے سنا ان کی مکارانہ باتوں کو تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور تیار کیں ان کے لیے مسندیں اور (جب وہ آ گئیں تو) دیدی ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری اور یوسف کو کہا کہ (ذرا) نکل (تو) آ ؤ ان کے سامنے۔ پس جب (یوسف آئے اور) انہوں نے اس کو دیکھا تو اس کی عظمت (حسن) کی قائل ہو گئیں اور (وارفتگی کے عالم میں) کاٹ بیٹھیں اپنے ہاتھوں کو اور کہہ اٹھیں: سبحان اللہ! یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ زلیخا (فاتحانہ انداز میں) بولی: یہ ہے وہ (پیکر رعنائی) جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں بخدا! میں نے اسے بہت بہلایا پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا اور اگر وہ نہ بجالایا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے قید کر دیا جائے گا اور وہ ہو جائے گا ان لوگوں سے جو بے آبرو ہیں''۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ، نِسْوَةٌ کو نون کے ضمہ کے ساتھ نُسوۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ اعمش، مفضل اور سلمی کی قرأت ہے اس کی جمع کثرت نساء ہے اس کو قالت نسوۃ اور قَالَ نِسْوَةٌ دونوں طرح پڑھنا جائز ہے جیسے قالت الاعراب اور قال الاعراب یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اہل مصر میں یہ قصہ مشہور ہو گیا اور عورتوں نے گفتگو کی۔ ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر کے ساقی کی بیوی تھی، اس کے نان بائی کی بیوی تھی، اس کے قیدی ساتھی کی بیوی تھی وغیرہ۔ ایک قول یہ ہے: حاجب کی بیوی تھی یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ کلام عرب میں الفتی نوجوان کو کہتے ہیں جبکہ عورت فتاۃ کہلاتی ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ایک قول کے مطابق: شَغَفَهَا سے مراد ہے غلبها جبکہ ایک قول یہ ہے: اس کی محبت اس کے اندر داخل ہو گئی (1)۔ مجاہد وغیرہ سے منقول ہے عمرو بن دینار نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اس کے دل کی تہہ میں محبت داخل ہو گئی۔ حسن بصری نے کہا الشغف دل کے باطن کو کہتے ہیں۔ سدی اور ابوعبید نے کہا: شغاف القلب سے مراد دل کا غلاف ہے اور اس سے مراد اس کی اوپر والی جلد ہے ایک قول کے مطابق: یہ دل کا درمیانی حصہ ہے۔ ان تمام اقوال کی روشنی میں معنی قریب قریب ہے۔ اور معنی یہ ہوگا: اس کی محبت اس کے شغاف (دل کے باطن) میں داخل ہو گئی پس وہ اس پر غالب آ گئی:

نابغہ نے کہا:

وقد حال ھَمٌّ دون ذالك داخلٌ　　دخولَ الشَّغافِ تبتغیه الأصابعُ (2)

ایک قول یہ ہے: شغاف، بیماری ہے۔ اصمعی نے رجز کہنے والے کو کہا:

یتبعها وھی شَغافٌ

ابوجعفر بن محمد بن محیصن اور حسن بصری نے اسے شَعَفَهَا عین غیر معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی محبت نے اس (زلیخاء) کے دل کو جلا دیا اور اس نے کہا: عمل پہلی قرأت پر ہے۔ جوہری نے کہا: وشغفه الحب احرق قلبه۔ ابوزید نے کہا: اس نے اس کو بیمار کر دیا، یعنی شغف کا معنی أمرض ہے جیسے کہا جاتا ہے: قد شغف بکذا فھو

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 236　　2۔ ایضاً

مشغوف۔ حسن بصری نے قد شغفھا پڑھا اور کہا: اس کا باطن محبت سے بھرپور تھا۔ نحاس نے کہا: اکثر اہل لغت کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہر مذہب چلا گیا، کیونکہ شتان الجبال سے مراد ان کا بلند ترین حصہ ہے قد شغف بذالك شغفا غین کے سکون کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ جب اس کا شوق دلایا جائے۔ مگر ابو عبیدہ نے امری القیس کا شعر پڑھا:

ایقتلنی وقد شَعَفْتُ فؤادھا کَمَا شَعَفَ المَھْنُوْءَۃَ الرَّجلُ والطَّالِی (1)

اس نے کہا: محبت کی سختی اور اس کے جوش کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

شعبی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: الشغف غین کے ساتھ کا معنی ہے محبت اور الشعف عین کے ساتھ کا معنی جنون ہے نحاس نے کہا: قَدْ شَغَفَھَا غین کے کسرہ کے ساتھ بھی اس کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ کلام عرب میں شغفھا غین کے فتحہ کے بغیر معروف ہی نہیں۔ اسی طرح شَغَفَھَا، یعنی اس نے اس کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ جنون میں مبتلا ہو چکا تھا۔ سعید بن ابی عروبہ نے حضرت حسن بصری سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: الشغاف، سے مراد دل کا حجاب ہے (2)۔ اور الشعاف سے مراد دل کا سیاہ نشان ہے۔ پس اگر محبت شغاف تک پہنچ جاتی تو وہ مر جاتی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: الشعاف، دل کے ساتھ ملی ہوئی اس جلد کو کہتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتی اور وہ سفید جلد ہوتی ہے۔ اس (یوسف) کی محبت زلیخا کی جلد کے ساتھ یوں چمٹ گئی جس طرح جلد دل کے ساتھ چمٹی ہوئی ہوتی ہے۔

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ یعنی اس کام میں۔ قتادہ نے کہا: فَتٰىهَا سے مراد فتی زوجھا ہے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک تو حضرت یوسف علیہ السلام غلاموں کے حکم میں تھے۔ اور ان کے بارے میں زلیخا کا حکم نافذ تھا۔ مقاتل نے عن ابی عثمان نہدی عن سلمان فارسی کہا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر کو ہبہ کیا تو اس نے پھر ان کو زلیخا کو ہبہ کر دیا اور کہا: تو اس کو کیا کرے گی؟ تو اس نے کہا: میں اس کو بیٹا بناؤں گی۔ اس نے کہا: یہ تیرا ہے۔ اس نے اس کی پرورش کی حتیٰ کہ وہ جوان ہو گئے اور اس کے (زلیخا) دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں (کوئی خاص بات نہ تھی) تو وہ بے پردہ ان کے سامنے آتی، بناؤ سنگھار کرتی اور بڑی نرمی سے انھیں بلاتی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ یعنی ان عورتوں کی زلیخا کی غیبت کو اور اس کے حوالے سے ان کے مکر و فریب کو سنا۔ ایک قول یہ ہے: زلیخا نے ان عورتوں کو اس محبت پر مطلع کیا اور اس راز پر امین بنایا تو انہوں نے اس کے راز کو ظاہر کر دیا تو اس کو "مکر" کہا گیا ہے۔ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ کلام میں حذف ہے یعنی ارسلت الیھن تدعوھن الی ولیمۃ لتوقعھن فیما وقعت فیہ مجاہد نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: عزیز مصر کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ میں کھانا تیار کروں اور ان عورتوں کو دعوت دوں تو عزیز مصر نے اسے کہا: اس طرح کر لو، تو اس نے کھانا بنایا پھر ان کے لیے گھر کو مزین کیا اور ان کی طرف دعوت بھیجی کہ ان کے لیے کھانا تیار ہے اور تم میں سے جس جس عورت کو دعوت دی گئی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 238 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 237

غیر حاضر نہ ہو۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ چالیس عورتیں تھیں اور ناپسندیدگی کے باوجود وہ آئیں ان کے بارے میں امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

حتى إذا جئنها قسرا ومهدت لهن أنضادا وكبابا

وہب بن منبہ نے کہا: وہ آئیں اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً یعنی اس نے ان کی جگہیں تیار کیں جن کے ساتھ وہ ٹیک لگاتیں گئیں۔ ابن جبیر نے کہا: ہر مجلس میں ایک جام تھا جس میں شہد، مالٹا، اور تیز چھری تھی۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے مُتْكًا پڑھا ہے یعنی مخفف غیر مہموز اور قبطیوں کی لغت میں "المتك" مالٹے کو کہتے ہیں۔ اور مجاہد نے بھی اسی طرح اس کی تفسیر کی ہے۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: المتکاء، مثقل ہونے کی صورت میں اس کا معنی کھانا ہوگا جبکہ "المتك" مخفف ہونے کی صورت میں اس سے مراد مالٹا ہے (1)۔ شاعر نے کہا:

نَشْرَبُ الإِثْمَ بِالصُّوَاعِ جِهَارًا وَتَرَى الْمُتْكَ بَيْنَنَا مُسْتَعَارًا

از دشنوہ کہتے ہیں: اس سے مراد لیموں کا کٹا ہوا درخت ہے۔ جوہری نے کہا: المتك سے مراد وہ ہے جس کو ختنہ کرنے والی باقی چھوڑتی ہے۔ اور المتك کی اصل گوشت کے ساتھ لپٹی ہوئی جھلی ہے۔ اور عورتوں میں سے المتکاء وہ ہے جس کا ختنہ نہ ہوا ہو فراء نے کہا: اہل بصرہ کے ثقہ لوگوں میں سے ایک شیخ نے مجھے بیان کیا ہے کہ "المتك" مخفف ہونے کی صورت میں گوشت میں لپٹی ہوئی جھلی ہے اور ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ یہ لیموں کا درخت ہے۔ اس کو اخفش نے بیان کیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد لیموں کا درخت اور شہد ہے جس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فَظَلِلْنَا بِنِعْمَةٍ وَاتَّكَأْنَا وَشَرِبْنَا الْحَلَالَ مِنْ قُلَلِه

اس میں اتکانا سے مراد أكلنا ہے یعنی ہم نے کھایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَعْتَدَتْ العتاد سے مشتق ہے۔

اور مُتَّكَاً کے بارے میں سب سے عمدہ بات وہ ہے جو علی بن ابی طلحہ (2) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد مجلس ہے۔ اور جہاں تک مفسرین کی ایک جماعت کا تعلق ہے جنہوں نے اس سے مراد کھانا لیا ہے تو یہ اس تقدیر پر درست ہوگا۔ طعام متکاء" جیسے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اور اس حذف پر یہ آیت وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا دلالت کرتی ہے کیونکہ عورتوں کا چھریوں سمیت آنا وہ کسی ایسے کھانے کے لیے ہی ہے جو چھریوں کے ساتھ کاٹا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "اعراب القران" میں یوں ہی کہا ہے جبکہ اپنی کتاب "معانی القرآن" میں انہوں نے کہا: معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے (3): المتکاء سے مراد کھانا ہے اور ایک قول یہ ہے "المتکاء" سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ کھاتے، پیتے یا گفتگو کرتے ہوئے جس کے ساتھ ٹیک لگائی جائے، یہ اہل لغت کے یہاں معروف بات ہے اور اس کے حوالے سے صحیح روایات بھی ہیں۔ قتبی نے کہا کہ کہا جاتا ہے: اتکانا عند فلان یعنی أكلنا، متکاء کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 242 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 238 3۔ ایضاً

اصل موتکأ ہے اسی کی طرح ہیں مُتَّزن اور مُتَّعد، کیونکہ یہ وزنت، وعدت اور وکأت سے مشتق ہیں۔ اس کا باب اتکأ، یتکئ اتکاء آتا ہے۔ کُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا دونوں مفعول ہیں۔ کسائی اور فراء نے حکایت کیا ہے کہ سکین مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ فراء نے شعر پڑھا ہے:

فَعَيَّثَ فِي السَّنَامِ غَدَاةَ قُرٍّ بِسِكِّينٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَابِ

محل استشہاد بِسِكِّينٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَابِ ہے یہاں سکین مونث استعمال ہوتی ہے۔

جوہری نے کہا: اس میں غالب تذکیر ہے، اس نے کہا:

يرى ناصحًا فيما بَدَا فإذا خَلَا فذالك سِكِّيْنٌ على الحَلْقِ حَاذِقُ

جبکہ اس شعر میں سکین کی صفت حاذق استعمال ہوئی جس سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ مذکر ہے۔

اصمعی نے کہا: سکین میں صرف تذکیر ہی معروف ہے۔

وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ التقائے ساکنین کی وجہ سے تا مضموم ہوگا، کیونکہ جب بعد میں ضمہ ہو تو کسرہ ثقیل ہوتا ہے اور اصل میں تو تا مکسور ہوگا۔ ایک قول یہ ہے زلیخا نے ان عورتوں کو کہا: تم نے پھلوں کو کاٹنا اور کھانا نہیں یہاں تک کہ میں تمہیں بتاؤں۔ پھر اس نے اپنے خادم کو کہا: جب میں تجھے کہوں کہ میرے لیے ایلاء کو بلاؤ تو یوسف کو بلانا۔ ایل بت تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام مٹی میں کام کرتے تھے اس لیے آپ نے اپنی کمر کسی ہوئی تھی اور کلائیوں سے کپڑا لپٹا ہوا تھا تو اس نے اپنے خادم کو کہا: میرے لیے اُیل کو بلالاؤ یعنی میرے لیے رب کو بلالاؤ۔ عبرانی زبان میں ایل رب کو کہتے ہیں۔ عورتیں حیران ہوئیں اور انہوں نے کہا: وہ کیسے آئے گا؟ خادم اوپر چڑھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا۔ پس جب آپ نیچے اترے تو زلیخا نے عورتوں کو کہا: جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے کاٹو۔ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ یہاں تک کہ چھریاں ہڈیوں تک پہنچ گئیں۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: آپ ان کے سامنے تب گئے جب زلیخا نے ان کا بناؤ سنگھار کیا، تو اچانک آپ ان کے سامنے گئے تو وہ مدہوش ہو گئیں اور آپ کے چہرے کے حسن اور اس کی زیب و زینت کے سبب حیران ہو گئیں تو انہوں نے ہاتھوں کو کاٹنا شروع کر دیا اور ان کا گمان یہ تھا کہ وہ مالٹے کاٹ رہی ہیں۔ اَكْبَرْنَهٗ کے معنی میں اختلاف ہے۔ جو یبر نے ضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہوں نے آپ کو عظیم خیال کیا۔ انہیں سے یہ بھی روایت ہے کہ وحشت کی وجہ سے ان کی منی اور مذی خارج ہو گئی۔ شاعر نے کہا:

إذا ما رأين الفحلَ من فوق قارةٍ صَهَلْنَ وأكْبَرْنَ المنيَّ المدفقا

شعر میں اکبرن سے مراد وحشت و خوف کی وجہ سے منی کا خارج ہونا ہے۔

ابن سمعان نے اپنے اصحاب سے روایت کرتے ہوئے کہا: انہوں نے کہا کہ عشق کی وجہ سے ان کی مذی نکل گئی۔ وہب نے کہا: وہ آپ کے عشق میں یوں مبتلا ہوئیں کہ ان میں سے دس عورتیں دہشت، حیرت اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سبب

وجد کی وجہ سے مرگئیں۔ ایک قول یہ ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ دہشت کے سبب ان کو حیض آ گیا(1)۔ یہ قتادہ، مقاتل اور سدی کا قول ہے۔ شاعر نے کہا(2):

نأتي النساءَ على أطهارهنّ　　ولا نأتي النساءَ إذا أكبرنَ إكبارا

ہم عورتوں کے پاس ان کے طہر میں آتے ہیں اور جب انہیں حیض آ جائے تو ہم ان کے پاس نہیں آتے۔ اکبرن سے مراد حیض کا آنا لیا گیا ہے۔

ابو عبیدہ اور دیگر نے اس کا انکار کیا ہے انہوں نے کہا: کلام عرب میں یہ معنی نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ کو بہت بڑا خیال کرنے کی شدت کے سبب ان کو حیض آ گیا ہو، کیونکہ بعض اوقات عورت پر فزع وخوف کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ حمل کو گرا دیتی ہے یا اسے حیض آ جاتا ہے۔ زجاج نے کہا: اَكْبَرْنَهٗ کہا گیا ہے حضنه نہیں کہا گیا پس پتا چلا اکبار بمعنی حیض نہیں ہے۔ زہری نے جواب دیا اور کہا: ''اکبرت'' کا بمعنی حاضت ہونا ممکن ہے کیونکہ جب ابتدا میں عورت کو حیض آتا ہے تو وہ صغر سنی سے نکل کر کبر میں پہنچ جاتی ہے۔ انہوں نے کہا: اکبرنه کی ھا، ھا وقف بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ کنایہ نہ ہو گی۔ اور یہ ناکارہ بات ہے، کیونکہ ھا وقف وصل کی صورت میں گر جاتی ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ھا فعل کے مصدر سے کنایہ ہے یعنی اکبرن اکبارا بمعنی حضن حیضا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پہلے قول کے مطابق تو ھا ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہو گی یعنی أعظمن یوسف وأجللنه۔

وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ مجاہد نے کہا: قطعنها سے مراد القینها ہے(3)۔ ایک قول یہ ہے: خدشنها یعنی زخمی کر دیا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: چھری کے ساتھ زخمی کر دیا۔ نحاس نے کہا: مجاہد کی مراد یہ ہے کہ ایسا کاٹنا نہیں تھا کہ جس میں ہاتھ علیحدہ ہو گئے ہوں بلکہ یہ صرف زخم اور خراشیں تھیں اور یہ بات تو لغت میں معروف ہے کہ جب کوئی انسان اپنے دوسرے دوست کے ہاتھ کو زخمی کر دے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ عکرمہ نے کہا: اَیْدِیَهُنَّ سے مراد اکمامهن ہے(4) مگر اس معنی میں بعد ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اَیْدِیَهُنَّ سے مراد ان کی انگلیوں کے پورے ہیں، یعنی انہوں نے کٹنے اور زخم لگنے کی وجہ سے کوئی درد محسوس نہ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دل حضرت یوسف علیہ السلام میں مشغول تھے اس لیے انہوں نے کوئی درد محسوس نہ کیا۔ تقطیع کثرت کی طرف اشارہ کرتی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہاتھ کئی جگہوں سے کٹ گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کٹنے والے ہاتھوں کی تعداد ہی زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ یعنی معاذ اللہ۔ اصمعی نے نافع سے روایت کیا ہے کہ اس نے اسے اسی طرح پڑھا ہے جس طرح ابو عمرو بن العلاء نے پڑھا وَ قُلْنَ حَاشَا لِلّٰهِ یعنی الف کو ثابت رکھ کے اور یہی اصل ہے۔ اور جس نے الف کو حذف کیا ہے اس نے لله کے لام کو اس کے عوض بنا دیا ہے۔ اس میں چار لغتیں ہیں حَاشَاكَ، حَاشَا لَكَ، حَاشَ لَكَ اور حَشَا لَكَ۔ اور اسی طرح حَاشَا زَيْدٍ اور حاشا زيدًا کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن زید سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239　　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 245　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239　　4۔ ایضاً

سنا: نصب اولی ہے(1) کیونکہ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ فعل ہے جیسے ان کا قول: حاش لزید اور اس میں سے کسی حرف کو حذف بھی نہیں کیا جاتا۔ نابغہ نے کہا ہے:

وَلَا أُحَاشِي مِنَ الْأَقْوَامِ مِنْ أَحَدِ

احاشی واحد متکلم کا صیغہ ہے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حاش حرف ہے اور احاشی فعل ہے اور حاش کے بعد جر کا واقع ہونا اس کے فعل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ابوزید نے ایک اعرابی سے حکایت کی ہے: اللھم اغفرلی ولمن یسمع، حاشا الشیطان وابا الأصبغ، تو اس نے بھی نصب ہی دی ہے۔ حسن بصری نے وقلن حاش للہ سین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے حاش الالہ بھی مروی ہے، جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے "حاش اللہ" بغیر لام کے پڑھا ہے۔ اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

حاشا أبي ثَوبانَ إنَّ بهِ ضَنًّا عنِ المَلْحَاةِ والشَّتْمِ(2)

یعنی حاشا لأبی ثوبان نہیں بلکہ حاشا أبی ثوبان ہے۔

زجاج نے کہا: کلمہ کی اصل حاشیہ سے ہے اور الشا بمعنی الناحیۃ ہے۔ آپ کہتے ہیں: کنتُ فی حَشَا فلانٍ یعنی میں فلاں کے کونے میں تھا، اور آپ کا قول حاشا لزید یعنی زید اس سے جدا ہوا اور اس سے دور ہوا۔ اس صورت میں تمام مذکورین میں سے باہر نکلنے اور جدا ہونے کی استثنا ہوگی۔

ابوعلی نے کہا: یہ المحاشاۃ سے فاعل ہے یعنی حاشا یوسف وصار فی حاشیۃ وناحیۃ مما قُرِف بہ، یا اس سے مراد یہ ہے کہ یوسف بشر ہونے سے دور ہے، پس حاشا اور حاش سیبویہ کے نزدیک استثنا کی صورت میں حرف جر ہیں اور مبرد اور ابوعلی کے قول کے مطابق فعل ہیں۔

مَا هٰذَا بَشَرًا خلیل اور سیبویہ نے کہا کہ ما، لیس کی طرح ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لیس زید قائماً، اور مَا هٰذَا بَشَرًا اور مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ کوفیوں نے کہا: جب با کو حذف کیا جائے تو پھر نصب دی جاتی ہے۔ اس کی تشریح احمد بن یحییٰ نے کی کہ جب آپ ما زید بمنطلق کہتے ہیں تو با کا محل نصب ہوتا ہے، اسی طرح تمام حروف جر کی صورتحال ہے اور جب با کو حذف کیا جائے تو نصب دی جاتی ہے تاکہ یہ اپنے محل پر دلالت کرے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: یہ فراء کا قول ہے۔ اس نے کہا مَا کوئی عمل نہیں کرتا۔ بصریوں نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ انہیں یوں کہنا چاہیے: زید القمر کیونکہ اس کا معنی ہے زیدٌ کالقمر۔ احمد بن یحییٰ نے یہ کہتے ہوئے اس کی تردید کی ہے کہ با کو حروف جر میں کاف سے زیادہ داخل کیا گیا ہے، کیونکہ کاف اسم ہے۔ نحاس نے کہا: بصریوں کی بات ہی درست ہے اور اس بات میں تناقض ہے کیونکہ فراء نے ما بمنطلق زیدٌ کو جائز قرار دیا ہے اور شعر بھی پڑھا ہے۔

أَمَا واللهِ أَنْ لو كنتَ حُرًّا وما بالحُرِّ أنتَ ولا العَتيقِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 248

شعر میں ما بالحنّل محل استشہاد ہے۔

اور اس نے نصب سے منع کیا ہے، اور ہم نحویوں کے درمیان اس قول کے جواز پر کسی اختلاف کو نہیں جانتے: مافیكَ براغبٍ زیدٌ اور ما الیك بقاصدٍ عمروٌ پھر وہ با کو حذف کر دیتے ہیں اور انہیں رفع دے دیتے ہیں۔ بصریوں اور کوفیوں نے ما زیدٌ منطلقٌ رفع کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے کہ یہ لغت تمیم ہے اس پر انہوں نے شعر بطور استشہاد بیان کیا ہے:

أتَيَّا تجعلون إلىَّ نِداً وما تَيْمٌ لِذِی حَسَبٍ نَدِیدٌ

ماتیمٌ محل استشہاد ہے۔

النِّد والندیدُ والنَّدیدۃُ کا معنی ہے مثل اور نظیر۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ یہ تہامہ اور نجد کی لغت ہے۔ اور فراء کا گمان یہ ہے کہ رفع دونوں صورتوں میں سے زیادہ قوی صورت ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ غلط ہے، کتاب اللہ اور لغت رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ قوی اور اولیٰ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: مصحف حفصہ رضی اللہ عنہا میں مَا هٰذَا بِشَرٌ ہے۔ اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری ابو نصر نے کہا: عورتوں نے یہ بات ذکر کی کہ صورت یوسف، صورت بشر سے زیادہ خوبصورت ہے بلکہ یہ تو ملکی صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۞ (التین) دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہوگی ان کا قول: حَاشَ لِلّٰهِ یہ فی الحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے بہلانے کے الزام سے برأت کا اظہار ہے یعنی یوسف تو اس سے دور ہے۔ اور ان کا قول لِلّٰهِ سے مراد لخوفه یعنی براءۃ للہ من ھذا یعنی یوسف اس سے نجات پا گیا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ یہ گناہوں سے بری ہونے میں فرشتوں کی طرح ہے۔ اس صورت میں کوئی تناقض اور تضاد باقی نہیں رہتا۔

ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے بہت زیادہ جمال اور خوبصورتی کی وجہ سے صورت میں بشر کے ساتھ مشابہت سے پاکی کو بیان کرنا ہے۔ اور لِلّٰهِ کا قول اسی معنی کی تاکید ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے عورتوں نے یہ بات اس گمان پر کہی کہ ان کے نزدیک فرشتے کی صورت بشر سے زیادہ خوبصورت ہے اور ان تک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۞ (التین) نہیں پہنچا کیونکہ یہ تو ہماری کتاب میں ہے۔ بعض ضعیف الاعتقاد لوگوں کا یہ گمان ہے کہ اگر ان عورتوں کی یہ بات گمان باطل ہوتا تو اللہ تعالیٰ پر ان کی اس بات کی تردید اور ان کے جھوٹ کو واضح کرنا واجب تھا۔ اور یہ باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز بھی واجب اور لازم نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ پر یہ لازم ہے کہ جہاں بھی وہ کافروں کے کفر اور جھوٹوں کے جھوٹ کے متعلق خبر دے تو اس کے ساتھ ہی ان کا رد بھی کرے۔ اور اسی طرح اہل عرف قبیح چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ شیطان ہے اور عمدہ چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کی مثل نہیں دیکھی کیونکہ انسان فرشتوں کو نہیں دیکھتے اس کی بنیاد بھی اسی گمان پر ہے کہ فرشتوں کی صورت زیادہ خوبصورت ہے۔ یا پھر اس کی بنیاد فرشتے کے اخلاق کی طہارت اور تہمت سے اس کے دور ہونے پر ہے۔ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ یعنی یہ نہیں مگر فرشتہ۔ شاعر نے کہا:

فلستَ لِاَنسِيّ ولكن لِمَلَاْكٍ تَنَزَّلَ مِنْ جَوِّ السَّمَاءِ يَصُوبُ

تو انسان نہیں بلکہ ایسا فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترا ہے۔

حضرت حسن بصری سے روایت ہے: مَاهٰذَا بِشِرًا با اور شین کے کسرہ کے ساتھ، یعنی یہ خرید اہوا غلام نہیں اس جیسے آدمی کو بکنا نہیں چاہیے پس مصدر کو اسم مفعول کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ جس طرح فرمایا گیا اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) یعنی مصیدہ۔ اور اس کی امثلہ کثیر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو: ماھذا بثمن یعنی اس جیسے آدمی کے ثمن اور قیمت نہیں لگائی جاسکتی ہے۔ اور اس صورت میں شراء سے مراد وہ ثمن ہونگے جن کے ذریعے خرید اجاتا ہے، جس طرح کہ جب کوئی آدمی کہے ھذا بألف تو اس کی بات کو رد کرنا مقصود ہو تو اس کو کہا جائے ماھذا بألف اس اعتبار سے با اس محذوف کے متعلق ہوگی جو کہ خبر ہے گویا کلام یوں ہے: ماھذا مقدرا بشراء اور عام قُراء کی قراءت اس کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ اس کے بعد اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ آپ کی فضیلت میں مبالغہ ہے ملائکہ کی جنس میں آپ کی شان کی تعظیم کے طور پر۔ اور بِشِرَى جیسے الفاظ قرآن کریم میں یا کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ جب عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو زلیخا نے اپنے عذر (محبت) کو الفاظ میں ظاہر کیا لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ، فیہ کی ہ ضمیر سے مراد ہے فی حبہ اور ذالک بمعنی ھذا ہے یہ طبری کا مختار موقف ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ''ہ'' ضمیر محبت کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا۔ ذالکن الحب الذی لمتننی فیہ یعنی حُبُّ هٰذَا هُوَ ذَالِكَ الْحُبُّ اور ''اللوم'' سے مراد قباحت و برائی کے ساتھ کسی کی صفت بیان کرنا ہے۔ پھر زلیخا نے اقرار کرتے ہوئے کہا: وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ، فَاسْتَعْصَمَ کا معنی ہے وہ رک گیا اور عصمت کو اسی لیے عصمت کہا جاتا ہے کہ یہ معصیت اور نافرمانی کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''اِسْتَعْصَمَ'' کا معنی اِسْتَعْصٰی ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ زلیخا نے دوبارہ ان عورتوں کی موجودگی میں آپ کو گناہ کی ترغیب دلائی اور حیاء کی چادر اتار پھینکی اور گناہ نہ کرنے کی صورت میں آپ کو قید کی دھمکی دی اور اس نے یہ کاروائی اس وقت کی جب اسے نہ ملامت کا ڈر تھا اور نہ ہی گفتگو کا خوف بخلاف پہلی دفعہ کے۔ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ یعنی ذلیل ورسوا۔ مصحف میں وَلَيَكُوْنًا کو الف کے ساتھ لکھا گیا اور تاکید کے لیے نون مخففہ کے ساتھ پڑھا گیا اور نون تاکید ثقیلہ بھی ہوتا ہے اور خفیفہ بھی اور لَيُسْجَنَنَّ پر نون کے ساتھ وقف کیا گیا کیونکہ یہ مثقلہ ہے اور لَيَكُوْنًا پر الف کے ساتھ وقف کیا گیا اس کے مخففہ ہونے کی وجہ سے اور یہ رایتُ رجلاً و زیداً و عمراً کی طرح نون اعراب کے مشابہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ (العلق) اس کے مشابہ ہے۔ جس طرح کہ اعشی کا قول ہے:

ولا تَعْبُدِ الشيطانَ واللهَ فاعبدا

یعنی تو شیطان کی عبادت نہ کر اور اللہ کی عبادت کر۔ اس کی مراد یہاں ''فاعبدا'' ہے تو جب اس نے اس پر وقف کیا تو الف کے ساتھ کیا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

''یوسف نے عرض کی: اے میرے پروردگار! قید خانہ (کی صعوبتیں) مجھے زیادہ پسند ہیں اس (گناہ) سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو (اپنی عنایت سے) نہ دور کرے مجھ سے ان کے مکر کو تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور بن جاؤں گا نادانوں سے۔ پس قبول فرمالی اس کی دعا اس کے رب نے اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکر وفریب کو، بے شک وہ (اپنے بندوں کی فریادیں) سننے والا اور (ان کے حالات) خوب جاننے والا ہے''۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ، السِّجْنُ اصل میں دخول السجن ہے مضاف کو حذف کر دیا گیا یہ قول زجاج اور نحاس کا ہے۔ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی یہ میرے لیے معصیت و نافرمانی میں مبتلا ہونے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جیل میں داخل ہونا کوئی پسندیدہ اور محبوب بات ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: اے یوسف! السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ کہہ کے تو نے اپنے آپ کو قید کر لیا، اگر آپ ۔۔۔ کہ عافیت میرے نزدیک پسندیدہ ہے تو میں آپ کو عافیت دے دیتا۔ ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے السَّجْنُ کو سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ ابن ابی اسحاق، عبدالرحمٰن، اعرج اور یعقوب کی قرآت ہے اور، سجنہ سجنًا کا مصدر ہے۔ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ، كَیْدَهُنَّ سے مراد عورتوں کا مکر ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان عورتوں کا مکر ہے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا، کیونکہ انہوں نے آپ کو عزیز مصر کی بیوی کی بات مان لینے کو کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ یہ مظلوم ہے اور آپ نے اس پر ظلم کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے عزیز کی بیوی کے بارے میں نصیحت کرنے کے لیے خلوت کا مطالبہ کیا اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ زلیخا کے حق میں وہ آپ کو علیحدہ کریں اور اس کی مدد و تعاون کرنے کی بات کریں کہ شاید آپ مان جائیں، تو ہر ایک نے خلوت حاصل کر لی اور ہر ایک نے آپ کو کہا: اے یوسف! میری ضرورت کو پورا کرو میں تمہارے لیے تمہاری مالکہ کی نسبت بہتر ہوں تو ہر ایک نے آپ کو اپنی طرف دعوت دی اور آپ کو بہلایا پھسلایا، تو آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! وہ ایک تھی اب پوری جماعت ہو گئی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عزیز کی بیوی کا مکر ہے جو اس نے آپ کو گناہ کی دعوت دی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے کیدھا کہنے کے بجائے جمع کی ضمیر یا تو اس کے بڑے پن کی وجہ سے استعمال کی یا پھر تصریح سے تعریض کی طرف خروج کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا، اور کید سے مراد دھوکے بازی کی کوشش ہے، اسی وجہ سے عرب جنگ کو کید کہتے ہیں کیونکہ اس میں لوگوں کا مکر وفریب اور دھوکہ بازی کا عمل ہوتا ہے۔ عمرو بن لحار نے کہا:

تَرَاتْ کَیْ تکیدَكَ اُمُّ بِشْرٍ وکیدٌ بِالتَّبَرُّجِ مَا تکیدُ

اَصْبُ اِلَیْهِنَّ جواب شرط ہے یعنی میں ان کی طرف مائل ہو گیا ہوتا۔ یہ صَبَا یَصْبُو، صُبُوًّا و صَبوۃً سے ہے یہ اس وقت

بولا جاتا ہے جب کوئی مائل ہو جائے اور اس میں اشتیاق پیدا ہو جائے۔

شاعر نے کہا:

إِلَى هِنْدٍ صَبَا قَلْبِي وَهِنْدٌ مِثْلُهَا يُصْبِي(1)

ہند کی طرف میرا دل مائل ہوا اور ھند جیسی عورت کی طرف مائل ہوا جاتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو گناہ سے بچنے کے سلسلہ میں مجھ پر مہربانی نہ فرماتا تو میں اس میں واقع ہو جاتا۔ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ اس سے مراد یہ ہے کہ میں ان جاہلین میں سے ہو جاتا جو گناہ کا ارتکاب کر کے مذمت کے مستحق بن جاتے ہیں یا اس سے مراد یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاتا جو جاہلوں جیسے کام کرتے ہیں۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر اس کی نافرمانی سے نہیں بچ سکتا اور یہ جہالت کی قباحت اور جاہل کی مذمت پر بھی دلیل ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! مجھ سے ان کے مکر کو دور کر، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا اور آپ پر مہربانی فرماتے ہوئے آپ کو زنا میں واقع ہونے سے بچا لیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو دور فرما دیا۔ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ، كَيْدَهُنَّ کو جمع ذکر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے مل کر آپ کو بہلایا تھا یا اس سے مراد عورتوں کا مکر ہے یا پھر عزیز مصر کی بیوی کا مکر ہے جس طرح کہ سابق آیت میں گزر چکا ہے۔ اس کو عموم پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ ﴿۳۵﴾

''پھر مناسب معلوم ہوا انہیں اس کے باوجود کہ وہ (یوسف کی پاکبازی کی) نشانیاں دیکھ چکے تھے کہ وہ اسے قید کر دیں کچھ عرصہ تک''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ یعنی عزیز اور اس کے مشیروں کے لیے ظاہر ہوا مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ اس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کی علامات اور نشانیاں ہیں، جس طرح کہ قمیص کا پیچھے سے پھٹنا، گواہ کی گواہی، ہاتھوں کا کٹنا، حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات سے ان عورتوں کا قلت صبر وغیرہ۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ آپ کو قید کر دیں تاکہ وہ اس قصہ کو عام لوگوں میں مشہور ہونے سے چھپا سکیں اور قید کو حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے درمیان حائل کر سکیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آیات سے مراد وہ برکات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ان میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے ان پر ظاہر ہوئیں لیکن پہلی توجیہہ زیادہ صحیح ہے۔

مقاتل نے مجاہد عن حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ارشاد: ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ کے بارے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 252

کہا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قمیص، گواہ کی گواہی، ہاتھوں کا کٹنا اور ان عورتوں کا آپ کو بہت بڑا سمجھنا یہ سب نشانیوں میں سے ہے۔ آپ کو قید کرنے کی مختلف وجوہات تھیں۔ ایک قول کے مطابق لوگوں میں رسوائی سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا اور زلیخا کو شرمندگی اور مایوسی کے خوف نے اسے پردے میں رکھنے پر راضی ہونے پر مجبور کر دیا یہ حیلہ اس نے اس لیے کیا تھا تا کہ جب اسے اس کے دیدار سے روک دیا جائے تو (اس کی خبروں سے اپنے بے تاب دل کو) تسلی و تشفی دے گی۔ شاعر نے کہا:

وما صَبابةُ مشتاقٍ على أملٍ من اللِّقاء كمشتاقٍ بلا أَمَلِ

ملاقات کی امید پر مشتاق کی سوزش عشق اس طرح نہیں جس طرح بغیر امید کے مشتاق کی محبت ہوتی ہے۔

یا پھر اس کو یہ توقع تھی کہ قید ان کو میری اطاعت پر مجبور کر دے گی اور یہ اس بات پر راضی ہو جائیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ لَیَسْجُنُنَّهٗ ارشاد گرامی میں یَسْجُنُنَّهٗ فاعل کی جگہ میں ہے، ای ظهرلهم ان یسجنوہ یعنی ان کے سامنے یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ آپ کو قید میں ڈال دیں، یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مبرد نے کہا: یہ غلط ہے۔ فاعل پورا جملہ نہیں ہوتا البتہ فاعل وہ ہے جس پر بَدَا دلالت کر رہا ہے اور وہ ہے مصدر؛ یعنی بَدَالَهُمْ بَدَاءٌ تو فاعل کو اس وجہ سے حذف کر دیا گیا کہ فعل اس پر دلالت کر رہا ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

وحقَّ لمن أبوموسیٰ أبوهُ يُوَفِّقه الذی نصب الجبالا

یہاں وحقَّ الحقُّ تھا تو الحقُّ فاعل کو حذف کر دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: ثم بَدَالَهُمْ رَأْیٌ لَمْ یَکُوْنُوْا یَعْرِفُوْنَهٗ اس کو حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام میں اس پر دلالت موجود ہے اسی طرح قول کو بھی حذف کر دیا گیا یعنی اصل میں تھا قالوا لَیَسْجُنُنَّهٗ لام مفتوح یمین مضمر کے جواب میں ہے یہ فراء کا قول ہے۔ اور یہ فعل مذکر ہے مونث نہیں کیونکہ اگر مونث ہوتا تو یَسْجُنَانِّه ہوتا۔ اس پر لَهُمْ کا قول دلیل ہے لَهُنَّ ارشاد نہیں ہوا، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور ان کے معاونین کی طرف سے خبر دی اور مذکر کو غلبہ دے دیا یہ ابو علی کا قول ہے۔

سدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا سبب یہ تھا کہ عزیز کی بیوی کو یہ شک ہوا کہ آپ نے اس کی تشہیر کی اور اس کی اس خبر کو پھیلا دیا ہے اس صورت میں لَهُمْ کی ضمیر بادشاہ کے لیے ہوگی۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰی حِیْنٍ یعنی نامعلوم مدت تک۔ یہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شہر میں پھیلی ہوئی خبر کے ختم ہونے تک، سعید بن جبیر نے کہا: چھ ماہ تک۔ الکیا نے بیان کیا کہ اس نے تیرہ ماہ مراد لیے ہیں۔ عکرمہ نے 9 سال کی مدت بیان کی ہے۔ کلبی نے پانچ سال اور مقاتل نے سات سال بیان کی ہے۔ البقرہ میں حین اور اس پر مرتب ہونے والے احکام گزر چکے ہیں۔ وہب نے کہا: آپ بارہ سال قید میں رہے۔ اور حَتّٰی بمعنی اِلٰی ہے جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (القدر) اللہ تعالیٰ نے قید کو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اس عورت کا ارادہ کرنے کی خطا سے طہارت کا سبب بنا دیا اور عزیز مصر اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جرات کو

جان چکا تھا اس کے باوجود آپ کو قید کرنے میں گویا اپنی بیوی کی اطاعت کر رہا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام سے تین مرتبہ فروگزاشت ہوئی ہے: جب آپ نے زلیخا کا ارادہ کیا تو قید میں ڈالے گئے، جب آپ نے نوجوانوں کو اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ کہا تو کئی سال جیل میں ٹھہرے رہے اور جب بھائیوں کو اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ۝ (یوسف) کہا تھا تو انہوں نے کہا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (یوسف: 77) (تم چور ہو تو انہوں نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی نے اس سے قبل چوری کی تھی)

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ پر قید کے ذریعے مجبور کیا گیا اور پانچ سال تک آپ قید خانہ میں رہے اور اپنے مقام و مرتبہ کی عظمت کی وجہ سے اس کو ترجیح دی، اور اگر کسی آدمی کو قید کے ذریعے زنا پر مجبور کیا جائے تو بالاجماع اس کے لیے جائز نہیں۔ اور اگر مارنے کے ذریعے مجبور کیا جائے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ مشکل ہو تو اس سے زنا کا گناہ اور حد ساقط ہو جائے گی۔ ہمارے (مالکیہ) بعض علماء نے کہا: یہ بات اس سے حد کو ساقط نہ کرے گی لیکن یہ ضعیف قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر دو عذاب جمع نہیں کرتا اور نہ ہی دو مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے کیونکہ یہ تو دین میں بہت بڑا حرج ہے جبکہ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور اس نے دین میں تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں بنائی۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۃ ''النحل'' میں آئے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا اور مکر و فریب سے اس کی پناہ مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ۝ قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ۝

''اور داخل ہوئے آپ کے ساتھ ہی قید خانہ میں دو نوجوان ان میں سے ایک نے (آکر) کہا کہ میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اٹھائے ہوئے ہوں اپنے سر پر کچھ روٹیاں، پرندے کھا رہے ہیں اس سے، آپ بتائیے ہمیں اس کی تعبیر، بے شک ہم دیکھ رہے ہیں آپ کو نیکوکاروں سے۔ آپ نے فرمایا: نہیں آئے گا تمہارے پاس کھانا جو تمہیں کھلایا جاتا ہے مگر میں تمہیں بتادوں گا اس کی تعبیر اس سے پیشتر کہ کھانا تمہارے پاس آئے، یہ ان

علموں میں سے ہے جو سکھایا ہے مجھے میرے رب نے، میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ تعالیٰ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، اور میں تو پیرو بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لیے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو، یہ (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ اس احسان پر شکر ہی بجا نہیں لاتے''۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ۔ فَتَيٰنِ، فتی کا تثنیہ ہے؛ اور یہ یائی ہے اور عربوں کا قول: الفُتُوُّ شاذ ہے۔ وہب اور دیگر لوگوں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کر کے قید خانے کی طرف گدھے پر سوار کر کے لایا گیا اور کہا گیا: هٰذَا جَزَاءُ مَنْ يَعْصِ سَيِّدَتَهٗ یہ سزا ہے اس کی جس نے اپنی مالکن کی نافرمانی کی، جبکہ آپ فرما رہے تھے: یہ آگ کے لباس، تارکول کی قمیص، پیپ کے پینے اور زقوم کھانے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ پہنچے تو آپ نے اس میں کچھ ایسے لوگ پائے جن کی امیدیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی آزمائش و ابتلا انتہائی سخت ہو چکی تھی تو آپ نے ان سے فرمایا: صبر کرو اور خوش رہو تمہیں اس پر اجر ملے گا تو انہوں نے آپ کو کہا: اے نوجوان: تیری گفتگو کتنی خوبصورت ہے، ہمیں تیرے پڑوس کی وجہ سے برکتیں نصیب ہوئیں اے نوجوان! تو کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں یوسف بن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ اسحق بن خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب عورت نے اپنے شوہر کو کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے رسوا کیا، میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے قید کر دیں تو اس نے آپ کو قید خانے میں قید کر دیا تو آپ اس میں پریشان حال کو دلاسہ دیتے، بیمار کی عیادت کرتے، زخمی کا علاج کرتے، ساری رات عبادت کرتے اور روتے یہاں تک کہ آپ کے ساتھ گھروں کی دیواریں، ان کی چھتیں اور دروازے بھی روتے، آپ کے سبب قید خانے کو پاکیزگی حاصل ہوئی اور قیدی آپ سے مانوس ہوئے؛ یہ صورتحال ہو گئی کہ جب کوئی آدمی قید خانے سے نکلتا تو وہ واپس لوٹ آتا اور قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بیٹھتا، قید خانے کے انچارج نے آپ کے ساتھ محبت کرتے ہوئے اسے آپ کے لیے وسیع کر دیا، پھر آپ کو کہا: اے یوسف! میں آپ کے ساتھ اتنی محبت کرتا ہوں جتنی کسی اور چیز کے ساتھ نہیں کرتا، تو آپ نے فرمایا: میں تیری محبت سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس نے کہا: ایسا کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرے باپ نے میرے ساتھ محبت کی تو میرے بھائیوں نے میرے ساتھ کیا جو کچھ کیا، میری مالکن نے میرے ساتھ محبت کی تو میرے اوپر وہ مصیبت نازل ہوئی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔

آپ قید میں تھے کہ بادشاہ اپنے نانبائی اور اپنے ساقی پر ناراض ہو گیا، سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے لوگوں کے درمیان لمبا عرصہ گزارا تو وہ اس سے تنگ ہو گئے تو انہوں نے خباز اور ساقی کے ذریعے سازش کی وہ دونوں کھانے اور شراب میں زہر ملا دیں، خباز نے ان کی بات مان لی اور ساقی نے انکار کر دیا، ساقی بادشاہ کے پاس گیا اور اسے اس بات کی خبر دی تو بادشاہ نے ان دونوں کو قید کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ تو یہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام سے مانوس ہو گئے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ایک قول یہ ہے کہ خباز نے کھانے میں زہر ملا دی، جب کھانا پیش کیا گیا تو ساقی نے

کہا: اے بادشاہ! نہ کھائیے کھانا زہر آلود ہے۔ خباز نے کہا: اے بادشاہ نہ پیجئے! شراب زہر آلود ہے۔ تو بادشاہ نے ساقی کو کہا: پیو! تو اس نے شراب پی لی اور شراب نے اسے کوئی نقصان نہ دیا، بادشاہ نے خباز کو کہا: تم کھاؤ؛ تو اس نے انکار کر دیا، کھانا ایک جانور کو کھلایا گیا تو وہ اسی جگہ مر گیا، تو بادشاہ نے ان دونوں کو ایک سال کے لیے قید کر دیا، اور وہ دونوں اس مدت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں رہے ساقی کا نام منجا اور دوسرے کا مجلث ہے، یہ ثعلبی نے کعب سے بیان کیا ہے۔ نقاش نے کہا: ایک کا نام شرہم تھا اور دوسرے کا سرہم؛ طبری نے کہا: جس نے (خواب میں) دیکھا تھا کہ وہ شراب نچوڑتا ہے وہ نبو تھا، سہیل نے کہا: دوسرے کا نام بھی ذکر کیا گیا ہے اور میں نے اس کو محفوظ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فَتَیٰنِ فرمایا، کیونکہ وہ دونوں غلام تھے اور غلام کو فتی کہتے ہیں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا؛ اس بات کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے کہا: شاید ان کے عرف میں غلام کا نام فتی تھا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فتی خادم کا نام ہو اگرچہ وہ مملوک نہ ہو۔

ممکن ہے کہ بادشاہ نے ان دونوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید کیا ہو ایسا بھی ممکن ہے کہ آپ کے بعد ان کو قید کیا ہو یا آپ سے پہلے ان کو قید کیا گیا ہو البتہ جس کمرے میں آپ تھے اس میں وہ آپ کے ساتھ داخل ہوئے۔ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا اس سے مراد انگور کو نچوڑنا ہے حضرت یوسف علیہ السلام قیدیوں کو فرماتے تھے کہ میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ دونو جوانوں میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: آؤ ہم اس عبرانی غلام کا تجربہ کریں؛ تو انہوں نے کسی چیز کو دیکھے بغیر آپ سے سوال کیا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں نے آپ سے آپ کے علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ تو انہوں نے اپنے خوابوں کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: ان کے سچے خواب تھے جو انہوں نے دیکھے اور ان کے متعلق آپ سے پوچھا؛ اسی وجہ سے ان کی تعبیر بھی صحیح اور سچی تھی۔ صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی: ''تم میں سے جو از روئے خواب کے جتنا سچا ہوگا اتنا ہی وہ از روئے کلام کے سچا ہوگا۔'' ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے خواب جھوٹے تھے اور انہوں نے صرف تجربہ کرنے کے لیے آپ سے ان کے متعلق پوچھا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: ان دونوں میں سے جس کو پھانسی دی گئی وہ جھوٹا تھا اور دوسرا سچا، یہ ابومجلز کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث روایت کی: ''جس نے جھوٹا خواب بیان کیا قیامت کے دن اس کو دو جو باندھنے کا مکلف بنایا جائے گا اور وہ ان دونوں کو نہیں باندھ سکے گا'' (2)۔ ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی آپ نے فرمایا: ''جس نے اپنے خواب کے بارے میں جھوٹ بولا اسے قیامت کے دن جو کو باندھنے کا مکلف بنایا جائے گا'' (3)۔ (ابوعیسیٰ نے) کہا: حدیث حسن۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب ان دونوں نے اپنے خواب دیکھے تو وہ پریشان ہو گئے؛ حضرت یوسف علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الوصایا، جلد 2، صفحہ 241

2۔ جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، ما جاء فی الذی یکذب حلمہ، جلد 2، صفحہ 52، ایضاً، حدیث نمبر 2208، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ ایضاً

السلام نے انہیں فرمایا: میں تمہیں پریشان کیوں دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ہمارے سردار! ہم نے خواب میں ناپسندیدہ بات دیکھی ہے؛ آپ نے فرمایا: مجھے بتاؤ، تو انہوں نے آپ کو وہ بات بتائی اور کہا: ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتائیے؛ یہ بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان کے خواب تھے۔ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ آپ کا احسان یہ تھا کہ آپ مریض کی عیادت کرتے اور اسے دوا دیتے تھے، پریشان وغمزدہ کو دلاسہ دیتے، جب اس کو ضرورت ہوتی تو اس کی خدمت کرتے اور اس کے لیے (لوگوں کو) کہتے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ سے مراد العالمین الذین أحسنوا العلم یہ فراء کا قول ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ لَنَا اِنْ فَسَّرْتَهٗ کہ اگر آپ اس کی وضاحت کر دیں تو آپ ہمارے محسنین میں سے ہوں گے۔ جس طرح کوئی آدمی کہتا ہے: ایسا کرو تو تم احسان کرنے والے ہو گے۔ آپ نے فرمایا: تم نے کیا دیکھا ہے؟ خباز نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں نے تین تنوروں میں روٹیاں پکائیں انہیں تین ڈبوں میں رکھ دیا، اور ان کو اپنے سر پر رکھ لیا تو ایک پرندہ آیا اور اس میں سے کھا گیا۔ دوسرے نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں نے سفید انگور کے تین گچھے لیے انہیں تین برتنوں میں نچوڑا، پھر اپنی پہلی عادت کے مطابق وہ میں نے بادشاہ کو پلا دیا، یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا یعنی انگور لغت عمان کے مطابق (انگور کو خمر کہتے ہیں)(1)۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اسے اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا پڑھا ہے۔ اصمعی نے کہا: مجھے معتمر بن سلیمان نے بتایا ہے کہ وہ ایک اعرابی کو ملے اس کے پاس انگور تھے تو انہوں نے اسے کہا: تیرے پاس کیا ہے؟ تو اس نے کہا: ''خمر'' ایک قول یہ ہے: اَعْصِرُ خَمْرًا کا معنی ہے ''عنب خمر'' تو مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ اور خمرۃ، خمر اور خمور کہا جاتا ہے جس طرح کھجور کے بارے میں تمرۃ، تمر اور تمور کہا جاتا ہے۔ قَالَ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو فرمایا: لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ یعنی کل تمہارے گھر سے تمہارے لیے کھانا نہیں لایا جائے گا۔ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ مگر میں تمہیں اس کی تاویل بتا دوں گا تا کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میں تمہارے خوابوں کی تعبیر جانتا ہوں، تو انہوں نے کہا: بیان کرو! آپ نے انہیں فرمایا: تمہارے پاس ایسا ایسا کھانا لایا جائے گا۔ تو کھانا اسی طرح کا تھا جس طرح آپ نے فرمایا؛ یہ علم غیب تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ اور آپ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس علم کے ساتھ اس لیے خاص فرمایا کہ آپ نے ایک ایسی قوم کی ملت کو چھوڑا تھا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتی تھی یعنی بادشاہ کے دین کو۔ میرے (قرطبی) کے نزدیک اس کلام کا معنی ہے: تمہارے خوابوں کی تعبیر کا علم، تمہارے پاس لائے جانے والے کھانے کا علم اور اللہ کے دین کا علم، پس سب سے پہلے وہ سنو جو دین کے ساتھ تعلق رکھتا ہے تا کہ تم ہدایت پا جاؤ اسی وجہ سے آپ نے ان کو تعبیر نہ بتائی بلکہ پہلے اسلام کی طرف دعوت دی، اور فرمایا: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ ایک قول یہ ہے: آپ کو علم تھا کہ ان میں سے ایک کو قتل کر دیا جائے گا تو آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی، تا کہ وہ یہ سعادت حاصل کر لیں۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں تعبیر بتانے کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو پتہ چل گیا تھا کہ ایک کے لیے یہ تعبیر ناپسندیدہ ہے لہٰذا آپ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 257

نے ان کے سوال سے اعراض برتا اور دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کردی اور فرمایا: لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ یعنی نیند کی حالت میں اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا مگر میں تمہیں اس کی تفسیر بیداری کی حالت میں بتادوں گا، یہ سدی کا قول ہے۔ انہوں نے آپ کو کہا: یہ تو کاہنوں اور قیافہ شناسوں کا عمل ہے تو آپ نے انہیں فرمایا: میں کاہن نہیں ہوں، یہ تو ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے میں تمہیں کہانت اور ستاروں کے ذریعے ان کی خبر نہیں دوں گا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے ہوگا۔ ابن جریج نے کہا: بادشاہ جب کسی آدمی کو قتل کرنا چاہتا تو اس کے لیے کھانا تیار کراتا اور اس کی طرف بھیجتا تھا (1)۔ تو معنی یہ ہوگا: تمہارے پاس حالت بیداری میں کھانا نہیں لایا جائے گا تو اس اعتبار سے تُرْزَقٰنِهٖۤ کا معنی ہوگا بادشاہ یا اس کے علاوہ کسی اور کی طرف سے تمہارے پاس آئے گا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جو تمہیں اللہ تعالیٰ رزق دے گا۔ حضرت حسن نے کہا: آپ انہیں غیب چیز کی خبر دے رہے تھے، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے ان دونوں کو اس طریقے سے اسلام کی دعوت دی اور آپ نے اس کو ایسا معجزہ بنادیا جس کے ذریعے انہوں نے غیب کے ذریعے خبر کی طرف راہنمائی حاصل کی۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ کیونکہ یہ انبیاء برحق تھے مَا كَانَ یعنی نہیں چاہیے کہ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ''مِن'' تاکید کے لیے ہے۔ جس طرح تیرا قول: مَا جَآءَنِیْ مِنْ اَحَدٍ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا یہ آپ کے زنا سے بچنے کی طرف اشارہ ہے وَ عَلَى النَّاسِ یعنی ان مومنین پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرک سے بچایا ہے۔ ایک قول یہ ہے: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا کہ اس نے ہمیں انبیاء بنایا، وَ عَلَى النَّاسِ کہ ہم کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور ایمان پر (اکثر لوگ شکر نہیں کرتے)۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اے قید خانہ کے میرے دو رفیقو! (یہ بتاؤ) کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ تم نہیں پوجتے اس کے علاوہ مگر چند ناموں کو جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے نہیں اتاری اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے حکم (کا اختیار کسی کو) سوائے اللہ تعالیٰ کے اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو بجز اس کے یہی دین قیم ہے لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ یعنی اے قید خانے کے ■ باسیو۔ آپ نے صحبت کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ اس میں لمبی دیر مقیم رہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 259

جس طرح کہ اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار کہا جاتا ہے۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ یعنی بچپن، بڑھاپے اور جوانی میں، یا اس سے مراد تعداد میں متفرق ہونا ہوگا۔ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ایک قول کے مطابق خطاب ان دونوں جوانوں اور دیگر قیدیوں کے لیے ہے اور ان کے سامنے ایسے بت تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے تو آپ نے حجت کو لازم کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا یعنی کئی معبود کوئی نفع و نقصان نہیں دے سکتے خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ جس نے ہر چیز پر غلبہ پایا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ (النمل) ایک قول یہ ہے: تفرق کے ذریعے آپ نے اس جانب اشارہ فرمایا کہ اگر معبود متعدد ہو جائیں تو وہ ارادہ میں مختلف ہو جائیں گے اور بعض بعض سے بلند ہو جائیں گے اور آپ نے واضح کر دیا کہ جب ان میں تفرق ہوگا تو وہ معبود نہیں ہوں گے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً آپ نے بتوں کے عجز اور کمزوری کو بیان کیا ارشاد فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی تم عبادت نہیں کرتے مگر ایسے اسماء والوں کی عبادت کرتے ہو جن کا کوئی معنی نہیں۔ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ یعنی جو نام تم نے اپنی طرف سے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اسماء سے مراد مسمیات ہیں یعنی تم ایسے بتوں کی عبادت کرتے ہو جن کے لیے سوائے معبودیت کے نام کے اور کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ وہ جمادات ہیں۔ فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا حالانکہ آغاز میں خطاب صرف دو کو تھا کیونکہ آپ نے ان تمام لوگوں (کو سمجھانے کا) قصد کیا جو شرک کے حوالے ان دونوں جیسے تھے۔

اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مفعول ثانی کو دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا ہے معنی ہوگا: سَمَّیْتُمُوْهَا اٰلِهَةً مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ، مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ، اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل نہیں فرمایا۔ سعید بن جبیر نے کہا: مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی حجت میں سے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ جو سب کا خالق ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ قیم بمعنی القویم ہے وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ﴿۴۱﴾

"اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! (اب خوابوں کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک (یعنی پہلا) تو پلایا کرے گا اپنے مالک کو شراب لیکن دوسرا سولی دیا جائے گا اور (نوچ) کھائیں گے پرندے اس کے سر سے، (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی کو کہا: تو تین دن کے بعد بادشاہ کو شراب پلانے والی سابقہ ڈیوٹی پر واپس چلا جائے گا اور دوسرے سے کہا: تجھے تین دن تک بلایا جائے گا اور سولی چڑھا دیا جائے گا پرندے تیرے سر سے (نوچ) کھائیں گے، اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے کوئی

(خواب) نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: تو نے دیکھا ہے یا نہیں قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (اٹل) فیصلہ ہو چکا ہے اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔ اہل زبان نے بیان کیا ہے کہ سقی اور اسقی دونوں لغتیں ہیں معنی دونوں کا ایک ہے، جس طرح کہ شاعر نے کہا:

سَقَى قومي بَنِي مَجْدٍ وأَسْقَى نُمَيْرًا والقبائلَ من هِلالِ

اس شعر میں سقی اور أسقی ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی میری قوم نے بنی مجد، نمیر اور ہلال کے قبائل کو پلایا۔

نحاس نے کہا: جس بات پر اکثر اہل زبان کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ سقا کا معنی یہ ہے کہ اس نے اس کو پکڑا اور پی لیا یا اس نے اپنے حلق میں پانی انڈیلا اور أسقا کا معنی ہے اس نے اسے پلایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا (المرسلات: 27) یعنی ہم نے تمہیں پلایا ماء فرات۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے (مالکی) علماء نے کہا: اگر یہ کہا جائے کہ جس نے اپنے خواب میں جھوٹ بولا اور تعبیر کرنے والے نے اس کی تفسیر بیان کر دی تو آیا اس کا حکم اسے لازم ہو جائے گا؟ ہم نے کہا: اسے یہ لازم نہ ہوگا۔ البتہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ہے کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی کی تعبیر فیصلہ ہوتا ہے آپ نے ارشاد فرمادیا کہ یہ معاملہ یوں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے معاملہ اسی طرح کر دیا جس طرح آپ نے خبر دی اور یہ آپ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے: عبد الرزاق عن معمر عن قتادہ روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس نے کہا: میں نے دیکھا کہ گویا میں ہرے بھرے مقام پر پہنچا ہوں پھر خشک جگہ پر پہنچا ہوں پھر شاداب مقام پر پہنچا ہوں پھر خشک مقام پر پہنچا ہوں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو ایک ایسا آدمی ہے کہ تو ایمان لائے گا پھر کفر اختیار کرے گا پھر ایمان لائے گا اور پھر کفر اختیار کرے گا، پھر تو کفر کی حالت میں مرے گا، تو آدمی نے کہا: میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تیرے لیے فیصلہ ہو چکا ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے (قیدی) ساتھی کے لیے ہو گیا تھا، تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ معاملہ کسی اور کے لیے نہیں کیونکہ آپ کی زبان پر حق جاری تھا اور آپ کی کیفیت یہ تھی کہ جب آپ گمان کرتے وہ گمان ہوتا تھا اور جب آپ کلام فرمادیتے تو واقع ہو جاتا تھا جس طرح کہ روایات میں ہے اور ایسی روایات کثیر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا تو آپ نے اسے فرمایا: میں آپ کو کاہن گمان کرتا ہوں تو وہ ویسا ہی تھا جیسا آپ نے گمان کیا؛ اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت ہے کہ آپ نے ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا تو اس نے آپ کو کہا کہ اس کے دوزخ کے سارے نام ہیں، تو آپ نے اسے فرمایا: تو نے اپنے اہل کو پالیا اور وہ سارے جل چکے ہیں تو وہ اسی طرح تھا جس طرح آپ نے ارشاد فرمایا، یہ روایت صاحب مؤطا نے بیان کی ہے اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ "الحجر" میں آئے گی۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

''اور کہا (یوسف علیہ السلام) نے اسے جس کے بارے میں آپ کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا ان دونوں سے کہ میرا تذکرہ کرنا اپنے آقا کے پاس لیکن فراموش کرا دیا اسے شیطان نے کہ وہ ذکر کرے اپنے بادشاہ کے پاس، پس آپ ٹھہرے رہے قید خانہ میں کئی سال''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں ظَنَّ بمعنی أَیقن ہے اور قتادہ نے ظَنَّ کی تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے جو یقین کے برعکس ہوتی ہے، انہوں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی نجات کا گمان کیا کیونکہ تعبیر کرنے والا گمان ہی کرتا ہے اور تیرا رب جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے؛ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح اور انبیاء کے حال کے زیادہ مشابہ ہے اور (اس وجہ سے بھی کہ) آپ نے جو دو جوانوں کو خواب کی تعبیر بتائی وہ وحی تھی اور لوگوں کے حق میں یہ گمان ہوتا ہے جہاں تک انبیاء کی بات کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس کا حکم حق اور سچ ہے خواہ وہ جس طرح بھی ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ یعنی اپنے آقا کے پاس اور لغت میں آقا کو رب کہنا معروف ہے اعشی نے کہا:

رَبِّی کَرِیْمٌ لا یُکَدِّرُ نِعْمَةً　　وَاِذَا تُنُوشِدَ فِی الْمَهَارِقِ أَنْشَدَا

ربی کریم سے مراد ہے کہ میرا آقا کریم ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ جو کچھ تو نے دیکھا اور خواب کی تعبیر کے حوالے سے میری جو صورتحال ہے بادشاہ کے سامنے اس کا ذکر کرنا اور اس کو یہ کہنا کہ میں مظلوم ہوں اور بغیر جرم کے قید ہوں۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو پلا (1)، اپنے رب کو کھلا، اپنے رب کو وضو کروا بلکہ اسے ربی کے بجائے سیدی، مولائی کہنا چاہیے''۔ اور قرآن کریم میں اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ، الی ربك اور اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ سے مراد ''صاحبی'' میرا صاحب یعنی عزیز مصر ہے۔ اور ہر وہ آدمی جو کسی چیز کی اصلاح و اتمام کرتا ہے اسے رَبَّهٗ یَرُبُّهٗ، فهو رَبٌّ له کہا جاتا ہے۔ علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی (جس میں رب کہنے کے بجائے سیدی، مولائی کہنے کی ترغیب ہے) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ فقط نصیحت کے طور پر ہے نہ کہ اس وجہ سے ہے کہ اس نام کا اطلاق حرام ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّهَا یعنی لونڈی اپنے مالک اور آقا کو جنے گی۔ آپ کا ارشاد آدمی پر ''رب'' کے لفظ کے اطلاق کے حوالے سے قرآن کے مطابق ہے تو اس سلسلہ میں نہی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان اسماء کے اطلاق کو اپنی عادت نہ بنالیں بلکہ ان کو ترک کرنا زیادہ عمدہ اور اولیٰ ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ آدمی کا عبدی اور أمتی کہنا دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ایک معنی یہ ہے کہ عبودیت فی الحقیقت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، حکم الطلاق لفظة، جلد 2، صفحہ 238

صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے؛ تو کسی کا لوگوں میں سے اپنے مملوک کو عبدی اور أمتی کہنا اور اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف ان الفاظ کے ساتھ کرنا جن الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو یہ جائز نہیں ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نام کی وجہ سے مملوک کے دل میں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کا خیال پیدا ہوگا، اور یہ چیز اسے نافرمانی پر ابھارے گی۔ ابن شعبان نے الزاهی کے بارے میں کہا: لا یقل السید عبدی و أمتی ولا یقل المملوك ربّی ولا ربّتی کہ آقا عبدی اور امتی نہ کہے اور غلام ربی اور ربتی نہ کہے" تو یہ اسی معنی پر محمول ہوگا جس کو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یقل العبد ربّی ولیقل سیدی (1) کہ غلام ربی نہ کہے بلکہ سیدی کہے، کیونکہ رب اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور بالاتفاق اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ جبکہ "سید" میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں نہیں تو فرق واضح ہو گیا کیونکہ اس صورت میں کوئی التباس اور اشکال نہیں رہتا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس صورت میں بھی یہ فرق ہوگا کہ اس کا استعمال اور شہرت اس طرح نہیں جس طرح رب کا استعمال اور شہرت ہے اور ابن عربی نے کہا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں جائز ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَأَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ۔ فَأَنْسٰهُ میں ہ ضمیر کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی شیطان نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا دیا یہ اس طرح کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے ساقی کو کہا: اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا تو گویا آپ نے اس لیے کہا کہ وہ آپ کو نجات دلائے گا اور پہلی حالت میں واپس لوٹا دے گا تو اس وقت آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرنا اور اس سے مدد طلب کرنا بھول گئے اور مخلوق سے استغاثہ کی طرف مائل ہوئے تو آپ کو قید میں ٹھہرا کر اس پر عتاب کیا گیا۔ عبد العزیز بن عمیر کندی نے کہا: جبرئیل امین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانہ میں آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اسے پہچان گئے تو کہا: اے ڈرانے والوں کے بھائی! میں آپ کو خطا کاروں کے درمیان کیسے دیکھ رہا ہوں؟ تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے طاہر بن طاہرین! اے پاکبازوں کے بیٹے! رب العالمین تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: کیا تمہیں بندوں سے مدد طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں تجھے چند سال اور قید میں رکھوں گا؛ تو آپ نے کہا: اے جبریل! کیا وہ مجھ سے راضی ہے؟ جبریل نے کہا: ہاں، تو آپ نے کہا: مجھے (اس مشقت کی) کوئی پرواہ نہیں۔ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب کیا اور آپ کی قید کو لمبا کر دیا۔ جبریل نے آپ سے کہا: اے یوسف! آپ کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل سے کس نے نجات دلائی؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: کنوئے سے آپ کو کس نے نکالا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: فاحشہ عورت سے آپ کو کس نے بچایا؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: عورتوں کے مکر کو آپ سے کس نے دور کیا؟ آپ نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، حکم الطلاق لفظة، جلد 2، صفحہ 238

کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: پھر تو نے کیسے مخلوق پہ اعتماد کر لیا اور اپنے رب کو چھوڑ دیا کہ تو نے اس سے سوال نہیں کیا؟ آپ نے کہا: اے پروردگار! مجھ سے یہ کلمہ لغزش میں سرزد ہو گیا۔ اے ابراہیم، اسحق اور شیخ یعقوب علیہم السلام کے معبود! میں تجھ سے رحم کا سوال کرتا ہوں، جبریل نے آپ سے کہا: تیری سزا یہ ہے کہ تو کئی سال قید میں رہے گا۔ ابو سلمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحم اللہ یوسف لولا الکلمۃ التی قال (1): اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ - فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ اللہ تعالیٰ یوسف پر رحم فرمائے اگر وہ اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ کا کلمہ نہ کہتے تو کئی سال قید خانہ میں نہ رہتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے نجات پانے والے جوان سے کہا: اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ تو کئی سال تک قید کو لمبا کر کے آپ کو سزا دی گئی۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کو یاد کیا ہوتا تو وہ آپ کو چھٹکارا نصیب فرماتا۔ اسماعیل بن ابراہیم عن یونس عن الحسن روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر یوسف کا کلمہ یعنی اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ نہ ہوتا آپ قید میں اتنا عرصہ نہ رہتے جتنا رہے''۔ راوی نے کہا: پھر حسن روتے ہوئے کہتے ہیں: ہمیں بھی کوئی مسئلہ بنتا ہے تو ہم لوگوں کے سامنے اس کی شکایت کرتے ہیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ فَأَنْسَاهُ کی ''ہ'' ضمیر نجات پانے والے جوان کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ بھولنے والا ہے؛ یعنی ساقی کو شیطان نے اس بات سے بھلا دیا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر اپنے مالک کے سامنے کرے۔ اس آیت میں حذف ہے اصل میں ہے أنساہ الشیطان ذکرہ لربہ بعض علماء نے اس قول کو ترجیح دی ہے انہوں نے کہا: اگر شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلایا ہوتا تو آپ کو قید میں ٹھہرانے کی سزا کا مستحق قرار نہ دیا جاتا کیونکہ بھولنے والا مواخذہ کا مستحق نہیں ہوتا۔ پہلے قول والوں نے یہ جواب دیا ہے کہ نسیان بعض اوقات ترک کے معنی میں ہوتا ہے تو جب آپ نے اللہ کا ذکر ترک کیا اور شیطان نے آپ کو اس طرف بلایا تو آپ کو سزا دی گئی؛ دوسرے قول والوں نے ان کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ذریعے کی: وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ (یوسف: 45) اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد۔ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بھولنے والا وہ ساقی تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر: 42) بے شک میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ شیطان کو انبیاء پر غلبہ حاصل ہی نہیں؟ ایک قول یہ ہے: نسیان سے سوائے ایک صورت کے انبیاء بھی معصوم نہیں اور وہ ایک صورت یہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ لوگوں تک پیغام پہنچاتے ہیں یعنی وحی الٰہی کی تبلیغ میں اس میں وہ معصوم ہیں۔ اور اگر ان سے ایسے معاملات میں نسیان سرزد ہو جائے جن میں سرزد ہو سکتا ہے تو اسے مطلق شیطان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور یہ نسبت نہیں کی جا سکتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نسیان کی خبر دی ہو اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان کی طرف نسیان کی نسبت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نسی آدم

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 265

فنسیت ذریتہ (1) حضرت آدم علیہ السلام کو نسیان ہوا تو ان کی اولاد کو بھی نسیان ہوا، آپ نے فرمایا: إنما أنا بشر أنسى کما تنسون (2) میں بشر ہوں میں بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ اس پر بحث گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ۔ بِضْعَ زمانے کا ایک حصہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ یعقوب نے عن ابی زید کہا: بَضع اور بِضع کہا جاتا ہے یعنی با کے فتح اور کسرہ کے ساتھ۔ اکثر علماء نے کہا: بضع و مائۃ نہیں کہا جاتا، اس کا اطلاق نوے تک ہوتا ہے، ہروی نے کہا: عرب بِضْعَ کو تین سے لیکر نو کے درمیان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بِضْعَ اور بضعۃ ایک ہی ہے ان دونوں کا معنی عدد کا ایک حصہ ہے۔ ابو عبیدہ نے بیان کیا کہ بِضْعَ چار کے نصف سے کم حصے کو کہتے ہیں ان کی مراد ایک سے لے کر چار کے درمیان کے اعداد ہیں۔ مگر اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہا: وکم البضع، بِضْعَ کیا ہے (3)؟ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تین سے نو تک کے درمیان۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذھب فزاید فی الخطر۔

اکثر مفسرین کے نزدیک بِضْعَ سے مراد سات ہے یہ ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ ماوردی نے کہا: یہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور قطرب کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تین سے نو تک (4)، یہ اصمعی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تین سے دس تک۔ زجاج نے کہا: یہ تین سے پانچ کے درمیان ہے۔ فراء نے کہا: بِضْعَ کو دس اور بیس سے لے کر نوے تک کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور سو کے بعد اس کو ذکر نہیں کیا جاتا۔

وہ مدت جس میں حضرت یوسف علیہ السلام قید رہے اس کے بارے میں تین قول ہیں۔ ایک: سات سال (5)، یہ ابن جریج قتادہ اور وہب بن منبہ کا قول ہے، وہب نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام سات سال آزمائش میں مبتلا رہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانہ میں رہے۔

دوسرا: بارہ سال، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

تیسرا: چودہ سال، یہ ضحاک کا قول ہے۔ مقاتل نے مجاہد عن ابن عباس کہا: حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں پانچ اور کچھ سال رہے۔ اس کا اشتقاق بضعت الشیء سے ہے یعنی قطعتہ۔ پس یہ عدد کا ایک قطعہ ہے پس اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گزشتہ پانچ سال کی قید کے بعد سات یا نو سال قید کی سزا دی پس بِضْعَ عقوبت کی مدت ہے نہ کہ کل قید کی مدت۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانہ میں قید رہے اور حضرت ایوب علیہ السلام سات سال آزمائش میں رہے اور بخت نصر کو سات سال مسخ کا عذاب دیا گیا۔ عبد اللہ بن راشد بصری نے عن سعید بن ابی عروبہ کہا کہ بِضْعَ کا اطلاق پانچ سے لے کر بارہ سال کے عرصے کے درمیان پر ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں یقین کے حصول کے باوجود اسباب کو پکڑنے کے جواز پر دلیل ہے۔ بے شک تمام

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اعراف، جلد 2، صفحہ 132 — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً، سورۂ روم، جلد 2، صفحہ 151

4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 267 — 5۔ ایضاً

امور مسبب کے قبضہ میں ہیں لیکن اس نے ایک سلسلہ بنایا ہے اور بعض معاملات کو بعض کے ساتھ ملا دیا ہے پس ان اسباب کو اختیار کرنا سنت ہے اور ان کو انتہا تک پہنچا دینا یقین ہے اور جو چیز اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے وہ نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کرنا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے وقت پیش آیا۔ یہ واضح ہے پس اس میں غور کرو۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ١ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ۝

"اور (کچھ عرصہ بعد ایک روز) بادشاہ نے کہا کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی کھا رہی ہیں انہیں سات دبلی گائیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات خشک سوکھے ہوئے، آؤ درباریو بتاؤ مجھے میرے خواب کی تعبیر اگر تم خوابوں کی تعبیر بتایا کرتے ہو"۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی آزادی قریب آئی تو بادشاہ نے خواب دیکھا۔ جبریل امین نازل ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو سلام کیا اور آزادی کی خوشخبری سنائی اور کہا: اللہ تعالیٰ تجھے قید سے نکالنے والا ہے اور زمین میں تجھے اقتدار دینے والا ہے، بادشاہ کو اور جابر لوگوں کو تیرا مطیع و فرمانبردار بنائے گا اور تجھے تیرے بھائیوں پر کلمہ علیا عطا فرمائے گا اور یہ اس خواب کی وجہ سے ہے جو بادشاہ نے دیکھا اور وہ یہ ہے اور اس کی تاویل ایسی، ایسی ہے پس آپ قید میں اس سے زیادہ نہیں رہے جتنا کہ بادشاہ نے خواب دیکھا تھا حتیٰ کہ باہر آ گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہلے خواب کو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے آزمائش اور سختی بنایا اور دوسری مرتبہ اسی کو خوشخبری اور رحمت بنایا۔ اور وہ یوں کہ بڑے بادشاہ ریان بن ولید نے خواب میں دیکھا کہ گویا خشک نہر سے سات موٹی گائیں نکلیں اور ان کے پیچھے سات دبلی پتلی، عِجَاف سے مراد کمزور گائیں ہیں۔ تو دبلی گائیں موٹی پر حملہ آور ہوئیں انہیں کانوں سے پکڑا اور سوائے سینگوں کے انہیں کھا گئیں، اور سات سرسبز خوشے دیکھے ان پر سات خشک خوشے حملہ آور ہوئے اور انہیں کھا گئے اور اب ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ بچی اور وہ خشک خوشے سرسبز و شاداب خوشوں کو کھانے کے باوجود خشک ہی رہے اسی طرح دبلی پتلی گاؤں میں بھی موٹی گاؤں کو کھانے کے باوجود کوئی اضافہ نہ ہوا۔ خواب نے بادشاہ کو پریشان کیا تو اس نے لوگوں کو اہل علم کو، جادو، علم نجوم اور کہانت کو جاننے والوں اور معززین قوم کی طرف پیغام بھیجا، اس نے انہیں کہا: يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اس نے اپنا خواب ان کے سامنے بیان کیا، لوگوں نے کہا: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ابن جریج نے کہا کہ مجھے عطا نے کہا ہے: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ سے مراد جھوٹے اور غلط خواب ہیں۔ جویبر نے عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا: کچھ خواب سچے ہوتے ہیں اور کچھ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ یعنی جھوٹے ہوتے ہیں۔ ہروی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ سے مراد اخلاط احلام ہے۔ لغت میں الضغث سے مراد کسی چیز کا گٹھہ ہوتا ہے جس طرح کہ سبزی، گھاس اور ان کے مشابہ دیگر اشیاء یعنی انہوں نے کہا: آپ کا خواب واضح نہیں ہے۔ احلام سے مراد غلط ملط خواب ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا:

اَضْغَاثُ سے مراد وہ خواب ہے جس کی کوئی تاویل نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ، سَبْعَ کے آخر سے ھا کو حذف کر دیا گیا تا کہ مذکر اور مونث میں فرق رہے۔ سِمَانٍ بقرات کی صفت ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ سَبْعَ بَقَرٰتٍ سمانا بھی جائز ہے اس صورت میں سمانا سبع کی صفت ہوگا اسی طرح خضرا بھی جائز ہے۔ فراء نے کہا: سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (الملک: 3) اسی کی طرح ہے، جبکہ ''بقرہ'' کا مادہ اشتقاق اور معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: بکری اور گائے جب شہر میں داخل ہوں تو اگر وہ موٹی ہوں تو یہ خوشحالی کا سال ہوتا ہے اور اگر وہ دبلی ہوں تو وہ سال سخت ہوتا ہے اور اگر وہ شہر سمندری شہر ہو تو اس میں ان کی تعداد اور حالت کے مطابق کشتیاں آتی ہیں ورنہ وہ پے در پے آزمائشیں ہیں، گویا کہ وہ آزمائشیں گائیں کا منہ ہیں، جس طرح کہ حدیث میں یشبہ بعضہا بعضا کے الفاظ ہیں اور متن کے حوالے سے ایک اور حدیث میں ہے کانہا صیاصی البقر یعنی گویا وہ گائیوں کے سینگ ہیں۔ اس میں مراد ان فتنوں کو گاؤں کے سینگوں کے ساتھ مشابہت دینا ہے اور اگر وہ مکمل طور پر زرد ہوں تو پھر وہ بیماریاں ہیں جو لوگوں پر حملہ آور ہیں اور اگر ان کے رنگ مختلف ہوں، بڑے سینگوں والی ہوں اور لوگ ان سے بھاگ رہے ہوں یا ان کے منہ سے آگ اور دھواں نکل رہا ہو تو وہ لشکر ہے یا غارت گری یا وہ ایسا دشمن ہے جو ان پر حملہ آور ہے اور ان کے گھروں میں اترا ہوا ہے۔ اور بعض اوقات ''بقرہ'' بیوی، خادم، غلہ اور سال پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں بچہ، غلہ اور بنات ہوتا ہے۔ ''یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ'''' عَجُفَ یَعْجُفُ بروزن عَظُمَ یَعْظُمُ ہے جبکہ عَجِفَ یَعْجِفُ بروزن حَمِدَ یَحْمَدُ بھی آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ، رؤیا کی جمع رؤی ہے یعنی مجھے اس خواب کے انجام کے متعلق خبر دو اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ یہ عبورالنہر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے عبرت النہر یعنی میں نہر کے کنارے پر پہنچا، خواب کی تعبیر سے مراد اس کا انجام ہوتا ہے۔ للرؤیا میں لام تبیین کے لیے ہے یعنی اگر تم تعبیر کر سکتے ہو تو بیان کرو۔ زجاج نے کہا: رؤیا کے لیے ہے۔

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾

''درباریوں نے کہا: (اے بادشاہ) یہ خواب پریشان ہیں، ہم پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ فراء نے کہا: أضغاث أحلام بھی جائز ہے۔ نحاس نے کہا: نصب بہت دور کی بات ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تو نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کی تعبیر ہو، یہ تو صرف اضغاث احلام یعنی غلط ملط خواب ہیں۔ أضغاث کا واحد ضغث ہے۔ سبزی اور گھاس وغیرہ کے گٹھے کو ضغث کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

کضغث حلم غرّ منہ حالمہ

وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ زجاج نے کہا: اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم غلط ملط خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

انہوں نے اپنے آپ سے اپنے علم کی نفی کی جس کی تعبیر نہ ہو نہ کہ انہوں نے اپنے آپ سے علم التاویل کی نفی کی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ سے تعبیر کے علم کی ہی نفی کر دی۔ اس بنیاد پر اضغاث سے مراد خوابوں کا ایک مجموعہ ہو گا جس میں سے کچھ صحیح اور کچھ باطل ہوں اسی وجہ سے ساقی نے کہا: اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ اس کو پتہ چل گیا کہ لوگ تعبیر کرنے سے عاجز آ گئے ہیں یہ نہیں کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تعبیر ہے ہی نہیں۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے تفسیر و تعبیر کا قصد و ارادہ ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے بادشاہ کے سینے سے ان کو مٹانا چاہا تا کہ اس کا دل ان میں مشغول نہ ہو۔ اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ انہیں اس کا علم تھا۔ الْاَحْلَامِ "حلم" کی جمع ہے اور حلم اسے کہتے ہیں جس کو سونے والا دیکھتا ہے اسی سے حلم اور احتلم ہے اسی طرح حَلَمْتُ بکذا و حلمته بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَحَلَمْتُهَا وَبَنُو رُفَيْدَةَ دُونَهَا لَا يَبْعُدَنَّ خَيَالُهَا الْمَحْلُومُ

اس کی اصل اناث ہے جبکہ اسی سے حلم ہے جو طیش کی ضد ہے نیند کے اندر دکھائی دی جانے والی بات کو حلم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ نیند اطمینان اور سکون کی حالت ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس آدمی کے قول کے بطلان پر دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ خواب اس آدمی پر واقع ہو جاتی ہے جو اس کی تعبیر بتاتا ہے کیونکہ لوگوں نے کہا: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ حالانکہ ایسا ہوا نہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر خشک سالی اور خوش حالی کے ساتھ کی اور معاملہ ایسا ہی تھا جیسا کہ آپ نے اس کی تعبیر کی۔ اس میں اس بات کے فاسد ہونے پر دلیل ہے کہ خواب اڑتے پرندے کی ٹانگ پر ہوتا ہے، جب اس کی تعبیر کی جائے تو واقع ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

"اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد میں بتاتا ہوں تمہیں اس خواب کی تعبیر، مجھے (قید خانہ) تک جانے دیجئے۔ اے یوسف! اے صدیق! بتایئے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازہ گائیں ہیں، کھا رہی ہیں انہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سر سبز اور دوسرے (سات خوشے) خشک تا کہ میں (آپ کا جواب لے کر) واپس جاؤں لوگوں کی طرف شاید وہ (آپ کے علم و فضل کو) جان لیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا یعنی بادشاہ کا ساقی وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ یعنی عرصہ بعد (1) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر سے مروی ہے، اور اسی سے الی أمة معدودة ہے۔ ابن درستویہ نے کہا: أمته سے مراد حین نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ اس میں مضاف کو حذف نہ مانا جائے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام نہ رکھا جائے گویا کہ وادکر بعد حین أمة یا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 270

بعد زمن أمة یا اس جیسے الفاظ کہے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور أمة لوگوں کی بڑی جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ اخفش نے کہا: یہ لفظاً واحد ہے جبکہ معنی میں جمع، اور حیوانات کی ہر جنس ایک امت ہے حدیث طیبہ میں ہے: لولا أن الکلاب أمة من الأمم لأمرت بقتلها (1) یعنی اگر کتے ایک امت نہ ہوتے تو میں انہیں قتل کرنے کا حکم دیتا۔

اللہ کے ارشاد وَادَّکَرَ سے مراد یہ ہے کہ اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کی ضرورت یاد آئی اور وہ آپ کا قول اذْکُرْنِی عِنْدَ رَبِّکَ ہے۔ عفان نے ہمام عن قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وادکر بعد أمة پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس، عکرمہ اور ضحاک کی معروف قرأت وادکر بعد أمة ہے ہمزہ کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ معنی ہوگا کہ وہ اس کو یاد آیا بھول جانے کے بعد۔ شاعر نے کہا:

أَمِهْتُ وكنتُ لا أنسى حديثًا كذاكَ الدهرُ يُودِي بالعقولِ

شُمیل بن عزرۃ الضبعی سے ہے: بعد أمه الف کے فتحہ، میم کے سکون اور ھا کے ساتھ اور یہ الأمَہ کی مثل ہے یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی نسیان ہے۔ جب کوئی بھول جائے تو کہا جاتا ہے: أَمِهَ یَأمَهُ أَمَهًا۔ اس بنیاد پر وادکر بعد أمه ہوگا۔ اس کو نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور رجل امه سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل جاتی رہی ہو۔ جوہری نے کہا: جوزہری کی حدیث میں أمه بمعنی اقرار اور اعتراف ہے تو یہ لغت غیر مشہورہ ہے۔ اُشہب عقیلی نے کہا: بعد إمة یعنی بعد نعمة، یعنی اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نجات کے ذریعے انعام فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: وہ نوجوان حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی قضا کی وجہ سے بھول گیا تاکہ آپ کچھ مدت قید خانہ میں رہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: وہ بھولا نہیں تھا بلکہ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں بادشاہ کو دوبارہ اس کا وہ جرم یاد نہ آجائے جس کی وجہ سے بادشاہ نے اسے اور نانبائی کو قید کیا تھا وَادَّکَرَ یعنی اس نے ذکر کیا اور خبر دی۔ نحاس نے کہا: اذکر کی اصل اذتکر ہے ذال، تا کا قریب المخرج حرف ہے اس کو اس میں ادغام کرنا جائز نہیں کیونکہ ذال مجہورہ ہے اور تا مہموسہ، اگر ادغام کیا جائے تو جہر جاتا رہے گا سو تا کا حرف مجہورہ کے ساتھ ابدال کیا گیا جو کہ دال ہے اور تا کو دال سے بدلنا اس کو طا کے ساتھ بدلنے سے بہتر ہے کیونکہ طا مطبقہ ہے تو اس طرح یہ اذدکر ہوگیا پس ذال کو دال میں ادغام کر دیا گیا دال کی رخاوت اور لین کی وجہ سے۔ پھر ارشاد فرمایا: اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ یعنی میں تمہیں خبر دیتا ہوں۔ حضرت حسن نے أنا أتیکم بتاویله پڑھا ہے۔ بادشاہ نے کہا: ایک عجمی کا فر انہیں کیسے بتائے گا؟ نحاس نے کہا: اُنَبِّئُكُمْ کا معنی ہے: میں تمہیں صحیح اور عمدہ خبر دوں گا، یعنی میں پوچھوں گا پھر تمہیں خبر دوں گا۔

فَاَرْسِلُوْنِ وہ مخاطب تو بادشاہ کو ہوا اگر تعظیماً جمع کا صیغہ استعمال کیا یا پھر وہ بادشاہ اور اہل مجلس کو مخاطب ہوا۔ یُوْسُفُ ندا مفرد ہے اسی طرح الصِّدِّيْقُ یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ اَفْتِنَا یعنی انہوں نے اسے بھیجا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: اے صدیق! اور آپ سے بادشاہ کے خواب کے متعلق پوچھا۔ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ یعنی بادشاہ اور اس کے اصحاب کی طرف۔ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس کا مفعول التعبیر ہے یا پھر اس کا مفعول مکانك من الفضل والعلم ہے یعنی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصید، حدیث 2462۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، باب النہی عن اقتناء الطلب، حدیث 2195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شاید وہ علم وفضل میں آپ کے مقام ومرتبہ کو جان لیں اور آپ کو آزاد کر دیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ النَّاس سے مراد بادشاہ ہو اور تعظیماً اسے ایسا کہا گیا ہو۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۝

"آپ نے فرمایا کہ تم کاشت کرو گے سات سال تک حسب دستور تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو خوشوں میں مگر تھوڑا سا (ضرورت کے لیے نکال لو) جسے تم کھالو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ تَزْرَعُوْنَ جب اس نے آپ کو خواب کے بارے میں بتایا تو آپ نے اس کے سامنے اس کی تفسیر کرنا شروع کی، آپ نے فرمایا: سات موٹی تازہ گاؤں اور شاداب خوشوں سے مراد سات سرسبز و شاداب سال ہیں۔ اور دبلی پتلی اور لاغر گائیں اور خشک خوشے سات قحط والے سال ہیں۔ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا یعنی لگاتار، مسلسل، یہ مصدر علی غیر المصدر ہے کیونکہ تَزْرَعُوْنَ کا معنی تدأبون کعادتکم فی الزراعة سبع سنین یعنی تم اپنی عادت کے مطابق سات سال کاشت کرتے رہو گے۔ ایک قول یہ ہے: یہ حال ہے یعنی دائبین۔ ایک قول یہ ہے: سَبْعَ سِنِیْنَ کی یہ صفت ہے یعنی دائبۃ۔ ابو حاتم نے یعقوب سے دأبا حکایت کیا ہے حمزہ کی حرکت کے ساتھ۔ اسی طرح حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں، ابو حاتم کا قول ہے: یہ دئب سے ہے۔ نحاس نے کہا: اہل لغت صرف دأب کو ہی جانتے ہیں۔ دوسرا قول۔ یہ متحرک ہے کیونکہ اس میں حروف حلق میں سے ایک حرف ہے یہ فراء کا قول ہے فراء نے کہا: اور اسی طرح ہر وہ حرف جس کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہو تو اس کی تثقیل جائز ہے جب اس کا دوسرا حرف ہمزہ، حا، عین، غین، حا اور خا ہو اور اس کی اصل عادت ہے، شاعر نے کہا:

كَدَاْبِكَ مِنْ أُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا (1)

جس طرح حویرث کی ماں سے پہلے تمہاری عادت اور طریقہ ہے۔

اس کے متعلق گفتگو سورۃ "آل عمران" میں گزر چکی ہے۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ ایک قول یہ ہے: (آپ نے یہ حکم اس لیے دیا) تاکہ اسے گھن نہ لگ جائے اور وہ زیادہ باقی رہنے والا ہو جائے: دیار مصر میں ایسا ہی ہوتا ہے اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ یعنی ضروری مقدار اس میں سے نکال لو۔ آپ کی طرف سے یہ قول امر ہے جبکہ پہلا خبر یہ بھی احتمال ہے کہ پہلا بھی امر ہو مگر زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ وہ خبر ہے، تو تَزْرَعُوْنَ کا معنی "ازرعو" ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کریمہ مصالح شرعیہ یعنی حفظ الادیان، حفظ النفوس، حفظ العقول، حفظ الانساب اور حفظ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 274

الاموال کے حوالے سے اصل و ضابطہ ہے پس ہر وہ چیز جو ان امور میں سے کسی امر کے حصول کی ضامن ہو تو وہ مصلحت ہے اور جو ان میں سے کسی چیز کو ختم کرنے والی ہو وہ مفسدہ ہے اس کو دور کرنا مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شرائع کا مقصود لوگوں کو ان کے دنیوی مصالح کی طرف رہنمائی کرنا ہے تاکہ ان کے ذریعے ان پر اللہ تعالیٰ کی معرفت و عبادت حاصل ہو جائے جو اخروی سعادت تک پہنچانے والی ہیں۔ اس کی رعایت اللہ تعالیٰ کا وہ فضل و رحمت ہے جو اس نے اپنے بندوں پر فرمایا جو نہ تو اس پر واجب ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا استحقاق ہے یہ تمام اہل سنت کے جملہ محققین کا مذہب ہے اس کی تفصیلات اصول فقہ میں ہیں۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾

''پھر آئیں گے اس (خوشحالی) کے بعد سات (سال) بہت سخت کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا ان کے لیے مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: سَبْعٌ شِدَادٌ یعنی قحط والے سال۔ یَّأْكُلْنَ مجاز ہے اور معنی ہوگا یاکل أھلھن، مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ یعنی جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہوگا۔ جس طرح کہ کہنے والے کا قول:

نھارُك يا مغرورُ سھوٌ وغفلةٌ   وليلُكَ نومٌ والرّدَى لكَ لازمُ(1)

اے مغرور! تیرا دن بھول اور غفلت ہے اور تیری رات نیند ہے اور گھٹیا پن تجھے لازم ہے۔ (سہو و غفلت کی نسبت دن کی طرف اور نیند کی نسبت رات کی طرف)

حالانکہ دن نہیں بھولتا اور رات نہیں سوتی بلکہ دن میں بھولا جاتا ہے اور رات میں سویا جاتا ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے بیان کیا: حضرت یوسف علیہ السلام دو آدمیوں کا کھانا رکھتے اور اسے ایک آدمی کے قریب کرتے تو وہ اس کا بعض حصہ کھا لیتا یہاں تک کہ جب وہ دن آیا تو آپ نے وہ اس کے قریب کیا تو وہ سارا کھا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ ان سات سخت سالوں میں سے پہلا دن ہے۔ إِلَّا قَلِيلًا استثنا کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ مِّمَّا تُحْصِنُونَ یعنی اس میں سے جو تم محفوظ رکھتے ہو تاکہ تم اسے کاشت کرو، کیونکہ بیج کو باقی رکھنے میں خوراک کی حفاظت ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: تم جس کو حرز میں رکھتے ہو۔ قتادہ نے کہا: تُحْصِنُونَ کا معنی تدخرون یعنی تم ذخیرہ کرتے ہو۔ معنی ایک ہی ہے، یہ بات ضرورت کے وقت کے لیے کھانے کو ذخیرہ کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کافر کے خواب کے صحیح ہونے میں اصل ہے اور اس کی تعبیر وہی کی جائے گی جو اس نے دیکھا بالخصوص جب اس کا تعلق کسی مومن کے ساتھ ہو۔ (اگر کافر کے خواب کی یہ صورتحال ہے تو) اس خواب کی کیا کیفیت ہوگی جو نبی کے لیے اللہ کی نشانی، رسول کے لیے معجزہ، مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے لیے تصدیق اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 275

درمیان واسطہ کے لیے محبت بن رہا ہو۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝

''پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں مینہ برسایا جائے گا لوگوں کے لیے اور اس سال وہ (پھلوں کا) رس نکالیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ثُمَّ يَأْتِي مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ایسی خبر ہے جو بادشاہ کے خواب میں نہیں تھی بلکہ یہ اس علم غیب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک سال کے علم کا اضافہ فرمادیا جس کے متعلق انہوں نے آپ سے نہیں پوچھا تھا اس کا سبب آپ کی فضیلت کا اظہار اور علم و معرفت میں آپ کا مقام و مرتبہ کا اعلان تھا۔ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ یہ الاغاثہ یا الغوث سے مشتق ہے۔ آدمی نے مدد طلب کی، اس نے کہا: واغوثاہ۔ اور اسم الغوث، الغُواث اور الغَواث ہے اور استغاثنی فلان فأغثتہ یعنی فلاں نے مجھ سے مدد طلب کی تو میں نے اس کی مدد کی۔ اور اسم الغیاث ہے، واؤ، ماقبل کے کسرہ کی وجہ سے یا ہو گیا۔ اور الغیث بارش کو کہتے ہیں۔ قد غاث الغیث الارض سے مراد بارش کا زمین کو پہنچنا ہے۔ اور غاث اللہ البلاد یُغیثھا غیثا، اور غِیثتِ الارض تغاث غیثاً فھی ارض مَغِیثۃ مغیوثہ، تو یغاث الناس کا معنی ہوگا ان پر بارش برسائی جائے گی۔ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ انگور اور تیل نچوڑیں گے، امام بخاری نے اس کو ذکر کیا ہے۔ حجاج نے ابن جریج سے روایت کیا: وہ انگور کو بطور شراب، تل اور زیتون کو بطور تیل نچوڑیں گے۔ ایک قول یہ ہے: دودھ دُھنا مراد ہے (اس کو نچوڑنے کے قول کے ساتھ ذکر کرنا) اس کی کثرت کی وجہ سے ہوگا۔ اور یہ نباتات کی کثرت پر دلالت ہے۔ ایک قول یہ ہے: يَعْصِرُوْنَ سے مراد ہے کہ وہ نجات پائیں گے اس صورت میں یہ العصرۃ سے مشتق ہوگا۔ ابو عبیدہ نے کہا: ''العصر'' ص کی حرکت کے ساتھ ملجاء و منجاء کو کہتے ہیں۔ اسی طرح العصرۃ بھی ہے۔ ابوزبید نے کہا:

صَادِيًا يَسْتَغِيثُ غَيْرَ مُغَاثٍ ولقد كَانَ عُصْرَةَ الْمَنْجُودِ (1)

المنجود سے مراد فزع ہے اور اعتصرت بفلان و تعصرت یعنی میں نے اس کی پناہ لی۔ ابو الغوث نے کہا: يَعْصِرُوْنَ سے مراد يَسْتَغِلُّوْنَ ہے کہ وہ غلہ حاصل کریں گے اس صورت میں یہ عصر العنب سے مشتق ہوگا۔ اور اعتصرت مالہ سے مراد یہ ہوگا کہ میں نے اس کے قبضہ سے اس کو نکالا۔ عیسیٰ نے تُعْصَرُوْن پڑھا ہے یعنی تا کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ، معنی ہوگا: تم پر بارش برسائی جائے گی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ (النباء) اور یہی معنی ہوگا تُعْصِرُوْنَ کا یعنی تا کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12 صفحہ 276

رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''(یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا: (فوراً) لے آؤ انہیں میرے پاس۔ پس جب (فرمان شاہی لے کر) ان کے پاس قاصد آیا (تو) آپ نے فرمایا: لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے پوچھو کہ حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹ ڈالے تھے اپنے ہاتھ، بے شک میرا پروردگار تو ان کے مکر (وفریب) سے خوب آگاہ ہے۔ بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا: کیا معاملہ ہوا تمہارا جب تم نے یوسف کو بہلایا تھا اس سے مطلب براری کے لیے (بیک زبان) بولیں: حاشاللہ! انہیں معلوم ہوئی ہمیں تو اس میں ذرہ برائی، عزیز کی بیوی (گویا رائے ضبط نہ رہا) کہنے لگی: اب تو آشکار ہو گیا حق میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا اپنی مطلب براری کے لیے بخدا وہ تو سچا ہے''۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ یعنی قاصد گیا اور بادشاہ کو خبر دی تو بادشاہ نے کہا: ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ یعنی اس نے آپ کو نکلنے کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا: ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ یعنی عورتوں کی حالت الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ تو آپ نے نکلنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ بادشاہ کے نزدیک آپ کی برأت ثابت ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ آپ بغیر جرم کے قید میں رہے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کریم بن کریم بن کریم یوسف بن اسحاق بن ابراہیم ہیں''(1)۔ آپ نے فرمایا: ''اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تھے، پھر مجھے قاصد بلانے آتا تو میں اس کے بلانے پر چلا جاتا''۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ۔

آپ نے فرمایا: ''اور اللہ کی رحمت ہو لوط علیہ السلام پر انہوں نے رکن شدید کی پناہ لی تھی جب انہوں نے کہا: لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (ہود) پس ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا وہ اپنی قوم میں سے اعلیٰ ترین خاندان سے مبعوث فرمایا''۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا(2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے انہوں نے رکن شدید کی پناہ لی تھی اور اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تھے تو میں بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حقدار ہیں اس بات کے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ (بقرہ:260) کیا تو ایمان نہیں رکھتا آپ نے کہا: کیوں نہیں لیکن (میں نے ایسا اس لیے کیا) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے آپ صبر کرنے والے، بردبار تھے اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 139
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 680

جتنی آپ رہے تھے تو میں بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا اور (اپنے بے قصور ہونے کے) عذر تلاش نہ کرتا''۔

اسی طرح کی حدیث عبدالرحمن بن قاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں ان کی سند سے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں مروی ہے، اور دیوان میں ابن قاسم کی اس کے علاوہ کوئی روایت نہیں۔ طبری کی روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام پر رحم فرمائے اگر میں قید ہوتا پھر میری طرف قاصد بھیجا جاتا تو میں جلدی جلدی نکلتا، حضرت یوسف علیہ السلام بردبار اور پرسکون طبیعت کے مالک تھے''(1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر اور ان کے کرم پر تعجب ہوتا ہے اللہ ان کی مغفرت کرے جب ان سے گائیوں کے متعلق سوال کیا گیا، اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کو بالکل جواب نہ دیتا اور یہ شرط رکھتا کہ (پہلے) وہ مجھے قید خانے سے نکالیں اور مجھے ان پر تعجب ہوتا ہے جب ان کے پاس قاصد آیا، اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو میں دروازے کی طرف جلدی کرتا''۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فعل اطمینان اور صبر تھا اور گھر کی براءت کا مطالبہ تھا، روایت کے مطابق اس کا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ خوف تھا کہ آپ نکلیں، بادشاہ کے ہاں مقام و مرتبہ حاصل کرلیں اور وہ درگزر کرتے ہوئے آپ کے جرم سے خاموشی اختیار کرلے تو لوگ ہمیشہ اسی آنکھ سے آپ کو دیکھتے رہیں گے اور کہتے رہیں گے: یہ ہے وہ جس نے اپنے آقا کی بیوی کو بہلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ آپ اپنی براءت کو واضح کردیں اور پاکدامنی اور بھلائی میں سے اپنے مقام و مرتبہ کو ثابت کردیں اور اس وقت آپ مقام و مرتبہ کے لیے نکلیں گے، پس اس وجہ سے آپ نے قاصد کو کہا: اپنے مالک کے پاس لوٹ جاؤ اور اسے کہہ کہ عورتوں کا کیا معاملہ ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد صرف یہ تھا کہ تو اس کو کہہ کہ میرے جرم کو دیکھ اور میرے معاملہ میں غور و فکر کر کہ کیا تو نے حق کے ساتھ قید کیا یا ظلم کے ساتھ اور آپ نے عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا یا تو یہ آپ کی حسن معاشرت ہے یا پھر عزیز کی مذمت کے حوالے سے اس کی رعایت فرماتے ہوئے۔ اور اگر یہ کہا جائے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر، اناءت اور جلدی نہ نکلنے کی تعریف کیسے فرمائی حالانکہ اپنے آپ کو اس مقام سے ہٹالیا جس مقام کی وجہ سے آپ نے ان کی تعریف فرمائی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے ایک اور رائے اختیار فرمائی اس میں بھی عمدگی موجود ہے آپ فرماتے ہیں: اگر میں ہوتا تو نکلنے میں جلدی کرتا، پھر اس کے بعد میں نے اپنا عذر پیش کیا، اور وہ یہ ہے کہ یہ قصص اور واقعات اس لیے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ قیامت تک کے لیے لوگ ان کی اقتدا کریں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو زیادہ محتاط بات پر ابھارنا چاہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات میں احتیاط کو چھوڑنا بعض اوقات قید میں رہنے ہی کو لازم کردیتا ہے اور اس کے قید سے نکلنے کی صورت کو دوبارہ ختم بھی کرسکتا ہے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی وجہ سے اس سے امن حاصل تھا جبکہ آپ کے علاوہ دیگر لوگوں کو یہ امن حاصل نہیں ہوتا تو وہ حالت جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو بیان فرمایا وہ احتیاط کی حالت ہے اور جو کچھ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا وہ بہت بڑا صبر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ آپ نے تمام عورتوں کا ذکر کیا تاکہ کنایۃً ان میں عزیز کی بیوی بھی داخل

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 279

ہو جائے اور صراحۃً اس کا ذکر نہ ہو یہ آپ کا حسن معاشرت ہے۔ کلام میں حذف ہے اصل میں فاسالہ أن یتصرف ما بال النسوۃ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بادشاہ نے عورتوں اور عزیز مصر کی طرف پیغام بھیجا۔ عزیز مصر فوت ہو چکا تھا۔ پس اس نے انہیں بلایا قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اور کہا: تمہارا معاملہ کیا ہے۔ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عورتوں میں سے ہر ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اپنی مطلب براری کے لیے کہا تھا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے یا پھر ہر ایک کے قول سے مراد یہ ہے کہ عزیز کی بیوی نے ظلم کیا تو یہ ان عورتوں کی طرف سے مطلب براری ہی تھا۔ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ یعنی معاذ اللہ۔ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ، سُوْٓءٍ سے مراد زنا ہے قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ جب اس نے عورتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کا اقرار کرتے دیکھا اور اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ انکار کی صورت میں عورتیں اس کے خلاف گواہی دیں گی تو اس نے بھی اقرار کر لیا۔ اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی۔

حَصْحَصَ الْحَقُّ یعنی واضح اور ظاہر ہو گیا۔ اس کی اصل حصص ہے ایک قول یہ ہے: اصل حَصْحَصَ ہی ہے جس طرح کبھوا کے بارے میں کُبْكِبُوا اور کفف کے بارے میں کفکف ہے، یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے۔ الحص کی اصل کسی چیز کا استصال ہے۔ حص شعرۃ کہا جاتا ہے جب وہ اس کو جڑ سے اکھیڑ دے۔

ابو القیس بن الاسلت نے کہا:

قد حَصَّتِ البَيْضَةُ رأسِي فَمَا أَطْعَمُ نومًا غيرَ تَهْجاعِ

اور سَنَةٌ حصاء سے مراد ایسا سال ہے جس میں بھلائی نہ ہو۔ جریر نے کہا:

يأوي إليكم بلا مَنٍّ ولا جَحَدٍ مَن ساقه السَّنَةُ الحَصَّاءُ والذِّيبُ

شاعر نے گویا کہ ''الضبع'' کہنا چاہا ہے، اور اس سے مراد قحط زدہ سال ہے؛ قافیہ کی وجہ سے ان کی جگہ ''الذیب'' کو ذکر کر دیا ہے۔ حَصْحَصَ الْحَقُّ کا معنی یہ ہے کہ حق اپنے ظاہر اور ثابت ہونے کی وجہ سے باطل سے جدا ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

أَلاَ مُبْلِغٌ عنِّي خِدَاشًا فإنَّهُ كذوبٌ إذا ما حَصْحَصَ الحقُّ ظالمُ

ایک قول یہ ہے: یہ حصۃ سے مشتق ہے معنی یہ ہو گا: حق کا حصہ باطل سے جدا ہو گیا۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: اس کی اصل عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے، حصَّ شعرۃ جب اسے جڑ سے اکھیڑ لیا گیا ہو، اسی سے الحصۃ من الأرض ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اسے کاٹ لیا جائے اور الحصحص کسرہ کے ساتھ مٹی اور پتھر کو کہتے ہیں، جوہری نے یہ ذکر کیا ہے۔

اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ یہ بھی عزیز کی بیوی کا قول ہے اگرچہ اس سے اس کے بارے میں پوچھا نہیں گیا تھا۔ اس نے یہ بات توبہ کے اظہار کے لیے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی اور کرامت کو ثابت کرنے کے لیے کی، کیونکہ اقرار کرنے والے کا اپنے خلاف اقرار کرنا اس کے خلاف دی جانے والی شہادت کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے شہادت اور اقرار دونوں کو جمع کر دیا تا کہ گمان کسی آدمی کی عقل کو نہ ڈھانپ لے اور نہ ہی اس میں شک کی آمیزش ہو۔ خَطْبُكُنَّ اور رَاوَدْتُّنَّ میں نون کے مشدد ہونے کی وجہ یہ ہے

کہ یہ مذکر میں پائی جانے والی میم اور واؤ کی طرح ہے۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ ؕ اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

”یہ میں نے اس لیے کہا تھا تاکہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں خیانت نہیں کی اور یقیناً اللہ تعالیٰ کامیاب نہیں ہونے دیتا دغابازوں کی فریب کاری کو۔ اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا۔ بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرمادے، یقیناً میرا رب غفور رحیم ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بات کس نے کہی، ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر کی گفتگو میں سے ہے اور یہ اس کے قول اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ کے ساتھ متصل ہے یعنی اس نے کہا کہ میں نے سچائی کا اقرار کیا تاکہ وہ جان لے کہ میں نے غیب میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی یعنی اس کے خلاف جھوٹ نہیں بولا اور اس کی عدم موجودگی میں برائی کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ میں نے سچ بولا اور خیانت سے نکل گئی پھر اس نے کہا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ بلکہ میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا؛ اسی بنیاد پر وہ صانع کا اقرار کر رہی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کہا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ قاصد کو واپس لوٹانے والا جو کام میں نے کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے تاکہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ یہ حسن، قتادہ اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ بِالْغَيْبِ کا معنی وھو غائب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ گفتگو بادشاہ کی موجودگی میں کی اور فرمایا: لِيَعْلَمَ (غیب کا صیغہ استعمال کیا) اس سے مقصود بادشاہ کی توقیر واحترام تھا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے یہ گفتگو اس وقت کی جب قاصد دوبارہ آپ کے پاس آیا اور آپ ابھی قید خانہ میں تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس خبر لے کر آیا، اور جبریل علیہ السلام آپ کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے؛ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ یعنی میں نے اپنے آقا کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا: اے یوسف! (اس وقت بھی آپ نے خیانت نہیں کی) جب آپ نے چادر کھولی اور اس طرح بیٹھے جس طرح مرد (اپنی) عورت کے پاس بیٹھتا ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ الآیۃ۔ سدی نے کہا: عزیز کی بیوی نے آپ کو کہا کہ اس وقت بھی خیانت نہیں کی جس وقت اے یوسف! تو نے اپنی سروال اتار دی تھی؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ (☆) اور ایک قول یہ ہے: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ عزیز کی گفتگو کا حصہ ہے؛ یعنی یہ اس وجہ سے ہوا تاکہ یوسف جان لے

☆ ایسی روایات کے بارے میں تبصرہ گزر چکا ہے۔ مترجم

کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی، اور میں اس کی امانت پر اسے انعام وجزا دینے سے غافل نہیں ہوا۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآىِٕنِیْنَ اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ان کے فریب کے ہوتے ہوئے ہدایت نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ایک قول یہ ہے: یہ عورت کی گفتگو کا حصہ ہے۔ قشیری نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اور وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: جب یہ احتمال ہے کہ یہ عورت کے کلام میں سے ہو تو پھر اس احتمال پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے تاکہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کو چادر اور سروال کھولنے سے بری قرار دیں اور جب ہم اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا کلام سمجھیں گے تو پھر یہ ان امور میں سے ہوگا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں آئے تھے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے وَ هَمَّ بِهَا (یوسف: 24) کے متعلق مختار قول گزرا ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: بعض لوگوں نے کہا: ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک عزیز کی بیوی کی گفتگو کا حصہ ہے، کیونکہ یہ اس کے قول اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ کے ساتھ متصل ہے۔ یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے ھم کی نفی کرتے ہیں۔ پس جس نے ان کے قول پر بنا کی ہے اس نے کہا: قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک کا کلام متصل ہے اور اس میں فی الحقیقت وقف تام نہیں ہے۔ ہم (قرطبی) نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اس جانب گئے ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ تو اللہ کے نبی کو اپنے ہی نفس کا تزکیہ اچھا نہ لگا تو فرمایا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ کیونکہ اپنے ہی نفس کا تزکیہ مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النجم: 32) اپنے آپ کو پاک وطاہر قرار نہ دو۔ ہم (قرطبی) نے اس کو سورۃ "النساء" میں بیان کر دیا ہے ایک قول یہ ہے: یہ عزیز کی گفتگو کا حصہ ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بدگمانی سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دیتا۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ یعنی اس میں برائی کی خواہش ہوتی ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ استثنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور مَا بمعنی مَن ہے یعنی الا من رحم ربی جس پر میرا رب رحم فرمائے تو وہ اس سے بچ جاتا ہے۔ اور مَا کا بمعنی من استعمال ہونا کثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: 3) یہاں بھی بمعنی من ہے۔ یہ استثنا منقطع ہے، کیونکہ یہ نفس امارہ کے زنا سے بچنے کے ذریعے رحم کیے جانے کی استثنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "تم اپنے ایسے ساتھی کے بارے میں کیا کہتے ہو کہ اگر تم اس کی عزت کرو، اطاعت کرو اور اسے کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں برائی کی انتہا تک لے جائے اور اگر تم اس کی اہانت کرو، اسے ننگا کرو اور اس کی مخالفت کرو تو وہ تمہیں بھلائی کی انتہا تک لے جائے"۔ ان (صحابہ) نے کہا: یا رسول اللہ! یہ زمین میں برا دوست ہے، آپ نے فرمایا: "مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ تمہارے ان نفوس کا دوست ہے جو تمہارے پہلوؤں میں ہیں۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا

مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

''اور بادشاہ نے حکم دیا کہ لے آؤ اسے میرے پاس میں چن لوں گا اسے اپنی ذات کے لیے، پھر جب اس نے آپ سے گفتگو کی (اور مطمئن ہوگیا) تو کہا: آپ آج سے ہمارے ہاں بڑے محترم (اور) قابل اعتماد (درباری) ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ جب بادشاہ کے سامنے آپ کی برأت ثابت ہوگئی، اس واقعہ میں آپ کی امانت متحقق ہوگئی اور وہ آپ کے صبر اور حوصلے کو بھی پہچان گیا تو اس کے نزدیک آپ کا مقام بڑھ گیا اور اسے آپ کی دوستی کی عمدگی کا یقین ہوگیا تو اس نے کہا: ائْتُوْنِيْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ بادشاہ کی گفتگو کو ملاحظہ کرو کہ جب آپ کا علم ثابت ہوا تو اس نے صرف ائْتُوْنِيْ بِهٖۤ کہا اور جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دوبارہ یہ معاملہ کیا تو اس نے ائْتُوْنِيْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ کہا۔ حضرت وہب بن منبہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا گیا تو آپ دروازے پر کھڑے ہوگئے اور فرمایا: مخلوق میں سے مجھے میرا رب کافی ہے، اس کا پڑوس عزت والا ہے، اس کی تعریف اعلیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر آپ داخل ہوئے، جب بادشاہ نے آپ کی طرف دیکھا تو اپنے تخت سے نیچے اترا اور آپ کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑا پھر بادشاہ نے آپ کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور کہا: اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ حضرت یوسف نے اسے کہا: اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ یعنی خزانوں کی (حفاظت کرنے والا) عَلِيْمٌ اس کے اندر تصرف کے طریقوں کو (جاننے والا)۔ ایک قول یہ ہے: حساب کو یاد کرنے والا، زبانوں کو جاننے والا۔ حدیث میں ہے: ''اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر آپ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو اسی وقت وہ آپ کو بنا دیتا لیکن اس نے اس معاملہ کو ایک سال تک مؤخر کر دیا''۔ ایک قول یہ ہے: آپ کی ملکیت کو ایک سال تک اس لیے مؤخر کیا گیا کہ آپ نے إن شاء اللہ نہ کہا۔ اور اس واقعہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے پاس گئے تو آپ نے کہا: یا اللہ! اس کی بھلائی میں سے میں تیری بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور اس کے شر اور دیگر لوگوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، پھر آپ نے بادشاہ کو عربی میں سلام کیا تو اس نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ میرے چچا اسماعیل کی زبان ہے پھر آپ نے اسے عبرانی میں بلایا تو اس نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے باپ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی زبان۔ بادشاہ ستر زبانوں میں گفتگو کرتا تھا تو جب بھی بادشاہ کسی زبان میں گفتگو کرتا حضرت یوسف علیہ السلام اسے اسی زبان میں جواب دیتے تو بادشاہ آپ کی اس صورتحال سے متعجب ہوا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ پھر اس نے آپ کو اپنے تخت پر بٹھایا اور کہا: میں آپ سے اپنا خواب سننا چاہتا ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ہاں اے بادشاہ! تو نے سات موٹی تازہ چمکدار گائیں دیکھیں۔ آپ کے سامنے دریائے نیل کو ان سے ظاہر کر دیا گیا وہ نیل کے کنارے سے تیرے پاس آئیں ان کے تھن دودھ سے بہہ رہے تھے اسی دوران تو نے ان کی طرف دیکھا اور ان کی خوبصورتی سے تو حیران ہوا۔ اس دوران نیل کا پانی جذب ہوگیا اور اس کی خشکی ظاہر ہوگئی تو اس کے کیچڑ سے سات دبلی پتلی گائیں نکلیں جن کے بال بکھرے ہوئے، پراگندہ اور پیٹ سکڑے ہوئے تھے، ان کی نہ کوئی کھیریاں

تھیں اور نہ ہی تھن۔ ان کے دانت داڑیں تھیں اور کتے کے پاؤں جیسے پاؤں تھے اور سونڈ درندوں جیسے تو وہ موٹی تازہ گائیوں کے ساتھ مل گئیں انہوں نے انہیں درندوں کی طرح چیرا پھاڑا، ان کے گوشت کھا گئیں، ان کی جلدوں کو پھاڑ دیا، ان کی ہڈیوں کو انہوں نے توڑ دیا اور ان کے دماغ نکال دیئے اس دوران تو ان کو دیکھتا رہا اور حیران ہوا کہ انہوں نے کیسے غلبہ حاصل کر لیا حالانکہ وہ کمزور ہیں؟ پھر ان میں کوئی موٹاپا ظاہر نہ ہوا اور نہ ہی انہیں کھانے کے بعد ان میں کوئی اضافہ ہوا۔

سات سرسبز و شاداب اور نرم و نازک خوشے تھے جو دانوں اور پانی سے بھرے ہوئے تھے، ان کی دوسری جانب سات خشک خوشے تھے جن میں نہ کوئی پانی تھا اور نہ ہی شادابی، ان کی ٹہنیاں مٹی اور پانی میں تھیں اسی دوران تو اپنے آپ سے کہتا ہے: یہ کون سی چیز ہے؟ یہ شاداب پھل ہیں اور وہ سیاہ خشک جبکہ ان کا اگنے والا تنا ایک ہی ہے، ان کی جڑیں پانی میں ہیں، تب ہوا چلی تو اس نے سیاہ خشک پتوں کو شاداب پھلدار پتوں پر ڈال دیا تو ان میں آگ بھڑک اٹھی تو اس نے انہیں جلا دیا تو وہ سیاہ راکھ بن گئے تو اے بادشاہ! تو خوف زدہ ہو کر بیدار ہو گیا، بادشاہ نے کہا: اللہ کی قسم! اس کی حقیقت کیا ہے اگرچہ یہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھی جو میں نے آپ سے سنی اے صدیق! میرے خواب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تو کھانا جمع کرے گا اور ان شاداب سالوں میں بہت زیادہ کھیتی کاشت کرے گا، اگر تو کسی پتھر یا کیچڑ پر کاشت کرے گا تو وہ بھی اگے گا اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ بڑھوتری اور برکت ظاہر فرمائے گا پھر تو ان خوشوں سے فصل اٹھائے گا اس کے لیے بڑے بڑے بھڑولے بنائے جائیں گے؛ تو خوشے اور پودے جانوروں کا چارہ بنیں گے جبکہ دانے لوگوں کے لیے ہوں گے، تو لوگوں کو حکم دے گا، وہ اپنے کھانے میں سے تیرے بھڑولوں میں پانچواں حصہ پہنچائیں گے تو جو کھانا تو جمع کرے گا وہ تمام شہر والے لوگوں اور ارد گرد رہنے والے لوگوں کے لیے کافی ہو گا گرد و نواح سے لوگ تیرے پاس آئیں گے اور تجھ سے لے کر جائیں گے اور تیرے پاس اتنا خزانہ جمع ہو جائے گا کہ تم سے پہلے کسی کے پاس بھی جمع نہیں ہوا ہو گا۔ تو بادشاہ نے کہا: ان امور کی تدبیر کون کرے گا؟ اگر سب شہر والوں کو جمع کیا جائے تو وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ اس سلسلہ میں امانت سے کام لینے والے نہیں، تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ۔ خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ سے مراد علی خزائن ارضك ہے یہ خزانۃ کی جمع ہے اور اضافت کے عوض اس پر الف، لام آیا ہے، جس طرح نابغہ کا قول ہے:

لَهُمْ شِیْمَةٌ لم یُعْطِهَا الله غَیْرَهُمْ   مِنَ الْجُوْدِ وَالْاَحْلَامُ غَیْرُ عَوَازِبِ

(والاحلام اصل میں احلامهم ہے تو اضافت کے عوض احلام پر الف لام آیا ہے۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ قید خانے میں جاری ہوا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کے پاس کیا گیا ہو پھر اس نے دوسری مجلس میں ائْتُوْنِیْ بِهٖ تاکیداً کہا ہو۔ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ یعنی میں اس کو اپنے لیے خالص بنا لوں گا، اپنی مملکت کے امور اس کے سپرد کروں گا۔ تو وہ گئے اور آپ کو لے آئے۔ اس بات پر فَلَمَّا كَلَّمَهٗ دلالت کرتا ہے، یعنی بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام

کے ساتھ کلام کیا اور آپ سے خواب کے بارے میں پوچھا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا، قَالَ بادشاہ نے کہا:
اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ مکین سے مراد متمکن ہے جس کا قول نافذ ہو ''امین'' تجھے دھوکے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

''آپ نے فرمایا: مجھے مقرر کر دے زمین کے خزانوں پر بے شک میں (ان کی) حفاظت کرنے والا (اور معاشی مسائل کا) ماہر ہوں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ حضرت سعید بن منصور نے کہا: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہتے سنا ہے: مصر زمین کا خزانہ ہے؛ جہاں تک اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ کا تعلق ہے تو اس میں حذف ہے یعنی اجعلنی علی حفظ خزائن الارض مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ اِنِّيْ حَفِيْظٌ یعنی جو میرے سپرد کیا جائے گا میں اس کی حفاظت کرنے والا ہوں گا عَلِيْمٌ اس کے معاملات کو جاننے والا ہوں۔ تفسیر میں ہے: میں حساب کرنے والا اور لکھنے والا ہوں، اور آپ سب سے پہلے آدمی تھے جس نے کاغذوں میں لکھا۔ ایک قول یہ ہے: حَفِيْظٌ خوراک کے اندازے کو عَلِيْمٌ خوشحالی کے سالوں کو۔ جویبر نے ضحاک عن حضرت ابن عباس کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر آپ نے اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ نہ کہا ہوتا تو وہ اسی وقت آپ کو یہ عہدہ سونپ دیتا لیکن اس نے یہ عہدہ آپ سے ایک سال مؤخر کر دیا (1)۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: امارت کا سوال کرنے والے دن سے جب سال گزرا تو بادشاہ نے آپ کو بلایا۔ آپ کی طرف متوجہ ہوا، آپ کو قلادہ پہنایا، آپ کے لیے سونے کا تخت بچھایا گیا جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے، آپ کو استبرق کا حلہ پہنایا گیا، چارپائی کی لمبائی تیس ذراع اور چوڑائی دس ذراع تھی، اس پر تیس بستر اور ساٹھ تکیے تھے پھر اس نے آپ کو نکلنے کا حکم دیا تو آپ جھومتے ہوئے نکلے، آپ کا رنگ برف کی طرح (سفید) اور چہرہ چاند کی طرح تھا، دیکھنے والا آپ کے چہرے کی رنگت کی صفائی سے اپنا چہرہ دیکھ سکتا تھا، آپ تخت پر براجمان ہوئے، بادشاہ آپ کے قریب ہوئے اور بادشاہ عورتوں کے ساتھ آپ کے کمرہ میں داخل ہوا، مصر کی شاہی اس نے آپ کے سپرد کی اور قطفیر اپنے عہدے سے الگ ہوگیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی جگہ لی۔ ابن زید نے کہا: مصر کے بادشاہ فرعون کے پاس کھانے کے علاوہ بہت سارے خزانے تھے، بادشاہ نے وہ سارے خزانے آپ کے سپرد کر دیئے اور ان راتوں میں قطفیر ہلاک ہوگیا، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی راعیل سے شادی کر لی جب آپ اس کے پاس گئے تو آپ نے کہا: کیا یہ اس سے بہتر نہیں جو تو چاہتی تھی؟ اس نے کہا: اے صدیق! مجھے ملامت نہ کرو، میں حسین وجمیل اور نرم و نازک عورت تھی جس طرح کہ آپ نے دیکھا، اور میرا شوہر عورتوں کے پاس نہیں آتا تھا اور آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے حسن عطا فرمایا اس کی وجہ سے میرا نفس مجھ پر غالب آگیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے باکرہ پایا، اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 9

کے قریب گئے تو اس سے دو بچے پیدا ہوئے: افراثیم بن یوسف اور منشا بن یوسف۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا جو کہ عزیز مصر کی بیوی تھی کے ساتھ بھائیوں کے کہنے پر ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ زلیخا، کا شوہر مر گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تھے، اس کا مال ضائع ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے روتے روتے اس کی بینائی جاتی رہی، لوگ اس سے دور ہو گئے، بعض اس پر رحم کرتے اور بعض رحم نہ کرتے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی قوم کے ایک لاکھ لوگوں کے ساتھ ہر ہفتے کچہری لگاتے۔ زلیخا کو کہا گیا کہ تو اپنی بات ان کے سامنے بیان کرنا شاید آپ تیرا مسئلہ حل کر دیں، پھر اسے کہا گیا: ایسا مت کرنا، ہو سکتا ہے تیری طرف سے جو بہلاوا اور قید والا معاملہ ہوا تو وہ انہیں یاد آ جائے تو وہ تیرے ساتھ ناروا سلوک کریں گے۔ زلیخا نے کہا: میں اپنے حبیب کے اخلاق کو جانتی ہوں۔ پھر زلیخا نے آپ کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب آپ کچہری میں بلند جگہ پر کھڑے ہوئے تو اس نے باآواز بلند ندا دی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ کون ہے؟ اس کو لے آؤ۔ وہ بولی: میں وہی ہوں جو آپ کی خدمت کرتی تھی، آپ کے بال سنوارتی تھی، میں نے اپنے گھر میں آپ کی تربیت کی، آپ کو عمدہ طریقے سے ٹھہرایا لیکن مجھ سے جہالت کی وجہ سے وہ زیادتی ہو گئی جو ہوئی۔ سو میں نے اپنے کیے کی مصیبت کو پالیا، میرا مال ضائع ہو گیا، میری ذلت و رسوائی کا سلسلہ دراز ہو گیا، بصارت چلی گئی، ان میں سے کوئی میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے اور کوئی مہربانی نہیں کرتا۔ اور یہ مفسدین کی جزا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بہت سخت روئے۔ پھر آپ نے اسے فرمایا: کیا تیرے دل میں میری محبت میں سے کچھ باقی ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! آپ کے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھنا میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھے اپنے گھوڑے کا اگلا حصہ پکڑا دیں۔ آپ نے اسے وہ پکڑا دیا، اس نے اسے اپنے سینے پر رکھ دیا، تو آپ نے زلیخا کے دل کی دھڑکن کی حرکت اور ارتعاش کو اپنے ہاتھ میں محسوس کیا، آپ روئے پھر آپ اپنے مقام پر تشریف لے گئے اور زلیخا کی طرف ایک قاصد بھیجا، اگر تو بغیر شوہر کے ہے تو ہم تیرے ساتھ شادی کر لیتے ہیں اور اگر تو شوہر والی ہے تو ہم تجھ سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اس نے قاصد کو کہا: میں اللہ کی پناہ میں آتی ہوں اس بات سے کہ بادشاہ میرے ساتھ مذاق کرے! انہوں نے میری جوانی، میری غنا، میرے مال اور عزت کے ہوتے ہوئے مجھے نہیں چاہا تو آج جب کہ میں بوڑھی، اندھی اور فقیر ہو چکی ہوں تو وہ مجھے کیسے چاہیں گے؟ قاصد نے آپ کو اس کی گفتگو سے آگاہ کیا، جب اگلے ہفتے آپ تشریف لائے تو اس نے آپ کو پھر پکارا۔ تو آپ نے فرمایا: کیا قاصد نے تجھے پیغام نہیں پہنچایا؟ اس نے کہا: میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ کے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھنا میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ آپ نے اس کے معاملات کی اصلاح کی اور شادی کر لی۔ پھر اس نے آپ کے ساتھ شب زفاف گزاری، حضرت یوسف علیہ السلام اٹھے نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، وہ بھی آپ کے پیچھے کھڑی ہو گئی، آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی جوانی، حسن و جمال اور بصارت کے لوٹانے کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا شباب اور حسن و جمال واپس لوٹا دیا حتیٰ کہ وہ بہلاوے والے دن سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے حضرت

یوسف علیہ السلام کے اللہ کے محارم سے بچنے کے صلہ میں یہ اکرام فرمایا۔ آپ نے اس کے ساتھ جماع کیا اس حال میں کہ وہ کنواری تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے (گزشتہ معاملات کے متعلق) پوچھا تو اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! میرا شوہر نامرد تھا، عورتوں کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا تھا اور آپ بے مثال حسن و جمال والے تھے۔

پھر دونوں نے بڑی ہی خوبصورت زندگی گزاری۔ اللہ تعالیٰ ہر روز ان کے لیے بھلائی کو تازہ فرماتا، پھر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے دو بچے پیدا کیے۔ ایک افرائیم اور دوسرا منشاء۔ اور روایت ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا سے بھی دوگنی محبت زلیخا کی پیدا کر دی۔ آپ نے اسے فرمایا: تجھے کیا ہوا ہے کہ تو میرے ساتھ اس طرح محبت نہیں کرتی جس طرح پہلے کرتی تھی؟ تو اس نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذائقہ چکھا ہے تو اس نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض اہل علم نے کہا: اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ ایک فاضل آدمی فاجر آدمی اور کافر بادشاہ کی طرف سے کوئی ذمہ داری سرانجام دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ اسے کوئی کام سپرد نہیں کرے گا جو وہ نہیں کرنا چاہتا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق معاملات کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کام اس فاجر کے اختیار اس کی خواہش اور اس کے فجور کے مطابق ہو تو یہ جائز نہیں ہوگا اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے اور آج کے زمانے میں کسی کے لیے جائز نہیں، بہرحال پہلی صورت بہتر ہے بشرطیکہ اس شرط کے مطابق ہو جو ذکر کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ ماوردی نے کہا: اگر بادشاہ ظالم ہو تو پھر اس کی طرف سے ولایت کو قبول کرنے کے حوالے سے دو طرح کا اختلاف ہے۔

(۱) ولایت کو قبول کرنے کا جواز بشرطیکہ امور مفوضہ میں حق کے مطابق کرے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون کی طرف سے والی بنے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے حق میں اس کا دنیاوی فعل معتبر ہوگا نہ کہ کسی اور کا۔

(۲) یہ جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں ظالموں کی طرف سے ولایت کو قبول کرنا ان کی معاونت کرنے اور ان کے اعمال کو درست سمجھنے کے مترادف ہے ان کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی فرعون کی طرف سے ولایت کے قبول کرنے کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون نیک سیرت آدمی تھا، اور سرکش فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی املاک کو دیکھا نہ کہ اس کے اعمال کو لہٰذا آپ کی طرف سے اس کی متابعت کا معاملہ نہ رہا۔ ماوردی نے کہا ہے: ظالم کی طرف سے ولایت کو قبول کرنے کے معاملہ میں ان دونوں قولوں کے اطلاق کے بجائے تفصیل کو بیان کرنا زیادہ صحیح ہے اور اس کی تین اقسام بنتی ہیں۔

نمبر 1۔ ایسے معاملات کہ جن کا نفاذ بغیر کسی اجتہاد کے جائز ہوتا ہے جیسے زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ تو ان میں ظالم کی طرف سے ولایت جائز ہوگی۔ اس کے مستحق پر نص نے اس میں اجتہاد سے مستغنی کر دیا ہے۔

نمبر 2۔ وہ معاملات جن میں کسی کے لیے علیحدگی اختیار کرنا ممکن نہ ہو اور جن کے مصارف میں اجتہاد لازم آتا ہو جیسے

مال فئی وغیرہ تو ان معاملات میں ظالم کی طرف سے ولایت کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں وہ بغیر حق کے تصرف کرے گا اور ایسے معاملات میں پڑے گا جن کا وہ استحقاق نہیں رکھتا۔

نمبر 3۔ وہ امور جن کو وہ تفویض کر سکتا ہو اور ان میں اجتہاد کا عمل دخل بھی ہو جیسے قضایا اور احکام تو اگر نظر وفکر دو باہم رضا مند آدمیوں کے درمیان فیصلے کی تنفید کے بارے میں ہو اور دو مجبور آدمیوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ کے طور پر ہو تو جائز ہے اور اگر بالجبر کوئی معاملہ لازم کرنا مقصود ہو تو پھر جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ آیت کریمہ میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آدمی جس کام کا اہل ہو اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: امام مسلم نے حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا(1): ''اے عبد الرحمٰن! امارت کا سوال نہ کر، اگر تیرے سوال کی وجہ سے تجھے امارت دی گئی تو تجھے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر بغیر سوال کے تجھے ملی تو اس پر تیری مدد کی جائے گی۔'' حضرت ابی بردہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میرے ساتھ دو اشعری آدمی تھے، ان میں سے ایک میری دائیں جانب تھا جبکہ دوسرا بائیں جانب تو ان دونوں نے کسی عہدہ کا سوال کیا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک فرما رہے تھے آپ نے فرمایا: ''اے ابو موسیٰ یا (آپ نے فرمایا) اے عبد اللہ بن قیس! تو کیا کہتا ہے؟ حضرت ابو موسیٰ نے کہا کہ میں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! انہوں نے مجھے اپنی دل کی بات سے آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ عہدہ کے طالب ہیں۔ آپ نے فرمایا: گویا میں آپ کی مسواک کو آپ کے ہونٹ کے نیچے دیکھتا ہوں کہ اسے دبا دیا گیا، آپ نے فرمایا: ''ہم ایسے آدمی کو عہدہ نہیں دیتے جو عہدہ لینا چاہے''۔ حضرت ابو موسیٰ نے پوری حدیث کو ذکر کیا، امام مسلم وغیرہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ولایت کا مطالبہ اس وجہ سے کیا کہ آپ کو علم تھا کہ عدل، اصلاح اور فقراء کو ان کے حقوق دینے کے حوالے سے کوئی بھی ان کی طرح نہیں تھا تو آپ نے یہ خیال کیا کہ یہ آپ پر فرض ہے کیونکہ وہاں آپ کے علاوہ اور ایسا کوئی نہیں تھا، آج بھی یہی حکم ہے (یعنی اگر ایسی صورت ہو تو مطالبہ جائز ہے) اگر کوئی آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ قضاء وحساب میں حق کو قائم رکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جو اصلاح کر سکے اور اس کے قائم مقام ہو سکے تو یہ کام اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ والی بنے اور اس کا مطالبہ کرے، اور علم وفضل میں جن اوصاف کے سبب وہ اس کا مستحق ہے ان کے بارے بتائے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، اور اگر وہاں کوئی ایسا آدمی ہو جو حق کو قائم کر سکتا ہے اور ان امور کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس آدمی کو بھی علم ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ مطالبہ نہ کرے اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جو آپ نے حضرت عبد الرحمن کو فرمایا: ''امارت کا سوال نہ کرو'' کیوں کہ ایسی صورت میں اس کا مطالبہ، اس میں پائی جانے والی آفات کی کثرت کے جاننے کے باوجود اس عہدہ کا لالچ اور اس سے چھٹکارا کے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیہا، جلد 2، صفحہ 120

حصول کا مشکل ہونا، اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے اور ذاتی اغراض کے لیے مطالبہ کر رہا ہے۔ جس آدمی کی کیفیت یہ ہو ممکن ہے اس پر اس کا نفس غالب آ جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے؛ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: ''اس کو اس کے سپرد کر دیا جائے گا'' کا یہی معنی ہے۔ اور جس آدمی نے اس کی آفات کو جاننے کی وجہ سے اور حقوق میں کوتاہی کے خوف کی وجہ سے اس کا انکار کیا اور اس سے بھاگا، پھر اس کو اس میں مبتلا کر دیا گیا تو اس کے لیے اس سے چھٹکارے کی امید کی جا سکتی ہے، یہی سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: ''اس پر اس کی مدد کی جائے گی'' کا معنی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا: میں کافی ہوں، کریم ہوں، اگرچہ آپ اس طرح تھے جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کریم ابن کریم ابن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحق بن ابراہیم (1)'' اور نہ ہی آپ نے فرمایا: میں خوبصورت ہوں، جمال والا ہوں، بلکہ آپ نے فرمایا: اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ تو آپ نے تو حفظ و علم کی وجہ سے مطالبہ کیا، نسب اور جمال کی وجہ سے نہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے آپ نے یہ بات اس آدمی کے سامنے کہی جو آپ کو جانتا نہیں تھا تو آپ نے اپنا تعارف کرانا چاہا، تو اس وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَلَا تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ (النجم: 32) سے مستثنیٰ ہو گئے۔

چوتھا جواب: آپ نے اس کو اپنے اوپر فرض متعین سمجھا کیونکہ وہاں آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آدمی میں پائے جانے والے علم و فضل کے ذریعے لوگوں کے سامنے اپنی صفات کو بیان کرنا جائز ہے۔ ماوردی نے کہا: مطلقاً تمام صفات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے بلکہ صرف اسی معاملے کے ساتھ خاص ہے جو اس کو درپیش ہو یا بیان کرنے والے کے ساتھ جس کا تعلق ہو، اور اس کے علاوہ تمام صورتوں میں ممنوع ہے کیونکہ اس میں اپنا ہی تزکیہ اور دکھلاوا ہے، اور اگر اس نے اپنے سے زیادہ فضیلت والے آدمی کو ممتاز کر دیا تو یہ خود اس کی اپنی فضیلت و شرافت کے زیادہ مناسب ہوگا؛ پس حضرت یوسف علیہ السلام کو جیسا کہ آپ کے حالات میں گزر چکا ہے ضرورت نے اس اظہار کی طرف دعوت دی اور دوسری بات یہ تھی کہ اہلیت کی وجہ سے آپ کامیابی کی امید بھی رکھتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾ وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ كَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾

''یوں ہم نے تسلط (اور اقتدار) بخشا یوسف کو سرزمین مصر میں تاکہ رہے اس میں جہاں چاہے، ہم سرفراز کرتے ہیں اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر عمدہ کام کرنے والوں کا اور آخرت کا اجر (اس سے) یقیناً بہتر ہے ان کے لیے جو ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیے رہے''۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَیۡثُ یَشَآءُ یعنی ان کو بادشاہ کے دل کے قریب کر کے اور قید سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 193

نجات دے کر ہم نے جوان پر انعام فرمایا اس انعام کے ذریعے ہم نے ان کو زمین میں تسلط واقتدار بخشا، یعنی جس طرح وہ چاہتے تھے اسی طرح ہم نے ان کو اقتدار عطا فرمایا۔ الکیا طبری نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ مباح چیز تک پہنچنے کے لیے اور جو اس میں خوشی، اصلاح اور حقوق کا حصول ہوتا ہے اس کے لیے حیلہ کے جواز پر دلیل ہے، اسی کی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص: 44) ہے (اور اپنے ہاتھ میں سبز وخشک گھاس کا مٹھا پکڑ پس اس کے ساتھ مار اور حانث نہ ہو) اسی طرح ''حیلہ کے جواز'' پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ وہ روایت ہے جو خیبر کے عامل کے بارے میں ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھجور پیش کی تھی اور پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ تاویل آنے والی وضاحت کی بنیاد پر باطل ہے۔

(مَكَّنَّا کو لام کے بغیر اور لام کے ساتھ ذکر کرنے کی دونوں صورتیں صحیح ہیں) جیسے کہا جاتا ہے مَكَّنَّاهُ و مَكَّنَّا لَهٗ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ (الانعام: 6) طبری نے کہا: بڑے بادشاہ ولید بن ریان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اطفیر کی ذمہ داری پر خلیفہ مقرر کیا اور اس کو معزول کر دیا۔ مجاہد نے کہا: اس نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس نے ڈیڑھ سال بعد آپ کو بادشاہ بنا دیا۔ مقاتل نے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ کے ساتھ انشاء اللہ کہا ہوتا تو اسی وقت آپ کو بادشاہ بنا دیا گیا ہوتا''۔ پھر اطفیر فوت ہوا تو ولید نے آپ کی شادی اطفیر کی بیوی راعیل سے کر دی، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے ساتھ دخول کیا تو آپ نے اسے باکرہ پایا۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرائیم اور منشا پیدا ہوئے اور جس کا گمان یہ ہے کہ وہ زلیخا تھی تو اس کے حوالے سے حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی تھی بلکہ جب اس نے آپ کو بھیڑ میں دیکھا تو رو پڑی پھر اس نے کہا: ''ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلام بنا دیا اور سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اطاعت کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہ بنا دیا'' تو آپ نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا پھر وہ آپ کے عیال میں رہی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا جبکہ آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی۔ اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ یہ وہب کی بیان کردہ بات کے برعکس ہے اس کو ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے'' واللہ اعلم'' جب بادشاہ نے مصر کی حکومت حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کی تو آپ نے لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک فرمایا اور انہیں اسلام کی دعوت دینا شروع کی یہاں تک کہ انہوں نے ایمان قبول کر لیا اور آپ نے ان میں عدل قائم فرمایا تو مرد اور عورتیں آپ کے ساتھ محبت کرنے لگے۔ حضرت وہب، حضرت سدی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر نے کہا: پھر سرسبز وشاداب سال آ گئے تو آپ نے زراعت کی اصلاح کا حکم ارشاد فرمایا اور کسانوں کو زراعت میں وسعت دینے کو کہا، جب غلہ حاصل ہوا تو آپ نے اسے ذخیرہ کرنے کا حکم دیا پھر آپ نے اس کے لیے گودام بنوائے اس سال ان گوداموں میں اتنا غلہ جمع ہوا کہ وہ غلہ کی کثرت کی وجہ سے تنگ پڑ گئے پھر اسی طرح ہر سال غلہ جمع ہوتا رہا یہاں تک کہ

شاداب سال گزر گئے اور قحط زدہ سال آ گئے تو جبریل امین اترے اور کہا: اے مصر والو! بھوکے ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر سات سال بھوک مسلط فرما دی۔ یہ بعض اہل عقل نے کہا ہے کہ بھوک اور قحط کی دو علامتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نفس عادت سے زیادہ کھانے کو پسند کرتا ہے اور پہلے کی نسبت اسے بھوک بھی جلدی لگتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھاتا ہے۔ اور دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ کھانا مفقود ہو جاتا ہے تو یہ دونوں علامتیں حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں جمع ہو گئیں۔ مرد، عورتیں اور بچے الجوع الجوع پکارتے! کھانا کھاتے مگر سیر نہ ہوتے اور بادشاہ بھی الجوع الجوع کی صدا لگاتا۔ پھر بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے نجات بخشی پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے پورے مصر میں یہ پیغام عام کر دیا کہ اے لوگو! کوئی آدمی بھی کھیتی کاشت نہ کرے اس طرح وہ بیج ضائع کرے گا اور کوئی چیز نہیں اگے گی اور وہ سال اتنے خطرناک آئے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب قحط کی ابتدا ہوئی تو بادشاہ کو آدھی رات کے وقت بھوک لگ گئی، تو اس نے کہا: اے یوسف! الجوع الجوع! تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: یہ قحط کی علامت ہے۔

پھر جب قحط زدہ سالوں میں سے پہلا سال آیا تو اس میں وہ سب کچھ ختم ہو گیا جو ان لوگوں نے شاداب سالوں میں جمع کیا ہوا تھا تو اہل مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کھانا خریدنا شروع کر دیا۔ آپ نے پہلے سال انہیں کھانا نقدی کے بدلے میں بیچا یہاں تک کہ مصر میں کوئی درہم و دینار نہ بچا تو آپ نے دوسرے سال زیورات اور جواہر کے بدلے میں انہیں کھانا بیچا حتیٰ کہ لوگوں کے پاس زیورات میں سے بھی کوئی چیز نہ بچی۔ تیسرے سال آپ نے انہیں مویشیوں اور چوپایوں کے بدلے میں کھانا بیچا، یہاں تک کہ وہ بھی سارے بک گئے۔ چوتھے سال غلاموں اور لونڈیوں کے بدلے دیا اور سب پر قبضہ کر لیا۔ پانچویں سال زمین کے بدلے میں کھانا بیچا یہاں تک کہ آپ سب زمینوں کے مالک ہو گئے۔ چھٹے سال ان کے بچوں اور بیویوں کے بدلے میں انہیں کھانا دیا اور ان سب کو غلام بنا لیا اور ساتویں سال خود ان کے اپنے بدلے ان کو کھانا دیا حتیٰ کہ ساتویں سال مصر میں ہر کوئی آپ کا غلام تھا، تو لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم نے اس سے بڑا کوئی بادشاہ نہیں دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کو کہا: میرے رب کی اس قدرت کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جس کا اظہار اس نے میرے حوالے سے فرمایا: اب یہ سب کچھ تمہارا ہے، اس کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ بادشاہ نے کہا: میں نظام حکومت آپ کے سپرد کرتا ہوں آپ جس طرح چاہیں کریں۔ ہم آپ کے تابعدار ہوں گے اور میں آپ کی اطاعت و فرمانبرداری سے کنارہ کشی اختیار کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میں تو آپ کے غلاموں میں سے ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں نے انہیں بھوک سے اس لیے آزاد نہیں کیا تھا کہ ان کو غلام بنا لوں، میں نے ان سے مصیبت کو اس لیے نہیں ہٹایا تھا کہ میں خود ان پر مصیبت بن جاؤں، میں اللہ کو اور آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے سب مصریوں کو آزاد کیا اور ان کے مال ان کو واپس لوٹائے اور خود تیری ملکیتیں تجھ پر اس شرط کے ساتھ واپس لوٹاتا ہوں کہ تو میرے طریقے پر چلے گا۔ اور روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان سالوں میں سیر ہو کر کھانا نہ کھاتے تھے، آپ کو کہا گیا: کیا آپ بھی بھوکے ہوتے ہیں حالانکہ آپ کے قبضہ میں

(مصر کی) سرزمین کے خزانے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ میں سیر ہو کر کھاؤں گا تو بھوکے کو بھول جاؤں گا، حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہی باورچی کو فرمایا کہ وہ آپ کا کھانا نصف دن کو بنایا کرے تاکہ بادشاہ بھی بھوک محسوس کرے اور بھوکوں کو بھول نہ جائے اسی وجہ سے بادشاہوں نے نصف دن کو اپنے کھانے پکوانے شروع کیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ یعنی اپنے احسان کے ذریعے رحمت کا معنی نعمت اور احسان ہے۔ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی ان کا ثواب۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت وہب نے کہا کہ محسنین سے مراد صابرین ہیں۔ اس کی وجہ حضرت یوسف علیہ السلام کا کنویں، غلامی اور قید میں صبر کرنا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے محارم سے صبر کرنا جبکہ عورت نے آپ کو اپنی طرف دعوت دی۔

ماوردی نے کہا: اس حالت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کچھ ملا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ابتلا اور آزمائش پر ثواب تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبتلا کیا تھا جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انعام فرمایا جبکہ ثواب آخرت اسی حالت پر باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ یعنی جو کچھ ہم آخرت میں دیتے ہیں وہ اس سے بہتر اور زیادہ ہے جو ہم دنیا میں عطا کرتے ہیں، کیونکہ آخرت کا اجر دائمی ہے جبکہ دنیا کا اجر ختم ہونے والا ہے آیت کا ظاہر تو ہر مومن اور متقی کے لیے عموم پر دلالت کر رہا ہے۔ انہوں نے شعر پڑھا:

أَمَا فِی رسول اللہ یوسفَ أُسْوَۃٌ لمثلکَ محبوسًا علی الظُّلم والإفْكِ
أقام جمیلَ الصّبرِ فی الحبس بُرهةً فآل به الصّبرُ الجمیلُ إلی المُلْك

اور ان میں سے کسی نے اس کے دوست کی طرف لکھا:

وراء مَضِيقِ الخوف مُتَّسَعُ الأَمْنِ وأوّلِ مفروجٍ به آخرُ الحزنِ
فلا تیأسن فاللہ مَلَّكَ یوسفًا خزائنه بعد الخلاصِ من السِّجن

اور کسی نے یہ شعر پڑھا ہے:

إذا الحادثاتُ بَلَغْنَ النُّهى وَكادت تَذوبُ لَهُنَّ المُهَجُ
وحلَّ البلاءُ وقَلَّ العزاء فعند التَّناهِی يكونُ الفَرَجُ

اور اس معنی میں بہت زیادہ اشعار ہیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

"اور ایک روز آنکلے برادران یوسف (علیہ السلام) اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکے"۔

قولہ تعالیٰ: وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ یعنی جب انہیں قحط لاحق ہوا تو وہ مصر آئے تاکہ غلہ حاصل کریں۔ یہ قرآن کریم کا

معجزانہ اختصار ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو کنعان میں بھی قحط آ گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو بھیجا، جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ ان کی نرمی، مہربانی، حسن سلوک، عدل اور سیرت کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل چکا تھا۔ جب لوگوں پر مصیبت آئی تو حضرت یوسف علیہ السلام لوگوں کی خاطر سودے کے وقت خود موجود ہوتے اور ان کی تعداد کے مطابق انہیں کھانا دیتے۔ ہر آدمی کو ایک وسق (ساٹھ صاع) ملتا۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں پہچان لیا وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ اور انہوں نے نہ پہچانا کیونکہ انہوں نے تو آپ کو بچپن میں چھوڑا تھا اور ان کا یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آپ غلامی کے بعد اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مدت بھی بڑی لمبی گزر چکی تھی۔

چالیس سال کی مدت گزری اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس لیے نہ پہچانا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ کافر بادشاہ ہے۔ ایک قول کے مطابق: انہوں نے آپ کو ریشمی لباس میں ملبوس دیکھا جبکہ آپ کی گردن میں سونے کا ہار تھا اور سر پر تاج اور آپ نے فرعون مصر کا سا لباس اور حلیہ بنا رکھا تھا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں اسی دور کے لباس اور حلیہ میں دیکھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس وجہ سے نہ پہچانا ہو کہ یہ ایک خلاف عقل اور خارق عادت معاملہ تھا اور اس سے مقصود امتحان تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیا۔

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

''سو جب مہیا کر دیا ان کے لیے ان (کی رسد وخوراک) کا سامان تو فرمایا: (دوبارہ آؤ) تو لے آنا میرے پاس اپنے پدری بھائی کو کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں۔ اور اگر تم اسے نہ لے آئے میرے پاس تو (سن لو) کوئی پیمانہ تمہارے لیے میرے پاس نہیں ہوگا اور نہ تم میرے قریب آ سکو گے۔ وہ بولے ہم ضرور مطالبہ کریں گے اس کے بھیجنے کے متعلق اس کے باپ سے اور ہم ضرور ایسا کریں گے''۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ کہا جاتا ہے: جھزت القوم تجھیزا یعنی میں نے ان کو ان کے سفر کے لیے ان کا سامان دے دیا اور شادیوں کا جہیز وہی ہوتا ہے جس کی شوہر کو بطور ہدیہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض کوفیوں نے الجھاز جیم کے کسرہ کو بھی جائز قرار دیا ہے اس آیت کریمہ میں الجھاز سے مراد کھانے کا وہ سامان ہے جو انہیں آپ کے پاس سے ملا۔ سدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پاس گیارہ اونٹ تھے جبکہ وہ خود دس تھے۔ انہوں نے حضرت یوسف کو کہا: ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے جو پیچھے رہ گیا ہے اور اس کا اونٹ ہمارے ساتھ ہے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں پیچھے رہ گیا؟ تو انہوں نے کہا: اس کے باپ کی اس کے ساتھ محبت کی وجہ سے۔ اور انہوں نے آپ کو بتایا کہ اس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا جو

جنگل میں گیا اور ہلاک ہو گیا، آپ نے انہیں فرمایا: میں تمہارے اس بھائی کو دیکھنا چاہتا ہوں جس کا تم نے ذکر کیا ہے تاکہ میں تمہاری صداقت اور اس کے ساتھ اس کے باپ کی محبت کا سبب جان سکوں۔ روایت ہے کہ وہ شمعون کو بطور رہن آپ کے پاس چھوڑ آئے اور پھر آپ کے بھائی بنیامین کو لے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام نے ترجمان کو کہا کہ انہیں کہو: تمہاری زبان ہماری زبان کے مخالف اور تمہارا لباس ہمارے لباس کے مخالف ہے تم کہیں جاسوس تو نہیں تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم جاسوس نہیں بلکہ ہم سب ایک باپ کے بیٹے ہیں اور وہ بوڑھا آدمی ہے، اس نے کہا: تمہاری تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم بارہ تھے ہمارا ایک بھائی جنگل کی طرف گیا اور وہیں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: دوسرا کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے باپ کے پاس؛ آپ نے فرمایا: کون تمہاری سچائی کو جانتا ہے؟ انہوں نے کہا: یہاں ہمیں کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم نے آپ کو اپنے نسب کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے، تو اب آپ کو ہم پر کس طرح اطمینان ہو سکتا ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ (اپنے باپ سے اپنے بھائی کو میرے پاس لے آؤ) اگر تم سچے ہو؛ تو میں مطمئن ہو جاؤں گا اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ یعنی میں وزن پورا کرتا ہوں اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتا اور تمہارے بھائی کے لیے ایک اونٹ کا وزن زیادہ دے رہا ہوں فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ اگر تم اس کو میرے پاس لے کر نہ آئے تو پھر میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں۔ آپ نے ان کو دھمکی دی کہ اگر وہ اسے نہ لے کر آئے تو آپ انہیں غلہ نہیں بیچیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ کے دو احتمال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے انہیں بھاؤ میں رخصت دی تو گویا وزن زیادہ ہو گیا اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے انہیں زیادہ وزن دیا ہو۔ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ آپ بہتر مہمان نواز ہیں، کیونکہ آپ نے ان کی عمدہ ضیافت فرمائی، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس تم آئے ہو ان میں میں امانت داری کے اعتبار سے بہتر ہوں۔ پہلی تاویل کے مطابق یہ النزل سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے "کھانا" اور دوسری صورت میں المنزل سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھر ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ یعنی میں اس کے بعد تمہیں کوئی چیز نہیں بیچوں گا کیوں کہ آپ نے انہیں اس حالت میں پورا وزن دے دیا۔ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ یعنی میں تمہیں اپنے ہاں قربت کا یہ مقام نہیں دوں گا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ سے دور ہو جائیں گے اور واپس لوٹ کے نہیں آئیں گے کیونکہ آپ نے انہیں واپس لوٹنے پر ابھارا ہے۔ سدی نے کہا: آپ نے ان سے واپس لوٹنے تک رہن کا مطالبہ کیا، تو شمعون آپ کے پاس رہن کے طور پر رہا۔ کلبی نے کہا: آپ نے ان میں سے شمعون کو اس لیے منتخب فرمایا کہ کنویں کے واقعہ کے دن اس کی رائے اور گفتگو سب سے عمدہ تھی۔ اور تَقْرَبُوْنِ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے اسی وجہ سے اس میں سے نون اور یا کو حذف کر دیا گیا کیونکہ یہ آیت کے آخر میں ہے۔ اگر یہ خبر ہوتی تو تَقْرَبُوْنِ نون کے فتح کے ساتھ ہوتا۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ یعنی ہم اس سے اس کا مطالبہ کریں گے اور یہ گذارش کریں گے وہ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں۔

وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ یعنی ہم اس کو یہاں تک لانے کے ضامن ہیں اور اس سلسلہ میں کوشش کریں گے۔

مسئلہ: اگر یہ کہا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کا مطالبہ کر کے اپنے باپ پر پریشانی ڈالنے کو کیسے جائز سمجھا؟ تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ اس کے چار جواب ہو سکتے ہیں۔

1۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش کرنے کے لیے آپ کو اس کا حکم دیا ہو تا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت زیادہ ثواب عطا فرمایا جائے۔ اور آپ نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی ہو۔ 2۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات سے آگاہ کرنا مراد ہو۔ 3۔ اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ان کے دونوں بیٹے اکٹھے واپس جائیں گے تو ان کی خوشی دوگنی ہو جائے گی۔ 4۔ اپنے بھائی کے سامنے رشتے کے ظاہر ہونے سے پہلے ملاقات کے ذریعے محبت و خوشی پیش کرنا مقصود ہو۔

البتہ پہلا معنی اور توجیہہ زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور آپ نے فرمایا اپنے غلاموں کو کہ (چپکے سے) رکھ دو ان کا سامان (جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا) ان خورجیوں میں تا کہ وہ اسے پہچان لیں جب وہ واپس لوٹیں اپنے گھر والوں کے پاس شاید وہ لوٹ کر آئیں''۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ یہ اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات ہے اور یہی ابو حاتم، نحاس اور دیگر لوگوں کے نزدیک مختار ہے، جبکہ سب کوفیوں نے اسے لفتیانہ پڑھا ہے اور ابو عبید کے نزدیک مختار ہے۔ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ کے مصحف میں بھی اس طرح ہے، ثعلبی نے کہا: یہ دونوں عمدہ لغتیں ہیں۔ جس طرح کہ الصبیان اور الصبیہ۔ نحاس نے کہا: لِفِتْيٰنِهِ سواد اعظم کے مخالف ہے کیونکہ سواد اعظم کے نزدیک نہ اس میں الف ہے اور نہ نون لہٰذا اس منقطع سند کی بنیاد پر سواد اعظم کو نہیں چھوڑا جائے گا اور یہ وجہ بھی ہے کہ فتیة، فتیان کی نسبت زیادہ مناسب ہے کیونکہ فتیة عربوں کے نزدیک کم تعداد کے لیے بولا جاتا ہے اور تھوڑے لوگوں کا خورجیوں میں سامان رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور ان غلاموں نے ان کے سامان کو برابر کر دیا تھا اسی وجہ سے ان کے لیے اپنا سامان اپنی خورجیوں میں رکھنا ممکن ہوا تھا۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ غلام نہ ہوں بلکہ آزاد ہوں اور آپ کے معاونین ہوں۔ اور ان کا سامان وہ دراہم اور دینار تھے۔ حضرت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جوتے، وہ سامان جس کو بطور سالن استعمال کیا جاتا ہے اور زاد راہ تھا اور اسے رحل کہتے ہیں۔ ابن انباری نے کہا: برتن کو بھی رحل کہا جاتا ہے اور گھر کو بھی رحل کہتے ہیں اور لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ ہو سکتا ہے کہ راستے میں وہ محفوظ نہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے ایسا اس لیے کیا تا کہ جب وہ اسے پائیں تو واپس لوٹیں کیونکہ آپ جانتے تھے کہ وہ بغیر قیمت کے کھانے کو قبول نہیں کریں گے۔ ایک قول کے مطابق یہ آپ نے اس لیے کیا تا کہ وہ کھانے کی خریداری کے لیے دوبارہ آپ کے پاس آئیں۔ ایک قول کے مطابق آپ نے ایسا اس لیے کیا کہ آپ نے اپنے باپ اور بھائیوں سے کھانے کی

قیمت لینے کو برا سمجھا۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسا کرنے کی حکمت یہ تھی کہ وہ لوگ آپ کی فضیلت و مہربانی کو دیکھیں اور دوبارہ آپ کے پاس آنے کی طرف راغب ہوں۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَیْهِمْ ؕ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِیْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا ۚ وَ نَمِیْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ ﴿۶۵﴾

''پھر جب واپس لوٹے اپنے باپ کے پاس تو عرض کرنے لگے: اے ہمارے پدر! (بزرگوار) روک دیا گیا ہم سے غلہ (لہٰذا از راہ نوازش) بھیجئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی (بنیامین) کو تاکہ ہم غلہ لا سکیں اور ہم یقیناً اس کی نگہبانی کریں گے۔ آپ نے (جواباً) فرمایا: کیا میں اعتماد کروں تم پر اس بارے میں بجز اس کے جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں اس سے قبل، پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ زیادہ مہربان ہے تمام مہربانی کرنے والوں سے۔ اور جب انہوں نے کھولا اپنا سامان تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مال انہیں واپس لوٹا دیا گیا ہے (ترغیب دینے کے لیے) کہنے لگے: اے ہمارے پدر (محترم)! ہم اور کیا چاہتے ہیں یہ (دیکھیے) ہمارا مال بھی لوٹا دیا گیا ہے ہماری طرف اور (اگر بنیامین ساتھ گیا تو) ہم رسد لائیں گے اپنے اہل خانہ کے لیے اور رکھوالی کریں گے اپنے بھائی کی اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ یہ غلہ بہت تھوڑا ہے''۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ انہوں نے یہ اس وجہ سے کہا کیونکہ انہیں فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ کہا گیا تھا۔ اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے ساتھ ہونے والے معاملے اور ملنے والی عزت و آرام سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ شمعون بطور رہن ان کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ وہ (یوسف) ان کی سچائی و صداقت کو جان نہیں لیتے۔ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ یعنی انہوں نے اس وقت کہا: ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے۔ نَكْتَلْ اصل میں نکتال تھا لام کلمہ سے ضمہ کو جزم کے لیے حذف کر دیا گیا۔ اور پھر الف کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ اہل حرمین، ابو عمرو اور عاصم کی قرات (نکتل) نون کے ساتھ ہے جبکہ سارے کوفیوں نے یکتل یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا ابو عبید کا مختار ہے تاکہ جو کچھ انہیں ملے اس میں وہ سب شریک ہو جائیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب یا کے ساتھ ہو تو اس وقت یہ صرف بھائی کے لیے ہوگا۔ نحاس نے کہا: یہ لازم نہیں؛ کیونکہ کلام دو صورتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں؛ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: فأرسل أخانا يكتل معنا (ہمارے بھائی کو بھیجئے وہ ہمارے ساتھ وزن کرے گا؛) تو اس صورت میں یہ سب کے لیے ہوگا یا تقدیر کلام تقدیم و تاخیر کے بغیر ہوگا جبکہ کلام میں ان سب کے داخل ہونے پر دلیل ہوگی،

اس (توجیہ) پر حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ۔

وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم اسے کسی تکلیف کے پہنچنے سے اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ یعنی تم نے یوسف کے ساتھ زیادتی کی تو اس کے بھائی کے حوالے سے میں تم پر کیسے اعتماد کرسکتا ہوں؟ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا بیان کی بنیاد پر یہ منصوب ہے۔ یہ اہل مدینہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرات ہے۔ سارے کوفیوں نے اسے حال کی بنیاد پر حافظا پڑھا ہے۔ زجاج نے کہا: بیان کی بنیاد پر ہے اس آیت کریمہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے حوالے سے جواب ارشاد فرمایا؛ آیت کا معنی یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ کا اس کی حفاظت کرنا تمہارے حفاظت کرنے سے بہتر ہے۔ کعب احبار نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت اور جلال کی قسم! تیرے میرے اوپر توکل کرنے کے بعد میں تیرے دونوں بیٹوں کو تیرے پاس واپس لوٹاؤں گا۔

وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ آیت کریمہ میں کوئی بھی مشکل معنی نہیں یعنی واضح ہے۔ مَا نَبْغِیْ، مَا محل نصب میں استفہام کے مقام پر ہے؛ معنی یہ ہوگا: ہم اس کے علاوہ کس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اس نے ہمارے لیے وزن پورا کیا اور ثمن بھی ہمیں واپس لوٹا دیئے اس سے انہوں نے اپنے باپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ایک قول یہ ہے کہ مَا نافیہ ہے یعنی ہم آپ سے دراہم اور سامان نہیں چاہتے بلکہ ہمیں ہمارا ہی سامان کافی ہے جو ہماری طرف لوٹا دیا گیا۔ علقمہ سے روایت ہے ردت الینا را کے کسرہ کے ساتھ کیونکہ اصل میں ''رددت'' ہے جب دال کو دال میں مدغم کیا گیا تو دال کی حرکت کو را کی حرکت سے بدل دیا گیا۔ اور نَمِیْرُ اَهْلَنَا سے مراد ہے ہم ان کے لیے کھانا لائیں گے شاعر نے کہا:

بَعَثْتُكَ مَائِرًا فَمَكَثْتَ حَوْلًا مَتٰى یَاْتِیْ غِیَاثُكَ مَنْ تُغِیْثُ(1)

میں نے تجھے کم عقلی کی حالت میں بھیجا تو پورا سال ٹھہر گیا، کب تیرا مددگار آئے گا جو مدد کرے گا۔

سلمی نے نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہم کھانا لانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ یعنی بنیامین کے اونٹ کا بوجھ (زیادہ لائیں گے)۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾

''آپ نے کہا: میں ہرگز نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ یہاں تک کہ کرو تم میرے ساتھ وعدہ جو پختہ کیا گیا ہو اللہ کی قسم سے کہ تم ضرور لے آؤ گے میرے پاس اسے مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے پس جب وہ لے آئے آپ کے پاس اپنا پختہ وعدہ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہم گفتگو کر رہے ہیں اس پر گواہ ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 16

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: تُؤْتُوْنِ کا مطلب ہے تعطون، مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی ایسا عہد جس پر یقین کیا جاسکے۔ سدی نے کہا: انہوں نے اللہ کی قسم اٹھائی کہ وہ ضرور اسے واپس لوٹائیں گے اور اسے کسی کے سپرد نہیں کریں گے لَتَاْتُنَّنِیْ میں ''لام'' لام قسم ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ مجاہد نے کہا: (اس کا مطلب ہے) مگر تم ہلاک ہوجاؤ یا مرجاؤ (1)۔ قتادہ نے کہا: مگر یہ کہ تم پر غلبہ پالیا جائے (2)۔ زجاج نے کہا: یہ محل نصب میں ہے۔ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ یعنی اس قسم کی حفاظت کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے: عہد کی حفاظت کرنے والا، تدبیر و عدل کے ذریعے اسے قائم کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کریمہ کفالت بالعین اور وثیقہ بالنفس کے جواز میں اصل ہے علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر علماء نے کہا ہے: یہ اس صورت میں جائز ہے جب متحمل بہ مال ہو۔ امام شافعی نے مال میں کفالت بالوجہ کو ضعیف قرار دیا ہے؛ اور ان کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے۔ عثمان بتی نے کہا: جب کسی نے قصاص یا زخم کی کفالت بالنفس کی تو اس کو نہ لانے کی صورت میں اس پر دیت اور زخم کا تاوان لازم ہوگا اور اسے ظلم کرنے والے کے مال میں سے ادا کیا جائے گا کیونکہ کفیل پر قصاص لازم نہیں ہوتا۔ یہ کفالت بالوجہ کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ اور صحیح وہ تفریق ہے جو امام مالک نے کی کہ کفالت یا ضمانت مال میں ہوسکتی ہے اور حد اور تعزیر میں نہیں ہوسکتی جس طرح کہ اس کا بیان آئے گا۔

وَ قَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور آپ نے کہا: اے میرے بچو! (شہر میں) نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے بلکہ داخل ہونا مختلف دروازوں سے اور نہیں فائدہ پہنچا سکتا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی، نہیں ہے حکم مگر اللہ تعالیٰ کے لیے، اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی پر توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب انہوں نے جانا چاہا تو آپ کو انہیں نظر بد لگنے کا اندیشہ لاحق ہوا؛ تو آپ نے انہیں شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونے کا حکم فرمایا۔ شہر کے چار دروازے تھے۔ آپ کو انہیں اس وجہ سے نظر بد کا اندیشہ ہوا کہ ایک آدمی کے گیارہ بیٹے ہوسکتے ہیں اور وہ سب خوبصورت، کمال کے حامل اور بھاری بھر کم تھے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اگر آیت کا معنی یہ ہو تو اس میں نظر سے بچنے پر دلیل ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ نظر حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک نظر آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کرسکتی ہے''۔ اور اس سے بچنے کے حوالے سے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 16 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 18

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ (1) بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام مالک نے حضرت محمد بن ابی امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ابو سہل بن حنیف نے خرار (مدینہ کی وادی) سے غسل کیا، اپنا جبہ اتارا تو عامر بن ربیعہ دیکھ رہے تھے۔ راوی نے کہا: سہل سفید رنگت والا اور خوبصورت جلد والا تھا۔ تو عامر بن ربیعہ نے انہیں کہا: اتنے گورے رنگ کا اتنا خوبصورت شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سہل کو اسی وقت بخار چڑھ گیا اور بخار شدت اختیار کر گیا نبی کریم ﷺ کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ سہل کو بخار چڑھ گیا ہے اور وہ آپ کے پاس نہیں جا سکتا رسول اللہ ﷺ سہل کے پاس تشریف لائے تو حضرت سہل نے عامر کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں آپ کو بتایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی کیوں اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے؟ تم نے تبارک اللہ أحسن الخالقین اللھم بارک فیہ کیوں نہ کہا بے شک نظر کا لگنا حق ہے تم اس کے لیے وضو کرو'' (2)۔ حضرت عامر نے وضو کیا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلے گئے اور وہ بالکل تندرست تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عامر کو کچھ اعضاء دھونے کا حکم دیا تو حضرت عامر نے اپنا چہرہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے اور پاؤں کے اطراف اور ازار کے اندر جسم کا حصہ ایک برتن میں دھویا پھر اسے (غسالہ) کو حضرت سہل کے اوپر بہا دیا گیا تو حضرت سہل نبی کریم ﷺ کے ساتھ چلے گئے اور انہیں کوئی مسئلہ نہ رہا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص ایک دن سوار ہوئے آپ کی طرف ایک عورت نے دیکھا تو کہا: تمہارا یہ امیر دونوں پہلوؤں میں پتلی اور نازک کمر والا ہے۔

آپ اپنے گھر واپس لوٹے تو گر پڑے آپ کو وہ بات بتائی گئی جو اس عورت نے کہی تو آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا اس نے آپ کے لیے غسل کیا۔

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ نظر کا لگنا حق ہے اور یہ آدمی کو مار ڈالتی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے یہ علماء امت کا قول اور اہل سنت کا مذہب ہے، جبکہ بدعتیوں کے ایک گروہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ سنت، اس امت کے اجماع اور ایک امر واقع کے منکر ہیں، اس لیے کہ کتنے ہی لوگ ہیں جن کو نظر بد نے قبر میں داخل کر دیا ہے اور کتنے ہی خوبصورت اونٹ ہیں جن کو اس نے ہنڈیا میں پہنچا دیا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ: 102) (اور وہ اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے) اصمعی نے کہا: میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کی نظر لگتی تھی اس نے سنا کہ ایک گائے بہت زیادہ دودھ دیتی ہے اس کو یہ بہت اچھا لگا اس نے پوچھا: وہ کون سی گائے ہے؟ لوگوں نے کوئی اور گائے بتائی اور اس کو مخفی رکھا تو وہ دونوں گائیں مر گئیں۔ اصمعی نے کہا: میں نے اس آدمی کو کہتے ہوئے سنا: جب میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگتی ہے تو میں ایک حرارت پاتا ہوں جو میری آنکھوں سے نکلتی ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، ماعوذ بہ النبی ﷺ، صفحہ 260

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، العین، صفحہ 259۔ ایضاً، حدیث نمبر 3499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب اسے کوئی چیز اچھی لگے تو وہ بارك الله فيه کہے کیونکہ جب وہ برکت کی دعا کرے گا تو لازمی طور پر برائی کو اس سے ہٹا لیا جائے گا۔ کیا آپ حضرت عامر کو کہے جانے والے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو نہیں دیکھتے: ألا بركت تو نے بارك الله فيه کیوں نہ کہا۔ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب نظر لگانے والا بارك الله فيه کہہ دیتا ہے تو نظر نہ لگتی ہے اور نہ ہی نقصان کرتی ہے، البتہ اگر وہ یہ الفاظ نہ کہے تو پھر نظر لگ جاتی ہے۔ پوری تبریک یہ ہے: تبارك الله أحسن الخالقين اللهم بارك فيه۔

مسئلہ نمبر 4۔ نظر لگانے والی کی نظر جب لگ جائے اور وہ بارك الله فيه نہ کہے تو اسے غسل کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ انکار کرے تو اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے، بالخصوص یہ امر، کیونکہ بعض اوقات نظر لگنے والے کی ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے اور کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کو ایسے کام سے روکے جس کی وجہ سے اس کے ایک بھائی کو فائدہ ہو سکتا ہے اور وہ نقصان سے بچ سکتا ہے بالخصوص اس صورت میں کہ جب وہ نقصان اس کی وجہ سے ہو رہا ہو۔

مسئلہ نمبر 5۔ جس آدمی کو اپنی آنکھ لگنے کا پتہ چل جائے اسے لوگوں میں جانے سے روک دیا جائے گا تا کہ لوگ اس کی تکلیف سے محفوظ رہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: امام اسے گھر میں نظر بند کرنے کا حکم دے گا اور اگر اس کے رزق کا مسئلہ ہو تو اس کی کفالت کرے گا اور لوگوں سے اس کی اذیت کو روکا جائے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے ملک بدر کیا جائے گا؛ البتہ امام مالک کی وہ روایت جو ہم نے ذکر کی ہے وہ ان اقوال کی تردید کرتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نہ تو حضرت عامر کی قید کا حکم دیا اور نہ ہی ملک بدری کا، بلکہ بعض اوقات نیک آدمی کی بھی نظر لگ جاتی ہے اور نہ تو اس میں یہ بات قدح کا باعث ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے اس پر فسق کا حکم لگایا جا سکتا ہے؛ اور جس آدمی نے کہا ہے: اسے قید کیا جائے اور نظر بندی کا حکم دیا جائے گا تو یہ احتیاط ہے اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک نے حمید بن قیس مکی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے پاس جعفر بن ابی طالب کے دو بیٹے لائے گئے تو آپ نے ان کی دائی کو فرمایا: ''کیا بات ہے میں ان دونوں کو کمزور دیکھتا ہوں؟'' تو دائی نے کہا: یا رسول اللہ! ان دونوں کو جلدی نظر لگ جاتی ہے، اور آپ نے ہمیں ان کو دم کرنے سے نہ روکا البتہ ہم نہیں جانتے کہ آیا وہ تمہارے موافق آتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو دم کرو کیونکہ اگر تقدیر سبقت لے گئی تو نظر سبقت لے جائے گی۔'' یہ حدیث منقطع ہے۔ البتہ حضرت اسماء بنت عمیس خثعمی والی روایت محفوظ ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کی ہے۔ اس میں ہے کہ دم ان چیزوں میں سے ہے جن کے ذریعے مصیبت کو روکا جاتا ہے اور نظر انسان میں اثر بھی کرتی ہے اور تکلیف بھی دیتی ہے یعنی اسے کمزور کرتی ہے اور اس میں نقاہت پیدا کرتی ہے؛ اور یہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے ہے اور کہا جاتا ہے کہ نظر بڑوں کی نسبت چھوٹوں میں جلدی اثر کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ حدیث ابو امامہ میں نبی کریم ﷺ نے نظر لگانے والے کو اس آدمی کے لیے غسل کرنے کا حکم فرمایا

ہے جس کو نظر لگی ہے اور اس روایت میں دم کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔" ہمارے (مالکیہ) علماء نے کہا ہے: دم اس صورت میں ہوگا جب نظر لگانے والے کا پتہ نہ ہو، اور جب نظر لگانے والے کا پتہ چل جائے تو پھر حدیث ابوامامہ کے مطابق اسے وضو کا حکم دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ یعنی ایسی چیز سے جس سے میں تمہیں محتاط رہنے کا حکم دیتا ہوں یعنی احتیاط، تقدیر کے ساتھ کوئی نفع نہیں دیتی۔ اِنِ الْحُكْمُ یعنی امر اور قضاء اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میں نے اعتماد اور بھروسہ کیا۔ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ اور اسی پر توکل کرنے والوں کو توکل کرنا چاہیے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾

"اور جب وہ (مصر میں) داخل ہوئے جس طرح حکم دیا تھا انہیں ان کے باپ نے، وہ نہیں فائدہ پہنچا سکتا تھا انہیں اللہ کی تقدیر سے کچھ بھی مگر (یہ احتیاطی تدبیر) ایک خیال تھا نفس یعقوب میں جسے انہوں نے پورا کیا اور بے شک وہ صاحب علم تھے بوجہ اس کے جو ہم نے سکھایا تھا انہیں لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ اور جب پہنچے یوسف کے پاس تو یوسف نے جگہ دی اپنے پاس اپنے بھائی کو (نیز) اسے فرمایا: میں تمہارا بھائی ہوں نہ غمزدہ ہو (ان حرکتوں پر) جو یہ کیا کرتے تھے پھر جب فراہم کر دیا انہیں ان کا سامان (خوراک) تو رکھ دیا (اپنا) پیالہ اپنے بھائی کی خورجی میں پھر پکارا ایک پکارنے والا: اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو"۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ یعنی مختلف دروازوں سے مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ یعنی اگر وہ ان پر کوئی ناپسندیدہ بات واقع کرنے کا ارادہ فرمالے تو اللہ کی تقدیر سے انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ اِلَّا حَاجَةً یہ استثنا ہے مگر متصل نہیں فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا یعنی خدشہ تھا جو ان کے دل میں کھٹکا؛ اور وہ ان کی وصیت تھی کہ وہ جدا جدا رہیں۔ مجاہد نے کہا: نظر کا اندیشہ تھا، اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ ہے: (متفرق داخل ہونے کی بنیاد اس خدشے پر تھی) کہ بادشاہ ان کی تعداد اور قوت کو نہ دیکھ لے کہ کہیں حسد کے مارے یا احتیاطاً ان کو پکڑ ہی نہ لے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ نحاس نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس نے کہا: یہاں نظر کا کوئی مطلب نہیں ہے اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اندیشے اور خوف والے کام سے محتاط کرے اور اس کی رہنمائی ایسے عمل کی طرف کرے جس میں سلامتی اور نجات ہو کیونکہ دین خیر خواہی ہے اور مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِنَّهٗ یعنی یعقوب علیہ السلام لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ یعنی اپنے دین کے معاملے کے بارے میں۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اپنے دین کے معاملے میں جو کچھ حضرت یعقوب علیہ السلام جانتے تھے وہ وہ نہیں جانتے تھے۔ ایک قول کے مطابق لَذُوْ عِلْمٍ سے مراد عمل والا ہے؛ کیونکہ علم، عمل کا پہلا سبب ہے لہٰذا یہاں سبب بول کر مسبب مراد لے لیا گیا ہے۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ (1) قتادہ نے کہا: اٰوٰۤى اِلَیْهِ سے مراد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو اپنے پاس بٹھایا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے حکم دیا کہ دو دو آدمی ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ، تو ایک بھائی اکیلا رہ گیا سواسے اپنے پاس بٹھالیا اور فرمایا: میں نے تنہائی کی وجہ سے اس پر شفقت کی ہے اور دیگر بھائیوں سے علیحدہ راز میں اس بھائی کو فرمایا: اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ یعنی میں تمہارا بھائی ہوں تو پریشان نہ ہو بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ان کی ان حرکتوں پر جو یہ کیا کرتے تھے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ جب بنیامین نے جان لیا کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں تو اس نے آپ کو کہا: مجھے ان کے حوالے نہ کرنا، تو آپ نے فرمایا: تو میرے بارے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے غم کو جانتا ہے تو اس طرح تو ان کے غم میں اضافہ ہو جائے گا تو بنیامین نے نکلنے سے انکار کر دیا؛ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تمہیں بغیر کسی نامناسب عمل کے قید کرنا ممکن نہیں، بنیامین نے کہا: مجھے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے صاع کو ان کے سامان میں ڈال دیا؛ یا تو خود ڈالا کہ کسی کو بھی اس کا پتہ نہ چلا یا پھر اپنے کسی خاص آدمی کو یہ کام کرنے کا حکم دیا۔ اور التجهیز سے مراد کھولنا اور کام کو فوراً کرنا ہے، اسی سے جهز علی الجریح ہے یعنی اس کو اس نے قتل کر دیا اور اس کا معاملہ جلدی جلدی ختم کر دیا۔ السِّقَایَةَ اور صاع ایک ہی چیز ہیں یہ ایک ایسا برتن ہے جس کے دو سرے ہوتے ہیں اور درمیان میں ایک پکڑنے والا قبضہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اس کے ایک سرے سے پیتا تھا اور دوسرے سرے سے کھانے کو لیتا تھا؛ یہ نقاش کا قول ہے جو اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ہر وہ چیز جس کے ذریعے پیا جائے تو وہ صواع ہے۔ شاعر نے کہا:

نَشْرَبُ الْخَمْرَ بِالصُّوَاعِ جِهَارًا

ہم صواع کے ذریعے اعلانیہ شراب پیتے ہیں۔

اس کی جنس میں اختلاف ہے؛ شعبہ نے ابو بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بادشاہ کا صواع چاندی کی ایسی چیز تھی جو مکوک کے مشابہ تھی ایسی چاندی سے بنا ہوا تھا جو جواہرات سے مرصع تھا اس کو سر پر رکھا جاتا تھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی زمانہ جاہلیت میں ایک صاع تھا۔ نافع بن ازرق نے آپ سے پوچھا: صواع کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: برتن؛ اس کے بارے میں اعشیٰ نے کہا ہے:

له دَرْمَكٌ فی رأسه و مَشارِبٌ ... وقِدْرٌ وطَبَّاخٌ وصاعٌ ودَيْسَقُ

عکرمہ نے کہا: یہ چاندی کا تھا(2)۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: سونے کا تھا؛ اسی کے ذریعے آپ نے ان کے کھانے کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 21   2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 24

تو لا مقصود ان کی عزت و احترام میں مبالغہ تھا۔ ایک قول کے مطابق اس کے ذریعے اس وجہ سے کیل کیا جاتا تھا کہ کھانا کم تھا۔ اور صاع مذکر اور مونث دونوں طرح مستعمل ہے۔ جس نے اس کو مونث کہا اس نے اصوع بروزن ''أدور'' کہا ہے اور جس نے مذکر استعمال کیا ہے اس نے اصواع بروزن اثواب کہا ہے۔

اس کی کئی قرآتیں ہیں: صواع عام قرآت ہے؛ صوغ غین کے ساتھ یہ یحیٰی بن یعمر کی قرآت ہے؛ انہوں نے کہا: یہ ایک ایسا برتن تھا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ صوع عین کے ساتھ یہ ابو رجاء کی قرأت ہے۔ صوع صاد مضموم، واو ساکنہ اور عین کے ساتھ حضرت ابی کی قرأت ہے۔ صاع صاد اور عین کے درمیان الف کے ساتھ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی قرآت ہے۔

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ یعنی منادی کرنے والے نے منادی کی اور اعلان کیا۔ و أذن تکثیر کے لیے ہے گویا کہ ندا دینے والے نے بار بار منادی کی اَیَّتُهَا الْعِیْرُ، الْعِیْرُ سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوجھ لادا جاتا ہے جیسے گدھا، اونٹ اور خچر وغیرہ۔ مجاہد نے کہا: ان کی سواریاں گدھے تھے (1)۔ ابو عبید نے کہا: الْعِیْرُ سے مراد وہ اونٹ ہے جو سفر کرتا ہے اور اس پر سواری کی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا یا اصحاب العیر جس طرح اللہ کا ارشاد وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) یعنی واسأل اهل القرية ہے۔ اور یا خيل الله اركبي یعنی یا اصحاب خيل الله ہے۔ یہاں دو اعتراضات ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر کہا جائے بنیامین اپنی خوشی سے وہاں بیٹھنے پر کس طرح راضی ہوئے حالانکہ اس میں غم کی زیادتی کے ساتھ باپ کی نافرمانی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ان کی موافقت کر لی؟ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کیسے کر لی حالانکہ وہ بری تھے یہ دوسرا اعتراض ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام پر پریشانی وغم اتنا غالب آ چکا تھا کہ بنیامین کی گمشدگی نے اس میں کوئی اثر نہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب بنیامین گم ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ (یوسف: 84) اور بنیامین کی طرف آپ نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور شاید حضرت یوسف علیہ السلام نے وحی کی وجہ سے ان کے ساتھ اتفاق کر لیا ہو۔ اس صورت میں کوئی اعتراض ہی نہیں۔ اور جہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کرنے کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود انہیں ان کے باپ سے چوری کیا اور کنویں میں پھینک دیا تھا پھر بیچ دیا تھا، لہٰذا وہ اس عمل کی وجہ سے اس نام کے مستحق تھے سو اس نام کا اطلاق ان پر صادق آتا تھا۔ جبکہ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے اس سے یہ مراد لیا تھا کہ اے قافلہ والو! تمہاری حالت چوروں کی سی ہے؛ اور مطلب یہ ہوگا کہ کسی اور آدمی کی چیز بادشاہ کی رضامندی اور علم کے بغیر تمہارے پاس ہے۔ اس کا ایک اور جواب یہ بھی ہے کہ یہ اپنے بھائی کو ساتھ رکھنے اور ان سے جدا کرنے کا ایک حیلہ تھا، یہ جواب اس صورت میں ہوگا جب بنیامین کو ان کی خورجی میں صاع کے رکھے جانے کا علم نہ ہو اور نہ ہی آپ نے خود ان کو اس بات کی خبر دی ہو۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ کلام کا معنی استفہام ہے، یعنی کیا تم چور ہو؟ جس طرح کہ وتلك نعمة یعنی أوتلك نعمة عنها علی؟ اور مقصود یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 25

طرف جھوٹ کی نسبت نہ کی جائے۔

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ۝ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ۝

''(حیرت زدہ ہوکر) بولے درانحالیکہ وہ ان کی طرف متوجہ تھے کون سی چیز تم نے گم کی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نے گم کیا ہے بادشاہ کا پیالہ اور وہ شخص جو (ڈھونڈ) لائے گا اسے (بطور انعام) بار شتر (غلہ) دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں بَعِيْرٍ سے مراد اونٹ ہے۔ جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ گدھا ہے یہ بعض عربوں کی لغت ہے یہ مجاہد کا قول ہے اور انہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے اور مجاہد نے کہا: زَعِيْمٌ سے مراد وہ منادی کرنے والا ہے جس نے أيتها العير کہا تھا (1)۔ زعیم، کفیل، حمیل، ضمین اور قبیل برابر ہیں اور زعیم سے مراد رئیس ہے۔

شاعر نے کہا:

وَإِنِّي زَعِيمٌ إِنْ رَجَعْتُ مُمَلَّكًا   بِسَيْرٍ تَرَى مِنْهُ الْفُرَانِقَ أَزْوَرَا

أني زعيم یعنی میں رئیس ہوں۔

لیلی اخیلیہ نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

وَمُخَرَّقٍ عنهُ القميصُ تَخَالُهُ   يومَ اللِّقاءِ من الحياءِ سَقِيمَا

حتىٰ إذا رَفَعَ اللِّوَاءَ رأيتَهُ   تحتَ اللِّواءِ على الخَمِيسِ زَعِيمَا(2)

مسئلہ نمبر 2۔ اگر کہا جائے: آپ نے اونٹ کے بوجھ کی ضمانت کیسے قبول کر لی حالانکہ وہ مجہول ہے اور مجہول کی ضمانت صحیح نہیں؟ تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ اونٹ کا بوجھ ان کے نزدیک معین و معلوم تھا جس طرح کہ وسق؛ لہٰذا اس کی ضمانت صحیح ہے البتہ یہ چور کے مال کا بدلہ تھا اور چور کے لیے ایسا صحیح نہیں اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شاید یہ ان کی شریعت میں صحیح ہو یا پھر یہ جعل (کسی چیز کو ڈھونڈنے کی اجرت) ہو۔ اور اس آدمی کے لیے مال خرچ کرنے کے مترادف ہو جو تفتیش کرتا ہے اور ڈھونڈتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: ایک جعل کے جواز کی اس کو ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے اس میں جہالت جائز ہے جو کہ کسی اور عقد میں جائز نہیں؛ جب آدمی نے کہا: جس نے ایسا کیا تو اس کے لیے یہ ہوگا تو یہ صحیح ہے۔ جعل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک طرف معلوم ہوتی ہے جبکہ دوسری ضرورت کی بنا پر مجہول ہوتی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 26   2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 28

ہے بخلاف اجارہ کے؛ اس میں عوض اور معوض دونوں جہتوں سے مقرر ہوتا ہے؛ یہ ان عقود جائزہ میں سے ہے جن کو کسی ایک کے لیے فسخ کرنا جائز ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مجعول لہ کے لیے اس کو شروع سے پہلے اور بعد میں دونوں صورتوں میں فسخ جائز ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے حق کو ساقط کرنے پر راضی ہو جبکہ جاعل کے لیے اسے اس وقت فسخ کرنا جائز نہیں ہوتا جب مجعول لہ کام میں شروع ہو جائے۔ عقد جعل میں متعاقدین کا حاضر ہونا شرط نہیں ہوتا جس طرح کہ دیگر عقود میں شرط ہوتا ہے؛ اس کی دلیل یہ آیت ہے وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ یہ سب امام شافعی نے فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب آدمی نے کہا: جو میرے بھاگے ہوئے غلام کو لے کر آیا تو اس کے لیے اتنے دینار، تو جب کوئی آدمی اسے لے آیا تو اسے وہ رقم لازم ہو جائے گی اور اگر بغیر ضمان کے لے کر آیا تب بھی مال لازم ہوگا جب وہ اجرت کے مطالبے پر اسے لے کر آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من جاء بابق فله اربعون درهما جو بھاگے ہوئے غلام کو لے کر آیا تو اس کے لیے چالیس درہم ہوں گے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات میں کوئی تفریق بیان نہیں فرمائی کہ وہ عقد ضمان کی صورت میں لایا یا بغیر عقد کے لایا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اور اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا: جس نے کسی آدمی کا کوئی ایسا کام کیا جس کا کرنا اس پر اس کے مصالح میں سے بذات خود لازم تھا تو اس کے لیے یہ مال لازم ہوگا، اور اگر وہ ایسا آدمی ہے اور اجرت پر کام کرتا ہے تو اس کے لیے اجرت مثل ہوگی۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس سبب میں ہم نے امام شافعی کی مخالفت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دوسری دلیل۔ کفالت کا جواز آدمی پر ہوگا؛ کیونکہ ضامن منادی حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ تھا، ہمارے علماء نے کہا: جب آدمی نے کہا تحملت، تكفلت، ضمنت، أنا حميل، أنا زعيم، أنا كفيل، أنا ضامن، أنا قبيل، هو لك عندي، هو لك علي، هو لك إلي یا هو لك قبلي تو یہ ساری کفالت ہے اور اسے لازم ہوگی۔ فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی نے کفالت بالنفس یا کفالت بالوجہ کی تو کیا اسے مال کی ضمانت لازم ہوگی یا نہیں؟ کوفیوں نے کہا: جس نے کسی آدمی کی کفالت بالنفس کی تو اسے وہ حق لازم نہیں ہوگا جو مطلوب پر تھا اگر مطلوب فوت ہو جائے۔ یہی امام شافعی کے دو مشہور قولوں میں سے ایک ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: جب کسی نے کفالت بالنفس کی اس حال میں کہ اس پر مال لازم تھا تو اگر وہ اسے لے کر نہ آیا تو بطور تاوان اس پر مال لازم ہوگا اور پھر مطلوب پر رجوع کرے گا؛ اور اگر اس نے کفالت بالنفس یا کفالت بالوجہ کی اور کہا: میں مال کا ضامن نہیں ہوں گا تو اس پر مال میں سے کچھ نہیں ہوگا۔ اور جس نے بطور تاوان مال کو لازم قرار دیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کفیل کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کفیل بالوجہ سے خون کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے؛ پس جب وہ اس کا ضامن بنا اور پھر اسے نہ لایا تو گویا وہ اس پر غالب آ گیا اور اس کے ہاتھوں سے نکل گیا لہٰذا اسے مال لازم ہو جائے گا۔ امام طحاوی نے احناف کی دلیل کو بیان کرتے ہوئے کہا: مکفول بہ کی موت کی وجہ سے مال کی ضمانت کے کوئی معنی نہیں کیونکہ اس نے کفالت بالنفس کو قبول کیا تھا نہ کہ کفالت بالمال کو، اور یہ تو محال ہے کہ جس کی اس نے ضمانت دی ہی نہیں وہ اسے لازم ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے کی طرف سے مال کا کفیل بنا؛ تو کیا مطالبہ کرنے والے کے لیے ان دونوں میں سے جس سے چاہے مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام ثوری، احناف، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد اور اسحق نے کہا: وہ جس سے چاہے لے سکتا ہے یہاں تک کہ اپنا حق پورا کرلے؛ اور یہی امام مالک کا قول تھا پھر انہوں نے اس سے رجوع کرلیا تھا اور کہا: وہ کفیل سے نہیں لے سکتا البتہ اگر مقروض کی مفلسی کا اعلان کردیا جائے یا وہ غیب ہوجائے تو پھر کفیل سے مطالبہ جائز ہوگا؟ کیونکہ جس پر حق لازم ہے اسی سے لینا زیادہ بہتر ہے، ہاں اگر وہ نہ رہے تو پھر کفیل سے لیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں تو وہ اس سے لینے میں معذور ہے؛ یہ حسن کا قول ہے۔ اور قیاس یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جس سے چاہے مطالبہ کرسکے۔ ابن ابی لیلی نے کہا: جب آدمی کسی کے لیے مال کا ضامن بنا تو وہ مال کفیل پر لازم ہوجائے گا اور اصل اس سے بری ہوجائے گا، البتہ اگر مکفول لہ نے ان دونوں سے مطالبہ کرنے کی شرط لگالی ہو تو پھر ان دونوں میں سے جس سے چاہے لے سکتا ہے، انہوں نے حضرت ابوقتادہ (1) کی ضمانت کی وجہ سے میت کے بری ہوجانے والے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ یہی ابوثور کا بھی قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ضمانت صرف ان حقوق میں دی جاسکتی ہے جن کی نیابت ہوسکتی ہے جن کا تعلق اموال کے ساتھ ہو اور وہ پختہ طریقہ سے ثابت بھی ہو؛ کفالت بالکتابت صحیح نہیں کیونکہ یہ ثابت و مستقر دین نہیں؛ کیونکہ غلام اگر بدل کتابت دینے سے عاجز آجائے تو وہ پھر غلام بن جاتا ہے اور اس کی کتابت فسخ ہوجاتی ہے۔ اور جہاں تک ان حقوق کا تعلق ہے جو کوئی آدمی کسی کی طرف سے ادا نہیں کرسکتا تو ان میں کفالت و ضمانت بھی نہیں ہوگی اور مدعی اسے قید کرے گا جس پر حد لازم ہے یہاں تک کہ اس کے معاملے کو وہ دیکھے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے حدود و قصاص میں کفالت کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے کہا: جب مقذوف یا مدعی قصاص نے کہا کہ میرے پاس بینہ حاضر ہے تو وہ تین دن کی ضمانت لے گا؛ امام طحاوی نے ان کے حق میں حمزہ بن عمرو عن عمرو بن مسعود و جریر بن عبد اللہ و اشعث کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے صحابہ کی موجودگی میں کفالت بالنفس کا فیصلہ کیا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ۝ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِیْنَ ۝ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

''کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو کہ ہم (یہاں) اس لیے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں زمین میں اور نہ ہی ہم چوری پیشہ ہیں (خدام یوسف) نے کہا: پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہوجاؤ۔ انہوں نے کہا کہ اس کی سزا

1۔ سلمہ بن اکوع نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کے لیے تشریف لائے آپ نے فرمایا: ''کیا اس پر کوئی قرض ہے'' لوگوں نے کہا: ''ہاں'' آپ نے فرمایا: ''کیا اس نے کوئی چیز چھوڑی ہے، انہوں نے کہا: ''نہیں'' آپ نے فرمایا: ''اپنے دوست کا جنازہ پڑھ لو'' حضرت ابوقتادہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ جنازہ پڑھیے اس کا قرض میرے ذمے رہا'' تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

یہ ہے کہ جس کے سامان میں یہ پیالہ دستیاب ہو تو وہ خود ہی اس کا بدلہ ہے، اسی طرح ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو"۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ روایت ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی کھیتی کا نقصان کرتے تھے انہوں نے اپنے اونٹوں کے مونہوں کو باندھا ہوا تھا تاکہ وہ لوگوں کی کھیتیوں کو خراب نہ کریں۔ کچھ کہا: وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ روایت ہے کہ انہوں نے وہ سامان واپس لوٹا دیا جو ان کی خورجیوں میں تھا؛ تو اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ جو آدمی حاصل شدہ مال واپس لوٹا دے وہ چور کیسے ہو سکتا ہے؟

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ معنی یہ ہوگا: اگر تمہارا جھوٹ ظاہر ہو جائے تو پھر ایسا کرنے والے کی سزا کیا ہوگی؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جواب دیا: جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ یعنی اسے غلام بنا لیا جائے گا۔ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ مبتدا ہے اور مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ اس کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: جَزَاءُهُ اِسْتِعْبَادُ مَنْ وُجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ یہ غلام بنانے سے کنایہ ہے جس طرح کہا جاتا ہے: جزاء من سرق القطع فهذا جزاءه جس نے چوری کی اس کی سزا قطع ید ہے پس یہی اس کی سزا ہے تو جملہ میں تاکید کا معنی پایا جا رہا ہے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی ہم اس طرح ظالموں کے ساتھ کرتے ہیں یعنی جب وہ چوری کریں تو انہیں غلام بنا لیتے ہیں، تو یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین میں تھا اور ان کا یہ قول ان میں سے اس کا ہے جس کو چوری کے حوالے سے کوئی شک و شبہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے اس کی غلامی کو ثابت کیا جس کی خورجی میں سے پیالہ ملے، اور اہل مصر کے ہاں چور کا حکم یہ تھا کہ جس سے مال مل جائے اس سے دوگنا مال وصول کیا جاتا؛ یہ حضرت حسن اور سدی وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ۔ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے کہ چوری کی وجہ سے قطع ید کا ہونا پہلی سب شریعتوں کا ناسخ ہے اسی طرح جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور کو غلام بنانے کا قانون تھا یہ اس کا بھی ناسخ ہے۔ واللہ اعلم۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝

"پس تلاشی لینی شروع کی ان کے سامانوں کی یوسف کے بھائی کے سامان کی تلاشی سے پہلے آخر کار نکال لیا وہ پیالہ اس کے بھائی کی خورجی سے، یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کے لیے، نہیں رکھ سکتے تھے یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ مصر کے قانون میں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، ہم بلند کرتے ہیں درجے جن کے چاہتے ہیں، اور ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی خورجیوں سے شروع کیا کیونکہ اگر اپنے بھائی کی خورجی سے شروع کرتے تو ان کے دلوں میں الزام اور شک پیدا ہو سکتا تھا تو گویا اس طرح الزام اور شک کی نفی کر

دی۔ الوعاء واو کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں؛ اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس میں سامان کی حفاظت کی جاتی ہے اور اسے بچایا جاتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ یعنی بنیامین کی خورجی سے نکالا؛ استخراج کے ساتھ آنے والی ھا ضمیر سے مراد سقایۃ ہے یا پھر صواع ہے یہ اس آدمی کے نزدیک ہوگا جو اسے مونث سمجھتا ہے؛ اور وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ فرمایا یہ ضمیر مذکر کی ہے تو یہ اس کے نزدیک ہے جو اس کو مذکر سمجھتا ہے۔

جب آپ کے بھائیوں نے یہ صورتحال دیکھی تو اپنے سر جھکا لیے اور مختلف سوچیں سوچنے لگے، بنیامین کے پاس آئے اور کہا: اے بنیامین! تیری بربادی ہو! ہمیں آج کے دن کی طرح کبھی بھی شرمندگی نہ ہوئی، تیری ماں راحیل نے دو بیٹے جنے اور وہ دونوں چوری کے لیے، انہوں نے اپنے بھائیوں کو کہا: اللہ کی قسم! میں نے اسے چوری نہیں کیا، اور نہ ہی مجھے پتہ ہے کہ کس نے میرے سامان میں اسے رکھا؟ روایت ہے کہ انہوں نے بنیامین کو کہا: اے بنیامین! کیا تو نے چوری کی ہے؟ بنیامین نے کہا: اللہ کی قسم! نہیں؛ انہوں نے کہا: کس نے تیری خورجی میں پیالہ رکھا؟ بنیامین نے کہا: جس نے تمہاری خورجیوں میں سامان رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ چیک کرنے والا جب آدمی کی خورجی سے فارغ ہوا تو اس نے اپنے اس فعل پر توبہ کرتے ہوئے استغفار کیا؛ حضرت قتادہ اور دیگر لوگوں کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ استغفار کرنے والے حضرت یوسف علیہ السلام تھے؛ کیونکہ وہی انہیں چیک کرنے والے تھے اور جانتے تھے کہ پیالہ کہاں ہے یہاں تک کہ بنیامین کی خورجی کی چیکنگ پر انہوں نے اختتام کیا اور کہا: میرا نہیں خیال کہ یہ نوجوان اس بات پر راضی ہو اور نہ ہی اس نے کوئی چیز لی ہے، تو بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: اللہ کی قسم! ہم تب تک مطمئن نہیں ہوں گے جب تک آپ اس کو چیک نہیں کریں گے؛ یہ بات آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی اطمینان قلب کا باعث ہوگی؛ آپ نے اس کی تلاشی لی اور پیالہ نکال لیا؛ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے لی جانے والی یہ تلاشی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ منادی نے یہ کاروائی آپ کی رائے اور مشاورت سے کی؛ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ بھی اس کو تقویت دیتا ہے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ اس میں تین مسائل ہیں؛

مسئلہ نمبر 1۔ كِدْنَا کا معنی ہے صنعنا ہم نے کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا بمعنی دبرنا۔ یعنی ہم نے تدبیر کی منقول ہے۔ ابن الانباری نے کہا: أردنا یعنی ہم نے ارادہ کیا۔ شاعر نے کہا:

کادتْ و کِدتُ و تِلك خیرُ إرادة   لو عاد مِنْ عهد الصِّبَا ما قد مَضَى

اس نے ارادہ کیا اور میں نے ارادہ کیا اور یہ اچھا ارادہ ہے کہ اگر وہ بچپن کے عہد سے واپس لوٹ آئے جو کہ گزر چکا ہے۔

اور اس واقعہ سے مقاصد کو حیلہ کے ذریعے حاصل کرنے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، بشرطیکہ وہ حیلہ شریعت کے مخالف نہ ہو اور نہ ہی شریعت کے کسی قانون کو ختم کرنے والا ہو، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کہ انہوں نے حیلہ کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور حلت کو ختم ہی کیوں نہ (1) کر دے۔

1۔ امام قرطبی نے امام اعظم پر جو اعتراض کیا ہے اس کے علماء احناف نے بڑے مسکت جوابات دیے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سال پورا ہونے سے پہلے آدمی اپنے مال میں بیع و ہبہ کے ذریعے تصرف کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی نیت زکوٰۃ سے فرار کی نہ ہو۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ جب سال پورا ہو جائے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت ہو جائے تو پھر اسقاط زکوٰۃ کا حیلہ کرنا یا مال میں کمی کرنا جائز نہیں اس طرح نہ اکٹھے مال میں تفریق کرنا اور نہ ہی متفرق مال کو جمع کرنا درست ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جب آدمی نے سال پورا ہونے سے ایک ماہ یا اس کے لگ بھگ کے عرصہ سے پہلے زکوٰۃ سے فرار کی نیت سے اپنے مال میں کمی کی تو بھی سال مکمل ہونے پر اسے زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد خشیۃ الصدقۃ (1) سے استدلال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی اس نے مال میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے فرار اختیار کرتے ہوئے تفریق کی تو یہ بات اس کے لیے نقصان دہ نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا لزوم صرف سال کی تکمیل کی صورت میں ہوتا ہے اور سال کی تکمیل سے پہلے خشیۃ الصدقۃ کے ارشاد کا اطلاق اس پر ہوتا ہی نہیں۔

ابن عربی نے کہا: میں نے ابوبکر محمد بن ولید فہری وغیرہ کو کہتے ہوئے سنا ہے: ہمارے شیخ قاضی القضاۃ ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانی دس ہزار دینار کے مالک تھے۔ جب سال کا اختتام آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور انھیں کہا: میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میری طاقت کمزور ہو گئی ہے، جبکہ یہ مال ہے جس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں لہٰذا یہ تمہارا ہے۔ پھر انہوں نے مال دے دیا لوگ اٹھا کر ان کے بیٹوں کے گھر لے گئے، پھر جب سال کا اختتام آیا تو انھوں نے کسی کام کے لیے اپنے بیٹوں کو بلایا۔ بیٹوں نے کہا: اے ہمارے باپ! ہمیں آپ کی زندگی کی امید ہے اور جب تک آپ زندہ ہیں ہمیں مال میں کوئی رغبت نہیں، کیونکہ آپ اور آپ کا مال ہمارا ہی ہے۔ سو یہ مال لے لیجئے۔ لوگوں نے مال اٹھایا اور ان کے ساتھ رکھ دیا اور مال کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق انھوں نے اکٹھے مال کو متفرق اور متفرق کو پھر جمع کر کے اسقاط زکوٰۃ کا حیلہ کیا ہے اور یہ بہت بڑی بحث ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ایک مربوط کتاب لکھی ہے جس کا نام انہوں نے ''کتاب الحیل'' رکھا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس میں پھر کئی باب بنائے ہیں جن میں ایک باب باب الزکوٰۃ وانلا یفرق بین مجتمع ولا یجمع بین متفرق خشیۃ الصدقہ کے عنوان سے ہے۔ اس میں حضرت انس بن مالک والی حدیث بھی انھوں نے بیان کی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف زکوٰۃ کے فریضہ کے بارے میں لکھا اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ والی حدیث بھی بیان کی کہ ایک اعرابی جس کے بال پراگندہ تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ الحدیث، اور اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں افلح ان صدق (2) یا یہ الفاظ ہیں دخل الجنۃ ان صدق اور بعض لوگوں (امام ابوحنیفہ) نے کہا ایک سو بیس اونٹوں میں دو حصے زکوٰۃ ہے۔ اگر مالک نے جان بوجھ کر ان کو ہلاک کر دیا یا انہیں ہبہ کر دیا یا اس نے زکوٰۃ سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لا یجمع بین متفرق و یتفرق بین مجتمع، جلد 1 صفحہ 195

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، وجوب صوم رمضان، جلد 1 صفحہ 254

بچنے کا کوئی حیلہ کیا تو اس پر کچھ بھی لازم نہ ہوگا۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث انہوں نے فوراً بعد بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن تم میں سے کسی کا خزانہ قوت والا گنجا سانپ ہوگا جس کی آنکھ پر دو سیاہ نقطے ہوں گے اور وہ کہے گا: میں تیرا خزانہ ہوں'' (1)۔ مہلب نے کہا: اس باب میں امام بخاری نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بتائیں کہ ہر وہ حیلہ جو کوئی آدمی اسقاط زکوٰۃ کے لیے اختیار کرے گا تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا، کیونکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے خوف سے ریوڑ کو جمع کرنے اور علیحدہ علیحدہ کرنے سے منع فرمایا ہے تو اس سے یہی مفہوم سمجھ آ جاتا ہے۔ اور آپ کے ارشاد أفلح إن صدق سے بھی یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی کو کم کرنے کے لیے کوئی حیلہ اختیار کیا تو وہ فلاح نہیں پائے گا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا یہ عذر قابل قبول ہوگا۔ اور جس نے سال پورے ہونے کے قریب مال میں صاحب مال کے تصرف کو جائز قرار دیا ہے تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں کہ اس طرح وہ زکوٰۃ سے فرار اختیار کرے۔ اور جس نے ایسا اس نیت سے کیا تو اس پر سے اس کا گناہ ساقط نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا، اسی طرح ہے جیسا کہ کوئی آدمی رمضان کے چاند کے طلوع سے ایک دن قبل رمضان کے روزے سے بچنے کے لیے کوئی ایسا سفر اختیار کرلے جس سفر کی اسے ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرض سے اعراض مقصود ہے جو اس نے مومنین پر لازم قرار دیا ہے، تو اس پر وعید صادق آئے گی، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ قیامت کے دن جان بوجھ کر زکوٰۃ سے روکنے کی سزا کیا ہوگی اسے اونٹ کیسے روندے گا اور اس کے مال کو اس کے لیے قوت والے گنجے سانپ کی تمثیل دی جائے گی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ زکوٰۃ سے فرار جائز نہیں اور آخرت میں اس کا مطالبہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا: بعض شافعی علماء نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ کے بارے میں کہا کہ یہ مباح کام کے لیے حیلہ اختیار کرنے پر دلیل ہے۔ مگر یہ بہت بڑا وہم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ (یوسف: 21) کے بارے میں رکھا گیا ہے کہ کما مکنا لیوسف مِلك نفسه عن امرأة العزیز مکنا له ملك الأرض عن العزیز یعنی جس طرح ہم نے عزیز کی بیوی سے خود یوسف کو اپنے اوپر ملکیت وتسلط بخشا اسی طرح عزیز سے حکومت کی ملکیت واقتدار بھی یوسف کو بخش دیا۔ شفعوی نے کہا: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص: 44) ہے۔ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک جھاڑو لے کر اسے ماریں اور حانث نہ ہوں۔ لیکن یہ حیلہ نہیں بلکہ یہ تو قسم کو الفاظ یا مقاصد پر محمول کرنا ہے۔ شفعوی نے کہا: اسی طرح حضرت ابوسعید خدری والی وہ حدیث ہے جو خیبر کے عامل کے بارے میں ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوریں لے آیا۔ الحدیث۔ اس حدیث کو بیان کرنے سے شافعیہ کا مقصود یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ساری کھجوریں بیچنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور پھر جس آدمی کو بیچیں ہیں اس سے یا کسی اور سے جنیب کھجوریں خریدنے کا حکم ارشاد فرمایا جبکہ مالکیہ نے کہا: اس کا مقصود ہی اور ہے اور وہ یہ کہ تاکہ جنیب اور دراہم جمع نہ ہو جائیں جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غلہ، غلہ کے بدلے میں اور دراہم سود ہیں۔

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 379

فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ یعنی بادشاہ کی بادشاہت میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن عیسیٰ سے اس کا معنی بادشاہ کی عادات میں، روایت ہے یعنی وہ بغیر دلیل کے ظلم کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فی حکمہ اور وہ ہے چوروں کو غلام بنالینا۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اس کی خورجی میں پیالے کے رکھنے کے لیے کوئی علت اور عذر بنا دے۔ قتادہ نے کہا: بلکہ بادشاہ کا فیصلہ مارنے اور جرمانہ کرنے کا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کی زبانوں پر بنی اسرائیل کا حکم (چوروں کا غلام بنانا) جاری ہو گیا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ یعنی علم وایمان کے ذریعے اس کو نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ بھی پڑھا گیا ہے جس کا معنی ہے نرفع من نشاء درجات، سورۃ الانعام میں یہ گزر چکا ہے۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ اسرائیل نے سماک عن عکرمہ عن ابن عباس روایت کیا ہے کہ یہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے اور وہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر علم والے سے اوپر ہے (1)۔ سفیان نے عن عبدالاعلی عن سعید بن جبیر روایت کیا ہے (2) انہوں نے کہا: ہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھے آپ نے گفتگو کی تو ایک آدمی نے حیرانگی کا اظہار کیا اور کہا: سبحان اللہ! وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کتنی بری بات تو نے کی ہے؟ اللہ علیم ہے اور وہ ہر عالم سے برتر ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۞ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۞

''بھائی بولے: اگر اس نے چوری کی ہے (تو کیا تعجب ہے) بے شک چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے پس چھپا لیا اس بات کو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے جی میں اور نہ ظاہر کیا اسے ان پر (جی ہاں) کہا: تم بہت بری جگہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ وہ کہنے لگے: اے عزیز! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے (اس کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا) پس ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے، بے شک ہم تجھے نیکوکاروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے کہا: ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ پکڑ لیں ہم مگر اس کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے ورنہ ہم ظالم ہوں گے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ معنی یہ ہوگا: یعنی اس نے اپنے بھائی کی پیروی کی ہے، اگر ہماری پیروی کرتا تو چوری نہ کرتا۔ انھوں نے یہ صرف اس لیے کہا تا کہ وہ اس کے فعل سے بری ہو جائیں، کیوں کہ وہ ان کی ماں کا بیٹا نہیں تھا۔ اور اگر اس نے چوری کی ہے تو اس نے اپنے چور بھائی کا اثر قبول کر لیا ہے۔ کیونکہ نسب میں اشتراک اخلاق پر

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 35 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 34

بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اس چوری کے بارے میں اختلاف ہے جس کی نسبت انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کی ہے؛ مجاہد وغیرہ سے روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی حضرت اسحق کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی بڑی تھی، اس کے بڑے ہونے کی وجہ سے حضرت اسحق کا پٹکا اس کے پاس تھا کیونکہ وہ عمر کے اعتبار سے وارث بنتے تھے یہ حکم ہماری شریعت کے ذریعے منسوخ ہو گیا ہے تو وہ پٹکا جس نے چوری کیا تھا اسے غلام بنا لیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی نے آپ کو دودھ پلایا تھا اور وہ آپ کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتی تھی جب آپ کی پرورش مکمل ہو گئی اور آپ بڑے ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں کہا: یوسف کو میرے حوالے کر دو، میں اس کو اپنی آنکھوں سے ایک پل بھی اوجھل نہیں رکھ سکتا؛ میں اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور اس کی جدائی کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تو آپ کی بہن نے آپ کو کہا: کچھ دن اسے میرے پاس چھوڑ دو تا کہ میں اس کا دیدار کر سکوں، جب حضرت یعقوب علیہ السلام باہر گئے تو اس نے حضرت اسحق کا پٹکا لیا اور اسے حضرت یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا، پھر کہا: حضرت اسحق کا منطقہ گم ہو گیا ہے، اسے تلاش کرو کس نے لیا ہے؟ اس نے تلاش کیا پھر کہا: گھر والوں کے کپڑوں میں تلاش کرو، تلاشی لی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سے ملا۔ تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! اب یہ میرا ہے میں اس کے ساتھ جو چاہوں وہ سلوک کروں پھر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کے پاس آئے تو اس نے آپ کو بھی اس کے بارے میں بتایا، تو آپ نے اس کو کہا: اگر اس نے ایسا کیا ہے تو اس کو تیرے سپرد کرتا ہوں؛ پھر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئیں۔ اس وجہ سے آپ کے بھائیوں نے یہ کہا: اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ اسی سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کی خورجی میں پیالہ رکھنے کا طریقہ سیکھا کیونکہ آپ کی پھوپھی نے بھی آپ کو اپنے ہاں رکھنے کے لیے ایسا ہی کیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا(1): حضرت یوسف علیہ السلام کی ماں نے آپ کو اپنے نانا کے بت چوری کرنے کا حکم دیا، آپ نے انہیں چوری کیا، توڑا اور راستے پر پھینک دیئے، ماں، بیٹے کا یہ عمل برائی کو ختم کرنے کے لیے تھا، اسی چوری کی طرف بھائیوں نے نسبت کی تھی۔ حضرت قتادہ نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ زجاج کی کتاب میں ہے: وہ سونے کا بت تھا۔ عطیہ عوفی نے کہا: آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھانے کے دستر خوان پر تھے کہ آپ نے گوشت کا ایک ٹکڑا دیکھا تو اسے چھپا لیا اس وجہ سے انہوں نے چوری کی نسبت کر دی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کھانے کے دستر خوان سے مساکین کے لیے چرا لیتے تھے؛ اس کو ابن عیسی نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کی طرف چوری کی نسبت کر کے آپ پر الزام تراشی کی ہے یہی حضرت حسن نے کہا ہے۔

فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی بات اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ کو اپنے جی میں چھپا لیا۔ یہ ابن شجرہ اور ابن عیسی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے اپنی بات اَنْتُمْ شَرٌّ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 36

فَکَانًا کو اپنے جی میں چھپالیا پھر اس کو ظاہر کرتے ہوئے کہا: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہے یعنی تم نے جس کی طرف اس چوری کی نسبت کی ہے اس سے بہت بری جگہ پر ہو۔ اور وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ تم نے کہا ہے یہ جھوٹ ہے، اور اگر ہے بھی تو اللہ کی مرضی سے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے بھائی انبیا نہیں تھے۔

قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا کَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ انہوں نے آپ کو عزیز کے نام سے مخاطب کیا کیونکہ اس وقت وہ پہلا معزول ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ اور ان کے قول: اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا کَبِیْرًا سے مراد قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑا ہے نہ کہ عمر کے اعتبار سے۔ فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ یعنی اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی کو غلام بنا لو۔ ایک قول کے مطابق یہ مجاز ہے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس پر غلامی کا حکم ثابت ہو چکا ہے اس کی جگہ کسی اور کو غلام بنانا جائز نہیں۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کسی کے کام کو ناپسند کرتے ہوئے اسے کہیں: تم مجھے قتل کر دو مگر اس طرح نہ کرو، تو اس سے تمہاری یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ تمہیں قتل کر دے بلکہ اسے اس کام سے روکنے میں مبالغہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ کہنا حقیقت پر مبنی ہو؛ تو ایسی صورت میں ان کے انبیاء ہوتے ہوئے (اگرچہ پہلے گزر چکا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ نبی نہ تھے) ان کا کسی آزاد کو غلام بنا لینے کی بات کرنا بعید از قیاس ہے، تو اس سے مراد یہی ہوگا کہ انہوں نے ایسا کہا کہ بنیامین کی آزادی کا ایک حیلہ اختیار کیا؛ یعنی اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو پکڑ لو یہاں تک کہ آپ تک آپ کے صاحب کو لوٹا دیا جائے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بنیامین اپنے باپ تک پہنچ جائے اور حضرت یعقوب علیہ السلام حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں؛ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس بات کو رد کر دیا کیونکہ حدود وغیرہ میں ضمانت۔ وہ بھی صرف مضمون کو حاضر کرنے کی۔ باہم رضامندی سے جائز ہے لازم نہیں۔

جبکہ ایسی ضمانت کہ جس میں ضامن پر وہ سزا لاگو کر دی جائے جو مضمون پر تھی یہ بالاجماع جائز نہیں۔ اور ''الواضحہ'' میں ہے کہ کفالت بالوجہ تمام حدود میں جائز ہے، سوائے نفس کے اور جمہور فقہاء کے نزدیک نفس میں بھی جائز ہے البتہ امام شافعی کا اختلاف ہے انہوں نے ایک مرتبہ اسے ضعیف قرار دیا اور ایک مرتبہ جائز قرار دیا ہے۔

اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ جو تمام معاملات میں آپ نے ان کے ساتھ سلوک کیا اس کا انہوں نے اظہار کیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ اگر آپ اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ مہربانی کر دیں تو ہم اس کو اپنے اوپر بہت بڑا احسان خیال کریں گے۔ یہ ابن اسحاق کی بیان کردہ تاویل ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یہ مصدر ہے اَنْ نَّاْخُذَ محل نصب میں ہے؛ یعنی من ان ناخذ، اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا، ناخذ کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ یعنی ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بری کو مجرم کے بدلے پکڑ لیں، اور تمہارے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کریں۔ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ یعنی اس کے علاوہ کسی اور کو پکڑنے کی صورت میں ہم ظلم کرنے والے ہوں گے۔

فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

''پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے۔ان کے بڑے بھائی نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے لیا تھا تم سے وعدہ جو پختہ کیا گیا تھا اللہ کے نام سے اور اس سے پہلے جو زیادتی یوسف کے حق میں تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہیں یاد ہے) سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو جب تک کہ اجازت نہ دیں مجھے میرے باپ یا فیصلہ فرمائے اللہ تعالیٰ میرے لیے اور وہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے''۔

فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ یعنی وہ مایوس ہو گئے یہاں اسْتَيْــَٔسُوْا بمعنی ییئسوا ہے جیسے عجب اور استعجب، سخر اور استسخر دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔خَلَصُوْا یعنی وہ علیحدہ ہو گئے اور وہ ان کے ساتھ نہیں تھا نَجِيًّا، خَلَصُوْا میں پائی جانے والی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔یہ واحد ہے اور جمع کا معنی دے رہا ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے اور اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے جیسے وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ (مریم) اس کی جمع أنجیة آتی ہے۔شاعر نے کہا:

إِنِّي إِذَا مَا الْقَوْمُ كَانُوا أَنْجِيَةْ　　وَاضْطَرَبَ الْقَوْمُ اضْطِرَابَ الْأَرْشِيَةْ
هُنَاكَ أَوْصِينِي وَلَا تُوصِي بِيَهْ

ابن کثیر نے استایسوا، ولا تایسوا۔إنه لایایس، أفلم یایس پڑھا ہے یعنی بغیر ہمزہ کے الف کے ساتھ؛ یعنی پہلے ہمزہ اور بعد میں یا پھر ہمزہ کو الف سے بدل دیا کیونکہ یا ساکن ماقبل مفتوح تھا جبکہ اصل جماعت کی قرات ہے کیونکہ مصدر یا کی تقدیم کے ساتھ ہی آتا ہے یأسا اور الإیاس، أیس کا مصدر نہیں بلکہ یہ أسْتُهُ أَوْسًا وإیاسا کا مصدر ہے جس کا معنی ہے اعطیتہ میں نے اسے عطا کیا۔بعض لوگوں نے کہا ہے: أیس اور یئس دونوں لغتیں ہیں؛ یعنی جب وہ اپنے بھائی کو لوٹانے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا جس میں ان کے علاوہ کوئی اور آدمی شامل نہیں تھا، اور جو مسئلہ انہیں درپیش تھا اس میں انہوں نے باہم سرگوشی کی۔اور نجی فعیل بمعنی مناجی ہے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ حضرت قتادہ نے کہا: وہ روبیل تھا، جو عمر میں ان سے بڑا تھا۔مجاہد نے کہا: شمعون تھا (1)، کیونکہ وہ رائے میں بڑا تھا۔کلبی نے کہا: وہ یہوذا تھا، کیونکہ وہ ان میں زیادہ عقلمند تھا۔محمد بن کعب اور ابن اسحاق نے کہا: وہ لاوی تھا، کیونکہ وہ ابوالانبیاء تھا۔اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی اپنے بیٹے کی حفاظت اور اس تک اسے واپس لوٹانے کا عہد جو اللہ کے نام سے پختہ کیا گیا تھا۔وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ، مَا، أن پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور معنی یہ ہوگا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے وعدہ لیا ہوا ہے جو اللہ کے نام کے ساتھ پختہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 43

کیا گیا ہے، اور تم یوسف کے بارے میں اپنی زیادتی کو جانتے ہو؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے اور مِنْ قَبْلُ میں مِنْ، تَعْلَمُوْا کے متعلق ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا زائدہ ہو۔ اور مِنْ قَبْلُ اور فِیْ یُوْسُفَ میں پائے جانے والے حروف جر فعل فَرَّطْتُمْ کے متعلق ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا اور فعل مصدر ہوں اور مِنْ قَبْلُ فعل مضمر کے متعلق ہو؛ تقدیر عبارت یہ ہو: تفریطکم فی یوسف واقع من قبل؛ ما اور فعل مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوں اور خبر وہ فعل مضمر ہو جس کے متعلق مِنْ قَبْلُ ہے۔ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ یعنی اس سرزمین کو لازم پکڑوں گا اور اسی میں مقیم رہوں گا؛ بَرِحَ بَرَاحًا وبُرُوْحًا کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ''زال'' اور جب اس پر نفی داخل ہوجائے تو یہ مثبت بن جاتا ہے۔ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ یعنی میرا باپ مجھے واپس لوٹنے کی اجازت دے دے کیونکہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ یعنی اللہ تعالیٰ بھائی کے ساتھ واپس لوٹنے کا فیصلہ فرمادے تو میں اس کے ساتھ اپنے باپ کے پاس جاؤں گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تلوار کے ذریعے فیصلہ فرمادے تو میں جنگ کروں گا اور اپنے بھائی کو حاصل کروں گا یا پھر عاجز آجاؤں تو کسی عذر کے ساتھ تو واپس پلٹوں گا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا لتاتننی بہ إلا أن یحاط بکم اور جس نے جنگ کی اور عاجز آگیا تو گویا اسے گھیر لیا گیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہوذا جب غصے میں ہوتا اور تلوار لے لیتا تو ایک ہزار آدمی بھی اسے واپس نہ کرسکتا؛ وہ اپنے بال سینے پہ ڈال لیتا۔ حدیث میں ہے کہ یہوذا نے اپنے بھائیوں کو کہا۔ اور یہ غصے کے حوالے سے سب سے زیادہ سخت تھا۔ یا تم بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی ہوجاؤ اور میں اہل مصر کے لیے کافی ہوں یا پھر تم اہل مصر کا بندوبست کرو اور میں بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی ہوں؛ انہوں نے کہا: آپ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کا بندوبست کرو جبکہ ہم اہل مصر کے لیے کافی ہیں؛ تو اس نے ایک بھائی کو بھیجا کہ مصر کے بازار گن کر آؤ تو اس نے مصر میں نو بازار دیکھے، تو ان میں سے ہر ایک نے ایک بازار کو لے لیا؛ پھر یہوذا حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گیا اور کہا: اے بادشاہ! اگر تو نے ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ نہ بھیجا تو میں ایسی چیخ ماروں گا کہ جس کی وجہ سے تیرے شہر کی حاملہ عورتیں اپنے حمل گرادیں گی؛ اور یہ ان میں بالخصوص غصہ کے وقت ہوتا تھا؛ اس بات نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی غصہ دلا دیا۔ تو یہوذا غصے میں آگیا اور اس کا غصہ شدت اختیار کرگیا، اس کے بال کھڑے ہوگئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹوں کی یہی حالت تھی جب انہیں غصہ آتا تو ان کی جلد کانپنے لگتی، جسم پھول جاتا اور ان کی پیٹھ کے بال کپڑوں کے نیچے سے ظاہر ہوجاتے، یہاں تک کہ ہر بال سے خون کا قطرہ بہنے لگتا اور اگر وہ زمین پر پاؤں مار دیتا تو زلزلہ بپا ہوجاتا تھا اور عمارتیں گرجاتی تھیں، اور اگر وہ چیخ مارتا تو عورتوں، جانوروں اور پرندوں میں سے جو بھی اسے سن لیتا وہ اپنے پیٹ میں جو کچھ ہوتا اسے گرادیتا تھا، پھر اس کا غصہ تب تک نہیں تھمتا تھا جب تک کہ وہ خون نہ بہاتا یا پھر نسل یعقوب علیہ السلام میں سے کوئی ہاتھ اسے نہ روکتا؛ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو پتہ چل گیا کہ ان کے بھائی یہوذا کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے تو آپ نے اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ قبطی زبان میں گفتگو کی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنا ہاتھ یہوذا کے دونوں کندھوں کے درمیان اس طرح رکھے کہ وہ دیکھ نہ پائے؛ تو بچے نے اسی طرح کیا تو یہوذا کا غصہ ختم ہوگیا، اس نے اپنی تلوار پھینک دی اور اپنے دائیں

بائیں دیکھا کہ شاید اسے اپنے بھائیوں میں سے کوئی نظر آئے لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا: تو وہ جلدی جلدی اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور کہا: کیا تم میں سے کوئی میرے پاس آیا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں: اس نے کہا: شمعون کہاں چلا گیا ہے؟ انہوں نے کہا: وہ پہاڑ کی طرف گیا ہے: وہ نکلا اور اس کو مل گیا، اور وہ ایک بڑی چٹان کو اٹھا رہا تھا: اس نے کہا: اس کے ساتھ کیا کرو گے؟ اس کو اس بازار میں لے کر جاؤں گا جو میرے حصے میں آیا ہے اور اس کے ذریعے بازار میں موجود ہر آدمی کو کچل دوں گا اس نے کہا: واپس لوٹ اور اسے چھوڑ دے یا اسے دریا میں پھینک دے، تو اس کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا، اس ذات کی قسم جس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا ہے: مجھے نسل یعقوب علیہ السلام میں سے کسی ہاتھ نے مس کیا ہے پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام پکڑنے کے اعتبار سے ان سے بھی زیادہ سخت تھے آپ نے فرمایا: اے عبرانیو! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ قوت میں تم سے زیادہ کوئی نہیں پھر طاحونہ کے پتھروں میں سے ایک بڑا پتھر آپ نے لیا اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور اسے دیوار کے پیچھے پہنچا دیا۔ الوکل کا لفظ یہاں استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے پاؤں سے ٹھوکر مارنا وقد رکلہ یرکلہ یہ جوہری کا قول ہے۔ پھر یہوذا کو آپ نے اپنے ایک ہاتھ سے پکڑا اور اپنے پہلو میں کھینچ لیا، اور کہا: میرے پاس لوہے کی سلاخیں لے آؤ میں ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹوں اور ان کی گردنیں اڑا دوں؛ پھر آپ اپنے تخت پر براجمان ہوئے اپنی مسند پر بیٹھے اور اپنے ہیٹ کے بارے میں حکم فرمایا تو وہ آپ کے سامنے رکھا گیا تو اس سے گھنٹی کی آوازیں آئیں، آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا : یہ کہہ رہی ہے کہ ان کے باپ کے دل پر جو پریشانی، غم اور کرب ہے وہ انہی کی وجہ سے ہے پھر دوبارہ آواز آئی اور آپ نے فرمایا: یہ آواز مجھے بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ایک چھوٹے بھائی کو پکڑا، حسد میں مبتلا ہوئے اور اسے اپنے باپ سے چھین لیا اور پھر اسے ضائع کر دیا۔ انہوں نے کہا: اے عزیز! ہماری پردہ پوشی کر اللہ تعالیٰ تیری پردہ پوشی کرے گا، ہمارے اوپر احسان کر اللہ تعالیٰ تیرے اوپر احسان کرے گا۔ پھر تیسری مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ آواز بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو کنویں میں پھینکا ہے، پھر اسے انتہائی سستا غلاموں کی قیمت پر بیچ دیا، اور اپنے باپ کو بتایا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے، پھر چوتھی مرتبہ صدا آئی تو آپ نے فرمایا: اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ اسی سال سے گناہ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے انہوں نے استغفار نہیں کیا اور نہ ہی توبہ کی ہے، پھر پانچویں مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا: یہ کہتی ہے کہ جس بھائی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ہلاک ہو گیا ہے چند دنوں میں وہ واپس لوٹے گا اور ان کی کاروائی سے لوگوں کو آگاہ کرے گا۔ پھر چھٹی مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ کہہ رہی ہے: اگر تم انبیاء یا انبیاء کی اولاد ہوتے تو تم نے جھوٹ نہ بولا ہوتا اور نہ ہی اپنے والد کی نافرمانی کی ہوتی۔ میں تمہیں سارے جہانوں کے لیے ضرور عبرت بناؤں گا، میرے پاس سلاخیں لاؤ میں ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹوں تو انہوں نے آہ وزاری کی، روئے اور توبہ کی اور کہنے لگے: اگر ہمیں بھائی یوسف علیہ السلام مل جائے اگر وہ زندہ ہے تو ہم اس کے تابعدار بن جائیں گے اور ہم مٹی بن جائیں گے جسے وہ اپنے پاؤں سے روندے گا؟ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف سے اس منظر کو دیکھا تو آپ رو پڑے اور انہیں فرمایا: میرے پاس سے

چلے جاؤ! میں نے تمہارے باپ کی عزت کی خاطر تمہیں چھوڑ دیا اگر وہ نہ ہوتے تو میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دیتا۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾

''تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر (انہیں یہ) عرض کرو: اے ہمارے محترم باپ! بلاشبہ آپ کے بیٹے نے چوری کی (اس لیے وہ گرفتار کر لیا گیا) اور ہم نے (آپ سے) وہی کچھ بیان کیا جس کا ہمیں علم تھا اور ہم نہیں تھے غیب کی نگہبانی کرنے والے''۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ کا قول اسی نے کہا جس نے فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ کہا تھا فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ضحاک اور ابو رزین نے اس کو ان ابنك سرق پڑھا ہے، نحاس نے کہا: مجھے محمد بن احمد بن عمر نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ابن شاذان نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں احمد بن ابی سریج بغدادی نے بیان کیا انہوں نے کہا: میں نے کسائی کو یا ابانا ان ابنك سرق پڑھتے ہوئے سنا ہے، یعنی سین کے ضمہ اور راء مکسورہ کی شد کے ساتھ، یعنی تیرے بیٹے کی طرف چوری کو منسوب کیا گیا ہے، جیسے خوّنتہ، و فسّقتہ و فجّرتہ کہا جاتا ہے جب ان عادات کی طرف کسی کی نسبت کی جائے۔ زجاج نے کہا: سرق میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس سے چوری کا پتہ چلا ہے اور دوسرا یہ کہ اس پر چوری کی تہمت لگی ہے۔ جوہری نے کہا السرق اور السرقۃ راء مکسورہ کے ساتھ یہ اس چوری شدہ چیز کو کہتے ہیں اور سَرَقَ يَسْرِقُ کا مصدر فتحہ کے ساتھ آتا ہے۔

وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا ان کی مراد یہ تھی کہ انہوں نے وہی کچھ بیان کیا جس کا ان کو علم تھا۔ اور جہاں تک اب کی صورتحال ہے تو ہم نے ظاہر کی گواہی دی ہے اور ہم غیب کو نہیں جانتے، گویا بنیامین کے قول: میری خورجی میں اسے اس نے رکھا ہے جس نے تمہاری خورجیوں میں تمہارا سامان رکھا، نے تمہیں تہمت میں مبتلا کر دیا؛ اس کا یہ معنی ابن اسحاق نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے۔ ما شهدنا عند يوسف بأن السارق يسترق إلا بما علمنا من دينك یہ ابن زید کا قول ہے۔ وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ یعنی جس وقت ہم نے اسے آپ سے لیا ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ چوری کرے گا ورنہ ہم اسے لیتے ہی نہ۔ مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا: ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کا بیٹا چوری کرے گا اور ہمارے اس کام کا یہ انجام ہوگا۔ اور ہم نے تو صرف یہ کہا تھا: ہم اپنی بساط کے مطابق اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی مراد یہ تھی (1) کہ اس نے رات کے وقت چوری کی ہے جبکہ وہ سو رہے تھے اور حمیر کی لغت میں غیب سے مراد رات ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے: ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ اپنی رات، دن اور آنے جانے میں کیا کرے گا۔ ایک قول یہ ہے: جب تک ہمارے سامنے رہا کوئی گڑبڑ نہ ہوئی اور جب ہم سے غائب ہوگیا تو اس کے حالات ہم

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 46

سے پوشیدہ ہو گئے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے: چوری کا سامان اس کی خورجی سے پکڑا گیا ہے۔ اور ہم نے اس سامان کو نکالا اور اس کی طرف دیکھتے رہے اور ہمیں غیب کا کوئی علم نہیں۔ شاید انہوں نے اس کی طرف چوری کو منسوب کر دیا ہو اور اس نے چوری نہ کی ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ جس طرح بھی پتہ چل جائے اس کی شہادت دینا جائز ہے، کیونکہ شہادت کا تعلق عقلاً اور شرعاً علم کے ساتھ ہے، لہٰذا یہ صرف اسی سے سنی جاتی ہے جس کو اس کا علم ہو، اور انہیں کی طرف سے اسے قبول کیا جاتا ہے۔ شہادات کے سلسلہ میں یہ قانون ہے، اسی وجہ سے ہمارے (مالکیہ) علماء نے کہا ہے: اندھے کی گواہی جائز ہے، کوشش کر کے سننے والے کی شہادت جائز ہے، اور گونگے کی شہادت جبکہ اس کا اشارہ سمجھ آ جائے جائز ہے، اسی طرح خط پر شہادت بشرطیکہ یہ یقین ہو جائے کہ یہ اس کا خط ہے یا فلاں کا خط ہے صحیح ہے پس ہر وہ آدمی جسے کسی چیز کا علم ہو جائے تو اس کے لیے شہادت دینا جائز ہوگی اگرچہ اسے اس پر گواہ نہ بھی بنایا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ** (الزخرف) یعنی مگر وہ جس نے سچی گواہی دی اس حال میں کہ وہ جانتے ہوں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! میں تمہیں گواہوں کی اچھائی کے متعلق بتاؤں، گواہوں کی بھلائی یہ ہے کہ وہ گواہی دیں قبل اس کے کہ ان سے گواہی کے بارے میں پوچھا جائے'' (1)۔ اس کی تفصیل سورۃ ''البقرہ'' میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ گزرنے والے کی شہادت کے متعلق امام مالک کا قول مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کہے: میں فلاں کے پاس سے گزرا تو میں نے اسے یوں کہتے ہوئے سنا تو اگر اس نے پوری بات کو سن لیا ہو تو وہ شہادت دے سکتا ہے جبکہ امام مالک کا دوسرا قول یہ ہے کہ جب تک اسے گواہ نہ بنایا جائے تب تک وہ گواہی نہیں دے سکتا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ پوری بات سمجھ آ جانے کی صورت میں اداء شہادت درست ہے۔ یہی علماء کی جماعت نے کہا ہے۔ اور یہی حق ہے، کیونکہ اس صورت میں اس نے مطلوب کو حاصل کر لیا ہے، اور اس پر علم کی ادائیگی لازم ہو چکی ہے، پس گواہوں کی بھلائی اس میں ہے جب اس کو ظاہر کر دیں اور برائی اس میں ہے جب وہ اس کو چھپالیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ جب کسی آدمی نے ایسی گواہی دی کہ اس کی عمر اس کی متحمل نہیں تھی تو اس کو رد کر دیا جائے گا کیونکہ اس نے باطل دعویٰ کیا ہے اور ظاہر نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے اور (پوچھیے) اس قافلے سے جس میں ہم آئے اور یقیناً ہم سچ عرض کر رہے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ **وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ** اس کے ذریعے وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس اپنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، بیان خیر الشہود، جلد 2، صفحہ 77

شہادت کو ثابت کر رہے ہیں اور اپنے آپ سے الزام کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ آپ ان پر الزام نہ لگائیں ۔اور وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ سے مراد اہل قریۃ ہیں مضاف محذوف ہے اور قریۃ سے مراد مصر ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ گاؤں ہے جس میں وہ اترے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ قریۃ اگرچہ جمادات پر مبنی ہے مگر آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور اللہ تعالیٰ جمادات کو بھی آپ کی خاطر زبان عطا فرمائے گا اور وہ گفتگو کریں گے۔ اگر یہ معنی مراد لیا جائے تو پھر اضمار کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔سیبویہ نے کہا: کلم ھند کہہ کر غلام ھند مراد لینا جائز نہیں۔کیونکہ یہ اشکال کا باعث ہے اور الْعِيْرَ میں وہی گفتگو ہے جو الْقَرْيَةَ میں تھی۔وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ یعنی اپنی بات میں ہم سچے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔اس آیت میں فقہ کا ایک قاعدہ بھی ہے کہ ہر وہ آدمی جو حق پر ہے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر نہیں یا اس کا خیال ہو کہ اس طرح وہ تہمت و الزام کو دور کر سکتا ہے اور اس حق کی وضاحت کر سکتا ہے جس پر وہ ہے تو اسے ایسا کر لینا چاہیے تا کہ کسی کا کوئی اعتراض باقی نہ رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت صفیہ کے ساتھ مسجد سے انہیں رخصت کرتے ہوئے گزرتے ہوئے دو آدمیوں کو یہ کہہ کر کہ ''یہ صفیہ بنت حی'' ہے(1) ایسا ہی کیا، تو ان دونوں نے کہا: سبحان اللہ! اور ان پر یہ بات گراں گزری، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان انسان کے خون تک پہنچ جاتا ہے اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ تمہارے دل میں کوئی تہمت نہ ڈال دے''۔اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

''آپ نے (یہ سن کر) کہا: بلکہ آراستہ کر دی ہے تمہارے لیے تمہارے نفسوں نے یہ بات، (میرے لیے) اب صبر ہی زیبا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو، بے شک وہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ یعنی اس نے آراستہ کر دیا لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اس بات کو کہ میرے بیٹے نے چوری نہیں کی، بلکہ یہ تو صرف ایسے کام کے لیے ہوا ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ یعنی میرا طریقہ صبر جمیل ہے یا صبر جمیل ہی مجھے زیبا ہے جس طرح کہ سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب اسے اس کی اولاد کو یا اس کے مال کو کوئی مصیبت لاحق ہو تو صبر جمیل کے ذریعے تسلی حاصل کرے اسی طرح اس حلیم و حکیم کی رضا اور تسلیم کو حرز جان بنائے اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام اور سارے انبیاء کی پیروی کرے۔سعید بن ابی عروبہ نے عن قتادہ عن حسن کہا ہے: بندے کے دو گھونٹوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ گھونٹ نہیں جن کو بندہ بھرتا ہے ایک وہ مصیبت کا گھونٹ جس کو بندہ خوبصورت صبر اور خوبصورت تسلی

1۔صحیح بخاری، کتاب الصیام، ھل یخرج المعتکف لحوائجہ، جلد 1 صفحہ 272

کے ذریعے بھرتا ہے اور دوسرا وہ غصہ کا گھونٹ جس کو بردباری اور عفو کے ذریعے بھرتا ہے۔ ابن جریج نے مجاہد سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَصَبْرٌ جَمِيلٌ کے بارے میں کہا: یعنی میں کسی کو بھی اس کی شکایت نہیں کروں گا۔ مقاتل بن سلیمان نے عطا بن ابی رباح عن ابی ہریرہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "جس نے کسی کو آگاہ کر دیا اس نے صبر نہیں کیا"۔ اور سورۃ "البقرہ" میں گزر چکا ہے کہ صبر صدمہ کے آغاز میں ہوتا ہے۔ اور ثواب اسے حاصل ہوتا ہے جس نے مصیبت کا ذکر کیا اور إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اگرچہ مصیبت کا وقت گزر ہی کیوں نہ چکا ہو۔ جو یبر نے ضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے سو شہیدوں کا ثواب عطا کیا گیا۔ اور اسی طرح اس امت میں سے جس نے مصیبت کو برداشت کیا تو اس کو بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اجر جیسا اجر دیا جائے گا۔

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا کیونکہ آپ کے نزدیک یہ بات ثابت تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا بلکہ صرف آپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں، کیونکہ جب یوسف کو اٹھایا گیا تو وہ غلام تھے خود اپنے لیے کسی چیز کے مالک نہیں تھے پھر بادشاہ نے انہیں خرید لیا تو آپ اس کے گھر رہتے تھے اور لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے پھر آپ کو قید میں ڈال دیا گیا اور جب قدرت حاصل ہوئی تو آپ نے ایک ایسا حیلہ کیا جس کے ذریعے آپ کے متعلق آپ کے باپ کو پتہ چل جائے۔ اور آپ نے قاصد کی طرف کوئی توجہ نہ دی کیونکہ آپ کے بھائیوں کو یہ بات ناپسند تھی کہ وہ اس سلسلے کو پہنچانتے اور آپ نے بِهِمْ کہا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تین بھائی تھے: ایک حضرت یوسف علیہ السلام، آپ کا بھائی بنیامین اور تیسرا جو بنیامین کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا اور جس نے کہا تھا: فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ، إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ یعنی میرے حال کو جانتا ہے۔ الْحَكِيمُ اور جو کچھ گزر چکا اس میں دانا ہے۔

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٤﴾

"اور منہ پھیر لیا آپ نے ان کی طرف سے اور کہا: ہائے افسوس! یوسف کی جدائی پر اور سفید ہو گئیں ان کی آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کیے ہوئے تھے"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ یعنی آپ نے ان سے اعراض کیا؛ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام تک بنیامین کی خبر پہنچی تو آپ کی پریشانی بہت زیادہ ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے جو مصیبت آپ کو لاحق ہوئی تھی اسے تازہ فرما دیا۔ آپ نے فرمایا: يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ اور اپنے بیٹے بنیامین کو بھول گئے اس کا کوئی ذکر نہ کیا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف کے واپس لوٹنے کی امید نہیں تھی ورنہ آپ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ نہ کہتے۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کا معنی یا حزناہ ہے (1)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: "یا جزعاہ" کثیر نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 48

فَيَا أَسَفًا لِلْقَلْبِ كَيْفَ انْصِرَافُهُ　وَلِلنَّفْسِ لَمَّا سُلِّيَتْ فَتَسَلَّتِ

ہائے افسوس دل کے لیے اس کا پھیرنا کیسے ممکن ہوگا اور نفس کو جب میں نے تسلی دی تو اس نے تسلی پالی۔

الأسف فوت شدہ چیز پر شدت غم کو کہتے ہیں۔ اور ندا کا مطلب یہ ہوگا: اے افسوس آ کہ یہ تیرا وقت ہے۔ زجاج نے کہا: اصل میں یا اسفی تھا یا کو الف سے بدل دیا گیا فتحہ کی خفت کی وجہ سے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ کہا گیا ہے کہ چھ سال تک آپ نے نہ دیکھا اور آپ نابینا ہو گئے، یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آنکھ سفید ہو گئی مگر تھوڑا سا نظر آتا تھا اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کی حالت کو بہتر جانتا ہے۔ اور آپ کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سفید ہو گئیں اور چونکہ رونے کا سبب حزن تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مِنَ الْحُزْنِ کہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام آپ کے سامنے لمبے لیٹے ہوئے تھے تو آپ نے نیند میں خراٹا لیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام آپ کی طرف متوجہ ہوئے پھر دوبارہ خراٹا لیا تو دوبارہ متوجہ ہوئے پھر تیسری مرتبہ خراٹا لیا تو انتہائی خوشی و مسرت سے آپ نے توجہ فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی فرمائی: میرے صفی اور میرے خلیل کے بیٹے کو دیکھو کھڑا میری مناجات میں ہے اور دیکھتا غیر کو ہے۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میں ضرور وہ دونوں آنکھیں چھین لوں گا جن کے ذریعے وہ متوجہ ہوا ہے۔ اور اس کے درمیان اور جس کی طرف اس نے توجہ کی اس کے درمیان اسی سال تک جدائی ڈال دوں گا تاکہ عالمین کو پتہ چل جائے کہ جو میرے سامنے کھڑا ہو تو اس پر میری نظر کی نگہبانی لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ نماز میں توجہ۔۔ اگرچہ نماز کو باطل نہیں کرتی ...... مگر اس میں نقص اور پکڑ پر دلالت کرتی ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز میں توجہ کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''یہ وہ جھپٹنا ہے جو شیطان بندے کی نماز سے مار لیتا ہے'' (1)۔

سورۃ ''المومنون'' میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا کہ علماء اس حوالے سے کیا کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ نحاس نے کہا: اگر لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حزن کی شدت کے متعلق پوچھیں تو اس کے تین جوابات ہیں جو علماء نے بیان کیے ہیں۔

نمبر 1: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتہ چلا کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں تو انہیں ان کے دین کا خوف لاحق ہوا۔ اس وجہ سے ان کی پریشانی شدت اختیار کر گئی۔

نمبر 2: ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ آپ نے بچپن میں انہیں بھائیوں کے سپرد کیا تھا اس وجہ سے پریشان ہوئے اور اس پر شرمندہ بھی ہوئے۔

نمبر 3۔ یہ تیسرا جواب زیادہ واضح ہے اور وہ یہ کہ پریشانی کوئی ممنوع چیز نہیں ممنوع تو واویلا، کپڑوں کو پھاڑنا اور ایسا کام کرنا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، الالتفات فی الصلوٰۃ، جلد 1 صفحہ 104

ہے جو نہیں کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آنکھیں بہتی ہیں دل پریشان ہوتا ہے اور ہم ایسی بات نہیں کہتے جو رب کو ناراض کر دے'' (1)۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے ارشاد: فَهُوَ كَظِيْمٌ کے ذریعے بیان فرما دیا۔ اس کا معنی ہے کہ حزن و پریشانی سے بھرا ہوا ہے اور اس پر کنٹرول کیے ہوئے اس کی شکایت اور اظہار نہیں کرتا اسی سے کظم الغیظ ہے اس سے مراد غصے کا چھپانا ہے۔ مکظوم سے مراد یہ کہ جس پر حزن کے راستے مسدود ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ (القلم) یعنی کرب و پریشانی سے بھرا ہوا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مکظوم بمعنی کاظم ہو اس سے مراد وہ ہے جو خوف پر مشتمل ہو اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کظیم سے مراد مغموم ہے۔ شاعر نے کہا:

فإنْ أكُ كاظِمًا لِمُصابِ شَاسٍ　فإنّي اليومَ مُنطلِقٌ لِساني

ابن جریج نے مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کہ آپ نے فرمایا: آپ کی آنکھیں پریشانی کی وجہ سے چلی گئیں (2) فَهُوَ كَظِيْمٌ آپ نے فرمایا: فهو مكروب یعنی آپ رنج و مشقت میں تھے۔ مقاتل بن سلیمان نے عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فَهُوَ كَظِيْمٌ کے بارے میں کہا: فهو كمد آپ پوشیدہ پریشانی میں تھے۔ کہتے ہیں: آپ جانتے تھے کہ یوسف زندہ ہے جبکہ یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، اس وجہ سے آپ باطنی طور پر پریشان تھے۔ جوہری نے کہا: الکمد سے مراد پوشیدہ غم ہے۔ اس سے كَمِدَ الرَّجُلُ كَمِدٌ وَكَمِيْدٌ کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ فلان کظیم و کاظم یعنی ایسا پریشان جو اپنی پریشانی کی شکایت نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

فَحَضَضْتُ قَوْمِي واحتسبتُ قِتَالَهم　والقومُ من خوف المَنَايا كُظَّم

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

''بیٹوں نے عرض کی: بخدا! آپ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں یوسف کو کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت یا آپ ہلاک نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں اور میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کو آپ کے بیٹے نے کہا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ کسائی نے کہا: فَتَأْتُ و فَتِئْتُ افعل ذالك یعنی مازلت۔ فراء کا خیال ہے کہ لا مضمرہ ہے یعنی لا تفتا اس نے شعر بطور استشہاد بیان کیا ہے:

فقلتُ يمينُ الله أبرحُ قَاعِدًا　ولو قَطعوُا رأسِي لَدَيْكِ وأوصَالِي

یہاں ابرح اصل میں لا ابرح ہے۔ نحاس نے کہا: جو حسن نے کہا ہے وہ صحیح ہے۔ خلیل اور سیبویہ کا خیال ہے کہ ''لا'' قسم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ما جاء فی البکاء علی المیت، صفحہ 115۔ ایضاً، حدیث نمبر 1577، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 50

میں مضمر ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی اشکال نہیں اور اگر واجب ہوتا تو لام اور نون کے ساتھ ہوتا۔ اور آپ کے بیٹوں نے آپ کو یہ بات اس لیے کہی کیونکہ وہ یقین سے جانتے تھے کہ آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے؟ کہا جاتا ہے: مازال یفعل کذا اور مافتی اور فتئا دونوں لغتیں ہیں اور دونوں انکار کے ساتھ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فما فتئتُ حتی کأن غُبارَھا　　سُرادِقُ یومِ ذی ریاحٍ تُرفَّعُ(1)

یعنی مابرحت فتفتا تبرح۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تتزال ہے۔

حَتّٰی تَكُوْنَ حَرَضًا یعنی آپ بیمار ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: بیماری کی وجہ سے قریب الموت ہونا مراد ہے اور یہ موت سے کم درجہ ہے۔ شاعر نے کہا:

سَرَی ھَمّی فأمرضنی　　وقِدْمًا زادنی مَرَضًا

کذاکَ الحبُّ قبل الیومِ مِمّا یُورِثُ الحَرَضَا

قتادہ نے کہا: اس کا معنی بڑھاپا ہے(2)۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی نشان کا مٹنا ہوا اور محو ہونا ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: اس سے مراد ذہنی توازن کا کھونا ہے(3)۔ فراء نے کہا: حارض سے مراد فاسد الجسم اور فاسد العقل ہے۔ اسی طرح حارض کا معنی بھی یہی ہے۔ حضرت ابن زید نے کہا: حرض سے مراد ارذل العمر کی طرف لوٹنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: ہڈیوں پر جسم کا خشک ہو جانا مراد ہے مؤرج نے کہا: غم سے پگھلنا مراد ہے۔ اخفش نے کہا: غم سے چل بسنا مراد ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ہلاک ہونے والا معنی ہے۔ یہ تمام معنی قریب قریب ہیں۔ اور حرض کی اصل پریشانی عشق یا بڑھاپے کی وجہ سے جسم اور عقل میں فساد کا آجانا ہے عرجی نے کہا:

إنی امرؤٌ لَجَّ بی حُبٌّ فأحْرَضَنی　　حتی بَلِیتُ وحتی شَفَّنِی السَّقَمُ (4)

نحاس نے کہا: حَرَضَ حَرَضًا، حَرُضَ حُرُوضًا، حُرُوضَۃ کہا جاتا ہے جب آدمی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے بخار ہو جائے۔ اسی طرح رجل حارِض و حَرَض" البتہ حرضا کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ اسی طرح قَمِن اور حری میں ان کا بھی تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ ثعلبی نے کہا: عربوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مذکر کے لیے حارض اور مؤنث کے لیے حارضہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں پس جب اس لفظ کے ساتھ وصف بیان کرتے ہیں تو تثنیہ جمع اور مؤنث استعمال کرتے ہیں۔ اور حَرِضَ یَحْرَضُ، حَرَاضَۃً فھو حَرِیض، وحَرِضٌ کہا جاتا ہے اور "رجل مُحْرَض" کہا جاتا ہے شاعر نے کہا:

طَلَبَتْہُ الخیلُ یوما کاملا　　ولو الْفَتْہُ لأضحی مُحْرَضًا(5)

امرؤ القیس نے کہا:

أرَی المرءَ ذا الأذْوَادِ یُصبِحُ مُحْرَضًا　　کإحْرَاضِ بِکْرٍ فی الدِّیارِ مَرِیضِ(6)

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 52　　2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 54　　3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 55

4۔ ایضاً　　5۔ ایضاً　　6۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 54

نحاس نے کہا: اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ جب غم کسی کو بیمار کردے تو احرضه الهم کہتے ہیں اور رجل حارض سے مراد احمق آدمی لیا جاتا ہے۔ انس نے حرضا حا کے ضمہ اور را کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اشنان کی لکڑی کی طرح۔ حضرت حسن نے حا اور را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: الحَرَض والحُرُض دونوں کا معنی اشنان ہے۔ اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ یعنی مردہ۔ یہ ان سب کا قول ہے اور ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام رونے سے اور پریشان رہنے سے باز آجائیں یہ ان کی محبت پر دال ہے جبکہ اس کا سبب بھی وہی تھے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ لغت میں بث کی حقیقت وہ مہلک اشیاء ہیں جو انسان پر وارد ہوتیں ہیں جن کو پوشیدہ رکھنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ بثثته سے مشتق ہے جس کا معنی ہے فرقته، تو مصیبت کو مجاز اً بث کہہ دیا گیا۔

ذوالرمہ نے کہا:

وَقفتُ على رَبْعٍ لِمَيَّةَ نَاقتي فما زِلْتُ أَبْكِي عندَهُ وأُخَاطِبهُ

وأَسقِيه حتّى كاد مما أَبثُّهُ تُكَلِّمُني أَحْجَارُهُ ومَلَاعِبُهُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بثی سے مراد ہے همی میرا غم۔ حضرت حسن نے کہا: حاجتی، اپنی حاجت۔ ایک قول ہے: غم کی سختی، اور اس کی حقیقت وہی ہے جو ذکر کردی گئی ہے۔ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ معطوف علیہ ہے۔ یہ اسی کا اعادہ ہے مترادف لفظ کے ذریعے۔ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے(1) اور میں اسے سجدہ کروں گا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے اپنے ساتھ احسانات کو جانتا ہوں جو مجھے اس کے ساتھ حسن ظن کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام نے ملک الموت کو کہا: کیا تو نے یوسف کی روح قبض کرلی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو اس گفتگو نے آپ کی امید کو اور زیادہ پختہ کردیا۔ سدی نے کہا: آپ اس بات کو زیادہ جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کے بیٹے نے آپ کو بادشاہ کی سیرت، عدل، اخلاق اور گفتگو کے بارے میں بتایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے سو آپ کو لالچ پیدا ہوا اور آپ نے کہا: شاید وہ یوسف ہو اور آپ نے کہا: زمین میں صدیق صرف نبی ہوتا ہے(2)۔ ایک قول یہ ہے: میں مجبور کی دعا کی قبولیت کو زیادہ جانتا ہوں جتنا تم نہیں جانتے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور سراغ لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا اور مایوس نہ ہو جاؤ رحمت الٰہی سے بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ''۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کو حضرت یوسف علیہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 57
1۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 61

السلام کی زندگی کا یقین تھا۔ اس کی کئی صورتیں ہیں: یا تو خواب کے ذریعے، یا اللہ تعالیٰ نے بھیڑیے کو بولنے کی طاقت دی اور بھیڑیے نے بتایا جس طرح کہ واقعہ کی ابتدا میں ہے یا ملک الموت نے خبر دی کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی روح کو قبض نہیں کیا اور یہ زیادہ ظاہر ہے۔ التحسس حواس کے ذریعے کسی چیز کو طلب کرنا ہے۔ یہ حس سے باب تفعل ہے یعنی اس آدمی کے پاس جاؤ جس نے تم سے تمہارا بھائی طلب کیا اور تم سے اسے لینے کا حیلہ اختیار کیا اور اس کے متعلق اور اس کے مذہب کے متعلق پوچھو اور روایت ہے کہ ملک الموت نے آپ کو کہا: اسے یہاں تلاش کرو! اور اس نے مصر کی جانب اشارہ کیا۔ اور ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام سامان کی واپسی، بھائیوں کی قید اور کرامت کے اظہار کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام پر آگاہ ہوئے اسی وجہ سے آپ نے انہیں مصر کی طرف ہی متوجہ کیا کسی اور طرف نہیں، وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کشادگی سے مایوس نہ ہو۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ مراد یہ ہے کہ مومن اللہ کی کشادگی کی امید رکھتا ہے اور کافر سختی میں ناامید ہوتا ہے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا: روح اللہ سے مراد اللہ کی رحمت ہے(1)۔ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ناامیدی گناہ کبیرہ ہے۔ سورہ ''الزمر'' میں ان شاء اللہ اس کا بیان آئے گا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝

''پھر جب وہ گئے (یوسف) کے پاس تو انہوں نے عرض کی: اے عزیز! پہنچی ہے ہمیں اور ہمارے اہل خانہ کو مصیبت اور (اس مرتبہ) ہم لے آئیں ہیں حقیری پونجی پس پورا ناپ کر دیں ہمیں پیمانہ اور (اس کے علاوہ) ہم پر خیرات بھی کریں، بے شک اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو''۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ یعنی روکنے والے مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ یہ ان کے مصر آنے کی تیسری دفعہ تھی۔ کلام میں حذف ہے یعنی وہ مصر کی طرف نکلے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: مَسَّنَا یعنی ہمیں پہنچی ہے۔ وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ یعنی بھوک اور حاجت، اس میں مصیبت یعنی بھوک کے وقت شکوہ کے جواز پر دلیل ہے، بلکہ جب فقر کی وجہ سے اسے اپنے اوپر کسی مصیبت کا خوف ہو تو اس پر واجب ہے۔ اور اس کے علاوہ جس آدمی سے نفع کی امید ہو اس کے سامنے اپنی حاجت کو ظاہر کرنا چاہیے، جس طرح کہ ڈاکٹر کے سامنے درد وغیرہ کی شکایت کرنا واجب ہے تاکہ وہ علاج کرے۔ اور یہ چیز توکل میں قدح کا باعث نہیں یہ اس صورت میں ہوگا جب شکوہ ناراضگی کی صورت میں نہ ہو۔ اور مصائب میں صبر اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اور سوال کرنے سے باز رہنا افضل ہے اور شکوہ میں عمدہ کلام یہ ہے کہ غلام کا سوال مصیبت کا زوال ہے اور یہی حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول ہے: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کی کاریگری کی خوبصورتی، مہربانی کی عجیب صورت اور اپنے بندوں پر اس کی توجہ، جہاں تک ایسے آدمی کے سامنے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 61

شکوہ کرنے کا تعلق ہے جو اس کا ازالہ نہ کر سکے تو یہ بے وقوفی ہے، البتہ وہ فقط تسلی اور معاملے کو ظاہر کرنے کے لیے ہو تو (پھر درست ہے) جس طرح کہ ابن درید نے کہا:

لَا تَحْسَبَنْ يَا دهرُ إِنِّي ضَارِعٌ لِنَكْبَةٍ تَعْرِقُنِي عَرْقَ الْمُدَى

مَارَسْتَ مَنْ لَوْ هَوَتِ الْأَفْلَاكُ مِنْ جَوَانِبِ الجوِّ عليه ماشكا

لكنها نَفْثَةُ مَصْدُورٍ إِذَا جَاشَ لُغَامٌ مِنْ نَوَاحِيهَا غَمَا

وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ۔ البضاعة سے مراد مال کا وہ ٹکڑا ہے جس کے ذریعے کسی چیز کی خریداری کا قصد کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: أبضعتُ الشئ واستبضعته یعنی میں نے اسے مال بنایا۔ ضرب المثل میں ہے: كمستبضع التمرالى هجر (بحرین کا ایک شہر) مزجاة، بضاعة کی صفت ہے۔ الازجاء کسی چیز کو دور پھینک دینا اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا (النور: 43) ہے معنی یہ ہوگا کہ یہ مسترد کر دیا جانے والا مال ہے جس کو ہر ایک قبول نہیں کرتا۔ ثعلب نے کہا: البضاعة المزجاة سے مراد تھوڑا مال ہے جو پورا نہ ہو۔ یہاں اس کے تعین میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: وہ جنگلی جانوروں کے گوشت کے خشک ٹکڑے تھے۔ اس کو واقدی نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: کہ اس کا معنی رسیوں اور کپڑوں کی بوسیدگی ہے (1)۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ایک قول یہ ہے۔ بدوؤں کا سامان اون اور گھی تھا (2)۔ یہ عبد اللہ بن حارث کا قول ہے۔ ایک قول ہے: سبز دانے اور صنوبر تھا اور وہ بطم ہے یعنی شام میں پائے جانے والے ایک درخت کا بیج ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے اور صابن بنانے کے لیے اس سے تیل بھی نچوڑا جاتا ہے یہ ابو صالح کا قول ہے۔ پس انہوں نے اسے دراہم کے بدلے بیچا جو کھانے میں مروج نہیں تھے اور لوگوں کے درمیان رائج تھے، تو انہوں نے کہا: اس نے ہم سے اسے ایسے عمدہ دراہم کے حساب سے لیا جو کھانے میں مروج ہوتے ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ردی دراہم ہیں (3)، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اس پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تصویر نہیں تھی جبکہ مصر کے دراہم پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تصویر ہوتی تھی۔ اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد جوتے اور چمڑا ہے اور انہیں سے مروی ہے کہ وہ چھانا ہوا ستو تھا۔

فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح عمدہ دراہم کے بدلے میں آپ بیچتے ہیں ہمارے دراہم کے بدلے میں بھی ہمارے لیے آپ اس میں کوئی کمی نہ کریں، یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ سے ان کی مراد وہ کیل تھا جو آپ پہلے اپنے بھائیوں کے لیے کر چکے تھے۔ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا یعنی عمدہ اور ردی سکوں کے بھاؤ کے حوالے سے ہمارے اوپر مہربانی کیجئے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر، سدی اور حسن کا قول ہے۔ کیونکہ صدقہ تو اولاد انبیاء پر حرام ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا یعنی ہمارے حق سے زیادہ دے کر مہربانی کریں۔ یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 63 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 64 3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 65

سفیان بن عیینہ کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: صدقہ صرف ہمارے نبی پر حرام تھا۔ ابن جریج نے کہا: ہمارے بھائی کو ہماری طرف لوٹا کر مہربانی کیجئے (1)۔ ابن شجرہ نے کہا: تَصَدَّقۡ عَلَيۡنَاۤ کا مطلب ہے کہ ہم سے درگزر فرمایئے۔ بطور استشہاد شاعر کا شعر پیش کیا ہے:

تصدّقْ علينا يا بن عفّان واحتَسِبْ وأْمِرْ علينا الأشعرى لَيَالِيَا

اِنَّ اللّٰهَ يَجۡزِى الۡمُتَصَدِّقِيۡنَ یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔ یہ تعریض ہے، کیونکہ ان کے نزدیک بادشاہ ان کے دین پر نہ تھا، اسی وجہ سے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ آپ کو اپنے صدقہ کی جزا دے گا، بلکہ انہوں نے ایسے لفظ بولے جن میں اس مراد کا وہم بھی ہے۔ اور ایسا وہم بھی ہے جس سے تاویل کے ذریعے ان کا نکلنا بھی ممکن ہے۔ یہ نقاش کا قول حدیث طیبہ میں ہے۔ "تعریض میں جھوٹ سے بچنے کی وسعت ہے" (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ امام مالک اور دیگر علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کیل کرنے والے کی اجرت بائع پر ہے۔ ابن قاسم اور ابن نافع نے کہا کہ امام مالک نے فرمایا: انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: فَاَوۡفِ لَنَا الۡكَيۡلَ تو حضرت یوسف علیہ السلام ہی کیل کرنے والے تھے اسی طرح وزن کرنے والے اور گنتی کرنے والے کی صورتحال ہوگی، کیونکہ جب آدمی کھانے کے سامان میں سے کئی معلوم پیمانے بیچتا ہے اور اس پر عقد لازم کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ مشتری کے حق کو اپنے حق سے علیحدہ اور جدا کرے، مگر یہ کہ اس میں سے معین کو بیچے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جہاں تک گننے کی اجرت کا تعلق ہے تو وہ بھی بائع پر ہوگی کیونکہ مشتری تو اپنے دراہم دینے والا ہے، دیتے ہوئے کہے گا: یہ صحیح ہے تو آپ نے ان کے ردی ہونے کا دعوی کرنا ہے سو خود ان کو دیکھ لو اور یہ وجہ بھی ہے کہ نفع بائع کے لیے ہے تو اجرت بھی اسی پر ہونی چاہیے، اسی طرح جس پر قصاص لازم ہے اس پر گننا لازم نہیں، کیونکہ اس پر خود اپنا ہاتھ کاٹنا تو لازم نہیں بلکہ اس پر تو لازم ہے کہ قصاص لینے والے کے مطالبہ کی صورت میں فدیہ دے اور اس فدیے پر صلح کرے، لہٰذا ہاتھ کاٹنے والے کی اجرت قصاص لینے والے پر ہے جبکہ امام شافعی نے اپنے مشہور قول میں کہا ہے کہ یہ اجرت اس پر ہوگی جس سے قصاص لیا جاتا ہے جس طرح کہ بائع پر ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ آدمی کے لیے اپنی دعا میں اللھم تصدق علی کہنا مکروہ ہے، کیونکہ صدقہ اس کی طرف سے ہوتا ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہ رہا ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تو تمام نعمتوں کے ذریعے ثواب عطا فرما کے فضل فرمانے والا ہے اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں۔ حضرت حسن نے ایک آدمی کو اللھم تصدق علی کہتے ہوئے سنا، تو فرمایا: اے فلاں! اللہ تعالیٰ صدقہ نہیں کرتا صدقہ تو وہ کرتا ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّ اللّٰهَ يَجۡزِى الۡمُتَصَدِّقِيۡنَ نہیں سنا تو تو یہ کہہ: اللھم أعطنی و تفضل علی یا الٰہی! مجھے عطا فرما اور میرے اوپر اپنا فضل فرما۔

قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِيُوۡسُفَ وَاَخِيۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ۝ قَالُوۡۤا ءَاِنَّكَ

1۔ السنن الکبریٰ، کتاب الشہادت، جلد 10، صفحہ 199
2۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 67

لَاَنْتَ یُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ٘ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَاؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۹۰ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ ۝۹۱ قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ٘ ؗ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝۹۲ اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۹۳

"آپ نے پوچھا: کیا تمہیں علم ہے جو سلوک تم نے کیا یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ جب تم نادان تھے (سراپا حیرت بن گئے) کہنے لگے: کیا (سچ سچ) آپ ہی یوسف ہیں، فرمایا: (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ بڑا کرم فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر یقیناً جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے (وہ آخر کار کامیاب ہوتا ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ بھائیوں نے کہا: خدا کی قسم! بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر اور بے شک ہم ہی خطا کار تھے۔ آپ نے فرمایا: نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرما دے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے لے جاؤ میرا یہ پیراہن پس ڈالو اسے میرے باپ کے چہرے پر وہ بینا ہو جائیں گے اور (جاکر) لے آؤ میرے پاس اپنے سب اہل و عیال کو"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ استفہام بمعنی تذکیر و توبیخ ہے، اور یہی وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی: لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا (یوسف: 15) میں تجھے ضرور ان کے اس معاملے سے آگاہ کروں گا۔ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب انہوں نے پکڑا تھا اس وقت وہ ابھی چھوٹے تھے اور نبی نہیں تھے، کیونکہ جہالت کی صفت اسی صورت میں بیان کی جاسکتی ہے اور یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اب ان کی حالت بہتر ہے۔ یعنی یہ تم نے اس وقت کیا جب تم چھوٹے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے۔ اور ان کا قول اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ (اگرچہ ہم غلطی پر تھے) اس بنیاد پر ہے، کیونکہ بڑے ہو گئے مگر اپنے باپ سے شرم محسوس کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے انہوں نے اپنی کارروائی سے اپنے باپ کو آگاہ نہ کیا۔

ایک قول کے مطابق: اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اس کارروائی کے انجام سے ناواقف تھے۔ واللہ اعلم۔

قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ جب وہ آپ کے پاس پہنچے اور انہوں نے کہا: مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ تو وہ آپ کے سامنے جھک گئے اور آپ کے سامنے انہوں نے عاجزی اختیار کی تو آپ کا دل ان کے لیے نرم ہو گیا اور آپ نے انہیں اپنا تعارف کرایا۔ فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ تو وہ متنبہ ہوئے اور کہا: اِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مسکرائے تو انہوں نے آپ کو یوسف کے مشابہ سمجھا تو سمجھ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب آپ نے انہیں فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ پھر حضرت یوسف مسکرائے۔ جب آپ

مسکرائے تو گویا آپ کے اوپر والے دانت پروئے ہوئے موتی تھے، تو انہوں نے آپ کو یوسف کے مشابہ جانا تو استفہامیہ انداز میں کہا: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ کے بھائیوں نے آپ کو نہ پہچانا یہاں تک کہ آپ نے تاج اتارا تو آپ کے سر مبارک میں ایک علامت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی وہ علامت شامہ کی مثل تھی تو جب آپ نے انہیں فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ پھر اپنا تاج اتارا تو وہ آپ کو پہچان گئے اور انہوں نے کہا: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے آپ کی طرف ایک خط لکھا جس میں آپ نے اپنے بیٹے کا مطالبہ کیا خط میں تھا: یعقوب صفی اللہ ابن اسحاق ذبیح اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے عزیز مصر کی طرف۔ امابعد۔ بے شک ہم آزمائش اور امتحان کا گھرانہ ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے دادا ابراہیم علیہ السلام کو نمرود اور اس کی آگ کے امتحان میں مبتلا کیا، پھر میرے باپ اسحاق کو ذبح کے ذریعے آزمایا، پھر اس نے مجھے اپنے ایسے بیٹے کے ذریعے آزمایا جو مجھے ساری اولاد سے محبوب تھا یہاں تک کہ رورو کے میری بینائی چلی گئی بے شک نہ میں نے چوری کی اور نہ ہی کوئی چور میں نے پیدا کیا۔ والسلام۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خط پڑھا تو آپ کے اعضاء کانپنے لگے جلد میں تھرتھراہٹ طاری ہوگئی اور آنکھوں سے رونے کی وجہ سے آنسوں بہنے لگے اور آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تو یہ بھید کھل گیا۔ ابن کثیر نے انک پڑھا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ قراءت بھی بطور استفہام ہو جیسے تلك نعمة کیا یہ نعمت ہے؟ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ یعنی میں مظلوم ہوں اور مراد آپ کا قتل ہے۔ اور آپ نے انا ہو یوسف نہ کہا اس واقعہ کی تعظیم کی وجہ سے۔ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا یعنی نجات اور بادشاہ کے ذریعے اللہ نے ہمارے اوپر احسان فرمایا اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے، مصائب پر صبر کرتا ہے اور گناہوں سے اجتناب کر کے صبر اختیار کرتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی جو اس کی آزمائش میں صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور اس کی اطاعت کو برقرار رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ابن کثیر نے کہا: اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِیْ یا کو ثابت رکھ کے پڑھا ہے یہ قراءت بھی جائز ہے اس صورت میں مَنْ بمعنی الذی ہوگا اور یتقی صلہ میں داخل ہوگا یا ثابت رہے گی اور یَصْبِرْ کو رفع دیا جائے گا۔ اور یصبر کو اس بنیاد پر جزم دینا بھی جائز ہوگا کہ یتقی کو آپ محل جزم میں بنائیں اور من شرطیہ ہو اور یا ثابت رہے۔ اور جزم کی علامت اس ضمہ کے حذف کو بنالیں جو اصل میں یا پر تھا جس طرح شاعر نے کہا ہے:

ثم نادِی إذا دَخلتَ دِمَشْقًا　　یا یزِیْدُ بنَ خالدِ بنِ یزید

پھر تو جب دمشق میں داخل ہو تو ندا دے اے یزید بن خالد بن یزید اس میں نادی میں ''ی'' ثابت ہے۔

ایک شاعر نے کہا:

ألم یأتیك والأنباءُ تَنْمِي　　بما لَاقتْ لَبُونُ بني زیادِ

جماعت کی قرات ظاہر ہے ''انه'' میں ''هاء'' گفتگو سے کنایہ اور جملہ اس کی خبر ہے۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا اصل میں دو ہمزہ تھے دوسرے کو مخفف کر دیا گیا اس کو ثابت رکھنا جائز نہیں اسم فاعل مؤثر ہے جبکہ مصدر ایثار ہے۔ کہا

جاتا ہے اثرت التراب اثارۃ فانا مشید یہ بھی افعل کا وزن تھا پھر اس میں تعلیل کر دی گئی اصل میں اَثْیَدُ تھا یا کی حرکت ثا کو دی یا (ماقبل مفتوح) کو الف سے بدلا پھر الف کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ اور اثرت بروزن فعلت ہو گیا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی اور آپ کو علم، بردباری، حکمت، عقل اور بادشاہی کے ذریعے منتخب فرمایا۔ وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ یعنی گناہ کار یہ خطی یخطأ سے مشتق ہے اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی غلطی کر دے۔ اور اس کے ضمن میں معافی کا سوال بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ انہوں نے وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ کیسے کہا حالانکہ انہوں نے تو جان بوجھ کے یہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ انہوں نے جان بوجھ کے ایسا کیا تھا مگر جان بوجھ کر بھی تب ہی کیا تھا کہ راہ حق سے غلطی کر لی تھی، اور اسی طرح ہر وہ آدمی جو گناہ کرتا ہے تو وہ اس راستے سے ہٹ جاتا ہے جو صحیح اور حق کا راستہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ شبہ اور گناہ میں پڑ جاتا ہے۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ اور آپ نے بردباری کی انتہا کر دی۔ الْیَوْمَ کا معنی الوقت ہے اور التثریب سے مراد التعییر والتوبیخ ہے یعنی اب نہ تم پر کوئی عار ہے، نہ سختی اور نہ ہی ملامت، یہ سفیان ثوری وغیرہ کا قول ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو وہ اسے حد لگائے ولا یثرب علیها یعنی اس کو عار نہ دلائے''۔ بشر نے کہا:

فَعَفَوْتُ عنهم عَفْوَ غَیْرِ مُثَرِّبٍ وترکتهم لعقابِ یومِ سَرْمَدِ

میں نے انہیں ایسا معاف کیا کہ ان پر کوئی عار نہیں اور میں نے انہیں قیامت کے دن کی سزا کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

اصمعی نے کہا: ثَرَّبْتُ علیه وعَرَّبْتُ علیه اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے یہ تب کہا جب تو اس کے ساتھ برائی سے پیش آیا۔ زجاج نے کہا: معنی یہ ہوگا کہ جو میرے اور تمہارے درمیان حرمت اور بھائی چارے کے حقوق ہیں ان میں اب کوئی فساد نہیں تمہارے لیے میرے پاس معافی اور درگزر ہے۔ تثریب کی اصل الافساد ہے اور یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن دروازے کے دونوں کواڑ پکڑے اور لوگوں نے بیت اللہ کی پناہ لی ہوئی تھی آپ نے فرمایا: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور گروہ کو شکست دی'' (1)۔ پھر فرمایا: ''اے معشر قریش! تمہارا کیا خیال ہے''۔ انہوں نے عرض کی: بھلائی، کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے اگرچہ آپ قدرت رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''میں بھی وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے حیاء محسوس کرتے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تھے تو میں نے ان کو کہا تھا: آج ہم تم سے انتقام لیں گے اور تمہارا بندوبست کریں گے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو مجھے اپنی بات سے شرم آ رہی تھی۔ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ اس میں دعا کا معنی ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی پردہ پوشی فرمائے اور ان پر رحم فرمائے۔ اخفش نے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمْ پر

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 9، صفحہ 83

وقف کو جائز قرار دیا ہے جبکہ پہلی صورت مستعمل ہے، کیونکہ عَلَيْكُمُ پر وقف اور الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ سے ابتدا کی صورت میں آج ہی مغفرت کے یقین کا اظہار ہے اور یہ تو صرف وحی کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ عطا خراسانی نے کہا: نوجوان سے ضروریات کو طلب کرنا بوڑھے سے طلب کرنے کی نسبت آسان ہے، آپ نہیں دیکھتے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ عنقریب میں تمہارے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا، هٰذَا قمیص کی صفت ہے اور قمیص مذکر ہے۔

جہاں تک شاعر کے قول کا تعلق ہے:

تَدْعو هَوَازِنُ والقميصُ مُفَاضَةٌ فوق النِّطاقِ تُشَدُّ بالأزرار

شعر میں القميص مفاضة سے معلوم ہو رہا ہے کہ قمیص مؤنث ہے۔

اس میں تقدیر عبارت: والقميص درع مفاضة ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ ابن سدی نے اپنے باپ سے عن مجاہد روایت کی: حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کہا: اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا اس نے کہا: حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات سے آگاہ کیا گیا تھا کہ ان کی قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کو لوٹا دے گی، لیکن وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ قمیص تھی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کے ریشم سے آگ میں پہنائی تھی، آپ نے حضرت اسحاق کو پہنائی، حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنائی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے وہ قمیص چاندی کے ایک ٹکڑے میں ڈال کر حضرت یوسف علیہ السلام کی گردن میں لٹکا دی اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے نظر کا خوف رہتا تھا۔ جبریل امین نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خبر دی کہ اپنی قمیص بھیجو اس میں جنت کی خوشبو ہے اور جنت کی خوشبو کسی بیمار یا مصیبت میں مبتلا آدمی پر پڑے تو اس کو شفا مل جاتی ہے۔ حسن نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے متعلق نہ بتایا ہوتا تو آپ کو پتہ نہ چلتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی انہیں واپس مل جائے گی۔ اور جس نے قمیص اٹھائی تھی وہ یہوذا تھا، اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: میں نے ہی آپ کی قمیص کو جھوٹا خون لگا کر ان تک پہنچائی تھی اور ان کو پریشان کیا تھا اور میں ہی اب اسے اٹھاؤں گا تاکہ ان کو خوش کروں اور ان کی بینائی ان تک واپس لوٹے، سو اسی نے قمیص اٹھائی، سدی نے اسے بیان کیا ہے۔ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ تاکہ مصر کو اپنا گھر بنالیں۔ مسروق نے کہا: ان کے مردوں اور عورتوں کی تعداد ترانوے تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ قمیص وہ تھی جس کو پیچھے سے پھاڑا گیا تھا تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتہ چل جائے کہ آپ زنا سے محفوظ رہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوعاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، قشیری نے اس کو ذکر کیا ہے واللہ اعلم

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۝ فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ

بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ۞ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۞ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۞

''اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا (تو ادھر کنعان میں) ان کے باپ نے فرمایا کہ میں تو یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں اگر تم مجھے بے وقوف خیال نہ کرو۔ گھر والوں نے کہا: بخدا! (باباجی) آپ اپنی اس پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ پس جب آ پہنچا خوشخبری سنانے والا (اور) اس نے ڈالا وہ پیراہن آپ کے چہرے پر تو وہ فوراً بینا ہو گئے آپ نے (فرط مسرت سے) کہا: (دیکھو) کیا میں نہیں کہا کرتا تھا تمہیں کہ میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ (کے جتانے) سے جو تم نہیں جانتے۔ بیٹوں نے عرض کی: اے ہمارے پدر! (محترم) مغفرت مانگیے ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی، بے شک ہم ہی قصوروار تھے۔ فرمایا: عنقریب مغفرت طلب کروں گا تمہارے لیے اپنے رب سے، بے شک وہی غفور رحیم ہے۔ پھر جب وہ سب یوسف کے روبرو ہوئے آپ نے جگہ دی اپنے پاس اپنے والدین کو اور (انہیں) کہا: داخل ہو جاؤ مصر میں، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم خیر و عافیت سے رہو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ یعنی جب قافلہ مصر سے شام کی طرف نکلا، کہا جاتا ہے: فصل فصولا، وفصلته فصلا، یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قَالَ اَبُوْهُمْ، یعنی آپ نے قریبیوں میں سے جو آپ کے پاس تھا اور مصر نہیں گیا تھا اسے کہا اور وہ آپ کے پوتے تھے اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے کچھ بیٹے گئے ہوں اور باقیوں کو آپ نے فرمایا ہو: اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہوا چلی اور وہ حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو آپ تک اٹھا لائی حالانکہ دونوں کے درمیان آٹھ راتوں کی مسافت تھی (1)۔ حضرت حسن نے کہا: دس راتوں کی مسافت تھی۔ انہیں سے ایک ماہ کی مسافت بھی مروی ہے۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: پیراہن کی خشبو تخت بلقیس کی طرح پہنچی کہ وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ مجاہد نے کہا: ہوا چلی اس نے پراہن کو الٹ پلٹ کیا تو دنیا میں جنت کی خوشبوئیں پہنچ گئیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گئیں، آپ نے جنت کی خوشبو پائی تو آپ کو پتہ چل گیا کہ دنیا میں جنت کی خوشبو صرف اسی پیراہن کی وجہ سے ہو سکتی ہے، تو اس وقت آپ نے فرمایا: اِنِّيْ لَاَجِدُ یعنی میں سونگھ رہا ہوں۔ تو وہ سونگھنے کی حس کی وجہ سے پائی گئی۔ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اگر تم مجھے بے وقوف نہ سمجھو (2)۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے:

إلاّ سليمان إذ قال المليك له قم في البرية فاحددها عن الفند

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 71
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 73

عن الفند یعنی عن السَّفَه، حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: لولا أن تکذبون یعنی اگر تم مجھے نہ جھٹلاؤ۔ الفند سے مراد الکذب ہے۔ قد أفند إفنادا یعنی اس نے جھٹلایا۔ اسی سے شاعر کا شعر ہے:

هل فی افتخار الكريم من أَوَدِ　　أم هَلْ لقول الصَّدُوقِ من فَنَدِ

یعنی من کذب ایک قول کے مطابق: لولا أن تقبحون ہے یہ ابوعمرو کا قول ہے۔

التنفید سے مراد التقبیح ہے، شاعر نے کہا:

يا صاحِبَيّ دعا لومي و تَفْنِيدِي　　فليس مافاتَ مِن أمري بمردودِ (1)

ابن الاعرابی نے کہا: لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ یعنی اگر تم میری رائے کو کمزور نہ سمجھو تو یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ الفند سے مراد بڑھاپے کی وجہ سے رائے کا کمزور ہونا ہے۔ چوتھا قول تضللون تم مجھے گمراہ نہ خیال کرو تو یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: تلومونی، یعنی تم مجھے ملامت نہ کرو تو۔ التفنید سے مراد ملامت اور رائے کا ضعف ہے۔ حضرت، حسن حضرت قتادہ اور مجاہد نے بھی کہا: تھرمون یعنی تم مجھے بوڑھا نہ سمجھو تو (2)۔ یہ تمام کے تمام اقوال قریب المعنی ہیں، یہ عاجزی اور رائے کے ضعف کی طرف راجع ہے، جب کوئی چیز کسی کو عاجز کردے تو کہا جاتا ہے: فنده تفنیدا جس طرح کسی نے کہا:

أهلكني باللوم والتفنيد

اس نے مجھے ملامت اور عاجز کر کے ہلاک کر دیا۔

جب کوئی غلط کلام کرے تو کہا جاتا ہے: أفند، الفند سے مراد کلام اور رائے میں خطا ہے، جس طرح نابغہ نے کہا:

فاحددها عن الفَنَدِ

یعنی عقل میں فساد بپا کرنے سے تو اسے روک۔ اور اسی سے کہا گیا ہے کہ ملامت تفنید ہے، شاعر نے کہا:

يا عاذِلَيَّ دَعَا المَلَامَ وأَقْصِرَا　　طالَ الهَوَى و أطلتما التَّفْنِيدَا (3)

اور أفند فلانا الدھر کہا جاتا ہے جب وہ اسے خراب کردے۔ اسی سے مقبل کا قول ہے:

دَعِ الدَّهْرَ يَفْعَلُ مَا أرَادَ فإنَّهُ　　إذا كُلِّفَ الإفنادَ بالنَّاسِ أَفْنَدَا (4)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ یعنی صحیح رستے سے چلے جانے میں۔

حضرت ابن عباس اور ابن زید نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں سے آپ اپنی ماضی کی غلطی میں ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: آپ اپنے پرانے جنون میں ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: یہ نافرمانی ہے۔ حضرت قتادہ اور سفیان نے کہا: آپ اپنی پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ ان کے نزدیک حضرت یوسف فوت ہو چکے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اولاد میں سے جو آپ کے پاس تھا اس نے یہ کہا جبکہ ان کو کوئی خبر نہ تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے: آپ کے اہل اور قرابت داروں میں سے جو آپ کے پاس تھا اس نے یہ کہا تھا۔ ایک قول کے مطابق پوتوں نے کہا اور وہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 73　2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 75　3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 76　4۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 73

چھوٹے تھے۔ واللہ اعلم۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ، عَلٰى وَجْهِهٖ سے مراد علی عینیہ ہے یعنی آپ کی دونوں آنکھوں پر فَارْتَدَّ بَصِيْرًا، اَنْ زائدہ ہے، اور بشیر سے مراد شمعون یا یہوذا ہے۔ یہوذا نے کہا: آج میں پیراہن لے کر جاؤں گا جس طرح کہ خون سے لت پت قمیص لے کے گیا تھا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سدی سے مروی ہے کہ اس نے بھائیوں کو کہا: تم جانتے ہو کہ پریشانی والی قمیص میں لے کے گیا تھا سو مجھے جانے دو تاکہ خوشی والی قمیص بھی میں لے کر جاؤں۔ یحییٰ بن یمان نے حضرت سفیان سے روایت کرتے ہوئے کہا: جب خوشخبری سنانے والا حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: تو نے یوسف کو کس دین پر چھوڑا ہے؟ اس نے کہا: اسلام پر۔ آپ نے فرمایا: اب نعمت مکمل ہوگئی۔ حضرت حسن نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خوشخبری لانے والا آیا تو آپ کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے ذریعے آپ اسے بدلہ دیتے تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور سات راتوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا، لیکن (اس کے بدلے میں) اللہ تعالیٰ نے تیرے اوپر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ دعا سارے انعامات سے بڑی ہے اور سب تحائف اور ذخائر سے زیادہ فضیلت والی ہے اور یہ آیت کریمہ خوشخبری کے وقت کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے جواز پر دلیل ہے۔ باب میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے جس میں یہ بھی ہے: ''جب وہ آدمی میرے پاس آیا جس کی خوشخبری دیتے ہوئے میں نے آواز سنی تو میں نے اپنے کپڑے اتارے اور اس کی خوشخبری کے بدلے اسے وہ پہنا دیئے''۔ اس کے بعد انہوں نے پوری حدیث ذکر کی ہے، اور یہ پوری حدیث ان تین آدمیوں کے واقعے کے بیان میں گزر چکی ہے جو پیچھے رہ گئے تھے اور حضرت کعب کا خوشخبری سنانے والے کو اپنے کپڑے دے دینا باوجود اس کے کہ ایسا کرنے کے جواز پر کوئی اور دلیل بھی نہیں تھی کہ جب آدمی کو کسی کے ذریعے خوشخبری کے حصول کی امید ہو (تو کیا وہ ایسا کر سکتا ہے یا نہیں)، تو یہ غم اور مصیبت کے زوال کے بعد خوشی کے اظہار کے جواز کی دلیل ہے۔ اس باب سے بچوں کے قرآن مقدس سیکھنے کی وجہ سے خوشی کے اظہار کا جواز اور اس سبب سے لوگوں کو کھانا کھلانے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ ''البقرہ'' کے حفظ کے بعد اونٹ ذبح کیا تھا۔ واللہ اعلم

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ انہیں اپنا ارشاد: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یاد کروایا۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ کلام میں حذف ہے، تقدیر عبارت: فلما رجعوا من مصر قالوا یا أبانا ہے یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے آپ کو کہا تھا: قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ وہ آپ کے پوتے تھے یا آپ کے قریبی رشتہ دار تھے آپ کا بیٹا نہیں تھا، کیونکہ وہ تو غائب تھے۔ اور انہوں نے آپ سے مغفرت کا سوال اس لیے کیا کہ انہوں نے آپ کو پریشان کیا جس کا گناہ سوائے آپ کی معافی کے ساقط نہیں ہو سکتا تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ حکم اس آدمی کے لیے بھی ثابت ہوگا جس نے کسی مسلمان کی جان، مال یا اس کے علاوہ کسی چیز

میں زیادتی کی ہو، تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے معافی مانگے اور اسے ظلم اور اس کی مقدار کے متعلق بتائے، کیا مطلق معافی مانگنا اسے نفع دے گا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ نفع بخش نہیں، کیونکہ اگر اس نے اسے زیادتی کے بارے میں آگاہ کیا جس کی ایک خاص حد اور نقصان تھا تو بعض اوقات مظلوم کا دل اسے معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

صحیح بخاری میں (1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے کسی بھائی کی عزت یا کسی چیز میں زیادتی کی ہوئی ہو تو اسے چاہیے کہ آج اس سے معافی مانگ لے قبل اس کے کہ دراہم و دینار نہیں ہوں گے اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوا تو اس کی زیادتی کی مقدار اس کے نیک عمل سے لیا جائے گا اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہ اس سے لے کر ظالم کو دے دیئے جائیں گے۔'' مہلب نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے: اخذ منه بقدر مظلمة ارشاد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زیادتی کی مقدار معلوم ہونی چاہیے اور واضح طور پر اس کی طرف اشارہ ہونا چاہیے واللہ اعلم۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ نے اپنی دعا کو سحری تک موخر فرمایا۔ مثنی بن صباح نے طاؤس سے روایت کرتے ہوئے کہا: جمعہ کی رات کی سحری تھی، اور یہ عاشوراء کی رات تھی۔ ترمذی کی کتاب میں حافظہ کی دعا کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اتنے میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ قرآن میرے سینے میں خلط ملط ہو گیا اور میں اس پر قابو نہ پا سکا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھا دوں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تجھے بھی فائدہ دے گا اور جس کو تو وہ سکھائے گا اسے بھی فائدہ دے گا اور جو کچھ تو حاصل کرے گا اسے تیرے سینے میں ثابت کر دے گا'' (2)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وہ کلمات سکھائے، آپ نے فرمایا: ''جب جمعہ کی رات ہو تو ہو سکے تو رات کے آخری ثلث میں اٹھ وہ ساعت مشہودہ ہے اور اس میں کی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے، میرے بھائی یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کہا تھا۔ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ وہ کہہ رہے تھے یہاں تک کہ جمعہ کی رات آئی'' حضرت ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ یعنی عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے استغفار کروں گا ایام بیض کی راتوں میں یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں کی رات میں کیونکہ ان راتوں میں دعا قبول ہوتی ہے۔ عامر شعبی سے مروی ہے انہوں نے کہا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ سے مراد یہ ہے کہ میں یوسف کو کہوں گا اگر اس نے تمہیں معاف کر دیا تو میں اپنے رب سے تمہارے لیے استغفار کروں گا؛ سعید بن داؤد نے اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حدثنا هشيم قال حدثنا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، القصاص یوم القیامۃ، جلد 2، صفحہ 967

ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی شان الحساب والقصاص، حدیث نمبر 2343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، حفظ الدعاء، جلد 2، صفحہ 194۔ ایضاً، حدیث 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبد الرحمن بن اسحق عن محارب بن دثار عن عمه انہوں نے کہا کہ میں سحری کے وقت مسجد میں آتا تھا تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرتا تو انہیں یہ کہتے ہوئے سنتا تھا: اے اللہ! تو نے حکم دیا تو میں نے اطاعت کی، تو نے دعوت دی تو میں نے اسے قبول کیا، اور یہ سحری کا وقت ہے مجھے معاف فرمادے، تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ملا اور کہا: کچھ ایسے کلمات ہیں جو میں آپ سے سنتا ہوں آپ سحری کے وقت کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی تو سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ کے قول کے ذریعے اپنے بیٹوں کو سحری تک مؤخر کیا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ یعنی اس محل میں داخل ہوئے جو آپ کا تھا۔ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خوشخبری سنانے والے کے ساتھ دو سو سواریاں اور زادراہ بھیجا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گزارش کی کہ وہ اپنے اہل خانہ اور سب بیٹوں کو ساتھ لائیں۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ یعنی اپنے پاس بلایا اور اَبَوَيْهِ سے مراد آپ کا باپ اور خالہ ہے کیونکہ آپ کی ماں تو بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال فرما گئیں تھیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر آپ کی ماں کو زندہ کیا تا کہ وہ آپ کو سجدہ کرے اور آپ کا خواب ثابت ہو جائے، یہ حضرت حسن کا قول ہے اور سورۂ ''بقرہ'' میں یہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو زندہ کیا اور وہ آپ پر ایمان لائے۔

اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ابن جریج نے کہا: یعنی سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ان شاء اللہ ہے(1) انہوں نے کہا: یہ قرآن کی تقدیم و تاخیر ہے؛ (یعنی اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کے الفاظ پہلی آیت کے ساتھ ہیں) نحاس نے کہا: ابن جریج کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ مصر میں داخل ہو چکے تھے تو انہیں آپ نے اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کیسے کہا؟ یہ قول بھی ہے کہ آپ نے اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تبرکاً کہا۔ اٰمِنِيْنَ یعنی قحط سے امن میں یا فرعون سے امن میں، کیونکہ وہ فرعون کی اجازت کے بغیر مصر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰

''اور (جب شاہی دربار میں پہنچے تو) آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے اور یہ (منظر دیکھ کر) یوسف نے کہا: اے میرے پدر بزرگوار! یہ تعبیر ہے میرے خواب کی جو پہلے (عرصہ ہوا میں نے) دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا کر دکھایا ہے اور اس نے بڑا کرم فرمایا مجھ پر جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے اور لے آیا تمہیں صحرا سے اس کے بعد کہ ناچاقی ڈال دی تھی شیطان نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 81

میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان، بے شک میرا رب لطف و کرم فرمانے والا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، یقیناً وہی سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے"۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ حضرت قتادہ نے کہا: عرش سے مراد چارپائی ہے۔ اس کے محامل پہلے گزر چکے ہیں اور بعض اوقات بادشاہی اور خود بادشاہ کو عرش کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے اسی سے نابغہ ذبیانی کا قول ہے:

عُرُوشٌ تَفَانَوا بعد عِزٍّ وأَمْنَةٍ

پہلے گزر چکا ہے۔

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا میں لَهٗ کی ضمیر کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے؛ معنی یہ ہوگا: اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ سجدے میں گر گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے خواب کے ثبوت کے لیے قبلہ کی طرح تھے، یہ حضرت حسن سے مروی ہے، جبکہ نقاش نے کہا: یہ غلطی ہے (صحیح بات یہ ہے کہ) ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے کیونکہ سورت کے آغاز میں رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ہے اور ان کا سلام یہ تھا کہ ادنیٰ، اعلیٰ کو اور چھوٹا بڑے کو سجدہ کرے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، آپ کی خالہ اور بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہوئی اور آپ نے کہا: هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان ایک سو بیس سال کا عرصہ تھا۔ حضرت سلمان فارسی اور عبداللہ بن شداد نے کہا: چالیس سال کا عرصہ تھا(1)۔ سدی، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: چھتیس سال کا عرصہ تھا۔ حضرت حسن، جسر بن فرقد اور فضیل بن عیاض نے کہا: اسی سال حضرت وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو جب کنویں میں پھینکا گیا تو آپ کی عمر سترہ سال تھی اور اسی سال آپ اپنے باپ سے غائب رہے اور اپنے باپ کی ملاقات کے بعد تئیس سال تک زندہ رہے اور وصال کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی جبکہ تورات میں ایک سو چھبیس سال مرقوم ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیز مصر کی بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد یہ افراثیم، منشاء اور رحمت حضرت ایوب علیہ اسلام کی بیوی ہے، جبکہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بیس سال رہے اور پھر آپ کا وصال ہو گیا۔ ایک قول کے مطابق: اٹھارہ سال رہے۔ بعض محدثین نے کہا: چالیس سال اور کچھ عرصہ رہے۔ اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے درمیان تینتیس سال کا عرصہ تھا پھر اللہ نے ان کو ملا دیا۔ ابن اسحاق نے کہا: اٹھارہ سال کا عرصہ تھا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت قتادہ عن حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا میں یہ نہیں تھا کہ انہوں نے سجدہ کیا ہو بلکہ ان کا ایک طریقہ تھا کہ وہ اپنے سروں سے اشارہ کرتے تھے، یہی ان کا سلام ہوتا تھا۔ ثوری، ضحاک

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 85

اور دیگر لوگوں نے کہا کہ وہ اسی طرح کا سجدہ تھا جس طرح ہمارے ہاں ہوتا ہے اور یہی ان کا سلام تھا۔ ایک قول کے مطابق رکوع کی طرح جھکنا تھا اور خرور علی الارض نہیں تھا اور اسی طرح جھک کر اور اشارہ کر کے ان کے سلام کا طریقہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سارے عمل کو ہماری شریعت میں منسوخ فرما دیا اور جھکنے کے بدلے کلام کو ہمارا سلام بنا دیا۔ مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ سجدہ جس بھی طریقے سے تھا صرف سلام کے طور پر تھا سجدہ عبادت نہیں تھا۔ قتادہ نے کہا: ان کے نزدیک بادشاہوں کا یہی سلام ہوتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اہل جنت کا سلام السلام علیکم عطا فرمایا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ جھکنا اور اشارہ کرنا جس کو منسوخ کر دیا گیا ہے یہ مصر کے علاقوں میں عجمیوں میں عادت بن چکا ہے، اسی طرح لوگوں کا کسی کے لیے کھڑا ہونا حتی کہ اگر وہ کھڑا نہ ہو تو آنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے دل میں اس کی کوئی قدر نہیں، اسی طرح جب وہ ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے جھکنا ان کی مستقل عادت اور مستقل وراثت ہے، بالخصوص امراء اور سرداروں سے ملاقات کے وقت۔ ان لوگوں نے ان لوگوں کے طریقے کو اپنا لیا اور سنن سے اعراض کر لیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم ایک دوست کو ملیں تو کیا ایک دوسرے کے لیے جھکیں؟ آپ نے فرمایا: ”نہیں“۔ ہم نے عرض کیا: کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ معانقہ کریں! آپ نے فرمایا: ”نہیں“۔ ہم نے کہا: کیا ہم مصافحہ کریں؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں“۔ اس روایت کو ابو عمر نے التمہید میں روایت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تو فرمایا ہے: ”تم اپنے سردار اور اپنے سے بہتر آدمی کے لیے کھڑے ہو جاؤ“ (1)۔ مراد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ ان مخصوص حالات کی بنیاد پر حضرت سعد کے ساتھ ہی خاص ہوگا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا قیام اس لیے تھا تا کہ وہ آپ کو گدھے سے اتاریں اور یہ بڑی عمر کے آدمی کے لیے جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس وجہ سے اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنے لگے اور اگر وہ اس عمل کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اپنے لیے اس کو لطف اور راحت محسوس کرے تو علماء نے اسے بھی جائز قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جس کو اس بات نے خوش کیا کہ لوگ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کریں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ٹھکانہ جہنم میں بنا لے“۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر کوئی بھی زیادہ عزت والا نہ تھا اس کے باوجود وہ اس عمل کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے آپ کو دیکھ کر آپ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اگر یہ کہا جائے کہ انگلی کے ساتھ اشارہ کرنے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ تو اسے کہا جائے گا: یہ اس صورت میں جائز ہے جب بندہ آپ سے دور ہو، تا کہ آپ سلام کے وقت اس کی تعیین کر دیں، اور اگر وہ قریب ہو تو پھر جائز نہیں جبکہ ایک قول قرب و بعد کی دونوں صورتوں میں منع کا ہے اس کا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”جس نے کسی اور کی مشابہت اختیار کی تو وہ ہم میں سے نہیں ہے“۔ اور آپ نے فرمایا: ”یہود و نصاریٰ کی طرح سلام نہ کرو، پس یہود کا سلام

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 95

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 100۔ ایضاً سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4552۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہتھیلی کے ذریعے اور نصاریٰ کا سلام اشارہ کے ساتھ ہے" (1)۔ اور جب کوئی سلام کرے تو وہ نہ جھکے اور نہ ہی سلام کے ساتھ اس کے ہاتھ کو چومے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جھکنا تواضع پر دلالت کرتا ہے اور تواضع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ اور جہاں تک ہاتھوں کو بوسہ دینے کا تعلق ہے تو یہ عجمیوں کا عمل ہے اور ان کے ایسے افعال کی اتباع نہیں کی جائے گی جو انہوں نے اپنے بڑوں کی تعظیم کے لیے خود بنا لیے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میرے سر کے پاس اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو جس طرح عجمی اپنے سے برتر لوگوں کے سر کے پاس کھڑے ہوتے ہیں"۔ تو یہ عمل اسی کے مثل ہے البتہ مصافحہ میں کوئی حرج نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ سے واپسی کے موقع پر حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کا حکم بھی ارشاد فرمایا اور فرمایا: "باہم مصافحہ کیا کرو یہ کھوٹ کو دور کرتا ہے" (2)۔ غالب تمار نے حضرت شعبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جب ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے تھے اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کرتے تھے، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام مالک نے تو مصافحہ کو بھی ناپسند کیا ہے تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے مصافحہ اور معانقہ کو ناپسند کیا ہے، سحنون اور دیگر اصحاب مالک نے یہی موقف اختیار کیا ہے تاہم امام مالک سے اس کے برعکس جواز مصافحہ کے حوالے سے بھی روایت موجود ہے۔ مؤطا کی روایت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ اور سلف وخلف میں سے علماء کی ایک جماعت جواز مصافحہ کی قائل ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے صرف اس وجہ سے مصافحہ کو ناپسند کیا ہے کہ آپ نے اسے دین کا کوئی معاملہ خیال نہیں کیا اور نہ ہی یہ سلام کی طرح منقول ہے، اگر یہ سلام کا حصہ ہوتا تو ذکر کے اعتبار سے بھی اس کے برابر ہوتا۔

میں (قرطبی) نے کہا: مصافحہ کے حوالے سے تو ایک حدیث بھی ہے جس میں اس کے بارے میں ترغیب ہے اور جو اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی محافظت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے آپ نے فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں نے عرض کیا: یارسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو یہ گمان کرتا تھا کہ مصافحہ عجمیوں کا (طریقہ) ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہم ان سے زیادہ مصافحہ کے حقدار ہیں جب بھی دو مسلمان ایک دوسرے کو ملتے ہیں اور باہم محبت اور اخلاص کی بنیاد پر ان میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتا ہے تو ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے" (3)۔

قولہ تعالیٰ: وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ۔ من الجب نہیں فرمایا یہ مہربانی اور کرم نوازی کے طور پر ہے تاکہ آپ اپنے بھائیوں کو تثریب علیکم کے قول کے ساتھ معاف کرنے کے بعد ان کی کارائی یاد نہ دلادیں۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہی صوفیاء کرام کے نزدیک اصل ہے کہ صفا کے وقت جفا کو ذکر کرنا بھی جفا ہے، صوفیاء کا یہ قول صحیح ہے جس پر کتاب اللہ بھی دال ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ آپ کے قید میں جانے میں خود اپنا اختیار تھا کہ آپ نے خود کہا تھا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ (یوسف: 33) جبکہ کنویں میں جانا اللہ تعالیٰ کے ارادے سے تھا۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ قید خانے میں آپ چوروں اور نافرمان لوگوں کے ساتھ تھے جبکہ کنویں میں اللہ تعالیٰ

1۔ کنز العمال، جلد 9، صفحہ 118 2۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 130 3۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 134

کے ساتھ، تو اسی طرح قید خانے سے نجات دینے میں احسان بھی بہت بڑا تھا اور چونکہ قید خانہ میں آپ ایسے معاملے کی وجہ سے گئے جس کا آپ نے ارادہ کیا تھا اور اسی طرح اپنے اختیار سے گئے جب آپ نے خود کہہ دیا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ تو اس میں مصیبت اور کرب بھی زیادہ تھا۔ اور اس میں آپ نے یہ بھی کہا تھا: عِنْدَ رَبِّكَ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا تو اس پر آپ کا عتاب ہوا۔ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا مسکن کنعان کی سرزمین تھی، اور اہل کنعان مویشیوں والے اور صحرائی لوگ تھے۔ ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام صحراء کی طرف نکل گئے اور وہیں رہائش پذیر ہو گئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بادیہ میں سے کسی کو نبی مبعوث نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ بدا مقام کی طرف چلے گئے شاعر نے بھی اس شعر میں بدا سے مراد وہ مقام لیا ہے۔

وأنتِ التی حَبَّبتِ شَغْبًا إلی بَدًا إلیّ وأوطانی بلادٌ سِواهُما

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہاڑ کے نیچے اس جگہ پر ایک مسجد تھی۔ بَدْوا کہا جاتا ہے جب وہ لوگ بدا آئیں جس طرح غار و اغور آ کہا جاتا ہے یعنی جب وہ غور کے مقام پر آئے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ تمہیں بدا کے مقام سے لے آئے گا، اس کو امام قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی نے ضحاک عن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ یعنی حسد کو پیدا کر کے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔ ایک قول کے مطابق نَّزَغَ کا معنی ہے افسد یعنی اس نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد بپا کیا۔ آپ کا ان کے گناہ کو شیطان پر ڈال دینا آپ کی طرف سے بطور مہربانی تھا۔ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ یعنی وہ اپنے بندوں کے لیے نرم ہے۔ خطابی نے کہا: لطیف سے مراد وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر لطف و کرم فرماتی ہے اور اس کا لطف و کرم ایسے طریقے سے ہوتا ہے جن کو بندے جانتے بھی نہیں ہوتے اور وہ ان کے لیے ایسے اسباب مہیا فرما دیتا ہے جو ان کے گمان میں بھی نہیں ہوتے، جس طرح کے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ (الشوریٰ:19) ایک قول کے مطابق لطیف سے مراد معاملات کے دقائق کو جاننے والا ہے۔ یہاں اس سے مراد اکرام اور نرمی ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے نکال کر ان کے خاندان کو صحراء سے وہاں پہنچا کر اور آپ کے دل سے شیطانی وسوسے کو نکال کر لطف و کرم فرمایا (1)۔

روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اہل اور بچوں کے ساتھ آئے اور مصر کی سرزمین کو شرف بخشا تو جب اس کی اطلاع حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچی تو آپ نے فرعون مصر سے اجازت مانگی جس کا نام ریان تھا کہ وہ آپ کو اپنے باپ یعقوب کو ملنے کی اجازت دے اور اسے آپ کے آنے کی خبر دی تو اس نے آپ کو اجازت دے دی اور اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کو آپ کے ساتھ سوار ہونے کا حکم دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور بادشاہ نکلے تو آپ کے ساتھ چار ہزار افراد تھے اور ہر امیر کے ساتھ اللہ کی اتنی مخلوق تھی جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور اہل مصر بھی ان کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملنے کے لیے سوار ہو گئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام یہوذا کے ہاتھ پر ٹیک لگا کر چل رہے تھے۔ حضرت یعقوب

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 86

علیہ السلام نے گھوڑے، لوگ اور لشکر کو دیکھا تو فرمایا: اے یہوذا! یہ فرعون مصر ہے؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ یہ آپ کا بیٹا یوسف ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے سلام میں پہل کرنا چاہا تو آپ کو اس سے روک دیا گیا کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام آپ سے زیادہ اس کے حقدار تھے اور افضل بھی تھے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے سلام کا آغاز فرمایا اور فرمایا: تم پر سلام ہو اے غموں کو دور کرنے والے! اور رو پڑے تو حضرت یوسف علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ رو پڑے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام خوشی سے روئے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد گرامی کی پریشانی کو دیکھ کر روئے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ رونا چار طرح سے ہوتا ہے، خوف سے رونا، تکلیف سے رونا، خوشی سے رونا اور دکھلاوے کا رونا، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے غموں اور پریشانیوں کے بعد میری آنکھ کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے گھرانے کے بیاسی آدمیوں کے ساتھ آپ مصر میں داخل ہوئے اور پھر وہ لوگ مصر سے تب نکلے جب ان کی تعداد چھ لاکھ اور کچھ ہزار ہوگئی۔ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دریا کو عبور کیا، اس بات کو عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو مرد، عورتیں ملا کر وہ کل ترانوے آدمی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی۔ ربیع بن خثیم نے کہا: جب داخل ہوئے تو ان کی تعداد بہتر ہزار تھی اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو چھ لاکھ تھے۔ حضرت وہب نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے بیٹے مصر میں داخل ہوئے تو مرد، عورتیں اور بچے ملا کر نوے آدمی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون سے بھاگ کر نکلے تو چھ لاکھ پانچ سو ستر اور کچھ مجاہدین تھے۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں چوبیس سال بڑی خوشحالی اور نعمت کی حالت میں مقیم رہے، مصر میں ہی آپ نے وصال فرمایا اور اپنے بیٹے یوسف کے نام وصیت لکھی کہ ان کے جسد اقدس کو یہاں سے اٹھا کر شام میں اپنے باپ حضرت اسحق کے پہلو میں دفن کیا جائے تو آپ نے ایسا ہی کیا، اور پھر مصر واپس لوٹ آئے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام کو ساج کے بنے ہوئے تابوت میں بیت المقدس منتقل کیا گیا۔ اسی دن عیصو فوت ہوا، تو دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا، اسی وجہ سے یہودی اپنے مردوں کو بیت المقدس لے جاتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور عیصو اکٹھے پیدا ہوئے اور ایک ہی قبر میں دفن ہوئے دونوں کی عمر ایک سو چوہتر سال تھی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

”اے میرے رب! عطا فرمایا تو نے مجھے یہ ملک نیز تو نے سکھایا مجھے باتوں کے انجام کا علم، اے بنانے والے آسمانوں اور زمین کے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں مجھے وفات دے در آنحالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ“۔

قولہ تعالیٰ: رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ قتادہ نے کہا: کسی نبی یا غیر نبی (1) نے موت کی تمنا نہیں کی سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے، اور وہ بھی تب جب آپ پر نعمتیں تمام ہو گئیں اور تمام معاملات مکمل ہو گئے تو آپ اپنے پروردگار کی ملاقات کے مشتاق ہو گئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی تمنا نہیں کی بلکہ اسلام پر وفات کی تمنا کی ہے، یعنی جب میری موت آئے تو مجھے حالت اسلام میں موت دے، یہ جمہور کا قول ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: موت کی تمنا صرف تین آدمی کرتے ہیں، ایسا آدمی جو موت سے بعد کے معاملات سے ناواقف ہوتا ہے یا وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا مشتاق اور محب ہوتا ہے۔ صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے جو اس پر نازل ہوئی ہے اگر تمنا کرنا ضروری ہی ہو تو اسے یہ کہنا چاہیے۔ یا اللہ! جب تک زندگی تو تو میرے لیے بہتر جانتا ہے مجھے زندہ رکھ اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھے موت دے دے''۔ اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ مسلم میں ہی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (3) سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے اور اس کے آنے سے پہلے اسے کوئی نہ بلائے، جب تم میں سے کوئی مرے گا تو اس کا سلسلہ عمل منقطع ہو جائے گا اور مومن کی عمر اس میں بھلائی اور خیر کا اضافہ کرتی ہے''۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت، دنیا سے جانے اور عمل کے خاتمہ کی تمنا کی؟ یہ بعید از قیاس بات ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے ان کی شریعت میں یہ جائز ہو، کیا فتنوں کے ظہور اور غلبہ کے وقت اور دین کے ضائع ہو جانے کے خوف کے وقت موت کی تمنا اور دعا جائز نہیں جس طرح کہ ہم (قرطبی) نے کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے۔ اللہ کے ارشاد: مِنَ الْمُلْكِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ مصر کی بادشاہی کل بادشاہی نہیں ہے اسی طرح علم تعبیر بھی کل علم نہیں ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مِنْ جنس کے لیے ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فاجتنبوا الرجس من یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، یعنی آتیتنی الملک وعلمتنی تاویل الاحادیث۔

قولہ تعالیٰ: فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ندا کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور وہ ہے رب یہ ندا مضاف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: یا رب! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ندا ثانی ہو اور فاطر سے مراد خالق ہے، فھو سبحانہ فاطر الموجودات یعنی موجودات کا خالق، ان کا آغاز کرنے والا، ان کی نشو و نما کرنے والا اور بغیر کسی چیز اور نمونے کے ان کو ایجاد فرمانے والا اس کی وضاحت سورۃ البقرہ میں بدیع السموات والارض کے ارشاد گرامی کے تحت تفصیل سے گزر چکی ہے اور ہم (قرطبی) نے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں اس پر مزید اضافہ کیا ہے۔ اَنْتَ وَلِیّٖ یعنی تو میرا مددگار اور دنیا و آخرت میں میرے معاملات کا والی ہے۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ صالحین سے مراد آپ کے تین آباء ہیں یعنی حضرت

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 89

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، کراھۃ تمنی الموت، جلد 2، صفحہ 342 3۔ ایضاً

ابراہیم، حضرت اسحق اور حضرت یعقوب علیہم السلام، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصر میں حالت طہارت و پاکیزگی میں وفات نصیب فرمائی اور سنگ مرمر کے صندوق میں دریائے نیل میں آپ کی تدفین ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ جب آپ کا وصال ہوا تو لوگ جمع ہو گئے، ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کے محلے میں آپ کی تدفین ہو تو اس محلے میں برکت کا نزول ہو۔ تمام لوگ اس معاملے پر بضد ہو گئے حتیٰ کے قتال کی نوبت آ گئی، تو پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو دریائے نیل میں ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں سے پورے مصر میں پانی جاتا ہے۔ آپ کی قبر پر سے پانی گزرے گا پھر پورے مصر میں وہ پانی منتشر ہو جائے گا، (تو سب کو برکت حاصل ہو گی) تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو انہوں نے آپ کو دریائے نیل سے نکالا اور چار سو سال کے بعد آپ کا تابوت بیت المقدس منتقل کیا گیا اور آپ کو ایک دعا، وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی وجہ سے اپنے آباء کے ساتھ دفن کیا گیا۔ آپ کی عمر ایک سو سات سال تھی، حضرت حسن سے روایت ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کو سترہ سال کی عمر میں کنویں میں ڈالا گیا اور غلامی، قید خانے اور بادشاہت میں اسی سال گزارے پھر آپ کے بکھرے ہوئے کاموں کو جمع کیا گیا اس کے بعد آپ نے تیئس سال زندگی گزاری (اس طرح کل عمر ایک سو بیس سال ہوئی)۔ آپ کی اولاد میں ابن لہیعہ کے قول کے مطابق افرائیم، منشا اور رحمت ہیں جو کہ حضرت ایوب کی زوجہ تھیں۔

امام زہری نے کہا: افرائیم بن یوسف کا بیٹا نون بن افرائیم تھا اور نون کا بیٹا حضرت یوشع بن نون تھا اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آپ کے معاون تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں نبی بنایا، تو ان کے بعد آپ نبی تھے۔ اور یہ وہی ہیں جنھوں نے اریحاء کو فتح کیا اور اس میں جابر لوگوں میں سے جو تھا اسے قتل کیا اور جس طرح سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے کہ سورج نے آپ کی خاطر رکنا چاہا۔ منشا بن یوسف کا بیٹا موسیٰ بن منشا تھا موسیٰ بن عمران سے پہلے۔ اہل تورات کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ ہیں جنھوں نے ایک عالم سے ملاقات کی خواہش کی تھی تا کہ اس سے علم حاصل کریں یہاں تک آپ نے اسے پالیا۔ اور عالم وہ تھا جس نے کشتی کو توڑا، بچے کو قتل کیا اور دیوار بنائی۔ اور موسیٰ بن منشا آپ کے ساتھ رہے یہاں تک کہ یہ آپ کے ساتھ وہاں تک پہنچے جہاں تک آپ پہنچے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس بات کا انکار کرتے ہیں اور صحیح بھی وہ بات ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی اسی طرح قرآن میں بھی ہے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کئی قومیں اور زمانے تھے ان کے درمیان حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ ۝ وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

"(اے حبیب) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کرتے ہیں آپ کی طرف اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ متفق ہو گئے تھے اس بات پر درآنحالیکہ مکر کر رہے تھے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ، خواہ آپ کتنا

ہی چاہیں ایمان لانے والے اور نہیں طلب کرتے آپ ان سے اس (درس ہدایت) پر کچھ معاوضہ، نہیں ہے یہ مگر نصیحت سب جہانوں کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ مبتدا اور خبر ہے نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ خبر ثانی ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذٰلِكَ بمعنی الذی ہو اور نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ اس کی خبر ہو، یعنی اَلَّذِی مِنْ انباءِ الغیب نوحیه الیك یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت یوسف کے معاملے میں سے غیب کی خبروں میں سے جو ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ یعنی ہم اس وحی کے ذریعے آپ کو سکھاتے ہیں۔ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ یعنی بھائی یوسف کے ساتھ آپ ان کے پاس نہیں تھے اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنے پر وہ متفق ہوئے وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ یعنی کنویں میں پھینکنے کے سلسلہ میں وہ یوسف کے ساتھ مکر کر رہے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود قمیص لاکر آپ کے ساتھ مکر کر رہے تھے یعنی وہ احوال آپ نے مشاہدہ نہیں کیے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مطلع کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ آپ کا خیال یہ تھا کہ جب عربوں نے اس قصہ کے متعلق پوچھا ہے اور آپ نے ان کو اس کے متعلق بتایا ہے تو وہ ایمان لے آئیں گے مگر وہ ایمان نہ لائے، تو یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لیے نازل ہوئی یعنی جس کو آپ ہدایت دینا چاہیں اس کو آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ حَرَصَ یَحْرِصُ باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے اور ضعیف لغت میں حَرِصَ یَحْرَصُ بھی ہے یعنی باب سَمِعَ یَسْمَعُ اور حرص اختیار کے ساتھ کسی چیز کا مطالبہ کرنے کو کہتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ، مِنْ صلہ ہے یعنی ما تسالهم جعلاً۔ اِنْ هُوَ یعنی ما هو، هُوَ سے مراد قرآن اور وحی ہے اِلَّا ذِكْرٌ یعنی نصیحت اور تذکرہ لِّلْعٰلَمِیْنَ سب جہانوں کے لیے۔

وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ۛ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

"اور کتنی ہی (بے شمار) نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (کے ہر گوشے) میں (سجی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح وشام) گزرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کیے ہوتے ہیں اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر اللہ کے ساتھ مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔ کیا وہ بے غم ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آئے ان پر چھا جانے والا اللہ تعالیٰ کا عذاب یا آجائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔ آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف، واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں، اور ہر عیب سے پاک ہے اللہ تعالیٰ اور نہیں ہوں میں مشرکوں سے"۔

قولہ تعالیٰ۔ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ خلیل اور سیبویہ نے کہا: یہ أی ہے اس پر کاف تشبیہ کا داخل ہوا تو این بن گیا، یہاں یہ کم کے معنی میں ہے سورۂ آل عمران میں اس کے حوالے سے گفتگو گزر چکی ہے اور السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے حوالے سے سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیات گزشتہ امتوں کی سزاؤں کے آثار ہیں، یعنی وہ غافل تھے اور ان میں غور و فکر سے اعراض کرتے تھے۔ عکرمہ اور عمرو بن فائد نے وَ الْاَرْضِ کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں یہ متبدا ہوگا اور اس کی خبر یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا ہوگی۔ سدی نے فعل کو مضمر مانتے ہوئے وَ الْاَرْضَ پڑھا ہے۔ ان دونوں قرأتوں کے مطابق وقف السَّمٰوٰتِ پر ہوگا۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یَمُرُّوْنَ کے بجائے یمشون علیها پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا اور سب اشیاء کا خالق ہے جبکہ وہ بوجا بتوں کی کرتے ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری، مجاہد، عامر، شعبی اور اکثر مفسرین کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے(1) وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو پیدا کرنے والا کون ہے تو ضرور کہیں گے: اللہ۔ پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا کلمات کہتے ہیں اور اس کے شریک بناتے ہیں۔ حضرت حسن سے یہ بھی مروی ہے یہ اہل کتاب ہیں ان کے پاس شرک و ایمان دونوں ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لاتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفیر کرتے ہیں تو ان کے ایمان صحیح نہیں۔ ابن الانباری نے یہ روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت مشرکین عرب کے تلبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان کا تلبیہ یہ تھا۔ لبیك لا شریك لك إلّا شریكا هو لك تملكه و ما ملك ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ تیرا شریک ہے جس کو تو نے اپنا شریک بنایا ہے تو اس کا مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی تو مالک ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ مشبهه ہیں اجمالی طور پر ایمان لاتے ہیں اور تفصیلی طور پر شرک کرتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، معنی یہ ہوگا وَ مَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ یعنی زبان سے ایمان لاتے ہیں مگر دل سے وہ کافر ہیں۔ یہ ماوردی نے حضرت حسن سے روایت کی ہے۔ عطا نے کہا: یہ دعا سے متعلق ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کفار خوشحالی میں اپنے رب کو بھول جاتے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو بڑے خلوص سے دعا مانگتے اس کی تفصیل ان آیات میں ہے وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ الآیہ (یونس: 22) اور انہوں نے گمان کیا کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ الایہ (یونس: 12) اور جب انسان کو کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کو دور کرنے کے لیے ہم سے دعا مانگتا ہے۔ اور ایک اور آیت میں ہے وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ۝ (فصلت) اور جب اسے کوئی برائی لاحق ہو تو وہ لمبی چوڑی دعا والا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہلاکت کی نجات کے لیے دعا مانگتے ہیں اور جب اللہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو کوئی کہتا ہے: اگر فلاں نہ ہوتا تو ہم نجات نہ پاتے، اگر فلاں نہ ہوتا تو چور ہمارے پاس آ جاتے اور اس طرح کے کلمات کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمت کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 94

فلاں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جوان کو چور سے بچایا ہوتا ہے اس کو کتے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس قسم کی باتیں تو اکثر عام مسلمانوں سے بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت واقعہ دُخان کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ قحط کے سالوں میں اہل مکہ کو دھویں نے ڈھانپ لیا تو انھوں نے کہا: رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝ (الدخان) اے ہمارے پروردگار! ہم سے عذاب کو دور فرما ہم ایمان دار ہیں تو یہ ان کا ایمان تھا اور عذاب کے چھٹ جانے کے بعد ان کا شرک، کفر کی طرف لوٹ گیا اس کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ۝ (الدخان) تم لوٹ کر جانے والے ہو۔ لوٹ کر جانا ابتدا کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تو اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ کا معنی ہوگا: الا وھم عائدون۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ، غاشیة کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مُجللة کیا ہے یعنی ڈھانپا ہوا۔ مجاہد نے کہا(1): اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو ان کو ڈھانپ لیتا ہو، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (العنکبوت: 55) جس دن ان کو ڈھانپ لے گا عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ لڑائی ہے جو ان کے لیے بپا ہوگی۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد کڑک اور پھڑ پھڑانے والی ہے۔ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ یعنی قیامت بَغْتَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس کی اصل مصدر ہے۔ مبرد نے کہا: عربوں سے نکرہ کے بعد حال کے جملے آئے ہیں جیسا کہ ان کا یہ قول: وقع أمرھم بغتة و فجأة نحاس نے کہا: بَغْتَةً کا معنی مصیبت کا ایسی جگہ سے آنا ہے جہاں سے توقع نہ ہو۔ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ یہ تاکید ہے بَغْتَةً کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ چیخنے والی لوگوں پر چیخے گی اس حال میں کہ وہ اپنے بازاروں اور اپنے مقامات پر ہوں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝ (یٰسین) وہ ان کو پکڑے گی درآنحالیکہ کروہ جھگڑ رہے ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ مبتدا اور خبر ہیں یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے یہ میرا رستہ، سنت اور طریقہ ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ ربیع نے کہا: سَبِيْلِيْۤ سے مراد دعوتی ہے، یعنی میری دعوت، مقاتل نے کہا: اس سے مراد دینی یعنی مراد دین ہے۔ معنی سب کا ایک ہی ہے، یعنی وہ طریقہ جس پر میں ہوں اور جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں وہ جنت کی طرف لے جاتا ہے۔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ یعنی حق اور یقین پر، اسی سے فلان مستبصر بھذا ہے۔ اَنَا تاکید ہے وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ مضمر پر عطف ہے۔ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرما دیجیے وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ میں ان مشرکین سے نہیں ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مدمقابل بناتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 94

لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم (نے رسول بنا) کر نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے، کیا یہ (منکر) لوگ سیر وسیاحت نہیں کرتے زمین میں تاکہ وہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان (منکرین) کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے، اور دار آخرت یقیناً بہتر ہے ان کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (اے سننے والو!) کیا تم نہیں سمجھتے جب (نصیحت کرتے کرتے) مایوس ہو گئے رسول اور وہ منکرین گمان کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے اس وقت آ گئی ان کے پاس ہماری مدد۔ پس بچا لیا گیا (عذاب سے) جس کو ہم نے چاہا اور نہیں ٹالا جا سکتا ہمارا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی یہ ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے تھے: لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ (انعام: 8) کیوں نہ اترا اس پر فرشتہ، یعنی ہم نے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے، جن میں نہ کوئی عورت ہے نہ جن اور نہ کوئی فرشتہ، یہ اس روایت کی بھی تردید ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عورتوں میں چار نبی ہیں، حوا، آسیہ، ام موسیٰ اور مریم''۔ اس کے متعلق کچھ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی سے مراد مدائن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحراؤں اور دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں سے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا کیونکہ دیہاتیوں میں جفا اور سختی کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ شہروں میں رہنے والے زیادہ عقلمند، حلیم، افضل اور زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اہل بادیہ سے کبھی بھی نبی مبعوث نہیں فرمایا اسی طرح نہ جنوں اور عورتوں میں سے کسی کو نبی بنا کر بھیجا۔ حضرت قتادہ نے کہا: مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی، سے مراد من اهل الأمصار ہے کیونکہ وہ زیادہ حلم اور علم والے ہوتے ہیں۔ علماء نے کہا: رسول کی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ مرد ہو، آدمی ہو اور شہری ہو، آدمی کی شرط علماء نے صرف ان کے اس قول سے بچنے کے لیے لگائی ہے کہ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) وہ جنوں میں سے مردوں کی پناہ مانگتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کیا یہ لوگ زمین میں سیر وسیاحت نہیں کرتے تاکہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے انجام کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ یہ متبدا اور خبر ہے۔ فراء کا خیال ہے کہ دار ہے ہی آخرت البتہ کسی چیز کو خود اس کی طرف لفظی اختلاف کی وجہ سے مضاف کر دیا جاتا ہے، جیسے یوم الخمیس، بارحۃ الاولی وغیرہ۔ شاعر نے کہا۔

ولو أقوَتْ عليكَ ديارُ عَبْسٍ   عَرَفْتَ الذُّلَّ عِرْفَانَ اليَقِينِ (1)

عرفان بھی یقین ہی ہوتا ہے مگر عرفان اور یقین دو مختلف لفظ تھے اس لیے شاعر نے عرفان الیقین کہہ دیا ہے۔ مراد عرفانا یقینا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 98

کسائی نے صلاۃ الاولی کے قول سے استدلال کیا ہے۔ اخفش نے مسجد الجامع سے استدلال کیا جبکہ نحاس نے کہا: اضافة الشیٔ الی نفسه محال ہے، کیونکہ کسی چیز کی اضافت دوسری چیز کی طرف اس لیے کی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعے اس کی معرفت حاصل ہو جائے سو عمدہ بات یہ ہے کہ الصلاۃ الاولی کہا جائے اور جس آدمی نے صلاۃ الاولی کہا اس کا مطلب عند صلاۃ الفریضة الاولی ہوگا۔ اس کو اولی اس وجہ سے کہا گیا کہ نماز کی فرضیت کے بعد سب سے پہلے یہی نماز ادا کی گئی اسی طرح سب سے پہلے جو سب سے زیادہ ظاہر ہوئی وہ بھی یہی ہے اسی وجہ سے اس کو ظہر بھی کہا جاتا ہے۔

تقدیر عبارت ہوگی، ولدار الحال الآخر ۃ خیر یہ بصریوں کا قول ہے اور اس دار سے مراد جنت ہے اور خیر سے مراد هی خیر للمتقین ہے۔ اس کو وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةِ بھی پڑھا گیا ہے۔ نافع، عاصم اور یعقوب وغیرہ نے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے خبر کے طور پر یعقلون پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ اس کی قرات اور معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا اس آیت کریمہ میں انبیاء کی ایسے امور سے تنزیہ اور عصمت بیان کی گئی ہے جو ان کے شایان شان نہیں۔ یہ باب بہت بڑا ہے اور اس کا خطرہ بہت زیادہ ہے اس پر توقف کرنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان بھٹک جائے اور جہنم کا حقدار بن بیٹھے۔ معنی یہ ہوگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا پھر ہم نے ان کی امتوں کو کوئی سزا نہیں دی حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ یہاں تک کہ رسول مایوس ہو گئے، یعنی اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا یعنی انہیں یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے انبیاء نے گمان کیا کہ قوم کے جو لوگ ان پر ایمان لائے ہیں وہ ان کی تکذیب کریں گے نہ کہ قوم نے تکذیب کی بلکہ انبیاء نے گمان کیا کہ وہ ان کی تکذیب کریں گے (کہ رسولوں نے کافروں پر جس عذاب کا وعدہ کیا تھا وہ عذاب اب تک نہیں آیا) یعنی انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ ان کے پیروکاروں کے دلوں میں شک داخل ہو جائے گا، تو اس طرح وظنوا کی اس سورت میں یہ تاویل ہوگی۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی، حضرت ابو جعفر بن قعقاع، حضرت حسن، حضرت قتادہ، ابو رجاء عطاری، عاصم، حمزہ، کسائی، یحییٰ بن وثاب، اعمش اور خلف نے كُذِبُوْا کو مخفف پڑھا ہے یعنی قوم نے یہ گمان کیا کہ ان کے رسولوں نے انہیں جو عذاب کی خبر دی تھی اس میں انہوں نے ان سے جھوٹ بولا ہے اور سچ نہیں بولا۔ ایک قول یہ ہے معنی یہ ہوگا ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے جو ان سے اللہ کی مدد کا وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا نکلا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی (نعوذ باللہ) یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ رسول ایسا گمان نہیں کر سکتا۔ اور جو ایسا گمان کرے وہ مدد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی؟ ابو نصر قشیری نے کہا: اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ بشر کے دل میں یہ بات کھٹکی ہو البتہ ان کے دلوں میں وہ محقق اور ثابت نہ ہوئی ہو، حدیث میں ہے: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ایسی باتوں سے درگزر فرمایا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، جب تک زبان نے وہ بات کہی نہ ہو یا اس

پر عمل نہ کیا گیا ہو" (1)۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ یہ کہا گیا ہو: وہ اس گمان کے قریب پہنچ گئے تھے جس طرح کہ آدمی کا قول: بلغت المنزل یعنی میں منزل کے قریب پہنچ گیا۔ ثعلبی اور نحاس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ بشر تھے اور لمبی آزمائش سے کمزور پڑ گئے اور بھول گئے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرہ: 214) حتیٰ کہ رسول اور ایمان لانے والوں نے کہا: اللہ کی مدد کب آئے گی؟ حکیم ترمذی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ رسول اللہ تعالیٰ کی مدد کے وعدے کے بعد خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کا خوف زدہ ہونا اللہ تعالیٰ کے وعدے میں کمزوری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ان کے دلوں کی کمزوری کی وجہ سے تھا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہوگئی ہو جس نے اس شرط اور وعدوں کو توڑ دیا ہو جو ان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ تو جب مدت طویل ہوگئی تو اس بنا پر ناامیدی اور گمانات در آئے۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، کہ بشری تقاضوں کے مطابق انبیاء نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی ہوگئی ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ: 260) سے آپ نے استشہاد کیا۔ (بہر حال) پہلی قرأت زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ مجاہد اور حمید نے قَدْ كَذَبُوْا کاف کے فتحہ اور ذال مخفف کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہوگا کہ قوم نے جب عذاب کی تاخیر میں اللہ کے فضل کو دیکھا تو رسولوں کی قوم نے گمان کیا کہ رسولوں نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو: جب رسولوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے کفر اختیار کر کے اللہ پر جھوٹ بولا ہے تو رسول ہماری مدد کو لے آئے۔ بخاری میں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ کے متعلق سوال کیا۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا: یہ كُذِبُوْا ہے یا کذبوا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: كُذِّبُوْا۔ میں نے کہا: ان کو یقین تھا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی ہے تو پھر گمان کیسا؟ آپ نے فرمایا: مجھے قسم انہیں یقین نہیں تھا۔ میں نے آپ کو کہا: وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! رسول اپنے رب کے بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا: تو اس آیت کا کیا مطلب ہوگا؟ آپ نے فرمایا: یہ رسولوں کے پیروکار تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی تھی وہ اللہ کی مدد آنے سے مایوس ہو گئے اور رسولوں نے یہ گمان کر لیا کہ اب ان کے پیروکار ان کی تکذیب کریں گے تو اس وقت ہماری مدد آ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَآءَهُمْ نَصْرُنَا کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی مدد رسولوں کے پاس آ گئی یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی قوم پر اللہ کا عذاب آ گیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ایک قول یہ ہے کہ انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں (کو نجات ملی) عاصم سے فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ایک نون اور یا مفتوح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مَنْ فعل مجہول کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ ابو عبید نے اس قرات کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر مصاحف میں ہے۔ ابن محیصن نے فنجا فعل ماضی پڑھا ہے۔ اور مَنْ فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، جبکہ باقیوں کی قرات کے مطابق مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَلَا يُرَدُّ

1۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 155

بَاْسُنَا یعنی عذابنا ہمارا عذاب نہیں ٹالا جاسکتا۔

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ یعنی کافرین ومشرکین سے۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''بلاشبہ پہلی قوموں (کے عروج وزوال) کی داستانوں میں (درس) عبرت ہے سمجھداروں کے لیے، نہیں ہے یہ قران ایسی بات جو (یونہی) گھڑلی گئی ہو بلکہ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو ان سے پہلے نازل ہوئیں ہیں اور یہ قران ہر چیز کی تفصیل ہے اور سراپا ہدایت ورحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ یعنی حضرت یوسف، آپ کے باپ اور بھائیوں کے قصہ میں یا قوموں کے قصوں میں۔ عِبْرَةٌ یعنی فکر، تذکرہ اور نصیحت۔ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی بہت زیادہ عقلمندوں کے لیے۔ محمد بن اسحاق نے عن زہری عن محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو چھتر سال زندہ رہے۔ اور آپ کے بھائی عیصو آپ کے ساتھ ایک دن میں فوت ہوئے اور دونوں ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ اس وجہ سے اللہ کا ارشاد: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ سورت کے آخر تک ہے۔ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی یعنی یہ قران ایسی بات نہیں جو گھڑی گئی ہو یا یہ قصہ ایسی بات نہیں جو گھڑا گیا ہو۔ وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ یعنی جو اس سے پہلے ہیں تورات، انجیل اور اللہ تعالیٰ کی ساری کتب میں سے۔ یہ تاویل اس آدمی کی نزدیک ہوگی جس کا خیال ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے، وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ ایسی چیزیں جن کی بندوں کو ضرورت ہوتی ہے حلال وحرام اور شرائع واحکام وغیرہ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ اور سراپا ہدایت ورحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

سورۂ رعد

آیاتہا ۴۳ ۱۳ سورۃ الرعد مدنیۃ ۹۶ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے قول کے مطابق یہ مکی ہے جبکہ کلبی اور مقاتل کے نزدیک مدنی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ کا ارشاد ہے: سوائے دو آیتوں کے جو مکے میں نازل ہوئیں باقی ساری سورت مدنی ہے اور وہ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ سے لے کر آخر تک دو آیتیں ہیں۔

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"الف۔ لام۔ میم۔ را۔ یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی) کی اور جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے، وہ حق ہے لیکن اکثر لوگ (اپنی کج فہمی کے باعث) ایمان نہیں لاتے"۔

قولہ تعالیٰ: الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یعنی یہ قرآن جو آپ پر اتارا گیا ہے مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ تیرے رب کی جانب سے حق ہے نہ کہ جس طرح مشرک کہتے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے اسے پیش کرتے ہیں، سواسے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرو۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت تب نازل ہوئی جب مشرکین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں۔ وَالَّذِيْٓ، اٰيٰتُ پر عطف کی وجہ سے محل رفع میں ہے یا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور الْحَقُّ اس کی خبر ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محل جر میں ہو اور تقدیر عبارت یوں ہو: وآیاتُ الذی اُنزلَ الیکَ اور الْحَقُّ کا رفع مبتدا کے مضمر ہونے کی بنیاد پر ہوگا، تقدیر عبارت: ذالك الحقُّ ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ الحقَّ یعنی ذالك الحقُّ فراء نے کہا: اور اگر آپ چاہیں تو وَالَّذِيْٓ کو الْكِتٰبِ کی صفت بنا کر مجرور پڑھ لیں، اگرچہ اس میں واو بھی ہے جس طرح کہا جاتا ہے: آتانا هذ الكتاب عن ابی حفص والفاروق۔ اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وابنِ الْهُمَامِ ؛ ولَيْثِ الْكَتِيبَةِ فِي الْمُزْدَحَمِ (1)

اس سے مراد ہے إلى الملك القرم بن الهمام، ليث الكتيبه ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 111

الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝

"اللہ وہ (قدرت وحکمت والا ہے) جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے (جیسے) تم انھیں دیکھ رہے ہو پھر وہ متمکن ہوا عرش پر اور پابند حکم بنا دیا سورج اور چاند کو، ہر ایک رواں ہے مقررہ میعاد تک، اللہ تعالیٰ تدبیر فرماتا ہے ہر کام کی کھول کر بیان کرتا ہے (اپنی) نشانیوں کو شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کر لو"۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ قرآن حق ہے، تو یہ بھی بیان فرمایا کہ اس کو نازل کرنے والا کمال پر قدرت رکھتا ہے، اس کی کاریگریوں کو دیکھو تا کہ اس کی قدرت کے کمال کو پہچان سکو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا کے ارشاد کے متعلق دو قول ہیں: ایک یہ کہ بغیر ستونوں کے بلند ہیں جیسے تم دیکھ رہے ہو، یہ حضرت قتادہ، ایاس بن معاویہ اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے ستون ہیں لیکن ہم وہ دکھاتے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آسمان کے ستون قاف پہاڑ پر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر یہ بات کی جائے کہ ستون اس کی وہ قدرت ہے جس کے ذریعے وہ آسمان اور زمین کو روکتا ہے۔ اور وہ قدرت ہمیں نظر نہیں آتی، زجاج نے اس بات کو ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ جب کافر کے کفر سے آسمان پھٹنے کے قریب ہو گیا تو مومن کی توحید آسمان بن گئی، اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے عمد، عمود کی جمع ہے۔ نابغہ نے کہا ہے:

وخَيِّسِ الجِنَّ إِنِّي قد أَذِنْتُ لَهُمْ　　يَبْنُونَ تَدْمُرَ بالصُّفَّاحِ والعَمَدِ(1)

اس میں العمد عمود کی جمع ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ یعنی ان دونوں کو اپنی مخلوق کے منافع اور اپنے بندوں کے مصالح کے لیے مسخر فرمایا اور ہر مخلوق اپنے خالق کی تابعدار ہے۔ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی معلوم وقت تک اور وہ دنیا کی فنا کا ہے اور اس وقت کے قیام کا ہے جس وقت سورج کو لپیٹ دیا جائے گا، چاند کو گرہن لگ جائے گا، ستارے محو ہو جائیں گے اور کواکب اڑ جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لِاَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد ان دونوں کے وہ درجات اور منازل ہیں جہاں ان کی انتہا ہوئی ہے اور ان مقامات سے آگے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ایک قول کے مطابق لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کا معنی یہ ہے کہ چاند مہینے میں اپنے فلک کو طے کرتا ہے اور سورج سال میں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف فرماتا ہے يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ یعنی ان کو بیان فرماتا ہے مراد یہ ہے کو جو ان امور پر قدرت رکھتا ہے وہ ان کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہو گا، اسی وجہ سے فرمایا: لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کر لو۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 112

وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③

''اور وہی ہے جس نے پھیلا دیا زمین کو اور بنا دیئے اُس میں پہاڑ اور دریا اور ہر قسم کے پھلوں میں سے دو دو جوڑے بنا دیئے وہ ڈھانپ دیتا ہے رات سے دن کو، بے شک ان تمام چیزوں میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ جب آسمان کی نشانیوں کو بیان فرما دیا تو اب زمین کی نشانیوں کو بیان فرمایا یعنی زمین کو طول و عرض میں پھیلا دیا۔

وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ یعنی ایسے پہاڑ جو بہت زیادہ ثابت ہیں، اِس کا واحد راسیۃ ہے کیونکہ زمین اِن کے ذریعے ثابت رہتی ہے اور الإرساء کا معنی الثبوت ہے۔ عنترہ نے کہا ہے:

فَصَبَرْتُ عَارِفَةً لذالك حُرَّةً ترسُو اِذا نَفسُ الجَبانِ تَطَلَّعُ

جمیل نے کہا:

أُحِبُّهَا والذی أرسَی قواعِدَهُ حُبًّا إذَا ظَهَرَت آيَاتُهُ بَطَنَا

ان دونوں اشعار میں ترسو اور أرسَى کا یہی معنی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا نے کہا: زمین پر قائم ہونے والا پہلا پہاڑ اُبوقُبیس ہے۔

مسئلہ۔ ان آیات میں ان لوگوں کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ زمین ایک کرہ ہے، اسی طرح ان کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ زمین کے دروازے اِس پر جھکتے ہیں۔ ابن راوندی کا خیال ہے کہ زمین کے نیچے بہت زیادہ بلند ہونے والے اجسام ہیں جس طرح کہ اوپر اُٹھنے والی ہوا ہوتی ہے۔ اور یہ ڈھلوان ہے تو قوت اور مدار میں نیچے آنے والی زمین اوپر اُٹھنے والے اجسام معتدل ہو جاتے ہیں تو اس طرح اِن دونوں میں موافقت پیدا ہو جاتی ہے، جبکہ دیگر لوگوں کا گمان یہ ہے کہ زمین دو جسموں سے مرکب ہے ایک نیچے آنے والا ہے اور دوسرا اُوپر اُٹھنے والا، دونوں میں اعتدال آیا تو اِس وجہ سے زمین ٹھہر گئی، جبکہ مسلمان اور اہل کتاب کا عقیدہ زمین کے وقوف، اس کے ساکن ہونے اور اس کے پھیلنے کا ہے اور اس کی حرکت عام طور پر زلزلہ کے ذریعے ہوتی ہے جو (بعض اوقات) اس میں بپا ہوتا ہے۔ وَ اَنْهٰرًا یعنی زمین پر جاری پانی، اس میں مخلوق کا فائدہ اور منافع ہے۔ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ۔ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ، بمعنی صنفين ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الزوج جو واحد ہے اور ہوتے دو ہیں۔ فراء نے کہا: الزوجين سے یہاں مراد مذکر اور مؤنث ہے لیکن یہ نص کے خلاف ہے۔ ایک قول ہے: زَوْجَيْنِ کا معنی نوعین ہے جس طرح کہ میٹھا اور کڑوا، خشک اور تر، سفید اور سیاہ، چھوٹا اور بڑا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ یعنی دلالت اور علامات لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ

صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۙ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

''اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں اور باغات ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں کچھ ایک تنے سے پھوٹی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے، سیراب کیا جاتا ہے ایک ہی پانی سے (اس کے باوجود) ہم فضیلت دیتے ہیں بعض (درختوں) کو بعض پر ذائقہ اور بو میں، بے شک ان میں (اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقلمند ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کلام میں فرق ہے: معنی ہوگا: وفی الأرض قطع متجاورات وغیر متجاورت جس طرح فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) جبکہ مطلب ہے سرابیل تقیکم الحر و تقیکم البرد پھر وغیر متجاورات کو سامع کے علم کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ المتجاورات سے مراد شہر اور وہ علاقے ہیں جو آباد ہوں اور غیر متجاورات سے مراد صحراء اور غیر آباد علاقے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مُّتَجٰوِرٰتٌ سے مراد قریب قریب کے شہر ہیں، ان کی مٹی ایک ہے، ان کا پانی ایک ہے، ان میں کھیتیاں اور باغات ہیں لیکن پھلوں اور کھجوروں میں واضح فرق ہے۔ بعض پھل میٹھے ہوتے ہیں جبکہ بعض ترش؛ بعض درخت کی ایک ٹہنی کا پھل چھوٹا، بڑا ہونے میں رنگ وذائقہ میں مختلف ہو جاتا ہے اور ان تمام پر سورج و چاند کا پھیلاؤ ایک ہی نظم ونسق کے مطابق ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی بے نیازی پر بہت بڑی دلیل ہے اور ایسے آدمی کے لیے بڑی نصیحت ہے جو اس کی معرفت سے گمراہی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ کے ذریعے اس بات پر آگاہ فرمایا کہ یہ سب کچھ اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور وہ ذات اپنی قدرت پر عمل فرمانے والی ہے۔ یہ طبیعت کے قول کے بطلان کی بہت بڑی دلیل ہے؛ کیونکہ اگر یہ سب کچھ پانی اور مٹی کے ذریعے ہوتا اور اس کا فاعل طبیعت ہوتو پھر اختلاف وقوع پذیر نہ ہوتا۔ ایک قول یہ ہے کہ استدلال کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ٹکڑوں کے درمیان فرق کو ثابت فرمایا۔ مٹی کے ایک ٹکڑے سے میٹھی چیز پیدا ہو رہی ہے اور دوسرے سے تُرش حالانکہ وہ بالکل ایک دوسرے کے قریب ہے۔

یہ بھی اس کی قدرت کے کمال کی دلیلیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ظالموں اور منکروں کی کہی ہوئی باتوں سے بلند تر ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ کفار لعنۃ اللہ علیہم کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر حادث چیز خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اس کا کوئی صانع اور بنانے والا نہیں ہوتا اس پر درختوں سے پیدا ہونے والے پھلوں کو بطور استشہاد انہوں نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے ان کے پیدا ہونے کا اقرار جبکہ پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا، اسی طرح اعراض کا انہوں نے انکار کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا: پھل بغیر صانع کے پیدا ہوتا ہے، اور اعراض کا فاعل ہوتا ہے، اور حادث کے لیے کسی محدث کے ضروری ہونے پر دلیل یہ ہے کہ وہ ایک وقت میں اسے پیدا کرتا ہے اور جو چیز اس کی ہم جنس ہے اسے دوسرے وقت میں پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ

اختصاص کی وجہ سے اس کے وقت میں اس کا حدوث ہوتا تو ضروری تھا کہ ہر وہ چیز جو اس کی ہم جنس ہے وہ اس کے وقت میں ہی پیدا ہوتی۔ جب اس کے وقت کے ساتھ اس کا اختصاص باطل ہے تو اس کے ساتھ اس کا اختصاص صحیح ہوگا اس مخصص کی وجہ سے جس نے اس کے ساتھ خاص کیا ہے، اگر اس کی تخصیص اس کے ساتھ نہ ہو تو اس کا حدوث اس کے وقت میں، اس کے وقت سے پہلے یا بعد اس کے حدوث سے اولی نہ ہو۔ اور اس کی تفصیل علم کلام میں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ حضرت حسن نے وَّ جَنّٰتٌ تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی: وجعل فیھا جنات یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ (فصلت: 10) پر محمول ہے۔ اور کل پر محمول کرتے ہوئے اس کا مجرور ہونا بھی صحیح ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: ومن کل الثمرات ومن جنات باقی قراء نے جَنّٰتٌ پڑھا ہے تقدیر عبارت ہوگی: وبینھما جنات، وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ وابن کثیر، ابو عمرو اور حفص نے جنات پر عطف کرتے ہوئے ان کو مرفوع پڑھا ہے یعنی وفی الارضِ ذرعٌ ونخیلٌ اور باقی قراء نے اَعْنَابٍ پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ تو کھیتی اور کھجور باغوں میں سے ہی ہوں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وَّ جَنّٰتٌ کی طرح کل پر ان کا عطف کیا جائے۔ مجاہد اور سلمی وغیرہ نے صُنوان صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں یہ دونوں "صنو" کی جمع ہیں اور یہ کھجور کے بہت سے درخت ہیں یا دو درخت ہیں۔ ان کی ایک ہی اصل ہوتی ہے اس سے کئی سرے نکلتے ہیں تو وہ کھجور کئی درخت بن جاتے ہیں۔ اس کی مثال قِنوان ہے جس کا واحد قِنو ہے۔ ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ صَنوان سے مراد جھنڈ ہے (1) اور غیر الصنوان سے مراد متفرق درخت ہیں۔ نحاس نے کہا: لغت میں یہ اس طرح ہے کہ جب اس میں کوئی اور کھجور کا درخت ہو یا زیادہ درخت ہوں تو صنوان کہا جاتا ہے اور الصِّنو سے مراد مثل ہے اسی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: عَمُّ الرجلِ صِنوُابیه ہے یعنی آدمی کا چچا اس کے باپ کی مثل ہے۔

اس میں تثنیہ اور جمع کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

العلمُ والحلمُ خُلّتاً کَرَمٍ للمرءِ زَینٌ إذاھُمَا اجْتَمَعاَ

صِنْوانِ لایُستَتَمُّ حُسْنُھُمَا اِلاَّ بجمعٍ ذا وذاکَ مَعاً

شعر میں صنوان تثنیہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ جس طرح کہ بنی آدم کے نیک اور خبیث سب کا باپ ایک ہے۔ یہ نحاس اور بخاری کا قول ہے۔ عاصم اور ابن عامر نے یُسقیٰ، یاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اس سب کچھ کو سیراب کیا جاتا ہے، جبکہ باقیوں نے جَنّٰتٌ کی وجہ سے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم اور ابو عبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ ابو عمرو نے کہا ہے کہ تانیث بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ فرمایا ہے بعضہ نہیں فرمایا۔ حمزہ اور کسائی نے یُدبرالامر یُفصِلُ اور یُغشِی کا قیاس کرتے ہوئے یُفَصِّلُ پڑھا ہے اور باقیوں نے نُفَضِّلُ نون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 119

نحنُ نفصّلُ حضرت جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت محمد ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''لوگ مختلف درختوں سے ہیں، میں اور آپ ایک درخت سے ہیں''۔ پھر حضرت محمد ﷺ نے وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کی یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ تک تلاوت فرمائی۔ اور الْاُكُلِ سے مراد پھل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد میٹھا، ترش، فارسی اور ردی کھجور ہے(1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ کے بارے میں فرمایا: الفارسی والدقل والحلو والحامض (2) اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: اس آیت سے مراد ضرب المثل ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے ضرب المثل بیان فرمائی ہے کہ ان کی اصل ایک ہے جبکہ یہ بھلائی، برائی، ایمان اور کفر میں اس طرح مختلف ہیں جس طرح ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

الناسُ کالنبتِ والنبتُ ألوان منها شجرالصّندلِ والکافورِ والبان

ومنها شجرینضحُ طول الدّهرِ قطران

اس شعر میں اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ یعنی ایسے آدمی کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنے والا دل رکھتا ہے۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ۬ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اے سننے والے! اگر تو (ان کے تعصب پر) حیران ہوتا ہے تو حیرت انگیز ان کا یہ قول بھی ہے کہ کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کیا جائے گا، یہی (منکرین قیامت) وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا اور انہیں (بدنصیبوں) کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس (آگ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ یعنی اے محمد ﷺ! اگر آپ ان کے اس رویے پر حیران ہیں (3) کہ آپ کو صادق و امین تسلیم کرنے کے بعد انہوں نے آپ کی تکذیب کی تو ان کا بعث بعد الموت کی تکذیب کرنا اس سے زیادہ حیران کن ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حیران نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے حیران ہونا چاہیے، کیونکہ تعجب تو اسباب مخفیہ کی وجہ سے نفس کی تبدیلی کو کہتے ہیں (اور اللہ تعالیٰ تو اس سے منزہ و مبرا ہے)، یہاں صرف اس لیے ذکر فرمایا ہے تاکہ اس سے اللہ کا نبی اور مومنین حیران ہوں۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے: اے محمد ﷺ! اگر آپ اس بات سے حیران ہیں کہ یہ مجھے آسمانوں، زمین

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 124
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 140
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 95

اور ایک زمین سے مختلف پھلوں کا خالق مانتے ہیں اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں تو ان کی یہ گفتگو حیران کن ہے جس سے ساری مخلوق حیران ہے کیونکہ اعادہ اور بعث بعد الموت ابتدا ہی کی طرح ہے۔ ایک قول کے مطابق: آیت صانع کے منکرین کے بارے میں ہے، یعنی اگر آپ اتنے واضح دلائل کے باوجود ان کے صانع کے انکار سے حیران ہیں کیونکہ متغیر کے لیے کسی تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہوتا ہے تو یہ بات (واقعتا) محل تعجب ہے۔ اور نظم آیت پہلے اور دوسرے دونوں معنوں پر دلالت کرتی ہے، ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ یعنی جب ہم مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا؟

اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ اس کو اِنَّا بھی پڑھا گیا ہے۔ والاَغلال، غُلٌّ کی جمع ہے اس سے مراد ایسا طوق ہے جس کے ساتھ ہاتھ سے گردن تک باندھ دیا جاتا ہے یعنی قیامت کے دن باندھ دیئے جائیں گے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ۔۔۔۔۔۔ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ ﴿﴾ (غافر) تک ہے۔ ایک قول کے مطابق اغلال سے مراد ان کے وہ برے اعمال ہیں جو انہیں لازم ہیں۔

وَ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۶﴾ وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾

''اور یہ تیزی سے مطالبہ کرتے ہیں آپ سے برائی (عذاب) کا نیکی (بخشش) سے پہلے اور (ان نادانوں کو یاد نہیں کہ) گزر چکے ہیں ان سے پہلے نزول عذاب کے کئی واقعات اور (اے محبوب) بلاشبہ آپ کا رب بہت بخشنے والا (بھی) ہے لوگوں کے لیے ان کے ظلم (زیادتی) کے باوجود اور بے شک آپ کا رب سخت عذاب دینے والا (بھی) ہے اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی ان کی طرف کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے آپ تو (کجروی کے انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے آپ ہادی ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ یعنی اپنے انکار اور تکذیب کی زیادتی کی وجہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کا یہ قول ہے: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: 32) یا اللہ! اگر تیری طرف سے یہی حق ہے تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ حضرت قتادہ نے کہا: انہوں نے معافی سے پہلے سزا کا مطالبہ کیا ہے (1)، جبکہ پروردگار عالم نے اس امت سے سزا کو قیامت تک مؤخر کرنے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: قَبْلَ الْحَسَنَةِ سے مراد قبل الایمان ہے جس کی وجہ سے امان اور نیکیوں کی امید ہوتی ہے۔ الْمَثُلٰتُ سے مراد عقوبات ہیں (2)، اس کا واحد مَثُلَة ہے۔ اعمش سے روایت ہے کہ اس نے الْمُثْلَات میم کے ضمہ اور ثا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مُثْلَة کی جمع ہے اور الْمَثُلات بھی صحیح ہے یعنی ضمہ کے ثقیل ہونے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ رعد، جلد 13، صفحہ 127 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 95-94

کی وجہ سے ضمہ کو فتحہ سے تبدیل کر دیا جائے۔ ایک قول یہ ہے: حا کے عوض فتحہ کو لایا جاتا ہے۔ اعمش سے یہ بھی روایت ہے کہ اس نے المَثْلاتُ میم کے فتحہ اور ثا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو یہ مَثْلَة کی جمع ہے پھر ضمہ کے ثقل کے باعث ضمہ کو حذف کر دیا گیا۔ نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ بیان کیا ہے۔ جماعت کی قرأت کے مطابق اس کا واحد مَثُلَة ہے جیسے صَدُقَة اور بنو تمیم ثا اور میم دونوں کو ضمہ دیتے ہیں، ان کی لغت کے مطابق اس کا واحد مُثْلَة یعنی میم کے ضمہ اور ثا کی جزم کے ساتھ ہے؛ جیسے غُرْفَة اور غُرُفات۔ اور اس سے فعل مَثَلْتُ، أَمْثُلُ، مثلاً میم کے فتحہ اور ثا کے سکون کے ساتھ آتا ہے۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ یعنی مشرکین (1) کے ایمان لانے کی صورت میں ان سے درگزر کرنے والا اور گناہگاروں کی توجہ کی صورت میں انہیں معاف فرمانے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیت وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ سے امید رکھتا ہوں۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ جب وہ کفر پر اصرار کرتے ہیں تو تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے عن سعید بن مسیب بیان کیا ہے کہ آپ نے کہا: جب وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اللہ کی معافی، رحمت اور درگزر کا سلسلہ نہ ہوتا تو کسی کی زندگی پرسکون نہ ہوتی اور اگر اس کی سزا، وعید اور عذاب نہ ہوتا تو ہر ایک توکل کر لیتا'' (2)۔ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ یعنی ھلا، اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ جب انہوں نے آیات کی خواہش کی اور ان کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ، منذر کا معنی معلم ہے۔ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ یعنی ایسا نبی جو ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے (3)۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ہے الھادی اللہ (4)۔ یعنی آپ پر انذار لازم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے تو اللہ ہر قوم کا ہادی ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝

''اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوتی ہے کوئی مادہ اور (جانتا ہے) جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ چیز کو اور ہر ظاہر چیز کو سب سے بڑا عالی مرتبہ ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى یعنی بچہ، بچی، عمدہ، قبیح، نیک اور نافرمان میں سے اور سورۃ انعام میں گزر چکا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علم غیب میں منفرد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور ہم نے وہاں امام بخاری کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بھی ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غیب کی چابیاں پانچ ہیں'' (5)۔ الحدیث اور اس

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 235 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 514 3۔ مصنف عبد الرزاق، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 229
4۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 235 5۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 681

میں یہ بھی ہے کہ ''جو رحم کم کرتے ہیں اسے سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا'' (1)۔

وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: یعنی یہ ہے کہ جو نو ماہ سے پہلے بچہ گرا دیتی ہیں اور جو نو ماہ سے زیادہ عرصے میں جنتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: جب عورت حالت حمل میں حائضہ ہو جاتی ہے (2) تو یہ اس کے بچے کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اگر حیض چھ دن سے زیادہ ہو جائے تو جو نقصان ہو چکا ہوتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ مجاہد سے ہی روایت ہے: الغیض سے مراد ہے'' خون میں سے جو رحم کم کر دیتے ہیں'' اور زیادتی سے مراد جوان سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق: کمی اور زیادتی دونوں بچے کی طرف راجع ہوتی ہیں جس طرح مثلاً ایک انگلی یا کسی اور عضو کا کم ہو جانا یا انگلی یا کسی عضو کا زیادہ ہو جانا۔ ایک قول یہ بھی ہے: الغیض سے مراد حیض کے خون کا ختم ہونا ہے اور وَ مَا تَزْدَادُ سے مراد وضع حمل کے بعد نفاس کا خون ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاملہ کو حیض آ سکتا ہے یہ امام مالک اور ایک قول کے مطابق امام شافعی کا بھی قول ہے۔ عطا، شعبی اور دیگر کا قول ہے کہ اسے حیض نہیں آ سکتا۔ یہی امام (اعظم) ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے آپ کی دلیل یہی آیت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تاویل کے بارے میں فرمایا: یہ حمل کا حیض ہوتا ہے، عکرمہ اور مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے اور یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے اور جب حاملہ عورتوں کو حیض آ جاتا تو آپ ان کو ترک نماز کا فتویٰ دیتی تھیں، اور اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کثرت سے موجود تھے کسی نے بھی آپ کی اس بات کا انکار نہیں کیا تو گویا اس پر سب کا اجماع ہو گیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابن قصار نے کہا ہے: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو آدمیوں کا بچے کے بارے میں تنازعہ ہو گیا، تو وہ کیس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے یہ کیس قیافہ شناسوں کے سامنے پیش کر دیا۔ قیافہ شناسوں نے وہ بچہ ان کے ساتھ ملایا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دودھ کی زیادتی کے سبب اس کا فیصلہ فرمایا اور قریشی عورتوں سے آپ نے پوچھا آپ نے فرمایا: دیکھو اس بچے کی کیا صورت حال ہے؟ انہوں نے کہا: پہلے شوہر نے اس کے ساتھ خلوت کی اور اسے فارغ کر دیا تو حالت حمل میں اسے حیض آ گیا اس نے یہ سوچا کہ شاید اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ تو دوسرے مرد نے اس کے ساتھ دخول کیا بچہ دوسرے کے پانی کے ذریعے پروان چڑھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ اکبر! اور بچے کو پہلے مرد کے حوالے کر دیا اور یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ حاملہ کو حیض نہیں آتا اور نہ صحابہ میں سے کسی نے کہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر اجماع ہے۔ واللہ اعلم۔ مخالف کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ حاملہ کو حیض آ سکتا ہے اور حاملہ عورت جو خون دیکھے گی وہ حیض ہو گا تو پھر حیض کے ذریعے استبرا صحیح نہیں ہو گا حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ حیض کے ذریعے استبرا ہو جاتا ہے۔ امام مالک سے امام محمد کی کتاب میں ایک روایت ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ حیض نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاملہ بعض اوقات نو ماہ سے کم یا زیادہ مدت میں بھی وضع حمل کرتی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ عبد الملک بن مروان چھ ماہ کی مدت میں پیدا ہوا تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 681 2۔ مصنف عبد الرزاق، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 230

مسئلہ نمبر 4۔ یہ چھ ماہ چاند کے اعتبار سے ہوں گے جس طرح کہ سارے شرعی مہینے۔

اسی وجہ سے امام مالک کے بعض اصحاب سے مذہب کے بارے میں روایت ہے، میرا (قرطبی) خیال ہے ابن حارث کی کتاب میں ہے کہ اگر وہ چھ ماہ سے تین دن کم ہوا تو بچہ مہینوں کی کمی یا زیادتی کی علت کے سبب کسی کے ساتھ ملحق ہوگا اس کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ حمل کی اکثر مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن جریج نے جمیلہ بنت سعد سے عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: حمل تکلہ کے سائے کے پھرنے کی مقدار بھی دو سال سے زیادہ نہیں ہوگا، اس کو دار قطنی نے ذکر کیا ہے جمیلہ بنت سعد، عبید بن سعد کی بہن نے لیث بن سعد سے بیان کیا (1): اس کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سال ہوگی۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے چار سال مروی ہے۔ امام مالک سے ایک روایت کے مطابق اور یہی مشہور ہے پانچ سال کی مدت منقول ہے۔ آپ سے ایک روایت مالانہایۃ کی بھی ہے اگرچہ وہ مدت دس سال سے بھی زائد کیوں نہ ہو جائے۔ آپ سے یہ تیسری روایت ہے۔ زہری سے چھ اور سات سال مروی ہیں۔ ابو عمر نے کہا: صحابہ کرام میں سے کسی نے اس کی مدت سات سال کہی ہے۔ امام شافعی سے کئی مدتیں منقول ہیں۔ جن میں سے آخری چار سال ہے۔ کوفی (یعنی احناف) کہتے ہیں: دو سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ محمد بن عبدالحکیم کہتے ہیں: ایک سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ داؤد کہتے ہیں: نو ماہ ہے، ان کے نزدیک حمل اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ ابو عمر نے کہا: یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی سوائے اجتہاد کے اور عورتوں کے معروف معاملات کی طرف لوٹنے کے کوئی اصل نہیں وباللہ التوفیق۔ دار قطنی نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہا (2) کہ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''حمل تکلہ کے سائے کے پھرنے کی مقدار بھی دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا'' تو آپ نے کہا: سبحان اللہ! یہ کون کہتا ہے؟ یہ ہماری لونڈی ہے جو کہ محمد بن عجلان کی بیوی ہے، حاملہ ہوتی ہے اور چار سال میں حمل وضع کرتی ہے، بہت زیادہ سچی عورت ہے اور اس کا شوہر بھی بہت زیادہ سچا ہے۔ اس نے تین حمل بارہ سال کی مدت میں وضع کیے ہیں۔ اس کا ہر حمل چار سال کا ہوتا۔ مبارک بن مجاہد نے اس بات کو ذکر کیا ہے اور کہا: ہمارے ہاں مشہور تھا کہ محمد بن عجلان کی بیوی چار سال میں حمل وضع کرتی تھی اور اسے حاملۃ الفیل کہا جاتا تھا۔ اس نے ہی روایت کیا ہے کہ ایک دن حضرت مالک بن دینار بیٹھے تھے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا: اے ابو یحییٰ! چار سال سے حاملہ عورت کے لیے دعا مانگو وہ شدید تکلیف میں ہے، مالک سخت غصے ہوئے اور مصحف کو بند کیا پھر کہا: یہ قوم ہمیں انبیاء خیال کرتی ہے پھر پڑھا پھر دعا مانگی پھر کہا: اے اللہ! اگر اس عورت کے پیٹ میں ہوا ہے تو اسے ابھی خارج فرما اور اگر اس کے پیٹ میں بچی ہے تو اسے بچے میں تبدیل فرما، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے، تیرے پاس ''ام الکتاب'' ہے۔ حضرت مالک نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھائے، قاصد اس آدمی کے پاس آیا اور کہا: تیری بیوی کو کوئی مسئلہ ہے، وہ آدمی گیا۔ حضرت مالک نے ابھی

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 280		2۔ ایضاً، حدیث 282

اپنے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ مسجد کے دروازے سے وہ آدمی سامنے ہوا اس کی گردن پر ایک بچہ تھا جس کے بال سخت گھنگریالے تھے، (تقریباً) چارسال کا بچہ، اس کے دانت بالکل برابر تھے اور اس کی ناف کٹی ہوئی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا (1) اس نے کہا: اے امیر المومنین! میں دوسال اپنی عورت سے غائب رہا میں واپس آیا تو وہ حاملہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے رجم کے بارے میں لوگوں کے ساتھ مشاورت کی، تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المومنین! اگرچہ آپ کو اس عورت پر اختیار حاصل ہے لیکن اس کے پیٹ پر کوئی اختیار نہیں۔ اس کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ یہ وضع حمل کر لے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا، تو اس نے ایسا بچہ جنا جس کے سامنے والے دانت نکل چکے تھے، آدمی نے مشابہت کو پہچان لیا اور کہا: رب کعبہ کی قسم! یہ میرا بیٹا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورتیں معاذ جیسا انسان پیدا نہیں کر سکیں، اگر معاذ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔ ضحاک نے کہا: میری ماں نے مجھے جنا اس حال میں کہ دوسال اس نے مجھے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ اس نے مجھے جنا تو میرے دانت نکل چکے تھے۔ امام سے ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بھی دوسال تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہے، ایک قول کے مطابق تین سال رہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن عجلان تین سال تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہا، ان کی ماں فوت ہو گئی اور وہ بہت زیادہ الٹ پلٹ ہو رہے تھے، تو اس کا پیٹ چاک کیا گیا اور انہیں نکالا گیا تو ان کے دانت نکل چکے تھے۔ حماد بن سلمہ نے کہا ہے کہ ہرم بن حیان کو ہرم کہتے ہی اس لیے ہیں کہ یہ اپنی ماں کے پیٹ میں چار سال رہے۔ غزنوی نے ذکر کیا کہ ضحاک دوسال میں پیدا ہوا۔ اور اس کے دانت نکل چکے تھے تو اس کا نام ضحاک رکھ دیا گیا۔ عباد بن عوام نے کہا: ہماری ایک لونڈی نے چار سال میں بچہ جنا جس کے بال کندھوں تک پہنچ چکے تھے اس کے پاس سے پرندہ گزرا تو اس نے کہا: "کش"۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن خویز منداد نے کہا: حیض اور نفاس کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت اور حمل کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت بطریق اجتہاد ماخوذ ہے، کیونکہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا ان میں سے کسی چیز پر اتنا ہی حکم لگانا درست ہو گا جتنا ہمارے سامنے ظاہر ہوا ہو یا جتنا عورتوں میں عادتاً پایا جاتا ہو یا نادر طور پر جتنا پایا گیا ہو۔ جب ہم نے کسی عورت کے حمل کو چار یا پانچ سال دیکھ لیا تو ہم نے اس کا حکم لگا دیا، اور جب حیض اور نفاس کے سلسلہ میں ہم نے کوئی مستقل صورت نہ دیکھی تو ہم نے دیکھا کہ عورتوں میں شاذ و نادر پائی جانے والی مدت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن عربی نے (2) کہا: بعض تساہل پسند مالکیوں سے منقول ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت نو ماہ ہے۔ اور یہ قول سوائے ہلاکت میں پڑنے والے کے کسی نے کبھی بھی نہیں کیا، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ رحم میں تدبیر کرنے والے سات سیارے ہیں وہ ایک ایک ڈیوٹی کرتے ہیں۔ چوتھا مہینہ سورج کا ہوتا ہے، اسی وجہ سے بچہ حرکت کرتا ہے اور اضطراب میں ہوتا ہے۔ جب سات ماہ میں سات سیاروں کے درمیان چکر مکمل ہو جاتا ہے تو آٹھویں ماہ میں وہ کام زحل کے سپرد ہوتا ہے تو وہ اپنی ٹھنڈک کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے، کاش میں ان کے ساتھ مناظرہ کرنے یا جنگ کرنے پر

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 323، حدیث 281 2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 1109

قادر ہوتا، کتنا عجیب ہے چکر تمام ہونے کے بعد وہ زحل پر ہی آسکتا ہے کسی اور کے پاس نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی خبر دی ہے یا تم اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشی کرتے ہو؟ اور جب یہ ممکن ہے کہ ان میں سے دو کے پاس تدبیر دوبارہ لوٹ سکتی ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ وہ تدبیر تین یا چار کے پاس دوبارہ آجائے یا تمام کے پاس دو، تین مرتبہ لوٹ آئے؟ امور باطنہ پر یہ کیسا باطل گمانات کے ساتھ فیصلہ ہے؟

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ یعنی نقصان اور زیادتی میں سے بِمِقْدَارٍ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ماں کے پیٹ سے بچے کے نکلنے کی مقدار اور نکلنے تک اس کے پیٹ میں اس کے ٹھہرنے کی مقدار ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس سے مراد رزق اور زندگی کی مقدار ہے (1)۔ مقدار سے مراد قدر ہے۔ اور آیت کا عموم ان سب کو شامل ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم

میں (قرطبی) نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مدح بیان کرتی ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، یعنی وہ اس چیز کو بھی جانتا ہے جو مخلوق سے غائب ہے اور اس کو بھی جانتا ہے جس کا مخلوق نے مشاہدہ کر رکھا ہے۔ غیب بمعنی غائب مصدر ہے اور شہادۃ بمعنی شاہد مصدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم غیب میں منفرد ہونے اور مخلوق پر مخفی چیزوں کا باطن کے ذریعے احاطہ کرنے پر آگاہ فرمایا ہے، اس معاملے میں کسی کی شرکت جائز نہیں، جہاں تک اہل طب کا تعلق ہے جو نشانیوں اور علامات کے ذریعے استدلال کرتے ہیں تو اگر وہ اس کے بارے میں قطعی بات کرتے ہیں تو یہ کفر ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ یہ تجربہ ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ عادت و تجربہ تو ناکام بھی ہو سکتا ہے جبکہ علم میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ الکبیر یعنی وہ ذات کہ ہر چیز اس سے کم درجے میں ہے المتعال اس سے بلند ہے جو مشرکین کہتے ہیں۔ ہر چیز سے اپنی قدرت اور قہر کے ذریعے بلند و برتر ہے۔ ان دونوں صفات کا ذکر ہم (قرطبی) نے ''شرح الاسماء'' میں مکمل طور پر کر دیا ہے۔ والحمد للہ

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾

''(اس کے علم میں) سب یکساں ہیں تم میں سے وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور جو بلند آواز سے بات کرتا ہے اور وہ بھی جو چھپا رہتا ہے رات کے وقت اور جو چلتا پھرتا رہتا ہے دن کے وقت''۔

قولہ تعالیٰ: سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ۔ اَسَرَّ الْقَوْلَ سے مراد وہ بات ہے (2) جو بندہ اپنی ذات کے ساتھ کرے اور جَهَرَ سے مراد وہ بات ہے جو بندہ کسی اور کے ساتھ کرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خیر و شر میں جو بندہ پوشیدہ طور پر کرے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس طرح کہ وہ اسے جانتا ہے جو ظاہری طور پر ہو۔ مِّنْكُمْ کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ سَوَآءٌ کی صفت ہو اور تقدیر کلام یوں ہو: سر من اسرّ و جهر من جهر سواء منکم اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سَوَآءٌ کے متعلق ہو کلام یوں ہو: یستوی منکم جس طرح کہ آپ کا قول: مررت بزید اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقدیر

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 97　　2۔ ایضاً

عبارت یہ ہو: سِرٌّ من أسَرَّ منكم و جهرٌ مَنْ جهَرَ منكم تقدیر عبارت یہ بھی ہو سکتی ہے: ذو سواء منکم من أسرّ القول و من جهر به جس طرح کہا جاتا ہے: عدل زید و عمرو یعنی ذو اعدل۔ ایک قول یہ ہے کہ سَوَآءٌ بمعنی مستوٍ ہے اس صورت میں مضاف کے حذف کی تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ یعنی پوشیدہ و ظاہر، راستوں میں ظاہر اور تاریکیوں میں چھپا ہوا اللہ کے علم میں برابر ہیں۔ اُخفش اور قطرب نے کہا: رات میں چھپا ہوا ظاہر ہے۔ اسی سے خَفَيْتُ الشئی و أخفيته ہے یعنی أظهرته اور أخفيتُ الشئی یعنی استخرجته۔ اسی سے کفن چور کو مختفی کہا جاتا ہے۔ امرؤالقیس نے کہا:

خَفَاهُنَّ مِنْ أَنْفَاقِهِنَّ كَأَنَّمَا　　خَفَا هُنَّ وَدْقٌ من عَشِيٍّ مُجلِّبِ

السارب کا معنی التواری یعنی سرنگوں میں چھپنے والا ہے۔

السارب المتواری سے مراد داخل سربا ہے اسی سے عربوں کا قول انسرب الوحشیّ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اپنی کچھار میں داخل ہو جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مُسْتَخْفٍ بمعنی پوشیدہ اور سَارِبٌ بمعنی ظاہر ہے۔ مجاہد نے کہا: مُسْتَخْفٍ یعنی وہ گناہوں کے ساتھ چھپتا ہے اور سَارِبٌ بمعنی ظاہر ہے۔ ایک قول کے مطابق سَارِبٌ کا معنی ذاهب ہے۔ کسائی نے کہا: سرب یسرب سربا و سروبا کہا جاتا ہے جب کوئی چلا جائے۔ شاعر نے کہا:

وكلُّ أناسٍ قَارَبوا قَيْدَ فَحْلِهِمْ　　ونَحْنُ خَلَعْنَا قَيْدَه فهو ساربٌ(1)

سَارِبٌ سے مراد ذاهب ہے۔ ابو رجاء نے کہا: السارب سے مراد زمین میں اپنے اعتبار پر چلنے پھرنے والا آدمی ہے۔ شاعر نے کہا:

أَنَّى سَرَبْتِ و كنتِ غيرَ سَرُوبِ(2)

قتبی نے کہا: سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ یعنی اپنی ضروریات کے سلسلہ میں تیزی سے گھومنے پھرنے والا۔ یہ عربوں کے قول انسرب الماء سے مشتق ہے۔ اصمعی نے کہا: خَلِّ سربه یعنی اس کا راستہ خالی کردو۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

"انسان کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے، اور جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اسے اور نہ ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے"۔

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 237　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 98

قولہ تعالیٰ: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ یعنی اللہ تعالیٰ کے ایسے فرشتے ہیں جو رات، دن انسان کا تعاقب کرتے رہتے ہیں، جب رات کے فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں تو دن کے فرشتے ان کے پیچھے آجاتے ہیں(1)۔ اللہ تعالیٰ نے مُعَقِّبٰتٌ فرمایا ہے۔ فرشتے مذکر ہیں کیونکہ معقبات، معقبہ کی جمع ہے اور کہا جاتا ہے: ملكٌ مُعَقِّبٌ اور ملائكةٌ مُعَقِّبَةٌ، پھر معقباتٌ جمع الجمع ہے۔ بعض لوگوں نے لَهٗ مَعَاقِبُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ پڑھا ہے۔ معاقیب، معقب کی جمع ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکۃ کے لیے معقبةٌ کا لفظ ملائکۃ کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں کی طرف سے تعاقب کی کثرت کی وجہ سے مُعقبۃ مؤنث ہے جیسے نسابة، علامۃ اور راویۃ وغیرہ۔ یہ جوہری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور تعقب شروع کرنے کے بعد لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ (النمل: 10) یعنی لم یرجع۔ اور حدیث میں ہے: مُعَقِّبَاتٌ لَا يَخِيبُ مَائِلُهُنَّ۔ أو۔ فاعلهنّ(2) پھر آپ نے تسبیح، تحمید اور تکبیر کا ذکر فرمایا ہے۔ ابو الہیثم نے کہا: ان کو معقباتٌ اس لیے کہا گیا کہ یہ بار بار لوٹتے رہتے ہیں، ایسے آدمی کا فعل کہ جو ایک کام کرے پھر دوبارہ وہی کام کرے تو اس وقت کہا جائے گا: فقد عَقَّبت اور اونٹنیوں میں سے معقّبات وہ ہوتی ہیں جو حوض پر وارد ہونے والے اونٹوں کے پچھلے حصے کے پاس کھڑی ہوتی ہیں اور جب ایک اونٹنی اس جگہ سے نکلتی ہے تو دوسری اس کی جگہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ یعنی رات کے وقت چھپنے والے(3) اور دن کے وقت چلنے پھرنے والے کے آگے۔ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ حفظ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور مہربانی وحشیوں، درندوں اور نقصان دہ چیزوں سے ان کی حفاظت کے لیے فرشتوں کی ڈیوٹی لگائی گئی ہو، اور جب تقدیر (غالب) آجائے تو وہ فرشتے بندے اور اس نقصان دہ چیز کے درمیان سے ہٹ جاتے ہوں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ابو مجلز نے کہا: مراد قبیلے کا ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا: بچ کے رہیے مراد قبیلے کے کچھ لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں بشرطیکہ تقدیر نہ آئی ہو، اور جب تقدیر آجائے تو وہ بندے اور اللہ کی تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں، بے شک موت بذات خود بہترین قلعہ ہے۔ اسی بنیاد پر يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے امر اور اس کے اذن سے من بمعنی با ہے اور حروف صفات ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے رہتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے من بمعنی عن ہو یعنی یحفظونه عن أمر الله، یہ پہلے معنی کے قریب تر ہے۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے: جس طرح كسوته عن عُرْيٍ ومن عُرْيٍ دونوں طرح مستعمل ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ہے یعنی عَنْ جوعٍ ایک قول ہے: وہ عذاب کے فرشتوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو سزا دینا روا نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی نعمت وعافیت کو تبدیل نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ خود کفر پر اصرار کے ذریعے تبدیل نہ کر دیں، جب وہ کفر پر ڈٹتے ہیں تو ان کی سزا کی مدت قریب آجاتی ہے، ان پر مصیبت نازل

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 98
2۔ تاریخ بغداد، جلد 6، صفحہ 112، العربیۃ، بغداد
3۔ تفسیر زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 341

ہوتی ہے اور حفاظت کرنے والے فرشتے ان سے ہٹ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے: وہ جنات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ حضرت کعب نے کہا(1): اگر اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے فرشتوں کے سپرد نہ کرتا جو تمہارے کھانے، پینے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں تو جن اور عذاب کے فرشتے تمہیں اللہ کے امر سے ضرور چھین لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ فرما کے خاص فرمایا کیونکہ وہ دیکھ نہیں رہے ہوتے جس طرح اللہ نے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء:85) فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے یعنی یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کا تم مشاہدہ کرتے ہو۔ فراء نے کہا کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے(2)، تقدیر عبارت یہ ہے: له معقبات من أمر الله من بين يديه و من خلفه يحفظونه، یہ مجاہد، ابن جریج اور نخعی سے مروی ہے۔ اور اگر يحفظونه من ملائكة العذاب و الجن من أمر الله ہو تو پھر کوئی تقدیم و تاخیر نہیں۔ ابن جریج نے کہا: وہ فرشتے بندے کے عمل کو محفوظ کرتے ہیں۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ اس کے اقوال و افعال کو لکھتے ہیں۔ جب مُعَقِّبٰتٌ فرشتے ہوں تو لَهٗ کی ھا ضمیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستخفی کے لیے ہو۔ ایک قول کے مطابق: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ (الرعد:7) سے چلا ہے یعنی تم میں سے سب اس بات میں یکساں ہیں وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور وہ بھی جو بلند آواز سے بات کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ نقصان نہیں دے سکتا بلکہ اللہ کے ایسے فرشتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تمام انبیاء کی طرف راجع ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۝ ارشاد فرمایا ہے، یعنی يحفظون الهادي من بين يديه و من خلفه اور چوتھا قول یہ ہے کہ آیت سے مراد وہ سلاطین و امراء ہیں جن کی قوم ان کے آگے اور پیچھے سے ان کی حفاظت کرتی ہے اور جب اللہ کا امر آ جاتا ہے تو اللہ سے وہ انہیں ذرہ بھر بھی نہیں بچا سکتے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت علی کا قول ہے۔ اور اسی طرح ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ مشرک بادشاہ ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے امر سے بچاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس تاویل کی صورت میں کلام میں نفی محذوف ہے یعنی لا يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: مُعَقِّبٰتٌ کو محافظ بنانے کی صورت میں معنی ہوگا: يحفظونه من أمر الله على ظنه و زعمه، ایک قول یہ ہے: یکساں ہے جو آہستہ بات کرتا ہے اور بلند آواز سے بات کرتا ہے تو اس کے محافظ اور مددگار ہیں جو اس کا تعاقب کرتے ہیں اور اسے گناہ و نافرمانی پر ابھارتے ہیں، اور اس میں نصیحت کے مؤثر ہونے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ قشیری نے کہا: یہ پروردگار عالم کو مہلت دینے سے نہیں روکتی یہاں تک کہ وہ عذاب کو ثابت کر دے۔ تو اس صورت میں اس نافرمان نے بذات خود گناہ پر اصرار کو لمبا کر کے اس حکم کو تبدیل کر دیا تو یہی چیز سزا کا سبب بن جائے گی تو گویا وہ ایسا آدمی ہے جس نے بذات خود سزا کو حلال کر لیا ہے، تو اللہ کا ارشاد: يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ سے مراد يحفظونه من انتقال أمر الله ہوگا۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: مُعَقِّبٰتٌ سے مراد وہ ہیں جو اللہ کے امر اور اس کی قضا سے اس کے بندوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: جس آدمی نے یہ بات کی ہے تو اس کے مطابق يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ

1۔ تفسیر زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 239	2۔ ایضاً

اللہ کے ارشاد کی تاویل کی دوصورتیں ہوں گی۔

نمبر 1:۔ وہ اس کی تب تک موت سے حفاظت کریں گے جب تک موت نہیں آتی۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

نمبر 2:۔ وہ اس کی جنوں اور موذی درندوں سے حفاظت کریں گے جب تک تقدیر غالب نہیں آتی (1)، یہ ابوامامہ اور کعب الاحبار کا قول ہے اور جب تقدیر آجائے گی تو وہ راستہ خالی چھوڑ دیں گے اور صحیح بات یہ ہے کہ **معقبات** سے مراد فرشتے ہیں۔ یہی حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور ابن جریج نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور نحاس نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''رات اور دن کے فرشتے تمہارا تعاقب کرتے ہیں'' (2)۔ الحدیث اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ ائمہ نے عمرو عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ آپ نے اس کی تلاوت یوں کی ہے: **معقبات من بین یدیه و رقباء من خلفه (من أمر الله) یحفظونه** تو اس نے معنی کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ کنانہ عدوی نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے بندے کے بارے میں بتائیے کہ اس کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ایک فرشتہ آپ کے دائیں طرف ہوتا ہے جو نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا بائیں جانب جو برائیاں لکھتا ہے اور جو دائیں جانب والا ہے وہ بائیں جانب والے پر امیر ہوتا ہے جب آپ نیک عمل کرتے ہیں تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب آپ برا عمل کرتے ہیں تو بائیں جانب والا، دائیں جانب والے کو کہتا ہے کیا میں لکھوں؟ وہ کہتا ہے نہیں شاید یہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے اور توبہ کر لے۔ جب وہ تین دفعہ کہتا ہے تو یہ کہتا ہے: ہاں لکھ، ہمیں اللہ تعالیٰ اس سے بچائے پس کتنا برا ساتھی ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی نگرانی کو کم خیال کرتا ہے اور اپنے حیاء کے حوالے سے تھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ** (ق) وہ کوئی بات نہیں کرتا مگر اس کے پاس ایک سخت تاڑنے والا ہوتا ہے اور دو فرشتے آپ کے سامنے اور پیچھے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ** (اور ایک فرشتہ آپ کی پیشانی پر قابض ہوتا ہے جب آپ اللہ کے لیے جھکتے ہیں تو وہ آپ کو اٹھا دیتا ہے اور جب تو اللہ تعالیٰ کو مجبور کرتا ہے تو وہ تجھے ہلاک کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے ہونٹوں پر ہوتے ہیں اور وہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر پیش کیا گیا درود محفوظ کرتے ہیں اور ایک فرشتہ تیرے منہ پر کھڑا ہوتا ہے وہ تیرے منہ میں سانپ کو داخل نہیں ہونے دیتا اور دو فرشتے تیری آنکھوں پر ہوتے ہیں تو یہ دس فرشتے ہیں جو ہر آدمی پر مسلط ہوتے ہیں رات کے فرشتے، دن کے فرشتوں سے بدلتے رہتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے، دن کے فرشتے نہیں ہوتے تو یہ کل بیس فرشتے ہر آدمی پر مسلط ہوئے اور ہر آدمی کے ساتھ ابلیس دن کے وقت ہوتا ہے جبکہ اس کا بیٹا رات کے وقت، اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: **مُعَقِّبٰتٌ**، چار فرشتے ہیں (3) جو فجر کی نماز کے وقت جمع ہوتے ہیں اور طبری کا مختار یہ ہے کہ **معقبات** سے مراد امراء کے سامنے اور پیچھے والی بھیڑ ہے اور **لَهٗ** کی ھاضمیر ان کے لیے ہے۔ علماء نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 99

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل صلوٰۃ العصر، جلد 1، صفحہ 79

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 98

اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات کو دو طرح بنایا ہے ایک وہ جن کے وقوع پذیر ہونے کا اس نے فیصلہ فرما دیا ہے ان کو نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہی ان کو کوئی تبدیل کر سکتا ہے، جبکہ دوسرے احکامات وہ ہیں جن کے آنے کا اس نے فیصلہ فرما دیا البتہ وقوع پذیر ہونے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ توبہ، دعا، صدقہ اور حفاظت کے ذریعے ان کے ٹل جانے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ کسی قوم کو تب تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ ان کی طرف سے تبدیلی وقوع پذیر نہ ہو یا تو یہ تبدیلی ان کی طرف سے ہو، یا ان کے دیکھنے والوں کی طرف سے یا کسی ایسے آدمی کی طرف سے ہو جو ان میں سے ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد کے دن تیر اندازوں کی بذات خود تبدیلی کے سبب انہیں شکست خوردہ لوگوں کے ساتھ بدل دیا، اس کے علاوہ بھی شریعت کی مثالیں موجود ہیں۔ آیت کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف گناہ کے سرزد ہونے کی صورت میں ہی عذاب نازل فرماتا ہے بلکہ بعض اوقات دوسرے لوگوں کے گناہوں کے سبب بھی مصائب نازل ہوتے ہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم نیک لوگوں کی موجودگی میں بھی ہلاک کر دیئے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا: "ہاں جب خبث (زنا) زیادہ ہو جائے گا" (1)۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا یعنی ہلاک کرنے اور عذاب نازل کرنے کا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ایک قول یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ بیماریوں وغیرہ میں سے کسی مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو اس مصیبت کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو برائی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو ان کی بصارت کو اندھا کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ ایسا کام اختیار کرتے ہیں جس میں مصیبت ہوتی ہے اور اسی کو عملی جامہ پہنا دیتے ہیں اور خود اپنے قدموں پر چل کر ہلاکت کی طرف جاتے ہیں یہاں تک کہ آدمی خود اپنے ہاتھ سے بربادی تلاش کرتا ہے اور اپنے قدم پر چل کر اپنے خون کو بہانے کی طرف جاتا ہے وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ یعنی کوئی پناہ گاہ۔ یہ سدی کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ ہے: وہ کوئی مددگار نہیں پاتا جو اسے اس عذاب سے بچا سکے۔ شاعر نے کہا:

مالی السماء سوی الرحمن من وال (2)

آسمان میں رحمٰن کے علاوہ کوئی مدد کرنے والا نہیں

وال اور والی ایسے ہیں ہے جیسے قادر اور قدیر۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

"وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی (کبھی) ڈرانے کے لیے اور (کبھی) وعید دلانے کے لیے اور اٹھاتا ہے (دوش

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، علامات النبوۃ فی الاسلام، جلد 1، صفحہ 508　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 100

ہوا پر) بھاری بادل اور رعد اس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے، اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ یعنی بارش کے ذریعے۔ السَّحَابَ جمع ہے اور واحد سَحَابَةٌ ہے، سُحُبٌ اور سَحَائِبُ بھی جمع آتی ہے۔ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ رعد، برق اور صواعق کے بارے میں سورۃ البقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے اس لیے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور آیت سے مقصود اپنی قدرت کے کمال کو بیان کرنا ہے۔ اور سزا میں تاخیر عاجزی کی وجہ سے نہیں، یعنی مسافر کو ڈرانے کے لیے آسمان میں تمہیں بجلی دکھاتا ہے، تو وہ بارش، دھول اور کڑکتی بجلی سے پہنچنے والے نقصان کی اذیت سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ (النساء: 102) اور مقیم کو اس بات کی امید دلانے کے لیے کہ اس کڑک کے بعد بارش اور شادابی ہوگی؛ یہ معنی حضرت قتادہ، مجاہد اور دیگر لوگوں نے بیان کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: بجلی کی کڑک سے ڈراتے ہوئے اور اس کی بارش جو قحط کو زائل کرنے والی ہوگی اس سے امید دلاتے ہوئے (1)۔ وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ مجاہد نے کہا: پانی کے ذریعے وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ جس نے کہا کہ کڑک بادل کی آواز ہے تو اس صورت میں ممکن ہے کہ کڑک پاکی بیان کرتا ہو، اس قول کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ یہی اگر رعد فرشتہ ہوتا تو پھر تو سب فرشتوں کے تحت داخل تھا۔ جس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ رعد فرشتہ ہے تو اس کے نزدیک مِنْ خِیْفَتِهٖ کا معنی مِنْ خیفة اللہ ہوگا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: فرشتے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں مگر وہ ابن آدم کی طرح نہیں ڈرتے بلکہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں پہچانتا کہ اس کے دائیں کون ہے اور بائیں کون ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہ انہیں کھانا روکتا ہے اور نہ پینا۔ آپ نے ہی فرمایا: رعد فرشتہ ہے جو بادلوں کو ہانکتا ہے اور پانی کے بخارات اس کے انگوٹھے کے پورے میں ہوتے ہیں وہ بادلوں کا موکل ہے ان میں اسی طرح تصرف کرتا ہے جس طرح اسے حکم ہوتا ہے اور وہ اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رعد تسبیح کرتا ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ تسبیح کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتا ہے، تو اس وقت بارش برستی ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ جب آپ رعد کی آواز سنتے تو کہتے: سبحان الذی سبحت له پاک ہے وہ ذات جس کی تو نے پاکی بیان کی ہے۔ امام مالک نے حضرت عامر بن عبداللہ عن ابیہ روایت کیا ہے کہ جب وہ رعد کی آواز سنتے تو کہتے: پاک ہے وہ ذات کہ رعد جس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں)۔ پھر کہتے کہ یہ اہل زمین کے لیے سخت وعید ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ ایک فرشتہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے، اس کے دائیں جانب ایک ہزار فرشتہ ہے اور بائیں جانب بھی اتنے ہی فرشتے ہیں، جب دائیں جانب والوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تسبیح کرتا ہے تو سارے اللہ کے خوف سے تسبیح کرتے ہیں اور جب بائیں جانب متوجہ ہو کر تسبیح کرتا ہے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 100

تو وہ سارے اللہ کے خوف سے تسبیح کرتے ہیں۔ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ ماوردی نے حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور مجاہد سے یہ بات ذکر کی ہے یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی (1) جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مجھے بتائیے آپ کا رب کس چیز سے بنا ہوا ہے کیا لؤلؤ سے یا یاقوت سے؟ تو بجلی کی کڑک آئی اور اس نے اسے جلا دیا۔ ایک قول یہ ہے، یہ عرب کے کسی کافر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت حسن نے کہا: عرب کے سرکشوں میں سے ایک آدمی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت اس کی طرف بھیجی تا کہ وہ اسے اللہ، اس کے رسول اور اسلام کی طرف دعوت دیں تو اس نے انہیں کہا: مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے بارے میں بتاؤ کہ کیا ہے اور کس چیز سے بنا ہوا ہے کیا چاندی سے یا لوہے سے یا نحاس سے؟ قوم نے اس کی بات کو بہت بڑا سمجھا، تو اس نے کہا: میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے رب کے بارے میں جواب دیتا ہوں جس کو وہ پہچانتا ہی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی طرف وفد بھیجا تو وہ ایسا ہی کہتا، تو وہ جماعت اس کے ساتھ جھگڑا کر رہی تھی اور اسے دعوت دے ہی رہی تھی کہ ایک بادل اٹھا اور ان کے سروں پر آ گیا، وہ کڑکا، چمکا اور اس نے بجلی پھینکی، تو اس بجلی نے کافر کو جلا دیا اور وہ بیٹھے رہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹ کے آئے تو بعض صحابہ کرام نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے کہا: تمہارا اصاحب (مخالف) جل گیا۔ وفد نے کہا: تمہیں کہاں سے پتہ چلا؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی کہ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ اس کو ثعلبی نے حضرت حسن سے ذکر کیا ہے اور قشیری نے حضرت انس سے روایت بالمعنی بیان کی ہے۔ وہ عنقریب آئے گی۔ ایک قول یہ ہے: یہ آیت لبید بن ربیع کے بھائی اربد بن ربیع اور عامر بن طفیل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عامر بن طفیل اور اربد بن ربیع دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے کے ارادے سے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی جماعت میں مسجد میں تشریف فرما تھے۔ دونوں مسجد میں داخل ہوئے، لوگوں نے عامر کے جمال کو دیکھنا چاہا وہ بھینگا تھا اور بڑا خوبصورت تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آرہا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو اگر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے ہدایت دے دے گا۔ وہ آگے بڑھا حتیٰ کہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہا: اے محمد! اگر میں اسلام قبول کر لوں تو میرے لیے کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا: "تیرے لیے وہی ہو گا جو مسلمانوں کے لیے ہے اور تیری ذمہ داری وہی ہو گی جو دوسرے مسلمانوں کی ہے۔" اس نے کہا: کیا اپنے بعد آپ مجھے خلیفہ بنائیں گے؟ آپ نے فرمایا: "یہ کام میرے سپرد نہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہ جس کو چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا"۔ اس نے کہا: کیا آپ مجھے مکان میں رکھیں گے اور خود خیمے میں رہیں گے، آپ نے فرمایا: "نہیں"۔ اس نے کہا: آپ مجھے کیا دیں گے؟ آپ نے فرمایا: "میں تجھے گھوڑوں کی مدد دوں گا جن کے ذریعے تو اللہ کے رستے میں جہاد کرے گا۔" اس نے کہا: کیا آج میرے پاس گھوڑے نہیں ہیں؟ میرے ساتھ اٹھو میں آپ کے ساتھ گفتگو کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ اٹھے اور عامر نے اربد کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب تو مجھے ان کے ساتھ گفتگو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 102-101

کرتے دیکھے گا تو ان کے پیچھے چکر لگانا اور تلوار کے ساتھ ان کو شہید کر دینا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا۔ اَربد تلوار لے کر ایک بالشت چلا پھر اللہ نے اسے روک لیا، اور وہ تلوار کو نہ سونت سکا اور تلوار پر ہی اس کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ اللہ نے آندھی اور چیخ و پکار والے دن اس پر بجلی کی کڑک ڈالی جس نے اسے جلا دیا اور عامر سرپٹ بھاگتا ہوا واپس لوٹا اور کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے اَربد کے لیے بددعا کی یہاں تک کہ اس نے اسے مار دیا، اللہ کی قسم! میں تم پر باریک بالوں والے گھوڑے اور بے ریش جوانوں کی بھر مار کر دوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اور قیلہ کے بیٹے (یعنی اوس وخزرج) کے نوجوان تجھے اس کام سے روکیں گے۔" عامر سلولیہ عورت کے گھر پہنچا اور صبح کے وقت کہتا جا رہا تھا: اللہ کی قسم! اگر محمد اور اس کا دوست یعنی ملک الموت مجھے صحراء میں مل گئے تو میں دونوں سے اپنا تیر گزار دوں گا، تو اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کے ساتھ اسے طمانچہ مارا اور اسے مٹی میں گرا دیا اور اس کے گھٹنے پر ایک بہت بڑا پھوڑا نکل آیا۔ وہ سلولیہ کے گھر واپس لوٹا اور کہتا جا رہا تھا: اونٹ کے پھوڑے کی طرح پھوڑا اور سلولیہ کے گھر میں موت، پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کی پیٹھ پر ہی مر گیا۔ لبید بن ربیع نے بھائی کا مرثیہ کہا ہے:

يا عينُ هلاَّ بَكَيتِ أَرْبَدَ إذْ قُمنا وقَامَ الخُصُومُ فی كَبَدِ

أَخْشَى على أَرْبَدَ الحُتُوفَ وَلَا أَرْهَبُ نَوْءَ السِّمَاكِ والأَسَدِ

فَجَّعنِي الرَّعدُ والصَّوَاعِقُ بالفا رِسِ يَوْمَ الكَرِيهَةِ النَّجِدِ (1)

اور اس کے متعلق اس نے یہ بھی کہا ہے:

إنَّ الرَّزِيَّةَ لَا رَزِيَّةَ مِثلُهَا فِقْدَانُ كُلِّ أَخٍ كَضَوْءِ الكَوْكَبِ

يا أَرْبَدَ الخَيرِ الكَرِيمَ جُدُودُهُ أَفْرَدتَنِي أَمشِي بِقَرنٍ أَعْضَبِ

مسئلہ۔ حضرت اَبان نے حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کو بجلی نہیں پکڑتی (2)۔" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کڑک کی آواز سنتے تو کہتے: سبحان من يسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته وهو على كل شئ قدير (جس نے یہ کلمات کہے) اسے اگر بجلی آلے تو اس کی دیت مجھ پر ہے۔ خطیب بغدادی نے سلیمان بن علی کی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس عن اَبیہ عن جدہ ذکر کی ہے آپ نے کہا: ہم ایک سفر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کہ ہمیں کڑک اور بادلوں کی ہوا نے آلیا، تو حضرت کعب نے ہمیں کہا: جس آدمی نے کڑک کی آواز سن کر سبحان من يسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته کے کلمات تین مرتبہ کہے تو اس کڑک میں موجود (نقصان) سے اسے معافی مل گئی، تو ہم نے ایسا ہی کیا تو ہم بچ گئے، پھر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ملا تو بادلوں کی ہوا آپ کے ناک کو لگی اور اثر انداز ہوگئی، میں نے کہا: اے امیر المومنین یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بادلوں کی ہوا میرے ناک کو لگی اور اثر انداز ہوگئی، تو میں نے کہا: کڑک کی آواز سن کر حضرت کعب نے ہمیں کہا تھا: جس نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 101 2۔ ایضاً

کڑک کی آواز سن کر سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ تین بار کہا تو اسے کڑک میں موجود (نقصان) سے نجات مل گئی، تو ہم نے یہ کلمات کہے تو ہمیں نجات مل گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے ہمیں کیوں نہ کہا تا کہ ہم بھی کہہ لیتے؟ اس کی تفصیل سورۂ ''بقرہ'' میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ یعنی یہودی کا جھگڑا جب اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہوا ہے؟ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس سے مراد اربد کا جھگڑا ہے (1) جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ حال ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عطف منقطع ہو۔ حضرت انس نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے ایک بڑے آدمی کے پاس وفد بھیجا تا کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے، تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مجھے اپنے معبود کے بارے میں بتاؤ! کیا وہ چاندی کا ہے، سونے کا ہے یا نحاس کا؟ تو اس وفد نے اس کو بڑی جسارت سمجھا۔ آپ کے پاس وفد واپس آیا اور اس نے آپ کو اس بات سے آگاہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے پاس واپس جاؤ اور اسے دعوت دو''۔ وفد واپس پہنچا تو بجلی کی کڑک اسے اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور وہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹا تو وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ کا ارشاد نازل ہوا۔ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ابن اعرابی نے کہا: الْمِحَالِ کا معنی مکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکر کا معنی حق کی تدبیر ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: اللہ کی طرف سے مکر ناپسندیدہ چیز کو ایسے طریقے سے اس کے مستحق کے سپرد کرنا ہے کہ جس سے احساس بھی نہ ہو۔ ابن یزیدی نے ابو زید سے روایت کیا کہ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ کا معنی ہے کہ وہ سخت بدلہ لینے والا ہے۔ ازہری نے کہا: الْمِحَالِ یعنی قوت اور شدت اور المحل سے مراد شدت ہے اس کی میم اصلی ہے، ماحلت فلانا محالا یعنی میں نے اسے پکڑا یہاں تک کہ واضح ہو گیا کہ کون سخت ہے۔ ابو عبید نے کہا: الْمِحَالِ یعنی سزا اور ناپسندیدہ بات۔ ابن عرفہ نے کہا: الْمِحَالِ سے مراد جلال اور جھگڑا ہے۔ مَاحَلَ عن أمرہ کہا جاتا ہے جس کا معنی ہی جَادَلَ اس نے جھگڑا کیا۔ قتیبی نے کہا: اس سے مراد سخت چال ہے، اس کی اصل حیلہ سے ہے، اس کی میم مکان کی میم کی طرح ہے جس کی اصل کون ہے۔ ازہری نے کہا: ابن قتیبہ نے اس کی میم کو زائدہ کہہ کر غلطی کی ہے بلکہ اس کی میم اصلی ہے، جب تو کسی لفظ کو فعال کے وزن پر دیکھے جس کا پہلا حرف مکسور ہو تو وہ اصلی ہوتا ہے، جیسے مِهاد، مِلاك اور مِراس وغیرہ۔ اور مِفعل جب ثلاثی ہو تو یہ واو کے اظہار کے ساتھ آتا ہے جیسے مِزود، مِحوَل اور مِحوَر وغیرہ۔ ازہری نے کہا: اعرج نے اسے وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرآت کے مطابق اس کی تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ حول سے مشتق ہے۔ یہ سارا ابو عبید ہروی نے ذکر کیا ہے سوائے اس کے جو پہلے ابن اعرابی کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ صحابہ و تابعین کی اس کے معنی کے متعلق تاویلات آٹھ ہیں۔

1:۔ شَدِيْدُ الْمِحَالِ کا معنی شدید العداوۃ یعنی دشمنی کی شدت ہے (2)، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

2:۔ اس کا معنی شدید الحول یعنی قوت و قدرت کی شدت والا ہے، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 102　2۔ ایضاً

3:۔ معنی شدید الاخذ یعنی پکڑ کی شدت والا ہے، یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

4:۔ شدید الحقد دلی دشمنی کی سختی والا، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

5:۔ شدید القوۃ قوت کی شدت والا، یہ مجاہد کا قول ہے۔

6:۔ شدید الغضب غضب کی سختی والا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔

7:۔ شدید الھلاك بالمحل یعنی قحط کے ذریعے ہلاکت کی شدت والا، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

8:۔ شدید الحیلۃ یعنی حیلہ کی شدت والا، یہ حضرت قتادہ کا قول ہے۔

ابوعبیدہ معمر نے کہا: اَلْمِحَالِ اور المماحلۃ سے مراد مماکرۃ اور مغالبہ ہے۔

اَعشیٰ نے شعر کہا ہے۔

فرع نَبْعٍ یھتَزُّ فی غُصْنِ المجد کثیر النَّدَی شدید المحال(1)

ایک اور شاعر نے کہا:

ولَبْسٍ بینَ أقوامٍ فکلٌّ أَعَدَّلہ الشَّغَازِبَ والمِحالا

عبد المطلب نے کہا:

لَاھُمَّ إنَّ المرئَ یَمْنَعُ رَحْلَہٗ فامْنَعْ حِلَالَكَ

لَا یَغْلِبَنَّ صَلِیبُھُمْ وَ مِحَالُھُمْ عَدْواً مِحَالَكَ

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

''اسی کو پکارنا سچ ہے اور وہ لوگ جو پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا وہ نہیں جواب دے سکتے انہیں کچھ بھی مگر اس شخص کی طرح جو پھیلائے ہوا پنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف تا کہ اس کے منہ تک پانی پہنچ جائے اور (یوں تو) پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہیں کافروں کی دعا بجز اس کے کہ وہ بھٹکی پھرتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ یعنی اللہ کو پکارنا سچ ہے۔ حضرت ابن عباس (2)، حضرت قتادہ اور دیگر لوگوں نے کہا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حضرت حسن نے کہا: بے شک اللہ ہی حق ہے، پس اس کی دعوت، دعوت حق ہے۔ ایک قول یہ ہے: دعا میں اخلاص حق کی پکار ہے، یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق: حق کی دعوت، خوف کے وقت اس سے دعا ہے، خوف میں صرف اسی سے دعا کی جاتی ہے، جس طرح کہ اللہ کا ارشاد ہے: ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ (الاسراء: 67) جس نے اس کے علاوہ کو پکارا وہ گمراہ ہوگیا۔ ماوردی نے کہا: یہ سیاق آیت کے مشابہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اس سے مراد بت (اصنام و اوثان) ہیں۔ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ یعنی ان کی دعا کو وہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 520 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 103

قبول نہیں کرتے اور نہ ان کی ندا کو سنتے ہیں۔ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ان کی دعاؤں کے جواب سے ان کی مایوسی کی پانی کے ساتھ ضرب المثل بیان کی ہے کیونکہ عرب لاحاصل کام کی سعی کرنے والے کی ضرب المثل ہاتھ کے ساتھ پانی پکڑنے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

فاصبحتُ مما کان بینی وبینھا من الودّ مثلَ القابضِ الماء بالیدِ (1)

میری اور اس (عورت) کے درمیان جو محبت تھی اس میں میں ہاتھ کے ساتھ پانی پکڑنے والے کی طرح ہو گیا۔

اس ضرب المثل کے معنی کی تین صورتیں ہیں (2):

1:۔ وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور معبود کو پکارتا ہے تو وہ اس پیاسے کی طرح ہے جو دور سے پانی کو اپنے منہ کی طرف بلاتا ہے اور زبان کے ذریعے اس پر قادر نہیں ہوتا، اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں آئے گا کیونکہ پانی جواب نہیں دیتا اور نہ ہی پانی اس تک پہنچ پاتا ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔

2:۔ وہ اس پیاسے کی طرح ہے جو اپنے خیال میں پانی کو دیکھتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیتا ہے تا کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خیال جھوٹا اور اس کے وہم میں فساد ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

3:۔ وہ ایسے آدمی کی طرح ہے جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلی کو پھیلاتا ہے تا کہ اس کو پکڑ لے مگر اس کی ہتھیلی میں پانی میں سے کچھ بھی نہیں ٹھہرتا۔ فراء کا خیال ہے کہ "الماء" سے یہاں مراد کنواں ہے، کیونکہ یہ پانی کا معدن ہوتا ہے اور ضرب المثل یہ ہے کہ یہ آدمی اس آدمی کی طرح ہے جو بغیر رسی و ڈول کے اپنے ہاتھ کو کنویں کی طرف پھیلاتا ہے۔ بطور استشہاد یہ شعر ہے:

فإنّ الماءَ ماءُ أبي وجدّي وبئري ذُو حَفَرْتُ و ذُو طَوَيْتُ

اس شعر میں ماء سے مراد کنواں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آدمی اس پیاسے کی طرح ہے جو کنویں کے کنارے پر ہوتا ہے، وہ کنویں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی پانی اس تک بلند ہوتا ہے۔ اور اِلَّا كَبَاسِطِ کا معنی ہے اِلَّا کاستجابة باسط کفیہ ہے۔ مصدر باسط کی طرف مضاف ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور مصدر مضاف کا فاعل ہی معنی میں مراد ہے اور وہ ہے "الماء" معنی یہ ہوگا: اِلا کاجابة باسط کفیه الی الماء اور لِيَبْلُغَ فَاهُ میں لام باسط کے متعلق ہوگی اور اللہ کا ارشاد: وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ پانی سے کنایۃ ہے، یعنی وما الماء ببالغ فاه اور پانی اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ هُوَ منہ سے کنایۃ ہو یعنی ما الفم ببالغ الی الماء منہ پانی تک پہنچنے والا نہیں۔ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی کافروں کا بتوں کی پوجا کرنا سوائے گمراہی کے کچھ نہیں، کیونکہ یہ شرک ہے۔ ایک قول کے مطابق: اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ کا معنی یہ ہے کہ وہ دعا ان سے دور ہو جاتی ہے پس وہ اس سے کوئی حصہ نہیں پاتے جس طرح اللہ نے ارشاد فرمایا: اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 243 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 103

عَنۡنَا (المومن) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ کافروں کی آواز اللہ تعالیٰ سے چھپ جاتی ہے پس ان کی دعائیں سنتا ہی نہیں (1)۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۩

''اور اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا حضرت حسن اور قتادہ وغیرہ نے کہا: مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور کافر تلوار سے مجبور ہو کر۔ حضرت قتادہ سے ہی مروی ہے کہ کافر کو جب ایمان کوئی فائدہ نہیں دیتا تو وہ مجبوراً سجدہ کرتا ہے۔ زجاج نے کہا: کافر کا سجدہ مجبوراً ہوتا ہے اس میں نہ خضوع ہوتا ہے اور نہ ہی عمل کا اثر۔ ابن زید نے کہا: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جو اسلام میں رغبت وشوق سے داخل ہوا (2) اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جو تلوار سے ڈر کر اسلام میں داخل ہوا۔ ایک قول یہ ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے (3) جس کے اسلام کی مدت لمبی ہے اور اس نے اس لمبی عمر کو سجدوں میں مصروف رکھا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی ذات کو حقیر اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے، تو اس صورت میں آیت مومنوں کے حوالے سے ہی ہے اس اعتبار سے وَالْاَرْضِ سے مراد بعض من فی الأرض ہے۔ قشیری نے کہا: آیت میں دو مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ آیت عام ہے اور اس کی مراد مخصوص ہے، مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے (4) اور بعض کفار منافقین کی طرح مجبوراً اور خوف سے سجدہ کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت مومنین کے بارے میں ہے۔ ان میں سے بعض خوشی سے سجدہ کرتے ہیں ان پر سجدہ بھاری نہیں ہوتا اور بعض پر بھاری ہوتا ہے کیونکہ امور تکلیفیہ کا التزام مشقت ہے مگر وہ مشقت کو اخلاص اور ایمان کے ساتھ برداشت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ حق کو پالیتے ہیں اور اس پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور دوسرا مسلک یہ ہے کہ مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے جبکہ کافر کو سجدہ کا حکم ہے اور اس پر اس کا مواخذہ بھی ہوگا۔ دوسرا مسلک اور یہی حق ہے کہ مومن اپنے بدن کے ساتھ خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور مومن و کافر ہر مخلوق اس اعتبار سے سجدہ کرتی ہے کہ وہ مخلوق ہے، جس طرح اللہ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الاسراء: 44) کوئی شے نہیں مگر وہ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ تو یہ تسبیح دلالۃً ہوتی ہے عبادۃً نہیں۔ وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ یعنی مخلوق کے سائے صبح وشام اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ (سائے) ان دو وقتوں میں جدا ہوتے ہیں، اور ایک طرف سے دوسری طرف جھکتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے جس طرح وہ چاہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآىِٕلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ (النحل) کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 243　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 104

3۔ ایضاً　4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1110

اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: مومن کا سایہ خوشی سے سجدہ کرتا ہے کیونکہ وہ خوش ہوتا ہے جبکہ کافر کا سایہ مجبوراً سجدہ کرتا ہے کیونکہ وہ مجبور ہے۔ ابن انباری نے کہا: سایوں کی بھی عقلیں بنادی جاتی ہے جن کے ذریعے وہ سجدہ کرتے ہیں اور ان پر خشوع طاری ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی سمجھ بنادی ہے یہاں تک کہ وہ مخاطب ہوتے ہیں اور انہیں مخاطب کیا جاتا ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے، کیونکہ پہاڑ کی تو آنکھ ہے ممکن ہے زندگی کی تقدیر کی شرط کے ساتھ اس کی عقل بھی ہو جبکہ سائے تو آثار اور أعراض ہیں، ان کے لیے زندگی متصور نہیں۔ اور سجود جھکنے کے معنی میں ہے، پس سایوں کے سجود سے مراد ان کا ایک طرف سے دوسری طرف جھکنا ہے، سجدت النخلۃ کہا جاتا ہے یعنی کھجور کا درخت جھک گیا۔ الأصال، أصُل کی جمع اور أصُل، أصِیل کی جمع ہے، اس سے مراد عصر سے لے کر غروب آفتاب کے درمیان کا وقت ہوتا ہے۔ پھر أصائل جمع الجمع ہے۔ أبو ذؤیب ہذلی نے کہا:

لَعَمْرِي لَأَنْتَ البيتُ أُكْرِمُ أَهْلَهُ　　وأقعدُ في أَفْيَائِهِ بالأَصَائِلِ(1)

اور ظِلٰلُهُمْ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَنْ پر اس کا عطف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو، تقدیر عبارت یوں ہو: و ظلالهم سُجَّدٌ بالغدو والآصال۔ الغدو مصدر بھی ہوسکتا ہے اور غداۃ کی جمع بھی ہوسکتا ہے، اور الأصال جمع کے مقابلے میں اس کا آنا اس کے جمع ہونے کو تقویت دیتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

"آپ (ان سے) پوچھیے: کون ہے پروردگار آسمانوں اور زمین کا؟ (خود ہی) فرمایئے: اللہ (انہیں) کہیے: کیا تم نے بنالیے ہیں اللہ کے سوا ایسے حمایتی جو اختیار نہیں رکھتے اپنے لیے کسی نفع کا اور نہ کسی نقصان کا (ان سے) پوچھیے: کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور بینا یا کیا یکساں ہوتے ہیں اندھیرے اور نور کیا انہوں نے بنائے ہیں اللہ کے لیے ایسے شریک جنہوں نے کچھ پیدا کیا ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا پس یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہوگئی ہو، فرمایئے: اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ تعالیٰ (2) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ آپ مشرکین کو فرمائیں:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 104　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 105

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پھر الله نے فرمایا کہ اگر وہ اس کا جواب نہ دیں یا وہ اس سے ناواقف ہوں تو آپ خود ہی فرمائیے کہ وہ الله ہے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ یہ آیت کریمہ ان کی طرف سے الله تعالیٰ کے خالق ہونے کے اعتراف پر دلالت کرتی ہے ورنہ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ کے ذریعے استدلال نہ کیا جاتا۔ اس پر الله تعالیٰ کا ایک اور ارشاد بطور دلیل پیش بھی کیا جاسکتا ہے الله تعالیٰ نے فرمایا: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان: 25) اور اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ الله نے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے اعتراف کرلیا تو پھر اس کے علاوہ کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اور وہ غیر کوئی نفع اور نقصان بھی نہیں دے سکتا۔ یہ الزام صحیح ہے۔ پھر الله تعالیٰ نے ان کے سامنے ایک ضرب المثل بیان فرمائی ہے فرمایا: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ پس اسی طرح وہ مومن جو حق کو دیکھتا ہے وہ اور مشرک جو حق کو نہیں دیکھتا برابر نہیں ہوسکتے۔ ایک قول یہ ہے: اعمیٰ ان لوگوں کی مثال ہے جو الله کے علاوہ کی پوجا کرتے ہیں اور بصیر ان کی مثال ہے جو الله کی عبادت کرتے ہیں۔ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ یعنی شرک اور ایمان۔ ابن محیصن، ابوبکر، اعمش، حمزہ اور کسائی نے پہلے فعل کی وجہ سے "یستوی" یا کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ الظُّلُمٰتُ کی تانیث حقیقی نہیں، جبکہ باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے ابوعبید کے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔ ابوعبید نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل اور مونث کے درمیان کوئی فاصلہ بھی نہیں۔ اور الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ایمان اور کفر کی طرح ہے اور اس کی کیفیت سے واقف ہیں۔ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ یہ آیت استدلال کی تکمیل ہے، یعنی غیر الله نے الله کی طرح کوئی چیز تخلیق کی ہے تو یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہوگئی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے معبودوں نے کس چیز کو تخلیق کیا ہے۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرمائیے: الله تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہر چیز اس کی عبادت کرے (1)۔ یہ آیت ان مشرکین اور قدریہ کا رد ہے جن کا گمان یہ ہے کہ انہوں نے بھی الله تعالیٰ کی تخلیق کی طرح تخلیق کی ہے۔ وَهُوَ الْوَاحِدُ یعنی ہر چیز سے پہلے الْقَهَّارُ یعنی ہر چیز پر غالب، ابونصر قشیری نے کہا: یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ آیت کریمہ ایسے لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہو جو صانع کا اعتراف نہیں کرتے، یعنی آپ ان سے آسمانوں اور زمین کے خالق کے بارے میں پوچھیں، کیونکہ یہ ان کے خلاف اس سلسلہ میں حجت قائم کرنے کے لیے اور تقریب الی الافہام کے لیے آسان تھا۔ کہ جمادات اور ہر مخلوق کا آسمانوں اور زمین سے عاجز آنا تو (سب کے نزدیک) معلوم ہے۔ جب یہ بات پختہ ہوجائے گی اور ظاہر ہوجائے گا کہ صانع تو الله تعالیٰ ہی ہے تو پھر اس کا شریک ٹھہرانا کیسے ممکن رہے گا؟ اور دوران کلام یہ بات تو واضح ہوچکی ہے کہ اگر اس جہان کے دو صانع ہوں تو تخلیق مشتبہ ہو جائے گی اور ایک کا فعل دوسرے کے فعل سے جدا نہیں ہوسکے گا، تو کیسے معلوم ہوگا کہ فعل دو کی طرف سے ہے؟

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 105

الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۬ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۝ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''اس نے اتارا آسمان سے پانی پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق، تو اٹھالیا سیلاب کی رو نے ابھرا ہوا جھاگ۔ اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں زیور بنانے کے لیے یا دیگر سامان بنانے کے لیے اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے یوں اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے حق اور باطل کی۔ پس (بیکار) جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے اور جو چیز نفع بخش ہے لوگوں کے لیے تو وہ باقی رہے گی زمین میں، یونہی اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا بھلائی (ہی بھلائی) ہے اور جنہوں نے نہیں مانا اس کا حکم تو اگر ان کے ملک میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ تو وہ (عذاب سے بچنے کے لیے) اسے بطور فدیہ دے دیں۔ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لیے سخت باز پرس ہوگی اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری قرارگاہ ہے۔ تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو اندھا ہے، نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے ضرب المثل بیان فرمائی ہے کفر کو اس جھاگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پانی پر اٹھتی ہے، یہ ختم ہو جاتی ہے اور وادیوں کی ایک جانب میں جمع ہوتی ہے اور ہوائیں اسے دھکیل کر لے جاتی ہیں پس اسی طرح کفر بھی چلا جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا، بِقَدَرِهَا سے مراد بقدر ملئها ہے یعنی اپنے بھرنے کے اندازے کے مطابق۔ ابن جریج نے کہا: اس سے مراد اپنے چھوٹے اور بڑے ہونے کے حساب سے ہے۔ اشہب عقیلی اور حضرت حسن بصری نے بِقَدْرِهَا دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اس کا معنی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمایا۔ الأودیہ وادی کی جمع ہے اور اس کو وادی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ نکلتی اور بہتی ہے۔ اس بنیاد پر وادی بہنے والے پانی کا نام ہے۔ ابوعلی نے کہا: أودیة توسع ہے یعنی اس کا پانی بہنے لگا تو اسے حذف کر دیا گیا، یعنی سال ماءھا اور بقدرھا کا معنی بقدر میاہھا ہے، کیونکہ وادی بذات خود اپنے اندازے سے نہیں بہتی۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا یعنی پانی کے اوپر اٹھنے اور بلند ہونے والی، مجاہد کا کہا گیا کلام یہاں ختم ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ یہ دوسری ضرب المثل ہے۔ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ یعنی سونے اور چاندی کے زیور۔ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ مجاہد

نے کہا: متاع سے مراد لوہا، نحاس اور کچ ہے اور زَبَدٌ مِّثْلُهٗ سے مراد ہے کہ یہ چیزیں جھاگ پھینکتی ہیں جس طرح کہ پانی کا بہاؤ پھینکتا ہے اور صرف پانی کا بہاؤ جھاگ پھینکتا ہے کیونکہ پانی میں زمین کی مٹی شامل ہو جاتی ہے تو وہ اس کو جھاگ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح جواہرات، سونے اور چاندی وغیرہ میں سے وہ چیزیں جو زمین کے معادن میں سے ہیں ان کو جب آگ پر گرم کیا جاتا ہے تو مٹی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، تو انہیں آگ پر گرم کیا جاتا ہے تا کہ وہ پگھل جائیں تو زمین کی مٹی زائل ہو جاتی ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً مجاہد نے جُفَآءً کا معنی جمود آ گیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: جب ہانڈی میں ابال آئے اور جھاگ کو باہر پھینک دے تو أجفأت القدر کہا جاتا ہے۔ اور جُفاء سے مراد وہ ہے وادی نے جسے باہر پھینک دیا ہو۔ ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے رُؤبہ کو جُفالاً پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: جب ہانڈی جھاگ کو باہر پھینک دے تو أجفأتِ القدر کہا جاتا ہے، اور جب ہوا بادلوں کو ختم کر دے تو أجفلت الريح السحاب کہا جاتا ہے۔ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ مجاہد نے کہا: اس سے مراد خالص اور صاف شفاف پانی ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد پانی اور سونے، چاندی، لوہے، نحاس اور کچ میں سے جو خالص ہو چکا ہو وہ ہے۔ ان دونوں ضرب الامثال کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ثبات کے سلسلہ میں حق کے لیے اور باطل کے اضمحلال کے سلسلہ میں باطل کے لیے بیان کیا ہے، باطل اگرچہ بعض حالات میں بہت بلند ہوتا ہے تاہم جھاگ اور خبث کی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ضرب المثل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور قرآن میں سے جو دلوں میں داخل ہوتا ہے اس کی مثال بیان فرمائی ہے، قرآن کو بارش کے ساتھ تشبیہ دی وجہ شبہ اس کی بھلائی کا عام ہونا اور اس کے نفع کا باقی ہونا ہے اور دلوں کو وادیوں کے ساتھ تشبیہ دی کہ ان میں قرآن داخل ہوتا ہے جس طرح کہ وادیوں میں ان کی وسعت اور تنگی کے حساب سے داخل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ''یعنی قرآناً۔ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا آپ نے فرمایا: أودية بندوں کے دل ہیں (1)۔ صاحب ''سوق العروس'' نے کہا: اگر یہ معنی صحیح ہے تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں قرآن کی مثال پانی کے ساتھ بیان فرمائی اور دلوں کی وادیوں کے ساتھ اور محکم کی صافی جبکہ متشابہ کی ''زبد'' کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے۔

ایک قول کے مطابق جس طرح کہ وادی کا پانی صاف ستھرا چلتا ہے تو وادی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو اٹھا لے جاتا ہے اور جہاں تک سونے اور چاندی کے زیورات کی بات ہے تو یہ ان اچھے احوال اور پاکیزہ اخلاق کی طرح ہیں جن کی وجہ سے مردوں کی خوبصورتی اور اعمال کی نیکی کی بنیاد ہے، جس طرح سونے اور چاندی سے عورتوں کی زینت ہے اور ان کی وجہ سے اشیاء کی قیمت ہے۔ حمید، ابن محیصن، اعمش، حمزہ، کسائی اور حفص نے يُوْقِدُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عبیدہ نے بھی يَنْفَعُ النَّاسَ کی وجہ سے اسی کو اختیار کیا تو اس لیے خبر دینا مقصود ہے اور یہاں مخاطبت کی کوئی صورت نہیں جبکہ باقی قرآء نے کلام کے آغاز میں اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ کی وجہ سے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فِي النَّارِ محذوف کے متعلق ہوگا یہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 106

حال کی جگہ پر ہے جبکہ ذوالحال عَلَیۡهِ کی ھا ضمیر ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: ومما توقدون علیه ثابتاً فی النار أو کائناً اور فِی النَّارِ میں ایک ضمیر مرفوع ہے جو اس ھا کی طرف لوٹتی ہے جو ذوالحال کا اسم ہے۔ اور فِی النَّارِ کو یُوۡقِدُوۡنَ کے متعلق کرنا درست نہیں کیونکہ أوقدتُ علیه فی النار درست نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ موقد علیہ نار میں ہوگا تو اس صورت میں تو فِی النَّارِ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ابۡتِغَآءَ حِلۡیَةٍ مفعول لہ ہے۔ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ مبتدا اور خبر ہیں، یعنی زبدٌ مثل السیل ایک قول یہ ہے کہ زَبَدٌ کی خبر فِی النَّارِ ہے۔ کسائی کے نزدیک زَبَدٌ مبتدا ہے اور مِّثۡلُهٗ اس کی صفت ہے اور خبر اس سے ماقبل جملے میں ہے اور وہ مِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ کا جملہ ہے۔ کَذٰلِكَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ یعنی جس طرح اس نے تمہارے لیے یہ مثالیں بیان فرمائیں ہیں اسی طرح وہ دلائل بیان فرماتا ہے۔ پھر فرمایا: لِلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمُ یعنی جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا، استجاب بمعنی أجاب ہے شاعر نے کہا ہے:

فَلَمۡ یَسۡتَجِبۡهُ عند ذاك مُجِیبٌ

لم یستجبه بمعنی لم یُجِبۡهُ ہے۔

یعنی انہوں نے توحید اور نبوت وغیرہ میں سے جن کی طرف اللہ نے دعوت دی ہے ان کو مان لیا۔ الۡحُسۡنٰی کیونکہ یہ بات بھلائی کی انتہا میں ہے۔ ایک قول یہ ہے: الۡحُسۡنٰی سے مراد دنیا میں مدد اور کل باقی رہنے والی نعمت یعنی جنت ہے۔ وَالَّذِیۡنَ لَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَهٗ یعنی اس پر ایمان لانے کو جنہوں نے نہیں مانا۔ لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا یعنی مال وغیرہ میں سے وَّمِثۡلَهٗ مَعَهٗ یعنی یہ ان کی ملکیت میں ہو۔ لَافۡتَدَوۡا بِهٖ قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں، اس کی مثال سورۂ ''آل عمران'' میں ہے کہ: اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَیۡـًٔا (آل عمران: 10) بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افۡتَدٰی بِهٖ (آل عمران: 91) جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ یعنی ان کی کسی نیکی کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے کسی گناہ سے صرف نظر کیا جائے گا۔ فرقد سبخی نے کہا کہ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: اے فرقد! کیا تو جانتا ہے کہ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں! انہوں نے کہا: سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ یہ ہے کہ آدمی کے تمام گناہوں کا حساب لیا جائے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا جائے۔ وَمَاۡوٰىهُمۡ یعنی ان کا مسکن اور مقام جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ یعنی وہ بستر جو خود انہوں نے اپنے لیے تیار کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنۡ یَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَقُّ کَمَنۡ هُوَ اَعۡمٰی

یہ ضرب المثل اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کے لیے بیان فرمائی ہے، روایت ہے کہ یہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اَعۡمٰی سے مراد دل کا اندھا ہے اور جو دین سے جاہل ہوتا ہے وہ دل کا اندھا ہے۔ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

''وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ یہ عقلمندوں کی صفت ہے یعنی نصیحت صرف وہی عقلمند قبول کرتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ العھد اسم جنس ہے یعنی اللہ کے تمام وعدے اور وہ اس کے وہ اوامر اور نواہی ہیں جو اس نے اپنے بندوں کو فرمائے ہیں۔ ان الفاظ کے تحت تمام فرائض کا التزام اور تمام گناہوں سے بچنا شامل ہے۔ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد تو تمام وعدوں کی جنس مراد ہو یعنی جب وہ اللہ کی اطاعت میں کوئی وعدہ کرتے ہیں تو اس کو نہیں توڑتے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے وعدوں کو توڑنے اور ان سے روکنے کے بارے میں بیس اور کچھ آیات اپنے بندوں کو دی ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے ذریعے کسی معین وعدہ کی طرف اشارہ مقصود ہو، اور یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اس وقت لیا تھا جب اس نے انہیں اپنے باپ آدم علیہ السلام کی صلب سے نکالا تھا۔ قفال نے کہا: اس سے مراد توحید و نبوت کے وہ دلائل ہیں جو اس نے بندوں کی عقل میں ڈال دیئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابوداؤد اور دیگر لوگوں نے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم سات، آٹھ یا نو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہیں کرتے (1)؟'' اور ہم بیعت کے ذریعے عہد کے متعلق گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے عرض کیا: ہم نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔ آپ نے تین دفعہ یہ الفاظ ارشاد فرمائے، تو ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور آپ کی بیعت کر لی، ایک کہنے والے نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نے آپ کی بیعت کر لی تھی تو ہم کس بات پر آپ کی بیعت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، پانچ نمازیں پڑھو گے، توجہ سے سنو گے اور اطاعت کرو گے''۔ اور آپ نے رازداری سے ایک کلمہ ارشاد فرمایا۔ اور فرمایا ''لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کرو گے'' حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس جماعت کے کسی بندے کا چابک بھی گر جاتا تو وہ اسے بھی پکڑانے کے لیے کسی سے سوال نہ کرتا۔ ابن عربی نے کہا: نصیحت میں بڑے وعدوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کیا جائے۔ حضرت ابو حمزہ خراسانی اللہ کے (نیک) بندوں میں سے تھے انہوں نے سنا کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر بیعت کی ہے کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے، تو ابو حمزہ نے کہا: اے پروردگار! ان لوگوں نے تو تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو یہ وعدہ کیا میں تیرے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ بھی نہیں مانگوں گا۔ شام سے مکہ کی طرف حج کے ارادے سے نکلے رات کے وقت راستے میں چل رہے تھے کہ اپنے دوستوں سے کسی عذر کی وجہ سے پیچھے رہ گئے پھر ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، اسی دوران راستے کے کنارے پر واقع ایک کنوئیں میں گر گئے۔ جب کنوئیں کے پیندے میں پہنچے تو سوچا کہ کسی سے مدد طلب

1۔ سنن ابن ماجہ، باب البیعۃ صفحہ 398، حدیث 2867۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1399، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں ہو سکتا ہے کوئی سن لے۔ پھر سوچا کہ جس کے ساتھ میں نے عہد کیا ہوا ہے وہ مجھے دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے، اللہ کی قسم! کسی انسان کے لیے ایک حرف بھی نہیں بولوں گا، پھر تھوڑی ہی دیر گزری کہ اس کنویں سے ایک وفد گزرا جب انہوں نے کنویں کو راستے کے کنارے پر دیکھا تو انہوں نے کہا: اس کنویں کو بند کر دینا چاہیے، انہوں نے لکڑیاں کاٹیں اور انہیں کنویں کے منہ پر رکھ کر مٹی کے ساتھ انہیں ڈھانپ دیا، جب ابوحمزہ نے یہ دیکھا تو سوچا: یہ تو ہلاکت گاہ ہے، پھر لوگوں سے مدد طلب کرنا چاہی مگر کہا: اللہ کی قسم! میں کبھی بھی اس عہد سے نہیں نکلوں گا، پھر اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: کیا تو نے اس کے ساتھ عہد نہیں کر رکھا جو تجھے دیکھ رہا ہے؟ پس خاموش ہو گئے اور توکل کر لیا، پھر اپنے معاملہ میں غور و فکر کرتے ہوئے کنویں کے پیندے میں ٹیک لگائی تو اچانک مٹی پڑی اور لکڑی اوپر اٹھ گئی اور اسی دوران کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اپنا ہاتھ لاؤ! ابوحمزہ نے کہا: میں نے اسے اپنا ہاتھ دے دیا تو اس نے ایک جست میں مجھے کنویں کے کنارے پر پہنچا دیا، باہر نکلا تو کسی کو بھی نہ پایا، غیب سے آواز سنی جو کہہ رہا تھا: تو نے توکل کا پھل کیسا پایا؟ تو ابوحمزہ نے یہ اشعار کہے:

نهانِي حيائي منك أن أكشفَ الهوى　　فأغنيتَنِي بالعلم منكَ عن الكَشْفِ

تَلَطّفتَ فِي أمرِي فأبديتَ شاهدِي　　إلى غائبِي واللطفُ يُدرَكُ باللُّطفِ

تراءيتَ لِي بالعلم حتّى كأنّما　　تُخبّرُنِي بالغيب أنَّكَ فِي كَفِّ

أرانِي وبِي من هَيْبَتِي لكَ وَحشَةٌ　　فتونسُنِي باللُّطفِ مِنكَ وبالعطفِ

وتُحيِي مُحِبّاً أنتَ فِي الحبِّ حَتفُهُ　　وذَا عَجَبٌ كيف الحياةُ مَعَ الحَتفِ

ابن عربی نے کہا (1): یہ ہے وہ آدمی جس نے اللہ کے ساتھ عہد کیا تو اسے تمام و کمل پورا کیا، پس اس کی اقتدا کرو انشاء اللہ ہدایت پا جاؤ گے۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: اس آدمی نے اس مقام پر بزعم خویش جو توکل اختیار کیا یہ درست نہیں۔ اگر وہ توکل کا معنی سمجھ لیتا تو اسے پتہ چل جاتا کہ اس حالت میں کسی سے مدد طلب کرنا توکل کے منافی نہیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا مکہ سے چھپ کر نکلنا توکل سے خارج نہیں پھر آپ کا کوئی حیلہ سوچنا، اس معاملہ کا پوشیدہ رکھنا اور اپنے آپ کو غار میں چھپانا اور سراقہ کو اخفِ عنّا کے الفاظ ارشاد فرمانا (توکل کے منافی نہیں) پس وہ توکل جو قابل تعریف ہے وہ کسی ممنوع فعل کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور کنویں میں یہ صورت اختیار کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لیے آلات پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ ضرر کو دور کر سکتا ہے اور ایسے آلات بھی پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ نفع حاصل کر سکتا ہے، اگر وہ ان آلات کو توکل کا دعویٰ کرتے ہوئے معطل کر دے تو یہ اس کی توکل سے عدم واقفیت اور تواضع کی حکمت کی تردید پر دلیل ہے، کیونکہ توکل تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر دل کے اعتماد کا نام ہے اور اسباب کو ختم کر دینا توکل کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی بھوکا ہو اور کسی سے کچھ نہ مانگے اور مر جائے تو جہنم میں جائے گا، یہ حضرت سفیان ثوری اور دیگر لوگوں کا قول ہے، کیونکہ اسلام کے طریقوں کی جانب اس کی رہنمائی کی گئی ہے، اب اگر اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1112

نے وہ طریقے اختیار نہیں کیے تو خود اپنے قتل پر اپنی معاونت کی ہے۔ ابو الفرج نے کہا: ابو حمزہ کے قول فَجَاءَ اَسَدٌ فَاَخْرَجَنِي (شیر آیا تو اس نے مجھے نکالا) قابل التفات نہیں کیونکہ اگر یہ صحیح بھی ہو تب بھی ایسا اتفاقاً ہوا ہے اور ایک جاہل آدمی پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی ہے اور اس کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مہربانی کی ہوگی، انکار تو اس کے اپنے فعل کا ہے جو اس نے کیا، کیونکہ اس کا اپنا فعل خود اس کی اپنی جان کے قتل پر معاونت تھی جو جان اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت تھی اور اللہ نے اسے اس کی حفاظت کا حکم فرما رکھا تھا۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

''اور جو لوگ جوڑتے ہیں اسے جس کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ جوڑا جائے اور ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور خائف رہتے ہیں سخت حساب سے۔ اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرتے رہے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور خرچ کرتے رہے اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی انہیں لوگوں کے لیے دار آخرت کی راحتیں ہیں (یعنی) سدا بہار باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو صالح ہوں گے ان کے باپ دادوں، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے (وہ بھی داخل ہوں گے) اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے: سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت کا گھر''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ حضرت قتادہ اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ صلہ رحمی کے بارے میں ظاہر ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تمام علامات کو بھی شامل ہے۔ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ایک قول یہ ہے: قطع رحم کے بارے میں وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جبکہ ایک قول کے مطابق تمام نافرمانیوں اور گناہوں سے ڈرتے ہیں۔ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ، سُوْٓءَ الْحِسَابِ سے مراد یہ ہے کہ حساب میں سختی اور مناقشہ کیا جائے گا اور جس سے تفصیلی حساب سختی سے لیا گیا اسے عذاب دیا (ہی) جائے گا۔ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ کا معنی تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلہ رحمی کے بارے میں ہے اور چوتھا احتمال یہ بھی ہے کہ نیک عمل کے ساتھ ایمان پر کاربند رہیں (1)، وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ اور ایسے معاملات کے بارے میں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 108

اپنے رب سے ڈرتے ہیں جن کو بجالانے کا اس نے انہیں حکم دیا ہے۔ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ان معاملات کو چھوڑنے کے حوالے سے حساب کی سختی سے ڈرتے ہیں؛ پہلا قول ان سب اقوال کو شامل ہے۔ باللہ توفیقنا۔

قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ایک قول کے مطابق یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ صَبَرُوْا فعل ماضی ہے لہٰذا یوفون پر اس کا عطف نہیں ہو سکتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ بھی گزشتہ لوگوں کی ہی صفت ہے۔ اور صفت کبھی لفظ ماضی کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور کبھی مضارع کے لفظ کے ساتھ، کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا من یفعل کذا فلہ کذا جو ایسا کرے گا تو اس کے لیے ایسا ہوگا۔ جب وَ الَّذِيْنَ متضمن بمعنی شرط ہے اور شرط میں ماضی، مضارع کے معنی میں ہوتی ہے تو ایسا جائز اور درست ہوگا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ فرمایا پھر وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا فرمایا اور پھر اس پر عطف کرتے ہوئے يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ فرمایا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کیا اور اللہ کی نافرمانی سے صبر کیا۔ عطا نے کہا: انہوں نے مصائب و آلام اور حوادث ونوائب پر صبر کیا۔ ابو عمران جونی نے کہا: جنہوں نے اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنے دین پر صبر کیا۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ یعنی انہوں نے نمازوں کو ان کے فرائض سمیت اور ان کے اوقات میں خشوع وخضوع سے ادا کیا۔ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ ''بقرہ'' میں تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے۔ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ یعنی وہ برے اعمال کو نیک اعمال کے ذریعے رد کرتے ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: بھلائی کے ذریعے برائی کو روکتے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر کے نزدیک نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرتے ہیں۔ ضحاک نے کہا: سلام کے ذریعے فحش کو دور کرتے ہیں۔ جویبر نے کہا: عفو کے ذریعے ظلم کو روکتے ہیں۔ ابن شجرہ نے کہا: توبہ کے ذریعے گناہ کو دور کرتے ہیں۔ قتیبی نے کہا: بردباری کے ذریعے جاہل کی بے وقوفی کو روکتے ہیں اور بے وقوفی سے مراد برائی اور بردباری سے مراد نیکی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جب وہ گناہ کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے رجوع کر لیتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں، جبکہ ایک قول کے مطابق: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی کے ذریعے وہ شرک کو دور کرتے ہیں۔ یہ اقوال ہیں اور تمام کا معنی قریب قریب ہے، پہلا معنی بالعموم سب کو شامل ہے اور اس کی مثال: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود: 114) ہے (بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں) اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کیلئے ارشاد ہے: اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَ خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (1) گناہ کے بعد نیکی کر یہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح معاملہ کر۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی آخرت کی عاقبت اور وہ دوزخ کے بدلے میں جنت ہے۔ اور مستقبل میں دار دو ہی ہوں گے، فرماں بردار کے لیے جنت اور نافرمان کے لیے دوزخ، پس جب اطاعت گزاروں کی صفات کو بیان فرمایا تو لامحالہ طور پر ان کا دار جنت ہی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: دار سے مراد دار دنیا ہے، یعنی جو انہوں نے اطاعت وفرمانبرداری والے کام کیے ہیں ان کی جزا انہیں دار دنیا میں ہی مل جائے گی۔

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس، حدیث 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یعنی ان کے لیے سدا بہار باغات ہیں، جَنّٰتُ عَدۡنٍ، عُقۡبَی سے بدل ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عُقۡبَی الدَّارِ کی تفسیر ہو یعنی لھم دخول جنّاتِ عدنٍ کیوں کہ عُقۡبَی الدَّارِ حدث ہے اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ عین، اور حدث اپنے جیسے حدث کی تفسیر بیان کرتا ہے، پس محذوف مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جَنّٰتُ عَدۡنٍ مبتدا محذوف کی خبر ہو اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ جنت کا درمیانی اور سب سے بڑا حصہ ہے، اور اس کی چھت رحمن کا عرش ہے۔ یہ ابونصر عبدالرحیم قشیری کا قول ہے اور صحیح بخاری میں ہے(1): ''جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس کا سوال کرو بے شک یہ اوسط الجنۃ اور اعلی الجنۃ ہے، اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں''۔ ہوسکتا ہے جَنّٰتُ عَدۡنٍ بھی اسی طرح ہو، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جنت میں ایک محل ہے جسے عدن کہا جاتا ہے اس کے اردگرد بروج اور مروج ہیں، اس میں ایک ہزار دروازہ ہے، ہر دروازے پر پانچ ہزار یمنی منقش چادریں ہیں اس میں صرف نبی، صدیق اور شہید ہی داخل ہوسکتے ہیں۔ عَدۡنٍ، عَدَنَ بالمکان سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی مکان میں مقیم ہوجائے، اس کا بیان انشاء اللہ سورۂ ''کہف'' میں آئے گا۔ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِهِمۡ، اُولٰٓئِكَ پر اس کا عطف بھی ہوسکتا ہے، معنی ہوگا اُولٰئک ومن صلح من آبائھم واَزواجھم وذریاتھم لھم عقبی الدار اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یَدۡخُلُوۡنَ میں ضمیر مرفوع پر اس کا عطف ہو اور یہ عطف صحیح و عمدہ بھی ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان ضمیر منصوب حائل ہے اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے: ید خلونھا وید خلھا من صلح من آبائھم یعنی وہ جو نیک ہو، اور نام و نسب کی وجہ سے وہ داخل نہیں ہوں گے، اور ''من'' محل نصب میں بھی ہوسکتا ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: وہ ان نیکوں کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے اگرچہ ان کے اعمال ان کی طرح نہیں ہوں گے مگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کی عزت کی وجہ سے انہیں بھی ملا دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ صلاح یا نیکی، اللہ اور رسول پر ایمان لانا ہے اور اگر ان کے پاس ایمان کے ساتھ ساتھ دیگر نیکیاں بھی ہوں گی تو وہ اپنی طاعات کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے نہ کہ ان کے تابع ہونے کی وجہ سے۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ ایمان تو ضروری ہے، پس عمل صالح کی شرط کا قول ایسا ہی ہے جیسا کہ ایمان کی شرط کا قول ہے۔

اظہر یہ ہے کہ یہ صلاح تمام اعمال میں ہے اور معنی یہ ہوگا کہ کل بروز قیامت ان پر نعمت اس طرح مکمل ہوگی کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سمیت جنت میں جمع ہوں گے، اور ہر انسان اپنے ذاتی عمل کے ذریعے جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ جنت جائے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مہربانی کرتے ہوئے ہدایا اور تحائف کے ساتھ فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے آئیں گے۔ سَلٰمٌ عَلَیۡكُمۡ یعنی وہ کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَیۡكُمۡ، قول کو مضمر کردیا یعنی تم آفات اور ابتلاء سے سلامت ہو۔ ایک قول یہ ہے: اگرچہ وہ سلامت اور محفوظ ہیں تاہم یہ ان کے لیے ہمیشہ کی سلامتی کی دعا ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے گا، یہ خبر ہے اور اس کا معنی دعا ہے، اور عبودیت کے اعتراف کو متضمن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرد علی الجھمیۃ، جلد 2، صفحہ 1104

ہے۔ بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی بصبرکم، ما فعل کے ساتھ آئے تو فعل مصدری معنی میں ہو جاتا ہے اور ما کے ساتھ آنے والی با، سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ کے متعلق ہوگی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہو یعنی هذه الكرامة بصبركم یہ عزت تمہارے صبر کی وجہ سے ہے، یعنی جو اللہ کے امر اور نہی پر تم نے صبر کیا (1)، یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے دنیا میں فقر پر صبر مراد ہے۔ یہ ابو عمران جونی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: اللہ کے راستے میں جہاد پر صبر، جس طرح کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کی مخلوق میں سے کون جنت میں داخل ہوگا؟'' صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''وہ مجاہد جن کے ذریعے سرحدیں محفوظ ہوتی ہیں اور جن کے ذریعے ناپسندیدہ کاموں سے بچا جاتا ہے جب ان میں سے کوئی فوت ہوتا ہے اور خود اپنی حاجت کو پورا نہیں کر سکتا تو فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے داخل ہوتے ہیں کہ تم پر تمہارے صبر کی وجہ سے سلامتی ہو پس یہ آخرت کا گھر کیا عمدہ ہے''۔ محمد بن ابراہیم نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کے آخر میں شہداء کی قبور پر آتے اور فرماتے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یہی معمول حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کا تھا۔ بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کے پاس آتے، جب دو پہاڑوں کے درمیان گھاٹی میں پہنچتے تو فرماتے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی دنیا کی فضولیات سے۔ ایک قول یہ ہے: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی طاعت کی ملازمت اور معصیت کی مفارقت پر، یہ معنی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ ابن زید نے کہا: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی جب کوئی ایسی چیز تم سے بچھڑ جاتی جس کے ساتھ تم محبت کرتے ہوتے تو اس پر صبر۔ اور بِمَا صَبَرْتُمْ کا ساتواں احتمال یہ ہے کہ شہوات کی اتباع سے صبر۔ حضرت عبد اللہ بن سلام اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو پکارنے والا پکارے گا کہ صبر والے کھڑے ہو جائیں، تو لوگوں میں سے کچھ کھڑے ہوں گے انہیں کہا جائے گا: تم جنت کی طرف چلے جاؤ، تو فرشتے انہیں ملیں گے اور کہیں گے: کدھر جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف، فرشتے کہیں گے: حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے: ہاں! فرشتے کہیں گے: تم کون ہو؟ تو وہ کہیں گے: ہم صبر والے ہیں، فرشتے کہیں گے: تمہارا صبر کیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہم نے اللہ کی طاعت پر اپنے نفس کو صابر رکھا، اللہ کی نافرمانی سے اسے صابر رکھا اور دنیا میں آزمائش اور امتحان میں اسے صابر رکھا۔ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فرشتے انہیں کہیں گے: جنت میں داخل ہو جاؤ عمل کرنے والوں کا کتنا عمدہ اجر ہے۔ ابن سلام نے کہا: فرشتے انہیں کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ یعنی دار آخرت جس میں تم ہو یہ کتنا عمدہ ہے، اس میں تم نے وہی کام کیا جو تم اس سے پہلے والے دار میں کرتے رہے؛ عُقْبَى اسی بنیاد پر اسم ہے اور الدَّارِ یہ دنیا ہے۔ ابو عمران جونی نے کہا: فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یعنی جنت، دوزخ کی نسبت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 109

کتنا عمدہ گھر ہے اور انہیں سے مروی ہے: فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یعنی جنت، دنیا کی نسبت کتنا عمدہ گھر ہے(1)۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝

''اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ (سے کیے ہوئے) وعدہ کو اسے پختہ کرنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ انہیں جوڑا جائے اور (فتنہ و) فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے) اور کفار بڑے مسرور ہیں دنیوی زندگی (کی راحتوں) سے اور (حقیقت یہ ہے کہ) نہیں دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر متاع حقیر''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ جب اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو پورا کرنے والوں اور اپنے حکم پر عمل پیرا ہونے والوں کا ذکر فرما چکا تو اب ان کا ذکر فرما رہا ہے جو ان کے برعکس ہیں۔ ''نقض المیثاق'' سے مراد اس کے حکم کا ترک ہے۔ ایک قول یہ ہے: اپنے عقلوں کو مہمل چھوڑ دینا مراد ہے، کہ وہ عقل کے ذریعے تدبر نہیں کرتے تاکہ اللہ کو پہچان لیں۔ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ یعنی قطع تعلق کرتے ہیں اور تمام انبیاء پر ایمان لانے کے عہد کو قطع کرتے ہیں۔ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی کفر اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ یعنی رحمت سے دوری اور محرومی۔ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ اس سے مراد سوء المنقلب ہے اور وہ جہنم ہے۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! یہ آزاد لوگ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ جب اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کے انجام کو ذکر فرمایا تو پھر یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق کو کشادہ بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کیونکہ یہ دار الامتحان ہے، پس کافر پر رزق کی کشادگی اس کی عزت کی دلیل نہیں اور نہ ہی کسی مومن پر رزق کی تنگی اس کی اہانت کی دلیل ہے۔ يَقْدِرُ کا معنی 'یضیق'' ہے یعنی تنگ کرتا ہے۔ اسی سے وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (الطلاق: 7) ہے یعنی اس نے تنگ کیا اور ایک قول کے مطابق يَقْدِرُ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضرورت کی مقدار عطا فرماتا ہے۔ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی مشرکین مکہ دنیا پر خوش ہیں اور اس کے علاوہ سے واقف نہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس سے جاہل ہیں۔ یہ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ پر معطوف ہے۔ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر عبارت یہ ہے: والذین ینقضون عهدالله من بعد میثاقه ویقطعون ما أمرالله به أن یوصل

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 109

ویفسدون فی الأرض وفرحوا بالحیاۃ الدنیا۔

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ، فِي الْاٰخِرَةِ سے مراد فی جنب الاخرۃ ہے یعنی آخرت کے پہلو میں اِلَّا مَتَاعٌ یعنی متاع من الأمتعۃ جس طرح پیالا اور وہ چھوٹا برتن جس میں سالن کھایا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: تھوڑی چیز جو چلی جانے والی ہے، دن چڑھا تو اسے زوال لازمی آئے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس طرح کا زادرہ ہے جس طرح ایک چرواہے کے پاس زادراہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: متاع الحیاۃ الدنیا سے مراد دنیوی زندگی کا وہ حصہ ہے جس سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق: اس سے مراد تقوی اور نیک عمل میں سے جو اس دنیا سے آخرت کی طرف بطور زادراہ لے جاتا ہے وہ ہے۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۚۖ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ

"اور کفار کہتے ہیں: (اگر یہ سچے نبی ہیں) تو کیوں نہ اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے، آپ فرمائیے: (نشانیاں تو بہت ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور رہنمائی فرماتا ہے اپنی (بارگاہ قرب کی) طرف جو صدق دل سے رجوع کرتا ہے (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح فرمادیا ہے کہ کفار کا سچائی پر دلالت کرنے والی ایک نشانی کو دیکھ لینے کے بعد رسولوں پر کئی نشانیوں کو پیش کرنے کا مطالبہ جہالت پر مبنی ہے اور یہ کہنے والے عبداللہ بن ابی امیہ اور اس کے وہ ساتھی ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ عزوجل يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ یعنی جس طرح اس نے کئی آیات کے نزول کے بعد تمہیں گمراہ کیا اور ان سے استدلال سے تمہیں محروم رکھا اسی طرح وہ ان کے علاوہ کئی آیات کے نزول کے وقت تمہیں گمراہ کرے گا۔ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۔ اَنَابَ سے مراد ہے جس نے رجوع کیا۔ اور اِلَيْهِ کی ضمیر حق، اسلام یا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی وہ اپنے دین اور اطاعت کی طرف اسے ہدایت دیتا ہے جو اپنے دل کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اِلَيْهِ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اَلَّذِيْنَ مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے؛ یعنی يَهْدِي اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مَنْ اَنَابَ کے ارشاد سے بدل ہے۔ وہ بھی محل نصب میں ہے۔ وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے ذریعے سکون پذیر اور مانوس ہوتے ہیں تو مطمئن ہو جاتے ہیں، یعنی وہ اپنی زبانوں کے ذریعے اللہ کا ذکر کر کے ہمیشہ اپنے دلوں کو اطمینان دیتے ہیں، یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مجاہد اور قتادہ وغیرہ نے کہا: ذکر سے مراد قرآن ہے۔ حضرت

سفیان بن عیینہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا امر ہے۔ مقاتل کے نزدیک اللہ کا وعدہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس کے نام کی قسم ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فضل وانعام کے ذکر کے ذریعے وہ اطمینان حاصل کرتے ہیں، جس طرح اس کے عدل، انتقام اور قضا کے ذکر سے کانپتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے بِذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی آیات میں غور وفکر کرتے ہیں تو بصیرت سے اس کی قدرت کے کمال کو پہچانتے ہیں۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ یعنی مومنین کے دل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا تعلق قسم کے ساتھ ہے، جب مد مقابل اللہ کے نام کی قسم اٹھاتا ہے تو بندہ مومن کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: بِذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: اس سے اللہ کا ثواب مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق اللہ کا وعدہ مراد ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل (بھی) نیک کیے مژدہ ہو ان کے لیے اور (انہی کے لیے) اچھا انجام ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ مبتدا اور خبر ہے ایک قول یہ ہے: اس کا معنی لَهُمْ طُوْبٰى ہے، طُوْبٰى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اس صورت میں تقدیر عبارت: جَعَلَ لَهُمْ طُوْبٰى ہوگی اور مذکورہ دونوں صورتوں میں وَحُسْنُ مَاٰبٍ کا اس پر عطف ہوگا، تو اس کو رفع بھی دیا جا سکتا ہے اور نصب بھی۔

عبد الرزاق نے ذکر کیا: ہمیں معمر نے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن عمرو بن ابی یزید بکالی عن عتبہ بن عبد السلمی بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، اس نے آپ سے جنت اور حوض کوثر کے بارے میں پوچھا اس نے کہا: کیا اس میں پھل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں ایک درخت ہے جسے طوبیٰ کہا جاتا ہے''۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہماری زمین میں کون سا درخت اس کے مشابہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تیری زمین کے درختوں میں سے کوئی بھی اس کے مشابہ نہیں کیا تو شام گیا ہے وہاں ایک درخت ہے جسے ''جوزہ'' کہا جاتا ہے جو تنے پر اگتا ہے اور اپنے اوپر والے حصے کو پھیلا دیتا ہے''۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کے تنے کی موٹائی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں میں سے جذعۃ کے ساتھ سفر کرے تو تب بھی تو اس کے تنے کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں تک کہ بڑھاپے کے سبب اس کی ہنسلی کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں''۔ اور راوی نے حدیث ذکر کی، اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں ''ابواب الجنۃ'' میں مکمل طور پر لکھ دیا ہے۔ والحمد للہ۔

ابن مبارک نے ذکر کیا اور کہا: أخبرنا معمر عن الأشعث عن عبد اللہ عن شھر بن حوشب عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ آپ نے فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے اسے ''طوبیٰ'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے وہ پیدا کر جو یہ چاہے تو وہ اس کے لیے زین، لگام اور اس کی ہیت سمیت ایک گھوڑا پیدا کرے گا جس طرح وہ چاہے گا، اور سواری والے جانور سے کجاوے، مہار اور اس کی ہیت سمیت پیدا کرے گا جو وہ چاہے گا یعنی خالص حصے اور کپڑے۔

حضرت ابن وہب نے شہر بن حوشب والی حدیث حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت کی ہے آپ نے کہا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے ہر گھر میں اس کی کوئی نہ کوئی ٹہنی ہوگی، کوئی خوبصورت پرندہ نہیں جو اس میں نہ ہو اور نہ ہی کوئی پھل ہے جو اس

میں نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل جنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محل میں ہوگی، پھر اس کی ٹہنیاں اہل جنت کے گھروں میں تقسیم ہوں گی جس طرح تمام اہل دنیا میں آپ کی بارگاہ سے علم اور ایمان پھیلتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: طُوْبٰی لَهُمْ کا مطلب ہے کہ ان کے لیے خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ طوبیٰ حبشی زبان میں جنت کا نام ہے، یہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے۔

حضرت ربیع بن انس نے کہا: ہندی زبان میں یہ باغ ہے، قشیری نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ دو زبانوں کو جوڑتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: طُوْبٰی لَهُمْ یعنی ان کے لیے بھلائی ہے۔ عکرمہ نے کہا: ان کے لیے نعمت ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: ان کے لیے بہتری ہے، انہیں سے مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے عزت ہے۔ ضحاک نے کہا: ان کے لیے خوشی و سرور ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سارے اقوال قریب قریب ہیں، کیونکہ ''طوبیٰ'' طیب سے فعلی کا وزن ہے، یعنی ان کے لیے پاکیزہ زندگی ہوگی اور یہ ساری چیزیں پاکیزہ چیز کی طرف ہی راجع ہیں۔ زجاج نے کہا: ''طوبیٰ'' طیب سے فُعلیٰ کا وزن ہے، اور یہ ان کی پاکیزگی کی حالت ہے، اس کی اصل طُیْبیٰ ہے، ''یا'' ساکن ماقبل مضموم واو سے بدل گئی جس طرح کہ: موسر اور موقن۔

میں (قرطبی) نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ یہ درخت ہے، اس کی دلیل ہماری ذکر کردہ مرفوع حدیث ہے، یہ روایت سہیلی کی ذکر کردہ شرائط کے مطابق صحیح ہے، اس کو ابو عمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیا ہے، اور اسی سے ہم نے اسے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اسے ذکر کیا ہے۔ المہدوی اور قشیری نے بھی اسے معاویہ بن قرۃ عن ابیہ روایت کیا ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست (قدرت) سے لگایا اور اس میں اپنی روح پھونکی زیورات اور حلّے اگاتا ہے اور اس کی ٹہنیاں جنت کی دیواروں کے پیچھے سے دکھائی دیتی ہیں۔'' جو اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ثعلبی کا مطالعہ کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے اس کی اصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں ہے اور ہر مومن کے گھر میں اس کی ایک ٹہنی ہے۔ حضرت ابو جعفر محمد بن علی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے طُوْبٰی لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں اور اس کی ٹہنیاں جنت میں ہیں''۔ آپ کو عرض کیا گیا: یارسول اللہ! آپ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اصلها فی دار علی و فرعها فی الجنة۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل جنت میں میرا گھر اور علی کا گھر ایک ہی جگہ پر ایک ہی ہوگا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی مروی ہے: ''یہ ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں ہے اور تم میں سے ہر ایک کے گھر میں اس کی ٹہنی لٹکی ہوئی ہے''۔ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ جب کوئی واپس لوٹے تو ''آب'' کہا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہوگا: الذین آمنوا و تطمئن قلوبهم بذکر اللہ و عملوا الصالحات طوبی لهم۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 354

اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ۝

''اسی طرح ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ایک قوم میں جس سے پہلے گزر چکی ہیں کئی قومیں تاکہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں وہ (کلام) جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا اور یہ کفار انکار کر رہے ہیں رحمن کا، فرمایئے: وہی میرا پروردگار ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اسی پر ہی میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی جناب میں رجوع کیے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ یعنی ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کو بھیجا، یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا اس پر ہونے والے انعام کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر ہونے والے انعام کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی طرف آپ سے پہلے انبیاء کو بھیجا گیا۔ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ یعنی قران وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ مقاتل اور ابن جریج نے کہا: یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی جب انہوں نے کتاب الصلح لکھنا چاہی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا(1): بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھو'' سہیل بن عمرو اور مشرکین نے کہا: ہم سوائے صاحب یمامہ کے رحمن کو نہیں جانتے، صاحب یمامہ سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھا، لہٰذا اکتب باسمك اللهم اسی طرح زمانہ جاہلیت میں لوگ لکھتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''یہ لکھو جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح ہوئی ہے''(2)۔ قریش کے مشرکین نے کہا: اگر آپ رسول تھے تو ہم نے آپ کے ساتھ جنگ کی اور تیرا راستہ روکا تو گویا ہم نے آپ کے ساتھ ظلم کیا ہے، (وہ نہ لکھو) بلکہ یہ لکھو: یہ ہے جس پر محمد بن عبد اللہ نے صلح کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے کہا: ہمیں چھوڑ دیجیے ہم ان کے ساتھ جنگ کریں گے، آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ وہ لکھو جو یہ چاہتے ہیں''۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ قریش کفار کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اُسجدوا للرحمن رحمن کو سجدہ کرو۔ تو انہوں نے کہا: رحمن کون ہے؟ تو یہ حکم نازل ہوا کہ قُلْ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جنہوں نے آپ کا انکار کیا ہے انہیں فرمایئے هُوَ رَبِّيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اگرچہ اس کے صفاتی نام مختلف ہیں۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میں نے اعتماد اور بھروسہ کیا وَ اِلَيْهِ مَتَابِ یعنی کل میرا لوٹنا اسی کی طرف ہوگا اور آج بھی میں نے اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے میں اس کی قضا پر راضی اور اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔ ایک قول یہ بھی ہے: ابو جہل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر میں یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ اے رحمٰن تو اس نے کہا: محمد ہمیں کئی معبودوں کی عبادت سے روکتا ہے اور خود دو معبودوں کو پکارتا ہے، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ بھی نازل ہوئی قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (الاسراء: 110)

وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ

1۔ کنز العمال، غزوۂ حدیبیہ، جلد 10، صفحہ 480، حدیث 3151　2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 342

الْاَمْرُ جَمِیْعًا ؕ اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۳۱﴾

"اور اگر کوئی ایسا قران اترتا جس کے ذریعے سے پہاڑ چلنے لگتے یا اس کے اثر سے پھٹ جاتی زمین یا مردوں سے اس کے ذریعہ بات کی جا سکتی (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں (با ایں ہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے ایمان والے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اور کفار اس حالت میں رہیں گے کہ پہنچتا رہے گا انہیں (آئے دن) اپنے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی صدمہ یا اترتی رہے گی کوئی نہ کوئی مصیبت ان کے گھروں کے گردونواح میں یہاں تک کہ آ جائے اللہ کے وعدہ (کے ظہور کا دن) بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کے ساتھ متصل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کا ایک گروہ جس میں ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی بھی تھے کعبہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا آپ ان کے پاس آئے تو عبداللہ نے آپ کو کہا: اگر آپ کو یہ بات خوش کرتی ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں تو قران کے ذریعے ہمارے پہاڑ کو چلا، اس کو ہم سے دور لے جا یہاں تک کہ یہ پھٹ جائے، یہ تنگ زمین ہے اور اس میں ہمارے لیے چشمے اور نہریں بنا دے تا کہ ہم اس میں درخت لگائیں اور فصلیں کاشت کریں، آپ کے خیال کے مطابق آپ اپنے رب کے نزدیک داؤد سے زیادہ کمزور نہیں ہیں کہ ان کے لیے اللہ نے پہاڑوں کو مسخر کیا وہ ان کے ساتھ چلتے تھے۔ اور ہمارے لیے ہوا کو مسخر کرو، ہم ان پر سوار ہو کر شام کو جائیں اسی پر اپنی ضروریات اور کام کریں، پھر آج ہی واپس لوٹ آئیں، آپ کے خیال کے مطابق سلیمان کے لیے ہوا مسخر تھی آپ اپنے رب کے نزدیک سلیمان بن داؤد سے زیادہ کمزور نہیں۔ ہمارے لیے اپنے دادا کی پرانی ہڈی کو زندہ کیجیے یا ہمارے مردوں میں سے جس کو چاہو زندہ کردو تا کہ ہم اس سے سوال و جواب کریں کہ کیا جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ حق ہے یا باطل؟ عیسیٰ (علیہ السلام) مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور آپ اپنے رب کے نزدیک ان سے زیادہ کم مرتبہ نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے (1): وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ الآیۃ نازل فرمایا: زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ اور ضحاک نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور جواب محذوف ہے اس کی تقدیر لکان ھذا القران ہے، لیکن اسے ایجازاً حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام کے ظاہر میں اس پر دلالت موجود تھی۔ جس طرح امرؤالقیس نے کہا:

فَلَوْ أَنَّهَا نَفْسٌ تَمُوتُ جَمِيعَةً وَلٰكِنَّهَا نَفْسٌ تَسَاقَطُ أَنْفُسَا

اس سے مراد ہے کہ لَهَانَ عَلَیَّ یہ حضرت قتادہ کے قول کا معنی ہے، آپ نے کہا: اگر تمہارے قران سے پہلے کسی قران

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 357

نے ایسا کیا ہے تو تمہارا قرآن بھی ضرور ایسا کرے گا۔ ایک قول یہ ہے: اس کا جواب مقدم ہے، اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی وھم یکفرون بالرحمن لو أنزلنا القران وفعلنا بھم ما اقترحوا۔ فرا نے کہا: جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''اگر قران ان کے ساتھ یہ بھی کر دیتا تو بھی وہ رحمن کا انکار کرتے''۔ زجاج نے کہا: وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سے لے کر الموتی تک پڑھنے کے بعد جواب ہے لما آمنوا کہ تب بھی وہ ایمان نہ لاتے یہاں تو مضمر جواب وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىٕكَةَ سے لے کر مَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ (انعام: 111) تک کے ارشاد سے زیادہ ظاہر ہے۔ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا یعنی وہ تمام امور کا مالک ہے، اس میں سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو تم چاہتے ہو یہ قران کے ذریعے نہیں ہوگا بلکہ الله کے امر کے ذریعے ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا، فراء نے کہا کہ کلبی نے کہا ہے: نخع کی لغت یہ ہے کہ ییئس بمعنی یعلم ہے اس کو قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے؛ یعنی أفلم یعلموا جوہری نے ''الصحاح'' میں بھی یہی بیان کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ ہوازن کی لغت ہے؛ یعنی أفلم یعلم؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور حسن سے بھی مروی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: أفلم یعلموا و یتبینوا یعنی کیا وہ نہیں جانتے اور ان کو واضح نہیں ہوا، اس سلسلہ میں ابو عبیدہ نے مالک بن عوف نصری کا شعر پڑھا ہے:

أَقُولُ لَهُمْ بِالشِّعْبِ إِذْ يَيْسِرُونَنِي   أَلَمْ تَيْأَسُوا أَنِّي ابْنُ فَارِسِ زَهْدَمِ(1)

أَلَمْ تَيْأَسُوا شعر میں بھی أَلَمْ یعلموا کے معنی میں ہے۔

ییسرونني، میسر سے ہے سورۂ ''بقرہ'' میں یہ گزر چکا ہے اور یاسرونني کا الأسر سے مشتق ہونا بھی مروی ہے۔ رجاح بن عدی نے کہا:

أَلَمْ يَيْئَسِ الْأَقْوَامُ أَنِّي أَنَا ابْنُهُ   وَإِنْ كُنْتُ عَنْ أَرْضِ الْعَشِيرَةِ نَائِيًا

یہاں بھی اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ بمعنی أَلَمْ یعلم ہے۔ اور کتاب الرد میں أَنِّي أنا ابنه ہے۔ غزنوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے: یعنی ألم یعلم معنی یہ ہوگا: کیا نہیں جانتے ایمان والے کہ اگر الله تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو بغیر ان کے نشانیاں دیکھنے کے ہدایت دے دیتا۔ ایک قول یہ ہے: یہ یأس جو کہ معروف ہے اسی سے ہے، یعنی کیا ایمان والے ان کافروں کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر الله تعالیٰ انہیں ہدایت دینا چاہتا تو ہدایت دے دیتا، کیونکہ مومنین نے کفار کے ایمان میں طمع کرتے ہوئے نزول آیات کی تمنا کی۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے: أفلم یتبین الذین آمنوا پڑھا ہے جو کہ ''البیان'' سے ہے۔ قشیری نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا گیا کہ لکھا ہوا تو اَفَلَمْ یَایْــٴَـسْ ہے آپ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ کاتب نے اسے لکھا تو وہ اونگھ کی حالت میں تھا، یعنی اس نے کچھ حروف زیادہ کر دیے حتیٰ کہ یَایْــٴَـسْ ہو گیا۔ ابو بکر انباری نے کہا: عکرمہ نے ابن ابی نجیح سے روایت کیا ہے کہ اس نے أفلم یتبین الذین آمنوا پڑھا ہے۔ اور جس نے اس کی تلاوت میں درست سمجھا اس نے اس سے ہی استدلال کیا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باطل ہے، کیونکہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 530

مجاہد اور سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ہے۔ پھر اس کا معنی: اَفَلَمْ یَتَبَیَّنْ ہے، پس اگر اللہ کی مراد اس لفظ کے تحت ہے جس کے ذریعے انہوں نے اجماع کی مخالفت کی ہے تو ہماری قرأت اس پر واقع ہوگی اور اس کی تاویل آئے گی اور اگر اللہ تعالیٰ نے وہ دوسرا معنی مراد لیا ہے جس میں یاس ہے جو علم کے طریق سے نہیں تو جو اعتراض انہوں نے کیا ہے وہ ساقط ہو گیا، اور جہاں تک اس کے سقوط کا تعلق ہے تو یہ قران کو باطل کر دیتا ہے اور قران والوں پر بہتان لازم آتا ہے۔ اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ، اَنْ مخففہ من المثقلہ ہے۔ یعنی اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ، لَهَدَى النَّاسَ جَمِیْعًا یہ قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ یعنی مصیبت جو ان کو ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے پریشان کرے گی، جب کسی کو مصیبت لاحق ہو تو قرعہ أمرٌ کہا جاتا ہے، اس کی جمع قوارع ہے اور قرع میں اصل ضرب المثل ہوتی ہے شاعر نے کہا:

أَفْنَى تِلَادِي وَمَا جَمَّعْتُ مِن نَشَبٍ قَرْعُ الْقَوَاقِيزِ أَفْوَاهَ الْأَبَارِيقِ

یعنی کفار اس حالت میں رہیں گے کہ جس طرح مشرکین کے سرداروں کو استہزاء کی وجہ سے عذاب نے پکڑا تھا اسی طرح ان کو بھی بجلی کی کڑک سے ہلاک کر دینے والی مصیبت و صدمہ پہنچتا رہے گا جس طرح اربد کو لاحق ہوا تھا اسی طرح قتل، قید، قحط سالی یا اس کے علاوہ عذاب و آزمائش کی صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صدمہ انہیں ملتا رہے گا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا: القارعة کا معنی النکبة یعنی مصیبت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ نے یہ بھی کہا ہے: القارعة سے مراد وہ جنگیں اور سرایا ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بھیج دیئے تھے۔ اَوْ تَحُلُّ یا مصیبت اترتی رہے گی قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ یہ حضرت قتادہ اور حسن کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: أوتحل أنت قريباً من دارهم۔ ایک قول یہ ہے: آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے، یعنی ان پر مصیبت نازل ہوتی رہے گی پس وہ ان کے صحن میں یا ان کے بالکل قریب نازل ہوئی جس طرح مدینہ اور مکہ کے گاؤں ہیں۔ حَتّٰى یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ یعنی فتح مکہ میں، یہ حضرت مجاہد و قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ مکہ میں نازل ہوئی، یعنی ان پر مصیبت نازل ہوتی رہے گی، اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے پاس سے نکل کر مدینہ چلے جائیں گے، تو یہ مصیبت ان کے گھروں کے قریب یا ان کا محاصرہ کرتے ہوئے اترے گی اور یہ محاصرہ اہل طائف کا اور خیبر کے قلعہ کا تھا اور آپ کے پاس ان کے ساتھ جنگ اور سختی کرنے کی اجازت کے ذریعے اللہ کا وعدہ آجائے گا۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ کے وعدہ سے مراد قیامت کا دن ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَیْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ

فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝

''اور بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گزرے پس میں نے ڈھیل دی کافروں کو (کچھ عرصہ تک) پھر میں نے پکڑ لیا انہیں تو (دیکھو) کیسا (بھیانک) تھا میرا عذاب۔ کیا وہ جو نگہبانی فرمارہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ (ان کے بتوں جیسا ہے؟ ہر گز نہیں) اور ان مشرکین نے بنا لیے ہیں اللہ تعالیٰ کے شریک۔ فرمایئے: ذرا نام تو لو ان کا (نادانو!) کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو ایسی بات سے جسے وہ (ہمہ دان) ساری زمین میں نہیں جانتا یا یونہی یاوہ گوئی کر رہے ہو، بلکہ آراستہ کر دیا گیا ہے کافروں کے لیے ان کے مکر و فریب اور روک دیئے گئے ہیں راہ (راست) سے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ ان (بدبختوں) کے لیے عذاب ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بڑا سخت ہوگا اور نہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی بچانے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ۔ الاستھزاء کا معنی سورۂ ''بقرہ'' میں اور الاملاء کا معنی ''آل عمران'' میں گزر چکا ہے۔ یعنی ان کا تمسخر اڑایا گیا اور ان کے ساتھ زیادتی کی گئی، پس میں نے کافروں کو کچھ مدت مہلت دی تاکہ جو میرے علم میں تھے کہ ایمان لائیں گے وہ ایمان لے آئیں، جب قضاء پوری ہوئی تو میں نے عقوبت کے ذریعے انہیں پکڑ لیا۔ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ یعنی آپ نے کیسا دیکھا جو میں نے ان کے ساتھ کیا؟، پس آپ کی قوم کے مشرکین کے ساتھ بھی میں اسی طرح کروں گا۔

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ یہ قیام وہ نہیں جو قعود کی ضد ہوتا ہے بلکہ مخلوق کے امور کی ولایت کے معنی میں ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: قام فلان بشغل کذا، فانه قائم علی کل نفس بما کسبت یعنی وہ ہر نفس کے اعمال کی نگہبانی کرتا ہے، اسے پیدا کرتا ہے، اسے رزق دیتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے عمل پر اسے جزا دیتا ہے، معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسا حفاظت کرنے والا ہے جو غافل نہیں ہوتا، جواب محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا: کیا غافل نہ ہونے والا نگہبان اس کی طرح ہے جو غافل ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ میں قَآئِمٌ کا معنی عالم جاننے والا ہے۔ یہ اعمش کا قول ہے۔

شاعر نے کہا:

فلولا رجالٌ من قریش أعزّة　　سَرَقْتُمْ ثیابَ البیت واللّٰهُ قائمٌ

اللہ جانتا ہے کہ اگر قریش کے سرداروں کا تجھے خوف نہ ہوتا تو تم بیت اللہ کا غلاف بھی چرا لیتے۔

واللہ قائم یعنی واللہ عالم، پس اللہ تعالیٰ ہر نفس کے اعمال کو جاننے والا ہے۔ ایک قول کے مطابق ضحاک کے نزدیک: اس سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو بنی آدم کے موکل ہیں وَجَعَلُوْا حال ہے، یعنی قد جعلوا یا اسْتُهْزِئَ پر عطف ہے یعنی استھزئ

وجعلوا، یعنی انہوں نے نام رکھ دیا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ جو اللہ کے شریک ہیں، شُرَكَآءَ سے مراد وہ بت ہیں جن کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے۔ قُلْ سَمُّوْهُمْ یعنی اے محمد! آپ ان کو فرمائیے: سَمُّوْهُمْ یعنی ان کے نام تو بیان کرو، یہ دھمکی کے طور پر ہے، یعنی انہوں نے نام بھی رکھے ہوئے ہیں: لات، عزیٰ، مناۃ اور ہبل وغیرہ۔ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ۔ اَمْ استفہامیہ بطور توبیخ ہے یعنی کیا تم اسے آگاہ کرتے ہو۔ درحقیقت یہ گزشتہ استفہام پر عطف معنوی ہے، کیونکہ سَمُّوْهُمْ کا معنی ہے أَلَهُم أَسْمَاء الخَالِقِينَ۔ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ؟ ایک قول یہ بھی ہے: معنی یہ ہے کہ آپ ان کو فرمائیے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو کسی باطنی بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہو جسے وہ نہیں جانتا یا ظاہری قول کی بات کرتے ہو جسے وہ جانتا ہے، اگر وہ کہیں کہ باطن کے متعلق جس کو وہ نہیں جانتا تو یہ محال ہے اور اگر وہ کہیں ظاہر کی بات ہے جسے وہ جانتا ہے تو آپ انہیں فرمائیے: ان کے نام تو بتاؤ، پھر اگر وہ لات وعزیٰ کا نام لیں تو آپ انہیں فرمائیں: اللہ تو اپنے لیے کسی کو شریک نہیں جانتا۔ ایک قول کے مطابق: اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ کا عطف اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ پر ہے یعنی کیا وہ جو نگہبان ہے یا تم اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز سے آگاہ کرنا چاہتے ہو جس کو وہ نہیں جانتا، یعنی تم اللہ کا شریک بناتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے کسی شریک کو نہیں جانتا، کیا تم اسے زمین میں اپنے کسی شریک سے آگاہ کرتے ہو حالانکہ وہ اسے نہیں جانتا؟ اور زمین میں شریک کے ہونے کی نفی اس لیے کی ہے کہ زمین کے علاوہ کسی اور مقام پر تو اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں کیونکہ مشرکین نے زمین میں ہی اس کے شرکاء کا دعویٰ کیا ہے۔ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کا معنی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر نازل فرمایا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس کا معنی باطل ہے، اسی سے شاعر کا قول ہے:

أَعَيَّرْتَنَا أَلْبَانَهَا وَلُحُومَهَا وَذَالِكَ عَارٌ يَا بن رَيطة ظَاهِرُ

عار ظاھر سے مراد باطل ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد بکذب من القول یعنی یاوہ گوئی ہے۔ اور پانچواں احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ایک ایسی محبت ہوگی جس کو وہ اپنی گفتگو کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں اور کلام کا معنی یہ ہوگا: کیا تم اسے اس کی خبر مشاہدہ کر کے دیتے ہو یا بطور دلیل تم یہ بات کرتے ہو؛ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ یعنی اس کو چھوڑیئے، بلکہ کافروں کے لیے ان کا مکروفریب آراستہ کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس طریقے سے یہ استدراک ہے، یعنی اللہ کا کوئی شریک نہیں، لیکن کافروں کے لیے ان کا مکروفریب آراستہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے بَلْ زَيَّنَ لِلَّذِينَ كفروا مَكرَهُم پڑھا ہے یعنی فعل مجہول کے بجائے فعل معروف۔ اور جماعت کی قرات کے مطابق جس ذات نے کافروں کے لیے ان کے مکروفریب کو آراستہ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایک قول کے مطابق: وہ شیطان ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کفر کو ہی مکر کہہ دیا گیا ہو، کیونکہ رسول کے ساتھ ان کا مکر کفر ہی تھا۔ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں راہ (راست) سے روک دیا، یہ حمزہ اور کسائی کی قرات ہے جبکہ باقیوں نے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے یعنی صَدُّوا ابو حاتم نے بھی اللہ تعالیٰ کے دیگر ارشادات کی وجہ سے اسے ہی اختیار کیا ہے جیسے وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (الاعراف: 86) اور هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (الفتح: 25) اور زین اور صدوا میں ضمہ کی قرات بھی عمدہ ہے کیونکہ اہل سنت کے مذہب میں یہ معلوم بات ہے کہ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو اس آیت میں قدر کا اثبات ہے یہی ابو

عبید کا مختار ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور علقمہ نے اسے صِدُّوا صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح ھٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رِدَّتْ اِلَيْنَا میں رِدَّتْ کو را کے کسرہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے۔ ان کی اصل صُدِدُوا اور رُدِدَتْ ہے، جب پہلی دال کا دوسری دال میں ادغام کیا گیا تو اس کی حرکت ماقبل کو دی گئی تو پہلے حرف پر کسرہ آ گیا۔ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ یعنی اس کی ذلت ورسوائی کے ذریعے فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ هَادٍ سے مراد توفیق دینے والا ہے۔ اس صورت میں کوفیوں اور ان کے متبعین کی قرات کا ثبوت ہے، اس کی دلیل اللہ کا ارشاد وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ اور وَ صُدُّوا ہے، جبکہ بڑے بڑے قراء بغیر یا کے دال پر وقف کرتے ہیں، اسی طرح والٍ اور واقٍ وغیرہ کیونکہ آپ کسی آدمی کے بارے میں کہتے ہیں: ھذا قاضٍ و والٍ وھادٍ تو آپ یا کو اس کے ساکن ہونے اور تنوین کے ساتھ التقاء کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں۔ اس کو فمالہ من ھادی و والی و واقی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت کے مطابق ہوگا جو ھذا داعی و والی و واقی یا کے ساتھ پڑھتے ہیں، کیونکہ یا کا حذف تو حالت وصل میں تنوین کے ساتھ التقاء ساکنین کی وجہ سے ہوتا ہے، اور ہماری یہ قرات وقف کی صورت میں ہے، لہٰذا یا واپس لوٹ آئے گی تو ھادی، والی اور واقی ہو جائے گا۔ خلیل نے قاضٍ کی ندا کے بارے میں: یا قاضی یا کو ثابت رکھ کے کہا ہے، کیونکہ نداء کی صورت میں تنوین نہیں آتی جس طرح الداعی اور المتعالی کی صورت میں تنوین نہیں آتی۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی راہ راست سے روکے ہوئے مشرکین کے لیے دنیا میں قتل، قید و بند اور اس کے علاوہ بیماریوں اور مصائب کی صورت میں عذاب ہے۔ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ یعنی اشد زیادہ سخت، جس طرح آپ کا قول: شَقَّ علیّ کذا یشُقُّ۔ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ یعنی کوئی ایسا مانع نہیں جو انہیں اس کے عذاب سے بچا سکے اور نہ ہی کوئی دفاع کرنے والا ہے۔ اور مِن زائدہ ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۟

''اس جنت کی کیفیت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ایسی ہے کہ رواں ہیں اس کے نیچے ندیاں، اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا سایہ بھی نہیں ڈھلتا، یہ انجام ہے ان کا جو (اپنے رب سے) ڈرتے رہے اور کفار کا انجام آگ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ، مَثَلُ کے رفع میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ سیبویہ نے کہا: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے یعنی فیما یتلی علیکم مثل الجنۃ خلیل نے کہا: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، جبکہ اس کی خبر تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ہے یعنی صفۃ الجنۃ التی وعد المتقون تجری من تحتھا الانھار، جس طرح کہ تیرا قول: قولی یقوم زید میں قولی مبتدا ہے اور یقوم زید اس کی خبر، اور مَثَلُ بمعنی صفت تو موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (الفتح: 29) مثلھم سے مراد صِفَتھم ہے۔ اور وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (النحل: 60) یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے صفت علیا ہے، ابوعلی نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے: مثل بمعنی صفت سنا ہی نہیں گیا،

اس کا معنی شبہ ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اسے اس کی جگہوں اور متصرفات میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے عربوں کا قول: مررت برجل مثلك اور یوں بھی کیا جاتا ہے: مررت برجل شبهك اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ درست نہیں کیونکہ مثل کا معنی جب صفت لیا جائے گا تو تقدیر کلام ہوگا: صفة الجنة التي فيها انهار۔

اس کی جنت کی صفت جس میں نہریں ہیں، تو یہ معنی درست نہیں، کیونکہ جنت میں انھار بذات خود ہیں جنت کی صفت نہیں۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہم سے غیب چیز کی مثال ایسی چیز کے ساتھ بیان فرمائی جس کو ہم دیکھتے ہیں، معنی یہ ہوگا کہ جنت کی مثال ایسی جنت (باغ) کی طرح ہے جس کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ ابوعلی نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا: اس قول کے مطابق مثل یا صفت ہوگی یا شبہ، تو ان دونوں صورتوں میں جو کچھ کہا گیا وہ درست نہیں، کیونکہ اگر یہ بمعنی صفت ہو تب بھی صحیح نہیں کیونکہ جب آپ، ؛ صفة الجنة جنة کہیں گے تو آپ نے جنة کو خبر بنا دیا جو کہ درست نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ الجنة صفت نہیں ہوتی، اسی طرح جنت کی شبہ جنت بھی نہیں ہوتی، آپ نہیں دیکھتے کہ شبہ تو دو متماثل چیزوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلت ہوتی ہے تو یہ حدث ہے جب کہ جنت تو حدث نہیں، وہ تو پہلی اور دوسری نہیں ہوتی۔ فراء نے کہا: المثل صرف تاکید کے لیے ہے، اور معنی ہوگا: الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ اور عرب مَثَل کے ذریعے ایسا اکثر کرتے ہیں جس طرح اللہ کا ارشاد: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) یعنی لیس هو کشی ایک قول کے مطابق تقدیر پر کلام ہی صفة الجنة التي وعد المتقون۔ صفة جنة، تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے: اس جنت کا حسن، نعمت اور ہمیشہ رہنے میں مشابہت جس کا پرہیزگاروں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے، اسی طرح ہے جس طرح دوزخ کا عذاب، شدت اور ہمیشہ رہنے میں مشابہت ہے۔ یہ مقاتل کا قول ہے، أُكُلُهَا دَائِمٌ ختم نہیں ہوتا، حدیث میں ہے: ''جب ایک کھجور لے لی جائے گی تو اس کی جگہ دوسری آ جائے گی''۔ ہم (قرطبی) نے اسے ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے۔ وَظِلُّهَا یعنی اس کا سایہ بھی اسی طرح ہے۔ اس کو حذف کر دیا گیا ہے، یعنی اس کا پھل ختم نہیں ہوتا اور اس کا سایہ زائل نہیں ہوتا۔ یہ جہمی فرقے کا رد ہے جن کا خیال یہ ہے کہ جنت کی نعمت زائل بھی ہوتی ہے اور فنا بھی۔ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ یعنی مکذبین کے معاملے کی عاقبت اور ان کی آخرت دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے۔

وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ ۖ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ ﴿٣٦﴾

''اور جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ خوش ہو رہے ہیں اس کتاب پر جو نازل کی گئی آپ کی طرف اور ان لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو بعض قرآن کا انکار کرتے ہیں، فرما دیجئے: (مجھے تمہاری مخالفت کی پرواہ نہیں) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ یعنی بعض اہل کتاب قرآن کی وجہ سے خوش ہو رہے ہیں

جس طرح ابن سلام اور سلمان، اور وہ لوگ جو حبشہ سے آئے، لفظ عام ہے جب کہ مراد مخصوص۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو قرآن کے نور سے خوش ہوتے ہیں (1)۔ مجاہد اور ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔ اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کے مومن ہیں۔ ایک قول یہ ہے: یہ یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب کی ایک جماعت ہے جو نزول قرآن کی وجہ سے اس لیے خوش ہیں کہ یہ ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اکثر علماء نے کہا: ابتدائی نزول میں قرآن میں الرحمٰن کا ذکر کم تھا، جب حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں نے اسلام قبول کیا تو قرآن میں الرحمٰن کے ذکر کی کمی انھیں اچھی نہ لگی کیونکہ تورات میں ان کا ذکر زیادہ تھا۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا، تو اللہ نے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاسراء: 110) کا ارشاد نازل فرمایا۔ قریش نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا دعوت تو ایک معبود کی طرف دیتا ہے تو آج اس نے دو معبودوں کی دعوت دینا شروع کر دی، ایک اللہ اور ایک الرحمٰن، اللہ کی قسم! ہم تو سوائے یمامہ کے رحمٰن کے کسی اور کو نہیں جانتے یمامہ کے رحمٰن سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھی، تو یہ آیت نازل ہوئیں: وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (الانبیاء) وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد: 30) تو اہل کتاب رحمٰن کے ذکر کی وجہ سے خوش ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے: وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کا ارشاد نازل فرمایا۔

وَ مِنَ الْاَحْزَابِ یعنی مشرکین مکہ، اور یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں میں سے جو ایمان نہ لائے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ عرب ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد لے کر آتے رہے۔ ایک قول یہ ہے: مسلمانوں کے دشمنوں میں سے وہ مراد ہیں جو قرآن کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، چونکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ۔ اُشْرِكَ میں جماعت کی قراءت اعبد پر عطف کی وجہ سے نصب دی ہے۔ ابو خالد نے جملہ مستانفہ کی حیثیت سے اس کو مرفوع پڑھا ہے، یعنی میں عبادت کے سلسلہ میں اسے یکتا مانتا ہوں کوئی اس کا شریک نہیں اور مشرکین سے جس نے المسیح ابن اللہ، عزیر ابن اللہ کہا اور یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھنے والے سے بیزار ہوں۔ اِلَيْهِ اَدْعُوْا یعنی اس کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہوں وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ یعنی اپنے تمام اُمور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

''اور اسی طرح ہم نے اُتارا ہے اسے فیصلہ عربی زبان میں، اور اگر تم پیروی کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آچکا تمہارے پاس صحیح علم تو نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا یعنی جس طرح ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تو بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا

1۔ زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 256

اسی طرح ہم نے اسے عربی زبان میں فیصلہ نازل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت، عربیا، بیان فرمائی کیونکہ اللہ نے حضرت محمد ﷺ پر اس کو اس حالت میں نازل فرمایا کہ یہ عربی ہے، تو انھیں لوگوں نے اس فیصلے کا بھی انکار کیا۔ ایک قول کے مطابق نظم آیت ہے کہ جس طرح ہم نے رسولوں پر ان کی زبان میں کتابیں نازل کیں اسی طرح ہم نے آپ پر قران کو عربی زبان میں فیصلہ نازل فرمایا، عَرَبِيًّا سے مراد ''عربی زبان میں'' ہے۔ اور حکم سے مراد وہ احکامات ہیں جو اس میں ہیں۔ ایک قول یہ ہے: ''حکم عربی'' سے مراد سارا قران ہے کیونکہ یہ حق وباطل میں فرق اور فیصلہ کرتا ہے۔ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی عبادت اور غیر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے میں مشرکین کی خواہشات (کی اگر آپ نے پیروی کی) بَعْدَمَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ یعنی ایسا مددگار جو تیری مدد کرے گا۔ وَّلَا وَاقٍ جو تمہیں اس کے عذاب سے بچائے گا۔ خطاب حضرت محمد ﷺ کو ہے اور مراد اُمت ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝

''اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لیے بیویاں اور اولاد اور نہیں ممکن کسی رسول کے لیے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر، ہر میعاد کے لیے ایک نوشتہ ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر1۔ کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے نبی کریم ﷺ پر ازواج مطہرات کے حوالے سے نقطہ چینی کی انھوں نے کہا: ہم اس آدمی کے سوائے بیویوں اور نکاح کے کوئی خواہش نہیں دیکھتے، اگر یہ نبی ہوتا تو امر نبوت اس کو نکاح سے مشغول رکھتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کو حضرت داود و سلمان علیہما السلام کا معاملہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً یعنی ہم نے ان کو بشر بنایا اور شہوات دنیا میں جو اللہ نے حلال کیں ان کو وہ پورا کرتے ہیں ان کی تخصیص صرف وحی میں ہے (یعنی ان کے پاس وحی آتی ہے)

مسئلہ نمبر2۔ یہ آیت نکاح میں ترغیب پر دلالت کرتی ہے اور اس پر ابھارتی ہے، جبکہ تبتل یعنی ترک نکاح سے روکتی ہے، اس آیت کے مطابق یہ رسولوں کی سنت ہے اور سنت بھی اس کے معنی پر وارد ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم شادیاں کرو، میں تمہاری وجہ سے دیگر اُمتوں پہ کثرت دکھانے والا ہوں گا'' (1)۔ الحدیث، سورۂ ''آل عمران'' میں یہ گزر چکی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جس نے شادی کی اس نے نصف دین کی تکمیل چاہی پس اسے دوسرے نصف کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے'' (2)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح زنا سے بچاتا ہے اور پاکدامنی ان دو خصلتوں میں سے ہے جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے جنت کی ضمانت دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو اللہ تعالیٰ نے دو کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں داخل ہو گیا (ایک) جو دو جبڑوں کے درمیان ہے (زبان) اور (دوسرا) جو ٹانگوں کے درمیان ہے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 296، حدیث 4561
2۔ ایضاً

(شرمگاہ)''(1)۔ اس کو مؤطا اور دیگر کتب کے مصنفین نے روایت کیا ہے۔ اور صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: تین آدمیوں کا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف آیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھتے رہے، جب انہیں بتایا گیا تو گویا انھوں نے اپنی عبادت کو کم سمجھا، انھوں نے کہا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اگلے پچھلے گناہوں سے محفوظ رکھا، ان میں سے ایک نے کہا: میں ہمیشہ رات کو نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ساری زندگی روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا بس شادی نہیں کروں گا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے آپ نے فرمایا: ''تم وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ، یہ کہا، اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تمہیں اللہ سے ڈراتا ہوں اور اس کی پرہیزگاری اختیار کرنے کا حکم دیتا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ میں سے نہیں''(2)۔ امام مسلم نے اس کو بالمعنی روایت کیا، اور یہ واضح ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے کہا: اگر آپ انہیں اجازت دے دیتے تو ضرور ہم اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔ ''آل عمران'' میں بچے کی طلب پر ابھارنا اور جو اس سے ناواقف ہے اس کی تردید گزر چکی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے تھے: میں عورت کے ساتھ شادی کرتا ہوں حالانکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، اور میں اس کے ساتھ وطی کرتا ہوں حالانکہ مجھے اس کی کوئی خواہش نہیں۔ آپ کو کہا گیا: اے امیر المومنین! کون سی چیز آپ کو اس پر ابھارتی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس بات کی محبت کہ اللہ تعالیٰ مجھ میں سے وہ اولاد پیدا کرے جس کی وجہ سے قیامت کے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیگر انبیاء پر فخر کریں گے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''تمہارے اوپر باکرہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنا لازم ہے بے شک وہ منہ کے اعتبار سے بہت زیادہ میٹھی، اخلاق کے لحاظ سے بہت زیادہ عمدہ اور بچے پیدا کرنے کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوتی ہیں اور میں قیامت کے دن تمہارے ذریعے دیگر اُمتوں پر فخر کروں گا(3)۔'' انتق ارحاما سے آپ نے زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت مراد لی ہے؛ زیادہ بچے پیدا والی عورت کو ناتق کہا جاتا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت معقل بن یسار سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا: ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا: مجھے ایک حسب نسب والی عورت مل رہی ہے لیکن وہ بچے نہیں جنتی، کیا میں اس کے ساتھ شادی کر لوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ پھر وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھر منع فرمایا، پھر تیسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہت زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت کے ساتھ شادی کرو، میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دیگر اُمتوں پر فخر کروں گا''(4)۔ ابو محمد عبد الحق نے اس کو صحیح قول قرار دیا ہے۔

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الکلام، ما جاء فیما یخاف من اللسان، جلد 2، صفحہ 988

2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، الترغیب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 757

3۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 294، حدیث 44549۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب تزویج الابکار، حدیث 1850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 296، حدیث 44561

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ انھوں نے آیات کے نزول کی خواہش کی تھی جس کا ذکر اسی سورت میں ہی گزر چکا ہے۔ دوبارہ اسی کے بارے میں کلام فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا۔ کلام کا ظاہر تو ممانعت پر دلالت کرتا ہے مگر اس کا معنی نفی ہے کیونکہ جس کی کوئی استطاعت ہی نہ رکھتا ہو اس کے حوالے سے اس کو منع نہیں کیا جا سکتا۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ یعنی ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا وہ اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے، یہ حضرت حسن کا قول ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی یہ ہوگا: لکل کتاب اجل یہ فرآء اور ضحاک کا قول ہے یعنی ہر کام جس کو اللہ نے لکھ دیا ہے اس کی مدت مقرر اور وقت معلوم ہے، اس کی مثال لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ عذاب کے نازل ہونے میں قوموں کے مطالبے بنیاد نہیں ہوتے بلکہ اس کی بنیاد لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مدت کے لیے لکھی ہوئی کتاب اور اُمر مقدر ہوتا ہے جس پر فرشتے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" میں شہر بن حوشب عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور سیناء میں ارتقا فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی انگلی میں انگوٹھی ملاحظہ فرمائی تو فرمایا: اے موسیٰ! یہ کیا ہے؟ حالانکہ وہ ان سے زیادہ اس کو جانتا تھا، آپ نے عرض کیا: مرد کے زیورات میں سے ایک چیز ہے، اللہ نے فرمایا: کیا اس پر میرے اسماء یا کلام میں سے کچھ لکھا ہوا ہے؟ آپ نے عرض کیا: نہیں، تو اللہ نے فرمایا: اس پر لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ لکھ دو۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹

"مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا ہے) اور اُسی کے پاس ہے اصل کتاب"۔

قولہ تعالیٰ: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ یعنی اس کتاب سے جس کو چاہتا ہے وہ اس کے اہل پر واقع ہو اور اس کو پہنچے تو اسے مٹاتا ہے وَ يُثْبِتُ جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے یعنی اس کے وقت تک اس کو مؤخر کر دیتا ہے۔ محوتُ الکتاب محواً کہا جاتا ہے یعنی میں نے اس کا اثر ختم کر دیا۔

وَ يُثْبِتُ یعنی یثبتہ جس طرح اللہ کا ارشاد: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (الاحزاب: 35) یعنی والذاکرات اللہ۔

ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے وَ يُثْبِتُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے مشدد پڑھا ہے، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرات ہے اور زیادہ لوگوں کی قرأت ہونے کی وجہ سے ابو حاتم نے اور ابو عبیدہ نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد دلیل بھی ہے: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (ابراہیم: 27) ابن عمر نے کہا: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: "اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے سوائے سعادت، بدبختی اور موت کے" (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سوائے چند اشیاء کے جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے تخلیق، اخلاق، موت، رزق، سعادت اور شقاوت۔ آپ ہی سے مروی ہے (2): سوائے ام الکتاب کے یہ دو کتابیں ہیں، ان دونوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ وہ جس میں سے کوئی چیز

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 361
2۔ زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 259

تبدیل نہیں ہوتی۔ قشیری نے کہا: کہا جاتا ہے کہ سعادت، شقاوت، تخلیق، اخلاق اور رزق میں کوئی تبدیلی نہیں، لہٰذا آیت کریمہ ان چیزوں کے علاوہ کے بارے میں ہے اور اس قسم میں ہے گویا تحکم کی صورت پائی جاتی ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس قسم کی چیزوں کو رائے اور اجتہاد کے ذریعے نہیں جانا جاسکتا بلکہ یہ توقیفی ہوتی ہیں، پس اگر یہ صحیح ہے تو اس کے مطابق قول لازم ہوتا ہے اور اس کے ہاں روک دیا جاتا ہے ورنہ آیت تمام چیزوں کو عام ہوگی، اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ اللہ اعلم۔ اور یہ معنی حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابووائل، حضرت کعب احبار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور یہی کلبی کا قول ہے۔ حضرت ابوعثمان نہدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: یا اللہ! اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دیا ہے تو مجھے ان میں ثابت رکھ اور اگر اہل شقاوت اور گناہگاروں میں لکھ دیا ہے تو مجھے ان میں سے مٹا دے اور اہل سعادت و مغفرت میں لکھ دے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا اللہ! اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھا ہے تو ان میں مجھے باقی رکھو، اور اگر بدبختوں میں لکھا ہے تو مجھے ان میں سے مٹا دے اور سعادت مندوں میں لکھ دے، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہے باقی رکھتا ہے، اور تیرے پاس اُمّ الکتاب ہے۔ اور حضرت ابووائل اکثر دعا مانگتے تھے: یا اللہ! اگر تو نے ہمیں بدبختوں میں لکھا ہوا ہے تو مٹا دے اور سعادت مندوں میں لکھ دے، اور اگر سعادت مندوں میں لکھا ہوا ہے تو باقی رکھ، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، حضرت کعب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کہا: اگر اللہ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے میں تجھے اس سے ضرور آگاہ کر دیتا، آیت سے مراد یَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ حضرت مالک بن دینار نے جس عورت کے متعلق دعا کی تھی (یہی کہا تھا): اے اللہ! اگر اس کے پیٹ میں بچی ہے تو اسے بچے میں تبدیل فرما بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور تیرے پاس اُمُّ الْكِتٰبِ ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت گزر چکی ہے(1) کہ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس کو یہ بات خوش کرتی ہے کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے''۔ اسی طرح کی روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی ہے(2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَحَبَّ جس کو یہ بات پسند ہے'' باقی حدیث بعینہ وہی ہے یعنی پہلی روایت میں مَنْ سَرَّهٗ کے الفاظ ہیں جبکہ اس میں مَنْ اَحَبَّ کے علاوہ باقی الفاظ میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی دو تاویلیں ہیں ایک معنوی تاویل ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اچھی تعریف، عمدہ ذکر اور اجر متکرر میں سے اس کے بعد باقی رہ جائیں گی، تو ایسا ہوگا کہ گویا وہ مرا ہی نہیں۔ اور دوسری تاویل یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی اجل اور وہ اجل جس کے بارے میں اللہ کے علم میں یہ تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اس کو مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح اللہ کا ارشاد: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح روایت کی کہ آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، من بسط فی الرزق، جلد 2، صفحہ 885 2۔ ایضاً

فرمایا: ''جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی عمر اور اجل لمبی ہو جائے اور اس کے رزق میں اضافہ کر دیا جائے تو وہ اللہ سے ڈرے اور صلہ رحمی کرے'' (1)۔ تو کہا گیا کہ عمر اور اجل میں کیسے اضافہ کیا جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ عزوجل نے فرمایا: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (الانعام: 2) وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اجل کا فیصلہ کیا اور اجل اس کے ہاں مقرر ہے۔ پہلی اجل بندے کی وہ اجل ہے جو اس کی ولادت سے لیکر وفات تک ہوتی ہے جب کہ دوسری اجل یعنی جو اللہ کے ہاں مقرر ہے وہ بندے کی وفات سے لیکر اس دن تک ہے جس دن برزخ میں اس کی ملاقات ہوگی اس کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، جب بندہ تقوی اختیار کرے اور صلہ رحمی کرے تو اللہ تعالیٰ بندے کی برزخ کی اجل سے پہلی عمر کی مدت میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے اور اگر وہ نافرمانی کرے اور قطع رحمی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا میں جتنی چاہتا ہے عمر کم کرتا ہے، اور اس کی برزخی زندگی کی مدت میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ اور جب اللہ کے علم میں اس کی سابق اجل حتمی ہو تو پھر زیادتی اور کمی ممتنع ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ۝ (الاعراف) یعنی جب اس کی اجل آجائے گی تو نہ ایک لحہ تاخیر سے آئے گی اور نہ ہی پہلے۔ پس اس طرح حدیث اور آیت میں مطابقت ہوگئی۔ اور یہی نفس عمر اور اجل میں ظاہری لفظوں کے اعتبار سے اضافہ ہے اس کو حبر الأمة نے اختیار کیا ہے، واللہ اعلم۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ سال کے معاملات کا رمضان المبارک میں قطعی فیصلہ فرما دیتا ہے پس جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے سوائے زندگی و موت، اور شقاوت وسعادت کے، اس کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کراما کاتبین کے رجسٹروں سے ایسے امور جن کی کوئی ثواب وسزا نہیں ہوتی ان میں جن کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جن میں ثواب وعقاب ہوتا ہے ان کو باقی رکھتا ہے، اس کا معنی ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کلبی نے کہا: رزق میں سے مٹاتا ہے اور اضافہ کرتا ہے، اور اجل میں سے مٹاتا ہے اور اضافہ کرتا ہے، اور انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ پھر کلبی سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: وہ ساری کی ساری باتیں لکھتا ہے یہاں تک کہ جب جمعرات کا دن آتا ہے تو اس میں سے ہر اس چیز کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے جس میں ثواب وعقاب نہیں ہوتا، جیسے مثلاً تمہارا قول: میں نے کھایا، میں نے پیا، میں داخل ہوا اور میں نکلا وغیرہ اور اس گفتگو میں بندہ سچا بھی ہو، اور جن میں ثواب وعقاب ہوتا ہے ان کو باقی رکھتا ہے۔ حضرت قتادہ، ابن زید اور سعید بن جبیر نے کہا: اللہ تعالیٰ فرائض ونوافل میں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے پس انھیں منسوخ کر دیتا ہے اور بدل دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے ان کو منسوخ نہیں کرتا، اور جملہ ناسخ ومنسوخ اس کے ہاں ام الکتاب میں ہیں۔ نحاس اور مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت کیا ہے، نحاس نے کہا: حدثنا بکر بن سہل قال حدثنا ابو صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن أبی طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ قرآن سے جو چاہتا ہے تبدیل کر دیتا ہے اور اسے منسوخ کر دیتا ہے۔ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ یعنی اسے تبدیل نہیں کرتا، وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ آپ فرماتے ہیں: ناسخ ومنسوخ سب اس کے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 475

ہاں اُمّ الکتاب میں ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا: یمحو مایشاء یعنی یغفر مایشاء ہے یعنی اپنے بندوں کے گناہوں میں سے جو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور یثبت مایشاء یعنی یترک مایشاء یعنی جو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے اور معاف نہیں کرتا۔ عکرمہ نے کہا: یمحو مایشاء و یثبت یعنی توبہ کے ذریعے تمام گناہوں کو مٹاتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں لکھ دیتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا آیۃ (الفرقان: 70) حضرت حسن نے فرمایا: یمحو مایشاء یعنی جس کی اجل آجائے اسے مٹا دیتا ہے وَ یُثْبِتُ اور جس کی اجل نہ آئے اسے باقی رکھتا ہے۔ اور حضرت حسن ہی نے کہا: اباء کو مٹاتا ہے اور ابناء کو باقی رکھتا ہے۔ اور آپ ہی سے مروی ہے: کراماً کاتبین کو گناہوں میں سے کچھ بھلا دیے جاتے ہیں اور کچھ نہیں بھلائے جاتے۔ سدی نے کہا(1): یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ یعنی چاند کو مٹاتا ہے وَ یُثْبِتُ اور سورج کو باقی رکھتا ہے، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً (الاسراء: 12) پس ہم نے رات کی نشانی کو مٹایا اور دن کی نشانی کو دکھائی دینے والا بنایا۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ نیند کی حالت میں ارواح کے حوالے سے ہے، نیند کے وقت وہ اس پر قبضہ کرتا ہے، پھر جب اچانک اس کی موت کا ارادہ کرتا ہے تو اسے روک لیتا ہے، اور جس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس کو ثابت رکھتا ہے اور اسے اپنے صاحب کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ اس کا بیان اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا الایۃ (الزمر: 42) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نسلوں اور قوموں میں سے جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد: اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ (یٰس: 31) کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور ان میں جن کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد گرامی: ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ (المومنون) پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔

پس ایک نسل کو مٹاتا ہے اور دوسری نسل کو ثابت رکھتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ آدمی ہے جو عرصہ دراز تک اللہ کی اطاعت پر کاربند رہتا ہے پھر اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور گمراہی پر ہی مرجاتا ہے، پس یہی ہے جس کو وہ مٹاتا ہے اور جو باقی رہتا ہے اس سے مراد وہ آدمی ہے جو طویل عرصہ تک اللہ کی نافرمانی پر ہی عمل کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ گناہوں کے رجسٹر سے اسے مٹاتا ہے اور نیکیوں کے رجسٹر میں اسے باقی رکھتا ہے، ثعلبی اور ماوردی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ سے مراد دنیا اور یُثْبِتُ سے مراد آخرت ہے۔ قیس بن عباد نے رجب کے دسویں دن کہا: یہی وہ دن ہے جس میں اللہ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے؛ جبکہ مجاہد سے مروی روایت گزر چکی ہے کہ یہ رمضان میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی سفید پتھر سے بنی ہوئی ایک لوح محفوظ ہے جس کی مسافت پانچ سو سال کی ہے، سیاہ یاقوت کی اس کی دو جلدیں ہیں، اللہ تعالیٰ ہر روز تین سو ستر مرتبہ اسے دیکھتا ہے، جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب رات کی تین ساعتیں باقی ہوتی ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ "الذکر" کو کھولتا ہے، اس

1۔ معالم التنزیل، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 362

کتاب کو دیکھتا ہے جس کو اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا پس جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے"۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا، تو یہ مٹانا اور ثابت رکھنا ان امور میں ہوتا ہے جن کے بارے میں قضا گزر چکی ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ قضا میں وہ بھی ہوتی ہے جو حتمی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہے تو یہ ثابت ہے اور قضا کی ایک صورت ایسی ہے جو اسباب کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے یہ مٹنے والی ہے۔ واللہ اعلم۔ غزنوی نے کہا: میرے نزدیک یہ ہے کہ لوح میں بعض ملائکہ کے احاطہ کر لینے کی وجہ سے جو غیب سے نکل چکی ہو تو وہ تبدیلی کا احتمال رکھتی ہے، کیونکہ مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے سارے علم کا احاطہ کرنا محال ہے اور اشیاء کی تقدیر میں جو اللہ کے علم میں ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ یعنی وہ اصل جن میں آجال وغیرہ لکھی ہوئی ہیں۔ ایک قول یہ ہے: امّ الکتاب سے مراد وہ لوح محفوظ ہے (1) جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ بھی ہے: اس میں بھی تبدیلی جاری رہتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: یہ صرف دوسرے جرائد میں جاری رہتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امّ الکتاب (2) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کا وہ خالق ہے اور جس کو اس نے پیدا کیا ہے وہ اس کے علم کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے سو اللہ نے اپنے علم کو فرمایا: "تو کتاب بن جا، اور اللہ کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں، اور آپ ہی سے مروی ہے کہ یہ الذکر ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ (الانبیاء: 105) اور ہم نے زبور میں الذکر کے بعد لکھ دیا ہے۔ یہ اس کے معنی کو پہلے کی طرف راجع کرتا ہے اور یہی حضرت کعب کے قول کا معنی ہے۔ حضرت کعب احبار نے فرمایا: اُمُّ الْكِتٰبِ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق اور جن کا وہ خالق ہے کے بارے میں علم ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

"اور اگر ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے (تو ہماری مرضی) یا ہم (پہلے ہی) اٹھالیں آپ کو (تو ہماری مرضی) سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ (ان سے) حساب لیں۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم (ان کے مقبوضہ) علاقہ کو ہر طرف سے (رفتہ رفتہ) کم کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کوئی نہیں رد و بدل کر سکتا اس کے حکم میں، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ "ما" زائد ہے، تقدیر عبارت: وان نرينك بعض الذي نعدهم ہے اس سے مراد عذاب ہے: دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (رعد: 34) دنیوی زندگی میں ان کے لیے عذاب ہے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ (رعد: 31) یعنی اگر ہم آپ کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 362　2۔ ایضاً

اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ پس آپ پر سوائے ابلاغ یعنی تبلیغ کے کچھ نہیں۔ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ حساب سے مراد جزاء وسزا ہے۔

قولہ تعالیٰ:۔ اَوَ لَمْ يَرَوْا یعنی کیا اہل مکہ نے نہیں دیکھا۔ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ یعنی ہم اس کا قصد کر رہے ہیں۔ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ہے یعنی ان کے علماء وصلحاء کی موت کے ذریعے ہم انہیں کم کر رہے ہیں۔ قشیری نے کہا: اس بنیاد پر اطراف سے مراد اشراف ہیں۔ ابن اعرابی نے کہا: الطَّرَفُ والطِّرَف سے مراد کریم آدمی ہے، لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے، کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے: ہم ان کو ان کے معاملات میں نقصان دکھاتے ہیں، تاکہ وہ جان لیں کہ ان سے سزا کی تاخیر عجز کی وجہ سے نہیں۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو یہود ونصاریٰ کے علماء کی موت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور حسن نے کہا: اس سے مراد مشرکین کے قبضہ میں موجود چیزوں میں سے جن پر مسلمانوں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا وہ ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد بے آباد زمین ہے حتیٰ کہ اس کے ایک کونے میں آبادی ہوتی ہے۔ مجاہد سے مروی ہے: اس کے نقصان سے مراد اس کی خرابی اور اس کے اہل کی موت ہے۔ وکیع بن جراح نے عن طلحہ بن عمیر عن عطاء بن ابی رباح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کا ذکر کرتے ہوئے کہا: اس سے اس کے فقہاء اور باسیوں میں سے بہترین لوگوں کا جانا مراد ہے۔ ابوعمر بن عبدالبر نے کہا: اس آیت کی تاویل میں عطا کا قول بہت عمدہ ہے، اہل علم نے اسے تلقی قبول سے نوازا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس کو مہدوی نے مجاہد اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور یہ بذات خود پہلے قول کی نص ہے۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا سے مراد فقہاء وعلماء کی موت ہے، اور لغت میں یہ بات معروف ہے کہ الطرف ہر چیز کے بہترین اور کریم حصہ کو کہا گیا ہے۔ اور ابونصر عبدالرحیم بن عبدالکریم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال میں سے جس قول کو منتخب کیا ہے یہ اس کے برعکس ہے۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: اس سے مراد نقصان اور لوگوں کی موت ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا: اگر زمین کم ہوتی تو تجھ پر وضو کرنے کی جگہ تنگ ہو جاتی اور دوسرے نے کہا: تجھ پر وہ جگہیں تنگ ہو جاتیں جن میں تو بول و براز کرتا ہے۔

ایک قول کے مطابق: اس سے مراد قریش سے پہلے ہلاک ہونے والی قوموں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان کی زمینوں کی بربادی ہے، اور معنی یہ ہے: کیا قریش نے اپنے سے پہلے لوگوں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان کی زمینوں کی بربادی نہیں دیکھی؟ کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ کہیں ان کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو جائے؟ یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ابن مریم سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس نے زمین کی برکات، اس کے پھل اور اس کے باسیوں کو کم کر دیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے: اس نے اس سرزمین کے حکمرانوں کے ظلم کی وجہ سے اس کو کم کر دیا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ معنی صحیح ہے، بے شک ظلم وستم شہریوں کے قتل، اس زمین سے ان کے انخلاء اور زمین سے برکت

کے اُٹھ جانے کے سبب شہروں کو برباد کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ:۔ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ یعنی کوئی بھی اس کے حکم میں نقص یا تبدیلی کے ذریعے ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ یعنی کافروں سے انتقام لینے میں اور مومن کو ثواب عطا کرنے میں وہ بہت جلدی کرتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق: اسے اپنے حساب میں دل کے سوچ بچار اور انگلیوں کے پوروں پر گننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝

"اور مکاریاں کرتے رہے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، سو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ان سب کو مکر کی سزا دینا وہ جانتا ہے جو کماتا ہے ہر شخص اور عنقریب کفار بھی جان لیں گے کہ دار آخرت (کی ابدی مسرتیں) کس کے لیے ہیں۔ اور کفار کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں، فرمایئے: (میری رسالت پر) اللہ تعالیٰ بطور گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ لوگ (بطور گواہ کافی ہیں) جن کے پاس کتاب کا علم ہے"۔

قولہ تعالیٰ:۔ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی مشرکین مکہ سے پہلے، ان لوگوں نے رسولوں کے ساتھ مکر کیا، ان کے ساتھ فریب کیا اور ان کا انکار کیا۔ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا یعنی مکر کرنے والوں کا مکر اسی کا پیدا کردہ ہے، لہٰذا اس کے اذن کے بغیر کوئی نقصان نہیں دیتا۔ ایک قول کے مطابق: فللّٰہ خیر المکر، یعنی وہ ان کو اس کی سزا دے گا۔ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ یعنی خیر اور شر میں سے جو کوئی کرتا ہے وہ جانتا ہے پس اس پر وہ سزا دے گا۔ وَيَعْلَمُ الكافر نافع، ابن کثیر اور ابو عمر کی یہی قرأت ہے جبکہ باقیوں نے الکفار پڑھا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کو مراد لیا ہے۔ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی ثواب وعقاب کے اعتبار سے دار دنیا کا انجام یا یہ مراد ہے کہ دار آخرت میں ثواب و عقاب کس کے لیے ہے، یہ تہدید اور وعید ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا حضرت قتادہ نے کہا(1): یہ عرب کے مشرکین تھے۔ لَسْتَ مُرْسَلًا یعنی تو نہ نبی ہے اور نہ رسول تو صرف جھوٹ بولنے والا ہے (نعوذ باللہ) وہ کسی چیز کا مطالبہ کرتے تو پورا نہ ہونے کی صورت میں یہ کہتے۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما دیجیے۔ كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی کفی اللہ، اللہ کافی ہے۔ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ یعنی میری سچائی اور تمہارے جھوٹ پر بطور گواہ کافی ہے۔ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ یہ مشرکین مکہ کے خلاف بطور حجت ہے، کیونکہ وہ تفاسیر میں اہل کتاب کے ایمانداروں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک قول کے مطابق: ان کی گواہی مدمقابل کے قول کے لیے قاطع ہوتی تھی اور وہ اہل کتاب کے مومن ہیں جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت سلمان فارسی، حضرت تمیم داری، حضرت نجاشی اور اس کے دوست، یہ حضرت قتادہ اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت کیا: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی کوشش کی گئی تو حضرت عبداللہ بن سلام آئے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 119

توحضرت عثمان نے انہیں کہا: کیا لے کے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: میں آپ کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں مجھ سے دور کرو، آپ کا باہر ہونا میرے لیے اندر ہونے سے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام لوگوں کے پاس گئے اور کہا: اے لوگو! زمانہ جاہلیت میں میرا نام فلاں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام عبداللہ رکھا، میرے بارے میں کتاب اللہ کی کچھ آیات نازل ہوئی ہیں: وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الاحقاف) بنی اسرائیل کے ایک گواہ نے اپنے جیسے آدمی کے خلاف گواہی دی، پس وہ ایمان لایا اور تم نے تکبر کیا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ میرے بارے میں نازل ہوئی ہے اور قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ آیت کریمہ میرے متعلق نازل ہوئی ہے۔ الحدیث۔ اور ہم (قرطبی) نے یہ پوری حدیث کتاب ''التذکرہ'' میں لکھ دی ہے۔ اس کے بارے میں ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: ہذا حدیث حسن غریب۔ زمانہ جاہلیت میں آپ کا نام حصین تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ رکھا۔ ابوبشر نے کہا: میں نے سعید بن جبیر کو کہا: وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ کس کے بارے ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ حضرت عبداللہ بن سلام ہیں (1)۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت عبداللہ بن سلام کیسے مراد ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ سورت مکی ہے اور حضرت عبداللہ بن سلام نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے؟ ثعلبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ قشیری نے کہا: ابن جبیر نے کہا کہ سورت مکی ہے اور حضرت ابن سلام نے اس سورت کے نزول کے بعد مدینہ میں اسلام قبول کیا، لہٰذا اس آیت کو ابن سلام پر محمول کرنا درست نہیں۔ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے جبریل امین مراد ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: اور وہ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ پڑھتے تھے اور جو یہ کہتا کہ یہ حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ہیں اس کا یہ انکار کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق سورت مکی ہے اور انہوں نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ پڑھا، اگرچہ روایت میں ضعف ہے۔ اس کو سلیمان بن ارقم نے عن الزہری عن سالم عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے اور محبوب نے اسمٰعیل بن محمد یمانی سے روایت کیا ہے آپ نے اسی طرح پڑھا ہے یعنی وَ مَنْ عِنْدَهٗ میم، عین اور دال کے کسرہ کے ساتھ عِلْمُ الْكِتٰبِ عین کے ضمہ اور کتاب کے رفع کے ساتھ۔ عبداللہ بن عطا نے کہا: میں نے ابوجعفر بن علی بن حسین بن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ صرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، محمد بن حنفیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ایک قول کے مطابق: سارے مومنین مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے کہا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، تو اس کو دو صورتوں میں سے کسی ایک پر محمول کیا جائے گا یا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کے نزدیک وہ سب مومنین سے زیادہ عالم ہوں گے جبکہ معاملہ ایسا نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ان سے زیادہ عالم تھے یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 365۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورۃ الاحقاف، حدیث نمبر 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارشاد أنا مدینة العلم وعلی بابها (1) کی وجہ سے تو یہ روایت باطل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم علم کا شہر ہیں اور آپ کے صحابہ اس کے دروازے، علوم میں قدر و منزلت کے مطابق ان میں سے کچھ کھلے دروازے ہیں اور کچھ درمیانی درجے کے البتہ جس نے کہا ہے کہ سارے مومنین مراد ہیں اس نے صحیح کہا، کیونکہ ہر مومن کتاب کو جانتا ہے، اس کے اعجاز کی وجہ کا ادراک رکھتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس بنیاد پر کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اور جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو مراد لیا ہے اس نے ترمذی کی حدیث پر بھروسہ کیا ہے، اور یہ ممتنع نہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں کوئی بات نازل ہوئی ہو اور مراد سارے مومنین ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ذکر سب کافروں کا ہے اور مراد قریش ہیں، پس جن کے پاس کتاب کا علم ہے وہ یہود و نصاریٰ کے مومنین ہو سکتے ہیں یعنی وہ لوگ وہ ہیں جو بتوں کی پوجا کرنے والوں کی نسبت نبوت اور کتاب کی معرفت کے زیادہ قریب ہیں۔ نحاس نے کہا: اور جس آدمی نے کہا کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر ہیں تو اس کی بات کا احتمال بھی ہے کیونکہ جب دلائل بھی صحیح ہوں اور یہ بھی معروف ہو کہ نزول قرآن سے پہلے وہ کتابوں کو پڑھتے تھے تو بات اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 1114

سورۂ ابراہیم

آیاتہا ۵۲ ۔ ۱۴ سُوْرَۃُ اِبْرٰہِیْمَ مَکِّیَّۃٌ ۷۲ ۔ رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت حسن، عکرمہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کے نزدیک ساری سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ نے کہا: سوائے دو آیتوں کے باقی ساری سورت مکی ہے جب کہ دو آیات مدنی ہیں، جب کہ ایک قول کے مطابق تین آیات (مدنی) ہیں جو ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کی وہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا سے لے کر فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۞ تک ہیں۔

الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۞

''الف، لام، را، یہ (عظیم الشان) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے آپ کی طرف تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نور (ہدایت و عرفان) کی طرف ان کے رب کے اذن سے (یعنی) عزیز و حمید کے راستہ کی طرف''۔

قولہ تعالیٰ: الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ یعنی آپ نکالیں کتاب کے ذریعے اور وہ قرآن ہے، یا اس کی طرف بلانے کے ذریعے لوگوں کو نکالیں۔ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ یعنی کفر، گمراہی اور جہالت کی تاریکیوں سے ایمان اور علم کے نور کی طرف اور یہ بطور تمثیل ہے، کیونکہ کفر بمنزلہ ظلمت اور اسلام بمنزلہ نور ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: بدعت سے سنت اور شک سے یقین کی طرف۔ سب کا معنی قریب قریب ہے۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق ملنے سے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بِاِذْنِ رَبِّهِمْ میں با تخرج کے متعلق ہے اور فعل کی اضافت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس لیے ہے کیونکہ دعوت دینے والا اور ڈرانے والا ہادی ہوتا ہے۔ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ عزیز اور حمید کے درمیان واؤ اس لیے نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں جس طرح خرجتُ إلی زید العاقل الفاضل عاقل و فاضل کے درمیان واؤ نہیں کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور اللہ وہ بے مثل ذات ہے جس کے کوئی مثل اور مشابہ نہیں۔ اور ایک قول یہ ہے الْعَزِيْزِ سے مراد وہ ذات ہے جس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ ایک قول کے مطابق الْعَزِيْزِ سے مراد اپنی ملکیت اور سلطنت میں کنٹرول کرنے والا ہے۔ الْحَمِيْدِ یعنی جس کی ہر زبان کے ذریعے تعریف کی گئی ہو، اور ہر حال میں ہر جگہ میں جس کی شان بیان کی جاتی ہو۔ مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور کچھ نے آپ کا انکار کیا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا تھا وہ

آپ پر ایمان لے آئے، اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے آپ کا انکار کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی، اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَ وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِۨ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۳

''وہی اللہ جس کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بربادی ہے کفار کے لیے سخت عذاب کے باعث جو پسند کرتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت (کی ابدی زندگی) پر اور (دوسروں کو بھی) روکتے ہیں راہ خدا سے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس راہ راست کو ٹیڑھا بنا دیں یہ لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یعنی ملکیت، بندگی، ایجاد اور تخلیق کے اعتبار سے آسمان و زمین کی سب چیزیں اللہ کی ہیں۔ نافع، ابن عامر اور دیگر قراء نے لفظ اللہ کو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ الَّذِيْ اس کی خبر ہوگی۔ جب کہ یہ بھی کہا گیا ہے الَّذِيْ اس کی صفت ہے اور خبر مضمر ہوگی، یعنی اللہ الذی لہ مافی السموات والأرض قادر علی کل شیٔ اور باقیوں نے الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ کی صفت کی بنیاد پر مجرور پڑھا ہے تو اس صورت میں صفت موصوف سے مقدم ہوگی، جیسے آپ مررت بالظریف زید کہتے ہیں (یعنی زید موصوف اور ظریف صفت ہے) یہ بھی قول ہے کہ صفت نہیں بلکہ الْحَمِيْدِ سے بدل ہے، کیونکہ اللہ کا اسم علم بن چکا ہے لہٰذا اس کی صفت کی ضرورت نہیں ہوگی البتہ معنوی اعتبار سے اس کی صفت بیان ہوسکتی ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جو قدرت ایجاد کے ذریعے منفرد ہے۔ ابو عمرو نے کہا: تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے یہ مجرور ہوگا یعنی إلی صراط اللہ العزیز الحمید الذی لہ مافی السموات ومافی الأرض۔

اور یعقوب الحمید پر وقف کی صورت میں اور وصل کی صورت میں جر دیتے ہیں۔ ابن انباری نے کہا: جس نے خبر دی ہے اس نے وَمَا فِي الْاَرْضِ پر وقف کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ویل کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ زجاج نے کہا: یہ ایسا کلمہ ہے جو عذاب اور ہلاکت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ یعنی جہنم میں۔ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا یعنی وہ دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں اختیار کرتے ہیں اور یہ کافروں کا طریقہ ہے۔ الَّذِيْنَ کافروں کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ ایک قول کے مطابق مضمر مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی ھم الذین۔ ایک قول یہ بھی ہے: الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ مبتدا ہے اور اس کی خبر اولئک ہے۔ ہر وہ آدمی جس نے دنیا اور اس کی لذات کو آخرت پر ترجیح دی، دنیا کی نعمتوں میں باقی رہنے کو آخرت میں ملنے والی نعمتوں کے مقابلے میں پسند کیا اور لوگوں کو اللہ اور اس کے دین سے جو اللہ کے رسول لے کر آئے پھیرا وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس آیت میں داخل ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 121

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اپنی امت کے حوالے سے جو خوف ہے اس میں سب سے زیادہ خوف گمراہ ائمہ کا ہے"۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ان ادوار کی نسبت اب یہ بہت زیادہ ہے(1)۔ واللہ المستعان۔

ایک قول یہ ہے: یَسْتَحِبُّوْنَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اللہ کی نعمت اس کی اطاعت کے ذریعے ہی حاصل کی جاتی ہے مصیبت اور نافرمانی کے ذریعے نہیں۔

وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اپنی خواہشات اور حاجات واغراض کو پورا کرنے کے لیے اللہ کے راستے کو ٹیڑھا کر دیں۔ السبیل مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے، دین، امر، ارض اور ہر وہ چیز جو قائم اور کھڑی نہ ہو تو اس میں العوج عین کے کسرہ کے ساتھ آتا ہے، جب کہ وہ چیزیں جو سیدھی کھڑی ہوتی ہے جیسے دیوار اور نیزہ وغیرہ ان کے لیے عین کے فتح کے ساتھ آتا ہے، سورۂ آل عمران اور دیگر مقامات پر یہ گزر چکا ہے۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ یعنی وہ حق سے دور ہیں۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لیے (احکام الٰہی کو) پس گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب، بہت دانا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیک وسلم! آپ سے پہلے ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا۔ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ، تاکہ وہ ان کے سامنے ان کے دین کے معاملات کو کھول کر بیان کریں۔ اور لسان کا قوم کی طرف مضاف ہونے کے باوجود واحد ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس سے مراد لغت ہے۔ اور یہ اسم جنس ہے قلیل وکثیر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس آیت میں عجم وعرب کے لیے کوئی حجت نہیں، کیونکہ ہر وہ آدمی جس کے سامنے نبی کے لائے ہوئے پیغام کو ایسے ترجمے کے ساتھ پیش کیا جائے جو اس کو سمجھ آتا ہو تو اس سے حجت لازم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (سبا:28) اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور بروقت خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر نبی کو اس کی امت کی طرف اس کی زبان کے ساتھ بھیجا گیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ہر سیاہ وسرخ کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! مجھے اس امت کے جس بھی یہودی اور نصرانی نے سنا اور پھر میرے لائے ہوئے پیغام پر ایمان نہ لایا تو وہ دوزخی ہے"(2)۔ اس روایت کو امام مسلم نے بیان کیا ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یہ مشیت کے نفاذ کے حوالے سے قدریہ کا رد ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ لیبین پر

1۔ کنز العمال، کتاب الاکمال، جلد 10، صفحہ 188، حدیث 28986

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، وجوب الایمان برسالۃ نبینا، جلد 1، صفحہ 86

اس کا عطف نہیں، کیونکہ ارسال ہوتا ہی تبیین کے لیے ہے گمراہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ اور یضل کو منصوب پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ ارسال اضلال کا سبب ہو سکتا ہے، تو یہ اسی طرح ہوگا جیسے الله کا ارشاد: لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا (القصص: 8) پس ارسال، اضلال کا سبب ہوگا کیونکہ جب آپ ان کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کا انکار کر دیا، تو یہ ایسا ہی ہوا گویا کہ یہ ان کے کفر کا سبب بن گیا۔ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ⑤

اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ (اور انہیں حکم دیا) کہ نکالو اپنی قوم کو (گمراہی کے) اندھیروں سے نور (ہدایت) کی طرف اور یاد دلاؤ انہیں الله تعالیٰ کے دن یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بہت صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا آیات سے مراد حجت و براہین ہیں یعنی ہم نے موسیٰ کو اپنی سچائی پر دلالت کرنے والے معجزات کے ساتھ بھیجا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ (نشانیاں) نو آیات ہیں (1)۔ أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ اس کی مثال سورت کے آغاز میں ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں الله کا یہ ارشاد ہے کہ: لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ایک قول کے مطابق أَنْ بمعنی أی ہے جس طرح الله تعالیٰ کا ارشاد: وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا (ص: 6) یعنی ای امشوا۔

قولہ تعالیٰ: وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ یعنی انہیں ایسی بات کہو جس کی وجہ سے انہیں الله تعالیٰ کے ایام یاد آئیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا: یعنی ان کو ان پر ہونے والی الله تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلاؤ (2)، اس کو حضرت ابی بن کعب نے بیان فرمایا اور مرفوعاً روایت کیا ہے یعنی انہیں فرعون اور وادی تیہ سے نجات دلا کر الله نے جو نعمت فرمائی وہ اور دیگر نعمتیں انہیں یاد دلاؤ۔ بعض اوقات نعمتوں کو ایام کا نام دے دیا جاتا ہے، اسی سے عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

وأيامٍ لنا غُرٍّ طوالِ

اس میں ایام سے مراد نعمتیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل سے مروی ہے: اس سے مراد سابقہ امتوں میں الله تعالیٰ کی طرف سے ہونے والے واقعات ہیں (3)، جیسے کہا جاتا ہے: فلان عالم بایام العرب یعنی فلاں عرب کے واقعات کو جانتا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں گزشتہ امتوں سے انتقام لیا گیا۔ اسی طرح ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے: اس سے مراد الله کی آزمائش اور امتحان ہے۔ طبری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں ماضی کے ایام میں ہونے والے معاملات کی نصیحت کی یعنی الله کے ایام میں جو نعمتیں اور آزمائش تھیں وہ یاد دلائیں۔ اور اس وقت وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا غلام تھے اور صرف

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 122　2۔ ایضاً　3۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 367

الایام کے ذکر پر اللہ تعالیٰ نے اکتفاء فرمایا کیونکہ وہ ان کے نزدیک معروف و معلوم تھے۔

حضرت سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے آپ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے درمیان اللہ تعالیٰ کے ایام کی یاد دلا رہے تھے اور اللہ کے ایام سے مراد اس کی آزمائش اور نعمتیں ہیں۔ اور حدیث خضر کا ذکر کیا۔ یہ آیت کریمہ دلوں کو نرم کرنے والے، یقین کو مضبوط کرنے والے، ہر بدعت سے خالی اور ہر قسم کی گمراہی اور شکوک و شبہات سے منزہ وعظ کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ یعنی اللہ تعالیٰ کے ایام کی تذکیر میں لَاٰیٰتٍ یعنی دلائل ہیں۔ لِّكُلِّ صَبَّارٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اور اس کی نافرمانی سے بہت زیادہ صبر کرنے والے کے لیے شَكُوْرٍ اللہ کی نعمتوں کا بہت زیادہ شکر کرنے والے کے لیے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: یہ وہ بندہ ہے کہ جب اسے عطا کیا جائے تو شکر کرے اور جب آزمائش میں مبتلا کیا جائے تو صبر کرے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایمان دو نصف پر مشتمل ہے نصف صبر اور نصف شکر پر'' (2)۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ کی تلاوت فرمائی۔ شعبی سے بھی اسی قسم کی موقوف روایت مروی ہے۔ حضرت حسن بصری حجاج سے سات سال تک پوشیدہ رہے (3) جب آپ کے پاس اس کی موت کی خبر پہنچی تو آپ نے عرض کیا: یا اللہ! تو نے اسے موت دے دی تو اس کے طریقوں کو بھی موت دے دے، پھر آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ پڑھی۔ آیات کو ہر بہت زیادہ صبر اور شکر کرنے والے کے ساتھ خاص کیا کیونکہ وہی ان کے ذریعے عبرت حاصل کرتے ہیں اور ایسی باتوں سے غافل نہیں ہوتے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا ۝ (النازعات) آپ صرف اسے ڈراتے ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں، اگرچہ نبی تو سب کو ڈرانے والا ہوتا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝

''اور جب فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو کہ یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت (و احسان) کو جو تم پر ہوا جب اس نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب اور ذبح کرتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے اور یاد کرو جب (تمہیں) مطلع فرمایا تمہارے رب نے (اس حقیقت سے) کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب شدید ہے''۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 122 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 36، حدیث 726

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ کی تفسیر سورۃ بقرہ میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ ایک قول کے مطابق: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو ارشاد ہے۔ اور ایک قول کے مطابق: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرو جب آپ کے رب نے یہ ارشاد فرمایا ہے: تاذن اور اذن بمعنی اعلم ہے جس طرح أوعد اور توعد۔ یہ معنی حضرت حسن بصری وغیرہ سے مروی ہے اسی سے الأذان ہے، کیونکہ یہ اعلام ہے۔ شاعر نے کہا:

فلم نَشْعُر بِضَوءِ الصبح حتی　　سمِعنا فی مجَالِسِنا الأَذِینَا (1)

ہمیں صبح کی روشنی کا احساس نہ ہوا حتیٰ کہ ہم نے اپنی مجلسوں میں اذان سنی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ پڑھتے تھے، معنی ایک ہی ہے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ یعنی اگر تم میرے انعامات پر شکر ادا کرو گے تو میں اپنے فضل میں اضافہ کروں گا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اگر تم میری نعمت پر شکر ادا کرو گے تو میں اپنی اطاعت کو تمہارے اندر زیادہ کر دوں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر تم موحد ہو گے اور اطاعت کرو گے تو میں تمہارے ثواب میں اضافہ کروں گا، ان تمام اقوال میں معنی قریب قریب ہے۔ آیت کریمہ اس بات کے حوالے سے نص ہے کہ شکر اضافہ کا سبب ہے سورۂ بقرہ میں علماء کے شکر کے بیان کردہ معانی گزر چکے ہیں۔ کسی صحابی سے اللہ تعالیٰ سے شکر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تو اللہ کی نعمتوں کے ذریعے اس کی نافرمانی پر قوی نہ ہونا۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے بیان کیا گیا ہے (2) کہ آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں کیسے تیرا شکر ادا کروں؟ اور میرا شکر ادا کرنا تیری طرف سے میرے اوپر نعمت کی تجدید ہوتا ہے۔ (اللہ) نے فرمایا: اے داؤد! اب تو نے میرا شکر ادا کیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس بنیاد پر شکر کی حقیقت یہ ہے کہ منعم کی نعمت کا اعتراف کیا جائے۔ اور اپنے بدن کو اس کی اطاعت کے علاوہ میں بندہ صرف نہ کرے۔ اور ہادی نے کھانا کھاتے ہوئے شعر کہا ہے:

أنالكَ رِزقَه لتقومَ فیہ　　بطاعتِہ و تشکرَ بعض حقِّہ

فلم تشکرْ لِنعمتِہ ولکِنْ　　قَوِیتَ علی معاصِیہ برزقہ

یہ شعر اسی سابقہ معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: جب تو نعمت شکر کے بارے میں سنے تو مزید کے لیے تیار ہو جا۔ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ یعنی اگر تم نے میرے حق کا انکار کیا۔ ایک قول کے مطابق: اللہ کی نعمتوں کا کفران مراد ہے (3)۔ اللہ تعالیٰ نے کفران نعمت یا کفر پر عذاب کا وعدہ فرمایا ہے، جس طرح شکر کی صورت میں اضافے کا وعدہ فرمایا ہے اور ان سے فاشرطیہ مشہور ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 123　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۬ۛؕ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝

''نیز (یہ بھی) فرمایا موسیٰ نے: اگر تم ناشکری کرنے لگو (صرف تم ہی نہیں بلکہ) جو بھی سطح زمین پر ہے (ناشکری کرے) تو بے شک اللہ تعالیٰ غنی (اور) سب تعریفوں کا مستحق ہے۔ کیا نہیں پہنچی تمہیں اطلاع ان (قوموں) کی جو پہلے گزر چکی ہیں یعنی قوم نوح اور عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد گزرے، نہیں جانتا انہیں مگر اللہ تعالیٰ، لے آئے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں پس انہوں نے (از راہ تمسخر) ڈال لیے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں اور (بڑی بے باکی سے) کہا: ہم نے انکار کیا اس دین کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اور جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی (صداقت کے بارے میں) ہم شک میں ہیں جو تذبذب میں ڈالنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ یعنی تمہاری اس کارروائی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان نہیں، بلکہ وہ غنی ہے۔ الحمید بمعنی المحمود ہے۔

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ، النبأ کا معنی خبر ہے اس کی جمع الانباء ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اَلَمْ یَاْتِیكَ وَالْاَنْبَاءُ تَنْمِی

ایک قول کے مطابق: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جب کہ ایک قول یہ ہے: یہ اللہ کے ارشادات میں سے ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرو جب آپ کے رب نے یوں فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی ابتدا اور حضرت نوح، حضرت عاد اور حضرت ثمود علیہم السلام کی قوم کی مشہور خبر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ان کی تعداد کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی ان کے نسب کو جانتا ہے اور نسبت بیان کرنے والے اگرچہ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں تاہم وہ بھی تمام قوموں کے اُحصاء کا دعویٰ نہیں کر سکتے بعض کا نسب بیان کرتے ہیں اور بعض کا بیان نہیں کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب نسب بیان کرنے والوں نے انہیں معد بن عدنان کی طرف منسوب کیا اور مزید اضافہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ بولا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، سوائے اللہ کے انہیں کوئی نہیں جانتا'' (1)۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: عدنان و اسماعیل کے درمیانی نسب کو جاننے والا ہم نے نہیں پایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا (2): عدنان و اسماعیل کے درمیان تیس باپ ہیں جو معروف نہیں ہیں۔ حضرت ابن

1۔ کنز العمال، کتاب الاکمال، العلوم المذمومة، جلد 10، صفحہ 218، حدیث 29157 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 124

مسعود رضی اللہ عنہ جب لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللهُ پڑھتے تو فرماتے (1): نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ بولا ہے۔ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنٰتِ یعنی حجتوں اور دلائل کے ساتھ فَرَدُّوٓا اَيْدِيَهُمْ فِيٓ اَفْوَاهِهِمْ یعنی ان لوگوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈال لیے تا کہ رسول کے لائے ہوئے پیغام کی وجہ سے وہ ان کو کاٹ لیں، کیونکہ اس پیغام میں ان کی بے وقوفیوں اور ان کے بتوں کی برائیوں کا بیان تھا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور عبد الرحمٰن بن زید نے بھی اس کی مثل بات کی ہے۔ اور عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (آل عمران: 119) کی تلاوت کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب انہوں نے کتاب اللہ کو سنا تو متعجب ہوئے اور اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں ڈال دیا۔ حضرت ابو صالح نے کہا (2): جب انہیں ان کے نبی نے فرمایا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں تو انہوں نے اپنی انگلیوں سے اپنے مونہوں کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش ہو جا، مقصود رسول کی تکذیب اور ان کی بات کو رد کرنا تھا، یہ تینوں قول قریب المعنی ہیں اور دونوں ضمیریں کفار کے لیے ہیں، اور سند کے اعتبار سے پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حدثنا عبد الرحمن بن مهدی عن سفیان عن ابی اسحاق عن ابی الاحوص عن عبد اللہ۔

ابو عبید نے اس سند کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَرَدُّوٓا اَيْدِيَهُمْ فِيٓ اَفْوَاهِهِمْ کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ غصے سے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے، شاعر نے کہا ہے:

لو أن سَلْمَى أَبْصَرَتْ تَخَدُّدِی ودِقَّةً فی عظمِ ساقی ویَدِی
وبُعْدَ أَهْلِی وجَفَاءَ عُوَّدِی عَضَّتْ من الوَجْدِ بأطرافِ الیدِ

یعنی اگر وہ ان سب چیزوں کو دیکھ لے تو غصے سے ہاتھ کے پوروں کو کاٹ لے (تو گویا غصے سے ایسا ہوسکتا ہے)

سورۂ آل عمران میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ حضرت مجاہد و قتادہ نے کہا: انہوں نے اپنی بات رسولوں پر لوٹائی اور اپنے مونہوں سے ان کی تکذیب کی، پہلی ضمیر رسولوں کے لیے ہے اور دوسری کفار کے لیے۔

حضرت حسن وغیرہ نے کہا ہے: انہوں نے اپنے ہاتھ رسولوں کے مونہوں پر رکھے، مقصود ان کی بات کی تردید تھی، اس صورت میں پہلی ضمیر کفار کے لیے اور دوسری رسولوں کے لیے ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے: انہوں نے رسولوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مقاتل نے کہا: انہوں نے رسولوں کے ہاتھ پکڑے اور انہیں خاموش کرنے کے لیے اور گفتگو کو ختم کرنے کے لیے اپنے ہاتھ اپنے رسولوں کے مونہوں پر رکھ دیئے۔ ایک قول یہ بھی ہے: رسولوں نے قوم کے ہاتھ ان کے مونہوں پر لوٹا دیئے۔ ایک قول یہ ہے: یہاں ہاتھوں سے مراد نعمتیں ہیں، یعنی رسولوں کی نعمتوں کو انہوں نے اپنے مونہوں کے ذریعے رد کر دیا۔ مونہوں کے ساتھ رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو اور تکذیب کر کے تردید کی۔ اور رسولوں کا شریعتیں لے کر آنا نعمتیں ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ رسول جو لے کر آئے انہوں نے اپنے مونہوں کے ذریعے ان کی تکذیب کی۔ اور فی بمعنی با ہوگا، جیسے کہا جاتا ہے: جلست فی البیت و بالبیت اور حروف صفات ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے ہیں۔

1۔ تفسیر کشاف، سورۂ ابراہیم، جلد 2، صفحہ 542 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 124

ابو عبید نے کہا: یہ ضرب المثل ہے، مراد یہ ہے کہ وہ ایمان نہ لائے اور انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور جب کوئی آدمی جواب نہ دے اور خاموشی اختیار کر لے تو عرب کہتے ہیں: قد ردّ یدہ فی فیہ۔ یہ اخفش کا بھی قول ہے۔ قتیبی نے کہا: ماموربہ کو ترک کرنے کی وجہ سے عربوں میں سے کسی سے بھی ہم نے یہ نہیں سنا کہ وہ یہ کہتے ہوں: ردّ یدہ فی فیہ لہٰذا معنی یہ ہوگا: انہوں نے غصے و ناراضگی سے ہاتھوں کو کاٹا۔ شاعر کا قول بھی ہے:

تَرُدّون فی فِیهِ غِشَّ الْحَسُود حتی یَعَضّ عَلَیَّ الأکُفَّا

''یعنی وہ حسد کرنے والوں کے ساتھ دشمنی اور غصے کا اظہار کرتے ہیں حتی کہ وہ اپنی انگلیوں اور ہتھیلی کو کاٹتا ہے''۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قَدْ أَفْنَی أَنَامِلَهُ أَزْمَةٌ فَأَضْحَی یَعَضُّ علیَّ الْوَظِیفَا

انہوں نے کہا: امتوں سے مراد رسولوں کی امتیں ہیں (1)۔ اِنَّا کَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ۔ اس میں انہوں نے ان کے رسول ہونے کا اقرار نہیں کیا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے گمان کے مطابق جس دین کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اس کا ہم نے انکار کیا۔ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ یعنی شکوک وشبہات اور تردد میں مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ یعنی توحید مُرِیْبٍ یعنی جو شک کا باعث ہے۔ جب تو کوئی ایسا کام کرے جو تردد اور شک کا باعث بنے تو اربتہ کہا جاتا ہے، یعنی ہمارا خیال ہے کہ تم بادشاہی اور دنیا کے طالب گار ہو۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۰

''ان کے پیغمبروں نے پوچھا: کیا (تمہیں) اللہ تعالیٰ کے متعلق شک ہے جو پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا جو (اتنا کریم ہے کہ) بلاتا ہے تمہیں تاکہ بخش دے تمہارے گناہ اور جو (اتنا مہربان ہے کہ پیہم نافرمانی کے باوجود) تمہیں مہلت دیتا ہے ایک مقررہ میعاد تک، ان (نادانوں نے) جواب دیا: نہیں ہو تم مگر بشر ہماری طرح تم یہ چاہتے ہو کہ روک دو ہمیں ان (بتوں) سے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے، پس لے آؤ ہمارے پاس کوئی روشن دلیل''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ استفہام بمعنی انکار ہے، کیا اللہ تعالیٰ کی توحید میں کوئی شک نہیں، یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اللہ کی توحید نہیں بلکہ اللہ کی اطاعت ہے یعنی اللہ کی اطاعت میں کوئی شک نہیں۔ اور اس میں ایک تیسرا احتمال بھی ہے، یعنی کیا اللہ کی قدرت میں شک ہے؟ کیونکہ وہ اس بات پر متفق تھے جبکہ اس کے علاوہ دیگر صورتوں میں ان کا اختلاف ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد (2): فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بھی دلالت کرتا

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 369
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 125

ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کرنے والا، بنانے والا اور عدم کے بعد ان کو وجود بخشنے والا ہے، اس ارشاد سے مقصود اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آگاہ کرنا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں۔

یَدْعُوْكُمْ یعنی رسولوں اور کتابوں کے ذریعے اس کی اطاعت کی طرف وہ تمہیں دعوت دیتا ہے۔ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ ابوعبید نے کہا: من زائدہ ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ تبعیضیہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض کو ذکر کر کے مراد سارے ہوں۔ ایک قول کے مطابق من بدل کے طور پر ہے نہ زائدہ ہے اور نہ تبعیضیہ، یعنی مغفرت گناہوں کے بدلے میں ہو جائے۔ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اس سے مراد موت ہے۔ پس وہ تمہیں دنیا میں عذاب نہیں دے گا۔ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ، ان بمعنی ما ہے۔ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا یعنی ہیئت اور صورت میں، تم وہی کھاتے ہو جو ہم کھاتے ہیں اور تم وہی پیتے ہو جو ہم پیتے ہیں اور تم فرشتے نہیں۔ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا مراد بت وغیرہ ہیں۔ فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اس سے مراد حجت ظاہری ہے۔ یہ ان سے محال تھا، کیونکہ رسول بغیر معجزات کے دعوت نہیں دیتے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ⑫

”کہا انہیں ان کے رسولوں نے کہ ہم تمہاری طرح انسان ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے، اور ہمیں یہ طاقت نہیں کہ ہم لے آئیں تمہارے پاس کوئی دلیل بجز اذن خداوندی اور مومنوں کو فقط اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے اور ہم کیوں نہ بھروسہ کریں اللہ تعالیٰ پر حالانکہ اس نے دکھائی ہیں ہمیں ہماری (کامیابی کی) راہیں اور ہم ضرور صبر کریں گے تمہاری اذیت رسانیوں پر۔ پس اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو“۔

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یعنی جس طرح تم کہتے ہو ہم صورت اور ہیئت میں تمہاری طرح ہیں۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ یعنی جس پر چاہتا ہے نبوت کے ذریعے مہربانی فرماتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: توفیق، حکمت، معرفت اور ہدایت کے ذریعے احسان فرماتا ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: اس سے مراد تلاوت قرآن اور اس کے فہم کے ذریعے احسان فرماتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ طبری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کہا: اے چچا! مجھے وصیت کرو۔ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح پوچھا جس طرح آپ نے پوچھا ہے تو آپ نے فرمایا: ”کوئی دن، رات اور گھڑی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ صدقہ نہ فرماتا ہو جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے الہام کرنے کی

طرح کا احسان اپنے بندوں پر نہیں فرمایا''۔

وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ یعنی حجت اور آیت اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ الله کے اذن سے مراد اس کی مشیت ہے یعنی یہ ہمارے بس میں نہیں، ہم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ الله کے امر اور قدرت کے بغیر جس طرح تم مطالبہ کرتے ہو اس طرح ہم حجت اور دلیل لے آئیں، الفاظ خبر کی صورت میں ہیں مگر معنی نفی کا ہے، کیونکہ کوئی بھی اس کام کا پابند نہیں جس پر وہ قادر نہ ہو(1)۔

وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ، ما استفہامیہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور لنا خبر ہے، اور اس کے بعد والا جملہ حال ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: أیّ شیٔ لنا فی ترک التوکل علی الله الله تعالیٰ پر بھروسے کو ترک کرنے کے سلسلہ میں ہمارے لیے کون سی شے ہے؟

وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا یعنی وہ راستہ جو الله کی رحمت تک پہنچاتا ہے، اور اس کی سختی اور انتقام سے نجات دلاتا ہے۔ وَ لَنَصْبِرَنَّ لام قسم کا ہے۔ اصل میں والله لنصبرن ہے۔ عَلٰى مَاۤ اٰذَيْتُمُوْنَا اس کے بعد بہ کے الفاظ بھی ہیں، توہین اور مارنا، تکذیب اور قتل وغیرہ جیسی اذیتیں مراد ہیں۔ ان اذیتوں کی برداشت الله تعالیٰ کی ذات پر اس بھروسے کی وجہ سے ہے کہ وہ ہمیں کافی ہے اور وہ ہماری مدد فرمائے گا۔ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

''اور کہا کفار نے اپنے رسولوں کو کہ ہم ضرور باہر نکال دیں گے تمہیں اپنے ملک سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں، پس وحی بھیجی ان کی طرف ان کے پروردگار نے کہ (مت گھبراؤ) ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو نیز ہم یقیناً آباد کریں گے تمہیں (ان کے) ملک میں انہیں (برباد کرنے) کے بعد، یہ (وعدۂ آخرت) ہر اس شخص کے لیے ہے جو ڈرتا ہے میرے روبرو کھڑا ہونے سے اور خائف ہے میری دھمکی سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ، لَنُخْرِجَنَّكُمْ میں لام قسم ہے۔ یعنی والله لنخرجنکم۔ او لتعودن یعنی حتی تعودوا یا إلا أن تعودوا یہ طبری اور دیگر مفسرین کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کو اس تقدیر (حتی یا الا ان) کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ او اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے تخییر پر دلالت کرتا ہے، کفار نے رسولوں کو اپنی ملت میں واپس لوٹنے یا انہیں اپنے ملک سے نکالنے کا اختیار دیا۔ اور یہ الله تعالیٰ کا اپنے رسولوں اور بندوں کے لیے طریقہ کار ہے، کیا آپ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (الاسراء) کو نہیں دیکھتے''(2)۔ اور انہوں نے ارادہ کر لیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 329　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1104

کہ پریشان و مضطرب کر دیں گے آپ کو اس علاقے سے تا کہ نکال دیں آپ کو یہاں سے اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ (یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر"۔

یہ معنی سورۂ اعراف وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ فِیْ مِلَّتِنَا یعنی ہمارے دین کی طرف۔ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ پس وحی بھیجی ان کی طرف ان کے پروردگار نے کہ (مت گھبراؤ) ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو نیز ہم یقیناً آباد کریں گے تمہیں (ان کے) ملک میں انہیں (برباد کرنے) کے بعد۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ یعنی قیامت کے دن میرے سامنے کھڑا ہونے سے، مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ مقام، قیام کی طرح مصدر ہے۔ قام قیامًا و مقامًا کہا جاتا ہے، اور اس کے اپنے ساتھ اختصاص کی وجہ سے اللہ نے یہ اضافت فرمائی ہے۔ اور مقام میم کے فتحہ کے ساتھ اقامت کی جگہ کو کہتے ہیں، اور میم کے ضمہ کے ساتھ اقامت کے فعل کو کہا جاتا ہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ یعنی میرے اس کے اوپر قیام اور اس کی نگرانی سے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (الرعد:33) کیا وہ خدا جو نگہبانی فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ۔

اخفش نے کہا: ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ میں مَقَامِیْ سے مراد، عذابی، یعنی میرا عذاب ہے۔ وَ خَافَ وَعِیْدِ یعنی قرآن اور اس کی دھمکیاں۔ ایک قول کے مطابق: یہ عذاب ہے اور الوعید وعد سے اسم ہے۔

وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ یُسْقٰی مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾ یَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ ﴿۱۷﴾

"اور رسولوں نے حق کی فتح کے لیے التجاء کی (جو قبول ہوئی) اور نامراد ہو گیا ہر سرکش، منکر حق، اس (نامرادی) کے بعد جہنم ہے اور پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی، وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا اور آئے گی اس کے پاس موت ہر سمت سے اور وہ (باینہمہ) مرے گا نہیں، (علاوہ ازیں) اس کے پیچھے ایک اور سخت عذاب ہوگا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اسْتَفْتَحُوْا یعنی انہوں نے مدد کی التجا کی، یعنی رسولوں کو اپنی قوم کے خلاف فتح کی التجا اور ان کی ہلاکت کی دعا کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر کا نقطہ نظر ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے اور اس سے حدیث طیبہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی کامیابی و کامرانی کے لیے فتح کی التجا کرتے تھے یعنی مدد طلب کرتے تھے۔

ابن زید نے کہا: مختلف امتوں نے دعا کے ذریعے فتح کی التجا کی جس طرح قریش نے کہا: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ الآیۃ (الانفال:32) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انہوں نے میری تکذیب کی ہے پس میرے درمیان اور ان کے درمیان فیصلہ فرما''۔ مختلف امتوں نے کہا: اگر یہ سچے ہیں تو ہمیں عذاب میں مبتلا کر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ اس کی مثال ائتنا بعذاب الله ان کنت من الصادقین ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لا اگر تو سچوں میں سے ہے۔ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ (الاحقاف) ہمارے اوپر وہ لا جس کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے اگر تو رسولوں میں سے ہے۔ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ، جَبَّارٍ سے مراد وہ متکبر ہے جو اپنے اوپر کسی کا کوئی حق نہیں سمجھتا۔ نحاس کے ذکر کردہ بیان کے مطابق اہل لغت کے نزدیک اس کا یہی معنی ہے اور عَنِيدٍ حق کا انکار کرنے والا اور اس سے پہلو تہی اختیار کرنے والا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر سے مروی ہے: جب کوئی قوم سے دوری اختیار کرلے تو عَنَدَ عن قومه کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ العَنَد سے ہے اور العُنُد سے مراد ناحیہ اور کونہ ہوتا ہے اور عَانَدَ فلانٌ سے مراد ہے اس نے کونے میں اعراض کرتے ہوئے پکڑا۔ شاعر نے کہا:

إذا نزلت فاجعلونی وَسَطًا إنّی کبیرٌ لا أُطِیقُ العُنُدَا

ہروی نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَبَّارٍ عَنِيدٍ سے مراد میانہ روی کی نسبت ظلم اختیار کرنے والا ہے۔ اور یہ العنود، العنید اور العاند ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ سے مستحاضہ عورت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: انه عرق عاند۔ ابو عبید نے کہا: یہ وہ ہے جس نے سرکشی اور بغاوت اختیار کی جس طرح انسان بغاوت کرتا ہے۔ تو یہ رگ بھی اس سے نکلنے والے خون کی کثرت کی وجہ سے اسی کی طرح ہے۔ شمر نے کہا: عاند وہ ہے جس کا خون نہیں رکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی سیرت کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں میانہ روی سے ہٹنے والے کو اپنی طرف کھینچتا ہوں۔ لیث نے کہا: اونٹوں میں سے عنود وہ ہے جو دیگر اونٹوں کے ساتھ نہیں ملتا بلکہ ہمیشہ ایک طرف رہتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جو مخالفت کا ارادہ کرے یا جماعت سے علیحدہ ہونا چاہے میں اسے اس کے ساتھ ملا دیتا ہوں۔

مقاتل نے کہا: عَنِيدٍ سے مراد متکبر ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ اپنی ناک کے ذریعے بلند ہونے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے: العنود اور العنید سے مراد وہ ہے جو رسولوں کے خلاف تکبر اختیار کرتا ہے اور حق کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اس پر نہیں چلتا۔ عرب راستے سے ہٹ جانے والے اونٹ کے متعلق کہتے ہیں: شر الابل العنود۔ ایک قول کے مطابق: العنید سے مراد گناہگار اور نافرمان ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: عنید وہ ہے جس نے لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہنے سے انکار کیا۔

میں (قرطبی) نے کہا: آیت میں جَبَّارٍ اور عَنِيدٍ کا معنی ایک ہی ہے اگرچہ لفظ مختلف ہیں۔ اور ہر وہ آدمی جو حق سے دور ہوتا ہے وہ جَبَّارٍ اور عَنِيدٍ ہے یعنی متکبر ہے۔ ایک قول یہ ہے: آیت میں اس سے مراد ابو جہل ہے، اس کو مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے اپنی کتاب أدب الدنیا والدین میں حکایت بیان کی ہے کہ ولید بن یزید بن عبدالملک نے ایک دن قرآن کریم کو کھولا تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ نکلا تو اس نے قرآن پاک کو پھاڑ دیا اور یہ اشعار پڑھنے لگا:

أتوعدُ کلَّ جبّارٍ عنیدٍ فها أنا ذاکَ جبّارٌ عنیدُ

إذا ما جئتَ ربك يوم حشرٍ فقُلْ يا رَبِّ مزّقني الوليدُ

کیا تو ہر جبار عنید کو دھمکی دیتا ہے یہ لو میں ہوں وہ جبار عنید۔ جب تو اپنے پروردگار کے پاس حشر والے دن آئے گا تو کہہ دینا: اے میرے پروردگار! مجھے ولید نے پھاڑا ہے۔

پھر کچھ ہی دن رہا کہ اسے بری طرح قتل کر دیا گیا اور اس کے سر کو اس کے محل پر لٹکا دیا گیا پھر اسے شہر کی چار دیواری پر لٹکایا گیا۔

قولہ تعالیٰ: مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ یعنی اس کافر کے پیچھے جہنم ہے یعنی اس کی ہلاکت کے بعد جہنم ہے اور وراء بمعنی بعد ہے نابغہ نے کہا:

حلفتُ فلم أترك لنفسك ريبةً وليس وراءَ الله للمرء مذهبُ(1)

میں نے قسم اٹھائی اور تیرے نفس کے لیے کوئی شک نہ چھوڑا اور ان کے لیے اللہ کے بعد کوئی اور مفر نہیں۔

یہاں وراء اللہ سے مراد بعد اللہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ سے مراد من بعدہ ہے۔ اور اللہ کے ارشاد وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (البقرہ: 91) سے مراد بما سواہ ہے۔ یہ فراء کا قول ہے۔ ابو عبید نے کہا: اس کا معنی بما بعدہ ہے۔ ایک قول کے مطابق: من ورائہ سے مراد من أمامه ہے اسی سے شاعر کا قول ہے:

ومن ورائك يومٌ أنت بالِغُه لا حاضرٌ مُعْجِزٌ عنه ولا بادِي(2)

من ورائك سے مراد من امامك یعنی تیرے سامنے ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

أترجو بنو مروان سَمْعِي و طاعتِي وقومي تميمٌ والفلاةُ ورائيا

ورائیا سے مراد امامی یعنی سامنے ہے۔

لبید نے کہا:

أليس ورائى ان تراخت منيتى لزوم العصا تحنى عليها الأصابع

ورائی سے مراد أمامی ہے اور وکان وراءهم ملك سے مراد کان أمامهم ملك ہے۔ ابو عبیدہ اور ابو علی قطرب وغیرہ کا یہی نقطہ نظر ہے۔

اخفش نے کہا: یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ هذا الأمر من ورائك یعنی عنقریب تیرے پاس آ جائے گا اور أنا من وراء فلان یعنی میں اس کی تلاش میں ہوں اور عنقریب اس تک پہنچ جاؤں گا۔

نحاس نے کہا: اللہ کے ارشاد مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ میں وَّرَآىِٕهٖ سے مراد امامه ہے یہ اضداد میں سے نہیں بلکہ یہ توریہ ہے۔ ازہری نے کہا: وراء بمعنی امام اور خلف دونوں ہے یہ اضداد میں سے ہے، یہ ابو عبید کا بھی قول ہے۔ اور ان دونوں کا

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 128
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 127

اشتقاق ان میں سے ہے جو پوشیدہ ہوتی ہیں، پس جہنم پوشیدہ ہے اور ظاہر نہیں ہوتی، لہٰذا یہ دراصل گئی کیونکہ دکھائی نہیں دیتی، اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے اور یہ عمدہ بات ہے۔

وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ یعنی ایسا پانی پلایا جائے گا جو پیپ کی طرح ہوگا، جس طرح بہادر آدمی کو اسد کہا جاتا ہے، اس سے مراد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ اسد کی طرح ہے یہ تمثیل اور تشبیہ ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ وہ ہے جو دوزخیوں کے جسم سے قیح اور خون بہتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی اور ربیع بن انس نے کہا: یہ دوزخیوں کا غسالہ ہے، اور یہ پانی ہے جو زانی مردوں اور عورتوں کی شرمگاہوں سے نکلتا ہے۔ صدید، صد سے ماخوذ ہے۔ ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں صفوان بن عمرو نے عن عبید الله بن بسر عن ابی امامہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبر دی ہے کہ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے منہ کے قریب کیا جائے گا تو وہ اس کو ناپسند کریں گے۔ جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو یہ اس کے چہرے کو بھون دے گا اور اس کی حدت اس کے سر تک پہنچ جائے گی اور جب وہ اسے پیے گا تو یہ اس کی انتڑیاں کاٹ دے گا یہاں تک کہ وہ اس کی دبر سے نکلے گا''۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾ (محمد) اور اللہ ارشاد فرماتا ہے: وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ (الکہف: 29) اس روایت کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ھذا حدیث غریب۔ (دونوں آیات حدیث کے معنی کی شرح ہیں) جس عبید اللہ بن بسر نے صفوان بن عمرو سے حضرت ابو امامہ کی حدیث روایت کی ہے شاید وہ عبد اللہ بن بسر کا بھائی ہو۔ يَّتَجَرَّعُهٗ یعنی وہ اس کو گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے، اس کی کڑواہٹ اور حرارت کی وجہ سے ایک ہی دفعہ نہیں پی سکیں گے۔ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ یعنی وہ اسے نگل نہیں سکے گا، جرع الماء و اجترعه و تجرعه کہا جاتا ہے اور اس کا معنی سَاغَ الشراب فی الحلق يَسُوغُ سَوغًا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ آسانی سے نگل لے، اسی طرح وأساغه الله إساغة ہے اور یکاد صلہ ہے، یعنی وہ اس کو دیر لگانے کے بعد نگلے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ (البقرہ) یعنی انہوں نے سستی کے بعد کام سرانجام دیا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ (الحج) تو یہ اساغت پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہ وہ اس کو جائز قرار دے گا اور نہ وہ اس کے ذریعے فائدہ حاصل کرے گا۔

وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی ہر طرف سے اس کے دائیں بائیں، اوپر نیچے، آگے اور پیچھے سے موت کے اسباب اس کے پاس آئیں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ (الزمر: 16) ان کے اوپر سے دوزخ کا سایہ ہوگا اور ان کے نیچے سے سایہ ہوگا۔

ابراہیم تیمی نے کہا: اس کے جسم کے ہر حصے سے وہ اس کے پاس آئے گی یہاں تک کہ بالوں کے اطراف سے بھی، ان تکلیفوں کے لیے موت کا لفظ بولا گیا ہے جو اس کے جسم کے ہر حصے سے آئیں گی (1)۔ ضحاک نے کہا: ہر طرف اور ہر جگہ سے حتی کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے موت اس کے پاس آئے گی۔ اخفش نے کہا: اس سے مراد وہ مصیبتیں ہیں جو جہنم میں

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 128

کافر کو جھیلنا پڑیں گی اللہ تعالیٰ نے ان مصیبتوں کو موت فرمایا ہے اور یہ موت بھی بڑی ہوگی۔ ایک قول یہ ہے: اس کے ہر عضو پر عذاب کی ایک صورت مسلط ہوگی۔ عذاب کی ایک صورت کا ایک لحظہ کے لیے تسلط اس پر ستر مرتبہ کی موت سے زیادہ مشکل ہوگا۔ عذاب کی مختلف صورتوں میں ڈسنے والا سانپ، ڈنگ مارنے والا بچھو، جلا دینے والی آگ، پاؤں کی بیڑیاں، گردن میں گرم زنجیریں، زنجیروں کے ساتھ جکڑنا، تابوت میں بند کرنا، پیپ، گرم پانی اور اس کے علاوہ کئی اور صورتیں ہیں۔ محمد بن کعب نے کہا: جب کافر جہنم میں پانی مانگے گا تو اسے دیکھ کر کئی موتیں مرے گا، جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو پھر کئی موتیں مرے گا، اور پھر جب اسے پیے گا تو کئی موتیں مرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ سے یہی مراد ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ نہیں مرے گا تو راحت طلب کرے گا۔ ابن جریج نے کہا: اس کی روح اس کی پسلیوں میں معلق ہو جائے گی اور باہر نہیں نکلے گی تو وہ مرے گا، پھر اس کے پیٹ سے روح اپنی جگہ کی طرف نہیں لوٹے گی تو زندگی اسے فائدہ دے گی، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے ارشاد ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴿۱۳﴾ (الاعلیٰ) میں ہے یعنی اس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کے جسم میں کئی آلام پیدا فرمائے گا جن میں سے ہر ایک موت کے الم کی طرح ہے۔ ایک قول یہ ہے: وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذریعے موت کے شدائد کو طوالت اور سکرات الموت کو لمبا کیا جا سکے گا تا کہ یہ صورت اس کے عذاب میں زیادتی کا سبب بنے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کافر مرے گا، حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا (فاطر: 36) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اسی طرح کے ہیں، کفار کے حالات ایسے ہوں گے جیسے اس آدمی کے حالات ہو سکتے ہیں جس پر ہمیشہ سکرات الموت طاری رہیں۔ واللہ اعلم۔

وَمِن وَرَائِهِ یعنی اس کے آگے۔ عَذَابٌ غَلِيظٌ اس سے مراد سخت اور مسلسل تکلیف دہ عذاب ہے جس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً (التوبہ: 123) ہے۔ اس سے مراد بھی شدت اور قوت ہے۔ اللہ کے ارشاد: وَمِن وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ کے بارے میں حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس سے مراد سانسوں کو روکنا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿۱۸﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿۱۹﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿۲۰﴾

"ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے ایسی ہے کہ ان کے اعمال راکھ کا ڈھیر ہیں جسے تند ہوا تیزی سے اڑا لے گی سخت آندھی کے دن، نہ حاصل کریں گے ان اعمال سے جو انہوں نے کمائے تھے کوئی فائدہ یہ (اعمال کا اکارت جانا ہی) بہت بڑی گمراہی ہے۔ کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے

آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اگر وہ چاہے تو سب ہلاک کر دے اور لے آئے کوئی نئی مخلوق اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں''۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ، مثل کے رفع میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ سیبویہ کے نزدیک یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جب کہ خبر مضمر ہوگی۔ تقدیر عبارت یہ ہے وفیما یتلی علیکم او یقص مثل الذین کفروا بربهم پھر نئے سرے سے کلام فرمایا اور فرمایا: اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ یعنی راکھ کے ڈھیر کی طرح۔ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت ہوگی مثل الذین کفروا فیما یتلی علیکم أعمالهم کرماد یہی فراء کے نزدیک بھی ہے۔ اس صورت میں مثل ملغی ہوگا اصل کلام یہ ہوگا: والذین کفروا بربهم أعمالهم کرماد انہیں سے مضاف کے حذف کی صورت بھی مروی ہے یعنی مثل أعمال الذین کفروا بربهم کرماد پہلی صورت کو ان سے مہدوی نے ذکر کیا ہے اور دوسری کو قشیری اور ثعلبی نے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مبتدا ہو جیسے صفة فلان أسمر تو مثل بمعنی صفت ہو۔ اور کلام میں اَعْمَالُهُمْ کو الذین سے بدل اشتمال بناتے ہوئے مجرور پڑھنا بھی صحیح ہوگا اور یہ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ کے ارشاد کے ساتھ متصل ہوگا جب کہ معنی یہ ہوگا کہ ان کے اعمال ضائع ہیں مقبول نہیں ہیں۔

اور رماد کسی چیز کے جلنے کے بعد جو باقی بچ جانے والا حصہ ہوتا ہے اسے کہتے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعمال کے اڑ جانے کو بطور تمثیل بیان فرمایا ہے کہ یہ اسی طرح ہے جس طرح سخت آندھی والے دن تیز ہوا راکھ کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ العصف ہوا کی تیزی کو کہتے ہیں۔ ان کی یہ صورتحال اس وجہ سے ہوگی کہ انہوں نے اپنے اعمال میں اللہ کے علاوہ کئی اور لوگوں کو شریک کیا۔ یوم کی عصف کے ساتھ صفت لانے کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ عصف اگرچہ ہوا کی صفت ہے مگر چونکہ ہوا دن میں ہوتی ہے اس لیے اسے دن کی صفت کے طور پر ذکر کرنا صحیح ہوگا اور یوم عاصف کہا جائے گا جس طرح مثلاً دن میں سردی اور گرمی کے ہونے کی وجہ سے یوم بارد اور یوم حار کہنا صحیح ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ سے مراد ہوا ہی ہوگی کیونکہ جملہ کے آغاز میں ہوا کا ذکر کر دیا گیا ہے اس لیے یہاں اس کو حذف کر دیا جیسے شاعر کا شعر ہے:

إذا جاءَ یومٌ مظلمُ الشمسِ کاسِفُ

یہاں مراد کاسف الشمس ہے مگر شمس کا ذکر پہلے ہو جانے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ہروی نے ذکر کی ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ الریح کی صفت ہے۔ اس کا اعراب موصوف کے مطابق اس لیے نہیں ہوگا کیونکہ جب یوم کے بعد آئے گا تو اعراب بھی اس کے مطابق ہوگا جیسے حُجْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ کہا جاتا ہے۔

یہاں خرب جحر کی صفت ہے مگر ضب کے بعد آنے کی وجہ سے اس کے تابع ہے، اس کو ثعلبی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے اور ابن اسحاق اور ابراہیم بن ابی بکر نے فی یومِ عاصفٍ پڑھا ہے۔ لَا يَقْدِرُوْنَ یعنی کفار مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ اس سے مراد آخرت ہے، یعنی کفر کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اس لیے دنیا میں انہوں نے جو نیک عمل کیا ہوگا آخرت میں

اس کا ثواب حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ یعنی بہت بڑا خسارہ موت کی وجہ سے۔ اس کے استدراک کے فوت ہو جانے کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس کو کبیر اور بعید بنا دیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یہاں رؤیت سے مراد رؤیت قلبی ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ کیا تیرے علم کی انتہا اس بات پر نہیں ہوئی۔ حمزہ اور کسائی نے خالق السموات والارض پڑھا ہے اور بِالْحَقِّ کا معنی یہ ہوگا کہ تا کہ آسمانوں اور زمین کے ذریعے اس کی قدرت پر استدلال کیا جا سکے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ یعنی اے لوگو! وہ جس طرح اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے اسی طرح ان کو فنا کرنے پر بھی قادر ہے، لہٰذا تم اس کی نافرمانی نہ کرو، اگر تم اس کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں ہلاک کر دے گا۔ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ جو تم سے زیادہ فضیلت والے اور تابعدار ہوں گے، کیونکہ اگر وہ بھی پہلے لوگوں کی طرح ہوں تو پھر تو تبدیلی کا کوئی فائدہ نہیں۔ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ عزیز سے مراد مشکل اور متعذر ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٢﴾

"اور (روز حشر) اللہ تعالیٰ کے سامنے (سب چھوٹے بڑے) حاضر ہوں گے تو کہیں گے کمزور (پیروکار) ان (سرداروں) سے جو متکبر تھے (اے سردارو!) ہم تو (ساری عمر) تمہارے فرمانبردار رہے پس کیا (آج) تم ہمیں بچا سکتے ہو عذاب الٰہی سے، وہ کہیں گے: اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم بھی تمہاری رہنمائی کرتے۔ یکساں ہے ہمارے لیے خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے لیے (آج) کوئی راہ فرار نہیں ہے اور شیطان کہے گا جب (سب کی قسمت کا) فیصلہ ہو چکے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت، سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو نہ میں (آج) تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو، میں انکار کرتا ہوں اس امر سے کہ تم نے مجھے شریک بنایا اس سے پہلے، بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا یعنی قیامت کے دن اپنی قبروں سے ظاہر ہوں گے۔ البروز کا معنی ظہور ہوتا ہے۔ اور براز کھلی جگہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ظاہر ہوتی ہے، اسی سے لوگوں کے سامنے آنے والی عورت کو امراۃ برزۃ کہا جاتا ہے۔ برزوا کا معنی ہوگا کہ وہ

اپنی قبروں سے ظاہر ہوئے۔ فعل ماضی ہے مگر معنی مضارع کا ہے اور وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ کے ساتھ یہ متصل ہے، یعنی جب رسولوں نے فتح کی التجا کی تو قریب ہے کہ وہ انہیں ہلاک کر دے گا، پھر روز حشر اٹھائے گا اور سب کے سب اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوں گے، کوئی چھپانے والا انہیں اللہ سے نہیں چھپا سکے گا۔ لِلّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں ظاہر کرنے کے حکم کی وجہ سے فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا ضعفاء سے پیروکار مراد ہیں۔ لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا ان سے مراد قیادت کرنے والے ہیں۔ اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا، متبع مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت ذوی تبع ہوگا۔ اور یہ تابع کی جمع بھی ہو سکتی ہے جیسے حارس اور حرس، خادم اور خدم، راصد اور رصد اور باقر اور بقر۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا یعنی ہمیں دور کر سکتے ہو۔

مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ یعنی شیئا اور من صلہ ہے جب کوئی آدمی کسی سے اذیت کو دور کرے تو اغنی عنہ کہا جاتا ہے اور جب کوئی کسی تک نفع پہنچا دے تو اغناہ کہا جاتا ہے۔ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی ہدایت دیتا تو ہم بھی اس کی طرف رہنمائی کرتے۔ ایک قول یہ ہے: اگر اللہ تعالیٰ جنت کے راستے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا تو ہم اس کی طرف تمہاری رہنمائی کرتے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اگر اللہ ہمیں عذاب سے نجات دیتا تو ہم اس سے تمہیں نجات دلاتے۔ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اَجَزِعْنَآ ہے یعنی سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ، مَّحِيْصٍ سے مراد بھاگنے کی جگہ اور پناہ گاہ ہے۔ یہ مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور اسم کے معنی میں بھی۔ جب کوئی فرار ہو جائے اور بھاگ جائے تو حَاصَ فلان عن كذا کہا جاتا ہے۔ یہ حَاصَ يَحِيصُ حَيْصًا وحُيُوصًا وحَيَصَانًا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی صورت نہیں جس کے ذریعے ہم دوزخ سے دور ہو جائیں۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''دوزخیوں پر جب عذاب کی شدت ہوگی تو وہ کہیں گے کہ آؤ ہم صبر کریں تو پانچ سو سال وہ صبر کریں گے جب وہ دیکھیں گے صبر نے تو انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا تو کہیں گے آؤ ہم جزع فزع کریں تو پانچ سو سال تک وہ جزع وفزع اور چیخ و پکار کریں گے، جب دیکھیں گے کہ اس نے بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا تو اس وقت کہیں گے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ یکساں ہے ہمارے لیے خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے لیے (آج) کوئی راہ فرار نہیں۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ دوزخی ایک دوسرے کو کہیں گے: اے وہ لوگو! اللہ نے تم پر عذاب اور مصیبت نازل کی ہے جس کو تم ملاحظہ کر رہے ہو آؤ ہم صبر کریں، شاید صبر ہمیں فائدہ دے جس طرح اہل طاعت نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا تو صبر نے انہیں نفع دیا، تو تمام دوزخیوں کا صبر پر اتفاق ہو جائے گا سو انہوں نے صبر کیا، تو ان کا صبر لمبا ہو گیا تو انہوں نے جزع فزع کی، پھر پکارے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ تو اس وقت شیطان اٹھے گا کہے گا: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ ، کہے گا: میں تمہیں کسی چیز سے نہیں بچا سکتا۔ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ۔'' یہ طویل حدیث ہے جس کو مکمل طور پر ہم (قرطبی) نے کتاب التذکرہ میں لکھ دیا ہے۔

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ حضرت حسن نے کہا(1): قیامت کے روز شیطان آگ کے منبر پر جہنم میں خطاب کرتا ہوا کھڑا ہوگا جس کو ساری مخلوق سنے گی۔ اور لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ کا معنی یہ ہے کہ جنتیوں کو جنت حاصل ہو جائے گی اور دوزخیوں کو دوزخ جس طرح کہ سورۂ مریم میں اس کا بیان آئے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ اس سے مراد بعث بعد الموت، جنت، دوزخ، اطاعت گزار کا ثواب اور نافرمانی کی سزا کا وعدہ ہے پس اس نے اپنے وعدے کو تمہارے سامنے سچ کر دکھایا ہے، اور میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا کہ بعث بعد الموت نہیں ہوگا، نہ جنت ہوگی، نہ دوزخ، نہ ثواب اور نہ عقاب ہوگا سو میں نے تم سے وعدہ خلافی کی۔

ابن مبارک نے حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث شفاعت کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے (2) کہ تمہاری رہنمائی نبی امی کی طرف کرتا ہوں۔ پس لوگ میرے پاس آئیں گے اللہ تعالیٰ مجھے اذن فرمائے گا اور میں کھڑا ہوں گا اور میری مجلس سے ایسی خوشبو پھیلے گی جسے آج تک کسی نے نہ سونگھا ہوگا تو میں اپنے رب کے حضور میں آ کر اپنی امت کی شفاعت کروں گا اور اللہ تعالیٰ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور میرے گیسوئے عنبریں سے لے کر میرے قدموں کے ناخنوں تک نور ہی نور ہوگا یہ منظر دیکھ کر کافر کہیں گے کہ مومنوں کو تو شفیع المذنبین مل گیا اب ہماری شفاعت کون کرے گا؟ پھر کہیں گے کہ شیطان کے پاس چلو اسی نے ہم کو گمراہ کیا تھا وہی ہماری شفاعت کرے گا، سب اس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اہل ایمان کو تو ان کا شفیع مل گیا اب تو ہماری شفاعت کر کیونکہ تو نے ہی ہمیں گمراہ کیا تھا۔ اس کی مجلس سے ناقابل برداشت بدبو اٹھے گی وہ رونے چلانے لگیں گے تو شیطان انہیں یہ جواب دے گا: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ الآیۃ، وَعْدَ الْحَقِّ یہ ایک چیز کی خود اسی کی طرف اضافت ہے، جیسے مسجد الجامع وغیرہ۔

فراء نے کہا: بصریوں نے کہا ہے (اصل عبارت یوں ہے) وعدکم وعد الیوم الحق یا وعدکم وعد الوعد الحق فصدقتکم تو مصدر کو دلالت حال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ، سلطان سے مراد حجت اور بیان ہے یعنی جو وعدہ میں نے دنیا میں تمہارے ساتھ کیا اور اسے مزین کر کے پیش کیا میں نے تمہارے لیے اس کی حجت اور بیان کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ یعنی میں نے تمہیں گمراہ کیا اور تم نے میری پیروی اختیار کر لی۔ اور ایک قول یہ ہے: میں نے اپنی دعوت کی طرف تمہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ یہ استثناء منقطع ہے مراد یہ ہے کہ لیکن میں نے وسوسے کے ذریعے تمہیں دعوت دی اور تم نے خود اپنی مرضی اور اختیار سے اسے قبول کر لیا۔ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ سے مراد یہ ہے کہ مجھے تمہارے دلوں اور ایمان کی جگہ پر زور حاصل نہیں تھا لیکن میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے فوراً میری دعوت کو قبول کر لیا اور یہ اس صورت میں ہے کہ اس سے گناہگار مومنین اور منکر کافروں کو خطاب کیا گیا ہو، مگر اس میں نظر ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد: لما قضی الامر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان نے صرف کفار کو خطاب کیا نہ کہ گناہگار مومنوں کو۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 130 2۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 375

فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ یعنی جب تم بغیر دلیل کے میرے پاس آئے ہو تو مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ یعنی میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ نہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ صارخ اور مستصرخ وہ ہوتا جو مدد طلب کرتا ہے اور مصرخ مددگار کو کہتے ہیں۔ سلامہ بن جندل نے کہا:

كنا إذا ما آتانا صارخ فزع　　كان الصراخ له قرع الظنابيب(1)

شعر میں صارخ سے مراد مدد و معاونت کا طلب گار ہے۔

امیہ بن ابی صلت نے کہا:

ولا تجزعوا إني لكم غير مصرخ　　وليس لكم عندي غناء ولا نصر(2)

یہاں مصرخ سے مراد مدد کرنے والا ہے۔

صرخ فلان کہا جاتا ہے یعنی اس نے مدد طلب کی۔ یہ صَرَخَ یَصْرُخُ صَرْخًا و صُرَاخًا و صَرْخَةً ہے اور اصطرخ بمعنی صرخ ہے اور التصرخ میں تصنع اور تکلف ہے اور المصرخ مددگار جب کہ المستصرخ مدد طلب کرنے والا ہے، اسی سے یہ جملہ بھی ہے کہ استصرخنی فاصرختہ یعنی اس نے مجھ سے مدد طلب کی پس میں نے اس کی مدد کی اور الصریخ مدد طلب کرنے والے کی آواز ہے اور الصریخ مدد طلب کرنے والا بھی ہوتا ہے، اور اس سے مراد مدد کرنے والا اور مدد طلب کرنے والا دونوں ہیں، یہ اضداد میں سے ہے، یہ جوہری کا قول ہے۔ عام قراء کی قرات بمصرخی یا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ جب کہ اعمش اور حمزہ نے بمصرخی یا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی اصل بمصرخیین ہے اضافت کی وجہ سے نون حذف ہو گیا اور یا جمع کو یا اضافت میں مدغم کر دیا گیا۔ جس نے اس کو نصب دی اس کی ایک وجہ تضعیف ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یا اضافت کا ماقبل ساکن ہو تو اس پر فتحہ ہی آتا ہے جیسے ھوای اور عصای وغیرہ اور اگر ماقبل متحرک ہو تو پھر فتحہ اور اسکان دونوں جائز ہیں جیسے غلامی اور غلامیَ وغیرہ۔ اور جس نے کسرہ دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دو ساکن مل جائیں اور حرکت کی ضرورت پڑے تو کسرہ کے ساتھ حرکت دی جاتی ہے کیونکہ یا اخت کسرہ ہے۔

فراء نے کہا: حمزہ کی قراءت اس کی طرف سے پائے جانے والے وہم کی وجہ سے ہے۔ زجاج نے کہا: یہ ردی قراءت ہے اور سوائے ایک ضعیف وجہ کے اس کی کوئی وجہ نہیں۔ قطرب نے کہا: یہ بنی یربوع کی قراءت ہے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ یا اضافت پر ایک اور یا کا اضافہ کرتے ہیں۔ قشیری نے کہا: جو چیز اس سے مستغنی کرتی ہے وہ تواتر کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثابت ہونا ہے لہٰذا یہ درست نہیں کہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ غلط ہے، قبیح ہے یا ردی ہے، بلکہ یہ قرآن میں فصیح ہے، اور اس میں ایسی صورتیں بھی ہیں جو اس سے بھی زیادہ فصیح ہیں، شاید ان کی مراد یہ ہوگی کہ جو حمزہ کے علاوہ دیگر کی قراءت ہے وہ زیادہ فصیح ہے۔ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ یعنی جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے شریک ٹھہرایا ہے میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ ما مصدر کے معنی میں ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں آج اس بات کا انکار کرتا ہوں جو تم دنیا میں اللہ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 334　　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 131

تعالیٰ کے ساتھ شرک کا دعویٰ کرتے تھے۔

قتادہ نے کہا: كَفَرْتُ بمعنی عصیت ہے یعنی میں نے اللہ کی نافرمانی کی۔ ثوری نے کہا: جو تم نے دنیا میں میری اطاعت کی میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان آیات میں قدریہ، معتزلہ، امامیہ اور ان کے پیروکاروں کی تردید ہے۔ ان کے پیروکاروں کی بات پر غور کرو۔ انہوں نے کہا: لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ اور اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں ہدایت دیتے اور شیطان کا قول: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا۔ ان اقوال کو دیکھو ان میں انہوں نے کیسے اللہ تعالیٰ کی صفات کے سلسلے میں حق کا اعتراف کیا ہے حالانکہ یہ دوزخی ہیں؟ جس طرح قرآن مجید میں ایک اور مقام پر كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ سے لے کر فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ (الملک: 8 تا 11) تک ہے اس میں انہوں نے دوزخ کی سختیوں میں حق کا اعتراف کیا مگر یہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوگا۔ یہ اعتراف دنیا میں اعتراف کرنے والے کے لیے نفع بخش اور سودمند ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ (التوبہ: 102) اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا نیک اور برے اعمال کو ملا جلا دیا اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عسیٰ کا استعمال وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"اور داخل کیا جائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے باغات میں رواں ہوں گی جن کے نیچے ندیاں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اپنے رب کے حکم سے ان کی دعا وہاں ایک دوسرے کو یہ ہوگی کہ تم سلامت رہو"۔

قولہ تعالیٰ: وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، جَنّٰتٍ اس سے مراد فی جنات ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دخول متعدی نہیں جس طرح کہ اس کی نقیض جو کہ خروج ہے وہ متعدی نہیں ہوتی، لہٰذا اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ مہدوی کا قول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کی حالت کے متعلق بیان فرمایا تو اس کے بعد جنتیوں کے حالات کے بارے میں خبر دی ہے۔ جمہور کی قراءت کے متعلق یہ ادخل فعل مجہول ہے۔ جب کہ حضرت حسن بصری نے اسے اُدْخِلُ پڑھا ہے یعنی مضارع کا صیغہ بطور استئناف آیا ہے۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ یعنی اسکے حکم سے۔ ایک قول کے مطابق اللہ کی مشیت مراد ہے۔ باذنی کی جگہ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تعظیم اور تفخیم کے لیے فرمایا ہے۔ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ سورۂ یونس میں یہ گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ (انہیں) خوب ذہن نشین کرلیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی مثال بیان فرمائی اور وہ ہے كَرَمَادِ ٱشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (ابراہیم: 18) تو مومنین کے احوال کی مثال بھی ذکر فرمادی۔ پھر اس مثال کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: كَلِمَةً طَيِّبَةً یعنی كلمة طيبة الثمر ایسا کلمہ جس کا پھل پاکیزہ ہے ثمر کو اس لیے حذف کر دیا گیا کہ کلام اس پر دلالت کر رہا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کلمہ طیبہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، جب کہ شجرہ طیبہ سے مراد مومن ہے (1)۔

مجاہد اور ابن جریج نے کہا: کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے۔ عطیہ عوفی اور ربیع بن انس نے کہا: یہ بذات خود مومن ہے۔ مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے کہ شجرہ سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ مومن کے دل میں کلمے کی اصل جو کہ ایمان ہے بڑھوتری میں اللہ تعالیٰ نے اسے کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہو، اور آسمان میں بندے کے عمل کی رفعت کو کھجور کے درخت کی ٹہنیوں کی رفعت کے ساتھ تشبیہ دی جب کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ثواب کو پھل کے ساتھ تشبیہ دے دی ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک ایمان کی مثال ثابت درخت کی ہے ایمان اس کی رگیں ہیں، نماز اس کی اصل ہے، زکوٰۃ اس کی فرع، روزے اس کی ٹہنیاں، اللہ کے راستے میں تکلیف اٹھانا اس کی بڑھوتری، حسن اخلاق اس کے پتے اور اللہ کے محارم سے رکنا اس کا پھل ہے''۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معنی یہ ہو: کھجور کے درخت کی جڑیں زمین میں ثابت ہیں یعنی اس کی جڑیں زمین سے پانی پیتی ہیں اور آسمان اوپر سے اسے سیراب کرتا ہے، لہٰذا یہ پاکیزہ بڑھنے والا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ حضرت انس نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک طشت لایا گیا جس میں تر کھجوریں تھیں، تو آپ نے فرمایا: مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا آپ نے فرمایا: یہ کھجور کا درخت ہے''۔ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ آپ نے فرمایا: ''یہ تمبیہ ہے'' (2)۔ ترمذی نے حضرت انس سے ان کا قول روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ زیادہ صحیح ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 132　　2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ ابراہیم، حدیث نمبر 3044، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللہ ﷺ نے ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کی تلاوت فرمائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہے''۔ تو میرے دل میں یہ بات آئی کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ سہیلی نے کہا: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے کہ اس سے مراد ہندی اخروٹ ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث صحیح مروی ہے کہ ''درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور یہی مومن کی مثال ہے مجھے بتاؤ یہ کون سا درخت ہے؟ پھر فرمایا: یہ کھجور کا درخت ہے''(1)۔

امام مالک نے مؤطا میں اس کو بیان کیا ہے۔ امام مالک کی روایت ابن قاسم وغیرہ سے ہے سوائے یحییٰ کے انہوں نے یحییٰ کو اپنی روایت سے ساقط کر دیا ہے۔ اہل صحیح نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور اس میں حارث بن اسامہ کا اضافہ کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اور یہ کھجور کا درخت ہے اس کے پتے نہیں گرتے اور اسی طرح مومن بھی ہے کہ اس کی دعوت نہیں گرتی''۔ اس ارشاد نے حدیث کے معنی اور مماثلت کو بیان کر دیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: غزنوی نے نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا ہے کہ ''مومن کی مثال (2) کھجور کے درخت کی طرح ہے اگر آپ اس کی دوستی اختیار کریں گے تو یہ تمہیں فائدہ دے گی، اگر آپ اس کے پاس بیٹھیں گے تو یہ تیرے لیے نفع بخش ہوگا اور اگر آپ اس کے ساتھ مشاورت کریں گے تو بھی یہ تیرے لیے نفع بخش ہوگا جس طرح کھجور کا درخت ہے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کے حوالے سے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنی پھوپھی سے کھاؤ'' (3)۔ اس سے آپ کی مراد کھجور کا درخت ہے جس کو حضرت آدم علیہ السلام کی بقیہ مٹی سے پیدا کیا گیا، اور اسی طرح یہ اپنے سر کے ساتھ باقی رہتا ہے، اپنے دل کے ذریعے زندگی پاتا ہے اور اس کا پھل مذکر و مونث کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: درختوں میں سے جب یہ انسان کے زیادہ مشابہ ہے تو اسی کے ذریعے تشبیہ بیان کر دی گئی، اور اس کی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ تمام درخت ایسے ہیں کہ اگر ان کے سروں کو کاٹ دیا جائے تو ان کی ٹہنیاں ہر طرف سے پہلے کی نسبت زیادہ گھنی ہو کر اگتی ہیں جب کہ کھجور کے درخت کے سرے کو اگر کاٹ دیا جائے تو وہ خشک ہو جاتا ہے اور اصلاً ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ التقاح میں انسان اور تمام حیوانوں کے مشابہہ ہے کیونکہ بغیر تلقیح کے یہ پھل لیتا ہی نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خير المال سكة مابورة و مهرة مامورة بہترین مال ... ہے جو بڑھنے والا اور نتیجہ خیز ہو۔ اور الابار سے مراد تلقیح ہے اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا۔ اور چونکہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی بقیہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا تو مٹی کا ایک ٹکڑا بچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے اس کی تصویر کشی کی اور جنت عدن میں اس کو گاڑ دیا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اکرموا عمتکم اپنی پھوپھی کی عزت کرو (4)۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہماری پھوپھی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھجور کا درخت''۔

1۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 338، حدیث 35299
2۔ ایضاً فی صفات المومنین، جلد 1، صفحہ 147، حدیث 726
3۔ ایضاً
4۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 377

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ربیع نے کہا: كُلَّ حِيْنٍ سے مراد صبح اور شام ہے، اسی طرح مومن کا عمل دن کے آغاز اور اختتام پر اوپر چڑھتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اور تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ کے متعلق بھی آپ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: یہ ہند کا درخت ہے جس کا پھل ختم نہیں ہوتا، ہر ماہ اس پر پھل لگتا ہے، ہر وقت اللہ کے لیے کیے گئے مومنین کے عمل کو اللہ نے کھجور کے اس درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو مختلف اوقات میں پھل دیتا ہے۔ ضحاک نے کہا: موسم گرما ہو یا سرما، رات، دن کی ہر ساعت تمام اوقات میں کھایا جاتا ہے، پس اسی طرح تمام اوقات میں مومن بھی خیر اور بھلائی سے خالی نہیں ہوتا۔ نحاس نے کہا: یہ تمام اقوال قریب المعنی ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ حین تمام اہل لغت کے نزدیک وقت کے معنی میں ہے اس کا اطلاق قلیل و کثیر دونوں زمانوں پر ہوتا ہے البتہ ان میں سے کوئی ایک ان سے علیحدہ ہوا ہے۔ اصمعی نے نابغہ کا شعر پڑھا ہے:

تَنَاذَرها الرَّاقُونَ من سُوءِ سُمِّهَا　　تُطَلِّقُه حِينًا و حِينًا تُرَاجِعُ(1)

پس یہ شعر بھی اسی بات کو واضح کرتا ہے کہ حین بمعنی وقت ہے، پس ایمان مومن کے دل میں ثابت ہے اور اس کا عمل، قول اور تسبیح بلند ہے اور آسمانوں کی طرف یوں اٹھتی ہیں جس طرح کھجور کے درخت کی ٹہنیاں، اور ایمان کی برکت اور ثواب میں جو وہ کماتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے سال کے مختلف اوقات میں کھجور کا پھل حاصل ہوتا ہے رطب، بسر، بلح، زہو، تمر اور طلع کی صورت میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ہے کہ شجرہ طیبہ جنت کا ایک درخت ہے جو ہر وقت پھل دیتا ہے، مثلاً، ضرب کا مفعول ہے اور کلمۃ اس سے بدل ہے جب کہ کشجرۃ میں کاف کلمۃ سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے: کلمۃ طیبۃ مشبہۃ بشجرۃ طیبۃ کہ کلمہ طیبہ شجرہ طیبہ کے مشابہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ جب درخت ہر سال ایک مرتبہ اپنا پھل دیتے ہیں، تو یہ حین کے حکم کا بیان ہو گا، لہٰذا ہم نے کہا: جس نے قسم اٹھائی کہ الا یکلم فلانا حینا کہ وہ فلاں کے ساتھ ایک حین تک گفتگو نہیں کرے گا تو اس میں حین سے مراد ایک سال ہو گا۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر حین کا لفظ آیا ہے جس سے مراد اکثر حصہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر: 1)

''التفسیر'' میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد چالیس سال ہیں۔ عکرمہ نے حکایت بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ان فعلت کذا و کذا إلی حین فغلامہ حر وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آیا اور آپ سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا کہ حین میں سے ایسا حین بھی ہے جس کا ادراک نہیں ہو سکتا، جیسے اللہ کا ارشاد: وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (الانبیاء) میرا خیال ہے کہ اس سے مراد کھجور توڑنے سے لے کر اس کو اٹھانے تک کا زمانہ ہے تو اس قول نے آپ کو تعجب میں ڈال دیا۔

یہ حضرت ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ حین سے مراد چھ ماہ ہیں آپ نے عکرمہ وغیرہ کی اتباع میں یہ بات کہی ہے۔ سورۃ البقرہ میں حین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال تفصیلاً گزر چکے ہیں۔ الحمد للہ۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 132

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ یعنی لوگوں کے لیے تشبیہات بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ یعنی وہ نصیحت اور عبرت حاصل کریں۔ یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۞

''اور مثال ناپاک کلمہ کی ایسی ہے جیسے ناپاک درخت ہو جسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے (اور) اسے کچھ قرار نہ ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ، كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ سے مراد کلمہ کفر ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد بذات خود کافر ہے۔ اور شجرہ خبیثہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ایلوا ہے، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ ایسا درخت ہے جو زمین پر پیدا ہی نہیں ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک قول کے مطابق اس کا معنی تھوم کا پودا بھی بیان ہوا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد کھنبی یا کائی ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ کشوث ہے اور کشوث ایسا درخت ہے جس کے نہ پتے ہوتے ہیں اور نہ ہی زمین میں اس کی کوئی جڑ ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

وهُمْ كُشُوثٌ فلا أصلٌ ولا ورقٌ (1)

وہ کشوث ہیں نہ (ان کی) کوئی جڑ ہے اور نہ پتے

اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ اس کو اپنی جڑوں سے اکھیڑ لیا گیا۔ اسی سے لقیط کا یہ شعر ہے:

هو الجلاءُ الذی يَجْتَثُّ أَصْلَكُم　　فمن رأى مثلَ ذا يوما ومن سَمِعَا (2)

مؤرج نے کہا: اسے اس کے جثہ سے پکڑ لیا گیا اور اس سے مراد اس کی ذات ہے اور جثہ انسانی ذات ہے چاہے وہ بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہو۔ اور جثہ کا معنی ہے اس نے اسے اکھیڑ دیا جب کہ اجتثہ کا معنی ہے کہ وہ زمین کے اوپر سے اکھڑ گیا یعنی اس کا ایسا مضبوط تنا نہیں ہے جو زمین سے اپنی جڑوں کے ذریعے تری حاصل کرتا ہو۔

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ یعنی زمین میں کوئی جڑ باقی نہیں رہے گی۔ ایک قول کے مطابق قرار کا معنی ثبات ہے، پس اسی طرح کافر کے لیے نہ کوئی حجت ہوگی، نہ ثبات اور نہ اس میں کوئی بھلائی ہے، اور نہ اس کا کوئی پاکیزہ قول بلند ہوگا اور نہ ہی نیک عمل۔ معاویہ بن صالح نے علی بن ابی طلحہ سے اللہ کے ارشاد ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً کے بارے میں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: یہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ شجرہ طیبہ، مومن ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ سے مراد یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مومن کے دل میں ثابت ہے۔ اور وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ سے مراد شرک جب کہ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ سے مراد مشرک ہے۔ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ سے مراد یہ ہے کہ مشرک کی کوئی اصل ہی نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر وہ عمل کرے۔ ایک قول کے مطابق: ضرب المثل کا تعلق ایمان کی طرف دعوت اور شرک کی طرف دعوت کے ساتھ ہے، کیونکہ کلمۃ سے قول اور دعوت الی

1۔ تفسیر کشاف، سورۂ ابراہیم، جلد 2، صفحہ 553　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 135

النّشی ءمفہوم ہوتا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝

''ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس پختہ قول (کی برکت) سے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا(1): قول ثابت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ نسائی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا آپ نے فرمایا: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ عذاب قبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کہا جائے گا: تیرا رب کون ہے؟ بندہ کہے گا: میرا رب اللہ اور میرا دین دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، پس یہی اللہ کا ارشاد: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: امام مسلم کے بعض طرق میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اسی طرح مروی ہے کہ یہ آپ کا قول ہے جب کہ اس کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ مرفوع ہے جس طرح صحیح مسلم، نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں حضرت براء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے بھی اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے حدثنا جعفر بن عمر قال حدثنا شعبة عن علقمة بن مرثد عن سعد بن عبيدة عن البراء بن عازب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا: ''جب مومن کو اس کی قبر میں بٹھایا جائے گا تو اس کے پاس آنے والا آئے گا پھر وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں پس یہی اللہ کا ارشاد: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ہے''(2)۔

ہم (قرطبی) نے اس باب کو کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے اور یہ بھی ہم نے بیان کیا ہے کہ کس کو قبر میں آزمایا جائے گا اور اس سے سوال پوچھے جائیں گے؟ جو اس سے آگاہی چاہتا ہے وہ دوبارہ غور و فکر کرے۔ حضرت سہل بن عمار نے کہا: میں نے یزید بن ہارون کو ان کی موت کے بعد خواب میں دیکھا۔ میں نے انہیں کہا: اللہ نے تیرے ساتھ کیا (سلوک) کیا؟ اس نے کہا: میری قبر میں میرے پاس دو سخت قسم کے فرشتے آئے۔ انہوں نے کہا: تیرا دین کیا ہے، تیرا رب کون ہے، اور تیرا نبی کون ہے؟ میں نے اپنی سفید داڑھی کو پکڑا اور کہا: کیا مجھ جیسے آدمی کو یہ کہا جا سکتا ہے حالانکہ میں نے اسی سال تک تمہارے ان سوالوں کے جواب لوگوں کو سکھائے؟ وہ چلے گئے اور انہوں نے کہا: کیا تو نے حریز بن عثمان سے کوئی حدیث لکھی ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ تو انہوں نے کہا: وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض رکھتا تھا تو اللہ نے اسے مبغوض و مردود بنا دیا۔ ایک قول کے مطابق يُثَبِّتُ اللّٰهُ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قول ثابت پر دوام نصیب فرمائے گا، اسی سے حضرت عبداللہ بن رواحہ کا قول ہے:

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 553

2۔ معالم التنزیل، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 378، سنن ابی داؤد، باب فی المسألة فی القبر الخ، حدیث نمبر 4125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب ذکر القبر والبلی، حدیث نمبر 4258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یُثَبِّتُ اللہ مَا آتاکَ من حَسَنٍ تَثبِیتَ موسی و نَصراً کالذی نُصِرا(1)

ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ ان کی جزا کے طور پر انہیں دارین میں قول ثابت پر ثابت رکھے گا۔ قفال اور ایک جماعت نے کہا: فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا سے مراد فی القبر ہے، کیونکہ بعث بعد الموت تک مردہ دنیا میں ہی ہوتا ہے اور فِی الْاٰخِرَۃِ سے مراد عند الحساب، یعنی حساب کا وقت ہے۔ ماوردی نے اسے حضرت براء سے حکایت کیا ہے کہ آپ نے کہا: دنیوی زندگی سے مراد قبر میں سوال و جواب ہیں اور آخرت سے مراد قیامت کے سوال و جواب ہیں۔

وَ یُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ یعنی ان کی قبروں میں ان کی حجتوں سے ایسے ہی بھٹکا دے گا جس طرح دنیا میں اس نے انہیں ان کے کفر کے سبب بھٹکایا پس وہ انہیں حق کے کلمہ کی تلقین نہیں کرے گا، جب ان کی قبروں میں ان سے پوچھا جائے گا تو وہ کہیں گے: ہم نہیں جانتے، وہ کہے گا: نہ تو نے جانا اور نہ پڑھا، اس وقت روایات کے مطابق انہیں لوہے کے چابک کے ساتھ مارا جائے گا۔

ہم (قرطبی) نے اسے کتاب ''التذکرہ میں ذکر کیا ہے''۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ انہیں مہلت دے گا یہاں تک کہ دنیا میں وہ گمراہی میں بہت آگے چلے جائیں گے۔ وَ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ یعنی کسی قوم کو عذاب دینے اور گمراہ کرنے کے حوالے سے جس طرح وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس آیت کے نزول کا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے کہ جب آپ نے منکر نکیر کے سوالات اور میت کے جواب کے متعلق بتایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے پاس میری عقل ہوگی؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ آپ نے عرض کیا: کیا اس پر پردہ ڈال دیا جائے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر (یعنی) دوزخ میں، جھونکے جائیں گے اس میں اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اور بنا لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے مدمقابل تا کہ بھٹکا دیں (لوگوں کو) اس کی راہ سے آپ (انہیں) فرمایئے (کچھ وقت) لطف اٹھالو پھر یقیناً تمہارا انجام آگ کی طرف ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے بدلے کفر کیا یعنی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں مبعوث فرمایا تو انہوں نے آپ کی تکذیب کرتے ہوئے کفر اختیار کر لیا، اس سے مراد قریش ہیں اور آیت انہیں کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔

ایک قول یہ ہے: یہ آیت ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر کے مقام پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 135

جنگ کی۔ ابو الطفیل نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا ہے: یہ وہ قریش ہیں جنہیں بدر والے دن قتل کیا گیا۔ ایک قول یہ ہے: یہ قریش کے بنو مخزوم اور بنو امیہ کے فاجروں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جہاں تک بنی امیہ کا تعلق ہے تو انہوں نے ایک وقت تک لطف اٹھایا جب کہ بنی مخزوم کو بدر میں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ عرب کے نصرانی جبلہ بن ایہم اور اس کے دوست ہیں کہ جب اس نے تھپڑ مارا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے بھی قصاص لازم کیا، تو اس نے اس بات کو پسند نہ کیا اور عیسائی بنتے ہوئے مرتد ہو گیا اور اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ روم چلا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے(1)۔ اور جب روم پہنچا تو پھر شرمندہ ہوا اور یہ اشعار کہے:

تَنَصَّرَتِ الأَشرافُ من عارِ لَطْمَةٍ   وما كان فيها لو صَبَرْتُ لها ضَرَرْ

تَكَنَّفَنِي منها لَجاجٌ و نَخْوَةٌ   وبِعتُ لها العينَ الصحيحة بالعَوَرْ

فياليتني أَرْعَى المَخاضَ ببلدةٍ   ولم أنكر القول الذى قاله عُمَرْ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تمام مشرکین کے متعلق عام حکم ہے(2)۔ وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ یعنی انہیں اتارا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بدر والے دن مشرکین کی قیادت کرنے والے لوگ ہیں انہوں نے اپنی قوم کو اتارا یعنی جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ دَارَ الْبَوَارِ ایک قول کے مطابق ابن زید کے نزدیک اس سے مراد جہنم ہے۔ ایک قول کے مطابق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور مجاہد کے نزدیک اس سے مراد بدر کا دن ہے اور بوار ہلاکت کو کہتے ہیں اسی سے شاعر کا قول ہے:

فلم أَرَ مثلهُمْ أبطالَ حَرْبٍ   غداةَ الحرب إِذْ خِيفَ البَوَارُ (3)

میں نے جنگ کی صبح ان جیسا بہادر نہیں دیکھا جب ہلاکت کا خوف ہو۔

جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ دَارَ الْبَوَارِ سے مراد جہنم ہے۔ اس صورت میں دَارَ الْبَوَارِ پر وقف کرنا جائز نہیں، کیونکہ جہنم دَارَ الْبَوَارِ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں ھی مضمر ہوگا یعنی ھی جہنم یا پھر یَصْلَوْنَهَا میں پائی جانے والی ضمیر کی وجہ سے مرفوع ہوگا کیونکہ دَارَ الْبَوَارِ پر وقف کرنا عمدہ بات ہے۔ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ قرار سے مراد ٹھکانا ہے۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا اس سے مراد بت ہیں جن کی انہوں نے عبادت کی۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ، سبیل سے مراد دین ہے، یعنی تا کہ لوگوں کو اس کے دین سے بھٹکا دیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح سورۃ الحج میں لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ (الحج: 9) اسی طرح سورۂ لقمان اور سورۃ الزمر میں ہے جب کہ باقیوں نے لیضلوا الناس عن سبیلہ یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جس نے فتح دیا ہے تو اس نے ھم یضلون عن سبیل اللہ لازم پڑھا ہے یعنی ان کا انجام گمراہ کرنا اور گمراہی ہے۔ یہ لام لام عاقبت ہے۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا ان کے لیے وعید ہے اور یہ دنیا میں پائی جانے والی لذت کے قلیل ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ ختم ہو جانے والی ہیں۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 136 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 137

فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ یعنی ان کے لوٹنے کی جگہ اور ان کا ٹھکانہ جہنم کا عذاب ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ۝

''آپ فرمایئے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ صحیح صحیح ادا کیا کریں نماز اور خرچ کیا کریں اس سے جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ اس سے بیشتر کہ آ جائے وہ دن جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی اہل مکہ نے اللہ کی نعمت کو کفر کے ساتھ تبدیل کر لیا ہے سو آپ اسے فرمایئے جو ایمان لایا اور جس نے اپنی عبودیت کو ثابت کر دیا ہے کہ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی پانچوں نمازیں ادا کریں، یعنی آپ ان کو ارشاد فرمائیں کہ قائم کرو، امر کے ساتھ شرط مقدر ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: اللہ کی اطاعت کر وہ تجھے جنت میں داخل کرے گا، یعنی اگر تو اس کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے جنت میں داخل کرے گا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: يُقِيْمُوا مجزوم ہے اصل میں۔ لیقیموا ہے لام کو ساقط کر دیا گیا ہے کیونکہ قل کی وجہ سے غائب کا صیغہ ہونے کے باوجود امر پر دلالت کرتا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ یقیموا کہا جائے اور یہ امر محذوف کا جواب ہو، یعنی قل لهم اقیموا الصلاۃ یقیموا الصلاۃ...... وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً اس سے مراد زکوۃ ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ جمہور نے کہا: سر سے مراد وہ ہے جو مخفی ہے اور علانیہ سے مراد وہ جو ظاہر ہے۔ قاسم بن یحییٰ نے کہا(1) کہ سر سے مراد نفل اور علانیہ سے مراد فرض (صدقات) ہیں۔ سورۂ بقرہ آیت 271 اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ کے تحت اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ یہ بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور خلال، خلقی جمع ہے جیسے قلتی جمع قلال آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فلستُ بمقلي الخِلالِ ولا قالِ(2)

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۝ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا بلندی سے پانی پھر پیدا کیے اس پانی سے پھل تمہارے کھانے کے لیے اور اس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے کشتی کو تا کہ وہ چلے سمندر میں اس کے حکم سے

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 137 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 139

اور تابع فرمان کر دیا تمہارے لیے دریاؤں کو۔ اور مسخر کر دیا تمہارے لیے آفتاب و مہتاب کو جو برابر چل رہے ہیں اور مسخر کر دیا تمہارے لیے رات اور دن کو۔ اور عطا فرمایا تمہیں ہر اس چیز سے جس کا تم نے اس سے سوال کیا، اور اگر تم گننا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے، بے شک انسان بہت زیادتی کرنے والا، از حد ناشکرا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یعنی بغیر کسی مثال کے اس نے ان کو بنایا اور ایجاد فرمایا۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ یعنی بادلوں سے مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ یعنی درخت سے پھل نکالے۔ رِزْقًا لَّكُمْ تمہارے کھانے کے لیے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ اس کی تشریح سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ یعنی میٹھے دریا مسخر کیے تاکہ تم ان سے پانی پیو، کھیتیوں کو سیراب کرو اور کاشت کاری کرو، اور نمکین دریا مختلف فوائد کے حصول کے لیے مسخر کیے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ یعنی نباتات وغیرہ میں سے جن کی اصلاح ان کے ذریعے ممکن ہوتی ہے ان کی اصلاح میں اللہ تعالیٰ نے سورج و چاند کو مسخر کر دیا ہے اور الدُّؤوب سے مراد عادت جاریہ کے مطابق کام میں کسی چیز کا چلنا اور گزرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ دائبین فی السیر اللہ کے امر کے لیے امتثال ہے اور معنی یہ ہے کہ قیامت تک یہ دونوں چلتے رہیں گے ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اس کا یہ معنی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ یعنی تاکہ تم رات میں سکون کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (القصص: 73) ہے یعنی اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن بنایا تاکہ تم اس میں سکون کرو اور اس کا فضل تلاش کرو۔

قولہ تعالیٰ: وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت یہ ہے: وأعطاكم من كلّ مسئول سألتموه شيئا یعنی تمہیں ہر اس چیز سے عطا کیا جس کا تم نے اس سے سوال کیا، یہ اخفش کے نزدیک ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہوگا کہ تمہیں ہر اس چیز سے عطا کیا جس کا تم نے اس سے سوال کیا اور ہر اس چیز سے جس کا تم نے سوال نہیں کیا، بعد والے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے (یہ معنی اس لیے بھی صحیح ہوگا) کہ سورج، چاند اور بہت سی نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ابتداء میں عطا فرمائیں ان کے بارے میں ہم نے اس سے سوال نہیں کیا، یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) ارشاد فرمایا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ایک قول کے مطابق من زائدہ ہے، یعنی أتاكم كلّ ما سألتموه حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک وغیرہ نے وأتاكم من كلٍّ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے یہ قراءت حضرت حسن بصری، ضحاک اور حضرت قتادہ سے مروی ہے اور نفی کی صورت میں یہ من کلّ مالم تسألوه ہوگا یعنی ہر اس چیز سے جس کا تم نے سوال نہیں کیا، جیسے سورج اور چاند وغیرہ۔ ایک قول یہ ہے کہ ما سألتموه، الذی سألتموه ہے یعنی ما معنی الذی ہے۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ یعنی اللہ کی نعمتوں کو نہ تم گن سکتے ہو اور نہ ہی شمار کرنے کی طاقت رکھتے ہو، اور ان کی کثرت کی وجہ سے ان کا حصر ممکن نہیں جیسے سماعت، بصارت، انسانی شکل و صورت علاوہ ازیں عافیت اور رزق وغیرہ۔ یہ ساری کی ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ہیں، پس تم اللہ کی نعمتوں کو کفر کے ساتھ کیوں تبدیل کرتے ہو؟ اور ان نعمتوں کے ذریعے اللہ کی اطاعت پر مدد کیوں نہیں طلب کرتے؟ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، اَلْاِنْسَانَ لفظ تو جنس پر دلالت کرتا ہے مگر اس کی مراد مخصوص ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ابو جہل ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد سارے کفار ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

"اور (اے حبیب!) یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب! بنادے اس شہر کو امن والا اور بچا لے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی: اے میرے پروردگار! ان بتوں نے تو گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور و رحیم ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، هٰذَا الْبَلَدَ سے مراد مکہ ہے سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ یعنی مجھے ان (بتوں) کی عبادت سے ایک طرف کر دے۔ اور بنی کے قول سے آپ کی مراد آپ کے صلبی بیٹے تھے جن کی تعداد آٹھ تھی، اور ان میں سے کسی ایک نے بھی بتوں کی عبادت نہیں کی۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ ہر اس آدمی کے لیے دعا ہے اللہ تعالیٰ جس کے لیے دعا چاہے۔

جحدری اور عیسیٰ نے واجنبنی الف قطعی کے ساتھ پڑھا ہے معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے، کہا جاتا ہے: جنبت ذالك الأمر، وأجنبتہ و جنبتہ ایاہ، فتجانبہ واجتنبہ ان کا معنی ہوگا: اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ ابراہیم تیمی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصص کے بارے میں کہتے تھے: حضرت خلیل کے بعد کون مطمئن ہوتا ہے جب آپ کہتے ہیں: مجھے بچا لے اور میرے بچوں کو کہ ہم بتوں کی پوجا کریں جس طرح میرے باپ اور قوم نے ان کی پوجا کی۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بت چونکہ گمراہی کا سبب تھے اس لیے مجازاً فعل کی اضافت ان کی جانب کر دی گئی ہے، ورنہ تو بت جمادات ہیں جو فعل کر ہی نہیں سکتے۔ فَمَنْ تَبِعَنِيْ یعنی توحید (خداوندی کو ماننے) میں جس نے میری پیروی کی۔ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ یعنی وہ میرے دین پر ہے۔ وَ مَنْ عَصَانِيْ یعنی جس نے شرک پر اصرار کیا۔ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ایک قول یہ ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات تب کی تھی جب ابھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات سے آگاہ نہیں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔ اور ایک قول یہ ہے: تو اس کے لیے غفور اور رحیم ہے جس نے موت سے پہلے اپنی نافرمانی اور گناہ سے توبہ کر لی۔ مقاتل بن حیان نے کہا: وَ مَنْ عَصَانِيْ سے مراد یہ ہے کہ جس نے شرک سے کم معاملات میں میری نافرمانی کی۔

رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۝

"اے ہمارے رب! میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں اے ہمارے رب! یہ اس لیے تا کہ وہ قائم کریں نماز پس کر دے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تا کہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: عورتوں میں سب سے پہلے پٹی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں کی طرف سے باندھی گئی آپ نے اس لیے پٹی باندھی تا کہ حضرت سارہ کو آپ اپنے اثر سے بچا سکیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے اسماعیل کو لے کر آئے حضرت اسماعیل ابھی دودھ پیتے تھے حتیٰ کہ ان دونوں کو آپ نے زمزم کے اوپر بیت اللہ میں چھوڑ دیا، اس وقت مکہ میں کوئی بھی آباد نہیں تھا، اور نہ ہی پانی تھا، ان دونوں کو وہاں چھوڑا، ایک تھیلا ان کے پاس رکھا جس میں کھجوریں تھیں اور ایک مشکیزہ رکھا جس میں پانی تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس پلٹے ام اسماعیل نے آپ کا پیچھا کیا، عرض کی: اے ابراہیم! آپ کہاں جا رہے ہیں اور ہمیں ایسی وادی میں چھوڑ دیا ہے جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز؟ آپ مسلسل یہی کہتی رہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی توجہ نہ دی، پھر حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ آپ نے کہا: پھر وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ اور واپس لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے رہے یہاں تک کہ جب ثنیہ میں ایسی جگہ پر پہنچے جہاں سے آپ انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے، تو وہاں قبلہ کی طرف اپنا منہ کیا اور یہ دعائیں مانگی، اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور عرض کیا: رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ سے لے کر يَشْكُرُوْنَ تک۔

حضرت اسماعیل کی ماں حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی رہی اور اس پانی سے پیتی رہی، حتیٰ کہ جب پانی ختم ہو گیا تو آپ کو بھی سخت پیاس لگی اور آپ کے بیٹے کو بھی اور آپ بیٹے کو مٹی پر لوٹتے ہوئے دیکھتی رہی، اس حالت میں جب نہ دیکھا گیا تو چل پڑیں، پاس ہی صفا پہاڑ کو آپ نے دیکھا، تو اس پر چڑھ گئیں، پھر وادی کی طرف منہ کیا کہ شاید کوئی آدمی نظر آ جائے، مگر کوئی بھی نظر نہ آیا تو صفا سے اتریں، وادی میں پہنچیں، اپنی اوڑھنی کے کنارے کو اٹھایا پھر مجبور انسان کی طرح دوڑنے لگیں، پھر وادی کو عبور کیا تو مروہ پہاڑ سامنے آیا اس پر چڑھ گئیں، دیکھا کہ شاید کوئی نظر آ جائے مگر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ سات مرتبہ آپ نے ایسے ہی کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پس یہی لوگوں کی صفا و مروہ کے درمیان سعی ہے"۔ جب آپ مروہ پر سے جھانکیں تو آپ نے ایک آواز سنی آپ نے کہا: رک جا! پھر توجہ سے آواز سنی تو پھر وہی آواز سنائی دی تو آپ نے کہا: تو نے مجھے آواز سنائی کیا تیرے پاس کوئی مدد ہے؟ تو تب ایک فرشتہ مقام زمزم کے پاس تھا اس نے اپنا پیر مارا حتیٰ کہ پانی ظاہر ہو گیا۔ آپ نے اسے بھرنا شروع کر دیا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے یہ (زمزم) کہہ رہی تھیں اور پانی

سے چلو بھر بھر کر اپنے مشکیزے میں ڈالنا شروع کر دیا مگر وہ ابلتا ہی رہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم کرے اگر وہ زمزم کو یونہی چھوڑ دیتی تو زمزم ایک چشمہ جاری ہوتا''۔ آپ نے فرمایا'' آپ نے خود پانی پیا اور اپنے بچے کو دودھ پلایا تو فرشتے نے آپ کو کہا: مت ڈرو یہاں بیت اللہ ہے اسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کریں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کے اہل کو کبھی ضائع نہیں ہونے دے گا''۔ اور لمبی حدیث کو ذکر کیا۔

مسئلہ۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ عزیز و رحیم پروردگار پر بھروسہ کرتے ہوئے اس واقعہ کی وجہ سے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی اقتدا کرتے ہوئے اپنے بیٹے اور گھر والوں کو کسی ایسی زمین میں چھوڑ دے جہاں ان کے ضیاع کا خطرہ ہو، جس طرح غالی قسم کے صوفیہ حقیقت توکل کے بارے میں کہتے ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کیا تھا۔ حدیث طیبہ میں موجود یہ الفاظ کہ'' کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ اور آپ کا فرمانا: ہاں''۔ اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی تو حضرت سارہ، حضرت ہاجرہ سے رشک کرنے لگیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں لے کر مکہ آ گئے۔ اور روایت ہے کہ آپ، حضرت ہاجرہ اور بچہ تینوں براق پر سوار ہوئے اور ایک ہی دن میں شام سے مکہ پہنچ گئے، اپنے بیٹے اور اس کی ماں کو وہیں چھوڑا اور اسی دن سوار ہو کر خود واپس لوٹ گئے۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی وجہ سے ہوا، جب واپس لوٹے تو یہ دعا کی جو اس آیت میں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے حال کی بنیاد، مقام کے آغاز، عزت والے گھر اور حرمت والے شہر کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو فرشتے کو بھیجا، اس نے پانی تلاش کیا اور اس پانی کو غذا کے قائم مقام بنا دیا۔ الصحیح میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تیس دن اور رات اسی پر گزارا کیا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے پاس سوائے ماء زمزم کے کوئی کھانا نہ تھا تو میں موٹا ہو گیا یہاں تک کہ میرے پیٹ کے بٹ (بل) ٹوٹ گئے اور مجھے بھوک کی وجہ سے کمزوری کا احساس تک نہ ہوا، لمبی حدیث کو انہوں نے ذکر کیا۔

دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمزم کا پانی اسی مقصد کے لیے ہے جس کے لیے پیا جائے اگر تو اسے اس لیے پیئے گا کہ شفا حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے شفا دے گا اور اگر اس لیے پیئے گا کہ تو سیر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ تجھے اس کے ذریعے سیر کر دے گا اور اگر پیاس بجھانے کے لیے پیے گا تو وہ تیری پیاس بجھائے گا یہ جبریل کے پر مارنے کی وجہ سے پیدا ہوا اور حضرت اسماعیل کو اللہ نے سیراب کیا''۔ حضرت عکرمہ سے بھی مروی ہے کہ آپ نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب زمزم سے پیتے تو عرض کرتے: اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع، وسیع رزق اور ہر بیماری سے شفا کا سوال کرتا ہوں۔ ابن عربی نے کہا: اس میں یہ اثرات قیامت تک ہر اس آدمی کے لیے موجود ہیں جس کی نیت صحیح ہو اور اس کی خواہش سلامت ہو نہ تو وہ اس کی تکذیب کرنے والا ہو اور نہ ہی تجرباتی طور پر وہ اسے پی رہا ہو۔ بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کے ساتھ ہے اور وہ تجربہ کرنے والوں کو ناکام و نامراد کرتا ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن علی ترمذی نے کہا کہ مجھے میرے باپ رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا انہوں نے کہا: ایک تاریک رات میں میں نے طواف شروع کیا تو مجھے پیشاب کا مسئلہ لاحق ہو گیا جس نے مجھے

مصروف کر دیا، میں نے اسے روکنا شروع کیا حتیٰ کہ اس نے مجھے اذیت دی اور مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ اگر میں مسجد سے نکلا تو کوئی مجھے روند ڈالے گا اور وہ حج کے دن تھے، تو مجھے یہ حدیث یاد آ گئی۔ میں زمزم میں داخل ہوا اور اتنا پیا کہ میری پسلیاں اکڑ گئیں، تو صبح تک میرا مسئلہ ختم ہو گیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: زمزم رکن یمانی کی طرف جنت میں ایک چشمہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں من تبعیضہ ہے یعنی أسکنت بعض ذرّیتی یعنی اسماعیل اور اس کی ماں، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام تو شام میں تھے۔ ایک قول کے مطابق یہ صلہ ہے، یعنی اسکنت ذرّیتی۔

مسئلہ نمبر 4۔ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ یہ ارشاد بیت اللہ کے قدیم ہونے پر دلالت کرتا ہے جس طرح مروی ہے کہ یہ طوفان نوح علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام (1) نے بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی کہ اللہ کے علاوہ کوئی اس کا مالک نہیں، اور اس کی صفت محرم کے ساتھ اس لیے بیان فرمائی کیونکہ کچھ چیزیں جماع اور دیگر امور میں سے ایسی ہیں جو اس میں حرام ہیں جب کہ دیگر بیوت میں مباح اور جائز ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت قتادہ وغیرہ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ یہ جابروں پر حرام ہے اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ دین کے جملہ معاملات میں سے نماز کو خاص کرنے کی وجہ ایک تو نماز کی فضیلت ہے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اہمیت ہے، اور یہ بندوں کے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک عہد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لکھ دیں ہیں'' (2)۔ الحدیث۔ لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں لام ہے۔ یہ اس کے متعلق ظاہر بات ہے اور یہ اَسْكَنْتُ کے متعلق ہوگی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لام امر ہو، گویا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف اس سلسلہ میں راغب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں نماز قائم کرنے کی توفیق دے۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت اپنے ضمن میں اس بات کو لیے ہوئے ہے کہ مکہ میں نماز پڑھنا دیگر مقامات میں نماز کی ادائیگی کی نسبت افضل ہے، کیونکہ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا معنی یہ ہے کہ میں نے انہیں تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں بسا دیا تا کہ یہ اس میں نماز ادا کریں۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا مکے میں نماز افضل ہے یا مسجد نبوی میں؟ عام محدثین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک سو نماز کی ادائیگی سے افضل ہے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (3): ''میری اس مسجد میں نماز کی ادائیگی دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز کی ادائیگی سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں ایک سو نماز کی ادائیگی سے افضل ہے''۔ امام حافظ ابو عمر نے کہا: وہ ثقہ تھے۔ اور اس حدیث کو حبیب المعلم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 138

2۔ کنز العمال، کتاب الاکمال، فی فضائل الصلوٰۃ، جلد 7، صفحہ 227، حدیث 18861۔

ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی المحافظۃ علی وقت الصلوات، حدیث 361، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب ماجاء فی فرض الصلوات الخمس، حدیث 390، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، فضائل مدینۃ وماحولھا، جلد 12، صفحہ 235، حدیث 34822

نے عطاء بن ابی رباح عن عبد اللہ بن زبیر بیان کیا ہے اور اسے عمدہ قرار دیا ہے، نہ اس کے الفاظ میں کوئی ملاوٹ کی اور نہ ہی معنی میں۔ ابن ابی خیثمہ نے کہا کہ میں نے یحییٰ بن معین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: حبیب المعلم ثقہ ہے۔ عبد اللہ بن احمد نے ذکر کیا ہے کہ میں نے اپنے باپ کو کہتے ہوئے سنا: حبیب المعلم ثقہ ہے اس کی بیان کردہ حدیث کتنی زیادہ صحیح ہے۔ ابوزرعہ رازی سے حبیب المعلم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: یہ بصری ہے، ثقہ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: حبیب المعلم کی اس حدیث کو عطاء بن ابی رباح عن عبد اللہ بن زبیر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حافظ ابو حاتم محمد بن حاتم التیمی البستی نے اپنی المسند الصحیح میں بیان کیا ہے۔ پس حدیث صحیح ہے اور تنازع اور اختلاف کی صورت میں حجت ہے والحمد للہ۔ موسیٰ جہنی نے نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور موسیٰ جہنی ثقہ ہیں ان پر قطان، احمد، یحییٰ اور ان کی جماعت نے اعتماد کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے اور شعبہ، ثوری اور یحییٰ بن سعید نے ان سے روایت کیا ہے اور حکیم بن سیف نے روایت بیان کی ہے حدثنا عبید اللہ بن عمر عن عبد الکریم عن عطاء بن ابی رباح عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام کی ایک نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے'' (1)۔ اور یہ حکیم بن سیف اہل رقہ کے شیخ ہیں ان سے ابوزرعہ رازی نے روایت کیا ہے اور ابن وضاح نے ان سے لیا ہے، اور یہ ان کے نزدیک شیخ صدوق ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ پس اگر تو اس نے یاد کیا تھا تو پھر تو یہ دونوں حدیثیں ہیں ورنہ حبیب المعلم کا قول ہے۔ اور محمد بن وضاح نے روایت بیان کی ہے حدثنا یوسف بن عدی بن عمر بن عبید عن عبد الملک عن عطا عن ابن عمر رضی اللہ عنہما آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد کی ایک نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے کیونکہ مسجد حرام کی نماز افضل ہے'' (2)۔ ابو عمر نے کہا: یہ سارے کا سارا اختلاف کے مقام میں نص ہے اور ہدایت یافتہ آدمی کے لیے قطعی ہے، اور اس کی وجہ سے اس کی عصبیت پر کوئی ملال نہیں آتا۔ ابن حبیب نے مطرف اور اصبغ سے عن ابن وہب ذکر کیا ہے کہ ان دونوں کا نظریہ مسجد نبوی میں نماز کی ادائیگی پر مسجد حرام کی نماز کی ادائیگی کی فضیلت کا تھا۔

امام مالک اور تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیدین کی نماز ہر شہر میں کھلے میدان میں پڑھی جائے گی سوائے مکہ مکرمہ کے وہاں مسجد حرام میں پڑھی جاتی ہے۔ اور حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو الدرداء، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم مکہ اور اس کی مساجد کو فضیلت دیتے تھے اور ان کی تقلید بعد والوں کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے۔ یہی نقطہ نظر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور یہی عطا، اہل مکہ اور اہل کوفہ کا قول ہے۔ اسی طرح حضرت امام مالک سے بھی مروی ہے۔ ابن وہب نے اپنی جامع میں امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تو آپ نے عرض کیا: اے میرے

1۔ کنز العمال، فضائل مدینہ وما حولها، جلد 12، صفحہ 235، حدیث 34821

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل المساجد الثلاثة، جلد 1، صفحہ 447-446

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی فضل الصلاۃ فی المسجد الحرام الخ، حدیث نمبر 1395، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پروردگار! کیا یہ تیرے نزدیک پسندیدہ ہے کہ اس میں تیری عبادت کی جائے؟ اللہ نے فرمایا: بلکہ مکہ میں، جب کہ آپ سے اور اہل مدینہ سے مشہور مدینہ کی فضیلت کا قول ہے۔ اہل بصرہ اور بغداد نے اس سلسلے میں اختلاف کیا ہے ایک گروہ نے مکہ کی افضلیت کی بات کی ہے اور ایک جماعت نے مدینہ کی۔

قولہ تعالیٰ: فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ، الافئدة، فواد کی جمع ہے(1) اور اس سے مراد دل ہیں اور بعض اوقات قلب کو فواد سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، جس طرح شاعر نے کہا ہے:

وَاِنَّ فُؤَاداً قَادَنِی بِصَبَابَةٍ اِلَیكِ علی طولِ المَدَی لَصَبُورُ(2)

اس میں فواد سے مراد دل ہے۔

ایک قول یہ ہے: یہ وفد کی جمع ہے اس کی اصل اوفدہ ہے، فا کو مقدم کیا گیا اور واؤ کو یا سے بدل دیا گیا تو أفئدہ ہو گیا، گویا کہ آپ نے فرمایا: واجعل وفوداً من الناس تھوی إلیھم یعنی وہ ان کی طرف مائل ہوں۔ جب کوئی چیز مائل ہو اور جھکے تو ھوی نحوہ کہا جاتا ہے، اور جب کوئی اونٹنی بہت زیادہ تیز دوڑے تو کہا جاتا ہے۔ هَوَتْ النَّاقَةُ تَهْوِي هَوِيًا فهي هَاوِيَةٌ گویا کہ وہ کھلی ہوا میں ہے۔ اور تھوی إلیھم اسی سے ماخوذ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اگر آپ نے افئدة الناس کہا ہوتا تو فارس، روم، ترک اور ہند کے لوگ اسی طرح یہودی، نصرانی اور مجوسی ان کے پاس پہنچ جاتے، لیکن آپ نے افئدة من الناس کہا تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ تھوی الیھم یعنی وہ ان کے مشتاق ہو جائیں، اور بیت اللہ کی زیارت کے مشتاق ہو جائیں۔ مجاہد نے تھوی الیھم پڑھا ہے یعنی وہ ان کی طرف مائل ہے اور ان کی تعظیم کرتا ہے۔ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ۔

پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی اور طائف میں ان کے لیے سارے درخت اگا دیے، اور سارے شہروں کے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آئے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے جس کا بعض حصہ ہم نے ذکر کیا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کرنے کے بعد تشریف لائے تو آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا، آپ کی بیوی سے آپ کے متعلق پوچھا، اس نے کہا: ہمارے لیے کچھ لینے نکلے ہیں، پھر آپ نے ان سے ان کی زندگی اور کیفیت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ہم برائی میں ہیں، ہم تنگی اور سختی میں ہیں، اس نے آپ کے سامنے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: جب تیرا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور اسے کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ تبدیل کر، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو گویا آپ کسی چیز سے مانوس ہوئے آپ نے کہا: کیا کوئی تمہارے پاس آیا ہے؟ بیوی نے کہا: ہاں ہمارے پاس اس طرح کا بوڑھا آیا تھا، اس نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا میں نے اسے بتایا، اس نے مجھ سے ہماری زندگی کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ ہم مشکل اور شدت میں ہیں۔ آپ نے کہا: کیا اس نے کسی چیز کے بارے میں وصیت بھی کی؟ بیوی نے کہا: اس نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو سلام دوں اور وہ کہتا تھا: اپنے دروازے کی چوکھٹ تبدیل کرو۔ آپ نے فرمایا: وہ میرا باپ تھا اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے جدا کر دوں

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 138 2۔ ایضاً

سو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا، آپ نے اسے طلاق دے دی اور ایک اور عورت سے شادی کر لی، پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف نہ لائے پھر کچھ عرصہ کے بعد آپ ان کے پاس آئے تو آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا، آپ کی بیوی کے پاس گئے اور آپ کے بارے میں اس سے پوچھا، اس نے کہا: وہ ہمارے لیے کچھ لینے نکلے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم کیسے ہو؟ اور آپ نے اس سے زندگی اور ان کی کیفیت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ہم بھلائی اور خیر سے ہیں اور اس نے اللہ کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا: تمہارا کھانا کیا ہے؟ اس نے کہا: گوشت۔ آپ نے فرمایا: تمہارا پینا کیا ہے؟ اس نے کہا: پانی۔ آپ نے کہا: اے اللہ! ان کے لیے گوشت اور پانی کو مبارک فرما۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس دن ان کے پاس کوئی دانہ نہیں تھا اگر ہوتا تو آپ اس میں برکت کی دعا بھی کرتے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''مکہ کے علاوہ جس نے بھی ان دونوں (پانی اور گوشت) پر اعتماد کیا یہ اسے موافق نہیں آئے'' (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ کہنا گویا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرنا تھا کہ لوگ مکہ کو رہائش گاہ بنا لیں، اور یہ حرمت والا گھر ہو جائے، اور یہ سب کچھ قبول ہوا۔ والحمد للہ۔

سب سے پہلے جو آدمی رہائش پذیر ہوا وہ قبیلہ جرہم کا تھا۔ بخاری میں ہے کہ بیت اللہ زمین سے بلند تھا اور اس طرح تھا جس طرح جھاگ اٹھی ہوئی ہو، جب سیلاب آتا تو دائیں بائیں سے اسے کاٹتا چلا جاتا، اسی طرح صورتحال رہی حتی کہ قبیلہ جرہم کا ایک قافلہ اس راستے سے گزرا، وہ مکہ کے زیریں علاقے میں اترے، انہوں نے ایک پرندے کو چکر لگاتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ پرندہ پانی پر چکر لگا رہا ہے، اس وادی میں پانی کی تلاش کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ انہوں نے ایک یا کئی قاصد بھیجے تو وہ پانی تک پہنچ گئے، انہوں نے انہیں پانی کے بارے میں بتایا تو وہ سارے پانی کے پاس آ گئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں پانی کے پاس تھیں۔ انہوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دیں گی؟ آپ نے فرمایا: ہاں لیکن پانی پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا: ہاں (ٹھیک ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں نے اس قبیلے کو پا لیا درآنحالیکہ آپ انس کو پسند کرتی تھیں۔ وہ اترے اور اپنے گھر والوں کی طرف پیغام بھیجا وہ بھی ان کے ساتھ رہائش پذیر ہو گئے یہاں تک کہ ان کے کئی گھر بن گئے، بچہ جوان ہو گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں کا انتقال ہو گیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد تشریف لائے'' (2)، الحدیث۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 475 2۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 385

دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

''اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم (دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (جیسے فرزند) بلاشبہ میرا رب بہت سننے والا ہے دعاؤں کا۔ میرے رب! بنادے مجھے نماز کو قائم کرنے والا اور میری اولاد کو بھی، اے ہمارے رب! میری یہ التجا ضرور قبول فرما۔ اے ہمارے رب! بخش دے مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سب مومنوں کو جس دن حساب قائم ہوگا''۔

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ یعنی تجھ پر ہمارے حالات میں سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل نے کہا: اسماعیل اور اس کی ماں کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کر ان کے متعلق جو میرے جذبات ہیں جن کو میں نے دل میں چھپا رکھا ہے اور جن کو میں نے ظاہر کر رکھا ہے تو سب کو جانتا ہے۔ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ایک قول یہ ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ کہا تو اللہ تعالیٰ نے وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ یعنی میرے اور میری بیوی کے بڑھاپے میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیانوے سال تھی اور حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت ایک سو بیس سال کی عمر تھی۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک سو دس سال کی عمر میں حضرت اسحاق کی بشارت دی گئی۔ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ۔

قولہ تعالیٰ: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ یعنی اسلام پر ثابت قدم اور اس کے احکام کا التزام کرنے والا بنا۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ یعنی میری اولاد کو بھی یہ دونوں کام کرنے والا بنا۔ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ، دُعَآءِ سے مراد عبادت ہے یعنی میری عبادت کو قبول فرما، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) اور تمہارے رب نے فرمایا: میری عبادت کرو میں تمہاری (عبادت کو) قبول کروں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دعا عبادت کا مغز ہے''(1)۔ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ ایک قول یہ ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کے لیے تب دعا مانگی جب ابھی آپ کے نزدیک یہ بات ثابت نہیں تھی کہ وہ دونوں اللہ کے دشمن ہیں۔ قشیری نے کہا: یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ آپ کی ماں مسلمان ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اپنے باپ کے استغفار کے بارے میں عذر کو ذکر کیا ہے۔ ماں کے استغفار کے بارے میں عذر کو ذکر نہیں فرمایا۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس وجہ سے حضرت سعید بن جبیر کی قراءت رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدِيْ ہے یعنی میرے باپ کو بخش دے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے ان دونوں کے ایمان کی لالچ میں دونوں کے لیے استغفار کیا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ما جاء فی فضل الدعاء، جلد 2، صفحہ 173

ان دونوں کے لیے اس شرط کے ساتھ استغفار کیا کہ وہ دونوں اسلام لے آئیں۔ اور ایک قول یہ ہے: والدین سے آپ کی مراد حضرت آدم علیہ السلام و حضرت حوا علیہما السلام ہیں۔

روایت ہے کہ بندہ جب رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ کہے اور اس کے والدین حالت کفر میں مر چکے ہوں تو مغفرت کی نسبت حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی طرف ہو جاتی ہے کیونکہ وہ ساری مخلوق کے والدین ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے دونوں بیٹے حضرت اسماعیل و حضرت اسحاق علیہما السلام ہیں۔ ابراہیم نخعی، وَلِوَلَدَیَّ پڑھتے تھے یعنی آپ کے دونوں بیٹے، یحییٰ بن یعمر نے بھی اسی طرح پڑھا ہے (1)۔ اس کو ماوردی اور نحاس نے ذکر کیا ہے۔ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مومنین ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: تمام مومنین کے لیے دعا ہے اور یہی زیادہ ظاہر اور مناسب ہے۔ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ یعنی جس دن لوگ حساب کے لیے کھڑے ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿ؕ۴۳﴾

"اور تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں وہ تو انہیں صرف ڈھیل دے رہا ہے اس دن کے۔ یہ جب کہ (مارے خوف کے) کھلی کی کھلی رہ جائیں گی آنکھیں۔ بھاگم بھاگ جا رہے ہوں گے اپنے سر اٹھائے ہوئے ان کی پلکیں نہیں جھپکتی ہوں گی اور ان کے دل (دہشت سے) اڑے جا رہے ہوں گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ مشرکین کے افعال اور ان کی دین ابراہیمی کی مخالفت سے نبی کو حیران کرنے کے بعد یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے، یعنی صبر کرو جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صبر کیا اور مشرکین کو بتاؤ کہ عذاب کی تاخیر کا مطلب ان کی کارروائیوں پر رضامندی کا اظہار نہیں بلکہ کچھ مدت کے لیے نافرمانوں کو مہلت دینے کی سنت الٰہیہ ہے۔ میمون بن مہران نے کہا: یہ ظالم کے لیے وعید اور مظلوم کے لیے تعزیت و تسلی ہے (2)۔ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ، هُمْ ضمیر سے مراد مشرکین مکہ ہیں یعنی وہ انہیں مہلت دیتا ہے اور ان کے عذاب کو مؤخر کرتا ہے۔ عام لوگوں کی قراءت یُؤَخِّرُهُمْ یاء کے ساتھ ہے اور ابو عبید اور ابو حاتم نے وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ کی وجہ سے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حسن اور سلمی نے اسے نُؤَخِّرُهُمْ نون کے ساتھ تعظیماً پڑھا ہے اور ابو عمرو سے بھی یہی مروی ہے۔

لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ فراء کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن میں جو ہولناکی کا وہ مشاہدہ کریں گے اس سے آنکھ بند نہیں کر سکیں گے۔ شَخَصَ الرجل بَصَرَہٗ و شَخَصَ البصرُ نفسہ کہا جاتا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا اس کی ہولناکی سے اس کی نظر اٹھی اور بلند ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شدت حیرت کے سبب

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 139
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 140

اس دن مخلوق کی آنکھیں ہوا کی طرف کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور وہ بند نہیں کر سکیں گے۔ مُهْطِعِيْنَ یعنی جلدی جلدی، یہ حضرت حسن، حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے، یہ أهطع يهطع إهطاعاً سے ماخوذ ہے، یہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی جلدی کرے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ (القمر: 8) ہے یہاں مُّهْطِعِيْنَ کا معنی مسرعین ہے۔ شاعر نے کہا:

بدجلة دارهم ولقد أراهم　　بدجلة مهطعين إلى السماع (1)

شعر میں بھی مہطعین کا مطلب مسرعین ہے۔

ایک قول کے مطابق المهطع وہ جو خشوع و تذلل سے دیکھتا ہے یعنی آنکھیں اٹھائے بغیر دیکھنے والے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور مجاہد اور ضحاک نے کہا: مُهْطِعِيْنَ سے مراد مسلسل دیکھنا ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں معروف یہی ہے کہ أهطع اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی جلدی کرے۔ ابو عبید نے کہا: بعض اوقات دو صورتیں اکٹھی پائی جاتی ہیں یعنی اسراع مع ادامة النظر۔ ابن زید نے کہا: المهطع وہ ہے جو اپنے سر کو نہیں اٹھاتا۔ مُقْنِعِىْ رُءُوْسِهِمْ یعنی اپنے سروں کو اٹھائے ہوئے، نیچے دیکھتے ہوئے۔ اقناع الراس سے مراد سر کا اٹھانا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے۔ ابن عرفہ اور قتبی وغیرہ کا قول ہے: المقنع وہ ہے جو اپنے سر کو اٹھاتا ہے اور اپنے سامنے دیکھتے ہوئے آتا ہے۔ اسی سے اقناع فی الصلاۃ یعنی نماز میں سر اٹھانا ہے اور اپنے سامنے دیکھنا ہے۔ اور جب کوئی آواز بلند کرے تو أقنع صوته کہا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس دن لوگوں کے چہرے آسمان کی طرف ہوں گے کوئی کسی کو نہیں دیکھے گا۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اپنے سروں کو جھکانے والے ہیں۔ مہدوی نے کہا: جب کوئی اپنے سر کو اٹھائے تب اقنع کہا جاتا ہے اور جب کوئی ذلت و خضوع سے اپنے سر کو پست کرے تب بھی أقنع کہا جاتا ہے۔ اور آیت دو احتمال رکھتی ہے، یہ مبرد کا قول ہے جب کہ پہلا قول لغت میں زیادہ معروف ہے۔ ایک رجز کہنے والے نے کہا:

أَنْغَضَ نَحْوِي رَأْسَهُ وَأَقْنَعَا　　كَأَنَّمَا أَبْصَرَ شَيْئًا أَطْمَعَا (2)

شعر میں أقنعا سے مراد سر اٹھانا ہے۔

شماخ نے اونٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

يُبَاكِرْنَ العضاةَ بِمُقْنَعَاتٍ　　نَوَاجِذُهُنَّ كَالْحَدَأِ الْوَقِيعِ

یعنی اپنے سروں کو درختوں کی طرف اٹھاتے ہیں تاکہ انہیں کھائیں۔

تو اس میں بھی سر کو اٹھانا ہی مراد ہے۔ اسی سے اوڑھنی کو مقنعة کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بلند ہوتی ہے۔ اور اسی سے قنع الرجل ہے یعنی وہ خوش ہوا، یعنی اس نے سوال کرنے سے سر اٹھا لیا۔ اور جب آدمی سوال کرے تو قنع کہا جاتا ہے یعنی وہ بتکلف قناعت کرتا ہوا آیا، یہ نحاس سے منقول ہے۔ اور فم مقنع یعنی اس کے دانت اندر کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔ اور

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 140　　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 141

رجل مقنع شد کے ساتھ اس سے مراد وہ آدمی ہے جس نے سر پر خود پہنا ہوا ہو، یہ جوہری کا قول ہے۔ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ یعنی شدت نظر سے ان کی پلکیں نہیں جھپکتی ہوں گی پس یہ نظر کا کھلا رہنا ہے۔ جب ایک پلک دوسری کے ساتھ مل جائے تو طَرَفَ الرجل یَطْرِفُ طَرْفًا کہا جاتا ہے۔ نظر کو طرف کہا گیا کیونکہ نظر طرف ہی سے ہوتی ہے۔ اور طرف سے مراد آنکھ ہے۔ عنترہ نے کہا:

وَاَغُضُّ طَرْفِی مَا بَدَتْ لِی جَارَتِی حَتّٰی یُوَارِیَ جَارَتِی مَاْوَاهَا

شعر میں طرفی سے مراد میری آنکھ ہے۔

جمیل نے کہا:

وَاَقْصِرُ طَرْفِی دُوْنَ جُمْلٍ کَرَامَةً لِجُمْلٍ وَلِلطَّرْفِ الَّذِی اَنَا قَاصِرُهٗ(1)

اس میں بھی طرفی سے مراد میری آنکھ ہے۔

وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ یعنی شدت خوف سے وہ کوئی فائدہ نہیں دیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی خیر اور بھلائی سے خالی ہوں گے۔ سدّی نے کہا: ان کے دل ان کے سینوں سے نکلیں گے اور ان کے حلقوں میں پیوست ہو جائیں گے۔ مجاہد، مرہ اور ابن زید نے کہا: بے آباد، برباد اور پھٹے ہوئے جن میں نہ کوئی بھلائی ہوگی اور نہ عقل، جس طرح کہ آپ اس گھر کے بارے میں انما ھو ھواء کہتے ہیں جس میں کچھ بھی نہ ہو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور لغت میں ھواء اسے کہتے ہیں جو کھوکھلا اور خالی ہو، اسی سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

اَلَا اَبْلِغْ اَبَا سُفْیَانَ عَنِّی فَاَنْتَ مُجَوَّفٌ نَخِبٌ هَوَاءُ(2)

خبردار ابو سفیان کو میری جانب سے پہنچا دو کہ تو کھوکھلا، بزدل اور خالی ہے۔

زہیر نے چھوٹے سر والی اونٹنی کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

کان الرحل منها فوق صعل من الظلمان جؤ جوءہ هواء(3)

جوجوءہ ھواء یعنی جس کا اگلا حصہ ہوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ فارغ یعنی خالی ہے۔

قرآن مجید میں اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا (القصص: 10) ہے یعنی سوائے غم موسیٰ کے ہر چیز سے فارغ۔ ایک قول کے مطابق: کلام میں اضمار ہے، یعنی ذات ھواء و خلاء۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾

"(اے میرے نبی!) ڈرایئے لوگوں کو اس دن سے جب آئے گا ان پر عذاب تو بول اٹھیں گے ظالم: اے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 141 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر کشاف، سورۃ ابراہیم، جلد 2، صفحہ 563

ہمارے رب! ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لیے ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ (اے کافرو!) کیا تم قسمیں نہیں اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانا نہیں ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْذِرِ النَّاسَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل مکہ مراد ہیں۔ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ وہ قیامت کا دن ہوگا، یعنی انہیں اس دن سے ڈرایئے۔ انہیں صرف عذاب کے دن کے ساتھ مخصوص فرمایا (1) حالانکہ وہ ثواب کا دن بھی ہوگا کیونکہ کلام گناہگار اور نافرمان کے لیے دھمکی اور تہدید کے طور پر ہے۔ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا یعنی اس دن کہیں گے رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ یعنی ہمیں مہلت دے۔ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ جب آخرت میں حق ظاہر ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا میں لوٹنے کا سوال کریں گے۔ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ یعنی تیری دعوت اسلام پر لبیک کہیں گے۔ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے، تو انہیں جواب دیا جائے گا اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ، مِّنْ قَبْلُ سے مراد دار دنیا ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ مجاہد نے کہا: یہ قریش کی قسم تھی کہ انہیں مرنے کے بعد نہیں اٹھایا جائے گا۔ ابن جریج نے کہا: یہ ان کے اس قول کی حکایت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ (النحل: 38) اور انہوں نے پختہ قسم اٹھائی اللہ کی کہ جو مرجائے گا اللہ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ کے بارے میں دو تاویلیں ہیں: ایک تاویل یہ ہے کہ تمہیں دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہی نہیں ہونا، یعنی نہ تمہیں دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ ہی تمہارا حشر ہوگا، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسری تاویل یہ ہے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ سے مراد مالکم من العذاب ہے یعنی تمہارے لیے عذاب ہے ہی نہیں۔ بیہقی نے محمد بن کعب قرظی سے ذکر کیا اس نے کہا: دوزخیوں کی پانچ گزارشات ہوں گی اللہ تعالیٰ انہیں چار کا جواب ارشاد فرمائے گا اور جب پانچویں گزارش تک پہنچیں گے تو اس کے بعد وہ کبھی بھی کلام نہیں کریں گے۔

وہ کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ اَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝ (غافر) اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا پس اب ہم اعتراف کرتے ہیں اپنے گناہوں کا سو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ۝ (غافر) اس کی وجہ یہ تھی کہ جب پکارا جاتا اللہ تعالیٰ کو اکیلا تو تم انکار کر دیتے اور اگر شریک بنایا جاتا کسی کو اس کا تو تم مان لیتے پس حکم کا اختیار اللہ کے لیے ہے جو برتر اور بزرگ ہے۔

پھر کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ) اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اور (کانوں سے) سن لیا پس (ایک بار) بھیج ہمیں (دنیا میں) اب ہم نیک عمل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدہ) پس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو، ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا اور چکھو ابدی عذاب ان (کرتوتوں) کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 142

پھر وہ کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِـعِ الرُّسُلَ اے ہمارے رب! ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لیے ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ جواب ارشاد فرمائے گا: اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (اے کافرو!) کیا تم قسمیں نہیں اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانا ہے۔

وہ کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ (فاطر: 37) اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال، ہم بڑے نیک کام کریں گے ایسے نہیں جیسے ہم پہلے کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیْرُؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ۠ (فاطر) کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا اور تشریف لے آیا تمہارے پاس ڈرانے والا (تم نے اس کی بات نہ مانی) پس اب (اپنے کیے کا) مزہ چکھو ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔

وہ کہیں گے: رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ۝ (المومنون) اے ہمارے رب! غالب آگئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے...... اللہ تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ۝ (المومنون) پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ۔ تو اس کے بعد وہ کبھی بھی کلام اور گفتگو نہیں کریں گے۔ ابن مبارک نے اسے اپنے دقائق میں اس سے بہت زیادہ طویل انداز میں تخریج کیا ہے اور ہم (قرطبی) نے اسے کتاب "التذکرہ" میں لکھا ہے۔ حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ وَّ سَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ۝ وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۝ اور تم آباد تھے ان لوگوں کے (متروکہ) گھروں میں جنہوں نے ظلم کیے تھے اپنے آپ پر اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی کہ کیسا برتاؤ کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمہارے لیے (طرح طرح کی) مثالیں اور انہوں نے اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں کیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے مکر کا توڑ تھا گرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے۔

راوی نے کہا: یہ تیسرا جواب ہوگا۔ اور حدیث کا ذکر کرنے کے بعد اللہ کے ارشاد اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ۝ (المومنون) کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ اس وقت ان کی دعا اور امید ختم ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح متوجہ ہوں گے کہ ایک دوسرے کو کتے کی طرح بھونک رہے ہوں گے۔ راوی نے کہا: مجھے ازہر بن ابی ازہر نے بیان کیا ہے کہ اس نے ذکر کیا کہ یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَۙ۝ وَ لَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ۝ (المرسلات)

وَّ سَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ۝ وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۝

''اور تم آباد تھے ان لوگوں کے (متروکہ) گھروں میں جنہوں نے ظلم کیے تھے اپنے آپ پر اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی کہ کیسا برتاؤ کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمہارے لیے (طرح طرح کی) مثالیں۔ اور انہوں نے اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں کیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے مکر کا توڑ تھا اگرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَسَكَنْتُمْ فِي مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ یعنی قوم ثمود اور اس جیسی دیگر قوموں کے شہروں میں تم نے ان کے گھروں سے کیوں عبرت حاصل نہیں کی، حالانکہ تم پر واضح ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے تمہارے لیے قرآن میں طرح طرح کی مثالیں بھی بیان کر دی تھیں۔ ابو عبدالرحمن سلمی نے ونبیّن لکم نون اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں صیغہ مستقبل کا ہے جب کہ معنی ماضی کا اور دوسری وجہ یہ ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ کے مناسب و مطابق ہو جائے جب کہ جماعت کی قراءت وتبیین ہے اور یہ معنی اس میں اس کی مثل ہے، کیونکہ یہ بھی ان پر اللہ ہی کے واضح کرنے سے واضح ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور رسولوں کی تکذیب اور دشمنی جیسی چالبازیاں انہوں نے کیں، وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ، اِنْ بمعنی ما ہے یعنی ان کا مکر ضعف اور کمزوری کی وجہ سے ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہاڑ اکھڑ جاتے۔ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر ان بمعنی ما استعمال ہوا ہے۔ ایک اس مقام پر، دوسرا فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ (یونس: 94) تیسرا، لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ڰ اِنْ كُنَّا (انبیاء: 17) یعنی ما کنا۔ چوتھا، قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ (الزخرف: 81) پانچواں، وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (الاحقاف: 26) جماعت نے ان کان نون کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ عمرو بن علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی نے وان کاد دال کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور عام لوگوں نے لتزول میں لام جحود ہونے کی وجہ سے اسے مکسور پڑھا اور نصب کی وجہ سے دوسری لام کو مفتوح پڑھا۔

اور ابن محیصن، ابن جریج اور کسائی نے لَتَزُوْلُ لام ابتدائیہ ہونے کی وجہ سے پہلی لام کو مفتوح پڑھا اور دوسری کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور ان کو مخففہ من مثقلہ بنایا ہے، اور اس قراءت کی صورت میں ان کے مکر کو بڑا سمجھنا مقصود ہے، یعنی ان کا فریب بہت بڑا تھا حتی کہ قریب تھا کہ اس سے پہاڑ اکھڑ جائیں۔ طبری نے کہا: مختار پہلی قراءت ہے، کیونکہ اگر پہاڑ زائل ہو جاتے تو وہ ثابت تو پھر نہ تھے۔ ابوبکر انباری نے کہا: اس حدیث میں مسلمانوں کے مصحف کے خلاف کوئی حجت نہیں جو ہمیں احمد بن حسین نے بیان کی ہے: حدثنا عثمان بن ابی شیبۃ حدثنا وکیع بن الجراح عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن عبدالرحمن بن دانیل انہوں نے کہا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا ہے: جابر لوگوں میں سے ایک جابر نے کہا کہ میں تب تک نہیں رکوں گا جب تک یہ معلوم نہیں کر لیتا کہ آسمان میں کون ہے؟ تو اس نے گدھوں کے بچے پالے اور گوشت پکانے کا حکم

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 388

دیا یہاں تک کہ وہ سخت اور مضبوط ہو جائے۔ پھر اس نے ایک ایسا تابوت بنانے کا حکم دیا جس میں دو آدمیوں کی گنجائش ہو اور اس کو لمبی لکڑیاں لگانے کا حکم دیا جس کے سروں پر سخت سرخ رنگ کا گوشت لگایا جائے۔ اور میخوں کے ذریعے گدھوں کی ٹانگوں کے ساتھ اسے باندھ دیا جائے اور لکڑیوں کو تابوت کے قوائم کے ساتھ باندھا جائے پھر وہ اور اس کا دوست تابوت میں بیٹھے اور گدھ اسے لے کر اڑے۔ جب گدھوں نے گوشت کو دیکھا تو اس کی طلب میں تابوت کو اوپر اڑاتے گئے حتیٰ کہ وہ وہاں تک پہنچ گئے جہاں اللہ نے چاہا۔ اس جابر نے اپنے دوست کو کہا: دروازہ کھول اور دیکھ تجھے کیا نظر آتا ہے؟ اس نے کہا: میں پہاڑوں کو یوں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مکھیاں ہیں، اس نے کہا: دروازہ بند کر۔ پھر وہ گدھ تابوت کو لے کر وہاں تک چڑھے جہاں تک اللہ نے چاہا کہ وہ چڑھیں۔ تو جابر نے اپنے دوست کو کہا: دروازہ کھول اور دیکھ تجھے کیا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا: اب تو مجھے آسمان نظر آرہا ہے اور یہ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ اس نے کہا: لکڑی کو توڑ دے اس نے اسے توڑ دیا، گدھیں گر گئیں۔ جب تابوت زمین پر گرا تو بہت بلند اور سخت آواز سنی گئی قریب تھا کہ پہاڑ اپنی جگہوں سے ہٹ جاتے۔ راوی نے کہا: میں نے حضرت علی بنائیں کو وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ پہلے لام کے فتحہ اور دوسرے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے بھی سنا ہے۔ ثعلبی نے اس خبر کو اپنے معنی کے ساتھ روایت کیا ہے اور جابر سے مراد نمرود تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا تھا۔

عکرمہ نے کہا: اس کے ساتھ تابوت میں ایک بغیر داڑھی کے لڑکا تھا، اس نے ایک کمان اور تیر اٹھایا ہوا تھا تو اس نے تیر پھینکا وہ خون کے ساتھ لت پت اس کے پاس واپس لوٹا۔ اس نے کہا: اے آسمان کے خدا! میں نے تیرا کام تمام کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: آسمان کی مچھلی کے خون سے تیر خون آلود ہوا جس مچھلی نے اپنے آپ کو سمندر سے ہوا میں پھینکا اور ہوا میں معلق ہوگئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ایک پرندہ تھا جسے تیر لگا پھر نمرود نے اپنے ساتھی کو کہا کہ لکڑی توڑ دے اور گوشت کو نیچے گرا دے، تو گدھیں تابوت سمیت گر گئیں۔ پہاڑوں نے تابوت اور گدھوں کے گرنے کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ اور انہوں نے گمان کیا کہ آسمان میں کوئی واقعہ پیش آگیا ہے اور قیامت قائم ہوگئی ہے، پس یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ہے۔

قشیری نے کہا: یہ واقعہ پہاڑوں میں زندگی کی تخلیق کی تقدیر کے ساتھ جائز ہو سکتا ہے۔ ماوردی نے حضرت ابن عباس بنیاد جہا سے ذکر کیا ہے کہ نمرود بن کنعان نے کوفہ کے گرد و نواح میں رس نامی بستی میں ایک محل بنایا اس نے اس کی لمبائی پانچ ہزار پچاس ذراع اور چوڑائی تین ہزار پچیس ذراع بنائی، اس سے گدھوں کے ساتھ وہ اوپر چڑھا، جب اسے معلوم ہوا کہ آسمان میں اس کے لیے کوئی راستہ نہیں تو اس نے اسے قلعہ بنا لیا اور اس میں گھر والوں اور بیٹوں کو جمع کیا تا کہ وہ اس میں ان کی حفاظت کرے، اللہ تعالیٰ نے اس کی عمارت اور محل کو بنیادوں سمیت اٹھایا، وہ محل ان پر گر پڑا اور وہ سارے ہلاک ہو گئے، وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ کا یہی معنی ہے اور ان کے مکر و فریب کی وجہ سے جن پہاڑوں کا زوال مراد لیا گیا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ زمین کے پہاڑ ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے مراد اسلام اور قرآن ہے، کیونکہ یہ اپنے ثبوت اور رسوخ میں پہاڑوں کی طرح ہیں۔ قشیری نے کہا: وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے فریب کو جاننا

ہے پس وہ انہیں اس کی سزا دے گا، یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے مکر کی جزا ہے یعنی عند الله جزاء مکرھم تو جزا جو کہ مضاف ہے اسے حذف کر دیا گیا۔ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ، لِتَزُوْلَ کی پہلی لام کے کسرہ کے ساتھ، یعنی ان کا مکر کوئی ایسا مکر نہیں کہ جس کا اللہ کے ہاں کوئی اثر ہو اور جس سے کوئی خطرہ ہو، اور پہاڑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی ضرب المثل ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ، فی تقدیرھم، لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ یعنی اگرچہ ان کا مکر ان کے اندازے میں ایسا تھا کہ اس سے پہاڑ اکھڑ جاتے اور اسلام کو باطل قرار دینے میں موثر تھا۔ اور اس کو لَتَزُوْلُ مِنْهُ الْجِبَالُ پہلی لام کے فتحہ اور دوسری کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی وہ بہت بڑا مکر تھا اس سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ (نوح) کی طرح ہے اور پہاڑ نہیں اکھڑتے یہ کسی چیز کے بڑا ہونے سے عبارت ہے، اور ایسا ہوتا رہتا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

"تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی کرنے والا ہے اپنے رسولوں سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے (اور) بدلہ لینے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اللہ تعالیٰ کا اسم جلالت اور مخلف تحسبن کے مفعول ہیں۔ اور رسلہ، وعدہ کا مفعول ہے اس میں ایسا ہونے کی وسعت ہے اور اس کا معنی وعدہ رسلہ ہے۔

شاعر نے کہا:

تَرَى الثَّوْرَ فيها مُدْخِلَ الظِّلِّ رأسَهُ　　وسائِرُهُ بادٍ إلى الشَّمْسِ أَجْمَعُ(1)

اس میں مدخل الظل رأسہ کا معنی ہے، مدخلا لرأسہ فی ظل کتابہ۔ قتبی نے کہا: یہ اس مقدم میں سے ہے جس کا مؤخر اس کی وضاحت کرتا ہے اور اس مؤخر میں سے ہے جس کا مقدم اس کی وضاحت کرتا ہے۔ لہٰذا مخلف وعدہ رسلہ اور مخلف رسلہ وعدہ دونوں برابر ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ یعنی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے المنتقم بھی ہے یعنی انتقام لینے والا اور ہم نے اسے "الکتاب الاسنی فی شرح اسماء الحسنی" میں بیان کر دیا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 346

وَلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

''یاد کرو اس دن کو جب کہ بدل دی جائے گی یہ زمین دوسری (قسم کی) زمین سے اور آسمان بھی (بدل دیئے جائیں گے) اور سب لوگ حاضر ہو جائیں گے اللہ کے حضور میں (وہ اللہ) جو ایک ہے (اور) سب پر غالب ہے اور تم دیکھو گے مجرموں کو اس روز کہ جکڑے ہوئے ہوں گے زنجیروں میں۔ ان کا لباس تارکول کا ہوگا اور ڈھانپ رہی ہوگی ان کے چہروں کو آگ۔ یہ اس لیے تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس نے کمایا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ (قرآن) ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے (اسے اتارا گیا ہے) تاکہ انہیں ڈرایا جائے اس کے ذریعہ اور تاکہ وہ اس حقیقت کو خوب جان لیں کہ صرف وہی ایک خدا ہے اور تاکہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیں (اس حقیقت کو) دانشمند لوگ''۔

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ یعنی یاد کرو اس دن کو جس دن زمین کو تبدیل کر دیا جائے گا، لہٰذا یوم ماقبل کے متعلق ہوگا یعنی اذکر کے۔ اور ایک قول کے مطابق یہ یوم یقوم الحساب کی صفت ہے۔ زمین کی تبدیلی کی کیفیت میں اختلاف ہے، بہت سارے لوگوں نے کہا کہ زمین کی تبدیلی اس کی صفات کی تبدیلی، اس کے ٹیلوں کی برابری، اس کے پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے، اور اس کی زمین کی لمبائی سے عبارت ہے۔ اس کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور ابن مبارک نے اسے شہر بن حوشب کی حدیث سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے آپ نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو سطح زمین کو لمبا کر دیا جائے گا اور اس کی وسعت میں اتنا اتنا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اور انہوں نے حدیث کو ذکر کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمین کو دوسری قسم کی زمین سے بدل دیا جائے گا پس وہ اسے پھیلائے گا اور وہ اسے عکاظی سطح زمین کی صورت میں لمبا کرے گا تو اس میں نہ کوئی ٹیڑھا پن دیکھے گا اور نہ ہی کوئی اونچا مقام دیکھے گا پھر اللہ تعالیٰ مخلوق کو سخت جھڑکے گا تو لوگ دوسری زمین میں اپنی انہی جگہوں میں پہنچ جائیں گے جن جگہوں میں پہلی زمین میں تھے۔ جو زمین کے اندر تھا وہ اندر ہی ہوگا اور جو زمین کے اوپر تھا وہ اوپر ہی ہوگا''۔ اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور آسمان کی تبدیلی اس کے سورج اور چاند کی روشنی کا خاتمہ اور اس کے ستاروں کے بکھر جانے کے ساتھ ہوگی، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: اس کے احوال مختلف ہونے کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوگی ایک دفعہ چاندی کی طرح اور دوسری دفعہ ادھوڑی کی طرح، اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے۔ ہم (قرطبی) نے اس باب کو کتاب ''التذکرہ'' میں تفصیلی طور پر بیان کر دیا ہے اور علماء کے جملہ اقوال ہم نے اس میں ذکر کر دیے ہیں۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس زمین کا ازالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ارشادات کے مطابق ہوگا۔

امام مسلم نے حضرت ثوبان جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے ان سے روایت کیا ہے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا تھا کہ یہودی علماء میں سے ایک عالم آپ کے پاس آیا اس نے کہا: السلام علیکم پھر راوی

نے حدیث ذکر کی اس میں یہ بھی ہے کہ یہودی نے کہا: جس دن زمین کو دوسری زمین سے اور آسمان کو دوسرے آسمان سے بدل دیا جائے گا اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پل کے پیچھے تاریکی میں ہوں گے''۔ اور پھر حدیث کو ذکر کیا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ کے متعلق پوچھا گیا کہ اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا: ''پل صراط پر'' (1)۔ ابن ماجہ نے اسے مسلم کی اسناد سے ذکر کیا ہے اور ترمذی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تخریج کی اور آپ ہی سوال کرنے والی تھیں۔ ترمذی نے کہا: ہذا حدیث حسن صحیح۔ یہ احادیث اس بات پر نص ہیں کہ آسمان اور زمین تبدیل ہوں گے، زائل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دوسری زمین پیدا فرمائے گا پل پر ٹھہرنے کے بعد اس زمین پر لوگ ہوں گے۔

صحیح مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگ سفید مٹیالی زمین پر جمع ہوں گے جیسے صاف آٹے کی روٹی ہوتی ہے۔ اس میں کسی کے لیے کوئی نشانی نہیں ہوگی'' (2)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے ابو جعفر محمد بن علی سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: اس کو روٹی کے ساتھ بدل دیا جائے گا قیامت کے دن لوگ اسی سے کھائیں گے۔ پھر انہوں نے وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ (الانبیاء: 8) کا ارشاد پڑھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کو ایک اور چاندی کی طرح سفید زمین کے ساتھ بدلا جائے گا جس پر کوئی غلطی نہیں ہوئی ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سفید چاندی کی زمین سے اسے تبدیل کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس دن زمین کو چاندی سے اور آسمان کو سونے سے بدلا جائے گا اور یہ عین اور ذات کی تبدیلی ہوگی۔ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ یعنی وہ اپنی قبروں سے ظاہر ہوں گے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ تَرَى الْمُجْرِمِیْنَ، مجرمین سے مراد مشرکین ہیں۔ یَوْمَئِذٍ یعنی قیامت کے دن۔ مُّقَرَّنِیْنَ یعنی باندھے ہوئے۔ فِی الْاَصْفَادِ یہ طوق اور بیڑیاں ہیں، اس کا واحد صفد اور صَفَد ہے اور صورتہ صفدا کہا جاتا ہے یعنی میں نے اسے قید کیا اور الصفد اسم ہے اور جب آپ کثرت کا ارادہ کریں تو صفدتہ تصفیدا کہیں گے۔ عمرو بن کلثوم نے کہا:

فَآبُوا　بِالنِّهَابِ　وَالسَّبَايَا　وَأُبْنَا　بِالْمُلُوكِ　مُصَفَّدِينَا (3)

مصفدینا سے مراد مقیدینا ہے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا،

مِن كُلِّ مَأسُورٍ يُشَدُّ صِفَادُهُ　صَقْرٍ إذَا لَاقَى الْكَرِيهَةَ حَامِ (4)

صفادہ سے مراد غلہ یعنی اس کی ہتھکڑی ہے۔

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 390

2۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب ذکر البعث، حدیث نمبر 4268، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 145

4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 144

اور أصفدتہ إصفادا سے مراد ہے کہ میں نے اسے عطا کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: صفدتہ اور أصفدتہ قید اور عطا کرنے دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ نابغہ نے کہا:

فَلَمْ أُعَرِّضْ أَبَيْتَ اللَّعْنَ بِالصَّفَدِ(1)

الصفد سے مراد عطا ہے کیونکہ یہ اسے قید کرتا ہے اور غلام بناتا ہے۔

ابوالطیب متنبی نے کہا:

وَقَيَّدْتُ نفسِی فی ذَرَاكَ مَحَبَّةً ومَنْ وَجَدَ الإحسانَ قَيْدًا تَقَيَّدَا

میں نے اپنے آپ کو محبت سے تیرے پاس قید کر دیا ہے اور جس نے احسان کو قید پایا وہ قید ہو گیا۔

(تو اس سے معلوم ہوا کہ عطا اور احسان بھی قید ہے)

اور ایک قول یہ ہے کہ ہر کافر کو شیطان کے ساتھ جکڑا جائے گا، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (الصافات: 22) میں ہے۔ اَزْوَاجَهُمْ سے شیطانوں میں سے جو ان کے دوست ہیں وہ مراد ہیں (2)۔ اور ایک قول یہ ہے ان سے مراد کفار ہیں وہ بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں اکٹھے ہوں گے جس طرح دنیا میں وہ گناہوں پر جمع ہوتے ہیں۔ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ، سَرَابِيْلُهُمْ سے مراد ان کی قمیصیں ہے۔ ابن درید وغیرہ سے منقول ہے کہ اس کا واحد سربال ہے اور فعل سربلت اور سربلت غیری آتا ہے، کعب بن مالک نے کہا:

تَلْقَاكُمْ عَصَبٌ حَوْلَ النَّبِی لَهُمْ مِنْ نَسْجِ دَاوُدَ فِی الْهَيْجَا سَرَابِيلُ

مِّنْ قَطِرَانٍ اس سے مراد اونٹوں کا وہ سیال ہے جس کو اونٹوں پر ملا جاتا ہے (تارکول) یہ حضرت حسن کا قول ہے (3)۔ اور یہ ان میں آگ کے بھڑکنے کے لیے زیادہ بلیغ ہے اور صحیح میں ہے کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر اپنے مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں کھڑی ہو گی کہ اس پر تارکول کی قمیص اور آگ کی اوڑھنی ہو گی۔

حماد سے مروی ہے کہ عربوں نے کہا کہ یہ تانبا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے قطران قاف کے فتحہ اور طا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں ایک تیسری قراءت بھی ہے، وہ ہے قاف کے کسرہ اور طا کی جزم کے ساتھ۔ اسی سے ابوالنجم کا یہ شعر ہے:

جَوْنٌ كَأَنَّ الْعَرَقَ الْمَنْتُوحَا لَبَّسَهُ الْقِطْرَانَ وَالْمُسُوحَا

اس میں القطران اسی تیسری قراءت کے مطابق ہے۔

اور چوتھی قراءت مِّنْ قِطْرٍ اٰنٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عکرمہ، حضرت سعید بن جبیر اور یعقوب سے مروی ہے: القطر سے مراد تانبا اور پگھلا ہوا پیتل ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد أتونی أفرغ علیه قطرا ہے اور ''ان'' انتہائی گرم، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ (الرحمٰن: 44) ہے۔ وَّ تَغْشٰى یعنی وہ مارے گی۔ وُجُوْهَهُمْ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 145
2۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 391
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 145

النَّارُ اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپ لے گی۔ لِيَجْزِيَ اللهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ، مَّا كَسَبَتْ سے مراد بما کسبت ہے۔ اِنَّ اللهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ پہلے گزر چکا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ یعنی یہ جو ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے یہ پیغام ہے۔ ابلاغ سے مراد تبلیغ اور نصیحت ہے(1)۔ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ یعنی تا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے انہیں ڈرائیں۔ اس کو ولینذروا یا اور ذال کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جب آپ کسی چیز کے متعلق جان لیں اور اس کی تیاری کرنے لگیں تو نذرتُ بالشئ أنذر کہا جاتا ہے۔

جس طرح عسیٰ اور لیس کا مصدر استعمال نہیں ہوتا اسی طرح اس کا مصدر بھی استعمال نہیں ہوتا، گویا کہ وہ ان اور فعل کے ذریعے اس مصدر سے مستغنی ہو گئے جیسے آپ کا قول: سرني أن نذرت بالشئي وليعلموا أنما هو إله واحد یعنی تا کہ دلائل و براہین کے قائم ہونے کے ذریعے وہ اللہ کی وحدانیت کو خوب جان لیں۔ وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی تا کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں(2)۔ لینذروا، لیعلموا اور لیذکر ہیں موجود لام محذوف کے متعلق ہوں گی، تقدیر عبارت ہو گی: ولذلك انزلناه یمان بن رباب نے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے(3)۔ کسی نے پوچھا کہ کیا اللہ کی کتاب کا کوئی عنوان بھی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں۔ کہا گیا: وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ آخر تک۔ سورۂ ابراہیم علیہ السلام مکمل ہوئی۔ والحمدللہ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 391　2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 146

سورة الحجر

آیاتها ۹۹ ﴿۱۵ سورۃ الحجر مکیۃ ۵۴﴾ رکوعاتها ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ۝۱

''الف۔لام۔را۔یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی کی اور روشن قرآن کی۔''

الٓرٰ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔اور الکتٰب کے بارے میں کہا گیا ہے: بے شک یہ اسم جنس ہے اور کتب سابقہ تورات اور انجیل کو شامل ہے، پھر ان دونوں کو کتاب مبین کے ساتھ ملا دیا(1)۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے، اس کے لئے دو اسم جمع کئے گئے ہیں۔

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ۝۲

''(عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) بہت آرزو کریں گے کفار کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔''

رُبَّ یہ فعل پر داخل نہیں ہوتا، لیکن جب اس کے ساتھ ما مل جائے تو وہ اسے فعل پر داخل ہونے کے قابل بنا دیتا ہے مثلاً تو کہتا ہے: ربما قام زید، اور ربما یقوم زید۔اور یہ بھی جائز ہے کہ ما نکرہ بمعنی شئ ہو، اور یَوَدُّ اس کی صفت ہو، ای رُبّ شئ یود الکافر (یعنی کافر بہت زیادہ آرزو کریں گے)۔نافع اور عاصم نے رُبَمَا با کو مخفف پڑھا ہے۔اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے اور اس میں دونوں لغات ہیں(2)۔ابو حاتم نے کہا ہے: اہل حجاز رُبَمَا کو مخفف پڑھتے ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

رُبَمَا ضربۃٍ بسیفٍ صقیلٍ بین بُصۡرَی و طعنۃٍ نجلاء

اور تمیم، قیس اور ربیعہ اسے مشدد پڑھتے ہیں۔اور اس میں: رُبَّمَا اور رُبَمَا، رُبَّتَمَا اور رُبَتَمَا، با کو تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اور اس میں اصل یہ ہے کہ یہ تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی کبھی یہ تکثیر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔أی یود الکفار فی أوقات کثیرۃ لو کانوا مسلمین، (یعنی کفار بہت سے اوقات میں یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے) یہ کوفیوں نے کہا ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

ألا ربّما أهدتُ لك العینُ نظرۃً قُصاراك منها أنها عنك لا تُجدِی

1۔تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 147، دار الکتب العلمیہ

2۔المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 349

اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: یہ اس جگہ تقلیل کے لئے ہے، کیونکہ وہ یہ بعض مقامات میں کہیں گے نہ کہ تمام مقامات میں، عذاب میں مشغول ہونے کے سبب۔ واللہ اعلم۔

اور فرمایا: رُبَمَا يَوَدُّ بے شک یہ اس کام کے لئے ہوتا ہے جو واقع ہو جائے، کیونکہ یہ وعدے کی صداقت کے بارے میں ہے گویا کہ وہ عیاں ہو چکا ہے، اور طبرانی ابوالقاسم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میری امت کے کچھ لوگ اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہوں گے پس وہ جہنم میں رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا کہ وہ اس میں رہیں پھر مشرکین انہیں عار دلائیں گے اور وہ کہیں گے جو تم ہمارے ساتھ اپنی تصدیق اور ایمان میں مخالفت کرتے تھے ہم نہیں دیکھ رہے کہ اس نے تمہیں کوئی نفع دیا ہو پھر کوئی موحد باقی نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے نکال لے گا...... پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (1)۔ حسن نے کہا ہے: جب مشرک مسلمانوں کو دیکھیں گے کہ وہ جنت میں داخل ہو چکے ہیں اور وہ انہیں جہنم میں نہ دیکھیں گے تو وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے (2)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ آرزو اور خواہش دنیا میں معاینہ کے وقت ہوگی جس وقت ان کے لئے گمراہی سے ہدایت واضح اور ظاہر ہو جائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آرزو قیامت میں ہوگی جب وہ مومنوں کی عزت و کرامت اور کافروں کی ذلت و رسوائی کو دیکھیں گے (3)۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

''انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں اور غافل رکھے انہیں (جھوٹی) امید کچھ عرصہ بعد وہ (حقیقت کو خود بخود) جان لیں گے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا یہ ان کے لئے تہدید اور جھڑک ہے۔ وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ یعنی جھوٹی امید انہیں طاعت سے غافل اور مشغول رکھے۔ کہا جاتا ہے: ألهاه عن كذا یعنی اس نے اسے اس سے مشغول کر دیا، غافل کر دیا۔ اور لَهِي هو عن الشيء يَلْهَى (وہ فلاں شے سے غافل ہو گیا)۔ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (وہ حقیقت کو خود بخود جان لیں گے) جب وہ قیامت کو دیکھیں گے اور اپنے کرتوتوں کا وبال چکھیں گے۔ یہ آیت آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ مسند بزار میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چار چیزیں شقاوت اور بدبختی میں سے ہیں آنکھ کا خشک ہو جانا، دل کا سخت ہو جانا، لمبی امید رکھنا، اور دنیا کی حرص رکھنا (4)''۔ اور لمبی امید اور آرزو عاجز کر دینے والی بیماری اور اپاہج کر دینے والا مرض ہے، اور جب یہ دل پر قدرت پا لے تو اس کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور علاج مشکل اور سخت ہو جاتا ہے، نہ اس سے بیماری جدا ہوتی ہے اور نہ اس میں کوئی دوا اثر

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 689　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 148

3۔ مجمع الزوائد، کتاب الزہد، باب فی جمود العین و قسوۃ القلب، جلد 10، صفحہ 389، دار الفکر کتب　4۔ ایضاً

انداز ہوتی ہے، بلکہ وہ اطباء کو تھکا دیتا ہے اور حکماء اور علماء اس کے صحت مند ہونے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور طویل امید کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا حریص ہونا اور اس پر گر پڑنا، اور اس کی محبت رکھنا اور آخرت سے اعراض کرنا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اس امت کے پہلے آنے والے لوگ یقین اور زہد کے سبب نجات پا گئے اور اس کے آخر میں آنے والے بخل اور امید کے سبب ہلاک ہو جائیں گے۔'' اور روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ دمشق کی مسجد کے صحن میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے اہل دمشق! کیا تم اپنے نصیحت کرنے والے بھائی کی بات نہیں سنو گے؟ بے شک جو تم سے پہلے تھے وہ کثرت سے جمع ہوتے تھے اور عمارتیں مضبوط بناتے تھے اور امیدیں دور کی رکھتے تھے، پس ان کے اجتماع ہلاک اور برباد ہو گئے، ان کی عمارتیں قبریں بن گئیں اور ان کی امیدیں غرور اور تکبر ہو گئیں۔ یہ (قوم) عاد تھی اس نے شہروں کو رہنے والوں، مال، گھوڑوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ پس آج مجھ سے کون خریدے گا میں نے انہیں دو درہم کے عوض چھوڑ دیا ہے اور یہ اشعار کہے:

یا ذا المؤمل آمالا وإن بَعُدتْ ... منه ويزعم أنْ يَحْظى بأقصاها

أنَّى تفوزُ بما ترجوه وَيْكَ وما ... أصبحتَ فى ثقة من نَيْل أدناها

اور حسن نے کہا ہے: کسی بندے نے امید کو طویل نہیں کیا مگر اس نے عمل کو برا کر دیا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے سچ کہا ہے! پس امید آدمی کو عمل سے سست کر دیتی ہے اور یہ تاخیر کرنے اور لاپرواہی برتنے کا وارث بناتی ہے، اور غفلت اور سستی کو اپنے پیچھے لاتی ہے، زمین کی طرف جھکا دیتی ہے، اور خواہش (نفس) کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اور یہ ایسا امر ہے جس کا مشاہدہ آنکھوں کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ کسی بیان اور وضاحت کا محتاج نہیں اور نہ ایسا کرنے والے سے دلیل طلب کی جائے گی، جیسا کہ امید کا مختصر ہونا کام اور عمل پر ابھارتا ہے، اور جلدی کی طرف پھیر دیتا ہے اور مسابقت پر برانگیختہ کرتا ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝

''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر یہ کہ اس کی (ہلاکت کا وقت) لکھا ہوا تھا جو معلوم تھا۔''

مراد وہ مقررہ وقت ہے جو ان کے لئے لوح محفوظ میں لکھا گیا تھا۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝

''نہ آگے بڑھ سکتی ہے کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔''

اس میں مِنْ صلہ ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: ما جاءنی من احد (یعنی اس میں بھی من صلہ ہے) یعنی اس کی مقررہ مدت تجاوز نہیں کرے گی کہ وہ اس سے زیادہ ہو جائے، اور نہ وہ اس سے پہلے آئے گی۔ اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (الاعراف) (سو جب آجائے ان کا مقررہ وقت تو نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک لمحہ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔)

وَ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝

''اور وہ کہنے لگے: اے وہ شخص اتارا گیا ہے جس پر قرآن بے شک تو مجنون ہے تو کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے۔''

کفار قریش نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور استہزاء یہ کہا، بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی صداقت پر بطور دلیل ملائکہ کو لانے کا مطالبہ کیا۔ اور لَوْ مَا یہ کسی کام پر ابھارنے کیلئے آتا ہے جیسا کہ لولا اور ھلا ہیں۔ اور فراء نے کہا ہے: لَوْ مَا میں میم لولا میں لام کا بدل ہے اور اسی کی طرح استولی علی الشئ اور استومی علیہ ہے۔ اور اس کی مثال خالمتہ اور خاللتہ بھی ہے، اور خِلمی اور خلی بھی یہی ہے یعنی صدیقی (میرا دوست) اور اس بنا پر یہ جائز ہے کہ لوما بمعنی خبر ہو، آپ کہتے ہیں: لو ما زید لضرب عمرو (اگر زید نہ ہوتا تو عمرو مارتا) کسائی نے کہا ہے: لولا اور لو ما خبر اور استفہام میں دونوں برابر ہیں۔

ابن مقبل نے کہا ہے:

لوما الحیاءُ و لوما الدِّیْنُ عبتُکما ببعض ما فیکما إذ عبتما عوَرِی(1)

مراد لولا الحیاء ہے۔ اور نحاس نے لوما، لولا اور ھلا کو ایک ہی معنی میں بیان کیا ہے۔

اور اہل لغت نے اس پر یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

تَعدّون عقْرَ النِّیبِ افضلَ مجدِکم بَنِی ضَوطَرَی لولا الکَمِیَّ المقنعا

یہ بمعنی ھلا تعدّون الکمِیّ المقنعا ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ ۝

''ہم نہیں اتارا کرتے فرشتوں کو مگر حق کے ساتھ اور انہیں اس کے بعد مزید مہلت نہیں دی جاتی۔''

حفص، حمزہ اور کسائی نے مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ پڑھا ہے اور اسے ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور ابو بکر اور مفضل نے مَا تُنَزَّلُ الْمَلَآئِكَةُ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مَا تَنَزَّلُ الْمَلَآئِكَةُ پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر یہ ہے: ما تتنزل یعنی دو تاء کے ساتھ پھر ان میں سے ایک کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے، اور بزی نے تا کو مشدد کر دیا ہے۔ اور اسے ابو حاتم نے اس قول پر قیاس کرتے ہوئے اختیار کیا ہے: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ (القدر: 4) (اترتے ہیں فرشتے اور روح) اور اِلَّا بِالْحَقِّ کا معنی الا بالقرآن ہے (یعنی ہم فرشتوں کو نہیں اتارا کرتے مگر قرآن کے ساتھ) اور بعض نے کہا ہے: رسالۃ (پیغام) کے ساتھ: یہ حضرت مجاہد سے منقول ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: مگر عذاب کے ساتھ اگر وہ ایمان نہ لائیں (2)۔ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ یعنی اگر ملائکہ انہیں ہلاک کرنے کے ارادہ سے نازل ہوں تو پھر انہیں مہلت دی جاتی اور نہ ان کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر ملائکہ نازل ہوں، اور آپ کی شہادت دینے لگیں اور وہ اس کے بعد کفر کریں تو

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 351 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 149

پھر انہیں مہلت نہ دی جائے گی۔ اِذًا اصل میں اذان ہے اور اس کا معنی حینئذ (اس وقت) ہے پھر اس کے ساتھ اَن ملا دیا گیا ہے، اور انہوں نے ہمزہ کو ثقیل سمجھا اور اسے حذف کر دیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

"بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ یعنی ہم نے ہی اس قرآن مجید کو نازل کیا ہے۔ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس سے کہ اس میں کوئی اضافہ اور زیادتی کی جائے یا اس سے کوئی کمی کی جائے۔ حضرت قتادہ اور ثابت بنانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے کہ شیاطین اس میں کسی باطل کا اضافہ کریں یا اس سے کسی حق کی کمی کریں (1)؛ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود اس کا ولی اور محافظ ہے اس لئے یہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور قرآن کریم کے علاوہ دوسری کتب کے بارے فرمایا: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا (المائدہ: 44) پس ان کی حفاظت ان کے سپرد کر دی تو انہوں نے انہیں بدل دیا اور ان میں تغیر کر دیا۔ ہمیں الشیخ الفقیہ الامام ابوالقاسم عبداللہ نے اپنے باپ الشیخ الفقیہ الامام المحدث ابوالحسن علی بن خلف بن معزوز الکومی التلمسانی سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: الشیخۃ العالمۃ فخر النساء شہدۃ بنت ابی نصر احمد بن الفرج الدینوری پر پڑھا گیا اور وہ جمادی الآخر ۵۶۴ھ کے آخر میں اپنے گھر دار السلام میں تھیں۔ ان سے کہا گیا: الشیخ الاَجل العامل نقیب النقباء ابوالفوارس طراد بن محمد الزینبی نے ان سے پڑھنے کی تمہیں خبر دی اور تم سن رہی تھیں (یہ) ۴۹۰ھ کی بات ہے، ہمیں علی بن عبداللہ بن ابراہیم نے خبر دی (انہوں نے کہا) ہمیں ابوعلی عیسیٰ بن محمد بن احمد بن عمر بن عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج المعروف بالطوماری نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں حسین بن فہم نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا: میں نے یحییٰ بن اَکثم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مامون مجلس نظر وفکر (اور مذاکرہ) میں تھا اور وہی اس وقت امیر اور حاکم تھا۔ تو ان تمام لوگوں میں ایک یہودی آدمی داخل ہوا اس کا لباس حسین تھا، چہرہ خوبصورت تھا اور عمدہ خوشبو لگائے ہوئے تھا، راوی نے بیان کیا اس نے کلام کی اور اس نے اپنی کلام اور عبارت کو خوب آراستہ اور مزین کیا، راوی نے بیان کیا: کہ جب مجلس برخاست ہوئی تو مامون نے اسے بلایا اور اس سے پوچھا: کیا تو اسرائیلی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ تو مامون نے اسے کہا: تو اسلام قبول کر لے تاکہ میں تیرے ساتھ معاملات کروں اور حسن سلوک کا برتاؤ کروں، اور اس نے اسے دھمکی بھی دی تو اس نے کہا: میرا دین وہی ہے جو میرے آباؤ اجداد کا دین ہے! اور واپس چلا گیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر جب ایک سال گزرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آیا تو وہ مسلمان تھا، اور اس نے فقہ سے متعلق انتہائی خوبصورت اور حسین گفتگو کی، پس جب مجلس برخاست ہوئی تو مامون نے اسے بلایا اور کہا: کیا کل تو ہمارا ساتھی نہ تھا؟ اس نے جواب دیا: ہاں کیوں نہیں۔ تو مامون نے کہا: پھر تیرے اسلام کا سبب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں تمہارے پاس سے واپس لوٹ کر گیا تو میں نے پسند کیا کہ میں ان ادیان کو آزماؤں، اور اس کے ساتھ ساتھ تو مجھے خوشنویس دیکھ رہا ہے، چنانچہ میں نے تورات کا قصد کیا اور اس کے تین نسخے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 149

لکھے اور ان میں کچھ کمی بیشی کر دی، اور میں انہیں گرجا گھر میں لے گیا اور وہ مجھ سے خرید لئے گئے۔ پھر میں نے انجیل کو لیا اور اس کے تین نسخے لکھے اور اس میں کچھ زیادتی اور کچھ کمی کر دی، اور انہیں لے کر یہودیوں کی عبادتگاہ میں گیا اور وہ مجھ سے خرید لی گئی۔ اور پھر میں نے قرآن کریم کا ارادہ کیا اور اس کے تین نسخے لکھے اور ان میں کچھ کمی بیشی کر دی، اور انہیں لے کر کاغذ بیچنے والوں کے پاس گیا تو انہوں نے ان کو خوب غور سے دیکھا، پس جب انہوں نے ان میں کمی بیشی کو تلاش کر لیا تو انہوں نے انہیں پھینک دیا اور انہیں نہ خریدا؛ تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، پس یہی میرے اسلام لانے کا سبب ہے۔ یحییٰ بن اکثم نے کہا ہے: میں نے اس سال حج کیا اور میں حضرت سفیان بن عیینہ سے ملا اور ان سے اس خبر کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے فرمایا: اس کا مصداق کتاب اللہ میں موجود ہے۔ میں نے پوچھا: کون سی جگہ میں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات اور انجیل کے بارے میں فرمایا ہے: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (المائدہ: 44) (اس واسطے کہ محافظ ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب کے۔) پس اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت ان پر ڈال دی تو یہ ضائع ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ پس اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا تو یہ ضائع نہ ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اس سے حفاظت کرنے والے ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں کوئی جھوٹا قول کہیں یا ہم ان پر کوئی جھوٹ ڈال دیں۔ یا وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم ان کی حفاظت کرنے والے ہیں اس سے کہ ان کے ساتھ کوئی دھوکہ کیا جائے یا انہیں قتل کیا جائے۔ اور اس کی نظیر وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: 67) ہے (اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔) اور نَحْنُ میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور نَزَّلْنَا اس کی خبر ہو اور پھر مکمل جملہ اِنَّا کی خبر ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ نَحْنُ، اِنَّا کے اسم کی تاکید ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہو اور یہ بطور فاصلہ (یا فارقہ) نہ ہو کیونکہ جو اس کے بعد ہے وہ معرفہ نہیں وہ بلاشبہ جملہ ہے، اور جملے نکروں کی صفت ہوتے ہیں لہٰذا یہ نکروں کے حکم میں ہوتے ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ ⑩

"اور بے شک ہم نے بھیجے (پیغمبر) آپ سے پہلے اگلی امتوں میں۔"

اس کا معنی ہے: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رسلا بے شک ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول بھیجے، پس رسلاً کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور شیع، شیعۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی امت ہے یعنی پہلی امتوں میں؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: پہلے گروہوں اور فرقوں میں، اور الشیعۃ کا معنی فرقہ، لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو باہم محبت کرنے والے اور کلام میں متفق ہوں تو گویا الشِّیَع سے مراد الفِرَق (فرقے) ہوا؛ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا (الانعام: 65) اور یہ اصل میں الشیاع سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی وہ چھوٹی لکڑیاں ہیں جن کے ساتھ بڑی جلائی جاتی ہیں، جیسا کہ سورۃ الانعام میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہاں الشِّیَع سے مراد بستیاں ہیں (1)۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 149

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ⑪

''اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے۔''

یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے باعث تسلی ہے؛ یعنی جس طرح آپ کے ساتھ ان مشرکین نے کیا اسی طرح آپ سے قبل بھی رسولوں کے ساتھ کیا جاتا رہا۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ⑫ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ⑬

''اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں۔ وہ نہیں ایمان لائیں گے اس پر اور گزر چکی ہے پہلوں کی یہی روش۔''

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ نَسْلُكُهُ اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی، کفر، استہزا اور شرک فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ مجرموں کے دلوں میں جو آپ کی قوم میں سے ہیں؛ یہ حضرت حسن اور قتادہ وغیرہ سے مروی ہے، یعنی جس طرح ہم نے اسے ان لوگوں کے دلوں میں داخل کیا جو پہلی امتوں میں سے گزر چکے ہیں اسی طرح ہم اسے آپ کی قوم کے مشرکوں کے دلوں میں بھی داخل کریں گے تاکہ وہ آپ کے ساتھ ایمان نہ لائیں، جیسا کہ ان سے پہلے والے لوگ اپنے رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائے۔ اور ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم تکذیب (جھٹلانا) داخل کرتے ہیں۔ اور السلك کا معنی ہے: ایک شے کو دوسری شے میں داخل کرنا جیسا کہ دھاگہ سوئی میں داخل کرنا۔ کہا جاتا ہے: سلكه يسلكه سَلْكا و سُلوكا، أسلكه اسلاكا (داخل کرنا) اور سلك الطريق سُلوكا و سَلْكا و أسلكه دخله (یعنی وہ راستے میں داخل ہوا)، اور ایک شے کا اپنے غیر میں اسی کی مثل ہونا ہے، اور ایک شے کا نیزے کے ساتھ اسی طرح ہونا ہے اور دھاگے کا جوہر میں ہونا ہے، یہ سب فَعَلَ اور أَفْعَلَ کے وزن پر ہیں۔ اور عدی بن زید نے کہا ہے:

وقد سلكوك في يوم عصيب (1)

(انہوں نے تجھے سخت گرم دن میں داخل کیا) اور السِلك (کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی دھاگہ ہے۔ اور آیت میں قدریہ اور معتزلہ کا رد ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم قرآن کو ان کے دلوں میں داخل کرتے ہیں اور وہ اسے جھٹلا دیتے ہیں۔ اور حسن، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یہی وہ قول ہے جس پر اکثر اہل التفسیر ہیں، اور یہی معتزلہ پر حجت لازم کرتا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی منقول ہے: ہم حجت کو لازم کرنے کے لئے ذکر کو داخل کرتے ہیں؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ یعنی کفار کو ہلاک کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کی یہی سنت گزر چکی ہے، پس یہ ہلاک ہونے والوں کے بہت قریب ہو چکے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ یعنی جس طرح انہوں نے تکذیب اور کفر کا ارتکاب کیا ہے اسی کی مثل پہلوں کی روش گزر چکی ہے، پس یہ انہی کی اقتدا کر رہے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 353

وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور اگر ہم کھول بھی دیتے ان پر دروازہ آسمان سے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے پھر بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری تو نظریں بند کر دی گئی ہیں بلکہ ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

کہا جاتا ہے: ظل یفعل کذا، یعنی وہ اسے دن بھر کرتا رہا۔ اور مصدر الظلول ہے۔ یعنی اگر وہ علامات اور نشانیاں جو انہوں نے تجویز کی ہیں پوری کر بھی دی جائیں تو وہ یقیناً کفر پر مصر رہیں اور خیالات (اور توہمات) کے ساتھ مشغول ہو جائیں، جیسا کہ قرآن معجز کے بارے انہوں نے کہا: بے شک یہ سحر اور جادو ہے۔ يَعْرُجُوْنَ یہ عَرَجَ يَعْرُجُ سے ہے اس کا معنی چڑھنا ہے۔ اور المعارج سیڑھیوں کو کہتے ہیں، یعنی اگر وہ آسمان کی طرف چڑھ جائیں اور ملکوت و ملائکہ کا مشاہدہ کر لیں تو پھر بھی یقیناً کفر پر اصرار کریں؛ یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَلَيْهِمْ میں ضمیر مشرکین کے لئے ہے اور فَظَلُّوْا میں ضمیر ملائکہ کے لئے ہے، وہ آتے جاتے رہیں، یعنی اگر ان کے لئے عیاں کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ آسمان میں دروازوں کو دیکھنے لگیں کہ ان سے ملائکہ اوپر چڑھ رہے ہیں اور نیچے اتر رہے ہیں تو بھی وہ یقیناً کہیں گے: ہم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ جو دیکھا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ سے منقول ہے۔ اور سُكِّرَتْ کا معنی ہے سدت بالسحر (ہماری نظریں جادو کے ساتھ بند کر دی گئی ہیں)؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: سُحِرَت (جادو کر دیا گیا ہے) کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أُغشيت أبصارنا (ہماری آنکھیں ڈھانپ دی گئی ہیں۔) اور انہیں سے یہ بھی ہے عَمِيت (ہماری آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں)۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أُخذت (انہیں پکڑ لیا گیا ہے)۔ اور مؤرج نے کہا ہے: دِيرَبنا (ہمیں چکرا دیا گیا ہے) یہ دوران سے ہے؛ یعنی ہماری آنکھیں نشے میں ہو گئی ہیں۔ جُوَیبر نے کہا ہے: خُدِعت ہماری آنکھوں کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اور ابو عمرو بن العلاء نے کہا ہے: سُكِّرَتْ انہیں ڈھانپ دیا گیا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔

اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

و طلعت شمس علیها مِغفَر و جعلت عین الحَرور تَسکُر(1)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سُکِّرت، حبست (وہ روک دی گئی ہیں)۔

اور اس معنی میں اوس بن حجر کا قول ہے:

فصرت علی لیلة ساهرة فلیست بطَلْقٍ ولا ساکِرَة(2)

میں (مفسر کہتا ہوں: یہ تمام اقوال باہم قریب قریب ہیں اور ان تمام کو آپ کا یہ قول جامع ہے: مُنِعت (ہماری نظریں روک دی گئی ہیں، انہیں منع کر دیا گیا ہے۔) ابن عزیز نے کہا ہے: سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ہماری نظریں بند کر دی گئی ہیں۔ یہ

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 151 2۔ ایضاً

تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: سکرت النهر جب تو نہر کو بند کر دے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ سُکر الشراب (شراب کا نشہ) سے ماخوذ ہے، گویا کہ آنکھ کو وہ کچھ لاحق ہو جاتا ہے جو شراب پینے والے کو لاحق ہوتا ہے جبکہ وہ نشے میں ہو۔ اور ابن کثیر نے سَکِرتْ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تشدید کے ساتھ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے: سُکِرت بمعنی ملئت ہے (بھر دی گئیں) اور مہدوی نے کہا ہے: سکرت میں تخفیف اور تشدید دونوں بالکل ظاہر ہیں، تشدید تکثیر کے لئے ہے اور تخفیف اپنے معنی کو ادا کرتی ہے، اور معروف یہ ہے کہ سکر متعدی نہیں ہوتا۔ ابو علی نے کہا ہے: جائز ہے کہ اسے بصر میں متعدی سنا گیا ہو۔ اور جنہوں نے سَکِرتْ پڑھا ہے چونکہ انہوں نے اس کے مشابہ قرار دیا ہے جو کچھ نشے کی حالت میں ان کی آنکھوں کو پیش آتا ہے، کیونکہ یہ نشے کے قائم مقام ہے کیونکہ اس صورت میں نشہ موجود نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ تخفیف کے ساتھ ہو تو سکر الشراب سے ماخوذ ہے، اور اگر تشدید کے ساتھ ہو تو اُخذت (جادو کر دیا گیا) کے معنی میں ہے، ان دونوں کو الماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اور نحاس نے کہا ہے: حضرت مجاہد اور حسن رحمہما اللہ تعالیٰ کی قرأت میں سے معروف سکِرت تخفیف کے ساتھ ہے۔ حسن نے کہا ہے: بمعنی سحِرت ہے (یعنی جادو کر دیا گیا) اور ابو عبید نے ابو عبیدہ سے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: سُکِّرَت ابصارهم جب ان پر بصارت کی کمزوری چھا جائے یہاں تک کہ وہ نہ دیکھ سکیں۔ اور فراء نے کہا ہے: جس نے سَکِرت پڑھا ہے اس نے اسے سکور الريح (ہوا کا پر سکون ہونا) سے لیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں۔ اس میں اصل وہ ہے جو ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، انہوں نے کہا: یہ السکر فی الشراب (شراب میں نشہ ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور یہ قول اچھا ہے: یعنی ان پر وہ شے چھا گئی جس نے ان کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا جیسے نشے والے پر وہ شے چھا جاتی ہے جو اس کی عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور سُکور الريح کا معنی ہوا کا ساکن ہونا اور اس کے تیزی کے بعد کم ہونا ہے پس یہ تحییر (حیرت میں ڈالنا) کے معنی کی طرف راجع ہے۔

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۶﴾

"اور بے شک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ہم نے آراستہ کر دیا ہے آسمان کو دیکھنے والوں کے لئے۔"

جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر اور ان کے بتوں کے عجز کا ذکر کیا تو پھر ساتھ ہی اپنی قدرت کاملہ کا تذکرہ کیا تا کہ اس سے اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جائے۔ البروج سے مراد محلات (القصور) اور منازل ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یعنی ہم نے آسمان میں سورج اور چاند کے بروج یعنی ان کی منازل بنائیں۔ اور ان بروج کے نام یہ ہیں: الحمل، الثور، الجوزاء، السرطان، الاسد، السنبلة، المیزان، العقرب، القوس، الجدی، الدلو اور الحوت۔ اور عرب علوم کی وجہ سے ستاروں کے واقع ہونے کی جگہوں اور ان کے دروازوں کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور ان سے راستوں، اوقات، شادابی (خوشحالی) اور خشک سالی پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک فلک میں بارہ برج ہیں، اور ہر برج اڑھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ اور بروج کا اصل معنی الظهور (ظاہر ہونا) ہے (2)؛ اور اسی سے تبرج المرأة ہے یعنی عورت کا اپنی زینت اور سنگار کو

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 151 2۔ ایضاً

ظاہر کرنا (1)۔ یہ معنی سورۃ النساء میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: البدجہ سے مراد النجوم ستارے ہیں (2)۔ اور انہیں یہ نام ان کے ظاہر ہونے اور ان کے بلند ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں (3)، یہ ابو صالح نے کہا ہے، یعنی سات سیارے (4)۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: بُرُوْجًا سے مراد ایسے محلات اور گھر ہیں جن میں محافظ اور نگران ہوتے ہیں (5)، انہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان میں پیدا کیا ہے۔ فاللہ اعلم۔ وَ زَيَّنّٰهَا یعنی ہم نے آسمان کو آراستہ کر دیا؛ جیسا کہ سورۃ الملک میں فرمایا: وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے۔) لِلنّٰظِرِيْنَ اعتبار اور غور وفکر کرنے والوں کے لئے۔

وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

''اور ہم نے محفوظ کر دیا ہے آسمان کو ہر شیطان سے جو راندہ ہوا ہے۔''

یہاں رَّجِيْمٍ بمعنی مرجوم (راندہ ہوا) ہے۔ اور الرجم کا معنی الرمی بالحجارۃ (پتھر مارنا) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرجم کا معنی لعنت کرنا اور بھگانا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ رجیم آیا ہے وہ بمعنی الشتم (گالی دینا) ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تمام آسمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک شیاطین سے محفوظ نہ تھے، پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو ان میں سے تین آسمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک محفوظ کر لیا، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد تمام آسمانوں کو محفوظ کر لیا اور ان (شیاطین) سے شہابوں کے ساتھ ان کی حفاظت اور نگرانی کی گئی۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (6)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ شیاطین کو آسمان میں جانے سے نہیں روکا جاتا تھا، پس وہ اس میں داخل ہو جاتے تھے اور وہاں کی خبریں کاہنوں کے پاس پہنچاتے تھے، پس وہ ان پر نو کا اضافہ کرتے اور اس کے بارے اہل زمین کو بتاتے تھے؛ ایک کلمہ حق ہے اور نو باطل ہیں؛ پس جب وہ اسی شے کو دیکھتے جو انہوں نے کہی ہوتی تو وہ اس بارے میں ان کی تصدیق کرتے جو وہ لے کر آتے، پس جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی ولادت ہوئی تو تین آسمانوں سے انہیں روک دیا، اور جب حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو تمام آسمانوں سے وہ روک دیئے گئے، پھر جو بھی کوئی چوری چھپے سننے کا ارادہ کرتا تھا اسے شہاب کے ساتھ بھگا دیا جاتا) جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

''بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے تو (اس صورت میں) تعاقب کرتا ہے اس کا ایک روشن شعلہ۔''

لیکن وہ جو چوری چھپے سن لے، یعنی کوئی تھوڑی سی چیز اچک لے، پس یہ استثناء منقطع ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ استثنا متصل ہے، یعنی سوائے اس کے جو چوری چھپے سن لے، یعنی ہم نے آسمان کو شیاطین سے محفوظ کر دیا ہے کہ وہ وحی وغیرہ میں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 151 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً | 5۔ ایضاً | 6۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 152

سے کسی چیز کو سنیں، بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے کیونکہ ہم نے اسے اس سے محفوظ نہیں کیا کہ وحی کے سوا آسمان کی خبروں میں سے کوئی خبر سنی جائے، اور رہی وحی! تو اس میں سے کوئی شے نہیں سنی جا سکتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ (شعراء) (نہیں (شیطان کو) تو اس کے سننے سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔) اور جب شیاطین کسی ایسی شے کی طرف کان لگا کر سنیں جو وحی نہیں تو وہ اسے آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ کاہنوں کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ پھر شہاب (شعلے) ان کا تعاقب کرتے ہیں پس وہ انہیں قتل کر دیتے ہیں یا ان کے اعضاء کو فاسد اور خراب کر دیتے ہیں؛ اسے حضرت حسن اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ۔ اَتْبَعَهٗ، اسے پالیتا ہے اور اسے پیچھے سے لاحق ہو جاتا ہے اور شہاب سے مراد روشن ستارہ ہے۔ اور اسی طرح شہاب ثاقب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: بِشِهَابٍ قَبَسٍ (نمل: 7) یعنی آگ کے اس شعلے کے ساتھ جو لکڑی کے سرے پر ہوتا ہے) یہ ابن عزیز نے کہا ہے۔

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

كأنه كوكب فی إثر عِفرِيَةٍ　　مسوَّمٌ فی سواد الليل مُنْقَضِبُ(1)

اور ستارے کو اس کی چمک اور روشنی کی وجہ سے شہاب کا نام دیا گیا ہے کہ وہ آگ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شہاب سے مراد آگ کا شعلہ ہے، جو اہل زمین کے لئے جلایا جائے پس وہ انہیں جلا دیتا ہے اور لوٹ کر نہیں آتا جب وہ جلا دے جیسا کہ جب آگ جلا دے تو وہ نہیں لوٹتی، بخلاف ستارے کے کیونکہ جب وہ جلائے تو اپنی جگہ (اور مقام) کی طرف لوٹ آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: شیاطین گروہ در گروہ اوپر چڑھتے ہیں اور چوری چھپے سنتے ہیں پھر ان میں سے زیادہ سرکش منفرد اور الگ ہو جاتا ہے اور وہ مزید بلند ہوتا ہے، تو اسے شہاب (شعلے) کے ساتھ بھگا دیا جاتا ہے پس وہ اس کی پیشانی یا اس کی ناک پر یا جہاں اللہ تعالیٰ چاہے آ لگتا ہے پس وہ جلنے لگتا ہے، اور وہ اپنے ساتھیوں کے پاس اسی حال میں آتا ہے کہ وہ جل رہا ہوتا ہے اور کہتا ہے: بے شک امر اس اس طرح ہے، پس وہ کاہنوں میں سے اپنے بھائیوں کے پاس جاتے ہیں اور اس پر نو کا اضافہ کر دیتے ہیں، اور وہ اس کے ساتھ اہل زمین سے گفتگو کرتے ہیں؛ ایک کلمہ حق ہے اور نو باطل ہیں۔ پس جب وہ ان کے کہنے کے مطابق کوئی شے دیکھ لیتے کہ وہ اسی طرح ہوئی ہے، تو وہ (اہل زمین) ان کی ہر اس بات کی تصدیق کر لیتے جو انہوں نے اس کے ساتھ اپنی طرف سے جھوٹ بھی بولے، یہی معنی مرفوع روایت کے ساتھ سورۃ السبا میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور شہاب کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ قتل کرتا ہے یا نہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ شہاب زخمی کر دیتا ہے، جلا دیتا ہے اور اعضاء کو خراب اور فاسد کر دیتا ہے، لیکن وہ قتل نہیں کرتا۔ حسن اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ قتل کر دیتا ہے؛ پس اس قول کی بنا پر جنوں تک سنی ہوئی بات پہنچانے سے پہلے شہابوں کے ساتھ ان کے قتل کے بارے میں دو قول

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 153

ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بات جو انہوں نے چوری چھپے سنی ہے اسے اپنے غیر تک پہنچانے سے پہلے وہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؛ پس اس بنا پر آسمان کی خبریں غیر انبیاء تک نہیں پہنچ سکتیں، اسی لئے کہانت ختم ہو چکی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے چوری چھپے سنا ہے اسے اپنے غیر جنوں تک پہنچانے کے بعد وہ قتل کئے جاتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے چرانے کے لئے دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے، اور اگر وہ بات نہ پہنچتی تو یقیناً چرانے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا اور جلانے کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الصافات میں آئے گا۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا شہابوں کے ساتھ بھگانا بعثت سے پہلے بھی تھا؟ تو اکثر نے کہا ہے: ہاں (یہ سلسلہ تھا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہیں۔ بلکہ یہ بعثت کے بعد شروع ہوا۔ اس مسئلہ کا بیان عنقریب سورۃ الجن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور سورۃ الصافات میں بھی۔

زجاج نے کہا ہے: شہابوں کے ساتھ بھگانا حضور نبی مکرم ﷺ کی ان علامات اور نشانیوں میں سے ہے جو آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے بعد ظاہر ہوئیں؛ کیونکہ قدیم شعراء نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ انہوں نے کسی تیز رفتار شے کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ انہوں نے بجلی اور سیلاب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بعید نہیں کہ کہا جائے کہ ستاروں کا ٹوٹنا تو قدیم زمانے میں تھا لیکن وہ شیطانوں کو بھگانے کے لئے نہ تھا، پھر جس وقت حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو یہ انہیں بھگانے کے لئے ہو گیا۔ اور علماء نے کہا ہے: ہم ستاروں کا ٹوٹنا دیکھتے ہیں۔ پس یہ بھی جائز ہے کہ وہ اسی طرح ہو جیسے ہم دیکھتے ہیں پھر وہ آگ بن جاتا ہو جب وہ شیطان کو پالے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ کہا جائے: وہ ہوائے نفس کی آگ کے شعلے کے ساتھ بھاگتے ہیں اور اس میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ستارہ چل رہا ہے۔ اور لغت میں شہاب سے مراد روشن آگ ہے۔ اور ابوداؤد نے عامر شعبی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب حضور نبی مکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تو شیاطین کو ستاروں کے ساتھ بھگایا گیا اس سے قبل وہ اس کے سبب نہ بھگائے جاتے تھے، پس وہ عبد یالیل بن عمرو ثقفی کے پاس آئے اور کہا: بے شک لوگ خوفزدہ ہو گئے ہیں اور وہ اپنے غلاموں کو آزاد کرنے لگے ہیں اور انہوں نے اپنے جانور چھوڑ دیئے ہیں جب سے انہوں نے ستاروں میں دیکھا ہے۔ تو اس نے انہیں کہا: اور وہ نابینا آدمی تھا...... تم جلدی نہ کرو اور حالات دیکھو اور غور و فکر کرو پس اگر ستارے وہ ہیں جو معروف ہیں اور پہچانے جا سکتے ہیں تو پھر یہ لوگوں کے فنا ہونے کا وقت ہے، اور اگر وہ ستارے پہچانے نہیں جا سکتے تو یہ کوئی حادثہ ہے جو پیش آنے والا ہے۔ پس انہوں نے غور سے دیکھا تو وہ ستارے نہیں پہچانے جا سکتے تھے، تو انہوں نے کہا: یہ کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ پس ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے بارے سن لیا۔

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾
وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ﴿۲۰﴾

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 153

''اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور گاڑ دیئے اس میں محکم پہاڑ اور ہم نے اگادی اس میں ہر چیز اندازے کے مطابق اور ہم نے بنا دیئے تمہارے لئے بھی اس میں رزق کے سامان اور ان کے لئے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے، اور ان میں سے جو اس کے کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: ہم نے زمین کو پانی کی سطح پر پھیلا دیا؛ جیسا کہ فرمایا: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿النازعات﴾ (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا۔) یعنی ہم نے اسے بچھا دیا۔ اور فرمایا: وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿الذاریات﴾ (اور زمین کا ہم نے فرش بچھا دیا پس ہم کتنے اچھے (فرش) بچھانے والے ہیں) اور یہ اس کا رد ہو رہا ہے جس کا گمان یہ ہے کہ یہ (زمین) گیند کی مثل ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ اور ہم نے اس میں ثابت اور محکم پہاڑ گاڑ دیئے ہیں تاکہ یہ اپنے رہنے والوں کے ساتھ حرکت نہ کرے۔ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ اور ہم نے اس میں ہر چیز معلوم اور متعین مقدار کے ساتھ اگادی؛ یہ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے اور بے شک فرمایا: مَّوْزُوْنٍ کیونکہ وزن وہ ہے جس کے ساتھ کسی شئ کی مقدار پہچانی جاتی ہے۔

چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

قد كنتُ قبل لقائكم ذامِرّة   عندی لِكُلِّ مخاصِم مِيزانه(1)

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: موزون سے مراد مقسوم (2) (تقسیم کیا گیا) ہے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: موزون سے مراد معدود ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: هذا كلام موزون؛ یعنی یہ کلام منظم ہے منتشر نہیں ہے۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا یعنی ہم نے زمین میں اُگادی ہر وہ چیز جس کا وزن کیا جاتا ہے جواہر، حیوانات اور معاون میں سے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے حیوانوں کے بارے میں فرمایا: وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران: 37) اور یہاں اِنبات سے مقصود پیدا کرنا اور ایجاد کرنا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا یعنی پہاڑوں میں مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ یعنی ہم نے پہاڑوں میں ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا فرمادی سونے، چاندی، تانبے، سیسے، قزدیر (ایک دھات) میں سے حتیٰ کہ ہڑتال اور سرمہ اور ہر وہ شے جس کا وزن کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر وہ شے جس میں ثمنوں کا وزن کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس شے کی نسبت قدر کے اعتبار سے اعلیٰ اور نفع کے اعتبار سے اعم ہوتی ہے جس کا کوئی ثمن نہ ہو۔ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ یعنی ہم نے تمہارے لئے اس میں کھانے پینے کی وہ چیزیں بنا دی ہیں جن کے ساتھ وہ زندگی گزارتے ہیں؛ مَعَايِش کا واحد معيشة (یاء کے سکون کے ساتھ) ہے۔

اور اسی سے جریر کا قول ہے:

تكلفنی مَعِيشَةَ آلِ زيدٍ   وَ مَنْ لی بالمرقق والصِّناب

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 153   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

یہ اصل میں مَعْيِشَةٌ مَفْعِلَةٌ کے وزن پر (یا متحرک کے ساتھ) ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: بے شک اس سے مراد ملابس (پہننے کے کپڑے) ہیں، یہ حسن نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: بے شک اس سے مراد مدت حیات تک اسباب رزق میں تصرف کرنا ہے۔ ماوردی نے کہا ہے: اور یہی ظاہر ہے۔ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ مراد جانور اور چوپائے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ بھی ہے کہ ان سے مراد غلام اور وہ بچے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (الاسراء: 31) (ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی) اور لفظ مَنْ کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ غلاموں اور چوپاؤں تمام کو شامل ہو جب وہ جمع ہوں؛ کیونکہ جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول جمع ہو جائیں تو ذوی العقول غالب ہوتے ہیں، یعنی ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان رزق، غلام، کنیزیں، جانور اور اولاد پیدا فرمادی ہے ہم انہیں رزق دیتے ہیں، تم انہیں رزق نہیں دیتے۔ پس اس تاویل کی بنا پر مَنْ محل نصب میں ہے؛ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وحشی جانور ہیں۔ حضرت سعید نے بیان کیا ہے: ہم پر منصور نے وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ پڑھی اور کہا: یہ وحشی مراد ہیں۔ پس اس معنی کی بنا پر مَنْ غیر ذوی العقول کے لئے ہوگا، جیسا کہ اس آیت میں ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ الآیہ (النور: 45) (تو ان میں کچھ تو رینگتے ہیں پیٹ کے بل ....) پس مَنْ محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف لَکُمْ میں کاف اور میم پر ہے۔ اور یہ بصریوں کے نزدیک قبیح ہے؛ کیونکہ ان کے نزدیک ظاہر کا عطف مضمر پر جائز نہیں ہوتا مگر حرف جر کے اعادہ کے ساتھ؛ جیسے مررت به وبزيد۔ اور مررت به وزيد کہنا شعر کے بغیر جائز نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فاليومَ قربت تهجونا و تشتمنا ۔ فاذهبْ فما بك والأيام من عجب

اس میں الایام کا عطف بِكَ پر بغیر حرف جر کے اعادہ کے ہے۔

یہ بحث سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

''اور نہیں کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں، اور ہم نہیں اتارتے اسے مگر ایک معلوم اندازے کے مطابق''

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ یعنی مخلوق کے رزقوں اور ان کے منافع میں سے کوئی شے نہیں ہے مگر ہمارے پاس اس کے خزانے بھرے پڑے ہیں؛ مراد آسمان سے نازل کی جانے والی بارش ہے، کیونکہ اسی کے ساتھ ہر شے اگتی ہے۔ حسن نے کہا ہے: بارش ہر شے کا خزانہ ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خزائن سے مراد مفاتیح (چابیاں) ہیں، یعنی رزق کی چابیاں آسمان میں ہیں؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ یعنی البتہ ہم اسے نازل نہیں کرتے مگر اپنی مشیت کے مطابق اور اتنی مقدار میں جتنی مخلوق کو اس کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے؛

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 155

جیسا کہ فرمایا: وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ (الشوریٰ: 27) (اور اگر کشادہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ رزق کو اپنے (تمام) بندوں کے لئے تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں، لیکن وہ اتارتا ہے ایک اندازے سے جتنا چاہتا ہے)۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حکم بن عتیبہ وغیرہما سے روایت ہے کہ ایک سال دوسرے سال کی نسبت بارش کے اعتبار سے زیادہ اور کثیر نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ جیسے چاہے اسے تقسیم کرتا ہے، پس ایک قوم کو بارش عطا کی جاتی ہے اور دوسروں کو محروم رکھا جاتا ہے (1)۔ اور بسا اوقات سمندروں اور چٹیل میدانوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور الخزائن الخزانۃ کی جمع ہے، اور اس سے مراد وہ جگہ ہے جس میں انسان اپنا مال چھپا کر رکھتا ہے (محفوظ رکھتا ہے) اور الخِزانۃ بھی خَزَنَ یَخْزُنُ کا مصدر ہے۔ اور ہر وہ شے جو انسان کے خزانہ میں ہے وہ اس کے لئے تیار کی گئی ہے، پس اسی طرح جس چیز پر رب قدرت رکھتا ہے تو گویا وہ اسی کے پاس تیار کی گئی ہے؛ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور جعفر بن محمد نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: عرش میں ہر اس شے کی مثال موجود ہے جو اللہ تعالیٰ نے بحر و بر میں تخلیق فرمائی ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تاویل ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ اور اس میں انزال بمعنی انشاء (بنانا) اور ایجاد کرنا ہے؛ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) (اور پیدا کئے تمہارے لئے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے۔)

اور یہ ارشاد گرامی ہے: وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (الحدید: 25) (اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انزال بمعنی اعطاء (عطا کرنا) ہے، اور اس کا نام انزال اس لئے رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام آسمان سے ہی نازل ہوتے ہیں۔

وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

"پس ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر پھر ہم اتارتے ہیں آسمان سے پانی پھر ہم پلاتے ہیں تمہیں وہی پانی۔ اور تم اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ عام قراءت الرِّیَاح جمع کے ساتھ ہے۔ اور حمزہ نے اسے واحد پڑھا ہے؛ کیونکہ ریح کا معنی جمع بھی ہے اگرچہ اس کا لفظ واحد ہے، جیسے کہا جاتا ہے: جاءت الریح من کل جانب (ہر طرف سے ہوا آئی)۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: أرض سَبَاسِب (وہ زمین جو دور تک ہموار ہو) اور ثوب اخلاق (پرانے کپڑے) اسی طرح عرب ہر شے میں وسعت کر دیتے ہیں۔ اور رہی قرأت عامہ کی وجہ تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت لَوَاقِحَ ذکر کی ہے اور یہ جمع ہے۔ اور لَوَاقِح کا معنی حوامل (اٹھانے والیاں) ہے؛ کیونکہ ہوا پانی، مٹی، بادل، خیر اور دیگر منافع اٹھائے ہوئے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 155

ہوتی ہے (اس لئے اس کی صفت لواقح ذکر کی گئی ہے)۔ ازہری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ریح کو لاقح بنایا ہے کیونکہ وہ بادل کو اٹھائے ہوئے ہوتی ہے؛ یعنی وہ اسے اٹھاتی ہے، اور اسے چلاتی ہے، اور پھر اسے برساتی ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا (الاعراف: 57) (یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل) اور ناقۃ لاقح اور نوق لواقح جب اونٹنیاں اپنے پیٹوں میں جنین اٹھائے ہوئے ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لواقح بمعنی مُلْقِحة ہے اور یہی اصل ہے (حاملہ کرنے والی) لیکن ہوا پر کوئی چیز ڈالی نہیں جاتی بلکہ یہ بذات خود لاقح (اٹھانے والی (حاملہ) ہوتی ہے، گویا ہوائیں خیر و بھلائی کے ساتھ حاملہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ذوات لقح (اٹھانے والی)، اور یہ سب صحیح ہے؛ یعنی ان میں سے وہ بھی ہیں جو درختوں میں تلقیح کا عمل کرتی ہیں: جیسے ان کا قول ہے: عیشة راضیة یعنی ایسی زندگی جس میں رضا اور خوشی ہے۔ اور لیل نائم یعنی ایسی رات جس میں نیند آئے۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو بادل لاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: لَقِحت الناقة (عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ) لَقَحا و لَقَاحًا (لام کے فتحہ کے ساتھ) فھی لاقح (یعنی اونٹنی حاملہ ہوئی) اور القحھا الفحل یعنی نر نے اس میں اپنا پانی ڈالا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ پس ہوائیں بھی بادلوں کے لئے فحل (نر) کی طرح ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: و ریاح لواقح اور مَلَاقِح نہیں کہا جائے گا، اور یہ نوادر میں ہے۔ مہدوی نے ابوعبیدہ سے بیان کیا ہے: لواقح بمعنی مَلَاقِح ہے، اور یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ مُلْقِحة اور مُلْقِح کی جمع ہے، پھر اس سے حروف زائدہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ لاقحة اور لاقح کی جمع ہے، اس کا معنی ہے ذات اللقاح (حمل والی) اور یہ نسبت کی بنا پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لاقح کا معنی حامل (اٹھانے والا) ہو۔ اور عرب جنوب کے لئے لاقح اور حامل، اور شمال کے لئے حائل اور عقیم (بانجھ پن) کہتے ہیں۔ اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ مبشرۃ (بشارت دینے والی ہوا) بھیجتا ہے اور وہ زمین کو مکمل طور پر صاف کر دیتی ہے، پھر مثیرہ بھیجتا ہے اور وہ بادل کو چلاتی ہے، پھر مؤلفہ (اکٹھا کرنے والی) کو بھیجتا ہے اور وہ اسے اکٹھا اور جمع کر دیتی ہے پھر اللواقح بھیجتا ہے اور وہ درختوں میں پیوندکاری کا عمل کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الریح الملاقح وہ ہوا ہے جو شبنم اٹھائے ہوتی ہے پس وہ اسے بادل میں ڈالتی ہے، پس جب وہ اس میں جمع ہو جائے تو وہ بارش بن جاتی ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جنوب کی ہوا جنت سے آتی ہے اور یہی وہ الریح اللواقح ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور اس میں لوگوں کے لئے منافع ہیں (1)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جنوب سے کوئی ہوا نہیں چلتی مگر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وافر پانی والا چشمہ جاری فرما دیتا ہے (2)۔'' اور ابوبکر بن عیاش نے کہا ہے: بادل سے کبھی بارش نہیں برستی مگر اس کے بعد کہ اس میں چار قسم کی ہوائیں عمل کریں: پس الصبا اسے ابھارتی اور جمع کرتی ہے، اور دبور اسے باردار بناتی ہے، اور جنوب اسے برساتی ہے اور شمال اسے منتشر اور متفرق کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن وہب، ابن قاسم، اشہب، اور ابن عبدالحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 354 | 2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 155

اشہب کہتے ہیں...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ پس میرے نزدیک گندم کا باردار ہونا یہ ہے کہ وہ دانہ لائے اور سٹہ بالیاں نکال لے، اور میں اسے نہیں جانتا جو اپنے شگوفوں میں خشک ہو جاتی ہے، لیکن جو دانے دار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اگر اس وقت وہ خشک ہو جائے تو یہ ایسا فساد نہیں جس میں کوئی نفع نہ ہو۔ اور تمام درختوں کا باردار ہونا یہ ہے کہ وہ پھلدار ہو جائیں پھر اس سے گر جاتا ہے جو گر جاتا ہے اور ثابت اور قائم رہتا ہے جو ثابت رہتا ہے، اور یہ پکنے کے ساتھ لازم نہیں۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے(1): اس تفسیر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے درخت کے باردار ہونے کو حمل کے اٹھانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ کہ بچہ جب تیار ہو جائے اور اس کی خلقت مکمل ہو جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے تو وہ پھل کے دانے دار ہونے اور اس کے بالیاں نکالنے کے قائم مقام ہے؛ کیونکہ اسے ایسا نام دیا گیا ہے جس میں ہر حاملہ شریک ہوتی ہے اور وہ اللقاح ہے، اور اسی کے بارے حدیث بھی ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دانے کی بیع سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ وہ پک (کر سخت ہو) جائے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے: اہل علم کے نزدیک کھجور کے درخت میں پیوند کاری یہ ہے کہ کھجور کے نر گابھے اور شگوفے سے کوئی شے لی جاتی ہے اور اسے مادہ گابھے کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ اور باقی پھلوں میں اس کا معنی یعنی انجیر وغیرہ میں سے پھل کا ظاہر ہونا ہے یہاں تک کہ پھل دکھائی دینے لگے، اس کی طرف دیکھا جا سکتا ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک پھلوں میں سے وہ جن کا ذکر کیا جاتا ہے اور وہ جن کا ذکر نہیں کیا جاتا ان میں معتبر یہ ہے کہ اس کی کلی ثابت رہے جو ثابت رہتا ہے اور اس کی گر جائے جو گر جاتا ہے۔ اور کھیتی میں اس کی حد (تعریف) یہ ہے کہ وہ زمین سے ظاہر ہو جائے؛ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ان سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ کھیتی کا باردار ہونا یہ ہے کہ وہ دانے دار ہو جائے۔ اور علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ باغ جب شق (پھٹ) ہو جائے تو اس کا مونث ہونا ظاہر ہو گیا تو اس کی تلقیح کو موخر کر دیا جائے اور اس کے غیر کی تلقیح کر دی جائے جس کی حالت اس کی حالت کی مثل ہے، تو اس کا حکم اسی کے حکم کی مثل ہو گا جس کا گابھا لگایا گیا، کیونکہ اس پر گابھا لگانے کا وقت آیا اور اس کا پھل دانے میں غیب ہونے کے بعد ظاہر ہوا۔ اور اگر کسی نے بعض باغ کی پیوند کاری کی تو جس حصے کی پیوند کاری نہیں کی گئی وہ اس کے تابع ہو گا، جیسا کہ وہ باغ جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہو جائے تو سارا باغ بیع کے جائز ہونے میں اس صلاحیت کے ظاہر ہونے والے حصے کے تابع ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ تمام ائمہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے جس کھجور کا درخت پیوند کاری کے بعد خریدا تو اس کا پھل اس کے لئے ہو گا جس نے اسے بیچا مگر یہ کہ مشتری اپنے لئے اس کی شرط لگا لے، اور جس نے غلام خریدا تو اس کا مال اس کے لئے ہو گا جس نے اسے فروخت کیا مگر یہ کہ مشتری اپنے لئے اس کی شرط لگا لے(2)۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک پیوند کاری کیا ہوا پھل بیع میں اصول (درختوں) کے ساتھ داخل نہیں ہوتا مگر شرط کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 126

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع باب ماجاء فی ابتیاع النخل، جلد 1، صفحہ 149

ساتھ، کیونکہ وہ عین موجود ہے جس کے ساتھ غالباً اس کے گرنے سے محفوظ ہونے کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، بخلاف اس کے جس کی پیوند کاری نہ کی جائے؛ کیونکہ جب وہ گرنے سے محفوظ نہیں تو پھر اس کے لئے وجود بھی متحقق نہیں، پس بیچنے والے کے لئے نہ اس کی شرط لگانا جائز ہے اور نہ اس کی استثنا کرنا؛ کیونکہ یہ جنین کی طرح ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے یہی مشہور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی استثنا جائز ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کھجور کا درخت خریدا جائے اور پھل بائع کے لئے باقی رہے تو درخت خریدنے والے کے لئے پھل پکنے سے پہلے اسے خرید لینا جائز ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور قول کے مطابق ہے۔ وہ اس کے لئے تبعیۃ کا حکم لگاتے ہیں اگرچہ اس کی بیع الگ کی گئی ہے، اور آپ سے ایک روایت ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ، ثوری، اہل ظواہر اور فقہاء الحدیث رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے نہی والی احادیث سے ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور ان میں سے جو اس باب سے تعلق رکھتی ہیں وہ ملاقح کی بیع سے نہی بھی ہے؛ اور ملاقح سے مراد نر اونٹ ہیں، یہ مُلْقِح کی جمع ہے۔ اور ملاقح سے مراد وہ مونث بھی ہیں جن کے پیٹوں میں ان کے بچے ہوں، اس کی واحد ملقحة (قاف کے فتحہ کے ساتھ) ہے۔ اور ملاقیح وہ جنین ہیں جو اونٹنیوں کے پیٹوں میں ہوں، اس کی واحد ملقوحة ہے، اور یہ ان کے اس قول سے ہے: لُقِحت (اونٹنی حاملہ ہوگئی)؛ جیسا محموم حُمّ سے ہے، اور مجنون جُنّ سے ہے، اور اس بارے میں بھی نہی وارد ہے، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے مَجر سے منع فرمایا اور یہ ان اَجنہ کی بیع ہے جو ابھی تک ماؤں کے پیٹوں میں ہوں۔ اور آپ نے مضامین اور ملاقیح سے بھی منع فرمایا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: مضامین وہ ہیں جو پیٹوں میں ہوں، اور وہ جنین ہیں۔ اور ملاقیح وہ ہیں جو ابھی نروں کی صلبوں میں ہوں۔ اور یہی حضرت سعید بن مسیب وغیرہ کا قول ہے۔ اور اس کا برعکس بھی کہا گیا ہے: بے شک مضامین وہ ہیں جو اونٹوں کے پیٹوں میں ہوں، اور ملاقیح وہ ہیں جو مونث (اونٹنیوں) کے پیٹوں میں ہوں۔ اور یہ ابن حبیب وغیرہ کا قول ہے۔ دونوں امروں میں سے جو بھی ہو، پس مسلمان علماء کا اس پر اجماع ہے کہ یہ بیع جائز نہیں ہے۔ اور مزنی نے ابن ہشام سے بطور شاہد یہ ذکر کیا ہے کہ ملاقیح وہ ہیں جو پیٹوں میں ہوں۔

کیونکہ بعض اعرابی کہتے ہیں:

مَنِيَّتِي مَلَاقِحًا فِي الْأَبْطُنِ | تُنْتَجُ مَا تَلْقَحُ بَعْدَ أَزْمُنِ

اور جوہری نے اس پر بطور شاہد راجز کا قول ذکر کیا ہے:

إِنَّا وَجَدْنَا طَرَدَ الْهَوَامِلِ | خَيْرًا مِنَ التَّأْنَانِ وَ الْمَسَائِلِ

وَعِدَةِ الْعَامِ وَ عَامٍ قَابِلِ | مَلْقُوحَةً فِي بَطْنِ نَابٍ حَائِلِ

قولہ تعالیٰ: فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ یعنی بادل سے ہم اتارتے ہیں، اور ہر وہ شے جو تجھ پر بلند ہو اور تجھ پر سایہ فگن ہو اس کا نام سماء ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم اتارتے ہیں آسمان کی طرف سے۔ مَآءً یعنی بارش۔ فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ یعنی ہم نے اس

بارش کو تمہارے پینے کے لئے اور تمہارے مویشیوں اور تمہاری زمین کو سیراب کرنے کے لئے بنایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سقی اور أسقی دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور ان کے درمیان فرق کا قول بھی کیا گیا ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ یعنی تمہارے پاس اس کا ذخیرہ نہیں ہے؛ یعنی ہم اس پانی کو ذخیرہ کرنے والے ہیں جب ہم چاہتے ہیں ہم اسے برساتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اسے روک لیتے ہیں۔ اور اسی کی مثل یہ ارشادات ہیں: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۝ (الفرقان) (اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی) وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ﴿ۖ﴾ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۝ (المومنون) (اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پھر ہم نے ٹھہرا لیا اسے زمین میں اور یقیناً ہم اسے بالکل ناپید کرنے پر پوری طرح قادر ہیں) اور سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم بارش کو روکنے والے نہیں ہو۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ۝

"اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہیں۔"

یعنی بے شک ہم ہی زمین کو اور اس پر بسنے والوں کو زندہ کرتے ہیں، اور ہمارے سوا کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَیْهَا وَ اِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ۝ (مریم) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے) پس ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے(1)، لیکن اس نے اپنے بندوں کو املاک کا مالک بنایا ہے پس جب وہ مر جائیں گے تو ان کے دعوے ختم ہو جائیں گے، پس اس وجہ سے اللہ تعالیٰ وارث ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں احیاء (زندہ کرنے) سے مراد رحموں میں نطفہ کو زندہ کرنا ہے۔ اور رہا بعث بعد الموت تو اس کا ذکر اس کے بعد کیا اس ارشاد میں: وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْ (الحجر: 25) (اور بے شک آپ کا پروردگار ہی انہیں (روز قیامت) جمع کرے گا۔)

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ۝

"اور یقیناً ہم جانتے ہیں ان کو بھی جو گزر چکے ہیں تم میں سے اور یقیناً ہم جانتے ہیں بعد میں آنے والوں کو۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ اس میں آٹھ تاویلات ہیں: (۱) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ یعنی جو آج دن تک پیدا ہونے میں آگے بڑھنے والے ہیں (2) اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وہ جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے، یہ حضرت قتادہ اور عکرمہ وغیرہما نے کہا ہے۔ (۲) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے مراد اموات (مرنے والے) ہیں (3)، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ سے مراد احیاء (زندہ) ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے کہا ہے۔ (۳) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے مراد وہ ہیں جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے پہلے گزر چکے ہیں اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وہ ہیں (4) جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 358 2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 156 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

کی امت میں سے پیچھے آنے والے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۴) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ وہ ہیں (1) جو خیر اور طاعت میں آگے بڑھنے والے ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وہ ہیں جو شر اور معصیت میں پیچھے رہنے والے ہیں؛ یہ حسن اور قتادہ نے بھی کہا ہے۔ (۵) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ وہ (2) جو جنگ کی صفوں میں آگے بڑھنے والے ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ جو ان میں پیچھے رہنے والے ہیں؛ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ (۶) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ جو (3) جہاد میں قتل ہونے کے سبب آگے گزرنے والے ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وہ جو قتل نہیں کیے گئے؛ یہ قرطبی نے کہا ہے۔ (۷) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے (4) مراد اول الخلق ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ آخر الخلق ہیں؛ یہ شعبی نے کہا ہے۔ (۸) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے (5) مراد نماز کی صفوں میں آگے نکلنے والے ہیں اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ سے مراد ان میں پیچھے رہنے والے ہیں عورتوں کے سبب۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے؛ کیونکہ وہ ہر موجود و معدوم کو جاننے والا ہے، اور وہ انہیں جاننے والا ہے جنہیں اس نے پیدا کیا ہے اور ہر اس شے کو جسے وہ یوم قیامت تک پیدا کریگا، مگر آٹھواں قول آیت کے نازل ہونے کا سبب ہے جیسا کہ اسے نسائی اور ترمذی نے ابوالجوزاء سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا ہے: ایک عورت جو کہ حسین ترین لوگوں میں سے ایک تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھی (6)، تو قوم میں سے بعض آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ وہ پہلی صف میں ہو گئے تاکہ وہ اسے نہ دیکھیں، اور بعض پیچھے ہو گئے یہاں تک کہ وہ پیچھے والی صف میں ہو گئے، اور جب رکوع کرتے تو اپنی بغلوں کے نیچے سے (اس کی طرف) دیکھتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ اور یہ ابوالجوزاء سے مروی ہے اور اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر نہیں کیا، اور یہی اصح ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ نماز میں اول وقت کی فضیلت پر اور پہلی صف کی فضیلت پر بھی دلالت کرتی ہے (7)، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑا ہونے کے (اجر و ثواب کو) جان لیں تو پھر وہ اسے نہ پا سکیں مگر یہ کہ وہ اس پر قرعہ اندازی کریں تو یقیناً اس پر قرعہ اندازی کرتے (8)۔'' پس جب ایک آدمی زوال کے وقت آئے اور پہلی صف میں امام کے پڑوس میں آ کر بیٹھ جائے، تو اس نے فضیلت کے تین مراتب حاصل کر لئے: (۱) اول وقت (۲) صف اول (۳) امام کی مجاورت۔ اور اگر کوئی زوال کے وقت آیا اور دوسری صف میں آ کر بیٹھ گیا یا پہلی صف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا، تو اس نے اول وقت کی فضیلت کو پالیا اور پہلی صف اور امام کی مجاورت کی فضیلت کو نہ پاسکا۔ اور اگر کوئی زوال کے وقت آیا اور پہلی صف میں اس جگہ بیٹھ گیا جو امام کے قریب نہ تھی تو اس نے اول وقت اور صف اول کی فضیلت کو حاصل کر لیا اور امام کی مجاورت اس سے فوت ہو گئی۔ اور اگر کوئی زوال کے بعد آیا اور پہلی صف میں آ کر بیٹھ گیا تو اس سے اول وقت کی فضیلت جاتی رہی اور اس نے پہلی صف اور امام کی مجاورت کو پالیا۔ اور اسی طرح امام کی مجاورت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی،

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 156 — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً — 4۔ ایضاً — 5۔ ایضاً

6۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب الخشوع فی الصلاۃ، حدیث نمبر 1035، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، صفحہ 1127 — 8۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1128

بلاشبہ یہ ایسے ہی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”چاہیئے کہ میرے قریب تم میں سے عاقل بالغ لوگ ہوں (1)“ الحدیث۔ پس جو امام کے پیچھے قریب ہو اسے چاہیئے کہ اس صف سے متصف ہو۔ اور اگر کوئی دوسرا اس کی جگہ آ بیٹھے تو اسے پیچھے کر دیا جائے اور وہ اس جگہ آگے آ جائے؛ کیونکہ صاحب شرع کے حکم سے یہ اس کا حق ہے، جیسا کہ محراب امام کی جگہ ہے چاہے وہ پہلے آئے یا بعد میں، یہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو محمول کیا جائے گا: اے فلاں! تو پیچھے ہو، اے فلاں! تو آگے ہو؛ پھر آپ آگے بڑھتے اور تکبیر کہی جاتی۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس امت میں سے ایک آدمی سجدہ کرتے ہوئے گر جائے گا اور اس کو بخش دیا جائے گا جو اس کے پیچھے ہوگا۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ اسی امید پر مسجد کی پچھلی صف کا قصد کرتے تھے، اور ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ تورات میں اسی طرح پایا ہے۔ اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اور اس باب سے متعلق زیادہ تفصیلی بیان سورۃ الصافات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور جس طرح یہ آیت نماز میں صف اوّل کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے، پس اسی طرح یہ جنگ میں بھی صف اوّل کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے؛ کیونکہ دشمن کے مقابلے میں کھڑا ہونا، اور بندے کا اپنی جان کو اللہ تعالیٰ سے فروخت کر دینا کوئی عمل اس کے مساوی نہیں ہوسکتا؛ پس اس کی طرف آگے بڑھنا افضل ہے، اس میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ اس میں کوئی خفا ہے۔ اور کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی عیب یا برائی بیان نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ دلیر اور شجاع تھے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! جب غصے کے سبب آپ کا رنگ سرخ ہوتا تو ہم آپ سے بچتے تھے۔ اور ہم میں سے بہادر وہ ہوتا جو آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ جاتا۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

”اور بے شک آپ کا پروردگار ہی انہیں (روز قیامت) جمع کرے گا بیشک وہ بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ یعنی حساب اور جزا کے لئے بے شک آپ کا رب ہی انہیں جمع کرے گا۔ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

”اور بلاشبہ ہم نے پیدا کیا انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی۔“

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ یعنی بلاشبہ ہم نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ مِنْ صَلْصَالٍ یعنی خشک کھنکتی مٹی سے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔ اور الصلصال: ایسی مٹی (گارا) جس میں ریت نہ ملی ہوئی ہو جب وہ ریت کے ساتھ مل جائے اور جب خشک ہو جائے، بجنے لگے، پھر جب اسے آگ پر پکا لیا جائے تو وہ فخار کہلاتی ہے؛ یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے۔ اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1128 2۔ ایضاً

كَعَدْوِ الْمُصَلْصِلِ الْجَوَّالِ

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد بدبودار گارا ہے اور کسائی نے اسے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: یہ عربوں کے اس قول سے ہے: صلّ اللحمُ و أصلّ جب گوشت بدبودار ہو جائے چاہے وہ پکا ہوا ہو یا کچا ہو، یَصِلّ صلولا۔ حطیہ نے کہا ہے:

ذاك فتىً يبذُل ذا قِدْرِہ　　لا يُفسِد اللحمَ لدَيْه الصُّلول (1)

اور طین صَلّال و مصْلال، یعنی ایسی مٹی جو آواز دیتی ہو جب تو اسے کھنکھنائے جیسا کہ لوہا آواز دیتا ہے، پس وہ پہلے تراب تھی، یعنی اس کے اجزاء متفرق تھے پھر اسے تر کیا گیا، گوندھا گیا تو طین ہو گئی، پھر اسے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس میں بدبو پیدا ہو گئی تو وہ حمأ مسنون ہو گئی، یعنی متغیر ہو گئی (اس کی شکل خراب ہو گئی) پھر وہ خشک ہوئی تو صلصال ہو گئی؛ یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور الحمأ سے مراد سیاہ گارا ہے اور اسی طرح الحَمْأة بالتسکین بھی ہے؛ اسی سے تو کہتا ہے: حَمَئْتُ البئرَحَمأً (یعنی یہ میم کے سکون کے ساتھ ہے) جب کنوئیں کا کیچڑ نکالا جائے۔ اور حَمِئَتْ البئرحَمَأً (میم متحرک کے ساتھ) جب اس کا کیچڑ زیادہ ہو جائے۔ اور أحماتھا إحماء میں نے اس میں کیچڑ ڈالا؛ یہ ابن السکیت سے منقول ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: الحمأۃ (میم کے سکون کے ساتھ) الکنأۃ کی مثل ہے۔ اور اس کی جمع حَمْءٌ آتی ہے، جیسا کہ تمرۃ اور اس کی جمع تمرٌ ہے۔ اور الحَمَأ مصدر ہے جیسا کہ الهلَع اور الجزَع ہے پھر اسی کے ساتھ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور المسنون کا معنی متغیر ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ مٹی جو گیلی اور بدبودار ہو، اور اسے صلصال بنایا گیا ہے جیسا کہ فخار ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، دونوں نے کہا ہے: بدبودار بدلی ہوئی مٹی یہ ان کے اس قول سے ہے: قد أسِن الماء جب پانی (کا رنگ اور ذائقہ) بدل جائے؛ اور اسی سے لَمْ يَتَسَنَّهْ (البقرہ: 259) (یہ باسی نہیں ہوا) اور مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ (محمد: 15) (وہ پانی جس کی بو اور مزہ نہیں بگڑتا) ہے۔

اور اسی سے ابوقیس بن اسلت کا قول ہے:

سقت صدای رُضابا غیر ذی أسن　　کالمسك فُتّ علی ماء العناقید (2)

اور فراء نے کہا ہے: اس سے مراد متغیر (وہ جس کی حالت بدل جائے) ہے، اور اس کی اصل ان کے اس قول سے ہے: سننت الحجر علی الحجر جب تو پتھر کو پتھر کے ساتھ رگڑے۔ اور جو کچھ دو پتھروں کو رگڑنے سے نکلتا ہے اسے السنانۃ اور السَّنِين کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ثم خاصرتُها الی القبة الحمراءِ　　تمشی فی مَرْمَرٍ مسنون

یعنی رگڑا ہوا ملائم پتھر۔ بیان کیا گیا ہے کہ یزید بن معاویہ نے اپنے باپ کو کہا: کیا تم عبدالرحمٰن بن حسان کو دیکھ نہیں

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 157　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 158

رہے وہ تمہاری بیٹی کے محاسن بیان کرتا ہے؟ تو معاویہ نے کہا: اس نے کیا کہا ہے؟ اس نے بتایا وہ کہتا ہے:

هی زهراءُ مثل لؤلؤة الغو اص مِیزت من جوهرٍ مکنونِ

یہ غواصی کرنے والے کے موتی کی مثل کلی ہے جسے چھپے ہوئے جوہر سے الگ کیا گیا ہو۔

تو معاویہ نے کہا: اس نے سچ کہا ہے! تو یزید نے کہا: وہ یہ بھی کہتا ہے:

واذا ما نسبتها لم تجدها فی سَناء من المکارم دونِ

اور جب بھی تو اس کا نسب بیان کرے تو تو اسے مکارم اور عظمت کی بلندیوں میں کم نہیں پائے گا۔

تو معاویہ نے کہا: اس نے سچ کہا ہے! پھر یزید نے کہا: اس کا یہ قول کہاں گیا: ثم خاصرتها...... البیت۔ تو معاویہ نے کہا: یہ جھوٹ ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: المسنون کا معنی انڈیلا ہوا ہے، اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: سننت الماء وغیرہ علی الوجہ جب تو پانی وغیرہ کو چہرے پر انڈیلے(1) (تو مذکورہ جملہ کہا جاتا ہے)۔ اور السن کا معنی الصب انڈیلنا ہے۔ اور علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ المسنون کا معنی الرطب (تر) ہے اور یہ بمعنی مصبوب ہی ہے؛ کیونکہ وہ مصبوب (انڈیلا ہوا) تبھی ہو سکتا ہے جب وہ تر ہو۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے؛ کیونکہ کہا جاتا ہے: سننت الشئ یعنی میں نے شے کو انڈیل دیا۔ ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: اور اسی سے وہ اثر ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ پانی اپنے چہرے پر انڈیلتے تھے اور اسے چھڑکتے نہ تھے اور الشن (شین کے ساتھ) ہو تو معنی پانی چھڑکنا ہے اور سین کے ساتھ ہو تو معنی بغیر تفریق کے پانی انڈیلنا اور بہانا ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے: المسنون کا معنی مصوّر ہے (یعنی وہ گارا جو بنایا گیا ہو) یہ سُنّۃ الوجہ سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی اس کی صورت اور شکل ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے:

تُرِیك سُنّۃ وجہٍ غیرَ مُقْرِفۃ مَلْسَاء لیس بها خالٌ ولاندَبُ

اور اخفش نے کہا ہے: المسنون کا معنی جو سیدھا کھڑا ہو، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے وجہ مسنون جب اس میں طوالت ہو۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: بے شک صلصال سے مراد گوندھی ہوئی مٹی (گارا) ہے؛ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلصال سے مراد بد بودار مٹی ہے تو اس کی اصل صلال ہے، پھر دو لاموں میں سے ایک کو صاد سے بدل دیا گیا ہے اور مِنْ حَمَاٍ، صلصال کی جنس کی تفسیر بیان کر رہا ہے؛ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: أخذت هذا من رجل من العرب (اس میں من العرب، رجل کی تفسیر کے لئے ہے۔)

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

"اور جن کو ہم نے پیدا فرمایا اس سے پہلے ایسی آگ سے جس میں دھواں نہیں۔"

قولہ تعالیٰ: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہم نے جن کو پیدا فرمایا۔ اور حسن نے کہا ہے:

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 158

مراد ابلیس ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا فرمایا۔ اور اسے آنکھوں سے چھپا رہنے کی وجہ سے جانٓ کا نام دیا گیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ثابت کی حدیث ہے (1) کہ وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر جنت میں بنائی اور اسے چھوڑ دیا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اسے چھوڑے رکھے تو ابلیس اس کے ارد گرد گھومتا رہا اور غور سے دیکھتا رہا یہ کیا ہے پس جب اس نے اس کے درمیان (پیٹ وغیرہ) کو دیکھا تو اس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو اپنے نفس کی مالک نہیں ہوگی''۔ (یعنی شہوات سے اسے محفوظ نہیں رکھ سکے گی) مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: نار السموم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے جن کو پیدا کیا ہے اور یہ جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: السموم سے مراد وہ گرم ہوا ہے جو مار ڈالتی ہے۔ اور آپ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ یہ ایسی آگ ہے جس کا دھواں نہیں۔ اور صواعق (بجلی کی کڑک) اسی سے ہوتی ہے۔ اور یہ (صواعق) ایک آگ ہے جو آسمان اور حجاب کے درمیان ہوتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ حکم صادر کرے تو حجاب پھٹ جاتا ہے اور صاعقہ (بجلی کا گرنا) وہاں جا کر گرتی ہے جہاں اسے حکم دیا گیا ہو۔ پس وہ آواز (اور کڑک) جو تم سنتے ہو وہ اسی حجاب (پردے) کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: نار السموم وہ آگ ہے جس کے نیچے حجاب ہے، اور بادل کی جو گرج تم سنتے ہو یہ اسی کی آواز ہوتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ابلیس ملائکہ کے گروہوں میں سے ایک گروہ تھا ان کو جن کہا جاتا ہے وہ ملائکہ میں سے ہوتے ہوئے نار سموم سے پیدا کئے گئے...... فرمایا...... اور وہ جن جن کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے وہ آگ کے خالص شعلے سے پیدا کئے گئے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے؛ کیونکہ یہ ایسی سند کا محتاج ہے جو عذر کو ختم کر دے؛ کیونکہ اس جیسا قول فقط رائے سے نہیں کیا جا سکتا۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ کی حدیث نقل کی ہے (2) انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور جن آگ کے خالص شعلے سے پیدا کئے گئے ہیں اور آدم علیہ السلام کو اس سے پیدا کیا گیا ہے جو تمہارے لئے بیان کیا گیا ہے۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: خلقت الملائكة من نور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور جوہری نے کہا ہے: مارج من نار سے مراد وہ آگ ہے جس کا دھواں نہیں اور اسی سے جن پیدا کئے گئے ہیں، اور سموم سے مراد گرم ہوا ہے یہ مؤنث ہے؛ اسی سے کہا جاتا ہے: سم یومنا (ہمارا دن گرم ہو گیا) پس یہی یوم مسموم ہے، اور اس کی جمع سمائم ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: گرم ہوا کبھی دن کے وقت ہوتی ہے اور کبھی رات کے وقت، اور الحرور (گرم ہوا) کبھی رات کے وقت ہوتی ہے اور کبھی دن کے وقت۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: گرم ہوا کو سموم کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب خلق الانسان، جلد 2، صفحہ 327

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب فی احادیث متفرقة، جلد 2، صفحہ 413

یہ اپنی لطافت اور نرمی کے سبب بدن کے مساموں میں داخل ہو جاتی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾

"اور (اے محبوب!) یاد فرماؤ جب آپ کے رب نے کہا تھا فرشتوں کو میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کھنکھناتی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار کیچڑ تھی تو جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے تو گر جانا اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ بے شک میں بجنے والی مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ پس جب میں اس کی خلقت اور اس کی صورت درست فرما دوں۔ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ، النفخ کا معنی کسی شی میں ہوا کو جاری کرنا ہے۔ اور الروح یہ لطیف جسم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ یہ ہے کہ وہ اس جسم کے ساتھ بدن میں حیات پیدا فرماتا ہے۔ اور اس کی حقیقت خلق کی نسبت خالق کی طرف کرنا ہے پس روح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جس کی اضافت تشریف و تکریم کے لئے اس نے اپنی طرف کی ہے۔ جیسا کہ ان ارشادات میں اضافت تشریف کے لئے ہے: اَرْضِی (میری زمین)، سَمَائِی (میرا آسمان)، بیتی (میرا گھر)، ناقة الله (اللہ کی اونٹنی) اور شهر الله (اللہ تعالیٰ کا مہینہ) اور اسی کی مثل وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ہے اور یہ مفصل بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور ہم نے کتاب (التذکرہ) میں اس بارے میں وارد ہونے والی وہ احادیث ذکر کی ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ روح ایک لطیف جسم ہے، اور یہ کہ نفس اور روح ایک مسمی کے دو نام ہیں۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جنہوں نے کہا ہے: بے شک روح ہی حیات (زندگی) ہے تو ان کی مراد یہ ہے کہ جب زندگی (حیات) اس سے مرکب کر دی جائے۔ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ یعنی تم اس کے لئے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا اور یہ سجدہ تعظیم و تکریم کے لئے ہے سجدۂ عبادت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ اسے فضیلت عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس اس نے انبیاء علیہم السلام کو ملائکہ پر فضیلت دی ہے۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور قفال نے کہا ہے: وہ آدم علیہ السلام سے افضل تھے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سجود کے ساتھ آزمایا اور یہ ان کو ثواب جزیل کے لئے پیش کرنا ہے۔ اور یہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرنے کے بارے میں حکم دیا گیا، اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے لئے قبلہ تھے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۳۱﴾

"پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کر دیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔"

قولہ تعالیٰ: فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) بے شک اسے اس سے تکبر کرنے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے نے روکا تھا؛ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، پھر کہا گیا ہے: وہ ملائکہ میں سے تھا۔ اور یہ استثنا اپنی جنس سے ہی ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: وہ ملائکہ میں سے نہ تھا؛ لہٰذا یہ استثنا منقطع ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: الجآن ابو الجن (جنوں کا باپ) ہے اور وہ شیاطین نہیں ہیں۔ اور شیاطین ابلیس کی اولاد ہیں، اور وہ نہیں مریں گے مگر ابلیس کے ساتھ اور جن فوت ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر بھی ہیں، پس حضرت آدم علیہ السلام انسانوں کے باپ ہیں۔ اور جآن جنوں کا باپ ہے۔ اور ابلیس شیطانوں کا باپ ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اور اس کے خلاف سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے، پس وہاں غور کر لو۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایک جنس کی دوسری جنس سے استثنا کرنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی کہے: لفلان علی دینار الا ثوبا (مجھ پر فلاں کے دینار ہیں سوائے کپڑے کے) یا عشرۃ اثواب الا قفیز حنطۃ (مجھ پر دس کپڑے ہیں سوائے ایک قفیز گندم کے) یہ ہم جنس نہیں ہیں لیکن یہ مقبول ہے، اور مستثنیٰ منہ سے کپڑے اور گندم کی قیمت ساقط ہو جائے گی اور اس میں کیلی، وزنی اور عددی سب چیزیں برابر ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مکیلی کی استثنا موزونی سے کرنا اور موزونی کی استثنا مکیلی سے کرنا جائز ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے دراہم کی استثنا گندم سے کی اور گندم کی استثنا دراہم سے کی تو وہ قبول کر لی جائے گی، لیکن جب کسی نے مقومات (جن کے ساتھ قیمت لگائی جاتی ہے) کی استثنا مکیلی یا موزونی چیزوں سے کی، اور مکیلی چیزوں کی استثنا مقومات سے کی، مثلاً وہ یہ کہے: علی عشرۃ دنانیر الا ثوبا (مجھ پر دس دینار ہیں سوائے کپڑے کے)، یا عشرۃ اثواب الا دینارا (مجھ پر دس کپڑے ہیں سوائے ایک دینار کے) تو یہ استثنا صحیح نہ ہوگی، اور اقرار کرنے والے پر مجموعی طور پر یہ سب چیزیں لازم ہو جائیں گی۔ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: غیر جنس سے استثنا کرنا صحیح نہیں ہوتا، اور اقرار کرنے والے پر وہ تمام چیزیں لازم ہو جاتی ہیں جن کا اس نے اقرار کیا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ لفظ استثنا جنس اور غیر جنس دونوں میں استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (الواقعہ) (نہ سنیں گے وہاں لغو باتیں اور نہ گناہ والی باتیں، بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی آواز آئے گی) پس اس میں تمام لغو کلام سے سلام کی استثنا کی گئی ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اور ابلیس من جملہ ملائکہ میں سے نہیں ہے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف: 50) (سوائے ابلیس کے، وہ قوم جن سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی۔)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 158

اور شاعر نے کہا: ---

وبلدةٍ لیس بھا أنیس　　إلا الیعافیر وإلا العِیسُ

پس اس میں شاعر نے یعافیر جو کہ مذکر ہرن ہے، اور عیس جو کہ سفید اونٹ ہے کی أنیس سے استثنا کی ہے؛ (اور یہ استثنا من غیر جنسہ ہی ہے۔) اور اسی کی مثل نابغہ کا قول بھی ہے۔

قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِيۡنَ ۝٣٢ قَالَ لَمۡ اَكُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۝٣٣ قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ ۝٣٤ وَّاِنَّ عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝٣٥

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابلیس! کیا وجہ ہے کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ (گستاخ) کہنے لگا کہ میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے بے ادب!) نکل جا یہاں سے تو مردود ہے، اور بلاشبہ تجھ پر لعنت ہے روز جزا تک۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا لَكَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابلیس! تیرے لئے کون سی شے مانع اور رکاوٹ تھی؟ اَلَّا تَكُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِيۡنَ یعنی اس بارے میں کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔ قَالَ لَمۡ اَكُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ یعنی اس نے اپنا تکبر اور اپنا حسد بیان کیا، اور یہ کہ وہ اس (آدم علیہ السلام) سے بہتر ہے، کیونکہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ مٹی کو کھا جاتی ہے؛ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے بے ادب!) تو نکل جا آسمانوں سے، یا جنت عدن سے، یا تمام ملائکہ سے۔ فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ یعنی تو شہابوں کے ساتھ بھگایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو لعنتی اور منحوس ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَّاِنَّ عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ یعنی بلاشبہ تجھ پر میری لعنت ہے)، جیسا کہ سورۃ ص میں ہے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ۝٣٦ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ ۝٣٧ اِلٰى يَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ۝٣٨

"کہنے لگا: اے میرے رب! پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیئے ہوئے گروہ میں سے ہے، (جنہیں) وقت مقرر کے دن تک مہلت دی گئی ہے۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ یہ ابلیس کی طرف سے سوال اور درخواست ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے مقام و مرتبہ کے اعتماد اور ثقاہت کی وجہ سے نہیں ہے، اور یہ کہ وہ اس اہل ہے کہ اس کی دعا اور درخواست کو قبول کیا جائے؛ بلکہ اس نے اپنے عذاب کو مؤخر کرنے اور اپنی آزمائش اور امتحان میں اضافہ اور زیادتی کرنے کے لئے یہ سوال کیا؛

جیسا کہ سلامتی سے مایوس اور ناامید کا فعل ہوتا ہے۔ اور اس نے اپنے سوال میں مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دینے سے ارادہ یہ کیا کہ وہ نہ مرے، کیونکہ قبروں سے اٹھائے جانے کے دن میں کوئی موت نہیں اور نہ اس کے بعد کوئی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ یعنی تو مہلت دیئے ہوئے گروہ میں سے ہے۔ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے اس سے نفخہ اولیٰ کا ارادہ فرمایا ہے، یعنی جس وقت مخلوق کو موت آئے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وقت معلوم سے مراد وہ وقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے۔ (یعنی کوئی دوسرا اس سے واقف نہیں) اور ابلیس اس سے جاہل ہے۔ پس ابلیس کو موت آئے گی پھر اسے اٹھایا جائے گا؛ (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ (الرحمٰن) (جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے) اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے کلام میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے...... کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے اس سے کلام کی۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعید میں شدت اور سختی پیدا کرنے کے لئے اس سے کلام کی نہ کہ تکریم و تقریب کے طور پر (1)۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

''وہ بولا: اے رب! اس وجہ سے کہ تو نے مجھے بھٹکا دیا، میں (برے کاموں کو) ضرور خوشنما بنا دوں گا ان کے لئے زمین میں اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو''

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ اغواء اور زینۃ کا معنی پہلے سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور یہاں اس کی تزیین (خوشنما بنانا) دو وجہوں سے ہو سکتی ہے: یا تو گناہوں کے ارتکاب کے ساتھ، اور یا انہیں فعل طاعت سے ہٹا کر دنیوی زینت و آرائش میں مشغول کرنے کے ساتھ اور لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ میں انہیں ہدایت کے راستے سے گمراہ کروں گا۔ اور ابن لہیعہ عبد اللہ نے دراج ابی السمح سے اس نے ابو الہیثم سے اور اس نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ابلیس نے کہا: اے میرے رب! تیری عزت و جلال کی قسم! میں اولاد آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کی ارواح ان کے جسموں میں موجود رہیں گی تو رب العالمین نے فرمایا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم میں ان کی مغفرت کرتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے رہے۔'' قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''ان ابلیس قال یا رب و عزتك و جلالك لا ازال اغوی بنی آدم ما دامت أرواحهم فی أجسامهم قال الرب و عزتی و جلالی لا أزال اغفر لهم ما استغفرونی'' (2)۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

''سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے''۔

اہل مدینہ اور اہل کوفہ نے لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ یعنی وہ جنہیں تو نے چن لیا ہے اور تو نے انہیں خاص کر لیا ہے اور باقیوں نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ یعنی وہ جنہوں نے عبادت کو تیرے لئے فساد یا ریاکاری سے خالص (اور پاک)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 160 2۔ شرح السنۃ، بغوی، 1239

کرلیا ہے۔ ابوثمامہ نے بیان کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مخلصین کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: (الذی یعمل ولا یحب أن یحمدہ الناس)(1)۔ ''یعنی وہ جو عمل کرتا ہے اور یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کی تعریف کریں''۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ۝۴۱

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے، جو میری طرف آتا ہے''۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ یہ راستہ ہے جو اپنے صاحب (اپنانے والے) کو سیدھا لے آتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے سبب جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عَلَیَّ بمعنی اِلَیَّ (میری طرف) ہے حضرت مجاہد اور کسائی نے کہا ہے: یہ وعید اور تہدید (جھڑکنے) کی بناء پر ہے؛ جیسا کہ جسے تو نے جھڑ لنا ہو اس کے لئے تیرا قول: طریقك علیّ و مصیرك الیّ (تیرا راستہ میرے خلاف ہے اور تیرا انجام میرے پاس ہے) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ (الفجر) (بے شک آپ کا رب (سرکشوں اور مفسدوں) کی تاک میں ہے) پس کلام کا معنی یہ ہوا: یہ راستہ ہے اس کا رجوع میری طرف ہے پس میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دوں گا، مراد عبودیت اور بندگی کا راستہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اس کا معنی ہے مجھ پر لازم ہے کہ میں پوری وضاحت اور دلائل کے ساتھ صراط مستقیم پر راہنمائی کروں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں توفیق اور ہدایت کے ساتھ (راہنمائی کروں)۔ ابن سیرین، قتادہ، حسن، قیس بن عباد، ابو رجاء، حمید اور یعقوب نے هٰذَا صِرَاطٌ عَلِیٌّ مُسْتَقِیْمٌ یعنی عَلِیٌّ کے رفع اور تنوین کے ساتھ قرأت کی ہے؛ اور اس کا معنی ہے رفیعٌ مستقیم، یعنی جو دین اور حق میں بلند ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: رفیعٌ ان یُنال (وہ ایسا سیدھا اور پختہ ہے کہ اس کی طرف مائل ہوا جائے) مستقیم أن یُنال (وہ ایسا بلند ہے کہ اسے پایا جائے)

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝۴۲

''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ علماء نے کہا ہے: یعنی میرے بندوں کے دلوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔ اور ابن عیینہ نے کہا ہے: یعنی اس بارے میں کہ وہ انہیں گناہ میں ڈال دے جو انہیں میری عفو سے روک دے اور اسے ان پر تنگ کر دے (ان پر کوئی بس نہیں چلتا) اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی ہے اور انہیں چن لیا ہے، اور انہیں پسند فرمالیا ہے اور انہیں منتخب فرمالیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید کہنے والا کہہ رہا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کے بارے اپنے اس ارشاد کے ساتھ خبر دی ہے: فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ (البقرہ: 36) (پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے) اور من جملہ اپنے نبی کے اصحاب کے بارے میں اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران: 155)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 161

(تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے) پس وہ جواب جوڑ کر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسے ان کے دلوں پر کوئی بس نہیں چلتا، اور نہ ان کے محل ایمان پر کوئی بس چلتا ہے، اور نہ وہ انہیں ایسے گناہ میں ڈال سکتا ہے جو انہیں عدم قبول کی طرف لوٹا دے، بلکہ توبہ اسے زائل کر دیتی ہے اور (اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع اسے مٹا دیتا ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کا نکلنا اس کی سزا نہیں جو انہوں نے کھایا؛ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور رہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تو ان کے بارے کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول: لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ ان کے بارے میں خاص ہو جن کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی ہے، اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ اکثر اوقات اور اکثر احوال کے بارے میں ہو، اور کبھی اس کا تسلط تکلیف کو دور کرنے اور غم کو زائل کرنے کی صورت میں ہوتا ہے؛ جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کیا گیا، جب وہ آپ کے پاس آیا تو وہ آپ کو تھپکی دینے لگا (پر سکون کرنے لگا) جیسے بچے کو تھپکی دی جاتی ہے یہاں تک کہ آپ سو گئے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام سب سو گئے پس بیدار نہ ہوئے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا، اور وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے: اس کا کیا کفارہ ہے جو ہم نے اپنی نماز کے بارے سستی کی ہے؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''نیند کی حالت میں تفریط نہیں ہے''(1)۔ پس آپ نے ان سے پریشانی اور اضطراب کو دور کر دیا۔ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ مگر جو گمراہوں اور مشرکوں میں سے تیری پیروی کرتے ہیں، یعنی ان پر اس کے غلبے کی دلیل یہ ہے اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۝ (النحل) (اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ اور اس سے پہلی والی آیت اس پر دلیل ہے کہ قلیل کی استثنا کثیر سے اور کثیر کی استثنا قلیل سے جائز ہے؛ مثلاً کوئی یہ کہے: عشرۃ الا درھما (دس سوائے ایک درہم کے) یا کوئی یہ کہے: عشرۃ الا تسعۃ (دس سوائے نو کے) اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: فقط نصف اور اس سے کم مقدار کی استثنا جائز ہوتی ہے۔ اور رہی کل سے اکثر کی استثنا تو یہ صحیح نہیں ہوتی۔ اور ہماری دلیل یہ آیت ہے، کیونکہ اس میں الغاوین کی استثنا عباد سے، اور عباد کی استثناء غاوین سے ہے، اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اقل کی استثنا کل سے اور اکثر کی استثنا کل سے سب جائز ہے۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ۝

''اور بے شک جہنم وعدہ کی جگہ ہے ان سب کے لئے اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ یعنی ابلیس اور اس کی پیروی کرنے والوں کے لئے (جہنم وعدہ کی جگہ ہے) لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ یعنی اس کے سات طبقات ہیں ہر طبق دوسرے طبق سے اوپر ہے۔ لِكُلِّ بَابٍ یعنی ہر طبقہ کے لئے مِّنْهُمْ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی من نام عن صلوۃ او نسیھا، جلد 1، صفحہ 80

جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ان میں سے مخصوص اور معلوم حصہ ہے۔

ابن المبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابراہیم ابو ہارون الغنوی نے خبر دی انہوں نے کہا: میں نے حطان بن عبداللہ رقاشی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: کیا تم جانتے ہو جہنم کے دروازے کیسے ہیں؟ ہم نے کہا: وہ ہمارے دروازوں کی مثل ہوں گے، انہوں نے کہا: نہیں، وہ اس طرح ہیں یعنی ان میں سے بعض بعض سے اوپر ہیں...... ثعلبی نے یہ زیادہ کیا ہے: آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک کو دوسرے کے اوپر رکھا...... اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جنتوں کو زمین پر رکھا، اور جہنموں میں سے بعض کو بعض کے اوپر رکھا ہے، پس سب سے نیچے جہنم ہے، اور اس کے اوپر الحطمہ ہے، اس کے اوپر سقر ہے، اس کے اوپر الجحیم ہے، اور اس کے اوپر لظی ہے، اس کے اوپر سعیر ہے، اور اس کے اوپر الھاویہ ہے، اور ہر طبقہ اس سے ستر گنا زیادہ گرم ہے جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تفسیر اسی طرح واقع ہے۔ اور وہ موقف جس پر اکثر علماء ہیں وہ یہ ہے کہ جہنم کے درکات میں سے اعلیٰ (اوپر والا) درکہ ہے اور یہ حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے گنہگاروں کے ساتھ خاص ہے، اور یہ وہ ہے جو اپنے اہل سے خالی ہو جائے گا اور ہوائیں اس کے دروازے بجائیں گی، پھر اس کے بعد لظی ہے، پھر حطمہ ہے، پھر سعیر ہے، پھر سقر ہے، پھر جحیم ہے اور پھر ہاویہ ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: درک اعلیٰ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی (محمدیون) ہوں گے، دوسرے میں نصاریٰ، تیسرے میں یہودی، چوتھے میں صابی، پانچویں میں مجوسی، چھٹے میں مشرکین عرب، اور ساتویں میں منافقین، آل فرعون اور اہل مائدہ میں سے کافر لوگ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء:145) (بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں سے)) اور یہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور ارشاد فرمایا: فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ) (پھر جس نے کفر اختیار کیا اس کے بعد تم سے تو بے شک میں عذاب دوں گا اسے ایسا عذاب کہ نہیں دوں گا کسی کو بھی اہل جہان سے) اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ اس امت کے علماء سوء ان دروازوں پر تقسیم ہوں گے؛ ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے۔

اور ترمذی (1) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جہنم کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ اس کے لئے ہے جس نے میرے کسی امتی پر اپنی تلوار سونتی"۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: جہنم کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ حروریہ کے لئے ہے۔ اور وہب بن منبہ نے کہا ہے: ہر دو دروازوں کے درمیان ستر برس کی مسافت ہے۔ اور ہر دروازہ (درکہ) اپنے اوپر والے سے ستر گنا زیادہ گرم ہے، اور ہم نے اس تمام کو کتاب "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے۔ اور سلام الطویل نے ابو سفیان سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140۔ ایضاً، باب ومن سورۃ الحجر، حدیث 3048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے ارشاد: لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ کے بارے میں روایت کیا ہے ''ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کیا اور ایک حصہ ان کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے غافل ہوئے، ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اپنی پسند اور خواہش کو اللہ تعالیٰ پر ترجیح دی، اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اپنے غصے کو اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ ٹھنڈا کیا، اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اپنی رغبت کو اپنی پسند کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے پھیر لیا، اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں حدود سے تجاوز کیا۔'' الحلیمی ابو عبداللہ حسین بن حسن نے اسے کتاب (منہاج الدین) میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے: اگر یہ روایت ثابت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے وہ بت پرست ہیں، اور شک کرنے والے وہ ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کا کوئی الٰہ ہے یا ان کا کوئی الہ نہیں، اور وہ اس کے دین اور شریعت میں شک کرتے ہیں کہ وہ اس کی طرف سے ہے یا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے والے وہ ہیں جو بالکل اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے ثابت کرتے ہی نہیں، اور پھر دہریے ہیں۔ اور اپنی شہوات کو اللہ تعالیٰ پر ترجیح دینے والے وہ ہیں جو گناہوں میں منہمک ہونے والے ہیں، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور اس کے اوامر و نواہی کی تکذیب کرتے ہیں، اور اپنے غصے کو اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ ٹھنڈا کرنے والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو اور اس کی طرف تمام دعوت دینے والوں کو قتل کرنے والے ہیں، اور اسے عذاب اور اذیت پہنچاتے ہیں جو انہیں نصیحت کرتا ہے یا ان کے مذہب کے سوا کسی اور کی پیروی کرتا ہے، اور اپنی رغبت کو اپنی پسند کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے (پھیرنے والے وہ ہیں) جو موت کے بعد زندہ کئے جانے اور حساب وغیرہ کا انکار کرتے ہیں، پس وہ ان کی عبادت کرتے ہیں جن میں وہ رغبت رکھتے ہیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان تمام کا حصہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حدود سے تجاوز کرنے والے وہ ہیں جو لاپرواہ ہوتے ہیں، اس بارے میں کہ جس نظریہ پر وہ ہیں وہ حق ہے یا باطل، پس نہ وہ غور و فکر کرتے ہیں، نہ قیاس کرتے ہیں اور نہ استدلال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ یعنی اس بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا ہے اگر یہ حدیث ثابت ہے۔ اور روایت کی جاتی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت سنی وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ تو آپ خوف سے تین دن تک بھاگتے رہے کوئی سمجھ ہی نہ رکھتے تھے، پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا یہ آیت وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ نازل ہوئی ہے؟ تو قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اس نے میرے دل کو کاٹ دیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (یقیناً پرہیزگار اس دن باغوں اور چشموں میں (آباد) ہوں گے) اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے مدینہ طیبہ کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک اعرابیہ عورت گزری تو اس نے آپ کے پیچھے نماز شروع کر دی اور آپ کو اس کا علم نہ ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ تو وہ اعرابیہ غش کھا کر گر پڑی، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرنے کی آواز سنی پس آپ نے پھر کر دیکھا اور پانی منگایا اور

اس کے چہرے پر انڈیلا حتیٰ کہ اسے افاقہ ہو گیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی، تو حضور نبی مکرم ﷺ نے پوچھا: ''اے فلانہ تجھے کیا ہوا ہے؟'' تو اس نے عرض کی: کیا یہ شئی (آیت) اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب میں سے ہے، یا آپ اسے اپنی جانب سے کہہ رہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اعرابیہ! (نہیں) بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب میں سے ہے''۔ تو اس نے عرض کی: میرے اعضاء میں سے ہر عضو کو ان میں سے ہر دروازے پر عذاب دیا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اعرابیہ! (نہیں) بلکہ ان میں سے ہر دروازے کے لئے ایک حصہ مخصوص ہے ان میں سے ہر ایک کے اہل کو ان کے اعمال کی مقدار کے مطابق عذاب دیا جائے گا''۔ تو اس نے عرض کی: قسم بخدا! بے شک میں ایک مسکین عورت ہوں، میرا کوئی مال نہیں ہے، اور میرے پاس سوائے سات غلاموں کے اور کچھ نہیں ہے، یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ کو گواہ بناتی ہوں کہ ان میں سے ہر غلام جہنم کے دروازوں میں سے ہر دروازے کے بدلے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے آزاد ہے۔ اتنے میں حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور یہ پیغام دیا: ''یا رسول اللہ! ﷺ اس اعرابیہ کو بشارت سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر جہنم کے دروازے حرام قرار دیئے ہیں اور اس کے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دیئے ہیں۔''

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾

''یقیناً پرہیزگار اس دن باغوں اور چشموں میں (آباد) ہوں گے (انہیں حکم ملے گا) داخل ہو جاؤ ان جنتوں میں خیر و عافیت کے ساتھ بے خوف ہو کر۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ یعنی وہ لوگ جو فواحش اور شرک سے بچتے رہے۔ فِیْ جَنّٰتٍ یعنی وہ باغات میں وَّ عُیُوْنٍ (اور چشموں میں (آباد) ہوں گے) اور یہ چار نہریں ہیں: پانی، شراب، دودھ اور شہد کی نہریں۔ اور رہے وہ چشمے جن کا ذکر سورۃ الانسان میں کیا گیا ہے یعنی کافور، زنجبیل اور سلسبیل، اور سورۃ المطففین میں: تسنیم ہے ان کا ذکر اور ان کے باسیوں کا ذکر آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور عُیُوْنٍ میں اصل کی بنا پر عین کو ضمہ، اور یا کی رعایت کرتے ہوئے اسے کسرہ بھی دیا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ عام قرأت اُدْخُلُوْهَا میں ہمزہ وصل اور خا کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ دَخَلَ یَدْخُلُ سے ماخوذ ہے۔ اور صیغہ امر ہے۔ اس کی تقدیر ہے: قیل أدخلوها۔ (انہیں کہا جائے گا: تم داخل ہو جاؤ)۔ اور حسن، ابو العالیہ اور رویس نے یعقوب سے أدخلوها تنوین اور ہمزہ وصل کے ضمہ اور خا کے کسرہ کے ساتھ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے، اور یہ أدخل سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان میں داخل فرمائے گا۔ اور ان کا مذہب یہ ہے کہ اس قسم کی مثالوں میں تنوین کو کسرہ دیا گیا ہے بِرَحْمَةٍ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ (الاعراف: 49) اور جو بھی اس کے مشابہ ہیں، مگر یہاں انہوں نے ہمزہ کی حرکت تنوین پر ڈال دی ہے، کیونکہ یہ ہمزہ قطعی ہے، لیکن اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف انتقال ہوا ہے پھر ضمہ سے کسرہ کی طرف، اور یہ زبان پر ثقیل ہو جاتا ہے۔ بِسَلٰمٍ یعنی ہر بیماری اور آفت سے سلامتی کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لئے سلام ہے۔ اٰمِنِیْنَ یعنی موت اور عذاب سے بے خوف ہو کر۔

وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا

نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

''اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ (وغیرہ) تھا وہ بھائی بھائی بن جائیں گے اور تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے نہیں پہنچے گی انہیں اس میں کوئی تکلیف اور نہ انہیں اس سے نکالا جائے گا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سب سے پہلے جو اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو ان کو دو چشمے پیش کئے جائیں گے، پس وہ ان میں سے ایک چشمے سے پئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں جو کینہ تھا اسے نکال دے گا، ختم کر دے گا، پھر وہ دوسرے چشمے پر داخل ہوں گے اور ان میں غسل کریں گے تو ان کے رنگ روشن ہو جائیں گے اور ان کے چہرے صاف اور چمکنے لگیں گے، اور ان پر نعمتوں کی تازگی اور رونق نمایاں ہو جائے گی؛ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مراد وہ کینہ وغیرہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان تھا۔ اور پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے، اور آیت کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں امید رکھتا ہوں کہ میں، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم انہی میں سے ہوں گے (1)۔ اور الغل کا معنی کینہ اور عداوت ہے، اسی (معنی) سے کہا جاتا ہے: غَلَّ يَغِلُّ۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ غلول سے ہے اور اس سے مراد مال غنیمت سے مال چرانا ہے۔ اس کا باب غل يَغُلّ ہے۔ اور خیانت کرنے کے معنی میں بھی ہے اور اس کے لئے أَغَلَّ يُغِلُّ کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

جَزَى اللهُ عنا حَمْزَةَ ابنةَ نَوْفَلٍ　جزاء مُغِلٍّ بالأمانة كاذبِ

یہ معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ یعنی وہ باہم ایک دوسرے سے ملنے اور محبت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردن کی پشت نہیں دیکھیں گے؛ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تخت ادھر ہی گھوم جائیں گے جدھر وہ چاہیں گے، اور ان میں سے کوئی دوسرے کی گردن کی پشت نہیں دیکھے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مُتَقٰبِلِيْنَ تحقیق وہ اور ان کی ازواج محبت کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے (2)۔ اور سرر، سریر کی جمع ہے؛ جیسے جَدِيد کی جمع جُدُدٌ ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ سرور سے ہے؛ تو گویا یہ وہ بلند اور رفیع مکان ہے جو سرور (خوشی) کے لئے تیار کیا گیا ہے (بچھایا گیا ہے) اور پہلا قول اظہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ ایسے تختوں پر ہوں گے جنہیں یاقوت، زبرجد، اور موتیوں کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہوگا، سجایا گیا ہوگا، اور ایک تخت اتنا ہوگا جتنا صنعا اور جابیہ کے درمیان فاصلہ ہے اور عدن سے لے کر ایلہ تک کا درمیانی فاصلہ ہے۔ اور اِخْوَانًا، الْمُتَّقِيْنَ سے یا اُدْخُلُوْهَا میں موجود ضمیر سے، یا اٰمِنِيْنَ میں مضمر ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یا پھر یہ صُدُوْرِهِمْ کی ھا اور میم سے حال مقدرہ ہو گا۔ وَ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ یہ اس پر دلیل ہے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں وہ کبھی زائل اور ختم نہیں ہوں گی، اور یہ کہ اہل

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 163　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 162

جنت ان میں باقی رہیں گے۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ (الرعد:35) (اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے۔) اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ (ص) (بے شک یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔)

نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

''بتادو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں، اور (یہ بھی بتادو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔''

یہ آیت حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد کی مثل ہے: ''اگر مومن اس سزا اور عذاب کو جان لے (1) جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی بھی اس کی جنت کی طمع اور حرص نہ کرے اور اگر کافر اس رحمت کو جان لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو۔'' اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور یہ سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ اور اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ اپنا اور دوسرے کا ذکر کرے پس اسے خوف بھی دلائے اور امید بھی دلائے، اور اس پر حالت مرض کے مقابلے میں حالت صحت میں خوف زیادہ اور غالب ہو۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے اور وہ ہنس رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم ہنس رہے ہو حالانکہ جنت اور دوزخ تمہارے سامنے ہیں''۔ تو یہ ان پر انتہائی گراں گزرا تب یہ آیت نازل ہوئی، اسے ماوردی (2) اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی کے الفاظ ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا: حضور نبی کریم ﷺ ہمارے پاس اس دروازے سے تشریف لائے جس سے بنوشیبہ داخل ہوتے تھے اور ہم ہنس رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ہے تمہارے لئے تم ہنس رہے ہو میں تمہیں ہنستے ہوئے نہ دیکھوں''۔ پھر آپ پیٹھ پھیر کر تشریف لے گئے یہاں تک کہ جب مقام الحجر کے پاس پہنچے تو الٹے پاؤں واپس تشریف لائے اور ہمیں ارشاد فرمایا: ''بے شک جب میں نکلا تو میرے پاس حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور کہا: اے محمد! ﷺ میرے بندوں کو میری رحمت سے مایوس نہ کیجئے نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾ پس قنوط مایوسی اور ناامیدی ہے، اور الرجاء مہمل چھوڑ دینا ہے، اور امور میں سے بہترین درمیانہ امر ہے۔

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور بتائیے انہیں ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ جب وہ آپ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: آپ پر سلام ہو۔ آپ نے کہا: (اے اجنبیو!) ہم تو تم سے خائف ہیں۔ مہمانوں نے کہا: مت ڈریئے ہم آپ کو مژدہ سنانے آئے ہیں ایک صاحب علم بچے کی پیدائش کا۔ آپ نے کہا: کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دینے آئے ہو

1۔ صحیح بخاری، باب الرجاء مع الخوف، جلد 2، صفحہ 958 2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 163

جب کہ مجھے بڑھاپا لاحق ہو چکا ہے پس یہ کیسی خوشخبری ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ضیف ابراہیم سے مراد وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے آپ کو بچے کے ہونے اور قوم لوط کی ہلاکت کی بشارت دی۔ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کنیت ابوالضیفان تھی، اور آپ کے محل کے چار دروازے تھے تا کہ کوئی بھی (اس میں داخل ہونے سے) رہ نہ جائے۔ اور ضیف کو ضیف کا نام آپ کی طرف اس کی اضافت اور آپ کے پاس اس کے اترنے کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ اور ضیف کا حکم سورۂ ہود میں گزر چکا ہے جو کافی ہے۔ والحمد للہ۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ خبر جمع لائی گئی ہے کیونکہ لفظ الضیف واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مونث کی مصدر کی طرح صلاحیت رکھتا ہے۔ ضافہ اور اضافہ، کا معنی امالہ (وہ اس کی طرف مائل ہوا، جھکا) ہے؛ اور اسی معنی میں یہ حدیث ہے "جس وقت سورج غروب کے لئے مائل ہوتا ہے" اور ضیفوفۃ السھم، (تیر کا اپنے ٹارگٹ سے پھر جانا) اور اضافت نحویہ ہے۔ فَقَالُوْا سَلٰمًا یعنی سلموا سلاماً (انہوں نے سلام کیا)۔ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ یعنی کہ ہم تم سے خوفزدہ ہیں اور ڈر رہے ہیں۔ اور یہ آپ نے اس کے بعد کہا کہ بچھڑا ان کے قریب کیا اور انہیں دیکھا کہ وہ نہیں کھا رہے، جیسا کہ سورۂ ہود میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ نے سلام پر تعجب (اور اس کا انکار) کیا کیونکہ ان کے شہروں میں سلام کی رسم نہ تھی۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ یعنی ملائکہ نے کہا: تم نہ ڈرو اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ بیشک ہم آپ کو ایک صاحب حلم بچے کی پیدائش کا مژدہ سنانے آئے ہیں؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: ایک صاحب علم بچے کی ولادت کا مژدہ سنانے آئے ہیں۔ اور وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں (1)۔ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ اس میں اَن مصدریہ ہے؛ یعنی مجھے اور میری بیوی کو بڑھاپا لاحق ہونے کی حالت پر تم مجھے خوشخبری دینے آئے ہو، اور یہ سورۂ ہود اور ابراہیم میں پہلے گزر چکا ہے۔ اس حیثیت سے وہ کہتے ہیں: فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (پس یہ کیسی خوشخبری ہے؟) یہ استفہام برائے تعجب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ استفہام حقیقی ہے۔ اور حسن نے تُوجَل تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اعمش نے بَشَّرْتُمُوْنِيْ بغیر الف کے، اور نافع اور شیبہ نے تُبَشِّرُوْنِ نون کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ قرأت کی ہے؛ جیسا کہ اَتُحَآجُّوْنِّيْ اور اس کی تعلیل پہلے گزر چکی ہے۔ ابن کثیر اور ابن محیصن نے تُبَشِّرُوْنِّ نون کو کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اس کی تقدیر تبشروننی ہے، پس نون کو نون میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اور باقیوں نے تبشرون نون کو نصب کے ساتھ بغیر اضافت کے پڑھا ہے۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾

"وہ بولے ہم نے تو آپ کو سچی خوشخبری دی پس نہ ہو جائیے آپ مایوس ہونے والوں سے۔"

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ یعنی ہم نے ایسی سچی خوشخبری دی ہے جس میں کوئی خلاف نہیں، اور یہ کہ بچے کا ہونا لازم اور ضروری ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ پس آپ اولاد سے مایوس ہونے والوں سے نہ ہو جائیے، حالانکہ آپ بڑھاپے کی زیادتی کی وجہ سے بچے سے مایوس ہو چکے تھے۔ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ میں عام قرأت الف کے ساتھ ہے۔ اور اعمش اور یحییٰ بن

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 163

وثاب نے مِنَ الْقَنِطِيْنَ بغیر الف کے پڑھا ہے، اور یہی ابو عمرو سے مروی ہے۔ اور یہ القانطین میں قصر کی گئی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جنہوں نے کہا ہے: قَنِطَ یَقْنَطُ؛ جیسا کہ حَذِرَ یَحْذَرُ۔ اور یَقْنَطُ کے نون کو فتحہ اور کسرہ دونوں دیئے ہیں، ان دونوں لغات کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ اور اس میں یَقْنُطُ نون کے ضمہ کے ساتھ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور اس میں قَنَطَ یقنط یعنی ماضی اور مضارع دونوں میں نون کا فتحہ نہیں آیا کیونکہ اس میں دو لغتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ پس ماضی میں اس کی لغت کو لیا گیا جو کہتے ہیں قَنَطَ یقنط، اور مضارع میں اس کی لغت کو جس نے کہا ہے قَنِطَ یقنط اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

''آپ نے فرمایا: کون ناامید ہوتا ہے اپنے رب کی رحمت سے بجز گمراہوں کے۔''

یعنی جھٹلانے والے سیدھی راہ سے ہٹ جانے والے ہیں، یعنی آپ نے اپنی کبرسنی کی وجہ سے بچے کی ولادت کو بعید سمجھا ہے نہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید اور مایوس ہوئے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

''آپ نے کہا اے فرستادو! کس اہم کام کے لئے آئے ہو، انہوں نے کہا: ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف، مگر لوط کے گھرانے والے ہم ان سب کو بچا لیں گے، بجز اس کی بیوی کے ہم نے (بامر الٰہی) یہ طے کیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب آپ نے جان لیا کہ یہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے آپ کو خارق عادت امر کے بارے خبر دی اور وہ ان کے بچے کی ولادت کے بارے خوشخبری دینا ہے۔ تو آپ نے کہا: تم کس اہم کام کے لئے آئے ہو؟ اور الخطب کا معنی ہے الامر الخطیر اہم ذی مرتبہ کام، یعنی تمہارا کام اور مقصد کیا ہے اور کس کام کی غرض سے تم آئے ہو؟ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ انہوں نے کہا: بے شک ہم مشرک اور گمراہ قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور کلام میں اضمار ہے: ای أرسلنا الی قوم مجرمین لنهلكهم (ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم انہیں ہلاک کر دیں۔) اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ سوائے آپ کی پیروی کرنے والوں کے اور آپ کے دین کو ماننے والوں کے۔ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ حمزہ اور کسائی نے لَمُنْجُوْهُمْ تخفیف کیساتھ پڑھا ہے یہ أنجي سے ماخوذ ہے۔ باقیوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ نجّي سے ماخوذ ہے، اور اسے ابو عبید اور ابو حاتم نے اختیار کیا ہے۔ اور التنجية اور الانجاء دونوں کا معنی تخلیص (نجات دینا، خلاصی دلانا) ہے۔ اِلَّا امْرَاَتَهٗ آل لوط میں سے آپ کی بیوی کی استثنا ہے اور وہ کافرہ تھی پس وہ ہلاکت میں مجرموں کے ساتھ مل گئی۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا قصہ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں گزر چکا ہے جو کچھ وہاں ہے وہ کافی ہے۔ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ یعنی ہم نے یہ فیصلہ کیا

ہے اور ہم نے لکھ دیا ہے کہ وہ عذاب میں باقی رہنے والوں سے ہوگی۔ اور الغابر کا معنی الباقی (باقی رہنے والا) ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے بھی کہا ہے:

لا تکسع الشّول بأغبارها إنك لاتدری من النّاتج

الأغبار کا معنی باقی رہنے والا دودھ ہے۔ ابو بکر اور مفضل نے قَدَرْنَا یہاں اور سورۂ نمل میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ ہروی نے کہا ہے: کہا جاتا ہے کہ قدّ ر اور قد ر دونوں ہم معنی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اہل زبان اور ان کے سوا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نفی سے استثنا اثبات اور اثبات سے استثنا نفی ہوتا ہے؛ پس جب کوئی آدمی کہے: لہ علی عشرۃ دراھم الا أربعۃ الا درھما (اس کے مجھ پر دس درہم ہیں سوائے چار کے سوائے ایک درہم کے) تو اس سے سات درہموں کا اقرار ثابت ہوا؛ کیونکہ ایک درہم کی استثنا چار سے کی گئی ہے، اور یہ مثبت ہے کیونکہ یہ منفی سے مستثنیٰ ہے، اور اربعہ (چار) منفی ہے، کیونکہ اس کی استثنا کلام موجب سے کی گئی ہے اور وہ عشرۃ (دس) ہے، پس ایک درہم چھ کی طرف لوٹ گیا اور وہ سات ہوگئے۔ اور اسی طرح اگر کوئی کہے: عَلَیَّ خمسۃ دراھم الا درھما الا ثلثیہ (مجھ پر پانچ درہم ہیں سوائے ایک درہم کے سوائے اس کے دو تہائی کے) تو اس پر چار درہم اور ایک درہم کا ایک ثلث لازم ہوگا۔ اور اسی طرح جب کسی نے کہا: لفلان علی عشرۃ الا تسعۃ الا ثمانیۃ الا سبعۃ (فلاں کے مجھ پر دس ہیں سوائے نو کے سوائے آٹھ کے سوائے سات کے) تو دوسری استثنا اپنے ماقبل کی طرف لوٹ جائے گی، اور تیسری دوسری کی طرف لوٹ جائے گی، نتیجتاً اس پر دو درہم لازم ہوں گے؛ کیونکہ دس اثبات ہے اور آٹھ بھی اثبات ہے پس یہ مجموعی طور پر اٹھارہ درہم ہو جائیں گے۔ پھر نو بھی نفی ہے اور سات بھی نفی ہے تو یہ سولہ درہم ہوگئے جو اٹھارہ سے ساقط ہو رہے ہیں پس باقی دو درہم رہ جائیں گے، اور یہی مقدار اقرار کے ساتھ واجب ہوئی ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ پس قولہ سبحانہ وتعالیٰ: اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ پس اس میں مجرموں کی قوم سے آل لوط کی استثنا کی ہے، پھر فرمایا اِلَّا امْرَاَتَهٗ پھر اس کی استثنا آل لوط سے کی، تو یہ تاویل میں مجرموں کی قوم کی طرف لوٹ گئی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور اسی طرح کا حکم طلاق میں ہے، اگر کسی نے اپنی بیوی کو کہا: أنت طالق ثلاثا إلا اثنتین إلا واحدۃ (تجھے تین طلاقیں سوائے دو کے سوائے ایک کے) تو وہ دو طلاقوں کے ساتھ مطلقہ ہوگی (1)، کیونکہ ایک مستثنیٰ منہ جو کہ تین طلاقیں ہیں سے باقی رہنے والی طلاق کی طرف لوٹ جائے گی اور اسی طرح اس کا حکم ہے جو اس طرز پر آئے پس تو اسے سمجھ لے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَ اَتَیْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَیْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

”پس جب آئے خاندان لوط کے پاس یہ فرستادے، آپ نے (انہیں دیکھ کر) کہا: تم تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1129

ہو۔ فرشتوں نے کہا: (ہم اجنبی نہیں) بلکہ ہم لے آئے ہیں تمہارے پاس وہ چیز جس میں وہ شک کیا کرتے تھے اور ہم لے آئے ہیں آپ کے پاس حق (عذاب) اور ہم بلاشبہ سچ کہہ رہے ہیں، تو چلے جائیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ رات کے کسی حصہ میں اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلئے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی، اور چلے جائیے جہاں (جانے کا) تمہیں حکم دیا گیا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَ ۙ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ یعنی میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ جوان تھے اور آپ نے جب حسن و جمال دیکھا تو ان کے بارے میں اپنی قوم کے فتنے کا آپ کو خوف لاحق ہوا، پس یہی وہ انکار اور اجنبیت ہے۔ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ (فرشتوں نے کہا: (ہم اجنبی نہیں) بلکہ ہم تمہارے پاس وہ چیز لے آئیں گے جس میں وہ شک کیا کرتے تھے کہ وہ ان پر نازل ہوگی، اور وہ عذاب ہے وَ اَتَیْنٰكَ بِالْحَقِّ اور ہم آپ کے پاس لے آئیں ہیں حق یعنی سچ۔ اور بعض نے کہا ہے: عذاب۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اور بلاشبہ ہم ان کی ہلاکت کے بارے میں سچ کہہ رہے ہیں۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ اس کا ذکر سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ یعنی آپ ان کے پیچھے رہ کر چلئے تاکہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے کہ اسے عذاب آپہنچے۔ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ انہیں پیچھے مڑنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ وہ چلنے میں پوری کوشش کریں اور گاؤں سے بہت دور نکل جائیں اس سے پہلے کہ ان پر صبح طلوع ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کوئی پیچھے نہ رہے۔ وَّ امْضُوْا حَیْثُ تُؤْمَرُوْنَ (اور چلے جائیے وہاں جہاں جانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد شام ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: مراد صفد ہے، اور یہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک آپ ارض خلیل کی طرف چلے گئے اسے یقین کہا جاتا ہے، اور اس کا نام یقین اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جب پیغامبر (فرشتے) نکلے تو آپ ان کے پیچھے گئے، اور آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: انہیں کہاں سے دھنسایا جائے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: "یہاں سے"۔ اور آپ نے مقررہ حد بیان کردی، اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام چلے گئے، پس جب حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹھے اور دونوں اس عذاب کا انتظار کرنے لگے، پس جب زمین لرزہ براندام ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا أيقنت بالله قسم بخدا! میں نے یقین کرلیا۔ تو اس وجہ سے اس کا نام یقین رکھ دیا گیا۔

وَ قَضَیْنَاۤ اِلَیْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ ۝ وَ جَآءَ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۙ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ ۝ قَالُوْۤا اَوَ لَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝

"اور ہم نے (بذریعہ وحی) لوط کو آگاہ کردیا اس حکم سے کہ یقیناً ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی جب وہ صبح کررہے

ہوں گے، اور (اتنے میں) آ گئے شہر والے خوشیاں مناتے ہوئے، آپ نے (انہیں) کہا: (ظالمو!) یہ تو میرے مہمان ہیں ان کے بارے میں تو مجھے شرمسار نہ کرو، اور ڈرو اللہ (کے غضب) سے اور مجھے رسوا نہ کرو، وہ بولے: کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دیا کرو، آپ نے کہا: یہ میری (قوم کی) بچیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو (تو ان سے نکاح کر لو)۔"

قولہ تعالیٰ: وَقَضَيْنَآ إِلَيْهِ یعنی ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف وحی کر دی۔ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ اس کی نظیر یہ قول ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (الانعام: 45) (تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا۔) مُّصْبِحِيْنَ یعنی صبح طلوع ہونے کے وقت اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ اور (اتنے میں) حضرت لوط علیہ السلام کے شہر والے آ گئے يَسْتَبْشِرُوْنَ مہمانوں کے سبب خوشیاں مناتے ہوئے اس حرص اور طمع میں کہ وہ ان سے برائی کا ارتکاب کریں گے۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ بے شک یہ میرے مہمان ہیں۔ فَلَا تَفْضَحُوْنِ یعنی تم مجھے شرمسار نہ کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ یہ بھی جائز ہے کہ یہ الخزی سے ہو اور اس کا معنی ذلت اور رسوائی ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الخزایۃ سے ہو اور اس کا معنی حیاء اور خجالت و شرمندگی ہے۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ وہ بولے: کیا ہم نے تمہیں کسی کو مہمان بنانے سے منع نہیں کیا تھا کیونکہ ہم ان سے برائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے فعل کے ساتھ اجنبیوں کا قصد کر رہے تھے؛ یہ حسن سے منقول ہے۔ اس کا ذکر سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیا ہم نے آپ کو اس سے منع نہیں کیا تھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کے بارے ہم سے کلام کریں جب ہم اس سے برائی کا قصد کریں قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ یعنی تم ان سے شادی کر لو اور حرام کی طرف مائل نہ ہو۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

"(اے محبوب!) آپ کی زندگی کی قسم! یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں (اور) بہکے بہکے پھر رہے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے بیان کیا ہے کہ مفسرین نے بالاجماع کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے شرف و عظمت کے اظہار کے لئے ان کی حیات مبارکہ کی قسم کھائی ہے کہ آپ کی قوم قریش (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہے (اور) بہکے بہکے پھر رہے ہیں اور اپنی حیرت میں ڈوبے ہوئے ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس بارے میں اہل تفسیر نے اجماع کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدت حیات کی قسم ہے (2)۔ اور اس کی اصل عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ العمر سے ہے لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے اسے فتحہ دیا گیا۔ اور اس کا معنی ہے: اے محمد! ﷺ تیری بقا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1130۔ 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1131

کی قسم۔ اور بعض نے کہا ہے: تیری حیات کی قسم۔ اور یہ تعظیم کی انتہا اور احسان اور شرف عطا کرنے کی حد ہے۔ ابو الجوزاء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے سوا کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی (1)، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری مخلوق سے زیادہ معزز و مکرم ہیں۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: وہ جو اس کے مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کی زندگی کی قسم کھائے اور اس کے سبب انہیں اس شرف و عظمت تک پہنچا دے جو چاہے، اور فضل و عظمت میں سے جو کچھ اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کو عطا فرمائے گا تو اس سے کئی گنا شرف اپنے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دے گا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ عزت والے ہیں؛ کیا آپ جانتے نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ عطا فرمائے، تو جب اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کی حیات کی قسم کھائے تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اس سے کہیں بلند اور ارفع ہے، (لہٰذا) کوئی ایک کلام سے دوسرے کلام کی طرف نہ نکلے اور بغیر ضرورت کے اس کا ذکر نہ کرے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ اچھا ہے؛ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کی قسم کھانا حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں کلام معترض ہے (یعنی بطور جملہ معترضہ ہے) قشیری ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف راجع ہو، یعنی وہ اپنی طاقت کے نشے میں مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ کیا اور فرمایا: یہ میری (قوم) کی بیٹیاں ہیں، تو ملائکہ نے کہا: اے لوط! لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ اور یہ نہیں جانتے ان کے ساتھ صبح کے وقت کیا کچھ ہونے والا ہے؟ پس اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے انجیر، زیتون اور طور سینا کی قسم کھائی ہے؛ تو اس میں کیا ہے؟ تو کہا جائے گا: کوئی شے نہیں ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے مگر وہ اس کی اس فضیلت پر دلالت کرتی ہے جو اس کے شمار میں داخل ہوتی ہے، پس اسی طرح ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آپ ان سے افضل ہیں جو آپ کے شمار میں ہیں۔ اور العُمر اور العَمر (یعنی عین کے ضمہ اور اس کی فتحہ کے ساتھ) یہ دو لغتیں ہیں اور ان دونوں کا معنی ایک ہے؛ مگر یہ لفظ قسم میں کثرت استعمال کی وجہ سے فتحہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اور تو کہتا ہے: عَمْرك الله۔ اى أسأل الله تعميرك (یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیری درازی عمر کی دعا کرتا ہوں)۔ اور لَعَمْرُكَ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، اس کا معنی ہے لعمرك مما أقسم به (تیری عمر اس میں سے ہے جس کی میں قسم کھا رہا ہوں)

مسئلہ نمبر 2۔ بہت سے علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے کہ کوئی انسان کہے لعمری، کیونکہ اس کا معنی ہے وحیاتی (میری زندگی کی قسم) اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: آدمی کے لئے مکروہ ہے کہ وہ کہے لعمری؛ کیونکہ یہ اس کی اپنی زندگی کی قسم ہے، اور یہ کمزور لوگوں کا کلام ہے۔ اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے: بے شک مردوں میں سے کمزور اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1130 2۔ ایضاً

عورتیں (اور خنثےٰ وغیرہ) تیری حیات اور تیری عیش (زندگی) کی قسم کھاتے ہیں، اور یہ ان کا کلام نہیں ہے جو مردانہ وصف سے متصف ہیں، اگرچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس قصہ میں اس کی قسم کھائی ہے، اور یہ اس کے رتبہ کے شرف اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا بیان ہے، پس اس کے سوا کوئی معنی اس پر محمول نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے اس کے سوا کسی اور معنی میں استعمال کیا جائے گا۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: مناسب یہ ہے کہ لعمرك کو کلام میں اس آیت کی طرف پھیر دیا جائے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب میں سے ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہی میں بھی کہتا ہوں، لیکن شریعت نے استعمال میں اسے قطعی قرار دیا ہے اور قسم کو اس کی طرف لوٹا دیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: لعمرك اور لعمری اور اسی طرح کے الفاظ کے ساتھ قسم کھانا عرب کے اشعار میں اور ان کے فصیح کلام میں کثرت سے موجود ہے۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

لَعَمْرِی وَ ما عمرِی علیّ بِهيّنٍ لقد نطقتْ بُطْلًا علیَّ الأقارعُ(1)

دوسرے نے کہا:

لَعَمْرُكَ إن الموت ما أخطأ الفتی لكالطِّوَل المُرخی و ثِنْیاه بِالیَدِ(2)

ایک اور نے کہا:

أیُّها المنكح الثُّریا سُهیلاً عَمْرَكَ اللهَ كیف یلتقیان

ایک دوسرے نے کہا:

إذا رَضِیتْ علیّ بنو قُشَیر لَعَمْرُ اللهِ أعجبنی رضاها

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا للہ عمر، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تو ازلی ہے۔ اسے زہراوی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ سورہ مائدہ میں ان (الفاظ) کے بارے گفتگو گزر چکی ہے جن کے ساتھ قسم اٹھائی جا سکتی ہے اور جن کے ساتھ قسم اٹھانا جائز نہیں ہے، اور وہاں ہم نے اس آدمی کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ذکر کیا ہے کہ جس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے (نام کے) ساتھ قسم کھائی اس پر کفارہ لازم ہوگا(3)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: میں نے غیر اللہ کے ساتھ ان چیزوں میں سے جن کی تعظیم حقوق میں سے کسی حق کے سبب جائز ہے قسم اٹھانے کو جائز قرار دیا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا: بے شک یہ قسم ہے اس کے ساتھ کفارہ متعلق ہوتا ہے؛ مگر یہ کہ جس نے کذب اور جھوٹ کا قصد کیا وہ قابل ملامت ہے: کیونکہ باطن میں وہ اسے حقیر جان رہا ہے جس کی تعظیم اس پر واجب ہے۔ انہوں نے کہا: اور قول باری تعالیٰ لَعَمْرُكَ مراد تیری حیات اور زندگی کی قسم ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی قسم کھائی ہے تو بلاشبہ اس نے

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 369 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1130

ہمارے لئے صراحۃً یہ بیان کرنے کا ارادہ فرمایا ہے کہ ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ ہم آپ کی حیات طیبہ کی قسم کھائیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق قول باری تعالیٰ: لَعَمْرُكَ اور وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ ۝ (التین) وَ الطُّوْرِ ۝ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ (الطور) وَ النَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ (النجم) وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا ۝ (الشمس) لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۝ (البلد) ان تمام کا معنی یہ ہے: انجیر اور زیتون کے خالق کی قسم، کتاب مسطور کے رب کی قسم، اس شہر کے رب کی قسم جس میں آپ اترے، اور آپ کی زندگی اور حیات کو پیدا کرنے والے کی قسم، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی قسم، تو ان تمام میں یمین اور قسم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نام سے حاصل ہوئی نہ کہ مخلوق کے ساتھ۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اور جس نے غیر اللہ کے ساتھ قسم کو جائز قرار دیا ہے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تاویل کی ہے: لاتحلفوا بابائکم (1) (اپنے آباء کے ساتھ قسم نہ کھاؤ) اور فرمایا: بے شک یہ کافر آباء کے ساتھ قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے، کیا آپ دیکھتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنے آباء کے ساتھ قسم کھائی تو آپ نے فرمایا: ''پہاڑ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز و مکرم ہیں تمہارے ان آباء سے جو جاہلیت میں مرے ہیں۔'' اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کو اپنے ظاہر پر ہی محمول کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: جس نے اسے جائز قرار دیا ہے اس نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کی قسموں میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر ہمارے آج تک یہ طریقہ جاری ہے کہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قسم کھاتے ہیں، حتیٰ کہ اہل مدینہ ہمارے اس دن تک جب ان میں سے کوئی اپنے کسی ساتھی کے بارے فیصلہ کرے تو کہتا ہے: تو مجھے اس کے حق کی قسم دے جسے یہ قبر جمع کئے ہوئے ہے، اور اس قبر کے مکین کے حق کی قسم، مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اور اس طرح حرم پاک، مشاعر عظام، رکن، مقام ابراہیم، محراب، اور جن کا اس میں ذکر کیا جاتا ہے (کی قسم کھائی جاتی ہے۔)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۝ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝

''پس آلیا ان کو ایک سخت کڑک نے جب سورج نکل رہا تھا پس ہم نے ان کی بستی کو زیر و زبر کر دیا اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر۔''

قولہ تعالیٰ: فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی سورج نکلنے کے وقت (انہیں ایک سخت کڑک نے آلیا)۔ کہا جاتا ہے: أشرقت الشمس یعنی سورج روشن ہو گیا، اور شرقت جب وہ طلوع ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور أشرق القوم یعنی وہ سورج طلوع ہونے کے وقت داخل ہوئے۔ اور اسی کی مثل اصبحوا اور أمسوا ہیں، اور یہی آیت میں مراد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد فجر کا طلوع ہونا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عذاب کا آغاز صبح کے وقت ہوا اور سورج کے طلوع کے وقت وہ خوب پھیل گیا، اور اس وقت ان کی ہلاکت مکمل ہو گئی۔ واللہ اعلم۔ اور الصَّيْحَةُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لاتحلفوا بآبائکم، جلد 2، صفحہ 983

کا معنی عذاب ہے۔ اور سجیل کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ﴿۷۵﴾

''بے شک اس واقعہ میں (عبرت کی) نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ترمذی الحکیم نے ''نوادر الاصول'' میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للمتفرسین (1) (نظر جما کر دیکھنے والوں کے لئے، اہل فراست کے لئے) اور یہی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتقوا فراسۃ المومن فانه ینظر بنور الله (2) (تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور مقاتل اور ابن زید نے کہا ہے: لِلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ بمعنی للمتفکرین (3) (غور وفکر کرنے والوں کے لئے) ہے اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ للناظرین (گہری نظر و فکر کرنے والے) کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أو کلما وردت عکاظ قبیلۃ ۔۔۔ بعثوا إلیّ عریفهم یتوسّم

اور قتادہ نے کہا ہے: یہ بمعنی للمعتبرین (عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے) ہے۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

و فیهن ملهیً للصدیق و منظرٌ ۔۔۔ أنیقٌ لعینِ الناظرِ المتوسِّمِ

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: بمعنی للمتبصرین (بصیرت والے) ہے، مذکورہ تمام معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور حکیم ترمذی نے حضرت ثابت کی حدیث بیان کی ہے انہوں نے اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو لوگوں کو علامت اور نشانی سے پہچان لیتے ہیں۔'' إنّ لله عزّ و جل عبادا یعرفون الناس بالتوسم۔ علماء نے بیان کیا ہے: التوسم تفعل کے وزن پر الوسم سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد ایسی علامت ہے جس سے اس کے سوا مطلوب پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے: توسمت فیه الخیر (یہ تب کہے گا) جب تو اس میں خیر اور بھلائی کی علامت دیکھ لے؛ اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

انّی توسمت فیك الخیر أعرفه ۔۔۔ والله یعلم أنّی ثابت البصر (4)

بلاشبہ میں نے آپ میں خیر کی علامت دیکھی ہے میں اسے پہچانتا ہوں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں صحیح البصر ہوں۔

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 167
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140
3۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 167
4۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1131

اور دوسرے نے کہا ہے:

توسمتُه لما رأيتُ مَهابةً علیه و قلتُ المرُمن آل هاشم(1)

اور اتسم الرجل جب آدمی اپنے لئے ایسی علامت بنالے جس سے اسے پہچانا جاسکتا ہو، اور توسم الرجل اس نے وسمی گھاس طلب کیا۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وأصبحن كالدوم النواعِم غدوة علی وِجْهَةٍ من ظاعِنٍ مُتَوَسِّم

اور ثعلب نے کہا ہے: واسم وہ ہوتا ہے جو تجھے سر سے پاؤں تک دیکھے۔ اور التوسم کا اصل معنی التثبت (ثابت رہنا) اور التفکر (غور و فکر کرنا) ہے؛ یہ الوسم سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے اونٹ وغیرہ کی جلد میں لوہے کے ساتھ نشان لگانا، اور یہ (قوت) طبیعت اور مزاج کی عمدگی، دماغ کی تیزی اور صاف ستھری فکر سے حاصل ہوتی ہے اور بعض نے یہ چیزیں زائد ذکر کی ہیں۔ اور دنیوی حشو و زوائد سے دل کو فارغ رکھنے، اور گناہوں کی میل، اخلاق کی کدورت اور دنیا کی فضولیات سے اسے پاک رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ نہشل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ لِلْمُتَوَسِّمِيْنَ کے بارے انہوں نے فرمایا: اہل صلاح و خیر کے لئے (اس واقعہ میں علامات ہیں) اور صوفیہ نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ کرامت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ علامات کے ساتھ استدلال ہے۔ اور علامات میں سے وہ ہوتی ہے جو ہر ایک کے لئے ظاہراً ظاہر ہوتی ہے اور پہلی نظر کے ساتھ (ظاہر ہوتی ہے)، اور ان میں سے جو مخفی ہوتی ہے وہ کسی کے لئے بھی ظاہر نہیں ہوتی اور نہ بادی النظر میں اسے پایا جاسکتا ہے۔ حسن نے کہا ہے: المتوسمون وہ ہیں جو امور میں غور و فکر کرتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ وہ جس نے قوم لوط کو ہلاک کر دیا ہے وہ ان کفار کو بھی ہلاک و برباد کرنے پر قادر ہے، اور یہ دلائل ظاہرہ سے ثابت ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: مجھ سے کسی نے کسی شے کے بارے سوال نہیں کیا مگر میں اسے پہچان لیتا ہوں کہ آیا وہ فقیہ ہے یا غیر فقیہ ہے۔ ما سألني أحد عن شئ إلا عرفت أفقيه هو أو غير فقيه اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد بن حسن رحمہما اللہ تعالیٰ کے بارے مروی ہے کہ وہ دونوں کعبہ معظمہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی مسجد کے دروازے پر تھا تو ان میں سے ایک نے کہا: میں اسے نجار (بڑھئی) دیکھتا ہوں، اور دوسرے نے کہا: (نہیں) بلکہ یہ حداد (لوہار) ہے، پس حاضرین میں سے ایک آدمی جلدی سے اس کی طرف گیا اور اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا: كنت نجاراً و أنا اليوم حداد (میں بڑھئی تھا اور آج کل میں لوہار ہوں) اور حضرت جندب بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس آئے جو قرآن پڑھ رہا تھا پس آپ اس کے پاس ٹھہر گئے اور کہا: جس نے شہرت کے لئے سنایا اللہ تعالیٰ نے اسے شہرت بنا دیا، اور جس نے دکھاوا کیا اللہ تعالیٰ نے اسے دکھاوا بنا دیا۔ تو ہم نے ان کو کہا: گویا آپ نے اس آدمی کے بارے میں تعریض کی ہے، تو انہوں نے فرمایا: بے شک یہ جو تجھ پر آج قرآن کریم پڑھ رہا ہے کل یہ حروریہ ہو کر نکل جائے گا؛ پس وہی

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 370

راس الحرور یہ تھا، اور اس کا نام مرداس تھا۔ اور حضرت حسن بصری کے بارے روایت ہے کہ وہ عمرو بن عبید کے پاس گئے اور فرمایا: یہ بصرہ کے نوجوانوں کا سردار ہے اگرچہ اس نے کوئی بات نہیں کی، پس اس کے بارے تقدیر کا فیصلہ یہی ہے جو ہو چکا ہے، یہاں تک کہ اس کے عام بھائیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور ایوب کو کہا: یہ اہل بصرہ کے جوانوں کا سردار ہے، اور کوئی استثنا نہیں کی۔ اور حضرت شعبی کے بارے روایت ہے کہ انہوں نے داؤد ازدی کو کہا اس حال میں کہ وہ ان کے ساتھ جھگڑ رہا تھا: بے شک تو نہیں مرے گا یہاں تک کہ تیرے سر میں داغا جائے گا۔ اور پھر اسی طرح ہوا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مذحج کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے ان میں اُشتر بھی تھا، پس آپ نے اس میں نظر جمادی اور خوب غور سے دیکھا اور فرمایا: یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: یہ مالک بن حارث ہے۔ تو آپ نے فرمایا: اسے کیا ہے اللہ اسے قتل کرے! بے شک میں مسلمانوں کے لئے اس کی طرف سے انتہائی سخت (تکلیف دہ) دن دیکھ رہا ہوں؛ پھر اس کی طرف سے فتنہ میں وہی ہوا جو ہوا۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپ کے پاس گئے، اور وہ بازار سے گزر کر گئے تھے اور انہوں نے ایک عورت کی طرف دیکھا تھا، پس جب آپ نے ان کی طرف دیکھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: تم میں سے کوئی مجھ پر داخل ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ کو کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی آرہی ہے؟ تو آپ نے جواب فرمایا: نہیں۔ لیکن یہ برہان، فراست اور سچ ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس کی مثل کثیر مثالیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے: "جب یہ ثابت ہے کہ علامت اور فراست سے پہچاننا معانی کی پہچان کے ذرائع میں سے ہے لیکن اس پر کوئی حکم مرتب نہیں ہو سکتا اور اس کے ساتھ موسوم (جس میں علامت پائی جائے) اور متفرس (جس کو فراست کے ساتھ پہچان لیا جائے) کو پکڑا نہیں جاسکتا۔ بغداد کے قاضی القضاۃ الشامی المالکی شام میں ہونے کے دوران احکام میں فراست کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے، ایاس ابن معاویہ کے طریقہ پر چلتے ہوئے، جن دنوں وہ قاضی تھے، اور ہمارے شیخ فخر الاسلام ابوبکر الشاشی نے اس کے رد میں ایک جز تصنیف کیا ہے انہوں نے اسے اپنے خط کے ساتھ میرے لئے لکھا اور وہ مجھے عطا فرمادیا۔ اور یہ صحیح ہے، کیونکہ احکام کی پہچان شرعاً معلوم ہے انہیں پانے کا ذریعہ قطعی ہے اور فراست ان قطعی ذرائع میں سے نہیں ہے(1)۔

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

"اور بے شک یہ بستی ایک آباد راستہ پر واقع ہے۔ یقیناً اس میں نشانی ہے اہل ایمان کے لئے۔ اور بے شک ایکہ کے باشندے بھی بڑے ظالم تھے۔ پس ہم نے ان سے بھی انتقام لیا اور یہ دونوں بستیاں کھلی شاہراہ پر واقع ہیں"۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1131

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّهَا مراد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں۔ لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی قوم کے راستے پر شام کی طرف واقع ہیں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی یقیناً یہ تصدیق کرنے والوں کے لئے باعث عبرت ہیں۔ وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ اس میں اصحاب الایکہ سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے، وہ جنگلوں، باغوں اور پھلدار درختوں کے مالک لوگ تھے۔ اور الایکہ سے مراد الغیضة ہے اور اس سے مراد درختوں کا جھنڈ ہے۔ اور جمع الایک ہے۔ روایت ہے کہ ان کے درخت کھجور کے درخت کے مشابہ تھے اور وہ گوگل کے درخت تھے۔

نابغہ نے کہا ہے:

تَجْلُو بِقادِمَتَيْ حمامة أَيْكَةٍ بَرَدًا أُسِفَّ لِثَاتُه بالاثمِد

اور کہا گیا ہے کہ الأیکۃ بستی کا نام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شہر کا نام ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ الأیکۃ اور لَیکۃ ان کا شہر ہے، جیسا کہ مکہ سے بکہ ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ اور یہ دونوں ایسے راستے پر واقع ہیں جو ذاتی اعتبار سے بڑا کھلا اور واضح ہے، مراد قوم لوط کا شہر اور اصحاب الایکہ کی بستی ہے، جو بھی ان دونوں کے پاس سے گزرتا ہے وہ ان سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۸۰﴾

اور بے شک جھٹلایا اہل حجر نے (اللہ تعالیٰ کے) رسولوں کو۔"

الْحِجْرِ کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے: اس میں سے ایک حجر الکعبہ ہے، ایک الحرام ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ (الفرقان) یعنی حرام جو کہ حرام کیا گیا ہے۔ اور الحجر کا معنی عقل ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِذِيْ حِجْرٍ (صاحب عقل کے لئے) اور الْحِجْرِ کا معنی حجر القمیص (قمیص کی بلکھی) ہے؛ اور فتحہ زیادہ فصیح ہے۔ اور الحجر کا معنی گھوڑی بھی ہے۔ اور الحجر سے مراد دیار ثمود بھی ہیں۔ اور یہاں یہی مراد ہیں، یعنی (قوم ثمود کا شہر)؛ یہ ازہری نے کہا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو مکہ مکرمہ اور تبوک کے درمیان ہے، اور یہی وہ وادی ہے جس میں ثمود آباد تھے۔ علامہ طبری نے کہا ہے: یہ وہ زمین ہے جو حجاز اور شام کے درمیان ہے، اور وہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی اور ارشاد فرمایا: الْمُرْسَلِيْنَ تو اس سے مراد اکیلے حضرت صالح علیہ السلام ہیں، لیکن جس نے ایک نبی علیہ السلام کو جھٹلایا تو تحقیق اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کو جھٹلا دیا؛ کیونکہ وہ تمام اصول میں ایک ہی دین پر ہیں، لہٰذا ان کے درمیان تفریق جائز نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام، ان کی اتباع کرنے والوں، اور آپ سے پہلے آنے والے تمام انبیاء علیہم السلام کو بھی جھٹلا دیا۔ واللہ اعلم۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کے درمیان حجر کے مقام پر اترے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کے کنوئیں سے نہ پانی پئیں اور نہ اس سے پانی لیں۔ تو انہوں نے عرض کی: ہم نے تو اس سے آٹا گوندھ لیا ہے اور ہم نے مشکیزے بھر لئے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ والی ثمود اخاھم صالحاً، جلد 1 صفحہ 478

ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ پانی بہادیں اور وہ آٹا بھی پھینک دیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت میں ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ثمود کی زمین الحجر پر اترے، انہوں نے وہاں کے کنوؤں سے پانی بھر لیا اور اس کے ساتھ آٹا وغیرہ گوندھ لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ جو انہوں نے پانی لیا ہے وہ اسے بہادیں اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کنوئیں سے پانی لیں جس پر (آپ کی) ناقہ وارد ہوتی۔ اور یہ بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے (1) روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام حجر سے گزرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: "تم ان کے گھروں میں داخل نہ ہو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا مگر اس خوف اور ڈر سے روتے ہوئے کہ کہیں اس کی مثل تمہیں نہ آپہنچے جو عذاب انہیں آپہنچا۔" پھر آپ نے اپنی ناقہ کو ڈانٹا اور تیز چل پڑے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس آیت میں وہ چیزیں ہیں جن کا حکم شارع نے بیان کیا ہے اور ان کے حکم کی وضاحت کی ہے اور وہ آٹھ مسائل ہیں (☆)، علماء نے ان کا استنباط کیا ہے اور ان میں سے بعض میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 1۔ پس ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ ان جگہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے، اور اسی پر بعض علماء نے کفار کے قبرستانوں میں داخل ہونے کو محمول کیا ہے، پس اگر انسان ان جگہوں میں سے کسی میں اور قبرستان میں داخل ہو تو وہ اس طریقہ اور صفت پر ہو جس کی طرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے راہنمائی فرمائی ہے یعنی عبرت حاصل کرتے ہوئے، خوف کھاتے ہوئے اور انتہائی تیزی کے ساتھ۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم بابل کی زمین میں داخل نہ ہو کیونکہ اس میں لعنت کی گئی ہے۔"

مسئلہ۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی کو بہادینے کا حکم دیا جو انہوں نے ثمود کے کنوئیں سے لیا تھا اور اس آٹے کو پھینک دینے کا حکم دیا جو اس سے گوندھا گیا تھا اور اس سے روٹی پکائی گئی تھی کیونکہ یہ ناراضگی اور سختی والا پانی ہے، پس اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے فرار اختیار کرتے ہوئے اس سے انتفاع جائز نہیں۔ اور فرمایا: "تم اسے اونٹوں کو کھلا دو (2)۔"

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح نجس پانی کا حکم ہے اور اس آٹے کا جو اس سے گوندھا جائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور دوسرا یہ ہے...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: بے شک طعام و شراب میں سے جس کا استعمال جائز نہیں ہوتا اسے اونٹوں اور جانوروں کو کھلانا جائز ہے، جبکہ انہیں تکلیف نہ ہو؛ اور اسی طرح نجس اور پلید شہد کے بارے میں بھی کہا ہے: بے شک اسے مکھیاں چاٹ سکتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آٹا جو اس پانی کے ساتھ گوندھا گیا تھا وہ اونٹوں کو کھلانے کا حکم ارشاد فرمایا، اور اسے اس طرح پھینکنے کا حکم نہیں دیا جیسا کہ خیبر کے دن پالتو گدھوں کا گوشت پھینک دینے کا حکم دیا تھا؛ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گدھوں کا گوشت تحریم میں اشد اور نجس ہونے میں زیادہ غلیظ ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، نھی عن الدخول علی اھل الحجر، جلد 2، صفحہ 411

2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1133

☆ متن میں بھی اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں سات مسائل مذکور ہیں۔

حکام کی کمائی کے بارے حکم دیا کہ وہ اونٹوں اور غلاموں کو کھلا دی جائے، حالانکہ نہ وہ حرام ہے اور نہ نجس ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر یہ حرام ہوتی تو آپ اس کے بارے حکم نہ دیتے کہ وہ اسے اپنے غلام کو کھلا دے)، کیونکہ وہ بھی اس میں عبادت کرنے والا ہے جیسے وہ خود عبادت کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ...... حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹا اونٹوں کو کھلانے کا حکم دینے میں اس پر دلیل ہے کہ آدمی کے لئے نجاست اٹھا کر اپنے کتے کو ڈالنا جائز ہے تا کہ وہ اسے کھائے؛ بخلاف ان کے جس نے ہمارے اصحاب میں سے اس کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے: اس پر کتوں کو چھوڑا جائے گا اور اسے ان کی طرف اٹھایا نہیں جائے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ پانچواں مسئلہ یہ ہے...... کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کنوئیں سے پانی لینے کا حکم دینا جس پر حضرت صالح کی اونٹنی پانی پینے آتی تھی یہ اس پر دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے آثار سے برکت حاصل کرنا جائز ہے، اگرچہ ان کا زمانہ کتنا قدیم ہو اور ان کے آثار مخفی ہوں، جیسا کہ پہلے حکم میں فساد برپا کرنے والوں کے بغض اور ان کے گھروں اور ان کے آثار کے مذموم ہونے پر دلیل ہے۔ اس میں تحقیق اگرچہ یہ ہے کہ جمادات پر مواخذہ نہیں ہے، لیکن جو چیز محبوب کے ساتھ مل جائے وہ بھی محبوب ہوتی ہے، اور جو مکروہ اور مبغوض کے ساتھ ملی ہوئی ہو وہ مبغوض ہوتی ہے۔

جیسا کہ بہت سے شعراء نے کہا ہے:

أحب لحبّها السودان حتّی　　أحبّ لحبّها سُودَ الکلاب

میں اس کی محبت کی وجہ سے سیاہ رنگ کو پسند کرتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کی محبت کی وجہ سے سیاہ رنگ کے کتوں کو بھی پسند کرتا ہوں۔

اور اسی طرح ایک دوسرے نے کہا ہے:

أمرّ علی الدّیار دیارِ لیلیٰ　　أقبّل ذا الجدارَ و ذا الجدارَ

میں دیار لیلیٰ سے گزرتا ہوں اور ان کی ہر ہر دیوار کو بوسے دیتا ہوں۔

وما تلك الدّیارُ شغفْنَ قلبی　　ولکن حُبُّ من سکن الدیارا

ان گھروں کی محبت میرے دل پر غالب نہیں ہے لیکن ان گھروں کے مکین کی محبت مجھ پر غالب ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور چھٹا مسئلہ یہ ہے:...... بعض علماء نے ایسی جگہ نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور کہا ہے: اس میں نماز جائز نہیں ہوتی کیونکہ وہ ناراضگی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہونے کا ٹکڑا ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس یہ علاقہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے مستثنیٰ ہو گیا: ''میرے لئے زمین مسجد اور پاکیزہ بنا دی گئی۔'' پس وہاں کی مٹی سے تیمم جائز نہ ہوگا اور نہ اس کے پانی سے وضو جائز ہوگا اور نہ اس میں نماز جائز ہو گی۔ اور ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے: کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ میں، جانور ذبح کرنے کی جگہ میں، قبرستان میں، ہلاک کرنے والی آفت کی جگہ میں،

حمام میں، اونٹ باندھنے کی جگہ میں، اور بیت اللہ شریف کے اوپر (1)۔ اور اس باب میں حضرت ابومرثد، حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی سند اتنی زیادہ قوی نہیں ہے کیونکہ زید بن جبیرہ میں ان کے حافظہ کے بارے کلام کی گئی ہے، اور ہمارے علماء نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ مغصوبہ گھر میں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں میں، اور اس مکان میں جس میں تصویریں اور بت پڑیں ہوں، غصب کی ہوئی زمین میں یا ایسی جگہ جس میں تیرا منہ سونے والے آدمی کی طرف ہو یا کسی آدمی کے چہرے کی طرف ہو یا ایسی دیوار پر جس پر نجاست ہو۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: ان جگہوں میں سے بعض وہ ہیں جن میں غیر کا حق ہونے کی وجہ سے نماز سے منع کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کی وجہ سے منع کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن میں نجاست کے مکمل طور پر موجود ہونے یا اس کے غالب ہونے کی وجہ سے نماز سے منع کیا گیا ہے، پس وہ جگہیں جن میں نجاست کی وجہ سے نماز سے منع کیا گیا ہے اگر اس میں پاک کپڑا بچھا دیا جائے جیسا کہ حمام اور قبرستان میں یا اس کی طرف تو بے شک وہ جائز ہے (یہ) مدونہ میں ہے۔ اور ابومصعب نے اس کے بارے کراہت کا ذکر کیا ہے۔

اور ہمارے علماء نے پرانے اور نئے قبرستان کے درمیان نجاست کی وجہ سے فرق کیا ہے، (اسی طرح) مسلمانوں اور مشرکوں کے قبرستان کے درمیان فرق کیا ہے: کیونکہ وہ دار عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی کا علاقہ ہے جیسا کہ مقام حجر ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے المجموعہ میں کہا ہے: اونٹوں کے باڑے میں نماز نہیں پڑھی جائے گی اگرچہ کپڑا بھی بچھا یا جائے؛ گویا کہ آپ نے اس کی دو علتیں بیان کی ہیں: ایک ان کا نجاست سے ڈھکا ہوا ہونا اور دوسرا اونٹوں کے بدکنے یا دوڑنے کا خدشہ پس (اس طرح) نمازی کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر اس میں ایک اونٹ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں؛ جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے: یہ حدیث صحیح میں ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایسی قالین پر نماز نہ پڑھی جائے جس میں تصاویر ہوں مگر ضرورت کے تحت۔ اور ابن قاسم نے نماز کو مکروہ قرار دیا ہے جبکہ قبلہ سمت تصاویر ہوں، اور مغصوبہ گھر میں بھی نماز مکروہ ہے، اور اگر کسی نے پڑھ لی تو وہ ہو جائے گی۔ اور بعض نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ غصب شدہ گھر میں نماز جائز نہیں ہوتی۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک بخلاف زمین کے ہے کیونکہ گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوا جاتا، اور زمین اگرچہ وہ (کسی کی) ملکیت ہے بے شک اس میں مسجد ہونے کا وصف قائم ہے اور کسی کا اس کا مالک ہونا اسے باطل نہیں کرتا۔ (2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان شاء اللہ وہ صحیح جس پر نظر وفکر اور خبر دلالت کرتی ہے کہ ہر پاک جگہ میں نماز جائز اور صحیح ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد میں یہ جو مروی ہے: ”بے شک یہ وادی ہے اس کے ساتھ شیطان ہے“۔ اور اسے معمر نے زہری سے روایت کیا ہے پس آپ نے فرمایا: ”تم اس جگہ سے نکل چلو جس میں تمہیں غفلت آپہنچی ہے“۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے منع فرمایا کہ میں بابل کی زمین میں نماز پڑھوں کیونکہ اس میں لعنت کی گئی ہے۔ اور آپ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1133 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1134

ﷺ کا ارشاد کہ جس وقت آپ ثمود کے مقام حجر سے گزرے: ''تم ان عذاب دیئے گئے لوگوں پر داخل نہ ہو مگر (اس طرح) کہ تم رو رہے ہو''(1)۔ اور آپ کا اونٹوں کے باڑے میں نماز سے منع کرنا اور علاوہ ازیں جو اس باب سے متعلقہ ہیں، یہ ان اصولوں کے مطابق جن پر اجماع ہے اور اس بارے میں آنے والے صحیح دلائل کے مطابق مردود ہیں۔ امام حافظ ابو عمر نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس باب میں مختار یہ ہے کہ اس وادی اور اس کے علاوہ زمین کے دیگر حصص کے لئے جائز ہے کہ ان تمام میں نماز پڑھی جائے جب تک ان میں کوئی یقینی ایسی نجاست نہ ہو جو نماز کے مانع ہو، اور جس کسی نے یہ علت بیان کی ہے کہ نماز سے سونے کی جگہ شیطان کی جگہ ہے اس کا کوئی معنی (اور اس کی کوئی اصل) نہیں ہے۔ اور وہ جگہ جس میں لعنت کی گئی اس میں کوئی واجب اور ضروری نہیں کہ اس میں نماز پڑھی جائے، اور اس باب میں جو روایات مروی ہیں کہ قبرستان میں، بابل کی زمین میں، اونٹوں کے باڑے میں اور علاوہ ازیں ان جیسی جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے وہ تمام ہمارے نزدیک حضور ﷺ کے اس ارشاد جعلت لی الأرض مسجدًا و طهورًا(2) کی عمومیت کی وجہ سے منسوخ اور ختم ہو چکی ہیں۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد یہ خبر دے رہا ہے کہ یہ آپ کے فضائل میں سے ہے اور ان چیزوں میں سے ہے جو آپ کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اہل علم کے نزدیک آپ کے فضائل پر دلالت کرنے والی روایات کا نہ نسخ جائز ہے نہ ان میں تبدیلی اور نہ ہی کمی جائز ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں''(3)۔

مسئلہ نمبر 7۔ یہ بھی روایت ہے کہ چھ عطا فرمائی گئی ہیں، اور اسی طرح تین اور چار کی روایت بھی ہے، اور ان کی انتہا اس سے زیادہ نو تک ہے، آپ نے ان میں فرمایا ہے:...... ''مجھ سے پہلے کسی کو وہ عطا نہیں کی گئیں مجھے سرخ و سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا اور رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میری امت کو تمام امتوں سے بہترین امت بنایا گیا، اور میرے لئے غنائم کو حلال کیا گیا، اور میرے لئے زمین کو مسجد اور پاکیزگی کا ذریعہ بنایا گیا، اور مجھے شفاعت عطا فرمائی گئی، اور مجھے جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا، اور اس اثنا میں کہ میں سویا ہوا تھا مجھے زمین (کے خزانوں) کی چابیاں عطا فرمائی گئیں اور وہ میرے ہاتھ پر رکھ دی گئیں، اور مجھے کوثر عطا فرمایا گیا، اور میرے ساتھ سلسلہ انبیاء علیہم السلام ختم کر دیا گیا''۔ اسے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ اور ان میں سے بعض نے ان میں سے بعض کو ذکر کیا ہے اور بعض نے وہ بعض ذکر کی ہیں جو ان کے سوا دوسروں نے ذکر نہیں کیں۔ اور یہ تمام کی تمام صحیح روایات ہیں۔ اور آپ ﷺ کے فضائل پر زیادتی جائز ہے لیکن ان میں کمی کرنا جائز نہیں ہے؛ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ نبی ہونے سے پہلے عبد تھے پھر رسول ہونے سے پہلے آپ نبی تھے؛ اسی طرح آپ سے مروی ہے۔ اور فرمایا: ''میں اسے نہیں جانتا جو میرے ساتھ کیا جائے گا اور نہ اسے جو تمہارے ساتھ کیا جائے گا''۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح: 2)

اور آپ ﷺ نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: یا خیر البریة (اے کائنات سے بہتر)؛ تو آپ نے فرمایا: ''وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب نهي عن الدخول، جلد 2، صفحہ 410

2۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 41　3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199

ابراہیم علیہ السلام ہیں۔'' اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی یہ نہ کہے، میں یونس بن متا سے بہتر ہوں'' اور فرمایا: ''سید حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں۔'' پھر ان تمام کے بعد ارشاد فرمایا: انا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں ہے) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل مسلسل بڑھتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض فرمالی؛ پس اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے: بلاشبہ ان میں نسخ، استثنا، اور کمی جائز نہیں ہے البتہ ان میں زیادتی جائز ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد جعلت لی الارض مسجدا و طھورا (1) کی وجہ سے ہم نے حمام، قبرستان اور زمین کے ہر حصہ میں نماز جائز قرار دی ہے جبکہ وہ نجاستوں سے پاک ہو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''جہاں بھی تجھے نماز کا وقت آپہنچے وہیں نماز پڑھ لے کیونکہ ساری زمین مسجد ہے (2)''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور کسی جگہ کے ساتھ یہ خاص نہیں۔ اور رہے وہ جنہوں نے ابن وہب کی حدیث سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: مجھے یحییٰ بن ایوب نے زید بن جبیرہ سے، انہوں نے داؤد بن حصین سے، انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مجھے خبر دی ہے، یہ ترمذی کی وہی حدیث ہے جسے ہم ذکر کر چکے ہیں پس اس حدیث کے ساتھ زید بن جبیرہ منفرد راوی ہیں اور محدثین نے اس پر اس کا انکار کیا ہے، اور یہ حدیث مسند معروف نہیں ہے مگر صرف اس روایت کے ساتھ یحییٰ بن ایوب عن زید بن جبیرۃ۔ اور لیث بن سعد نے عبداللہ بن نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا اور اس حدیث کے بارے پوچھا، تو عبداللہ بن نافع نے ان کی طرف لکھا: میں اسے نہیں جانتا جس نے اسے نافع سے بیان کیا ہے مگر یہ کہ یہ باطل ہے۔ حلوانی نے اسے سعید بن ابی مریم سے اور انہوں نے لیث سے ذکر کیا ہے، اور اس میں مشرکوں کے مقبرہ کی دوسروں سے کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، اور مجھے بابل کی زمین میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں لعنت کی گئی ہے (3)۔ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ اور اس کے ضعف پر اجماع ہے، اور وہ ابو صالح جنہوں نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ سعید بن عبدالرحمٰن غفاری، بصری ہیں وہ مشہور راوی نہیں ہیں اور ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع صحیح نہیں ہے، اور جو ان کے سوا راوی ہیں مجہول ہیں، وہ معروف نہیں ہیں۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ کا غیر مرفوع قول ہے وہ حدیث حسن الاسناد ہے، اسے فضل بن دکین نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے: مغیرہ بن ابی الحر کندی نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا مجھے ابو العنبس حجر بن عنبس نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حروریہ کی طرف نکلے، پس جب ہم سوریا سے آگے نکلے اور بابل کی زمین میں داخل ہوئے، ہم نے کہا: اے امیر المومنین! شام ہو گئی ہے، نماز نماز؛ تو آپ نے کسی سے کلام نہ کی۔ پھر لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! تحقیق شام کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں (شام

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی موضع لایجوز صلاۃ، جلد 1، صفحہ 70

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ ولقد آتینا لقمان الحکمۃ، جلد 1، صفحہ 487

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، فی الموضع التی لا تجوز فیھا صلاۃ، جلد 1، صفحہ 70

ہو چکی ہے) لیکن میں اس زمین میں نماز نہ پڑھوں گا جسے اللہ تعالیٰ نے دھنسا دیا ہے۔ اور مغیرہ بن حر کوفی ثقہ راوی ہے؛ یہ یحییٰ بن معین وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حجر بن عنبس کبار اصحاب علی رضی اللہ عنہ میں سے ہیں۔ اور ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمین ساری کی ساری مسجد ہے سوائے مقبرہ اور حمام کے (1)''۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے سفیان ثوری نے عمرو بن یحییٰ سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے، گویا یہ اثبت اور اصح ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: پس اس سے استدلال کرنا ان کے نزدیک ساقط ہے جو مرسل روایت کو حجت تسلیم نہیں کرتے، اگرچہ اس سند سے ثابت ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔

ہم اس طرح نہیں کہتے جیسا کہ ان بعض نے کہا ہے جو اہل مدینہ کے مذہب کو اپنانے والے ہیں کہ بے شک اس حدیث میں اور اس کے علاوہ دیگر احادیث میں مقبرہ سے مراد صرف مشرکوں کا قبرستان لیا گیا ہے)، کیونکہ المقبرۃ الحمام دونوں الف لام کے ساتھ ذکر فرمائے، پس یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر توقیف کے مراد بعض مقبروں کے سوا بعض مقبرے ہوں یا بعض حماموں کے سوا بعض حمام مراد لئے جائیں، کیونکہ یہ ایسا قول ہے جس پر کتاب وسنت میں سے کوئی دلیل نہیں ہے نہ کوئی خبر صحیح موجود ہے، اور نہ اس کے لئے قیاس اور عقل میں کوئی گنجائش ہے، اور نہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی خبر موجود ہے۔ اور جنہوں نے مشرکین کے مقبرہ کو خاص کیا ہے ان کی تخصیص دو وجہوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہوگی کہ یا تو وہ اس وجہ سے ہے کہ وہاں کفار کی آمد و رفت لگی رہتی ہے لیکن اس سبب سے مقبرہ کے خصوصی ذکر کا کوئی معنی نہیں، کیونکہ ہر وہ جگہ جہاں وہ اپنے جسموں کے ساتھ اور اپنے قدموں کے ساتھ آتے جاتے ہوں تو اس کا حکم اسی طرح ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس سے عظیم اور بلند تر ہے کہ آپ ایسی چیز کے بارے گفتگو فرمائیں جس کا کوئی معنی نہ ہو۔ یا پھر یہ اس وجہ سے ہوگا کہ وہ ناراضگی اور غضب کے نازل ہونے کی جگہ ہے، تو اگر اس طرح ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں کے مقبرہ میں اپنی مسجد نہ بناتے نہ آپ انہیں اکھیڑتے، نہ ہموار کرتے اور نہ ان پر مسجد کی تعمیر کرتے۔ اگر مقابر میں سے کسی مقبرہ میں نماز ادا کرنے کے لئے قائل کا قول جائز ہوتا تو پھر اس حدیث کی وجہ سے مشرکین کا مقبرہ بدرجہ اولیٰ مخصوص اور مستثنیٰ ہوتا۔ اور ہر وہ جس نے مقبرہ میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے اس نے کسی مقبرہ کو خاص نہیں کیا؛ کیونکہ الف لام کا اشارہ جنس کی طرف ہے نہ کہ معہود کی طرف، اور اگر مسلمانوں اور مشرکوں کے مقبرہ کے مابین فرق ہوتا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور بیان فرماتے اور اسے مہمل نہ چھوڑتے: کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضاحت اور بیان کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اگر کسی جاہل کے لئے یہ کہنا جائز ہو کہ مقبرہ اس طرح ہے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کہنا بھی جائز ہوگا کہ حمام اس طرح ہے؛ کیونکہ حدیث میں مقبرہ اور حمام دونوں کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح آپ کا قول: المزبلۃ (کوڑے کرکٹ کا ڈھیر) اور المجزرۃ (ذبح خانہ) ہے؛ اس میں یہ جائز نہیں کہ یہ کہا جائے: ڈھیر اس طرح ہو اور نہ ہی جائز ہے کہ کہا جائے: ذبح خانہ اس طرح ہو اور نہ یہ کہنا جائز ہے کہ راستہ اس طرح ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، ان الارض کلھا مسجد، جلد 1، صفحہ 42

اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مشرکین کے مقبرہ میں تیمم جائز ہے بشرطیکہ مٹی طیب، طاہر اور صاف ستھری ہو۔ اور اسی طرح انہوں نے اس پر بھی اجماع کیا ہے کہ جس نے عیسائیوں یا یہودیوں کی عبادتگاہ میں پاک جگہ پر نماز پڑھی کہ اس کی نماز قضا ہو رہی ہو تو وہ جائز ہے۔ اور یہ سورۂ براۃ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ کنیسہ (گرجا گھر) مقبرہ کی نسبت اس کے زیادہ قریب ہے کہ وہ ناراضگی اور غضب کے نازل ہونے کی جگہ ہو، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے، اور مقبرہ اس طرح نہیں ہے۔ اور یہودیوں کی عبادتگاہوں اور گرجا گھروں کو مساجد بنانے کے بارے میں سنت بھی موجود ہے۔ امام نسائی نے حضرت طلق بن علی سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: ہم ایک وفد کی صورت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلے اور ہم نے آپ کی بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز ادا کی، اور ہم نے آپ کو خبر دی کہ ہماری زمین میں ہمارے یہودیوں کی ایک عبادتگاہ ہے، اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور اس میں ہے: ''پس جب تم اپنی زمین پر پہنچو تو اپنی موجودہ عبادتگاہ کو توڑ دو اور اسے مسجد بنالو۔''

اور ابوداؤد نے عثمان بن ابی العاص سے ذکر کیا ہے (1) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ طائف کی مسجد اس جگہ بنائیں جہاں ان کے بت پڑے تھے۔ اور سورۂ براۃ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تیرے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مسجد ہی (بطور حجت) کافی ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی درآنحالیکہ وہ مشرکین کے قبرستان میں بنائی گئی اور یہ ہر اس کے خلاف حجت ہے جس نے اس میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور جنہوں نے مقبرہ میں نماز کو مکروہ کہا ہے چاہے وہ مسلمانوں کا ہو یا مشرکوں کا وہ حضرت ثوری، امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کا اعادہ نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز جائز ہوگی جب اس نے مقبرہ میں ایسی جگہ پڑھی جہاں کوئی نجاست نہ تھی یہ ان احادیث کی وجہ سے ہے جو اس بارے میں معلوم ہیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور تم انہیں قبریں نہ بناؤ (2)۔'' اور ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو (3)''۔ اور یہ دونوں حدیثیں سند کے اعتبار سے ثابت ہیں، اور ان میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں تاویل کا احتمال رکھتی ہیں، اور یہ واجب نہیں ہے کہ ہر پاک جگہ میں نماز پڑھنے سے رکا جائے مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو تاویل کا احتمال نہ رکھتی ہو۔ اور مسلمان فقہاء میں سے کسی نے مسلمانوں اور مشرکوں کے مقبرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے مگر وہ جسے ہم نے بیان کیا ہے وہ ایسا لغو قول ہے جس کی مثل کے ساتھ آدمی مشغول نہیں ہو سکتا، اور نظر و فکر میں اس کی کوئی وجہ نہیں اور نہ اس بارے میں کوئی صحیح اثر ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور آٹھواں مسئلہ یہ ہے...... کہ وہ باغ جس میں گندگی اور غلاظت پھینکی جاتی ہو تا کہ وہ اس میں بیلیں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی بناء المسجد، جلد 1، صفحہ 65

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل التطوع فی البیت، جلد 1، صفحہ 104

3۔ ایضاً، کتاب الجنائز، باب فی کراھیۃ القعود المقبر، جلد 1، صفحہ 104

وغیرہ لگائے تو اس میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے یہاں تک کہ وہ تین بار اسے سیراب کر لے، جیسا کہ اسے دار قطنی نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے باغ کے بارے میں روایت بیان کی ہے جس میں گندگی اور غلاظت پھینکی جاتی ہے، آپ نے فرمایا: ''جب وہ تین بار سیراب کر لیا جائے تو پھر اس میں نماز پڑھ لے (1)'' اور انہوں نے حضرت نافع کی حدیث بھی نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ان سے ایسے باغات کے بارے پوچھا گیا جن میں گندگیاں پھینکی جاتی ہیں اور یہ کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے، کیا ان میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب تو انہیں تین بار سیراب کر لے تو پھر ان میں نماز پڑھ لے (2)، انہوں نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع بیان کیا ہے اور دونوں نے اسناد میں اختلاف کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾

''اور ہم نے عطا کیں انہیں اپنی نشانیاں مگر وہ ان سے روگردانی ہی کرتے رہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا ای بآیتنا (اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا کیں) یہ قول اس قول کی طرح ہے: آتِنَا غَدَآنا ای بغذائنا۔ (تو ہمارے پاس ہماری غذا لے آ) اور یہاں مراد ناقہ (اونٹنی) ہے۔ اور اس میں بہت سی نشانیاں تھیں: اس کا پتھر کی چٹان سے نکلنا، اور اس کے نکلنے کے وقت ہی اس کا حاملہ ہونا اور بچہ جننے کی حالت کے قریب ہونا، اور اس کا عظیم ہونا یہاں تک کہ کوئی اونٹنی اس کے مشابہ نہ تھی، اور اس کے دودھ کا کثیر ہونا یہاں تک کہ وہ ان تمام کو کافی ہوتا تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ناقہ کے علاوہ دوسرے معجزے بھی ہوں، جیسا کہ کنواں وغیرہ فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ یعنی انہوں نے اعتبار نہ کیا، غور و فکر نہ کی۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور وہ کھود کر بنایا کرتے تھے پہاڑوں کو اپنے گھر (اور) وہ بے خوف و خطر رہا کرتے تھے۔ پس پکڑ لیا انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے جب وہ صبح اٹھ رہے تھے۔ پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں اس (مال) نے جو وہ کمایا کرتے تھے۔''

کلام عرب میں النحت کا معنی تراشنا اور چھیلنا ہے۔ نحته ینحته (یہ عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ ہے) نحتا یعنی اس نے اسے تراشا۔ اور النحاتة کا معنی البراية (تراشا) ہے۔ اور المنحت سے مراد وہ آلہ ہے جس کے ساتھ کھودا اور تراشا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ (الصافات) (یعنی کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنہیں خود تراشتے اور بناتے ہو۔) پس وہ اپنی شدید قوت کے ساتھ اپنے لئے پہاڑوں میں اپنے گھر بناتے تھے۔ اٰمِنِيْنَ یعنی وہ ان کے ان پر گرنے سے یا خراب ہونے سے پر امن اور بے خوف و خطر رہتے تھے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ یعنی صبح کے وقت انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے پکڑ لیا، اور مُصْبِحِيْنَ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ الصَّيْحَةُ کا ذکر سورۂ ہود اور

1۔ دار قطنی، جلد 1، صفحہ 228 2۔ ایضاً

اعراف میں گزر چکا ہے۔ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ پس انہیں مالوں اور پہاڑوں میں موجود قلعوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا، اور نہ اس قوت وطاقت نے جو انہیں عطا کی گئی تھی انہیں کوئی فائدہ پہنچایا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۶﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور بے شک قیامت آنے ہی والی ہے پس (اے حبیب!) آپ درگزر فرمایا کیجئے ان سے عمدگی کے ساتھ، یقینا آپ کا رب ہی سب کا خالق (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی (ہم نے ہر شے کو) زوال اور فناء ہونے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یعنی تاکہ میں نیکی کرنے والے اور برائی کرنے والے کو جزا اور بدلہ دوں؛ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۙ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ﴿۳۱﴾ (النجم) (اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ وہ بدلہ دے بدکاروں کو ان کے اعمال کا اور بدلہ دے نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا۔) وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ بے شک قیامت ہوکر رہنے والی ہے پس ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دی جائے گی۔ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ اسی کی مثل یہ ارشاد ہے وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾ (المزمل) (اور ان سے الگ ہوجایئے بڑی خوبصورتی سے۔) یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے درگزر فرمایئے، اور انہیں خوب اچھی طرح معاف فرما دیجئے؛ پھر اسے آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ کردیا گیا۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے منسوخ کردیا ہے: وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ (البقرہ: 191) (تو پکڑلو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں تم پاؤ انہیں۔) اور یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تحقیق میں تمہارے پاس ذبح (قربانی) کا حکم لے کر آیا ہوں اور مجھے حصاد (کٹائی) کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے اور میں زراعت کے ساتھ مبعوث نہیں کیا گیا''۔ یہ عکرمہ اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، اور یہ کہ یہ اپنی ذات کے حق میں درگزر کرنے کا حکم ہے ان معاملات میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان ہیں۔ اور الصفح کا معنی اعراض کرنا ہے یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ یعنی بے شک آپ کا رب ہی خلق اور اخلاق کو مقرر کرنے والا اور ان کا فیصلہ کرنے والا ہے الْعَلِیْمُ وہ موافقت کرنے والوں اور نفاق رکھنے والوں کو جاننے والا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی۔''

سبع مثانی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے؛ پس کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے؛ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابوہریرہ، ربیع بن انس، ابو العالیہ اور حسن وغیرہم رضی اللہ عنہم نے کہا ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ

اسناد کے ساتھ حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابو سعید بن معلی رضی اللہ عنہما کی حدیث سے مروی ہے۔ اور یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اور امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الحمد لله ام القرآن، ام الکتاب اور السبع المثانی (1) ہے۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ نص ہے، اور سورۃ فاتحہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

نشدتکم بمنزِل القرآن امِّ الکتاب السبعِ من مثانی (2)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد سات طویل سورتیں ہیں (اور وہ یہ ہیں) البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور انفال اور التوبہ دونوں اکٹھی ہیں؛ کیونکہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ شریف نہیں ہے۔

نسائی نے بیان کیا ہے: علی بن حجر نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں شریک نے ابو اسحاق سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کے بارے خبر دی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اس سے مراد سات طویل سورتیں ہیں، اور ان کا نام مثانی اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ عبرت، احکام، اور حدود کا ذکر ان میں بار بار کیا گیا ہے۔ اور ایک قوم نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل کی گئی ہے، اور طوال میں سے کوئی شے وہاں نازل نہیں کی گئی۔ اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم آسمان دنیا کی طرف نازل کیا اور پھر وہاں سے اسے بالتدریج آہستہ آہستہ (اور تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل فرمایا، پس جو اللہ تعالیٰ نے آسمان دنیا کی طرف نازل کیا تو گویا وہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرما دیا اگرچہ اس کے بعد آپ پر نازل نہ بھی کیا گیا ہو۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ سات طویل سورتیں ہیں وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور جریر نے کہا ہے:

جزی الله الفرزدق حین یُنسِی مُضِیعا للمفصّل والمثانی (3)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: المثانی سے مراد سارا قرآن کریم ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر: 23) (یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں) یہی قول حضرت ضحاک، طاؤس اور ابو مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے، اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور اس کو مثانی کہا گیا ہے، کیونکہ اس میں اخبار اور قصص بار بار بیان کئے گئے ہیں۔ اور حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرثیہ کہتی ہیں:

فقد کان نورا ساطعا یُهتدی به یُخَصُّ بتنزیل المثانی المعظَّم (4)

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 170
3۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 171
4۔ ایضاً

تحقیق آپ روشن و منور نور تھے جس سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کی جاتی تھی اور قرآن عظیم کی تنزیل کے ساتھ آپ کو خاص کیا گیا ہے۔

اس میں المثانی العظیم سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السبع المثانی سے مراد قرآن کریم کی اقسام ہیں، مثلاً امر، نہی، بشارت دینا، انذار (ڈرانا) ضرب الامثال، نعمتیں شمار کرنا اور قرون ماضیہ کی خبریں بیان کرنا؛ یہ زیاد بن ابی مریم نے بیان کیا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ نص ہے۔ تحقیق ہم نے سورۂ فاتحہ میں ذکر کیا ہے کہ اسے مثانی کا نام دینے میں ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے سوا یہ نام دینے کے مانع ہو، مگر یہ کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شی کے بارے نص ثابت اور وارد ہو جو تاویل کا احتمال نہ رکھتی ہو تو آپ کے نزدیک اسی پر وقوف اور توقف ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ اس میں اضمار ہے تقدیر کلام یہ ہے: وھو أن الفاتحه القرآن العظیم اور وہ سورۂ فاتحہ ہی قرآن عظیم ہے کیونکہ وہ ان امور پر مشتمل ہے جو اصول اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں واؤ مقحمہ ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: ولقد آتیناك سبعا من المثانی القرآن العظیم۔

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

إلى الملِكِ القَرْمِ و ابنِ الهمامِ و ليثِ الكَتِيبَةِ فى المُزْدَحَم

اور یہ پہلے اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (البقرہ:238) (پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی)۔

لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾

''اپنی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے ان (اموال) کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے ان کے مختلف طبقوں کو اور رنجیدہ خاطر بھی نہ ہوں ان (کی گمراہی) پر اور نیچے کیجئے اپنے پروں کو مومنوں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اس کا معنی ہے: تحقیق میں نے آپ کو غنی کر دیا ہے قرآن کریم کے ساتھ ہر اس شی سے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، کیونکہ وہ ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کے ساتھ مستغنی نہیں ہوا یعنی وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے یہ خیال کیا کہ قرآن کریم میں سے جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے ساتھ وہ غنی نہیں ہے یہاں تک کہ اس کی نظر دنیوی زیب و آرائش کی طرف اٹھتی رہی حالانکہ اس کے پاس معارف مولیٰ موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے: یہ اس بارے ہے کہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودیوں کے سات قافلے ایک دن میں بصریٰ اور اذرعات سے آئے، اور ان کے پاس گندم، خوشبو، جواہرات اور سامان بحر موجود تھا، تو مسلمانوں نے کہا: اگر یہ اموال ہمارے پاس ہوتے تو یقیناً ہم ان کے ساتھ تقویت پاتے اور ہم انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ یعنی یہ تمہارے لئے ان سات قافلوں سے بہتر ہے، پس تم ان کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھئے، اور اس طرف ابن عیینہ گئے ہیں، اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ذکر کیا ہے: لیس منا من لم یتغن بالقران(1)۔ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ مستغنی نہیں ہوا۔ اور یہ معنی کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اور اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ کا معنی ہے جو مال و نعم میں ان کی مثل ہیں، یعنی اغنیاء اور مالدار جو غنی اور مال میں بعض بعض کی مثل ہوتے ہیں، پس وہ ازواج ہی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت دائمی طور پر سامان دنیا سے آراستہ اور مزین ہونے سے زجر و توبیخ کرنے اور بندے کو اپنے مولیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اسی کی مثل یہ آیت ہے ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیواة الدنیا لنفتنهم فیه الآیہ (اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب و زینت ہیں دنیوی زندگی کی اور (انہیں اس لئے دی ہیں) تاکہ ہم آزمائیں انہیں) حالانکہ اس طرح نہیں، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حبب الی من دنیا کم النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلواة(2) (تمہاری دنیا سے میرے لئے عورتوں اور خوشبو کو پسندیدہ بنایا گیا ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے ساتھ مشغول ہوتے تھے انسانی فطرت کے اعتبار سے اور خلقت انسانیہ کی تزیین اور آراستگی کے لئے، اور خوشبو پر دوام اختیار فرماتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ فقط اپنے مولیٰ کی مناجات کے وقت نماز میں ٹھنڈی ہوتی تھی، اور آپ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مناجات اور عبادت کرنا کسی اور سے زیادہ موزوں، لائق اور اولیٰ ہے۔ اور حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں رہبانیت نہیں ہے اور نہ ہی کلی طور پر دنیا سے قطع تعلقی کر کے ہمہ وقت اعمال صالحہ اور عبادت و ریاضات میں متوجہ ہونا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں تھا، بے شک اللہ تعالیٰ نے دین کے ساتھ تمسک اور میلان، فیاضی جو مشقت سے خالی ہو اور آدمی پر خفیف اور آسان ہو کو مشروع قرار دیا ہے۔ وہ آدمیت سے اس کی شہوات کو لیتا ہے اور قلب سلیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قراء اور فضلاء میں سے مخلصین نے لذات سے رکنا اور زمین و آسمان کے پروردگار کے لئے خلوص اختیار کرنا آج اولیٰ اور بہتر دیکھا ہے، کیونکہ دنیا پر حرام غالب آچکا ہے، اور بندہ اپنی معاش میں ایسے لوگوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور ہے جن کے ساتھ اس کا اختلاط اور ملنا جائز نہیں اور آدمی ان کے ساتھ کاروبار کرنے پر مجبور ہے جن کا کاروبار حرام ہے، پس قرأت کرنا افضل ہے، اور دنیا سے فرار اختیار کرنا بندے کے لئے زیادہ صحیح اور درست ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں کا ریوڑ ہوگا وہ ان کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات پر پھرتا رہے گا اور اپنے دین کو فتنوں سے بچا لے جائے گا(3)۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ یعنی آپ مشرکوں پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں اگر وہ ایمان نہیں لائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 373　2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1137　3۔ ایضاً

اس کا معنی ہے آپ اس (مال) پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں جس سے انہیں دنیا میں لطف اندوز کیا گیا ہے بے شک آپ کے لئے آخرت میں اس سے افضل و اعلیٰ ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ ان پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں اگر وہ عذاب کی طرف جا رہے ہیں بے شک وہ اہل عذاب ہی ہیں۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی آپ اس کے لئے اپنا پہلو نرم کیجئے جو آپ کے ساتھ ایمان لایا ہے اور آپ ان کے لئے تواضع اختیار کیجئے۔ اور اس کا اصل معنی ہے کہ پرندہ جب اپنے بچے کو اپنے ساتھ ملا لے پھر اپنے پر پھیلائے اور انہیں بچوں پر بچھا دے، پس کسی بھی انسان کے لئے اپنے پیروکاروں کو اپنے قریب لانے کے لئے یہی وصف بنایا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: فلان خافض الجناح، یعنی فلاں بڑے وقار اور سکون میں ہے۔ اور ابن آدم کے دو پر اس کے دو پہلو ہیں، اور اسی سے یہ ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ (طٰہٰ: 22) (اور (حکم ملا) دبا لو اپنے ہاتھ اپنے بازو کے نیچے۔) اور پرندے کے پر اس کے ہاتھ ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وحَسْبُكَ فِتْيَةٌ لزعيم قوم يمدّ على أخي سُقِم جناحا

یعنی تواضع اور نرمی کرتے ہوئے۔

وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿89﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿90﴾

اور فرمایئے کہ میں تو بلاشبہ (ایسے عذاب سے) کھلا ڈرانے والا ہوں، جیسے اتارا ہم نے ان بانٹنے والوں پر۔"

اس کلام میں حذف ہے؛ یعنی انی انا النذیر المبین عذابا (بے شک میں عذاب سے کھلا ڈرانے والا ہوں) پس اس سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے، جبکہ انذار اس پر دلالت کر رہا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿13﴾ (فصلت) (میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی کڑک کی مانند (ہلاکت خیز) ہوگی۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کاف زائدہ ہے، یعنی أنذرتكم ما أنزلنا على المقتسمين (میں تمہیں اس سے ڈرانے والا ہوں جو ہم نے بانٹنے والوں پر اتارا)؛ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: أنذرتكم مثل ما أنزلنا بالمقتسمين (میں نے تم کو ڈرایا ہے جو ہم نے بانٹنے والوں پر نازل کیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ای من العذاب یعنی جس طرح ہم نے عذاب بانٹنے والوں پر اتارا۔ اور ہم آپ کی طرف سے استہزاء کرنے والوں کے لئے کافی ہیں، پس آپ اس کا اعلان کر دیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے جنہوں نے بغاوت کی، کیونکہ ہم آپ کے لئے ان سرداروں کے مقابلے میں کافی ہیں جو آپ ان سے پایا کرتے جو پایا کرتے۔

اور الْمُقْتَسِمِيْنَ کے بارے میں سات مختلف اقوال ہیں:

(۱) مقاتل اور فراء نے کہا ہے: یہ وہ سولہ آدمی ہیں جنہیں ولید بن مغیرہ نے حج کے ایام میں بھیجا تھا پس انہوں نے مکہ مکرمہ کی گھاٹیاں، وہاں کے درے اور کھلے راستے تقسیم کر لئے جو بھی ان پر چل کر آتا وہ اسے کہتے تھے: تم اس کے دعوے

میں نہ آنا جو ہم میں ظاہر ہوا ہے اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، کیونکہ وہ مجنون ہے اور بسا اوقات کہتے وہ ساحر (جادوگر) ہے، کبھی کہتے وہ شاعر ہے اور کبھی کہتے وہ کاہن ہے، پس ان کا نام مقتسمین اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہوں نے یہ راستے تقسیم کر لئے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں انتہائی بری موت کے ساتھ مار دیا۔ اور انہوں نے ولید بن مغیرہ کو بطور حکم (ثالث) مسجد کے دروازے پر کھڑا کیا، اور جب وہ اس سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتے تو وہ کہتا: انہوں نے سچ کہا ہے۔

(۲) حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ کفار قریش کی ایک جماعت اور گروہ ہے انہوں نے کتاب اللہ کو تقسیم کر لیا پس بعض کو شعر بنا دیا، بعض کو سحر بنا دیا، بعض کو کہانت بنا دیا، اور بعض کو پہلے لوگوں کے افسانے بنا دیا۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: یہ وہ اہل کتاب ہیں جو قرآن کریم کے بعض کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا(1)۔ اور اسی طرح عکرمہ نے بھی کہا ہے: وہ اہل کتاب ہیں، اور ان کا نام مقتسمین اس لئے رکھا گیا کیونکہ وہ استہزاء کرنے والے تھے، پس ان میں سے کوئی کہتا تھا(2): یہ سورت میرے لئے اور یہ سورت تیرے لئے (نازل ہوئی ہے) اور یہی چوتھا قول ہے۔

(۵) حضرت قتادہ نے کہا ہے: انہوں نے اپنی کتاب کو تقسیم کر دیا اور اسے متفرق کر دیا اور اسے بکھیر دیا اور اس میں تحریف کر دی۔

(۶) حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: مراد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے(3)، انہوں نے آپ کے قتل کے بارے باہم قسمیں کھائیں، پس اسی وجہ سے ان کا نام مقتسمین رکھا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ (النمل: 49) (انہوں نے کہا: آؤ اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کر لیں کہ شبخون مار کر صالح اور اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیں گے۔)

(۷) اخفش نے کہا ہے: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے قسم کھائی اور اس پر ایک دوسرے سے حلف لیا(4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عاص بن وائل، عتبہ اور شیبہ، ربیعہ کے دونوں بیٹے، ابوجہل بن ہشام، ابوالبختری بن ہشام، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، اور منبہ بن حجاج تھے، اس کا ذکر ماوردی نے کیا ہے(5)۔

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝۹۱

''جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ۔''

یہ بانٹنے والوں کی صفت ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ ہے۔ اور عِضِيْنَ کی واحد عِضَةٌ ہے، یہ عضیت الشئ تعضیۃ سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اسے متفرق کر دیا اور ہر فرقہ (اور گروہ) عضۃ کہلاتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اصل میں عِضْوَۃٌ تھا پس اس سے واؤ کم کر دی گئی، اور اسی وجہ سے اس کی جمع عضین ہے، جیسا کہ انہوں نے کہا ہے: عِزِيْنَ عِزَۃٌ کی جمع ہے۔ اور یہ اصل میں عِزْوَۃٌ تھا، اور اسی طرح ثُبَۃٌ اور اس کی جمع ثبین ہے۔ اور معنی اسی کی طرف لوٹتا ہے جو ہم

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 172 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 173 5۔ ایضاً

نے مقتسمین کے ضمن میں ذکر کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ بعض (قرآن) کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ انہوں نے کفر کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے قرآن کریم کے بارے میں متفرق جھوٹ گھڑے اور اسے جھوٹ، سحر، کہانت، اور شعر قرار دیا۔ عضوته ای فرقته (میں نے اسے بکھیر دیا۔)

رؤبہ شاعر نے کہا ہے:

ولیس دین اللہ بالمُعَضّی (1)

اللہ تعالیٰ کا دین متفرق نہیں ہے۔

ای بالمفرق (جس کو تقسیم کیا گیا ہو) اور کہا جاتا ہے: اس میں ھاء کم کر دی گئی ہے اور اس کی اصل عضهة ہے کیونکہ العِضه اور العِضین لغت قریش میں اس کا معنی سحر ہے۔ اور وہ ساحر کو عاضِه اور ساحرة (جادوگر عورت) کو عاضِهة کہتے ہیں۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

أعوذ بربی من النافثاتِ فی عُقَد العاضِه المُعْضِه

اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے العاضِهة اور المستعضهة پر لعنت کی ہے۔ اور اس کی تفسیر الساحرة (جادو کرنے والی) اور المستسحرة (2) (جادو کرنے والی) سے کی گئی ہے۔ اور اس کا معنی ہے: انہوں نے قرآن کریم پر کثرت سے بہتان لگائے اور اس کے بارے میں طرح طرح کی کذب بیانی کی، پس انہوں نے کہا: یہ جادو ہے اور پہلے لوگوں کے افسانے ہیں، اور یہ کہ یہ گھڑا ہوا جھوٹ ہے، علاوہ ازیں اسی طرح کی باتیں کی۔ اور حرف کم کرنے میں عضة کی نظیر شفة ہے، اس کی اصل شفهة ہے، جیسا کہ انہوں نے کہا ہے: سنة اور اس کی اصل سنهة ہے، پس انہوں نے ھاء اصلیہ کو ساقط کر دیا اور ھا علامت تانیث کو قائم رکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ العضه سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی النمیمة (چغلخوری) ہے۔ اور العَضِیهة سے مراد بہتان ہے، اور یہ انسان کا چغلی کھانا ہی ہوتا ہے اور آدمی اس میں وہ کچھ کہتا ہے جو اس میں نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے: عَضَهه عضها اس نے اس پر بہتان باندھا۔ وقد أعْضَهت یعنی میں بہتان لے کر آیا۔ (میں نے بہتان تراشی کی)۔ کسائی نے کہا ہے: العِضة کا معنی جھوٹ اور بہتان ہے، اور اس کی جمع عِضون ہے، مثلاً عزة اور اس کی جمع عزون ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ۔) اور کہا جاتا ہے: عضوا یعنی وہ اس کے ساتھ ایمان لائے جسے انہوں نے پسند کیا اور باقی کے ساتھ کفر کیا، پس ان کے کفر نے ان کے ایمان کو ضائع کر دیا۔ اور فراء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ العِضاة سے ماخوذ ہے، اور یہ وادی کا ایک درخت ہے اور وہ کانٹے کی طرح نکلتا ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

''پس آپ کے رب کی قسم! ہم پوچھیں گے ان سب سے، ان اعمال کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ یعنی ہم ضرور ان کے بارے پوچھیں گے جن کا ذکر جاری ہے ان اعمال کے

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 173 2۔ ایضاً

بارے میں جو انہوں نے دنیا میں کئے۔ اور امام بخاری میں ہے: متعدد اہل علم نے قول باری تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ کے بارے کہا ہے (کہ مراد یہ ہے) کہ ہم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے بارے پوچھیں گے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث مرفوعاً روایت کی گئی ہے، ترمذی حکیم نے بیان کیا ہے: ہمیں جارود بن معاذ نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا ہمیں فضل بن موسیٰ نے شریک سے انہوں نے لیث سے انہوں نے بشیر بن نھیک سے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ کے بارے میں فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (2) کے قول (کے بارے ہم ان سے پوچھیں گے)۔ ابوعبداللہ نے کہا: ہمارے نزدیک اس کا معنی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی سچائی اور اسے پورا کرنے کے متعلق سوال ہوگا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں عمل کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور یہ نہیں فرمایا عما کانوا یقولون (یعنی اس کے بارے جو وہ کہتے ہیں) اگرچہ یہ جائز ہے کہ قول بھی زبان کا عمل ہوتا ہے، بے شک اس سے مراد وہ معنی ہے جسے اہل لغت پہچانتے ہیں کہ قول قول ہے اور عمل عمل ہے۔ اور بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عن قول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اس کے ساتھ وفا کرنے اور اس کے قول کی سچائی کے بارے سوال ہوگا، جیسا کہ امام حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایمان آراستہ اور مزین ہونے کے ساتھ نہیں اور نہ دین تمنی کے ساتھ ہے لیکن یہ وہ ہے جو دلوں میں راسخ اور ثابت ہو اور اعمال اس کی تصدیق کریں، اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے: ''جس نے اخلاص کے ساتھ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا اخلاص کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ اسے اللہ تعالیٰ کے محارم سے روکے رکھے۔'' اسے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ عہد کیا ہے کہ میری امت کا کوئی آدمی جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے گا اور اس کے ساتھ کسی اور شے کی آمیزش نہیں کرے گا اس کے لئے جنت واجب ہے''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سی شے ہے جسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا پر حریص ہونا، اس کو جمع کرنا اور پھر اسے روک کر رکھنا، وہ قول انبیاء کا کہتے ہیں اور عمل جابروں اور ظالموں کا کرتے ہیں۔'' اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے باز رکھتا ہے جب تک وہ اپنے دنیا کے معاملہ کو اپنے دین پر ترجیح نہ دیں پس جب اپنی دنیا کے معاملہ کو اپنے دین پر ترجیح دیں اور پھر کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو اسے ان پر لوٹا دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے جھوٹ کہا ہے۔'' اس کی اسانید نوادر الاصول میں ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت اپنے عموم کے اعتبار سے تمام کے سوال اور ان کے محاسبہ پر دلالت کرتی ہے جو ان میں سے کافر ہیں اور جو ان میں سے مومن ہیں، سوائے ان کے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے جیسا کہ ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے۔ پس اگر کہا جائے: کیا کافر سے سوال کئے جائیں گے اور اس کا محاسبہ کیا جائے گا؟ تو ہم

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 141	2۔ ایضاً

کہتے ہیں: اس میں اختلاف ہے، اور ہم نے اسے "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے۔ اور جو اس کے سوال کو ظاہر کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ (الصافات) (اور (اب ذرا) روک لو انہیں، ان سے باز پرس کی جائے گی۔) اور اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (الغاشیہ) (بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے) پس اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (القصص) (اور نہیں دریافت کئے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ۔)

اور فرمایا: فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (الرحمٰن) (تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا) اور فرمایا: وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ (البقرہ: 174) (اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ۔) اور فرمایا: اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (المطففین) (یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا۔) تو ہم کہیں گے: قیامت کے کئی مقامات ہیں، پس کسی جگہ پر سوال و کلام ہوگی، اور کسی مقام پر ان میں سے کچھ نہ ہوگا۔ اور عکرمہ نے کہا: قیامت میں کئی مقامات ہوں گے، بعض میں سوال کئے جائیں گے اور بعض میں سوال نہیں کئے جائیں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان سے یہ سوال حصول خبر اور حصول علم کے لئے نہیں ہوگا کہ کیا تم نے اس اس طرح کیا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر شے کو جاننے والا ہے، لیکن ان سے یہ سوال برائے ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کے ہوگا پس اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا: تم نے قرآن کریم اور اس میں اپنے لئے موجود دلائل کی نافرمانی کیوں کی ہے؟ اور قطرب نے اسی قول پر اعتماد کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر) یعنی ہم مکلف مومنوں سے ضرور سوال کریں گے، اس کا بیان یہ قول باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (التکاثر) (پھر ضرور پوچھا جائے گا تم سے اس دن جملہ نعمتوں کے بارے میں) اور عموم کے مطابق قول کرنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝

"سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے۔ ہم کافی ہیں آپ کو مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے۔"

قولہ تعالیٰ: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ یعنی آپ اس کے بارے اعلان کر دیجئے جس کے بارے آپ کو حکم دیا گیا ہے، یعنی آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام تمام مخلوق تک پہنچائیے تا کہ ان پر حجت قائم ہو جائے، تحقیق اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اور الصدع کا معنی الشق (پھاڑنا) ہے۔ اور تصدع القوم یعنی قوم متفرق ہو گئی اور اسی سے ہے يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ (الروم) یعنی اس دن وہ متفرق ہو جائیں گے (بکھر جائیں گے) اور صدعته فانصدع ای انشق۔ (میں نے اسے پھاڑا پس وہ پھٹ گیا۔) اور الصدع کا اصل معنی جدا کرنا اور پھاڑنا ہے۔

ابوذؤیب اپنے گدھوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وكأنهن رِبابة و كأنّه يَسَرٌ يُفيض على القِداح و يَصْدَع

اس میں یصدع بمعنی یفرق اور یشق (یعنی جدا جدا کرنا اور پھاڑنا) کے ہے۔

پس قول باری تعالیٰ: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ فراء نے کہا ہے: اس سے فاصدع بالأمر کا ارادہ کیا ہے، یعنی اپنے دین کا اظہار کیجئے، پس اس میں ما فعل کے ساتھ مل کر قائم مقام مصدر کے ہے۔ اور ابن الاعرابی نے کہا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا معنی ہے اس کا قصد کیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا معنی ہے آپ ان کی جمعیت اور ان کے کلمہ کو جدا جدا کر دیجئے اس کے ساتھ کہ آپ انہیں توحید کی طرف دعوت دیں کیونکہ یہ متفرق ہو جائیں گے اور جدا جدا ہو جائیں گے اس طرح کہ بعض اسے قبول کر لیں گے، پس اس تفسیر کے مطابق الصدع جماعت کفار کو متفرق کرنے کی طرف راجع ہوگا۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اور آپ مشرکوں کے استہزا کو اہمیت دینے سے اور ان کے قول کی کوئی پرواہ کرنے سے اعراض کر لیجئے، منہ پھیر لیجئے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بری قرار دیا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (التوبہ: 5) کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور عبد اللہ بن عبید نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل (دعوت) چھپاتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قول نازل فرمایا: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب باہر نکلے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں اللہ تعالیٰ نے نماز میں قرآن بالجہر پڑھنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اور آپ ان کی پرواہ نہ کریں۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے: جب وہ شر میں انتہائی سرکش ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کثرت سے استہزا کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اور اس کا معنی ہے آپ اس کا اعلان کر دیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لئے کافی ہے جس نے آپ کو اذیت پہنچائی جیسا کہ وہ آپ کو مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے کافی ہے، اور وہ اہل مکہ کے پانچ سردار تھے ان میں ولید بن مغیرہ تھا وہ ان کا سرخیل تھا، اور عاص بن وائل، اسود بن مطلب بن اسد ابو زمعہ، اور اسود بن عبد یغوث، اور حارث بن طلاطلہ، اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو ہلاک کر دیا، کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں غزوہ بدر میں ایک ہی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استہزا کرنے کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ اور ان کے ہلاک ہونے کے سبب سے متعلق ابن اسحاق نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور وہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے، پس وہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تھے تو آپ کے پاس سے اسود بن مطلب گزرا اور آپ نے اس کے چہرے پر سبز پتہ پھینکا تو وہ اندھا ہو گیا اور اس کی آنکھ درد کرنے لگی، تو وہ اپنا سر دیوار کے ساتھ مارنے لگا۔ اور آپ کے پاس سے اسود بن عبد یغوث گزرا تو آپ نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا پس اس کا پیٹ پانی سے بھر گیا اور اس سوج کی وجہ سے مر گیا۔ کہا جاتا ہے: حَبِنَ (کسرہ کے ساتھ) حبنًا اور حُبِنَ فعل مجہول کے لئے ہے یعنی اس کا پیٹ زرد پانی کے ساتھ بھر گیا، بڑھ گیا، فھو اَحبَنُ (وہ بڑے پیٹ والا ہے) والمرأۃ حَبناء (سوجے ہوئے پیٹ والی عورت)، اسی طرح الصحاح میں ہے۔ اور ولید بن مغیرہ آپ کے پاس سے گزرا پس آپ نے اس کے پاؤں

کے ٹخنے کے نیچے زخم کے نشان کی طرف اشارہ کیا، اور وہ اس کو کئی سال پہلے لگا تھا، اور وہ اپنی چادر تکبر کی وجہ سے زمین پر گھسیٹ کر چلا کرتا تھا اور اس کی وجہ یہ ہوئی وہ خزاعہ کے ایک آدمی کے پاس سے گزرا وہ اپنے تیر کو پر لگا رہا تھا پس اس کا تیر اس کی چادر کے ساتھ اٹک گیا اور اس کے پاؤں میں خراش لگ گئی وہ فقط خراش تھی اور کچھ نہ تھا، تو وہ اس کے ساتھ جھگڑ پڑا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ اور عاص بن وائل آپ کے پاس سے گزرا اور آپ نے اس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ طائف کے ارادہ سے گدھے پر نکلا، تو گدھا اس کے ساتھ ایک کانٹے دار بوٹی پر بیٹھ گیا اور ایک کانٹا اس کے پاؤں کے تلوے میں لگ گیا اور اسی نے اسے قتل کر ڈالا۔ اور حارث بن طلاطلہ آپ کے پاس سے گزرا، اور آپ نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا پس اس سے پیپ بہنے لگی اور اسی نے اسے مار ڈالا۔ اور ان کی موت کے سبب میں جو اختلاف ذکر کیا گیا ہے وہ اس کے قریب قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو اس قول باری تعالیٰ سے مراد ہیں: فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26) (پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔) اسے تشبیہ دی گئی ہے ان کے ساتھ جنہیں موت ان پر چھت گرنے کی وجہ سے واقع ہو، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۹۶

''جو بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا، سو یہ (حقیقت حال کو) ابھی جان لیں گے۔''

یہ استہزا کرنے والوں کی صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝۹۷

''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ یعنی ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، کیونکہ سینہ دل کا محل ہے۔ بِمَا يَقُوْلُوْنَ یعنی اس کے سبب جو آپ ان سے اپنی تکذیب اور اپنے قول کا رد سنتے ہیں، اور آپ اور آپ کے اصحاب اسے اپنے دشمنوں سے پاتے ہیں (1)۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۹۸

''سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جائیے سجدہ کرنے والوں سے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَسَبِّحْ پس آپ نماز کی پناہ لیجئے، یہ تسبیح کی غایت اور پاکی بیان کرنے کی انتہا ہے (2)، اسی لئے اس کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی: وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ اور اس میں کوئی خفا نہیں ہے کہ نماز میں غایت قرب حالت سجود میں حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ حالت سجدہ میں ہو پس تم اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔'' اور اسی وجہ سے سجود کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1138 2۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 2۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں امر سے مراد نفس سجود ہی ہے، اور اس مقام کو قرآن میں محل سجود قرار دیا ہے (1)، اور بیت المقدس طہرہ اللہ میں محراب زکریا کے امام کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس مقام پر سجدہ کرتے ہیں اور میں نے بھی اس میں ان کے ساتھ سجدہ کیا ہے، لیکن جمہور علماء کا یہ موقف نہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو بکر نقاش نے ذکر کیا ہے کہ یہاں ابو حذیفہ اور یمان بن رباب کے نزدیک سجدہ ہے اور وہ اسے واجب گمان کرتے ہیں۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

''اور عبادت کیجئے اپنے رب کی یہاں تک کہ آجائے آپ کے پاس الیقین۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ الیقین سے مراد موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی عبادت کا حکم دیا (3) جب اس کے بندے اس میں کوتاہی کریں کہ یہ آپ پر واجب ہے۔ اگر کہا جائے: قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ کا کیا فائدہ ہے؟ حالانکہ قول باری تعالیٰ: وَاعْبُدْ رَبَّكَ عبادت کا حکم دینے کے بارے میں کافی تھا، تو کہا جائے گا: اس میں فائدہ یہ ہے کہ اگر رب کریم مطلقاً وَاعْبُدْ رَبَّكَ فرماتا پھر آپ ایک بار اس کی عبادت کر لیتے تو آپ اطاعت کرنے والے ہو جاتے اور جب فرمایا: حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ تو اس کا معنی ہوا اس سے جدائی اور علیحدگی اختیار نہ کیجئے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔ پھر اگر کہا جائے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کیسے کہہ دیا: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ اور ابدا نہیں کہا، تو جواب یہ ہے کہ الیقین، ابداً کے قول کی نسبت زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ لفظ ابدا ایک لحظہ اور ہمیشہ کے معنی کا احتمال رکھتا ہے۔ اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہاں مراد مدت حیات تک عبادت کو جاری رکھنا ہے، جیسا کہ عبد صالح نے کہا: وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ (مریم) (اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا جب تک میں زندہ رہوں۔) اور اسی پر یہ مسئلہ مرتب ہوتا ہے کہ جب کسی آدمی نے اپنی بیوی کو کہا: أنت طالق أبدا (تو ہمیشہ طلاق والی ہے) اور کہا: میں نے اس سے ایک دن یا ایک مہینے کی نیت کی ہے تو اس کے لئے رجعت کا حق حاصل ہوگا (4)۔ اور اگر اس نے کہا: میں نے اسے زندگی بھر کے لئے طلاق دی ہے تو پھر اسے رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اور اس پر دلیل کہ یقین سے مراد موت ہے (5) ام العلاء انصاریہ کی حدیث ہے، اور وہ بیعت کرنے والی عورتوں میں سے تھی۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رہے عثمان یعنی عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ..... تحقیق انہیں موت آئی اور میں ان کے لئے خیر کی امید رکھتا ہوں قسم بخدا! میں نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں وہ جو اس کے ساتھ کیا جائے گا۔'' اور آگے حدیث ذکر کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: لوگوں کو موت کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1138　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1139　5۔ ایضاً

بارے جو یقین ہے اس سے زیادہ کوئی یقین شک کے مشابہ میں نے نہیں دیکھا کہ پھر وہ اس کی تیاری نہیں کرتے، یعنی گویا وہ اس میں شک کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہاں یقین سے مراد وہ حق ہے جس میں کوئی شک نہیں (کہ) آپ کی آپ کے دشمنوں کے خلاف مدد کی گئی ہے۔ یہ ابن شجرہ نے کہا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اور یہی حضرت مجاہد، قتادہ اور حسن کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔ جبیر بن نفیر نے ابو مسلم خولانی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا ہے بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری طرف یہ وحی نہیں کی گئی کہ میں مال جمع کروں اور میں تاجروں میں سے ہو جاؤں لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور سجدہ کرنے والوں سے ہو جائیے اور اپنے رب کی عبادت کیجئے یہاں تک کہ آپ کے پاس الیقین آ جائے''۔

سورة النحل

آیاتہا ۱۲۸　۱۶ سورۃ النحل مکیۃ ۷۰　رکوعاتہا ۱۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کے قول کے مطابق یہ ساری سورۃ مکیہ ہے۔ اور اس کا نام سورۃ النعم بھی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ان نعمتوں کو شمار کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں پر فرمائی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ سورۃ مکیہ ہے سوائے اس قول باری تعالیٰ کے: وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ الآیہ یہ آیت مدینہ طیبہ میں حضرت حمزہ اور شہداء احد کی تمثیل بیان کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور سوائے اس قول کے: وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ، اور سوائے اس قول کے: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا الآیہ۔ اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ الَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا فِي اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا۔ یہ مکی ہے اور ہجرت حبشہ کی شان میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ سورہ مکی ہے سوائے تین آیات کے جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں، اور وہ یہ ہیں: وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝۔

اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝

قریب آ گیا ہے حکم الٰہی پس اس کے لئے عجلت نہ کرو، پاک ہے اللہ تعالیٰ اور برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ کہا گیا ہے کہ اس میں اَتٰى بمعنی یاتی ہے، (یعنی آ رہا ہے) اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: إن اکرمتنی اکرمتك (اگر تو نے میری عزت کی تو میں تیری تکریم کروں گا)۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ماضی اور مستقبل میں خبر دینا برابر ہے، کیونکہ وہ لامحالہ ہو کر رہنے والا ہے، جیسا کہ اس کا قول ہے: وَ نَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ (الاعراف: 44) اور اَمۡرُ اللّٰهِ سے مراد اس کے لئے اس کی سزا اور عقاب ہے جو شرک کرنے اور اس کے رسول کی تکذیب کرنے پر قائم رہا۔ حسن، ابن جریج اور ضحاک نے کہا ہے: امر سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے فرائض و احکام کو بیان کیا ہے۔ اور اس میں بہت بعد ہے، کیونکہ یہ منقول نہیں ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے اللہ تعالیٰ کے فرائض کی طلب میں عجلت کی ہو اس سے پہلے کہ وہ ان پر فرض کئے جائیں، البتہ عذاب و عقاب کی طلب میں جلدی کرنے والے ہیں اور وہ بہت سے کفار قریش وغیرہ سے منقول ہے حتیٰ کہ نضر بن حارث نے کہا: اَللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ

الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ، تو اس نے عذاب کی طلب میں عجلت کی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ضحاک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرتے ہیں کہ میں نے اور میرے رب نے تین چیزوں میں باہم موافقت کی ہے: مقام ابراہیم میں، حجاب میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں، اسے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر پر انہیں جزا دینے کا وعدہ کیا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَإِذَا جَآءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ (المومنون: 27) (یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم اور ابل پڑا تنور)۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ قیامت کا دن ہے یا قیامت کی علامت میں سے وہ جو اس کے قرب پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر) (قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند شق ہو گیا)۔ کفار نے کہا: بے شک یہ گمان کر رہے ہیں کہ قیامت قریب آ چکی ہے، پس تم ان بعض کاموں سے رک جاؤ جو تم کرتے ہو، پس وہ رک گئے اور انتظار کرنے لگے لیکن انہوں نے کوئی شے نہ دیکھی، تو پھر کہنے لگے: ہم تو کوئی شے نہیں دیکھ رہے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی، اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ الآیہ (الانبیاء: 1) (قریب آ گیا لوگوں کے لئے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت......) پس وہ خوفزدہ ہو گئے اور قرب قیامت کا انتظار کرنے لگے، پھر ایام طویل ہو گئے تو وہ کہنے لگے: ہم تو کوئی شے نہیں دیکھ رہے ہیں، پھر یہ آیت نازل ہوئی: اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اچھل پڑے اور خوفزدہ ہو گئے، پھر یہ ارشاد نازل ہوا: فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ پس وہ مطمئن ہو گئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے قیامت کے ساتھ ان دو کی طرح مبعوث کیا گیا ہے" (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیوں کے ساتھ اشارہ کیا اور وہ ایک سبابہ (شہادت کی انگلی) اور اس کے ساتھ والی انگلی تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ قریب تھا کہ وہ مجھ سے سبقت لے جاتی لیکن میں اس پر سبقت لے گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہی ہے۔ اور یہ کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام جب آسمان والوں کے پاس سے گزرتے اس حال میں کہ انہیں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا جاتا تھا تو وہ کہتے: اللہ اکبر، قیامت قریب آ گئی۔ قولہ تعالیٰ: سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہر اس شے سے پاک ہے جس کے ساتھ وہ اسے متصف کرتے ہیں کہ وہ قیامت قائم کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، اور یہ اس لئے ہے کہ وہ کہتے تھے: کوئی بھی مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، پس وہ اللہ تعالیٰ کو اس عجز کے ساتھ متصف کرتے تھے جس کے ساتھ صرف اور صرف مخلوق کو متصف کیا جا سکتا ہے، اور یہ شرک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی اس کی ذات ان کے شریک ٹھہرانے سے پاک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما بمعنی الذی ہے، یعنی وہ ذات جو ان سے بلند ہے جنہوں نے اس کے ساتھ شرک کیا۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ، جلد 2، صفحہ 406

”اتارتا ہے فرشتوں کو روح (یعنی وحی) کے ساتھ اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے کہ خبر دار کرو (لوگوں کو) کہ نہیں کوئی معبود سوائے میرے پس مجھ سے ہی ڈرا کرو“۔

مفضل نے عاصم سے تَنَزَّلُ الملائکۃُ پڑھا ہے اور یہ اصل میں تتنزّل تھا، پس فعل کو ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور کسائی نے ابوبکر سے اور انہوں نے عاصم سے اس سے مختلف قرأت کی ہے، اور اعمش نے تُنُزِّلَ الملائکۃُ فاعل کا ذکر کئے بغیر (فعل مجہول) پڑھا ہے۔ اور جعفی نے ابوبکر سے اور انہوں نے عاصم سے نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ نون کے ساتھ اور فعل معروف کے ساتھ قرأت کی ہے، اور باقیوں سے يُنَزِّلُ یا اور فعل معروف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے اسم کے لئے ہے۔ اور حضرت قتادہ سے نُنْزِلُ الملائکۃ نون اور تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ اور اعمش نے تَنْزِلُ تا کے فتحہ اور زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ نزول سے ماخوذ ہے۔ اور الملائکۃُ مرفوع ہے جیسا کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ میں ہے۔ بِالرُّوْحِ یعنی وحی کے ساتھ اور وہ نبوت ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اس کی نظیر يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (غافر: 15) ہے۔ ربیع بن انس نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے کلام کے ساتھ اور وہ قرآن کریم ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس حق کا بیان ہے جس کی اتباع اور پیروی واجب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد مخلوق کی ارواح ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ کوئی فرشتہ نہیں اترتا مگر اس کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جیسا کہ ابن آدم کی صورتیں اور شکلیں ہیں، اور آسمان سے کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ان میں سے ایک ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: رحمت کے ساتھ (یعنی ملائکہ کو رحمت کے ساتھ اتارتا ہے) یہ حسن اور قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہدایت کے ساتھ، کیونکہ دل اس کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں جیسا کہ بدن ارواح کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں (1)، اور یہی معنی زجاج کے قول کا ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: روح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے امر کی طرف ارشاد اور ہدایت سے حیات ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہاں روح سے مراد حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ بِالرُّوْحِ میں با بمعنی مع ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: خرج بثیابہ، ای مع ثیابہ (وہ اپنے کپڑوں کے ساتھ نکلا)۔ مِنْ اَمْرِهٖ، ای بأمرہ (اپنے حکم کے ساتھ)۔ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ یعنی ان پر جنہیں اللہ تعالیٰ نبوت کے لئے منتخب فرمالے۔ یہ ان کے اس قول کا رد ہے: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف) (کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو دو شہروں میں بڑا ہے)۔

اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ یہ بتوں کی عبادت سے تحذیر اور ڈرانا ہے، اور اسی لئے انذار کا لفظ آیا ہے، کیونکہ اس کا اصل معنی اس سے ڈرانا اور آگاہ کرنا ہے جس سے ڈرا جاتا ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ: فَاتَّقُوْنِ دلالت کر رہا ہے۔ اور اَنْ (یعنی اس کے ساتھ کہ تم کافروں کو اس بارے خبر دار کرو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں)۔ پس اَنْ حرف جر کے ساقط ہونے کے ساتھ محل نصب میں ہے یا اس پر انذار کے وقوع کے سبب (یہ محل نصب میں ہے)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 178

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

''اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ وہ برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یعنی زوال اور فناء کے لئے (زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِالْحَقِّ یعنی اپنی قدرت پر دلالت کرنے کے لئے، اور یہ کہ بندے اس کی طاعت کرتے ہوئے عبادت کریں اور یہ کہ وہ موت کے بعد مخلوق کو زندہ کر سکتا ہے۔ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی وہ برتر ہے ان بتوں سے جو کسی چیز کو پیدا کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝

''اس نے پیدا فرمایا انسان کو نطفہ سے پس اب وہ برملا جھگڑالو بن گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر دلیل ذکر فرمائی تو اس کے بعد انسان، اس کی درشتیوں، مشقتوں اور ایک حالت سے دوسری کی طرف تجاوز کرنے کا ذکر کیا۔ الْاِنْسَانَ یہ اسم جنس ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد ابی بن خلف جمحی ہے، وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند بوسیدہ ہڈیاں لے کر آیا اور کہا: کیا آپ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کرے گا اس کے بعد کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں، گل سڑ چکی ہیں؟ اور اسی بارے میں یہ آیت بھی نازل ہوئی: اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ (یٰسٓ) (کیا انسان (اس حقیقت کو) نہیں جانتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے پس اب وہ (ہمارا) کھلا دشمن بن بیٹھا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس پانی سے تخلیق فرمایا جو آدمی کی صلب اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے، پھر اسے مختلف ہیئتوں میں منتقل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس حیثیت سے پروان چڑھتا ہے کہ امور میں جھگڑا کرنے لگتا ہے، پس کلام کا معنی انسان کے بارے میں تعجب کا اظہار کرنا ہے وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ (یٰسین: 78) (اور بیان کرنے لگا ہے ہمارے لئے (عجیب وغریب) مثالیں اور اس نے فراموش کر دیا اپنی پیدائش کو) اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ یعنی مخاصم جھگڑا کرنے والا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے نسیب بمعنی مناسب ہے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی قدرت کے بارے میں جھگڑتا ہے۔ اور مُّبِيْنٌ یعنی اس کا جھگڑنا بالکل ظاہر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی طرف سے باطل کے ساتھ جھگڑنے کا اظہار کرتا ہے۔ اور الْمُبِيْنُ سے مراد وہ ہے جو اپنے کلام کے ساتھ اس کی وضاحت کرنے والا ہو جو اس کے دل میں چھپا ہوا اور پوشیدہ ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝

''نیز اس نے جانوروں کو پیدا کیا تمہارے لئے ان میں گرم لباس بھی ہے اور دیگر فائدے ہیں اور انہیں (کا گوشت) تم کھاتے ہو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کا ذکر کیا تو پھر اس کا ذکر کیا جس کے

ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرمایا اور الْاَنْعَامَ سے مراد اونٹ، گائیں اور بکریاں ہیں۔ اور نَعم اور انعام کے الفاظ اکثر اونٹوں کے لئے بولے جاتے ہیں، اور یہ مجموعہ کے لئے بولے جاتے ہیں اکیلے بکریوں کے لئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا (1)۔

حضرت حسان نے کہا ہے:

عفت ذاتُ الأصابع فالجِوَاءُ إلى عَذْراءَ منزِلُها خلاءُ

دِيارٌ من بَنِي الحَسْحاس قَفْرٌ تُعَفِّيها الروامِسُ والسماء

وكانت لايزال بها أنيس خِلال مُرُوجها نَعَمٌ وشاءُ

پس اس میں نَعَم سے مراد صرف اونٹ ہیں۔ اور جوہری نے کہا ہے: النَّعَم الأنعام کی واحد ہے اور اس سے مراد چرنے والا مال ہے، اور اکثر اوقات اس اسم کا اطلاق اونٹوں پر ہوتا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: هذا نعم وارد (یہ اونٹ آ رہا ہے)، اور اس کی جمع نُعمان آتی ہے جیسا کہ حَمَل اور اس کی جمع حُمْلان آتی ہے۔ اور الأنعام مذکر بھی آتا ہے اور مونث بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ (النحل: 66) اور دوسرے مقام پر فرمایا: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا (المومنون: 21) اور الانعام، الانسان پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یا پھر فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: دِفْءٌ، الدف کا معنی السخانة (گرم ہونا) ہے (2)، اور اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ گرمائش حاصل کی جاتی ہے یعنی ان کی اون سے، اونٹوں کے بالوں سے اور دیگر جانوروں کے بالوں سے یعنی لباس، لحاف اور کمبل وغیرہ (بنا کر ان سے گرمائش حاصل کی جاتی ہے)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: دفؤها سے ان کی نسل مراد ہے (3)۔ واللہ اعلم۔

علامہ جوہری نے صحاح میں کہا ہے: الدفء سے مراد اونٹ کا بچے جننا، ان کا دودھ دینا اور دیگر منافع جو ان سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ اور حدیث میں ہے لنامن دِفئهم ما سلموا بالميثاق (ہمارے لئے ان کے اونٹوں میں سے وہ ہیں جو انہوں نے معاہدہ کے ساتھ حوالے کئے) اور الدفء کا معنی السخونة (گرم ہونا) بھی ہے، اس معنی میں تو کہتا ہے: دَفِئَ الرجل دَفَاءَةً جیسا کہ كَرِهَ كراهة ہے۔ (آدمی نے گرمی محسوس کی)۔ اور اسی طرح دَفِئَ اور دَفَأ ہے مثلاً ظَمِئَ اور ظمأ ہے۔ اور اسم الدِّفْءُ (کسرہ کے ساتھ) ہے اس سے مراد وہ شے ہے جو تجھے گرمائش پہنچائے، اور اس کی جمع الأدفاء ہے۔ آپ کہتے ہیں: ماعليه دِفْءٌ (اس پر گرم لباس نہیں ہے) کیونکہ یہ اسم ہے۔ اور آپ یہ نہیں کہتے: ماعليك دَفَاءَة، کیونکہ یہ مصدر ہے۔ اور آپ کہتے ہیں: اقعد فی دِفْء هذا الحائط ای كِنّه (آپ اس دیوار کے پردے میں بیٹھیں)۔ اور رجل دَفِئٌ علی فَعِلٍ جب وہ ایسا لباس پہنے جو اسے گرمی پہنچائے۔ اور اسی طرح

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 379 2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 179

3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1140

رجل دفآن اور امرأۃ دفاء ہے۔ اور تحقیق أدفأہ الثوب (کپڑے نے اسے گرمائش دی) وتدفأ ھو بالثوب (اس نے کپڑے کے ساتھ گرمائش حاصل کی) واستدفأ بہ، اور ادفأبہ اور یہ باب افتعال ہے، یعنی اس نے وہ لباس پہنا جو اسے گرمی پہنچاتا ہے۔ اور دَفُؤت لیلتنا (ہماری رات گرم ہوگئی) وھو یوم دفِیٔ (اور وہ گرم دن ہے) یہ فعیل کے وزن پر ہے۔ اور لیلۃ دفیئۃ، (گرم رات) اور اسی طرح کپڑا اور گھر ہے۔ اور المدفِئۃ بہت زیادہ اونٹ، کیونکہ وہاں بعض بعض کو اپنی سانسوں کے ساتھ گرمی پہنچاتے ہیں، اور کبھی اسے مشدد پڑھا جاتا ہے اور المُدْفَاۃ وہ اونٹ جس کے بال اور چربی بہت زیادہ ہو، یہ اصمعی سے منقول ہے۔

اور شماخ نے شعر بیان کیا ہے:

وکیف یَضِیعُ صاحبُ مُدْفآتٍ علی أثْبَاجِھن مِن الصَّقِیعِ

قولہ تعالیٰ: وَّ مَنَافِعُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: المنافع سے مراد ہر جانور کی نسل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد سوار ہونا، بوجھ اٹھانا، دودھ، گوشت اور گھی وغیرہ ہیں۔ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ صرف کھانے کی منفعت ذکر کی گئی ہے کیونکہ یہ تمام منافع میں سے عظیم منفعت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم ذبح کے وقت ان کا گوشت کھاتے ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت اون کا لباس پہننے پر دلیل ہے (1)؛ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ سے قبل دیگر انبیاء علیہم السلام جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ نے اس کا لباس پہنا ہے۔ اور حدیث مغیرہ میں ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا چہرہ مبارک دھویا اور اون کا بنا ہوا شامی جبہ پہنے ہوئے تھے اس کی آستینیں تنگ تھیں...... الحدیث، اسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ متقی لوگوں کا شعار اور علامت ہے، صالحین کا لباس ہے، صحابہ کرام اور تابعین کا حسن ہے، اور زہاد اور عارفین کی پسند ہے، اور وہ نرم، سخت (کھردرا)، عمدہ، درمیانہ اور ردی (گھٹیا) سبھی قسم کا لباس پہنتے ہیں، اور اسی کی طرف لوگوں میں سے صوفیہ کی جماعت منسوب ہے، کیونکہ اکثر ان کا لباس یہی ہوتا ہے۔ پس (صوفیہ میں) یا نسبت کی ہے اور ھا تانیث کے لئے ہے (2)۔ ان کے بعض اشیاخ نے مجھے بیت المقدس طہرہ اللہ کے یہ شعر بیان کئے ہیں:

تشاجر النّاسُ فی الصوفیّ واختلفوا فیہ وظنوہ مشتقاً من الصوف (3)

لوگوں نے صوفی کے بارے میں باہم جھگڑا کیا اور ان کا اس بارے میں اختلاف ہوا اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہ الصوف سے مشتق ہے۔

ولست انحلُ ھذا الاسمَ غیرفتیً صَافَیٰ فصُوفِیَ حتی سُمّیَ الصوفی (4)

اور میں یہ نام اس جوان کے بغیر کسی کو نہیں دیتا جو خود خالص اور پاک ہوا اور اسے پاک صاف کیا گیا یہاں تک کہ اسے صوفی کا نام دے دیا گیا۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1140 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝

"اور تمہارے لئے ان میں زیب وزینت بھی ہے جب تم شام کو (چرا کر) انہیں گھر لاتے ہو اور جب تم صبح ان کو چرانے لے جاتے ہو۔"

الجمال وہ شے جس سے خوبصورتی اور زیب وزینت حاصل کی جائے۔ اور الجمال کا معنی حسن ہے۔ اور جمُل الرجل (ضمہ کے ساتھ) جمالاً فهو جميل (آدمی حسین ہوا)، اور المرأة جميلة (عورت حسین ہے) اور جملاء بھی صفت آتی ہے۔ یہ کسائی سے منقول ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

فهي جَمْلاء كبدرٍ طالع بَذّت الخلقَ جميعا بالجمال

اور ابوذؤیب کا قول ہے:

جمالكَ ايها القلبُ القريح

مراد یہ ہے: تو اپنے حسن وجمال اور اپنے حیاء کو لازم پکڑ اور بری اور قبیح جزع فزع نہ کر۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پس حسن وجمال صورت اور ترکیب اعضاء میں ہوتا ہے، اور اخلاق باطنہ میں ہوتا ہے (1)، اور افعال میں ہوتا ہے، پس جہاں تک خلقت اور صورت کے حسن وجمال کا تعلق ہے تو وہ ایسا امر ہے جس کا ادراک آنکھ کر سکتی ہے اور اسے نرمی اور ملائمت کے ساتھ دل کی طرف متوجہ کر سکتی ہے، اور اس کے چہرے کی پہچان کے بغیر اور انسانوں میں سے کسی کی طرف اس کی نسبت کے بغیر نفس اس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔ اور رہا اخلاق کا جمال تو یہ صفات محمودہ کی بنا پر ہوتا ہے مثلاً علم، حکمت ودانائی، عدل، پاکدامنی، غصہ کو پی جانا، اور ہر ایک کے لئے خیر کا ارادہ کرنا اور جہاں تک افعال کے جمال کا تعلق ہے تو اس کا وجود مخلوق کے مصالح اور منافع کے لئے ملائمۃ اور نرمی اختیار کرنے اور ان میں جلب منافع کے فیصلے کرنے اور ان سے شر اور برائی کو دور کرنے سے ہوتا ہے۔ اونٹوں اور چوپاؤں کا جمال جمال خلقت میں سے ہے، اور وہ آنکھوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور دیکھنے والوں کے موافق ہوتا ہے۔ اور ان کے حسن وجمال میں سے ان کا کثیر ہونا ہے اور لوگ جب انہیں دیکھیں تو ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ فلاں کے جانور ہیں؛ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور اس لئے کہ جب وہ شام کو چر کر واپس آتے ہیں تو ان کا حسن زیادہ ہو چکا ہوتا ہے، ان کی شان عظیم ہو جاتی ہے، اور دل ان کے ساتھ معلق ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت چرنے کے سبب ان کا موٹاپا اور ان کے کھیر دودھ کے سبب بڑھے ہوئے ہوتے ہیں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اسی معنی کی وجہ سے رواح (شام کے وقت واپس آنا) کو سراح (صبح کے وقت چرانے کے لئے لے جانا) پر مقدم کیا ہے کیونکہ ان کا دودھ اور ان کے سبب نفس کا سرور اس حالت میں مکمل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ (النحل) اور یہ مویشیوں میں اس وقت ہوتا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1141

ہے جب وہ چراگاہ کی طرف آتے جاتے ہوں (1)۔ اور الرواح شام کے وقت چراگاہ سے واپس لوٹنا ہوتا ہے اور سراح صبح کے وقت اس کی طرف جانا ہوتا ہے، تو کہتا ہے: سرحت الابل أسرحها سرحا و سروحا جب تو صبح کے وقت اونٹ کو چراگاہ کی طرف لے جائے اور اسے چھوڑ دے، وسرحت یہ متعدی اور لازم دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی میں ہے۔

وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۟ۙ

اور (یہ جانور) اٹھالے جاتے ہیں تمہارے بوجھ ان شہروں تک جہاں تم نہیں پہنچ سکتے مگر سخت مشقت سے، بے شک تمہارا رب بہت مہربان (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ، الأثقال سے مراد لوگوں کے بوجھ ہیں مثلاً ساز و سامان، اور اناج وغیرہ۔ اور یہی وہ ہے جسے اٹھانا انسان پر بھاری اور بوجھل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے بدن ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۟ۙ (الزلزلہ) (اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو) اور عکرمہ کے قول کے مطابق البلد سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عموم پر محمول ہے (2) ہر اس شہر کے بارے میں جس کے لئے خشکی کا راستہ ہے۔ اور شق الانفس سے مراد ان کی مشقت اور ان کی غایۃ جُهد ہے۔ قرأت عامہ شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الشق کا معنی مشقت ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اور یہ کبھی مفتوح ہوتا ہے، اسے ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: شِقّ میں شین کے کسرہ اور اس کے فتحہ دونوں باہم متقارب ہیں، اور دونوں مشقت کے معنی میں ہیں اور یہ الشق فی العصا و نحوها سے ماخوذ ہے۔ (ڈنڈے میں مشقت ہے) کیونکہ اس سے انسان سے پائی جانے والی مشقت کی مثل مشقت پائی جاتی ہے۔ اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابوجعفر نے اِلَّا بِشَقِّ الْاَنْفُسِ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں، مثلاً رِقّ و رَقّ اور جِصّ و جَصّ اور رِطل و رَطل ہیں۔

اور شاعر کا قول شین کے کسرہ اور اس کے فتحہ دونوں کے ساتھ آتا ہے:

وذی إبل یَسْعَی و یحسبها له ۔۔۔ أخِی نَصَب من شقها و دؤوب

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر کے معنی میں ہو، یہ شققت علیه أشُقّ شَقًّا (میں نے اسے مشقت میں ڈال دیا) سے ماخوذ ہے۔ اور الشق کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی نصف بھی ہے، کہا جاتا ہے: أخذتُ شِق الشاة و شقة الشاة۔ (میں نے بکری کا نصف لیا) اور کبھی آیت سے یہ معنی مراد ہوتا ہے، یعنی تم اس تک پہنچنے والے نہیں ہو مگر قوت کے نقصان کے ساتھ اور اس سے نصف ختم کرنے کے ساتھ، یعنی تم اس تک نہیں پہنچ سکتے مگر اپنی نصف قوت کے ساتھ اور دوسرا نصف ختم کرنے کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1141
2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 180

ساتھ اور الشِقِ کا معنی پہاڑ کا کنارہ بھی ہے۔ اور ام زرع کی حدیث میں ہے: وجدنی فی اهل غُنیمه بشق (اس نے مجھے پہاڑ کے کنارے اہل غنیمہ میں پالیا)۔ ابوعبید نے کہا ہے: یہ جگہ کا نام ہے۔ اور الشق کا معنی الشقیق بھی ہے، کہا جاتا ہے: هو أخی و شق نفسی (وہ میرا بھائی ہے اور میری جان کا حصہ ہے)۔ اور شِقّ عرب کے کاہنوں میں سے ایک کاہن کا نام ہے۔ اور الشق کا معنی الجانب (طرف) بھی ہے۔

اور اس معنی میں امرء القیس کا قول ہے:

إذا ما بَکیٰ مِن خَلفِها انصرفَتْ له — بشِقٍّ و تحتِی شِقُّها لم یحوّل

پس یہ لفظ کئی معنوں میں مشترک ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عمومی جانوروں کے ساتھ احسان فرمایا ہے، لیکن یہاں بوجھ اٹھانے میں صرف اونٹ کے ذکر کو تمام جانوروں پر فوقیت اور خصوصیت دی ہے، کیونکہ بکریاں چرنے کے لئے جانے اور ذبح کے لئے ہیں، اور گائیں ہل جوتنے کے لئے ہیں، اور اونٹ بوجھ اٹھانے کے لئے ہیں (1)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (2) انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اثنا میں کہ ایک آدمی اپنی گائے ہانک کر لے جا رہا تھا اور اس نے اس پر بوجھ لاد دیا تو وہ گائے اس کی طرف متوجہ ہوئی اور کہا: بلاشبہ مجھے اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ مجھے تو ہل جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو لوگوں نے تعجب اور گھبراہٹ کی حالت میں کہا: سبحان اللہ؟ کیا یہ گائے باتیں کر رہی ہے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک میں، ابوبکر اور عمر اس کی تصدیق کرتے ہیں۔'' تو یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ گائے پر نہ بوجھ لادا جا سکتا ہے اور نہ اس پر سوار ہوا جا سکتا ہے، بلکہ وہ ہل جوتنے کے لئے، کھانے کے لئے، نسل کشی کے لئے اور دودھ دینے کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جانوروں کے ساتھ سفر کرنا اور ان پر بوجھ لادنا جائز ہے، لیکن اتنی مقدار میں جسے وہ برداشت کر سکتے ہوں، بوجھ حد سے بڑھا ہوا نہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ چال میں نرمی ہو (3)۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نرمی برتنے، انہیں راحت اور سکون پہنچانے اور ان کے چارے اور ان کے پانی کو تلاش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے (4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم خوشحالی (اور شادابی) میں سفر کرو تو اپنے اونٹ کو زمین سے اس کا حصہ دو (یعنی اسے چرنے دو) اور جب تم قحط سالی میں سفر کرو تو پھر اسے اس کی منزل پر پہنچانے میں جلدی کرو۔'' اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں ابوعبید سے اور انہوں نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے۔ اور معاویہ بن قرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا ایک اونٹ تھا اس کو دمون کہا جاتا تھا، تو آپ اسے کہتے تھے: اے دمون! تو اپنے رب کے پاس میرے ساتھ جھگڑا نہ کرنا۔ پس جانور تو گونگے (بے زبان) ہیں یہ اس کی قدرت نہیں رکھتے کہ وہ بذات خود اس شے کا حیلہ کریں جس کے وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1143 — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً — 4۔ ایضاً

محتاج ہوتے ہیں، اور نہ وہ یہ قدرت رکھتے ہیں کہ وہ اپنی حاجات کو کھلے بیان کر سکیں، پس جس نے ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا پھر اس نے ان کی ضروریات وحاجات کو ضائع کر دیا تو اس نے شکر ضائع کر دیا اور خصومت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ہوگی۔ اور مطر بن محمد نے بیان کیا ہے، ابوداؤد نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا ہمیں ابن خالد نے بیان کیا اس نے کہا ہمیں مسیب بن آدم نے بیان کیا اس نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا آپ نے ایک ساربان کو مارا اور فرمایا: تو اپنے اونٹ پر اتنا بوجھ لادتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا......؟

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ⑧

''اور اس نے پیدا کئے گھوڑے اور خچر اور گدھے تا کہ تم ان پر سواری کرو اور (تمہارے لئے ان میں) زینت ہے اور پیدا فرمائے گا ایسی سواریوں کو جو تم نہیں جانتے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَّالْخَيْلَ یہ نصب کے ساتھ ہے اور معطوف ہے، یعنی و خلق الخیل (اور اس نے گھوڑے پیدا کئے) اور ابن ابی عبلہ نے وَّالْخَيْلُ وَالْبِغَالُ وَالْحَمِيْرُ ان تمام کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور گھوڑے کو خیل کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس کی چال میں اکڑ اور تکبر ہوتا ہے۔ اور خیل کا واحد خائل ہے، جیسا کہ ضائن، ضأن کا واحد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا کوئی واحد نہیں۔ اور یہ پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے، اور ہم نے وہاں احادیث ذکر کی ہیں۔ اور جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا الگ ذکر کیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ الانعام کے تحت داخل نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے تحت داخل ہیں لیکن انہیں الگ اور منفرد اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رکوب (سوار ہونا) ان کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، کیونکہ یہ عمل گھوڑوں، خچروں اور گدھوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں جانوروں اور چوپاؤں کا مالک بنایا ہے اور انہیں ہمارے لئے مطیع کر دیا ہے، اور ہمارے لئے انہیں مسخر کرنا اور ان سے نفع اٹھانا مباح قرار دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے رحمت ہے، اور حیوانوں میں سے جس کا انسان مالک ہے اسے مسخر کرنا (مطیع بنانا) اس کے لئے جائز ہے اور اس کو کرائے پر دینا بھی اس کے لئے جائز ہے اس پر اہل علم کا اجماع ہے، ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اونٹوں اور چوپاؤں کے کرائے کا حکم کتب فقہ میں مذکور ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جانوروں اور اونٹوں پر بوجھ لادنے اور ان کے ساتھ سفر کرنے کے لئے ان کا کرایہ لینے میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ الآیہ۔ اور علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ ایک آدمی اپنا جانور اور سواری (اونٹ) ایک معین شہر تک کرائے پر دے اگر چہ وہ یہ ذکر نہ کرے کہ وہ کہاں اس سے اترے گا، اور کتنے گھاٹ ہیں جن پر وہ (اسے پانی پلانے کے لئے) اترے گا، اور اس کے چلنے کی رفتار کیسے ہوگی، اور کتنی بار وہ اپنے راستے میں اترے گا، اور انہوں نے اس بارے میں اس کی اجازت دی ہے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ ہمارے علماء نے کہا

ہے: اور کرائے پر دینا قائم مقام بیوع (خرید و فروخت) کے ہوتا ہے ان چیزوں میں جو حلال ہوتی ہیں اور حرام ہوتی ہیں (یعنی حلال و حرام ہونے میں حکم بیوع کا ہے جن کی بیع حلال ہے انہیں اجرت پر دینا بھی حلال ہے اور جن کی بیع حرام ہے انہیں اجرت پر دینا بھی حرام ہے۔) ابن القاسم نے کہا ہے: جس کسی نے جانور ایک معین جگہ تک ہروی کپڑے کے عوض کرائے پر لیا اور کپڑے کی اصل حقیقت (کوالٹی) اور اس کی پیائش بیان نہ کی، تو یہ جائز نہیں، کیونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بیع میں اسے جائز قرار نہیں دیتے، اور وہ کرائے کے ثمن میں جائز قرار نہیں دیتے ہیں مگر وہی چیز جو بیع کے ثمن میں جائز ہوتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ، کیونکہ یہ اجارہ ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم میں سے وہ جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے کوئی جانور کرائے پر لیا تاکہ وہ اسے اس پر دس قفیز گندم لادے گا پس اس نے اس پر اتنا بوجھ ہی لادا جس کی شرط لگائی پھر وہ جانور ضائع ہو گیا، ہلاک ہو گیا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اور اسی طرح حکم ہے اگر اس نے اس پر دس قفیز جو لاد دیئے۔ اور انہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے جانور کرائے پر لیا کہ وہ اس پر دس قفیز لادے گا پھر اس نے اس پر گیارہ قفیز لاد دیئے، تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ابو ثور رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں کہتے ہیں: وہ جانور کی قیمت کا ضامن ہوگا اور اس پر کرایہ بھی ہوگا۔ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے: اس پر اس کی قیمت ہوگی اور اس پر اجرت نہ ہوگی۔ اور اس میں تیسرا قول یہ ہے..... کہ اس پر کرایہ ہوگا اور اس پر اجرت میں سے ایک جز ہوگا اور جانور کی قیمت میں سے اس مقدار کے عوض ایک جز ہوگا جتنی مقدار معینہ بوجھ سے زائد لادی اور یہ حضرت نعمان رحمۃ اللہ علیہ، یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ابن القاسم صاحب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس پر کوئی ضمان نہ ہوگی جبکہ زائد قفیز جانور کے لئے باعث مشقت نہ ہو، اور یہ معلوم ہو کہ اس کی مثل سے جانور ہلاک نہیں ہو سکتا، اور جانور کے مالک کے لئے پہلے کرائے کے ساتھ ساتھ زائد قفیز کی اجرت بھی ہوگی، کیونکہ اس کا ہلاک ہونا اس زیادتی کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور یہ مسافت میں مقررہ حد سے تجاوز کر جانے کے خلاف ہے، کیونکہ مسافت میں تجاوز کرنا مکمل طور پر تعدی اور زیادتی ہے لہٰذا وہ ضامن ہوگا جب جانور ہلاک ہو جائے چاہے وہ تجاوز قلیل مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں۔ اور مشروط بوجھ پر زیادتی میں اجازت اور تعدی دونوں چیزیں جمع ہیں، پس جب زیادتی ایسی ہے جس کی مثل سے جانور کی ہلاکت نہیں ہو سکتی تو اس سے معلوم ہو گیا کہ اس کی ہلاکت اس سے ہوئی جس کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور اہل علم نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو معلوم اجرت کے عوض مقررہ جگہ تک ایک جانور کرائے پر لیتا ہے، پھر وہ تعدی کرتا ہے اور اس مقررہ جگہ سے تجاوز کر جاتا ہے پھر لوٹ کر اس جگہ کی طرف آتا ہے جس کی اجازت دی گئی ہے (تو) اس کی طرف لوٹنے میں اختلاف ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب اس نے اس معین جگہ سے تجاوز کر لیا تو وہ اس کا ضامن ہو گیا اور اس تعدی میں اس پر کرایہ نہیں ہوگا: اسی طرح ثوری نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس کے لئے مقررہ مسافت کی اجرت ہوگی، اور جو مقرر نہیں اس کی اجرت نہ ہوگی، لیکن چونکہ اس نے (وعدہ کا) خلاف کیا ہے لہٰذا وہ ضامن ہوگا، اور یہی یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

ہے: اس پر اس کا کرایہ ہوگا جو مسافت مقرر تھی، اور اس کا کرایہ مثلی ہوگا جتنا اس نے تجاوز کیا، اور اگر جانور ہلاک ہوگیا تو اس کی قیمت لازم ہوگی، اسی طرح فقہائے سبعہ نے کہا ہے، اہل مدینہ کے مشائخ نے کہا ہے: جب وہ مقررہ مسافت تک پہنچ جائے پھر اس سے آگے نکل جائے تو اس پر اس زائد مسافت کا کرایہ ہوگا اگر وہ جانور محفوظ رہا اور اگر وہ ہلاک ہوگیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔ اور امام احمد، اسحاق اور ابوثور نے کہا ہے: اس پر کرایہ اور ضمان دونوں ہوں گے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور یہی ہم بھی کہتے ہیں۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: جب وہ اس جگہ کی حد تک پہنچ جائے جہاں تک اس نے جانور کرائے پر لیا تھا پھر وہ ایک میل یا کئی میل یا بہت زیادہ آگے گزر گیا اور جانور ہلاک ہوگیا، تو اس کے مالک کے لئے پہلا کرایہ ہوگا اور جہاں تک زائد آگے چلا گیا ہے اس کا کرایہ لینے میں اسے اختیار ہوگا یا پھر جانور کی وہ قیمت لے لے جو تعدی اور زیادتی بنتی ہے۔ ابن المواز نے کہا ہے: تحقیق یہ بھی روایت ہے کہ وہ اس کا ضامن ہوگا اگرچہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھے۔

ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے میل اور اس طرح کے پیمانے کی زیادتی کی صورت میں کہا ہے: اور رہی وہ مسافت (زیادتی) جس کو لوگ ایک مرحلہ کے برابر قرار دیتے ہیں تو وہ ضامن نہ ہوگا۔ اور ابن حبیب نے ابن ماجشون اور اصبغ سے بیان کیا ہے: جب زیادتی تھوڑی ہو یا وہ اس مقررہ حد سے تھوڑا سا تجاوز کر جائے جو اس نے کرایہ پر لی تھی اور وہ مر جائے یا اس جگہ تک پہنچنے والے راستے میں مر جائے جہاں تک اس نے اسے کرائے پر لے رکھا تھا، تو اس کے لئے زیادتی کے کرائے کے سوا کچھ نہیں ہوگا، جیسا کہ اس کا اس مال کو لوٹانا جو اس نے ودیعت سے قرض لے رکھا تھا۔ اور اگر اس نے بہت زیادہ زیادتی کی جس میں اتنے زیادہ دن ٹھہرا رہا جس کی مثل میں اس کی چال بدل سکتی ہے تو وہ ضامن ہوگا، اسی طرح حکم ہے اگر جانور مقررہ حد سے تجاوز کرنے یا سفر کرنے کے درمیان مر گیا، کیونکہ جب زیادتی اتنی تھوڑی ہو جس کے بارے یہ جانا جا سکتا ہو کہ یہ اس کے قتل پر معاون و مددگار نہیں ہے اور اس کی ہلاکت معینہ جگہ تک واپس لوٹنے کے بعد ہوئی تو یہ بالیقین اس مال کی ہلاکت کی طرح ہے جو اس نے مال ودیعت سے قرض لیا تھا اور اس کے لوٹانے کے بعد وہ ہلاک ہوگیا۔ اور اگر زیادتی زیادہ ہو تو پھر وہ زیادتی اس کے قتل اور ہلاک ہونے میں معاون ہوگی۔ (لہٰذا اس پر ضمان ہوگی۔)

مسئلہ نمبر 5۔ ابن القاسم اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً پس اس نے انہیں سواری اور زیب و زینت کے لئے بنایا ہے اور انہیں کھانے کے لئے نہیں بنایا ہے: اور اسی طرح اشہب سے بھی منقول ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا ہے: گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے سواری اور زیب و زینت پر نص بیان کر دی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ جو اس کے سوا ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ اور الانعام کے ذکر میں فرمایا: وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (النحل) اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سے گرم لباس اور دیگر منافع کے ذکر کے ساتھ بھی احسان فرمایا۔ پس ان میں ذبح کو مشروع قرار دے کر ان کا کھانا ہمارے لئے مباح قرار دیا۔ اور اسی آیت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حکم بن عتیبہ نے استدلال کیا ہے، حکم نے کہا ہے: گھوڑوں کا گوشت کتاب اللہ میں حرام ہے، اور انہوں نے یہ اور اس سے پہلے والی آیت پڑھی اور کہا: یہ

کھانے کے لئے ہے اور یہ سواری کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے گھوڑے کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے اسے مکروہ قرار دیا، اور آپ نے یہی آیت تلاوت کی اور فرمایا: یہ سواری کے لئے ہے، اور آپ نے وہ آیت پڑھی جو اس سے پہلے ہے وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ پھر فرمایا: یہ کھانے کے لئے ہے۔ اور اسی طرح امام مالک، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، اوزاعی، مجاہد اور ابوعبید رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے کہا ہے، اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد، نسائی اور دارقطنی وغیرہم نے صالح بن یحییٰ بن مقدام بن معد یکرب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گھوڑوں، خچروں، گدھوں، تمام چیر پھاڑ کرنے والے درندوں اور پنجوں کے ساتھ شکار کرنے والے پرندوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا(1)۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔

اور نسائی نے بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانا حلال نہیں ہے۔'' اور جمہور فقہاء و محدثین نے کہا ہے: یہ مباح ہے۔ اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور ایک گروہ علیحدہ ہو گیا ہے اور اس نے تحریم کا قول کیا ہے، ان میں سے ایک حکم ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ ان سے تین روایات رویانی نے ''بحر المذہب علی مذہب الشافعی'' میں بیان کی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح مذہب جس پر نظر و فکر اور خبر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ گھوڑوں کا گوشت کھانا جائز ہے، اور رہی آیت اور حدیث تو ان دونوں میں حجت لازمہ نہیں ہے، جہاں تک آیت کا تعلق ہے تو اس میں گھوڑوں کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اگر آیت اس پر دلالت کرے تو پھر یقیناً گدھوں کے گوشت کے حرام ہونے پر بھی دلالت کرے، اور یہ سورۃ مکی ہے، اور پھر کون سی حاجت اور ضرورت تھی کہ غزوہ خیبر کے سال گدھوں کے گوشت کو حرام قرار دینے کی تجدید ہوئی حالانکہ اخبار میں گھوڑوں کا حلال ہونا ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان آرہا ہے، اور یہ بھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے الانعام کا ذکر کیا، تو ان کے اغلب اور اہم ترین منافع کا بھی ذکر کیا، اور وہ بوجھوں کو اٹھانا اور (ان کا گوشت) کھانا ہے، اور ان کے ساتھ سوار ہونے اور ہل جوتنے کا ذکر نہ کیا اور نہ علاوہ ازیں کسی کی تصریح کی، حالانکہ ان پر سوار بھی ہوا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ہل بھی چلایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (غافر) اور گھوڑوں کے بارے میں فرمایا: لِتَرْكَبُوْهَا وَزِیْنَةً اور ان کے بھی اغلب منافع ذکر کئے اور جو ان سے مقصود ہے وہ ذکر کیا، اور ان پر بوجھ لادنے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہ ان پر لادا جاتا ہے جیسا کہ عام مشاہدہ ہے اور اسی طرح ان کے کھانے کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت کی جسے اس کا بیان بنایا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی اکل لحوم الخیل، حدیث نمبر 3296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب لحوم البغال، حدیث نمبر 3188، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس سے کہ انہیں سواری اور زیب وزینت کے لئے پیدا کیا گیا ہے یہ لازم نہیں آتا کہ انہیں نہ کھایا جائے، پس اس گائے کو اس کے اس خالق نے قوت گویائی عطا فرمائی جس نے ہر شے کو بولنے کی طاقت دی پس اس نے کہا: بے شک اسے ہل جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تو اس سے اس پر یہ لازم آتا ہے جس نے یہ علت بیان کی ہے کہ گھوڑوں کا گوشت نہیں کھایا جائے گا کیونکہ انہیں سواری کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ گائے کا گوشت بھی نہ کھایا جائے کیونکہ اسے ہل جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

حالانکہ مسلمانوں نے اس کے کھانے کے جواز پر اجماع کیا ہے، پس اسی طرح گھوڑے بھی ہیں اور ان کے بارے سنت ثابتہ موجود ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور گھوڑوں کے گوشت کے بارے میں اجازت عطا فرمائی (1)۔ اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خیبر کے دن گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور آپ نے گدھوں کے گوشت سے ہمیں منع فرمایا (2)۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے اسے خیبر کے دن کھایا یہ حال کی حکایت ہے اور آنکھوں دیکھا فیصلہ ہے، پس اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ضرورت کے تحت ذبح کئے ہوں، اور مخصوص احوال کے تحت جو فیصلے کئے جائیں ان سے استدلال نہیں کیا جا سکتا (3)۔ تو ہم کہیں گے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے اور آپ کی جانب سے یہ خبر دی جا رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں گھوڑوں کا گوشت کھاتے تھے اور یہ اس احتمال کو زائل کر دیتا ہے، اور اگر ہم اسے تسلیم کر بھی لیں تو ہمارے پاس حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں گھوڑا ذبح کیا اس حال میں کہ ہم مدینہ طیبہ میں تھے (4) اور ہم نے اسے کھایا؛ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور نص کے مقابلہ میں بغیر ترجیح کے ہر تاویل بلاشبہ وہ دعویٰ ہوتا ہے، پس نہ اس کی طرف توجہ کی جائے گی اور نہ اس کی طرف مائل ہوا جائے گا۔ اور دار قطنی نے حدیث اسماء رضی اللہ عنہا میں حسین زیادتی روایت کی ہے جس پر ہر تاویل رفع ہو جاتی ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک گھوڑا تھا وہ مرنے کے قریب ہو گیا تو ہم نے اسے ذبح کر دیا اور پھر ہم نے اسے کھایا۔ پس اسے ذبح کرنا اس پر طاری ہونے والی موت کے خوف سے ہوا نہ کہ احوال میں سے کسی اور حاجت اور حالات کے سبب۔ وباللہ التوفیق۔

اور اگر کہا جائے: یہ حیوان ہے جو کھروں والا ہے پس اسے نہیں کھایا جائے گا جیسا کہ گدھے؟ تو ہم کہیں گے: یہ قیاس الشبہ ہے اور ارباب اصول نے اس کے بارے گفتگو میں اختلاف کیا ہے اور اگر ہم اسے تسلیم کر لیں تو پھر یہ خنزیر کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سینگوں والا ہے حالانکہ سینگوں والے جدا جدا ہیں۔ اور اس بنا پر بھی کہ قیاس جب نص کے مقابلہ میں ہو تو وہ وضعاً ہی فاسد ہے لہٰذا وہ قابل التفات نہیں ہوگا۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ہے اس پر اجماع ہے کہ جن کے کھانے کا ذکر کیا گیا ہے ان پر سوار ہونا جائز ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ جن کے لئے سواری کا ذکر کیا گیا ہے انہیں کھانا بھی جائز ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، باب اکل لحوم الخیل، جلد 2، صفحہ 150
2۔ جامع ترمذی، کتاب الصید، باب اکل لحوم الخیل، جلد 2، صفحہ 1
3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1144
4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 77

مسئلہ نمبر 6۔ اور رہے خچر تو انہیں گدھوں کے ساتھ ملایا جاتا ہے، اگر ہم کہیں کہ بے شک گھوڑا کھایا جاتا ہے، تو یہ (خچر) دو عینوں سے پیدا ہوتا ہے جو دونوں نہیں کھائے جاتے (یعنی گھوڑا اور گدھا) اور اگر ہم کہیں کہ گھوڑا کھایا جاتا ہے، تو بے شک یہ (خچر) ایسے دو عینوں سے پیدا ہوتا ہے جن میں سے ایک (گھوڑا) کھایا جاتا ہے اور دوسرا (گدھا) نہیں کھایا جاتا۔ پس اصول قاعدہ کے مطابق اس پر تحریم غالب ہوگی (1)۔ اور اسی طرح جب دو کافروں کے درمیان سے پیدا ہونے والا بچہ کسی جانور کو ذبح کرے ان (کافروں) میں سے ایک کا ذبیحہ حلال ہو اور دوسرا اس اہل نہ ہو، تو اس کا ذبح کرنا درست نہیں ہوگا اور اس کے سبب اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔ اور گدھوں کی تحریم کے بارے میں کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور گدھا کھانے کے حرام ہونے کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کر دیا ہے جس وقت وہ مذکر (یعنی اپنے جیسے گدھے) پر کود پڑا اور اس نے لواطت کی، پس اسے رجس (پلید) کا نام دے دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 7۔ آیت میں اس پر دلیل ہے کہ گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہم پر ان چیزوں کے ساتھ احسان فرمایا جو اس نے ہمارے لئے مباح فرمائیں اور ہمیں ان کے منافع سے عزت و تکریم عطا فرمائی، تو پھر یہ جائز نہیں کہ ان میں کوئی تکلیف اور مشقت بغیر دلیل کے لازم ہو۔ تحقیق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن دینار سے انہوں نے سلیمان بن یسار سے انہوں۔ نے عراک بن مالک سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان پر اس کے غلام میں اور اس کے گھوڑے میں کوئی صدقہ نہیں ہے (2)''۔ اور ابو داؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''گھوڑوں اور غلاموں میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے مگر غلام میں صدقۃ الفطر ہے (3)''۔ اور یہی امام مالک، امام شافعی، اوزاعی، لیث، ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: اگر یہ سارے مونث (گھوڑیاں) ہوں یا مذکر اور مونث ملے جلے ہوں، تو پھر ہر گھوڑے میں ایک دینار ہے جبکہ وہ چرنے والے ہوں، اور اگر چاہے تو وہ اس کی قیمت لگا لے اور پھر ہر دو سو درہم سے پانچ درہم ادا کرے۔ اور انہوں نے ایک اثر جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چرنے والے گھوڑوں میں سے ہر گھوڑے میں ایک دینار ہے (4)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''گھوڑے تین قسم کے ہیں (5) '' الحدیث۔ اور اس میں ہے: ''اور وہ ان کی گردنوں اور ان کی پشتوں میں اللہ تعالیٰ کا حق نہ بھولے (6)''۔

پہلی روایت کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو غورک سعدی کے سوا کسی نے جعفر بن محمد عن أبیہ عن جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نہیں کیا۔ اور دارقطنی نے کہا ہے: جعفر سے روایت کرنے میں غورک منفرد ہے اور وہ بہت ضعیف ہے، اور اس کے نیچے بھی ضعفاء ہیں۔ اور رہی وہ حدیث جس میں حق کا ذکر کیا گیا تو وہ ان پر نکلنا ہے جب عام اعلان جنگ ہو جائے اور دشمن کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1145　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1146

3۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب صدقۃ الرقیق، حدیث نمبر 1359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

قتال کے لئے وہ متعین ہو جائیں جب وہ تعین اس پر ہو گیا اور وہ (لشکر سے) کٹ جانے والوں کو اس پر اٹھانے لگے جبکہ انہیں اس کی ضرورت ہو، تو اب اس پر یہ واجب ہو گیا جب یہ تعین ہو چکا، جیسا کہ اس پر متعین ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں ضرورت کے وقت چارہ وغیرہ کھلائے، تو یہی ان کی گردنوں (ذاتوں) میں اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں۔ اور اگر کہا جائے: یہ تو وہ حق ہے جو ان کی پشتوں میں ہے اور وہ حق باقی رہا جو ان کی گردنوں میں ہے۔ تو کہا جائے گا: تحقیق روایت یہ ہے لا ینسی حق اللہ فیھا، تو آپ کے ارشاد حق اللہ فیھا اور فی رقابھا و ظھورھا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ معنی ایک ہی شے کی طرف لوٹ رہا ہے، کیونکہ حق ان کے سارے بدن کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ اور تحقیق علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک یہاں حق سے مراد ان کی ملکیت کا حسن اور ان کے سیر ہونے (پیٹ بھرنے) کی دیکھ بھال کرنا، اور ان کے ساتھ اچھا اور خوبصورت سلوک کرنا، اور بغیر کسی مشقت کے ان پر سواری کرنا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: "تم ان کی پشتوں کو کرسیاں نہ بناؤ۔" ان کی گردنوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ حقوق لازمہ اور فرائض واجبہ کے مقامات میں کثرت سے رقاب اور اعناق مستعار لی جاتی ہیں اور اسی سے یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء: 92) (پس مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔) اور عربوں کے نزدیک ان کا استعمال اور ان کا استعارہ کثیر ہے حتیٰ کہ انہوں نے اسے خوشحالی اور اموال میں بھی ذکر کیا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کثیر لوگوں کا یہ قول ہے:

غَمْر الرداء اذا تبسّم ضاحكا غَلِقتْ لِضَحْكَته رِقابُ المال

اور یہ بھی کیونکہ وہ حیوان جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کا نصاب اس کی جنس سے ہوتا ہے، تو جب گھوڑے اس سے خارج ہیں تو ہم نے جان لیا کہ ان میں زکوٰۃ ساقط ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی کہ صرف ان کی مونثات (گھوڑیوں) میں زکوٰۃ واجب کرنا بغیر مذکروں (گھوڑوں) کے تو یہ بھی ان کی طرف سے تناقض ہے حالانکہ حدیث میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ اور ہم صدقہ وزکوٰۃ کی نفی میں مؤنثوں کو مذکروں پر قیاس کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ یہ حیوان اپنی نسل کی حفاظت کے لئے رہیں نہ کہ دودھ کے لئے، اور اس کے مذکروں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لہٰذا اس کے مؤنثوں میں بھی واجب نہ ہوگی جیسا کہ خچر اور گدھے ہیں۔

اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ اس کی مؤنثوں میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اگرچہ وہ منفرد ہوں جیسا کہ اس کے مذکروں میں واجب نہیں ہوتی درآنحالیکہ وہ منفرد ہوں۔ یہی وہ مذہب ہے جس پر جمہور ہیں۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: گھوڑوں کی زکوٰۃ کے بارے میں جو خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حدیث زہری وغیرہ سے صحیح ہے۔ اور حدیث مالک سے مروی ہے، اسے ان سے جویریہ نے اور انہوں نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت سائب بن یزید نے کہا: تحقیق میں نے اپنے باپ کو دیکھا وہ گھوڑوں کی قیمت لگاتے پھر ان کی زکوٰۃ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیتے۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے شیخ حماد بن ابی سلیمان رحمہم اللہ تعالیٰ کی حجت ہے، میں فقہائے امصار میں سے کسی کو نہیں جانتا جس نے ان دو کے سوا گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب کی ہو۔ اس کو روایت کرنے میں جویریہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منفرد ہے اور وہ ثقہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ زِيْنَةً یہ اضمار فعل کے ساتھ منصوب ہے، اس کا معنی ہے: وجعلها زينة (اور اس نے انہیں زینت (اور خوبصورتی) بنایا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے۔ اور الزینة سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ تزئین اور خوبصورتی حاصل کی جاتی ہے، اور یہ حسن و جمال اور زیب و زینت ہیں اگرچہ سامان دنیا میں سے ہیں تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس میں اجازت عطا فرمائی ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اونٹ اپنے مالکوں کے لئے عزت ہے اور بکری برکت ہے اور گھوڑے کی پیشانی میں خیر اور بھلائی ہے (1)''۔ اسے برقانی اور ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور سورۃ الانعام میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عزت کو اونٹ میں جمع کیا ہے، کیونکہ اس میں لباس، کھانا، دودھ، بوجھ اٹھانا، اور جنگ میں شریک ہونا بھی امور ہیں اور اگرچہ حملہ اور فرار ہونا اسے نقصان پہنچائے اور آپ نے برکت بکریوں میں رکھی ہے اس لئے کہ ان میں لباس، کھانا، پینا اور کثرت اولاد ہے، کیونکہ یہ ایک سال میں تین بار بچے جنتی ہیں یہاں تک کہ سکون اور راحت ان کے پیچھے پیچھے ہوتی ہے اور یہ اپنے مالک کو اس پر پر جھکانے اور پہلو نرم کرنے کے بارے ابھارتی ہیں، بخلاف خیموں میں رہنے والے ان لوگوں کے جن کے پاس اونٹ کثیر مقدار میں ہوتے ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر اور بھلائی کو گھوڑوں کی پیشانیوں کے ساتھ ملا دیا ہے جب تک زمانہ باقی ہے کیونکہ ان میں ایسے فوائد اور منافع ہیں جو کسب اور معاش کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں، اور جو دشمنوں کے قہر اور کافروں کے غلبہ اور اعلاء کلمۃ اللہ تعالیٰ میں سے اس تک پہنچاتے ہیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جمہور نے کہا ہے: وہ پیدا فرمائے گا مخلوق سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ زمین خشکی اور تری کی نچلی تہوں میں کیڑے مکوڑوں اور دیگر موذی جانوروں کی اتنی اقسام پیدا فرمائے گا جن کو کسی انسان نے نہ دیکھا ہے اور نہ اس کے بارے سنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی ان میں سے وہ نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کے اہل کے لئے اور جہنم میں اس کے اہل کے لئے تیار کی ہیں، ان میں سے جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے اس کے بارے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں اس کا تصور تک نہیں آیا۔ حضرت قتادہ اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد کپڑوں میں سوس (گھن) اور پھلوں میں کیڑوں کو پیدا کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد عرش کے نیچے چشمہ پیدا کرنا ہے، اسے ماوردی نے بیان کیا ہے (3)۔ ثعلبی نے بیان کیا ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرش کی دائیں جانب نور کی ایک نہر ہے جو سات آسمانوں، سات زمینوں، اور سات سمندروں کے ستر بار ہونے کی مثل ہے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر سحری کے وقت اس میں داخل ہو کر غسل کرتے ہیں اور اس کے نور سے اپنے نور میں، اس کے حسن و جمال سے اپنے حسن و جمال میں اور اس کی عظمت و بڑائی سے اپنی بڑائی میں اضافہ کرتے ہیں، پھر پروں کو جھاڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر پر سے ستر ہزار قطرے نکالتا ہے، اور ہر قطرے سے ستر ہزار فرشتے پیدا فرماتا ہے، ان میں سے ہر روز ستر ہزار فرشتے بیت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1142۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب اتخاذ الماشية، حدیث نمبر 2295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً　3۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 181

المعمور میں، اور کعبہ معظمہ میں ستر ہزار داخل ہوتے ہیں اور پھر یوم قیامت تک اس کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

اور پانچواں قول یہ ہے ...... اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "وہ سفید زمین ہے، سورج کی مسافت تیس دنوں کی ہے وہاں ایک مخلوق پیدا فرمائے گا وہ نہیں جانتے ہوں گے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے" (1)۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا وہ آدم کی اولاد سے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: "وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہے"۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو ان میں سے ابلیس کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا ہے" ...... پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ یَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں، اسی معنی کی طرح وہ ہے جسے علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: بے شک اندلس سے اتنا پرے اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جتنا ہمارے اور اندلس کے درمیان فاصلہ ہے، وہ نہیں جانتے کہ مخلوق نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے، ان کے سنگریزے موتی اور یاقوت کے ہیں اور ان کے پہاڑ سونے اور چاندی کے ہیں، نہ وہ ہل چلاتے ہیں، نہ وہ کاشتکاری کرتے ہیں اور نہ کوئی اور کام وہ کرتے ہیں، ان کے درخت ان کے دروازوں پر ہیں ان کے ساتھ پھل ہیں اور یہی ان کا طعام اور کھانا ہے ان کے کچھ درخت ہیں ان کے پتے چوڑے ہیں اور وہی ان کا لباس ہیں؛ انہوں نے اسے "کتاب الاسماء والصفات" کے باب بدء الخلق میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت موسیٰ بن عقبہ کی حدیث ذکر کی ہے جو انہوں نے محمد بن منکدر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے حاملین عرش ملائکہ میں سے کسی فرشتے سے گفتگو کروں جس کے کان کی لو سے لے کر اس کے کندھے تک سات سو سال کی مسافت ہے"۔ (3)

وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآىِٕرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۟

"اور اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے راہ راست کو دلائل سے واضح کرنا اور ان میں غلط راہیں بھی ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ یعنی راہ راست کا بیان اور وضاحت اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے، اس کلام میں مضاف محذوف ہے اور وہ بیان ہے۔ اور السَّبِيْلِ سے مراد اسلام ہے یعنی رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات اور دلائل و براہین کے ساتھ اس کی وضاحت کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔ اور قَصْدُ السَّبِيْلِ سے مراد سیدھی راہ ہے؛ کہا جاتا ہے: طریق قاصد یعنی وہ راستہ جو مطلوب اور منزل تک پہنچانے والا ہو۔ وَ مِنْهَا جَآىِٕرٌ ای و من السبیل جائر، یعنی ایسے راستے بھی ہیں جو حق سے پھرنے والے ہیں پس ان سے ہدایت اور راہنمائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اور اسی سے امرء القیس کا قول ہے:

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 181 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، باب فی الجهمية، حدیث 4102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

و من الطریقة جائر و هُدًی قَصْد السبیل و منه ذو دَخَل

اور طرفہ نے کہا ہے:

عَدَوْلِیّةٌ أو من سَفِین ابن یَامِنٍ یَجُور بها المَلّاح طَوْرًا و یَهتدِی

اس میں العدولیۃ کشتی ہے جو عَدَوْلی کی طرف منسوب ہے اور یہ بحرین کا ایک گاؤں ہے اور العدولی سے مراد ملاح ہے؛ یہ صحاح میں ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (الانعام: 153) (اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی)۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے و منهم جائر عن السبیل الحق، (1) یعنی ان میں سے راہ حق سے پھرنے والے بھی ہیں پس اس کی طرف راہنمائی نہیں پائی گئی۔ اور ان کے بارے میں دو قول ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مختلف خواہشات رکھنے والے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول ہے...... وہ مِلل الکفر ہیں مثلاً یہودیت، مجوسیت اور عیسائیت۔ اور مصحف حضرت عبداللہ میں و منکم جائر ہے اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے و منکم کاف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے و عنها جائر ای عن السبیل (یعنی راستے سے پھرنے والے۔) پس مِن بمعنی عن ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرمائے تو اس کے لئے ایمان کا راستہ سہل اور آسان کر دیتا ہے، اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ فرمائے تو اس پر ایمان اور اس کے احکام ثقیل اور بھاری کر دیتا ہے۔ (من اراد الله ان یهدیه سهل له طریق الایمان، و من اراد أن یضله ثقل علیه الایمان و فروعه)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَصْدُ السَّبِیْلِ کا معنی ہے تمہارا چلنا اور تمہارا لوٹنا۔ اور السبیل واحد ہے لیکن جمع کے معنی میں ہے، اسی لئے ضمیر مؤنث لائی گئی ہے اور فرمایا: وَ مِنْهَا اور لغت اہل حجاز کے مطابق سبیل مؤنث ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ یہ بیان فرمایا کہ مشیت اللہ تعالیٰ کیلئے ہی ہے، اور یہ اس موقف کو صحیح قرار دے رہا ہے جو آیت کی تاویل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اختیار کیا ہے، اور یہ قدریہ اور ان کے موافق لوگوں کا رد کرتا ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝

"اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تمہارے لئے اس میں سے کچھ پینے کے کام آتا ہے اور اس سے سبزہ اگتا ہے جس میں تم (مویشی) چراتے ہو۔"

شراب سے مراد وہ (پانی) ہے جسے پیا جاتا ہے، اور شجر کا معنی تو معروف ہے یعنی وہ بارشوں سے درخت، بیلیں اور سبزہ اگاتا ہے۔ اور تُسِیْمُوْنَ اور تم (اسے) اپنے اونٹوں کو چراتے ہو۔ کہا جاتا ہے: سامت السائمة تسوم سومًا (یعنی چرنے والا جانور چرا) فهی سائمة اور السَّوَام اور السائم دونوں ہم معنی ہیں، اور وہ چرنے والا مال ہے۔ اور السائم اور السائمة کی

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 181

جمع سوائم ہے۔ اور أستھا أنا یعنی میں نے اسے چرنے کے لئے نکالا۔ پس میں مُسِیم ہوں اور وہ مُسامة اور سائمة ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا:

أَوْلٰی لَکَ ابنَ مُسِیمہ الأجمال (تیرے لئے اونٹ چرانے والے کا بیٹا ہونا اولیٰ اور بہتر ہے)

اور السوم کا اصل معنی چراگاہ میں دور تک چلے جانا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ السّومة سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی علامت ہے، یعنی یہ اپنے چرنے کے سبب زمین میں علامات اور نشانات چھوڑ جاتے ہیں یا یہ اس لئے ہے کیونکہ انہیں چراگاہ میں بھیجنے کے لئے نشانات لگائے جاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الخیل المسومة وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کو چرایا جاتا ہے اور وہ ہوتا ہے جس کو کوئی علامت اور نشان لگایا گیا ہوتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مُسَوِّمِیْنَ (آل عمران) اخفش نے کہا ہے: وہ ہوتے ہیں جنہیں نشان لگائے گئے ہوں اور وہ ہوتے ہیں جو چھوڑ دیئے گئے ہوں۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: سوم فیھا الخیل ای أرسلھا یعنی اس نے گھوڑا اس میں چھوڑ دیا، اور اسی سے السائمة (چرنے والا) ہے، بے شک یہ (جمع) یاء اور نون کے ساتھ آئی ہے کیونکہ گھوڑوں کو بھیجا گیا اس حال میں کہ ان پر ان کے سوار بھی تھے۔

یُنْۢبِتُ لَکُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱

"اگاتا ہے تمہارے لئے اس کے ذریعے (طرح طرح کے) کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور اور (ان کے علاوہ) ہر قسم کے پھل، یقیناً ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے۔"

قولہ تعالیٰ: یُنْۢبِتُ لَکُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ابوبکر نے حضرت عاصم سے تعظیم کی بنا پر ننبت نون کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ عام قرأت یا کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے ینبت اللّٰہُ لَکُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اگاتا ہے)۔ کہا جاتا ہے: نبتت الأرض و أنبتت یہ دونوں ہم معنی ہیں (زمین نے اگایا)، اور نبت البقل و أنبت یہ دونوں ایک معنی میں ہیں (یعنی سبزی اگی)۔ اور فراء نے شعر کہا ہے:

رأیتُ ذوِی الحاجات حول بیوتهم　　قَطِینا بها حتی اذا أنبت البقلُ

اس میں أنبت بمعنی نَبَتَ ہے۔ اور أبنته اللّٰہُ فهو منبوت (اللہ تعالیٰ نے اسے اگایا پس وہ اگ گئی)، تو یہ خلاف قیاس ہے۔ اور أنبت الغلام یعنی بچے کے زیر ناف بال نکل آئے۔ اور نَبَّتَ الشجر غرسه (اس کے درخت لگانے نے درخت کو اگایا)۔ کہا جاتا ہے: نَبِّتْ أجلك بین عینیك (تو اپنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ)۔ اور نَبِّتُ الصبی تنبیتا یعنی تو نے بچے کی پرورش اور تربیت کی۔ اور المنبت سے مراد سبزہ اگنے کی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے: ما أحسن نابِتة بنی فلان یعنی اس کے پران کے اموال اور ان کی اولاد بڑھ رہی ہے۔ اور نَبَتَتْ لهم نابتة جب ان کے چھوٹے بچے جوان ہو جائیں۔ اور ان

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 382

بنی فلان لنابتۃُ شرٍ (بے شک بنی فلاں شر پھیلا رہے ہیں) اور النوابت من الأحداث الأغمار (نوجوان بچے ناتجربہ کار ہیں)۔ اور النبیت یہ یمن کا ایک محلہ ہے۔ اور الینبوت، خشخاش کا پودا۔

یہ سب جوہری سے منقول ہے۔ وَالزَّیْتُوْنَ یہ زیتونۃ کی جمع ہے۔ اور نفس درخت کو بھی زیتونۃ کہا جاتا ہے اور پھل کو بھی زیتونۃ کہا جاتا ہے۔ پھلوں کی زکوٰۃ کا حکم سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ بے شک اس اترنے اور اگانے میں لَاٰیَۃً نشانی اور دلالت ہے۔ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۱۲

"اور اللہ تعالیٰ نے مسخر فرما دیا تمہارے لیے رات، دن، سورج اور چاند اور تمام ستارے بھی اس کے حکم کے پابند ہیں، بے شک ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی) کی نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو دانشمند ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے راحت و سکون پانے اور کام کرنے کے لئے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (القصص: 73) (اور محض اپنی رحمت سے اس نے بنا دیا ہے تمہارے لئے رات اور دن کو تاکہ تم آرام کرو رات میں اور تلاش کرو (دن میں) اس کے فضل (رزق) سے) وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ یعنی یہ سب اوقات کو پہچاننے کے لئے، پھلوں اور کھیتوں کے پکنے کے لئے اور اندھیروں میں ستاروں سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے مطیع کر دیئے گئے ہیں۔ اور [حضرت ابن عباس اور] ابن عامر اور اہل شام نے وَالشمسُ والقمرُ والنجومُ مسخراتٌ پڑھا ہے۔ یعنی یہ مبتدا اور خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہیں۔ اور باقیوں نے ماقبل پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور حفص نے عاصم سے رفع کے ساتھ قرأت کی ہے یعنی وَالنُّجُوْمُ اور مُسَخَّرٰتٌ اس کی خبر ہے۔ اور والشمسَ وَالقمرَ والنجومَ کو اللیلَ والنھارَ پر عطف کرتے ہوئے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور والنجومُ کو مبتدا ہونے کی بنا پر رفع دیا گیا ہے۔ اور مسخراتٌ کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی ھی مسخراتٌ اور یہ اسے منصوب پڑھنے والوں کی قرأت میں حال مؤکدہ ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا (یعنی اس میں مصدقا حال مؤکدہ ہے) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ بے شک ان تمام چیزوں میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان چیزوں کی عقل اور سمجھ رکھتی ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کیا اور جس کی انہیں توفیق دی۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳

"اور (علاوہ ازیں) جو پیدا فرمایا تمہارے لئے زمین میں (اسے بھی مسخر کر دیا) الگ الگ ہے ان کا رنگ و روپ، یقیناً ان میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا ذَرَاَ یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ سب مسخر کر دیا جو زمین میں تمہارے لئے پیدا فرمایا اس میں ذَرَاَ بمعنی خلق ہے (یعنی پیدا فرمایا) ذَرَأَ اللهُ الخلق یذرؤھم ذرءًا یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پس وہ ذارئ (پیدا کرنے والا) ہوا۔ اور اسی سے الذُّرِّیَّة ہے یعنی جن وانس کی نسل (اولاد) مگر عربوں نے اس کا ہمزہ چھوڑ دیا ہے اور اس کی جمع الذراری ہے۔ کہا جاتا ہے: أنمی الله ذرأك و ذروك یعنی اللہ تعالیٰ تیری ذریت کو بڑھائے (اس میں برکت دے) اور الذرو اور الذَّرُء کا اصل معنی جمع (اجتماع) سے متفرق اور علیحدہ ہونا ہے۔ اور حدیث میں ہے ذرء النار یعنی بے شک وہ جہنم کے لئے پیدا کئے گئے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ مسخر اور مطیع ہے مثلاً چوپائے، اونٹ اور دیگر حیوانات اور درخت وغیرہ، اور جو چیزیں ان کے سوا ہیں۔ اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کعب الاحبار سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: اگر وہ کلمات نہ ہوتے جو میں پڑھتا ہوں تو یقیناً یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔ تو ان سے پوچھا گیا: وہ کلمات کیا ہیں؟ تو انہوں نے کہا: أعوذ بوجه الله العظیم الذی لیس شئ اعظم منه، و بکلمات الله التآمات التی لا یجاوزھن برّ ولا فاجر، و بأسماء الله الحسنی کلها ما علمت منها و ما لم اعلم، من شرّ ما خلق و برأ و ذرأ۔ اور اس میں یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت سفر پر لے جایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں میں سے ایک عفریت کو دیکھا کہ وہ آپ کو آگ کے شعلے کے ساتھ تلاش کر رہا ہے، الحدیث۔ اور اس حدیث میں ہے و شرّ ما ذرأ فی الارض (اور اس کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیدا کیا ہے) ہم نے اس کا اور اس کی ہم معنی روایات کا ذکر کئی مقامات پر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اس میں مُخْتَلِفًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اَلْوَانُهٗ سے مراد اس کی ہیئتیں اور اس کے مناظر ہیں، مراد چوپائے اور درخت وغیرہ ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ یعنی بے شک ان کے رنگ وروپ کے اختلاف میں لَاٰیَةً عبرت اور سبق ہے لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان بنائی ہوئی چیزوں کی تسخیر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر علامات اور نشانیاں ہیں اور یہ کہ اس کے سوا کوئی اور اس پر قادر نہیں ہو سکتا۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور وہی ہے جس نے پابند حکم کر دیا ہے سمندر کو تا کہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت اور نکالو اس سے زیور جسے تم پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو کہ موجوں کو چیر کر جا رہی ہوتی ہیں سمندروں میں تا کہ (ان کے ذریعہ) تم تلاش کرو اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو تا کہ اس کا شکر ادا کرتے رہو۔''

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ سمندر کو مسخر کرنے کا معنی انسان کو اس میں تصرف کرنے کی قدرت

دینا ہے اور اسے سوار ہونے اور پناہ لینے کے لئے مطیع کرنا ہے (1)، اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات میں سے بہت بڑی نعمت اور احسان ہے، پس اگر وہ چاہے تو اسے ہم پر مسلط کر دے اور ہمیں غرق کر دے۔ سمندر اور اس کے شکار کے بارے بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور یہاں اس کا نام لحم (گوشت) رکھا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گوشت تین جنس کے ہیں: پس چار پاؤں والے جانوروں کا گوشت ایک جنس ہے، پروں والوں کا گوشت ایک جنس ہے، اور پانی میں رہنے والوں کا گوشت ایک جنس ہے، پس ایک جنس کی بیع کرنا اپنی ہی جنس کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہے، اور گائے اور جنگلی جانور کے گوشت کی بیع کرنا پرندے اور مچھلی کے گوشت کے ساتھ یہ متفاضلاً جائز ہے (یعنی دونوں عوض مقدار میں برابر نہ ہوں)۔ اور اسی طرح پرندے کے گوشت کی بیع کرنا گائے، جنگلی جانور اور مچھلی کے گوشت کے عوض متفاضلاً جائز ہوئی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام گوشت مختلف انواع کے ہیں جیسا کہ اس کے اصول مختلف ہیں، پس گائے کا گوشت ایک نوع ہے، بکری کا گوشت ایک نوع ہے، اور اونٹ کا گوشت الگ نوع ہے۔ اور اسی طرح جنگلی جانور بھی مختلف ہیں، اسی طرح پرندے ہیں اور اسی طرح مچھلیاں ہیں۔ اور امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ شتر مرغ، شکار، پرندہ اور مچھلی یہ سب ایک جنس ہے ان میں تفاضل جائز نہیں ہے۔ اور ان کے مذہب میں سے ان کے اصحاب کے نزدیک پہلا قول مشہور ہے۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے ناموں میں ان کی زندگی میں فرق رکھا ہے پس فرمایا: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ (الانعام: 143) (پیدا فرمائے) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) پھر فرمایا: وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ (الانعام: 144) (اور اونٹ سے دو (نر و مادہ) اور گائے سے دو (نر و مادہ) پھر جب ان تمام سے گوشت کا قصد کیا تو فرمایا: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ (المائدہ: 1) (حلال کئے گئے ہیں تمہارے لئے بے زبان جانور) اور انہیں ایک گوشت کے ساتھ جمع کر دیا ان کے منافع قریب ہونے کی وجہ سے جیسا کہ بکری کے گوشت کے منافع اور بھیڑ کے گوشت کے منافع باہم متقارب ہیں۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ (الواقعہ) (اور پرندوں کا گوشت بھی جس کی وہ رغبت کریں گے) اور یہ اس طائر کی جمع ہے جو واحد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (الانعام: 38) (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے) پس تمام پرندوں کے گوشت کو ایک اسم کے ساتھ جمع کر دیا۔ اور یہاں فرمایا: لَحْمًا طَرِيًّا پس مچھلی کی تمام اقسام کو ذکر واحد کے ساتھ جمع کر دیا، پس گویا چھوٹی مچھلیاں بڑی مچھلیوں کی طرح ہیں (کیونکہ) اس جمع میں دونوں داخل ہیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ ان سے بکری اور مینڈھے کے گوشت کے بارے پوچھا گیا کیا وہ ایک ہی شے ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں اور کسی نے آپ سے اختلاف نہیں کیا پس یہ اجماع کی مثل ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

اور اس کے خلاف کوئی حجت نہیں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام کی بیع سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ وہ برابر برابر ہو، تو بے شک لفظ طعام اپنے اطلاق میں گندم وغیرہ تمام ماکولات کو شامل ہوتا ہے لیکن گوشت کو شامل نہیں ہوتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 383

کہ جب کوئی کہنے والا یہ کہے: میں نے آج طعام کھایا۔ تو اس سے ذہن گوشت کھانے کی طرف نہیں جاتا، اور اس لئے بھی کہ یہ حضور نبی مکرم ﷺ کے اس قول کے معارض ہے: ''جب دو جنسیں مختلف ہوں تو جیسے چاہو ان کی بیع کرو۔'' اور یہ دو جنسیں ہیں۔ اور یہ بھی کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ گوشت کی بیع کرنا پرندے کے گوشت کے ساتھ متفاضلاً جائز ہے اس کی علت یہ ہے کہ یہ طعام کی بیع ہے اس کی زکوۃ نہیں ہے اسے گوشت کے ساتھ بیچا گیا ہے جس میں زکاۃ نہیں ہے، اسی طرح مچھلی کی بیع تفاضل کیساتھ کرنا پرندے کے گوشت کے ساتھ یہ بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور رہی مکڑی! تو یہ ہمارے نزدیک مشہور ہے کہ اس کے بعض کی بیع تفاضل کے ساتھ بعض کے عوض کرنا جائز ہے۔ اور سحنون کے بارے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اس سے منع کرتے ہیں، اور اسی کی طرف بعض متاخرین بھی مائل ہیں اور اسے ان چیزوں میں سے گمان کیا ہے جو ذخیرہ کی جاسکتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا۔ تو ابن القاسم نے کہا ہے: مذکورہ چاروں انواع میں سے کسی نوع کا گوشت کھانے سے وہ حانث ہو جائے گا۔ اور اشہب نے المجموعہ میں کہا ہے: وہ حانث نہیں ہوگا مگر وحشی جانوروں وغیرہ کے علاوہ دیگر جانوروں کا گوشت کھانے سے، کیونکہ اس میں عرف اور عادت کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور اسے لفظ کے اطلاق لغوی پر مقدم کیا گیا ہے (1)، اور یہی احسن ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا** اس میں حلیۃ (زیور) سے مراد موتی اور مرجان ہیں (2)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝** (الرحمٰن) (ان سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔) اور زیور کا نکالنا بلاشبہ صرف نمکین (سمندر) سے معروف ہے۔ اور کہا جاتا ہے: انّ فی الزمرد بحریا (بے شک زمرد سمندر سے حاصل کیا گیا ہے) اور ہذلی کو موتی کے وصف میں اپنے قول میں غلط قرار دیا گیا ہے:

فجاء بها من دُرّة لطيمة　　على وجهها ماء الفرات يدوم (3)

پس انہوں نے اسے میٹھے پانی سے قرار دیا ہے۔ پس زیور حق ہے اور یہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد پر اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اور انہیں تاج پہنایا گیا اور جنت کے جواہر کے ساتھ آراستہ اور مرصع کیا گیا تھا، اور آپ کو وہ انگوٹھی پہنائی گئی جس کے وارث آپ سے حضرت سلیمان بن داؤد صلوات اللہ علیہم بنے اور اس کو خاتم العز (عزت اور غلبے کی انگوٹھی) کہا جاتا تھا جیسا کہ روایت کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مردوں اور عورتوں پر اس کے ساتھ احسان عام فرمایا جو کچھ سمندر سے نکلتا ہے، پس اس میں سے کوئی شے ان پر حرام نہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مردوں پر سونا اور ریشم حرام قرار دیا ہے (4)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے صحیح میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم ریشم مت پہنو کیونکہ جس نے دنیا میں اسے پہن لیا وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1147　　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1148

3۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 383　　4۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1148

اسے آخرت میں نہیں پہنے گا(1)"۔ اس کے بارے گفتگو عنقریب سورۃ الحج میں آرہی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوائی اور اس میں ایسا نگینہ لگوایا جو آپ کی ہتھیلی کے باطن کے ساتھ ملا ہوتا تھا، اور اس میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نقش کروایا، تو لوگوں نے بھی اس کی مثل انگوٹھیاں بنوالیں، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا کہ انہوں نے یہ بنوالی ہیں تو آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا: لا البسه ابدا (میں کبھی بھی اسے نہیں پہنوں گا) بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور لوگوں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں بنوالیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہ انگوٹھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہنی پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وہ بئر اریس میں گر پڑی (2)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ جب آپ کے ہاتھ سے انگوٹھی گر پڑی۔ اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ تمام مردوں پر چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے۔ علامہ خطابی نے کہا ہے: عورتوں کے لئے چاندی کی انگوٹھی پہننا مکروہ ہے، کیونکہ یہ مردوں کے لباس میں سے ہے، پس اگر وہ سونا نہ پائیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اسے زعفران یا اس کے مشابہ کسی شی کے ساتھ زرد بنا دیں (یعنی سنہری بنا دیں) اور سلف و خلف میں سے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی بنوانا حرام ہے، سوائے اس روایت کے جو ابوبکر بن عبدالرحمن اور خباب سے مروی ہے، وہ اس کے خلاف ہے اور شاذ ہے، اور ان دونوں میں سے کسی کو نہی اور نسخ کا حکم نہیں پہنچا۔ واللہ اعلم۔

اور رہی وہ روایت جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی دیکھی، پھر لوگوں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں بنوائیں اور پہن لیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگوٹھی پھینک دی تو لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں (3)۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے اور الفاظ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ علماء کے نزدیک یہ ابن شہاب کو وہم ہوا ہے، کیونکہ وہ انگوٹھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھینکی تھی بلاشبہ وہ سونے کی انگوٹھی تھی۔ اسے عبدالعزیز بن صہیب، ثابت اور قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور یہ اس کے خلاف ہے جسے ابن شہاب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے پس ایک کے مقابلے میں فیصلہ جماعت کے مطابق کرنا واجب ہے جبکہ وہ ایک جماعت کے مخالف ہو، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی جماعت کی شہادت دیتی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب مردوں کے لئے چاندی کی انگوٹھی پہننا اور اس سے زینت حاصل کرنا جائز ہے اور یہ ثابت ہے، تو علماء میں سے ابن سیرین وغیرہ نے مکروہ قرار دیا ہے کہ وہ اس میں نقش کروائے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو۔ اور علماء کی جماعت نے اس میں نقش کرانے کو جائز قرار دیا ہے، پھر جب وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم یا کلمہ حکمت یا قرآن کریم میں سے کوئی کلمات نقش کروائے اور اسے اپنے بائیں ہاتھ میں پہنے، تو کیا وہ اس کے ساتھ بیت الخلا میں داخل ہو سکتا ہے اور اپنے

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم الاستعمال إناء الذهب والفضه، جلد 2، صفحہ 191

2۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب خاتم الفضه، جلد 2، صفحہ 872 3۔ ایضاً

بائیں ہاتھ کے ساتھ استنجا کر سکتا ہے؟ تو حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں تخفیف کی ہے (اور رخصت دی ہے) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا: اگر انگوٹھی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کندہ ہو اور آدمی اسے بائیں ہاتھ میں پہنتا ہو تو کیا وہ اس کے ساتھ استنجا کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: میں امید کرتا ہوں کہ اسے رخصت ہوگی۔ اور آپ سے کراہت بھی مروی ہے اور یہی اُولیٰ ہے۔ اور آپ کے اکثر اصحاب نے اس سے منع کیا ہے۔

اور ہمام نے ابن جریج سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلا میں تشریف لے جاتے تھے تو اپنی انگوٹھی اتار لیتے (1)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ حدیث منکر ہے، اور بلاشبہ ابن جریج سے معروف ہے کہ انہوں نے زیادہ بن سعد سے انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے پھینک دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: اسے ہمام کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا۔

مسئلہ نمبر 7۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور اس میں ''محمد رسول اللہ'' نقش کروایا اور فرمایا: ''بے شک میں نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی ہے اور اس میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نقش کروایا ہے پس تم میں سے کوئی بھی اس نقش پر نقش نہ کروائے۔'' ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ آدمی کے لئے انگوٹھی پر اپنا نام لگوانا جائز ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: خلفاء اور قضاۃ کی یہ شان ہے کہ وہ اپنے نام اپنی انگوٹھیوں پر کندہ کروائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی یہ ہے کہ کوئی بھی آپ کی انگوٹھی کے نقش کی طرح نقش نہ بنوائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم اور صفت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق کی طرف وصف رسالت کے ساتھ متصف ہے۔ اور اہل شام نے روایت کیا ہے کہ حاکم کے بغیر کسی کے لئے انگوٹھی بنوانا جائز نہیں ہے۔ اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بھی روایت کی ہے۔ وہ ابوریحانہ سے مروی ہے اور یہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف کی وجہ سے کوئی حجت نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: لاینقشن أحد علی نقشه (2) بھی اسے رد کرتا ہے، اور یہ تمام لوگوں کے انگوٹھی بنوانے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، جبکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے نقش پر منقش نہ ہو۔ اور حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ کی انگوٹھی کا نقش محمد یسأل اللہ العافیة تھا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی انگوٹھی کا نقش حسبی اللہ و نعم الوکیل تھا۔ ترمذی الحکیم نے (نوادر الاصول) میں ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (الرعد) تھا اور یہ سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ ان کے بیٹے نے ایک ہزار درہم کے عوض انگوٹھی خریدی ہے تو آپ نے اس کی طرف دیکھا: بے شک مجھے یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ تو نے ہزار درہم کے عوض انگوٹھی خریدی ہے، پس تو اسے فروخت کر دے اور اس سے ہزار بھوکوں کو کھانا کھلا۔ اور ایک درہم کے ساتھ لوہے کی انگوٹھی خرید لے، اور اس پر یہ لکھ رحم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ و سننھا، باب ذکر اللہ علی الخلاء، حدیث 298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 873

اللہ امرء اعرف قدر نفسہ (اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جس نے اپنے نفس کی قدر پہچان لی)۔

مسئلہ نمبر 8۔ جس کسی نے قسم کھائی کہ وہ زیور نہیں پہنے گا پھر اس نے موتی پہن لئے تو وہ حانث نہ ہوگا، یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: کیونکہ یہ وہ ہے جسے لغوی طور پر اسم اگرچہ شامل ہے لیکن قسم کے ساتھ اس کا قصد اور ارادہ نہیں، اور قسم عرف کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ فراش پر نہیں سوئے گا پھر وہ زمین پر سویا تو حانث نہ ہوگا؟ اور اسی طرح کسی نے قسم کھائی وہ سراج (چراغ) سے روشنی حاصل نہیں کرے گا پھر وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ گیا تو وہ حانث نہ ہوگا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فراش کا اور سورج کو سراج کا نام دیا ہے۔ اور امام شافعی، امام ابو یوسف، اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ زیور نہیں پہنے گا اور اس نے موتی پہن لئے تو وہ حانث ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا اور جو کچھ اس (سمندر) سے نکلتا ہے وہ موتی اور مرجان ہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ کشتی اور سمندر میں سوار ہونے کا ذکر سورۃ البقرہ وغیرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: مَوَاخِرَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: جَوَارِيَ (چلنے والیاں)، یہ جرت تجری سے ماخوذ ہے۔ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے: معترضة (چوڑی بچھی ہوئی)۔ اور حسن نے کہا ہے: مواقر (یعنی لدی ہوئی) اور حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: یعنی وہ جارہی ہیں اور آرہی ہیں درآنحالیکہ وہ ایک ہی ہوا کے ساتھ آنے والی ہیں اور واپس جانے والی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَوَاخِرَ سمندر کے اندر موجوں کو چیرتے ہوئے۔ المخر کا اصل معنی پانی کو دائیں بائیں سے چیرنا، شق کرنا ہے۔ مَخَرَتِ السفينة تَمْخَرُ و تَمْخُرُ مَخْرًا و مُخُوْرًا جب کشتی پانی کو چیرتے ہوئے آواز کے ساتھ چلے، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ یعنی تو انہیں چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور مَخَرَ السابح جب تیرنے والا اپنے سینے کے ساتھ پانی کو شق کرے، چیرے۔ اور مخر الارض اس نے زمین کو کاشت کے لئے پھاڑا۔ اور مَخَرَها بالماء جب زمین میں پانی روک لیا جائے یہاں تک کہ وہ أريضة ہو جائے، یعنی وہ کھیتی کا بہترین اور عمدہ سبزہ اگانے کے قابل ہو جائے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لغت میں المخر کا معنی ہے ہوا کے چلنے کی آواز اور یہ پانی میں ہونے کے ساتھ مقید نہیں، اور کہا: بے شک اس بارے میں واصل مولی ابی عیینہ کا قول ہے: جب تم میں سے کوئی بول (چھوٹا پیشاب) کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ اجسام میں ہوا کی آواز میں غور وفکر کرے کہ وہ کس سمت سے آرہی ہے، پھر وہ اس کی طرف منہ کرنے سے اجتناب کرے تاکہ اس کا بول اس پر لوٹ کر نہ آئے۔ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ یعنی چاہئے کہ تم اس پر تجارت اور طلب منفعت کے لئے سوار ہو۔ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یہ سب سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ⑮

''اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تا کہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ اور نہریں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1148

جاری کر دیں اور راستے بنا دیئے تا کہ تم (اپنی منزل کی) راہ پا سکو۔"

قولہ تعالیٰ: وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین میں ثابت رہنے والے پہاڑ گاڑ دیئے ہیں۔ رسا یرسو جب وہ ثابت اور پختہ ہو جائے۔

جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

فصبرتُ عارِفةً لذالك حُرّةً ترسو إذا نفسُ الجبان تطلّعُ

اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ ای لئلا تمید (تا کہ وہ لرزتی نہ رہے)، یہ کوفیوں کے نزدیک ہے۔ وکراھیۃ أن تمید (یعنی اس کے لرزنے کو ناپسند کرتے ہوئے)؛ یہ بصریوں کے قول کے مطابق ہے۔ اور المید کا معنی ہے دائیں بائیں جھومنا اور لرزنا، اضطراب کا اظہار کرنا۔ ماد الشئ یمید میدا جب وہ شے حرکت کرے، اور مادت الأغصان جب ٹہنیاں جھک جائیں، اور ماد الرجل جب آدمی اکڑ کر چلے، تکبر کا اظہار کرے۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو وہ لرزنے لگی اور آگے پیچھے ہلنے لگی، تو فرشتوں نے کہا: بے شک یہ تو کسی کو اپنی پشت پر نہیں ٹھہرنے دے گی۔ پس انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ اسے پہاڑوں کے ساتھ ثابت اور مضبوط کر دیا گیا تھا، اور ملائکہ نہ جان سکے کہ پہاڑ کس سے پیدا کر دیئے گئے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو یہ ہلنے لگی اور جھک گئی اور کہنے لگی: اے میرے پروردگار! کیا تو مجھ پر اسے رکھے گا جو گناہوں اور خطاؤں کا عمل کریگا، اور مجھ پر مردار اور بدبو ڈالے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس میں پہاڑ گاڑ دیئے وہ جنہیں تم دیکھ رہے ہو اور وہ جنہیں تم نہیں دیکھ رہے۔ اور ترمذی نے کتاب التفسیر کے آخر میں روایت بیان کی ہے کہ محمد بن بشار نے ہمیں بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں یزید بن ہارون نے بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں عوام بن حوشب نے سلیمان بن ابی سلیمان سے، انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو یہ لرزنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ تخلیق فرمائے اور ان کے ساتھ اس پر توجہ کی (یعنی انہیں اس میں گاڑ دیا) تو یہ ٹھہر گئی، پختہ ہو گئی۔ تو ملائکہ کو پہاڑوں کی شدت اور سختی پر تعجب ہوا اور کہا: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے پہاڑوں سے زیادہ سخت بھی ہے تو رب کریم نے فرمایا: ہاں وہ لوہا ہے، انہوں نے عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے؟ رب کریم نے فرمایا: ہاں وہ آگ ہے۔ پھر عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے آگ سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں وہ پانی ہے۔ انہوں نے عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے پانی سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں وہ ہوا ہے۔ پھر عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے ہوا سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں وہ ابن آدم (انسان) ہے جو اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے اور اسے اپنے بائیں ہاتھ سے مخفی رکھتا ہے (1)۔" ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب خلق الانسان ھلوعا لاینما لک، جلد 2، صفحہ 327

ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ المعوذتین، حدیث نمبر 3291، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: یہ حدیث غریب ہے، ہم اس سند کے سوا اسے مرفوع نہیں پہچانتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت میں اسباب کے استعمال پر بہت بڑی دلیل ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ بغیر پہاڑوں کے اسے ساکن کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اَنْهٰرًا یعنی اس میں نہریں بنا دیں یا اس میں نہریں رکھ دیں۔ وَّ سُبُلًا یعنی اس میں راستے بنا دیئے۔ لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تا کہ تم ان شہروں کی طرف راہ پا سکو جہاں جانے کا تم قصد کرتے ہو پس تم بھٹکتے نہیں اور نہ حیرت زدہ ہوتے ہو۔

وَ عَلٰمٰتٍ ؕ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝۱۶

"اور (راستوں پر) علامتیں بنا دی ہیں اور ستاروں کے ذریعہ سے وہ راہ یاب ہوتے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ عَلٰمٰتٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: علامات سے مراد دن کے وقت راستوں پر لگائی گئی نشانیاں ہیں (1)، یعنی راستوں کے لئے ایسی علامات اور نشانیاں مقرر کر دی گئی ہیں جن سے راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ یعنی رات کے وقت وہ ستاروں کے ذریعے سے راہ یاب ہوتے ہیں، اور النجم سے النجوم (ستارے) مراد لئے جاتے ہیں۔ اور ابن وثاب نے و بالنُّجْم پڑھا ہے۔ اور حسن نے نون اور جیم دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے مراد النجوم ہے، پس اسے کم کر دیا ہے۔ (یعنی قصر کیا ہے)۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إنَّ الفقیر بیننا قاضٍ حَكَمْ　　أن تَرِدِ الماءَ إذا غاب النُّجُم

اور اسی طرح اس کے بارے قول ہے جس نے النَّجْم پڑھا ہے مگر یہ کہ اس نے تخفیف کے لئے جیم کو ساکن کر دیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ النُّجُم نَجْمٌ کی جمع ہو جیسا کہ سَقْفٌ کی جمع سُقُفٌ ہے اور النجوم کے بارے میں اختلاف ہے؛ پس فراء نے کہا ہے: مراد جَدْی (قطب کے پاس ایک ستارہ جس سے قبلہ کی شناخت کی جاتی ہے اور اس کو جدی الفرقد بھی کہتے ہیں) اور الفرقدان (فرقد وہ ستارہ جو قطب شمالی کے قریب ہے اور اس سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں اور اس کی دوسری جانب میں ایک دوسرا ستارہ ہے جو اس سے روشنی میں کم ہے پھر دونوں کو فرقدان کہتے ہیں [المنجد] ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد ثریا ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

حتی إذا ما استقَلَّ النَّجْمُ فی غَلَس　　و غُودر البقْلُ مَلْوِیٌّ و محصودُ

ای منه ملوِیٌّ و منه محصود۔ (اسی ستارے) سے ان کا نشوونما پانا، بڑھنا ہے اور اسی سے کاٹنے کے وقت کو پہنچنا ہے) اور یہ ثریا کے طلوع کے وقت ہوتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: علامات سے مراد پہاڑ ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (2): یہ ستارے ہی ہیں؛ کیونکہ وہ ستارے ہی ہیں جن سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اور انہیں میں سے وہ ہیں جو

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 182　　2۔ ایضاً

ایسی علامت ہوتے ہیں جس سے راہنمائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ: وَ عَلٰمٰتٍ پر کلام مکمل ہوگئی۔ پھر نئی کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ اور پہلے قول کے مطابق یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے علامات بنادی ہیں جن سے تم راہنمائی حاصل کرتے ہو۔ اور علامات میں سے ہوائیں ہیں جن سے راہنمائی لی جاتی ہے۔ اور اهتداء سے جو مراد ہے اس کے بارے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے...... سفروں میں راہنمائی حاصل کرنا(1)، یہ جمہور کا قول ہے۔ اور دوسرا۔ قبلہ سمت معلوم کرنے میں راہنمائی لینا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ کے بارے پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن عباس! وہ الجدی (ستارہ) ہے، اسی پر تمہارا قبلہ ہے اور اس سے تم اپنے خشکی اور بحری سفر میں راہنمائی لے سکتے ہو"۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(3): رہے تمام ستارے تو ان سے راہنمائی وہ حاصل کرسکتا ہے جو ان کے طلوع وغروب ہونے کے مقامات کو جانتا ہو، اور ان میں سے جنوبی اور شمالی کے درمیان فرق کرسکتا ہو، اور بعد میں آنے والوں میں یہ بہت کم ہے۔ اور رہا ثریا تو اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرسکتا مگر وہی جو تمام ستاروں سے راہنمائی لے سکتا ہو۔ اور بلاشبہ ہر ایک کیلئے جدی اور فرقدین کے ساتھ راہنمائی ممکن ہے، کیونکہ یہ وہ ستارے ہیں جن کے مطالع ظاہرہ اور سمت ثابتہ معین جگہ اور محل کے ساتھ محصور ہے، کیونکہ یہ قطب ثابت کے اردگرد معین مدار میں چکر لگاتے ہیں، پس یہ خشکی میں مخلوق کی راہنمائی کیلئے بالکل ظاہر ہیں جب راستہ گم ہوجائے، معلوم نہ ہو، اور سمندر میں کشتیوں کے چلنے کے وقت اور قبلہ سمت جب مجہول ہوجائے تو اس کیلئے یہ راہنمائی کرتے ہیں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قطب کو اپنے بائیں کندھے کی پشت پر رکھو تو جس طرف آپ کا منہ ہوگا تو وہی جہت قبلہ ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے النجم کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا: "وہ جدی ہے اسی پر تمہارا قبلہ ہے اور اسی کے ساتھ تم اپنے خشکی اور سمندر کے سفر میں راہنمائی حاصل کرتے ہو(4)"۔ وہ یہ کہ جدی کے آخر میں بنات نعش الصغری ہیں (بنات نعش الکبریٰ قطب شالی کے رخ میں سات ستارے ہیں، انہیں کے قرب میں بنات نعش الصغریٰ کے سات ستارے ہیں۔ المنجد) اور قطب وہ ہے جس پر ان کے درمیان میں سیدھا قبلہ ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دو وجہوں پر ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اسے دیکھے اور اس کا معائنہ کررہا ہو تو اس صورت میں لازم ہے کہ وہ سیدھا اس کی طرف منہ کرے اور اپنا سارا بدن اس کی طرف کرنے کا ارادہ کرے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ کعبہ معظمہ اس طرح ہو کہ وہ اسے دیکھ نہ رہا ہو تو اس صورت میں اس کی طرف منہ کرنا لازم ہوتا ہے اور دلائل سے اس کے سامنے ہونا ضروری ہے، اور وہ سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، اور ہر وہ

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 183
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1149
4۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 183

شے ہے جس کے ساتھ اس کی جہت کو پہچاننا ممکن ہوتا ہے، اور جس سے قبلہ غائب ہوجائے اور اس نے اجتہاد کرتے ہوئے اس کے سوا دوسری سمت منہ کر کے نماز پڑھ لی اور یہ ان میں سے ہو جن کے لیے اجتہاد ممکن ہوتا ہے تو اس کی نماز نہ ہوگی اور جب کسی نے اجتہاد اور استدلال کرتے ہوئے نماز پڑھی پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کے لئے ظاہر ہوا کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی ہے تو وہ نماز کا اعادہ کرے اگر نماز کا وقت ہو، اور یہ اس پر واجب نہیں ہے، کیونکہ اس نے اپنا فرض اس طریقہ پر ادا کیا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝١٧

''کیا وہ ذات جس نے سب کچھ پیدا فرمایا اس کی مانند ہو سکتی ہے جس نے کچھ بھی نہیں بنایا کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے۔''

قولہ تعالیٰ: أَفَمَنْ يَخْلُقُ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ مراد بت ہیں۔ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ان بتوں کے بارے خبر دی گئی ہے جو نہ کچھ بنا سکتے ہیں اور نہ کسی کو نقصان اور نفع پہنچا سکتے ہیں، جیسا کہ اس کے بارے خبر دی جارہی ہے جو اس طور پر عمل کرتا ہے جیسے عمل کا عرب اس سے مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان (بتوں) کی عبادت کرتے تھے اور اسے لفظ مَنْ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ یہ قول ہے أَلَهُمْ أَرْجُلٌ (الاعراف: 195) (کیا ان کے پاؤں ہیں۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ذکر میں ضمیر خالق کے ساتھ ملنے کی وجہ سے ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے: إشتبه علی الراکب و جمله فلا ادری مَن ذا و مَن ذا۔ (مجھ پر سوار اور اس کا اونٹ مشتبہ ہیں پس میں نہیں جانتا یہ کون ہے اور یہ کون ہے۔) اگرچہ ان دونوں میں سے ایک انسان نہیں ہے۔ اور مہدوی نے کہا ہے: کہ مَنْ کے ساتھ باری تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے اور اس کے بارے ما کے ساتھ سوال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ما کے ساتھ اجناس کے بارے سوال کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جنس نہیں، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا جس وقت ان کو فرمایا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوسٰى ۝٤٩ (طہٰ) (پس تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ) اور یہ جواب نہ دیا جس وقت ان کو کہا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٢٣ (الشعراء) مگر من کے جواب کے ساتھ اور ما کے جواب سے اضراب کیا جس وقت سوال فاسد تھا۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: من کان قادرا علی خلق الاشیاء المتقدمة الذکر کان بالعبادة أحق فمن هو مخلوق لا یضر ولا ینفع۔ (جو ان تمام چیزوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے جن کا ذکر پہلے ہوا وہ اس سے زیادہ عبادت کا مستحق ہے جو مخلوق ہے اور نفع و نقصان نہیں دے سکتا۔) هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (لقمان: 11) (یہ تو ہے اللہ کی تخلیق (اے مشرکو!) اب ذرا دکھاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے اس کے سوا؟ (کچھ بھی نہیں) اور اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (الاحقاف: 4) (مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے۔)

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٨ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝١٩

''اور اگر تم شمار کرنا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم انہیں گن نہیں سکو گے، یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اس کا ذکر سورۂ ابراہیم میں گزر چکا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اسے بھی جو تم چھپاتے ہو اور اسے بھی جو تم ظاہر کرتے ہو...... یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور جو لوگ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (غیروں کو) وہ نہیں پیدا کر سکتے کوئی چیز، بلکہ وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ مردہ ہیں وہ زندہ نہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ کب انہیں اٹھایا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قرأۃ عامہ تَدْعُوْنَ، تا کے ساتھ ہے کیونکہ اس کا ماقبل خطاب ہے۔ ابوبکر نے عاصم سے اور ہبیرہ نے حفص سے يَدْعُوْنَ یا کے ساتھ روایت کیا ہے، اور یہی یعقوب کی قرأت ہے...... اور رہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ تو سب خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ ہیں، سوائے اس کے جو ہبیرہ نے حفص سے اور انہوں نے حضرت عاصم سے روایت کیا ہے کیونکہ انہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا یعنی وہ کسی شے کو پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ (بلکہ وہ خود پیدا کیے گئے ہیں)۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ای ھم اَمْوَاتٌ یعنی وہ مردہ ہیں، مراد بت ہیں، نہ ان میں روحیں ہیں، نہ وہ سنتے ہیں اور نہ وہ دیکھتے ہیں، یعنی وہ جمادات ہیں تو تم کیسے ان کی عبادت کرتے ہو حالانکہ حیات کے سبب تم ان سے افضل ہو۔ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ (یعنی بت) نہیں سمجھتے۔ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ سلمی نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اِیَّان پڑھا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں، اور یہ يُبْعَثُوْنَ کے سبب محل نصب میں ہے اور یہ استفہام کے معنی میں ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ اور انہیں اس سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آدمیوں کو تعبیر کیا جاتا ہے (2)، کیونکہ وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ان کے بارے عقل و سمجھ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں اور وہ ان کی اللہ تعالیٰ کے پاس شفاعت کریں گے، پس ان کا خطاب اسی انداز پر جاری ہوا۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بتوں کو اٹھائے گا اور ان کے لئے ارواح ہوں گی پس وہ ان کی عبادت سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے، اور وہ دنیا میں جمادات ہیں وہ نہیں جانتے کہ کب اٹھائیں جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بتوں کو اٹھایا جائے گا اور ان میں روحوں کو ملایا جائے گا اور ان کے ساتھ ان کے شیاطین بھی ہوں گے پس وہ اپنی پوجا کرنے والوں سے برأت کا اظہار کریں گے، پھر شیاطین اور مشرکین کو جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دے دیا جائے گا، اور کہا گیا ہے: بے شک بتوں کو ان کی پوجا کرنے والوں سمیت قیامت کے دن جہنم میں پھینکا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 386 2۔ ایضاً

اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) (اے مشرکو!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ پر کلام مکمل ہو گئی ہے۔ پھر آغاز کیا اور مشرکین کا وصف بیان کیا کہ وہ مردہ ہیں، اور یہ موت کفر کی موت ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ یعنی کفار نہیں جانتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا، یعنی اٹھائے جانے کا وقت کیا ہے، کیونکہ بعث بعد الموت کے بارے ایمان ہی نہیں رکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کرنے کی تیاری کریں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ نہیں جانتے کہ قیامت کب آئے گی، شاید وہ قریب آچکی ہو۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۲۲ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝۲۳

تمہارا خدا (بس) خدائے واحد ہے، پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر ان کے دل منکر ہیں اور وہ مغرور ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ پسند نہیں کرتا غرور و تکبر کرنے والوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ جب یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا محال ہے تو اب یہ بیان کیا کہ معبود واحد و یکتا ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے۔ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ یعنی ان کے دل نہ کوئی وعظ و نصیحت قبول کرتے ہیں اور نہ ان میں ذکر اثر انداز ہوتا ہے، یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ یعنی وہ حق قبول کرنے سے تکبر اور غرور کرنے والے ہیں۔ استکبار کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہر وہ قول و عمل جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں پس وہ انہیں بدلہ اور جزا دے گا۔

خلیل نے کہا ہے: لَا جَرَمَ کلمہ تحقیق ہے اور یہ صرف جواب کے لئے آتا ہے۔ کہا جاتا ہے: فعلوا ذالك (انہوں نے ایسا کیا)، فیقال: لا جرم سیندمون۔ (تو کہا جائے گا: یقیناً وہ نادم اور شرمندہ ہوں گے) یعنی یہ لازم ہے کہ ان کے لئے جہنم ہو۔ اس بارے میں مکمل بحث سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ یعنی نہ وہ انہیں ثواب دیتا ہے اور نہ ان کی تعریف کرتا ہے۔ حضرت حسین بن علی سے روایت ہے کہ آپ مساکین کے پاس سے گزرے درآنحالیکہ انہوں نے اپنے سامنے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے اور وہ کھا رہے تھے تو انہوں نے کہا: اے ابا عبد اللہ! کھانا کھاؤ، تو آپ اترے اور ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ پس جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا: تحقیق میں نے تمہاری دعوت قبول کی ہے پس تم میری دعوت قبول کرو، تو وہ اٹھ کر آپ کے ساتھ آپ کے گھر کی طرف چلے تو آپ نے انہیں کھانا کھلایا اور انہیں پانی پلایا اور انہیں (تحائف سے) نوازا، اور پھر وہ واپس چلے گئے، علماء نے کہا ہے: سوائے تکبر کے ہر گناہ کو چھپانا اور اسے مخفی

رکھنا ممکن ہوتا ہے، کیونکہ یہ ایسا فسق ہے جس کا اعلان لازم ہوتا ہے، اور یہ تمام گناہوں کی اصل ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''بے شک تکبر کرنے والے قیامت کے دن چیونٹیوں کی مثل اٹھائے جائیں گے ان کے تکبر کی وجہ سے لوگ انہیں اپنے قدموں کے ساتھ روند ڈالیں گے۔'' یا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''محشر میں ان کے اجسام چھوٹے ہو جائیں گے یہاں تک کہ ان کا چھوٹا ہونا انہیں نقصان دے گا اور جہنم میں ان کے اجسام بڑے ہو جائیں گے، یہاں تک کہ ان کا بڑا ہونا انہیں نقصان اور تکلیف دے گا (1)''۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ۝

''اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے، کہتے ہیں: (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ یعنی جب ان سے پوچھا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان لوگوں میں سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل بعث بعد الموت کے منکر ہیں مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے؟۔ کہا گیا ہے: کہنے والا النضر بن حارث تھا، اور یہ آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ حیرہ کی طرف نکلا اور کلیلہ و دمنہ کی کہانیاں خرید کر لایا اور وہ قریش میں پڑھتا اور کہتا تھا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب پر نہیں پڑھتے ہیں مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے؛ یعنی یہ ہمارے رب کی طرف سے نازل کردہ کتاب نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک مومنین ہی بطور آزمائش ان کو یہ کہتے تھے تو وہ اپنے اس قول کے ساتھ جواب دیتے: اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (یہ پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں) پس انہوں نے ایک شے کے انکار کے ساتھ یہ اقرار کر لیا کہ وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ہیں۔ اور اَسَاطِيْرُ سے مراد جھوٹے اور باطل واقعات ہیں۔ یہ سورۃ الانعام میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ میں گفتگو اسی طرح ہے جیسے مَاذَا يُنْفِقُوْنَ میں ہے۔ اور قولہ: اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، اور تقدیر عبارت ہے: الذی أنزله أساطير الاولين (وہ جو اس نے اتارا ہے وہ پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔)

لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝

''تاکہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں جہالت سے، کتنا برا (اور گراں) ہے یہ بوجھ جسے وہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ کہا گیا ہے: یہ لام کی ہے، اور یہ اپنے ماقبل سے متعلق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ لام عاقبت ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (القصص: 8) سنو (تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6677

باعث رنج والم بنے) یعنی قرآن کریم اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کے قول نے انہیں اس تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں۔ کَامِلَةً (مکمل بوجھ) یعنی وہ اس میں سے کوئی چیز بھی نہ چھوڑیں اس مصیبت کی وجہ سے جو انہیں دنیا میں اپنے کفر کے سبب پہنچی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ لام امر ہے، اور اس کا معنی جھڑکنا اور دھمکانا ہے۔ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ اٹھائیں گے ان لوگوں کا بوجھ بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا اور جن کو گمراہ کیا گیا ہے ان کے گناہ سے کوئی شے کم نہیں ہوگی۔ حدیث طیبہ میں ہے: ”جس بھی دعوت دینے والے نے گمراہی کی طرف دعوت دی اور اس کی اتباع اور پیروی کی گئی تو بلاشبہ اس پر ان کے بوجھوں کی مثل بوجھ ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع کی مگر ان کے بوجھوں سے کوئی شے کم نہ ہوگی، اور جس بھی دعوت دینے والے نے ہدایت کی طرف دعوت دی اور اس کی اتباع و پیروی کی گئی تو اس کے لئے ان کے اجروں کی مثل اجر ہوگا مگر ان کے اجروں میں سے کوئی شے کم نہ ہوگی۔“ اسے امام مسلم نے اسی معنی میں بیان کیا ہے۔ اور مِنْ جنس کے لئے ہے تبعیض کے لئے نہیں، پس گمراہی کی دعوت دینے والوں پر ان کے بوجھوں کی مثل ہوگا جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ اور قولہ: بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی وہ مخلوق کو گمراہ کرتے ہیں اس سے جاہل اور غافل رکھتے ہوئے جو ان پر گناہ لازم ہو رہے ہیں، کیونکہ اگر وہ جان لیں تو یہ انہیں گمراہ نہ کر سکیں۔ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ یعنی کتنا برا ہے وہ بوجھ جسے وہ اٹھا رہے ہیں۔ اور اس آیت کی نظیر یہ ہے وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت:13) (اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کئی بوجھ (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ) اور قول باری تعالیٰ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام:64) کے بیان میں سورۃ الانعام کے آخر میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

”(دعوت حق کے خلاف) مکر وفریب کیا کرتے تھے وہ لوگ جو ان منکرین سے پہلے گزرے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی، پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے اور آ گیا ان پر عذاب جہاں سے انہیں خیال وگمان بھی نہ تھا۔“

قولہ تعالیٰ: قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی وہ اقوام جو سابقہ رسولوں کے ساتھ کفر کرنے کے سبب ان سے سبقت لے گئی ہیں (وہ دعوت حق کے خلاف مکر وفریب کیا کرتی تھیں) لیکن حسین اور خوبصورت انجام رسل علیہم السلام کا ہوا۔ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ حضرت ابن عباس اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہم وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ نمرود بن کنعان اور اس کی قوم نے آسمان پر چڑھنے اور اس کے باسیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، پس انہوں نے ایک محل بنایا تاکہ وہ اس سے اوپر چڑھ سکیں اس کے بعد کہ اس نے گدھوں کے ساتھ بنایا جو بنایا، پس وہ گر پڑا۔ اس کا بیان سورۂ ابراہیم کے آخر میں گزر چکا ہے۔

اور فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا امر عمارت تک پہنچا یا تو زلزلہ کی صورت میں یا ہوا کی صورت میں اور اس نے اسے

گرا دیا۔ حضرت ابن عباس اور وہب رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: آسمان کی طرف اس محل کی طوالت پانچ ہزار گز تھی، اور اس کا عرض تین ہزار گز تھا۔ اور حضرت کعب اور مقاتل نے بیان کیا ہے: اس کا طول دو فرسخ تھا، پس ہوا چلی اور اس نے اس کا سرا سمندر میں پھینک دیا اور باقی ان پر گر پڑی۔ اور جب وہ محل گر گیا تو اس دن خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے لوگوں کی زبانیں مخلوط ہو گئیں، گڑگڑانے لگیں پس وہ تہتر زبانوں میں کلام کرنے لگے، پس اسی وجہ سے اس کا نام بابل رکھا گیا ہے، اور اس سے قبل ان کی زبان صرف سریانی تھی۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ ابن ہرمز اور ابن محیصن نے السُّقُفُ سین اور قاف دونوں کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے سین کو ضمہ دیا ہے اور قاف کو تخفیفاً ساکن کر دیا ہے؛ جیسا کہ وَ بِالنَّجْمِ کے تحت دو وجہوں کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ سقف کی جمع ہو۔ اور القواعد سے مراد عمارت کی بنیادیں اور جڑیں ہیں۔ اور جب بنیادیں خراب ہو جائیں تو عمارت گر جاتی ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: مِنْ فَوْقِهِمْ ابن الاعرابی نے کہا ہے: اس کے ساتھ تو کید لگائی تا کہ وہ تجھے بتائے کہ وہ اس کے نیچے رہ رہے تھے۔ اور عرب کہتے ہیں: خرّ علینا سقف ووقع علینا حائط (چھت یا دیوار ہم پر گر پڑی) جب وہ اس کے مالک ہوں اگرچہ وہ ان پر نہ بھی گرے۔ پس فرمایا: مِنْ فَوْقِهِمْ لائے تا کہ وہ اس شک کو نکال دے جو کلام عرب میں پایا جاتا ہے، پس فرمایا: مِنْ فَوْقِهِمْ یعنی وہ ان پر گرا اور وہ اس کے نیچے تھے پس وہ ہلاک ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی نہ بچا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سقف سے مراد آسمان ہے، یعنی بے شک اس آسمان کی طرف سے ان پر عذاب آیا جو ان کے اوپر ہے؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ یہ تمثیل ہے، اور اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا تو وہ اس کی طرح ہو گئے جس پر اس کی عمارت گر پڑی ہو۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا پس وہ اس کی طرح ہو گئے جس کی عمارت گر پڑی ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب اور ان کی تدبیر کو باطل کر دیا اور وہ ہلاک ہو گئے جیسے وہ ہلاک ہو جاتا ہے جس پر اس کے اوپر سے چھت گر پڑے۔ اور اسی وجہ سے ان کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جن پر چھت گری، پس حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زید رضی اللہ عنہم نے وہ کہا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بخت نصر اور اس کے ساتھی تھے؛ یہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ بانٹنے والے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجر میں کیا ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور اس تاویل کی بنا پر تمثیل کی وجہ خارج ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَّ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ یعنی اس حیثیت سے کہ ان کا گمان تھا وہ امان میں ہیں (ان پر عذاب آ گیا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: (عذاب) سے مراد وہ مچھر ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے نمرود کو ہلاک کر دیا۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾

”اس کے بعد روز قیامت اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کرے گا اور (ان سے) پوچھے گا: کہاں ہیں وہ میرے

شریک جن کے بارے میں تم جھگڑا کیا کرتے تھے؟ کہیں گے وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے کہ بلاشبہ آج ہر قسم کی رسوائی اور بربادی کافروں کے لئے ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں عذاب کے ساتھ رسوا کرے گا اور اس کے ساتھ انہیں ذلیل کرے گا اور ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے گا۔ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ اور ان سے پوچھے گا: تمہارے گمان میں اور تمہارے دعوے کے مطابق جو میرے شریک ہیں وہ کہاں ہیں، یعنی وہ معبود جن کی تم میرے سوا عبادت اور پرستش کرتے ہو، اور یہ سوال برائے زجر و توبیخ ہے۔ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ یعنی جن کے سبب تم میرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ عداوت رکھتے تھے اور جھگڑا کرتے تھے، پس چاہئے کہ وہ تم سے اس عذاب کو دور ہٹائیں۔ اور ابن کثیر نے شُرَكَايَ یا کو مفتوح بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت نافع نے تُشَاقُّوْنِ اضافت کی بنا پر نون کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تعادوننی فیهم (تم میرے ساتھ ان کے بارے میں جھگڑا کیا کرتے تھے) اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی ملائکہ نے کہا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد مومنین ہیں۔ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ یعنی بلاشبہ قیامت کے دن رسوائی اور ذلت وَالسُّوْٓءَ اور عذاب، عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کافروں کے لئے ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

''وہ کافر جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ اپنے پر ظلم کر رہے ہیں، تب وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم تو کوئی برا کام نہیں کیا کرتے تھے (اہل علم جواب دیں گے) نہیں نہیں (تم بڑے بدکار تھے) بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو (برے کام) تم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ یہ کفار کی صفات میں سے ہے۔ اور ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے؛ ای وهم ظالمون أنفسهم یعنی درآنحالیکہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے ہیں جب انہوں نے انہیں ہلاکت کی جگہوں میں ڈال دیا۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ یعنی تب انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور موت کے وقت تابعدار بن گئے اور کہنے لگے: مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ہم تو کوئی برا کام یعنی شرک وغیرہ نہیں کیا کرتے تھے۔ پس ملائکہ انہیں کہیں گے: بَلٰٓى نہیں بلکہ تم تو بہت برے اعمال کیا کرتے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اعمال تم کیا کرتے تھے) اور عکرمہ نے کہا ہے: یہ آیت مدینہ طیبہ میں ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں اسلام لائے اور انہوں نے ہجرت نہ کی، تو قریش نے انہیں بدر کی طرف بالجبر نکالا اور وہ وہاں قتل کر دیئے گئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یعنی وہ جنہیں فرشتے ان کی ارواح قبض کر کے موت دیتے ہیں۔ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وہ اپنے مقام میں مکہ مکرمہ رہنے اور ہجرت چھوڑنے کے سبب اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ فَاَلْقَوُا

السَّلَمَ یعنی انہوں نے ان کے ساتھ نکلنے میں ان کی تابعداری کی۔ اور اس میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ صلح ہو، یہ اخفش نے کہا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ تابعداری اختیار کرنا، یہ قطرب نے کہا ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ خضوع ہو، یہ مقاتل نے کہا ہے۔ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ یعنی کفر میں سے کوئی برا عمل ہم نہیں کیا کرتے تھے۔ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تمہارے اعمال کفار کے اعمال کی طرح ہی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بعض مسلمانوں نے جب مومنوں کی تعداد کو کم دیکھا تو وہ مشرکوں کی طرف لوٹ گئے۔ پس یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پہلے قول کے مطابق کوئی کافر اور منافق دنیا سے نہیں جائے گا یہاں تک کہ وہ تابعدار ہو جائے گا اور سر تسلیم ختم کرلے گا، اور خضوع اختیار کرے گا اور اپنی ذلت کا اظہار کرے گا لیکن اس وقت تو یہ اور کوئی ایمان انہیں فائدہ نہیں دے گا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (غافر:85) (پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب) یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے بے شک کفار ضرب اور ذلت ورسوائی کے ساتھ مرتے ہیں، اور اسی طرح سورۃ الانعام میں بھی ہے۔ اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔

فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹

''(اے کفار!) پس داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں سے تمہیں ہمیشہ رہنا ہوگا وہاں، بے شک برا ٹھکانا ہے غرور و تکبر کرنے والوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ یعنی یہ ان کی موت کے وقت کہا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے لئے عذاب قبر کے بارے بشارت اور اطلاع ہے، کیونکہ یہ کافروں کے لئے جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: دوسرے درکہ والا اس تک نہیں پہنچے گا مگر پہلے درکہ میں داخل ہونے کے ساتھ پھر دوسرے اور پھر تیسرے میں آگے اسی طرح۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ ہر درکہ کا الگ دروازہ ہے، پس بعض ایک دروازے سے داخل ہوں گے اور بعض دوسرے دروازے سے۔ واللہ اعلم۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی وہ اس میں پڑے رہیں گے۔ فَلَبِئْسَ مَثْوَى یعنی کتنا برا مقام ہے۔ الْمُتَكَبِّرِيْنَ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ایمان لانے سے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے تکبر کیا، تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے قول حق کے ساتھ ان کی وضاحت کی: اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۳۵ (الصافات) (کفار کا یہ حال ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا تو یہ تکبر کرنے لگتے ہیں۔)

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۱ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا

الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور (یونہی) پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ وہ کیا ہے جو اتارا تمہارے رب نے؟ انہوں نے کہا: (سراپا) خیر! جنہوں نے اچھے کام کئے اس دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لئے) بہتر ہے اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر۔ (ان کے لئے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں ان کے لئے وہاں ہر وہ چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے، یوں بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو، وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں: (اے نیک بختو!) سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوْا خَيْرًا یعنی انہوں نے کہا: سراپا خیر نازل کیا اور کلام مکمل ہو گئی۔ اور مَاذَآ اس بنا پر واحد اسم ہے۔ عرب سے کوئی آدمی ایام حج میں مکہ مکرمہ آتا تھا اور مشرکوں سے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتا تو وہ کہتے: ساحر ہے یا شاعر ہے یا کاہن ہے یا مجنون ہے۔ اور وہ مومنوں سے پوچھتا تو وہ کہتے: اللہ تعالیٰ نے ان پر خیر اور ہدایت نازل کی ہے، اور اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قیامت کے دن یہ اہل ایمان کو کہا جائے گا۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اگر کہا جائے: اس قول باری تعالیٰ: اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ میں جواب مرفوع اور اس قول: خَيْرًا میں منصوب کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین تنزیل قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لائے، تو گویا انہوں نے کہا: وہ جو کچھ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں وہ پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔ اور مومنین نزول کے ساتھ ایمان لائے پس انہوں نے کہا: اس نے سراپا خیر نازل کیا(1)۔ اور اعراب کے اعتبار سے اس کے معنی کا یہی مفہوم ہے، والحمد للہ۔

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ کہا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ من جملہ ان لوگوں کے کلام سے ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور یہاں حَسَنَةٌ سے مراد جنت ہے، یعنی جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تو اس کے لئے کل (قیامت کے دن) جنت ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا یعنی ان کے لئے آج دنیا میں نصرت و فتح اور غنیمت جیسی بھلائی ہے۔ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ یعنی آخرت میں جو وہ جنت کا ثواب پائیں گے وہ دار دنیا سے بہتر اور اعظم ہوگا، دنیا کے فناہ ہونے کی وجہ سے اور آخرت کے باقی رہنے کی وجہ سے۔ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ اس میں دو وجہیں ہیں: حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور پرہیزگاروں کا بہت اچھا اور عمدہ گھر دنیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس میں عمل کر کے آخرت کا ثواب کمایا اور وہ جنت میں داخل ہوئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور پرہیزگاروں کا بہت ہی عمدہ گھر آخرت ہے؛ اور یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اس بنا پر جَنّٰتُ عَدْنٍ الدار سے بدل ہوگا، پس اسی وجہ سے یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 14، صفحہ 210، زیر آیت ہذہ

مرفوع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس تقدیر پر مرفوع ہے ھی جنات عدن پس یہ قول باری تعالیٰ: دَارُ الْمُتَّقِيْنَ کے لئے بیان ہوگا۔ یا یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہوگا، اور تقدیر عبارت ہوگی: جَنّٰتُ عَدْنٍ نِعْمَ دَارُ الْمتقين۔ يَّدْخُلُوْنَهَا یہ صفت کے محل میں ہے، بمعنی مدخولة (جس میں داخل ہوا جائے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: جَنّٰتُ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر يَّدْخُلُوْنَهَا ہے اور اسی بنا پر حسن کا قول بیان کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ یعنی ان کے لئے اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی وہ تمنا اور خواہش کریں گے۔ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ یعنی اسی قسم کی جزا اللہ تعالیٰ متقین کو عطا فرماتا ہے۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ اعمش اور حمزہ نے دونوں مقامات پر یا کے ساتھ يَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ پڑھا ہے، اور اسے ہی ابو عبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک قریش کا گمان ہے کہ ملائکہ مونث ہیں پس تم انہیں مذکر ذکر کرو۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ قرأت کی ہے، کیونکہ اس سے مراد ملائکہ کی جماعت ہے۔ اور طَيِّبِيْنَ میں چھ اقوال ہیں: (۱) طَيِّبِيْنَ درآنحالیکہ وہ شرک سے پاک ہیں۔ (۲) وہ صالحین ہیں۔ (۳) وہ اپنے افعال اور اپنے اقوال کا تزکیہ کرنے والے ہیں، انہیں پاک کرنے والے ہیں۔ (۴) اپنے آپ کو خوش کرنے والے ہیں اس پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے جو وہ اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب حاصل کر رہے ہیں۔ (۵) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ اپنے نفوس کو پاک کرنے والے ہیں۔ (۶) طَيِّبِيْنَ خوش ہو رہے ہیں کہ ان کی وفات اچھی اور آسان ہوئی اس میں کوئی مشکل اور دکھ درد نہیں، بخلاف اس کے کہ جب فرشتے کسی کافر اور اوباش کی روح قبض کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ سلام ان کے لئے وفات کے بارے میں ڈراوا ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ان کے لئے جنت کی بشارت ہو، کیونکہ سلام امان ہے۔ اور ابن المبارک نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے حیوہ نے بیان کیا انہوں نے کہا مجھے ابو صخر نے محمد بن کعب قرظی سے خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا: جب بندہ مومن کی سانس (مراد روح ہے) جمع ہو جاتی ہے تو حضرت ملک الموت علیہ السلام اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: السلام علیك ولي الله، الله يقرأ عليك السلام (تجھ پر سلام ہو اے اللہ تعالیٰ کے دوست، اللہ تجھ پر سلام فرما رہا ہے)، پھر وہ اس آیت کے ساتھ نکالتا ہے الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ۔(1) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جب حضرت ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور وہ بندہ مومن کی روح قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں: تیرا رب تجھے سلام فرماتا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک بندۂ مومن اپنے بعد اپنی اولاد کی اصلاح سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کی آنکھ اس سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے۔ اور وہاں ہم نے اس بارے میں آنے والی احادیث بھی ذکر کی ہیں، والحمد لله۔ اور قول باری تعالیٰ: ادْخُلُوا الْجَنَّةَ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے: اس کا معنی ہو تمہیں جنت میں داخل ہونے کی بشارت ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ انہیں یہ آخرت میں کہیں

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 123

گے۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی ان نیک اعمال کے باعث جو تم دنیا میں کرتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

''یہ مشرک کس کے منتظر ہیں بجز اس کے کہ آجائیں ان کے پاس (عذاب کے) فرشتے یا آجائے آپ کے رب کا (اٹل) حکم، یونہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان کے پیشرو تھے، اور نہیں زیادتی کی تھی ان پر اللہ تعالیٰ نے بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر زیادتی کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اس میں ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی کفار انتظار نہیں کر رہے ہیں مگر یہ کہ ملائکہ ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے ان کے پاس آئیں درآنحالیکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور کسائی اور خلف نے یاتیھم الملائکۃ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ یعنی یا تیرے رب کا اٹل حکم عذاب کے بارے میں آجائے چاہے وہ قتل کی صورت میں ہو جیسا کہ یوم بدر کو ہوا یا دنیا میں زلزلہ اور خسف (دھنسا دینا) ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد یوم قیامت ہے۔ اور وہ لوگ ان چیزوں کے منتظر اس لئے نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ایمان نہیں لائے، بلکہ ایمان سے ان کے انکار نے ان پر عذاب واجب کر دیا، پس اس کی نسبت ان کی طرف کی گئی، یعنی ان کا انجام عذاب ہے۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی وہ کفر پر مصر رہے تو اللہ تعالیٰ کا اٹل حکم ان پر آ گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب دے کر اور انہیں ہلاک کر کے ان پر کوئی زیادتی اور ظلم نہیں کیا، بلکہ شرک کر کے انہوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''پس ملی انہیں سزا ان کے برے اعمال کی اور گھیر لیا انہیں اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا کہا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے؛ تقدیر عبارت ہے: کذالک فعل الذین من قبلھم فاصابھم سیئات ما عملوا (اسی طرح انہوں نے کیا جو ان سے پہلے ہوئے ہیں پس انہیں ان کے برے اعمال کی سزا ملی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ خود اپنے آپ سے زیادتی کر رہے ہیں۔ پس انہیں ان کے کفر کی سزا اور ان کے خبیث اعمال کا بدلہ ملا ہے۔ وَ حَاقَ بِهِمْ یعنی ان کا احاطہ کر لیا اور انہیں گھیر لیا مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ یعنی ان کے استہزا کی سزا نے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

''اور کہنے لگے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا کہ اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو ہم عبادت نہ کرتے اس کے سوا کسی اور چیز کی نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو، ایسی ہی (بے سروپا) باتیں کیا کرتے تھے ان کے پیشرو۔ (اے سننے والے!) کیا رسولوں کے ذمہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ وہ صاف طور پر (حکم الٰہی) پہنچا دیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ای شیئا (یعنی مشرکوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی شے کی عبادت نہ کرتے) اور اس میں من صلہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے: انہوں نے یہ قول استہزاء کیا، اور اگر وہ یہ قول اعتقاد اور یقین کے ساتھ کہتے تو وہ مومن ہوتے۔ اس کا معنی اور ترکیب مفصل طور پر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی اسی تکذیب اور استہزا کی مثل انہوں نے بھی رسولوں سے کی جو ان سے پہلے تھے پس وہ ہلاک کر دیئے گئے۔ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ یعنی رسل علیہم الصلوات والتسلیمات پر سوائے تبلیغ (حکم الٰہی پہنچانے) کے اور کچھ نہیں، اور رہی ہدایت تو وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۶﴾

''اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول (جو انہیں یہ تعلیم دے) کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور دور رہو طاغوت سے سو ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن پر گمراہی مسلط ہو گئی، پس سیر و سیاحت کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کس قدر عبرت ناک تھا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (تحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (یہ تعلیم دینے کے لئے) کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) اور اسے واحد و یکتا مانو۔ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود کو چھوڑ دو جیسا کہ شیطان، کاہن، بت اور ہر وہ جو گمراہی کی طرف دعوت دے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ یعنی ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنی عبادت کی طرف ہدایت دی، راہنمائی فرمائی۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے بارے پہلے (گمراہی کا) فیصلہ ہو چکا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے کفر پر ہی مرے۔ اور اس سے قدریہ کا رد ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ہدایت دی ہے اور انہیں ہدایت کی توفیق دی ہے، اور اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ اور یہ بحث کئی مقامات پر پہلے گزر چکی ہے۔ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ یعنی تم زمین میں غور و فکر کرتے ہوئے (اور عبرت حاصل کرتے ہوئے) سیر و سیاحت کرو۔ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ (اور اپنی آنکھوں سے دیکھو ان جھٹلانے والوں کے معاملے کا انجام

کیسے ہوا (یعنی) ان کی بربادی، عذاب اور ہلاکت کی طرف دیکھو۔)

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝۳۷

''(اے حبیب!) آپ خواہ کتنے ہی حریص ہوں ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر مگر اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا جنہیں وہ (پیہم سرکشی کے باعث) گمراہ کر دیتا ہے اور نہیں ان کے لئے کوئی مدد کرنے والا۔''

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اپنی جد و جہد اور کوشش کے ساتھ ان کے ہدایت یافتہ ہونے کی خواہش اور طلب کریں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ تو بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے وہ گمراہ کر دے، یعنی جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلے گمراہی کا فیصلہ ہو چکا ہو وہ اسے ہدایت نہیں دیتا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور اہل کوفہ کی قرأت ہے۔ پس یَهْدِیْ فعل مستقبل ہے اور اس کا ماضی هَدٰی ہے۔ اور مَنْ، یَهْدِیْ کے سبب محل نصب میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ هدی یهدی بمعنی اهتدی یهتدی ہو، اسے ابو عبید نے فراء سے روایت کیا ہے اس نے کہا: جیسا کہ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰی (یونس: 35) بمعنی یهتدی قرأت کی گئی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے فراء کے بغیر اسے روایت کیا ہو، اور وہ اس بارے میں متہم نہیں ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن زید سے مجھے بیان کیا گیا ہے گویا لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ کا معنی ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم ہوا اور اس کے نزدیک پہلے اس کا فیصلہ ہو چکا ہو، فرمایا: یَهْدِیْ بمعنی یهتدی نہیں ہو سکتا مگر تبھی جب وہ یُهَدِّی یا یُهْدِیْ ہو۔ اور فراء کے قول کے مطابق یَهْدِیْ بمعنی یهتدی ہے، پس مَنْ محل رفع میں ہوگا اور مَنْ کی طرف لوٹنے والی ها ضمیر صلہ میں محذوف ہوگی، اور اِنَّ کے اسم کی طرف لوٹنے والی ضمیر یُضِلُّ میں پوشیدہ ہے۔ اور باقیوں نے لَا یُهْدٰی یا کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے ابو عبید اور ابو حاتم نے اختیار کیا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے کوئی ہدایت دینے والا اسے ہدایت نہیں دے سکتا، من اضله الله لم یهده هاد اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ (الاعراف: 186) (جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے) اور مَنْ اس بنا پر محل رفع میں ہے کہ وہ اسم مالم یُسَمَّ فاعلہ ہے، اور یہ بمعنی الذی ہے، اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر اس کے صلہ سے محذوف ہے، اور فَاِنَّ اللّٰهَ میں اِنَّ کے اسم کی طرف لوٹنے والی ضمیر یُضِلُّ میں پوشیدہ ہے۔ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ ؕ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۸

''اور بڑی شد و مد سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (دوبارہ) زندہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ جو (ایک بار) مر جاتا ہے، ہاں ضرور زندہ کرے گا یہ اس کا وعدہ ہے اس پر لازم ہے اس کو پورا کرنا لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ یہ ان کی کارکردگی پر اظہار تعجب ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں

کھاتے ہیں اور انہیں پختہ کرنے میں خوب مبالغہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جو ایک بار مر جاتا ہے۔
اور اظہار تعجب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی قسمیں کھاتے ہیں لیکن پھر اسے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز قرار دیتے ہیں۔ اور ابوالعالیہ نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی کا ایک مشرک پر قرض تھا پس اس نے اس کا تقاضا کیا(1)، اور اس کے کلام میں یہ ہے: والذی أرجوه بعد الموت انه لکذا (وہ جس کی میں موت کے بعد امید رکھتا ہوں بے شک وہ اس طرح ہے) تو مشرک نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جو ایک بار مر جاتا ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ایک آدمی نے کہا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما، بے شک بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موت کے بعد قیامت سے پہلے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور وہ اس آیت کی تاویل بیان کرتے ہیں، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ کہا ہے! بلاشبہ یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہے، اگر قیامت سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوبارہ زندہ کیا جانا ہوتا تو ہم ان کی بیویوں سے نکاح نہ کرتے اور نہ ان کی میراث تقسیم کرتے(2)۔

بَلٰی یہ ان کا رد ہے؛ یعنی نہیں بلکہ وہ ضرور انہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ اس کا قول: یبعثهم وعدہ پر دلالت کرتا ہے، یعنی اس نے دوبارہ زندہ کرنے کا سچا اور پختہ وعدہ فرما رکھا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اور بخاری میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے میری تکذیب کی ہے حالانکہ اس کے لئے یہ مناسب نہیں۔ اور اس نے مجھے سب وشتم کیا ہے حالانکہ اس کے لئے یہ مناسب نہیں، پس اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ اس نے یہ کہا: وہ ہرگز مجھے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا، جیسے پہلی بار اس نے مجھے پیدا کیا۔ اور رہا اس کا مجھے سب وشتم کرنا تو یہ اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو) بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں واحد و یکتا ہوں بے نیاز ہوں اور نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے(3)"۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ وَ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِیْنَ ﴿۳۹﴾

"(وہ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا) تا کہ واضح کر دے ان پر وہ بات جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے تا کہ خوب جان لیں کافر کہ بلاشبہ وہی جھوٹے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: لِیُبَیِّنَ لَهُمُ تا کہ وہ ان کے لئے ظاہر کر دے، واضح کر دے۔ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ دوبارہ زندہ کئے جانے کا معاملہ جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ وَ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا تا کہ خوب جان لیں وہ جنہوں نے دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کیا اور اس پر قسمیں کھائیں۔ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِیْنَ کہ بلاشبہ وہی جھوٹے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 127 2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 126

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ وقال اتخذ اللہ، جلد 2، صفحہ 644

معنی ہے تحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تا کہ وہ ان کے لئے اس بات کی وضاحت کرے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور وہ جس میں مشرکوں اور مسلمانوں نے اختلاف کیا ہے وہ کئی امور ہیں: ان میں سے دوبارہ زندہ کرنا ہے، بتوں کی عبادت کرنا ہے، اور ان میں سے ایک قوم کا اس بارے اقرار کرنا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں لیکن آپ کی اتباع سے تقلید نے انہیں منع کیا ہے جیسا کہ حضرت ابوطالب۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَآ أَرَدْنَٰهُ أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝

"ہمارا فرمان کسی چیز کے لئے جب ہم ارادہ کرتے ہیں (اس کے پیدا کرنے کا) صرف اتنا ہے کہ ہم اسے حکم دیتے ہیں کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ اس پر پیدا کرنا کتنا آسان ہے، یعنی جب ہم ارادہ کریں گے کہ اسے ہم دوبارہ زندہ کریں جو ایک بار مر چکا ہے تو وہ ہم پر مشکل نہیں ہوگا اور نہ انہیں زندہ کرنے میں کوئی دقت ہوگی، اور علاوہ ازیں بھی جو کام ہم کرتے ہیں ان میں کوئی مشکل اور دقت نہیں، کیونکہ ہم اس کو کہتے ہیں تو ہو جا وہ ہو جاتا ہے۔ ابن عامر اور کسائی کی قرأت فَيَكُونَ ہے اور یہ أَن نَّقُولَ پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ وہ كُن کا جواب ہونے کی بنا پر منصوب ہو۔ اور باقیوں نے اسے مرفوع پڑھا ہے اس لئے کہ معنی یہ ہے فهو يكون (پس وہ ہو جاتا ہے) اور اس بارے میں مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے: لفظ شے کو ہر اس پر واقع کیا گیا ہے جو اپنی خلقت سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس معلوم ہو کیونکہ یہ اس کے قائم مقام ہے جو پالی گئی اور اس کا مشاہدہ کر لیا گیا۔ اور آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ قرآن کریم غیر مخلوق ہے، کیونکہ اگر اس کا قول: كُن مخلوق ہو تو پھر وہ ایک دوسرے قول کا محتاج ہے، اور دوسرا تیسرے کا محتاج ہوگا اور پھر اسی طرح تسلسل جاری رہے گا اور یہ محال ہے۔ اور اس پر دلیل موجود ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جملہ واقعات وحوادث کا ارادہ فرماتا ہے چاہے ان میں خیر ہو یا شر، وہ نفع بخش ہوں یا ضرر رساں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ جو کوئی اپنی سلطنت میں ایسی چیز دیکھتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہے اور وہ اس کا ارادہ بھی نہیں کرتا تو اس کی دو میں سے ایک وجہ ہے: یا تو وہ اس کے جاہل اور ناواقف ہونے کی وجہ سے ہے وہ اسے جانتا ہی نہیں، اور یا پھر اس وجہ سے کہ وہ مغلوب ہے اور اس کی طاقت نہیں رکھتا، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وصف میں ان میں سے کوئی شی بھی جائز نہیں ہے، تو پھر اس پر دلیل قائم ہوگئی کہ وہی بندوں کی کمائی کا خالق ہے، اور یہ محال ہے کہ وہ کوئی کام کرنے والا ہو اور اس کا ارادہ فرمانے والا نہ ہو، کیونکہ ہمارے اکثر افعال ہمارے مقصود اور ارادہ کے خلاف حاصل ہوتے ہیں، پس اگر حق سبحانہ وتعالیٰ بھی ارادہ کرنے والا نہ ہو تو یقیناً اس کے بھی وہ افعال بغیر قصد و ارادہ کے حاصل ہوں) اور یہ طبیعیین کا قول ہے، اور موحدوں کا اس کے خلاف اور اس کے فاسد ہونے پر اجماع ہے۔

وَٱلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ فِى ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا۟ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ ٱلْءَاخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ۝

"اور جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اس کے بعد کہ ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے تو ہم ضرور ان کو

دنیا میں بھی بہتر ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش! یہ جان لیتے۔“

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ہجرت کا معنی سورۃ النساء میں گزر چکا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یا اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنے وطن، اہل خانہ اور قرابتداروں کو چھوڑنا ہے، اور برائیوں اور گناہوں کو ترک کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فِی بمعنی لام ہے یعنی ھاجروا للہ۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا یعنی اس کے بعد کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں طرح طرح کا عذاب دیا گیا۔ یہ آیت حضرت صہیب، حضرت بلال، حضرت خباب اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اہل مکہ نے انہیں اذیتیں دیں حتیٰ کہ انہوں نے ان کو وہ کہا جس کا انہوں نے ارادہ کیا، پس جب انہوں نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرما ہو گئے، یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو جندل بن سہیل رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں، مشرکوں نے مکہ مکرمہ میں ان پر ظلم کیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا یہاں تک کہ ان میں سے ایک گروہ حبشہ چلا گیا، پھر اللہ کریم نے ان کے لئے دار الھجرۃ (مدینہ طیبہ) کو ٹھکانا اور قیام گاہ بنا دیا اور ان کے لئے اور مومنین کو انصار اور معاون و مددگار بنا دیا(2)۔ اور یہ آیت ان تمام کو شامل ہے۔ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً حسنہ کے بارے میں چھ اقوال ہیں: (۱) مدینہ طیبہ میں اترنا، یعنی ہم انہیں دنیا میں بہتر ٹھکانا دیں گے یعنی مدینہ طیبہ میں اتار دیں گے۔ یہ قول حضرت ابن عباس، حسن، شعبی اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ (۲) مراد رزق حسن ہے(3)، یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ (۳) ان کے دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت کرنا، یہ ضحاک نے کہا ہے۔ (۴) بے شک یہ سچ کی زبان ہے، اسے ابن جریج نے بیان کیا ہے۔ (۵) جو انہوں نے علاقے فتح کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ اور ان میں ان کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ (۶) جو ان کے لئے دنیا میں ثناء و تعریف باقی رہی، اور ان کی اولاد کو اعزاز و شرف حاصل ہوا۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے لئے جمع ہوا ہے۔ والحمد للہ۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ یعنی دار آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، یعنی وہ اس سے عظیم اور بڑا ہے کہ کوئی اس کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اسے جان سکے؛ وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْكًا كَبِیْرًا۝ (الانسان) (اور جدھر بھی تم وہاں دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی) لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ یعنی کاش یہ ظلم کرنے والے اسے جان لیتے۔ کہا گیا ہے: یہ ضمیر مومنین کی طرف راجع ہے، یعنی اگر وہ آخرت کا ثواب دیکھ لیتے اور اس کا معائنہ کر لیتے تو یقیناً وہ جان لیتے کہ وہ دنیا کے اجر سے بہت بڑا ہے۔ اور روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب مہاجرین کو عطیات دیتے تھے تو فرماتے: یہ وہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے اور جو تمہارے لئے آخرت میں ذخیرہ کیا ہے وہ اس سے زیادہ ہے، پھر آپ ان پر یہ آیت تلاوت کرتے(4)۔

الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۝

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 129
2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 128
3۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 129
4۔ تفسیر ماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 189

''جنہوں نے (مصائب میں) صبر کیا اور (مشکلات میں اب بھی) اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

کہا گیا ہے: الَّذِيْنَ یہ پہلے الَّذِيْنَ سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کی ضمیر سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین پر صبر کیا، اس پر ڈٹے رہے وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ وہ اپنے جملہ امور میں اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور بعض اہل تحقیق نے کہا ہے: مخلوق میں سے بہترین اور اعلیٰ وہ ہے جسے جب کوئی امر پیش آجائے تو وہ صبر کرے، اور جب وہ کسی کام سے عاجز ہو تو وہ توکل کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٣﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٤﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو ہم وحی بھیجتے ہیں ان کی طرف، پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔ (پہلے رسولوں کو بھی ہم نے) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ 'ذکر' تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور وفکر کریں۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ قرأۃ العامہ يُوْحٰى یعنی یا کے ساتھ اور حا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور حفص نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ نون عظمت اور حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت انہوں نے حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا اور کہا: اللہ تعالیٰ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا رسول بشر (انسان) ہو پس اس نے ہماری طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ ان کا جواب دیا: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ سے پہلے بھی امم ماضیہ کی طرف رسول بنا کر نہیں بھیجے مگر آدمی (یعنی مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔) فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ حضرت سفیان نے کہا ہے: یعنی تم ان سے پوچھ لو جو اہل کتاب میں سے مومن ہیں، اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اگر تم خود نہیں جانتے تو وہ تمہیں خبر دیں گے کہ تمام انبیاء علیہم السلام بشر (انسان) تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس تم اہل کتاب سے دریافت کر لو سو اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے لیکن وہ یہ اعتراف کریں گے کہ رسل علیہم السلام بشر تھے۔

اس کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل ذکر سے مراد اہل قرآن ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اہل علم ہیں، اور یہ دونوں قریب المعنی ہیں۔ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ کہا گیا ہے: بِالْبَيِّنٰتِ، ارسلنا کے متعلق ہے۔ اور کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ ای ما ارسلنا من قبلك بالبينات و الزبر الا رجالا ...... ای غیر رجال (یعنی ہم نے آپ سے پہلے واضح نشانیاں اور کتابیں سوائے مردوں کے نہیں بھیجیں) پس اس

میں اِلَّا بمعنی غیر ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: لا الہ الا اللہ ای غیر اللہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) اور یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے...... ہم ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں حذف ہے اور اس پر اَمۡ سَلۡنَا دلالت کرتا ہے۔ ای أرسلناھم بالبینات والزبر (یعنی ہم نے انہیں واضح نشانیوں کے ساتھ اور کتابوں کے ساتھ بھیجا)۔ اس قول کی بنا پر بِالۡبَیِّنٰتِ کا پہلے ارسلنا کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا کیونکہ اِلَّا کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کا تعلق ارسلنا مقدرہ کے ساتھ ہوگا، یعنی أرسلناھم بالبیّنَاتِ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تعلمون کا مفعول ہے اور با زائدہ ہے، یا اسے اَعۡنِی کو مضمر مان کر نصب دی گئی ہے۔

جیسا کہ اعشی نے کہا ہے:

ولیس مُجیراً ان أتی الحیَّ خائف　　　ولا قائِلا الا ھو المتعیَّبا (1)

ای اعنی اَلۡمُتَعَیَّبَ (یعنی اعنی فعل کے سبب یہ منصوب ہے۔) اور البینات کا معنی دلائل و براہین ہیں۔ اور الزبر سے مراد کتب ہیں (2)۔ اس کا ذکر آل عمران میں ہو چکا ہے۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ ذکر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ (اور ہم نے آپ کی طرف قرآن کریم نازل کیا) لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ تاکہ آپ اپنے قول و فعل سے لوگوں کو کھول کر بیان کریں اس کتاب میں موجود احکام اور وعد و وعید جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مراد اور مفہوم کو کھول کر بیان کرنے والے اور وضاحت کرنے والے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مجمل ذکر کیا ہے مثلاً نماز اور زکوٰۃ کے احکام اور علاوہ ازیں وہ چیزیں جنہیں مفصل ذکر نہیں کیا۔ یہ مکمل بحث مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ وَ لَعَلَّهُمۡ یَتَفَكَّرُوۡنَ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ یَاۡتِیَهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ اَوۡ یَاۡخُذَهُمۡ فِیۡ تَقَلُّبِهِمۡ فَمَا هُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۴۶﴾ اَوۡ یَاۡخُذَهُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۷﴾

"کیا بے خوف (اور نڈر) ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے برے مکر کئے کہ مبادا گاڑ دے اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں یا آ جائے ان پر عذاب اس طرح کہ (ان کو اس کی آمد کا) شعور ہی نہ ہو۔ یا پکڑ لے انہیں جب وہ (اپنے کاروبار میں) دوڑ دھوپ کر رہے ہوں پس نہیں وہ (اللہ کو) عاجز کرنے والے۔ یا پکڑ لے انہیں جب کہ وہ خوفزدہ ہو چکے ہوں، پس بے شک تمہارا رب بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ ای بالسیّات (کیا بے خوف (اور نڈر) ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے برائی اور گناہوں کے ساتھ مکر و فریب کئے، یہ ان مشرکوں کے لئے وعید ہے جنہوں نے اسلام کو باطل قرار دینے اور اسے مٹانے

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 132　　2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 133

کے حیلے اور کوششیں کیں۔ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ (کہ مبادا اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں گاڑ دے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جیسا کہ قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا، کہا جاتا ہے: خَسَفَ المکانُ یَخْسِفُ خُسُوفاً مکان زمین میں چلا گیا، دھنس گیا۔ اور خسف اللہ بہ الأرض خسوفاً یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں غیب کر دیا، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص: 81) (پس ہم نے غرق کر دیا اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں) اور خَسَفَ ھوبٖی الارض (وہ خود زمین میں دھنس گیا) اور خُسِفَ بِهٖ (اسے دھنسا دیا گیا) اور استفہام بمعنی انکار ہے یعنی واجب ہے کہ وہ سزا سے پرامن (اور نڈر) نہ ہوں جو انہیں لاحق ہوگی جیسا کہ وہ جھٹلانے والوں کو لاحق ہوئی۔ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ جیسا کہ قوم لوط وغیرہ کے ساتھ کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد یوم بدر ہے، کیونکہ وہ اس دن ہلاک کر دیئے گئے، اور اس سے کوئی شے ان کے حساب میں نہ تھی۔ اَوْ یَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ یا وہ دوڑ دھوپ کر رہے ہوں اپنے سفروں میں اور اپنے کام کاج میں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ یعنی نہ وہ اللہ تعالیٰ سے آگے نکل جانے والے ہیں اور اس سے فوت اور گم ہونے والے ہیں (یعنی وہ کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِیْ تَقَلُّبِهِمْ یا وہ انہیں پکڑ لے اس حال میں کہ وہ ابھی اپنے بستروں پر ہوں جہاں بھی ہوں۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رات اور دن کے وقت۔ اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے: یا وہ انہیں پکڑ لے ان کے مالوں، مویشیوں اور ان کی کھیتیوں میں کمی کرتے ہوئے۔ اور اسی طرح ابن الاعرابی نے بھی کہا ہے، یعنی بتدریج مالوں، جانوں، اور پھلوں میں نقصان اور کمی کرتے ہوئے یہاں تک کہ وہ ان تمام کو ہلاک کر دے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ خوف سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے: وہ ایک گروہ کو پکڑ لے اور دوسرے کو چھوڑ دے، پس باقی رہنے والے ڈر جائیں گے کہ ان پر بھی اسی طرح کا عذاب نازل ہوگا جیسا ان کے ساتھیوں پر نازل ہوا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: عَلٰی تَخَوُّفٍ کہ وہ ایک بستی والوں کو پکڑ لے تاکہ دوسری بستی والے ڈر جائیں، یہ معنی بعینہ اس قول کے معنی کی مثل ہے جو پہلے گزرا ہے، اور یہ دونوں پہلے معنی کی طرف راجع ہیں کہ التخوف کا معنی التنقص (آہستہ آہستہ کم کرنا) ہے، تَخَوَّفَهٗ تَنَقَّصَهٗ (اس نے اسے نقصان پہنچایا)، اور تخوفه الدھر و تخوّنه (یعنی فاء اور نون کے ساتھ) دونوں ایک ہی معنی میں ہیں (زمانے نے اسے خوفزدہ کر دیا، نقصان پہنچایا) کہا جاتا ہے: تخوّننی فلان حقی جب وہ تیرا نقصان کر دے (یعنی فلاں نے میرا حق مار لیا)۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے:

لا، بل ھو الشّوقُ من دارٍ تخوّنھا　　مَرًّا سحابٌ و مَرًّا بارِحٌ تَرِبُ

اور لبید نے کہا ہے:

تخوّنَھا نزولی و ارتحالی

یعنی اس کا گوشت اور اس کی چربی کم ہوگئی۔ اور ہیثم بن عدی نے کہا ہے: التخوف (فا کے ساتھ ہو) اس کا معنی التنقص

(کم کرنا) ہے۔ یہ ازدشنوءہ کی لغت ہے۔ اور شاعر کا شعر ہے

تخوّف غدرهم مالی وأهدى سلاسلَ فی الحلوق لها صليل (1)

اور حضرت سعید بن مسیب نے بیان کیا ہے: اس اثنا میں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما تھے۔ فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں کیا کہتے ہو: اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ؟ تو لوگ خاموش رہے، تو بنی ہذیل کے ایک شیخ نے کہا: اے امیر المومنین! یہ ہماری لغت ہے۔ التخوف بمعنی التنقص ہے، پھر ایک آدمی نکلا اور اس نے کہا: اے فلاں! تیرا دین کیا ہے؟ اس نے کہا: تخوفته، ای تنقصته (میں نے اسے کم کر دیا ہے) پس وہ لوٹ کر گیا اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا عرب اپنے اشعار میں اسے جانتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ ہمارے شاعر ابو کبیر ہذلی نے ناقہ کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے سفر اونٹنی کی کوہان کے لمبا ہونے اور گوشت کے جمع ہونے کے بعد اس کو کم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

تخوّفَ الرحلُ منها تامِكًا قرِدًا كما تخوّفَ عُودَ النَّبعَة السَّفَنُ (2)

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! تم پر لازم ہے کہ تم زمانہ جاہلیت کی شاعری پر مبنی دیوان پڑھو کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی موجود ہیں۔ تَمَكَ السنام يَتْمِكُ تَمْكًا یعنی کوہان لمبی ہوگئی اور اٹھ گئی، فهو تامك اور السَّفَنُ و المسفن وہ آلہ جس کے ساتھ لکڑی کو چھیلا جاتا اور ہموار کیا جاتا ہے (رندا)۔ اور لیث بن سعد نے کہا ہے: عَلٰى تَخَوُّفٍ یا وہ انہیں پکڑ لے جلدی میں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان گناہوں پر ڈانٹتے ہوئے جو انہوں نے آگے بھیجے، اور یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: عَلٰى تَخَوُّفٍ کہ وہ انہیں سزا دے یا درگزر کر لے۔ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ یعنی وہ جلدی نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿٤٨﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ نے پیدا فرمایا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔“

حمزہ، کسائی، خلف، یحییٰ اور اعمش نے تَرَوْا تا کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ اَلَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ کے بارے خبر ہے اور یہی مختار ہے۔ مِنْ شَيْءٍ یعنی ایسے کھڑے جسم کی طرف جس کا سایہ ہے چاہے وہ درخت ہو یا پہاڑ۔ (کیا انہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا)۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے، اگرچہ تمام کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کا حکم سننے والی اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والی ہیں۔ يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ ابو

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 136 2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 135

عمرو اور یعقوب وغیرہ نے اسے تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ظلال مونث ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے ابو عبیدہ نے اختیار کیا ہے، یعنی وہ (سایہ) جھکتا ہے، مائل ہوتا ہے ایک جانب سے دوسری جانب کی طرف، اور وہ دن کے اول حصہ میں ایک حال پر ہوتا ہے اور وہ سکڑ جاتا ہے پھر دن کے آخر میں دوسری حالت پر لوٹ آتا ہے، پس ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف اس کا گھومنا اور اس کا مائل ہونا ہی اس کا سجدہ کرنا ہے اور اسی معنی میں شام کے وقت سائے کو فَیْءٌ کہا گیا ہے، کیونکہ وہ مغرب سے مشرق کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اور الفیٔ کا معنی الرجوع (لوٹنا) ہے؛ اور اسی سے حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات: 9) (یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف۔) ہے۔ اس قول کا معنی حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما سے مروی ہے اور یہ معنی سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: مراد جسم کا سجدہ کرنا ہے، اور اس کا سجود اس کا اطاعت و تابعداری کرنا ہے اور وہ جو اس میں کام کا اثر دکھائی دیتا ہے، اور یہ ہر جسم میں عام ہے۔ اور وَهُمْ دٰخِرُوْنَ کا معنی ہے اور وہ خضوع کر رہے ہیں، اپنی عاجزی کا اظہار کر رہے ہیں۔ الدخور کا معنی الصغار والذل (چھوٹا ہونے اور پست ہونے کا اظہار کرنا) ہے۔ کہا جاتا ہے: دَخَرَ الرجل (فتحہ کے ساتھ) فهو داخر، وأدخره الله (اللہ نے اسے ذلیل کر دیا)۔

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

فلم یَبْقَ إلاَّ داخِرٌ فی مُخَیَّسٍ　　ومُنْجَحِرٌ فی غیرِ أرْضِكَ فی جُحْرِ (1)

اسے ماوردی نے ذوالرمہ کی طرف منسوب کیا ہے اور جوہری نے فرزدق کی طرف اس کی نسبت کی ہے اور کہا ہے: المُخَیَّسُ یہ جیل کا نام ہے یہ عراق میں ہے، یعنی ذلت و رسوائی کی جگہ۔

اور کہا ہے:

أما ترانی کَیِّسًا مُکَیَّسًا　　بَنَیْتُ بعدَ نافعٍ مُخَیَّسًا

اور اپنے قول: عَنِ الْیَمِیْنِ میں یمین کو واحد ذکر کیا ہے اور شمال کو جمع ذکر کیا ہے، کیونکہ یمین کا معنی جمع ہے اگرچہ یہ واحد ہے، اور اگر کوئی کہے: عن الأیمان والشمائل، والیمین والشمائل، یا الیمین والشمال، یا الأیمان والشمال تو (غیر قرآن میں) یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس کے معنی کثرت کے ہیں۔ اور یہ بھی کہ عربوں کا طریقہ ہے کہ جب ایک شے میں دو علامتیں جمع ہو جائیں تو ان میں سے ایک جمع لائی جاتی ہے اور دوسری مفرد، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ (البقرہ: 7) (مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) اور اسی طرح ارشاد ہے: یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (البقرہ: 257) (اور وہ نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف) اور اگر کوئی کہے علی أسماعهم اور الی الأنوار تو یہ بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لفظ یمین کا رجوع لفظ ما کی طرف ہو اور لفظ شمال کا رجوع اس کے معنی کی طرف ہو۔ اور کلام میں اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

شاعر نے کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 140

الوارِدُون و تَیْم فی ذُرَا سَبَاء　　قد عَضَّ أعناقهم جِلْدُ الجَوَا میس(1)

اس میں جلو دنہیں کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یمین کو واحد ذکر کیا ہے کیونکہ سورج جب طلوع ہوتا ہے اور تیرا منہ قبلہ کی طرف ہو تو سایہ دائیں جانب سے پھیلتا ہے پھر ایک حال میں بائیں جہت کی طرف مڑ جاتا ہے پھر اس میں کئی حالات ہوتے ہیں، پس اس کا نام شمائل رکھا۔ (یعنی پہلی صورت میں ایک حال ہے لہٰذا لفظ یمین واحد ذکر کیا اور دوسری صورت میں کئی حالات ہیں اس لئے شمائل جمع ذکر کیا۔)

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

"اور اللہ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے یعنی ہر قسم کے جاندار اور فرشتے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے۔ ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے اور کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ اور اللہ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے یعنی ہر وہ شی جو زمین پر رینگ کر چلتی ہے (مراد ہر قسم کے جاندار ہیں) وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ یعنی وہ ملائکہ جو زمین میں ہیں، اور ان کے شرف مرتبہ کی وجہ سے ان کی خصوصیت کے پیش نظر ان کا ذکر الگ فرمایا۔ اور دبیب (رینگنا) کی صفت سے انہیں ذکر کے ساتھ ممتاز کر دیا اگرچہ یہ ان میں داخل ہیں؛ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝ (الرحمٰن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہیں من جملہ ان جانداروں سے جو رینگتے ہیں یا ہاتھ پاؤں پر چلتے ہیں نکالنے کے لئے الگ ذکر کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پر بنا دیئے ہیں، لہٰذا یہ ان میں داخل نہیں پس اسی لئے ان کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے ملائکہ، سورج، چاند، ستارے، ہوائیں اور بادل کا ارادہ کیا ہے وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ اور زمین کے ملائکہ سجدہ کرتے ہیں۔ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ اور وہ اپنے رب کی عبادت سے غرور و تکبر نہیں کرتے۔ اور یہ ان قریش کا رد ہے جنہوں نے یہ گمان کیا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ کا معنی ہے یعنی "اپنے رب کی سزا اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، کیونکہ ہلاک و برباد کر دینے والا عذاب آسمان سے ہی نازل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے" اپنے رب کی اس قدرت سے ڈرتے ہیں جو ان کی قدرت و اختیار سے زیادہ اور اس پر غالب ہے۔ پس کلام میں حذف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ کا معنی ہے کہ ملائکہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور یہ ان سے فائق اور اعلیٰ ہیں جو زمین میں جاندار وغیرہ ہیں اور اس کے باوجود وہ ڈرتے ہیں، تو جو رتبہ میں ان سے کم ہیں انہیں تو بدرجہ اولیٰ ڈرنا چاہئے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ یعنی ملائکہ وہ کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 141

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہ بناؤ دو خدا، وہ تو صرف ایک ہی خدا ہے (اس نے فرمایا) پس فقط مجھ سے ہی ڈرا کرو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم دو خدا نہ بناؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اثْنَیْنِ کا قول تاکید کے لئے آیا ہے۔ اور جب سچا خدا متعدد نہیں ہو سکتا تو پھر ہر وہ جو متعدد ہوگا تو وہ الٰہ (خدا) نہیں ہے، اور اثنین کے ذکر پر اقتصار کیا گیا ہے، کیونکہ مقصود تعدد کی نفی ہے۔ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی بلاشبہ اس کی ذات مقدسہ تو فقط ایک ہے۔ اور اس کی وحدانیت پر عقلی اور شرعی دلیل قائم ہو چکی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور ہم نے اسے شرح الاسماء میں اس کے اسم پاک الواحد کے تحت ذکر کیا ہے، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ یعنی پس تم مجھ سے ہی ڈرا کرو۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝

''اور اسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی تابعداری اور اطاعت لازمی ہے۔ تو کیا اللہ کے سوا غیروں سے ڈرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا اس میں الدِّیْنُ کا معنی طاعت اور اخلاص ہے۔ اور وَاصِبًا اس کا معنی ہے دائماً (ہمیشہ) یہ فراء نے کہا ہے، اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ وَصَبَ الشیئُ یصِب وُصُوبًا، یعنی شے دائمی ہے۔ اور وصبَ الرجلُ علی الأمر (کہا جاتا ہے) جب کوئی آدمی کسی کام پر مواظبت اختیار کرے اور اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہمیشہ واجب ہے۔ اور جنہوں نے وَاصِبًا کا معنی دائماً بیان کیا ہے وہ حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور ضحاک ہیں۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ (الصافات) یعنی ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔

اور دؤلی نے کہا ہے:

لا أبتغی الحمد القلیل بقاؤہ ... بذم یکون الدھرَ أجمعَ واصبًا(1)

اور غزنوی اور ثعلبی وغیر ہما نے کہا ہے:

ما أبتغی الحمد القلیلَ بقاؤہ ... یوما بِذَمِّ الدھر أجمعَ واصبا(2)

ان میں واصباً دائما کے معنی میں ہی واقع ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الوصب کا معنی التعب والاعیاء (تھک جانا اور تھکا دینا) ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت واجب رہتی ہے اگرچہ بندہ اس میں تھک جائے۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

لا یُمسك السّاقَ من أین ولا وَصَب ... ولا یَعَضّ علی شُرْسُوفِه الصفر

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 142 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 193

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے: وَاصِبًا بمعنی واجبًا ہے۔ اور فراء رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بمعنی خالصًا ہے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ یعنی یہ نہیں چاہیے کہ تم غیر اللہ سے ڈرو، پس "غیر" تَتَّقُوْنَ کے سبب منصوب ہے۔

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں، پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی جانب میں گڑگڑاتے ہو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ دور فرما دیتا ہے تکلیف کو تم سے تو فوراً ایک گروہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ ناشکری کرتے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم نے انہیں عطا کی ہیں پس (اے ناشکرو!) لطف اٹھا لو چند روز، تمہیں (اپنا انجام) معلوم ہو جائے گا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ فراء نے کہا ہے: مَا بمعنی الجزاء ہے۔ اور بِكُمْ میں با فعل مضمر کے متعلق ہے، تقدیر عبارت ہے: وما یکن بکم۔ مِّنْ نِّعْمَةٍ یعنی جسمانی صحت، وسعت رزق اور اولاد وغیرہ فَمِنَ اللّٰهِ وہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ هي۔ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ یعنی پھر جب تمہیں بیماری، مصیبت اور قحط سالی (غربت وغیرہ) آ پہنچتی ہے۔ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ تو اسی کی جانب دعا کے ساتھ گڑگڑاتے ہو۔ کہا جاتا ہے: جأر یجأر جؤارًا اور الجؤار الخوار کی طرح ہے؛ کہا جاتا ہے: جأر الثور یجأر یعنی بیل نے شور مچایا۔ اور بعض نے عِجْلًا جسدًا لہ جؤار .... قرأت کی ہے۔ اسے اخفش نے بیان کیا ہے۔ اور جأر الرجل إلی اللّٰہ یعنی آدمی نے دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور تضرع کا اظہار کیا۔

اور اعشیٰ نے گائے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فطافت ثلاثا بین یوم و لیلۃ و کان النکیر أن تضیف و تجأرا

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ پھر جب اللہ تعالیٰ تم سے بلا، مصیبت اور بیماری دور فرما دیتا ہے۔ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ تو اس مصیبت کے ازالہ کے بعد اور گڑگڑاہٹ کے بعد تم میں سے فوراً ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ پس کلام کا معنی ہلاک ہونے سے نجات پانے کے بعد شرک کرنے پر اظہار تعجب کرنا ہے، اور یہ معنی قرآن کریم میں کئی بار ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانعام اور یونس میں گزر چکا ہے، اور سبحان وغیرہ میں آ رہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اس کے ساتھ خاص ہے جس نے کفر کیا۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ یعنی اس طرح وہ انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا جو اس نے ان سے ضرر و نقصان اور مصیبت کو، دور فرما کر ان پر انعام فرمایا، یعنی انہوں نے شرک کیا تاکہ وہ انکار کریں، پس لام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام عاقبت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ یعنی اس طرح انہوں نے نعمت کو سبب کفر بنا دیا، اور یہ سب فعل خبیث ہے، جیسا کہ کسی نے کہا:

والكفر مخبثة لنفس المنعم

انعام کرنے والے کی ذات کے لئے انکار خبث ہے فَتَمَتَّعُوْا یہ امر برائے تہدید وجھڑک ہے۔ اور عبداللہ نے فتمتعوا پڑھا ہے۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (اے ناشکرو! چند روز لطف اٹھالو تم عنقریب اپنے عمل کا انجام جان لوگے۔)

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾

''اور مقرر کرتے ہیں ان کے لئے جن کو یہ جانتے ہی نہیں حصہ اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے، اللہ کی قسم! تم سے ضرور باز پرس ہوگی اس کے متعلق جو تم بہتان باندھا کرتے ہو''

قولہ تعالیٰ: وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ان کی جہالت کی دوسری نوع کا ذکر کیا ہے، اور وہ یہ کہ وہ مقرر کرتے ہیں اپنے مالوں میں سے کچھ حصہ ان کے لئے جن کے بارے وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کوئی نقصان اور نفع دے سکتے ہیں اور وہ بت ہیں (صرف اس لئے) تاکہ وہ اس کے سبب ان کے قریب ہو جائیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے، پس اس معنی کے مطابق يَعْلَمُوْنَ مشرکین کے لئے ہوگا (یعنی وہ نہیں جانتے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بتوں کے لئے ہے، اور اسے واؤ، نون کے ساتھ ذکر کرکے انہیں قائم مقام ذوالعقول کے رکھا ہے، اور یہ ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے اور یعلم کا مفعول محذوف ہے، اور تقدیر عبارت ہے: ویجعل هولاء الكفار للأصنام التي لا تعلم شيئا نصيبًا (اور یہ کفار ان بتوں کے لئے حصہ مقرر کررہے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے۔) اور اس معنی کی تفسیر سورۃ الانعام میں اس قول کے تحت گزر چکی ہے: فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (الانعام: 136) (اور کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لئے) پھر خبر سے خطاب کی طرف رجوع فرمایا اور ارشاد فرمایا: تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔـلُنَّ (قسم بخدا! تم سے ضرور باز پرس ہوگی) تو یہ سوال اور باز پرس برائے زجر و توبیخ ہوگی۔ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ یعنی اس کے بارے میں جو تم اللہ تعالیٰ کے بارے مختلف نوعیت کے جھوٹ بولتے ہو کہ اس نے تمہیں اس بارے حکم دیا ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٥٧﴾

''اور تجویز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں سبحان اللہ! اور ان کے لئے تو وہ (بیٹے) ہیں جنہیں وہ پسند کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ یہ آیت بنی خزاعہ اور کنانہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، پس وہ کہتے تھے بیٹیوں کو بیٹیوں کے ساتھ ملحق کردو۔ سُبْحٰنَهٗ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی پاکی بیان فرمائی ہے اور اپنے آپ کا اس سے عظیم تر (اور بے نیاز) ہونے کا ذکر کیا ہے جس کی نسبت وہ اس کی طرف کرتے ہیں (یعنی) کسی کو اولاد بنانا۔ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ یعنی اپنے لئے تو وہ بیٹے پسند کرتے ہیں اور بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور ما مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، اور اس کی خبر لَهُمْ ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول سُبْحٰنَهٗ پر کلام مکمل ہوگئی۔ اور فراء نے اس کے محل نصب میں ہونے کو جائز قرار دیا ہے، تقدیر کلام ہوگی: ويجعلون لهم ما يشتهون۔ اور زجاج نے اس کا انکار کیا

ہے۔ اور کہا ہے: عرب اس جیسے کلام میں ویجعلون لأنفسھم استعمال کرتے ہیں۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾

''اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی تو (غم سے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ (رنج واندوہ سے) بھر جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى یعنی جب ان میں سے کسی کو بچی کی ولادت کی خبر دی جاتی ہے۔ ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا تو اس کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اور یہاں سواد (سیاہی) سے مراد وہ نہیں ہے جو بیاض (سفیدی) کی ضد ہے، بلکہ یہ اس کے بچی کے سبب غمزدہ اور پریشان ہونے سے کنایہ ہے۔ اور ہر وہ آدمی جسے کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ شے لاحق ہو اس کے لئے عرب کہتے ہیں: قد اسود وجهه غما و حزنا۔ (تحقیق اس کا چہرہ غم اور پریشانی کے سبب سیاہ ہو گیا)؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور ماوردی نے بیان کیا ہے کہ مراد رنگ کا سیاہ ہونا ہی ہے، فرمایا: یہی جمہور کا قول ہے (1)۔ وَّ هُوَ كَظِيْمٌ اور وہ غم اور رنج سے بھر جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی حزین (2) (غمزدہ، پریشان حال) ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو اپنا غصہ پی جاتا ہے اور اسے ظاہر نہیں کرتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ مغموم اور پریشان حال آدمی ہے جو اپنا منہ بند کر لیتا ہے اور غم کی وجہ سے کلام نہیں کرتا، یہ الكظامة سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی مشکیزے کا منہ بند کرنا ہے؛ یہ علی بن عیسیٰ نے کہا ہے۔ اور یہ معنی سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''چھپتا پھرتا ہے لوگوں (کی نظروں) سے اس بری خبر کے باعث جو دی گئی ہے اسے، (اب یہ سوچتا ہے کہ) کیا وہ اس بچی کو اپنے پاس رکھے ذلت کے ساتھ یا گاڑ دے اسے مٹی میں، آہ! کتنا برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ یعنی لوگوں کی نظروں سے چھپتا پھرتا ہے اور غائب رہتا ہے۔ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ یعنی اس غم، ندامت اور شرم وحیا کے سبب جو اسے بیٹی کے سبب لاحق ہوگا۔ اَيُمْسِكُهٗ ضمیر کو مذکر ذکر کیا کیونکہ وہ ما کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ عَلٰى هُوْنٍ یعنی ذلت ورسوائی کے ساتھ (کیا اسے اپنے پاس رکھے) اور اسی طرح عیسیٰ ثقفی نے علی هوان پڑھا ہے۔ اور الهون اور الهوان لغت قریش کے مطابق ہیں، یہ یزیدی نے کہا ہے، اور اسے ابو عبید نے کسائی سے بیان کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ تھوڑا سا لغت تمیم کے مطابق ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس سے مراد بلاء (مصیبت وتکلیف) اور مشقت ہے۔

اور حضرت خنساء رحمۃ اللہ علیہا نے کہا ہے:

نُهِيْنُ النفوسَ و هُوْنُ النفوس   يوم الكريهة أبقى لها

(اس میں هون کا لفظ ابتلاء اور مشقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔)

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 194   2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 148

اور اعمش نے أیسکہ علی سُوْءٍ پڑھا ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے، اور کہا ہے: جحدری نے أمْ یَدُسُّھَا فی التُّرَابِ پڑھا ہے اور وہ اسے قول باری تعالیٰ بِالْاُنْثٰی کی طرف لوٹاتے ہیں۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ أیُمْسِکُھَا پڑھا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الھوان (ذلت ورسوائی) بیٹی (البنت) کی طرف راجع ہے، یعنی أیمسکھا وھی مھانۃ عندہ (کیا وہ اسے روکے رکھے اس حال میں کہ وہ اس کے پاس ذلیل ورسوا ہو)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کی طرف لوٹ رہی ہے جس کی ولادت اس کے پاس ہوگی، أیمسکہ علی رغم أنفہ أم یدسہ فی التراب (کیا وہ اسے اپنی ناک خاک آلود کرکے روکے رکھے یا اسے مٹی میں گاڑ دے) اور یہ وہی ہے جو وہ بیٹی کو زندہ دفن کرنے کا عمل کرتے تھے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: مضر اور خزاعہ قبیلے کے لوگ اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے اور اس بارے میں ان سے زیادہ سخت تمیم تھے۔ انہوں نے گمان کیا کہ ان پر ظلم اور غلبے کا خوف اور غیر کفو کا طمع اور حرص انہیں (بچیوں) میں ہے۔ اور صعصعہ بن ناجیہ جو کہ فرزدق کا چچا تھا جب اس میں سے کوئی شے محسوس کرتا تو وہ بچی کے والد کی طرف اونٹ بھیجتا اور اس کے ساتھ وہ اس بچی پر شرم وحیا محسوس کرتا، پس فرزدق نے فخر کرتے ہوئے کہا ہے:

وعمی الذی منع الوائدات وأحیا الوَئِید فلم یُوأَدِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: دَسُّھَا کا معنی اسے لوگوں سے چھپانا ہے تاکہ اس کی پہچان ہی نہ ہو، جیسا کہ مدسوس فی التراب یعنی مٹی میں گاڑ دیا جانا اسے نظروں سے چھپانے کے لئے ہے اور اس کا احتمال بھی ہے۔

مسئلہ۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: میرے پاس ایک عورت آئی اور اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، تو اس نے مجھ سے مانگا، سوال کیا اور میں نے اپنے پاس سوائے ایک کھجور کے اور کچھ نہ پایا۔ پس میں نے وہ کھجور اسے دے دی، اس نے اسے لیا اور اسے اپنی دونوں بچیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور خود اس سے کچھ بھی نہ کھایا، پھر وہ اٹھی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر نکل گئی، میرے پاس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور میں نے اس کا واقعہ آپ کو عرض کیا، تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جسے بیٹیوں میں سے کسی سے آزمایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو وہ اس کے لئے آتش جہنم سے پردہ بن جائیں گی" (1)۔ تو یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بیٹیاں آزمائش ہیں، پھر آپ نے یہ خبر بھی دی ہے کہ ان کے بارے صبر کرنے میں اور ان کے ساتھ احسان اور نیکی کرنے میں اتنا اجر ہے جو آتش جہنم سے بچالے گا۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میرے پاس ایک مسکین عورت آئی وہ اپنے ساتھ دو بچیوں کو اٹھائے ہوئے تھی، تو میں نے اسے تین کھجوریں عطا کیں تو اس نے ان میں سے ہر ایک کو ایک کھجور دی، اور ایک کھجور اپنے منہ کی طرف اٹھائی تاکہ اسے کھائے اتنے میں اس کی دونوں بچیوں نے وہ مانگ لی پس اس نے اس کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جسے وہ کھانا چاہتی تھی اور دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، پس اس کی اس کیفیت اور طرز عمل نے مجھے بہت

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب فضل الاحسان إلی البنات، جلد 2، صفحہ 330

متعجب کیا، تو جو عمل اس نے کیا تھا میں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ عزوجل نے اس کے بدلے اس کے لئے جنت واجب کر دی ہے یا اس کے عوض اسے جہنم سے آزاد کر دیا ہے (1)''۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دو بچیوں کی کفالت کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح ہوں گے'' (2)۔ اور آپ نے اپنی انگلیوں کو ملا دیا۔ ان دونوں روایتوں کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے۔ اور حافظ ابو نعیم نے اعمش کی حدیث نقل کی ہے حضرت ابو وائل حضرت عبداللہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جس کی ایک بیٹی ہو پس اس نے اسے ادب سکھایا اور اسے خوب اچھی طرح ادب سکھایا اور اسے تعلیم دلائی اور اسے خوب اچھی طرح تعلیم دلائی اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے اسے عطا کیں جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرمائیں تو وہ اس کے لئے آتش جہنم سے ستر اور حجاب ہو گی۔'' عقیل بن علفہ کی طرف اس کی بیٹی جرباء کے بارے پیغام نکاح بھیجا گیا تو اس نے کہا:

إنّي وإن سِيق إلى المهر ألفٌ و عُبدان و خُوزٌ عشرٌ

أحبّ أصهاري إلى القبر

اور عبداللہ بن طاہر نے کہا ہے:

لكل أبِي بنت يراعى شؤونها ثلاثةٌ اصهار اذا حُمد الصِّهرُ

فبعلٌ يُراعيها و خِدرٌ يُكِنّها و قبرٌ يوارِيها و خيرهم القبرُ

اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ یعنی بیٹیوں کی نسبت اپنے خالق کی طرف اور بیٹوں کی اضافت اپنی طرف کرنے میں (کتنا غلط فیصلہ وہ کرتے ہیں) اس کی نظیر یہ ہے: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ (النجم) (کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہیں اور اللہ کے لئے نری بیٹیاں۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾ (النجم) (یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے۔) یعنی یہ ظلم کرنے والی ہے، اس کا بیان آگے آئے گا۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

''ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے بری صفتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے، اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں بیان کرتے ہیں مَثَلُ السَّوْءِ جہالت اور کفر جیسی بری صفتیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کو بیوی اور اولاد کے ساتھ متصف کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد عذاب اور جہنم ہے۔ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے اور وصف اعلیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ و الادب، باب فضل الاحسان الی البنات، جلد 2، صفحہ 330 2۔ ایضاً

سے مراد اخلاص اور توحید ہے، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: صفۃ علیا اس اعتبار سے ہے کہ وہ خالق ہے، رازق ہے، قادر ہے، اور جزا دینے والا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَثَلُ السَّوْءِ اس سے مراد جہنم ہے، اور الْمَثَلُ الْاَعْلٰی سے مراد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت دینا ہے۔ اور کہا گیا ہے: لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اس کے اس قول کی طرح ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ (النور: 35) (اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال ......) اور اگر کہا جائے: یہاں کیسے مثل کی اضافت اپنی ذات کی طرف کر دی حالانکہ اس نے فرمایا ہے: فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (النحل: 74) (پس (اے جاہلو!) نہ بیان کیا کرو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں) تو جواب یہ ہے کہ اس کے قول فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ میں امثال سے مراد وہ ہیں جو مشابہت اور نقائص کو ثابت کرتی ہیں؛ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی مثال نہ بیان کرو جو نقص اور مخلوق کے ساتھ تشبیہ کا تقاضا کرتی ہو۔ اور الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ایسی شے کے ساتھ اس کا وصف بیان کرتا ہے جس کی نہ کوئی مشابہت ہو اور نہ نظیر۔ اور جو کچھ ظلم کرنے والے اور انکار کرنے والے کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند اور اعلیٰ ہے۔ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَیْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ یُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور اگر (فوراً) پکڑ لیا کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ظلم کے باعث تو نہ چھوڑتا زمین پر کسی جاندار کو لیکن وہ مہلت دیتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک، پس جب آ جاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کفر اور ان کی بہتان تراشی کے سبب جلدی پکڑ لیا کرتا مَّا تَرَكَ عَلَیْهَا تو زمین پر کسی کو نہ چھوڑتا، پس یہ غیر مذکور سے کنایہ ہے، لیکن اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ دَآبَّةٍ کیونکہ جاندار زمین پر ہی چلتا، رینگتا ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ مِنْ دَآبَّةٍ سے مراد کافر (کفر کرنے والا) ہے، پس یہ خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آباء کو ان کے کفر کے سبب ہلاک کر دیتا تو بیٹے بھی نہ ہوتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت سے مراد عموم ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان کے کرتوتوں کے باعث پکڑ لیا کرتا تو اس زمین کی پشت پر نبی اور غیر نبی میں سے کسی جاندار کو نہ چھوڑتا اور یہ حسن کا قول ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی: اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کو گنہگاروں کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا کرتا تو اس کا عذاب تمام مخلوق کو پہنچتا حتیٰ کہ سیاہ رنگ کے (غلاظت کے) کیڑے کو اس کی بل میں، اور وہ آسمان سے بارش اور زمین سے نباتات روک لیتا تو سارے جاندار مر جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ عفو وفضل کو لیتا ہے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ (المائدہ: 15) (اور درگزر فرماتا ہے بہت سی باتوں سے۔) فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ یعنی جب ان کی موت کا مقررہ وقت اور ان کی عمروں کے ختم ہونے

کا وقت آجائے۔ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور اگر کہا جائے: پس ہلاکت عام کیسے ہو سکتی ہے اس کے باوجود کہ ان میں مومن بھی ہیں جو ظالم نہیں ہیں؟ تو کہا جائے گا: ظالم کی ہلاکت کو انتقام اور جزا بنا دیا جائے گا، اور مومن کی ہلاکت کو آخرت کے ثواب کا عوض قرار دیا جائے گا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت مذکور ہے انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب دینے کا ارادہ کرے تو عذاب ان تمام کو پہنچتا ہے جو ان میں ہوں پھر انہیں ان کی نیتوں کے مطابق اٹھایا جائے گا(1)''۔ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور ان سے اس لشکر کے بارے میں پوچھا گیا جسے دھنسا دیا جائے گا اور وہ حضرت ابن زبیر کے ایام (حکومت) میں ہوا، تو انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی پناہ لینے والا گھر میں پناہ لیتا ہے پس اس کی طرف کوئی جماعت (دستہ) بھیج دیا جائے گا اور جب وہ زمین میں مقام بیداء پر ہوں گے تو انہیں دھنسا دیا جائے گا(2)''۔ تو میں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو اس کے بارے کیا ہوگا جو مجبور ہو؟ تو آپ نے فرمایا: ''ان کے ساتھ اسے بھی دھنسا دیا جائیگا لیکن قیامت کے دن اسے اپنی نیت پر اٹھایا جائے گا۔'' ہم نے اس معنی پر عمدہ بحث ''کتاب التذکرہ'' میں کی ہے اور سورۃ المائدہ میں اور سورۃ الانعام کے آخر میں اتنی بحث گزر چکی ہے جو کافی ہے۔ والحمد للہ۔ اور کہا گیا ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ یعنی جب قیامت کا دن آجائے گا۔ واللہ اعلم۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا یَكْرَهُوْنَ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور تجویز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے (بیٹیاں) جنہیں وہ (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں اور بیان کرتی ہیں ان کی زبانیں جھوٹ (جب وہ کہتی ہیں کہ) فقط انہیں کے لئے بھلائی ہے، یقیناً ان کے لئے تو آتش (جہنم) ہے اور انہیں کو (دوزخ میں) پہلے بھیجا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا یَكْرَهُوْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے تجویز کرتے ہیں وہ جنہیں وہ اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں یعنی بیٹیاں۔ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ یعنی ان کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں۔ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ان کا یہ کہنا ہے کہ ان کے لئے بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں ہیں۔ الْكَذِبَ یہ تَصِفُ کا مفعول ہے۔ اور اَنَّ، الکذب سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ اس کا بیان ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَلْحُسْنٰى سے مراد اچھی اور بہترین جزا ہے؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ حضرت ابن عباس، ابو العالیہ، مجاہد، اور ابن محیصن نے الْكُذُبُ کاف، ذال اور با کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ السنۃ کی صفت ہے اور اسی طرح وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ ہے (النحل: 16)۔ اور الکُذُبُ کَذوب کی جمع ہے، مثلاً رسولٌ کی جمع رُسُل، صبور کی صُبُر، اور شکورٌ کی جمع شُکُر ہے۔ لَا یہ ان کے قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا و اہلہا، باب الامر بحسن الظن باللہ تعالیٰ عند الموت، جلد 2، صفحہ 387

2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 203، حدیث 34668

کارد ہے، اور کلام مکمل ہو گئی، یعنی ایسا نہیں ہے جس طرح تم گمان کرتے ہو۔ جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ یعنی یہ ثابت شدہ امر ہے کہ ان کے لئے آتش جہنم ہے۔ یہ مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ یعنی انہیں آتش جہنم میں چھوڑ دیا جائے گا اور بھلا دیا جائے گا؛ ابن الاعرابی، ابو عبیدہ، کسائی اور فراء نے یہ کہا ہے، اور یہی سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہ بھی کہا ہے: مبعدون (انہیں دور کر دیا جائے گا) حضرت قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: انہیں آتش جہنم کی طرف جلدی بھیجا جائے گا (1)، اس کی طرف انہیں فوراً آگے بھیج دیا جائے گا۔ اور الفارط وہ ہے جو پانی کی طرف آگے بڑھ جاتا ہے اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: انا فرطکم علی الحوض (2) میں حوض پر تمہارے پیش پیش ہوں گا۔

اور قطامی نے کہا ہے:

فاستعجلونا وكانوا من صحابتنا کما تعجّل فُرّاطٌ لورّاد (3)

اور الفُرّاط کا معنی ہے پانی کی طلب اور تلاش میں آگے بڑھنے والے۔ اور الورّاد کا معنی ہے پیچھے رہنے والے۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ نے ورش کی روایت میں مُفْرِطُوْنَ راء کو کسرہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأت ہے، اور اس کا معنی ہے: گناہوں اور معصیت میں زیادتی کرنے والے، اسراف کرنے والے، یعنی افرطوا فیہا (انہوں نے ان میں بہت زیادتی کی)۔ کہا جاتا ہے: أفرط فلان علی فلان (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ اس پر بہت زیادتی کرے، اور اس نے اس کو اس سے زیادہ برا کہا جتنا اس نے کہا۔ اور ابو جعفر القاری نے مُفَرِّطُوْنَ را کو کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو ضائع کرنے والے ہیں، پس یہ واجب میں تفریط کرنے (کمی کرنے) سے ماخوذ ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

”بخدا! ہم نے بھیجا ہے (رسولوں کو) مختلف قوموں کی طرف آپ سے پہلے پس آراستہ کر دیا ان کے لئے شیطان نے ان کے (برے) اعمال کو پس وہی ان کا دوست ہے آج بھی اور ان کے لئے عذاب الیم ہے۔“

قولہ تعالیٰ: تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ یعنی شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کر دیا۔ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جو انبیاء علیہم السلام آپ سے پہلے تشریف لائے ہیں ان کی قوم نے ان کے ساتھ بھی کفر کیا ہے۔ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ یعنی ان کے گمان کے مطابق وہی دنیا میں ان کا معاون و مددگار ہے۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور ان کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَهُوَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 154
2۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب ماجاء فی قول اللہ واتقوا فتنۃ، جلد 2، صفحہ 1045
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 196

وَلِيُّهُمُ پس وہی جہنم میں ان کا ساتھی ہوگا۔ الْيَوْمَ مراد قیامت کا دن ہے، اور اس کے مشہور ہونے کی وجہ سے اس پر اسم الیوم کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کو قیامت کے دن کہا جائے گا: یہ تمہارا دوست ہے پس تم اس سے مدد طلب کرو کہ وہ تمہیں عذاب سے نجات دلائے، یہ ان کو زجر و توبیخ کرنے کے انداز میں ہے۔

وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

''اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر یہ کتاب مگر اس لئے کہ آپ صاف صاف بیان کر دیں ان کے لئے وہ بات جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور (یہ کتاب) سراپا ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایماندار ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مگر اس لئے کہ آپ ان کے لئے دین اور احکام میں سے وہ بات صاف صاف بیان کر دیں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں پس آپ کے بیان سے ان پر حجت قائم ہو جائے گی۔ اور هُدًى وَّرَحْمَةً کا لِتُبَيِّنَ کے محل پر عطف کیا گیا ہے کیونکہ اس کا محل نصب ہے۔ اور مجاز کلام یہ ہے: وما أنزلنا علیك الکتاب الا تبیانا للناس (اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں اتاری مگر لوگوں کو وضاحت سے بیان کرنے کے لئے)۔ هُدًى مراد رشد، راہنمائی ہے۔ وَّرَحْمَةً یعنی مومنین کے لئے یہ سراپا ہدایت اور رحمت ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کیا اس سے زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد، بے شک اس میں (کھلی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو (حق کی آواز) سنتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور اللہ تعالیٰ نے بادل سے (پانی) اتارا۔ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کلام نعمتوں کو شمار کرنے اور کمال قدرت کو بیان کرنے کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بے شک اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل ہے جب انہوں نے یہ جان لیا کہ ان کا معبود کسی شے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو یہ دلیل ہو جائے گی لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے (حق کی آواز) دلوں کے ساتھ سنتے ہیں نہ کہ کانوں کے ساتھ) فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (الحج) (حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔)

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝

''اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں ایک عبرت ہے، دیکھو! ہم تمہیں پلاتے ہیں جو ان کے شکموں میں گوبر اور خون ہے ان کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ جو بہت خوش ذائقہ ہے پینے والوں کے لئے۔''

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے، اور یہاں چوپاؤں کی چار قسمیں مراد ہیں: اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری۔ لَعِبْرَةً یعنی ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی وحدانیت اور اس کی عظمت پر دلیل ہے۔ اور العبرۃ دراصل ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ تشبیہ دینا ہے اور اس کی مثل قرار دینا ہے تاکہ اس کی حقیقت بطریق مشاکلہ پہچان لی جائے۔ اور اسی سے فَاعْتَبِرُوْا (پس عبرت حاصل کرو) ہے۔ اور ابو بکر وراق نے کہا ہے: مویشیوں میں عبرت ان کا اپنے مالکوں کے لئے مسخر ہونا اور ان کے لئے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے، اور تیرا اپنے رب کی سرکشی اختیار کرنا اور ہر شے میں اس کی مخالفت کرنا ہے، اور عظیم ترین عبرت اور سبق یہ ہے کہ وہ اس سے برأت کا اظہار کرے جو گنہگار کو گناہ پر ابھارتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: نُسْقِيْكُمْ اہل مدینہ، ابن عامر اور ابو بکر کی روایت میں عاصم کی قرأت (نون کے فتحہ) کے ساتھ ہے اور یہ سقی یسقی سے ماخوذ ہے۔ اور باقیوں نے اور حفص نے حضرت عاصم سے (نون کے ضمہ) کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ أسقی یُسقی سے ماخوذ ہے، اور یہی کوفیوں اور اہل مکہ کی قرأت ہے۔ کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں۔

اور لبید نے کہا ہے:

سَقَى قَوْمِي بَنِي مَجْدٍ وأسقى نُمَيْرًا و القبائلَ من هِلالِ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو شے تیرے ہاتھ میں ہو اور اسے کسی کے منہ میں ڈالے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے: سقیتہ (میں نے اسے پلایا)۔ اور جب تو اس کے لئے گھاٹ بنائے یا اسے پانی پیش کرے کہ وہ خود اپنے منہ سے اسے پی لے یا وہ کھیتی کو لگائے تو کہا جائے گا: أسقیتہ (میں نے اسے سیراب کیا)؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ایک جماعت نے تسقیکم تا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضعیف ہے، مراد چوپائے ہیں۔ اور اسے یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی یسقیکم اللہ عزوجل (اللہ تعالیٰ تمہیں پلاتا ہے۔) اور قراء سابقہ دونوں قرأتوں پر ہیں، پس نون کا فتحہ قریش کی لغت ہے اور اس کا ضمہ حمیر کی لغت ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ لوگوں نے قول باری تعالیٰ: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ میں ضمیر کے بارے اختلاف کیا ہے کہ کس کی طرف لوٹ رہی ہے؟ تو کہا گیا ہے کہ یہ اپنے ماقبل کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہ جمع مونث ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: عرب الانعام کے بارے خبر واحد کے ساتھ بھی خبر دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا ہے (2): میرا خیال ہے انہوں نے اسی آیت کی وجہ سے اس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ آپ کے منصب کے موافق نہیں ہے اور نہ اس کا ادراک آپ کے لائق اور مناسب

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 157 2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1151

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب جمع کا لفظ اسم جنس ہو تو اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جا سکتا ہے پس کہا جائے گا: ھو الأنعام اور ھی الأنعام، لہٰذا مذکر ضمیر کا لوٹنا جائز ہوا۔ اور یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے مما فی بطون ما ذکرنا (اس سے جو پیٹوں میں ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے پس ضمیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہوگی۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ (المدثر) (یہ تو نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مثل الفراخ نتقت حواصلہ

اس میں بھی مذکر ضمیر لوٹائی گئی ہے۔ اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور کسائی نے کہا ہے: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ یعنی اس سے جو ان میں سے بعض کے پیٹوں میں ہے، کیونکہ مذکر جانوروں کا دودھ نہیں ہوتا، اور یہ وہی ہے جس پر ابو عبیدہ نے اسے محمول کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: الأنعام اور النَّعَم دونوں ایک ہی (معنی میں) ہیں، اور النعم مذکر ذکر کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے عرب کہتے ہیں: ھذا نعم وارد (یہ جانور قریب پہنچنے والے ہیں) پس یہ ضمیر اس لفظ نعم کی طرف لوٹ رہی ہے جو بمعنی الانعام ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: بلاشبہ مذکر ضمیر جمع کے معنی کی طرف، اور مونث ضمیر جماعت کے معنی کی طرف لوٹتی ہے، پس یہاں اسے لفظ جمع کے اعتبار سے مذکر ذکر کیا ہے، اور سورۃ المومنون میں لفظ جماعت کے اعتبار سے اسے مونث ذکر کیا ہے پس فرمایا: نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا اور اس تاویل سے معنی خوب اچھی طرح درست اور صحیح ہو جاتا ہے (1)۔ اور لفظ جماعت کے اعتبار سے مونث ذکر کرنا اور لفظ جمع کے اعتبار سے مذکر ذکر کرنا یبرین کے صحراؤں اور فلسطین کے چٹیل میدانوں سے زیادہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض اجل علماء نے اور وہ قاضی اسماعیل ہیں نے اس ضمیر کے لوٹانے سے یہ استدلال کیا ہے کہ نر کا دودھ تحریم کا فائدہ دیتا ہے، اور کہا ہے: بلاشبہ اسے مذکر لایا گیا ہے، کیونکہ یہ مذکر جانور کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ مذکر کے لئے دودھ شمار کیا گیا ہے، اسی لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ نر کا دودھ حرمت ثابت کر دیتا ہے جس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ابو القعیس کے بھائی افلح کی حدیث میں اس کا انکار کیا فللمرأۃ السقی وللرجل اللقاح (پس عورت کے لئے سیراب ہونا ہے اور مرد کے لئے مادہ منویہ ڈالنا ہے) پس اس میں ان دونوں کے درمیان اشتراک جاری ہے۔ اور لبن فحل کی تحریم کے بارے بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ نکال کر اپنی عظیم قدرت پر آگاہ فرمایا ہے۔ اور الفرث: وہ گوبر ہے جو اوجھ کی طرف اتر آتا ہے پس جب وہ خارج ہو جائے تو اسے فرث نہیں کہا جاتا۔ کہا جاتا ہے: أفرثت الکرش جب تو اسے نکال دے جو کچھ اس میں ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ طعام (چارے) میں سے کچھ وہ ہوتا ہے جو اوجھ میں ہوتا ہے اور اس سے کچھ خون بن جاتا ہے، پھر دودھ خون سے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1151

خالص ہو جاتا ہے، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ یہ دودھ اس کے اور خون کے درمیان سے رگوں سے نکلتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بے شک جانور چارہ کھاتے ہیں اور جب وہ اس کی اوجھ میں قرار پکڑ جائے تو وہ اسے پکا دیتی ہے پس اس کا نچلا حصہ گوبر ہے، اس کا درمیانہ حصہ دودھ، اور اس کا اوپر والا حصہ خون ہوتا ہے، اور جگر اور کلیجہ کو ان اصناف پر غالب اور مسلط کیا گیا ہے، پس وہ خون کو تقسیم کرتا ہے، اسے الگ کرتا ہے اور اسے رگوں میں چلاتا ہے، اور وہ دودھ کو کھیری میں پہنچاتا ہے۔ اور گوبر اسی طرح باقی رہ جاتا ہے جیسا کہ وہ اوجھ میں تھا: حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ (القمر) ((وہ خبریں) سراسر حکمت ہیں پس ڈرنے والوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا) خَالِصًا مراد یہ ہے کہ وہ اسے خون کی سرخی اور گوبر کی گندگی سے پاک صاف کر دیتا ہے حالانکہ اس نے دونوں کو ایک برتن میں جمع کر رکھا ہے۔ اور ابن بحر نے کہا ہے: خالصا بیاضه اس کی سفیدی کو خالص کرتا ہے۔ نابغہ نے کہا ہے:

بخالصة الأردان خُضْرِ المناكب

مراد آستینوں کی سفیدی ہے۔ اور یہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی مگر اسے ہی جو ہر شے میں مصلحت اور فوائد قائم رکھنے والا ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ نقاش نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ منی نجس نہیں ہے، اور یہ ان کے سوا کئی دوسروں نے بھی کہا ہے اور استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: جس طرح دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے اور وہ لذیذ اور خالص ہوتا ہے اسی طرح یہ جائز ہے کہ ، پیشاب کے راستے سے نکلنے کے باوجود طاہر اور پاک ہو۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: بے شک یہ بہت بڑی جہالت ہے اور انتہائی شنیع عمل میں شروع ہوتا ہے، دودھ کے بارے میں تو اس نعمت واحسان ہونے کی خبر آئی ہے جو قدرت سے صادر ہوتا ہے تاکہ وہ عبرت ہو جائے، پس یہ سب خلوص اور لذت کے وصف کا تقاضا کرتا ہے اور منی اس حالت میں نہیں ہے کہ اسے اس کے ساتھ ملایا جائے یا اس پر قیاس کیا جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے معارض آتا ہے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ کون سا احسان اس منی کے نکلنے سے عظیم تر اور بلند ہے جس سے معزز ومکرم انسان پیدا ہوتا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآىِٕبِ ۝ (الطارق) (جو (مرد وزن کی) پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے) اور فرمایا: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (النحل: 72) (اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے عورتیں اور پیدا فرمائے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے۔)

اور یہ احسان کی عنایت اور انتہا ہے، پھر اگر کہا جائے: بے شک یہ پیشاب کے راستے نکلنے کے سبب ناپاک اور پلید ہو جاتی ہے، تو ہم کہیں گے: یہ وہی ہے جس کا ہم نے ارادہ کیا ہے۔ پس نجاست ایک امر عارض ہے اور اس کی اصل پاک اور طاہر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کے نکلنے کا راستہ پیشاب کے راستہ کے سوا ہے اور خاص کر عورت میں، کیونکہ اس میں ذکر کو داخل کرنے کا راستہ اور بچے کا راستہ پیشاب کے راستہ کے سوا ہے جیسا کہ علماء نے کہا ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پھر اگر کہا جائے: چونکہ اس کی اصل خون ہے اور وہ ناپاک اور نجس ہے، تو ہم کہیں گے: یہ اعتراض کستوری

کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی اصل خون ہے اور وہ پاک اور طاہر ہے۔ اور جنہوں نے اس کی طہارت کا قول کیا ہے وہ امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں، اس کی وجہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے اپنے ناخن کے ساتھ اسے کھرچ ڈالتی تھی درآنحالیکہ وہ خشک ہوتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اگر وہ نہ بھی کھرچی جاسکے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے سے منی کھرچ ڈالتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ نخامہ (ناک سے بہنے والا مادہ) کی مثل ہے تو اسے اذخر (گھاس) کے ساتھ پھیلالے اور پھر کپڑے کے ساتھ اسے صاف کرلے، پونچھ ڈالے۔ پھر اگر یہ کہا جائے: تحقیق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی دھو ڈالتی تھی پھر آپ اسی کپڑے میں نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور میں اس میں دھونے کے اثر (اور نشان) دیکھ رہی ہوتی تھی۔ تو ہم کہیں گے: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ اسے گندگی سمجھ کر دھو ڈالتی تھیں جیسا کہ دیگر وہ اشیاء جو کپڑے سے زائل کی جاتی ہیں نہ کہ نجاست کی وجہ سے، اور اس طرح ان احادیث کے درمیان تطبیق ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، ان کے اصحاب، اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ نجس اور پلید ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کپڑے سے احتلام کو دھونا امر واجب ہے اور ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے۔ اور یہی علمائے کوفہ کا بھی قول ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنے کپڑوں سے دھوتے تھے۔ اور اس میں حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے اختلاف کیا گیا ہے۔ منی کی نجاست اور اس کی طہارت کے بارے میں انہی دو قولوں پر تابعین بھی ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دودھ سے پینے وغیرہ کا نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن جہاں تک مردار کے دودھ کا تعلق ہے تو اس سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ وہ پاک مائع ہے جو ناپاک برتن میں پڑی ہوئی ہے، اور وہ اس طرح کہ مردار کی کھیری نجس اور ناپاک ہے اور دودھ پاک ہے پس جب اسے دوہیا گیا تو وہ اسی طرح ہو گیا گویا اسے ناپاک برتن سے لیا گیا ہے۔ اور رہا مردہ عورت کا دودھ تو اس بارے میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ انسان طاہر ہے زندہ ہو یا مردہ تو وہ طاہر ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے: انسان مرنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک وہ نجس ہے۔ دونوں قولوں کے مطابق حرمت (رضاعت) ثابت ہو جاتی ہے؛ کیونکہ بچہ اس سے اسی طرح غذا حاصل کرتا ہے جیسے زندہ کے دودھ سے غذا حاصل کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”رضاع وہ ہے جو گوشت پیدا کرے اور ہڈیوں کو بڑھائے“ (1)۔ اور آپ نے اس میں کوئی تخصیص نہیں کی)، تفصیل سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ یعنی لذیذ، خوش ذائقہ اور پینے والوں کے لئے اتنا آسان اور سکون بخش کہ پیتے وقت گلے میں ذرا نہ اٹکتا نہیں۔ کہا جاتا ہے: ساغ الشراب یسوغ سوغا یعنی جس کا حلق میں داخل ہونا آسان اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی رضاعۃ الکبیر، جلد 1، صفحہ 281۔ ایضاً، حدیث نمبر 1763، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سہل ہو، اور أساغه شاربه (اس نے اسے پینے والے کے لئے آسان بنا دیا)، اور سغته أنا أسيغه وأسوغه، یہ متعدی بھی ہوتا ہے اور غیر متعدی بھی، اور عمدہ أسغته إساغة ہے کہا جاتا ہے: أسِغ لي غُصّتي یعنی مجھے مہلت دے اور میرے لئے جلدی نہ کر اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ (ابراہیم: 17) (وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔) اور السِواغ (سین کے کسرہ کے ساتھ) وہ جس کے ساتھ تیرا غصہ اتر جائے۔ کہا جاتا ہے: الماء سِواغ الغصص (پانی غصے کو ٹھنڈا کر دینے والا ہے) اور اسی سے کمیت کا قول ہے:

فكانت سِوَاغاً ان جَئِزت بِغُصّة

(پس یہ حلق کے پھندے کو دور کرنے والی شے ہے اگر اسے غصہ کے ساتھ پھندا لگ جائے) اور روایت ہے کہ دودھ کے ساتھ کبھی بھی کسی کا گلا نہیں گھٹا، اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں میٹھی شے کے استعمال اور لذیذ کھانوں کے تناول کرنے پر دلیل موجود ہے، اور یہ نہیں کہا جائے گا: بے شک یہ زہد کو ختم کر دیتا ہے اور اسے دور کر دیتا ہے، لیکن جب جزوی طور پر ہو اور بغیر اسراف اور کثرت کے ہو۔ یہ معنی سورۃ المائدہ وغیرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیالے کے ساتھ یہ تمام مشروبات پلائے ہیں شہد، نبیذ، دودھ اور پانی۔ اور بعض قراء نے فالوذج (آٹے، پانی اور شہد سے بنا ہوا حلوہ) کھانے اور کھانے کے ساتھ دودھ پینے کو مکروہ قرار دیا ہے، اور عام علماء نے اسے مباح قرار دیا ہے۔ اور حسن سے روایت کی گئی ہے کہ وہ ایک دستر خوان پر تھے اور ان کے ساتھ مالک بن دینار بھی تھے، پس فالوذج لایا گیا تو انہوں نے اسے کھانے سے انکار کر دیا تو حسن نے انہیں کہا: کھاؤ! کیونکہ تم پر ٹھنڈے پانی میں اس سے زیادہ محاسبہ ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ ابو داؤد وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دودھ لایا گیا تو آپ نے اسے نوش فرمایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کھانا کھانے لگے تو اسے چاہئے کہ یہ کہے: اللّٰهم بارك لنا فيه وأطعمنا خيرا منه (اے اللہ! ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما اور ہمیں اس سے بہتر کھلا) اور جب دودھ پلایا جائے تو یہ کہنا چاہئے اللّٰهم بارك لنا فيه وزدنا منه (اے اللہ! ہمارے لئے اس میں برکت رکھ دے اور ہمیں اس سے زیادہ عطا فرما) کیونکہ دودھ کے سوا کوئی شے نہیں ہے جسے کھانے پینے کا بدل بنایا جا سکے (1)۔'' ہمارے علماء نے کہا ہے: ایسا کیسے نہیں ہو سکتا جب کہ یہ وہ ہے جس سے سب سے پہلے انسان غذا حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ اجسام وابدان نشوونما پاتے ہیں، پس یہ وہ قوت اور طاقت ہے جو مفاسد سے خالی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اجسام مضبوط اور طاقتور بنتے ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کے لئے اس امت کے ہدایت پر ہونے کی علامت قرار دیا ہے جو تمام امتوں سے بہترین امت ہے، پس صحیح میں فرمایا: ''میرے پاس حضرت جبرائیل امین

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات باب مايقول إذا اكل طعاما، جلد 2، صفحہ 183۔ ایضاً، حدیث نمبر 3377، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الاشربہ، باب مايقول اذا شرب اللبن، جلد 2، صفحہ 168

علیہ السلام ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لے کر آئے تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو جبرائیل امین علیہ السلام نے مجھے کہا آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے بلاشبہ اگر آپ شراب کو پسند کر لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی''۔ پھر دعا میں اس کی زیادتی کی التجاء یہ خوشحالی، خیرات کے ظہور، اور برکتوں کے کثیر ہونے کی علامت ہے، پس یہ سراپا برکت ہی برکت ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

''اور (ہم پلاتے ہیں تمہیں) کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بناتے ہو اس سے میٹھا رس اور پاک رزق، بلاشبہ اس میں بھی (ہماری قدرت کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھدار ہیں۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ علامہ طبری نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے و من ثمرات النخیل والاعناب ما تتخذون (یعنی کھجور اور انگور کے پھلوں سے جو کچھ تم بناتے ہو) پس ما کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے حذف پر دلیل قول باری تعالیٰ: مِنْهُ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس میں محذوف شئ ہے، اور امر قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منہ کا معنی ہے ای من المذکور (یعنی ان سے جن کا ذکر کیا گیا ہے)۔ پس کلام میں حذف نہ ہوگا اور یہی اَولیٰ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَمِنْ ثَمَرٰتِ کا عطف الْاَنْعَامِ پر ہو یعنی اور تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں میں عبرت ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مِمَّا پر معطوف ہو یعنی اور ہم تمہیں پھلوں سے بھی مشروبات پلاتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: سَكَرًا السکر ہر وہ شے جو نشہ دیتی ہے؛ لغت میں یہی مشہور ہے۔ سکر سے مراد خمر (شراب) لیا ہے، اور رزق حسن سے مراد ہر وہ حلال شے ہے جو ان دونوں درختوں سے کھائی پی جاتی ہے۔ اور یہی قول ابن جبیر، نخعی، شعبی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک لغت حبشہ کے مطابق سکر سے مراد سرکہ ہے، اور رزق حسن سے مراد طعام ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السکر سے مراد میٹھا اور حلال رس (جوس) ہے، اور اسے سکر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جب یہ پڑا رہے تو یہ بھی مسکر (نشہ آور) ہو جاتا ہے، پس جب یہ نشہ دینے کی حد تک پہنچ جائے تو حرام ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان اقوال میں سے زیادہ صحیح اور مضبوط قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، اور دو معنوں میں سے ایک پر ہو سکتا ہے، یا تو یہ کہ اس آیت کا نزول تحریم خمر سے پہلے ہو، اور یا اس کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھجور اور انگور کے پھلوں کے ساتھ انعام فرمایا ہے اور تم اس سے وہ شے بناتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہے (یہ) تمہاری طرف سے حد سے تجاوز اور زیادتی ہے، اور وہ شے بناتے ہو جو تمہارے لئے اس نے حلال کی ہے (اور) اس سے تمہاری منفعت کا قصد و ارادہ فرمایا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت تحریم خمر سے پہلے نازل ہوئی پھر یہ منسوخ ہو گئی، کیونکہ یہ آیت باتفاق علماء مکی ہے، اور شراب مدینہ طیبہ میں حرام ہوئی (1)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1153

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اس بنا پر کہ سکر سے مراد سرکہ یا میٹھا رس ہو تو اس میں کوئی نسخ نہیں ہے، اور یہ آیت محکم ہوگی اور یہی اچھا اور بہتر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل حبشہ سرکہ کو سکر کا نام دیتے ہیں، مگر جمہور کا موقف یہ ہے کہ سکر سے مراد خمر (شراب) ہے، ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت ابورزین، حسن، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان تمام نے یہ کہا ہے: سکر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پھلوں میں سے حرام قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح اہل لغت نے بھی کہا ہے: السکر اسم الخمر و ما یسکر۔ (یعنی سکر خمر کا نام ہے اور ہر اس شے کا جو نشہ آور ہوتی ہے)۔ اور انہوں نے یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

بِئْسَ الصُّحَاةُ وَ بِئْسَ الشَّرْبُ شَرْبُهُم إذا جری فیهم المُزَّاءُ والسَّكَرُ (1)

اور رزق حسن سے مراد وہ ہے جو ان دونوں کے پھلوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قول باری تعالیٰ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا خبر ہے۔ اس کا معنی استفہام بمعنی انکار ہے، یعنی کیا اس سے شراب بناتے ہو اور پاکیزہ رزق (یعنی) سرکہ، کشمش، اور کھجور سب چھوڑ دیتے ہو؟ جیسا کہ یہ قول ہے: فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ یعنی کیا وہ ہمیشہ رہیں گے؟ یعنی یہ تیرے لئے خوراک ہے۔ اور شاعر کا قول بیان کیا ہے:

جَعَلْتَ عَيْبَ الأَكْرَمِيْنَ سَكَرًا (2)

(تو نے معززین کی عیب جوئی کو خوراک بنا لیا ہے) یعنی تو نے ان کی مذمت کو خوراک بنا لیا ہے۔ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے کہ السکر سے مراد ہر وہ شے جو کھانے میں سے کھائی جاتی ہے اور کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اس کا پینا حلال ہو اور یہی رزق حسن ہے، پس الفاظ مختلف ہیں لیکن معنی ایک ہے۔

اسی طرح یہ قول ہے: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (یوسف: 86) (میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں) یہ معنی مراد لینا اچھا ہے اور اس میں کوئی نسخ نہیں، مگر زجاج نے کہا ہے: ابوعبیدہ کا یہ قول معروف نہیں ہے، اور علماء تفسیر اس کے خلاف ہیں، اور جو شعر انہوں نے کہا ہے اس میں ان کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ ان کے سوا دوسروں کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ یہ بیان کر رہا ہے کہ وہ لوگوں کے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے، چھپا لیتی ہے۔ اور احناف نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ سَكَرًا سے مراد وہ ہے جو نبیذوں میں سے نشہ آور نہ ہو اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان چیزوں کے ساتھ احسان کیا ہے جو اس نے ان کے لئے تخلیق فرمائی ہیں، اور احسان صرف انہی چیزوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو حلال کی گئی ہیں نہ کہ ان کے ساتھ جو حرام ہیں، پس یہی ایسی نبیذ کے پینے کے جواز پر دلیل ہے جو مسکر نہ ہو، پس جب وہ نشہ کی حد تک پہنچ جائے تو وہ جائز نہ ہوگی، اور انہوں نے اسے اس حدیث کے ساتھ قوی اور مضبوط کیا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اس خمر (شراب) کو حرام بعینہا اور سکر (نشہ آور شراب) کو حرام من غیرھا قرار دیا ہے (3)"۔ اور اس روایت سے جسے عبد الملک بن نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 198 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 162، حدیث 9984

سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے ایک آدمی کو دیکھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ رکن کے ساتھ تشریف فرما تھے، اور اس نے آپ کو ایک پیالہ پیش کیا سو آپ نے اسے اپنے منہ کی طرف اٹھایا تو اسے سخت (نشہ آور) پایا تو آپ نے اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دیا۔ تو اس وقت آپ کو لوگوں میں سے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ حرام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''اس آدمی کو میرے پاس لاؤ''۔ اسے لایا گیا تو آپ نے اس سے پیالہ پکڑ لیا، پھر پانی منگایا اور وہ اس میں انڈیل دیا پھر اسے اپنے منہ کی طرف بلند کیا اور اسے ہلایا۔ پھر پانی منگایا اور وہ بھی اس میں انڈیل دیا پھر ارشاد فرمایا: ''جب تم پر یہ برتن جوش مارنے لگیں تو تم ان کی شدت اور سختی کو پانی کے ساتھ توڑ دو''۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نبیذ بنائی جاتی تھی اور اسی دن آپ اسے نوش فرما لیتے تھے۔ اور جب اسے دوسرا یا تیسرا دن ہو جاتا تو آپ خادم کو پلا دیتے جب اس میں معمولی تغیر ہوتا، اگر یہ حرام ہوتی تو آپ قطعاً اسے نہ پلاتے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابو عون ثقفی نے عبداللہ بن شداد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: خمر (شراب) بعینها حرام ہے وہ قلیل ہو یا کثیر اور ہر مشروب سے سکر (نشہ آور) حرام ہے۔ اسے دار قطنی نے بھی نقل کیا ہے۔ پس اس حدیث میں اور ان میں جو اس کی مثل ہیں، یہ ہے کہ غیر خمر کا عین اس طرح حرام نہیں جس طرح خمر بعینها حرام ہے۔ انہوں نے کہا: خمر انگور کی شراب ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور ان کے دلائل میں سے وہ روایت بھی ہے جسے شریک بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ ابو اسحاق ہمدانی نے عمرو بن میمون سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک ہم ان اونٹوں کا گوشت کھاتے ہیں اور اسے ہمارے پیٹوں میں سوائے نبیذ کے کوئی شے ہضم نہیں کر سکتی۔ شریک نے بیان کیا ہے: میں نے ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے زمانے کے جید عالم مالک بن معول کے گھر نبیذ پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ان کا یہ قول کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے اور اس کا احسان نہیں ہو سکتا مگر ان چیزوں کے ساتھ جو اس نے حلال فرمائی ہیں یہ بالکل صحیح ہے؛ مگر یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ ارشاد تحریم خمر سے پہلے کا ہو جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے تو پھر یہ منسوخ ہوگا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ کہا جائے اس کا نسخ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ یہ خبر ہے اور خبر میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا؟ تو ہم کہیں گے: یہ اس کا کلام ہے جس نے شریعت کی تحقیق نہیں کی، تحقیق ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ خبر جب وجود حقیقی کے بارے میں ہو یا ثواب عطا کرنے کے بارے میں درآنحالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل ہو تو یہ وہ خبر ہے جس میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا، لیکن جب خبر حکم شرعی کو متضمن ہو تو احکام تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور منسوخ بھی ہو جاتے ہیں، چاہے وہ خبر کی صورت میں ہوں یا امر کی صورت میں، اور نسخ نفس لفظ کی طرف راجع نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کی طرف راجع ہوتا ہے جسے وہ متضمن ہوتا ہے، پس جب تم یہ سمجھ گئے تو تم ان کند ذہنوں کی صنف سے خارج ہو گئے جس کے متعلق کفار کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (النحل) (اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں تم

صرف افترا پرداز ہو، بلکہ ان میں سے اکثر (آیت بدلنے کی حکمت کو) نہیں جانتے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس سے جاہل اور ناواقف ہیں کہ رب کریم جس کے بارے چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے پابند اور مکلف بنا دیتا ہے اور اپنے عدل کے ساتھ اس میں سے جو چاہتا ہے اٹھالیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ انتہائی برا طعن و تشنیع ہے یہاں تک کہ اس میں نیکوکار علماء بھی فہم و فراست کی کمی میں کفار کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور یہ مسئلہ اصولی ہے، وہ یہ کہ احکام شرعیہ کے بارے اخبار کا نسخ جائز ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ نسخ جائز ہے اور اس کی وجہ یہ آیت اور اس کی مثل آیات ہیں، اور اس لئے بھی کہ کسی حکم کے مشروع ہونے کے بارے خبر اس مشروع کی طلب کو متضمن ہوتی ہے، اور وہی طلب وہ حکم شرعی ہے جس کے نسخ پر استدلال کیا جا رہا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور رہیں وہ احادیث جو انہوں نے ذکر کی ہیں تو ان میں سے پہلی اور دوسری دونوں ضعیف ہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ثابت کے ساتھ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ہر شراب جو نشہ دے پس وہ حرام ہے(1)''۔ اور مزید فرمایا: ''ہر نشہ آور (مشروب) خمر ہے اور ہر نشہ آور (شراب) حرام ہے''۔ کلُّ مسکرٍ خمرٌ وکلُّ مسکرٍ حرامٌ(2) اور مزید فرمایا: ''جس شے کی کثیر مقدار نشہ آور ہو تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے(3)''۔ نسائی نے کہا ہے: ان احادیث کے تمام روات اہل ثبت و عدالت ہیں اور صحت نقل کے ساتھ مشہور ہیں، اور عبد الملک ان میں سے کسی ایک کے قائم مقام بھی نہیں ہوسکتا اگرچہ اس کے ہم مثلوں کی جماعت بھی اس کی تائید اور معاونت کرے۔ وباللہ التوفیق۔

اور رہی تیسری حدیث تو اگرچہ وہ صحیح ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خادم کو وہ اس لئے نہیں پلاتے تھے کہ وہ مسکر ہے بلکہ آپ اس لئے پلا دیتے تھے کہ اس کی بو تبدیل ہو چکی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند کرتے تھے کہ آپ سے بو پائی جائے، پس اسی لئے آپ اسے نہ پیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی ازواج نے عسل زینب کے بارے میں آپ پر یہ وہم اور شبہ کیا کہ آپ کو کہا گیا: بے شک ہم آپ سے مغافیر کی بو پاتی ہیں، مراد ناپسندیدہ بو ہے، پھر اس کے بعد آپ نے اسے نہ پیا۔ اس کا بیان سورت تحریم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور رہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث! تو آپ سے اس کے خلاف بھی مروی ہے اور وہ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ، طاؤس رحمۃ اللہ علیہ اور مجاہد کی روایت سے ہے کہ آپ نے فرمایا: ''وہ شے جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے(4)''۔ اور اسے آپ سے حضرت قیس بن دینار نے روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح مسکر کے بارے میں آپ کا فتویٰ ہے؛ یہ دارقطنی نے کہا ہے۔ اور پہلی حدیث آپ سے حضرت عبد اللہ بن شداد نے روایت کی ہے حالانکہ ایک جماعت نے ان سے مخالفت کی ہے، پس اس کے ساتھ قول ساقط ہو گیا اس کے ساتھ ساتھ کہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت بھی نہیں اور جہاں تک اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب لا یجوز الوضوء بالنبیذ، جلد 1، صفحہ 38

2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب اباحۃ النبیذ الذی لم یشتد ولم یصر مسکرا، جلد 2، صفحہ 168

3۔ جامع ترمذی، کتاب الاشربہ، باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام، جلد 2، صفحہ 9۔

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام، حدیث 3384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 4۔ ایضاً

روایت کا تعلق ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: ہمارے پیٹوں میں نبیذ کے سوا کوئی شے اسے ہضم نہیں کر سکتی، تو آپ اس سے غیر مسکر کا ارادہ فرما رہے ہیں اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور نسائی نے عتبہ بن فرقد سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: وہ نبیذ جسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پیا تھا اس کا سرکہ بنا لیا گیا۔ نسائی نے بیان کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے پر حضرت سائب رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث دلالت کرتی ہے، حارث بن مسکین نے کہا ہے آپ پر پڑھا گیا اور میں ابن قاسم سے سنتا رہا: مالک نے ابن شہاب سے، انہوں نے سائب بن یزید سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے انہیں خبر دی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: بے شک میں نے فلاں سے شراب کی بو پائی ہے، تو آپ کو گمان ہوا کہ وہ شراب الطلاء ہو اور میں اس کے بارے پوچھنے لگا ہوں جو اس نے پیا ہے، پس اگر وہ مسکر ہوا تو میں اسے کوڑے لگاؤں گا، پس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے مکمل حد کے کوڑے لگائے۔ تحقیق آپ نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: امابعد! اے لوگو! چونکہ شراب (خمر) کے حرام ہونے کا حکم نازل ہو چکا ہے اور یہ پانچ چیزوں سے تیار ہوتی ہے انگور، شہد، کھجور، گندم اور جو سے اور خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ اور سورۃ المائدہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ ابراہیم نخعی اور امام ابوجعفر طحاوی نے اس کے پینے کو حلال قرار دیا ہے اور وہ بھی اپنے اہل زمانہ کے امام تھے، اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اسے پیتے تھے۔ تو ہم کہیں گے: نسائی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے نبیذوں میں سے مسکر کو حلال قرار دیا وہ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اور یہ ایک عالم کی پھسلاہٹ (اور خطا) ہے اور ہمیں عالم کی پھسلاہٹ سے محتاط رکھا گیا ہے، اور سنت کے ہوتے ہوئے کسی کے قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ اور نسائی نے بھی ابن المبارک سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے مسکر کے بارے میں کسی سے ایسی رخصت نہیں پائی جو صحیح ہو سوائے ابراہیم کے۔ ابو اسامہ نے کہا ہے: میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو بلاد شام، مصر، یمن اور حجاز میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر علم کا طالب ہو۔ اور رہے حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ! اگر ان دونوں سے یہ قول صحیح ہے تو بھی ان سے ان کے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا جن ائمہ کرام نے تحریم مسکر میں ان کی مخالفت کی ہے اس کے ساتھ ساتھ کہ یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔

اس بنا پر کہ امام طحاوی نے اپنی کتاب "الکبیر" میں اختلاف میں اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کتاب التمہید میں ذکر کیا ہے کہ ابوجعفر طحاوی نے کہا ہے: امت اس پر متفق ہے کہ انگور کا رس (عصیر العنب) جب سخت ہو جائے، ابل جائے اور اس پر جھاگ بن جائے تو وہ خمر ہے اور اسے حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ اور نقیع التمر (بھگوئی ہوئی کھجوروں کا شربت) میں علماء نے اختلاف کیا ہے جب وہ ابل جائے اور نشہ پیدا کر دے۔ فرمایا: پس یہ تیری اس پر راہنمائی کر رہا ہے کہ یحییٰ بن ابی کثیر کی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "خمر ان دو درختوں سے بنتا ہے کھجور اور انگور (1)"۔ ان کے نزدیک اس کے مطابق عمل نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ حدیث کو قبول کرتے تو وہ نقیع التمر کو حلال قرار دینے والوں کو کافر قرار دیتے، تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ خمر جو حرام کیا گیا ہے اس میں انگور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، بیان ان جمیع ماینبذ مما یتخذ من النخل والعنب، جلد 2، صفحہ 163

کے اس رس کے سوا کوئی داخل نہیں جو سخت ہو گیا ہو اور اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ نشہ دینے لگے۔ فرمایا: پھر وہ اس سے خالی نہ ہو گا کہ تحریم صرف اسی کے ساتھ معلق ہو اور اس پر کسی غیر کو قیاس نہ کیا گیا ہو یا اس پر قیاس واجب اور ضروری ہو گا، تو ہم نے تمام کو پایا ہے کہ انہوں نے اس پر نقیع التمر کو قیاس کیا ہے جب وہ ابلنے لگے اور اس کی کثیر مقدار نشہ دینے لگے اور نقیع الزبیب بھی اسی طرح ہے۔ فرمایا: پس اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ واجب ہے کہ مشروبات میں سے ہر اس کو حرام قرار دیا جائے جو نشہ آور ہو۔ فرمایا: تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ہر مسکر حرام ہے (2)''۔ اور اس کی سند کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے تمام نے قبول کیا ہے۔ اور ان کے درمیان اختلاف اس کی تاویل میں ہے، پس ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ آپ نے اس سے اس جنس کا ارادہ کیا ہے جو نشہ دیتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ نے اس سے ارادہ اس کا کیا ہے جس کے ساتھ وہ نشہ میں مبتلا ہو جائے جیسا کہ کسی کو قتل کے وجود کے بغیر قاتل کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ حرام ہے ان کے اس قول کی وجہ سے: پس اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ واجب ہے کہ ہر نشہ آور مشروب کو حرام قرار دیا جائے۔ اور دار قطنی نے اپنی سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے خمر کو اس کے نام کی وجہ سے حرام نہیں کیا بلکہ اس کے انجام کی وجہ سے اسے حرام کیا ہے، پس ہر شراب کا انجام خمر کے انجام کی مثل ہی ہوتا ہے پس وہ خمر کے حرام ہونے کی طرح ہی حرام ہو گی۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل کوفہ معلول اخبار لائے ہیں، اور جب لوگوں کا کسی شے کے بارے اختلاف ہو جائے تو پھر اسے کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف لوٹانا واجب ہے۔ اور بعض تابعین کے بارے میں جو یہ مروی ہے کہ انہوں نے وہ شراب پی ہے جس کی کثیر مقدار نشہ دیتی ہے تو یہ قوم کے گناہ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت طلب کریں گے، اور یہ دو معنوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہے کہ یا تو وہ خطا کار ہے اس حدیث کی تاویل میں اس نے خطا کی ہے جو اس نے سنی یا آدمی سے گناہ صادر ہوا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کثرت سے کرے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے اولین و آخرین پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں۔ اور آیت کی تاویل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک یہ عبرت کے لئے ذکر کی گئی ہے یعنی جو (ذات) ان اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ یقیناً دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، اور یہ اعتبار اس سے مختلف نہیں ہوتا کہ خمر حلال ہو یا حرام، پس السکر (رس) بنانا تحریم پر دلالت نہیں کرتا، اور یہ اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرہ: 219) (آپ فرمائیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے۔) واللہ اعلم۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

''اور ڈال دی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات کہ بنایا کر پہاڑوں میں (اپنے) چھتے اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، بیان ان جمیع ما ینبذ مما یتخذ من النخل والعنب، جلد 2، صفحہ 168

درختوں (کی شاخوں) میں اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ وحی کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے اور وہ یہ کہ یہ کبھی بمعنی الہام ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ابتداءً ہی بغیر کسی ظاہری سبب کے دل میں بات القا کر دیتا ہے۔" اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے: وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝ (الشمس) (قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو) اور اسی سے چوپائے اور وہ چیز ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان میں اپنے منافع پانے، اپنے نقصان اور تکلیف کے مقام سے اجتناب کرنے اور اپنی معاش کی تدبیر کرنے کے بارے پیدا فرما دیتا ہے۔ اور تحقیق اللہ عزوجل نے بے جان چیزوں کے بارے میں اسی کی خبر دی اور فرمایا: تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (الزلزلہ) (اس روز وہ بیان کر دے گی اپنے سارے حالات، کیونکہ آپ کے رب نے اسے (یونہی) حکم بھیجا ہے۔)

ابراہیم حرمی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کو بے جان چیزوں میں قدرت ہے اس کے بارے معلوم نہیں وہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پاس سے اس کے بارے کچھ نہیں لائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بارے آگاہ کر دیا ہے یعنی ان کو الہام کر دیا ہے۔ اور تاویل کرنے والے علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہاں وحی بمعنی الہام ہے۔ اور یحییٰ بن وثاب نے حا کے فتحہ کے ساتھ اِلَى النَّحَلِ پڑھا ہے۔ اور اسے نحل کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے وہ شہد عطا فرمایا ہے جو اس سے نکلتا ہے؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: النحل اور النحلۃ الدبر (شہد کی مکھیوں کے انبوہ) کا اطلاق نر اور مادہ دونوں پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: یَعْسُوب (نر مکھی، شہد کی مکھیوں کا بادشاہ) اور اہل حجاز کی لغت میں النحل کو اور ہر اس جمع کو جس کے درمیان اور اس کی واحد کے درمیان صرف ھا کا فرق ہوتا ہے مؤنث لایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام مکھیاں جہنم میں ہوں گی اللہ تعالیٰ انہیں اہل جہنم کے لئے عذاب بنا دے گا سوائے شہد کی مکھی کے"۔ اسے حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" (1) میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد (لٹورا، موٹے سر، سفید پیٹ اور سبز پیٹھ کا ایک پرندہ جو چھوٹے پرندوں کو شکار کرتا ہے) کو مارنے سے منع فرمایا ہے (2)، اسے ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے، اور اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ یہ تب ہے جب ان کا کوئی مالک نہ ہو وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کے چھتے ان تین قسموں میں بنائے ہیں یا تو پہاڑوں اور ان کی غاروں میں ہوں، درختوں

1۔ نوادر الاصول فی معرفۃ حدیث الرسول، باب الاصل الرابع والتسعون فی حکمۃ اللہ تعالیٰ فیما نھی عن قتلہ، صفحہ 132

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی قتل الذر، جلد، صفحہ 358۔ ایضاً، حدیث نمبر 4583، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے درمیان (ان کی ٹہنیوں کے ساتھ) ہوں، یا پھر ان چھپروں، خالی جگہوں اور دیواروں وغیرہ کے ساتھ جنہیں لوگ بناتے ہیں۔ اور یہاں عرش بمعنی ھیأ (تیار کرنا) ہے۔ اور اس کا اکثر استعمال ایسے چھپر کے لئے ہوتا ہے جو لکڑیاں گاڑ کر، ٹہنیوں کو جوڑ کر سایہ حاصل کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اور اسی سے وہ عریش ہے جو غزوہ بدر کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنایا گیا تھا، اور اسی سے لفظ عرش ہے۔ کہا جاتا ہے: عرش یعرِش و یعرُش (یعنی را کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ)، اور اسے دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ابن عامر نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور انہوں نے اس میں عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو پیدا فرمایا اور اس میں عجیب بات یہ ہے کہ اسے اپنا چھتہ مسدس (چھ کونوں والا) بنانے کا الہام کیا، پس اسی سبب سے وہ جڑا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک ٹکڑے کی مانند ہو جاتا ہے، اور وہ اس لئے کہ مثلث (تکون) سے معشر (دس کونوں والی شکل) تک تمام شکلیں جب ان میں سے ہر کوئی اپنی امثال کے ساتھ جمع ہو تو وہ آپس میں جڑتی نہیں اور ان دونوں کے درمیان شگاف آ جاتا ہے، سوائے مسدس شکل کے، کیونکہ یہ جب اپنی امثال کے ساتھ جمع ہو تو یہ جڑ جاتی ہے اور اس طرح ہو جاتی ہے (1) گویا کہ وہ ایک ٹکڑا ہے۔

ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۶۹

"پھر رس چوسا کر ہر قسم کے پھلوں سے پھر چلتی رہا کر اپنے رب کی آسان کی ہوئی راہوں پر، (یوں) نکلتا ہے ان کے شکموں سے ایک شربت مختلف رنگوں والا، اس میں شفا ہے لوگوں کے لئے، بے شک اس میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اور یہ اس لئے ہے کیونکہ یہ درختوں سے کلیاں کھاتی ہیں۔ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ پھر تو اپنے رب کی راہوں پر چلتی رہا کر۔ اور السبل کا معنی الطرق (راستے) ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسبت اپنی طرف کی ہے کیونکہ وہ ان کا خالق ہے، یعنی تو پہاڑوں اور درختوں کے درمیان میں رزق تلاش کرنے کے لئے اپنے رب کی راہوں پر داخل ہو جا۔ ذُلُلًا یہ ذلول کی جمع ہے اور اس سے مراد مطیع کیا ہوا ہے، یعنی وہ راہیں جو مطیع اور مسخر کر دی گئی ہیں، پس ذُلُلًا یہ النحل سے حال ہے، یعنی شہد کی مکھی تابعداری کرتی ہے اور وہاں جاتی ہے جہاں اس کا مالک چاہے، کیونکہ یہ اپنے مالکوں کی اتباع اور پیروی کرتی ہیں جہاں وہ جائیں؛ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ ذُلُلًا سے مراد راستے ہیں۔ اور یعسوب شہد کی مکھیوں کی سردار، ملکہ مکھی، جب وہ ٹھہر جائے تو یہ ٹھہر جاتی ہیں اور جب وہ چل پڑے تو یہ چل پڑتی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا یہ خطاب سے خبر کی طرف رجوع ہے اس بنا پر کہ اس میں نعمتوں کو شمار

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1156

کرنا اور عبرت پر تنبیہ کرنا ہے پس فرمایا: یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ یعنی ان کے شکموں سے شہد نکلتا ہے۔ اور جمہور لوگوں کا موقف یہ ہے کہ شہد شہد کی مکھیوں کے مونہوں سے نکلتا ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ایک قول منقول ہے (1) جو آپ نے اس دنیا کی حقارت بیان کرنے کے لئے کیا ہے کہ ابن آدم کا اشرف ترین اور عمدہ لباس وہ ہے جس میں ایک کیڑے کا لعاب ہے اور اس کا عظیم اور بہترین مشروب شہد کی مکھی کی بیٹ ہے۔ تو اس قول کا ظاہر اس پر دال ہے کہ شہد منہ کے سوا کسی اور مقام سے نکلتا ہے۔ المختصر یہ کہ وہ نکلتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اس کے منہ سے نکلتا ہے یا اس کے نیچے سے، لیکن اس کی صلاحیت اور منفعت ان کے سانسوں کی گرمائش کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ارسطاطالیس نے شیشے کا ایک مکان بنایا تا کہ وہ اس کیفیت کو دیکھ سکے جو وہ عمل کرتی ہیں، تو انہوں نے وہ عمل نہ کیا یہاں تک کہ شیشے کا اندرونی حصہ مٹی کے ساتھ لتھڑ گیا، لت پت ہو گیا: اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور کہا: مِنْۢ بُطُوْنِهَا کیونکہ کھانوں میں تبدیلی اور تغیر پیٹ میں ہی ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ اس سے مراد اس کی مختلف انواع اور اقسام ہیں یعنی سرخ، سفید، زرد، جامد اور سائل (بہنے والا) مائع۔ ماں ایک ہوتی ہے اور اولاد مختلف ہوتی ہے یہ اس پر دلیل ہے کہ قدرت نے اسے غذا کی تقسیم کے اعتبار سے تقسیم کر دیا ہے، جیسا کہ اس کا ذائقہ کھائی جانے والی چیزوں کے مختلف ہونے کے حساب سے مختلف ہوتا ہے، اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت زینب کا قول ہے: جَرَسَتْ نَحْلُهُ الْعُرْفُطَ (2) (اس شہد کی مکھی نے ببول کے درخت کو چوسا ہے) اس لئے اس کی بو مغافیر کی بو کے مشابہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ، فِيْهِ میں ضمیر شہد کے لئے ہے؛ یہ جمہور نے کہا ہے، یعنی شہد میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، ضحاک، فراء، اور ابن کیسان سے روایت کیا گیا ہے کہ یہ ضمیر قرآن کریم کے لئے ہے، یعنی قرآن میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے یا ان میں لوگوں کے لئے شفا ہے جو ہم نے تم پر آیات و براہین میں سے بیان کی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شہد میں شفا ہے، اور یہ قول بھی بین اور واضح ہے، کیونکہ اکثر وہ مشروبات اور معجونیں جن کے ساتھ علاج کیا جاتا ہے ان کی اصل شہد ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے (3): جنہوں نے کہا ہے کہ مراد قرآن کریم ہے یہ اس سے بہت بعید ہے جو میں ان کی طرف سے صحیح خیال کرتا ہوں، اور اگر نقلاً صحیح بھی ہو تو عقلاً صحیح نہیں، کیونکہ سیاق کلام مکمل طور پر شہد کے بارے ہے، قرآن کریم کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جہلاء میں سے ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ اس آیت سے مراد اہل بیت اور بنو ہاشم ہیں کہ وہ نحل (شہد کی مکھی) ہیں، اور شراب قرآن اور حکمت ہے۔ ان میں سے کسی نے منصور ابو جعفر عباسی کی مجلس میں اس کا ذکر کیا، تو حاضرین میں سے کسی آدمی نے اس کو کہا: اللہ تعالیٰ نے تیرا کھانا، پینا اس میں سے بنایا ہے جو بنی ہاشم کے پیٹوں سے نکلتا ہے، پس اس نے حاضرین کو ہنسا دیا اور وہ دوسرا مبہوت ہو گیا اور اس پر اپنے قول کی کمزوری ظاہر ہو گئی (4)۔

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 406
2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب لم تحرم ما احل اللہ لک، جلد 2، صفحہ 793
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1158
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1157

مسئلہ نمبر 4۔ علماء کا اس قول باری تعالیٰ: فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کے بارے میں اختلاف ہے کیا یہ اپنے عموم پر ہے یا نہیں؟ تو ایک گروہ نے کہا ہے: یہ اپنے عموم پر ہے اس میں ہر حال میں اور ہر ایک کے لئے شفا ہے (1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ آپ کو جب بھی کسی زخم یا کسی اور بیماری کی شکایت ہوتی تو اس پر شہد استعمال کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر پھوڑا نکل آتا تو اس پر شہد لگاتے تھے (2)۔ اور نقاش نے ابو وجرہ سے بیان کیا ہے کہ وہ شہد کے ساتھ سرمہ لگاتے تھے اور شہد ہی بطور دست آور دوا پیتے تھے اور پھر شہد کے ساتھ ہی علاج کرتے تھے۔ اور روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے تو ان کو کہا گیا: کیا ہم آپ کا علاج نہ کریں؟ تو انہوں نے فرمایا: میرے پاس پانی لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا (ق:9) (اور ہم نے اتارا آسمان سے برکت والا پانی۔) پھر فرمایا: میرے پاس شہد لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے) اور میرے پاس زیتون کا تیل لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (النور:35) (برکت والے درخت سے) پس وہ فوراً یہ تمام چیزیں لے آئے تو آپ نے ان تمام کو آپس میں ملا دیا پھر یہ شربت پی لی تو وہ صحت یاب ہو گئے (3)۔

اور ان میں سے بعض علماء نے کہا ہے: بے شک یہ عموم پر ہے جب یہ سرکے کے ساتھ ملایا جائے اور اسے پکایا جائے تو یہ ایسا مشروب تیار ہو گا جو ہر حال میں ہر بیماری کے لئے نفع بخش ثابت ہو گا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک یہ خاص معنی پر ہے اور یہ ہر بیماری میں، اور ہر انسان کے لئے عام ہونے کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ یہ تو اس کے بارے خبر ہے کہ یہ اسی طرح باعث شفا ہے جس طرح اس کے علاوہ دیگر ادویہ بعض کے لئے، بعض حالات میں باعث شفا ہوتی ہیں، پس آیت کا فائدہ اس کے بارے یہ خبر دینا ہے کہ یہ دوا ہے کیونکہ اس کے ساتھ اکثر شفا ہو جاتی ہے۔ اور یہ مشروبات اور معجونوں میں سے دیگر ادویہ کے لئے یہ جز اور ان کا معاون ہو گیا اور یہ کوئی پہلا لفظ نہیں ہے جسے خاص کیا گیا ہے بلکہ قرآن اس سے بھرا پڑا ہے اور لغت عرب میں بہت سے عام بمعنی خاص اور خاص بمعنی عام آتے ہیں۔ اور جو چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ اپنے عموم پر نہیں ہے وہ یہ کہ شفا نکرہ سیاق اثبات میں ہے، اور اس میں عموم نہیں ہوتا اس پر اہل زبان، محققین اہل علم، اور مختلف اہل اصول کا اتفاق ہے، لیکن اسے اہل الصدق والعزم میں سے ایک گروہ نے عموم پر محمول کیا ہے، پس وہ ہر قسم کے دردوں اور بیماریوں سے شہد کے ساتھ شفا حاصل کرتے ہیں، اور وہ اپنی بیماریوں سے قرآن کریم کی برکت اور تصدیق وایقان کی صحت کے ساتھ شفا پاتے ہیں۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جس کی نیت کمزور ہو اور اس کی عادت دین پر غالب ہو تو اس نے اس کا مفہوم اطباء کے قول کے مطابق لیا ہے، اور یہ سب اسی حکیم کی حکمت میں سے ہے جو وہ سب کچھ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہیں شہد نفع دیتا ہے اور وہ بھی جنہیں یہ نقصان اور ضرر دیتا ہے، تو پھر یہ لوگوں کے لئے شفا کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اسے کہا جائے گا: پانی ہر شے کے لئے حیات ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 407 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1158 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1157

حالانکہ ہم نے کئی دیکھے ہیں جنہیں پانی مار دیتا ہے جب وہ اسے اس حال میں استعمال کریں جب ان کے بدن کی بیماری اس کی ضد اور اس کے خلاف ہو۔ اور ہم نے شہد کی شفا تو اس کے مشروبات میں سے اکثر میں دیکھی ہے؛ یہ معنی زجاج نے بیان کیا ہے۔ اور اطباء نے اپنے سرخیل بکرۃ سے سکنجبین کے ہر بیماری میں عام نفع بخش ہونے کی مدح پر اتفاق کیا ہے۔ اور اس کی اصل شہد ہے اور اسی طرح تمام معجونیں ہیں، اس بنا پر کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اشکال کو ختم کر دیا اور احتمال کی وجہ کو دور کر دیا جس وقت آپ نے اس آدمی کے لئے شہد پینے کا حکم ارشاد فرمایا جو اپنے پیٹ میں بیماری کی شکایت کرتا ہے، سو جب اس کے بھائی نے آپ کو عرض کی کہ اسے استطلاق بطن (پیٹ کھلنے کی بیماری) میں اضافہ ہو گیا ہے تو آپ نے اسے دوبارہ یہی مشروب پینے کا حکم دیا تو وہ صحت یاب ہو گیا اور آپ نے فرمایا: صدق اللہ و کذب بطن أخیك(1) (اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اور تیرے بھائی کے پیٹ نے جھوٹ بولا ہے۔)

مسئلہ نمبر 6۔ بعض زندیق اطباء نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے: تحقیق اطباء کا اس پر اجماع ہے کہ شہد دست لاتا ہے (پیٹ کو نرم کرتا ہے) تو پھر یہ اس کے لئے کیسے مفید ہو سکتا ہے جسے پہلے ہی اسہال کی بیماری ہو تو جواب یہ ہے کہ وہ قول اس کے لئے فی نفسہٖ حق ہے جس کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تصدیق حاصل ہو چکی ہے، اور وہ اسے اسی طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو آپ نے معین فرمایا ہے اور یہ وہ محل ہے جس میں آپ نے اسے نیت اور حسن ضمیر کا اظہار کرنے کا حکم دیا ہے، تو وہ اس کی منفعت اور فوائد دیکھ لے گا اور اس کی برکت پالے گا، جیسا کہ اس شہد والے اور اس کے سوا دوسروں کو اتفاق ہوا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور رہا یہ کہ اس پر اجماع بیان کیا گیا ہے تو یہ ان کی جہالت پر نقلی دلیل ہے اس حیثیت سے کہ انہوں نے اسے مقید نہیں کیا بلکہ مطلق کہا ہے۔ امام ابو عبد اللہ مازری نے کہا ہے: یہ جان لینا چاہئے کہ اسہال کا عارضہ کثیر وجوہ سے ہو سکتا ہے، ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ بدہضمی اور ہیضہ کی وجہ سے دست شروع ہو جاتے ہیں، تو اس کی مثل میں تمام اطباء کا اس پر اجماع ہے کہ اس کا علاج یہ ہے کہ طبیعت اور اس کے فعل کو (اپنے حال پر) چھوڑ دیا جائے اور اگر اسہال کی معاون دوا کی ضرورت ہو تو وہ استعمال کی جائے جب تک قوت باقی ہو، کیونکہ انہیں روکنا نقصان دہ ہے، تو جب یہ واضح ہو گیا تو پھر ہم کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے اس آدمی کو اسہال کی بیماری پیٹ (میں ہوا) بھرنے اور ہیضہ کے سبب لگی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شہد پینے کا حکم ارشاد فرمایا ہو پس وہ زیادہ ہو گئے یہاں تک کہ وہ مادہ ختم ہو گیا اور اسہال رک گئے تو نتیجۃً شہد کا پینا اس کے لئے موافق اور نفع بخش ثابت ہوا، پس جب یہ بات طب کی صناعت سے نکلی ہے تو اس نے معترض کے اس صناعت سے جاہل اور ناواقف ہونے سے بھی آگاہ کر دیا۔

فرمایا: ہم ایسے نہیں کہ ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر یقین کریں اس لئے کہ اطباء آپ کی تصدیق کرتے ہیں (نہیں) بلکہ اگر وہ آپ کو جھٹلا دیں گے تو ہم یقیناً انہیں جھٹلا دیں گے اور یقیناً ہم ان کا انکار کر دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کریں گے۔ پس اگر ہم نے ان کے قول کی صحت کو مشاہدہ کے ساتھ پالیا تو اس وقت ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تاویل

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الدواء بالعسل، جلد 2، صفحہ 848

اور اس معنی پر اس کی تخریج کے محتاج ہوں گے جس پر وہ صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اس پر دلائل موجود ہیں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔

مسئلہ نمبر 7۔ فی قولہ تعالیٰ: فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس میں دوا وغیرہ پینے کے ساتھ علاج کرنے کے جواز پر دلیل ہے بخلاف ان اجل علماء کے جنہوں نے اسے ناپسند کیا ہے، اور وہ ان صوفیہ کے طریقہ پر ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ولایت مکمل نہیں ہوتی مگر تب جب بندہ اس سب کے ساتھ راضی ہو جو اس پر مصیبت اور تکلیف وغیرہ نازل ہو، اور اس کے لئے علاج جائز نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جنہوں نے اس کا انکار کیا ہے، صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر بیماری کے لئے دوا ہے پس جب بیماری کی دوا استعمال کی جائے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ شفایاب ہو جاتا ہے (1)۔'' ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت اسامہ بن شریک سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: اعرابیوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم علاج نہ کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں۔ اے اللہ کے بندو! تم علاج کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر اس کے لئے شفا یا دوا بھی رکھی ہے سوائے ایک بیماری کے''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے (2)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بڑھاپا''۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں، اور انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ابوخزیمہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا دم کے بارے کیا خیال ہے جو ہم کراتے ہیں، اور دوا کے بارے جس کے ساتھ ہم علاج کرتے ہیں، اور وہ پرہیز اور احتیاط جسے ہم اپناتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے کسی شے کو رد کر دیتی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے ہے (3)'' (امام ترمذی نے) فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ اس حدیث کے سوا ابوخزیمہ سے کوئی حدیث معروف نہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تمہاری دواؤں اور علاج میں سے کسی شی میں خیر اور بھلائی ہے تو وہ پچھنے لگانے یا شہد پینے یا آگ کے ساتھ جلانے کی شرط میں ہے اور میں داغ لگانا پسند نہیں کرتا (4)''۔ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔ اور اس باب میں احادیث شمار سے زیادہ ہیں۔ اور جمہور علماء کا موقف یہی ہے کہ علاج کرنا اور دم کرانا مباح ہے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما لقوہ کی وجہ سے داغ لگاتے اور بچھو کے ڈسنے کا دم فرماتے۔ ابن سیرین سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے بچے کو تریاق پلاتے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جنہوں نے اسے (علاج کو) مکروہ قرار دیا ہے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک گروہ اپنے چھوٹے بڑوں سمیت اکٹھا جنت میں داخل ہوگا وہ تعویذ گنڈہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، لکل داء دواء و استحباب التداوی، جلد 2، صفحہ 225

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ما جاء فی الدواء والحث علیه، جلد 2، صفحہ 25۔ ایضاً، حدیث نمبر 1961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ما جاء فی الرقی والادویة، جلد 2، صفحہ 28۔ ایضاً، حدیث نمبر 1991، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، بالدواء بالعسل، جلد 2، صفحہ 848

نہیں کراتے ہیں، نہ وہ داغ لگواتے ہیں، اور نہ وہ فال پکڑتے ہیں، اور صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (1)''۔ انہوں نے کہا: پس مومن پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو لازم پکڑتے ہوئے، اس پر توکل کرتے ہوئے، اس پر اعتماد کرتے ہوئے، اور ہر شے سے کٹ کر اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اسے چھوڑ دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایام مرض اور ایام صحت تمام کو جانتا ہے پس اگر مخلوق اس میں کمی کرنے یا زیادتی کرنے کی حریص ہو تو وہ اس پر قادر نہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا (الحدید: 22) (نہیں آئی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ لکھی ہوئی ہے کتاب میں اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں۔)

اور ان میں سے جو اس طرف گئے ہیں وہ اہل فضل واثر کی ایک جماعت ہے، اور یہی حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے اس بیماری کے دوران تشریف لے گئے جس میں ان کا وصال ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم کیا تکلیف پا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میرے گناہ (باعث تکلیف ہیں)۔ آپ نے پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: اپنے رب کی رحمت، انہوں نے فرمایا: کیا میں تمہارے لئے کوئی طبیب نہ بلاؤں؟ تو انہوں نے کہا: طبیب نے ہی تو مجھے بیمار کیا ہے...... اور آگے حدیث ذکر کی۔ مکمل روایت سورۂ واقعہ کے فضائل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور وکیع نے ذکر کیا ہے: ابو ہلال نے معاویہ بن قرۃ سے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو وہ ان کی عیادت کو گئے اور کہا: کیا ہم آپ کے لئے کوئی حکیم نہ بلائیں؟ انہوں نے جواب دیا: طبیب نے ہی تو مجھے لٹا رکھا ہے۔ اور اسی طرف ربیع بن خثیم بھی گئے ہیں۔ اور سعید بن جبیر نے بھی تعویز، منتر کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور حسن دودھ اور شہد کے سوا تمام ادویہ پینا مکروہ جانتے تھے۔ اور پہلے فریق نے حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ داغ لگانے کی کسی خاص نوع کا ارادہ کرنا مکروہ ہو، دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احزاب کے دوران ابی کو رگ اکحل پر داغ لگایا جب انہیں تیر مارا گیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شفا تین میں ہے (2)''۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی طرح یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے منتر اور تعویذوں کا قصد مراد ہو جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں، حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ (الاسراء: 82) (اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں۔) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دم فرمایا اور انہیں دم کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 8۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ شہد میں زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ یہ کھایا بھی جاتا ہے اور خوراک بھی ہے۔ اور اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، اور اپنے نئے قول میں انہوں نے جو قطعی بات کی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شہد میں زکوٰۃ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، من اکتوی او کوی غیرہ، جلد 2، صفحہ 850 2۔ ایضاً، باب الشفاء فی ثلاث، جلد 2، صفحہ 848

واجب ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، کیونکہ آپ کے نزدیک اس میں نصاب شرط نہیں ہے۔ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس میں کوئی شے نہیں ہے یہاں تک کہ یہ آٹھ افراق تک پہنچ جائے اور ایک فرق میں چھتیس رطل عراقی ہوتے ہیں۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہر دس مشکیزوں میں سے ایک مشکیزہ، اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شہد کے ہر دس مشکیزوں میں سے ایک مشکیزہ ہے (1)''۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: اس کی اسناد میں کلام ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی بڑی شے صحیح منقول نہیں ہے، اور اسی پر اکثر اہل علم کے نزدیک عمل ہے، اور یہی امام احمد اور اسحاق بھی کہتے ہیں، اور بعض اہل علم نے کہا ہے: شہد میں کوئی شی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو غور وفکر کرتے ہیں یعنی عبرت حاصل کرتے ہیں اور شہد کی مکھی میں عبرت سے مراد اس کے عجیب معاملہ میں انصاف کی نظر سے اور گہری غور وفکر کرتے ہوئے دیکھنا ہے، تو یقین شہادت دیتا ہے کہ اسے کمزور اور ضعیف بنیاد کے باوجود لطیف صنعت کا الہام کرنے والا، اور اس کے متفرق احوال میں اسے حیلہ سازی کی مہارت عطا کرنے والا وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے؛ جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ الآیہ۔ پھر یہ کھٹا، کڑوا، میٹھا، نمکین (رس)، اور نقصان دہ گھاس وغیرہ بھی چوستی ہے، اور اللہ تعالیٰ اسے شہد بنا دیتا ہے جو میٹھا بھی ہوتا ہے اور باعث شفا بھی، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے تمہیں پھر جان قبض کرے گا تمہاری اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں لوٹا دیا جاتا ہے ناکارہ عمر کی طرف تا کہ وہ کچھ نہ جانے جان لینے کے بعد، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ اس کا معنی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ یعنی وہ اسے بدکام بنا دیتا ہے اور اسے کمینہ بنا دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ ہے جس کی قوت وطاقت اور عقل کم ہو جاتی ہے، اور وہ اسے بے عقلی تک پہنچا دیتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد أسفل العمر (انتہائی گھٹیا اور ناکارہ عمر) ہے، یعنی وہ اس بچے کی مثل ہو جاتا ہے جس میں کوئی عقل نہیں ہوتی اور دونوں معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ مانگتے ہوئے کہتے تھے: اللّٰهم إني أعوذ بك من الكسل و أعوذ بك من الجبن و أعوذ بك من الهرم و أعوذ بك من البخل (2) (اے اللہ! میں تیری پناہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، ما جاء فی زکاۃ العسل، جلد 1، صفحہ 80

2۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من أرذل العمر، جلد 2، صفحہ 943

مانگتا ہوں کاہلی اور سستی سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں بزدلی سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں بڑھاپے سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں بخل سے) اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے واعوذبك أن أرد إلى أرذل العمر(1) الحدیث (اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں ناکارہ عمر کی طرف لوٹا دیا جاؤں)۔ اسے امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا یعنی وہ بچپنے کی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ پس وہ ان امور کو بڑھاپے کی زیادتی کی وجہ سے نہیں جان سکتا جن کو اس سے پہلے جانتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ کیفیت بندہ مومن کو لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ مومن سے اس کا علم نہیں چھینا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تاکہ وہ چیزوں کو جاننے کے بعد ان پر عمل نہ کر سکے، پس عمل کو علم سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ عمل کے لئے علم کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے؛ کیونکہ اس کے عمل میں بڑھاپے کی تاثیر اس کے علم میں اس کی تاثیر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور معنی مقصود منکرین بعث پر استدلال کرنا اور حجت پکڑنا ہے، یعنی وہ ذات جو اسے اس حال کی طرف لوٹانے پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اسے مارے اور پھر اسے زندہ کر دے۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ۝۷۱

”اور اللہ تعالیٰ نے برتری بخشی ہے تم میں سے بعض کو بعض پر دولت کے لحاظ سے پس (اب بتاؤ) کیا وہ لوگ جنہیں برتری بخشی گئی ہے وہ لوٹانے والے ہیں اپنی دولت کو ان لوگوں پر جو ان کے مملوک ہیں تاکہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں؟ (ہرگز نہیں) تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو غنی، بعض کو فقیر (مفلس)، بعض کو آزاد، اور بعض کو غلام بنایا ہے۔ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا پس (اب بتاؤ) کیا وہ لوگ جنہیں رزق میں برتری بخشی گئی ہے۔ بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ (وہ اپنی دولت ان لوگوں پر لوٹانے والے ہیں جو ان کے مملوک ہیں) یعنی کوئی آقا اپنے مملوک پر اس دولت میں سے کوئی شے نہیں لوٹائے گا جو اس کو بخشی گئی ہے کہ مملوک اور مالک مال میں برابر ہو جائیں۔ اور یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتوں کی پوجا کرنے والوں کی بیان کی ہے، یعنی جب تمہارے غلام تمہارے ساتھ برابر نہیں تو پھر تم میرے غلاموں کو میرے ساتھ برابر کیسے بناتے ہو؟ پس جب ان کے غلام ان کے مالوں میں ان کے شریک نہیں تو پھر ان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ غیر اللہ کو عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائیں مثلاً بت، پتھر اور دیگر وہ جن کی عبادت کی جاتی ہے جیسا کہ ملائکہ اور انبیاء وغیرہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی مخلوق ہیں۔ یہ معنی علامہ طبری نے بیان کیا ہے، اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس وقت انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فرمایا: فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ یعنی کوئی آقا اپنے مملوک پر وہ مال نہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من أرذل العمر، جلد 2، صفحہ 942

لوٹا تا جو اسے دیا گیا ہے کہ آقا اور غلام دونوں مال میں برابر برابر شریک ہو جائیں، تو پھر تم میرے لئے وہ کیسے پسند کرتے ہو جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے کہ تم میرے لئے میرے غلاموں اور بندوں سے بیٹا بنا رہے ہو اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (الروم: 28) (اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لئے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے، (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے یوں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ غلام مالک نہیں ہوتا جیسا کہ ابھی اس کا بیان آئے گا۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝

''اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے عورتیں اور پیدا فرمائے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے اور رزق عطا فرمایا تمہیں پاکیزہ، تو کیا (یہ لوگ) باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی ناشکری کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا اس میں جعل بمعنی خلق ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا، اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ کا معنی ہے تمہاری جنس سے اور تمہاری نوع سے اور تمہاری خلقت پر پیدا فرمائیں، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 128) یعنی انسانوں میں سے ہی تمہارے پاس رسول آیا۔ اور اس میں ان عربوں کا رد ہے جو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اس نے (فلانے) جن سے شادی کر رکھی ہے اور وہ اس سے جماع کرتا ہے، حتیٰ کہ یہ روایت ہے کہ عمرو بن ہند نے ان میں سے ایک بھتنی کے ساتھ شادی کی اور وہ اسے بجلی کی چمک سے چھپا لیتا تھا تا کہ وہ اسے دیکھ نہ لے کہ پھر بھاگ جائے، پس جب ایک رات بجلی چمکی اور اس بھتنی نے اسے دیکھ لیا تو اس نے کہا: عمرو! اور بھاگ گئی، پھر کبھی اس نے اسے نہ دیکھا۔ اور یہ ان کے گھڑے ہوئے جھوٹوں میں سے ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی حکمت کے مطابق جائز ہے، پس یہ ان فلاسفہ کا بھی رد ہے جو جنوں کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور وہ ان کے طعام کو محال قرار دیتے ہیں۔ اَزْوَاجًا مرد کا زوج وہ اس کی بیوی ہے، کیونکہ وہ ایک فرد ہے اور جب وہ اس کی طرف منسوب ہوگئی تو وہ زوجین (جوڑا) ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اضافت مرد کی طرف کی گئی ہے نہ کہ عورت کی طرف کیونکہ وہی وجود میں عورت کی اصل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ یہ آیت بیٹوں کو نعمت شمار کرنے میں ظاہر ہے، اور بیٹوں کا وجود اکٹھا ان دونوں سے ہوتا ہے، لیکن جب بچے کی خلقت عورت میں ہوتی ہے اور یہ اسی سے الگ اور جدا ہوتا ہے (یعنی اس کے بطن سے خارج ہوتا ہے) تب اس کی اضافت اور نسبت اس کی طرف کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غلامی اور آزادی میں

اسی کے تابع ہوتا ہے اور یہ مالیت میں اس کی مثل ہوتا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے مدینۃ الاسلام میں حنابلہ کے امام ابوالوفاء علی بن عقیل کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک مالیت میں بیٹا ماں کے تابع ہے اور یہ غلامی اور آزادی میں اسی کے حکم میں ہے، کیونکہ باپ سے تو نطفہ خارج ہوا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں اور نہ اس میں کوئی مالیت اور منفعت ہے، بلاشبہ اس (مرد) نے جو حاصل کیا وہ عورت کے ساتھ اور اس سے ہی حاصل کیا، پس اسی وجہ سے بچہ عورت کے تابع ہے، جیسا کہ اگر کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کی زمین میں کھجور کھائے اور اس کی گٹھلی کھانے والے کے ہاتھ سے اس زمین پر گر پڑے اور اس سے کھجور کا درخت نکل آئے تو اس پر امت کا اجماع ہے کہ وہ درخت مالک زمین کی ملکیت ہوگا نہ کہ کھجور کھانے والے کی ملکیت ہوگا، کیونکہ جو شے کھانے والے سے الگ ہوئی ہے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَحَفَدَةً ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ان سے قول باری تعالیٰ: بَنِيْنَ وَحَفَدَةً کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میری رائے میں حَفَدَةً سے مراد خدام اور معاونین و مددگار ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَحَفَدَةً کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ مددگار اور معاونین ہیں۔ پس جس نے تیری معاونت اور مدد کی پس وہی تیرا حفید ہے۔ تو آپ سے پوچھا گیا: کیا عرب اسے جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں وہ تو اسے بولتے ہیں، کیا تو نے شاعر کا یہ قول نہیں سنا:

حَفَدَ الولائدُ حولهن وأُسلِمَتْ بأكفِهِنَّ أَزِمَّةُ الأجمالِ (1)

یعنی انہوں نے خدمت میں خوب تیزی کی۔ اور الولائد سے مراد خدام ہیں، اور اس کا واحد ولیدۃ ہے۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

كَلَّفْتُ مجهولَها نُوقًا يمانيةً إذا الحُداةُ على أكسائها حَفَدوا (2)

یعنی انہوں نے بہت تیزی اور جلدی کی۔ (حفدوا بمعنی أسرعوا ہے)

اور ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک الحفدۃ سے مراد أعوان و مددگار ہیں۔ پس ہر وہ جس نے کوئی کام کیا اس میں اس نے اطاعت کی اور تیزی کی تو وہی حافد کہلاتا ہے، فرمایا: اسی معنی میں یہ قول ہے: إليك نسعى و نحفد (تیری طرف ہی ہم کوشش کرتے ہیں اور خوب تیزی کرتے ہیں) اور الحَفَدان کا معنی سرعت اور تیزی ہے۔ ابوعبید نے کہا ہے: الحفد کا معنی عمل اور خدمت ہے۔ اور خلیل بن احمد نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک الحفدۃ سے مراد خدام ہیں، اور یہی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ الحفدۃ سے مراد اولاد کی اولاد یعنی بچوں کے بچے (پوتے) ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد داماد ہیں (3)؛ یہ حضرت ابن مسعود، علقمہ، ابوالضحیٰ، سعید بن جبیر اور ابراہیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 172 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 203 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1161

فلوأن نفسي طاوعتني لأصبحت لها حَفَدٌ مما يُعَدُّ كثيرُ
ولكنها نفسٌ علىٰ أبيّة عَيُوفٌ لإصهار اللئام قذور (1)

اور زر نے عبداللہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ الحفدة سے مراد أصهار (داماد یا بہنوئی وغیرہ کی قرابت) ہے، (یا سسرال کی قرابت ہے)؛ اور یہ ابراہیم نے کہا ہے، اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے: الخَتَن وہ رشتہ دار جو عورت کی جانب سے ہو، مثلاً اس کا باپ (سسر) اس کا بھائی (سالا) اور انہی کی مثل دیگر رشتہ دار اور اصہار ان کا مجموعہ ہوتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: أصهر فلان الى بني فلان و صاهر (فلان نے بنی فلاں کو سسرال بنا دیا۔) اور عبداللہ کا قول هم الأختان دونوں معنوں کا ایک ساتھ احتمال رکھتا ہے۔ یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس کی مراد عورت کا باپ اور اس کے مشابہ اس کے دیگر رشتہ دار ہوں، اور یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ مراد یہ ہو اور اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا کی ہیں، تم ان کا نکاح کرتے ہو، پس ان کے سبب سے تمہارے داماد ہوتے ہیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: الحفدة آدمی کا نفع جو اس کے بیٹے کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور اس کی اصل حَفَدَ یَحْفِدُ (یعنی ماضی میں عین کلمہ مفتوح اور مضارع میں یہ مکسور ہے) سے ہے جب کوئی اپنی چال میں خوب تیزی کرے، جیسا کہ کثیر نے کہا ہے:

حفد الولائد بينهن ...... البيت۔

اور کہا جاتا ہے: حفدت اور أحفدت یہ دونوں لغتیں ہیں جب تو کسی کی خدمت کرے۔ اور کہا جاتا ہے: حافد و حفد، جیسا خادم و خدم ہے، اور حافد و حفدة کافر و کفرة کی مثل ہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے الحفدة سے مراد خدام لئے ہیں انہوں نے اسے اپنے ماقبل سے منقطع کر دیا ہے اور اسے مقدم کرنے کی نیت کی ہے، گویا کہ یہ فرمایا: جعل لكم حفدة و جعل لكم من ازواجكم بنين۔ (اس نے تمہارے لئے خدام پیدا کئے اور اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے پیدا کئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ جواز ہری نے کہا ہے کہ حفدة سے مراد بچوں کے بچے ہیں وہی قرآن کریم کا ظاہر ہے بلکہ اس کی نص ہے، کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ اس نے فرمایا ہے: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً پس اس نے حفدة اور بنين ان سے پیدا کئے ہیں۔ (یعنی پوتے اور بیٹے)۔

ابن عربی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس قول میں زیادہ ظاہر بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (بیٹے اور پوتے) ہیں کہ بیٹے آدمی کی اپنی صلبی اولاد ہے اور حفدة (پوتے) اس کے بیٹے کی اولاد ہے (3)۔ اور لفظ کی قوت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اور اس معنی کی بنا پر آیت کی تقدیر یہ ہوگی: وجعل لكم من ازواجكم بنين و من البنين حفدة (اس نے تمہارے تمہاری بیویوں سے بیٹے پیدا کئے اور بیٹوں سے پوتے پیدا کئے۔) اور یہ معنی حسن نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب ہم نے حضرت مجاہد، حضرت ابن عباس، امام مالک اور علمائے لغت علیہم الرحمہ کے اس قول پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 202 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1161 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1162

تفریع بیان کی ہے کہ الحفدۃ سے مراد خدام اور اعوان ومددگار ہیں، تو پھر بیٹے اور بیوی کی خدمت عمدہ بیان کے ساتھ قرآن سے نکل آئی؛ یہ ابن عربی نے کہا ہے(1)۔

امام بخاری وغیرہ نے حضرت سہل بن سعد سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابواسید ساعدی نے اپنی دعوت ولیمہ کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی پس ان کی بیوی ان کی خدمت کرتی رہی(2)......الحدیث۔ یہ سورۃ ھود میں گزر چکی ہے۔ اور صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی کے اونٹوں کے قلادے خود اپنے ہاتھوں سے بٹے(3)۔ الحدیث۔ اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: عورت پر لازم ہے کہ وہ بستر بچھائے، ہانڈی پکائے، اور گھر میں جھاڑو پھیرے، اپنی حالت اور اپنے رواج کا لحاظ رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (الاعراف: 189) (اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے)۔ گویا ہمارے لئے ان میں سکون و راحت، لطف اندوز ہونا، اور عادت جاریہ کے مطابق خدمت کرنا سبھی امور جمع کر دیئے گئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ آدمی اپنی بیوی کی خدمت کرے گا ان امور میں جن میں خدمت آسان ہو اور وہ اس کی مدد و معاونت کر سکتا ہو، جیسا کہ اسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کے کام کاج میں شریک ہوتے تھے اور جب آپ اذان سنتے تو پھر آپ تشریف لے جاتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: اور وہ اس کی مدد کرے گا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں سے یہ ہے کہ آپ نعلین پاک کی مرمت کر لیتے تھے، گھر میں جھاڑو لگا دیتے تھے اور کپڑا سی لیتے تھے(4)۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا درآنحالیکہ آپ سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کام کرتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان تھے آپ اپنے کپڑے سے جوئیں نکالتے تھے، اپنی بکریاں دوہ لیتے تھے اور اپنے آپ کی خدمت کرتے تھے (یعنی اپنے کام خود کرتے تھے)۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور ایک خادمہ کا خرچہ دیا جائے گا، اور یہ بھی کہا گیا ہے: ایک سے زیادہ کا خرچہ دیا جائے گا، اس کا انحصار دولت و ثروت اور مقام و مرتبہ کی قدر پر ہے۔ اور یہ وہ امر ہے جس کا دارومدار اس عرف پر ہے جو اصول شریعت میں سے ایک اصل ہے، کیونکہ دیہاتیوں اور بادیہ نشینوں کی عورتیں اپنے خاوندوں کی خدمت کرتی ہیں حتیٰ کہ میٹھا پانی لانے اور جانوروں کو چرانے اور ہانکنے میں بھی معاونت کرتی ہیں، اور جہاں تک شہروں کی عورتوں کا تعلق ہے تو ان میں سے کمزور اور متوسط درجے کے لوگ اپنی بیویوں کی ان کاموں میں خدمت کرتے ہیں جو ہلکے ہوتے ہیں اور وہ ان کی معاونت کرتے ہیں، اور رہے اہل ثروت اور خوشحال لوگ تو وہ اپنی بیویوں کی خدمت کرتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ سکون اور آرام لیتی ہیں جب

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1163　2۔ صحیح بخاری، کتاب الاشربۃ، الانتباذ فی الاوعیۃ، جلد 2، صفحہ 837

3۔ ایضاً، کتاب المناسک الحج، من قلد القلائد بیدہ، جلد 1، صفحہ 230

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1163

ان کے لئے ایسا منصب ہو، اور اگر کام مشکل ہو تو بیوی اسے اسی پر ڈال دیتی ہے، اور یہ شہادت دیتی ہے کہ یہ تو معروف ہے کہ وہ (عورت) ان میں سے ہے جو اپنے آپ کی خدمت نہیں کر سکتیں پس اس کی خدمت کا انتظام کر، چنانچہ وہی نافذ ہو جاتا ہے اور اس بارے میں دعویٰ (کا حق) ختم ہو جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ یعنی پھلوں، اناج اور حیوانوں سے (اس نے تمہیں پاکیزہ رزق دیا) اَفَبِالْبَاطِلِ مراد بت ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ جمہور کی قرأت یا کے ساتھ ہے اور ابو عبدالرحمن نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ مراد اسلام ہے اور اسلام کے ساتھ هُمْ يَكْفُرُوْنَ وہ کفر کرتے ہیں۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

"اور یہ لوگ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی جو انہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے اور نہ وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ پس (اے جاہلو!) نہ بیان کیا کرو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ اس میں رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ سے مراد بارش ہے۔ وَ الْاَرْضِ اس سے مراد نباتات ہے۔ شَيْـًٔا اخفش نے کہا ہے: یہ رِزْقًا سے بدل ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس پر رزق کو واقع کرنے کے سبب یہ منصوب ہے، یعنی يعبدون ما لا يملك أن يرزقهم شيئا (وہ عبادت کرتے ہیں ان معبودوں کی جو کچھ اختیار نہیں رکھتے کہ وہ انہیں کوئی شے عطا کریں۔) وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ یعنی وہ کسی شے پر قدرت نہیں رکھتے، مراد بت ہیں۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ یعنی تم اس کے ساتھ ان جمادات کو تشبیہ نہ دو، کیونکہ وہ تو واحد اور یکتا ہے وہ قدرت رکھتا ہے اس کی کوئی مثل نہیں ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

"بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال (وہ یہ کہ) ایک بندہ ہے جو مملوک ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور (اس کے مقابلہ میں) ایک وہ بندہ ہے جسے ہم نے رزق دیا اپنی جناب پاک سے رزق حسن۔ پس وہ خرچ کرتا رہتا ہے اس سے پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر (اب تم ہی بتاؤ) کیا یہ برابر ہیں۔ الحمد للہ! (حقیقت حال واضح ہو گئی) بلکہ ان میں سے اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ضلالت و گمراہی پر متنبہ کیا ہے، اور یہ اپنے

ماقبل سمیت ان نعمتوں کے ذکر کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمائی ہیں اور ان کے معبودوں میں سے کسی کے اس کی مثل نہ ہونے کو شامل ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا یعنی ایک مثال اور تشبیہ بیان فرمائی۔ پھر اس کا ذکر کیا اور فرمایا: عَبْدًا مَّمْلُوْكًا یعنی جس طرح تمہارے نزدیک عبد مملوک جو اپنے معاملات میں سے کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو اور وہ آزاد آدمی جسے رزق حسن دیا گیا ہے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ پس اسی طرح میں اور یہ بت برابر نہیں ہو سکتے۔ پس جو اس آیت میں مثال ہے وہ ایسا غلام ہے جو اس صفت کے ساتھ متصف ہو کہ وہ کسی کی ملکیت میں ہو مال میں سے کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو اور نہ اپنے ذاتی معاملات پر قدرت رکھتا ہو، اور وہ صرف اور صرف اپنے آقا کے ارادہ کے تابع اور مطیع ہو۔ اور اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ سارے کے سارے غلام اسی صفت کے ساتھ متصف ہوتے ہیں، کیونکہ کلام مثبت میں نکرہ اہل زبان کے نزدیک عموم کا تقاضا نہیں کرتا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، بلکہ یہ مفرد کا فائدہ دیتا ہے، اور جب یہ امر یا نہی کے بعد یا مصدر کی طرف مضاف ہو کر واقع ہو تو یہ اس عموم کا فائدہ دیتا ہے جو تمام کو شامل ہوتا ہے؛ جیسا کہ یہ قول: أعتق رجلا، لا تُهِن رجلا، اور مصدر کی مثال اعتاق رقبة، پس جس آدمی کو بھی اس نے آزاد کر دیا تو وہ خطاب (حکم) کی ذمہ داری سے نکل جائے گا۔ اور اس سے استثنا صحیح ہوگی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ مثال مومن اور کافر کی ہے؛ قتادہ اس طرف جاتے ہیں کہ عبد مملوک سے مراد کافر ہے، کیونکہ آخرت میں وہ اپنی عبادت سے کسی شے کا نفع حاصل نہیں کر سکے گا، اور وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا سے مراد مومن ہے۔ یہی موقف جمہور اہل علم و تاویل کا ہے۔ اصم نے کہا ہے: عبد مملوک سے مراد وہ ہے جو بسا اوقات اپنے آقا سے جثہ اور قوت کے اعتبار سے طاقتور اور چہرے کے اعتبار سے زیادہ حسین اور روشن ہوتا ہے، حالانکہ وہ اپنے آقا کے سامنے ذلیل اور مطیع ہوتا ہے وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا سوائے اس کے جس کے بارے آقا اسے اجازت دے، پس اللہ تعالیٰ نے مثال بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے۔ پس جب یہ حالت تمہاری اور تمہارے غلاموں کی ہے تو پھر تم کیسے پتھروں اور بے جانوں کو خلق اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہو، حالانکہ نہ وہ عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہ وہ سنتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ مسلمانوں نے اس آیت سے اور اس سے جو اس سے پہلے ہے یہ سمجھا ہے کہ غلام رتبہ ملکیت میں آزاد آدمی سے کم ہے اور یہ کہ وہ کسی شے کا مالک نہیں ہوتا اگرچہ اس کی ملکیت میں کوئی شے ہو۔ اہل عراق نے کہا ہے: غلامی ملکیت کے منافی ہوتی ہے، پس وہ یقیناً کسی حال میں کسی شے کا مالک نہیں ہو سکتا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نیا قول یہی ہے، اور یہی حسن اور ابن سیرین نے کہا ہے۔ اور ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے: وہ مالک ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت ناقص ہوتی ہے، کیونکہ اس کے آقا کو اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے اس سے چھین لے، اور یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے متبعین کا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قدیم قول میں یہی کہا ہے۔ اور یہی اہل ظاہر کا قول ہے، اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا ہے: اس پر اموال کی عبادت یعنی زکوٰۃ اور کفارات وغیرہ واجب نہیں ہوتے، اور نہ ہی عبادات بدنیہ میں سے وہ واجب ہوتی ہیں جو آقا کی خدمت میں رکاوٹ اور مانع ہوں مثلاً حج اور جہاد وغیرہ۔ اور اس مسئلہ کا فائدہ یہ ہے کہ اگر اس کا آقا اسے کسی کنیز کا مالک بنائے تو اس کے لئے ملک یمین کے طور پر اس سے وطی کرنا جائز ہوگا، اور اگر وہ اسے چالیس بکریوں کا مالک بنا دے اور ان پر سال

گزر جائے تو ان کی زکوٰۃ نہ آقا پر واجب ہوگی کیونکہ وہ اس کے غیر کی ملکیت ہیں، اور نہ اس غلام پر واجب ہوگی کیونکہ اس کی ملکیت مستقل نہیں ہے۔ اور عراقی کہتا ہے: اس کے لئے کنیز سے وطی کرنا جائز نہیں ہوگا، اور نصاب میں زکوٰۃ آقا پر پہلے کی طرح واجب ہوگی۔ اور اس مسئلہ میں فریقین کے دلائل مختلف کتب میں موجود ہیں۔ اور ہمارے لئے سب سے بڑی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ (الروم: 40) (اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں رزق دیا۔) پس اللہ تعالیٰ نے رزق اور خلق میں غلام اور آزاد کو برابر قرار دیا ہے۔ اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''جس نے غلام آزاد کیا درآنحالیکہ اس کا مال ہو(1)...... '' پس اس میں آپ نے مال کی اضافت اس کی طرف کی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے غلام کو دیکھتے تھے کہ وہ اپنے مال میں سخاوت کا اظہار کر رہا ہے تو آپ اس پر کوئی عیب وغیرہ نہیں لگاتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کے غلام نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں کہ وہ اسے ملک یمین کے طور پر واپس لے آئے، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ (غلام) اس چیز کا مالک ہوتا ہے جو اس کے قبضے میں ہوتی ہے اور اس میں وہ ایسا تصرف کر سکتا ہے جیسا مالک اپنی مملوکہ شے میں تصرف کر سکتا ہے جب تک اس کا آقا اس سے چھین نہ لے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ بعض علماء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ غلام کی طلاق اس کے آقا کے اختیار میں ہے، اور اس پر کہ لونڈی کو بیچنا اس کی طلاق ہے اور اس میں اس قول باری تعالیٰ میں تعویل کی گئی ہے: لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ فرمایا: پس اس کا ظاہر تو یہ فائدہ دیتا ہے کہ وہ بالکل کسی شے پر قدرت نہیں رکھتا، نہ ملکیت پر اور نہ اس کے سوا کسی اور پر پس یہ ارشاد اپنے عموم پر ہے، مگر دلیل اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے اور اس بارے میں ہم نے جو کچھ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا ہے وہ تخصیص پر دلالت کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابو منصور نے عقیدہ (کتاب کا نام) میں کہا ہے: الرزق یہ وہ ہے جس سے غذا حاصل ہو۔ اور یہ آیت اس تخصیص کو رد کرتی ہے اور اسی طرح یہ قول باری تعالیٰ بھی ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ) (اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں) اور اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ: 254) (اور خرچ کرلو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا۔) علاوہ ازیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے رکھ دیا گیا ہے(2)''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''میری امت کے رزق اس کے گھوڑوں کے اطراف اور اس کے نیزوں کے پھلوں میں ہیں۔'' پس غنیمت ساری کی ساری رزق ہے، اور ہر وہ شے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو وہی رزق ہے۔ اور اس کے کئی مراتب ہیں: ان میں سے اعلیٰ مرتبہ اس کا ہے جس کو غذا بنایا جاتا ہے۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفع اٹھانے کی وجوہ کو اپنے اس ارشاد میں محصور کر دیا ہے: ''انسان کہتا ہے میرا مال میرا مال حالانکہ تیرے لئے تیرے مال سے اس کے سوا نہیں ہے جو تو نے کھا لیا اور اسے فناہ کر دیا یا تو نے پہن لیا اور اسے بوسیدہ کر دیا یا تو نے صدقہ کر دیا اور اسے آگے بھیج دیا۔'' یقول ابن آدم مالی مالی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، من اعتق عبداً ولہ مال، جلد 2، صفحہ 196

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ما قیل فی الرماح، جلد 1، صفحہ 408

وھل لك من مالك إلا ما أكلت فأفنيت أو لبست فأبليت أو تصدقت فأمضيت (1)، اور لباس کے معنی میں سوار ہونا وغیرہ داخل ہے۔ اور محدثین کی زبان میں سماع رزق ہے، اور وہ اس حدیث کا سننا مراد لیتے ہیں۔ اور یہ صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا اس سے مراد مومن ہے، جو اپنی ذات اور مال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہے۔ اور کافر نے جب اطاعت میں کچھ خرچ نہیں کیا تو وہ اس غلام کی طرح ہو گیا جو کسی شے کا مالک نہیں ہوتا هَلْ يَسْتَوٗنَ یعنی وہ برابر نہیں ہو سکتے، اور یہاں مَنْ کے محل کی وجہ سے یستویان نہیں کہا کیونکہ یہ مبہم اسم ہے جو واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مونث کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک عَبْدًا مَّمْلُوْكًا اور وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ دونوں سے مراد ان کی جنس عام لی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی وہی حمد کا مستحق ہے نہ کہ وہ جن کی وہ اس کے سوا عبادت کرتے ہیں، کیونکہ بتوں کا ان پر کوئی احسان اور نیکی نہیں ہے کہ اس پر ان کی تعریف کی جائے۔ بلاشبہ کامل تعریف صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، کیونکہ وہی نعمتیں عطا فرمانے والا اور خالق ہے۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ یعنی اکثر مشرک لَا يَعْلَمُوْنَ نہیں جانتے کہ حمد اور تعریف میرے لئے ہے، اور تمام نعمتیں میری طرف سے ہی ہیں۔ ذکر اکثر کا کیا ہے حالانکہ مراد تمام ہیں، پس یہ وہ خاص ہے جس سے عموم مراد لیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ مخلوق میں سے اکثر نہیں جانتے، اور یہ اس لئے ہے کہ ان میں سے اکثر مشرک ہی ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۟

''اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال، دو آدمی ہیں ان میں سے ایک تو گونگا ہے کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر جہاں کہیں وہ اس (نکمے) کو بھیجتا ہے تو وہ واپس نہیں آتا کسی بھلائی کے ساتھ، کیا برابر ہو سکتا ہے یہ (نکما) اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے عدل کے ساتھ اور وہ راہ راست پر گامزن ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ یہ دوسری مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور بتوں کے لئے بیان فرمائی ہے۔ پس اَبْكَمُ (گونگا) وہ جو کسی شے پر قادر نہ ہو وہ بت ہے۔ اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے (2) وہ اللہ تعالیٰ ہے؛ یہ حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: أبکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، اور آپ اس پر اسلام پیش کرتے تھے اور وہ انکار کر دیتا تھا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عدل کے ساتھ حکم دیتے تھے، اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور آپ کے آزاد کردہ غلام جو کہ کافر تھا اس کی مثال ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أبکم سے مراد ابوجہل ہے، اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے وہ حضرت عمار بن یاسر عنسی رضی اللہ عنہ ہیں اور عنس (نون کے ساتھ) مذحج کا ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا اور یہ ابوجہل کے قبیلہ بنی مخزوم کا حلیف تھا، اور ابوجہل انہیں اسلام قبول کرنے پر ستاتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر، جلد 2، صفحہ 407
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 204

اور اذیتیں دیتا تھا اور ان کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو بھی عذاب دیتا تھا، آپ ابوجہل کی کنیز تھیں، ایک دن اس نے آپ کو کہا: بلاشبہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایمان لائی ہے اس لئے کہ تو انہیں ان کے حسن و جمال کی وجہ سے پسند کرتی ہے، پھر اس نے آپ کی شرمگاہ میں نیزہ مارا اور آپ شہید ہو گئیں، اور آپ ہی پہلی شہیدہ ہیں جنہوں نے حالت اسلام میں جام شہادت نوش کیا، یہ نقاش وغیرہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اور عنقریب آیۃ الاکراہ میں اس کا مفصل بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت عطا نے کہا ہے: أبکم ابی بن خلف ہے، وہ کبھی خیر اور بھلائی کی گفتگو نہ کرتا تھا۔ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ یعنی وہ اپنی قوم پر بوجھ ہے کیونکہ وہ انہیں اذیت پہنچاتا تھا اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو ستاتا تھا۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت ہشام بن عمرو بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، وہ کافر تھا اس میں خیر اور بھلائی بہت کم تھی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک أبکم سے مراد کافر ہے، اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے وہ مومن ہے یہ جملہ کے بدلے ہے (یعنی جملہ کفار کے مقابلے میں جملہ مومن ہیں)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ حسن ہے کیونکہ یہ عام ہے۔ اور أبکم وہ ہوتا ہے جو بول نہ سکتا ہو (گونگا)، اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو عقل نہ رکھتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو نہ سنتا ہو اور نہ دیکھتا ہو۔ اور تفسیر میں ہے کہ یہاں أبکم سے مراد بت ہے۔ اور یہ بیان کیا کہ اس کے پاس نہ قدرت ہے اور نہ اس کا کوئی حکم ہے، اور یہ کہ کوئی دوسرا اسے منتقل کرتا ہے اور دوسرا ہی اسے تراشتا ہے۔ پس وہ اس پر بوجھ ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عدل کے ساتھ حکم دینے والا ہے، اور ہر شے پر غالب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ یعنی وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر اور اپنے قرابتداروں پر اور وبال ہے اپنے صاحب (ساتھی) پر اور اپنے چچا کے بیٹے پر۔ اور یتیم کو بھی کَلّ کا نام دیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اس پر ثقیل اور بھاری ہوتا ہے جو اس کا کفیل ہوتا ہے۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

أَكُولٌ لِمَالِ الْكَلِّ قَبْلَ شَبَابِهِ　　إِذَا كَانَ عَظْمُ الْكَلِّ غَيْرَ شَدِيدِ(1)

اور کَلٌّ وہ بھی ہوتا ہے جس کا نہ بیٹا ہو اور نہ اس کا والد ہو۔ اور کَلّ کا معنی عیال بھی ہے، اور اس کی جمع کلول آتی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: كَلَّ السِّكِّينُ يَكِلُّ كَلًّا یعنی چھری کی دھار موٹی ہو گئی پس وہ نہیں کاٹتی۔ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ جمہور نے۔ يُوَجِّهْهُ پڑھا ہے۔ اور یہی خط مصحف ہے، یعنی جہاں بھی اس کا مالک اسے بھیجتا ہے وہ خیر اور بھلائی کے ساتھ واپس نہیں آتا، کیونکہ نہ وہ جانتا ہے اور نہ اسے سمجھتا ہے جو اس کو کہا جاتا ہے اور نہ اس سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یحییٰ بن وثاب نے فعل مجہول کی بنا پر أَيْنَمَا يُوَجَّهْ پڑھا ہے۔ [اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے] اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تَوَجَّهْ صیغہ خطاب پر بھی مروی ہے۔ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ یعنی کیا یہ أبکم (نکما) اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے اور راہ راست پر ہے یہ برابر ہو سکتے ہیں؟

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 411

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۷۷

''اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی مخفی باتوں کو، اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ متصل ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النحل)

یعنی اس نے تحلیل (حلال قرار دینا) و تحریم (حرام قرار دینا) کا قانون بنایا اور بلاشبہ اسے اچھا وہ بنا سکتا ہے جو ان کے انجام اور مصالح کا علم رکھتا ہو اور انہیں محیط ہو، اور تم اے مشرکو! تم تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تو پھر تم فیصلے کیونکر کر سکتے ہو۔ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اور تمہیں اس (قیامت کے دن) میں اپنے اعمال کے بدلے جزا دی جائے گی۔ اور الساعة سے مراد وہ وقت ہے جس میں قیامت قائم ہوگی، اس کا نام ساعة رکھا گیا ہے کیونکہ اس ساعة میں لوگ گھبرا جائیں گے اور ساری مخلوق ایک چیخ کے ساتھ مر جائے گی۔ اور اللمح کا معنی ہے تیزی اور سرعت کے ساتھ دیکھنا، کہا جاتا ہے: لمحہ لمحا و لمحانا۔ اور تاویل کی وجہ یہ ہے کہ قیامت جب یقیناً آنے والی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اسے آنکھ جھپکنے کی مثل قریب قرار دیا جائے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ ارادہ نہیں کیا کہ قیامت آنکھ جھپکنے میں آئے گی، بلکہ اسے لانے پر قدرت کی تیزی اور سرعت کو بیان کیا ہے، یعنی وہ کسی شے کو کہتا ہے کن (تو ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ جھپکنے کے ساتھ تشبیہ اور مثال بیان کی ہے کیونکہ یہ آسمان پر ظاہر ہوگا اس کے باوجود کہ اس پر زمین سے کوئی دوری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ قریب ہونے کی تمثیل ہے، جیسا کہ کہنے والا کہتا ہے: ما السنہ الا لحظة، و شبهه (سال نہیں ہے مگر ایک لحظہ یا اس کے مشابہ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح ہوگی نہ کہ مخلوق کے نزدیک، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ (المعارج) (کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے (لیکن) ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں) اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (یا اس سے بھی جلد) اس میں اَوْ شک کے لئے نہیں تمثیل کے لئے ہے یعنی مثل دونوں میں سے جس قسم کا بھی ارادہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مخاطب کے شک کے لئے داخل ہوا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ اَوْ بمنزلہ بل کے ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل، تا کہ تم (ان بیش بہا نعمتوں پر) شکر ادا کرو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا بیان فرمایا کہ اس کی نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے نکالا اس حال میں کہ تم بچے تھے اور تمہیں کسی شے کا بھی علم نہ تھا۔ اور اس میں تین اقوال

ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے..... تم اس میں سے کچھ نہیں جانتے تھے جو اس نے تم سے وعدہ لیا درآنحالیکہ تم ابھی اپنے باپوں کی صلبوں میں تھے۔ دوسرا قول یہ ہے..... تم اس میں سے کچھ نہ جانتے تھے جو اس نے تمہارے بارے میں سعادت وشقاوت کا فیصلہ کیا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے..... تم اپنے منافع میں سے کچھ نہ جانتے تھے: کلام مکمل ہوگئی، پھر نئے سرے سے آغاز کیا اور فرمایا: وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ یعنی یہ وہ ہیں جن کے ساتھ علم حاصل کرتے ہو اور ادراک کرتے ہو۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے بندوں کیلئے انہیں پیٹوں سے نکالنے سے پہلے بنادیا اور بلاشبہ انہیں علم وادراک شکموں سے نکالنے کے بعد عطا فرمایا) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کان بنائے تاکہ تم ان کے ساتھ امر و نہی کو سنو، اور آنکھیں بنائیں تاکہ تم ان کے ساتھ اس کی صنعت وکاریگری کے آثار دیکھو، اور دل بنائے تاکہ تم ان کے ساتھ اس کی معرفت اور پہچان حاصل کرسکو۔ وَالْاَفْـِٕدَةَ یہ الفؤاد کی جمع ہے جیسے غراب کی جمع أغربة ہے، اور قول باری تعالیٰ: وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ کے ضمن میں قوت گویائی کے اثبات کا قول بھی کیا گیا ہے کیونکہ جو سن نہیں سکتا وہ کلام بھی نہیں کرسکتا، اور جب سننے کا حاسہ پایا گیا تو نطق اور کلام بھی پائی گئی۔ اور اعمش، ابن وثاب، اور حمزہ نے یہاں سورۃ النور، الزمر اور النجم میں ہمزہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ اُمَّهٰتِكُمْ پڑھا ہے۔ اور رہے کسائی! تو انہوں نے ہمزہ کو کسرہ اور میم کو فتحہ دیا ہے اور بلاشبہ یہ (ہمزہ کا کسرہ ماقبل کی) اتباع کی وجہ سے ہے۔ اور باقیوں نے اصل پر رکھتے ہوئے ہمزہ کو ضمہ اور میم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور أمهات کی اصل أمات ہے، پھر ھا بطور تاکید زیادہ کردی گئی جیسا کہ انہوں نے أهرقت الماء میں ھا کو زیادہ کیا ہے حالانکہ یہ اصل میں أرقت ہے۔ اور یہ بحث سورۃ الفاتحہ میں گزر چکی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس میں دو تاویلیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اور دوسری یہ ہے..... مراد یہ ہے کہ تم اس کی صنعت وکاریگری کے آثار دیکھو کیونکہ انہیں دیکھنا شکر تک پہنچادیتا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

"کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں فضاء آسمانی میں، کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے۔ بے شک اس میں (کھلی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ یحییٰ بن وثاب، اعمش، ابن عامر، حمزہ اور یعقوب نے تَرَوْا تا کے ساتھ صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے، اور ابوعبید نے اسے پسند کیا ہے۔ اور باقیوں نے خبر کے طور پر یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ مُسَخَّرٰتٍ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطیع وفرمانبردار بن کر: یہ کلبی نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مُسَخَّرٰتٍ کا مفہوم ہے تمہارے منافع کے لئے مطیع وفرمانبردار بن کر (اڑ رہے ہیں)۔ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ، الجو سے مراد وہ فضا ہے جو زمین وآسمان کے درمیان ہے اور فضا کی اضافت آسمان کی طرف کی اس لئے کہ وہ زمین سے بلند ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مُسَخَّرٰتٍ میں مسخِر پر دلیل ہے جس نے انہیں مطیع وفرمانبردار بنایا ہے اور مدبر پر دلیل ہے جس نے انہیں تصرف کی قدرت

دی ہے۔ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ یعنی پروں کو بند کرنے، انہیں کھولنے اور صف بندی کی حالت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے انہیں کوئی چیز تھامے ہوئے نہیں ہے۔ ان کے لئے واضح فرمادیا کہ وہ ان (پرندوں) سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کیسا خوبصورت استدلال کر سکتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ بے شک اس میں علامات، سامان عبرت اور کھلے دلائل ہیں۔ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس دین کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں جسے لے کر اس کے رسل علیہم السلام تشریف لائے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے ہی (اپنے فضل وکرم سے) بنادیا ہے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو آرام وسکون کی جگہ اور بنائے ہیں تمہارے لئے جانوروں کے چمڑوں سے گھر (یعنی خیمے) جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو سفر کے دن اور اقامت کے دن۔ اور (اسی نے بنائے ہیں) بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقت مقررہ تک۔''

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: جَعَلَ لَكُمْ اس کا معنی صیر ہے۔ اور ہر وہ شے جو تجھ پر بلند ہو اور تجھے سایہ کرے تو وہ سقف (چھت) اور سماء ہے، اور ہر وہ شے جو تیرے نیچے ہو وہ ارض (زمین) ہے، اور ہر وہ جو تجھے چاروں جہتوں سے ڈھانپ لے وہ دیوار ہے۔ اور جب یہ باہم منظم ہو جائیں اور آپس میں مل جائیں تو وہ بیت (گھر، کمرہ) کہلاتا ہے۔ اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شمار ہے جو لوگوں پر گھروں میں ہیں، پس پہلے شہری گھروں کا ذکر کیا اور یہ وہ ہیں جو طویل اقامت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اور قولہ تعالیٰ: سَكَنًا یعنی تم ان میں سکونت اختیار کرتے ہو اور تمہارے اعضائے بدن حرکت سے راحت وسکون پاتے ہیں، اور کبھی ان میں متحرک ومضطرب رہتے ہیں اور ان سے باہر سکون پاتے ہیں، مگر قول کا اطلاق غالب صورت حال پر ہے۔ اور اسے بھی جملہ نعمتوں میں ہی شمار کیا ہے کیونکہ اگر وہ چاہتا تو بندے کو ایسی حالت میں پیدا کرتا کہ وہ ہمیشہ مضطرب اور متحرک رہتا جیسا کہ افلاک تو یقیناً ایسا ہی ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ تخلیق فرماتا اور چاہتا، اور اگر وہ اسے ساکن پیدا کرتا جیسا کہ زمین تو وہ یقیناً ایسا ہی ہوتا جیسے وہ پیدا کرتا اور ارادہ فرماتا، لیکن اس نے اس کی تخلیق اس انداز سے فرمائی ہے کہ یہ دونوں اعتبار سے تصرف کر سکتا ہے، اور اس کی حالت دونوں حالتوں کے درمیان بدلتی رہتی ہے، اور یہ اسے جس حال اور کیفیت پر اور جہاں چاہے لوٹا سکتا ہے۔ اور السَّکَنُ مصدر ہے اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لگائی جا سکتی ہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ان گھروں کا ذکر فرمایا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ پس فرمایا: وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یعنی چمڑوں سے اس نے تمہارے لئے گھر بنائے ہیں۔ بُیُوْتًا گھروں سے مراد خیمے اور قبے وغیرہ ہیں جنہیں اٹھانا دوران سفر تم پر آسان اور ہلکا ہوتا ہے۔ یَوْمَ

ظَعۡنِكُمۡ۔ اَلظَّعْنُ سے مراد گھاس کی تلاش میں جنگل کی طرف چلنا اور بادیہ نشین کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے۔

اسی معنی میں عنترہ کا قول ہے:

ظَعَنَ الذین فِراقَهم أَتَوَقَّع　　وجری بینهم الغراب الابقع

اور الظعن کا معنی ہودج بھی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

ألاهل هاجك الأظعان إذ بانوا　　وإذا جاءت یوشك البین غربان

اور اسے عین کے سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ الشَّعْر اور الشَّعَر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ چمڑے، بالوں اور صوف کے خیموں سبھی کو شامل ہو، کیونکہ یہ سب جانوروں کی جلد اور کھال سے ہیں، کیونکہ بال اور اون اسی کھال میں ہی ثابت ہوتے ہیں؛ اس طرف ابن سلام گئے ہیں۔ اور یہ بہت اچھا احتمال ہے، اور قول باری تعالیٰ: وَمِنۡ اَصۡوَافِهَا ابتدائے کلام ہو، گویا کہ یہ فرمایا اس نے أثاث (ساز و سامان) بنایا مراد لباس اور بستر وغیرہ ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أهاجتك الظعائن یوم بانوا　　بذی الزِّیّ الجمیل من الأثاث(1)

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ قول باری تعالیٰ: مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ سے مراد صرف چمڑے کے گھر (خیمے) ہوں جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ اور اس کا قول: وَمِنۡ اَصۡوَافِهَا کا اس کے قول مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ پر عطف ہو، یعنی اس نے صوف کے بھی گھر (خیمے) بنائے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ امر اور شے ہے جو ان علاقوں میں عام اور پھیلا ہوا تھا، اور ہمارے شہر اس سے دور ہیں، پس ہمارے پاس خیمے صرف کتان اور صوف کے بنائے جاتے ہیں، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ بھی چمڑے کا تھا۔ اور تیرے لئے طائف کا چمڑا قیمت میں مہنگا ہونے، بناوٹ میں اعلیٰ ہونے اور دکھائی دینے میں حسین ہونے کے اعتبار سے کافی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خوشحالی اور دولتمندی شمار کیا ہے اور نہ اس میں اسراف اور فضول خرچی دیکھی ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے شمار کیا ہے اور اس سے استفادہ کی اجازت دی ہے، اور اس کی منفعت کی وجوہ مثلاً اس میں (چیزوں کو) چھپانا اور ان سے سایہ حاصل کرنا وہ ہیں جن سے جنس انسان نکلنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ اور جو عادت جاریہ ہے اس میں سے عجیب یہ ہے کہ میں نے بعض مصنوعی غافل زاہدوں کی بعض محدثین کے ساتھ مل کر ملاقات کی۔ پس ہم کتان کے خیمے میں اس کے پاس گئے تو میرے محدث ساتھی نے اسے پیشکش کی کہ وہ اسے اٹھا کر بطور مہمان اس کے گھر آجائے، اور کہا: بے شک یہ ایسی جگہ ہے جہاں گرمی زیادہ پڑتی ہے اور گھر آپ کے لئے آرام دہ ہوگا اور میرا دل بھی آپ کے بارے میں مطمئن اور خوش ہوگا۔ تو اس نے جواب دیا: ہمارے لیے یہ خیمہ بہت ہے، اور ہماری صنف میں بے وقعت چیز کو اپنایا جاتا ہے۔ تو میں نے کہا: ایسا نہیں جیسا تم نے گمان کیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے طائف کے چمڑے کا خیمہ تھا حالانکہ زہاد کے رئیس اور سرخیل تھے آپ سفر میں اسے ساتھ رکھتے تھے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 412

اس سے سایہ حاصل کرتے تھے، پس وہ مبہوت ہو گیا، اور میں نے اسے اپنے مقام پر عاجز اور تھکا ہوا دیکھا تو میں نے اسے اپنے ساتھی سمیت چھوڑ دیا اور اس سے نکل گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَآ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھیڑوں کی صوف، اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے نفع حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ اس نے ہڈیوں میں اجازت عطا کی ہے، اور یہ ان کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت کھانا ہے، اور روئی اور کتان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ بلاد عرب میں وہ اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کو شمار کیا جن کے ساتھ ان پر انعام فرمایا، اور انہیں چیزوں میں انہیں مخاطب بنایا گیا جنہیں وہ اپنی فہم و فراست کے ساتھ پہچانتے تھے، لیکن جو چیز بھی ان کے قائم مقام اور ان کی نائب ہوگی پس وہ استعمال اور نعمت میں ان کے محل میں داخل ہوگی اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (النور: 43) (اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔)

پس انہیں بَرَد (اولے) کے ساتھ خطاب کیا کیونکہ وہ انہیں اپنے پاس کثرت سے نازل ہونے کے سبب پہچانتے تھے، اور ثلج (برف) کے ذکر سے سکوت اختیار فرمایا، کیونکہ یہ ان کے شہروں اور علاقوں میں نہ تھی، حالانکہ یہ بھی اپنے وصف اور منفعت میں اس (بَرَد) کی مثل ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت کے بیان میں آلہ تطہیر کے طور پر ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ فرمایا ہے: اللھم اغسلنی بماء و ثلج و بَرَد (1) (اے اللہ! مجھے پانی، برف، اور اولوں کے ساتھ طہارت عطا کردے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: الثلج (برف) سفید رنگ کی شے ہے جو آسمان سے اترتی ہے اور میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک روئی اور کتان کے ذکر کو چھوڑنا بلاشبہ یہ خوشحالی اور دولتمندی کے اظہار سے اعراض ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے صالح اور نیک بندوں کا لباس صوف (اون) ہے اور یہ محل نظر ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ (الاعراف: 26) (اے اولاد آدم! بے شک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو) اس کا بیان سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور وہاں فرمایا: جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ اور لفظ سرابیل میں روئی اور کتان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اَثَاثًا خلیل نے کہا ہے: مراد وہ ساز و سامان ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہو، یہ أَثَّ سے ماخوذ ہے جبکہ وہ زیادہ اور کثیر ہو۔

شاعر نے کہا:

وَ فَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ ... أَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اَثَاثًا سے مراد کپڑے ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ صوف، اون اور بالوں سے ہر حال میں نفع حاصل کرنا جائز ہے اسی لئے ہمارے اصحاب نے کہا ہے: مردار کی صوف اور اس کے بال پاک ہیں ان سے ہر حال میں نفع اٹھانا جائز ہے۔ اور اس خوف سے اسے دھو ڈالا جائے گا کہ اس کے ساتھ کوئی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من المأثم والمغرم، جلد 2، صفحہ 942

میل کچیل یا گندگی وغیرہ لگی ہوئی ہو۔ اور اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مردار کی کھال کے استعمال میں کوئی حرج نہیں جب اس کی دباغت کر دی جائے اور اس کی اون اور اس کے بالوں میں کوئی حرج نہیں جب انہیں دھوڑالا جائے (1)''۔ کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جن میں موت داخل نہیں ہوتی، برابر ہے کہ وہ ان جانوروں کے بال ہوں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے یا ان کے جن کا نہیں کھایا جاتا، جیسا کہ انسان اور خنزیر کے بال، کیونکہ یہ سب طاہر اور پاک ہیں؛ یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، لیکن انہوں نے ہم سے یہ زائد بیان کیا ہے کہ سینگ، دانت اور ہڈیاں یہ بالوں کی مثل ہیں؛ فرمایا: چونکہ یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن میں روح نہیں ہوتی اس لئے حیوان کی موت کے سبب وہ نجس اور پلید نہیں ہوتیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، لیث بن سعد اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک بال سارے کے سارے نجس اور پلید ہیں لیکن یہ دھونے کے ساتھ پاک ہو جاتے ہیں۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے تین روایتیں ہیں: (۱) یہ پاک ہیں موت کے سبب پلید نہیں ہوتے۔ (۲) نجس اور ناپاک ہوتے ہیں۔ (۳) انسان اور دوسروں کے بالوں میں فرق ہے، پس انسان کے بال پاک ہیں اور اس کے سوا دوسروں کے بال ناپاک ہیں۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ مِنْ اَصْوَافِهَا الآیہ کا عام ہونا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے کہ ہمارے لئے ان سے انتفاع کو جائز قرار دیا ہے، اور مردار کے بالوں کو ذبح شدہ جانور کے بالوں سے خاص نہیں کیا ہے، پس یہ حکم عام ہی رہے گا مگر یہ کہ کوئی دلیل اس سے مانع ہو۔ اور یہ بھی کہ اصل یہ ہے کہ موت سے پہلے بالا جماع یہ پاک ہیں، پس جس کا گمان یہ ہے کہ یہ (موت کے ساتھ) نجاست کی طرف منتقل ہو گئے ہیں تو دلیل اسی پر ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قولہ تعالیٰ: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (المائدہ: 3) (تم پر مردار حرام کیا گیا ہے) پورے بدن سے عبارت ہے۔ تو ہم کہیں گے: ہم اسے ان دلائل کے ساتھ خاص کرتے ہیں جو ہم نے ذکر کئے ہیں، کیونکہ یہ توصوف کے ذکر میں بطور نص ہے اور تمہاری بیان کردہ آیت میں اس کا ذکر صراحۃً موجود نہیں ہے، پس ہماری دلیل اولیٰ اور راجح ہوئی۔ واللہ اعلم۔

اور شیخ الامام ابو اسحاق امام الشافعیہ بغداد نے اس پر یہ تعویل کی ہے کہ پیدائشی طور پر بال حیوان کا جزء متصل ہے، پس وہ اس کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتے ہیں اور دیگر تمام اجزاء کی طرح اس کی موت کے ساتھ وہ بھی نجس اور پلید ہوتے ہیں (2)۔ تو جواب یہ دیا گیا ہے: بے شک بڑھنا اور نمو پانا یہ حیات پر دلیل نہیں ہے، کیونکہ نباتات بڑھتی ہیں لیکن وہ زندہ نہیں۔ جب انہوں نے متصل نشوونما پر محمول کرتے ہوئے ان کی زندگی پر استدلال کیا ہے تو ہم نے انہیں ان کی علیحدگی اور جدائی پر محمول کیا ہے تو انہیں اکھیڑنا اس عدم احساس پر دلالت کرتا ہے جو حیات نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اور رہا وہ جو احناف نے ذکر کیا ہے کہ ہڈیاں، دانت اور سینگ بالوں کی مثل ہیں، تو ہمارے نزدیک مشہور قول یہ ہے کہ وہ گوشت کی طرح نجس ہیں۔ اور ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل کہا ہے۔ اور ہمارے لئے ایک تیسرا قول بھی ہے ..... کیا سینگوں اور کھروں کی اطراف (کنارے) ان کی جڑوں کے ساتھ یا بالوں کے ساتھ ملائی جائیں گی؟ تو اس بارے میں بھی دو قول ہیں۔ اور اسی

1۔ سنن دارقطنی، باب الدباغ، جلد 1، صفحہ 47، حدیث 19

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1170

طرح پروں کے بال ان کا حکم بالوں کے حکم کی مثل ہے، ان کی ہڈیوں کا حکم اس کے حکم کی مثل ہے۔ اور ہماری دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ”تم مردار کی کسی شے سے نفع حاصل نہ کرو(1)“۔ اور یہ اس بارے میں اور اس کے ہر جز کے بارے میں عام ہے، سوائے اس کے جس پر دلیل قائم ہو جائے) اور اس پر دلیل قاطع اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۝ (یٰسین) ([گستاخ] کہتا ہے اجی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں) اور مزید فرمایا: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا (البقرہ: 259) (اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں۔) اور فرمایا: فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (المومنون: 14) (پھر ہم نے پہنا دیا ان ہڈیوں کو گوشت) اور مزید فرمایا: ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً۝ (النازعات) ([یعنی] جب ہم بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے) پس اصل یہ ہڈیاں ہی ہیں، اور ان میں روح اور حیات اسی طرح ہیں جس طرح گوشت اور جلد میں ہیں۔ اور عبداللہ بن عکیم کی حدیث میں ہے: ”تم مردار کی کھال سے نفع نہ اٹھاؤ اور نہ اس کے پٹھوں سے (2)“۔ اور اگر کہا جائے: تحقیق صحیح روایت میں ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بکری کے بارے فرمایا: ”کیا تم نے اس کی جلد سے نفع حاصل نہیں کیا؟“ تو صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! بلاشبہ وہ تو مردار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ اسے کھانا حرام ہے(3)“۔ اور ہڈی کھائی نہیں جاتی۔ تو ہم کہیں گے: ہڈی کھائی جاتی ہے، بالخصوص دودھ پینے والے بکری کے بچے، ایک سال کے بکری کے بچے، اور پرندوں کی ہڈیاں، اور بڑوں کی ہڈی کو بھونا جاتا ہے اور کھایا جاتا ہے۔ اور جو کچھ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا وہ سب ہڈیوں میں حیات کے پائے جانے پر دلالت کرتا ہے، اور جو شے حیات کے سبب پاک ہو اور ذبح کرنے کے سبب وہ مباح سمجھی جاتی ہو تو موت کے سبب وہ نجس اور پلید ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ یہ زندہ اور مردہ کی جلد کے بارے میں عام ہے، پس مردار کے چمڑے سے نفع حاصل کرنا جائز ہے اگرچہ اس کی دباغت نہ بھی کی جائے۔ اور یہی ابن شہاب زہری اور لیث بن سعد نے کہا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہم نے لیث کے سوا فقہاء میں سے کسی کو نہیں پایا جس نے مردار کی کھال کو دباغت سے قبل بیچنا جائز قرار دیا ہو۔ ابو عمر نے کہا ہے: فقہاء سے مراد تابعین کے بعد امصار کے ائمہ فتویٰ ہیں، اور رہے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ زہری تو یہ ان سے صحیح ہے، اور یہ وہ قول ہے جس کا جمہور اہل علم نے انکار کیا ہے۔ اور دونوں سے اس قول کے خلاف بھی مروی ہے، اور پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ دارقطنی نے اپنی سنن میں یحییٰ بن ایوب کی حدیث یونس سے اور عقیل کی زہری سے، بقیہ کی حدیث زبیدی سے، محمد بن کثیر عبدی اور ابو سلمہ منقری کی حدیث سلیمان بن کثیر سے اور انہوں نے زہری سے بیان کی ہیں،

1۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، ما جاء فی جلود المیتۃ اذا دبغت، جلد 1، صفحہ 206 2۔ ایضاً

ایضاً، سنن ابی داؤد، باب من روی ان لا ینتفع باھاب المیتۃ، حدیث نمبر 3598۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب من قال لا ینتفع من المیتۃ، حدیث نمبر 3602، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب الطہارۃ جلود المیتۃ بالدباغ، جلد 1، صفحہ 158

اور ان کے آخر میں کہا: یہ اسانید صحاح ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ مردار کی جلد کی جب دباغت کر دی جائے تو علماء کے مابین اختلاف ہے کیا وہ پاک ہو گی یا نہیں؟ ابن عبدالحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جو ذکر کیا ہے وہ ابن شہاب کے مذہب کے ساتھ اس میں مشابہت رکھتا ہے۔ اسے ابن خویز منداد نے اپنی کتاب میں ابن عبدالحکم سے بھی ذکر کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: اور یہی زہری اور لیث کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب وہ ہے جو ابن عبدالحکم نے ذکر کیا ہے، اور وہ یہ کہ دباغت مردار کی کھال کو پاک نہیں کرتی، لیکن خشک اشیاء میں اس سے نفع اٹھانا مباح ہوتا ہے، اور اس پر نماز نہیں پڑھی جائے گی اور نہ اس میں ڈال کر کوئی چیز کھائی جائے گی، اور ''مدونہ'' میں ابن قاسم نے کہا ہے: جس نے مردار کی غیر مدبوغ کھال غصب کی پھر اس نے اسے ضائع کر دیا تو اس پر اس کی قیمت ہو گی۔ اور انہوں نے یہ بیان کیا کہ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ابوالفرج نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے کسی آدمی کے مردار کی غیر مدبوغ کھال غصب کر لی تو اس پر کوئی شی نہ ہو گی۔ اسماعیل نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ مجوسی کا ہو۔ اور ابن وہب اور ابن عبدالحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ اس کی بیع جائز ہے، اور یہ ہر مردار کی جلد کے بارے میں ہے سوائے اکیلے خنزیر کے، کیونکہ ذبح کرنا اس میں کوئی عمل نہیں کرتا، تو پھر دباغت بدرجہ اولیٰ عمل نہیں کرے گی۔ ابو عمر نے کہا ہے: ہر وہ جلد جس کو ذبح کیا جائے اس کا استعمال وضو اور اس کے سوا کے لئے جائز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دباغت کے بعد مردار کی کھال سے بنے ہوئے برتن میں وضو کرنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا قول مختلف ہے، اور ایک بار انہوں نے کہا: بے شک انہوں نے اسے مکروہ نہیں قرار دیا مگر صرف اپنے حق میں۔ اور اس پر نماز پڑھنا اور اس کو فروخت کرنا مکروہ ہے، اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے اس میں آپ کی اتباع کی ہے۔ اور رہے اکثر اہل مدینہ! تو وہ اس کی اباحت کے قائل ہیں اور اس کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس چمڑے کو بھی رنگ دیا گیا تو وہ پاک ہو جائے گا۔'' اکثر اہل حجاز اور عراق کے اہل فقہ و حدیث اسی مذہب پر ہیں اور یہی ابن وہب کی پسند ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مردار کی کھال سے کسی شی میں انتفاع جائز نہیں ہے اگرچہ اس کی دباغت کی جائے، کیونکہ وہ مردار کے گوشت کی مانند ہے اور وہ روایات جو دباغت کے بعد نفع حاصل کرنے کے متعلق ہیں وہ آپ کے اس قول کو رد کرتی ہیں۔ اور انہوں نے عبداللہ بن عکیم کی حدیث سے استدلال کیا ہے...... اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے...... انہوں نے بیان کیا: ہم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط پڑھا گیا جو ارض جہینہ کے بارے تھا اور میں جوان بچہ تھا: ''خبردار! تم مردار کے چمڑے سے نفع نہ اٹھاؤ اور نہ پٹھوں سے (1)''۔ اور ایک روایت میں ہے: یہ آپ کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کا ہے۔ اسے قاسم بن مخیمرہ نے عبداللہ بن عکیم سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے مشائخ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف لکھا...... داؤد بن علی نے کہا ہے: میں نے یحییٰ بن معین سے اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، من روی ان لاینتفع باهاب المیتة، جلد 2، صفحہ 213

حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے اسے ضعیف قرار دیا اور کہا: لیس بشیٔ (یہ کوئی شی نہیں) بلاشبہ وہ کہتے ہیں اشیاخ نے مجھے بتایا، ابوعمر نے کہا ہے: اگر یہ حدیث ثابت بھی ہو تو پھر یہ احتمال ہے کہ یہ ان احادیث کے مخالف ہو جو حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ اور حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہیں، کیونکہ یہ جائز ہے کہ ابن عکیم کی حدیث کا معنی یہ ہو" کہ تم مردار کے چمڑے سے دباغت سے پہلے نفع نہ اٹھاؤ۔" اور جب یہ احتمال ہے کہ یہ مخالف نہیں تو پھر ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم اسے مخالف بنائیں، اور ہم پر لازم ہے کہ ہم دونوں خبروں کے مطابق عمل کریں جہاں تک ممکن ہو، اور عبداللہ بن عکیم کی حدیث اگرچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ایک مہینہ قبل کی ہے جیسا کہ خبر میں موجود ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا قصہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا سماع" کہ جس چمڑے کو رنگ دیا جائے وہ پاک ہو گیا(1)" آپ کے وصال سے ایک ہفتہ یا اس سے بھی کم وقت پہلے ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ ہمارے نزدیک مشہور یہ ہے کہ خنزیر کی جلد اس حدیث میں داخل نہیں اور نہ عموم اسے شامل ہے، اور اسی طرح کتا بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ اور امام اوزاعی اور ابوثور کے نزدیک یہ ہے کہ دباغت کے ساتھ صرف ان جانوروں کی جلد پاک ہوتی ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اور معن بن عیسیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے خنزیر کی جلد کے بارے میں پوچھا گیا جب اس کی دباغت کر لی جائے تو انہوں نے اسے مکروہ قرار دیا۔ ابن وضاح نے کہا ہے: میں نے سحنون کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح محمد بن عبدالحکم اور داؤد بن علی اور ان کے اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "جو چمڑا بھی رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے(2)"۔ ابوعمر نے کہا ہے: یہ ارشاد احتمال رکھتا ہے کہ آپ نے اس قول سے بالعموم وہ چمڑے مراد لئے ہوں جن سے نفع حاصل کرنا معہود اور مروج ہے، تو جہاں تک خنزیر کا تعلق ہے تو وہ اس معنی میں داخل نہیں کیونکہ اس کی جلد سے انتفاع معہود نہیں، کیونکہ اس میں ذبح کرنا بھی کوئی عمل نہیں کرتا۔ اور دوسری دلیل وہ ہے جو نضر بن شمیل نے بیان کی ہے: بے شک اھاب (چمڑا) کا اطلاق گائے، بکری اور اونٹ کی جلد پر ہوتا ہے اور ان کے سوا جو بھی ہیں ان کی کھال کو جلد کہا جاتا ہے نہ کہ اھاب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتے اور ان جانوروں کی جلد جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا اس سے انتفاع بھی غیر معہود ہے لہٰذا وہ پاک نہ ہوگی۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "درندوں میں ذی ناب کو کھانا حرام ہے(3)"۔ پس ان کو ذبح کرنا بھی ذبح کرنا نہیں ہے (یعنی یہ ان میں کوئی اثر نہیں کرتا) جیسا کہ خنزیر میں ذبح کرنا کوئی اثر نہیں کرتا۔ اور نسائی نے حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم، سونے اور جلدوں کو زینوں پر اور کجاوں میں بچھانے سے منع فرمایا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، ما جاء فی جلود المیتۃ اذا دبغت، جلد 1، صفحہ 206　2۔ ایضاً

ایضاً سنن ابی داؤد، باب من روی ان لاینتفع باھاب المیتۃ، حدیث نمبر 3599، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصید، تحریم اکل کل ذی ناب، صفحہ 492

مسئلہ نمبر 8۔ فقہاء نے اس دباغت میں اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ مردار کی کھالیں پاک ہو جاتی ہیں کہ وہ کیا ہے؟ پس اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہی آپ کا مشہور مذہب ہے ہر وہ شے جس سے جلد کی دباغت کر دی جائے مثلاً نمک، بیری کے پتے، یا پھٹکڑی کی مثل نمک یا علاوہ ازیں کوئی شے تو اس سے انتفاع جائز ہے، اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے بھی کہا ہے، اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اس مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک تو یہی ہے، اور دوسرا قول یہ ہے: پھٹکڑی کی مثل نمک اور بیری کے پتوں کے سوا کوئی شے اسے پاک نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ دباغت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معہود تھی، اور اسی کو خطابی نے نقل کیا ہے...... واللہ اعلم ...... وہ روایت جسے نسائی نے حضرت میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ قریش کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرے وہ گھوڑے کی مثل اپنی ایک بکری کھینچ کر لے جا رہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''کاش تم اس کا چمڑا اتار لیتے''۔ انہوں نے عرض کی: یہ مردار ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانی اور بیری کے پتے اسے پاک کر دیتے ہیں (1)''۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: اَثَاثًا، أثاث سے مراد گھر کا ساز و سامان ہے، اس کا واحد أثاثۃ ہے؛ یہ ابو زید انصاری کا قول ہے۔ اموی نے کہا ہے: الأثاث گھر کا ساز و سامان ہے، اور اس کی جمع آثّۃ اور أُثُث ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: الأثاث سے مراد تمام قسموں کا مال ہے اور اس کے لفظوں میں اس کی کوئی واحد نہیں ہے۔ اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل معنی کثرت ہے اور سامان میں سے بعض کا بعض کے ساتھ جمع ہونا ہے یہاں تک کہ وہ کثیر ہو جائے، اور اسی سے شعر أثیث ہے بمعنی کثیر۔ اور اث شعرُ فلانٍ یأثُّ أثًّا جب بال زیادہ ہوں اور گھنے ہوں۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

وفرعٍ یزینُ المتن أسود فاحم أثیث کقِنوِ النخلة المتعثکل

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الأثاث وہ ہوتا ہے جو پہنا جاتا ہے اور بچھایا جاتا ہے۔ اور قد تأثثت جب تو اُثاث بنا لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اَثَاثًا بمعنی مال ہے۔ اور الحین کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے، اور یہاں اس سے مراد ہر انسان کے اعتبار سے غیر معین وقت ہے یا تو اس کی موت کے اعتبار سے اور یا ان اشیاء کے مفقود ہونے کے اعتبار سے جو اُثاث ہیں۔

اور اسی لفظ کے بارے میں شاعر کا قول ہے:

أهاجتك الظعائن یوم بانوا بذی الزّیّ الجمیل من الأثاث (2)

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝۸۱

''اور اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں تمہارے (آرام) کے لئے ان چیزوں کے سائے جن کو اس نے پیدا فرمایا اور

2۔ سنن أبي داود، کتاب اللباس، باب فی اھاب المیتۃ جلد 2، صفحہ 213 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 412

اس نے بنائی ہیں تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں اور اسی نے بنائے ہیں تمہارے لئے ایسے لباس جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے اور (کچھ ایسے آہنی) لباس جو بچاتے ہیں تمہیں لڑائی کے وقت، اسی طرح وہ پورا فرماتا ہے اپنا احسان تم پر تاکہ تم سر اطاعت خم کر دو"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ظِلٰلًا الظلال: اس سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے چاہے وہ گھر ہوں یا درخت ہوں۔ اور قول باری تعالیٰ: مِّمَّا خَلَقَ سایہ کرنے والے جمیع اشخاص کو عام ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَكْنَانًا الاکنان کِنّ کی جمع ہے، مراد وہ جگہ ہے جو بارش اور ہوا وغیرہ سے حفاظت کرتی ہے، اور یہاں مراد وہ غاریں ہیں جو پہاڑوں میں ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کے لئے تیار بنایا ہے وہ ان میں پناہ لے سکتے ہیں، وہ انہیں اپنی حفاظت کا قلعہ بنا سکتے ہیں اور ان میں مخلوق سے علیحدگی اور تنہائی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور صحیح روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شروع شروع میں غار حرا میں جا کر عبادت کرتے تھے اور کئی کئی راتیں اس میں قیام پذیر رہتے تھے ...... الحدیث۔ اور صحیح بخاری میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر اپنی قوم سے تعلق توڑتے ہوئے اور اپنے دین کو دور تک پہنچانے کے لئے اپنے ساتھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں نکلے یہاں تک کہ دونوں جبل ثور کی غار تک پہنچ گئے، اور تین راتیں اس میں روپوش رہے ان دونوں کے پاس رات کے وقت حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما حاضر ہوا کرتے تھے آپ جوان آدمی تھے انتہائی تیز فہم اور سنی ہوئی بات کو فوراً یاد کر لینے والے تھے اور آپ ان کے پاس سے سحری کے وقت واپس چلے جاتے اور صبح مکہ مکرمہ میں قریش کے ساتھ کرتے گویا رات وہیں تھے اور جو بات بھی سنتے جس میں ان دونوں کے بارے ناپسندیدہ بات کی جاتی آپ اسے ضرور اپنے پاس محفوظ کر لیتے یہاں تک کہ ان کے پاس اس وقت اس کی خبر لے کر آتے جب اندھیرا چھا جاتا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا غلام عامر بن فہیرہ ریوڑ میں سے دودھ والی بکری چراتا رہتا تھا اور شام کے وقت اسے ان کے پاس لے آتا تھا جبکہ عشاء (شام) کا کچھ وقت گزر جاتا پس یہ دونوں ہستیاں بڑے سکون اور وقار سے رات گزارتے اور وہ دونوں کو بکریوں کا دودھ پیش کرتا اور وہ گرم پتھر کے ساتھ گرم کیا ہوتا تھا یہاں تک کہ پھر تاریکی میں ہی عامر بن فہیرہ انہیں لے کر وہاں سے چلا جاتا، اور تین راتوں میں سے ہر رات وہ اسی طرح کا عمل کرتا رہا...... آگے حدیث ذکر کی اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ مراد قمیصیں اور کرتے ہیں، اور سرابیل کی واحد سربال ہے۔ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ اس میں مراد وہ زرہیں ہیں جو لوگوں کو جنگ میں محفوظ رکھتی ہیں۔

اور اسی سے کعب بن زہیر کا قول ہے:

شُمُّ العرانین أبطالٌ لَبُوسُهُمْ　　من نَسْج داودَ فی الهیجا سَرَابِیلُ

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: کیسے فرمایا: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا اور اس کے ساتھ میدان کا ذکر نہیں

کیا، اور فرمایا: تَقِيْكُمُ الْحَرَّ اور اس کے ساتھ برد (سردی) کا ذکر نہیں کیا؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ لوگ پہاڑوں میں رہنے والے تھے اور ان کے پاس میدان نہ تھے، وہ گرمی میں رہنے والے تھے ان کے ہاں سردی نہ تھی، اس لئے ان کے لئے اس نعمت کا ذکر فرمایا جو ان کے ساتھ خاص تھی جیسا کہ انہیں صوف وغیرہ کے ذکر کے ساتھ خاص کیا، اور روئی، کتان اور برف وغیرہ کا ذکر نہیں کیا...... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے...... کیونکہ یہ چیزیں ان کے علاقوں اور شہروں میں نہیں تھیں؛ اس کا یہ معنی عطا خراسانی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہ ان میں سے ایک شے کا ذکر دوسری پر دلالت کرتا ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

وما أدری اذا یممت أرضا أرید الخیر أیهما یلینی

أالخیر الذی أنا أبتغیه أم الشر الذی هو یبتغینی(1)

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بندوں کو سامان جہاد تیار رکھنا چاہئے تاکہ وہ اس کے ساتھ دشمن کے ساتھ قتال میں مدد لے سکیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخموں سے بچنے کے لئے زرہ وغیرہ پہنتے تھے اگرچہ آپ شہادت کے طالب تھے، بندے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس طرح شہادت کا طالب ہو کہ اپنے آپ کو موت، نیزوں کے پھلوں اور تلواروں کی ضربوں کے لئے جھکا دے، بلکہ وہ آلات جنگ پہنے تاکہ وہ اسے اپنے دشمن کے ساتھ لڑنے اور جنگ کرنے کی قوت اور طاقت دیں، اور وہ قتال کرے اس لئے تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند و بالا ہو، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہے گا کرے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ابن محیصن اور حمید نے دو تاؤں کے ساتھ تَتِمُّ اور نِعْمَتُهٗ کو مرفوع پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ فاعل ہے۔ اور باقیوں نے يُتِمُّ یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ▪ ہے جو اس نعمت کو مکمل کرتا ہے۔ اور تُسْلِمُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ تَسْلَمُوْنَ تا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، یعنی تم زخموں سے محفوظ رہتے ہو، اور اس کی اسناد ضعیف ہے؛ اسے عباد بن عوام نے حنظلہ سے انہوں نے شہر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور باقی تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور اس کا معنی ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجالاتے ہوئے اس کی معرفت اور طاعت کے لئے سر تسلیم خم کر دو اور مطیع و فرمانبردار ہو جاؤ۔ ابوعبید نے کہا ہے: قرأت عامہ ہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو ہم پر اسلام کا انعام فرمایا وہ اس سے کہیں افضل ہے جس کے ساتھ اس نے زخموں سے سلامتی عطا فرمائی۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾

"اے محبوب! اگر (ان روشن دلائل کے باوجود) وہ منہ پھیریں تو (فکرمند نہ ہو) آپ کے ذمہ تو صرف وضاحت سے پیغام پہنچانا ہے"۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1171

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ منہ پھیر لیں اس نظر واستدلال اور ایمان سے۔ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ یعنی آپ پر تو فقط تبلیغ کرنا، پیغام پہنچانا ہے، اور رہی ہدایت تو وہ ہمارے ذمہ ہے۔

یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۠ ﴿۸۳﴾

''وہ پہچانتے ہیں اللہ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا اور ان میں سے اکثر لوگ کافر ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ سدی نے کہا ہے: مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (1)، یعنی وہ آپ کی نبوت کو پہچانتے ہیں۔ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا اور آپ کو جھٹلاتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد وہ نعمتیں ہیں جو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر شمار کی ہیں، یعنی وہ پہچانتے ہیں کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور وہ ان کا انکار اپنے اس قول کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ ان کے اپنے آباء واجداد کی جانب سے وارث بنے ہیں۔ اور اسی کی مثل حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور عون بن عبداللہ نے کہا ہے: یہ کسی آدمی کا یہ قول ہے اگر فلاں نہ ہوتا تو اس طرح ہوتا، اور اگر فلاں نہ ہوتا تو میں اس مصیبت میں نہ پڑتا، حالانکہ وہ یہ پہچانتے ہیں کہ نفع اور نقصان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان تمام نعمتوں کے بارے پہچان کرائی تو انہوں نے انہیں پہچان لیا، اور کہا: ہاں، یہ تمام کی تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں، لیکن یہ ہمارے معبودوں کی سفارش وشفاعت کے ساتھ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں ان سے بہرہ اندوز ہونے کے سبب، اور ان پر شکر ادا نہ کر کے ان کا انکار کرتے ہیں۔ اور چھٹا احتمال یہ ہے...... کہ وہ انہیں شدت اور تنگی کی حالت میں پہچانتے ہیں اور پھر خوشحالی اور راحت کی حالت میں ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور ساتواں احتمال یہ ہے...... وہ انہیں اپنے اقوال کے ساتھ پہچانتے ہیں لیکن اپنے افعال واعمال کے ساتھ ان کا انکار کرتے ہیں۔ اور آٹھواں احتمال یہ ہے...... وہ انہیں اپنے دلوں سے تو پہچانتے ہیں اور اپنی زبانوں کے ساتھ ان کا انکار کرتے ہیں؛ اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ (النمل: 14) (اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے) وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ مراد یہ ہے کہ وہ تمام کے تمام کافر ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ یَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا ثُمَّ لَا یُؤْذَنُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ لَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور قیامت کے دن ہم اٹھائیں گے ہر امت سے ایک گواہ تب ان لوگوں کو اجازت نہیں ہوگی جنہوں نے کفر کیا اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا اس کی نظیر یہ آیت ہے: فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ (النساء: 41) اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ثُمَّ لَا یُؤْذَنُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا یعنی انہیں عذر پیش کرنے اور کوئی کلام کرنے کے بارے میں اجازت نہیں دی جائے گی، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: وَ لَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ (المرسلات)

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 189

اور یہ اس وقت ہوگا جب ان پر جہنم بند کر دی جائے گی، جیسا کہ سورۃ الحجر کے شروع میں گزر چکا ہے اور آگے بھی آرہا ہے۔ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ یعنی نہ ان کی رضامندی کا مطالبہ کیا جائیگا، مراد یہ ہے کہ انہیں اس کا مکلف اور پابند نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو راضی کریں؛ کیونکہ آخرت دار تکلیف نہیں ہے اور نہ انہیں دنیا کی طرف رجوع کے لئے چھوڑا جائے گا کہ وہ توبہ کرلیں۔ یہ کلمہ دراصل العتب سے ماخوذ ہے اس کا معنی ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرنا ہے، کہا جاتا ہے: عَتَبَ عَلَيه يعتب جب وہ اس پر ناراضگی اور عتاب کا اظہار کرے۔ اور جب وہ اس سے مذاکرہ کرے اس کے بارے جس کی وجہ سے اس نے اس پر عتاب کیا تو اس کے لئے کہا جاتا ہے: عاتبه، اور جب وہ تجھے خوش کرنے اور راضی کرنے کی طرف لوٹ آئے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے: أَعْتَبَ، اور اس کا اسم العُتبىٰ ہے اور اس سے مراد معتوب علیہ کا اس کی طرف رجوع کرنا ہے کہ وہ عتاب کرنے والے کو راضی اور خوش کر سکے؛ یہ ہروی نے کہا ہے۔

اور نابغہ نے کہا ہے:

فإن كنتُ مظلوما فعبدا ظلمتَه　　وإن كنتَ ذا عُتْبىٰ فمثلُكَ يُعتِبُ

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝

"اور جب دیکھ لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا عذاب (آخرت کو) تو اس وقت وہ عذاب ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ انہیں (مزید) مہلت دی جائے گی۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اور جب دیکھ لیں گے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا الْعَذَابَ یعنی جہنم کا عذاب اس میں داخل ہونے کے سبب۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ وہاں ان کے لئے کوئی توبہ نہ ہوگی۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

"اور جب دیکھیں گے مشرک اپنے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں کو تو بول اٹھیں گے: اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے بنائے ہوئے شریک جنہیں ہم پوجا کرتے تھے تجھے چھوڑ کر، تو وہ شریک انہیں جواب دیں گے یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ پیش کر دیں گے بارگاہ الٰہی میں اس دن اپنی عاجزی اور فراموش ہو جائیں گے انہیں وہ بہتان جو وہ باندھا کرتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ اس میں شرکاء سے مراد ان کے لکڑی اور پتھر کے وہ بت ہیں جن کی وہ پوجا کرتے رہے ہے، اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معبودوں کو اٹھائے گا کہ وہ ان کی اتباع کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ پھر انہیں جہنم میں ڈال دے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: "جو کسی شے کی پرستش کرتا رہا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس کے پیچھے اور

اس کی اتباع میں ہو جائے پس سورج کی پوجا کرنے والے سورج کے پیچھے ہو جائیں گے، چاند کی پرستش کرنے والے اس کے پیچھے ہو جائیں گے اور جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ ان کے پیچھے ہو جائیں گے۔'' الحدیث۔ انہوں نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے، اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے، اس میں ہے: ''پس صلیب والوں کے لئے اس کی صلیب کی تمثیل اور تصاویر والوں کے لئے اس کی تصاویر کی تمثیل اور آگ والوں کے لیے اس کی آگ کی مثل بنائی جائے گی پس وہ اس شے کی اتباع کریں گے جس کی وہ پرستش اور پوجا کرتے رہے(1)''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ یعنی یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے تیرا شریک بنا رکھا تھا۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ یعنی وہ معبودان باطلہ یہ قول انہیں پر ڈال دیں گے، یعنی جنہوں نے ان کی پوجا کی انہیں جھٹلاتے ہوئے وہ بول اٹھیں گے کہ وہ معبود اور الٰہ نہیں تھے اور نہ انہوں نے انہیں اپنی عبادت کا حکم دیا، پس اللہ تعالیٰ بتوں کو قوت گویائی عطا فرمائے گا تا کہ اس وقت کافروں کی ذلت و رسوائی کا خوب اظہار ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کی وہ پوجا کرتے رہے۔ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ یعنی مشرکین اس دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی عاجزی پیش کر دیں گے، یعنی اس کے عذاب کی وجہ سے تابعدار ہو جائیں گے اور اس کے غلبے کی وجہ سے خضوع اور عاجزی اختیار کر لیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عابد و معبود دونوں تابعداری اختیار کرلیں گے اور اپنے بارے میں اس کے حکم کی پیروی و اطاعت کریں گے۔ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی ان سے وہ سب زائل ہو جائے گا جو شیطان نے ان کے لئے آراستہ و مزین کیا تھا اور وہ جو اپنے معبودان باطلہ کی شفاعت کے آرزومند اور امیدوار رہتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) روکا اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہم نے بڑھا دیا اور عذاب ان کے پہلے عذاب پر اس وجہ سے کہ وہ فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: وہ بچھو ہیں جن کی داڑھیں کھجور کے درخت کی طرح طویل ہوں گی(2)، اور سانپ ہیں جو اونٹ کی گردن کی مثل ہوں گے، اور اژدھا ہیں گویا کہ وہ لمبی گردن والے اونٹ ہیں وہ انہیں ماریں گے (اور ان پر مسلط ہوں گے) پس یہی زیادتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے انہیں آگ سے زمہریر کی طرف نکالا جائے گا پس وہ اس کی سخت اور شدید سردی اور ٹھنڈک کی وجہ سے آگ کی طرف بھاگیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے ان کی قیادت کرنے والوں پر ان کی اتباع کرنے والوں کی نسبت عذاب بڑھا دیا، پس دو عذابوں میں سے ایک ان کے کفر کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا عذاب ان کے لئے دوسروں کو روکنے کی وجہ سے ہوگا۔ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ اس وجہ سے کہ وہ دنیا میں کفر اور معصیت کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، باب ما جاء فی خلود الجنۃ واھل النار، جلد 2، صفحہ 79

ایضاً، باب ما جاء فی خلود اھل الجنۃ الخ، حدیث نمبر 2480، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 1191

سب فساد برپا کرتے تھے۔

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ ۭ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

''اور وہ دن (بڑا ہولناک ہوگا) جب ہم اٹھائیں گے ہر امت سے ایک گواہ ان پر انہیں میں سے اور ہم لے آئیں گے آپ کو بطور گواہ ان سب پر، اور ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا اور یہ سراپا ہدایت ہے اور یہ مژدہ ہے مسلمانوں کے لئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اور وہ انبیاء علیہم السلام ہیں، جو قیامت کے دن اپنی امتوں پر یہ شہادت دیں گے کہ بلاشبہ انہوں نے ان تک پیغام پہنچایا تھا اور انہیں ایمان کی طرف دعوت دی تھی، اور ہر زمانے میں گواہ اور شاہد موجود رہتا ہے اگرچہ وہ نبی نہ ہو۔ اور ان کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ وہ ہدایت دینے والے اور راہنمائی کرنے والے ائمہ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے...... کہ وہ وہ علماء ہیں جن کے ساتھ اللہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی شریعت اور دین محفوظ فرما دیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس بنا پر کوئی زمانہ فترت نہیں مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل موجود رہے ہیں، جیسا قس بن ساعدہ، اور زید بن عمرو بن نفیل وہ ہے جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے الگ امت کے طور پر اٹھایا جائے گا''۔ سطیح اور ورقہ ابن نوفل وہ ہے جس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اسے جنت کی نہروں میں غوطہ زن ہوتے ہوئے دیکھا ہے''۔ پس یہ لوگ اور جو ان کی مثل ہیں وہ اپنے اہل زمانہ پر حجت اور ان پر گواہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ اس کا بیان سورۃ البقرہ اور النساء میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اس کی نظیر یہ ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38) اس پر بحث گزر چکی ہے وہاں دیکھ لی جائے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس میں حلال و حرام کا تفصیلی بیان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو اور (ہر ایک کے ساتھ) بھلائی کرو اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے اور برے کاموں سے اور سرکشی سے، اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے تمہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر پڑھا تو وہ بہت متعجب ہوئے

اور کہا: اے آل غالب! آپ کی اتباع اور پیروی کرو کامیاب ہو جاؤ گے، فلاح پا جاؤ گے۔ قسم بخدا! بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ آپ تمہیں مکارم اخلاق کے بارے حکم دیں (1)۔ اور حدیث میں ہے۔ بے شک حضرت ابو طالب کو جب یہ کہا گیا: بے شک آپ کے بھتیجے نے یہ گمان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ نازل کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیہ، تو انہوں نے کہا: تم میرے بھتیجے کی اتباع و پیروی کرو، قسم بخدا! وہ محاسن اخلاق کے بغیر کوئی حکم نہیں دیتا۔ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن مغیرہ پر یہ آیت آخر تک پڑھی اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ تو اس نے عرض کی: اے میرے بھتیجے! اسے دوبارہ پڑھو! پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت دوبارہ پڑھی تو اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ اس میں بڑی شیرینی اور حلاوت ہے، اور اس پر بڑا حسن و جمال اور رونق ہے۔ اور بے شک اس کی اصل (جڑ) پتے لانے والی ہے، اور اس کی بلندی (شاخیں) پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ واللہ إن له لحلاوة، وإن عليه لطلاوة، وإن أصله لمورق، وأعلاه لمثمر، وما هو بقول بشر! اور غزنوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بھی قاری تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں ابتدا میں اسلام نہیں لایا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حیاء کرتے ہوئے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا تو میرے دل میں ایمان راسخ اور پختہ ہو گیا۔ پھر میں نے اسے ولید بن مغیرہ پر پڑھا تو اس نے کہا: اے میرے بھتیجے! اسے دوبارہ پڑھ! تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا تو اس نے کہا: قسم بخدا! اس میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہے...... اور آگے پوری خبر بیان کی۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: قرآن کریم میں یہ آیت اس خیر اور بھلائی کو جس کی پیروی کی جاتی ہے، اور اس شر اور برائی کو جس سے اجتناب کیا جاتا ہے زیادہ جامع ہے (2)۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے: کہا جاتا ہے عدل کی زکوٰۃ احسان ہے، اور قدرت کی زکوٰۃ عفو و درگزر ہے، اور غنی (دولتمندی) کی زکوٰۃ نیکی ہے اور جاہ وحشمت کی زکوٰۃ آدمی کا اپنے بھائیوں کی طرف کچھ لکھنا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے عدل و احسان کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: عدل سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا، اور احسان سے مراد فرائض کو ادا کرنا ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عدل سے مراد فرض، اور احسان سے مراد نفل ادا کرنا ہے۔ اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: یہاں عدل سے مراد ظاہر اور باطن کو برابر رکھنا ہے، اور احسان یہ ہے کہ خلوت کی حالت اعلانیہ حالت سے افضل ہو۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: عدل سے مراد انصاف کرنا، اور احسان سے مراد تفضل اور مہربانی کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: عدل سے مراد ہر وہ شے جو عقائد میں سے فرض ہے اور امانتیں ادا کرنے میں وہ دین اور شریعت ہے، اور ظلم کو ترک کرنا اور انصاف کرنا، اور حق ادا کرنا ہے۔ اور احسان سے مراد ہر وہ کام کرنا ہے جو اس کے لئے مندوب اور مستحب ہو، اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو فرض ہیں، مگر اس سے بدلہ دینے کی حد عدل میں داخل ہے، اور بدلے سے زائد کے ساتھ اس کی تکمیل کرنا احسان میں داخل ہے۔ اور رہا حضرت ابن عباس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 416
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1173
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 416
4۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 194

رضی اللہ عنہما کا قول تو وہ محل نظر ہے، کیونکہ فرائض کو ادا کرنا ہی اسلام ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث جبرائیل علیہ السلام میں اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے، اور وہی عدل ہے، اور بلاشبہ احسان سے مراد مکمل کرنے والے اور کامل بنانے والے امور ہیں اور وہ مندوب اور مستحب ہیں جیسا کہ حدیث جبرائیل علیہ السلام میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر اسی کا تقاضا کرتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (احسان یہ ہے): أَنْ تعبد الله كَأَنَّكَ تراه فإن لم تكن تراه فانه يراك (1) (تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو بلاشبہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے) پس اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول صحیح ہے تو پھر آپ نے فرائض سے مراد مکمل کرنے والے امور لیے ہیں۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بندے اور اس کے رب کے درمیان عدل یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے نفس کے حصے پر ترجیح دینا ہے، اور اس کی رضا کو اپنی خواہش پر مقدم کرنا ہے، اور نواہی سے اجتناب کرنا اور اوامر کی پیروی اور اتباع کرنا ہے۔ اور رہا عدل بندے اور اس کے نفس کے درمیان! تو یہ اسے ہر اس شی سے روکنا ہے جس میں اس کی ہلاکت ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ (النازعات)

اور اتباع سے خواہش و لالچ کو دور رکھنا ہے، اور ہر حال اور معنی میں قناعت کو لازم پکڑنا ہے۔ اور وہ عدل جو اس کے اور مخلوق کے درمیان ہے تو وہ انہیں نصیحت کرنا ہے، خیانت کو ترک کرنا ہے چیز کم ہو یا زیادہ، اور اپنی طرف سے ان کے ساتھ ہر اعتبار سے انصاف کرنا ہے اور تیری طرف سے کسی کے ساتھ برائی نہ ہو نہ قولاً نہ فعلاً اور نہ سراً نہ اعلانیہ طور پر، اور ان کی طرف سے جو مصیبت اور تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کرنا، اور اس میں کم سے کم انصاف کرنا ہے اور اذیت دینے کو چھوڑ دینا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عدل میں یہ تفصیل انتہائی اچھی اور عین عدل ہے، اور رہا احسان تو ہمارے علماء نے کہا ہے: الاحسان مصدر ہے أحسن يُحسِن إحساناً۔ اور اسے دو معنوں پر بولا جاتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ بذات خود متعدی ہے، جیسے تیرا یہ قول: أحسنتُ كذا، یعنی میں نے اسے اچھا کیا اور اسے مکمل کیا، اور یہ ہمزہ کے ساتھ حَسُنَ الشئ سے نقل کیا گیا ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسے تیرا یہ قول: أحسنت إلى فلانٍ، یعنی میں نے اس تک وہ شے پہنچائی جس کے ساتھ وہ نفع حاصل کر سکتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ لفظ اس آیت میں ان دونوں معنوں کے ساتھ اکٹھا مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بعض کا بعض کے ساتھ احسان کرنا پسند فرماتا ہے، یہاں تک کہ پرندہ تیرے پنجرے میں ہو اور بلی تیرے گھر میں ہو تو تیرے احسان کے بارے یہ مناسب نہیں کہ تو اس کی دیکھ بھال اور حفاظت میں کوتاہی کرے، اور اللہ تعالیٰ تو ان کے احسان سے غنی اور بے نیاز ہے، اور اس کی طرف سے احسان، نعمتیں، فضل و مہربانی اور عنایتیں اور بخششیں ہیں۔ اور یہ حدیث جبرائیل میں پہلے معنی کے اعتبار سے ہے نہ کہ دوسرے معنی کے اعتبار سے، کیونکہ پہلا معنی عبادت کے اتقان، اور اسے ان امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کرنے کی طرف راجع ہے جو اس عبادت کو صحیح بنانے والے اور مکمل کرنے والے ہیں، اور اس میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الایمان، جلد 1، صفحہ 27
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1172

حق کا مراقبہ کرنا، اور عبادت کے شروع اور پھر اسے جاری رکھنے کی حالت میں اس (حق) کی عظمت و جلال کے تصور کو قائم رکھنا ہے۔ اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے مراد ہے۔ أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فانه يراك (1) اور اصحاب دل کی اس مراقبہ میں دو حالتیں ہوتی ہیں: ایک یہ کہ مشاہدہ حق اس پر غالب ہوتا ہے تو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور شاید حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت کی طرف اپنے اس ارشاد سے اشارہ کیا ہے: ''اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے (2)''۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ وہ اس مقام تک نہیں پہنچتا، لیکن اس پر یہ تصور غالب ہوتا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اس پر مطلع ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ اشارہ ہے: الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۟ۙ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝ (الشعراء) (جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور (دیکھتا رہتا ہے جب) آپ چکر لگاتے ہیں سجدہ کرنے والوں (کے گھروں کا)۔ اور قول باری تعالیٰ: اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ (یونس: 61) (مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى مراد قرابت دار اور رشتہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: وہ (آدمی) انہیں مال دیتا ہے جیسے اس نے فرمایا: وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الاسراء: 26) (اور رشتہ دار کو اس کا حق یعنی صلہ ادا کرو) اور یہ واجب پر مندوب کے عطف کے باب سے ہے، اور اس سے امام شافعی نے مکاتب کو دینے کے وجوب کے بارے استدلال کیا ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا، اور اللہ تعالیٰ نے ذوی القربیٰ کو خاص کیا ہے کیونکہ ان کے حقوق زیادہ موکد اور ان کا صلہ نسبتاً زیادہ واجب ہے، اس رحم کے حق کی تاکید کی وجہ سے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے، اور اس کا صلہ اپنے صلہ سے قرار دیا ہے، پس صحیح میں فرمایا: أما ترضين أن أصل من وصلك وأقطع من قطعك (3) (کیا تم اس پر راضی نہیں کہ میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں جس نے تیرے ساتھ صلہ رحمی کی اور میں اس کے ساتھ قطع تعلقی کر لوں جس نے تیرے ساتھ قطع تعلقی کی) اور بالخصوص جب وہ فقراء ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ الفحشاء سے مراد فحش ہے، اور اس کا اطلاق ہر قبیح پر ہے چاہے وہ قول قبیح ہو یا فعل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد زنا ہے۔ اور المنکر سے مراد ہر وہ شے ہے جس کا شریعت نے اس سے منع کر کے انکار کیا ہو، اور یہ تمام گناہوں، رذائل اور مختلف انواع کی کمینی حرکات کو شامل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ اور البغی سے مراد تکبر، ظلم، کینہ اور تعدی اور زیادتی کرنا ہے۔ اور اس کا حقیقی معنی حد سے تجاوز کرنا ہے، اور یہ منکر کے تحت بھی داخل ہے، لیکن اس کے ضرر اور نقصان کے شدید ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''بغاوت اور سرکشی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الایمان، جلد 1، صفحہ 27

2۔ سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حسب النساء، جلد 2، صفحہ 93

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتہا، جلد 2، صفحہ 315

سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ سزا (اور عذاب) کو لانے والا کوئی گناہ نہیں"(1)۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: "باغی کو بچھاڑ دیا گیا ہے"(2)۔ (یعنی وہ ہلاک کر دیا گیا ہے) تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی اور بعض کتب منزلہ میں ہے: اگر کسی پہاڑ نے کسی پہاڑ کے خلاف بغاوت کی تو ان میں سے باغی کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی صحیح میں عنوان ذکر کیا اور فرمایا: باب قول اللہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ ، اور قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (یونس: 23) (تمہاری سرکشی کا وبال تمہیں پر پڑے گا۔) ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ (الحج: 60) (پھر (مزید) زیادتی کی گئی اس پر تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرمائے گا) و ترك اثارة الشر علی مسلم أو کافر (مسلمان یا کافر پر شر بھڑکانے کو ترک کرنے کا بیان)۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ذکر کی جو کہ حضور نبی مکرم ﷺ پر لبید بن اعصم کے جادو کرنے کے بارے میں ہے۔ ابن بطال نے کہا ہے: امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ان آیات اور ترك اثارة الشر علی مسلم أو کافر سے استدلال کیا ہے جیسا کہ حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس پر دال ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خبردار آگاہ رہو اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا عطا فرما دی ہے اور رہا میں تو یہ ناپسند کرتا ہوں کہ میں لوگوں میں شر کو جوش دلاؤں (اور اسے پھیلا دوں)"(3)۔

اور اس کی وجہ...... واللہ اعلم ...... یہ ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ میں تاویل کی ہے کہ برائی کرنے والے کے ساتھ احسان (اور نیکی) کرنا اور اس کی برائی پر اس کی سزا کو چھوڑ دینا یہ مستحب ہے۔ پس اگر کہا جائے: بغی والی آیات میں تاویل کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ تو کہا جائے گا: اس کی وجہ...... واللہ اعلم ...... یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو آگاہ کر دیا کہ سرکشی اور بغاوت کا ضرر و نقصان باغی کی طرف پھر جاتا ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (یونس: 23) اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد و نصرت کی ضمانت دی ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے۔ تو پھر جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے اس کا بدرجہ اولیٰ یہ حق بنتا ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس کی مدد و نصرت کی ضمانت دی ہے تو اس کے مقابلے میں اس کی طرف سے عفو و درگزر ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے، اور اسی طرح حضور نبی مکرم ﷺ نے اس یہودی کے ساتھ کیا جس نے آپ پر جادو کیا تھا، حالانکہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے ساتھ آپ ﷺ کے لئے اس سے انتقام لینے کی اجازت تھی: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) (اور اگر تم (انہیں) سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے)۔ لیکن آپ ﷺ نے اس ارشاد کو لیتے ہوئے عفو و درگزر کو ترجیح دی: وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ) (اور جو شخص ان مظالم پر) صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3 صفحہ 416	2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان، جلد 2 صفحہ 896

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متضمن ہے، اور ان دونوں کے بارے میں کلام پہلے گزر چکی ہے۔ روایت ہے کہ ایک جماعت نے اپنے ایک عامل کی شکایت ابو جعفر منصور عباسی کے پاس پیش کی تو عامل نے اس جماعت کے ساتھ مباحثہ کیا اور وہ ان پر غالب آ گیا، اس طرح کہ وہ اس پر کوئی بڑا ظلم ثابت نہ کر سکے اور نہ کسی شے میں اس کی زیادتی ثابت کر سکے، تو اتنے میں قوم سے ایک نوجوان کھڑا ہوا اور اس نے کہا: اے امیر المومنین! بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے، اور بلاشبہ اس نے عدل کیا ہے اور احسان نہیں کیا۔ راوی نے کہا: پس ابو جعفر اس کی اصابت رائے سے بہت متعجب ہوا اور اس نے عامل کو معزول کر دیا۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

''اور پورا کرو اللہ تعالیٰ کے عہد کو جب تم نے اس سے عہد کر لیا ہے اور نہ توڑو (اپنی) قسموں کو انہیں پختہ کرنے کے بعد حالانکہ تم نے کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ یہ لفظ عام ہے اور ان تمام عقدوں اور معاہدوں کو شامل ہے جو زبان کے ساتھ کئے جاتے ہیں اور آدمی اسے لازم کر لیتا ہے بیع ہو یا صلہ ہو یا ایسے امر کے بارے معاہدہ ہو جو دین کے موافق ہو۔ اور یہ آیت اس قول کو ضمن میں لینے والی ہے: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ کیونکہ اس کا معنی اس میں ہے: تم اس طرح کرو، اور اس سے باز رہو، پس اسی تقدیر پر اس کا عطف کیا گیا ہے۔ تحقیق یہ کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت اسلام پر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیعت لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اسی حلف کے لازم ہونے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو زمانہ جاہلیت میں وقوع پذیر ہوا اور پھر اسلام نے اسے پورا کرنے کے بارے حکم دیا؛ حضرت قتادہ، مجاہد اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے یہ کہا ہے۔ اور عموم ان تمام کو شامل ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ اور صحیح میں حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں اور جو معاہدہ جاہلیت میں ہوا اسلام نے سوائے شدت اور سختی کے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا'' (1)۔ یعنی (وہ معاہدہ) حق کی مدد کرنے، حق کے ساتھ قائم ہونے اور باہمی غمخواری کرنے کے بارے ہو۔ اور یہ اسی طرح ہو جیسا کہ وہ حلف الفضول ہے جسے ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا: قریش کے قبائل عبد اللہ بن جدعان کے شرف و نسب کی وجہ سے اس کے گھر میں جمع ہوئے اور انہوں نے اس پر باہمی ایک عقد اور معاہدہ کیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں کوئی مظلوم نہیں پائیں گے چاہے وہ مکہ کے رہنے والوں سے ہو یا کوئی اور مگر وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ اس پر سے ظلم واپس لوٹا دیا جائے، اس معاہدہ کو قریش نے حلف الفضول کا نام دیا، یعنی حلف الفضائل۔ اور یہاں فضول فضل کی جمع کثرت ہے جیسا کہ فلس کی جمع فلوس ہے۔ ابن

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مواخاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 308

اسحاق نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں معاہدے کے وقت حاضر تھا میں یہ پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس کے بدلے سرخ اونٹ دیئے جائیں اگر اسلام میں بھی مجھے اس کے بارے دعوت دی جائے تو میں یقیناً اسے قبول کروں گا۔'' اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ ولید بن عتبہ نے حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما پر ان کے مال کے بارے میں زیادتی کی، اس لئے کہ ولید کی حکومت تھی اور وہ مدینہ طیبہ کا امیر تھا۔ تو حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں تو میرے حق کے بارے میں میرے ساتھ ضرور انصاف کرے گا یا پھر میں اپنی تلوار پکڑ لوں گا اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں کھڑا ہو جاؤں گا پھر حلف الفضول کے بارے دعوت دوں گا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں حلف اٹھاتا ہوں قسم بخدا! اگر آپ نے ہمیں دعوت دی تو میں یقیناً اپنی تلوار اٹھاؤں گا پھر میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا یہاں تک کہ آپ کے حق کے بارے انصاف ہو یا ہم سارے کے سارے مر جائیں۔ اور یہ خبر مسور بن مخرمہ تک پہنچی تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا۔ اور یہ خبر عبد الرحمن بن عثمان بن عبید اللہ التیمی تک پہنچی تو اس نے بھی اسی طرح کہا۔ پس جب یہ خبر ولید کو پہنچی تو اس نے آپ کے ساتھ انصاف کیا۔ علماء نے کہا ہے: پس یہ وہی معاہدہ ہے جو دور جاہلیت میں ہوا تھا اور وہ وہی ہے جسے اسلام نے مزید مضبوط کیا اور حضور نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے قول لا حلف فی الاسلام کے عموم سے خاص کیا ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ شریعت کا حکم ظالم سے بچنے کے بارے ہے اور اس سے حق لینے کے بارے اور اسے مظلوم تک پہنچانے کے بارے میں ہے، اور اسے قانون شریعت کے ساتھ ایجاب عام کی صورت میں ہر اس آدمی پر واجب کیا ہے جو مکلفین میں سے قدرت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ظالموں پر راستہ اور اختیار دے دیا ہے۔ پس ارشاد فرمایا: اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَيَبۡغُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ‌ ؕ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۞ (الشوریٰ) (بے شک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں زمین میں ناحق، یہی ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے)۔ اور صحیح میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''تو اپنے بھائی کی مدد کر ظالم ہو یا مظلوم۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ یہ تو معلوم ہے کہ ہم مظلوم کی مدد کر سکتے ہیں لیکن ہم ظالم کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس کے ہاتھ پکڑ لو ..... اور ایک روایت میں ہے: تم اسے ظلم سے روک دو ..... پس یہی اس کی مدد و نصرت ہے۔'' اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے: ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے دی جانے والی سزا (عذاب) میں انہیں بھی شامل کر لے۔'' إن الناس إذا رأوا الظالم ولم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله بعقاب من عنده (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اپنی قسموں کو مضبوط اور مغلظ کرنے کے بعد نہ توڑو؛ کہا جاتا ہے: توکید و تاکید، وکد اور اکد اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا یعنی شہیدا۔ (حالانکہ تم نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کو گواہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی نزول العذاب اذا لم یغیر المنکر، جلد 2، صفحہ 39

بنالیا ہے)۔ اور کہا جاتا ہے: محافظ بنالیا ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ضامن بنالیا ہے۔ اور بے شک فرمایا: بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا تو یہ وہ قسم ہے جسے عزم و ارادہ کے ساتھ موکد کیا گیا ہو اور یمین لغو کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: التوکید انسان کی وہ قسم جو ایک شے کے بارے میں بار بار ہو، وہ اس میں تین بار یا اس سے بھی زیادہ قسم کو دہراتا اور اس کا اعادہ کرتا ہے، جیسے اس کا یہ قول: واللہ لا أنقصه من كذا، (قسم بخدا! میں اسے اس سے کم نہیں کروں گا)، واللہ لا أنقصه من كذا، واللہ لا أنقصه من كذا۔ فرمایا: پس اس کا کفارہ کفارہ یمین کی مثل ایک ہی ہوگا۔ یحییٰ بن سعید نے کہا ہے: یہ عهود اور عهد قسم ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ عہد کا کفارہ نہیں دیا جائے گا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر عہد توڑنے والے کے لئے قیامت کے دن اس کی سرین کے پاس اس کے معاہدہ توڑنے کی مقدار کے مطابق جھنڈا گاڑا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں کی خیانت اور وعدہ خلافی ہے(1)“۔ اور رہی اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھانا! تحقیق اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک خصلت کے ساتھ کفارہ مشروع قرار دیا ہے، اور جس پر قسم منعقد ہوا سے کھول دیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: التوکید یہ ہے کہ آدمی دو مرتبہ قسم کھائے، اور اگر آدمی ایک بار قسم کھائے تو اس میں کفارہ نہیں ہوگا۔ یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

”اور نہ ہو جاؤ اس عورت کی مانند جس نے توڑ ڈالا اپنے سوت کو مضبوط کاتنے کے بعد (اور اسے) پارہ پارہ کر ڈالا تم بناتے ہو اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ تا کہ اس طرح ہو جائے ایک گروہ زیادہ فائدہ اٹھانے والا دوسرے گروہ سے، صرف آزماتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ ان قسموں سے۔ اور واضح فرما دے گا تمہارے لئے قیامت کے روز ان باتوں کو جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا، النقض اور النكث (توڑنا) دونوں کا ایک ہی معنی ہے، اور اسم النکث اور النقض ہے، اور جمع الأنكاث ہے۔ پس اس آیت نے اس آدمی کو جو حلف اٹھاتا ہے، معاہدہ کرتا ہے، اور وہ اپنے عہد کو خوب پختہ کرتا ہے اور پھر اسے توڑ دیتا ہے اسے اس عورت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو اپنا سوت کاتتی ہے اور اسے مضبوط بنتی ہے اور پھر اسے کھول دیتی ہے، پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ اور روایت کی جاتی ہے کہ مکہ میں رہنے والی ایک بیوقوف عورت تھی، اس کا نام ریطہ بنت عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ تھا وہ اس طرح کرتی تھی، پس اس کے ساتھ یہ تشبیہ واقع ہوئی ہے! یہ فراء نے کہا ہے، اور اسے عبداللہ بن کثیر اور سدی نے بیان کیا ہے اور ان دونوں نے عورت کا نام ذکر نہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب إذا قال عند قوم شيئا ثم خرج بخلافه، جلد 2، صفحہ 1053

کیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، یہ ضرب المثل ہے، کسی معین عورت کے ساتھ تشبیہ نہیں ہے (1)۔ اور اَنْكَاثًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور الدخل سے مراد فریب، دھوکا اور ملاوٹ ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: ہر وہ کام جو صحیح نہ ہو وہی دخل ہے۔ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت ان عربوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سے ایک قبیلہ جب دوسرے قبیلہ سے معاہدہ کرتا، پھر ان میں سے ایک کسی ایسے قبیلے کے پاس آتا جو افرادی قوت کے اعتبار سے زیادہ اور قوی ہوتا تو وہ اس میں داخل ہو جاتا، پہلے کے ساتھ دھوکا کرتا اور اپنا عہد توڑ ڈالتا اور اس بڑے کی طرف لوٹ جاتا (2)...... یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے...... اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: تم اس وجہ سے معاہدہ نہ توڑو کہ ایک طائفہ افراد یا اموال کے اعتبار سے دوسرے طائفہ کی نسبت زیادہ ہو تو تم اپنی قسمیں توڑ دو جب تم اپنے مشرک دشمنوں کی دنیا میں خوشحالی اور کثرت تعداد کو دیکھو۔ اور مقصود کفار اور ان کے اموال کی کثرت کے سبب کفر کی طرف لوٹنے سے منع کرنا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم کسی قوم کے ساتھ ان کی قلت اور اپنی کثرت کے سبب یا اپنی قلت اور ان کی کثرت کے سبب معاہدہ نہ توڑو؛ حالانکہ تم انہیں قسم کے ساتھ قوی اور مضبوط کر چکے ہو۔ اَرْبٰى بمعنی اکثر ہے؛ یہ رَبَا الشئ یربو سے ماخوذ ہے جبکہ شے کثیر ہو جائے، زیادہ ہو جائے اور بِهٖ میں ضمیر احتمال رکھتی ہے کہ وہ اس وفا کی طرف لوٹ رہی ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ربا کی طرف لوٹ رہی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے کے ساتھ حسد کرنے، اور ان میں سے بعض کے بعض پر غلبہ پانے کی طلب کے ساتھ آزمایا ہے، اور اس نے اس کے ساتھ انہیں امتحان میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ دیکھے کون اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے کہ وہ اسے ان کے مخالف بنا دے جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور اس کی خواہش کے مقتضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور یہی اس قول باری تعالیٰ کا معنی ہے: اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ یعنی تم دوبارہ زندہ کئے جانے وغیرہ کے بارے میں اختلاف کرتے ہو۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تمہیں ایک امت لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، اور ضرور تم سے باز پرس کی جائے گی ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک ہی ملت اور دین پر بنا دیتا۔ وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ (لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے) اپنی طرف سے ان کی مدد چھوڑنے کے سبب اور اپنی طرف سے ان میں عدل کرتے ہوئے۔ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ انہیں اپنی توفیق سے نوازتے ہوئے اور اپنی طرف سے ان پر فضل و احسان فرماتے ہوئے، جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ تم سے پوچھا جائے گا: اور یہ آیت قدریہ کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 418-417 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 418

رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ اور وَلَيُبَيِّنَنَّ اور وَلَتُسْـَٔلُنَّ میں لام اور نون مشددہ (ثقیلہ) دونوں مضمر قسم پر دلالت کرتے ہیں، یعنی واللہ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ وَلَتُسْـَٔلُنَّ۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾

''اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ ورنہ (جادۂ حق سے) پھسل جائے گا (لوگوں کا) قدم (اس پر) جم جانے کے بعد اور تمہیں چکھنا پڑے گا (اس کا) برا نتیجہ کہ تم نے (اپنی عہد شکنی اور فریب کاری) کے باعث لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا اور تمہارے لئے بڑا (دردناک) عذاب ہوگا۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اسے بطور تاکید مکرر ذکر کیا۔ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا یہ اس سے روکنے اور منع کرنے میں مبالغے کا اظہار ہے اس لئے کہ دین میں اس کے وقوع کا محل عظیم ہے اور لوگوں کے معاملات میں بار بار دہرائی جاتی ہے، یعنی تم ایسی قسمیں نہ کھاؤ جن سے مقصود دھوکہ اور فساد ہو ورنہ قدم جم جانے کے بعد (جادۂ حق سے) پھسل جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد قسم سے قدم پھسل جائے گا۔ اور یہ استعارہ ہے سیدھی راہ پر چلنے والے کے لئے جو بہت بڑے شر اور برائی میں واقع ہو جاتا ہے اور اس میں گر پڑتا ہے، کیونکہ قدم جب پھسل جائے تو انسان اچھی حالت سے بری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اور اسی معنی میں کثیر کا قول ہے:

فلما توافینا ثبتُّ وزلّت　(پس جب ہم آ گئے تو میں ثابت قدم رہا اور وہ پھسل گئی)

اور عرب ہر اس آدمی کے لئے جو عافیت کے بعد کسی مصیبت میں مبتلا ہو یا کسی گڑھے میں گرنے والا ہو، کہتے ہیں زلّت قدمہ (اس کا قدم پھسل گیا)۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

سَيُمْنَعُ منك السَّبْقُ ان كنت سابقا　　وتُقْتَلُ ان زَلَّت بك القدمان(1)

اور جو آدمی کسی شے میں خطا کرے اس کے لئے کہا جاتا ہے: زلّ فیہ۔ (وہ اس میں پھسل گیا) پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عذاب کی اور آخرت میں عذاب عظیم کی وعید فرمائی ہے۔ اور یہ وعید بلاشبہ اس کے بارے میں ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کو توڑا، کیونکہ جس نے آپ کے ساتھ معاہدہ کیا پھر اس نے اپنا عہد توڑ دیا وہ ایمان سے خارج ہو گیا، اور اسی لئے فرمایا: وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی تمہارے اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکنے کے سبب۔ اور دنیا میں برا نتیجہ چکھنا یہ ہے کہ جو ان پر تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13 صفحہ 201

مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

"اور مت بیچو اللہ تعالیٰ کے عہدوں کو تھوڑی سی قیمت کے عوض، بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہی بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو۔ جو (مال و زر) تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو (رحمت کے خزانے) اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہیں گے، اور ہم ضرور عطا کریں گے انہیں جنہوں نے (ہر مصیبت میں) صبر کیا ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا یہ عہد توڑنے پر اموال لینے اور رشوت سے نہی ہے، یعنی تم دنیا کے قلیل ساز و سامان کے عوض اپنے عہدوں کو نہ توڑو۔ وہ بلاشبہ قلیل ہی ہے اگرچہ وہ کثیر بھی ہو، کیونکہ یہ زائل ہونے والا اور ختم ہو جانے والا سامان ہے، پس یہ فی الحقیقت قلیل ہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ (جو (مال و زر) تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو (رحمت کے خزانے) اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہیں گے) سے یہی مراد ہے۔ پس دنیا اور آخرت کی حالت کے درمیان فرق بیان کر دیا اس طرح کہ یہ ختم ہو جاتا ہے اور بدل جاتا ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اس کا فضل و عطا ہے، اور اس کی جنت کی نعمتیں ثابت رہنے والی ہیں وہ اس سے زائل نہیں ہوں گی جس نے وعدہ وفا کیا اور اپنے عقد پر ثابت قدم رہا۔

کسی شاعر نے کتنا خوب کہا:

المال ينفدُ حِلّه و حرامه   يوما و تبقى فی غدٍ آثامُه

اس دن مال کی حلت و حرمت ختم ہو جائے گی اور کل اس کے گناہوں کی جزا باقی رہے گی۔

ليس التقيُّ بمتقٍ لِإلهه   حتى يطيب شرابه و طعامه

تقویٰ صرف اس کے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے ساتھ نہیں ہے یہاں تک کہ اس کا کھانا، پینا بھی حلال اور طیب ہو۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے:

هَبِ الدنيا تساق إليك عفْوًا   أليس مصير ذاك إلى انتقال

تو دنیا کو چھوڑ دے وہ تیری طرف معافی مانگتے ہوئے چل کر آئے گی کیا اس کا انجام انتقال نہیں ہے۔

و ما دنياك إلا مثالُ فَيْئٍ   أظلّك ثم آذن بالزوال

تیری دنیا تو فقط سائے کی مثل ہے اس نے تجھ پر سایہ کیا اور پھر زوال کا اعلان کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا یعنی ہم انہیں ضرور عطا کریں گے جنہوں نے اسلام اور طاعات پر صبر کیا اور جنہوں نے گناہ کرنے سے صبر کیا (اجتناب کیا)۔ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ان کا اجر ان کے ان اچھے کاموں کے

عوض ہے جو وہ طاعات میں سے کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں احسن قرار دیا کیونکہ حسن میں سے اس نے جو چیزیں شمار کرائی ہیں وہ مباح ہیں۔ اور طاعات پر جزا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے وعدہ کے مطابق ہوگی۔ عاصم اور ابن کثیر نے تعظیم کی بنا پر نون کے ساتھ وَ لَنَجْزِيَنَّ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ قرأت کی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت وَلَا تَشْتَرُوْا یہاں تک امرؤ القیس بن عابس کندی اور اس کے خصم ابن اسوع کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ دونوں زمین کے بارے میں جھگڑ پڑے پس امرؤ القیس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا اور جب اس نے یہ آیت سنی تو قسم سے انکار کر دیا اور اس کے لئے اس کے حق کا اقرار کر لیا) واللہ اعلم۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''جو بھی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی، اور ہم ضرور دیں گے انہیں ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ اور حیات طیبہ کے بارے میں پانچ قول ہیں: (۱) اس سے مراد رزق حلال ہے(1)؛ یہ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عطا اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ (۲) اس سے مراد قناعت ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، زید بن وہب (2) اور وہب بن منبہ نے کہا ہے، اور اسے حکم نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ (۳) اس کا طاعات (وعبادات) کی توفیق دینا ہے کیونکہ یہ اعمال اسے اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچا دیتے ہیں؛ یہ معنی ضحاک نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: جس نے نیک عمل کئے درآنحالیکہ وہ مومن ہو تنگی کی حالت میں اور خوشحالی کی حالت میں تو اس کی زندگی پاکیزہ ہے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کیا اور اپنے رب کے ساتھ ایمان نہ لایا اور کوئی نیک عمل نہ کیا تو اس کی معیشت تنگ ہوگئی اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہ ہوگی۔ اور حضرت مجاہد، قتادہ، اور ابن زید رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے(3): اس سے مراد جنت ہے، اور یہ حسن نے کہا ہے، اور فرمایا: کسی کی زندگی پاکیزہ نہیں ہوگی مگر جنت میں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سعادت ہے(4)، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ اور ابو بکر وراق نے کہا ہے: یہ طاعت کی حلاوت ہے۔ اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہے: وہ یہ ہے کہ بندے سے اس کی تدبیر چھین لی جائے اور اس کی تدبیر کو حق کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کی تصدیق کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مخلوق سے بے نیاز ہونا اور حق کی طرف متوجہ ہونا اور اس کا محتاج ہونا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد قضا کے ساتھ راضی ہونا ہے۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ اور آخرت میں ہم انہیں ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ان کے اچھے کاموں کے عوض جو وہ کرتے

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 203 2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 204 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

تھے۔) اور فرمایا: فَلَنُحْیِیَنَّهٗ پھر فرمایا: وَ لَنَجْزِیَنَّهُمْ اس لئے کہ مَنْ واحد اور جمع دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے، پس ایک بار ضمیر لفظ کے اعتبار سے (واحد) لوٹائی اور ایک بار معنی کے اعتبار سے (جمع) لوٹائی اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو صالح نے کہا ہے: تورات کو ماننے والے کچھ لوگ، اور انجیل کو ماننے والے کچھ لوگ، اور بت پرستوں میں سے کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، تو ان میں سے ایک فریق نے کہا: ہم افضل ہیں، اور دوسروں نے کہا: ہم افضل ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾

''سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:...... اور وہ یہ کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ کے ساتھ متصل ہے پس جب تو اس کی قرأت میں شروع ہو تو اللہ تعالیٰ سے اس بارے پناہ طلب کر کہ شیطان تیرے لئے ظاہر ہو اور وہ تجھے اس میں غور و فکر کرنے سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کرنے سے روکے اور اس سے یہ مراد نہیں کہ تو قرأت کے بعد پناہ طلب کر، بلکہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: إذا أكلت فقل بسم الله یعنی جب تو کھانے کا ارادہ کرے تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ۔ اور جبیر بن مطعم نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا جس وقت آپ نماز شروع کرتے تو کہتے: اللّٰهم إني أعوذ بك من الشيطان من همزه و نفخه و نفثه (1)۔ (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وساوس سے، اس کے کبر و نخوت سے، اور اس کے غزلیہ اشعار سے۔)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں قرأت سے پہلے تعوذ پڑھتے تھے۔ الکیا طبری نے کہا ہے: بعض سلف سے یہ منقول ہے کہ تعوذ مطلقاً قرأت کے بعد ہے، اور ان کا استدلال اس قول باری تعالیٰ سے ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ تعوذ قرأت کے بعد ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا (النساء: 103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے) مگر اس کے سوا دوسرے معنی کا اس میں احتمال ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (الانعام: 152) (اور جب بھی بات کہو تو انصاف کی کہو۔)

وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الاحزاب: 53) (اور جب تم مانگو ان سے کوئی چیز تو مانگو پس پردہ ہو کر۔) اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے سوال کے بعد حجاب کے پیچھے سے وہ ان سے سوال کرے۔ اور اسی کی مثل قائل کا یہ قول ہے: إذا قلت فاصدق (جب تو بات کرے تو سچ بول) اور وإذا أحرمت فاغتسل (اور جب تو احرام باندھے تو غسل کر) یعنی احرام باندھنے سے پہلے۔ اور ان تمام میں معنی یہ ہے: جب تو اس کا ارادہ کرے۔ پس اسی طرح استعاذہ (پناہ طلب کرنا، تعوذ پڑھنا) بھی ہے۔ یہ معنی اور استعاذہ کی مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من رای الاستفتاح بسبحانك، جلد 1، صفحہ 113۔ ایضاً، حدیث نمبر 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''یقیناً اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی بے شک اس کا ان لوگوں پر گمراہ کرنے اور کفر کے بارے زور نہیں چلتا جو (سچے دل سے) ایمان لائے، یعنی تجھے اس پر قدرت نہیں ہے کہ تو انہیں ایسے گناہ پر ابھارے جس کی مغفرت نہیں ہوسکتی؛ یہ سفیان نے کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے اس پر کوئی حجت نہیں ہے گناہوں میں سے جن کی طرف وہ انہیں دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کو ان پر کسی حال میں کوئی زور نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قوت ان پر ڈال دی ہے جس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس نے کہا اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو(1): وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۴۰﴾ (الحجر) (اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾ (الحجر) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ ایسا عام ہے جس میں تخصیص داخل ہے، تحقیق اس نے حضرت آدم وحواء علیہما السلام سے اپنے زور کے ساتھ لغزش کا ارتکاب کروایا، اور اس نے اپنے اپنے وقت کے فضلاء کو اپنے اس قول کے ساتھ کہ ''تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟'' تشویش میں مبتلا کیا، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاعراف کے آخر میں گزر چکا ہے۔

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ بلاشبہ اس کا زور صرف ان پر چلتا ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تولیتہ یعنی میں نے اس کی اطاعت کی، اور تولیت عنہ، یعنی میں نے اس سے اعراض کرلیا۔ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ اور ان پر جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں بِهٖ ضمیر شیطان کی طرف لوٹ رہی ہے؛ یہ ربیع بن انس اور قتیبی نے کہا ہے(2)۔ اور اس کا معنی ہے: اور وہ لوگ جو اس کی وجہ سے شرک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: کفرت بھذہ الکلمۃ، یعنی میں نے اس کلمے کی وجہ سے کفر کیا۔ اور صار فلان بك عالما، یعنی فلاں تیری وجہ سے عالم ہوگیا، یعنی وہ جو شیطان کی اطاعت کرتے ہیں (اور اس کے ساتھ یارانہ گانٹھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔)

وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 213 2۔ ایضاً

اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۰۲

''اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں: تم صرف افتراء پرداز ہو، بلکہ ان میں سے اکثر (آیت بدلنے کی حکمت کو) نہیں جانتے۔ فرمائیے: نازل کیا ہے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ ثابت قدم رکھے انہیں جو ایمان لائے ہیں اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جب ہم سابقہ شریعت کو نئی شریعت کے ساتھ بدلتے ہیں؛ یہ ابن بحر نے کہا ہے (1)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی جب ہم ایک آیت کو اٹھا لیتے ہیں اور اس کی جگہ دوسری رکھ دیتے ہیں (2)۔ اور جمہور نے کہا ہے: جب ہم ایک آیت کو ایسی آیت کے ساتھ منسوخ کر دیتے ہیں جو پہلی سے ان پر زیادہ شدید اور سخت ہوتی ہے۔ نسخ اور تبدیل کا معنی ہے ایک چیز کو اٹھا لینا اس طرح کہ اس کی جگہ دوسری شے رکھ دی جائے (3)، اور نسخ کے بارے میں مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ قَالُوْۤا مراد کفار قریش ہیں یعنی یہ کہتے ہیں: اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ تم تو فقط جھوٹ گھڑنے والے ہو، اور وہ یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ حکم کی تبدیلی کو دیکھتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ نے احکام اور بعض کو بعض کے ساتھ تبدیل کرنے کو مشروع قرار دیا ہے (اکثر اسے جانتے ہی نہیں ہیں) اور قول باری تعالیٰ: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، وہ مکمل قرآن کریم یعنی اس کا ناسخ اور منسوخ سبھی لے کر نازل ہوئے۔ اور صحیح اسناد کے ساتھ عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: تین سال تک حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقرر کیا گیا، پس وہ ایک ایک کلمہ کے ساتھ آپ کے پاس آتے تھے پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ پر قرآن کریم لے کر نازل ہوئے۔ اور صحیح مسلم میں بھی ہے کہ آپ پر سورۃ ''اَلْحَمْدُ'' کے ساتھ ایک فرشتہ نازل ہوا جو پھر کبھی زمین کی طرف نہیں اترا، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ یعنی تیرے رب کے کلام کو حق کے ساتھ (روح القدس نے نازل کیا ہے) لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تاکہ وہ ثابت قدم رکھے انہیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں دلائل اور آیات میں سے۔ وَهُدًى اور یہ ہدایت ہے۔ وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ اور مسلمانوں کے لئے خوشخبری ہے۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۰۳

''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ تعلیم قرآن کی نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے۔''

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 214 2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 210 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 214

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ اس کے نام میں اختلاف ہے جس کے بارے انہوں نے کہا کہ وہ آپ کو قرآن سکھاتا ہے۔ پس کہا گیا ہے: وہ الفاکہ بن مغیرہ کا غلام تھا اور اس کا نام جبر ہے، وہ نصرانی تھا پھر اسلام لے آیا اور جب وہ (کفار مکہ) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ آیات سنتے تھے جو گزر چکی ہیں اور جو آنے والی ہیں اس کے باوجود کہ آپ امی ہیں اور آپ نے کچھ نہیں پڑھا تو وہ کہتے: بے شک انہیں جبر سکھاتا ہے حالانکہ وہ عجمی ہے، تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ یعنی جبر آپ کو کیسے سکھا سکتا ہے حالانکہ وہ عجمی ہے اور یہ وہ کلام ہے کہ جن وانس میں سے کوئی اس کی ایک سورت یا اس سے زیادہ اس کے معارض لانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ جبر کا آقا اسے مارتا تھا اور اسے کہتا تھا: تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھاتا ہے؟ تو وہ کہتا: نہیں قسم بخدا! بلکہ آپ مجھے تعلیم دیتے ہیں اور میری راہنمائی کرتے ہیں۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے: جو خبر مجھ تک پہنچی ہے اس کے مطابق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات مروہ کے قریب نصرانی غلام کے پاس بیٹھتے تھے اس کو جبر کہا جاتا تھا، اور وہ بنی الحضرمی کا غلام تھا، اور وہ کتابیں پڑھتا رہتا تھا، تو مشرک کہنے لگے: قسم بخدا! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ انہیں جبر نصرانی کے سوا کوئی نہیں سکھاتا۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: اس کا نام یعیش تھا وہ بنی حضرمی کا غلام تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قرآن کی تلقین کرتے تھے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی نے حضرت عکرمہ اور قتادہ سے ذکر کیا ہے کہ وہ بنی مغیرہ کا غلام تھا اس کا نام یعیش تھا، اور وہ عجمی کتابیں پڑھتا رہتا تھا، تو قریش نے کہا: بلاشبہ اسے بشر (کوئی انسان) سکھاتا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مہدوی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے وہ بنی عامر بن لوی کا غلام تھا، اور اس کا نام یعیش تھا۔ اور عبداللہ بن مسلم حضرمی نے کہا ہے: ہمارے دو نصرانی غلام تھے جو عین التمر کے رہنے والے تھے، ان میں سے ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا(1)۔ اور اسی طرح ماوردی، قشیری اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے، مگر ثعلبی نے یہ کہا ہے: ان میں سے ایک کو نبت کہا جاتا تھا اور اس کی کنیت ابوفکیہہ تھی، اور دوسرے کو جبر، اور وہ دونوں تلواروں کو تیز کرنے اور انہیں صاف کرنے کا کام کرتے تھے اور وہ دونوں ان کی کتاب پڑھتے تھے۔

ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ تورات اور انجیل پڑھتے تھے۔ ماوری اور مہدوی نے کہا ہے: وہ تورات پڑھتے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے پاس سے گزرتے تھے اور ان کی قرآت سنتے تھے، تو مشرک کہنے لگے: آپ ان سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان سے سیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مراد لئے؛ یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ مکہ میں ایک نصرانی تھا اس کا نام بلعام تھا، اور وہ غلام تھا تورات پڑھتا تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور مشرک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے پاس داخل ہوتے اور اس سے نکلتے وقت دیکھتے تھے، تو کہتے تھے: بلاشبہ بلعام انہیں سکھاتا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: مکہ مکرمہ میں ایک عیسائی آدمی تھا اس کو ابو میسرہ کہا جاتا تھا وہ رومی زبان میں گفتگو کرتا تھا، پس بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 215　　2۔ ایضاً

اس کے پاس بیٹھ جاتے، تو کفار کہنے لگے: بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے سیکھتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ عتبہ بن ربیعہ کا غلام عداس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حویطب بن عبدالعزی کا غلام عابس اور ابن حضرمی کا آزاد کردہ غلام یسار ابوفکیہہ تھا، اور دونوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان تمام کا احتمال ہوسکتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں کبھی کبھار ان کے پاس بیٹھتے تھے تاکہ آپ انہیں اس کے بارے تعلیم دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا، اور یہ مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال باہم متضاد اور متناقض نہیں ہیں، کیونکہ یہ جائز ہے کہ وہ ان تمام کی طرف اشارہ کرتے ہوں، اور یہ گمان رکھتے ہوں کہ وہ آپ کو سکھاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں وہ حقیقت سے بہت دور ہے، کیونکہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، اور یہ آیت مکی ہے۔ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ، الالحاد کا معنی مائل ہونا (المیل) (ٹیڑھا ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: لحد و ألحد، یعنی مال عن القصد (وہ ہدایت سے پھر گیا، ہٹ گیا) اور یہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے اور حمزہ نے یَلْحَدُوْنَ یا اور حا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کی زبان جس کی طرف وہ مائل ہورہے ہیں اور جس کی طرف وہ اشارہ کررہے ہیں وہ عجمی ہے۔ اور العُجمہ کا معنی الاخفاء: (چھپانا) ہے اور یہ بیان کی ضد ہے۔ اور رجل أعجم و امرأۃ عجماء یعنی جو فصیح و بلیغ نہ ہو۔ اور اسی سے عجم الذنب گناہ کو چھپانے کے لئے ہے۔ اور العجماء جانوروں کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے بارے میں وضاحت نہیں کر سکتے۔ اور أعجمت الکتاب کتاب کے بغیر اعراب کے ہونے نے پھسلا دیا۔ اور عرب ہر اس کو أعجمی کا نام دیتے ہیں جو ان کی زبان نہیں جانتا اور نہ ان کی کلام میں گفتگو کرسکتا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: أعجم وہ ہے جس کی زبان میں عجمہ ہو اگرچہ وہ عربی ہو، اور الأعجمی یا عجمی وہ ہے جو دراصل عجم سے ہو۔ اور ابوعلی نے کہا ہے: أعجمی وہ ہے جو فصیح و بلیغ نہ ہو برابر ہے وہ عرب سے ہو یا عجم سے، اور اسی طرح اعجم اور اعجمی جو عجم کی طرف منسوب ہوں، اگرچہ وہ فصیح و بلیغ ہوں۔ اور لسان سے مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ عرب قصیدہ اور شعر کے لئے لسان بولتے تھے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لسانُ الشرّ تهديها إلينا وخُنت و ما حسبتك أن تخونا

مراد لسان القصیدہ ہے۔ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ یعنی یہ عربی کلام میں سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

”بے شک جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یعنی یہ وہ مشرک ہیں جو قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لاتے۔ لَا یَهْدِیْهِمُ

اللّٰہِ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۰۴﴾۔

اِنَّمَا یَفۡتَرِی الۡکَذِبَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

''وہی لوگ تراشا کرتے ہیں جھوٹ جو ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیات پر اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا یَفۡتَرِی الۡکَذِبَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یہ اس کا جواب ہے جو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف افتراء پردازی کی نسبت کی۔ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ یہ انہیں کذب کے ساتھ متصف کرنے میں مبالغے کا اظہار ہے، یعنی ہر جھوٹ ان کے جھوٹ کی نسبت سے قلیل اور تھوڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: کذب فلان (فلاں نے جھوٹ بولا) اور یہ نہیں کہا جاتا: انہ کاذب (بے شک وہ جھوٹا ہے) کیونکہ فعل کبھی لازم ہوتا ہے اور کبھی لازم نہیں ہوتا۔ اور رہی لغت (صفت) تو وہ لازم ہوتا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے: عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾ (طٰہٰ) (اور حکم عدولی ہو گئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا)۔ اور یہ نہیں کہا جاتا: انہ عاصٍ و غاوٍ (کہ وہ حکم عدولی کرنے والے اور راستہ بھٹکنے والے ہیں) پس جب کہا جائے: کذب فلانٌ فھو کاذب، تو یہ کذب کے وصف میں مبالغہ کا اظہار ہے؛ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔

مَنۡ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِہٖۤ اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ وَ قَلۡبُہٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِیۡمَانِ وَ لٰکِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡکُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَیۡہِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۰۶﴾

''جس نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ (تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا) لیکن وہ (بدنصیب) کھل جائے کفر کے ساتھ (جس کا سینہ) تو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔''

اس میں اکیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَنۡ کَفَرَ بِاللّٰہِ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا پس یہ وصف بالکذب میں مبالغے کا بیان ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے مرتد نہ ہو، یعنی جس نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اور وہ مرتد ہو گیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور مقیس بن صبابہ، عبداللہ بن خطل، اور قیس بن ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا۔ پھر فرمایا: اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ، (1) اور زجاج نے کہا ہے: مَنۡ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِہٖۤ، مَنۡ یَفۡتَرِی الۡکَذِبَ سے بدل ہے؛ یعنی بلاشبہ وہ جھوٹ گھڑتا ہے جس نے اپنے ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ سے کفر کیا، کیونکہ اس نے کلام میں استثنائے غیر تام کے آخر کی طرف دیکھا ہے پس اس نے اسے ماقبل کے ساتھ معلق کر دیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: مَنۡ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، اور دوسرے مَنۡ کی خبر پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: من یاتنا من یحسن نکرمہ۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 216-215

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہی اہل تفسیر کا قول ہے کہ یہ اس بعض کے زیادہ قریب ہے جس کی طرف انہوں نے آپ کو بلایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مشرکوں نے آپ کو پکڑ لیا اور انہوں نے آپ کے والد اور والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت خباب اور حضرت سالم رضی اللہ عنہم کو بھی پکڑ لیا اور انہیں بہت ستایا، اذیتیں پہنچائیں، اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا اور ان کی شرمگاہ میں نیزہ مارا گیا۔ اور انہیں کہا گیا: بے شک تو نے ان مردوں کی وجہ سے اسلام قبول کیا ہے، پھر انہیں شہید کر دیا گیا اور ان کے خاوند حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا گیا، اور یہ دونوں اسلام میں پہلے مقتول ہیں۔ اور رہے حضرت عمار رضی اللہ عنہ! تو آپ نے مجبوراً اپنی زبان سے ان کے سامنے وہ کہہ دیا جو انہوں نے ارادہ کیا، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: ''اپنے دل کو کیسا پاتے ہو؟'' انہوں نے عرض کی: وہ ایمان کے ساتھ مطمئن ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پس اگر وہ اعادہ کریں تو تم بھی دوبارہ کہہ دو(1)''۔ اور منصور بن معتمر نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: اسلام میں پہلی شہیدہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی ماں ہے، انہیں ابوجہل نے قتل کیا تھا، اور مردوں میں سے پہلے شہید مجمع مولیٰ حضرت عمر ہیں۔ اور منصور نے بھی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ سب سے پہلے جنہوں نے اسلام ظاہر کیا وہ سات ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت صہیب، حضرت عمار اور حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم۔ پس رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ان کی حفاظت حضرت ابوطالب نے کی، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حفاظت ان کی قوم نے کی، اور دوسروں کو انہوں نے پکڑ لیا۔ اور انہیں لوہے کی زرہیں پہنا دیتے، پھر انہیں دھوپ میں ڈال دیتے یہاں تک کہ انہیں لوہے اور سورج کی گرمی سے حد درجہ مشقت اور تکلیف پہنچتی، اور جب شام ہوتی تو ابوجہل اپنے ساتھ نیزہ لے کر ان کے پاس آتا اور انہیں گالیاں دینے لگتا اور انہیں خوب جھڑکتا، اور پھر وہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور انہیں گالیاں دینے لگا اور بے حیائی کرنے لگا، پھر ان کی شرمگاہ پر نیزہ مارا یہاں تک کہ وہ ان کے منہ سے باہر نکل گیا اور انہیں قتل کر دیا؛ رضی اللہ عنہا۔ انہوں نے بیان کیا: اور دوسروں نے وہ کچھ کہہ دیا جو ان سے پوچھا گیا، سوائے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کیونکہ ان پر ان کے نفس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر معاملہ آسان کر دیا، پس وہ انہیں عذاب اور اذیتیں دینے لگے اور ان کو کہنے لگے: اپنے دین سے رجوع کر لو۔ (واپس لوٹ آؤ) اور وہ فرماتے: أَحَدٌ أَحَدٌ (اللہ تعالیٰ ایک ہے، اللہ تعالیٰ ایک ہے)، یہاں تک کہ وہ آپ سے اکتا گئے، پھر انہوں نے آپ کو باندھ دیا اور آپ کے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ڈال دی اور اپنے بچوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ مکہ کے ان دو پہاڑوں کے درمیان کھیلتے رہیں حتیٰ کہ وہ بھی آپ سے اکتا گئے اور پھر چھوڑ دیا۔ راوی نے بیان کیا پس حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم تمام نے سوائے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس بارے کلام کی جو انہوں نے کہا...... کاش اللہ تعالیٰ ہمارا تدارک فرماوے...... کیونکہ ان پر ان کے نفس نے اللہ کی راہ آسان کر دی، پس وہ اپنی قوم پر غالب آ گئے یہاں تک کہ

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، سورۃ النحل، جلد 2، صفحہ 389، حدیث 3362

وہ آپ سے اکتا گئے اور انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید لیا اور انہیں آزاد کر دیا۔ اور ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ ایمان لائے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے مدینہ طیبہ سے ان کی طرف لکھا کہ تم ہماری طرف ہجرت کر آؤ، کیونکہ ہم اپنی طرف سے تمہاری کوئی امداد نہیں کر سکتے یہاں تک کہ تم ہماری طرف ہجرت کر آؤ، پس وہ مدینہ طیبہ کے ارادہ سے نکلے یہاں تک کہ قریش نے انہیں راستے میں پکڑ لیا، پس انہوں نے انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا تو انہوں نے مجبور ہو کر کفر اختیار کر لیا، پس ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ دونوں روایتیں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کی ہیں۔

اور ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو دو امروں کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر انہوں نے دونوں میں سے زیادہ درست اور صحیح کو اختیار کیا(1)''۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک جنت تین افراد کی مشتاق ہے (یعنی) حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہم (2)''۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم حسن بن صالح کی حدیث کے سوا اسے نہیں جانتے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے اکراہ کے وقت اپنے ساتھ کفر کرنے کو بخش دیا ہے حالانکہ وہی اصل شریعت ہے اور اس کے سبب کوئی مؤاخذہ نہیں کیا، تو علماء نے اس پر بہت سے شرعی فروعات کو محمول کیا ہے، پس جب ان پر اکراہ واقع ہو تو ان کے سبب مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی حکم مرتب ہوگا اور اسی کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور اثر مروی ہے: ''میری امت سے خطا اور نسیان اور وہ عمل جس پر انہیں مجبور کیا گیا اٹھا لئے گئے ہیں(3)''۔ الحدیث۔ یہ خبر اگرچہ اس کی سند صحیح نہیں ہے لیکن اس کا معنی باتفاق علماء صحیح ہے، یہ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا ہے۔ اور ابو محمد عبد الحق نے بیان کیا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے، فرمایا: اسے ابو بکر الاصیلی نے ''الفوائد'' میں اور ابن منذر نے کتاب ''الاقناع'' میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جسے کفر پر مجبور کیا گیا یہاں تک کہ اسے اپنے اوپر قتل کا خوف (غالب) ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اگر اس نے کفر کیا بشرطیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو اور نہ اس سے اس کی بیوی جدا ہوگی اور نہ اس پر کفر کے حکم کے ساتھ کوئی حکم لگایا جائے گا، یہ قول امام مالک، امام شافعی اور کوفیوں کا ہے، مگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بن حسن نے کہا ہے: جب اس نے شرک کا اظہار کیا تو وہ ظاہر میں مرتد ہو گیا، اور جو معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے اس میں وہ اسلام پر ہی رہے گا، اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو جائے گی، اور اگر وہ مر گیا تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اور وہ اپنے باپ کا وارث نہیں بنے گا بشرطیکہ وہ اسلام پر فوت ہوا ہو۔ اور یہ وہ قول ہے جسے کتاب وسنت رد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ

1۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، جلد 2، صفحہ 220۔ ایضاً، حدیث نمبر 3734، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، جلد 2، صفحہ 220۔ ایضاً، حدیث نمبر 3732، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق المکرہ والناسی، صفحہ 148

نے ارشاد فرمایا: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ الآیہ۔ اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران: 28) (مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ)۔ اور فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ الآیہ (النساء: 97) (بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر فرشتوں نے انہیں کہا کہ تم کس شغل میں تھے؟ (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا: ہم تو بے بس تھے زمین میں)۔ مزید فرمایا: اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الآیہ (النساء: 98) (مگر واقعی کمزور و بے بس مرد اور عورتیں اور بچے......الخ)

پس اللہ تعالیٰ نے ان کمزور لوگوں کو معذور قرار دیا ہے جو اس کام کو ترک کرنے سے باز رہتے ہیں جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے، اور مُكْرَہ نہیں ہوتا مگر وہی کمزور جو اس عمل کو کرنے سے رکنے والا نہیں جس کے بارے اسے حکم دیا گیا ہے، یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ رخصت فقط قول میں ہے اور جہاں تک فعل کا تعلق ہے تو اس میں کوئی رخصت نہیں، مثلاً یہ کہ انہیں غیر اللہ کو سجدہ کرنے پر یا غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے یا کسی مسلمان کو قتل کرنے پر یا اسے مارنے پر یا اس کا مال کھانے پر مجبور کیا جائے یا زنا کرنے، اور شراب پینے اور سود کھانے پر مجبور کیا جائے؛ یہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون کا قول بھی یہی ہے۔ اور محمد رحمۃ اللہ علیہ بن حسن نے کہا ہے: جب کسی قیدی کو کہا جائے: اس بت کو سجدہ کر ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر وہ بت قبلہ سمت ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سجدہ کر لے اور اس کی نیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور اگر وہ قبلہ سمت نہ ہو تو پھر وہ سجدہ نہ کرے اگرچہ وہ اسے قتل کر دیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ سجدہ کر لے اگرچہ وہ غیر قبلہ کی طرف ہی ہو، اور اس وقت سجدہ کرنا ہی اس کے لائق اور مناسب ہے۔ اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آرہے تھے تو آپ اپنی سواری پر ہی جدھر اس کا منہ ہوتا نماز پڑھتے تھے (1)۔ انہوں نے فرمایا: اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: 115) (سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔) پس جب یہ دوران سفر حالت امن میں محض سواری سے اترنے کی مشقت کے پیش نظر نفل نماز کے لئے مباح ہے تو پھر حالت اکراہ میں یہ کیسے نہیں ہو سکتا؟ اور انہوں نے رخصت کو قول میں محصور کرنے کے بارے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے: کوئی کلام نہیں ہے جو مجھ سے طاقتور کے دو کوڑے دور کر سکتا ہو مگر یہ کہ میں اس کے ساتھ کلام کروں۔ تو انہوں نے رخصت کو قول میں محصور کیا ہے اور فعل کا ذکر نہیں کیا، اور یہ وہ ہے جس کے بارے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ قول یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے کلام کو بطور مثال ذکر کیا ہو حالانکہ وہ یہ ارادہ رکھتے ہوں کہ فعل بھی اسی کے حکم میں ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ قول اور فعل میں اکراہ برابر ہے بشرطیکہ اندر ایمان

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1181

موجود ہو۔ اور یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور مکحول رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل عراق کے ایک گروہ کا قول ہے۔ اور ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کیا ہے کہ جسے شراب پینے پر، نماز چھوڑنے پر یا رمضان میں روزہ افطار کرنے (نہ رکھنے پر) مجبور کیا گیا، تو اس سے گناہ اٹھالیا گیا۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جسے دوسرے کو قتل کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس پر اقدام قتل جائز نہیں اور اس کی حرمت کو ختم کرنا کوڑوں یا کسی اور شے کے بدلے جائز ہے، بلکہ وہ اس مصیبت اور اذیت پر صبر کرے جو اس پر آئی ہے، اور اس کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کا فدیہ کسی اور کے ساتھ دے، اور اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی التجا کرتا رہے۔

اور زنا کے بارے میں اختلاف ہے، پس مطرف، اصبغ، ابن عبدالحکم اور ابن ماجشون نے کہا ہے: کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا، اگرچہ وہ قتل کر دیا جائے وہ ایسا نہ کرے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو وہ گنہگار ہوگا اور اس پر حد لازم ہوگی؛ ابوثور اور حسن نے یہی کہا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ اس کے لئے اقدام زنا جائز ہوگا اور اس پر حد نہ ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اسے لازم کیا ہے، کیونکہ ان کی رائے ہے کہ یہ فطری شہوت ہے اس میں اکراہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور وہ شہوت کا باعث بننے والے سبب سے غافل ہے اور وہی اسے اس پر مجبور کرنے والا ہے، اور یہی وہ ہے جس نے اس کا حکم ساقط کر دیا ہے، اور بلاشبہ حد اس شہوت پر واجب ہوتی ہے جس پر سبب اختیاری نے برانگیختہ کیا ہو، پس انہوں نے شے کو اپنی ضد پر قیاس کیا ہے، پس یہ اس کی طرف سے درست اور صحیح نہیں۔

اور ابن خویز منداد نے احکام میں کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اس بارے اختلاف کیا ہے جب آدمی کو زنا پر مجبور کیا جائے، پس بعض نے کہا ہے: اس پر حد ہوگی، کیونکہ وہ یہ عمل اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر حد نہ ہوگی۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اسے غیر سلطان نے مجبور کیا تو اسے حد لگائی جائے گی، اور اگر اسے سلطان نے مجبور کیا تو پھر قیاس یہ ہے کہ اسے حد لگائی جائے گی لیکن مستحسن یہ ہے کہ اسے حد نہ لگائی جائے۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) نے ان سے اختلاف کیا ہے پس انہوں نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں اس پر حد نہ ہوگی، اور انہوں نے انتشار کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب یہ علم ہو کہ وہ فعل زنا کے ساتھ قتل سے نجات پا جائے گا تو انتشار جائز ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اس پر کوئی حد نہیں، اور اس میں سلطان اور غیر سلطان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ مُکرَہ کی طلاق اور اس کے عتاق کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس کی کوئی شے لازم نہ ہوگی۔ ابن وہب نے حضرت عمر، حضرت علی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ اس کی طلاق کو کوئی شے نہیں جانتے۔ اسے ابن منذر نے حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، عطا، طاؤس، حسن، شریح، قاسم، سالم، امام مالک، امام اوزاعی، امام احمد، اسحاق، اور ابوثور رضی اللہ عنہم ورحمہم اللہ تعالیٰ سے ذکر کیا ہے۔

اور ایک گروہ نے اس کی طلاق کو جائز قرار دیا ہے؛ اور یہ حضرت شعبی، نخعی، ابوقلابہ، زہری اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے مروی ہے، اور یہی کوفیوں کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مکرہ کی طلاق لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس میں رضا سے زیادہ کوئی شے معدوم نہیں، اور اس کا وجود طلاق میں شرط نہیں جیسا کہ ھازل (ٹھٹھا مذاق کرنے والا)۔ اور یہ قیاس باطل ہے، کیونکہ ھازل طلاق واقع کرنے کا قصد کرتا ہے اور اس کے ساتھ راضی ہوتا ہے، اور مکرہ راضی نہیں ہوتا اور نہ طلاق میں اس کی نیت ہوتی ہے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے (1)''۔ اور بخاری میں ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جسے چور مجبور کرتے ہیں پس وہ طلاق دے دیتا ہے: تو وہ کوئی شے نہیں ہے (یعنی طلاق واقع نہیں ہوتی) اور یہی حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عمر، شعبی، اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اگر چوروں نے اسے مجبور کیا تو وہ طلاق نہ ہوگی، اور اگر اسے سلطان نے مجبور کیا تو وہ طلاق ہو جائے گی۔ اور ابن عیینہ نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور کہا ہے: بے شک چور اس کے قتل کا اقدام کرے گا اور سلطان اسے قتل نہیں کرے گا۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور رہا وہ آدمی جسے بیع پر مجبور اور تنگ کیا جائے تو اس کی دو حالتیں ہیں: (۱) کہ وہ اپنا مال اس حق کے بدلے بیچے جو اس پر واجب ہے؛ تو یہ بیع ہو جائے گی، جائز ہوگی اور فقہاء کے نزدیک اس میں رجوع نہ ہوگا، کیونکہ غیر مبیع سے حق اس کے مالک کو ادا کرنا اس پر لازم ہے، پس جب اس نے وہ نہیں کیا تو اس کی بیع اس کے اختیار سے ہوئی پس وہ لازم ہو جائے گی۔ اور رہی مکرہ کی بیع ظلماً یا جبراً، تو یہ وہ بیع ہے جو اس پر جائز نہ ہوگی، اور اس میں اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنا سامان بغیر ثمن کے لے لے، اور مشتری (خریدار) ثمن کے لئے اس ظالم کا پیچھا کرے، پس اگر سامان ضائع ہو گیا تو وہ اس کے ثمن یا اس میں سے اکثر کی قیمت کے ساتھ اس ظالم پر رجوع کرے جبکہ مشتری اس کے ظلم کو نہ جانتا ہو۔ مطرف نے کہا ہے: خریدنے والوں میں سے جو مکرہ کی حالت کو جانتا ہو تو وہ اس کا ضامن ہوگا جو اس نے اس کے غلاموں اور سامان میں سے خریدا جیسا کہ غاصب کا حکم ہے، پس خریدنے والے نے اس میں آزاد کرنے یا مدبر بنانے یا وقف کرنے وغیرہ کا جو تصرف اور عمل کیا وہ مکرہ پر لازم نہیں ہوگا، اور اس کے لئے اپنا سامان لینا جائز ہوگا۔ سحنون نے کہا ہے: ہمارے اصحاب اور اہل عراق نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ظلم اور جور وستم پر مکرہ کا بیع کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور ابہری نے کہا ہے: بے شک اس پر اجماع ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اور رہا مکرہ کا نکاح، تو سحنون نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے مکرہ اور مکرلہ (مرد و عورت) کے نکاح کے باطل ہونے پر اجماع کیا ہے، اور انہوں نے کہا ہے: اس پر قائم رہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ منعقد ہی نہیں ہوا۔ محمد بن سحنون نے کہا ہے: اہل عراق نے مکرہ کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اگر اسے اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ (فلاں) عورت سے دس ہزار درہم کے عوض، اور ایک ہزار درہم مہر مثل کے عوض نکاح کرے، تو وہ نکاح جائز ہوگا اور ایک ہزار درہم اس پر لازم ہوں گے اور فضل (فالتو رقم) باطل ہوگا۔ امام محمد نے کہا ہے: پس جس طرح انہوں نے ہزار سے زائد کو باطل قرار دیا ہے پس اسی طرح اکراہ کے ساتھ نکاح کو باطل قرار دینا ان پر لازم ہے۔ اور ان کا قول خلاف سنت ہے جو کہ

1۔ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 2

حدیث خنساء بنت حذام انصاریہ میں ثابت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے مہروں کے بارے میں مشورہ کرنے کے حکم کے سبب ثابت ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے، پس ان کے قول کا کوئی معنی نہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ پھر اگر وہ آدمی جسے نکاح پر مجبور کیا گیا اس نے عورت سے وطی کی درآنحالیکہ اسے وطی پر مجبور نہ کیا گیا اور نکاح کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے، تو ہمارے نزدیک نکاح لازم ہو جائے گا اور اس پر مہر مسمی لازم ہوگا اور اس سے حد ختم ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے کہا: میں نے اس کے ساتھ اپنی طرف سے نکاح پر رضامندی کے بغیر وطی کی ہے تو اس پر حد ہوگی اور مہر مسمی ہوگا، کیونکہ وہ مہر مسمی کو باطل کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے، اور عورت کو حد لگائی جائے گی اگر اس نے یہ اقدام کیا اور وہ یہ جانتی تھی کہ اسے نکاح پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور رہی وہ عورت جسے نکاح پر اور وطی پر مجبور کیا گیا تو اس پر حد نہیں ہوگی اور اس کے لئے مہر ہوگا۔ اور وطی کرنے والے کو حد لگائی جائے گی، پس تو اسے جان لے، یہ سحنون نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ جب عورت کو زنا پر مجبور کیا جائے تو اس پر کوئی حد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ (مگر وہ جسے مجبور کیا جائے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا، نسیان اور وہ عمل جس پر انہیں مجبور کیا گیا کو اٹھا لیا ہے۔'' (اور ان سے درگزر فرمالی ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۞ (النور) (تو بے شک اللہ تعالیٰ ان کے مجبور کئے جانے کے بعد (ان کی لغزشوں کو) بخشنے والا (اور ان پر) رحم فرمانے والا ہے) مراد دوشیزائیں ہیں۔ اور اسی معنی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لونڈی کے بارے میں فیصلہ کیا جسے غلام نے مجبور کیا تھا اور اسے حد نہ لگائی۔ اور علماء اس پر متفق ہیں کہ وہ عورت جسے مجبور کیا گیا، اس پر کوئی حد نہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی عورت حاملہ پائی گئی اور اس کا خاوند نہ ہو اور اس نے کہا: مجھے مجبور کیا گیا تو اس سے وہ قول قبول نہیں کیا جائے گا اور اس پر حد ہوگی، مگر جب اس کے پاس بینہ (گواہ) ہو یا اس نے وہ زخم ظاہر کر دیا جو اسے لگایا گیا یا کوئی شی جو اس کے مشابہ ہو۔ اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کتاب اللہ میں رجم اس پر لازم ہے جس نے مردوں اور عورتوں میں سے زنا کیا بشرطیکہ وہ محصن ہو جبکہ اس پر بینہ قائم ہو جائے یا حمل ظاہر ہو جائے یا وہ اعتراف کر لے۔ ابن منذر نے کہا ہے: پہلے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 12۔ وہ عورت جسے مجبور کیا گیا اس کے لئے مہر کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ پس حضرت عطا اور زہری نے کہا ہے: اس کے لئے مہر مثل ہوگا، اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب اس پر حد قائم کر دی گئی جس نے اس کے ساتھ زنا کیا تو مہر باطل ہو گیا۔ اور یہی حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، اور یہی اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: پہلا قول صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ جب کسی انسان کو اس کے گھر والوں کے اسلام پر ایسی شے کے لئے مجبور کیا گیا جو حلال نہیں تو وہ اسے تسلیم کر لے، اور اپنے آپ کو اسے چھوڑ کر قتل نہ کرے اور اس سے خلاصی اور نجات پانے میں اذیت برداشت نہ کرے۔ اس کی اصل اس روایت میں ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کی اور وہ اس کے ساتھ ایک شہر میں داخل ہوئے اس میں بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ یا جابروں میں سے کوئی جابر تھا تو اس نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ تم اس کو میرے پاس بھیج دو، پس آپ نے اسے بھیج دیا اور خود اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے پس وہ کھڑی ہوئی، وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی۔ اور دعا مانگی: اے اللہ! اگر میں تیرے ساتھ اور تیرے رسول کے ساتھ ایمان لائی ہوں تو مجھ پر اس کافر کو مسلط نہ کرنا۔ پس (اس پر نیند طاری کر دی گئی) اور وہ خراٹے لینے لگا یہاں تک کہ اپنے پاؤں کے ساتھ اس نے دور ہٹا دیا (1)“۔ اور یہ حدیث بھی اس پر دلیل ہے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا پر جب کوئی ملامت نہیں ہے، تو اسی طرح مستکرہ پر بھی کوئی ملامت نہ ہوگی، اور نہ اس میں حد ہوگی جو خلوت میں سے اس سے زیادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 14۔ جہاں تک مُکرَہ کی قسم کا تعلق ہے تو وہ لازم نہیں ہوتی یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور، اور اکثر علماء کے نزدیک ہے۔ ابن ماجشون نے کہا ہے: برابر ہے اس نے ایسی شے کے بارے قسم کھائی جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہو یا ایسی چیز کے بارے میں جو معصیت اور گناہ ہو جب اسے قسم پر مجبور کیا جائے اور یہ اصبغ نے بھی کہا ہے۔ اور مطرف نے کہا ہے: اگر کسی کو ایسی شے کے بارے قسم پر مجبور کیا گیا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو یا اس کے کرنے میں طاعت ہو نہ معصیت تو اس میں قسم ساقط ہو جائے گی، اور اگر اسے ایسی شے میں قسم کھانے پر مجبور کیا گیا جو طاعت ہو مثلاً یہ کہ والی کسی فاسق آدمی کو پکڑ لے اور اسے مجبور کرے کہ وہ طلاق کے ساتھ قسم اٹھائے کہ وہ شراب نہیں پیئے گا یا وہ فسق نہیں کرے گا یا وہ اپنے کام میں بددیانتی نہیں کرے گا یا والد اپنے بیٹے کو ادب سکھانے کے لئے یہ قسم دیتا ہے تو یہ قسم لازم ہو جائے گی، اگرچہ مکرہ ان چیزوں کے بارے میں خطاکار ہو جن کا وہ مکلف اور پابند بنایا جا رہا ہے۔ اور یہی ابن حبیب نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور کوفیوں میں سے آپ کے متبعین نے کہا ہے: بے شک اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر اس نے وہ کیا تو وہ حانث ہو جائے گا، انہوں نے کہا: کیونکہ جس کو مجبور کیا گیا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنی تمام قسموں میں حقیقت کو چھپائے (یعنی توریہ استعمال کرے) اور جب اس نے نہ چھپایا اور نہ اس نے اس کے خلاف نیت کی جس پر اسے مجبور کیا گیا تو تحقیق اس نے قسم کا ارادہ کر لیا۔ اور پہلے فریق کے ائمہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: جب اسے قسم پر مجبور کیا گیا ہے پس تو اس کی نیت اس کے قول کے مخالف ہو گئی کیونکہ وہ مجبور اس شے کے لئے ہے جس پر اس نے قسم کھائی۔

مسئلہ نمبر 15۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: عجیب معاملہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اکراہ کی صورت میں حانث ہونے پر اختلاف کیا ہے کہ کیا اس کے ساتھ حنث واقع ہوگا یا نہیں؟ اور یہ مسئلہ عراقیہ ہے جو ہمارے لئے ان سے چلا ہے، نہ یہ مسئلہ ہو اور نہ وہ ہوں!

اے ہمارے اصحاب کی جماعت! کون سا فرق ہے قسم پر مجبور کرنے کے درمیان اس بارے میں کہ وہ لازم نہیں ہوتی اور حنث کے درمیان اس بارے میں کہ وہ واقع نہیں ہوتا؟ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی بصیرتوں کی طرف رجوع کرو اور اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، باب اذا استکرہت المراۃ علی الزنا، جلد 2، صفحہ 1028

روایت سے دھوکہ نہ کھاؤ کیونکہ یہ درایت میں عیب ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ جب کسی آدمی کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ قسم اٹھائے ورنہ اس کا مال لے لیا جائے گا جیسا کہ ٹیکس وصول کرنے والے اور محصول لینے والوں کا ظلم اور ظلم وزیادتی کرنے والے، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں اس کے لئے کوئی بچاؤ نہیں ہے۔ بے شک آدمی اپنی قسم کے ساتھ اپنے بدن سے تکلیف دور کر سکتا ہے اپنے مال سے نہیں۔ اور ابن ماجشون نے کہا ہے: وہ حانث نہیں ہوگا اگرچہ اس نے اپنے مال سے (نقصان کے خطرہ کو) دور کر دیا اور اسے اپنے بدن پر کوئی خوف نہ ہو۔ اور ابن القاسم نے مطرف کے قول سے کہا ہے، اور انہوں نے اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، اور یہ ابن عبد الحکم اور اصبغ نے کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجشون کا قول صحیح ہے، کیونکہ مال سے نقصان کو دور کرنا جان کی مدافعت کی مثل ہی ہے اور یہی حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور عنقریب آ رہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں۔'' اور مزید فرمایا: ''ہر مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے(1)''۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے اگر کوئی آدمی آئے جو میرا مال اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو تو اسے اپنا مال نہ دے۔'' اس نے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے قتل کر دے۔'' اس نے عرض کی: ''آپ کی کیا رائے ہے اگر وہ مجھے قتل کر دے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس تو شہید ہوگا''۔ اس نے عرض کی: آپ کیا دیکھتے ہیں اگر میں اسے قتل کر دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جہنم میں ہو گا(2)''۔ اسے امام مسلم نے ذکر کیا ہے۔ اور اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اور مطرف اور ابن ماجشون نے کہا ہے: اگر کسی قسم کھانے والے نے ظالم والی کے سامنے قسم کے بارے سوال سے پہلے ہی قسم کھانے میں جلدی کر دی تاکہ وہ اس کے ساتھ اپنے مال اور اپنے بدن میں سے جس پر جو خوف ہے اسے دور کر سکے پس اس نے اس کے لئے قسم اٹھا دی تو وہ اس پر لازم ہو جائے گی۔ اور یہ ابن عبد الحکم اور اصبغ نے کہا ہے۔ اور ابن ماجشون نے بھی اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جسے کسی ظالم نے پکڑ لیا اور اس نے اس کے لئے طلاق البتہ کے ساتھ قسم کھائی اور اس کے بغیر کہ وہ اسے قسم دے اور اس نے اسے چھوڑ دیا حالانکہ وہ جھوٹا ہے، بلاشبہ اس نے یہ قسم اس کے مارنے، قتل کرنے یا اس کا مال لینے کے خوف سے کھائی ہے، پس اگر وہ خوف کے غلبہ اور نجات کی امید کے ساتھ قسم کھانے کے سبب اس کے ظلم سے چھٹکارا پا گیا تو وہ اکراہ میں داخل ہوگا اور اس پر کوئی شے نہ ہوگی، اور اگر اس نے نجات کی امید پر قسم نہ کھائی تو وہ حانث ہوگا۔

مسئلہ نمبر 17۔ محققین علماء نے کہا ہے: جب مکرہ کفر کا تلفظ کرے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر توریہ کے اسے اپنی زبان پر لے آئے)، کیونکہ توریہ میں جھوٹ کی وسعت اور کشادگی ہوتی ہے اور جب اس طرح نہ ہوا تو وہ کافر ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآدب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ، جلد 2، صفحہ 317

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال غیرہ بغیر حق، جلد 1، صفحہ 81

جائے گا، کیونکہ توریہ پر اکراہ کی کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے...... اس کی مثال یہ ہے کہ اس کو کہا جائے: اکفر باللہ (اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کر) تو وہ کہے گا ھو کافر بالنبی، یعنی اسے مشدد کہے گا اور اس کا معنی زمین کی بلند جگہ ہے۔ اور اس پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے جو کھجور کے پتوں سے دسترخوان کی طرح کی چیزیں بنانے کا کام کرتا ہے، پس وہ ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کا اپنے دل سے قصد اور ارادہ کرے گا اور کفر کے گناہ سے بری ہو جائے گی۔ اور اگر اس کو کہا گیا: اکفر بالنبیٔ (ہمزہ کے ساتھ) تو وہ کہے گا: ھو کافر بالنبیٔ اور اس سے ارادہ مخبر کا کرے گا، یعنی کوئی بھی خبر دینے والا ہو جیسا طلیحہ اور مسلیمہ کذاب تھے یا اس سے مراد وہ نبی لے گا جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

فاصبح رَتْمًا دُقاق الحَصَی مکان النبیٔ من الکاثب

مسئلہ نمبر 18۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس آدمی کو کفر پر مجبور کیا گیا لیکن اس نے قتل کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا اجر اس سے زیادہ اور عظیم ہے جس نے رخصت کو اختیار کیا اور اس کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے جسے قتل کے سوا کسی ایسے فعل پر مجبور کیا گیا جو اس کے لئے حلال نہ ہو تو اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں شدت اور سختی کو لینا، اور قتل و ضرب کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک رخصت کو اختیار کرنے سے افضل ہے، اسے ابن حبیب اور سحنون نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن سحنون نے اہل عراق سے ذکر کیا ہے کہ جب کسی کو قتل یا قطع اعضاء یا مارنے کے ساتھ ڈرایا دھمکایا گیا اور اس سے جان ضائع ہونے کا خوف ہو تو اس کے لئے مباح ہے کہ وہ عمل کرے جس پر اسے مجبور کیا گیا ہے، مثلاً شراب پینا یا خنزیر کھانا وغیرہ اور اس نے ایسا نہ کیا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا گیا تو ہمیں اس کے گنہگار ہونے کا خوف ہے کیونکہ وہ مضطر کی طرح ہے۔ اور حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت پیش کی درآنحالیکہ آپ کعبہ معظمہ کے سائے میں چادر کا تکیہ بنائے لیٹے ہوئے تھے میں نے عرض کی: کیا آپ ہمارے لئے مدد طلب نہیں کریں گے، کیا آپ ہمارے لئے دعا نہیں مانگیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کبھی تم میں سے پہلے لوگوں میں سے کوئی آدمی پکڑ لیا جاتا تھا اور اس کے لئے زمین میں گڑھا کھود دیا جاتا، پھر اس میں اسے رکھا جاتا، پھر آرا لایا جاتا اور اسے اس کے سر پر رکھ دیا جاتا اور اسے دو حصوں میں نصف نصف کر دیا جاتا اور لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ اس کے گوشت اور اس کی ہڈیوں کو نوچ لیا جاتا تو یہ چیزیں اسے اپنے دین سے نہ روکتی تھیں، قسم بخدا! یہ امر (دین اسلام) ضرور مکمل ہوگا یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت کی طرف ایک سوار چلے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور اپنے ریوڑ پر بھیڑیئے کے سوا کوئی خوف نہ ہوگا لیکن تم بہت جلد بازی کرتے ہو(1)''۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امم ماضیہ کا یہ وصف بیان کرنا ان کی مدح کے طریقہ پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مکروہ اور تکلیف دہ چیز پر صبر کرنے کے بیان کے لئے ہے، اور یہ کہ انہوں نے ظاہر میں کفر نہیں کیا اور نہ ایمان کو چھپایا تاکہ وہ اپنے آپ سے عذاب اور اذیتیں دور کر لیں۔ اور یہ ان کی دلیل اور حجت ہے جنہوں نے ضرب، قتل اور ذلت و رسوائی کو رخصت پر اور دار الجنان میں رہنے کو ترجیح دی ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ الاخدود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، باب من اختار الضرب والقتل والھون علی الکفر، جلد 2، صفحہ 1027

اور ابو بکر محمد بن محمد بن الفرج بغدادی نے ذکر کیا ہے: انہوں نے بیان کیا، ہمیں شریح بن یونس نے اسماعیل بن ابراہیم سے انہوں نے یونس بن عبید سے اور انہوں نے حسن سے بیان کیا ہے کہ مسیلمہ کے جاسوسوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے دو آدمیوں کو پکڑا اور وہ انہیں مسیلمہ کے پاس لے گئے، تو اس نے ان میں سے ایک کو کہا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا: ہاں۔ پس اس نے اسے چھوڑ دیا، آزاد کر دیا۔ پھر دوسرے آدمی کو کہا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ پھر اس نے پوچھا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ اس نے جواب دیا: میں بہرہ ہوں کچھ نہیں سنتا؛ پس اس نے اسے آگے بلا بھیجا اور اس کی گردن ماردی۔ پس وہ پہلا آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: میں ہلاک ہو گیا! آپ نے فرمایا: ''کس چیز نے تجھے ہلاک کیا ہے؟'' پھر اس نے پوری بات ذکر کی، آپ نے فرمایا: ''جہاں تک تیرے ساتھی کا تعلق ہے تو اس نے یقین اور اعتماد کو اختیار کیا ہے اور تو نے رخصت کو لیا ہے اب اس وقت تو کون سی حالت پر ہے؟ اس نے عرض کی: میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسی حال پر رہ جس پر تو ہے۔''

اس آدمی کے بارے میں رخصت جسے ظالم حکمران نے قسم دی اپنی ذات پر یا اس پر کہ وہ فلاں آدمی پر یا فلاں آدمی کے مال پر اس کی راہنمائی کرے گا۔ تو حسن نے کہا: جب اس پر اور اس کے مال پر خوف ہو تو اسے چاہئے کہ وہ قسم اٹھا دے اور اپنی قسم کا کفارہ نہیں دے گا۔ یہی حضرت قتادہ کا قول ہے جبکہ اس نے اپنی ذات پر یا اپنے ذاتی مال پر قسم کھائی۔ اور اس بارے میں علماء کا نظریہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور موسیٰ بن معاویہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو سعید بن اشرس صاحب مالک سے سلطان تیونس نے ایک آدمی کے خلاف قسم لی سلطان نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا کہ اس نے اسے پناہ نہیں دی ہے، اور نہ یہ اس کی جگہ کو جانتا ہے، تو ابن اشرس نے اس کے لئے قسم دے دی، اور پھر اپنی بیوی کو کہا: تو مجھ سے علیحدہ ہو جا پس وہ اس سے علیحدہ ہو گئی، پھر ابن اشرس سوار ہوا یہاں تک کہ بہلول بن راشد قیروان کے پاس آیا، اور اسے اپنے واقعہ کی خبر دی، تو بہلول نے اسے کہا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے بے شک تو حانث ہے۔ تو ابن اشرس نے کہا: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، اور بلاشبہ میں نے رخصت کا ارادہ کیا ہے، یا اس معنی کی کلام کی، تو بہلول بن راشد نے اس کو کہا: حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے بے شک تجھ پر کوئی حنث نہیں ہے۔ راوی کا بیان ہے: پس ابن اشرس نے اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لیا اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کیا۔

اور عبد الملک بن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ مجھے معبد نے مسیب بن شریک سے اور انہوں نے ابو شیبہ سے بیان کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جسے کسی آدمی کے بدلے پکڑ لیا جاتا ہے، آپ کیا رائے رکھتے ہیں کہ وہ قسم اٹھا دے تا کہ وہ اسے اپنی قسم کے ساتھ بچالے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں، کیونکہ میں ستر قسمیں اٹھاؤں اور انہیں توڑ دوں میرے نزدیک یہ زیادہ پسندیدہ ہے اس سے کہ میں کسی مسلمان پر راہنمائی کروں۔

اور ادریس بن یحییٰ نے کہا ہے کہ ولید بن عبدالملک جاسوسوں کو حکم دیتا تھا وہ رعایا کی جاسوسی کرتے تھے اور خبریں اس کے پاس لاتے تھے، اس نے بیان کیا: پس ان میں سے ایک آدمی رجاء بن حیوہ کے حلقہ میں بیٹھا تو اس نے بعض کو سنا وہ ولید کے بارے میں کچھ اعتراض کر رہے ہیں، پس اس نے وہ خبر ولید تک پہنچائی تو اس نے کہا: اے رجاء! تیری مجلس میں برائی کے ساتھ میرا ذکر کیا گیا اور تو نے اسے تبدیل نہیں کیا؟ تو انہوں نے فرمایا: اے امیر المومنین! ایسا نہیں ہوا۔ تو ولید نے اس کو کہا: کہو: آللہ الذی لا الہ الا ھو (قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں) تو آپ نے کہا: اللہ الذی لا الہ الا ھو (اللہ وہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں)؛ پس ولید نے جاسوس کے بارے حکم دیا اور اسے ستر کوڑے مارے، پس وہ رجا کو ملتا تھا اور کہتا تھا: اے رجا! تیرے وسیلہ سے بارش برستی ہے، اور ستر کوڑے میری پشت پر لگتے ہیں! تو حضرت رجا فرماتے: تیری پشت پر ستر کوڑے لگنا اس سے بہتر ہے کہ ایک مسلمان آدمی کو قتل کر دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 19۔ علماء نے اکراہ کی حد میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: آدمی اپنے بارے میں پر امن نہیں ہوتا جب تو اسے خوفزدہ کرے یا اسے مضبوط باندھ دے یا اسے مارے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کوئی کلام نہیں جو مجھ سے دو کوڑے دور کر سکتی ہو مگر میں وہ کلام کروں گا۔ اور حسن نے کہا: مومن کے لئے احتیاط و بچاؤ یوم قیامت تک جائز ہے، مگر یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قتل میں کوئی احتیاط و بچاؤ نہیں بنایا ہے۔ اور نخعی نے کہا ہے: قید اکراہ ہے اور سجن بھی اکراہ ہے۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، مگر یہ کہ انہوں نے کہا ہے: خوفزدہ کرنے والی وعید بھی اکراہ ہے اگرچہ وہ واقع نہ بھی ہو، جب کہ اس تعدی کرنے والے کا ظلم اور اس کا نفاذ متحقق اور ثابت ہو جس کے ساتھ وہ ڈرا رہا ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک ضرب اور قید میں کوئی مقرر حد نہیں ہے، بلاشبہ ضرب (مار) وہ ہے جو ضرر رساں اور دردناک ہو، اور قید اور جیل وہ ہے جس کی وجہ سے مکرہ پر تنگی واقع ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سلطان اور کسی دوسرے کا اکراہ اکراہ ہی ہے۔ اور کوفیوں نے اختلاف کیا ہے پس انہوں نے شراب پینے اور مردار کھانے پر جیل اور قید کو اکراہ نہیں قرار دیا، کیونکہ ان دونوں سے ضائع اور ہلاک ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے ان دونوں کو کسی کے اس اقرار میں کہ "فلاں کے میرے پاس ہزار درہم ہیں" اکراہ (مجبور کرنا) قرار دیا ہے۔ ابن سحنون نے کہا ہے: اس پر علماء کا اجماع ہے کہ درد اور شدید تکلیف اکراہ ہے یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اکراہ بغیر جان کے ضیاع کے بھی ہو سکتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جسے قسم پر مجبور کیا گیا کسی وعید (دھمکی) یا جیل بھیجنے یا مارنے کی دھمکی کے ساتھ، تو اس کے لئے ہے کہ وہ قسم اٹھا دے اور اس پر حانث ہونا نہیں ہے، یہی امام شافعی، امام احمد، ابوثور اور اکثر علماء رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ اس باب سے یہ ثابت ہوا ہے کہ توریہ میں جھوٹ کی وسعت اور کشادگی ہے۔ اور اعمش نے حضرت ابراہیم نخعی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے جب تیری طرف سے کسی آدمی کو کوئی شے پہنچے کہ تو کہے: قسم بخدا! بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو کچھ اس میں سے میں نے تیرے بارے میں کہا ہے۔ عبدالمالک بن

حبیب نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کچھ میں نے کہا ہے، اور یہ اپنے ظاہر میں قول کی نفی ہے، اور اس پر حنث نہیں ہے جس نے اپنی قسم میں یہ کہا ہے اور نہ اس پر اس کے کلام میں جھوٹ ہے۔ اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کا کلام قسم کو لغو کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنے آپ سے اسے دور ہٹا رہے ہیں، نہ وہ اس میں کوئی کذب اور جھوٹ دیکھتے ہیں اور نہ انہیں اس میں حانث ہونے کا کوئی خوف اور ڈر ہے۔ عبدالمالک نے کہا ہے: وہ کلام میں سے اسے توریہ کا نام دیتے ہیں جب اس میں کوئی مکروفریب نہ ہو اور نہ کسی حق میں دھوکا ہو۔ اور اعمش نے کہا ہے: حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب کوئی آتا تو آپ اس کی طرف نکلنا (اس سے ملاقات کرنا) ناپسند کرتے تھے چنانچہ آپ اپنے گھر کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور اپنی کنیز کو کہہ دیتے: اسے کہہ دو قسم بخدا! وہ مسجد میں ہیں۔ اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت بیان کی ہے کہ وہ لشکر میں سے کسی آدمی کو یہ اجازت دیتے تھے کہ جب وہ اپنے امیر کے پاس پیش ہو تو وہ یہ کہے: قسم بخدا! میں راہ نہیں پا سکتا مگر یہ کہ کوئی دوسرا مجھے سیدھی راہ پر لگائے، اور میں سوار نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ کوئی دوسرا مجھے سوار کرے اور اسی طرح کا اور کلام۔ عبدالملک نے کہا ہے: اس کے قول: غیری سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، وہی اسے سیدھی راہ دکھانے والا ہے اور وہی اسے اٹھاتا ہے (سوار کرتا ہے)؛ پس وہ اس آدمی پر اس کی اس قسم میں حنث نہیں دیکھتے، اور نہ اس کے کلام میں کوئی کذب ہے، اور وہ یہ ناپسند کرتے تھے کہ یہ کلام دھوکہ دہی، ظلم اور حق کے انکار میں کہی جائے پس جس نے یہ جرأت کی اور ایسا کیا تو وہ اپنی دھوکہ دہی میں گنہگار ہوگا اور اس کی قسم میں اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا یعنی اس کے سینے کو کفر قبول کرنے کے سبب وسیع کر دیا، کھول دیا، اور اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا اور یہ قدریہ کا رد کر رہا ہے۔ اور صَدْرًا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور وہ عذاب جہنم ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پسند کر لیا دنیا کی (فانی) زندگی کو آخرت کی (ابدی) زندگی پر اور بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کافر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر اور یہی لوگ (اپنے اعمال کے نتائج سے) غافل ہیں۔ ضرور یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ یعنی اس غضب کی وجہ یہ ہے۔ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا یعنی انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت پر پسند کر لیا۔ وَاَنَّ اللّٰهَ اس میں اَنَّ محل جر میں ہے اور اس کا عطف بِاَنَّهُمْ پر ہے۔ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ پھر ان کا

وصف بیان کیا اور فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی نصیحتوں کو سمجھنے سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ وَ سَمْعِهِمْ اور اللہ تعالیٰ کا کلام سننے سے ان کے کانوں پر وَ اَبْصَارِهِمْ اور آیات کو دیکھنے سے ان کی آنکھوں پر (مہر لگا دی ہے)۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ اور یہی لوگ اس سے غافل ہیں جس کا ان کے بارے ارادہ کیا جا رہا ہے۔ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"پھر بے شک آپ کے پروردگار کا معاملہ ان کے ساتھ جنہوں نے ہجرت کی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد پھر جہاد بھی کیا اور (مصائب میں) صبر سے کام لیا، بے شک آپ کا رب ان آزمائشوں کے بعد (ان کے لئے) بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا یہ سب حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کا معنی ہے انہوں نے جہاد پر صبر کیا؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی جو ہجرت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی طرف نکلے اس کے بعد کہ مشرکوں نے انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کیا اور انہیں اذیتیں دیں، ان کا ذکر اس سورت میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ مرتد ہو گیا تھا اور مشرکین سے جا ملا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اسے قتل کرنے کا حکم دیا، تو اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے پناہ طلب کی پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے پناہ دے دی (1)؛ اسے نسائی نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: سورۃ النحل میں ہے مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ...... تا قولہ...... وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور یہ منسوخ ہو گیا، اور اس میں سے استثناء کی اور فرمایا: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اور یہ وہی عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح ہیں جو مصر پر (حاکم) رہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا پس شیطان نے اسے پھسلا دیا اور وہ کفار کے ساتھ مل گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اسے قتل کرنے کے بارے حکم دیا، تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کے لئے پناہ طلب کی پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پناہ عطا فرما دی۔

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"اس دن کو یاد کرو جب آئے گا ہر نفس کہ جھگڑا کر رہا ہو گا (صرف) اپنے متعلق اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہو گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

1۔ سنن ابی داؤد، باب الحکم فی من ارتد، حدیث نمبر 3792، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا یعنی اس بارے میں بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے یاذکرھم يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا یعنی انہیں یاد دلاؤ اس دن کی جب ہر نفس صرف اپنے متعلق جھگڑا کرتے ہوئے آئے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ہر کوئی قیامت کے دن کہے گا: نفسی نفسی (ہائے میری جان، ہائے میری جان) اور یہ قیامت کے دن کی ہولناکی کی شدت کی وجہ سے ہوگا، سوائے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیونکہ آپ تو اپنی امت کے بارے التجا کر رہے ہوں گے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اے کعب! ہمیں ڈرائیے، ہمیں جوش دلائیے، ہمیں کچھ بیان کیجئے، ہمیں متنبہ کیجئے۔ تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے امیر المومنین! قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم نے قیامت کے دن ستر انبیاء علیہم السلام کے عمل کی مثل بھی اجر پالیا تو پھر بھی تم پر کچھ مراحل ایسے آئیں گے جن میں تمہارے نفس کے سوا کوئی شی تمہیں پریشان اور بے چین نہیں کرے گی، اور بے شک جہنم ایک سانس نکالے گی اور کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی منتخب نبی باقی نہیں رہے گا مگر وہ اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑے گا، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اپنی خلت کا واسطہ دے کر عرض کریں گے: اے میرے رب! بے شک میں تیرا خلیل ابراہیم ہوں، میں آج کے دن سوائے اپنے نفس کے تیری بارگاہ میں کسی کی التجا نہیں کرتا! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے کعب! کتاب اللہ میں تو اسے کہاں پاتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا ہے: قیامت کے دن لوگوں کے ساتھ خصومت اور جھگڑا مسلسل رہے گا یہاں تک کہ روح اور جسم بھی آپس میں جھگڑنے لگیں گے، پس روح کہے گی: اے میرے پروردگار! روح تجھ سے ہے تو نے اسے پیدا فرمایا ہے، میرا کوئی ہاتھ نہیں جس کے ساتھ میں پکڑ سکتی ہوں، میرا کوئی پاؤں نہیں جن کے ساتھ میں چل سکتی ہوں، میری کوئی آنکھ نہیں جس کے ساتھ میں دیکھ سکتی ہوں، کوئی کان نہیں جس کے ساتھ سن سکتی ہوں، اور عقل نہیں جس کے ساتھ کچھ سمجھ سکتی ہوں، یہاں تک کہ میں آئی اور اس جسم میں داخل ہوگئی پس اس پر مختلف انواع کے عذاب کو دوگنا کردے اور مجھے نجات عطا فرما دے؛ اور جسم کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے تخلیق فرمایا ہے تو میں لکڑی کی مثل تھا، میرے لئے ہاتھ نہیں تھا جس کے ساتھ میں پکڑ سکتا، پاؤں نہیں تھے جن کے ساتھ دوڑ سکتا، آنکھیں نہ تھیں کہ ان کے ساتھ دیکھ سکتا، کان نہیں تھے کہ ان کے ساتھ سن سکتا پس یہ (روح) آئی نور کی شعاع کی مثل، پس اس کے سبب میری زبان بولنے لگی، اس کے ساتھ میری آنکھ دیکھنے لگی، اس کے ساتھ میرے پاؤں چلنے لگے اور اس کے ساتھ میرے کان سننے لگے، پس اس پر طرح طرح کے عذاب کو دوگنا کردے اور مجھے اس سے نجات عطا فرما دے۔

راوی نے بیان کیا: پس اللہ تعالیٰ ان دونوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائے گا کہ ایک نابینا اور ایک اپاہج آدمی دونوں ایک ایسے باغ میں داخل ہوئے جس میں طرح طرح کے پھل ہیں، پس اندھا پھل کو دیکھ نہیں سکتا اور اپاہج اسے پا نہیں سکتا، پھر اپاہج نے اندھے کو بلایا: میرے پاس آؤ اور مجھے اوپر اٹھاؤ میں خود بھی کھاؤں گا اور تجھے بھی کھلاؤں گا، پس وہ اس کے قریب آیا اور اسے اوپر اٹھالیا، اور وہ پھل تک پہنچ گئے اور اسے پالیا، پس اب عذاب اور سزا کس پر ہوگی؟ [وہ دونوں کہیں گے: دونوں پر

عذاب ہوگا] تو رب کریم فرمائے گا: تو تم دونوں پر اکٹھا عذاب ہے؛ اسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بکثرت ہر طرف سے پس اس (کے باشندوں) نے ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنادیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً یہ مشرکین کے ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین قریش کے خلاف دعا کی اور عرض کی: ''اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت اور پکڑ سخت کر دے۔ اور ان پر قحط مسلط کر دے حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی طرح (1)''۔ پس وہ قحط میں مبتلا کر دیئے گئے یہاں تک کہ وہ ہڈیاں کھانے لگے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف اناج بھیجا اور وہ ان میں تقسیم کیا گیا۔ كَانَتْ اٰمِنَةً اس کے رہنے والوں کو کوئی اضطراب اور پریشانی نہ تھی۔ يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ یعنی بحر و بر کے راستے سے اس کا رزق اس کے پاس آتا تھا؛ اس کی نظیر یہ آیت ہے: يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ الآیہ (القصص: 57) (کھچے چلے آتے ہیں اس کی طرف ہر قسم کے پھل) فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ اس میں الأنْعُم، النِعمة کی جمع ہے؛ جیسا کہ الأشُدّ، الشِدَّۃ کی جمع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نُعْمٰی کی جمع ہے۔ مثلاً بُؤسٰی کی جمع أبؤس ہے۔ اور اس کفران نعمت سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنا ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے رہنے والوں کو چکھایا۔ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ اس (عذاب) کو لباس کا نام دیا کیونکہ اس سے ان پر کمزوری، رنگ کی تبدیلی، اور بدحالی غالب آنے لگی تو یہ لباس کی طرح ہی ہوگیا۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ یعنی اس کفر و معاصی کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔

حفص بن غیاث، نصر بن عاصم، ابن ابی اسحاق، حسن، اور ابو عمرو اس میں جوان سے عبدالوارث، عبید اور عباس نے روایت کیا ہے الخوفَ منصوب پڑھا ہے اس طرح کہ اس پر أذاقھا کو واقع کیا ہے، اور اس کا عطف لِبَاسَ الْجُوْعِ پر کیا ہے۔ [ای أذاقھا اللہ لباس الجوع] و أذاقھا الخوف۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ عذاب چکھایا کہ انہیں بھوک کا لباس پہنا دیا اور ان پر خوف مسلط کر دیا)۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ان سرایا کو بھیجنا تھا جو ان کا چکر لگاتے تھے۔ اور چکھنا تو دراصل منہ کے ساتھ ہوتا ہے پھر اسے مستعار لیا گیا اور اسے ابتلاء کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اور دوسرے شہروں کے لئے مکہ مکرمہ کی مثال بیان فرمائی یعنی بلاشبہ یہ بیت اللہ اور اس کی مسجد کی عمارت کے جوار میں واقع ہے جب اس کے باسیوں نے کفر کیا، ناشکری کی تو ان پر قحط مسلط ہو گیا تو پھر اس کے سوا دوسرے شہروں کا حال کیا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بستی سے مراد

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ آل عمران، لیس لک من الأمر شیء، جلد 2، صفحہ 655

مدینہ طیبہ ہے، اس کے رہنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اور یہ وہ فتنے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (وصال کے) بعد وہاں ظاہر ہوئے۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ مثال ہر اس بستی کی بیان کی گئی ہے جو تمام بستیوں میں سے اس حال اور صفت پر ہو(1)۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

''اور آیا ان کے پاس رسول انہی میں سے پس انہوں نے اسے جھٹلایا پھر پکڑ لیا انہیں عذاب نے اس حال میں کہ وہ ظلم وستم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بستی مکہ مکرمہ ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ عذاب سے مراد وہ قحط ہے جو مکہ مکرمہ میں واقع ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہاں کی سختیاں اور قحط سالی ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝

''پس کھاؤ اس سے جو رزق دیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے جو حلال (اور) طیب ہے، اور شکر کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ یعنی اے مسلمانوں کے گروہ تم غنائم سے کھاؤ۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف ان پر شفقت اور نرمی کرتے ہوئے کھانا بھیجا، اور یہ اس وقت ہوا کہ جب وہ سات سال تک قحط میں مبتلا رہے اور اہل عرب نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان سے ذخیرہ کی ہوئی خوراک روک لی، تو انہوں نے جلی ہوئی ہڈیاں، مردار، مردہ کتے، چمڑے اور خون میں لتھڑے ہوئے اونٹ کے بال تک کھائے، پھر سرداران مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی جس وقت خوب مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہوئے اور کہنے لگے: یہ تو مردوں کا عذاب ہے اور عورتوں اور بچوں کا حال کیا ہوگا؟ (وقال له ابو سفیان: یا محمد، انك جئت تأمر بصلة الرحم والعفو، وإن قومك قد هلكوا: فادع الله لهم۔ فدعا لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم، و أذن للناس بحمل الطعام اليهم وهم بعد مشركون)۔ اور ابوسفیان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کی: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک آپ تشریف لائے اور آپ صلہ رحمی اور عفو و درگزر کا حکم دیتے ہیں، اور بے شک آپ کی قوم ہلاک ہوگئی ہے، سو آپ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا فرمائی اور لوگوں کو طعام ان کی طرف لانے کی اجازت عطا فرمائی اور وہ اس کے بعد بھی شرک کرتے رہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 217

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَ الدَّمَ وَ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اس نے تم پر حرام کیا صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر بلند کیا گیا ہو غیر اللہ کا نام ذبح کے وقت، پس جو مجبور ہو جائے (ان کے کھانے پر بشرطیکہ) وہ لذت کا جویا نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو (تو کوئی حرج نہیں) بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔''

اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُکُمُ الۡکَذِبَ ہٰذَا حَلٰلٌ وَّ ہٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ؕ مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۪ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۱۷﴾

''اور نہ بولو جھوٹ جن کے بارے میں تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے اس طرح تم افتراء باندھو گے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا، بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ (وہ) تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں (انجام کار) ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِمَا تَصِفُ یہاں مَا مصدر یہ ہے، ای لوصف (السنتکم) (تمہاری زبانوں کے بیان کی وجہ سے) اور کہا گیا ہے کہ یہ لام لام سببیہ اور اجلیہ ہے، یعنی تم نہ کہو اپنے بیان کی وجہ سے الۡکَذِبَ (جھوٹ) یہ حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہے، یعنی لما تصف السنتکم من الکذب اور اسے الکُذُبُ کاف، ذال، اور با کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور یہ السنۃ کی صفت ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن نے یہاں خاص طور پر الکَذِبِ کاف کے فتحہ اور ذال اور با کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لِمَا کی صفت ہے، تقدیر کلام ہے: ولا تقولوا الوصف ألسنتکم الکذبِ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ما سے بدل ہونے کی بنا پر مجرور ہے یعنی ولا تقولوا للکذب الذی تصفہ ألسنتکم۔ (اور تم اس جھوٹ کو نہ کہو جسے تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں)، ہٰذَا حَلٰلٌ وَّ ہٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ الآیہ۔ یہ خطاب ان کفار کو ہے جنہوں نے بحائر اور سوائب جانوروں کو حرام قرار دیا اور انہیں حلال قرار دیا جو ابھی چوپاؤں کے پیٹوں میں تھے اگرچہ وہ مردہ ہوں۔ پس قول باری تعالیٰ: ہٰذَا حَلٰلٌ یہ اشارہ ان مردہ جانوروں کی طرف ہے جو ابھی چوپاؤں کے پیٹوں میں ہوں، اور ہر اس کی طرف جسے انہوں نے حلال قرار دیا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَّ ہٰذَا حَرَامٌ یہ اشارہ بحائر اور سوائب اور ہر اس کی طرف ہے جسے انہوں نے حرام قرار دیا۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ یعنی اس میں ان کے لئے جو دنیوی نعمتیں اور فوائد ہیں وہ عنقریب

زائل ہو جائیں گے، ختم ہو جائیں گے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یعنی ان کے فوائد قلیل فوائد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لئے تھوڑا سا فائدہ ہے پھر وہ دردناک عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے: ہمیں ہارون نے حفص سے اور انہوں نے اعمش سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابراہیم کو کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں سنا یہ حلال ہے اور نہ یہ سنا کہ یہ حرام ہے، بلکہ وہ یہ کہتے تھے: وہ ناپسند کرتے تھے اور وہ پسند کرتے تھے۔ اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لوگوں میں اہل فتویٰ یہ نہیں کہتے: یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں تم اس اس سے بچو۔ (اِیاکم کذا و کذا) اور میرے لئے نہیں کہ میں ایسا کروں۔

ولم أکن لأصنع ھذا اور اس کا معنی یہ ہے کہ کسی کو حلال قرار دینا اور کسی کو حرام قرار دینا بلاشبہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اور کسی اور کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ یہ کہے یا اعیان میں سے کسی معین چیز کے بارے اس کی تصریح کرے مگر یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی شے کے بارے اس کی خبر دے۔ اور وہ شے جس کے بارے میں اجتہاد اس تک پہنچائے کہ یہ حرام ہے اس کے بارے کہے: إنی أکرہ کذا۔ (بے شک میں اسے ناپسند کرتا ہوں، مکروہ قرار دیتا ہوں) اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس میں اپنے متقدمین اہل فتویٰ کی اقتدا کرتے تھے۔ پس اگر کہا جائے: تحقیق انہوں نے اس کے بارے میں کہا ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: انت علی حرام (تو مجھ پر حرام ہے) بے شک وہ حرام ہو جاتی ہے اور تین طلاقیں ہو جاتی ہیں (1)۔ تو جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک وہ حرام ہے، تو انہوں نے آپ کی ہی اقتدا کی۔ کبھی مجتہد کے نزدیک تحریم پر دلیل قوی ہوتی ہے تو اس وقت اس کے حرام کہنے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ وہ چھ معین اشیاء کے سوا میں کہتے کہ سود (ربوا) حرام ہے، اور بسا اوقات اس پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کا اطلاق کرتے ہیں، پس حرام کہنا موپذیر اموال میں اور ان امور میں جو مصالح کے خلاف ہوں مناسب نہیں ہے۔ اور آپ نے زیر بحث مسئلہ میں مقصد کے حصول کے لئے دلائل کی قوت کے ساتھ دامن بچالیا۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

"اور یہودیوں پر ہم نے حرام کر دیں وہ چیزیں جن کا ذکر ہم آپ سے پہلے کر چکے ہیں، اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا بیان فرمایا کہ چوپائے اور کھیتی اس امت کے لئے حلال ہے، اور رہے یہودی تو ان پر ان میں سے کچھ چیزیں حرام ہیں۔ حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ یعنی سورۃ الانعام میں ہم ان کا ذکر آپ سے کر چکے ہیں۔ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ اور جو چیزیں ہم نے ان پر حرام کی ہیں ان کو حرام کرنے کے ساتھ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1183

نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے پس ہم نے بطور سزا ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں، جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

"پھر بے شک آپ کا رب ان کے لئے جنہوں نے غلطی کی (لیکن) نادانی سے پھر انہوں نے توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنے آپ کو سنوار لیا، بے شک آپ کا پروردگار اس کے بعد (ان کے گناہوں کو) بہت بخشنے والا (اور ان پر) نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ اس میں سوء سے مراد شرک ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

"بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کو ملت (دین) ابراہیم علیہ السلام کی طرف دعوت دی، کیونکہ آپ ان کے اباء اور اس گھر کے بانی تھے جس کے ساتھ انہیں عزت حاصل تھی۔ اور الامۃ سے مراد وہ کامل مرد ہے جو خیر اور بھلائی کی صفات کا جامع ہو۔ اور اسے جن جن معنوں پر محمول کیا جا سکتا ہے وہ پہلے گزر چکے ہیں۔ اور ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ مجھ تک خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت معاذ پر رحم فرمائے! وہ امۃ قانتاً (مرد کامل اللہ تعالیٰ کے مطیع) تھے۔ تو آپ کو کہا گیا: اے ابا عبدالرحمن! بے شک اللہ عزوجل نے تو اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک امت سے مراد وہ ہے جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے، اور بے شک قانت وہ ہے جو مطیع و فرمانبردار ہو (1)۔ تحقیق قنوت کا معنی سورۃ البقرہ میں اور حَنِيْفًا کا معنی سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

"وہ (ہر لحہ) شکر گزار تھے اللہ تعالیٰ کی (پیہم) نعمتوں کے لئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور انہیں ہدایت فرمائی سیدھے راستہ کی طرف۔ اور ہم نے مرحمت فرمائی انہیں دنیا میں بھی (ہر طرح کی) بھلائی اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔"

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1184

قولہ تعالیٰ: شَاكِرًا یعنی وہ شکر گزار تھے۔ لِّاَنْعُمِهٖ، الأنعم نِعمة کی جمع ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے اِجْتَبٰىهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا۔ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (اور انہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرمائی۔ اور ہم نے انہیں مرحمت فرمائی دنیا میں بھی (ہر طرح کی بھلائی)۔ کہا گیا ہے: اس سے مراد نیک طیب بچہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: مراد اچھی تعریف ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ مراد نبوت ہے (1)۔ یہ قول بھی ہے: مراد یہ ہے کہ تشہد میں حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے ساتھ آپ پر درود پڑھنے کو ملا دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اہل دین نہیں ہیں مگر وہی جو آپ کے ساتھ محبت اور دوستی رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ آپ کی ضیافت (مہمان نوازی) اور آپ کی قبر کی زیارت کو باقی رکھا (2)۔ اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور زیادہ عطا فرمائیں۔ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اس میں مِنْ بمعنی مع ہے، ای مع الصالحین یعنی وہ آخرت میں نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے، کیونکہ وہ دنیا میں بھی نیک لوگوں کے ساتھ تھے۔ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۲۳

”پھر ہم نے وحی فرمائی (اے حبیب!) آپ کی طرف کہ پیروی کرو ملت ابراہیم کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مناسک حج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سکھائے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتوں سے برأت اختیار کرنے اور اسلام سے آراستہ اور مزین ہونے میں آپ علیہ السلام کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین میں آپ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے سوائے ان احکام کے جنہیں چھوڑنے کا آپ کو حکم دیا گیا؛ یہی بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، جیسا کہ ماوردی نے اسے بیان کیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ عقائد شرع میں اتباع کا حکم ہے نہ کہ فروعات میں، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لئے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ۔)

مسئلہ۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ افضل کا مفضول کی اتباع کرنا جائز ہے، جبکہ وہ راہ صواب اور اس کے مطابق عمل کرنے میں مقدم اور پہلے ہو، اور اس میں فاضل (فضیلت رکھنے والا) پر کوئی تاوان نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں، حال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام: 90) (تو انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 219　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۴﴾

''صرف ان لوگوں پر سنیچر کی پابندی تھی جنہوں نے اختلاف کیا تھا اس میں، اور بلاشبہ آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت ان امور کے متعلق جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی (یہ پابندی) نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں تھی اور نہ ان کے دین میں، بلکہ وہ تو بڑا وسیع تھا اس میں کوئی مشکل اور سختی نہ تھی۔ اور سنیچر کی پابندی اور سختی یہودیوں پر تھی اس لئے کہ کاروبار چھوڑنے اور معاش میں پھیلاؤ ترک کرنے کے بارے میں اس میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا (اسی سبب سے ان پر سنیچر کی پابندی عائد کردی گئی)، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جمعہ کے دن کے ساتھ آئے اور فرمایا: ہر سات دنوں میں سے ایک دن عبادت کے لئے فارغ رہو۔ تو انہوں نے کہا: ہم نہیں چاہتے کہ ان کی عید ہماری عید کے بعد ہو، پس انہوں نے اتوار کا دن پسند کیا (اور اسے منتخب کرلیا) ان میں جو اختلاف واقع ہوا اس کی کیفیت میں علماء کے مابین اختلاف ہے؛ چنانچہ ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جمعہ کے دن کے بارے حکم ارشاد فرمایا اور اسے ان کے لئے معین کردیا۔ اور انہیں دوسرے دنوں پر اس کی فضیلت کے بارے میں بھی آگاہ کیا، لیکن انہوں نے آپ سے مناظرہ اور مباحثہ کیا کہ سنیچر کا دن افضل ہے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ارشاد فرمایا: ''تم انہیں اور اسے جو انہوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے چھوڑ دو'' اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے معین نہیں فرمایا، بلکہ آپ نے انہیں یوم جمعہ کی تعظیم کی خاطر اس کا حکم دیا پس ان کا اجتہاد اس کی تعیین میں مختلف ہوگیا، تو یہودیوں نے سنیچر کا دن معین کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دن (کائنات) کی تخلیق سے فارغ ہوا۔ اور عیسائیوں نے اتوار کا دن معین کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دن (کائنات کی) تخلیق کا آغاز کیا۔ پس ان میں سے ہر گروہ کو اسی دن کے ساتھ لازم کردیا گیا جس تک اس کے اجتہاد نے انہیں پہنچایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے جمعہ کا دن معین فرمایا بغیر اس کے کہ وہ انہیں ان کے اجتہاد کے حوالے کرے یہ اس کی طرف سے فضل واحسان ہے، پس یہ امت ہونے کے اعتبار سے تمام امتوں سے بہتر ہے۔ اور صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم آخر میں آنے والے قیامت کے دن اول ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے مگر یہ کہ انہیں کتاب ہم سے پہلے دی گئی ہے اور ہمیں وہ ان کے بعد عطا کی گئی ہے پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے ہماری راہنمائی فرمادی جس میں حق میں سے انہوں نے اختلاف کیا، پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت (اور راہنمائی) فرمادی...... فرمایا جمعہ کا دن ...... پس آج کا دن ہمارے لئے ہے اور آنے والا کل (سنیچر کا دن) یہودیوں کے لئے ہے اور اس کے بعد (اتوار) کا دن عیسائیوں کے لئے ہے''(1)۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول: ''پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے'' ان کے قول کو تقویت دیتا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، باب فرض الجمعہ لقول اللہ تعالیٰ، جلد 1، صفحہ 120

جنہوں نے یہ کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اسے معین نہیں کیا، کیونکہ اگر یہ ان کے لئے معین کیا جاتا اور پھر وہ سرکشی کرتے تو اخْتَلَفُوْا نہ کہا جاتا، بلکہ یہ کہا جانا زیادہ موزوں اور مناسب تھا فخالفوا فیہ وعاندوا۔ (پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور سرکشی کی)۔ اور جو چیزیں اسے تقویت دیتی ہیں ان میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے انہیں جمعہ سے غافل اور گمراہ کر دیا جو ہم سے پہلے تھے۔'' اور یہ اس معنی میں نص ہے۔ اور اس کے بعض طرق میں یہ آیا ہے: ''پس یہ ان کا وہ دن ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا (اور) انہوں نے اس میں اختلاف کیا(1)''۔ اور یہ پہلے قول کی حجت اور دلیل ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر جمعہ فرض کیا جو ہم سے پہلے تھے پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے لئے ہدایت عطا فرما دی پس اس میں لوگ ہماری اتباع کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مراد جمعہ کے دن میں اختلاف کا ہونا ہے، جیسا کہ ہم اسے بیان کر چکے ہیں، انہوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختلاف کیا۔ اور اس کی اپنے ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو آپ کے ساتھ اختلاف کرنے سے ڈرایا کہ ان پر بھی ایسی سختی اور پابندی عائد کر دی جائے گی جیسا کہ یہودیوں پر پابندی لگائی گئی ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

''(اے محبوب!) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اس کے راستہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ آیت مکہ مکرمہ میں قریش کی صلح کے بارے معاملات کرنے کے وقت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی شریعت کی طرف بڑی شفقت اور نرمی کے ساتھ دعوت دیں نہ کہ درشتی اور سختی کے ساتھ، اور اسی طرح قیامت کے دن تک مسلمانوں کو وعظ ونصیحت کرنی چاہئے۔ پس یہ آیت موحدین میں سے گنہگاروں اور نافرمانوں کے اعتبار سے محکم ہے، اور کافروں کے حق میں قتال کرنے کے بارے منسوخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ جسے یہ احوال کفار میں سے کسی پر قدرت دیں اور بغیر قتال کے اس کے ایمان کی امید کی جا سکتی ہو تو یہ آیت اس کے بارے میں محکم ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1186-1185

''اور اگر تم (انہیں) سزا دینا چاہو، تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے اور اگر تم (ان کی ستم رانیوں پر) صبر کرو تو یہ صبر ہی بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جمہور علمائے تفسیر نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا غزوہ احد کے دن مثلہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور یہ صحیح بخاری اور کتاب السیر میں موجود ہے۔ اور نحاس اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے، اور اس کا معنی اس کے ماقبل مکی آیت کے ساتھ انتہائی خوبصورت اتصال کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ رفتہ رفتہ رتبے ان لوگوں سے جنہیں دعوت دی جاتی ہے اور نصیحت کی جاتی ہے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کے ساتھ مناظرہ اور مباحثہ کیا جاتا ہے، اور پھر ان کی طرف جنہیں ان کے فعل پر جزا دی جائے گی، لیکن جو جمہور نے روایت کیا ہے وہ زیادہ پختہ اور ثابت ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب مشرکین مقتولین احد سے واپس پھرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف گئے اور انتہائی بھیانک اور دردناک منظر دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کا پیٹ چاک کر دیا گیا ہے، ان کی ناک کاٹ لی گئی ہے، اور ان کے کان بھی کاٹ لئے گئے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر عورتیں غمزدہ نہ رہتیں یا میرے بعد یہ سنت نہ بن جاتی تو میں انہیں چھوڑ دیتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں درندوں اور پرندوں کے شکموں سے دوبارہ زندہ کرتا میں ضرور ان کی جگہ ستر افراد کا مثلہ کروں گا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چادر منگائی اور اس کے ساتھ ان کے چہرے کو ڈھانپ دیا، اور آپ کے پاؤں اس سے باہر نکل گئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا چہرہ ڈھانپ دیا اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دی، پھر انہیں سامنے رکھا اور ان پر دس تکبیریں کہیں۔ بعد ازاں ایک ایک شہید کو لایا جاتا اور اسے وہاں رکھا جاتا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ پر رہنے دیا گیا، یہاں تک کہ آپ پر ستر مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی، اور شہدائے احد بھی ستر تھے، پس جب وہ دفن کر دیئے گئے اور آپ ان سے فارغ ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ لَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبر کیا اور کسی کا مثلہ نہ کیا۔ اسے اسماعیل بن اسحاق نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث زیادہ مکمل ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک گروہ سے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے ساتھ مظالم کئے گئے کہ جب انہیں اپنے ساتھ ظلم کرنے والے پر قدرت حاصل ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ اس کے ظلم کی مثل ہی سلوک کریں اس سے زیادہ کی طرف تجاوز نہ کریں۔ اسے ماوردی نے ابن سیرین اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اہل علم نے اس کے بارے اختلاف کیا ہے کہ جس آدمی پر کسی نے مال چھین کر ظلم کیا پھر ظالم نے اسی مظلوم کو مال پر امین بنا دیا، کیا اس کے لئے اس میں اتنی مقدار خیانت جائز ہے جتنا اس نے اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی کی

ہے؟ تو ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے؛ ان میں حضرت ابن سیرین، حضرت ابراہیم نخعی، سفیان اور حضرت مجاہد ہیں اور انہوں نے اس آیت اور اس کے عموم لفظ سے استدلال کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: اس کے لئے خیانت کرنا جائز نہیں ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''اس تک امانت پہنچا دے جس نے تجھے امین بنایا ہے اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تیرے ساتھ خیانت کی ہے۔'' اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ مکمل بحث گزر چکی ہے۔

اور مسند ابن اسحاق میں ہے کہ یہ حدیث اس آدمی کے بارے میں وارد ہوئی ہے جس نے کسی دوسرے آدمی کی بیوی کے ساتھ زنا کیا، پھر اس دوسرے نے اس کی بیوی پر قدرت پالی اس طرح کہ اس نے بیوی کو اس کے پاس چھوڑا اور خود سفر پر چلا گیا، پس اس آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: أد الامانة الی من ائتمنك ولا تخن من خانك (1)۔ اور اسی بنا پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مال کے بارے میں قوی ہو جاتا ہے، کیونکہ خیانت اس میں لاحق ہو چکی ہے، اور یہ ایسی رذالت اور کمینگی ہے جس سے وہ جدا اور الگ نہیں ہو سکتا، پس چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے۔ اور اگر وہ مال سے حق لینے پر قادر ہو تو وہ اس پر امین نہ بنے تو یہ اس کے جائز ہونے کے مشابہ ہوگا، گویا اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ اگر کوئی حاکم سے حکم اور فیصلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ قصاص میں تماثل اور برابری جائز ہے، پس جس نے لوہے کے ساتھ قتل کیا اسے اسی کے ساتھ قتل کیا جائے، اور جس نے پتھر کیساتھ قتل کیا اسے پتھر کے ساتھ قتل کیا جائے، اور واجب مقدار سے تجاوز نہیں کیا جائے گا، اور یہ بحث مکمل طور پر سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے، والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اذیتوں کو عقوبت کا نام دیا ہے، حالانکہ حقیقۃً عقوبت وہ ہے جو دوسری ہے (یعنی اذیت کے مقابلے میں جو سزا دی جائے وہ عقوبت کہلاتی ہے)، تو بے شک ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ دونوں لفظ برابر ہو جائیں اور تاکہ قول کا آغاز اس کے مناسب ہو جائے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے ان اقوال کے برعکس ہے: وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ (آل عمران: 54) اور اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ: 15) کیونکہ ان میں دوسرا لفظ مجاز ہے اور پہلا حقیقت ہے؛ یہ ابن عطیہ نے کہا ہے (2)۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾

''اور آپ صبر فرمایئے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور رنجیدہ نہ ہوا کریں ان (کی ہٹ دھرمی) پر اور نہ غمزدہ ہوا کریں ان کی فریب کاریوں سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے)

1۔ تاریخ دمشق الکبیر، جلد 4، صفحہ 359، دار المسیرہ بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 432

ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔"

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ ابن زید نے کہا ہے: یہ آیت آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے (1)۔ اور جمہور لوگ اس پر ہیں کہ یہ محکم ہے، یعنی آپ اس کی مثل سزا دینے سے عفو و درگزر کے ساتھ صبر کیجئے جیسی انہوں نے مثلہ وغیرہ کے ساتھ سزا دی۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ یعنی آپ شہدائے احد پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ، ضیق ضیقة کی جمع ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كَشَفَ الضَّيقَةَ عَنَّا وَ فَسَحَ (2)

(اس نے ہم سے تنگی دور کردی اور وسعت و خوشحالی عطا کردی)

اور جمہور کی قرأت ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابن کثیر نے ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے نافع سے روایت کیا گیا ہے، اور یہ اس کی غلطی ہے جس نے اسے روایت کیا ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے: ضاد میں فتحہ اور کسرہ مصدر میں دونوں لغتیں ہیں۔ اخفش نے کہا ہے: الضَّيق اور الضِّيق ضاق يضيق کا مصدر ہے۔ اور اس کا معنی ہے: آپ کا سینہ ان کے کفر سے تنگ نہ ہو (یعنی آپ پریشان نہ ہوں) اور فراء نے کہا ہے: الضَّيق وہ ہے جس پر تیرا سینہ تنگ ہو جائے، اور الضِّيق وہ ہے جو اس شی میں ہوتی ہے جو وسیع اور تنگ ہوتی رہتی ہے: مثلاً گھر اور کپڑا وغیرہ۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: یہ دونوں لفظ مساوی اور برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: في صدره ضَيق و ضِيق (اس کے سینے میں تنگی ہے) اور قتبی نے کہا ہے: ضَيْق ضيّق کا مخفف ہے، یعنی لا تكن في أمر ضيّق (تو کسی تنگ معاملے میں نہ پڑ) پھر اس میں تخفیف کردی گئی، جیسا کہ هَيْن اور هَيِّن ہیں۔ اور ابن عرفہ نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: ضاق الرجل تب جب آدمی بخیل ہو جائے، اور أضاق تب جب وہ محتاج ہو جائے۔ اور قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو اس کی مدد و نصرت، معاونت، فضل، نیکی اور اس کی تائید کے ساتھ فواحش اور کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ اور احسان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہرم بن حبان کو ان کی موت کے وقت کہا گیا: ہمیں کوئی وصیت فرمایئے، تو انہوں نے کہا: میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی آیات اور سورۃ النحل کے آخر کی وصیت کرتا ہوں: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ سے تا آخر۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 221 2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 234

سورۃ الاسراء

آیاتہا ۱۱۱ ۱۷ سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ ۵۰ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ سورت مکی ہے سوائے تین آیات کے (اور وہ یہ ہیں) قول باری تعالیٰ: وَ اِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اور اس وقت یہودیوں نے کہا: یہ انبیاء علیہم السلام کی زمین نہیں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ الآیہ۔ اور مقاتل نے کہا ہے: اور یہ قول باری تعالیٰ بھی: اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖٓ الآیہ۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم کے بارے میں کہا ہے: بے شک یہ عتاق اوّل میں سے ہیں، اور یہ میری پرانی کمائی میں سے ہیں (1)۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

"(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک بابرکت بنا دیا ہم نے جس کے گرد و نواح کو تاکہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں، بے شک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں: (☆)

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: سُبْحٰنَ۔ سبحان اسم ہے جو مصدر کی جگہ رکھا گیا ہے، اور یہ غیر متمکن ہے، کیونکہ اس میں وجوہ اعراب جاری نہیں ہو سکتیں، اور نہ اس پر الف لام داخل ہو سکتا ہے، اور نہ اس سے فعل آتا ہے، اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائدہ تان ہے، تو کہتا ہے: سبّحتُ تسبیحا و سُبحانا، جیسا کہ کفّرتُ الیمین تکفیرا و کفرانا ہے۔ اور اس کا معنی ہے التنزیہ و البراۃ للہ عزوجل من کل نقص (ہر نقص سے اللہ تعالیٰ کی برأت اور پاکی بیان کرنا ہے)۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر عظیم ہے اس کے سوا کوئی اور اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اور رہا شاعر کا یہ قول:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 434

☆ نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے تاہم مسائل چھ ہیں۔ مترجم

أقول لمّا جاءني فخرُه سُبحانَ مِن علقمة الفاخِرِ(1)

تو بلاشبہ شاعر نے یہ بطریق نادر ذکر کیا ہے۔ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ الفیاض رضی اللہ عنہ جو کہ اصحاب عشرہ میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: سبحان اللہ کا معنی کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تنزیه الله من کلّ سُوءٍ(2) (اللہ تعالیٰ کو ہر کمزوری اور نقص سے پاک قرار دینا)۔ سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل وہ فعل ہے جو اس کا ہم معنی ہو نہ کہ اس کے لفظوں سے ہو، جبکہ اس کے لفظ سے فعل آتا ہی نہیں، اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قعد القرفصاء (وہ اپنے ہاتھوں کے ساتھ احتباء کی حالت میں بیٹھا) اور اشتمل الصّماء (وہ کپڑے میں مکمل طور پر لپٹ گیا) (دونوں مثالوں میں دونوں فعل ہم معنی ہیں) پس ان کے نزدیک تقدیر عبارت یہ ہے: أنزه الله تنزیها، تو "سبحان الله" آپ کے قول تنزیھا کی جگہ واقع ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: أَسْرَى بِعَبْدِهٖ۔ أسری میں دو لغتیں ہیں: سری اور أسری، جیسا کہ سقی اور أسقی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أسرت علیه من الجوزاء ساریةٌ تُزجی الشّمال علیه جامدَ البَرد

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

حَیِّ النَّضیرة ربة الخِدْرِ أسرت إلیّ ولم تکن تَسْری

دونوں شعروں میں دونوں لغتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور اسراء کا معنی رات کو چلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: سَریت مَسْرًی وَ سُرًی، اور أسریت إسراءً۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ولیلة ذات ندًی سریتُ ولم یَلِتنِی من سُراها لَیتُ (3)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: أسریٰ وہ رات کے پہلے حصہ میں چلا۔ اور سَرَیٰ وہ رات کے آخری حصہ میں چلا۔ پہلا قول زیادہ معروف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: بِعَبْدِهٖ علماء نے کہا ہے: اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور اسم گرامی اس سے اشرف ہوتا تو یقیناً اس حالت علیا میں اللہ تعالیٰ آپ کا ذکر اس کے ساتھ فرماتا۔

اور اس معنی میں انہوں نے یہ شعر بیان کیے ہیں:

یاقومِ قلبی عند زهراءِ یعرفه السامع والرائی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 223
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 435
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 224

لا تدعنی الا بیا عبدھا فانہ أشرف أسمائی (1)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بارگاہ عالی کی طرف اٹھایا، اور آپ کو ستاروں کی بلندی سے بھی اوپر لے گیا، تو امت کے سامنے تواضع کے لئے آپ کا ذکر اسم عبودیت کے ساتھ فرمایا۔

مسئلہ نمبر 4۔ تمام کتب حدیث میں اسراء ثابت ہے، اور جملہ اطراف اسلام میں یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے پس یہ اس وجہ سے متواتر اخبار میں سے ہے، اور نقاش نے اس سے ذکر کیا ہے جس نے اسے بیس صحابہ کرام سے روایت کیا ہے۔ اور صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا اور یہ سفید رنگ کا طویل جانور ہے جو گدھے سے بڑا ہے اور خچر سے ذرا کم ہے وہ اپنا پاؤں اپنی حد نظر پر رکھتا ہے...... فرمایا...... پس میں اس پر سوار ہوا یہاں تک کہ میں بیت المقدس میں آ گیا...... فرمایا...... پھر میں نے اسے اس حلقہ کے ساتھ باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام سواریاں باندھتے تھے...... فرمایا...... پھر میں مسجد میں داخل ہوا اور میں نے اس میں دو رکعتیں نماز پڑھی پھر میں (باہر) نکلا تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لے کر آئے تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے...... فرمایا...... پھر وہ ہمارے ساتھ آسمان کی طرف چڑھے...... (2)'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور ان روایات میں سے جو صحیحین میں نہیں ہیں وہ ہے جسے آجری اور سمرقندی نے ذکر کیا ہے، آجری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس قول باری تعالیٰ کے تحت ذکر کیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے بارے بتایا جس میں آپ کو سفر معراج پر لے جایا گیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس ایک جانور لایا گیا جو جانوروں میں سے خچر کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا تھا اس کے دونوں کان حرکت کر رہے تھے اور وہ وہی براق ہے جس پر اس سے قبل انبیاء علیہم السلام سواری کرتے تھے پس میں اس پر سوار ہوا اور وہ چل پڑا وہ اپنا قدم انتہا نگاہ پر رکھتا تھا پس میں نے اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ دریافت کر لوں، پس میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا (کوئی توجہ نہ دی) پھر میں نے اپنی بائیں جانب سے ایک ندا سنی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں، لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا پھر میرے سامنے ایک عورت آئی جس پر دنیا کی ہر زینت و آرائش تھی وہ اپنا ہاتھ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں، لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پھر میں بیت المقدس مسجد اقصیٰ آیا اور اس جانور سے اتر گیا اور میں نے اسے اسی حلقے سے باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام باندھتے تھے۔ بعد ازاں میں مسجد میں داخل ہوا اور اس میں نماز پڑھی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم نے کیا سنا ہے! تو میں نے کہا: میں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1192 2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 387، حدیث 3184

اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر جایئے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں لیکن میں چلتا رہا اور اس پر اعتماد نہ کیا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ یہود کی دعوت دینے والا تھا۔ اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت یہودی ہو جاتی ...... فرمایا ...... پھر میں نے ایک ندا اپنی بائیں جانب سے سنی ہے ٹھہر جایئے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں لیکن میں چلتا رہا اور اس پر اعتماد نہ کیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ عیسائیت کی دعوت دینے والا تھا۔ بلاشبہ اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت عیسائی ہو جاتی ...... فرمایا ...... پھر میرے سامنے ایک عورت آئی اس پر دنیا کی ہر قسم کی زیب و زینت تھی وہ اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی ٹھہر جایئے لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ دنیا تھی اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے۔ اور اسے پسند کرتے ...

فرمایا ...... پھر میرے پاس دو برتن لائے گئے ان میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی، سو مجھے کہا گیا: پکڑو اور پیو جسے چاہو، تو میں نے دودھ لے لیا اور اسے پیا، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے کہا: آپ نے فطرت کو اپنا لیا ہے اور اگر آپ شراب لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ پھر وہ سیڑھی (معراج) لے کر آئے جس کے ساتھ بنی آدم کی ارواح اوپر چڑھتی ہیں تو وہ اس سب سے حسین تھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا، کیا تم نے مرنے والے کی طرف نہیں دیکھا وہ کیسی تیز نظر سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر ہمیں اوپر لے جایا گیا یہاں تک کہ ہم آسمان دنیا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے کھولنے کو کہا تو پوچھا گیا: یہ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جبریل۔ انہوں نے پوچھا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہوں نے پوچھا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ پس انہوں نے میرے لئے دروازہ کھولا اور مجھے سلام کیا وہاں آسمان کا محافظ فرشتہ تھا اس کو اسماعیل کہا جاتا ہے اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تھے اور ہر فرشتے کے ساتھ ایک لاکھ تھے ...... فرمایا وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (المدثر: 31) (اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے) اور آگے حدیث ذکر کی یہاں تک کہ فرمایا: ''پھر ہم پانچویں آسمان پر پہنچے تو وہاں میری ملاقات حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام سے ہوئی وہ اپنی قوم میں بڑے محبوب تھے اور ان کے اردگرد ان کی امت کے کثیر متبعین تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا وصف بیان کیا اور فرمایا: ان کی ریش مبارک طویل تھی حتیٰ کہ وہ ان کی ناف تک پہنچنے کے قریب تھی، پھر ہم چھٹے آسمان کی طرف چلے تو وہاں میرے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے انہوں نے مجھے سلام پیش کیا اور مرحبا کہا ...... حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا وصف بیان کیا اور فرمایا ... وہ بہت زیادہ بالوں والے آدمی تھے اگر ان پر دو قمیصیں بھی ہوتیں تو ان سے ان کے بال باہر نکلے رہتے ... ''الحدیث۔

اور بزار نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گھوڑا لایا گیا اور آپ کو اس پر سوار کیا گیا۔ اس کا ہر قدم اپنی حد نگاہ پر پڑتا تھا ...... اور آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں براق کی صفت میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اثنا میں کہ میں حجر میں سویا ہوا تھا کہ اچانک میرے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے میرے پاؤں کو حرکت دی تو میں نے پلٹ کر ایک شخص کو دیکھا اور وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے جو مسجد کے

دروازے پر کھڑے تھے ان کے ساتھ ایک جانور تھا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اس کا چہرہ انسان کے چہرہ کی مثل تھا اس کے پاؤں کھر والے جانور کے پاؤں کی مثل تھے، اس کی دم بیل کی دم کی مثل تھی اور اس کی کلغی گھوڑے کی کلغی (مراد گردن کے بال تھے) کی مثل تھی پس جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے میرے قریب کیا تو وہ بدکنے لگا اور اس کی کلغی کے بال بکھر گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے ہاتھ پھیرا اور کہا: اے برقہ تو محمد ﷺ سے مت بدک قسم بخدا! کوئی مقرب فرشتہ تجھ پر سوار نہیں ہوا اور نہ کوئی نبی مرسل جو حضرت محمد ﷺ سے افضل ہو اور کوئی بھی ان سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز و مکرم نہیں۔ وقال یا بُرقہ لا تنفری من محمد ﷺ فواللہ مارکبك ملك مقرب ولا نبی مُرسَل افضلُ من محمد ﷺ ولا اکرم علی اللہ منہ۔ اس نے جواب دیا میں جانتا ہوں کہ آپ اسی طرح ہیں اور یہ کہ آپ صاحب شفاعت ہیں اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں بھی اس کی شفاعت میں ہو جاؤں تو میں نے کہا: تو میری شفاعت میں ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ......" الحدیث۔

ابو سعید عبد الملک بن محمد نیشاپوری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب حضور نبی مکرم ﷺ چوتھے آسمان میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: مرحباً بالأخ الصالح و النبیّ الصالح (خوش آمدید صالح بھائی اور صالح نبی) جس کے بارے ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم اسے دیکھیں گے پس ہم نے اسے آج کی رات کے سوا نہیں دیکھا فرمایا: پس اس میں مریم بنت عمران تھیں ان کے لئے موتیوں کے بنے ہوئے ستر محل تھے اور حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی والدہ کے لئے ستر محل تھے جو سرخ مرجانہ کے بنے ہوئے تھے ان کے دروازے موتیوں سے مرصع تھے اور ان کے پلنگ ایک ہڈی سے بنے ہوئے تھے۔ پس جب معراج (سیڑھی) پانچویں آسمان کی طرف بلند ہوئی اور اس کے باسیوں کی تسبیح سبحان من جمع بین الثلج والنار (پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو اکٹھا کیا) جس نے یہ تسبیح ایک بار بھی اس کے لئے ان کے ثواب کی مثل ثواب ہوگا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا پس ان کے لئے دروازہ کھول دیا گیا پس وہاں ایک بوڑھا تھا اس سے زیادہ خوبصورت بوڑھا کبھی نہیں دیکھا گیا ان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں ان کی ریش مبارک ناف کے قریب پہنچی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ وہ سیاہ و سفید رنگ میں ہو۔ اور ان کے اردگرد قوم بیٹھی ہوئی تھی وہ ان پر قصے بیان کر رہے تھے تو میں نے پوچھا: اے جبرائیل! یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: یہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں جو اپنی قوم میں محبوب ہیں......" آگے پوری حدیث ذکر کی۔

یہ ان احادیث معراج کا مختصر خلاصہ ہے جو صحیحین سے خارج ہیں، انہیں ابو الربیع سلیمان ابن سبع نے مکمل طور پر کتاب "شفاء الصدور" میں ذکر کیا ہے۔ اہل علم اور جماعت اہل السیر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز حضور نبی مکرم ﷺ پر مکہ مکرمہ میں اس وقت فرض کی گئی جس وقت آپ کو آسمان کی طرف سفر معراج پر لے جایا گیا۔ اور انہوں نے واقعہ معراج کی تاریخ اور نماز کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ معراج روح کو ہوئی یا آپ کے جسم کے ساتھ ہوئی؟ پس یہ تین مسائل ہیں جو اس آیت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، اور یہ ان میں سے ہیں جن پر واقفیت ہونی چاہئے اور ان کے بارے بحث ہونی چاہئے،

اور یہ ان احادیث کو بیان کرنے سے زیادہ اہم ہے، اور اب میں وہ ذکر کرتا ہوں جس پر علماء کے اقوال سے اور فقہاء کے اختلاف سے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ میں واقف ہوا ہوں۔

جہاں تک پہلا مسئلہ ہے...... وہ یہ ہے کہ کیا معراج روح کے ساتھ ہوئی یا جسم کے ساتھ؟ اس کے بارے میں سلف و خلف کا اختلاف ہے، پس ایک گروہ کا موقف یہ ہے کہ معراج روح کو ہوئی، اور یہ کہ آپ کا جسم اقدس آپ کے بستر سے الگ نہیں ہوا، اور یہ کہ یہ خواب تھا جس میں آپ نے حقائق کو دیکھا، اور انبیاء علیہم السلام کے خواب حق ہیں۔ یہ نظریہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے، اور اسے حضرت حسن اور حضرت ابن اسحاق سے بیان کیا گیا ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ معراج جسم کے ساتھ حالت بیداری میں بیت القدس تک ہوئی، اور آسمان تک روح کے ساتھ ہوئی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا پس انہوں نے مسجد اقصیٰ کو اسراء کی غایت قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگر اسراء آپ کو جسم کے ساتھ مسجد اقصیٰ سے آگے تک ہوتی تو یقیناً اس کا ذکر ہوتا کیونکہ یہ مدح و تعریف میں مزید مبالغہ اور اضافہ ہے۔ اور عظیم اسلاف اور مسلمانوں نے یہ نظریہ اپنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوئی، اور یہ کہ آپ مکہ مکرمہ سے براق پر سوار ہوئے، اور آپ بیت المقدس تک پہنچے، اس میں نماز پڑھی پھر وہاں سے جسم کے ساتھ معراج پر لے جایا گیا۔ اور اس پر وہ اخبار دلالت کرتی ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور معراج کے جسم کے ساتھ اور حالت بیداری میں ہونے میں کوئی استحالہ نہیں ہے، اور ظاہر اور حقیقت سے تاویل کی طرف عدول تب کیا جاتا ہے جب کوئی استحالہ لازم آئے، اور اگر یہ خواب ہوتی تو اللہ تعالیٰ کہتا: بروح عبدہ (اپنے بندے کی روح کو) اور یہ نہ کہتا بعبدہ۔ اور قول باری تعالیٰ: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ۝ (النجم) اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اگر یہ خواب ہوتی تو اس میں کوئی نشانی اور معجزہ نہ ہوتا، اور نہ ام ہانی آپ کو یہ کہتیں: آپ لوگوں کے سامنے بیان نہ کریں وہ آپ کو جھٹلا دیں گے۔ اور نہ اس کے سبب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فضیلت دی جاتی، اور نہ قریش کے لئے تشنیع و تکذیب ممکن ہوتی، حالانکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے خبر دی تو قریش نے آپ کو جھٹلایا حتیٰ کہ کچھ لوگ مرتد ہو گئے جو ایمان لا چکے تھے۔ پس اگر یہ خواب ہوتی تو کوئی اس کا انکار نہ کرتا، حالانکہ مشرکین نے آپ کو کہا: اگر آپ سچے ہیں تو پھر ہمیں قافلے کے بارے بتائیے کہ کہاں آپ اس سے ملے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فلاں فلاں جگہ میں اس کے پاس سے گزرا اور فلاں آدمی پریشان اور گھبرایا ہوا تھا"۔ تو اس کو کہا گیا: اے فلاں! تو نے کیا دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کوئی شے نہیں دیکھی! سوائے اس کے کہ اونٹ بدکنے لگا ہے۔ پھر انہوں نے کہا: پس آپ ہمیں بتائیے: ہمارا قافلہ کب آئے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ تمہارے پاس فلاں فلاں دن پہنچے گا۔" انہوں نے پوچھا: کون سے وقت؟ آپ نے فرمایا: "میں نہیں جانتا، ادھر سے سورج پہلے طلوع ہو گا یا ادھر سے قافلہ پہلے آئے گا۔" پس اس دن ایک آدمی نے کہا: یہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ تو ادھر دوسرے آدمی نے کہا: یہ تمہارا قافلہ بھی آ گیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیت المقدس کی صفات و کیفیات

کے بارے معلومات طلب کیں تو آپ ﷺ نے وہ سب بیان فرما دیں حالانکہ اس سے پہلے آپ نے اسے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تحقیق میں حجر میں تھا اور قریش مجھ سے سفر معراج کے بارے پوچھنے لگے، تو انہوں نے مجھ سے بیت المقدس کے بارے میں کچھ چیزیں پوچھیں میں نے انہیں اچھی طرح محفوظ نہیں کیا ہوا تھا تو مجھے اتنی شدید پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کی مثل پریشانی کبھی نہیں ہوئی تھی...... فرمایا: ''پس اللہ تعالیٰ نے اسے میرے لئے اٹھایا میں اس کی طرف دیکھنے لگا تو انہوں نے اس کے بارے مجھ سے جو شے بھی پوچھی میں نے اس کے بارے انہیں بتا دیا (1)''۔ الحدیث۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول پر اعتراض یہ ہے: ''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کو معراج پر لے جایا گیا'' اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چھوٹی عمر میں تھیں آپ نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، اور نہ آپ نے حضور نبی کریم ﷺ سے کچھ بیان کیا ہے۔ اور رہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ! تو وہ اس وقت کافر تھے انہوں نے بھی نہ اس حال کا مشاہدہ کیا، اور نہ حضور نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث بیان کی۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے جو اس سے زیادہ معلوم کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی ''کتاب الشفاء'' کا مطالعہ کرے اس سے وہ شفاء پالے گا۔ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نظریہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (الاسراء: 60) (اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لئے) پس اسی وجہ سے انہوں نے اسے (معراج کو) رؤیا کا نام دیا ہے۔

اور اس کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا اور حالت خواب (کے سفر) کو اَسْرٰى نہیں کہا جاتا۔ اور یہ بھی کہ رؤیۃ العین (آنکھ کے ساتھ دیکھنے) کو بھی رؤیا کہا جاتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان اسی سورت میں آئے گا۔ اور اخبار ثابتہ کی نصوص میں اس پر واضح دلالت ہے کہ معراج بدن کے ساتھ ہوئی، اور جب ایک شے کے بارے میں خبر بھی وارد ہو، عقل بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہونے کو جائز قرار دیتی ہو تو پھر اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بالخصوص خلاف عادات امور کے زمانہ میں، حضور نبی مکرم ﷺ کو کئی معراجیں ہوئیں: اور یہ بعید نہیں کہ ان میں سے بعض حالت خواب میں ہوئی ہوں، اور اسی پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کو محمول کیا جائے گا جو صحیح میں ہے: بینا أنا عند البیت بین النائم والیقظان (2) (اس اثنا میں کہ میں بیت اللہ شریف کے پاس حالت نیند اور بیداری کے درمیان تھا۔) الحدیث۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اسراء سے نیند کی طرف لوٹتے ہوں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ یہ معراج کی تاریخ کے بارے ہے، علماء نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے، اور اس میں اختلاف ابن شہاب پر ہے، پس آپ سے موسیٰ بن عقبہ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے ایک سال قبل بیت المقدس کی طرف سفر اسراء پر لے جایا گیا۔ اور آپ سے یونس نے عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے یہ روایت کیا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا وصال نماز فرض کئے جانے سے پہلے ہوا۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرؤیا، باب فی المعراج، صفحہ 529 2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ، جلد 1، صفحہ 455

ابن شہاب نے کہا ہے: یہ واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سات سال بعد پیش آیا۔ اور ان سے وقاصی نے یہ روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پانچ سال بعد آپ کو معراج پر لے جایا گیا۔ ابن شہاب نے کہا ہے: روزے مدینہ طیبہ میں بدر سے پہلے فرض کیے گئے، اور زکوٰۃ اور حج مدینہ طیبہ میں فرض کیے گئے، اور شراب غزوہ احد کے بعد حرام کی گئی۔ اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہی بیت المقدس ہے کی طرف رات کے وقت لے جایا گیا، اور اسلام مکہ مکرمہ کے قبائل میں پھیلا۔ اور ان سے یونس بن بکیر نے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نماز ادا کی۔ عنقریب اس کا ذکر آ رہا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ قول تیری اس پر راہنمائی کرتا ہے کہ معراج ہجرت سے کئی سال پہلے ہوئی، کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوا۔ بعض نے کہا: تین سال پہلے ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار سال پہلے ہوا ہے۔ اور ابن اسحاق کا قول ابن شہاب کے قول کے مخالف ہے، اس بنا پر ابن شہاب سے اختلاف ہوا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حربی نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے ایک برس پہلے ماہ ربیع الثانی کی ستائیسویں رات کو معراج ہوئی۔ اور ابو بکر محمد بن علی بن قاسم ذہبی نے اپنی تاریخ میں کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کی طرف سفر اسراء پر لے جایا گیا اور وہاں سے آسمان کی طرف بلند کیا گیا اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اٹھارہ مہینے بعد پیش آیا۔ ابو عمر نے کہا ہے: اہل سیر میں سے میں کسی کو نہیں جانتا جس نے وہ کہا ہو جو ذہبی نے بیان کیا ہے، اور نہ انہوں نے اپنے قول کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کیا ہے جن کی طرف اس علم کی نسبت کی جاتی ہے، اور نہ اسے ان میں سے کسی پر پیش کیا ہے جن سے حجت پکڑی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ رہی نماز کی فرضیت اور اس کی ہیئت، جس وقت نماز فرض کی گئی، تو اہل علم اور اہل سیر کی جماعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز مکہ مکرمہ میں شب معراج اس وقت فرض کی گئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان کی طرف بلندی پر لے جایا گیا، صحیح وغیرہ میں اس پر نصوص موجود ہیں۔ البتہ انہوں نے نماز کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے جس وقت یہ فرض ہوئی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی ہے، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور چار رکعتیں مکمل کر دی گئیں، اور حالت سفر کی نماز کو دو رکعتوں پر برقرار رکھا گیا، اسی طرح حضرت شعبی، میمون بن مہران اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سوائے مغرب کے۔ یونس رحمۃ اللہ علیہ بن بکیر نے کہا ہے: اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آئے جب آپ پر نماز فرض ہوئی یعنی اسراء میں پس انہوں نے وادی کے کنارے پر اپنی ایڑی ماری تو اس سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس سے وضو کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے رہے۔ پس انہوں نے اپنا چہرہ دھویا، ناک میں پانی ڈالا اور کلی کی، اپنے سر اور اپنے کانوں کا مسح کیا اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا اور اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکا، پھر اٹھے اور دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی آنکھ کو ٹھنڈا کر دیا، آپ کا دل انتہائی خوش اور مطمئن تھا اور آپ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے پسندیدہ امر لے کر آئے، پس آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا

ہاتھ پکڑا اور اسی چشمے پر لے آئے اور اسی طرح وضو کیا جیسے حضرت جبرائیل امین نے وضو کیا تھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا برابر نماز پڑھتے رہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں نماز فرض ہوئی، اسی طرح نافع بن جبیر، حسن بن ابی الحسن بصری نے کہا ہے اور یہی ابن جریج کا قول ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مروی ہے وہ اس سے موافقت کرتا ہے (1)۔

اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام شب معراج کی صبح کو زوال کے وقت نازل ہوئے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اور اس کے اوقات سکھائے۔ یونس بن بکیر نے سالم مولی ابی المہاجر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا میں نے میمون بن مہران کو کہتے سنا ہے کہ پہلے نماز دو رکعتیں تھی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعتیں نماز پڑھی تو وہی سنت ہوگئی، اور مسافر کے لئے اسی نماز کو برقرار رکھا گیا اور وہی مکمل نماز ہے۔ ابو عمر نے بیان کیا ہے: یہ ایسی اسناد ہے جس کی مثل سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، اور ان کا قول: فصارت سنۃ (پس وہی سنت ہوگئی) یہ قول منکر ہے، اور اسی طرح شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی اکیلے مغرب کی نماز کی استثنا کرنا بھی ہے اور انہوں نے صبح کا ذکر نہیں کیا تو یہ ایسا قول ہے جس کا کوئی معنی نہیں۔ تحقیق مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حضر میں نماز کے فرض چار ہیں سوائے مغرب اور صبح کی نماز کے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے نہ عملاً اور نہ کسی خبر مستفیض سے نقلاً۔ اور جو اختلاف بھی اصل فرض میں ہے وہ ان کے لئے قطعاً ضرر رساں اور نقصان دہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اذان کے بارے میں بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے، والحمدللہ۔ اور سورۂ آل عمران میں یہ گزر چکا ہے کہ پہلی مسجد جو زمین میں بنائی گئی وہ مسجد حرام ہے، پھر مسجد اقصیٰ ہے۔ اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان چالیس برس کا فرق ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا مسجد اقصیٰ اور آپ کا اس کے لئے بلانا حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے مروی ہے اور ان میں تطبیق کی وجہ بھی مذکور ہے، پس وہیں غور کر لو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور یہاں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ذکر کریں گے: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ اِلَی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِلٰی مَسْجِدِیْ ھٰذَا وَاِلٰی مَسْجِدِ اِیْلِیَاءَ ...... او بیت المقدس (2) (کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مساجد کی طرف (یعنی) مسجد حرام کی طرف اور میری اس مسجد (مسجد نبوی) کی طرف، اور مسجد اقصیٰ کی طرف) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں جو ہے وہ تمام مساجد پر ان تین مساجد کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے، اسی لئے علماء نے کہا ہے: جس نے کسی مسجد میں نماز کی نذر مانی جس تک وہ سواری اور کجاوے کے بغیر نہ پہنچ سکتا ہو تو وہ اس پر عمل نہ کرے، اور وہ اپنی مسجد میں نماز پڑھ لے، سوائے مذکورہ تین مساجد کے، کیونکہ جس نے ان میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو وہ ان کی طرف نکلے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے سرحد پر لشکر کی حفاظت کے لئے چھاؤنی بنانے کی نذر مانی کہ وہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی الافطار للحامل، حدیث نمبر 1656، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد، حدیث نمبر 2525، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسے بند کردے گا، تو وہیں اسے پورا کرنا اس پر لازم ہے جہاں چھاؤنی ہو کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ اور ابوالبختری نے اس حدیث میں مسجد الجند کا اضافہ کیا ہے، اور یہ صحیح نہیں ہے اور حدیث موضوع ہے، کتاب کے مقدمہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام کے درمیان بہت دوری اور بعد ہونے کی وجہ سے اس کا نام اقصیٰ رکھا گیا ہے، اور وہ زمین میں اہل مکہ سے بہت دور مسجد تھی زیارت کے ساتھ جس کی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی، پھر فرمایا: الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ کہا گیا ہے: اس کے اردگرد پھلوں کے ساتھ اور نہریں جاری کرنے کے ساتھ ہم نے برکت رکھ دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے سبب جو اس کے اردگرد مدفون ہیں ہم نے وہاں برکت رکھ دی ہے۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس بنا دیا ہے۔ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے شام تو میری جگہوں (زمین) میں سے عمدہ اور چنا ہوا علاقہ ہے اور میں اپنے بندوں میں سے انتہائی مخلص دوست تیری طرف بھیجنے والا ہوں (1)''۔ (شام کی اصل سام ہے اسے معرب بنایا گیا ہے) لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا یہ اسلوب کلام کی تبدیلی کے باب سے ہے۔ اور آیات اور نشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان عجائبات میں سے دکھائے جن کے بارے آپ نے لوگوں کو خبر دی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف ایک رات میں لے جانا حالانکہ ایک مہینے کی مسافت تھی، اور آپ کا آسمان کی طرف اوپر جانا اور آپ کا انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک کر کے وصف بیان کرنا، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝

''اور دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور بنایا ہم نے اس کتاب کو باعث ہدایت بنی اسرائیل کے لئے (اس میں انہیں حکم دیا) کہ نہ بناؤ میرے بغیر کسی کو (اپنا) کارساز''۔

یعنی ہم نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے ساتھ شرف و تکریم عطا فرمائی، اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب کے ساتھ عزت و تکریم عطا کی اور وہ تورات ہے۔ وَجَعَلْنٰهُ اور ہم نے اس کتاب کو بنایا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ھا ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں (2) (یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بنایا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام کا معنی یہ ہے پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں اور موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی) پس اس طرح کلام غیب سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دینے (اخبار) کی طرف نکل گئی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: بے شک سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا کا معنی ہے اَسْرَيْنَا (ہم نے سیر کرائی) اور اس پر اس کا مابعد قول لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا دلالت کرتا ہے۔ اور وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اسی معنی پر محمول ہے۔ اَلَّا تَتَّخِذُوْا ابو عمرو نے یتخذوا یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے، پس یہ اسلوب کلام کی تبدیلی کے باب سے ہے۔ وَكِيْلًا یعنی میرے بغیر کسی اور کو شریک نہ بنانا، پھر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 227-226 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 227

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم میرے سوا کسی کو اپنے امور کا کفیل نہ بنانا؛ اسے فراء نے بیان کیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: تم میرے سوا کسی کو رب نہ بنانا جس پر وہ اپنے امور کے بارے توکل اور بھروسہ کرتے ہوں؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ بمعنی کافیاً ہے، اور تقدیر کلام ہے: عھدنا الیہ فی الکتاب الا تتخذوا من دونی وکیلاً (ہم نے انہیں کتاب میں نصیحت کی کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ بنانا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لئلا تتخذوا (تاکہ تم نہ بناؤ) اور الوکیل: وہ ہے جس کی طرف معاملہ (امر) سپرد کیا جاتا ہے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ③

''اے ان لوگوں کی اولاد! جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا نوح علیہ السلام کے ساتھ، بے شک نوح علیہ السلام ایک شکر گزار بندہ تھا''۔

یعنی یا ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا، اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا! یہ ندا کی بنا پر ہے؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور ان سے اسے ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے اور ذریۃ سے مراد ہر وہ ہے جس پر قرآن سے حجت پیش کی گئی، اور وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگ ہیں؛ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی نے کہا ہے (1): مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل میں سے آپ کی قوم ہے، اور اس کا معنی ہے اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا! تم شرک نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا تاکہ وہ انہیں ان کے آباء کو غرق ہونے سے نجات دلانے کی نعمت یاد دلائے۔ اور سفیان نے حمید سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ذَرِّيَّةَ ذال کے فتحہ اور را اور یا کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس قرأت کو عامر بن واجد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی ذِرِّيَّة ذال کا کسرہ اور را اور یا کی شد مروی ہے۔ پھر بیان فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام شکر گزار بندے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا اس کی ہر نعمت پر شکر ادا کرتے تھے اور ہر خیر اور بھلائی اس کی طرف سے جانتے تھے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: جب وہ کپڑا پہنتے تھے تو کہتے: بسم اللہ، اور جب اتارتے تو کہتے: الحمد للہ۔ اسی طرح ان سے معمر نے روایت کیا ہے اور معمر نے منصور سے اور انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جب کھانے لگتے تو کہتے: بسم اللہ۔ اور جب کھانے سے فارغ ہوتے تو کہتے: الحمد للہ (2)۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: چونکہ وہ اپنے طعام پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے (اس لئے وہ عبد شکور تھے۔) اور عمران بن سلیم نے بیان کیا ہے: بے شک حضرت نوح علیہ السلام کو عبداً شکوراً کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جب آپ کھانا تناول فرماتے تھے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے کھانا کھلایا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے بھوکا رکھتا، (الحمد للہ الذی أطعمنی ولو شاء لأجاعنی)، اور جب (پانی وغیرہ) پیتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے سیراب کیا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے پیاسا رکھتا۔ (الحمد للہ الذی سقانی ولو شاء لأظمأنی) اور جب آپ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ الاسراء، جلد 3، صفحہ 228
2۔ ایضاً

لباس پہنتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے لباس پہنایا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے ننگا رکھتا۔ (الحمد لله الذی کسانی ولو شاء لأعرانی) اور جب جوتا پہنتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے جوتا پہنایا ہے اور اگر وہ چاہتا تو مجھے ننگے پاؤں رکھتا۔ (الحمد لله الذی حذانی ولو شاء لأحفانی)، اور جب قضاء حاجت کرتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے اذیت (اور تکلیف دہ شے) کو باہر نکال دیا اور اگر وہ چاہتا تو اسے میرے اندر روک لیتا۔ (الحمد لله الذی أخرج عنی الأذی ولو شاء لحبسه فیّ) (1) اور آیت کا مقصود یہ ہے: بے شک تم حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہو اور وہ شکر گزار بندے تھے پس ان کی اقتدا کرنا تمہارا زیادہ حق ہے نہ کہ اپنے جاہل آباء واجداد کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شکر گزار بندے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے بنایا (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ ذُرِّيَّةَ، تَتَّخِذُوْا کا دوسرا مفعول ہو۔

اور قول باری تعالیٰ: وَكِيْلًا سے مراد جمع ہو پس یہ تمام دونوں قراءتوں میں جائز ہے، دونوں قراءتوں سے مراد تَتَّخِذُوْا میں یا اور تا کی قراءت ہے۔ اور دونوں قراءتوں میں ایک ساتھ یہ بھی جائز ہے کہ ذُرِّيَّةَ قول باری تعالیٰ: وَكِيْلًا سے بدل ہو کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے؛ تو گویا اس نے یہ فرمایا: لا تتخذوا ذریۃ من حملنا مع نوح۔ (تم ان کی اولاد کو نہ بناؤ جنہیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا۔ اور اس کی نصب اعنی اور امدح فعل مضمر کے ساتھ بھی جائز ہے، اور عرب مدح وذم پر نصب دیتے ہیں۔ اور تَتَّخِذُوْا میں مضمر ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر رفع دینا بھی جائز ہے اس کی قراءت میں جس نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اچھا نہیں جنہوں نے تا کے ساتھ قراءت کی ہے، کیونکہ مخاطب سے غائب بدل نہیں بن سکتا۔ اور دونوں صورتوں میں بنی اسرائیل سے بدل قرار دے کر اسے جر دینا بھی جائز ہے۔

پس رہا اَن۔ قول باری تعالیٰ: اَلَّا تَتَّخِذُوْا میں تو یہ ان کی قراءت میں حرف جار کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے جنہوں نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے، تقدیر کلام ہے: ھدیناھم لئلا یتخذوا (ہم نے ان کی راہنمائی فرمائی تا کہ وہ نہ بنائیں)۔ اور تا کی قراءت پر یہ زائدہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں قول مضمر ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان مفسرہ بمعنی ای ہو، اور اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو، اور لانہی ہو پس یہ خبر سے نہی کی جانب خروج ہوگا۔

وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝

”اور ہم نے آگاہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم ضرور فساد برپا کرو گے زمین میں دو مرتبہ اور تم (احکام الٰہی سے) بڑی سرکشی کرو گے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ حضرت سعید بن جبیر اور ابو العالیہ نے لفظ جمع کے ساتھ (3) فِي الْكُتُبِ پڑھا ہے۔ اور کبھی لفظ واحد ہوتا ہے اور اس کا معنی جمع ہوتا ہے، پس دونوں قراءتیں ایک ہی معنی میں ہوں گی۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 25　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 228　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 437

قَضَيْنَآ کا معنی (1) أعلمنا اور أخبرنا (ہم نے آگاہ کیا، اور ہم نے خبر دی) ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی حکمنا ہے یعنی ہم نے فیصلہ کیا۔ اور قضا کا اصل معنی کسی شے کا فیصلہ کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قضینا بمعنی أوحینا (ہم نے وحی کی) ہے؛ اسی لئے فرمایا: اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور حضرت قتادہ کے قول کے مطابق الیٰ بمعنی علی ہے؛ یعنی قضینا علیھم وحکمنا (ہم نے ان پر وحی کی اور ہم نے فیصلہ کیا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہ کہا ہے۔ اور الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ لَتُفْسِدُنَّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لَتُفْسَدُنَّ اور عیسیٰ ثقفی نے لَتَفْسُدُنَّ پڑھا ہے۔ اور دونوں قرأتوں میں معنی قریب قریب ہے، کیونکہ جب انہوں نے فساد برپا کیا تو وہ فاسد ہو گئے، اور یہاں فساد سے مراد تورات کے احکام کی مخالفت کرنا ہے۔ فِي الْاَرْضِ اس سے مراد شام، بیت المقدس اور اس کے آس پاس کی زمین ہے۔ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ۔ لَتُفْسِدُنَّ اور لَتَعْلُنَّ میں لام لام قسم مضمر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ عُلُوًّا كَبِيْرًا اس سے مراد تکبر، بغاوت، سرکشی، رعونت، غلبہ اور عداوت و دشمنی ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

"پس جب آ گیا پہلا وعدہ ان دونوں وعدوں سے تو ہم نے (تمہاری سرکوبی کے لئے) بھیج دیئے اپنے چند بندے جو بڑے کرخت (اور) سخت تھے پس وہ گھس گئے (تمہاری) آبادیوں میں، اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا وہ پورا ہو کر رہنا تھا"

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا یعنی جب ان کے فساد کی دو باریوں میں سے پہلی بار آ گئی۔ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ وہ اہل بابل تھے، اور ان پر پہلی بار میں بخت نصر حاکم تھا جس وقت انہوں نے حضرت ارمیاء کو جھٹلایا، انہیں زخمی کر دیا اور انہیں قید کر لیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان پر جالوت کو بھیجا اور اس نے انہیں قتل کر دیا، پس وہ اور اس کی قوم بڑے کرخت اور سخت تھے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فارس سے ایک لشکر ان کے پاس آیا وہ ان کی خبروں کی جاسوسی کرنے لگے اور ان کے ساتھ بخت نصر بھی تھا پس اس نے اپنے ساتھیوں کے درمیان سے ان کی باتیں یاد کر لیں، پھر وہ فارس کی طرف لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی، اور یہ پہلی بار میں ہوا، پس ان کی طرف سے آبادیوں میں گھسنا اور گھومنا پھرنا ہوا قتال اور جنگ نہ ہوئی)، اسے قشیری ابو نصر نے ذکر کیا ہے۔ اور مہدوی نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ ان کے پاس بخت نصر آیا اور بنی اسرائیل نے اسے شکست دی، پھر وہ دوسری بار ان کے پاس آیا اس نے انہیں قتل کیا اور انہیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ اور ابن ابی نجیح نے اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور محمد بن اسحاق نے ایک طویل خبر میں کہا ہے: بے شک شکست کھانے والا سنحاریب بادشاہ بابل تھا، وہ آیا اور اس کے ساتھ چھ لاکھ جھنڈے تھے اور ہر جھنڈے کے نیچے ایک لاکھ شہسوار تھے پس وہ بیت المقدس کے گرد آ کر اترا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 437

اسے شکست سے دوچار کیا اور سخاریب اور اس کے کاتبوں میں سے پانچ آدمیوں کے سوا سبھی کو مار دیا، اور بنی اسرائیل کے بادشاہ جس کا نام صدیقہ تھا اسے سخاریب کی تلاش میں بھیجا پس وہ اپنے پانچوں ساتھیوں سمیت پکڑا گیا، ان میں سے ایک بخت نصر تھا، پس ان کی گردنوں میں طوق ڈالے گئے اور انہیں ستر دن تک بیت المقدس اور ایلیاء کے اردگرد گھمایا اور چکر لگوایا جاتا رہا۔ اور وہ ان میں سے ہر آدمی کو ہر روز جو کی دو روٹیاں دیتا تھا، پھر اس نے انہیں چھوڑ دیا اور وہ بابل کی طرف واپس لوٹ گئے، پھر سات برس بعد سخاریب فوت ہو گیا، اور اس نے بخت نصر کو اپنا خلیفہ اور نائب بنایا اور بنی اسرائیل میں نئے واقعات اور بدعات بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے محارم کو حلال قرار دیا تھا اور اپنے نبی حضرت شعیا علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا، پس بخت نصر وہاں آیا اور وہ اپنے لشکر سمیت بیت المقدس میں داخل ہو گیا اور بنی اسرائیل کا قتل عام کیا یہاں تک کہ انہیں فناہ اور بالکل تباہ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ پہلا فساد حضرت زکریا علیہ السلام کا قتل ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا: پہلی بار میں ان کا فساد اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت شعیا علیہ السلام کو درخت میں قتل کرنا ہے۔ وہ اس طرح کہ صدیقہ فوت ہو گیا تو ان کے بادشاہ نے ان کا معاملہ (کام) خراب کر دیا اور وہ بادشاہ پر غالب آ گئے اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور اپنے نبی علیہ السلام کی بات بھی نہ سنتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا: اٹھو اپنی قوم میں جاؤ اور اپنی زبان میں انہیں پیغام پہنچاؤ۔ پس جب وہ اس کے بیان سے فارغ ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی تھی تو وہ لوگ آپ پر دوڑ کر آ گئے تاکہ وہ آپ کو قتل کر دیں پس آپ بھاگ پڑے اور آپ کے لئے ایک درخت پھٹ گیا (اس میں شگاف ہو گیا) اور آپ اس میں داخل ہو گئے، اور شیطان نے آپ کو پالیا پس اس نے آپ کے کپڑے کا پلو پکڑ لیا اور انہیں وہ دکھا دیا، تو انہوں نے اس درخت کے درمیان میں آری رکھ دی اور اسے چیر ڈالا یہاں تک کہ انہوں نے درخت کو اور اس کے وسط میں آپ کو بھی کاٹ ڈالا۔ اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے انہیں یہ خبر دی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا وصال اپنی طبعی موت سے ہوا، انہیں قتل نہیں کیا گیا اور جنہیں قتل کیا گیا وہ حضرت شعیا علیہ السلام تھے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے قول باری تعالیٰ: بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَٰلَ الدِّيَارِ میں کہا ہے: وہ موصل کے اہل نینویٰ میں سے سخاریب بادشاہ بابل تھا (1)۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو ابن اسحاق نے کہا ہے۔ فاللہ اعلم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ عمالقہ تھے اور وہ کافر تھے، یہ حسن نے کہا ہے۔ اور جَاسُوا کا معنی ہے: انہوں نے فساد برپا کیا اور قتال کیا اور اسی طرح حاسوا، ھاسوا اور داسوا بھی ہیں؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے، اور یہی قتبی کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے حاسوا حا مہملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوزید نے کہا ہے: الحوس، الجوس، العَوس اور الهَوس ان تمام کا معنی رات کے وقت گھومنا، چکر لگانا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: الجوس تیرے قول جاسوا خلال الدیار کا مصدر ہے، یعنی وہ آبادی میں گھس گئے اور اسے تلاش کیا جو کچھ اس میں تھا جیسا کہ ایک آدمی خبریں تلاش کرتا ہے اور اسی طرح لفظ اجتیاس بھی ہے۔ اور الجَوَسان (واؤ متحرک کے ساتھ) رات کا طوفان یا تباہ کن موت ہوتی ہے اور یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 229

اورعلامہ طبری نے کہا ہے: وہ گھروں کے درمیان گھومتے رہے اور انہیں تلاش کرنے لگے اور شدت اور سختی کے ساتھ قتل کرنے لگے، پس انہوں نے اہل لغت کے قول کے درمیان تطبیق کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چلے اور آبادی اور گھروں کے درمیان گھومنے لگے۔ اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں قتل کیا ہے۔

اور حضرت حسان کا یہ شعر بھی نقل کیا:

و منا الذی لاقی بسیف محمد　　فجاس به الأعداء عرض العساكر(1)

اور قطرب نے کہا ہے: وہ اترے۔

شاعر نے کہا ہے:

فجُسْنَا دِیَارَهم عَنْوَةً　　و أُبْنَا بسادتهم مُوثَقِینَا(2)

وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا یعنی یہ وعدہ اس طرح پورا ہونے والا ہے جس کا خلاف ہرگز نہ ہوگا۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝

''پھر ہم نے پلٹا دیا تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کو جو دشمن کے خلاف تھی اور ہم نے قوت دی تمہیں مال سے، بیٹوں سے اور بنادیا تمہیں کثیر التعداد''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ یعنی ہم نے تمہارے حق میں زمانے کی گردش اور رجعت کو پلٹا دیا، اور یہ اس وقت ہوا جب تم نے توبہ کی اور اطاعت اختیار کر لی۔ پھر کہا گیا ہے: یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے جالوت کو قتل کرنے یا کسی اور کو قتل کرنے کے سبب ہوا(3)، یہ اس کے بارے میں اختلاف ہونے کی بنا پر ہے جس نے انہیں قتل کیا۔ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (اور ہم نے مال اور بیٹوں سے تمہیں قوت دی) یہاں تک کہ تم اسی حالت پر لوٹ آئے جس پر پہلے تھے۔ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا اور ہم نے تمہیں تعداد اور مردوں کے اعتبار سے تمہارے دشمن سے زیادہ کر دیا۔ اور نفیر وہ ہے جو اپنے خاندان میں سے کسی مرد کے ساتھ چلے، کہا جاتا ہے نفیر و نافر جیسا کہ قدیر و قادر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ النفیر، نفر کی جمع ہو جیسا کہ کلیب، کلب کی اور معیز، معز کی، اور عبید، عبد کی جمع ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَاُكْرِمْ بِقَحْطَانَ من والد　　و حِمْیَرَ أكرم بقوم نفیرا(4)

اور اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس پہلے واقعہ کے بعد اتفاق کرنے اور احوال کی اصلاح کرنے کے اعتبار سے زیادہ ہو گئے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اطاعت و فرمانبرداری پر لوٹنے کی جزا اور بدلہ ہے۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 229　　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 230

3۔ ایضاً　　4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440

لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝

"اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا۔ اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی (تمہارے) نفسوں کو ملے گی، پس جب آ گیا دوسرا وعدہ (تو اور ظالم ان پر غالب آ گئے) تا کہ غمناک بنا دیں تمہارے چہروں کو اور تا کہ (جبرا) داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے داخل ہوئے تھے اس میں پہلی مرتبہ تا کہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیں جس پر قابو پائیں۔"

قولہ تعالیٰ: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ یعنی اگر تم اچھے کام کرو گے تو تمہاری نیکی اور اچھے کام کا نفع تم پر ہی لوٹ کر آئے گا۔ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ای فعلیہا۔ اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی تمہیں پر ہوگی، جیسا کہ سلام لک بمعنی سلام علیک ہے (یعنی تجھ پر سلام ہو)۔ کسی شاعر کا قول ہے:

فخر صریعا للیدین وللفم

اس میں بھی لام بمعنی علی ہے (یعنی وہ ہاتھوں اور منہ کے بل پر گرا)۔ اور طبری نے کہا ہے: لام بمعنی الی ہے، یعنی وان اساتم فالیہا، یعنی اگر تم برائی کرو گے تو اسی (نفس) کی طرف برائی کی سزا لوٹے گی۔) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۝ (الزلزال) اس میں بھی لہا بمعنی الیہا ہے (بے شک تیرے رب نے اس کی طرف وحی کی۔) اور کہا گیا ہے: فلہا الجزاء و العقاب۔ پس اسی کے لئے جزا اور سزا ہوگی۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: فلہا رب یغفر الاساءۃ۔ (پس اس کے لئے رب ہے جو برائی کو معاف فرما سکتا ہے)۔ پھر یہ احتمال ہے کہ یہ خطاب پہلی بار میں بنی اسرائیل کو ہو، یعنی تم نے برے عمل کئے تو تمہیں قتل کرنا، قید کرنا، اور تباہ و برباد کرنا حلال ہو گیا بعد ازاں تم نے اچھے عمل کئے تو بادشاہی، بلندی اور انتظام حال تمہاری طرف لوٹ آئے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہو، یعنی تم نے گناہوں کی وجہ سے سزا کے لئے اپنے اسلاف کا استحقاق پہچان لیا ہے پس تم بھی اسی کی مثل کا انتظار کرو یا یہ اسی وجہ کی بنا پر مشرکین قریش کو خطاب ہو۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پس جب تمہارے فساد پھیلانے کے بارے دوسرا وعدہ آ گیا؛ اور وہ یہ کہ انہوں نے دوسری مرتبہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کر دیا، انہیں بنی اسرائیل کے بادشاہ نے قتل کیا تھا اس کو لاخت کہا جاتا تھا؛ یہ قتبی نے کہا ہے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا نام ہیردوس تھا، اسے انہوں نے تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ اور ایک آزبیل نامی عورت نے اسے آپ کے قتل پر ابھارا تھا۔ اور علامہ سدی نے کہا ہے: بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی بڑی عزت و تکریم کرتا تھا اور وہ معاملات میں آپ سے مشاورت کرتا تھا، پس بادشاہ نے آپ سے یہ مشورہ طلب کیا کہ وہ اپنی بیوی کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ نے اسے اس سے منع کر دیا اور فرمایا: بلاشبہ وہ تیرے لئے حلال نہیں ہے، پس اس کی ماں کے دل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے حقد اور عداوت پیدا ہو گئی، پھر اس نے اپنی بیٹی کو باریک

سرخ کپڑے پہنائے اور اسے خوب معطر کیا اور اسے بادشاہ کی طرف بھیج دیا اس حال میں کہ وہ شراب میں مست تھا۔ اور اس نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے چھیڑ چھاڑ کرے، اور اگر وہ اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ انکار کر دے یہاں تک کہ وہ اسے وہ کچھ عطا کرے جو وہ اس سے مانگتی ہے، اور جب وہ اسے قبول کر لے تو پھر وہ اس سے مطالبہ کرے کہ یحیٰی بن زکریا کا سر سونے کی ٹرے میں رکھ کر لایا جائے، پس اس نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ وہ حضرت یحیٰی بن زکریا علیہما السلام کا سر لے آیا اور سر گفتگو کرتا رہا یہاں تک کہ جب وہ اس کے سامنے رکھا گیا تو وہ کہہ رہا تھا: لا تحل لک، لا تحل لک (یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے، یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے) پس جب صبح ہوئی تو ان کا خون ابھی کھول رہا تھا، پس اس نے اس پر مٹی ڈالی تو وہ پھر اس سے زیادہ کھولنے لگا، پس وہ مسلسل اس پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ وہ شہر کی فصیل تک پہنچ گیا اور وہ اس میں بھی کھولتا رہا؛ اسے ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

اور حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت حسین بن علی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ ان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ مر گیا اور اس نے اپنی بیوی اور ایک بیٹی پیچھے چھوڑی اور اس کی سلطنت کا وارث اس کے بھائی کو بنایا گیا، تو اس نے اپنے بھائی کی بیوی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا، تو اس نے اس بارے میں حضرت یحیٰی بن زکریا علیہما السلام سے مشاورت کی، اس زمانے میں بادشاہ انبیاء علیہم السلام کے حکم کے مطابق عمل کرتے تھے، تو آپ نے اسے کہا: تو اس سے شادی نہ کر کیونکہ وہ فاحشہ عورت ہے، پس اس عورت کو بتا دیا گیا کہ اس نے اس کا ذکر کیا ہے اور آپ نے اسے اس سے پھیر دیا ہے، تو اس عورت نے پوچھا: یہ کہاں سے ہوا ہے؟ یہاں تک کہ اس تک یہ خبر پہنچ گئی کہ یہ یحیٰی کی جانب سے ہوا ہے، تو اس نے کہا کہ یحیٰی کو ضرور قتل کیا جائے گا یا اسے اس ملک سے نکال دیا جائے گا، پس اس نے اپنی بیٹی کو بلایا اور اس کا خوب بناؤ سنگار کر کے اسے تیار کیا، پھر اسے کہا: تو اپنے چچا کے پاس مجلس کے وقت جا کیونکہ وہ جب تجھے دیکھے گا تو وہ تجھے بلائے گا اور تجھے اپنے حجرہ میں بٹھائے گا، اور وہ کہے گا: مجھ سے مانگ جو تو چاہتی ہے، کیونکہ جو شے بھی تو مجھ سے مانگے گی وہ میں تجھے عطا کروں گا، پس جب وہ تجھے یہ کہے، تو تو یہ کہنا: مجھے یحیٰی کے سر کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ راوی نے کہا: ان بادشاہوں میں سے جب کوئی سر مجلس کسی شے کے بارے بات کر دیتا پھر اسے پورا نہ کرتا تو اس سے بادشاہی چھین لی جاتی، پس اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے کہا: یحیٰی کو قتل کرنے سے بھی اسے موت آئے گی اور اپنی سلطنت سے باہر نکلنے سے بھی اسے موت آئے گی، چنانچہ اس نے اپنے ملک کو اختیار کیا اور آپ کو قتل کر دیا۔ راوی نے بیان کیا: پس اس لڑکی کی ماں کو زمین نے اپنے اندر نگل لیا (یعنی وہ زمین میں دھنس گئی)۔

ابن جدعان نے کہا ہے: میں نے یہ حدیث حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیان کی تو انہوں نے فرمایا: کیا میں تجھے خبر نہ دوں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کیسے قتل کئے گئے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، تو انہوں نے بیان کیا: حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے کو جس وقت قتل کیا گیا تو وہ ان سے بھاگ نکلے اور ان لوگوں نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ آپ ایک موٹے تنے والے درخت کے پاس پہنچ گئے تو اس نے آپ کو اپنی طرف بلایا اور آپ کو اپنے اندر چھپا لیا اور آپ کے کپڑے کا ایک کنارہ (جھالر) باہر رہ گئی ہوائیں اسے اڑانے لگیں، پس وہ بھی چلتے ہوئے اس درخت کے پاس آ پہنچے اور انہوں نے اس

درخت کے بعد آپ کا کوئی اثر اور نشان نہ پایا، اور انہوں نے اس کپڑے کے ٹکڑے کی طرف دیکھا اور پھر آری منگائی اور اس درخت کو کاٹ دیا اور اس کے ساتھ آپ کو بھی کاٹ دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامہ طبری نے ''التاریخ الکبیر'' میں بیان کیا ہے کہ ابوالسائب نے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں ابو معاویہ نے اعمش سے انہوں نے منہال سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے یحییٰ بن زکریا کو ان بارہ حواریوں میں بھیجا جو لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، فرمایا: وہ چیزیں جن سے انہوں نے لوگوں کو منع کیا ان میں بھائی کی بیٹی سے نکاح بھی تھا، فرمایا: اور ان کے بادشاہ کے بھائی کی بیٹی تھی جو اسے پسند تھی ..... آگے خبر مذکورہ خبر کے مثل ہی بیان کی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو ان بارہ حواریوں میں بھیجا گیا جو لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، اور جو وہ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اس میں وہ انہیں بھانجی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کرتے تھے، اور ان کے بادشاہ کی بھانجی تھی وہ اسے چاہتی تھی، اور وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اس سے شادی کر لے، ہر روز اس کی کوئی حاجت ہوتی تھی تو وہ اسے پورا کر دیتا تھا، پس جب یہ خبر اس کی ماں کو پہنچی کہ انہوں نے بھانجی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کیا ہے تو اس نے اسے کہا: جب تو بادشاہ کے پاس جائے اور وہ پوچھے: کیا تیری کوئی حاجت ہے؟ تو تو یہ کہنا: میری حاجت یہ ہے کہ تو یحییٰ بن زکریا کو ذبح کر دے، پس بادشاہ نے اس سے کہا: تو اس کے سوا مجھ سے مانگ! تو اس نے کہا: میں تجھ سے اس کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ پس جب اس نے اس کا انکار کیا تو اس نے ایک ٹب منگایا اور آپ کو بھی بلایا اور آپ کو ذبح کر دیا، پس آپ کے خون کا قطرہ زمین کے چہرے پر ظاہر اور نمایاں ہو گیا پس وہ مسلسل ابلتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور ان کے دل میں یہ بات القا کر دی کہ وہ انہیں اسی خون پر قتل کرے یہاں تک کہ یہ خون ساکن ہو جائے، پس اس نے اس پر ان میں سے ستر ہزار افراد قتل کئے، اور ایک روایت میں پچھتر ہزار کا ذکر ہے۔ حضرت سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: یہ ہر نبی علیہ السلام کی دیت ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف وحی کی ہے کہ میں نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے بدلے ستر ہزار افراد کو قتل کیا، اور میں تمہارے نواسے کے بدلے ستر ہزار کو قتل کروں گا۔ اور سمیر بن عطیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا ہے: وہ چٹان جو بیت المقدس میں ہے اس پر ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا گیا ان میں سے حضرت یحییٰ بن زکریا بھی ہیں۔ اور زید بن واقد سے روایت ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سر کو اس وقت دیکھا جب انہوں نے مسجد دمشق بنانے کا ارادہ کیا، وہ اس گنبد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے نیچے سے نکالا جو اس محراب کے ساتھ ملتا ہے جو مشرق کی جانب ملتا ہے، اور آپ کا چہرہ اور بال مبارک اپنی اصلی حالت پر تھے کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ اور قرہ بن خالد نے کہا ہے: حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اور حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے سوا آسمان کسی پر نہیں رویا اور اس کی سرخی اس کا رونا ہی ہے۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: تین مقامات میں ابن آدم زیادہ وحشت زدہ ہوتا ہے: ایک پیدا ہونے کے دن پس وہ غم و

اندوہ کے دار کی طرف نکل کر آتا ہے، اور ایک اس رات جو وہ مردوں کے ساتھ گزارتا ہے پس وہ ایسے پڑوسیوں کا پڑوسی بن جاتا ہے جن کی مثل اس نے پہلے نہیں دیکھے، اور ایک اس دن جب اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور وہ اس جگہ حاضر ہو گا جس کی مثل اس نے پہلے نہیں دیکھی: اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لئے ان تینوں مقامات کے بارے فرمایا: وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا (مریم) (اور سلامتی ہو ان پر جس روز وہ پیدا ہوئے اور جس روز انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے) یہ سب مذکورہ تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جسے ان پر دوسری بار بھیجا گیا، پس کہا گیا ہے کہ وہ بخت نصر تھا۔ اور یہ قشیری ابو نصر نے کہا ہے، ان کے سوا کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سہیلی نے کہا ہے: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد قتل کیا گیا، اور بخت نصر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے بہت عرصہ پہلے اور اسکندر سے بھی پہلے ہوا ہے اور اسکندر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً تین سو سال کا عرصہ ہے، لیکن دوسری بار سے مراد وہ لی گئی ہے جس وقت انہوں نے حضرت شعیا کو قتل کیا تھا، اس وقت بخت نصر زندہ تھا، پس یہی وہ ہے جس نے انہیں قتل کیا اور بیت المقدس کو خراب اور برباد کیا اور مصر تک ان کا پیچھا کیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے یہ روایت کیا ہے کہ بخت نصر وہ ہے جس نے بنی اسرائیل پر اس وقت حملہ کیا جس وقت انہوں نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کیا تھا وہ اہل السیر والاخبار کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ ان تمام کا اس پر اجماع ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر اس وقت حملہ کیا تھا جس وقت انہوں نے حضرت شعیا علیہ السلام کو قتل کیا تھا اور یہ ارمیاء کے عہد میں ہوا تھا۔ انہوں نے بیان کیا: ارمیاء کے عہد اور بخت نصر کے بیت المقدس کو خراب و برباد کرنے سے لے کر حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی ولادت تک درمیان میں چار سو اکسٹھ برس کی مدت ہے، اور یہ کہ وہ بیت المقدس کی تخریب سے لے کر کوسک کے عہد میں اس کی آبادی تک ستر برس کا عرصہ ہے، پھر اس کی آبادی کے بعد سے لے کر بیت المقدس پر اسکندر کے غلبہ تک اٹھاسی برس ہیں، پھر اسکندر کی مملکت کے بعد سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت تک تین سو تریسٹھ سال ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں سے صحیح وہ ہے جو محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا اور انہوں نے یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا...... اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا...... تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بابل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ بھیجا اس کو خردوس کہا جاتا تھا۔ پس وہ اہل بابل کے ساتھ ان کی طرف چلا اور ان پر شام کے ساتھ غلبہ پا لیا، پھر اس نے اپنے سالار لشکر کو کہا: میں نے اپنے الٰہ کی قسم کھائی ہوئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیت المقدس پر غلبہ دیا تو میں ضرور انہیں قتل کروں گا یہاں تک کہ ان کا خون میرے لشکر کے درمیان سے بہے گا، اور اس نے اسے حکم دیا کہ وہ انہیں قتل کریں یہاں تک کہ وہ ان تک پہنچ جائے، پس وہ سالار لشکر بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے اس میں ابلتا ہوا خون دیکھا تو اس نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے بتایا: یہ قربانی کا خون

ہے ہم نے اسے قربان کیا لیکن اسی برس سے یہ ہماری طرف سے قبول نہیں ہوئی۔ اس نے کہا: تم نے میرے سامنے سچ نہیں کہا، پس اس نے ان سرداروں میں سے سات سوستر افراد کو اس خون پر ذبح کیا لیکن وہ پر سکون نہ ہوا، [پھر ان کے بچوں میں سے سات سو بچے لائے گئے اور وہ اس خون پر ذبح کئے گئے لیکن وہ پر سکون نہ ہوا] پھر اس نے ان کے قیدیوں اور ان کی عورتوں میں سے سات ہزار لانے کا حکم دیا اور اس نے انہیں اس خون پر ذبح کیا لیکن وہ ٹھنڈا نہ ہوا، تب اس نے کہا: اے بنی اسرائیل! مجھے سچ سچ بتاؤ اس سے پہلے کہ میں تم میں سے کوئی عورت آگ کو پھونک مارنے کے لئے بھی نہ چھوڑوں اور نہ کوئی مرد چھوڑوں مگر اسے قتل کردوں۔ پس جب انہوں نے مشقت اور تکلیف کو دیکھا تو کہنے لگے: بیشک یہ ہمارے نبی علیہ السلام کا خون ہے وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بننے والے بہت سے امور سے منع کرتے تھے تو ہم نے انہیں قتل کر دیا، پس یہ انہی کا خون ہے۔ ان کا اسم گرامی حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام تھا، انہوں نے کبھی آنکھ جھپکنے کی دیر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی اور نہ معصیت کا قصد کیا، تو اس نے کہا: اب تم نے مجھے سچ بیان کیا ہے، اور وہ سجدہ میں گر گیا پھر اس نے کہا: اب اس کی مثل کا تم سے انتقام لیا جائے گا، اور اس نے دروازے بند کرنے کا حکم دیا اور کہا: خردوس کے لشکر میں سے جو یہاں ہیں تم باہر نکل جاؤ، اور وہ بنی اسرائیل کے لئے خالی ہوگئی اس نے کہا: اے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام تحقیق میرا اور آپ کا رب جانتا ہے آپ کی وجہ سے آپ کی قوم پر جو آفت اور مصیبت آئی، پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے پر سکون ہو جاؤ اس سے پہلے کہ میں ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑوں۔ پس حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا خون اللہ عزوجل کے حکم سے ٹھنڈا ہو گیا، اور اس نے ان سے قتل کو اٹھا لیا اور کہا: اے میرے رب! بلاشبہ میں اس کے ساتھ ایمان لایا جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، پس اللہ تعالیٰ نے رؤس الانبیاء میں سے ایک رأس کی طرف وحی بھیجی۔ بے شک یہ سالار مومن ہے اور بہت سچا ہے۔ پھر اس نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ کے دشمن خردوس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم میں سے اتنے لوگوں کو قتل کروں کہ تمہارا خون اس کے لشکر کے درمیان سے بہہ کر جائے۔ اور بلاشبہ میں اس کی نافرمانی اور حکم عدولی نہیں کر سکتا، پس اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ خندق کھودیں اور انہیں اپنے مالوں میں سے اونٹ، گھوڑے، خچر، گدھے، گائیں اور بکریاں وغیرہ لانے کا حکم دیا پس انہوں نے انہیں ذبح کیا یہاں تک کہ خون لشکر کی طرف بہہ گیا، اور وہ مقتول جو اس سے پہلے قتل کئے گئے تھے انہیں ان ذبح کئے گئے جانوروں پر پھینک دیا گیا، پھر وہ ان سے بابل کی طرف لوٹ گیا، حالانکہ یہ قریب تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر دیتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں طویل حدیث مرفوع موجود ہے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ہم نے اسے (کتاب التذکرہ) میں ابواب فی اخبار المہدی میں مقطوع ذکر کیا ہے، ہم اس میں سے یہاں اتنا ذکر کریں گے جو آیت کے معنی کی وضاحت کر دے گا اور اس کی تفسیر بیان کر دے گا یہاں تک کہ اس کے ساتھ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہوگی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی عظیم، عالیشان اور قدر و مرتبہ کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ان اعلیٰ و ارفع اور بلند مرتبہ گھروں

میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے، چاندی، موتی، یاقوت اور زمرد سے بنایا۔''
اور وہ اس طرح کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب اسے بنایا تو اللہ تعالیٰ نے جن ان کے لئے مسخر کر دیئے (ان کے تابع بنا دیئے) پس وہ معادن (کانیں) سے سونا اور چاندی لے آتے تھے، اور وہ آپ کے پاس جواہر، یاقوت اور زمرد لے آتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے جن آپ کے تابع رکھے یہاں تک کہ انہوں نے ان اصناف سے اسے بنا دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: سو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ چیزیں بیت المقدس سے کیسے اٹھالی گئیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور وہ مجوسی (آتش پرست) تھا اور اس کی حکومت سات سو سال تک رہی، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا پس وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا اور اموال اور وہ سب کچھ جو ان اصناف میں سے بیت المقدس میں تھا سب جمع کر لیا اور اسے ایک لاکھ ستر ہزار سامان لادنے والی گاڑیوں پر لاد دیا یہاں تک کہ اسے بابل پہنچا دیا، پس وہ وہیں مقیم رہے۔ بنی اسرائیل سے خدمت لیتے رہے اور سو برس تک ذلت و رسوائی اور سزا و عذاب کے ساتھ ان پر حکومت کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو یہ القا کیا کہ وہ بابل کی زمین میں مجوسیوں کی طرف چلے، اور ان کے قبضے میں بنی اسرائیل میں سے جو ہیں انہیں نجات دلائے، پس وہ بادشاہ ان کی طرف چل پڑا یہاں تک کہ وہ بابل کے علاقے میں داخل ہو گیا اور مجوسیوں کے ہاتھوں میں جو بنی اسرائیل کے لوگ باقی تھے انہیں چھڑا لیا اور وہ زیورات جو بیت المقدس سے وہ لے آئے تھے وہ بھی ان سے لے لئے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اسی مقام پر واپس لوٹا دیا جس پر وہ پہلے تھے پس اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اے بنی اسرائیل اگر تم پھر گناہوں اور نافرمانی کی طرف لوٹ گئے تو ہم بھی قید اور قتل و غارت کو تم پر لوٹا دیں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (الاسراء: 8) (قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے) اور جب بنی اسرائیل بیت المقدس کی طرف لوٹ کر آئے تو دوبارہ گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہ روم قیصر کو مسلط کر دیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۞ پس اس نے ان پر بحر و بر میں حملہ کیا اور انہیں قیدی بنایا انہیں قتل کیا اور ان کے اموال اور ان کی عورتوں کو اٹھا لیا، اور بیت المقدس کے جمیع زیورات بھی اٹھا لئے اور انہیں ایک لاکھ ستر ہزار سامان والی گاڑیوں پر لادا، یہاں تک کہ انہیں کنیسۃ الذہب میں پہنچا دیا۔ پس وہ اب بھی اس میں ہیں حتیٰ کہ حضرت مہدی علیہ السلام اسے اٹھائیں گے اور اسے بیت المقدس کی طرف لوٹا دیں گے، اور ایک ہزار سات سو کشتیوں کو یافا پر لنگر انداز کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے بیت المقدس کی طرف منتقل کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع کر دے گا''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ یعنی دونوں باریوں میں سے جب دوسرا وعدہ آ گیا۔ اور اذا کا جواب محذوف ہے، تقدیر کلام ہے: بعثناھم (تو ہم نے ان پر مسلط کر دیا) اور اس پر دلیل پہلا بَعَثْنَا ہے۔ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ تاکہ قید اور قتل کے ساتھ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ اور اس غم کا اثر تمہارے چہروں میں ظاہر ہونے لگے۔ پس لِیَسُوْٓءٗا محذوف کے متعلق ہے، یعنی ہم نے ایسے بندے بھیج دیئے (مسلط کر دیئے) تاکہ وہ تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ اور سلوک کریں جو تمہارے چہروں کو سیاہ اور غمزدہ کر دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: الوجوہ سے مراد سرداری ہے یعنی تاکہ وہ انہیں ذلیل و رسوا کر دیں۔ اور کسائی نے لِنَسُوْٓءَ نون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اپنے بارے میں خبر دینے والے کا فعل عظیم الشان ہے، اور یہ کہ اسے قول باری تعالیٰ: وَ قَضَیْنَا اور بَعَثْنَا، رَدَدْنَا پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا ہے۔ اور اسی طرح علی سے مروی ہے۔ اور اس کی تصدیق حضرت ابی کی قرأت لنسوءن نون اور حرف تاکید کے ساتھ ہوتی ہے(1)۔ ابوبکر، اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور ابن عامر نے لِیَسُوْٓءَ صیغہ واحد کی بنا پر یاء اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے لیسوٓ اللہ وجوھکم (تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دے۔) اور دوسری یہ ہے ..... لیسوٓ الوعد و جوھکم (تاکہ وہ وعدہ تمہارے چہروں کو غمزدہ کر دے) اور باقیوں نے لِیَسُوْٓءٗا صیغہ جمع کی بنا پر یا اور ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تاکہ وہ لوگ جو کرخت اور قوت و طاقت والے ہیں تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ وَ لِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِیُتَبِّرُوْا اور تاکہ وہ (جبراً) مسجد میں داخل ہو جائیں جیسے وہ پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے تاکہ وہ تباہ و برباد اور ہلاک کر دیں۔ اور قطرب نے کہا ہے: تاکہ وہ اسے گرا دیں۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فما الناس إلا عاملان فعاملٌ يُتَبِّرُ ما يَبْنِي و آخر رافعٌ (2)

مَا عَلَوْا یعنی تمہارے شہروں میں سے جس پر وہ غالب آ جائیں۔ تَتْبِیْرًا (مکمل طور پر تباہ و برباد کرنا)

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ⑧

''قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے، اور ہم نے بنا دیا جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ۔''

قولہ تعالیٰ: عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ اور یہ (خبر) ان میں سے ہے جس کے بارے انہیں ان کی کتاب میں خبر دی گئی ہے اور عَسٰی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے کہ وہ ان سے (اس تکلیف اور غم کو) دور فرما دے گا، اور عَسٰی کا لفظ اللہ تعالیٰ سے واجب (اور ثابت) ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ کہ تمہارا رب تم سے اپنا انتقام لینے کے بعد تم پر رحم فرمائے گا، اور پھر اسی طرح ہوا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھا دیا اور ان سے کئی بادشاہ بنائے۔ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: پس وہ دوبارہ (فسق و فجور کی طرف) لوٹ آئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 231

فرمادیا۔ اور وہ بڑی رذالت اور حقارت کے ساتھ جزیہ دینے لگے؛ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو پہلے حدیث وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: تحقیق بنی اسرائیل پر عذاب اور سختی ■ بارہ کفار کے ہاتھوں سے آئی اور ایک بار مسلمانوں کے ہاتھوں سے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب وہ دوبارہ فسق و فجور کی طرف لوٹ آئے تو اللہ تعالیٰ (کی گرفت) بھی ان پر لوٹ آئی۔ اور اس بنا پر حضرت قتادہ کا قول صحیح لگتا ہے۔ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ اور جیل بنا دیا ہے۔ یہ الحصر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی حبس (قید کرنا) ہے۔ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے حَصَرَهٗ يَحْصِرُهٗ حَصْرًا اس نے اس پر تنگ کر دیا اور اس کا احاطہ کر لیا۔ اور الحصیر: الضیق البخیل (سخت بخیل) اور الحصیر کا معنی البارية (تراشیدہ) ہے۔ اور الحصیر سے مراد پہلو بھی ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: وہ ہڈی جو اونٹ اور گھوڑے کے پہلو میں ظاہر ہوتی ہے اس سے لے کر عرضا اوپر کی جانب پہلو کے ختم ہونے تک درمیان میں جو (گوشت) ہے وہ حصیر کہلاتا ہے۔ اور الحصیر سے مراد بادشاہ بھی ہے، کیونکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔

لبید نے کہا ہے:

و قَمَاقِمٍ غُلْبِ الرقاب كأنهم　　　جِنٌّ لدى باب الحَصِير قيام(1)

اس میں الحصیر سے مراد بادشاہ لیا گیا ہے۔

اور روایت کیا جاتا ہے: و مَقَامَةٍ غُلْبِ الرقاب...... یہ اس بنا پر ہے کہ غلب، مقامة سے بدل ہو گویا کہ اس طرح کہا: و رُبَّ غُلْبِ الرقاب۔ اور ابوعبیدہ سے مروی ہے:

لدى طرف الحصير

قیام یعنی نعمان بن منذر کی چٹائی کے کنارے کے پاس۔ اور الحصیر کا معنی قید خانہ بھی ہے(2)، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اور علامہ قشیری نے کہا ہے: جس کو بچھایا جاتا ہے وہ حصیر کہلاتی ہے، کیونکہ بنائی کے سبب اس کے بعض حصے بعض کو روکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: أي فراشا و مهادا (یعنی اللہ تعالیٰ نے جہنم کو کافروں کے لئے فرش اور بچھونا بنا دیا ہے) (یعنی) یہ اس طرف گئے ہیں کہ حصیر وہ ہے جسے بچھایا جاتا ہے، کیونکہ عرب چھوٹی چٹائی کو حصیر کا نام دیتے ہیں، ثعلبی نے کہا ہے: اور یہ خوبصورت توجیہ ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾

''بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب راہوں سے سیدھی راہ ہے اور مژدہ سناتا ہے ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بلاشبہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ اور بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 231

تیار کر دیا ہے ان کے لئے دردناک عذاب۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ جب اللہ تعالیٰ نے معراج کا ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارے جو وعدہ اور فیصلہ کیا اس کا ذکر کیا، اور یہ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے، پھر یہ بیان فرمایا کہ وہ کتاب جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائی وہ ہدایت پانے کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ کا معنی ہے الطریقة التی ھی أسد و أعدل و أصوب۔ یعنی یہی وہ راہ ہے جو زیادہ سیدھی، موزوں اور صحیح ہے، پس التی موصوف محذوف کی صفت ہے، یعنی الطریقة التی ھی أقوم۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہی وہ حال ہے جو تمام حالات سے زیادہ صحیح اور موزوں ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لانا ہے، اور یہ کلبی اور فراء نے کہا ہے (1)۔ قولہ تعالیٰ: وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اَنَّ لَهُمْ ای بأن لهم (اعمال صالحہ کے سبب) ان کے لئے اَجْرًا كَبِيْرًا (بڑا اجر ہے) یعنی جنت ہے۔ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یعنی اور انہیں مژدہ سنا رہا ہے کہ ان کے دشمنوں کے لئے عذاب وعقاب ہے۔ اور قرآن کریم اس کی شان اور عظمت وعدہ و وعید ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے وَيَبْشُرُ مخفف یا کے فتحہ اور شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ اس کا ذکر بھی پہلے کر دیا گیا ہے۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ⑪

''اور دعا مانگا کرتا ہے انسان برائی کے لئے جیسے دعا مانگا کرتا ہے بھلائی کے لئے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) انسان بڑا جلد باز (واقع ہوا) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: یہ آدمی کا اپنی ذات اور اپنی اولاد کے خلاف غصے اور تنگی کی حالت میں دعا کرتا ہے ایسی شے کے بارے جس کے قبول ہونے کو وہ پسند نہیں کرتا (2) کہ اے اللہ! اسے ہلاک کر دے وغیرہ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ جیسا کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اس کو عافیت عطا فرمائے، پس اگر اللہ تعالیٰ شر اور برائی کے بارے اس کی دعا اس کے اپنے خلاف قبول کر لے تو وہ ہلاک ہو جائے لیکن وہ اپنے فضل کے ساتھ اس کے لئے اسے قبول نہیں کرتا۔ اس کی نظیر یہ ہے: وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ (یونس: 11) (اور اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لئے) اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ دعا مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑫ (الانفال) (اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب۔) اور کہا گیا ہے کہ وہ ممنوع چیز کی طلب میں دعا مانگتا ہے جیسا کہ مباح چیز کی طلب میں دعا مانگتا ہے۔

جیسا کہ شاعر ابن جامع نے کہا ہے:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 232　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 441

أطوف بالبيت فيمن يطوف　　وأرفع من مِئزَرِي المُسْبَلِ

میں بیت اللہ کا طواف کرنے والوں میں اس کا طواف کرتا ہوں اور اپنی لٹکی ہوئی چادر اٹھالیتا ہوں۔

وأسجدُ بالليل حتی الصباح　　وأتلُو من المُحْكَم المُنْزَلِ

اور میں رات کے وقت صبح تک عبادت کرتا ہوں اور نازل کی گئی محکم کتاب کی تلاوت کرتا ہوں۔

عسی فارجُ الهَمِّ عن يوسف　　يُسَخِّرلی ربة المَحْمِلِ

پس قریب ہی تو یوسف سے غم دور ہونے کا امیدوار رہ، وہ میرے لئے محمل کے مالک کو تابع کر دے گا۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے ما علی فلان مِحْمِل جیسا کہ مَجْلِس ہے یہ بمعنی معتمد ہے یعنی (فلان پر اعتماد نہیں) اور محمل، محامل الحاج کا واحد بھی ہے (حاجیوں کو اٹھانے والا ہودج) اور مِحْمَل جیسا کہ مِرجل ہے اس کا معنی ہے تلوار کی پیٹی۔ اور وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ سے لفظ اور خط (یعنی پڑھنے اور لکھنے) میں واو حذف کر دی گئی ہے لیکن معنی میں یہ حذف نہیں ہوئی کیونکہ یہ محل رفع میں ہے لیکن اس کے سامنے لام ساکن آنے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ (العلق) وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ (الشوریٰ: 24) وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء: 146) يُنَادِ الْمُنَادِ (ق: 41) فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ (القمر) (ان میں پہلی دو آیتوں میں واؤ اور آخری تین میں یاء لام ساکنہ کی وجہ سے حذف کر دی گئی ہیں)۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا یعنی انسان کے مزاج اور طبیعت میں جلد بازی اور تیزی ہے، پس یہ برائی کے سوال میں اسی طرح جلد بازی اور تیزی کرتا ہے جس طرح خیر اور بھلائی مانگنے میں جلدی کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے اشارہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے کہ جس وقت وہ روح کے مکمل طور پر اپنے بدن میں داخل ہونے سے پہلے ہی اٹھ بیٹھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا سر تخلیق فرمایا پس وہ دیکھتے رہے درآنحالیکہ ان کا جسم تخلیق ہوتا رہا، پس جب عصر کا وقت ہوا ان کی ٹانگیں ابھی باقی تھیں ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی تو انہوں نے کہا: اے میرے پروردگار! رات آنے سے پہلے پہلے جلدی کیجئے؛ تو اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب پھونک ان کی ناف تک پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے جسم کی طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ قادر نہ ہو سکے؛ پس اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب روح ان کی آنکھوں میں داخل ہوئی تو انہوں نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا، اور جب ان کے پیٹ میں داخل ہوئی تو کھانے کی چاہت پیدا ہوئی تو روح کے اپنی ٹانگوں کی طرف پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے پھلوں کی طرف جلدی سے اچھل پڑے، تو اسی وقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) (انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے۔) اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر بنائی تو جتنا اللہ تعالیٰ نے چھوڑنا چاہا اسے چھوڑ دیا تو ابلیس اس کے اردگرد چکر لگاتا رہا اور

دیکھتا رہا کہ وہ کیا ہے؟ پس جب اس نے آپ کا پیٹ دیکھا تو وہ پہچان گیا کہ یہ ایسی مخلوق پیدا کی گئی ہے جو اپنے او پر قابو نہیں رکھ سکے گی (1)''۔ یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قیدی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کیا تو وہ رات کے وقت کراہنے لگا، آپ نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: میرے کراہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چمڑے کا تسمہ شدید اور سخت بندھا ہوا ہے، چنانچہ آپ نے اسے بندھے ہوئے تسمے کو تھوڑا ڈھیلا کر دیا پس جب آپ سو گئیں تو وہ بھاگ گیا، تو آپ نے اس کی اطلاع حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھ کاٹ دے (2)''۔ پس جب صبح ہوئی تو آپ اس آفت کی توقع کرنے لگیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ وہ میری دعا اس کے خلاف کر دے جو میری اہل میں سے رحمت کا مستحق نہیں ہے کیونکہ میں بھی انسان ہوں غصے میں ہو جاتا ہوں جیسا کہ انسان غصے میں ہو جاتا ہے''۔ اور یہ آیت نازل ہوئی؛ اسے ابو نصر قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اے اللہ! بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بشر ہے غضبناک ہوتا ہے جیسے انسان غصے میں ہوتا ہے اور بلاشبہ میں نے تجھ سے ایک عہد لے رکھا ہے اور تو ہرگز میرے ساتھ اس کا خلاف نہیں کرے گا پس جس مومن کو بھی کوئی اذیت پہنچاؤں یا اسے گالی دوں یا اسے کوڑے کے ساتھ ماروں تو تو اسے اس کے لئے کفارہ اور ذریعہ قربت بنا دے۔ اسے اس کے سبب قیامت کے دن اپنا قرب عطا فرمانا (3)'' اور اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔ اور کہا گیا ہے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا کا معنی ہے کہ وہ جلدی ملنے والی شے (دنیا) کو ترجیح دیتا ہے اگرچہ وہ قلیل ہے دیر سے ملنے والی پر (آخرت پر) اگرچہ وہ عظیم اور زیادہ ہے۔

وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝

''اور ہم نے بنایا ہے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں اور ہم نے مدھم کر دیا رات کی نشانی کو اور بنا دیا دن کی نشانی کو روشن تا کہ (دن کے اجالے میں) تم تلاش کرو رزق اپنے رب سے اور تا کہ تم جان لو سالوں کی تعداد اور حساب کو، اور ہر چیز کو ہم نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ یعنی ہم نے رات اور دن کو اپنی وحدانیت، وجود اور اپنے کمال علم و قدرت پر دو علامتیں اور نشانیاں بنایا۔ اور ان دونوں میں علامت اور نشانی یہ ہے: ان دونوں میں سے ہر ایک کا وہاں سے آنا جسے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، خلق الانسان خلقا لا یتمالك، جلد 2، صفحہ 327

2۔ مجمع الزوائد، کتاب علامات النبوۃ، ما جاء فی دعائہ واشتراطہ فیہ، جلد 8، صفحہ 477، حدیث 13993

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، من لعنہ النبی أو سبہ او دعا علیہ ولیس ھو اھلاً، جلد 2، صفحہ 324

نہیں جانتا اور اس کی طرف واپس لوٹتا ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ اور دونوں میں سے ایک کا دوسرے کے مقابلے میں کم اور زیادہ ہونا اور پھر اس کا برعکس ہو جانا، یہ بھی علامت اور نشانی ہے۔ اور اسی طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریک ہونا بھی ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَمَحَوْنَآ اٰیَةَ الَّیْلِ اور یہ نہیں فرمایا: فمحونا اللیل (ہم نے رات کو مٹا دیا) پس جب آیت (نشانی) کی اضافت رات اور دن کی طرف کی تو اس پر دلیل ہے کہ مذکورہ دونوں آیتیں (نشانیاں) ان دونوں کے لیے ہیں نہ کہ یہ دونوں ہیں۔ اور مَحَوْنَا کا معنی ہے: ہم نے مٹا دیا۔

اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم فرمایا تو انہوں نے اپنا پر چاند کے چہرہ پر سے گزارا تو اس کی روشنی مٹ گئی حالانکہ وہ ... روشنی میں سورج کی مثل تھا، اور وہ سیاہی جو چاند میں دکھائی دیتی ہے وہ اسی مٹنے کا اثر ہے۔ حضرت ابن عباس ... نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سورج کے ستر جز بنائے اور چاند کے بھی ستر جز بنائے، پھر چاند کے نور سے انہتر جز مٹا دیئے اور انہیں سورج کے نور کے ساتھ رکھ دیا۔ پس سورج کے نور کے ایک سو انتالیس جز بن گئے، اور چاند کا ایک جز باقی رہا۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے نور سے دو سورج پیدا کئے، اور پھر وہ کیا جو اس کے علم میں پہلے تھا کہ اس دنیا کے مشارق و مغارب کی مقدار کے برابر اس پر ایک سورج ہو، اور چاند کو سورج سے کم بنایا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے اپنا پر تین بار چاند کے چہرہ پر پھیرا اور وہ اس وقت سورج تھا پس اس کی روشنی مدہم پڑ گئی اور اس کا نور باقی رہا، پس وہ سیاہی جو تم چاند میں دیکھتے ہو وہ اس مٹنے کا اثر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اسے سورج ہی باقی رہنے دیتا تو پھر رات اور دن کے درمیان پہچان نہ ہو سکتی۔ پہلے قول کو ثعلبی نے اور دوسروں کو مہدوی نے ذکر کیا ہے اور عنقریب یہ مرفوع روایت بھی آئے گی۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ محو سے مراد وہ سیاہ داغ ہے جو چاند میں دکھائی دیتا ہے، تاکہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے کم ہو جائے اور رات دن سے ممتاز ہو جائے۔ وَجَعَلْنَآ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً یعنی ہم نے دن کے سورج کو آنکھوں کو روشن کرنے والا بنایا۔ ابو عمرو بن علاء نے بیان کیا ہے: یعنی وہ اس کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اور یہ عربوں کے قول میں سے ہے أبصر النهار جب دن خوب روشن ہو جائے، اور وہ اس حال میں ہو جائے کہ اس کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے اس قول کی طرح ہے خبیث مُخْبِث جب اس کے ساتھی خبثاء ہوں۔ اور رجل مضعف جب اس کی سواری کمزور ہو، پس اسی طرح النهار مبصرا جب اس کے اہل دیکھنے والے ہوں۔ لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ اس سے مراد معاش (اور کاروبار حیات) میں تصرف کرنا ہے۔ اور رات کے وقت آرام اور سکون کا ذکر نہیں کیا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے جو دن کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس: 67) (وہ ہے جس نے بنائی تمہارے لئے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا۔) وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ یعنی اگر وہ اس طرح نہ کرتا تو رات دن سے نہ پہچانی جا سکتی، اور نہ ہی حساب اور تعداد معلوم ہو سکتی۔ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا یعنی احکام تکلیفی میں سے ہر شے ہم نے تفصیل سے بیان کر

دی ہے، اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: 89) (اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38) (نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اور اس کی مخلوق میں سے سوائے آدم کے کوئی باقی نہ رہا تو اس نے اپنے عرش کے نور سے سورج اور چاند پیدا فرمائے اور یہ دونوں دو سورج تھے پس وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھا کہ وہ ان میں سے ایک کو سورج چھوڑے گا پس اس نے اسے اس دنیا کی مثل پیدا کیا جو اس کے مشارق و مغارب کے درمیان ہے اور رہا وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ ایک کو چاند بنا دے گا تو اسے اس نے سورج سے کم تخلیق فرمایا لیکن آسمان کی انتہائی بلندی میں ہونے اور زمین میں بہت دور ہونے کی وجہ سے یہ دونوں چھوٹے دکھائی دیتے ہیں پس اگر اللہ تعالیٰ سورج اور چاند دونوں کو اسی طرح چھوڑ دیتا جیسے اس نے ان دونوں کو تخلیق فرمایا تو رات کو دن سے نہ پہچانا جا سکتا اور نہ ایک مزدور یہ جان سکتا کہ وہ کب تک کام کرے گا اور نہ روزے دار کو معلوم ہوتا کہ وہ کب تک روزہ رکھے گا اور نہ عورت جان سکتی کہ وہ عدت کیسے گزارے گی اور نہ نمازوں اور حج کے اوقات معلوم ہو سکتے اور نہ قرض اتارے جا سکتے اور نہ یہ معلوم ہو سکتا کہ کس وقت بیج ڈالنا ہے اور فصل کاشت کرنی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بدنوں کو راحت پہنچانے کے لئے کب آرام کر سکتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف دیکھا اور وہ ان کے ساتھ ان کے اپنے آپ سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے چاند کے چہرے پر اپنا پر تین بار پھیرا اور وہ اس وقت سورج تھا پس اس سے روشنی مٹ گئی اور اس میں نور باقی رہ گیا پس اسی کے بارے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ الآیہ"۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝

"اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔ اور ہم نکالیں گے اس کے لئے روز قیامت ایک کتاب جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا۔ (اسے حکم ملے گا) پڑھو اپنا دفتر عمل تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کرنے کے لئے۔"

قولہ تعالیٰ: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ زجاج نے کہا ہے: عنق (گردن) کا ذکر لزوم (لازم ہونا) سے عبارت ہے جیسا کہ گردن کے لئے قلادہ (ہار) کا لازم ہونا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: طٰٓئِرَهٗ یعنی اس کا عمل اور جو اس پر خیر و شر میں سے مقدر ہے(1)، اور وہ اسے لازم ہوتا ہے جہاں وہ ہو۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی نیکی اور اس کی برائی اس کے ساتھ ہوگی۔ اس کا عمل اور اس کا رزق (اس کے ساتھ لازم ہے)، اور انہی سے مروی ہے: کوئی بچہ نہیں جو پیدا ہوتا ہے مگر اس کی گردن میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس میں اس کا شقی (بد بخت ہونا) یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 442

سعید(1) (سعادتمند ہونا) لکھا ہوتا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ یعنی اس کی شقاوت اور سعادت اور جو کچھ خیر و شر میں سے اس کے لئے لکھا ہوا ہے اور جو اس کے لئے تقدیر میں سے لکھا ہوا ہے(2)۔ (ہم نے وہ اسے لازم کر دیا ہے) یعنی وہ ازل میں تقسیم کے وقت اس کے لئے ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے ارادہ تکلیف (مکلف بنانا) کا ہے، یعنی ہم نے اسے شریعت کو لازم پکڑنے کا پابند بنا دیا ہے۔ اور وہ اس حیثیت سے ہے کہ اگر وہ وہ کام کرنا چاہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس سے باز رہے جس سے اسے روکا گیا ہے تو یہ اس کے لئے ممکن ہے۔ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا یعنی اس کی وہ کتاب جو اس کے گلے میں لٹکی ہوگی (اسے وہ قیامت کے دن اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا) حسن، ابو رجا اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم نے طَیْرَہٗ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور اسی کے مطابق وہ ہے جو خبر میں مروی ہے اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ اِلَّا خَيْرُكَ وَلَا طَيْرَ اِلَّا طَيْرُكَ وَلَا رَبَّ غَيْرُكَ (اے اللہ! کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے سوائے تیری بھلائی کے اور کوئی نصیب نہیں ہے سوائے تیرے نصیب (عطا کرنے کے) اور تیرے سوا کوئی رب (پروردگار) نہیں ہے۔) حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، ابن محیصن، ابو جعفر، اور یعقوب نے وَیَخْرُجُ یا کے فتحہ اور را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہوگا ویخرج له الطائر کتابا (اور اس کا نصیب ظاہر ہو گا اس حال میں کہ وہ لکھا ہو گا)۔ پس کتاباً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو: ویخرج الطائر فیصیر کتاباً (اور اس کا نصیب ظاہر ہو گا پس وہ لکھا ہوا ہو جائے گا)۔ اور یحییٰ بن وثاب نے وَیُخْرِجُ یا کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نکالے گا۔ اور شیبہ اور محمد بن سمیقع نے اور اسی طرح ابو جعفر سے بھی روایت ہے: وَیُخْرَجُ فعل مجہول کی بنا پر یا کے ضمہ اور را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کا معنی ہے: اور اس کے لئے قسمت کا نوشتہ نکالا جائے گا۔ اور باقیوں نے وَنُخْرِجُ نون کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے: بمعنی و نحن نُخْرِجُ (اور ہم نکالیں گے) ابو عمرو نے اس قرأت میں قول باری تعالیٰ: اَلْزَمْنٰهُ سے استدلال کیا ہے۔ اور ابو جعفر، حسن اور ابن عامر نے یُلَقّٰىهُ یا کو ضمہ، لام کو فتحہ اور قاف کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، بمعنی یُؤتاہ (وہ اسے دیا جائے گا) اور باقیوں نے یا کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ای یراہ منشورا (وہ اسے کھلا دیکھے گا) اور فرمایا: مَنْشُوْرًا یعنی نیکی کے سبب بشارت اور خوشخبری میں اور برائی کے سبب زجر و توبیخ میں جلدی کرنے والا۔ ابو السوار عدوی نے کہا ہے: اور یہ آیت پڑھی وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ اور فرمایا: یہ دونوں کھلے اور لپٹے ہوئے ہیں پس اے انسان! جب تک تو زندہ ہے تو تیرا صحیفہ کھلا ہوا ہے سو تو جو چاہے اس میں لکھوا لے، اور جب تو فوت ہو جائے گا تو اسے لپیٹ دیا جائے گا یہاں تک کہ جب تجھے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اسے کھولا جائے گا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ حسن نے کہا ہے: ہر انسان اپنا نامہ عمل پڑھ لے گا چاہے وہ پڑھا ہوا ہو یا نہ پڑھا ہوا ہو(3)۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا (آج کے دن تم خود ہی اپنے محاسبے کے لئے کافی ہو۔) اور بعض صلحاء نے کہا ہے: یہ کتاب ہے، تیری زبان اس کی قلم ہے، اور تیرا لعاب اس کی سیاہی ہے، اور تیرے اعضاء اس کے کاغذ ہیں اور تو ہے کہ تو اپنے محافظ فرشتوں (کراماً کاتبین)

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 61　2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 16　3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 18

کو لکھوانے والا ہے نہ اس میں زیادتی اور اضافہ کیا جائے گا اور نہ اس سے کچھ کم کیا جائے گا، اور جب تو اس سے کسی چیز کا انکار کرے گا تو اس بارے میں تجھ سے ہی تیرے خلاف شاہد اور گواہ ہوں گے۔

مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

''جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو وہ راہ ہدایت پر چلتا ہے اپنے فائدے کے لئے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے، اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو۔''

قولہ تعالیٰ: مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا یعنی بلاشبہ ہر ایک سے اس کی اپنی ذات کے بارے میں حساب لیا جائے گا کسی دوسرے کے بارے میں نہیں، پس جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو اس کے راہ ہدایت پر چلنے کا ثواب اسی کے لئے ہوگا، اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کے کفر (اور نافرمانی) کی سزا اسی پر ہوگی۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یہ سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس نے اہل مکہ کو کہا تھا: تم میری اتباع کرو اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر کرو اور تمہارا بوجھ مجھ پر ہوگا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی بلاشبہ ولید تمہارے گناہوں کو نہیں اٹھائے گا بلکہ ہر ایک کا گناہ اس کے اپنے اوپر ہوگا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَزَرَ یَزِرُ وِزْرًا وَ وِزْرَةً معنی ہے اس نے گناہ کیا۔ اور الوزر کا معنی ہے بھاری بھرکم بوجھ اور اس کی جمع أوزار ہے، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ (الانعام: 31) یعنی وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ وَ قَدْ وَزَرَ جب وہ اٹھا لے فھو وازر (تو وہ اٹھانے والا ہوگیا) اور اسی سے بادشاہ کا وزیر ہوتا ہے جو اس کی مملکت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ اور قول میں ھا ضمیر النفس سے کنایہ ہے، یعنی کسی گناہ کرنے والے نفس کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا، یہاں تک کہ والدہ قیامت کے دن اپنے بیٹے کو کہے گی: اے میرے بچے! کیا میری گود تیرے لئے فرش (بچھونا) نہیں رہی، کیا میری چھاتی تیرے لئے باعث سیرابی نہیں رہی، کیا میرا پیٹ تیرے لئے حفاظت کی جگہ نہیں رہا! تو وہ کہے گا: ہاں (کیوں نہیں) اے میری ماں! تو وہ کہے گی: اے میرے بیٹے! کیونکہ میرے گناہوں نے مجھے بوجھل کر دیا ہے پس تو مجھ سے ان میں سے ایک گناہ اٹھا لے۔ تو وہ کہے گا: اے میری ماں! مجھ سے دور ہو جا کیونکہ آج میں اپنے گناہوں کے سبب تجھ سے مشغول ہوں (یعنی میں تیرا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔)

مسئلہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے رد میں دلیل اخذ کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کے سبب عذاب دیا جاتا ہے (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 443

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعذب المیت ببعض بکاء اھلہ، جلد 1، صفحہ 171

شک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس شے نے اس پر ابھارا ہے کہ وہ یہ ہے جسے آپ نے سنا نہیں، اور دوسرا یہ کہ یہ آیت کے معارض ہے، حالانکہ ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اس معنی کے راوی کثیر ہیں، مثلاً حضرت عمر اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور قیلہ بنت مخرمہ رضی اللہ عنہم۔ اور یہ تمام روایت کے ساتھ یقین رکھنے والے ہیں، ان کے غلطی کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں ہے، اور آیت اور حدیث کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے، کیونکہ حدیث اس معنی پر محمول ہے جب نوحہ میت کی وصیت سے ہو اور اس کا طریقہ ہو، جیسا کہ وہ جاہلیت میں کرتے تھے۔

یہاں تک کہ طرفہ نے کہا ہے:

إذا مِتّ فانعيني بما أنا أهله　و شُقّي علىَ الجيب يا بنت معبَدِ

اور مزید کسی نے کہا:

إلى الحَول ثم اسمُ السلام عليكما　و من يَبْكِ حَوْلا كاملا فقد اعتذر

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت ان میں سے داؤد بھی ہیں وہ ظاہر حدیث کے اعتقاد کی طرف گئے ہیں کہ اسے ان کے نوحہ کے سبب عذاب دیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے انہیں اپنی موت سے پہلے اس (نوحہ) سے روکا نہیں، اور اس نے انہیں اس بارے ادب نہیں سکھایا، لہٰذا اسی تفریط کے سبب اسے عذاب دیا جائے گا اور اس ذمہ داری کو ترک کرنے کے سبب اسے عذاب دیا جائے گا جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا (التحریم:6) (تم بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے۔) نہ کہ کسی دوسرے کے گناہ کے عوض اسے عذاب دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا یعنی ہم نے مخلوق کو مہمل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ہم نے رسول بھیجے۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ احکام ثابت نہیں ہوتے مگر شریعت کے ساتھ، بخلاف معتزلہ کے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عقل قبیح اور حسین اور مباح اور ممنوع قرار دیتی ہے۔ اس بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا کے حکم میں ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی امت کو عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں کرے گا مگر ان کی طرف رسول اور ڈرانے والے بھیجنے کے بعد۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ دنیا اور آخرت میں عام ہے(1)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا (الملک) (جب بھی اس میں کوئی جتھا جھونکا جائے گا تو اس سے دوزخ کے محافظ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، وہ کہیں گے: کیوں نہیں، بے شک ہمارے پاس آیا تھا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ جس پر نظر وفکر پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت توحید کے ساتھ ہوئی اور آپ نے دلائل قائم کر کے اپنی اولاد میں اعتقادات پھیلائے جو کہ فطرت کی سلامتی کے ساتھ صانع پر دلالت کرتی ہیں اور عالم میں سے ہر ایک پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کی اتباع کرنا واجب قرار دیتی ہیں، پھر حضرت نوح علیہ السلام کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 444

زمانہ میں کفار کے غرق ہونے کے بعد تجدید ہوئی۔ اور اس آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ان کے بارے میں ہو جن تک کوئی پیغام رسالت نہیں پہنچا، اور وہ زمانہ فترت کے لوگ ہیں جن کے وجود کو بعض اہل علم نے مقدر کیا ہے۔

اور یہ جو روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کی طرف، مجانین (پاگل لوگ) اور بچوں کی طرف (رسول) بھیجے گا یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ وہ ہے جس کا تقاضا شریعت کرتی ہے کیونکہ آخرت دار تکلیف نہیں ہے (1)۔ مہدوی نے کہا ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اہل فترت، گونگوں اور بہروں کی طرف رسول بھیجے گا پس وہ انہیں وہ کچھ عطا کرے گا جو وہ چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں انہیں عطا کرے، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی؛ اسے معمر نے ابن طاؤس سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث موقوف ہے، اور عنقریب سورۂ طٰہٰ کے آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ایک قوم نے اس بارے میں استدلال کیا ہے کہ اہل جز: رجب اسلام کے بارے میں سنیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو جو گزر چکا ہے ان پر اس کی کوئی پابندی نہیں ہے اور یہ صحیح ہے۔ اور جن تک دعوت نہیں پہنچی تو وہ عقلی اعتبار سے عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝

”اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں اس میں، پس واجب ہو جاتا ہے ان پر (عذاب کا) فرمان پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہ رسول بھیجنے سے پہلے کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا، اس لئے نہیں کہ یہ اس کی طرف سے قبیح ہوگا اگر وہ ایسا کرے گا، بلکہ یہ اس کی طرف سے وعدہ ہے، اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب وہ اپنے وعدہ کے اس طرح ثابت ہونے کے ساتھ جس طرح اس نے کہا ہے کسی بستی کو ہلاک اور برباد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ وہاں کے رئیسوں کو فسق و فجور اور ظلم و ستم میں لگا دیتا ہے تو پھر ان پر ہلاکت و بربادی کا فرمان حق اور ثابت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے یہ بتا رہا ہے کہ جو کوئی ہلاک ہوا بلاشبہ وہ اس کے ارادہ کے ساتھ ہلاک ہوا، پس وہی ہے جو اسباب پیدا کرتا ہے اور انہیں اپنے انجام کی طرف لے جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کا قول سابق ثابت اور متحقق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَمَرْنَا ابو عثمان نہدی، ابو رجا، ابو العالیہ، ربیع، مجاہد اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے اَمَّرْنَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے (2)، یعنی ہم نے وہاں کے شریروں کو مسلط کر دیا پس انہوں نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 444　2۔ ایضاً

اس میں نافرمانی کی اور فسق و فجور کا ارتکاب کیا، پس جب انہوں نے ایسا کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اور ابوعثمان نہدی نے کہا ہے: امّرنا یعنی میم کی تشدید کے ساتھ (اس کا معنی ہے) تو ہم ان پر امراء بنا دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ ان پر غالب اور مسلط ہوتے ہیں؛ اور یہ ابن عزیز نے کہا ہے اور تأمّر علیھم کا معنی ہے تسلّط علیھم (وہ ان پر غالب ہو گیا، قابض ہو گیا) اور حسن نے بھی، قتادہ، ابوحیوہ شامی، یعقوب اور خارجہ نے نافع اور حماد سے انہوں نے ابن کثیر اور علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ان دونوں (قراتوں) کے خلاف پڑھا ہے: آمرنا یعنی مد اور تخفیف کے ساتھ، یعنی ہم اس کے جابروں اور رئیسوں کو زیادہ کر دیتے ہیں؛ یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: آمرتہ مد کے ساتھ ہو اور أمرتہ یہ دونوں لغتیں بمعنی کثرتہ (میں نے اسے زیادہ کر دیا) ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے خیر المال مُهرةٌ مأمورة او سِكّة مأبورة۔

یعنی بہترین مال وہ ہے جس کے بچے اور نسل کثیر ہو (1)۔ اور اسی طرح ابن عزیز نے کہا ہے: آمرنا اور أمرنا دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، یعنی اکثرنا (ہم نے زیادہ کر دیا) اور حسن سے بھی اور یحییٰ بن یامر سے اَمِرنا بغیر مد اور میم کے کسرہ کے ساتھ فَعِلنا کے وزن پر روایت ہے، اور اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت قتادہ اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اکثرنا اور اسی طرح ابوزید اور ابوعبید نے بیان کیا ہے، اور کسائی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: کثرت کے معنی میں فقط آمرنا مد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کی اصل أأمرنا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی ہے، اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور صحاح میں ہے: اور ابوالحسن نے کہا ہے أمِر مالُہ (یعنی میم کے کسرہ کے ساتھ) یعنی اس کا مال زیادہ ہو گیا۔ اور أمِر القوم یعنی قوم بڑھ گئی، زیادہ ہو گئی۔

شاعر نے کہا ہے:

أمِرون لا یرثون سَهمَ القُعْدُدِ

(وہ کثیر ہیں وہ قلیل الآباء کے حصے کے وارث نہیں ہو سکتے)

اور آمر اللہ مالہ (مد کے ساتھ) (اللہ تعالیٰ نے اس کا مال زیادہ کر دیا)۔ ثعلبی نے کہا ہے: کثیر شی کو أمِرٌ کہا جاتا ہے، اور اس سے فعل آتا ہے: أمِرَ القومُ یأمَرون أمراً جب قوم زیادہ ہو جائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب دور جاہلیت میں کوئی قبیلہ زیادہ ہو جاتا تو ہم اس کے لئے کہتے تھے: أمِرَ أمرُ بنی فلان (بنی فلاں کی تعداد بڑھ گئی)۔

جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

کل بنی حُرّۃ مَصیرُھُم قُلٌّ وان اکثرت من العددِ

اِن یُغْبَطُوا یَهبِطوا وان اَمِرُوا یوما یصیروا للهُلْكِ والنَّكَدِ (2)

تو اس میں أمِرُوا اکثرت کے معنی میں ہی استعمال ہو رہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہرقل کی حدیث میں ہے اور وہ حدیث صحیح ہے: لقد أمِرَ أمْرُ ابن ابی کبشہ، لیخافہ ملک بنی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1196 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 236

الأصفر، ای کثر۔ (یعنی ابن ابی کبشہ (مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کی تعداد زیادہ ہوگئی تاکہ بنی اصفر کا حاکم اس سے خوفزدہ ہوجائے۔) اور یہ سب غیر متعدی ہیں اسی لئے کسائی نے اس کا انکار کیا ہے، واللہ اعلم۔ مہدوی نے کہا ہے: جس نے أمِر پڑھا ہے تو وہ بھی ایک لغت ہے، اور أمِر کے متعدی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عَمِر کے مشابہ ہے اس حیثیت سے کہ کثرت کسی شے کو عمارۃ (آبادی) کے زیادہ قریب کرنے والی ہے پس یہ عَمِر کے متعدی ہونے کی طرح متعدی ہوا۔ اور باقیوں نے اَمَرْنَا، الأمر سے بنایا ہے، یعنی ہم نے انہیں اطاعت کے بارے حکم دیا الزام سے برأت کے لئے، خوفزدہ کرنے کے لئے اور وعید سناتے ہوئے۔ فَفَسَقُوْا یعنی وہ ہماری نافرمانی کرتے ہوئے ہماری اطاعت سے نکل گئے۔ فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ پس ان پر وعید (ہلاکت و بربادی) واجب ہوگئی، ثابت ہوگئی: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَمَّرْنَا یعنی ہم نے انہیں امراء بنادیا، کیونکہ عرب کہتے ہیں: أمیر غیر مأمور یعنی امیر وہ ہے جس پر کوئی امیر نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے اس کے تکبر کرنے والوں کو بھیج دیا۔ ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابی کی قرأت ہے: ''ہم نے اس میں بڑے بڑے مجرم بھیج دیئے اور انہوں نے فسق و فجور کا ارتکاب کیا۔'' اسے ماوردی نے بیان کیا ہے۔

اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور ہارون نے ابی کی قرأت میں کہا ہے: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں اس کے بڑے بڑے مجرم بھیج دیتے ہیں پس وہ اس میں مکر و فریب کرتے ہیں تو اس پر (عذاب کا) فرمان واجب ہوجاتا ہے۔ واذا أردنا أن نهلك قرية بعثنا فيها أكابر مجرميها فمكروا فيها فحق عليها القول، اور یہ بھی جائز ہے کہ أمَرْنا بمعنی اکثرنا ہو، اور اسی سے خیر المال مهرة مأمورة (1) ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مامورۃ مأبورۃ کے تابع ہے، جیسا کہ الغدایا والعشایاہیں اور جیسا کہ آپ کا یہ قول ہے: ارجعن مأزورات غير مأجورات (2) (گناہ کرنے والیاں بغیر کسی اجر کے لوٹ جائیں۔) اور اس بنا پر یہ نہیں کہا جاتا: امرهم الله، بمعنی كثرهم (اللہ تعالیٰ نے انہیں زیادہ کردیا)، بلکہ یہ کہا جائے گا: آمرۃ اور أمرۃ (اس نے اسے زیادہ کردیا) اور ابوعبید اور ابوحاتم نے قرأت عامہ کو اختیار کیا ہے۔ ابوعبید نے کہا ہے: بلاشبہ ہم نے امرنا کو اختیار کیا ہے کیونکہ اُمر، امارت اور کثرت میں سے تینوں معنی اس میں جمع ہیں اور المترف سے مراد خوشحال اور رئیس ہے اور انہیں اُمر کے ساتھ خاص اس لئے کیا ہے کیونکہ ان کے سوا دوسرے لوگ ان کے تابع ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَدَمَّرْنٰهَا یعنی ہم ہلاکت کے سبب اسے جڑ سے اکھیڑ دیتے ہیں۔ تَدْمِيْرًا مصدر کا ذکر ان پر واقع ہونے والے عذاب میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔ اور صحیح میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں ان کی حدیث ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1196

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ماجاء فی اتباع النساء الجنائز، صفحہ 144

آپ گھبرائے ہوئے تھے اور آپ کا چہرہ سرخ تھا آپ فرمانے لگے: ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں عربوں کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے اس شر سے جو قریب آچکا ہے آج یاجوج ماجوج کی دیوار سے اتنا سا سوراخ ہو گیا ہے'' (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے حلقہ سا بنایا۔ آپ فرماتی ہیں: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم ہلاک ہو جائیں (2) گے حالانکہ ہم میں صالحین موجود ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں جب خبث (پلیدی) بڑھ جائے گا''۔ اس بارے میں کلام پہلے گزر چکی ہے۔ بے شک گناہ اور معاصی جب ظاہر ہو جائیں اور انہیں تبدیل نہ کیا جائے تو وہ تمام کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

''اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے نوح کے بعد، اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر ہے (اور انہیں) خوب دیکھنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ یعنی کتنی قومیں ہیں جنہوں نے کفر کیا اور ان پر ہلاکت و بربادی آئی۔ (اللہ تعالیٰ) کفار مکہ کو ڈرا رہا ہے اور قرن کے بارے میں سورۃ الانعام میں کلام گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا، خَبِیْرًا یعنی آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے والا ہے۔ بَصِیْرًا (اور) ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

''اور جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں، پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے جہنم تاپے گا وہ اسے اس حال میں کہ وہ مذمت کیا ہوا (اور) ٹھکرایا ہوا ہو گا، اور جو شخص طلبگار ہوتا ہے آخرت کا اور جدوجہد کرتا ہے اس کے لئے پوری طرح درآنحالیکہ وہ مومن بھی ہو، پس یہ وہ (خوش نصیب ہیں) جنکی کوشش مقبول ہو گی۔''

قولہ تعالیٰ: مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ مراد دنیا ہے، اور مراد الدار العاجلۃ (یعنی جو لوگ طلبگار ہیں صرف دار دنیا کے)، تو اس میں منعوت کو نعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ یعنی ہم اس میں سے اسے عطا نہیں کرتے مگر جو ہم چاہتے ہیں پھر ہم اس کے عمل کے مطابق اس کا مواخذہ کریں گے، اور اس کا انجام جہنم میں داخل ہونا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویل للعرب من شر قد اقترب، جلد 2، صفحہ 1046

2۔ ایضاً

مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا یعنی اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھگایا ہوا اور دور کیا ہوا ہوگا اور یہ فاسق منافقوں کی صفت ہے، اور ان ریا کاری اور دکھاوا کرنے والوں کی جو اندر کینہ چھپا کر ظاہر داری کرتے ہیں، وہ اسلام اور طاعت کا لبادہ اوڑھتے ہیں تا کہ وہ جلدی ملنے والی دنیا کے منافع اور فوائد وغیرہ کو حاصل کریں، پس آخرت میں ان سے وہ عمل قبول نہیں کیا جائے گا اور دنیا میں انہیں صرف وہ دیا جائے گا جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور سورۂ ہود میں یہ گزر چکا ہے کہ یہ آیات ان آیات مطلقہ کو مقید کر رہی ہے، پس تو اس میں غور کر لے۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ یعنی اور جو دار آخرت کے طلبگار ہیں۔ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا یعنی اس نے طاعات وعبادات میں سے جو عمل کئے وہ آخرت کے لئے کئے۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ کیونکہ طاعات وعبادات قبول نہیں کی جاتیں مگر مومن سے۔ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا پس ان کی سعی وکوشش مقبول ہوگی مردود نہیں ہوگی۔ اور کہا گیا ہے: مضاعفا یعنی ان کے لئے نیکیوں کو دس گنا تک اور ستر گنا تک، اور سات سو گنا تک، (بلکہ) کثیر گنا تک بڑھا دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے تحقیق انہیں کہا گیا: کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر ہزار ہزار نیکی کا بدلہ اور جزا دیتا ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر دو لاکھ گنا تک نیکیوں کا ثواب اور جزا عطا فرماتا ہے۔''

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰــهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

''ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں ان کی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے، اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ دیکھو! کیسے بزرگی دی ہے ہم نے بعض کو بعض پر اور آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل وکرم کے سب سے اعلیٰ ہے۔ نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تم بیٹھ رہو گے اس حال میں کہ تمہاری مذمت کی جائے گی اور بے یار ومددگار ہو جاؤ گے۔''

قولہ تعالیٰ: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ تو یہ جان لے کہ وہ مومنوں اور کافروں سبھی کو رزق دیتا ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا یعنی آپ کے رب کی عطا کسی کے لئے ممنوع اور بند نہیں ہے: محظور یہ حظر یحظر حظرا و حظارا سے ماخوذ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ دیکھو! ہم نے رزق اور عمل میں بعض کو بعض پر کیسے فضیلت دی، پس ان میں سے تنگ دست بھی ہیں اور خوشحال و دولتمند بھی (اسی طرح عمل کے اعتبار سے کچھ کمزور ہیں اور کچھ اعلیٰ۔) وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا یعنی مومنوں کے لئے آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل وکرم کے سب سے اعلیٰ ہے اور وہ کافر تو اگرچہ دنیا میں اسے ایک بار وسعت دی گئی، اور مومن پر ایک بار تنگی آئی لیکن آخرت ان کے اعمال کے اعتبار سے صرف ایک بار تقسیم کی جائے گی، پس جس سے کوئی شے ایک بار فوت ہوگئی تو پھر وہ اسے اس میں نہیں پا سکے گا۔ اور قول باری تعالیٰ: لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰــهًا اٰخَرَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ

کی امت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب انسان کو ہے (کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ)۔ فَتَقْعُدَ ورنہ تم باقی رہو گے۔ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا اس حال میں کہ نہ تمہارا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی دوست۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝

''اور حکم فرمایا آپ کے رب نے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اگر بڑھاپے کو پہنچ جائے تیری زندگی میں ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں تو انہیں اف تک مت کہو اور انہیں مت جھڑکو، اور جب ان سے بات کرو تو بڑی تعظیم سے بات کرو۔ اور جھکا دو ان کے لئے تواضع و انکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے اور عرض کرو: اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے (بڑی محبت و پیار سے) مجھے پالا تھا جب میں بچہ تھا۔''

اس میں سولہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قَضٰى اس کا معنی ہے اَمَرَ (تیرے رب نے حکم دیا)، الزم (اس نے لازم کیا) اور اَوْجَبَ (اس نے واجب کیا) حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یہ قضا حکم نہیں ہے بلکہ یہ قضا امر ہے۔ اور مصحف حضرت ابن مسعود میں وَوَصّٰى ہے اور یہی آپ کے اصحاب کی قرأت ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: بلاشبہ یہ وَوَصّٰى ربك ہے پس دو واؤں میں سے ایک کو قاف سے بدل دیا اور اسے وَقَضٰى رَبُّكَ پڑھا گیا کیونکہ اگر یہ قضا (حکم) ہوتا تو پھر کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور حکم عدولی نہ کرتا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: ایک قوم پر مصحف لکھتے وقت تصحیف ہوتی جس وقت واؤ صاد کیساتھ ملی وصی بقضی (یعنی وصی کو قضی سے بدل دیا) ابو حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضحاک کے قول کی مثل ہی ذکر کیا ہے۔ اور میمون بن مہران سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر دلیل موجود ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ (الشوریٰ: 13) (اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لئے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف) پھر ابو حاتم نے انکار کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہو۔ اور کہا: اگر ہم یہ کہیں تو پھر زنادقہ ہمارے مصحف کے بارے میں طعن کریں گے۔ پھر ہمارے علمائے متکلمین وغیرہ نے کہا ہے: لفظ قضا لغت میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، پس قضا بمعنی امر ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ یعنی تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم عبادت نہ کرو مگر اسی کی۔ اور قضا بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے؛ جیسے قول باری تعالیٰ ہے: فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (فصلت: 12) یعنی اس نے انہیں دو دنوں میں تخلیق فرمایا۔

اور قضا بمعنی حکم (فیصلہ کرنا) ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ: 72) یعنی تو فیصلہ کر جو تو فیصلہ کرتا ہے۔ اور قضا بمعنی الفراغ (فارغ ہونا) ہے؛ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ (یوسف) (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔ یعنی وہ اس سے فارغ ہوا۔ اور اسی معنی میں یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (البقرہ: 200) (پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان) ل باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ (الجمعہ: 10) (پھر جب پوری ہو چکے نماز)۔

اور قضا بمعنی ارادہ بھی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (غافر) (جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے) اور قضا بمعنی عہد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ (القصص: 44) (اور آپ نہیں تھے (طور) کی مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف (حکم بھیجا)، تو جب قضا ان معانی کا احتمال رکھتا ہے تو پھر اس قول کا اطلاق جائز نہیں ہے کہ معاصی اللہ تعالیٰ کی قضا سے ہوتی ہیں، کیونکہ اگر اس سے امر مراد لیا جائے تو پھر اس کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان (معاصی) کے بارے میں حکم نہیں دیا، کیونکہ وہ فحشاء (برائیوں) کے بارے حکم نہیں دیتا۔ اور زکریا بن سلام نے کہا ہے: ایک آدمی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا بے شک اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور وہ تجھ سے جدا ہو گئی ہے، تو اس آدمی نے کہا: (کیا) اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے؟ تو حضرت حسن نے فرمایا حالانکہ آپ بڑے فصیح تھے: ماقضی اللہ ذالك یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے حکم نہیں دیا۔ اور پھر یہ آیت پڑھی: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنی توحید کے بارے حکم ارشاد فرمایا، اور والدین کے ساتھ نیکی کرنے کو اس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے، جیسا کہ آپ نے ان دونوں کا شکر ادا کرنے کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے اور فرمایا ہے: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اور فرمایا: اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ (لقمان) (کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے)۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نماز اپنے وقت پر ادا کرنا''۔ عرض کی: پھر کون سا عمل؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا''۔ عرض کی: پھر کون سا عمل؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا'' (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا اس نماز کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ووصینا الانسان بوالدیہ، جلد 2، صفحہ 882

بعد افضل ترین عمل ہے جو اسلام کے ارکان میں سے سب سے عظیم رکن ہے۔ اور اسے اس ثُمَّ کے ساتھ مرتب کیا جو ترتیب اور مہلت کا فائدہ دیتا ہے۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الصلوۃ علی وقتھا'' قال ثم ای؟ قال ''ثم برّ الوالدین'' قال ثم ای؟ قال ''الجھاد فی سبیل اللہ''۔

مسئلہ نمبر 3۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ گالی گلوچ کرتے ہوئے تعرض اور چھیڑ چھاڑ نہ کرے اور نہ ان کی نافرمانی کرے، کیونکہ بلا اختلاف یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اور اس کے بارے سنت ثابتہ (صحیحہ) موجود ہیں، پس صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک کبیرہ گناہوں میں سے کسی آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا ہے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! ؟ کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''۔ ایک آدمی کسی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور ایک آدمی دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے۔'' (انّ من الکبائر شتم الرجل والدیه قالوا: یا رسول اللہ، و ھل یَشْتُمُ الرجل والدیه؟ قال نعم، یسبّ الرجل أبا الرجل فیَسُبّ أباہ و یَسُبُّ أُمَّه فیسبّ امّه)(1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ عقوق الوالدین (والدین کی نافرمانی) ان کی جائز اغراض میں ان کی مخالفت کرنا ہے، جیسا کہ ان کے ساتھ نیکی کرنے کا معنی ان کی اغراض میں ان کے ساتھ موافقت کرنا ہے۔ اس بنا پر جب وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اپنی اولاد کو کسی کام کے بارے حکم دیں تو اس بارے میں ان کی اطاعت کرنا واجب ہے، جب وہ امر معصیت اور گناہ کا نہ ہو، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ مامور بہ مباح کے قبیلے سے ہو، اسی طرح حکم ہے جب وہ مندوب کے قبیل سے ہو۔ اور بعض لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مباح کے بارے ان دونوں کا حکم دینا اولاد کے حق میں اسے مندوب بنا دیتا ہے اور ان دونوں کا مندوب کے بارے حکم دینا اس کے مندوب ہونے میں مزید تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میرے عقد میں ایک عورت تھی میں اسے پسند کرتا تھا، اور میرے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) اسے ناپسند کرتے تھے پس انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں تو میں نے انکار کر دیا، پھر میں نے یہ واقعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے عبد اللہ ابن عمر! تو اپنی بیوی کو طلاق دے دے (2)''۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (3) کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: لوگوں میں سے کون میرے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ اس نے عرض کی: پھر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیری ماں ہے''۔ اس نے عرض کی: پھر کون ہے؟

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر و اکبرھا، جلد 1، صفحہ 64

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، ما جاء فی الرجل یسأله ابوہ أن یطلق امراته، جلد 1، صفحہ 142، ایضاً، حدیث 1110، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلہ و الادب، بر الوالدین و انھما أحق به، جلد 2، صفحہ 312

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیری ماں ہے''۔ اس نے عرض کی: اس کے بعد کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیرا باپ ہے''۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کی محبت اور اس پر شفقت باپ کی محبت کی تین مثل ہونی چاہئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا ذکر تین بار فرمایا اور باپ کا ذکر صرف چوتھی بار فرمایا۔ اور جب اس معنی کو جوڑا جائے تو اس کے کئی شواہد مل جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ حمل کی صعوبت اور اسے وضع کرنے کی تکلیف، اور دودھ پلانے اور تربیت کرنے کی صعوبت (ایسی چیزیں ہیں) جن کے ساتھ باپ کے سوا ماں منفرد ہوتی ہے، پس یہی وہ تین منازل ہیں جن سے باپ علیحدہ اور خالی ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان سے ایک آدمی نے کہا: میرا باپ سوڈان میں ہے، اور اس نے میری طرف لکھا ہے کہ میں اس کے پاس آؤں، اور میری ماں مجھے اس سے منع کر رہی ہے، تو آپ نے اسے فرمایا: تو اپنے باپ کی اطاعت کر، اور اپنی ماں کی نافرمانی نہ کر۔

پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس پر دلیل ہے کہ ان کے نزدیک دونوں کے ساتھ نیکی کرنا اور احسان کرنا برابر ہے۔ تحقیق حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے اسے ماں کی اطاعت و پیروی کرنے کا حکم دیا اور یہ گمان کیا کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے دو ثلث ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے تین چوتھائی ہیں اور یہی اس۔ کے خلاف حجت ہے جس نے اختلاف کیا ہے۔ اور محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الرعایہ'' میں یہ بیان کیا ہے کہ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے تین چوتھائی اور باپ کے لئے ایک چوتھائی ہے؛ اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقتضا کی بنا پر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنا اس کے ساتھ مختص نہیں ہے کہ وہ دونوں مسلمان ہوں، بلکہ اگر وہ کافر بھی ہوں تب بھی وہ ان سے نیکی کرے گا اور حسن سلوک سے پیش آئے گا جب ان کے لئے کوئی معاہدہ اور امان ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ (الممتحنۃ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو)۔

اور صحیح بخاری میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میری ماں آئی اور وہ مشرکہ تھی قریش کے عہد اور ان کی مدت میں جب کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا (وہ) اپنے باپ کے ساتھ آئی، تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا اور عرض کی: بے شک میری ماں آئی ہے اور وہ رغبت رکھتی ہے کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں تو اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر (1)''۔ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد (2) میں میری ماں رغبت رکھتے ہوئے میرے پاس آئی تو میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اس سے صلہ رحمی کر سکتی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' ابن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب، صلۃ المرأۃ امہا ولہا زوج، جلد 2، صفحہ 884 2۔ ایضاً، کتاب الأدب، صلۃ لوالد المشرک، جلد 2، صفحہ 884

عیینہ نے کہا ہے: پس اللہ عزوجل نے انہی کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ہے: لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ (الممتحنہ:8)

پہلی روایت معلق ہے اور دوسری مسند ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ان دونوں کے ساتھ احسان اور نیکی میں سے یہ بھی ہے کہ جب جہاد متعین (فرض عین) نہ ہو تو وہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہ جائے۔ صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے کہا: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''پس تو ان دونوں (کی خدمت) میں رہ اور جہاد کر (1)''۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اور غیر صحیح میں الفاظ یہ ہیں اس نے کہا: جی ہاں، میں نے انہیں روتے ہوئے چھوڑا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تو جا اور انہیں ہنسا جیسا کہ تو نے انہیں رلایا ہے (2)''۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تیرا اپنے والدین کے ساتھ ان کے بستر پر سونا کہ وہ تیرے ساتھ ہنسی مزاح کریں اور تیرے ساتھ دل بہلائیں یہ تیرے لئے میرے ساتھ جہاد پر جانے سے افضل ہے۔'' اسے ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے۔ اور بخاری کے الفاظ ''کتاب برالوالدین'' میں یہ ہیں ہمیں ابو نعیم نے خبر دی اور سفیان نے ہمیں عطاء بن سائب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے خبر دی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ وہ آپ کی ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہے، اور اس نے اپنے والدین کو روتے ہوئے چھوڑا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تو ان کی طرف لوٹ جا اور تو انہیں اسی طرح ہنسا جیسے تو نے انہیں رلایا ہے۔'' ابن منذر نے کہا ہے: اس حدیث میں والدین کی اجازت کے بغیر نکلنے سے منع کیا گیا ہے جب تک نفیر عام نہ ہو، اور جب (حاکم وقت کی جانب سے) جہاد کے لئے اعلان عام ہو جائے تو پھر تمام پر نکلنا واجب ہے۔

اور یہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بالکل بین اور واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جیش الامراء بھیجا...... اور حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب، اور حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کا قصہ بیان کیا اور یہ کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منادی نے اعلان کیا کہ نماز تیار ہے (الصلوٰۃ جامعۃ)، پس لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! نکلو اور اپنے بھائیوں کی مدد کرو اور کوئی پیچھے نہ رہے۔'' پس لوگ شدید گرمی میں پیدل چلتے ہوئے اور سوار ہو کر نکلے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد: اخرجوا فامدوا اخوانکم اس پر دلیل ہے کہ جہاد سے پیچھے رہنے کا عذر اس وقت تک ہے جب تک نفیر عام نہ ہو، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والأدب، تقدیم بر الوالدین، جلد 2، صفحہ 313

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب الرجل یغزو الخ، حدیث نمبر 2771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب الرجل یغزو ولہ ابوان، صفحہ 205

فانفروا (1) (پس جب تم سے مدد طلب کی جائے تو مدد کیا کرو)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام احادیث اس پر دلیل ہیں کہ فرائض اور مستحبات جب جمع ہو جائیں تو پھر ان میں سے اہم کو مقدم کیا جائے۔ یہ بحث مکمل طور پر محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ''الرعایہ'' میں بیان کی ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ مشرک والدین کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی اجازت کے ساتھ نکلا جائے گا جب کہ جہاد فروض کفایہ میں سے ہے، تو امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: آدمی ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہو گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہو۔ ابن منذر نے کہا ہے: دادے بھی باپ ہیں اور دادیاں بھی مائیں ہیں پس آدمی ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہو گا اور میں کوئی دلیل نہیں جانتا جو ان کے علاوہ بھائیوں اور دیگر تمام رشتہ داروں میں سے کسی کے لئے یہ حکم ثابت کرتی ہو۔ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ بہنوں کے بارے میں کوشش اور دوڑ دھوپ کرنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل گمان کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 10۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کی تکمیل میں سے ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے، پس صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک بہترین نیکی آدمی کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر لے (2)''۔ (یعنی باپ فوت ہو جائے) حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ نے روایت ذکر کی ہے اور یہ بدری صحابی تھے۔ فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انصار میں سے ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا میرے والدین کے فوت ہونے کے بعد نیکی اور احسان میں سے کوئی شے باقی ہے جس کے ساتھ میں ان دونوں کے ساتھ نیکی اور احسان کر سکوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''، ان پر نماز جنازہ پڑھنا، ان کیلئے استغفار کرنا، ان کے بعد ان کے وعدہ کو پورا کرنا، ان کے دوستوں کی تکریم کرنا اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا جن کے ساتھ تیرا تعلق صرف انہیں کی جانب سے ہو پس یہی وہ امور ہیں جو تجھ پر باقی ہیں۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کی طرف ان کے ساتھ نیکی اور وفا کرتے ہوئے تحائف بھیجا کرتے تھے حالانکہ آپ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفیقۂ حیات ہیں، تو پھر والدین کے بارے تیرا کیا خیال ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا یہاں بڑھاپے کی حالت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ حالت ہے جس میں وہ دونوں آدمی کے احسان اور نیکی کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کی حالت اور کیفیت تبدیل ہو چکی ہوتی ہے، پس اس حالت میں ان دونوں کے احوال کا لحاظ رکھنا (اور ان کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، المبایعۃ بعد فتح المکۃ علی الاسلام والجہاد، جلد 2، صفحہ 130

2۔ ایضاً، کتاب البر والصلۃ والادب۔ فضل الصلۃ اصدقاء الاب والام و نحوھما، جلد 2، صفحہ 314

3۔ سنن ابی داؤد، باب فی بر الوالدین، حدیث 4476، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دیکھ بھال کرنا) اس سے زیادہ لازم قرار دی ہے جتنی اس سے پہلے لازم کی ہے، کیونکہ وہ اس حالت میں اس پر بھاری ہو گئے ہیں پس وہ بڑھاپے میں اس شے کے ملنے کے محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں جس کا وہ اپنے بچپن اور صغرسنی میں محتاج تھا کہ وہ اس سے وہ برتاؤ کریں، پس یہی وجہ ہے کہ ذکر کے ساتھ اسی حالت کو خاص کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ طویل مدت تک آدمی کا ٹھہرے رہنا عادۃً آدمی کے لئے بوجھل اور گراں ہو جاتا ہے اور اکتاہٹ حاصل ہو جاتی ہے اور تنگی بڑھ جاتی ہے پس اس کا غصہ اپنے والدین پر ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی رگیں ان کے لئے پھولنے لگتی ہیں، اور بیٹا ہونے کے ناطے سے اس کا جرأت کرنا اور دیانت کا کم ہونا ان دونوں پر گراں گزرتا ہے، اور کم سے کم مکروہ اور ناپسندیدہ وہ رویہ ہے جو تنگی اور پریشانی سے اس کی سانس کے مضطرب اور متردد ہونے کے سبب ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ایسی گفتگو اور قول کرے جو عزت و کرامت کے ساتھ متصف ہو، اور وہ ہر عیب سے محفوظ و مامون ہو پس ارشاد فرمایا: **فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا**۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (1) سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو" عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کس کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اپنے والدین میں سے ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔" اور بخاری نے "کتاب برالوالدین" میں بیان کیا ہے، مسدد نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) بشر بن مفضل نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) عبدالرحمن بن اسحاق نے ابوسعید مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو اپنے پاس بڑھاپے کی حالت میں پایا اور انہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کیا، اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس پر رمضان المبارک کا مہینہ آیا پھر وہ اس سے پہلے گزر گیا کہ اس کی مغفرت کی جائے (2)"۔

ابن ابی اویس نے ہمیں بیان کیا ہے کہ میرے بھائی نے سلیمان بن بلال سے، انہوں نے محمد بن ہلال سے، انہوں نے سعد بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سالمی سے اور انہوں نے اپنے باپ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: بے شک حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "منبر لاؤ" پس جب آپ باہر تشریف لائے تو منبر پر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو فرمایا: "امین" پھر دوسرے زینہ پر چڑھے تو فرمایا: "امین" پھر تیسرے زینہ پر بلند ہوئے تو فرمایا: "آمین"، پس جب آپ فارغ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لائے تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق آج ہم نے آپ سے وہ شے سنی ہے جو پہلے ہم آپ سے نہیں سنتے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم نے اسے سنا ہے"؟ ہم نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک حضرت جبرائیل علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔ فضل الصلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما، جلد 2، صفحہ 314

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ماجاء فی جامع الدعوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 671

السلام پیش ہوئے اور کہا: وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہو جس نے رمضان المبارک کو پایا اور اس کی مغفرت نہ کی گئی تو میں نے کہا آمین۔ اور جب میں دوسری سیڑھی پر چڑھا تو انہوں نے کہا وہ دور ہو جس کے پاس آپ کا ذکر کیا گیا اور اس نے آپ پر درود پاک نہ پڑھا تو میں نے کہا: آمین۔ اور جب میں تیسرے زینے پر بلند ہوا تو انہوں نے کہا وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہوا جس نے اپنے پاس اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور انہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کیا تو میں نے کہا: آمین (1)"۔

ابونعیم نے ہمیں بیان کیا ہے (انہوں نے کہا) ہمیں سلمہ بن وردان نے بیان کیا ہے میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر ایک سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین"۔ پھر دوسری سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین" پھر تیسری سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین"، پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تو آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے آمین کس پر کہی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے کہا: اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس آپ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود پاک نہ پڑھے تو میں نے کہا: آمین، اور اس کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو پایا اور وہ جنت میں داخل نہ ہوا تو میں نے کہا: آمین (2)" الحدیث۔ پس سعادت مند وہ ہے جو ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کی فرصت کو غنیمت جانتا ہے تاکہ وہ ان کی موت کے سبب اس سے فوت نہ ہو جائے کہ پھر وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہو۔ اور شقی (بدبخت) وہ ہے جس نے ان کی نافرمانی کی، بالخصوص وہ جس تک ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کا حکم پہنچا ہوا ہو۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ یعنی تم انہیں اتنا بھی نہ کہو جس میں معمولی سا بھی زچ کرنا ہو۔ ابورجا عطاروی نے کہا ہے: الأف سے مراد وہ کلام ہے جو فحش، ردی اور خفی ہو۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے جب تو انہیں بڑھاپے کی حالت میں اس بول و براز میں دیکھے جو انہوں نے طفولیت کی حالت میں دیکھا تو تو انہیں گندہ خیال نہ کر (اور ان سے گھن نہ کر) کہ تو کہے: اف۔ اور آیت اس سے عام ہے۔ اور اف اور تف سے مراد ناخنوں کی میل کچیل ہے۔ اور ہر وہ شے جو بے چین اور تنگ کرتی ہے اور ثقیل سمجھی جاتی ہے اس کے لئے اُف کہا جاتا ہے۔ ازہری نے کہا: التُّفف سے حقیر شے بھی مراد ہے۔ اور اُف کو منون اور مجرور پڑھا گیا ہے، جیسا کہ اُصوات (آوازیں) کو جر دی جاتی ہے اور انہیں تنوین کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جب آپ کہتے ہیں: صَہٍ اور مَہٍ۔ اور اس میں دس لغات ہیں: اُفٌ، اُفُ، اِفِ، اُفًّا، اُفِّ، اُفَّ، اُفَّۃٌ، اِف لک (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) اُف (ہمزہ اور فا کے سکون کے ساتھ) اور اُفًا (یعنی فا کی تخفیف کے ساتھ)۔

اور حدیث میں ہے: "پس آپ نے اپنے کپڑے کی ایک طرف اپنی ناک پر رکھی پھر کہا: اُف اُف" ابوبکر نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس شے کی بو اور گندگی محسوس کرنا جسے سونگھے۔ اور بعض نے کہا ہے: اف کا معنی ہے کسی کو حقیر اور قلیل جاننا، یہ

1۔ الترغیب والترہیب، ترہیب من دعا الانسان علی نفسہ وولدہ وخادمہ ومالہ، جلد 2، صفحہ 504، حدیث 2495

2۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 41، حدیث 43848

الافف سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی قلیل ہونا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: اس کا اصل معنی ہے تیرا کسی ایسی شے کو پھونک مارنا جو ریت اور مٹی وغیرہ سے تجھ پر گرتی ہے، اور اس جگہ کے لئے جس سے تو کوئی شے دور کرنے اور ہٹانے کا قصد کرے تا کہ تو وہاں بیٹھ سکے، پس ہر ثقیل (اور ناپسندیدہ) شے کے لئے یہ کلمہ کہا گیا ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: الأف سے مراد ناخنوں میں پائی جانے والی میل کچیل ہے اور التف سے مراد ناخنوں کے کٹے ہوئے ریزے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: اُف کا معنی بدبو ہے۔ اور اصمعی نے کہا ہے: الأف سے مراد کان کی میل ہے، اور التف سے مراد ناخنوں کی میل ہے، پس اس کا استعمال کثیر ہے یہاں تک کہ اسے ہر اس شے میں ذکر کیا گیا ہے جس کے ساتھ کسی کو اذیت دی جاتی ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ عقوق (نافرمانی) میں سے کوئی شے اُف سے بھی ادنیٰ اور گھٹیا پاتا تو یقیناً وہ اس کا ذکر کرتا پس نیکی اور احسان کرنے والا جو عمل کرنا چاہے کرے وہ ہرگز جہنم میں داخل نہ ہوگا) ۔ اور والدین کی نافرمانی کرنے والا جو چاہے عمل کرے وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک والدین کے لئے اس کا اُف کہنا سب سے گھٹیا اور ادنیٰ لفظ ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو کفران نعمت اور ناشکری کے طور پر چھوڑا ہے، اور تربیت کا انکار کیا ہے، اور اس وصیت کو رد کیا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمائی۔ اور اُف وہ کلمہ ہے جو ہر چھوڑی ہوئی شے کے لئے کہا گیا ہے؛ اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانبیاء: 67) (تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا) یعنی تم کو اور تمہارے ساتھ ان بتوں کو چھوڑنا ہے۔

مسئلہ نمبر 13 ۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَنْهَرْهُمَا۔ النهر کا معنی جھڑکنا اور غصے کا اظہار کرنا ہے۔ وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا یعنی تو ان سے بڑی لطافت اور نرمی کے ساتھ گفتگو کرے۔ مثلاً: یا ابتاہ و یا اُماہ (اے ابا، اے اماں) بغیر اس کے کہ ان کا نام پکارے یا ان کی کوئی کنیت پکارے؛ یہ عطا نے کہا ہے۔ اور ابو البداح تجیبی نے کہا ہے: میں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو کہا قرآن کریم میں والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کے بارے جو کچھ ہے اسے میں جانتا ہوں سوائے اس قول باری تعالیٰ کے: وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا یہ قول کریم کیا ہے؟ تو حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلطی کرنے والے غلام کا اپنے آقا کو درشت اور سخت کلمات کہنا۔

مسئلہ نمبر 14 ۔ قولہ تعالیٰ: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ یہ والدین کے ساتھ شفقت و رحمت کرنے سے استعارہ ہے اور ان کے لئے عجز و انکساری اور تذلل کا اظہار کرنا ہے جیسا کہ رعایا امیر کے لئے اور غلام اپنے آقاؤں کے لئے تذلل اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، جیسا کہ اسی طرف حضرت سعید بن مسیب نے اشارہ کیا ہے، اور پروں کو جھکانے اور انہیں کھڑا کرنے کو بیان کیا جیسا کہ پرندے کے پر جس وقت وہ اپنے بچوں کے لئے اپنے پر کھڑے کر لیتا ہے۔ اور الذل سے مراد نرمی کرنا ہے۔ اور جمہور کی قرأت ذال کے ضمہ کے ساتھ ہے، یہ ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا و ذِلَّة و مذلة فھو ذال و ذلیل سے ماخوذ ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس اور حضرت عروہ بن زبیر نے الذِّل ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے،

اور یہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: دابة ذلول بينة الذِّل۔ اور جانوروں میں ذل سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جس کو مطیع بنانا آسان ہو مشکل نہ ہو، پس اس آیت کے حکم سے چاہئے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے والدین کے ساتھ انتہائی اچھی عجز وانکساری میں رکھے، اپنے اقوال، حرکات وسکنات اور اپنے دیکھنے میں، اور وہ ان کی طرف اپنی تیز نگاہ سے نہ دیکھے کیونکہ وہ غصے والے کی نظر ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ اس آیت میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین موجود نہ تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء) میں الذُّل کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہاں حق کی عظمت اور اس کی تاکید کے اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنَ الرَّحْمَةِ میں مِنَ بیان جنس کے لئے ہے، یعنی بے شک یہ جھکنا ایسی رحمت اور شفقت سے ہو جو نفس (دل) میں راحت وسکون پہنچانے والی ہو، نہ کہ وہ کام لینے کے اعتبار سے ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ انتہا غایت کے لئے ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے آباء پر رحم کرنے اور ان کے لئے دعا مانگنے کا حکم ارشاد فرمایا، اور یہ کہ تو ان کے ساتھ رحم کا سلوک کر جیسے انہوں نے تجھ پر رحم اور شفقت کی اور تو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کر جیسے انہوں نے تیرے ساتھ نرمی کی، جب وہ تیرے والی اور محافظ تھے اس حال میں کہ تو صغیر تھا، جاہل اور محتاج تھا پس انہوں نے تجھے اپنی ذاتوں پر ترجیح دی، وہ اپنی راتیں جاگتے رہے، وہ خود بھوکے رہے اور تجھے خوب پیٹ بھر کر کھلایا، وہ خود ننگے رہے اور تجھے لباس پہنایا، پس تو انہیں جزا اور بدلہ نہ دے مگر (اس وقت) کہ جب وہ بڑھاپے کے سبب اس حد کو پہنچ جائیں جس میں تو عہد طفولیت میں تھا۔ اور تو ان کا والی ومددگار ہو جیسا کہ وہ تیرے والی اور مددگار تھے، اور اس وقت ان کے لئے ترجیح وتقدم کی فضیلت ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بیٹا والد کو جزا اور بدلہ نہیں دے سکتا مگر یہ کہ وہ اسے کسی کی ملکیت میں پائے اور پھر اسے خرید لے اور اسے آزاد کر دے (1)''۔ اس حدیث کے بارے میں بحث سورۂ مریم میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا رَبَّيٰنِيْ تربیت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے تاکہ بندے کو والدین کی شفقت اور تربیت کے دوران ان کی مشکلات اور مشقت یاد آئے، پس یہ اس میں ان کے ساتھ شفقت اور نرمی ومہربانی کا سلوک کرنے میں اضافہ کا باعث ہوگا، اور یہ سب مومن والدین کے بارے میں ہے۔ اور قرآن کریم نے مشرک مرنے والوں کے لئے استغفار کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ وہ انتہائی قریبی ہوں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ منسوخ ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (التوبہ)

پس جب مسلمان کے والدین ذمی ہوں تو وہ ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے یہاں حکم دیا ہے، مگر کفر پر ان کے مرنے کے بعد ان کے لئے رحم کی دعا نہ کرے، کیونکہ یہ اکیلا حکم مذکورہ آیت کے ساتھ منسوخ

1۔ صحیح مسلم، کتاب العتق، باب فضل العتق الوالد، جلد 1 صفحہ 495

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نسخ کا محل نہیں ہے، پس یہ تو مشرک والدین کے لئے دنیوی رحمت کے بارے دعا ہے جب تک وہ زندہ رہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا اس آیت کا عموم اسی کے ساتھ خاص ہے، نہ کہ آخرت کی رحمت کے ساتھ، بالخصوص جب یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کیا، تو ان کی ماں نے اپنے آپ کو ننگے بدن سخت گرمی (دھوپ) میں ڈال دیا، اس کا ذکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: مناسب ہے وہ مرجائے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مسلمان والدین کے لئے دعا کرنے کے بارے خاص ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس کا عموم اسی طرح ہے جیسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ آدمی جس نے شام اس حال میں کی کہ وہ اپنے والدین کو راضی کرنے والا ہو اور صبح کی شام کی اور صبح کی، تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہیں اگرچہ وہ ایک سے داخل ہوگا پھر ایک سے، اور جس نے شام اور صبح کی اس حال میں کہ وہ اپنے والدین کو ناراض کرنے والا ہو اور اس نے شام اور صبح اسی طرح کی تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک میں داخل ہوگا اور پھر ایک میں۔'' تو ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی کی ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگرچہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم ہی کیا ہو، اگرچہ انہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو، اگرچہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم ہی کیا ہو۔'' اور ہم نے اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی کو کہا: ''تو اپنے باپ کو میرے پاس لے آ''۔ پس اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: بے شک اللہ عزوجل آپ کو سلام فرمارہا ہے اور آپ کو فرمارہا ہے کہ جب وہ بوڑھا شیخ آپ کے پاس آئے تو اس سے اس شے کے بارے پوچھنا جو اس نے اپنے دل میں کہی اور اس کے کانوں نے اسے نہیں سنا۔'' پس جب وہ بوڑھا شیخ آیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تیرے بیٹے کو کیا ہوا ہے وہ تیری شکایت کررہا ہے کیا تو اس کا مال لینا چاہتا ہے؟ تو اس نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے پوچھئے کیا میں اسے اس کی پھوپھیوں یا اس کی خالاؤں میں سے کسی ایک یا اپنی ذات کے سوا کسی پر خرچ کرتا ہوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خاموش رہ، تو ہمیں اس سے رہنے دے، تو مجھے اس شے کے بارے بتا جو تو نے اپنے دل میں کہی تیرے کانوں نے اسے نہیں سنا؟ تو اس بوڑھے شیخ نے کہا: قسم بخدا! یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہمارے یقین میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے، تحقیق میں نے اپنے دل میں کوئی چیز کہی جسے میرے کانوں نے نہیں سنا۔ آپ نے فرمایا: ''تم کہو اور میں سن رہا ہوں'' اس نے کہا میں نے کہا:

غَذَوْتُكَ مولودا و مُنْتُكَ يافِعا — تُعَلّ بما أجْنِي عليك و تُنْهَلُ

إذا ليلةٌ ضافَتْكَ بالسُّقم لم أبِتْ — لسُقْمِك إلاساهرا أتململُ

كأني أنا المطروق دونك بالذي — طُرِقتَ به دوني فعيني تَهْمُلُ

تخاف الرّدی نفسی علیک و إنها لتعلم أن الموت وقتٌ مؤجّل

فلما بلغتَ السّنّ والغایةَ التی إلیها مَدَی ما کنتُ فیک أؤمِّلُ

جعلتَ جزائی غِلظةً و فظاظةً کأنك أنت المُنعِم المتفضِّلُ

فلیتك إذ لم ترْعَ حقّ أبوّتی فعلتَ کما الجار المُصاقِب یفعلُ

فأولیتنی حقّ الجِوار ولم تکن علیّ بمال دون مالك تبْخَلُ

راوی نے کہا: پس اس وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کے گریبان کو پکڑا اور فرمایا: انت و مالك لأبیك (1) (تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے)۔ طبرانی نے کہا ہے: لجنی یہ حدیث ابن منکدر سے اس طرح مکمل اور اشعار کے ساتھ سوائے اس سند کے روایت نہیں کرتے اور عبید اللہ بن خلصہ اس کے ساتھ منفرد ہیں۔ واللہ اعلم۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ۗ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ۝

"تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک کردار ہو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ بکثرت تو بہ کرنے والوں کے لئے بہت بخشنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ والدین کے ساتھ رحم و مہربانی کرنے اور ان پر شفقت کرنے کے اعتقاد میں سے تمہارے دلوں میں ہے یا اس کے علاوہ نافرمانی یا محض ریاکاری کے لئے ظاہراً ان سے نیکی اور احسان کرنے میں سے (جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے)، اور ابن جبیر نے کہا ہے: مراد وہ جلد بازی ہے جو تیزی میں ہو جاتی ہے (2)، جیسا کہ بغیر ارادہ کے تیزی سے کوئی کام ہو جانا اور پھسل جانا، یہ آدمی سے اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے، اور اس سے کسی تکلیف کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ یعنی اگر تم والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کی نیت میں سچے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسی جلد بازی کو معاف فرما دیتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا یہ اصلاح اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت کی طرف بار بار لوٹنے اور رجوع کرنے کی شرط کے ساتھ مغفرت اور بخشش کا وعدہ ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ وہ بندہ ہے جو توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا اور پھر گناہ کرتا ہے (3)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "الاواب" "الحفیظ الذی اذا ذکر خطایاہ استغفر منها" (وہ توبہ کی حفاظت کرنے والا کہ جب وہ اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہے تو ان سے استغفار کرتا ہے۔) اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: اوّاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو تنہائی اور خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہیں پھر اللہ عزوجل سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں۔ اور عون عقیلی نے کہا ہے: اوّابون وہ ہیں جو چاشت کی نماز پڑھتے ہیں اور صحیح میں ہے: صلاۃ

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 466، حدیث 45471۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب مال الرجل من مال ولدہ، حدیث 2281، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 80 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 239

الاوابین حین ترمض الفصال (1) (اوابین کی نماز اس وقت ہوتی جب اونٹ کے بچوں کے قدم جلیں) اور لفظ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ آب یؤوب سے ہے جب وہ رجوع کر لے، لوٹ آئے۔

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝

''اور دیا کرو رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی نہ کیا کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکر گزار ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ یعنی رشتہ دار کو اس کا حق اسی طرح دیا کرو جیسے تم والدین کے حق کی رعایت کرتے ہو اور صلہ رحمی کرو، پھر مسکین اور مسافر پر بھی صدقہ کرو۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ کے بارے میں علی بن حسین نے کہا ہے: اس سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے حقوق بیت المال سے دینے کا حکم فرمایا ہے (2)، یعنی غزوہ اور مال غنیمت میں سے ذوالقربیٰ کے حصہ سے (ان کا حق ادا کرو) اور یہ خطاب والیوں یا ان کے قائم مقام حاکموں کو ہو سکتا ہے۔ اور اس آیت میں صلہ رحمی، حاجت کو پورا کرنے، ضرورت کے وقت مال کے ساتھ غمخواری کرنے اور ہر اعتبار سے معاونت کرنے میں سے جو متعین ہیں وہ سب اس میں ملا دیئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُبَذِّرْ یعنی بغیر حق کے مال خرچ کرنے میں فضول خرچی نہ کر۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: تبذیر سے مراد مال کو غیر حق میں خرچ کرنا ہے، اور خیر اور نیکی کے عمل میں تبذیر (فضول خرچی) نہیں ہے۔ اور یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: التبذیر سے مراد مال کو اس کے حق سے لینا اور اسے غیر حق میں خرچ کرنا ہے، اور یہی اسراف (فضول خرچی) ہے، اور یہ حرام ہے (3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ اور اللہ تعالیٰ کے قول اِخْوَانَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کے تابع ہیں، کیونکہ مبذر (فضول خرچی کرنے والا) فساد پھیلانے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ شیاطین۔ یا یہ کہ وہ ایسے کام کرتے ہیں جو ان کے نفس ان کے لئے مزین اور آراستہ کر دیتے ہیں، یا یہ معنی ہے کہ انہیں کل (قیامت کے دن) جہنم میں ان (شیاطین) کے ساتھ ملا دیا جائے گا؛ یہ تین اقوال ہیں۔

یہاں الاخوان اخ کی جمع ہے جو کہ نسبی بھائی نہ ہو، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں) اور قول باری تعالیٰ: وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا یعنی تم شیطان کی متابعت اور فساد میں اس کی مشابہت اختیار کرنے سے بچو۔ اور الشیطان اسم جنس ہے۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے اخوان الشیطان مفرد پڑھا ہے، اور اسی

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 807، حدیث 21506
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 450
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1203

طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ثابت ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جس نے اپنا مال حاجات وضروریات سے زائد شہوات میں خرچ کیا اور اس نے اسے ختم اور فنا کرنے کے لئے اس طرح پیش کیا تو وہ فضول خرچ ہے۔ اور جس نے اپنے مال کا نفع اپنی شہوات میں خرچ کیا اور اصل مال یا غلام محفوظ رکھا تو وہ فضول خرچ نہیں ہے۔ اور جس نے ایک درہم حرام میں خرچ کیا تو وہ فضول خرچ ہے اور اس پر وہ درہم حرام میں خرچ کرنے پر پابندی لگائی جائے گی، اور اگر اس نے اسے شہوات میں خرچ کیا تو اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی مگر جب اس کے بارے فنا کرنے اور ضائع کرنے کا خوف ہو(1) (تو پھر پابندی لگا دی جائے گی۔)

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

''اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے ان سے منہ پھیرنا پڑے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جس کی تمہیں توقع ہے (اس اثنا میں) ان سے بات کرو جو بڑی نرمی سے کرو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس قول کے ساتھ خاص کیا ہے: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا اور یہ انتہائی عجیب اور خوبصورت تادیب ہے اور انتہائی عمدہ اور لطیف قول ہے، یعنی آپ ان سے غنی اور قدرت کے ہوتے ہوئے حقیر سمجھنے والوں کے اعراض کی طرح اعراض نہ کریں کہ آپ انہیں محروم کر دیں۔ بلاشبہ کسی عارض آنے والے عجز اور پیش آنے والی رکاوٹ (تنگدستی) کے وقت آپ کا ان سے اعراض کرنا (منہ پھیرنا) جائز ہے، اور آپ اس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے خوشحالی کا دروازہ کھولنے کی توقع اور امید رکھیں تاکہ آپ اس کے سبب سائل کی دلجوئی اور غمخواری کر سکیں، پس اگر آپ پر ایسی حالت طاری ہو تو اس دوران ان سے بڑی نرمی کے ساتھ بات کرو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس کے سبب نزول کے بارے میں ابن زید نے کہا ہے: یہ آیت ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگتے تھے اور آپ انہیں دینے سے انکار فرما دیتے تھے، کیونکہ آپ ان کے بارے یہ جانتے تھے کہ وہ مال فساد وغیرہ پھیلانے میں خرچ کرتے ہیں، پس ان سے اس رغبت کے تحت منہ پھیر لیتے تھے کہ ان کو فساد سے روکنے میں اجر ہے تاکہ آپ ان کے فساد میں ان کے معاون اور مددگار ثابت نہ ہوں(2)۔ اور عطا خراسانی نے قول باری تعالیٰ: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا کے بارے میں کہا ہے: یہ والدین کے ذکر میں نہیں ہے، (بلکہ) مزینہ قبیلے سے کچھ لوگ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے وہ آپ سے سواریوں کا مطالبہ کرنے لگے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں کوئی شے نہیں پاتا جس پر میں تمہیں اٹھاؤں'' (سوار کروں) پس وہ واپس پھرے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں غم کے آنسو بہا رہی تھیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا اس میں رحمۃ سے مراد الفیء (مال فئی) ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1203
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 450

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا** اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے لئے دعا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، یعنی ان کے لئے اپنی دعا کے ساتھ ان کا فقر و افلاس ان پر آسان کر دو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لئے ایسی دعا کرو جو ان کے لئے فتح اور اصلاح کو متضمن ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ کا معنی ہے: یعنی اے محمد! ﷺ اگر آپ اپنے ہاتھ کے تنگ ہونے کی وجہ سے انہیں دینے سے منہ پھیریں تو اس اثنا میں ان سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو، یعنی انتہائی حسین اور خوبصورت انداز میں بات کریں اور اپنا عذر بیان فرما دیں، اور ان کے لئے وسعت رزق کی دعا فرما دیں، اور یہ کہیں: جب میں نے وسعت پائی تو میں ضرور دوں گا اور عزت و تکریم بھی کروں گا، کیونکہ مواسات اور غمخواری کا عمل اپنے نفس کی خوشی اور خوشحالی کی حالت میں کیا جا سکتا ہے۔ اور آپ ﷺ سے جب کسی چیز کے بارے سوال کیا جاتا اور آپ کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رزق آنے کا خاموشی سے انتظار کرتے (کیونکہ آپ) سائل کو رد کرنا ناپسند کرتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آپ ﷺ سے جب کوئی چیز مانگی جاتی اور آپ ﷺ کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو آپ فرماتے: ''اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔'' پس اس تاویل کی بنا پر رحمۃ سے مراد وہ رزق ہے جس کا انتظار کیا جائے۔ اور یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اور عَنْهُمُ کی ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر آباء، قرابتداروں، مساکین اور مسافروں میں سے پہلے گزر چکا ہے۔ اور قَوْلًا مَّيْسُوْرًا یعنی ایسی بات جو انتہائی نرم، لطیف اور اچھی ہو، یہ مفعول بمعنی فاعل ہے، اور لفظ یُسر سے ماخوذ ہے جیسا کہ میمون ہے، یعنی حسین و جمیل وعدہ، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔

اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اِلّا تکن وَرِقٌ یوما أجود بها	للسائلین فانّی لیّن العُودِ

لایعدم السائلون الخیر من خلقی	اِمّا نَوالِ واِمّا حسنُ مردودی

تو کہتا ہے: یَسَّرتُ لک کذا جب تو اسے تیار کر دے (تو تو کہے گا میں نے تیرے لئے اس طرح آسانی کر دی)۔

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝۲۹

''اور نہ بنا لو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کے ارد گرد اور نہ ہی اسے بالکل کشادہ کر دو ورنہ تم بیٹھ جاؤ گے ملامت کئے ہوئے درماندہ۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ یہ مجاز ہے اور اس کے ساتھ اس بخیل کو تعبیر کیا گیا ہے جو اپنے دل سے اپنے مال میں سے کوئی شے نکالنے کی قدرت نہیں رکھتا، پس اس کی مثال اس طوق کے ساتھ بیان کی گئی جو تصرف بالید سے مانع ہوتا ہے۔ اور صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی کہ وہ ایسے دو آدمیوں کی طرح ہیں جن پر لوہے کے دو جبے ہوں اس حال میں کہ ان کے ہاتھ ان کے سینے اور ان کی ہنسلی کی جانب جکڑے ہوئے ہوں پس صدقہ کرنے والا جب بھی کوئی صدقہ دیتا ہے تو وہ (جبہ) اس سے کھل جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے پوروں کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسکے (چلنے کے) اثر (نشان) کو مٹا دیتا ہے، ختم کر دیتا ہے۔ اور بخیل کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ جب بھی صدقہ کا قصد اور ارادہ کرتا ہے تو وہ (جبہ) اور سکڑ جاتا ہے اور ہر حلقہ اپنی جگہ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: پس میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی انگلیاں اس طرح اپنے گریبان میں ڈال کر یہ بیان کرتے ہوئے دیکھا ہے پس اگر تو آپ کو اسے وسیع (کھلا) کرتے ہوئے دیکھتا اور تو وسیع نہ کرتا (1) (تو تجھے تعجب ہوتا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ مال کو ختم کرنے کے لئے کھلے ہاتھ کے ساتھ مثال بیان فرمائی، پس اگر ہتھیلی کو بند کر لیا جائے تو جو کچھ اس میں ہوتا ہے وہ اسے روک لیتی ہے، اور اسے بالکل کھول دینا اسے ختم کر دیتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔ یہ سارے کا سارا خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، اور ایسا قرآن کریم میں کثرت سے آیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے سردار ہیں اور ان کے رب کے پاس ان کے لئے واسطہ ہیں تو پھر آپ کی ذات کے ساتھ ان کو تعبیر کیا گیا ہے اور یہ اس بارے میں عربوں کی عادت جاریہ کے مطابق ہے۔ اور یہ بھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی چیز دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کرتے تھے، اور فاقہ کشی کرتے تھے حتیٰ کہ بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ اور بہت سے صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام اموال خرچ کر دیتے تھے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر کوئی سختی نہیں کرتے تھے اور نہ انہیں منع کرتے تھے اس لئے کہ ان کا یقین صحیح اور ان کی بصیرت مضبوط اور پختہ تھی۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خرچ کرنے میں افراط سے منع فرمایا ہے، اور اس آدمی کو اپنا سارا مال نکالنے سے منع فرمایا ہے جس کے بارے اپنے ہاتھ سے نکالے گئے مال پر حسرت و درماندگی کا خوف ہو، اور رہا وہ جس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر وثوق ہو اور جو اس نے خرچ کیا ہے اس پر ثواب جزیل کا یقین ہو تو وہ اس آیت کی مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ خطاب صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ خاص ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ کو خرچ کرنے کی کیفیت کی تعلیم دی ہے اور آپ کو میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ایک بچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: میری ماں اس اس طرح کا آپ سے سوال کر رہی ہے (یعنی فلاں فلاں چیز مانگ رہی ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آج تو ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے۔'' اس نے کہا: پس وہ آپ کو کہتی ہے اپنی قمیص مجھے پہنا دو۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص مبارک اتاری اور وہ اسے دے دی اور خود گھر میں ننگے بیٹھ گئے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: پس حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لئے اذان کہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرنے لگے، اور دل مشغول ہو گئے، تو ان میں سے بعض اندر آئے دیکھا تو آپ ننگے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، مثل المنفق والبخیل، جلد 1 صفحہ 328

بدن (یعنی قمیص کے بغیر) تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ سب خیر اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کے بارے ہے، اور رہا فساد کے لئے خرچ کرنا تو وہ قلیل ہو یا کثیر سب حرام ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت نے ان امور میں ساری دولت خرچ کرنے سے منع کیا ہے جن میں مومنین کی طرف سے پہلے مطالبہ ہوتا ہے، اس لئے کہ جو اس کے بعد آئے وہ اس شے سے محروم نہ رہے یا پھر منفق اپنے اہل وعیال کو محروم نہ کر دے۔ اور اسی طرح کسی حکیم اور دانا کا قول ہے: میں نے کبھی کوئی فضول خرچی نہیں دیکھی مگر یہ کہ وہ اپنے ساتھ کوئی حق ضائع کرنے والی ہوتی ہے۔ اور یہ آیت فقاہت حال سے متعلقہ آیات میں سے ہے پس اس کا حکم نہیں بیان کیا جا سکتا مگر لوگوں میں سے ایک ایک شخص کے اعتبار سے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ابن عرفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے آپ نہ فضول خرچی کریں اور نہ اپنا مال ضائع کریں کہ آپ درماندہ ہو کر اور نفقہ و تصرف سے بالکل کٹ کر باقی رہ جائیں، جیسے تھکا ماندہ اونٹ ہوتا ہے، اور یہ وہ ہے جس کی قوت ختم ہو جائے اور اس کے سبب اس کے لئے اٹھنا، چلنا ممکن نہ رہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ﴿﴾ (ملک) (لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام درآنحالیکہ وہ تھکی ماندی ہوگی۔) یعنی آنکھ تھکی اور کٹی ہوگی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یعنی ورنہ تم اپنے کئے پر نادم ہو کر بیٹھ جاؤ گے (1)، پس انہوں نے اسے حسرت سے بنایا ہے، اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ الحسرۃ سے فاعل حَسِرٌ اور حَسْرَانُ آتا ہے اور محسور نہیں آتا۔ اور الملوم سے مراد وہ ہے جس پر مال ضائع کرنے کی وجہ سے ملامت کی جاتی ہو، یا اسے وہ ملامت کرتا ہے جسے وہ دیتا نہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿۳۰﴾ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِیَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا ﴿۳۱﴾

”بے شک آپ کا رب کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) یقیناً وہ اپنے بندوں (کے حالات) سے خوب آگاہ ہے اور (انہیں) دیکھنے والا ہے۔ اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے، ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی، بلاشبہ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس آیت کے بارے میں سورۃ الانعام میں بحث گزر چکی ہے، والحمد للہ۔ اور الاملاق سے مراد فقر و افلاس اور ملکیت کا نہ ہونا ہے۔ أملق الرجل یعنی اس کے لئے سوائے مَلَقات کے کچھ باقی نہیں رہا اور ملقات سے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15-16، صفحہ 91

مراد بڑے بڑے ہموار اور چکنے پتھر ہیں۔

ہذلی نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

أُتِيحَ لها أُقَيْدِرُ ذو حَشِيف إذا سامَتْ على المَلَقات ساما

ملقات کا واحد مَلَقَة ہے۔ اور أُقيدِر، اقدر کی تصغیر ہے، مراد چھوٹے قد کا آدمی ہے۔ اور الحشیف من الثیاب سے مراد پرانا کپڑا ہے۔ اور سامت کا معنی مرّت (وہ گزری) ہے۔ اور شمر نے کہا ہے: املق لازم اور متعدی دونوں طرح ہے، أَمْلَقَ جب کوئی محتاج ہو جائے، اور أملق الدھر ما بیدہ (زمانے نے اس کے ہاتھ میں جو تھا اسے ختم کر دیا۔)

اوس نے کہا ہے:

وأَمْلَق ما عندی خطوب تَنَبَّلُ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: خِطْأً خا کے کسرہ، طا کے سکون اور ہمزہ اور قصر کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور ابن عامر نے خَطَأً خا اور طا کے فتحہ اور ہمزہ مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی ابو جعفر یزید کی قرأت ہے۔ اور یہ دونوں قرأتیں خَطِئَ سے ماخوذ ہیں جب کوئی آدمی جان بوجھ کر گناہ کرے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: کہا جاتا ہے خَطِئَ فی ذنبہ خَطَأً جب وہ اس میں گنہگار ہو، اور أخطأ جب کوئی خطا کے راستے پر چلے چاہے بالارادہ چلے یا بغیر ارادہ کے۔ فرمایا: اور خَطِئَ أخطأ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے خَطِئَ یخطأ خِطئًا جب کوئی خطا اور غلطی کا قصد کرے) جیسا کہ أَثِمَ یأثم إِثْمًا ہے۔ اور أخطأ جب وہ ارادہ اور قصد نہ کرے، إخطاء و خطأ۔

شاعر نے کہا ہے:

دَعِينی إنما خَطَئِی وَصَوْبِی علیّ وإنّ ما أهلكتُ مالُ

اس میں خَطَئِی بالقصد غلطی کرنے کے معنی میں ہے۔

اور الخطأ اسم الاخطاء کے قائم مقام ہوتا ہے، اور یہ صواب کی ضد ہے اور اس میں دو لغتیں ہیں، ایک قصر اور یہی جید اور عمدہ ہے، اور دوسری مد کے ساتھ اور یہ قلیل ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خَطَأً خا کے فتحہ، طا کے سکون اور ہمزہ کے ساتھ مروی ہے۔ اور ابن کثیر نے اسے خا کے کسرہ، طا کے فتحہ اور ہمزہ کی مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میں اس قرأت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں پاتا، اسی وجہ سے ابو حاتم نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہ خاطأ یخاطئ سے مصدر ہے، اگرچہ ہم خاطأ نہیں پاتے، لیکن ہم نے تخاطأ پالیا ہے، اور یہ خاطأ کا مطاوع ہے، پس اس پر انہوں نے ہماری راہنمائی کی ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

تَخَاطَأَتِ النَّبلُ أحشاءَہ وأَخَّرَ یومی فلم أَعْجَلِ(1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 452

اور مھاۃ (حسن) کے وصف میں کسی دوسرے نے کہا ہے:

تخاطأه القنّاص حتى وجدته　　وخرطومه في منقع الماء راسبُ(1)

اور جوہری نے تخاطأہ بمعنی أخطأہ کیا ہے۔

اور اوفی بن مطر مازنی نے کہا ہے:

ألا أبلغا خُلّتي جابرا　　بأنّ خليلك لم يُقتَلِ

تخاطأت النّبلُ أحشاءه　　وأخّر يومي فلم يَعْجَلِ

اور حسن نے خطاء خا اور طا کے فتحہ اور ہمزہ کو مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ لغت میں معروف نہیں ہے پس یہ غلط ہے، جائز نہیں ہے۔ اور ابو الفتح نے کہا ہے: الخطأ أخطات سے ہے جیسا کہ عطاء اعطیت سے ہے، اور یہ اسم بمعنی مصدر ہے، اور حسن سے بھی خطئی خا کے فتحہ کے ساتھ اور طا کی تنوین کے ساتھ بغیر ہمزہ کے مروی ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

''اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے، اور بہت ہی برا راستہ ہے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى یہ وَلَا تزنوا کہنے سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے تم بدکاری کے قریب نہ جاؤ۔ اور الزنی کے لفظ میں مد اور قصر دونوں لغتیں ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

كانت فريضة ما تقول كما　　كان الزّناء فريضةَ الرّجم

اور سَبِيْلًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے؛ تقدیر کلام ہے: وساء سبیلہ سبیلاً (اور اس کا راستہ بہت ہی برا راستہ ہے) یعنی کیونکہ یہ جہنم تک پہنچا دیتا ہے۔ اور زنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور اس میں اور اس کی قبح میں کوئی اختلاف نہیں ہے بالخصوص جب یہ پڑوسی کی بیوی کیساتھ ہو، اس سے غیر کے بچے کو خادم اور نائب بنانا ہوتا ہے اور اسے ہی بیٹا بنانا ہوتا ہے اور علاوہ ازیں اسے میراث سے حصہ دیا جاتا ہے اور پانیوں کے اختلاط کے سبب نسبوں میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور صحیح میں روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم باب فسطاط پر ایک حاملہ عورت کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: ''شاید وہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے وطی کرے''۔ تو لوگوں نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق میں نے قصد کیا ہے کہ میں اس پر ایسی لعنت بھیجوں جو اس کی قبر میں اس کے ساتھ داخل ہو وہ کیسے اسے وارث بنائے گا حالانکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گا وہ کیسے اس سے خدمت لے گا حالانکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گا (2)؟''۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 452　　2۔ صحیح مسلم، کتاب فی النکاح، تحریم وطی الحامل، جلد 1، صفحہ 465

''اور نہ قتل کرو اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو قتل کیا جائے ناحق تو ہم نے مقتول کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) حق دے دیا ہے پس اسے چاہئے کہ قتل میں اسراف نہ کرے، ضرور اس کی مدد کی جائے گی۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ سورۃ الانعام میں اس کے بارے کلام گزر چکی ہے۔ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا اور جو آدمی بغیر ایسے سبب کے قتل کیا گیا جو قتل کو واجب اور ثابت کرتا ہو۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ تو ہم نے اس کے ولی یعنی اس کے خون کے مستحق کو (قصاص کے مطالبہ کا حق دے دیا ہے)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ولی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد ہو، کیونکہ لفظ مذکر کے ساتھ اسے ولایت کے ساتھ مفرد ذکر کیا ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق نے قول باری تعالیٰ: فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ میں ذکر کیا ہے کہ یہ ارشاد مطلق لفظ ولی سے عورت کے نکلنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور بالخصوص عورتوں کے لئے قصاص میں اس کا کوئی حق نہیں ہے اور اس (عورت) کے معاف کرنے کے بارے میں بھی کوئی روایت نہیں ہے، اور نہ اس کے لئے پورا حق لینا ہے۔ اور مخالف نے کہا ہے: بے شک یہاں ولی سے مراد وارث ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں)۔

اور مزید فرمایا: وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ (الانفال: 72) (اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی نہیں تمہارے لئے ان کی وراثت سے کوئی چیز) اور مزید فرمایا: وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الانفال: 75) (اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، کتاب اللہ کی رو سے)۔ پس یہ تمام وارثوں کے لئے قصاص کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے، اور رہا وہ جو انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لفظ ولی اپنے ظاہر کے اعتبار سے مذکر ہے اور وہ واحد ہے، مفرد ہے، تو گویا وہ اس کی طرح ہے جو جنس کے معنی میں ہوتا ہے اور جنس میں مذکر و مونث سبھی برابر ہوتے ہیں، اور اس کی مکمل بحث مختلف کتب میں ہے (جو دونوں نظریات سے متعلق ہیں۔)

سُلْطٰنًا یعنی ہم نے اسے اس پر ایسے مسلط کر دیا ہے کہ اگر چاہے تو وہ اسے (قاتل کو) قتل کر دے اور اگر چاہے تو اسے معاف کر دے، اور اگر چاہے تو اس سے دیت لے لے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک، اشہب اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے(1)۔ اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: سلطان سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر (حکم) ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سلطان سے مراد حجت اور دلیل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سلطان سے مراد اس کا مطالبہ کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں، اور ان میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1208

زیادہ واضح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے پھر بلاشبہ اللہ عزوجل کا امر بطور نص واقع نہیں ہوا لہٰذا اس میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: (کہ اسے) صرف قتل کا حق حاصل ہے۔ اور اشہب نے کہا ہے: اسے اختیار ہے، جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اس میں تین اقوال ہیں: مقتول کے قاتل کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا؛ یہ حضرات حسن، ضحاک، مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے...... اس کے ولی کے بدلے دو قتل نہیں کئے جائیں گے جیسا کہ عرب اس طرح کرتے تھے۔ تیسرا قول یہ ہے...... قاتل کا مثلہ نہیں کیا جائے گا؛ یہ طلق بن حبیب نے کہا ہے۔ اور یہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ ان میں وہ اسراف ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور جمہور نے يُسْرِفْ یا کے ساتھ پڑھا ہے(2)، مراد ولی ہے (یعنی وہ اسراف نہ کرے)، اور ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تسرف تا کے ساتھ قرأت کی ہے، اور یہی حضرت حذیفہ کی قرأت ہے۔ اور عطاء بن عبدالکریم نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: یہ (حکم) پہلے قاتل کے لئے ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس کا معنی یہ ہے فلا تسرف ایها القاتل۔ (اے قاتل! تو اسراف نہ کر) اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے ائمہ کو خطاب کے معنی میں ہے، یعنی تم غیر قاتل کو قتل نہ کرو(3)۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے: فلا تسرفوا فی القتل (پس تم قتل میں اسراف نہ کرو)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا یعنی بلاشبہ اس کی مدد اور معاونت کی جائے گی، یعنی ولی کی مدد کی جائے گی۔ اور اگر کہا جائے: کتنے ولی ہیں جن کی مدد چھوڑ دی گئی اور وہ اپنے حق تک نہ پہنچ سکے؟ تو ہم کہیں گے: معونت کبھی حجت اور دلیل کے ظاہر ہونے کیساتھ ہوتی ہے اور کبھی اسے مکمل طور پر پانے کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی ان کے مجموعے کے ساتھ ہوتی ہے، پس ان میں سے جو بھی ہو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مدد و نصرت ہی ہے۔ اور ابن کثیر نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: بے شک مقتول مدد کیا گیا ہے(4)۔ نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معنی یہ ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کے ولی کے ساتھ اس کی مدد کی ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابی کی قرأت میں ہے فلا تسرفوا فی القتل ان ولی المقتول کان منصورا (پس تم قتل میں اسراف نہ کرو بے شک مقتول کے ولی کی مدد کی جائے گی)۔ نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زیادہ بین یا ہے اور وہ ولی کے لئے ہوگی، کیونکہ بلاشبہ یہ کہا جا رہا ہے: وہ اسراف نہ کرے اگر اس کو قتل کرنے کا اختیار حاصل ہو، اور یہ ولی کے لئے ہی ہے۔ اور تا کے ساتھ ہو تب بھی ولی کے لئے جائز ہو سکتا ہے، مگر اس میں وہ مخاطب کی تحویل کا محتاج ہوگا۔ ضحاک نے کہا ہے: یہ پہلی آیت ہے جو قتل کے بارے میں قرآن کریم میں نازل ہوئی، اور یہ مکی ہے(5)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1209　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 95
4۔ ایضاً، جلد 16-15، صفحہ 97　5۔ ایضاً، جلد 16-15، صفحہ 96

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۴

''اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر ایسے طریقہ سے جو (اس یتیم کے لئے) بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو بیشک ان وعدوں کے بارے میں (تم سے) پوچھا جائے گا۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ اس کے بارے میں کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اس کے بارے کئی مقامات پر کلام گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ہر وہ کام جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور جس سے منع کیا ہے پس وہی عہد ہے (1)۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا عنہ، بے شک اس عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ پس کلام میں عنہ محذوف ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۶ (التحریم) بہ (اور وہی کرتے ہیں جس کے بارے وہ حکم دیئے جاتے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک عہد کے بارے عہد توڑنے والے کو رلانے اور رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا: تو نے کیوں توڑا ہے؟ جیسا کہ زندہ درگور کی گئی بچی سے درگور کرنے والے کو رلانے اور رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵

''اور پورا پورا ماپو جب تم کسی چیز کو ماپنے لگو اور تولو تو اسے ترازو سے تولو جو بالکل درست ہو، یہی طریقہ بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ اس کے بارے کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

اور یہ آیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ کیل (ماپ) کرنا بائع کے ذمہ ہے، یہ سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور الْقِسْطَاس (قاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) سے مراد میزان (ترازو) ہے اور یہ لغت روم کا لفظ ہے؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: القسطاس، ترازو چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: القسطاس سے مراد عدل کرنا ہے، اور آپ فرماتے تھے: یہ لغت رومیہ سے ہے، گویا کہ لوگوں کو کہا گیا ہے: اپنے وزنوں میں عدل کرتے ہوئے وزن کرو (2)۔ اور ابن کثیر، ابوعمرو، نافع، ابن عامر اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں القِسطاس قاف کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں (3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 242　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 445　3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا یعنی پورا پورا ماپ کرنا اور صحیح صحیح وزن کرنا تیرے رب کے نزدیک بہتر اور زیادہ باعث برکت ہے۔ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔ حسن نے کہا ہے: ہمارے لئے ذکر کیا گیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی حرام پر قادر نہیں ہوتا پھر وہ اسے چھوڑ دیتا ہے صرف الله تعالیٰ کے خوف اور ڈر سے تو الله تعالیٰ اسے آخرت سے پہلے دنیا میں جلدی ملنے والی نعمت کیساتھ بدل دیتا ہے جو اس کے لئے اس (حرام) سے بہتر ہوتی ہے (1)۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

''اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق (تم سے) پوچھا جائے گا۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْفُ یعنی پیروی نہ کرو اس کی جسے تم جانتے نہیں اور نہ وہ تیرا مقصود اور مراد ہو سکتی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو نہ کہہ میں نے دیکھا ہے حالانکہ تو نے نہیں دیکھا، اور میں نے سنا ہے حالانکہ تو نے نہیں سنا (2)، اور میں جانتا ہوں حالانکہ تو نہیں جانتا؛ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو اس چیز کے سبب کسی کی مذمت نہ کر جس کے بارے تیرے پاس علم نہیں ہے؛ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جھوٹے آدمی کا شہادت دینا ہے (3)۔ اور قتبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ظن اور وہم کی پیروی نہ کر۔ اور یہ تمام معانی باہم متقارب ہیں۔ اور القفو کا اصل معنی بہتان لگانا اور کسی باطل کی تہمت لگانا ہے اور اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہم بنو نضر بن کنانہ اپنی ماں کی پیروی نہیں کرتے اور نہ ہم اپنے باپ سے نفی کرتے ہیں (4)''۔ یعنی ہم اپنی ماں کو برا نہیں کہیں گے۔

اور کمیت نے کہا ہے:

فلا أرمی البریٔ بغیر ذنب ولا أقفو الحواصن إن قُفینا (5)

کہا جاتا ہے: قَفَوْتُہ اقفوہ اور قُفْتُہ اقوفہ اور قَفَیتہ جب تو کسی کے نشان کی پیروی کرے۔ اور اسی سے القافۃ ہے کیونکہ وہ ان کے آثار و نشانات قدم کی پیروی کرتا ہے اور ہر شی کے قافیہ سے مراد اس کا آخر ہوتا ہے، اور اسی سے قافیۃ الشعر بھی ہے، کیونکہ وہ شعر کا آخر ہوتا ہے۔ اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی المُقفِّی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام

1۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 787، حدیث 43113 | 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1211

3۔ ایضاً | 4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 455

5۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 456۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب من نفی رجلا من قبیلتہ، حدیث نمبر 2601، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انبیاء علیہم السلام کے آخر میں تشریف لائے۔ اور اسی سے القائف ہے، یہ وہ ہے جو کسی شبہ کے اثر اور نشان کا پیچھا کرتا ہے (کھرا تلاش کرنے والا)۔ کہا جاتا ہے: قَافَ الْقَائِفُ یَقُوفُ جب وہ ایسا کرے (یعنی کھرا تلاش کر لے) اور آپ کہتے ہیں: قُفْتُ الْأَثَرَ (میں نے نشان کا پیچھا کیا) اس میں فا قاف پر مقدم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شبہ یہ ہے کہ یہ لفظ ان بعض الفاظ میں سے ہو جن میں عرب کھیل اور تفریح کا عمل کرتے رہتے ہیں، جیسے وہ کہتے ہیں: رَعَمْلِیْ فِیْ لَعَمْرِیْ میں ایسا کرتے ہیں۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فرقہ کی جانب سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا ہے: قفا و قاف، جیسا کہ عتا و عات ہے۔ اور منذر بن سعید اس طرف گئے ہیں کہ قفا اور قاف جَبَذَ اور جَذَبَ کی مثل ہے۔

الختصر یہ کہ یہ آیت جھوٹے قول اور تہمت لگانے سے اور ہر اس سے جو جھوٹے اور ردی اقوال میں سے اس کے مشابہ ہو یہ اس سے منع کرتی ہے اور روکتی ہے۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ بعض لوگوں نے تَقُفْ قاف کو ضمہ اور فا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جراح (قاضی بصرہ) نے وَالْفَآدَ فا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بعض لوگوں کی لغت ہے، اور ابو حاتم وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت قافہ (آثار دیکھ کر پہچان کرنے والا) کے حکم کو متضمن ہے، کیونکہ جب یہ فرمایا: تم اس کی پیروی نہ کرو جس کے بارے تمہیں علم نہ ہو۔ تو یہ اس کے جواز پر دلیل ہے جس کے بارے ہمیں علم ہو، تو ہر وہ چیز جسے انسان جان لے یا اس کے بارے اسے ظن حاصل ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کا حکم لگانا جائز ہے، اور اسی سے ہم نے قرعہ اندازی اور تخمینہ لگانے کے اثبات پر استدلال کیا ہے، کیونکہ یہ بھی غلبہ ظن کی ایک قسم ہے، اور اسے وسعت علم کا نام دیا جاتا ہے۔ پس (اعضاء و آثار دیکھ کر پہچان کرنے والا) بیٹے کو باپ کے ساتھ ان دونوں کے درمیان مشابہت پائے جانے کی وجہ سے ملا دیتا ہے، جیسا کہ ایک فقیہ فرع کو اصل کے ساتھ بطریق مشابہت ملا دیتا ہے۔ اور صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی مسرت و فرحت کی کیفیت میں میرے پاس تشریف لائے آپ کے چہرے کے خدوخال چمک رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو نہیں جانتی (1) کہ ایک اعضاء بدن دیکھ کر پہچان کرنے والے نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا ہے اس حال میں کہ ان دونوں پر ایک چادر تھی وہ اپنے سروں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور ان کے پاؤں ظاہر تھے تو اس (دیکھنے والے) نے کہا ہے: بے شک ان قدموں کا بعض اس کا بعض ہے۔'' (یعنی یہ دونوں ایک دوسرے کا جز ہیں۔) اور حدیث میں مُجَزِّز سے مراد قائف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام ابو عبد اللہ مازری نے کہا ہے: زمانہ جاہلیت میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نسب میں جرح قدح ہوتی تھی کیونکہ ان کا رنگ انتہائی زیادہ سیاہ تھا، اور ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ روئی سے زیادہ سفید تھے، اسی طرح اسے ابو داؤد نے احمد بن صالح سے ذکر کیا ہے۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اور احمد کے سوا کسی نے کہا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا رنگ انتہائی صاف اور روشن تھا اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ انتہائی شدید سیاہ رنگ کے تھے اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، العمل بالحاق والقائف الولد، جلد 1، صفحہ 471

عربی کلب قبیلہ سے تھے، اور پھر آپ کو زید اور دوری آپہنچی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحزاب میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ جمہور علماء نے بیٹے میں تنازع اور اختلاف کے وقت قیافہ شناس کی طرف رجوع کرنے پر اس سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قیافہ شناس کے قول سے بہت خوش ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نہیں تھے کہ آپ کو باطل اور غلط طریقہ سے خوش کیا جا سکے اور نہ آپ اس پر تعجب اور خوشی کا اظہار فرماتے۔ اور امام ابوحنیفہ، اسحاق، ثوری اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح نہیں لیا ہے اور استدلال اس سے کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لعان میں مشابہت کو لغو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 5۔ قیافہ شناس کے اقوال کو لینے والوں نے اختلاف کیا ہے کہ کیا ان اقوال کو آزاد عورتوں اور لونڈیوں دونوں کی اولاد میں قبول کیا جائے گا یا یہ لونڈیوں کی اولاد کے ساتھ مختص ہے؟ تو اس کے بارے دو قول ہیں: پہلا قول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس روایت میں جو آپ سے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ اور آپ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ یہ صرف لونڈی کی اولاد میں محصور ہے۔ اور صحیح وہ ہے جو آپ سے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے اور وہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، کیونکہ وہ حدیث جو اس باب میں اصل ہے بلاشبہ وہ آزاد عورتوں کے بارے میں واقع ہے، کیونکہ حضرت اسامہ اور ان کے والد رضی اللہ عنہما دونوں آزاد تھے تو اس سبب کو کیسے لغو قرار دیا جا سکتا ہے جس پر حکم کی دلیل کا انحصار ہے اور وہ اس کا باعث بنا ہے؟ یہ علماء اصول کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اور اسی طرح اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے کیا قیافہ شناسوں میں سے ایک کے قول پر اکتفا کیا جائے گا یا دو کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ شہادت ہے؟ پہلا قول ابن قاسم نے کہا ہے اور یہی خبر کا ظاہر ہے بلکہ اس کی نص ہے۔ اور دوسرا قول امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا یعنی ان میں سے ہر ایک سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جو اس نے عمل کیا، پس دل سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جس میں اس نے غور و فکر کیا اور اس کا اعتقاد بنایا۔ اور کان اور آنکھ سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جو اس نے دیکھا اور جو سنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان سے اس کے بارے پوچھے گا جسے اس کے کان، آنکھ اور اس کے دل نے جمع کیا ہوگا اور اس کی نظیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی اپنی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا(1)''۔ پس انسان اپنے اعضاء پر حاکم ہے، تو گویا فرمایا یہ کہ ان تمام کے بارے انسان سے پوچھا جائے گا، تو اس صورت میں مضاف حذف ہوگا، لیکن حجت میں پہلا معنی زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس کی تکذیب اس کے جوارح سے واقع ہوگی، اور یہ ذلت و رسوائی کی انتہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (یٰسین) (آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان (بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: شَهِدَ عَلَيْهِمْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، الجمعۃ فی القری والمدن، جلد 1، صفحہ 122

سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿﴾ (حم السجدہ) ((اس وقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے)۔ اور انہیں سمع، بصر اور فواد سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان کا ادراک کرنے والے حواس ہیں، اور اس آیت میں انہیں مسئولہ بنایا ہے، اور یہ اس کی حالت ہے جو عقل اور سمجھ رکھتا ہے، پس اسی وجہ سے ان کو ان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے قول باری تعالیٰ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿﴾ (یوسف) میں کہا ہے: بلاشبہ انہوں نے کہا: رَاَيْتُهُمْ میں نے ستاروں میں دیکھا، کیونکہ جب انہیں سجود کے ساتھ متصف کیا اور یہ (سجدہ کرنا) اس کا فعل ہے جو عقل رکھتا ہے تو پھر انہیں کنایۃً ان سے تعبیر کیا جو عقل رکھتے ہیں؛ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور زجاج نے بیان کیا ہے کہ عرب ذوالعقول اور غیر ذوالعقول کو ان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

انہوں نے اور طبری نے یہ شعر بیان کیا ہے:

ذُمَّ المنازل بعد منزلة اللِّوَى والعيش بعد أولئك الأيام (1)

یہ امر ہے ان کے نزدیک اس پر وقف کیا جاتا ہے، اور رہا شعر تو اس میں ایک روایت الاقوام کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

"اور نہ چلو زمین میں اکڑتے ہوئے (اس طرح) نہ تم چیر سکتے ہو زمین کو اور نہ پہنچ سکتے ہو پہاڑوں کے برابر بلندی میں۔ یہ سب (جن کا ذکر گزرا) ان میں سے ہر بری بات اللہ تعالیٰ کو (سخت) ناپسند ہے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا یہ غرور اور تکبر سے نہی ہے اور تواضع اور انکساری کا حکم ہے۔ المرح کا معنی ہے بہت زیادہ خوشی اور فرحت کا اظہار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی چلنے میں تکبر کا اظہار کرنا (یعنی اکڑ کر چلنا) ہے۔ بعض نے کہا ہے: انسان کا اپنی قدر اور مقام سے تجاوز کر جانا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے مراد چال میں غرور اور خود پسندی کا اظہار کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی کسی نعمت پر اترانا اور اس کا شکر ادا نہ کرنا ہے (2) اور اکڑنا ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس سے مراد نشاط اور چستی کا اظہار کرنا ہے۔ یہ تمام اقوال معنوی اعتبار سے قریب قریب ہیں لیکن یہ دو قسموں میں منقسم ہیں: ان میں سے ایک قسم مذموم (قابل مذمت) ہے اور دوسری محمود (قابل تعریف) ہے، پس تکبر کرنا، اترانا، غرور کرنا، اور انسان کا اپنی قدر سے تجاوز کرنا یہ سب مذموم ہے اور فرحت و انبساط اور نشاط و چستی کا اظہار کرنا محمود اور اچھا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک کے ساتھ (یعنی فرحت اور نشاط) اپنے آپ کو متصف فرمایا ہے، پس صحیح حدیث میں ہے اللہ أفرح بتوبة العبد من رجل...... الحدیث (3) (اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے اس آدمی کی نسبت زیادہ خوش ہوتا

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 102 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 244

3۔ مجمع الزوائد، کتاب التوبة، باب الحث على التوبة، جلد 10، صفحہ 322، حدیث 17498

ہے)۔ اور سستی شرعاً مذموم ہے اور نشاط اس کی ضد ہے۔ اور کبھی تکبر اور جو چیزیں اس کے معنی میں ہیں محمود اور اچھی ہوتی ہیں، اور وہ یہ کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور ظالموں کے خلاف ہوں۔ ابو حاتم محمد بن حبان نے ابن جابر بن عتیک سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”غیرت میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ مبغوض اور ناپسند جانتا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور غرور اور تکبر میں سے ایک وہ ہے جسے اللہ عزوجل پسند فرماتا ہے اور اس میں سے ایک وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ مبغوض قرار دیتا ہے، پس وہ غیرت جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ وہ غیرت ہے جو دین کے بارے میں ہو اور وہ غیرت جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ وہ غیرت ہے جو دین کے معاملہ میں نہ ہو اور وہ رعونت و تکبر جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے وہ آدمی کا جنگ کے وقت اور صدقہ دیتے وقت اپنے نفس کے ساتھ اظہار فخر کرنا ہے اور وہ تکبر و غرور جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ باطل اور غلط کاموں میں اس کا غرور اور تکبر کرنا ہے“(1)۔ اسے ابوداؤد نے اپنی مصنف وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

اور انہوں نے یہ اشعار بھی کہے ہیں:

ولا تمش فوق الأرض إلاّ تواضعا فكم تحتها قومٌ هم منك أرفعُ

تو زمین کے اوپر تواضع اور انکساری کے بغیر نہ چل پس اس کے نیچے کتنی قومیں ہیں جو تجھ سے بلند اور ارفع تھیں۔

و إن كنتَ في عزٍّ و حِرزٍ و مَنْعة فكم مات من قوم هم منك أمنعُ

اور اگر تو عزت، حفاظت اور قوت میں ہے، تو قوم میں سے کتنے مر گئے جو تجھ سے زیادہ محفوظ اور طاقتور تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ انسان کا بغیر حاجت کے محض برتری اور غلبے کے اظہار کے لئے شکار کرنا بھی اس آیت میں داخل ہے، اس میں حیوان کو عذاب دینا اور اسے جاری رکھنا بغیر کسی حاجت اور مقصد کے وہ بھی داخل ہے۔ اور رہا وہ آدمی جو کسی دن اور اس دن کی کسی ساعت میں راحت و سکون حاصل کرتا ہے، اور اس میں وہ اپنے آپ کو اس مقابلے اور راحت میں قوت و طاقت باہم پہنچاتا ہے تاکہ وہ اس کے سبب نیکی اور خیر میں مشغول رہنے کے لئے مدد حاصل کر سکے، مثلاً علم پڑھنا یا نماز پڑھنا وغیرہ، تو یہ اس آیت میں داخل نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَرَحًا جمہور کی قرأت را کے فتحہ کے ساتھ ہے(2)۔ اور اس میں ایک گروہ کی قرأت جسے یعقوب نے بیان کیا ہے وہ اسم فاعل ہونے کی بنا پر را کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور پہلی زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ بلاشبہ تیرا یہ قول: جاء زيد رَكْضًا تیرے قول جاء زيد راكِضًا کی نسبت زیادہ بلیغ ہے، پس اسی طرح تیرا قول: مَرَحًا بھی ہے۔ اور المرح مصدر ہے لہٰذا اس میں مَرِحًا کہنے کی نسبت مبالغہ زیادہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ یعنی تو ہرگز زمین کے اندر داخل نہیں ہو سکتا کہ تو اسے جان لے جو کچھ اس میں ہے۔ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا یعنی تو ہرگز پہاڑوں کے برابر نہیں ہو سکتا نہ اپنی طوالت و لمبائی کے ساتھ اور نہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فی الخیلاء فی الحرب، حدیث نمبر 2286، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 456

اپنے فخر وتکبر کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے: خرق الثوب یعنی اس نے کپڑا پھاڑ دیا، اور خرق الارض اس نے زمین کاٹ دی۔ اور الخرق سے مراد زمین کی کشادگی ہے۔ یعنی تو اپنے تکبر اور زمین پر چلنے کے ساتھ زمین کو کشادہ نہیں کر سکتا، یعنی تو اپنی قدرت کے ساتھ اس مقام اور حد تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ تو تو ذلیل اور حقیر بندہ ہے، تو اپنے نیچے اور اپنے اوپر سے ہر طرف سے گھرا ہوا ہے، اور جو گھرا ہوا ہو وہ محصور اور ضعیف ہوتا ہے، پس تیرے لئے تکبر اور رعونت مناسب اور موزوں نہیں ہے۔ اور یہاں خرق الأرض سے مراد زمین کو نقب لگانا، اس کو پھاڑنا ہے نہ کہ اسے مسافت کے ساتھ طے کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ازہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ ہرگز اسے کاٹ نہیں سکتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ زیادہ بین اور واضح ہے، کیونکہ یہ الخرق سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وسیع صحرا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: فلاں أخرق من فلان، یعنی فلاں سخر، عزت اور قوت کے اعتبار سے فلاں سے زیادہ ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ سبا نے اپنے لشکروں کے ساتھ زمین کے شرق وغرب اور اس کے میدانوں اور پہاڑوں کا چکر لگایا اور بڑے بڑے سرداروں کو قتل کیا اور قیدی بنایا...... اور اسی وجہ سے اس کا نام سبا رکھا گیا...... اور مخلوق خدا اس کے قریب ہوگئی پس جب اس نے یہ دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے تین دن الگ اور خلوت میں رہا پھر ان کی طرف نکلا تو کہا: بلاشبہ جو میں نے پایا ہے وہ کوئی بھی نہیں پا سکا میں نے ان نعمتوں کے شکر کے سبب ابتدا کو دیکھ لیا ہے، اور میں نے اس میں سورج سے زیادہ سجود کا اہل کوئی نہیں دیکھا جب وہ طلوع ہوتا ہے، نتیجتاً انہوں نے اسے سجدہ کیا اور یہی سورج کی عبادت اور پرستش کا آغاز ہے، پس یہی غرور، تکبر اور اکڑنے والوں کا انجام ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا، ذٰلِكَ یہ اشارہ امر ونہی میں سے اس تمام کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور ذٰلِكَ واحد، جمع اور مونث و مذکر سبھی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عاصم، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور مسروق رحمہم اللہ تعالیٰ نے سَيِّئُهٗ، سَيِّءُ کو ضمیر کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے (1)، اور اسی لئے فرمایا: مَكْرُوْهًا یہ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور السیء سے مراد مکروہ (اور ناپسندیدہ) عمل ہے۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جس سے نہ اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور نہ اس کے بارے حکم دیتا ہے۔ تحقیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان آیات میں یعنی وَ قَضٰى رَبُّكَ سے لے کر...... تا قولہ ...... كَانَ سَيِّئُهٗ کچھ وہ امور ذکر کئے ہیں جن کے بارے حکم دیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ پس وہ سیئۃ سے ان تمام کے بارے خبر نہیں دے رہا کہ مامور بہ بھی منہی عنہ امور میں داخل ہو جائیں۔ اس قرأت کو ابو عبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ذالك كان سيئاته ہے۔ اور یہ اضافت کے لئے ہی ہوتا ہے۔ ابن کثیر، نافع، اور ابو عمرو نے سيئة تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (2) یعنی ہر وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے وہ سیئہ (برا) ہے۔ اور اسی بنا پر کلام قول باری تعالیٰ: وَ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا پر منقطع ہوگئی۔ پھر فرمایا: وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، وَ لَا تَمْشِ، پھر کہا: كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ تنوین کے ساتھ کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قول باری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 457

2۔ ایضاً

تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ سے لے کر اس آیت تک یہ سَیِّئُهٗ ہی ہے اس میں کوئی حسنہ اور نیکی نہیں ہے، پس انہوں نے کُلًّا کو صرف منھی عنه کے لئے محیط بنایا ہے نہ کہ کسی اور کے لئے۔ اور قول باری تعالیٰ: مَكْرُوْهًا۔ سَیِّئُهٗ کی صفت نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے بدل ہے اور تقدیر کلام ہے: کان سیئة و کان مکروھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مکروھا کان کی دوسری خبر ہے اس لئے کہ اسے لفظ کل پر محمول کیا گیا ہے، اور سیئة اس سے پہلے مذکورہ تمام اشیاء میں معنی پر محمول ہے(1)۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: یہ سیئة کی صفت ہے، کیونکہ جب اس کی تانیث مونث غیر حقیقی ہے تو پھر جائز ہے کہ مذکر کیساتھ اس کی صفت لگائی جائے۔ اور ابو علی فارسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے: بے شک مونث کو جب مذکر بنایا جائے تو پھر یہ چاہئے کہ اس کا مابعد بھی مذکر ہو، اور یہ تساہل اور سستی ہے کہ پہلے وہ فعل ہو جو مونث کی طرف منسوب ہو اور وہ ایسے صیغہ میں ہو جو مذکر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

کیا آپ شاعر کا یہ قول نہیں دیکھتے:

فلا مزنة وَدَقَتْ وَدْقَهَا　　ولاأرض أبقل إبقالها(2)

یہ ان کے نزدیک قبیح سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کہنے والا کہے: أبقل أرض تو یہ قبیح نہیں ہے۔

ابوعلی نے کہا ہے: لیکن قول باری تعالیٰ: مَكْرُوْهًا میں یہ جائز ہے کہ وہ سَیِّئُهٗ سے بدل ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس ضمیر سے حال ہو جو عِنْدَ رَبِّكَ میں ہے اور عِنْدَ رَبِّكَ، سیئة کی صفت کے محل میں ہو(3)۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے اس آیت سے رقص اور اس میں مشغول ہونے کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ امام ابوالوفاء ابن عقیل نے بیان کیا ہے: رقص سے نہی پر قرآن کریم نے نص بیان کی ہے اور فرمایا: وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اور اکڑنے والے کی مذمت بیان کی ہے۔ اور رقص شدید ترین غرور کرنا اور اترانا ہے۔ کیا ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے نبیذ کو خمر پر قیاس کیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں چستی اور نشہ لانے میں باہم متفق ہیں، تو ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ شعر کی کاٹ اور اس کو ترنم اور سر کے ساتھ کہنے کو آلات موسیقی ستار، بانسری اور طبلے پر ان دونوں کے اجتماع اور اتفاق کے باوجود قیاس نہیں کرتے۔ تو یہ صاحب ریش سے کتنا قبیح ہے اور کیسا لگتا ہے جب وہ بوڑھا ہو، اور وہ اس سر اور کاٹ پر رقص کر رہا ہو اور تالی بجا رہا ہو، اور بالخصوص اس وقت جبکہ عورتوں اور مردوں کی آوازیں ہوں، کیا یہ اس کے لئے اچھا لگتا ہے جس کے سامنے موت، سوال، حشر اور پل صراط ہو، پھر وہ دارین میں سے ایک کی طرف جانے والا ہو، وہ رقص کے ساتھ جانوروں کے اچھلنے کی طرح اچھلتا کودتا ہے، اور عورتوں کے تالی بجانے کی طرح تالی بجاتا ہے۔ قسم بخدا! میں نے اپنی عمر میں کئی مشائخ کو دیکھا ہے کہ تبسم کے سبب ان کا کوئی دانت ظاہر نہیں ہوا چہ جائیکہ ضحک کے سبب ظاہر ہوا اس کے باوجود کہ میرا ان کے ساتھ اختلاط اور میل جول ہمیشہ رہا۔ اور ابوالفرج علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: بعض مشائخ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مجھ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رقص دو کندھوں کے درمیان حماقت ہے اور یہ لعب کے بغیر زائل نہیں ہوتی اس باب کا مزید بیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 457　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 458

سورۃ الکہف وغیرہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

''یہ ہدایات جنہیں بذریعہ وحی آپ کی طرف آپ کے رب نے بھیجا ہے دانائی کی باتوں میں سے ہیں، اور (اے سننے والے!) نہ بنا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تجھے پھینک دیا جائے گا جہنم میں اس حال میں کہ تمہیں ملامت کی جائے گی اور دھکے دیئے جائیں گے۔''

ذٰلِكَ سے اشارہ ان آداب، قصص اور احکام کی طرف ہے جنہیں وہ سابقہ آیات متضمن ہیں جنہیں لے کر حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے، یعنی یہ ان محکم افعال میں سے ہیں جن کا تقاضا اللہ عزوجل کی حکمت اپنے بندوں کے بارے میں کرتی ہے، اور اس نے انہیں ان کے لئے محاسن اخلاق، حکمت، محکم معانی اور افعال فاضلہ کے قوانین میں سے بنایا ہے۔ پھر اپنے قول: وَ لَا تَجْعَلْ کا سابقہ نواہی پر عطف کیا ہے۔ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد ہر وہ انسان ہے جس نے اس آیت کو سنا۔ اور المدحور سے مراد ذلیل ورسوا کیا گیا اور (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) بہت دور ہٹایا گیا ہے۔ اور یہ اس سورت میں گزر چکا ہے۔ اور دعا میں کہا جاتا ہے: اللّٰھم ادحر عنا الشیطان (اے اللہ! شیطان کو ہم سے دور کر دے)۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝

''کیا چن لیا ہے تمہیں تمہارے رب نے بیٹوں کے لئے اور (اپنے لئے) بنا لیا ہے فرشتوں کو بیٹیاں (صد افسوس!) تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو بہت سخت ہے۔''

یہ آیت ان عربوں کا رد کرتی ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (1)، اور ان کے لئے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیاں بھی ہیں، لیکن اس نے ارادہ یہ کیا ہے کہ کیا اس نے اپنے سوا تمہارے لئے بیٹوں کو خالص کیا ہے اور بیٹیوں کو اپنے اور تمہارے درمیان مشترک بنایا ہے۔ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت سخت گناہ ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝

''اور بلاشبہ ہم نے مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے (دلائل توحید کو) اس قرآن میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں، (بایں ہمہ) سوائے نفرت کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا اور بلاشبہ ہم نے بیان کیا۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے بار بار بیان کیا۔ فِيْ هٰذَا

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 105

الْقُرْاٰنِ کہا گیا ہے کہ فی زائدہ ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: ولقد صرفنا ھذا القرآن (1) (بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو بیان کیا)، مثلاً: اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ (الاحقاف: 15) ای اصلح ذریتی۔ (میری اولاد کی اصلاح فرما)۔ اور تصریف کا معنی ہے: کسی شی کو ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرنا۔ اور اس تصریف سے مراد بیان اور تکریر (یعنی بار بار کسی چیز کو بیان کرنا) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد مغایرت ہے یعنی ہم نے مواعظ و نصائح کے انداز کو بدل بدل کر بیان کیا تا کہ وہ غور و فکر کریں، عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں۔ اور عام قرأت صَرَّفْنَا کثرت کے معنی کی بنا پر تشدید کے ساتھ ہے۔ اور حسن نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ اور قول باری تعالیٰ: فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ اس سے مراد امثال، باعث عبرت قصص، حکمتیں، مواعظ اور احکام و اخبار ہیں۔ ثعلبی نے بیان کیا ہے: میں نے ابوالقاسم حسین کو امام شیخ ابوالطیب کی موجودگی میں یہ کہتے سنا ہے کہ قول باری تعالیٰ: صَرَّفْنَا کے دو معنی ہیں؛ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے (قرآن مجید کو) ایک نوع پر نہیں رکھا بلکہ وعدہ و وعید، محکم و متشابہ، امر و نہی، ناسخ و منسوخ اور اخبار و امثال کے متنوع انداز میں بیان کیا ہے، جیسا کہ ہواؤں کو صبا، دبور، جنوب اور شمال کی متنوع اقسام میں چلاتا ہے، اور افعال کو ماضی، مستقبل، امر، نہی، فعل و فاعل اور مفعول وغیرہ کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نے اسے ایک ہی بار نازل نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ (الاسراء: 106) اور اس کا معنی ہے ہم نے کثرت سے جبرئیل علیہ السلام کو آپ کی طرف بھیجا ہے: لِيَذَّكَّرُوْا (الفرقان: 50) یحیٰی، اعمش، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ کی قرأت لِيَذْكُرُوْا تخفیف کے ساتھ ہے (3)۔ اور اسی طرح فرقان حمید میں ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا (الفرقان: 50) اور باقیوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے اسے اختیار کیا ہے، کیونکہ اس کا معنی لیتذکروا و لیتعظوا (تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں) ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے لِيَذَّكَّرُوْا کو شد دی ہے، انہوں نے اس سے تدبر کرنے اور غور و فکر کرنے کا معنی مراد لیا ہے۔ اور اسی طرح جنہوں نے لِيَذْكُرُوْا پڑھا ہے۔ اور پہلے کی نظیر یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ (القصص) (اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ نصیحت قبول کریں)۔ اور دوسرے کی نظیر وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ (البقرہ: 63) ہے۔

وَمَا يَزِيْدُهُمْ یعنی بار بار بیان کرنے اور نصیحت کرنے نے ان میں اضافہ نہیں کیا۔ اِلَّا نُفُوْرًا مگر حق سے دور کرنے اور نظر و فکر سے غفلت برتنے کا، اور یہ اس لئے ہوا کیونکہ انہوں نے قرآن کریم کے بارے یہ اعتقاد رکھا کہ یہ محض حیلہ، سحر، کہانت اور شعر ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

”آپ فرمائیے: اگر ہوتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا جس طرح یہ کافر کہتے ہیں تو ان خداؤں نے (مل کر)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 458 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تلاش کر لی ہوتی عرش کے مالک (پر غالب آنے کی) کوئی راہ۔ وہ پاک ہے اور وہ بہت برتر و بالا ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ یہ اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا (الاسراء: 29) اور یہ بتوں کی پرستش کرنے والوں کا رد ہے۔ كَمَا يَقُوْلُوْنَ ابن کثیر اور حفص نے يَقُوْلُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تقولون خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ اِذًا لَّابْتَغَوْا یعنی ان الٰہوں نے تلاش کر لی ہوتی۔ اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنے اور جنگ کرنے کا مطالبہ کرتے جیسا کہ دنیا کے بادشاہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تب انہوں نے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی راہ تلاش کر لی ہوتی (2) تاکہ وہ اس کی بادشاہی کو زائل اور ختم کر سکیں، کیونکہ وہ اس کے شریک ہیں۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تب ان خداؤں نے صاحب عرش کے پاس قرب کی راہ تلاش کر لی ہوتی، اور اس کی نزدیکی تلاش کر چکے ہوتے کیونکہ وہ اس کے سوا ہیں، اور قوم یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ وہ بت انہیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیتے ہیں، پس جب انہوں نے بتوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے محتاج ہیں تو پھر یہ باطل ہو گیا کہ وہ الٰہ ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی ہر اس شے سے پاکی، عظمت اور بزرگی بیان کی ہے جو اس کے لائق اور مناسب نہیں۔ اور تسبیح کا معنی تنزیہ (پاکی بیان کرنا) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

"پاکی بیان کرتے ہیں اس کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے، اور (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ اس میں آسمانوں اور زمین کی طرف ذوی العقول کی ضمیر لوٹ رہی ہے، اس لئے کہ ان کی طرف عاقل کا فعل منسوب کیا گیا ہے اور وہ تسبیح کرنا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ مَنْ فِيْهِنَّ میں مراد فرشتے، انسان اور جنات ہیں، پھر اس کے بعد تمام اشیاء کو اپنے اس قول میں شامل کیا: وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور اس عموم میں اختلاف ہے، کیا یہ مخصص ہے یا نہیں؟ تو ایک فرقہ اور جماعت نے کہا ہے: یہ عام مخصوص نہیں ہے اور اس سے مراد تسبیح الدلالۃ ہے۔ اور ہر پیدا ہونے والی اور بنائی جانے والی شے اس کی ذات پر یہ شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور قادر بھی۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ تسبیح حقیقی ہے، اور علی العموم ہر شے ایسی تسبیح بیان کرتی ہے جسے انسان نہ سن سکتا ہے اور نہ اسے سمجھ سکتا ہے، اور اگر مراد وہ ہو جو پہلے فریق نے کہا ہے کہ مراد صنعت کا اثر اور دلالت ہے تو یقیناً یہ ایسا امر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 459

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 106

ہے جو سمجھا جا سکتا ہے، اور آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ یہ تسبیح سمجھی نہیں جا سکتی (1)۔ اور انہیں جواب یہ دیا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: لَّا تَفْقَهُونَ سے مراد وہ کفار ہیں جو غور و خوض کرنے سے منہ پھیر لیتے ہیں پس وہ اشیاء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: مِّن شَیْءٍ میں عموم ہے لیکن اس کا معنی ہر زندہ اور نامی (بڑھنے والا) کے ساتھ خاص ہے، اور یہ جمادات کو شامل نہیں، اسی سے عکرمہ کا قول ہے: درخت تسبیح بیان کرتے ہیں اور ستون تسبیح بیان نہیں کرتے (2)۔ یزید رقاشی نے حسن کو کہا اور یہ دونوں کھانے پر تھے اس حال میں کہ دستر خوان سامنے بچھا ہوا تھا: اے ابا سعید! کیا یہ دستر خوان بھی تسبیح بیان کرتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ ایک بار تسبیح بیان کرتا ہے؛ مراد یہ ہے کہ درخت اپنے پھلدار ہونے اور اپنے اعتدال کے زمانے میں تسبیح بیان کرتا ہے، لیکن اب یہ عمدہ خوشبودار دستر خوان بن چکا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کے لئے اس سنت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے گناہ میں انہیں عذاب نہیں دیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک چغلخوری کرتا تھا اور رہا دوسرا! تو وہ پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تر ٹہنی منگائی اور اس کے دو حصے کر دیئے، پھر ایک حصہ ایک قبر پر گاڑ دیا اور دوسرا دوسری قبر پر گاڑ دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''ان سے عذاب ہلکا کر دیا جائے گا جب تک یہ خشک نہیں ہوں گے۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: مالم ییبسا (4) (جب تک یہ خشک نہ ہوئے) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں حصے جب تک تر رہیں گے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہیں گے، اور جب خشک ہو جائیں گے تو جماد ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

اور مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف ایک پر اور نصف دوسری پر رکھ دی اور فرمایا: ''ان دونوں پر عذاب ہلکا اور نرم کر دیا جائے گا جب تک ان دونوں میں ان کی تری میں سے کوئی شے رہی۔'' (لعله أن يهوّن عليهما العذاب ما دام فيهما من بلولتهما شئ) ہمارے علماء نے کہا ہے: اسی سے قبروں پر درخت لگانا اور قرآن کریم پڑھنا مستفاد ہوتا ہے، جب درختوں کے سبب ان سے تخفیف کر دی جاتی ہے تو پھر ایک مومن آدمی کے قرآن کریم پڑھنے سے کیسے نہیں ہوگی۔ ہم نے اس کا مفصل اور شافی بیان ''کتاب التذکرہ'' میں کیا ہے، اور یہ بھی کہ میت کو جو ثواب ہدیہ اور تحفہ بھیجا جاتا ہے وہ اس تک پہنچ جاتا ہے۔ والحمد للہ علی ذالك۔ اور دوسری تاویل کی بنا پر اس کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے مطابق ہر شے چاہے جماد ہو یا غیر جماد وہ تسبیح بیان کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل اور اس قول کے لئے کتاب اللہ سے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا جاتا ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ۝ (ص) (یاد فرماؤ ہمارے بندے داؤد کو جو بڑا طاقتور تھا۔ وہ (ہماری طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے فرمانبردار بنا دیا تھا پہاڑوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت۔) اور قول باری تعالیٰ: وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (البقرہ: 74) (اور کئی ایسے بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 459　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1980

ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے)۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اور قول باری تعالیٰ ہے: وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿﴾ (مریم) (پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے، کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔)

اور ابن مبارک نے (اپنی دقائق) میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں مسعر نے عبداللہ بن واصل سے انہوں نے عوف بن عبداللہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو کہتا ہے: اے فلاں! کیا تیرے پاس سے آج کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ پس اگر وہ کہے: ہاں، تو اس کے سبب اسے انتہائی مسرت اور خوشی ہوتی ہے۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿﴾ الآیہ (مریم) (اور کفار کہتے ہیں: بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا)۔ فرمایا: کیا تم انہیں دیکھ رہے ہو وہ جھوٹ سن سکتے ہیں اور خیر اور نیکی کی بات نہیں سن سکتے۔ اور اسی بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: کوئی صبح اور شام نہیں مگر زمین کے ٹکڑے آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں: اے میرے پڑوسی! کیا آج تیرے پاس سے کوئی ایسا بندہ گزرا ہے جس نے تجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھی ہو یا اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا ہو؟ تو ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں: نہیں اور بعض کہتے ہیں: ہاں، پس جب وہ ہاں کہے تو وہ اس کے سبب اسے اپنے سے افضل دیکھتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مؤذن کی آواز جن وانس، شجر و حجر، مٹی کا ڈھیلا یا اور کوئی شے نہیں سنتی مگر وہ قیامت کے دن اس کے لئے شہادت اور گواہی دیں گے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تحقیق ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے حالانکہ وہ کھایا جا رہا ہوتا تھا۔ اور اس روایت کے علاوہ دوسری روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں کھانا کھا رہے تھے اور ہم اس کی تسبیح سن رہے تھے (2)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھ پر سلام کیا کرتا تھا بلاشبہ میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (3)''۔ کہا گیا ہے کہ وہ حجر اسود ہے۔ واللہ اعلم۔ اس بارے میں بہت سی اخبار ہیں اور ہم ان میں سے بہت سی روایات پر اللمع اللؤلؤیۃ فی شرح العشرنیات النبویہ للفاداری رحمہ اللہ تعالیٰ میں آگاہ ہوئے ہیں۔ اور اسی بارے میں جذع (یعنی کھجور کے تنا) والی روایت بھی مشہور ہے۔ جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ اور جب یہ ایک جماد میں ثابت ہے تو پھر دیگر جمادات میں بھی اس کا پایا جانا جائز ہے، اور اس میں سے کوئی شے بھی محال نہیں ہے، پس اس عموم کی بنا پر ہر شے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ اسی طرح حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ ان تمام چیزوں کو بھی عام اور شامل ہے۔ اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، رفع الصوت بالنداء من حدیث ابی سعید خدری، جلد 1، صفحہ 85

ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث 714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ جامع ترمذی، باب البرکۃ فی الماء، حدیث نمبر 3566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و تسلیم الحجر علیہ قبل النبوۃ، جلد 2، صفحہ 245

انہوں نے انہیں اخبار سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جمادات کی تسبیح یہ ہے کہ وہ اپنی طرف دیکھنے والے کو یہ کہنے کی دعوت دیتی ہیں: سبحان اللہ! کیونکہ ان میں ادراک نہیں ہوتا۔

اور شاعر کا قول بھی ہے:

تُلْقِی بتسبیحة من حیث ما انصرفت　و تَستقر حَشَا الرائی بِتَرْعَادِ(1)

یعنی جو انہیں دیکھتا ہے وہ کہتا ہے: سبحان خالقھا (انہیں تخلیق فرمانے والے کی ذات پاک ہے)۔

پس صحیح یہ ہے کہ تمام چیزیں تسبیح بیان کرتی ہیں کیونکہ اخبار و روایات اس پر دلالت کرتی ہیں، اور اگر وہ تسبیح تسبیح الدلالۃ ہی ہوتو پھر داؤد کی تخصیص کون سی ہے؟ بلاشبہ وہ تسبیح مقال ہے اللہ تعالیٰ کے ان میں حیات اور زندگی پیدا کرنے کے ساتھ اور تسبیح کے ساتھ بولنے کی قوت عطا کرنے کے ساتھ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور سنت اس پر نص ہے جس پر ہر شے کے تسبیح بیان کرنے میں سے قرآن کریم کا ظاہر دلالت کرتا ہے پس اس کے ساتھ کلام کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ حسن، ابو عمر، یعقوب، حفص، حمزہ، کسائی اور خلف نے تفقھون فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے تا کے ساتھ قرأت کی ہے۔ باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، اور ابو عبید نے اسے ہی اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا: فعل اور تانیث کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا بے شک وہ دنیا میں اپنے بندوں کے گناہوں سے حلم کا اظہار کرنے والا ہے۔ غَفُوْرًا اور آخرت میں مومنوں کو بخشنے والا ہے۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

"اور (اے محبوب!) جب آپ پڑھتے ہیں قرآن کو تو ہم (حائل) کر دیتے ہیں آپ کے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے۔"

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب سورہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ (لہب: 1) نازل ہوئی تو کانی ام جمیل بنت حرب آئی وہ بڑے جوش اور غصے میں تھے اور اس کے ہاتھ میں پتھر تھا اور وہ کہہ رہی تھی: مُذَمَّمًا عَصَيْنَا (ہم نے مذمم کی نافرمانی کی) وَاَمْرَهٗ اَبَيْنَا (ہم نے اس کے حکم کا انکار کیا) وَدِيْنَهٗ قَلَيْنَا (اور ہم نے اس کے دین کو ناپسند کیا)۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے، پس جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ آ رہی ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ آپ کو دیکھ لے گی! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انها لن ترانی (2) (بے شک وہ مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم پڑھا اور اس کے ساتھ محفوظ رہے جیسے آپ نے فرمایا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا پس وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آکر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 245　2۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، سورۂ تبت، جلد 7، صفحہ 302، حدیث 11529

رکی اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا اور کہنے لگی: اے ابا بکر! مجھے خبر دی گئی ہے کہ تیرے ساتھی نے میری ہجو کی ہے! تو آپ نے فرمایا: نہیں اس گھر کے رب کی قسم انہوں نے تیری ہجو نہیں کی۔ آپ فرماتے ہیں: پس وہ واپس مڑی تو یہ کہہ رہی تھی: تحقیق قریش جانتے ہیں کہ میں ان کے سردار کی بیٹی ہوں۔

اور حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: جب تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ (لہب) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کاش آپ اس سے دور ہٹ جائیں تاکہ وہ آپ کو کوئی ایسا کلمہ نہ سنادے جو آپ کو اذیت اور تکلیف پہنچائے، کیونکہ یہ فحش بکنے والی عورت ہے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انه سيحال بيني و بينها(1) (بلاشبہ میرے درمیان اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جائے گا) پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابا بکر! تیرے ساتھی نے میری ہجو بیان کی ہے! تو آپ نے فرمایا: قسم بخدا! نہ وہ شعر بناتے ہیں اور نہ شعر کہتے ہیں۔ تو اس نے کہا: بلاشبہ آپ تو ان کی تصدیق کرتے ہیں، پھر وہ وہیں سے واپس لوٹ گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس نے آپ کو نہیں دیکھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں۔ میرے اور اس کے درمیان حائل ہو کر فرشتے نے مجھے مسلسل ڈھانپے رکھا یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔'' (لا۔ ما زال ملك بيني و بينها يسترني حتى ذهبت) اور حضرت کعب نے اس آیت کے تحت کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تین آیات کے ساتھ مشرکین کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے: ایک آیت وہ ہے جو سورہ انعام میں ہے: وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (الانعام: 25) (ہم نے ڈال دیئے ان کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی۔) اور ایک آیت وہ ہے جو سورۂ نحل میں ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ (النحل: 108) (یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر۔) اور ایک آیت وہ ہے جو سورۂ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً الآیہ۔ (الجاثیہ: 23) (ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنا لیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ۔) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیات پڑھ لیتے تھے تو مشرکین سے اوجھل ہو جاتے تھے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے ان کے بارے اہل شام میں سے ایک آدمی کو بتایا، پس وہ روم آ گیا اور وہیں طویل عرصہ تک قیام پذیر رہا، پھر وہاں سے بھاگ نکلا تو وہ لوگ اس کی تلاش میں نکلے تو اس نے یہی آیات پڑھ لیں تو وہ اس طرح ہو گئے کہ راستے میں اس کے ساتھ ہونے کے باوجود اسے دیکھ نہ سکتے تھے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی ہے جسے وہ حضرت کعب سے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ میں نے اس کے بارے اہل الری میں سے ایک آدمی کو بتایا اور وہ دیلم میں قید ہو گیا کافی عرصہ وہاں ٹھہرا رہا پھر وہاں سے

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر سورۂ تبت، جلد 7، صفحہ 302، حدیث 11529

بھاگ نکلا تو وہ اس کی تلاش میں نکلے تو اس نے یہ آیات پڑھ لیں۔ یہاں تک کہ ان کے کپڑے اس کے کپڑوں کے ساتھ مس ہونے لگے لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم ان آیات میں سورۂ یٰسین کی ابتدا سے لے کر فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ تک کا اضافہ کرتے ہیں، کیونکہ سیرت میں حضور نبی مکرم ﷺ کے ہجرت فرمانے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آپ کے بستر پر آرام فرمانے کا تذکرہ موجود ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ایک مشت مٹی اپنے ہاتھ میں اٹھائی، اور اللہ عزوجل نے ان کی آنکھوں پر آپ کو دیکھنے سے پردہ ڈال دیا۔ پس وہ آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکے، اور آپ نے وہ مٹی ان کے سروں پر پھینک دی اور آپ سورۂ یٰسین کی یہ آیت پڑھتے رہے: يٰسٓ ۝ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ان آیات سے فارغ ہو گئے، اور ان میں سے کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کے سر پر مٹی نہ پڑی ہو، پھر آپ اس طرف چلے گئے جہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علاقے اندلس میں اعمال قرطبہ میں حصن منثور کے ساتھ اسی طرح کا واقعہ مجھے پیش آیا، وہ یہ کہ میں دشمن کے سامنے سے بھاگ گیا اور میں اس سے ایک طرف پیچھے ہٹ گیا، پس ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو گھڑسوار میری تلاش میں نکل پڑے اور میں زمین کی کھلی فضا میں بیٹھا ہوا تھا اور کوئی چیز مجھے ان سے چھپانے اور ڈھانپنے والی نہ تھی، اور میں سورۂ یٰسین شروع سے اور علاوہ ازیں قرآن کریم کی آیات پڑھنے لگا، تو وہ دونوں مجھ سے آگے گزر گئے پھر اسی جگہ سے واپس لوٹے تو ان میں سے ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا یہ تو دِيْبَلَه یعنی شیطان (جن) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور وہ مجھے نہ دیکھ سکے، والحمد للہ حمداً کثیراً علی ذالك۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ پردہ (مستور) ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی مہر ہے یہاں تک کہ نہ وہ اسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس میں موجود حکمت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی یہ کہ ان کے آپ کی قرأت سے اعراض کرنے اور آپ سے تغافل برتنے کے سبب یہ اس طرح ہے کہ آپ کے درمیان اور اس کے درمیان آپ کو نہ دیکھنے کے بارے میں حجاب اور پردہ ہے گویا ان کے دلوں پر پردہ سا پڑ گیا ہے(1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچاتے تھے جب آپ قرآن کریم پڑھتے تھے، اور وہ ابوجہل، ابوسفیان، نضر بن حارث، ابولہب کی بیوی ام جمیل، اور حویطب تھے، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو قرآن کریم پڑھنے کے وقت ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا، چھپا دیا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس سے گزرتے تھے اور آپ کو دیکھتے نہ تھے؛ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہی پہلے قول کا بعینہ معنی ہے، اور

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 29

یہی آیت میں اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: مَّسْتُوْرًا اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے..... کہ حجاب تم سے چھپا ہوا ہے تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اور دوسرا یہ ہے..... کہ حجاب تم سے اپنے ورا کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہے اور اس صورت میں مستور بمعنی ساتر ہوگا (1)۔

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝۴۶

''اور ہم ڈال دیتے ہیں ان کے دلوں پر پردہ تا کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی (پیدا کر دیتے ہیں) اور جب آپ ذکر کرتے ہیں صرف اپنے رب کا قرآن میں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً، اَكِنَّة، كِنَان کی جمع ہے، اور اس سے مراد ہر وہ شے ہے (2) جو کسی شے کو ڈھانپ لے۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ یعنی تا کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں، یا اس کے سمجھنے کو ناپسند کریں، یعنی اس میں اوامر ونواہی اور حکم ومعانی میں سے جو کچھ ہے اسے سمجھنا (انہیں ناپسند ہو) یہ قدریہ کا رد ہے۔

وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا اور ان کے کانوں میں بہرہ پن اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کلام میں اضمار ہے یعنی أن يسمعوه (کہ وہ اسے سن سکیں)۔ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ یعنی آپ کہیں: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس حال میں کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہوں۔ اور ابو الجوزاء اوس بن عبد اللہ نے کہا ہے: کوئی شے نہیں ہے جو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قول سے بڑھ کر شیطان کو دل سے بھگانے والی ہو، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا اور علی بن حسین نے کہا ہے: اس سے مراد آپ کا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہنا ہے۔ اس کا ذکر پہلے بسم اللہ شریف کی بحث میں گزر چکا ہے۔ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا کہا گیا ہے: اس سے مشرکین مراد لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شیاطین مراد ہیں۔ اور نُفُوْرًا یہ نافر کی جمع ہے، جیسا کہ شهود، شاهد کی جمع ہے، اور قعود، قاعد کی جمع ہے۔ اور یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو جو فعل کے الفاظ کے سوا ہے، جبکہ قول باری تعالیٰ: وَلَّوْا بمعنی نفروا ہو اور اس کا معنی یہ ہو نفروا نفورًا۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۴۷

''ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کے لئے یہ سنتے ہیں اسے جب یہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کر رہے مگر ایک ایسے آدمی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 460 2۔ ایضاً

کی جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ بِهٖۤ میں باز ائدہ ہے مراد ہے یستمعونہ (یعنی ہم اس کے بارے خوب جانتے ہیں جس کے لئے یہ اسے سنتے ہیں) اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سنتے تھے پھر نفرت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ ساحر (جادوگر) ہے اور اس پر جادو کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اس کے بارے خبر دی ہے: یہ حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے۔ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى یعنی (ہم خوب جانتے ہیں) جب وہ آپ کے معاملے میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ان کی سرگوشیاں ان کا یہ قول ہوتا تھا: بے شک یہ مجنون ہے، بے شک یہ ساحر ہے، اور بے شک یہ پہلے لوگوں کے افسانے لاتا ہے (1)، اور اس طرح کی اور باتیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب عتبہ نے معززین قریش کو کھانے پر بلایا جو اس نے ان کے لئے تیار کیا، پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف لے گئے اور ان پر قرآن کریم پڑھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور کہنے لگے: یہ جادوگر اور مجنون ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ کھانے کا اہتمام کریں اور مشرکین میں سے اشراف قریش کو اس کی دعوت دیں، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دعوت کا اہتمام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان پر قرآن کریم پڑھا اور انہیں توحید کی طرف دعوت دی، اور فرمایا: "کہو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یقیناً عرب تمہارا مطیع ہو جائے گا اور اہل عجم تمہارا دین قبول کر لیں گے۔" لیکن انہوں نے انکار کر دیا، وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنتے تھے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے تھے: یہ تو جادوگر ہے اور اس پر جادو کر دیا گیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور زجاج نے کہا ہے: النجوی اسم مصدر ہے، یعنی اذھم ذونجوی (جب وہ سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں) اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اس سے مراد ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور ان جیسے دیگر لوگ ہیں۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (کہ تم پیروی نہیں کر رہے مگر ایسے آدمی کی) جس پر جادو کر دیا گیا۔ یہ تحقیق سحر (جادو) نے اسے خراب کر دیا ہے اور اس پر اس کا معاملہ خلط ملط ہو چکا ہے، وہ یہ اس لئے کہتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بھاگ جائیں (نفرت کرنے لگیں)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مَّسْحُوْرًا اس کا معنی ہے دھوکا دیا ہوا مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ (المومنون) یعنی کہاں سے تمہیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: مَّسْحُوْرًا اس کا معنی ہے کہ ان کے تابع ایک جن ہے، لہٰذا وہ کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہیں، پس وہ تمہاری ہی مثل ہیں اور وہ فرشتہ نہیں ہیں۔ اور عرب بزدل آدمی کے لئے کہتے ہیں: قد انتفخ سَحْرُہ (وہ تو بزدل اور ڈرپوک نکلا)۔ آدمی وغیرہ میں سے جو بھی کھائے یا پیئے اسے مسحور اور مُسَحَّر کہا جاتا ہے۔ لبید نے کہا ہے:

فإن تسألينا فيم نحن فإننا ... عصافير من هذا الأنام المُسَحَّرِ (2)

اور امرء القیس نے کہا ہے:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 247 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 461

أرانا　مُوضِعِین　لأمر　غَیْبِ　　وَ نُسْحَرُ بالطعام و بالشَّراب(1)

یعنی ہم کھانا کھلائے جاتے ہیں اور بار بار پلائے جاتے ہیں۔

اور حدیث طیبہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کون ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے میرے مقابلے میں فخر کر سکتی ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے کے ساتھ لگے ہوئے وصال فرمایا(2)۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

"دیکھئے (یہ گستاخ) کس طرح آپ کے لئے مثالیں بیان کرتے ہیں پس (اس گستاخی کے باعث) وہ گمراہ ہو گئے اب وہ سیدھے راستہ پر چل نہیں سکتے"۔

قولہ تعالیٰ: اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ یہ ان کے عمل اور کارستانی پر اظہار تعجب کیا ہے کہ وہ کبھی کہتے ہیں: یہ جادوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ مجنون ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ شاعر ہے۔ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا پس وہ لوگوں کو آپ سے روکنے کا حیلہ کر کے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حق سے گمراہ ہو گئے ہیں پس اب وہ ہدایت کی طرف لے جانے والے راستے کو نہیں پا سکتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ (گمراہی سے) نکلنے کی راہ نہیں پا سکتے کیونکہ ان کے قول میں ان کا کلام متناقض ہے، یعنی وہ کبھی مجنون، کبھی ساحر اور کبھی شاعر کہتے ہیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

"اور انہوں نے (از راہ انکار) کہا کہ جب ہم (مر کر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہمیں اٹھایا جائے گا از سر نو پیدا کر کے"۔

قولہ تعالیٰ: اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا یعنی انہوں نے یہ کہا اس حال میں کہ وہ سرگوشیاں کر رہے تھے جب انہوں نے قرآن کریم سنا اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا حکم سنا کہ اگر یہ جادو کیا ہوا اور دھوکا دیا ہوا نہ ہوتا تو یہ اس طرح نہ کہتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الرفات کا معنی غبار ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی تراب (مٹی) ہے(3)۔ اور الرفات ہر وہ شے جو ریزہ ریزہ ہو جائے اور ہر وہ شے جو بوسیدہ اور پرانی ہو جائے، جیسا کہ فُتَات، حُطام اور رُضاض (تینوں کا معنی ٹوٹی ہوئی چیز کے ٹکڑے اور چورا ہے۔) یہ ابو عبیدہ، کسائی، فراء اور اخفش سے منقول ہے، اسی سے تو کہتا ہے: رُفِتَ الشیٔ رَفْتًا، یعنی چیز کو توڑ دیا گیا فھو مرفوت (پس وہ ٹوٹی ہوئی ہے) اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا، اَئِنَّا استفہام ہے اور اس سے مراد جحد اور انکار ہے۔ اور خَلْقًا منصوب ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، یعنی بعثًا جدیدًا (نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھانا، تو یہ مفعول مطلق ہے۔) اور یہ ان کی طرف سے حد درجے کا انکار ہے۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 461　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 462

مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

''فرمائیے (یقیناً ایسا ہی ہوگا) خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ۔ یا کوئی ایسی مخلوق بن جاؤ جس کا ازسرنو پیدا کرنا تمہارے خیال میں بہت مشکل ہے، وہ کہیں گے: ہمیں دوبارہ کون (زندہ کرکے) لوٹائے گا؟ فرمائیے: وہی جس نے پیدا فرمایا تمہیں پہلی مرتبہ، پس وہ حیرت سے آپ کی طرف (دیکھ کر) سروں کو جنبش دیں گے اور پوچھیں گے: ایسا کب ہوگا؟ آپ بتائیے: شاید اس کا وقت قریب ہی ہو''

قولہ تعالیٰ: قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیے (اگرچہ) تم عاجز کرنے کی جہت سے تم شدت اور قوت میں پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ (تب بھی ایسا ہی ہوگا۔) علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر تمہیں اس پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہڈیاں اور گوشت پیدا کرے گا تو تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ اگر تم قدرت رکھتے ہو(1)۔ اور علی بن عیسیٰ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ تم اگر پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے جب اس نے تمہارا ارادہ کر لیا، مگر یہ کلام امر کے محل میں ہے، کیونکہ الزام میں یہ زیادہ بلیغ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر تم پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو وہ یقیناً تمہیں دوبارہ اٹھائے گا جیسے اس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے، اور وہ یقیناً تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا(2)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم جو چاہو ہو جاؤ تم عنقریب دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے کیونکہ وہ یہ استطاعت اور طاقت نہیں رکھتے کہ وہ پتھر ہو جائیں۔ اور بلاشبہ اس کا معنی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے خالق کے بارے اقرار کر لیا اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کیا تو انہیں کہا گیا کہ یہ سمجھ لو کہ تم جو چاہو ہو جاؤ، پس اگر تم پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو بھی تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے جس طرح پہلی بار پیدا کئے گئے۔ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں کیونکہ لوگوں کے خیال میں یہ بڑے عظیم ہیں(3)۔ اور یہی معنی حضرت قتادہ کے قول کا ہے۔ وہ کہتے ہیں: تم جو چاہو ہو جاؤ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں موت دے گا اور پھر تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابن جبیر، مجاہد نے بھی، عکرمہ، ابو صالح، اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: مراد موت ہے، کیونکہ ابن آدم (انسان) کے خیال میں اس سے بڑی اور کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ امیہ بن ابی صلت نے کہا ہے:

و للموت خلق فی النفوس فظیع(4) (لوگوں کے خیال میں موت خوفناک مخلوق ہے۔)

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: بے شک تم اگر پتھر یا لوہے سے پیدا کئے جاتے یا تم موت ہوتے تو میں ضرور تمہیں موت دوں گا اور یقیناً تمہیں دوبارہ اٹھاؤں گا، کیونکہ وہ قدرت جس کے ساتھ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے اسی کے ساتھ تمہیں دوبارہ اٹھاؤں گا۔ اور یہی معنی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا: فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اور حدیث میں ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 113 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 248 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

کہ "قیامت کے دن چتکبرے مینڈھے کی صورت میں موت کو لایا جائے گا اور اسے جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بعث (دوبارہ زندہ کیا جانا) ہے، کیونکہ لوگوں کے خیال میں یہی سب سے بڑی شے ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ فَطَرَكُمْ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں بنایا۔ فَسَيُنْغِضُونَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ یعنی وہ بطور استہزا اپنے سروں کو حرکت دیتے ہیں؛ کہا جاتا ہے: نَغَض رأسه يَنْغَضُ ويَنْغِضُ نَغْضاً وَنُغُوضاً، یعنی اس کے سر نے حرکت کی۔ اور أنغض رأسه یعنی اس نے اپنے سر کو ہلایا، حرکت دی، اس طرح جیسا کہ کوئی کسی شے سے تعجب کرنے والا کرتا ہے۔ اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: فَسَيُنْغِضُونَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ۔

راجز کا قول ہے: أنغض نحوی رأسه وأقنعا (1) (اس نے میری طرف اپنے سر کو ہلایا اور اسے اوپر اٹھالیا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: نَغَضَ فلان رأسه (یعنی فلاں نے اپنے سر کو حرکت دی) یہ متعدی اور غیر متعدی دونوں طرح آتا ہے، اسے اخفش نے بیان کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: نغضت سنه یعنی اس کا دانت ہل گیا اور اکھڑ گیا۔ راجز نے کہا ہے:

ونغضت من هرم أسنانها (2)

(بڑھاپے کے سبب اس کے دانت ہل گئے) اور دوسرے نے کہا ہے:

لما رأتني انغضت لي الرأسا (3)

(جب اس نے مجھے دیکھا تو میرے لئے اپنا سر ہلا دیا)۔

اور ایک اور نے کہا ہے:

لا ماء في المقراة إن لم تنهض بمسد فوق المحال النغض

المحال اور المحالة سے مراد وہ بڑی چرخی ہے جس کے ساتھ اونٹوں کو پانی پلایا جاتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ یعنی وہ کہتے ہیں کہ دوبارہ زندہ کیا جانا، لوٹانا اور وہ وقت کب ہوگا۔ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا یعنی آپ فرمایئے وہ قریب ہے، کیونکہ عسی واجب کے معنی میں ہے؛ اس کی نظیر یہ ہے: وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ (الاحزاب) (اور (اے سائل!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔) اور لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ (الشوریٰ) (شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔) اور ہر وہ شے جو آنے والی ہو تو وہ قریب ہی ہوتی ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

"اس دن کو یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ بلائے گا سو تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے اور یہ گمان کر رہے ہو گے کہ تم نہیں ٹھہرے (دنیا میں) مگر تھوڑا عرصہ۔"

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ، الدعا سے مراد میدان حشر کی طرف ایسے کلام کے ساتھ بلانا اور ندا دینا ہے جسے تمام مخلوق سنے گی، اس میں اللہ تعالیٰ انہیں (قبروں سے) نکلنے کے بارے ندا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 462 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 116 3۔ ایضاً

سے مراد ایسی چیخ ہے جسے وہ سب سنیں گے، پس وہی ان کو قیامت کی زمین میں جمع ہونے کی دعوت ہوگی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک قیامت کے دن تمہیں اپنے ناموں اور اپنے باپوں کے ناموں سے بلایا جائے گا اس لئے اپنے نام خوبصورت رکھو(1)''۔ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِهٖ یعنی اس کے حمد کے مستحق ہونے کے سبب (تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے) اور ابو سہل نے کہا ہے: مراد الحمدللہ کہنا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے

فإني بحمد الله لاثوب فاجر لبِستُ، ولا من غدرة أتقنع(2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ہے: تم جواب دو گے اس حال میں کہ تم اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کر رہے ہو گے(3)۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے اور وہ کہہ رہے ہوں گے سبحانك وبحمدك لیکن اس دن کا اعتراف انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: بِحَمْدِهٖ سے مراد بامرہ (یعنی اس کے حکم سے) ہے، یعنی تم اقرار کرو گے کہ وہی تمہارا خالق ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس کی معرفت اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے(4) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کی قدرت کے ساتھ۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کے تمہیں بلانے کے ساتھ۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے، کیونکہ صور میں پھونکنا ان کے قبروں سے نکلنے کا سبب ہوگا اور بالحقیقت یہ حق کی دعوت و پکار کے ساتھ مخلوق کا باہر نکلنا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِهٖ پس وہ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوں گے سبحانك اللّٰھم وبحمدك۔ فرمایا: پس قیامت کا دن وہ دن ہے جس کا آغاز بھی حمد سے ہوگا اور اسی کے ساتھ اختتام ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِهٖ اور اس کے آخر کے بارے میں فرمایا: وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الزمر) (اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ اور کہا جائے گا سب تعریفیں اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے۔)

وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا یعنی دو نفخوں کے درمیان (تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ) اور یہ اس لئے ہوگا کہ دو نفخوں کے درمیان ان سے عذاب روک دیا جائے گا جنہیں پہلے عذاب دیا جا رہا تھا، اور وہ عرصہ چالیس برس ہوگا پس وہ سو جائیں گے اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: 52) (کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہے ہماری خواب گاہ سے؟) اور یہ کفار کے لئے خاص ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قیامت کے دن سے پہلے کافروں کو ہلکی سی نیند آئے گی وہ اس میں نیند کا ذائقہ ہی پائیں گے، تو اچانک اہل قبور کے لئے چیخ ماری جائے گی تو وہ خوفزدہ، گھبرائے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ دنیا ان کی نگاہوں میں حقیر اور قلیل ہو جائے گی جس وقت وہ قیامت کے دن کو دیکھیں گے۔ حسن نے کہا ہے: وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا آخرت میں اپنے طویل ٹھہرنے کی وجہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، جلد 2، صفحہ 320۔ ایضاً، باب فی تغییر الأسماء، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 249

4۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

سے تم گمان کرو گے کہ دنیا میں تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ (1)۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾

"اور آپ حکم دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں، بے شک شیطان فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے ان کے درمیان، یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اس کے اعراب اور ترکیب کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے عرب (2) میں سے ایک آدمی کو خوب سب و شتم کیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا، قریب تھا کہ فتنہ بھڑک اٹھتا تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اسے ثعلبی، ماوردی، ابن عطیہ اور واحدی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ان کے قتال کے بارے میں اجازت عطا فرمایئے تحقیق ان کی اذیت رسانی ہمارے لئے بڑھ گئی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے ابھی تک قتال کے بارے حکم نہیں دیا گیا ہے"۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ حکم دیجئے میرے ان بندوں کو جنہوں نے اعتراف کیا کہ میں ان کا خالق ہوں اور وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں کلمہ توحید میں سے اور اقرار نبوت میں سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور حکم دیجئے میرے ایمان والے بندوں کو جب وہ توحید کے بارے میں کفار سے جھگڑا کریں، مباحثہ کریں، تو وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت ہی عمدہ ہوں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: 108) (اور تم نہ برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ بھی برا بھلا کہنے لگیں اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے۔) اور حسن نے کہا ہے کہ وہ کافر کو کہے جب وہ زیادتی کرے: اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت دے! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے! اور یہ انہیں جہاد کے بارے حکم دیئے جانے سے پہلے کی بات ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ انہیں حکم دیجئے کہ وہ اس چیز کے بارے حکم دیں جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور وہ اس سے منع کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، اس معنی کی بنا پر آیت مومن اور کافر کے بارے میں عام ہوگی، یعنی آپ تمام کو حکم دیجئے۔ واللہ اعلم۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنوں کو ان امور کے بارے میں حکم دیا ہے جو ان کے درمیان خاص ہیں، حسن ادب کے ساتھ اور قول کی نرمی کے ساتھ، پر جھکانے کے ساتھ اور شیطان کے فسادات کو پرے پھینکنے کے ساتھ، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ (3)"۔ یہ احسن قول ہے، یہ آیت محکم ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 249 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، تحریم التحاسد والتباغض، جلد 2، صفحہ 315

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ بے شک شیطان ان کے درمیان فساد اور عداوت و گمراہی پھیلانا چاہتا ہے۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ یوسف میں اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے نزغ بیننا شیطان نے ہمارے درمیان فساد برپا کیا؛ یزیدی نے یہ کہا ہے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: النزغ کا معنی ہے الاغراء برانگیختہ کرنا، ابھارنا۔ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا بے شک شیطان انسان کا شدید عداوت کے سبب کھلا دشمن ہے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ "ایک قوم بیٹھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے تھے پس شیطان آیا تا کہ ان کی مجلس کو ختم کر دے تو ملائکہ نے اسے روک دیا تو وہ ایک قوم کے پاس آیا جو قریب ہی بیٹھے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کر رہے تھے پس اس نے انہیں آپس میں اکسایا تو وہ آپس میں جھگڑ پڑے اور ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے تو ان ذکر کرنے والوں نے کہا: ہمارے ساتھ اٹھو ہم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیں، پس وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی مجلس ختم کر دی اور اس سے شیطان خوش ہو گیا، پس یہ اس کی عداوت اور دشمنی میں سے ہے"۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۖ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۖ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾

"تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے، اگر چاہے تو تم پر رحم (و کرم) فرمادے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے، اور نہیں بھیجا ہم نے ان کو ان کا ذمہ دار بنا کر (تا کہ ان کے کفر کے لئے آپ جوابدہ ہوں)۔"

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۖ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ یہ خطاب مشرکین کو ہے، اور اس کا معنی ہے: اگر وہ چاہے تو تمہیں اسلام کی توفیق عطا فرمادے اور تم پر رحم و کرم فرمادے، یا تمہیں شک پر موت دے دے اور تمہیں سزا اور عذاب میں مبتلا کر دے؛ یہ ابن جریج نے کہا ہے۔ اور أعلم بمعنی علیم (خوب جاننے والا) ہے، جیسا کہ ان کا قول: اللہ اکبر میں اکبر بمعنی کبیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مومنین کے لئے ہے، یعنی اگر وہ چاہے تو تم پر رحم و کرم فرمائے اس طرح کہ وہ کفار مکہ سے تمہیں محفوظ رکھے، یا اگر وہ چاہے تو وہ تمہیں ان کو تم پر مسلط کر کے سزا دے؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا یعنی ہم نے آپ کو انہیں کفر سے روکنے کے بارے میں ذمہ دار نہیں بنایا اور نہ ہم نے ان کے ایمان کو آپ کے سپرد کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے آپ کو ان کا کفیل نہیں بنایا کہ آپ کو ان کے بدلے پکڑ لیا جائے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے:

ذكرت أبا أروى فبت كأنني برد الأمور الماضيات وكيل(1)

اس میں وکیل بمعنی کفیل ہے۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 250

اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

''اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور بے شک ہم نے بزرگی دی ہے بعض انبیاء کو بعض پر اور ہم نے عطا فرمائی ہے داؤد کو زبور۔''

قولہ تعالیٰ: وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ اس قول وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ کے بعد اس کا اعادہ کیا تا کہ وہ یہ واضح کردے کہ وہی ان کا خالق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاق، اشکال، احوال اور مال میں مختلف بنایا ہے: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (الملک: 14) (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے)۔ اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اسے ان کے اس حال کے بارے خوب علم ہے۔ اس بارے بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا زبور وہ کتاب ہے جس میں حلال وحرام میں سے کوئی نہیں ہے، اور نہ اس میں حدود وفرائض ہیں، بلکہ وہ تو فقط دعا اور تحمید وتمجید ہے، یعنی جس طرح ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی ہے بس محمد ﷺ کو قرآن دیئے جانے کا انکار نہ کرو اور یہ یہودیوں کے جھگڑے اور اختلاف کے بارے میں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

''(انہیں) کہیے اب بلاؤ ان کو جنہیں تم گمان کیا کرتے تھے (کہ یہ خدا ہیں) اللہ تعالیٰ کے سوا، وہ تو قدرت نہیں رکھتے کہ تکلیف دور کرسکیں تم سے اور نہ ہی وہ (اسے) بدل سکتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ جب قریش کو قحط میں مبتلا کیا گیا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یعنی تم ان کو بلاؤ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے ہو اور یہ گمان کرتے ہو کہ وہ خدا ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: یعنی ملائکہ، عیسیٰ اور عزیر (کو بلاؤ)(1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ یعنی جنوں کو بلاؤ(2)۔ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ یعنی وہ قحط جو سات سال تک ان پر مسلط رہا (وہ اس تکلیف کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے)، یہ مقاتل کے قول کے مطابق ہے۔ وَلَا تَحْوِيْلًا اور نہ ہی وہ اسے فقر سے غنیٰ (خوشحالی) کی طرف اور بیماری سے صحت کی طرف بدل سکتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

''وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں، وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ کہ کون سا بندہ (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ قریب ہے اور امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور ڈرتے رہتے ہیں اس کے عذاب سے بے شک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔''

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 30
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 250

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے۔ الَّذِيْنَ، اُولٰٓئِكَ کی صفت ہے۔ اور صلہ کی ضمیر محذوف ہے، یدعونھم یعنی وہ جنہیں پکارا جاتا ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ خبر ہے یا یہ حال ہوگا، اور الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ خبر ہے، ای یدعون الیہ عبادا [او عبادہ] الی عبادتہ۔ (وہ اس کی طرف اس کے بندوں کو اس کی عبادت کے لئے پکارتے ہیں)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تدعون صیغہ خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خبر کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ یا کے ساتھ ہے۔ اور صحیح مسلم میں کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ کے بارے کہا ہے: جنوں کے ایک گروہ نے اسلام قبول کرلیا حالانکہ ان کی عبادت کی جاتی تھی، پس وہ جو ان کی عبادت کرتے تھے ان کی عبادت اور پرستش پر باقی رہے حالانکہ جنوں کا ایک گروہ اسلام لا چکا تھا (1)۔ اور ایک روایت میں انہوں نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے نازل ہوئی وہ جنوں کے گروہ کی عبادت کرتے تھے پس جنوں سے تعلق رکھنے والے تو اسلام لے آئے اور انسان جو ان کی عبادت کرتے تھے وہ یہ شعور نہیں رکھتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی (2): اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ، اور انہی سے یہ روایت بھی ہے کہ وہ ملائکہ ہیں عرب قبائل ان کی پرستش کرتے تھے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ وہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ اور يَبْتَغُوْنَ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب اور نزدیکی کا ذریعہ تلاش کر رہے ہیں، اور جنت کی طلب میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور زاری کر رہے ہیں، اور یہی وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کر دیا کہ ان کے معبود اپنے رب سے قرب اور نزدیکی تلاش کر رہے ہیں۔ اور رَبِّهِمُ میں ھا اور میم عبادت کرنے والوں کی طرف یا معبودوں کی طرف یا ان تمام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اور رہا يَدْعُوْنَ تو اس کی ضمیر عبادت کرنے والوں کی طرف ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ کی ضمیر معبودوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ، يَبْتَغُوْنَ میں موجود ضمیر سے بدل ہو، اور اس کا معنی یہ ہو تلاش کرنا چاہئے کہ کون سا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے؟ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا بے شک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے اس سے کسی کو کوئی امان نہیں، پس چاہئے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے خوف کیا جائے۔ اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: امید اور خوف انسان پر دو زمانے ہیں، پس جب یہ دونوں برابر ہوں اس کے احوال صحیح اور درست ہوتے ہیں، اور اگر ان میں سے ایک ترجیح پا جائے تو دوسرا باطل ہو جاتا ہے (3)۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

"اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر ہم اسے برباد کر دیں گے روز قیامت سے پہلے یا اسے سخت عذاب دیں گے، یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، فی قولہ تعالیٰ اولئک الذین یدعون، جلد 2، صفحہ 422
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 252

فیصلہ کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا نَحۡنُ مُهۡلِكُوۡهَا اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر اسے خراب اور برباد کر دیں گے۔ قَبۡلَ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ اَوۡ مُعَذِّبُوۡهَا عَذَابًا شَدِیۡدًا مقاتل نے کہا ہے: اگر اس بستی کے رہنے والے نیک اور صالح لوگ ہیں تو موت کے ساتھ اس بستی کو ختم کر دیں گے، اور اگر وہ بدکار اور نافرمان ہیں تو پھر عذاب کے ساتھ اسے برباد کر دیں گے (1)۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان فرما دیتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اور اگر وہ ظالموں کی بستی میں سے ہو۔ اور اسے یہ قول باری تعالیٰ تقویت دیتا ہے: وَ مَا كُنَّا مُهۡلِكِی الۡقُرٰۤی اِلَّا وَ اَهۡلُهَا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ (القصص) (اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے بسنے والے ظالم ہیں۔) یعنی مشرکوں کو ڈرنا چاہئے، کیونکہ کافروں کی کوئی بستی نہیں ہے مگر اس میں عنقریب عذاب آئے گا۔ كَانَ ذٰلِكَ فِی الۡكِتٰبِ یعنی یہ فیصلہ کتاب یعنی لوح محفوظ میں ہے۔ مَسۡطُوۡرًا لکھا ہوا۔ اور السطر اس کا معنی لکھنا ہے اور یہ اصل میں مصدر ہے۔ اور السَّطَرُ طا متحرک کے ساتھ ہو تو بھی اسی طرح ہے۔

جریر نے کہا ہے:

من شاء بایعته ما لی وخُلعَتَهٗ　　ما تُكْمِل التَّیمُ فی دیوانهم سَطَرًا

الخُلعة خا کے ضمہ کے ساتھ اس کا معنی مال کا اختیار ہے۔ اور السَّطَرَ کی جمع أسطار ہے، جیسے سبب کی جمع اسباب ہے، پھر اس کی جمع الجمع اساطیر ہے۔ اور السطر کی جمع أسطر اور سطور ہے، جیسے أفلس اور فلوس ہیں۔ اور یہاں الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ وَ اٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَۃَ مُبۡصِرَۃً فَظَلَمُوۡا بِهَا ؕ وَ مَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴿۵۹﴾

"اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم بھیجیں (کفار کی تجویز کردہ) نشانیاں مگر اس بات نے کہ جھٹلایا تھا ان نشانیوں کو پہلوں نے (اور وہ فوراً تباہ کر دیئے گئے تھے) اور ہم نے دی تھی قوم ثمود کو ایک اونٹنی جو روشن نشانی تھی پس انہوں نے زیادتی کی اس پر، اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر لوگوں کو (عذاب سے) خوفزدہ کرنے کے لئے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ اس کلام میں حذف ہے، اور تقدیر کلام ہے: و ما منعنا أن نرسل بالآیات التی اقترحوها إلا أن یکذبوا بها فیهلکوا کما فُعل بمن کان قبلهم (اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم وہ نشانیاں بھیجیں جن کو کفار نے تجویز کیا مگر اس بات نے کہ وہ انہیں جھٹلائیں اور ہلاک کر دیئے جائیں جیسا کہ ان کے ساتھ کیا گیا جو ان سے پہلے تھے۔) اس کا یہ معنی قتادہ اور ابن جریج وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کفار قریش سے عذاب کو مؤخر کر دیا کیونکہ اس کے علم میں تھا کہ ان میں وہ بھی ہیں جو ایمان لائیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں جو مومنوں کو جنم

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 124

دیں گے۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام وغیرہ میں گزر چکا ہے کہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے صفا کو سونے میں بدل دے اور پہاڑ ان سے دور ہٹا دیئے جائیں، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: اگر آپ چاہیں تو وہی ہو جائے جو آپ کی قوم نے مانگا ہے لیکن اگر وہ ایمان نہ لائے تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور اگر آپ چاہیں تو ان کے بارے انتظار کر لیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ میں ان کے بارے انتظار کروں گا۔'' اور پہلا اَنْ محل نصب میں ہے اس لئے کہ منع ان پر واقع ہوا، اور دوسرا اَنْ محل رفع میں ہے۔ اور بِالْاٰیٰتِ میں با زائدہ ہے۔ اور مجاز کلام یہ ہے: وما منعنا ارسال الآیات إلّا تکذیب الأولین۔ (اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر پہلوں کے جھٹلانے نے) اور اللہ تعالیٰ کو کسی شے سے روکا نہیں جا سکتا، پس یہ اس معنی میں اظہار مبالغہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا تو گویا اسے اس سے روک دیا گیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی جو کچھ اس نے ان کے ساتھ کیا جنہوں نے نشانیوں کا مطالبہ کیا اور وہ ان کے ساتھ ایمان نہ لائے، پس فرمایا: وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً یعنی ہم نے قوم ثمود کو ایسی نشانی عطا فرمائی جو حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر انتہائی واضح اور روشن دلیل تھی، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ فَظَلَمُوْا بِهَا یعنی انہوں نے اسے جھٹلانے کے ساتھ زیادتی کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تسلیم نہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے پس اللہ تعالیٰ نے عذاب کے ساتھ انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا اس میں پانچ قول ہیں: (۱) وہ نصائح اور معجزات جو ڈرانے والے دلائل میں سے جھٹلانے والوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ہاتھوں پر ظاہر فرمائے۔ (۲) کہ یہ گنہگاروں کو ڈرانے کے لئے انتقام کی علامات اور نشانیاں ہیں۔ (۳) یہ احوال کو بچپن سے جوانی کی طرف پھر بڑھاپے کی طرف اور پھر شیخوخت کی طرف پھیرنا اور بدلنا ہے، تاکہ تو اپنے احوال کے بدلنے سے عبرت حاصل کرے اور اپنے انجام سے ڈرنے لگے: اور یہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے(1)۔ (۴) اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ (۵) اس سے مراد جلدی اور تیزی سے آنے والی موت ہے) یہ قول حسن نے کہا ہے(2)۔

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝۶۰

''اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا آپ کو کہ بے شک آپ کے پروردگار نے گھیرے میں لے لیا ہے لوگوں کو، اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لئے نیز (آزمائش بنایا) اس درخت کو جس پر لعنت بھیجی گئی ہے قرآن میں، اور ہم انہیں (نافرمانی کے انجام سے) ڈراتے رہتے ہیں پس نہ بڑھایا اس ڈرانے نے انہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہاں الناس سے مراد اہل مکہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 252	2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 126

ہیں، اور اس کے انہیں گھیرنے سے مراد اس کا انہیں ہلاک کرنا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں ہلاک کر دے گا۔ اور اس کو ماضی کے لفظ کے ساتھ ذکر کرنا اس کے تحقق اور وقوع کے یقینی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور وہ ہلاک کرنا جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ ہے جو کچھ یوم بدر اور یوم فتح کو ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَحَاطَ بِالنَّاسِ کا معنی ہے، یعنی اس کی قدرت نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے، پس وہ اس کے قبضے میں ہیں اور وہ اس کی مشیت سے نکلنے پر قدرت نہیں رکھتے؛ یہ حضرت مجاہد اور ابن ابی نجیح نے کہا ہے (1)۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے اس کے علم نے لوگوں کو گھیرا ہوا ہے (2)۔ اور یہ قول بھی ہے: کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں سے آپ کی حفاظت اور نگہبانی فرمائے گا کہ وہ آپ کو قتل کریں یہاں تک کہ آپ اپنے رب کا پیغام پہنچا دیں، یعنی ہم نے آپ کو ان پر نگران اور محافظ بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ آپ پر تبلیغ کرنے اور پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے، پس آپ اپنی محبت اور کوشش کے ساتھ تبلیغ کریں کیونکہ ہم آپ کو ان سے بچائیں گے اور ہم آپ کی حفاظت کریں گے، پس آپ ان سے نہ ڈریں اور وہ کام کریں تبلیغ رسالت میں سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے، پس ہماری قدرت تمام کو محیط اور گھیرے ہوئے ہے؛ اس کا یہ معنی حضرت حسن، عروہ اور قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے (3)۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ جب یہ بیان کیا کہ قرآن کریم کی آیات کو نازل کرنا ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کو متضمن ہے تو اس کے ساتھ آیۃ الاسراء کا ذکر ملا دیا، اور وہ آیت اس سورت کے آغاز میں مذکور ہے۔ صحیح بخاری اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کے تحت فرمایا: یہ آنکھ کے ساتھ دیکھا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات دکھایا گیا جس رات آپ کو بیت المقدس کی طرف لے جایا گیا۔ فرمایا: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ یہ زقوم (تھور) کا درخت ہے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (4): یہ حدیث صحیح ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی مثل ہی حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ، حسن، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، ضحاک، ابن ابی نجیح اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور فتنہ سے مراد قوم کا مرتد ہونا ہے جو اسلام لا چکے تھے (اور اس وقت مرتد ہو گئے) جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبر دی کہ انہیں معراج پر لے جایا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حالت نیند کی رؤیت ہے۔ اور یہ آیت اس قول کے فاسد ہونے کا تقاضا کرتی ہے، اور وہ اس لئے کہ حالت خواب میں دیکھنے میں کوئی فتنہ نہیں ہے، اور کوئی بھی نہیں ہے جو اس کا انکار کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں جس رؤیا کا ذکر ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیبیہ کے سال میں یہ دیکھنا ہے کہ آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے، لیکن آپ کو واپس لوٹا دیا گیا پس مسلمان اس وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی، پس جب آئندہ سال آیا تو آپ اس میں داخل ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ (الفتح: 27) (یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ) اس تاویل میں ضعف ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور وہ نظارہ آپ نے مدینہ طیبہ میں دیکھا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 253 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، من سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 141

تھا۔ اور تیسری روایت میں آپ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بنی مروان کو دیکھا کہ وہ آپ کے منبر پر بندروں کے کودنے کی طرح کود رہے ہیں، تو آپ کو یہ بہت برا لگا تو کہا گیا: بلاشبہ یہ دنیا ہے جو انہیں عطا کی گئی ہے، پس آپ سے فکر دور کر دی گئی، اور آپ کا مکہ مکرمہ میں کوئی منبر نہ تھا لیکن یہ جائز ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں مدینہ منورہ والے منبر کا نظارہ دیکھا ہو۔ اور یہ تیسری تاویل حضرت سہل بن سعد نے بھی بیان کی ہے۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہی نظارہ وہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی امیہ کو اپنے منبر پر بندروں کے کودنے کی طرح کودتے دیکھا، تو آپ اس سے غمزدہ ہو گئے، اور اس دن سے آپ کھل کر ہنسے نہیں یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا، پس یہ آیت اس کی خبر دینے کے لئے نازل ہوئی کہ ان کی بادشاہی اور ان کے غالب آنے کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے فتنہ (آزمائش) اور امتحان بنا دے گا(1)۔ اور امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کے بارے میں اپنے خطبہ میں یہ پڑھا: وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۱۱۱﴾ (الانبیاء) (اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تاویل محل نظر ہے۔ اور اس رؤیا میں حضرت عثمان، حضرت عمر بن عبد العزیز، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم داخل نہیں ہیں۔ قولہ تعالیٰ: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی ما جعلنا الرؤيا ألتي أريناك والشجرة الملعونة في القرآن إلا فتنة للناس۔ (ہم اس نظارہ کو جو ہم نے آپ کو دکھایا اور اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے نہیں بنایا مگر لوگوں کے لئے آزمائش) اور اس کا فتنہ یہ تھا کہ انہیں جب اس کے ساتھ خوفزدہ کیا گیا تو ابو جہل نے استہزا کیا: یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں تمہیں ایسی آگ سے ڈرا رہے ہیں جو پتھروں کو جلاتی ہے، پھر یہ گمان کرتے ہیں کہ درختوں کو اگاتی ہے حالانکہ آگ درختوں کو کھاتی ہے، اور ہم زقوم کو نہیں پہچانتے مگر یہ کہ وہ کھجور اور مکھن ہے، پھر ابو جہل نے اپنی لونڈی کو حکم دیا پس وہ کھجور اور مکھن لے آئی اور اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا: تزقموا زقوم کھاؤ(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ قول کہ ہم زقوم کو نہیں جانتے مگر کھجور اور مکھن، کہنے والا ابن زبعری ہے جس وقت اس نے کہا: كثر الله من الزقوم في داركم (اللہ تعالیٰ تمہارے گھر میں زقوم زیادہ کرے)، کیونکہ لغت یمن میں اس سے مراد مکھن اور کھجور ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں نے اس طرح کہا ہو۔ پس بعض ضعیف اور کمزور لوگ اس قول کی وجہ سے بھی آزمائش اور فتنہ میں پڑ گئے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی ہے کہ بے شک واقعہ معراج اور زقوم کے درخت کے ذکر کو آزمائش اور امتحان بنا دیا گیا ہے تاکہ وہ کافر ہو جائے جس پر کفر سبقت لے گیا ہے اور وہ تصدیق کرلے جس کے لئے ایمان سبقت لے گیا ہے۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر ہے وہ انکار کر دے اور جو مومن ہے وہ تصدیق کر دے۔) جیسا کہ روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معراج کی صبح کہا گیا: بے شک آپ کا ساتھی کہہ رہا ہے کہ وہ گزشتہ رات بیت المقدس میں سے ہو آیا ہے! تو آپ نے فرمایا: ان كان قال ذالك فقد صدق اگر آپ نے یہ فرمایا ہے تو یقیناً سچ فرمایا ہے۔ تو آپ کو کہا گیا: کیا آپ ان کی تصدیق کر رہے ہیں اس سے پہلے کہ آپ ان سے سنیں؟ تو انہوں نے فرمایا: تمہاری عقلیں کہاں ہیں؟ میں آسمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 468　　2۔ ایضاً

کی خبر کے بارے ان کی تصدیق کرتا ہوں، تو میں بیت المقدس کی خبر کے بارے کیسے ان کی تصدیق نہیں کروں گا، حالانکہ آسمان اس سے بہت زیادہ دور ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ خبر ابن اسحاق نے ذکر کی ہے، اور انہوں نے بیان کیا ہے: فرمایا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کے بارے میں جو حدیث مجھ تک پہنچی ہے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حسن بن ابی الحسن، ابن شہاب زہری اور قتادہ رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ دیگر اہل علم اور حضرت ام ہانی بنت ابی طالب سے مروی ہے، جو کچھ اس حدیث میں جمع ہے، ہر کوئی ان بعض امور کو بیان کرتا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ اسراء کے وقت بیان کئے گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اسراء میں اور جو کچھ اس بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس میں آزمائش، امتحان اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی سلطنت سے متعلقہ امور میں سے کئی امور ہیں، اس میں صاحب عقل لوگوں کے لئے سامان عبرت ہے، اور ان کے لئے ہدایت، رحمت اور ثبات ہے جو ایمان لائے اور تصدیق کی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ امر تو یقینی ہے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی جیسے چاہی اور جہاں تک چاہی تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وہ نشانیاں دکھائے جن کا اس نے ارادہ کیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے امر، اس کی عظیم سلطنت اور اس کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کا معائنہ اور مشاہدہ کیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس روایت میں جو ان سے مجھ تک پہنچی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس براق لایا گیا...... اور یہ وہ جانور ہے جس پر آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو اٹھایا جاتا رہا وہ اپنا قدم اپنی حد نگاہ پر رکھتا ہے ...... پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر سوار کیا گیا، پھر اس کا صاحب (لانے والا) اسے لے کر نکلا آپ آسمان و زمین میں موجود علامات اور آیات دیکھتے رہے، یہاں تک کہ آپ بیت المقدس تک پہنچ گئے، تو اس میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو گروہ انبیاء میں دیکھا وہ آپ کے لئے جمع کئے گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز پڑھائی پھر آپ کے پاس تین برتن لائے گئے: ایک برتن میں دودھ تھا، ایک برتن میں شراب تھی، اور ایک برتن میں پانی تھا۔ انہوں نے بیان کیا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سو میں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جس وقت وہ مجھ پر پیش کئے گئے کہ اگر انہوں نے پانی لیا تو غرق ہو جائیں گے اور ان کی امت بھی غرق ہو جائے گی، اور اگر انہوں نے شراب پکڑی تو گمراہ ہو جائیں گے اور ان کی امت بھی گمراہ ہو جائے گی، اور اگر انہوں نے دودھ لیا تو خود بھی ہدایت پا جائیں گے اور ان کی امت بھی ہدایت پا جائے گی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس میں نے دودھ والا برتن پکڑا اور پی لیا تو جبرائیل امین نے مجھے کہا: ''اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی راہنمائی کر دی گئی اور آپ کی امت کی بھی راہنمائی کر دی گئی۔''

ابن اسحاق نے کہا ہے: میں نے حسن سے حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس اثنا میں کہ میں حجرے میں سو رہا تھا میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کے ساتھ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 468

مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا لیکن میں نے کوئی شے نہ دیکھی پھر میں اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا پھر وہ دوسری بار میرے پاس آئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کے ساتھ مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا لیکن میں نے کوئی شے نہ دیکھی پھر میں اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا۔ پھر وہ تیسری بار میری طرف آئے اور اپنے قدموں کے ساتھ مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا اور انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا اور میں ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور وہ مسجد کے دروازے کی طرف نکل گئے وہاں سفید رنگ کا جانور تھا جو (قد میں) خچر اور گدھے کے درمیان تھا اس کی رانوں پر دو پر تھے وہ انہیں اپنی ٹانگوں پر مارتا تھا اور اپنا قدم اپنی انتہائے نگاہ پر رکھتا تھا پس انہوں نے مجھے اس پر سوار کر دیا پھر میرے ساتھ نکل پڑے پھر نہ وہ مجھ سے الگ ہوئے اور نہ میں ان سے الگ ہوا'' ابن اسحاق نے بیان کیا ہے اور مجھے حضرت قتادہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا، مجھے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب میں اس کے قریب ہوا کہ میں اس پر سوار ہوں تو وہ اچھلنے اور بدکنے لگا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کی کلغی والی جگہ پر رکھا اور فرمایا: اے براق! کیا تو اس سے حیا نہیں کرتا جو تو کر رہا ہے؟ قسم بخدا! حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ تجھ پر سوار نہیں ہوا جو ان سے زیادہ معزز و مکرم ہو، فرمایا: پس اسے حیاء آ گئی یہاں تک کہ پسینہ بہنے لگا پھر وہ پرسکون ٹھہر گیا اور میں اس پر سوار ہو گیا۔''

حسن نے اپنی حدیث میں کہا ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور ان کے ساتھ جبرائیل امین بھی چلتے رہے یہاں تک کہ آپ بیت المقدس پہنچ گئے، پس وہاں آپ نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو گروہ انبیاء علیہم السلام میں پایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی امامت کرائی اور انہیں نماز پڑھائی پھر آپ کے پاس دو برتن لائے گئے: ان میں سے ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ تھا، فرمایا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا برتن پکڑ لیا اور اس سے پی لیا اور شراب کا برتن چھوڑ دیا۔ راوی نے کہا: تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو کہا: آپ کی راہنمائی فطرت کی طرف کر دی گئی اور آپ کی امت کو ہدایت دے دی گئی اور تم پر شراب حرام کر دی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کی طرف واپس لوٹ کر آئے، پس جب صبح کی اور قریش کی ملاقات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واقعہ کی خبر دی، تو اکثر لوگوں نے کہا: قسم بخدا! یہ معاملہ تو بین اور واضح ہے؟ قسم بخدا! بے شک ایک قافلہ مکہ سے شام کی طرف مسلسل ایک مہینہ چلتا ہے ایک مہینہ جاتے ہوئے اور ایک مہینہ واپس آتے ہوئے، اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ایک رات میں جاتے ہیں اور مکہ کی طرف واپس بھی لوٹ آتے ہیں! راوی نے بیان کیا: پس بہت سے وہ لوگ مرتد ہو گئے جو ابھی اسلام لائے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف گئے: اے ابابکر! کیا تجھے اپنے ساتھی کے بارے خبر ہے؟ اس کا خیال ہے کہ وہ اس رات بیت المقدس آیا، اور اس میں نماز پڑھی اور واپس مکہ لوٹ آیا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک تم ان کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہو، تو انہوں نے کہا: نہیں، بلکہ وہ وہاں مسجد میں بیٹھے لوگوں سے بیان کر رہا ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! اگر انہوں نے یہ کہا ہے تو یقیناً وہ سچ ہے اس میں سے کون سی شے تمہیں تعجب میں ڈال رہی ہے؟ قسم بخدا! بلاشبہ وہ مجھے خبر دیتے ہیں کہ یہ خبر آسمان سے زمین کی طرف رات یا دن کی ایک ساعت میں آتی ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، تو یہ

اس سے بہت بعید اور دور ہے جس سے تم تعجب کر رہے ہو۔ پھر آپ آئے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے اور عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا آپ نے انہیں یہ بیان کیا ہے کہ آپ اس رات بیت المقدس تشریف لے گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' آپ نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس کے بارے مجھے بیان فرمائیے، کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے پس حسن نے بیان کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے میرے لئے اٹھایا گیا یہاں تک کہ میں اسے دیکھنے لگا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کی ہیئت بیان فرمانے لگے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: آپ نے سچ فرمایا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جب بھی آپ اس میں سے کوئی شے بیان فرماتے تو یہ کہتے: صدقت، أشهد أنك رسول الله (آپ نے سچ فرمایا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔) راوی نے بیان کیا: یہاں تک کہ جب بات مکمل ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا: وأنت یا ابابکر الصدیق (اے ابا بکر تو تو صدیق ہے) پس اس دن آپ نے آپ کا نام صدیق رکھ دیا۔ حسن نے بیان کیا ہے: اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے یہ آیت نازل فرمائی جو اس وجہ سے اسلام سے مرتد ہو گئے: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝ ۔(1)

پس یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ اسراء کے بارے حسن کی حدیث ہے اور کچھ اس میں حضرت قتادہ کی حدیث سے بھی داخل ہے، اور ان سے باقی واقعہ معراج کا ذکر کتب میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ درخت بنو امیہ ہیں، اور یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو شہر بدر کر دیا۔ یہ قول ضعیف اور من گھڑت ہے اور یہ سورت مکی ہے، اور یہ تاویل بعید ہے، مگر اس صورت میں کہ یہ آیت مدنی ہو، لیکن یہ ثابت نہیں۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مروان کو کہا تھا: اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ پر لعنت کی ہے اور تو اس کی صلب میں تھا پس تو بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت کا بعض اور جز ہے۔ پھر فرمایا: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ اور قرآن میں اس درخت پر لعنت جائز نہیں، لیکن (اس طرح کہ) اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت کی ہے اور وہ اسے کھانے والے ہیں۔ اور اس کا معنی ہے: والشجرة الملعونة فی القرآن آکلوها۔ (اور وہ درخت جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ اسے کھانے والے ہیں۔) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عربوں کے اس قول کی بنا پر ہو کہ وہ ہر ناپسندیدہ اور نقصان دہ کھانے کے لئے کہتے ہیں: ملعون (اس پر لعنت کی گئی ہے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الشجرة الملعونه سے مراد وہی درخت ہے جو درختوں پر لپٹ جاتا ہے اور انہیں مار دیتا ہے (یعنی خشک کر دیتا ہے) مراد الکشوث ہے(2) (یعنی ایک قسم کی گھاس ہے جو کانٹوں اور درختوں پر لپٹی ہوتی ہے نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ اس کے پتے ہوتے ہیں۔ المنجد) وَنُخَوِّفُهُمْ اور ہم انہیں زقوم (تھور) کے ساتھ ڈراتے ہیں۔ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اور یہ ڈرانا سوائے کفر کے ان میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 34-33　2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 132

خَلَقْتَ طِيْنًا ۞ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۞

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے کہا: کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا۔ اس نے کہا: مجھے بتا یہ (آدم) جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے (اس کی وجہ کیا ہے)؟ اگر تو مجھے مہلت دے روز قیامت تک تو جڑ سے اکھیڑ پھینکوں گا اس کی اولاد کو سوائے چند افراد کے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ شیطان کے انسان کا دشمن ہونے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، پس کلام کو ذکر آدم کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس کا معنی ہے: ان مشرکین کی سرکشی اور اپنے رب کے بارے میں ان کی رعونت کے ساتھ ابلیس کے قصہ کو یاد کرو جس وقت اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی تھی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، اور وہ کہا جو کہا، اور وہ وہ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں دی ہے: فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا یعنی کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے بحث سورۃ البقرہ اور الانعام میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ قَالَ اَرَءَيْتَكَ یعنی یہ ابلیس نے کہا۔ اور اس میں کاف خطاب کی تاکید کے لئے ہے۔ (اس نے کہا: مجھے بتا) هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ یعنی یہ آدم ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔ اس نے آگ کے جوہر کو کیچڑ اور مٹی کے جوہر سے بہتر دیکھا اور اسے یہ علم نہ ہوا کہ جواہر متماثل اور برابر ہیں۔ یہ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور ھذا، أرأیت کے سبب منصوب ہے۔ اور الذی اس کی صفت ہے۔ اور الا کرام: ایسا اسم ہے جو ہر اس شے کو جامع ہے جس کی تعریف کی جا رہی ہو۔ اور کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت یہ ہے: أخبرنی عن ھذا الذی فضلتہ علیّ (مجھے اس کے بارے خبر دے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے)، تو نے اسے کیوں فضیلت دی ہے حالانکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے؟ سامع کو علم ہونے کی وجہ سے کلام کو حذف کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر حذف کی کوئی حاجت نہیں، یعنی مجھے بتا تو نے کیا تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی ہے میں ضرور اس کے ساتھ اس اس طرح کروں گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق لَاَحْتَنِكَنَّ کا معنی ہے: میں ان پر غالب آ جاؤں گا۔ اور یہ فراء نے بھی کہا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں ضرور انہیں جمع کر لوں گا۔ ابن زید نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں گمراہ کروں گا۔ اور اس کا معنی قریب قریب ہے، یعنی میں اس کی اولاد کو بھٹکانے اور گمراہ کرنے کے سبب جڑ سے اکھیڑ دوں گا، اور ضرور انہیں ہلاک و برباد کر دوں گا۔ اور عربوں سے مروی ہے: احتنک الجراد الزرع جب ٹڈی دل (مکڑی) ساری کھیتی کو تباہ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں ضرور چلاؤں گا جہاں میں چاہوں گا اور میں انہیں ادھر ہی کھینچوں گا جہاں کا میں نے ارادہ کیا۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: حنکت الفرس أحنکہ واحنکہ حنکا جب تو گھوڑے کے منہ میں رسی ڈال لے اور اسی طرح احتنکہ بھی ہے اور پہلا قول اس کے قریب ہے، کیونکہ وہ کھیتی پر تباہی و بربادی لاتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

أشكوا إليك سنةً قد أجحفت　　جهداً إلى جهدٍ بنا وأضعفت

واحتنكت أموالنا واجتلفت (1)

اس میں اِحتنک ہلاک اور برباد کرنے کے معنی میں ہی ہے۔

اِلَّا قَلِیْلًا مراد وہ ہیں جو محفوظ اور بچے ہوئے ہیں، اور وہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر:42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) ابلیس نے یہ ظناً کہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّهٗ (السبا:20) (اور بے شک سچ کر دکھایا ان (ناشکروں) پر شیطان نے اپنا گمان) یا اس نے انسان کی طبع اور مزاج کو جان لیا کہ ان میں شہوت رکھی ہوئی ہے، یا اس نے ملائکہ کے اس قول پر بنیاد رکھی: اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (البقرہ:30) (کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں)۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ اس کا ظن اور گمان ہے کیونکہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام میں وسوسہ اندازی کی اور اس نے انہیں پختہ عزم نہ پایا۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جا چلا جا (جو مرضی ہو کر) سو جو تیری پیروی کرے گا ان سے تو بے شک جہنم ہی تم سب کی پوری پوری سزا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَ اذْهَبْ یہ امر برائے اہانت (وحقارت) ہے، یعنی تو اپنی پوری کوشش کر لے تحقیق ہم تجھے دیکھ لیں گے۔ فَمَنْ تَبِعَكَ یعنی اولاد آدم میں سے جس نے تیری اطاعت و پیروی کی۔ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا تو بے شک جہنم تم سب کی پوری اور وافر سزا ہے۔ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے، کہا جاتا ہے: وفرتہ اِفرہٗ وَفْرًا (میں نے اسے پورا کر دیا)، اور وَفَرَ المالُ بنفسہ یَفِرُ وفوراً فھو وافر (مال خود بخود پورا ہو گیا)، پس یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔

وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

''اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ اور شریک ہو جا ان کے مالوں میں اور اولاد میں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا رہ، اور وعدہ نہیں کرتا ان سے شیطان مگر مکر و فریب کا۔''

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 135

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَفْزِزْ یعنی تو پھسلا اور دور ہٹا اور اس کا اصل معنی القطع (کاٹنا) ہے۔ اور اسی سے ہے تفززّ الثوبُ جب کپڑا کٹ جائے، اور اس کا معنی ہے تو اسے حق سے کاٹ کر (یعنی گمراہ کر کے) اسے پھسلا دے۔ اور استفزّہ الخوفُ یعنی خوف نے اسے ہلکا کر دیا، دور ہٹا دیا اور قعد مُسْتَوفِزًا یعنی وہ غیر مطمئن بیٹھا۔ وَاسْتَفْزِزْ یہ امر برائے تعجیز (عاجز کرنے کے لئے) ہے، یعنی تو کسی کو گمراہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا، اور نہ تجھے کسی پر کوئی غلبہ ہو سکتا ہے پس تو جو چاہے کر لے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بِصَوْتِكَ اور اس کی آواز ہر وہ داعی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی کی طرف بلاتا ہے، دعوت دیتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (1)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گیت، بانسری، اور لہو (ولہب) ہے (2)۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بانسری کی آواز مراد ہے (3)۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے ہابیل کی اولاد کو پہاڑ کی چوٹی پر سکونت دی، اور قابیل کی اولاد کو اس کے نیچے رکھا، اور ان میں حسین و جمیل بیٹیاں تھیں، پس شیطان لعین نے بانسری بجائی اور وہ نیچے اترنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکے پس انہوں نے بدکاری کی؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِصَوْتِكَ سے مراد ہے تو اپنے وسوسہ کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ، الاجلاب کا اصل معنی ہے السوق بجلبة من السائق (ہانکنے والے کا کسی چیز کو سختی سے ہانک کر لے آنا)، کہا جاتا ہے: أجلب إجلابا (وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھا) اور الجَلَب اور الجَلَبة کا معنی آوازیں (شور و شغب) ہے۔ تو اسی سے کہتا ہے: جَلَّبُوْا (یعنی تشدید کے ساتھ) انہوں نے شور مچایا۔ اور جَلَب الشئ یجلِبه و یجلُبه جَلَبًا و جَلْبًا (اس نے شے کو ہانکا) اور جلبت الشئ إلی نفس اور اجتلبته دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور أجلب علی العدو إجلابا یعنی اس نے دشمن پر دھاوا بول دیا (یکبارگی حملہ کر دیا)۔ پس آیت کا معنی یہ ہوا تو ان پر دھاوا بول دے جب بھی تو اس پر اپنے مکر و فریب سے قدرت رکھے۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: مراد اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں ہر گھوڑ سوار اور پیدل چلنے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: بے شک جنوں اور انسانوں میں سے اس کے گھوڑ سوار اور پیدل (دستے) ہیں، پس جو بھی گھوڑ سوار اور پیدل چلنے والا اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں قتال کرتا ہے تو وہی ابلیس کے گھوڑ سوار اور پیدل دستے ہیں (4)۔ اور حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر وہ گھوڑا جو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں چلا، اور ہر وہ پاؤں جو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں چلا، اور ہر وہ مال جو حرام سے حاصل کیا گیا، اور ہر وہ بچہ جو بدکار اور باغی ہو تو وہ شیطان کے لئے ہے۔ اور الرَّجْل راجل کی جمع ہے (پیدل) جیسا کہ صَحْب صاحب کی جمع ہے۔ اور حفص نے وَرَجِلِكَ جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں، کہا جاتا ہے: رَجْل و رَجِل بمعنی راجل (پیدل چلنے والا)۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 136
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 255
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 137

حضرت عکرمہ اور قتادہ نے ورجالک صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ یعنی تو اپنے آپ کو ان میں شریک بنا لے، پس اموال میں اس کی شرکت انہیں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں خرچ کرنا ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ شرکت وہ ہے جس کے سبب وہ مالوں کو غیر حلال تک پہنچادیں؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں(3)۔ اور یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ جانور مراد ہیں جنہیں وہ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اور اولاد میں شرکت کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ مراد زنا سے پیدا ہونے والی اولاد ہے؛ یہ حضرت مجاہد، ضحاک اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور انہی سے یہ بھی ہے: مراد وہ ہے جو انہوں نے اپنے بچوں میں سے قتل کئے اور ان میں جرائم پیدا کردیئے۔ اور اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ان کا عبدالحارث، عبدالعزیٰ، عبداللات اور عبدشمس وغیرہ نام رکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کا اپنے بچوں کو کفر میں رنگنا ہے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں یہودی بنادیا اور انہیں عیسائی بنادیا جیسا کہ عیسائی اپنے بچوں کو اس پانی میں ڈبونے کا عمل کرتے تھے جو ان کے لئے تیار کرتے؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور پانچواں قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: جب آدمی جماع کرے اور بسم اللہ نہ پڑھے تو جن (شیطان) اس کے حشفہ کے ساتھ لپٹ جاتا ہے اور وہ بھی اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿الرحمٰن﴾ (جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک تم میں مغربین ہیں"۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مغربون کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ لوگ جن میں جن شریک ہوجاتے ہیں" (4)۔ اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں روایت کیا ہے۔ ہروی نے کہا ہے: پس جنوں کے انسانوں کے ساتھ بعض امور اور میل جول میں مفاخر ہوتے ہیں پس ان میں سے بعض کی ان میں شادی ہوتی ہے، اور سبا کی ملکہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنوں میں سے تھا۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَعِدْهُمْ یعنی انہیں جھوٹی امیدیں دلا، اور یہ کہ کوئی قیامت نہیں اور نہ کوئی حساب ہے، اور یہ کہ اگر حساب، جنت اور جہنم ہوئے بھی تو بھی دوسروں کی نسبت تم جنت کے زیادہ مستحق اور اولیٰ ہو۔ اس معنی کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مزید قوت دیتا ہے: يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُورًا ﴿النساء﴾ (شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے انہیں اور نہیں وعدہ کرتا شیطان مگر فریب کا) یعنی شیطان ان سے صرف باطل وعدہ کرتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: وَعِدْهُمْ یعنی تو ان کی مدد و نصرت کا وعدہ کر بر اس کے خلاف جو ان کے بارے میں برائی کا ارادہ کرے۔ اور یہ امر شیطان کے لئے جھڑک اور سخت وعید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اسے اور اس کی اتباع کرنے والوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 255 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 354، حدیث 44900

کو حقیر اور ہلاک سمجھنا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں وہ بھی ہے جو بانسری، گیت، گانے اور لہو (ولہب) کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اور ہر وہ جو شیطان کی آواز یا اس کے فعل سے ہو اور وہ چیز جسے وہ اچھا سمجھتا ہو اس سے بچنا واجب ہے۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں رکھ لیں اور راستے سے اپنی سواری کو پھیر لیا اور یہ کہنے لگے: اے نافع! کیا تو سن رہا ہے؟ تو میں نے کہا: ہاں، پس آپ چلتے رہے یہاں تک کہ میں نے کہا: نہیں، پس اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اپنی سواری کو اپنے راستے پر لوٹا دیا۔ اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے ایک چرواہے کی بانسری کی آواز سنی تو آپ نے بھی اسی طرح کیا(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جب اس آواز کے حق میں ان کا فعل اور عمل یہ ہے جو اعتدال سے نہیں نکلتی، تو پھر اس زمانے کے باسیوں کے گانے اور ان کی بانسری بجانے کے بارے کیفیت اور حالت کیا ہوگی؟ اس کا مزید بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ﴿۶۵﴾

''جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا، اور (اے محبوب!) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مومنین ہیں۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا یعنی تیرا رب قبول کر کے ابلیس سے بچانے کے لئے، اس کے فریب اور اس کے مکر کی برائی سے حفاظت کرنے کے لئے کافی ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾

''تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں تاکہ تم تلاش کرو (بحری سفر کے ذریعہ) اس کا فضل، بے شک وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ، الازجاء کا معنی ''چلانا'' ہے۔ اور اسی سے یہ قول باری تعالیٰ بھی ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا (النور: 43) (کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

یاأیتها الراکب المزجی مطیّته سائل بنی أسد ما هذه الصوتُ(2)

تو اس میں بھی مزجی چلانے والے کے معنی میں ہے۔

اور ازجاء الفلک کا معنی ہے کشتیوں کو نرم ہوا کے ساتھ چلانا۔ اور الفلک یہاں جمع ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب کراھیۃ الغناء الخ، حدیث نمبر 4278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 256

البحر سے مراد کثیر پانی ہے چاہے وہ میٹھا ہو یا نمکین ہو، اور یہ اسم مشہور معنی پر غالب ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے بندوں پر اس کے فضل و کرم کے بارے واقفیت دلاتی ہے، یعنی تمہارا رب وہ ہے جس نے تم پر اس طرح کی نعمتیں فرمائی ہیں پس تم اس کے ساتھ کسی شی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ تاکہ تم تجارت میں اس کا فضل تلاش کرو۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝

''اور جب پہنچتی ہے تمہیں تکلیف سمندر میں تو گم ہو جاتے ہیں وہ (معبود) جن کو تم پکارا کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے، پس جب وہ خیر و عافیت سے تمہیں ساحل پر پہنچا دیتا ہے (تو) تم روگردانی کرنے لگتے ہو اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ، والضُّرُّ کا لفظ غرق ہونے اور چلنے سے رکنے کے خوف اور اس کے حالات کے خوفناک ہونے (یعنی) اس کے اضطراب اور اس کے موجیں مارنے وغیرہ سبھی کو شامل ہے۔ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ، ضَلَّ اس کا معنی ضائع ہونا اور مفقود ہونا، اور گم ہونا ہے اور یہ ان کی تحقیر سے عبارت ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا بطور الٰہ پکارا جاتا ہے۔ اور اس آیت میں اس کا معنی یہ ہے کہ کفار بلاشبہ اپنے بتوں کے بارے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ شفاعت اور سفارش کرنے والے ہیں، اور یہ کہ ان کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے ہر ایک فطرت کے مطابق یہ علم رکھتا ہے جو وہ اپنے دفاع پر قدرت نہیں رکھتا کہ ان بڑی بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں میں بتوں کا کوئی عمل اور فعل نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس سے متعلق سمندر کی حالت پر انہیں واقفیت دلائی کہ جہاں حیلے اور وسائل کٹ جاتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ پس جب وہ تمہیں خلاصی عطا فرما کر ساحل پر پہنچا دیتا ہے تو تم روگردانی کرنے لگتے ہو۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے) یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نعمتوں کی ناشکری انسان کی طبع اور مزاج ہے سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ بچا لے۔ پس یہاں انسان بطور جنس کے مذکور ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝

''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے کہ اللہ دھنسا دے تمہارے ساتھ خشکی کے کنارہ کو یا بھیج دے تم پر اولے برسانے والا بادل پھر اس وقت تم نہیں پاؤ گے اپنے لئے کوئی کارساز۔''

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ یہ بیان فرمایا کہ وہ خشکی میں بھی انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اگرچہ وہ سمندر سے صحیح سالم بچ جائیں۔ اور الخسف کا معنی ہے زمین کا کسی چیز کے ساتھ دھنس جانا)۔ کہا جاتا ہے: بئر خسیف جب کنوئیں کی اصل اور بنیاد گر جائے۔ اور عین خاسف یعنی آنکھ کی سیاہی سر میں دھنس گئی اور عین من الماء خاسفۃ یعنی چشمے کا

پانی نیچے دھنس گیا۔ اور خسفت الشمس یعنی سورج زمین سے چھپ گیا (سورج کو گرہن لگ گیا)۔ اور ابو عمرو نے کہا ہے: الخسیف وہ کنواں ہے جو پتھروں میں کھودا جاتا ہے اور اس کا پانی کثیر اور زیادہ ہونے کے سبب ختم نہ ہو۔ اور اس کی جمع خُسُف ہے۔ اور جَانِبَ الْبَرِّ سے مراد زمین کا کنارہ ہے۔ اور اس کا نام جانب رکھا ہے کیونکہ وہ دھنسنے کے بعد جانب (کنارہ) ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ سمندر ایک جانب ہے اور خشکی ایک جانب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ ساحل سمندر پر تھے، اور اس کا ساحل خشکی کا کنارہ ہے، اور وہ اس میں سمندر کی ہولناکیوں سے پر امن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے ڈرایا جس سے وہ خشکی میں محفوظ تھے جیسا کہ انہیں اس سے ڈرایا جس کا انہیں سمندر میں خوف تھا (1)۔ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا (الملک: 17) یعنی یا وہ تم پر شدید آندھی بھیج دے۔ اور یہ وہ ہے جو سنگریزے پھینکتی ہے۔ اور الحصباء سے مراد چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں (سنگریزے)؛ یہ ابو عبیدہ اور قتبی نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ وہ آسمان سے پتھر ان پر برسائے، جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ کیا گیا۔ اور اس بادل کو بھی حاصب کہا جاتا ہے جو اولے برساتا ہے: حاصب اور اس ہوا کو جو مٹی اور سنگریزے کو اٹھا کر لاتی ہے حاصب کہا جاتا ہے اور حَصِبَۃ بھی۔

جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

جرّت علیها أن خَوَتْ من أهلها أذیالَها كلُّ عَصُوفٍ حَصِبه

اور فرزدق نے کہا ہے:

مستقبلین شَمَال الشام یضربنا بحاصب كنَدِیف القطن منثور (2)

ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا پھر اس وقت اپنے لئے تم کوئی محافظ اور مددگار نہیں پاؤ گے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالے۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ۞

''کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے سمندر میں دوسری مرتبہ اور بھیجے تم پر سخت آندھی جو کشتیوں کو توڑنے والی ہو پھر غرق کر دے تمہیں بوجہ کفر کے جو تم نے کیا پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لئے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا۔''

قولہ تعالیٰ: اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى (کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوسری مرتبہ لے جائے) سمندر میں۔ فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ ۔ القاصف، وہ سخت اور تیز ہوا جو اپنی شدت کے ساتھ (ہر شے کو) توڑ دیتی ہے۔ یہ قصف الشئ یقصفه سے ماخوذ ہے، یعنی اس نے اسے شدت اور سختی کے ساتھ توڑ دیا۔ اور القصف کا معنی توڑنا ہے۔ کہا جاتا ہے: قصفت الریح السفینة (ہوا نے کشتی کو توڑ دیا) اور ریح قاصف یعنی شدید آندھی۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 143

اور رعد قاصف، سخت آواز والی گرج۔ کہا جاتا ہے: قصف الرعدُ وغیرُہ قصیفا (گرج وغیرہ نے سخت آواز نکالی) اور التقصف کا معنی ہے درختوں کو توڑنے والی۔ اور التقصف، اس کا معنی ٹوٹنا اور توڑنا ہے۔ اور التقصف کا معنی لہو ولعب بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ (معنی) نیا پایا گیا ہے۔ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ پھر وہ تمہیں تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے نَخْسِفَ بِكُم، اَوْ نُرْسِلَ عَلَيْكُمْ، اَنْ نُعِيْدَكُمْ، فَنُرْسِلَ عَلَيْكُمْ، فَنُغْرِقَكُمْ پانچوں مقامات پر تعظیم کی بنا پر نون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے قول عَلَيْنَا کی وجہ سے (نون کے ساتھ پڑھا ہے) اور باقیوں نے یا کے ساتھ، کیونکہ آیت میں اس سے پہلے اِيَّاهُ ہے۔ اور ابو جعفر، شیبہ، رویس اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے فَتُغْرِقَكُم تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ریح (ہوا) کی صفت ہے۔ اور حسن اور قتادہ سے فَيُغَرِّقَكُم یا اور را کی تشدید کے ساتھ منقول ہے۔ اور ابو جعفر نے یہاں اور پورے قرآن میں الرياح پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قاصف وہ ہے جو خشکی میں ہلاک کرنے والی ہو، اور عاصف وہ ہے جو سمندر میں غرق کرنے والی ہو؛ اسے ماوردی نے بیان کیا ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ: ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پھر تم اس پر ہم سے کوئی بدلہ لینے والا نہیں پاؤ گے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: (ثائر) یہ الثار سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح ہر انتقام اور بدلہ کا مطالبہ کرنے والے کو تبیع اور تابع کہا جاتا ہے؛ اور اسی سے فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 178) ہے ای مطالبۃ نیکی کا مطالبہ کرنے والا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

"اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سے چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ الآیہ۔ جب ترہیب اور ڈرانے والی چیزوں میں سے جن کا ذکر کیا سو کیا تو ساتھ ہی ان پر انعام و کرام کا بھی ذکر کیا۔ كَرَّمْنَا یہ کرم کو مضاعف بنا کر (یعنی عین کلمہ کو مشدد کر کے) پڑھا ہے، یعنی ہم نے انہیں عزت اور شرف و فضل عطا فرمایا۔ یہ وہ عزت ہے جس نے نقصان اور کمی کی نفی کی ہے نہ کہ اس سے مراد مال کی عزت ہے۔ اور اس عزت و کرامت میں انہیں اس ہیئت یعنی سیدھے قد اور حسین صورت پر پیدا کرنا بھی داخل ہے، اور انہیں بر و بحر میں سوار کرنا بھی ان چیزوں سے ہے جو سوائے انسان کے کسی حیوان کے لئے صحیح نہیں کہ وہ اپنے ارادہ، قصد اور تدبیر کے ساتھ سوار ہو سکے۔ اور ان کی تخصیص ان چیزوں کے ساتھ بھی ہے کھانے، پینے اور لباس میں سے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص کیا ہے۔ اور اس میں انسان کی وسعت کی مثل کوئی حیوان وسعت نہیں رکھتا، کیونکہ خاص طور پر وہی مال کماتے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257　　2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 145

ہیں نہ کہ دیگر حیوان، اور وہ کپڑے پہنتے ہیں اور طرح طرح کے مرکب کھانے کھاتے ہیں۔ اور ہر حیوان کی غایت یہ ہے کہ وہ کچا گوشت یا غیر مرکب کھانا کھاتا ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے یہ بیان کیا ہے کہ ابن آدم کی وجہ فضیلت یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کھاتا ہے اور باقی تمام حیوان منہ سے کھاتے ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛ اسے مہدوی اور نحاس نے ذکر کیا ہے اور یہی کلبی اور مقاتل کا قول ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بولنے اور تمیز کی قوت کے ساتھ عزت عطا فرمائی۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سیدھے قد اور اس کے بڑھنے کی فضیلت دی۔ یمان نے کہا ہے: حسن صورت کے ساتھ فضیلت دی۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: انہیں اس سے فضیلت دی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بنایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوں کو داڑھی کے ساتھ اور عورتوں کو مینڈھیوں کے ساتھ فضیلت دی۔ اور محمد بن جریر طبری نے کہا ہے: انہیں تمام مخلوق پر مسلط کر کے اور تمام مخلوق کو ان کے لئے مسخر کر کے انہیں عزت و تکریم عطا کی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام کرنے اور لکھنے کی قوت کے ساتھ فضیلت دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فہم و فراست اور تمیز کی قوت کے ساتھ فضیلت دی۔ اور وہ صحیح قول جس پر تعویل کی جاسکتی ہے کہ بلاشبہ انسان کی فضیلت کا سبب عقل ہے جو مکلف بنائے جانے کی اصل اور بنیاد ہے، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے اس کا کلام سمجھا جاتا ہے، اور اس کی نعمتوں اور رسل علیہم السلام کی تصدیق تک پہنچا جاسکتا ہے، مگر یہ کہ جب بندے کے لئے تمام مقصود اور مدعیٰ واضح نہ ہوا تو رسول مبعوث کئے گئے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ پس شریعت کی مثال سورج ہے، اور عقل کی مثال آنکھ ہے، پس جب وہ کھلی ہو اور صحیح و تندرست بھی ہو تو وہ سورج کو دیکھ سکتی ہے اور اشیاء کی تفاصیل کا ادراک کر سکتی ہے۔ اور جو اقوال اوپر مذکور ہوئے ہیں ان میں سے بعض بعض سے قوی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بعض حیوانوں میں ایسے خصائل رکھ دیئے ہیں جن کے ساتھ وہ ابن آدم سے بھی افضل ہیں، مثلاً گھوڑے کا دوڑنا، اس کا سننا اور اس کا دیکھنا، ہاتھی کی قوت، شیر کی شجاعت اور بہادری اور مرغ کی سخاوت، تو بلاشبہ تکریم و تفضل عقل کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت انسانوں اور جنوں پر ملائکہ کو فضیلت دینے کا تقاضا کرتی ہے اس حیثیت سے کہ ان کی اس قول باری تعالیٰ میں استثنا کی گئی ہے: وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء: 172) (اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)) اور یہ آیت سے لازم نہیں آتا، بلکہ اس میں انسانوں اور جنوں کے درمیان فضیلت کا ذکر ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر وہ چیزیں شمار کرائی ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام حیوانوں سے خاص کیا ہے، اور جن تو بہت زیادہ مفضول ہیں (یعنی ان پر تو بہت زیادہ فضیلت دی گئی ہے۔) اور ملائکہ ان بہت زیادہ مفضول سے خارج ہیں، لہٰذا آیت نے ان کے ذکر کو نہیں چھیڑا، بلکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ملائکہ افضل ہوں، اس کے برعکس کا احتمال بھی ہو سکتا ہے، اور مساوی ہونے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے، الختصر یہ کہ کلام اس مسئلہ میں کسی یقین کی حد تک نہیں پہنچتی۔ تحقیق ایک قوم اس بارے میں کلام کرنے سے دور رہی جیسا کہ وہ بعض انبیاء علیہم السلام کو بعض پر فضیلت دینے کے بارے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 145

کلام کرنے سے دور رہے اور بچے رہے، کیونکہ حدیث میں ہے: ''تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان پسند و اختیار کے اعتبار سے موازنہ نہ کرو اور نہ تم مجھے یونس بن متی پر فضیلت دو۔'' اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے درمیان بعض کو بعض پر فضیلت دینے کے بارے نص موجود ہے۔ ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں بیان کر دیا ہے۔ اور اس میں ملائکہ اور مومن کی تفضیل کے بارے کلام گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ یعنی ہم نے انہیں لذیذ کھانے اور مشروبات عطا فرمائے۔ مقاتل نے کہا ہے: مراد گھی، شہد، مکھن، کھجور اور حلوا (اور میٹھا پھل وغیرہ) ہیں، اور انسانوں کے سوا دیگر حیوانوں کا جو رزق بنایا وہ تم پر مخفی نہیں ہے مثلاً بھوسہ اور ہڈیاں وغیرہ۔ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا اور ہم نے انہیں بہت سے چوپاؤں، جانوروں، درندوں، پرندوں پر غلبہ اور تسخیر کے ساتھ، ثواب اور جزا، حفظ و تمیز اور صحیح فہم و فراست کے ساتھ فضیلت دی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ آیت اسے رد کرتی ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے آپ کو عمدہ کھانے سے دور رکھو کیونکہ یہ شیطان کو قوی کرتا ہے وہ اس قوت سے رگوں میں دوڑتا ہے۔'' اور اس سے بہت سے صوفیاء لذیذ اور عمدہ کھانے ترک کرنے پر استدلال کرتے ہیں، اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم اس کا رد کرتا ہے، اور سنت ثابتہ اس کے خلاف ہیں، جیسا کہ کئی مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ اور ابو حامد طوسی نے بیان کیا ہے کہ حضرت سہل ایک مدت تک بیری کے پتوں سے خوراک حاصل کرتے رہے، اور دقاق نے تین سال تک بھوسہ کے پتے کھائے۔ اور ابراہیم ابن البنا نے ذکر کیا ہے کہ میں اخمیم سے اسکندریہ تک ذوالنون کے ساتھ رہا، پس جب بھی آپ کی افطاری کا وقت آتا تو میں ایک روٹی اور نمک نکالتا جو میرے پاس تھا، اور میں کہتا: آؤ، تو وہ مجھے کہتے: کیا تیرا نمک کوٹا ہوا ہے؟ میں کہتا: ہاں۔ فرماتے: تو کامیاب نہیں ہوگا، تو میں نے ان کے توشہ دان کی طرف دیکھا تو اس میں تھوڑے سے جو کے ستو تھے وہ ان سے پھانک لیتے تھے۔ اور ابو یزید نے کہا ہے: میں نے چالیس سال تک ان میں سے کوئی شے نہیں کھائی جو بنی آدم کھاتے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ ان چیزوں میں سے ہے جس پر نفس کو ابھارنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو گندم کے ساتھ عزت و تکریم دی ہے اور اس کے چھلکے کو جانوروں کے لئے بنایا ہے، لہٰذا بھوسہ کھانے میں چوپاؤں کی مزاحمت کرنا صحیح نہیں ہے، اور رہے جو کے ستو تو یہ قولنج کا سبب بنتے ہیں، اور جب انسان جو کی روٹی اور کوٹے ہوئے نمک پر اقتصار کرے تو اس کا مزاج بدل جاتا ہے، کیونکہ جو کی روٹی خشک ٹھنڈی ہے، اور نمک خشک قابض ہے جو دماغ اور بصارت کو نقصان دیتا ہے۔ اور جب نفس اس شے کی طرف مائل ہو جو اس کی اصلاح کرتی ہے اور پھر اسے روک دیا جائے تو اس طرح اسے رد کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت کا مقابلہ کیا گیا، پھر یہ بدن میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ پس یہ فعل شرع اور عقل دونوں کے مخالف ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ بدن آدمی کی سواری ہے، اور جب اس نے سواری کے ساتھ دوستی کا برتاؤ نہ کیا تو وہ اسے (منزل پر) نہیں پہنچائے گی۔ اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے مکھن، شہد، اور سفید آٹے کی روٹی خریدی، تو انہیں کہا گیا: یہ سب کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب ہم نے پایا تو ہم

مردوں کی طرح کھائیں گے، اور جب ہم نے کچھ نہ پایا تو ہم مردوں کے صبر کرنے کی طرح صبر کریں گے۔ اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ گوشت، انگور، اور فالوذج (آٹے، پانی اور شہد سے تیار کیا ہوا کھانا) کھاتے تھے پھر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسلاف میں اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اس میں کچھ سورۃ المائدہ اور الاعراف وغیرہ میں گزر چکا ہے اور وہ کافی ہے۔ اور پہلا نظریہ دین میں غلو ہے اگر ان کے بارے میں یہ صحیح ہے۔ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید:27) (اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔)

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍۭ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝

''وہ دن جب ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ، پس وہ شخص جس کو دیا گیا اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں تو یہ لوگ (خوشی خوشی) پڑھیں گے اپنا نامۂ عمل اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍۭ بِإِمَامِهِمْ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍۭ بِإِمَامِهِمْ کے بارے میں فرمایا: ''ان میں سے ایک کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور اس کا جسم اس کے لئے ساٹھ گز تک پھیلا دیا جائے گا اور اس کا چہرہ روشن کر دیا جائے گا اور اس کے سر پر موتیوں کا تاج رکھا جائے گا جو چمک رہا ہوگا پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف چل کر آئے گا اور وہ دور سے ہی اسے دیکھ لیں گے اور کہنے لگیں گے: اے اللہ! ہمیں بھی اس کی مثل عطا فرما اور ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما یہاں تک کہ وہ ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور کہے گا: تمہیں بشارت (اور مبارک) ہو تم میں سے ہر ایک کے لئے اسی کی مثل ہے ...... فرمایا...... اور رہا کافر! تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا اور اس کا جسم اس کے لئے آدم کی صورت پر ساٹھ گز بڑھا دیا جائے گا اور اسے ایک تاج پہنایا جائے گا پس اس کے ساتھی اسے دیکھیں گے، تو کہیں گے: ہم اللہ تعالیٰ سے اس شر سے پناہ مانگتے ہیں! اے اللہ! تو ہمیں اس طرح کا نہ دینا۔ بیان فرمایا: پس وہ ان کے پاس آئے گا اور وہ کہیں گے: اے اللہ! اسے رسوا اور ذلیل کر، تو وہ کہے گا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں (رحمت سے) دور ہٹا دیا ہے کیونکہ تم میں سے ہر آدمی کے لئے اسی کی مثل ہے(1)''۔ ابو عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور اس کی نظیر یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰٓ إِلَىٰ كِتَٰبِهَا ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (الجاثیہ) (اور آپ دیکھیں گے ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا۔ ہر گروہ کو بلایا جائے گا اس کے صحیفہ (عمل) کی طرف۔ (انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔)

اور کتاب (نامۂ عمل) کو امام کا نام دیا جا رہا ہے، کیونکہ ان کے اعمال کی پہچان کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، قتادہ، اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: بِإِمَامِهِمْ سے مراد بکتابھم ہے یعنی ان میں سے ہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الاسراء، جلد 2، صفحہ 141۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انسان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جس میں اس کے عمل ہوں گے(1))۔ اور اس کی دلیل فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: اس سے مراد ان پر نازل کی گئی کتاب ہے(2)، یعنی ہر انسان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، پس اہل تورات کو تورات کے ساتھ اور اہل قرآن کو قرآن کے ساتھ بلایا جائے گا، اور کہا جائے گا: اے اہل قرآن! تم نے کون سے عمل کیے ہیں، کیا تم نے اس کے اوامر کی پیروی کی ہے، کیا تم نے اس کی نواہی سے اجتناب کیا ہے؟ اور اسی طرح کے سوال کیے جائیں گے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بِنَبِیِّهِمْ ہے(3) (یعنی انہیں اپنے نبی کے ساتھ پکارا جائے گا۔) اور امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اور کہا جائے گا: آؤ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والو!، آجاؤ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والو!، آجاؤ شیطان کی اتباع کرنے والو!، آجاؤ بتوں کی پیروی کرنے والو!۔ پس اہل حق اٹھیں گے اور وہ اپنے نامۂ عمل اپنے دائیں ہاتھوں میں پکڑیں گے، اور اہل باطل اٹھیں گے اور وہ اپنے نامۂ عمل اپنے بائیں ہاتھوں میں پکڑیں گے۔ اور یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مراد بامام عصرھم ہے (یعنی انہیں اپنے زمانے کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ایک کو اپنے زمانے کے امام اور اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کے ساتھ بلایا جائے گا'' پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والو! آجاؤ، اے موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والو تم آجاؤ! اے عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ، اور اے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ...... پس اہل حق اٹھیں گے اور اپنا نامۂ عمل اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیں گے اور پھر وہ فرمائے گا: اے شیطان کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ، اے ضلالت و گمراہی کے سرداروں کی پیروی کرنے والو تم آجاؤ درآنحالیکہ ہر ایک کے لئے ہدایت کا امام بھی ہوگا اور گمراہی کا امام بھی ہوگا(4)''۔ (اسی کے ساتھ اسے بلایا جائے گا)۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بأعمالهم ہے(5) (یعنی انہیں ان کے اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا)۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کہا جائے گا: کہاں ہیں تقدیر کے ساتھ راضی ہونے والے؟ کہاں ہیں اس چیز سے صبر کرنے والے جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے مذاہب ہیں، پس انہیں ان کے ساتھ پکارا جائے گا جن کی وہ دنیا میں اقتدا کرتے تھے، اے حنفی، اے شافعی، اے معتزلی، اے قدری وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ اس کی اتباع کرتے ہوں خیر میں یا شر میں، حق پر یا باطل پر، اور ابو عبیدہ کے قول کا یہی معنی ہے۔ اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: صدقہ دینے والوں کو باب الصدقہ سے اور جہاد کرنے والوں کو باب الجہاد سے بلایا جائے گا...... الحدیث۔ یہ طویل حدیث ہے۔ ابو سہا نے کہا ہے: کہا جائے گا فلاں نمازی اور روزے دار کہاں ہیں؟ اور اس کا برعکس دف بجانے والے اور چغلخور ہیں۔ اور محمد بن کعب نے کہا ہے بِاِمَامِهِمْ سے مراد بأمهاتهم ہے (یعنی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 258 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ موسوعہ اطراف حدیث النبوی الشریف، جلد 6، صفحہ 452 5۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 146

انہیں اپنی ماؤں کے ساتھ پکارا جائے گا) اور امام امّ کی جمع ہے۔ حکماء نے کہا ہے: اس میں حکمت کی تین وجہیں ہیں: ان میں ایک یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے۔ اور دوسری یہ ہے...... امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے شرف و عظمت کے اظہار کے لئے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے...... تا کہ زنا کی اولاد درسوانہ ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اولین و آخرین تمام کو جمع فرمائے گا تو ہر خیانت کرنے والے کے لئے جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں بن فلاں کی خیانت ہے''۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے روایت کیا ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: ھذہ غدرۃ فلان بن فلان یہ اس پر دلیل ہے کہ آخرت میں لوگوں کو ان کے اپنے ناموں اور ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، اور یہ روایت اس کا رد کرتی ہے جس نے یہ کہا ہے کہ انہیں ان کی ماؤں کے ناموں سے بلایا جائے گا کیونکہ اسمیں ان کے باپوں کے بارے ستر پوشی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ یہ ان کے قول کو تقویت دیتا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ بِاِمَامِهِمْ سے مراد ہ بکتابھم ہے۔ اور اسے یہ قول بھی قوت دیتا ہے: وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ۝ (یٰسین) (اور ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لوح محفوظ میں)۔ فَاُولٰٓىِٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا، الفتیل وہ ہے جتنی گٹھلی کی ایک طرف یا ایک حصہ ہوتا ہے اور یہ سوۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا ۝

''اور جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى یعنی جو دنیا میں نظر و فکر کرنے سے اور حق کو دیکھنے سے اندھا بنا رہے گا۔ فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ تو وہ آخرت کے معاملہ میں بھی اَعْمٰى اندھا ہوگا۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اہل یمن کی ایک جماعت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئی اور انہوں نے اس آیت کے بارے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: اس کے ماقبل کو پڑھو۔ رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ...... تا قولہ...... تَفْضِیْلًا ۝ (الاسراء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو آدمی ان نعمتوں اور ان آیات اور نشانیوں کے بارے جو اس نے دیکھیں اندھا بنا رہا تو وہ اس آخرت کے بارے میں جسے اس نے دیکھا نہیں اندھا ہی ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جو ان نعمتوں سے اندھا رہا جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اس پر دنیا میں فرمائی ہیں تو آخرت کی نعمتوں سے بھی اندھا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آدمی جو اس دنیا میں جس میں مہلت دی گئی ہے اور اس کو وسعت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ اندھا بنا رہا تو وہ اس آخرت میں جس میں کوئی توبہ نہیں اندھا ہی ہوگا۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو آدمی اس دنیا میں کافر اور گمراہ رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا اور گم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 474

کردہ راہ ہوگا(1)۔ اور یہ بھی قول ہے: وہ آدمی جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دلائل سے اندھا بنا رہا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اندھا ہی اٹھائے گا؛ جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۝ الآیات۔ (طٰہٰ) (اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔) اور مزید فرمایا: وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (الاسراء: 97) (اور ہم اٹھائیں گے انہیں قیامت کے روز منہ کے بل اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام اقوال میں فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى میں اس کا معنی ہے: سخت اندھا ہوگا، کیونکہ وہ دل کا اندھا ہونا ہے، اور آنکھ کے اندھے کے بارے میں اس کی مثل نہیں کہا جاسکتا۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: کیونکہ وہ بھی خلقت کے اعتبار سے ہاتھ اور پاؤں کی طرح ہی ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا ما اعماہ جیسا کہ یہ نہیں کہا جاسکتا ما ایداہ۔ اخفش نے کہا ہے: اس میں یہ نہیں کہا گیا کیونکہ اس کے حروف تین سے زائد ہیں۔ اور اس کی اصل اعمی ہے۔ اور بعض نحویوں نے ما أعماہ اور ما أعشاہ کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس کا فعل عَمِيَ اور عَشِيَ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: ایک بصری شیخ نے مجھے شام میں بتایا کہ اس نے عربوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ما اسود شعرہ۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ما فی المعالی لکم ظل و لا ثمر　　و فی المخازی لکم أشباح أشیاخ

أما الملوك فأنت الیوم ألأمهم　　لؤما و أبیضهم سِربال طباخ

اور ابوبکر، حمزہ، کسائی اور خلف نے دو حرفوں اعمی اور اعمی میں امالہ کہا ہے اور باقیوں نے ان میں فتح پڑھا ہے۔ اور ابوعمرو نے پہلے میں امالہ کیا ہے اور دوسرے کو فتح دیا ہے۔ وَاَضَلُّ سَبِيْلًا یعنی وہ ہدایت کی طرف کوئی راہ نہیں پائے گا۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا۝

''اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپ بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اس کے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے۔''

حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم ﷺ طواف کے دوران حجر اسود کا استلام کر رہے تھے، تو قریش نے آپ کو منع کیا اور کہا: ہم تمہیں استلام کی اجازت نہیں دیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے الہوں کے بھی قریب ہو، تو آپ نے اپنے دل میں خیال کیا اور کہا: مجھ پر نہیں ہے کہ میں ان کے قریب ہوں اس کے بعد کہ وہ مجھے استلام حجر کی اجازت دیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔'' پس اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار کیا اور آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، یہ حضرت مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت ثقیف کے وفد کے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 37　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 259

بارے نازل ہوئی، اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا مطالبہ کیا جو حق سے دور تھا انہوں نے کہا: ایک سال تک ہمیں اپنے خداؤں سے منافع حاصل کرنے دیں یہاں تک کہ ہم وہ لے لیں جو انہیں ہدایا پیش کئے جاتے ہیں، پس جب ہم اسے لے لیں گے تو ہم انہیں توڑ دیں گے اور ہم اسلام قبول کر لیں گے، اور آپ ہماری وادی کو اسی طرح حرم قرار دیجئے جیسے مکہ کرمہ کو حرم قرار دیا ہے، تا کہ عرب اپنے اوپر ہماری فضیلت کو جان لیں، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انہیں عطا کرنے کا قصد وارادہ کیا تب یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اکابرین قریش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: آپ ان گرنے والے (کمزور لوگوں) کو اور ان غلاموں کو ہم سے دور بھگا یئے تا کہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھیں اور آپ سے کچھ سن سکیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ارادہ کر لیا یہاں تک کہ آپ کو اس سے منع کر دیا گیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ قریش ایک رات صبح تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خلوت اور تنہائی میں رہے اور آپ کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، آپ کی شان بیان کرتے رہے، آپ کو سردار بنانے اور آپ کو اپنے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے، اور کہنے لگے: بلاشبہ آپ جو شے لائے ہیں وہ لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں لاسکتا، اے ہمارے آقا! آپ تو ہمارے سردار ہوئے، وہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ان بعض امور میں ان کے قریب ہونے لگے جو وہ چاہتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ رکھ لیا، بچا لیا (2)، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور لَيَفْتِنُوْنَكَ کا معنی ہے وہ آپ کو برگشتہ کرتے ہیں، پھسلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: فتنتُ الرجل من رأیه جب تو کسی آدمی کو اس رائے سے پھسلا دے، پھیر دے جس پر وہ تھا؛ یہ ہروی نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ آپ کو پھراتے ہیں (یزیلونك اور یصرفونك) دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ یعنی قرآن کریم کے حکم سے، کیونکہ انہیں وہ دینے میں جس کا انہوں نے سوال اور مطالبہ کیا ہے اس میں قرآن کریم کے حکم کی مخالفت ہے۔ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ یعنی تا کہ آپ ایسا بہتان تراش کر ہماری طرف منسوب کر دیں جو اس کے خلاف ہو جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، اور وہ ثقیف کا یہ قول ہے کہ آپ ہماری وادی کو اسی طرح حرام قرار دیجئے جیسے آپ نے مکہ مکرمہ کو حرام قرار دیا ہے، (یعنی) اس کے درختوں کو، اس کے پرندوں کو، اور اس کے وحشی جانوروں کو، اور اگر عرب آپ سے پوچھیں: آپ نے انہیں کیوں خاص کیا؟ تو آپ یہ فرمائیے: اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے مجھے حکم دیا ہے، تا کہ وہ آپ کے لئے عذر ہو جائے۔ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا یعنی اگر آپ وہ کریں جو وہ چاہتے ہیں تو وہ آپ کو گہرا دوست بنالیں گے، یعنی وہ آپ سے محبت کریں گے اور آپ کی طرف مائل ہو جائیں گے؛ (خلیل) الخُلّة (خا کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد دوستی ہے کیونکہ آپ ان کے ساتھ موافقت کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا یعنی وہ آپ کو فقیر اور محتاج بنادیں گے۔ یہ الخَلّة (خا کے فتحہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد فقر ہے کیونکہ آپ ان کے حاجت مند اور محتاج ہو جائیں گے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 260-259
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 150

الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾

''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ۔ (بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپ کو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد پھر آپ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ یعنی اگر ہم نے آپ کو حق پر ثابت قدم نہ رکھا ہوتا اور ہم نے آپ کو ان کی موافقت سے نہ بچایا ہوتا۔ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ تو آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔ شَیْـًٔا قَلِیْلًا یعنی تھوڑا اور کچھ نہ کچھ۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عرض کی: اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِی اِلٰی نفسی طرفة عین (1) (اے اللہ! تو مجھے آنکھ جھپکنے کی دیر بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔) اور کہا گیا ہے: خطاب کا ظاہر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور اس کا باطن ثقیف کے بارے خبر دے رہا ہے۔ اور اس کا معنی ہے: وان کادوا لیرکنونك، یعنی قریب تھا کہ وہ آپ کے بارے یہ خبر دیتے کہ آپ ان کے قول کی طرف مائل ہو گئے ہیں، پس ان کے فعل کو مجازاً اور وسعۃً آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے: کدت تقتل نفسك (قریب ہے تو اپنے آپ کو قتل کر دے)، یعنی قریب ہے لوگ تجھے اس سبب سے قتل کر دیں جو تو نے فعل کیا ہے، اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی طرف سے ان کی طرف مائل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں بنا، بلکہ اس کا معنی ہے: اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو آپ یقیناً ان کی موافقت کی طرف مائل ہو جاتے، لیکن آپ پر مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کا فضل رہا سو آپ نے ایسا نہ کیا؛ یہ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، لیکن یہ امت کی تعریف ہے تاکہ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی شرائع میں سے کسی شی میں مشرکین کی طرف مائل نہ ہو۔

اور قولہ تعالیٰ: اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ یعنی (بفرض محال) اگر آپ مائل ہوتے تو آپ کو دنیا میں دنیا کے عذاب کی دو مثل اور آخرت میں موت کے عذاب کی دو مثل چکھاتے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے (2)۔ اور یہ انتہائی وعید ہے۔ اور جب بھی رتبہ اور درجہ اعلیٰ اور بلند ہو تو مخالفت کی صورت میں عذاب بھی اتنا بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔)

اور ضعف الشی سے مراد دو مرتبہ اس کی مثل ہونا ہے (دوگنا)، اور کبھی ضعف کا معنی حصہ بھی ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ ضِعْفٌ (الاعراف: 38) یعنی ہر ایک کے لئے ایک حصہ ہے، یہ معنی سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۷۶﴾

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 475 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 260

''اور انہوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ پریشان و مضطرب کردیں آپ کو اس علاقہ سے تاکہ نکال دیں آپ کو یہاں سے اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ۔''

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مدنی ہے، جیسا کہ سورت کے آغاز میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں قیام فرما ہونے کے ساتھ حسد کیا اور کہا: بے شک انبیاء علیہم السلام شام بھیجے گئے ہیں، پس اگر آپ نبی ہیں تو آپ بھی وہاں چلے جائیں، کیونکہ اگر آپ نے اس کی طرف خروج کیا تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں راسخ ہوگئی کیونکہ آپ ان کے اسلام لانے کو پسند کرتے تھے، چنانچہ آپ نے مدینہ طیبہ سے ایک مرحلہ (منزل) تک سفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور عبدالرحمن بن غنم نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے آپ صرف شام کا ارادہ رکھتے تھے، پس جب آپ تبوک اترے تو یہ ارشاد وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ سورت کے ختم ہونے کے بعد نازل ہوا، اور آپ کو واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ کے آپ کو نکالنے کے ارادہ کے بارے نازل ہوئی، اور اگر انہوں نے آپ کو نکال دیا تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم ارشاد فرمایا تو آپ وہاں سے نکل آئے، یہ قول اصح ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور اس لئے بھی کہ اس آیت کا ماقبل اہل مکہ کے بارے خبر ہے، اور یہ یہودیوں کا ذکر جاری نہیں۔

اور قولہ تعالیٰ مِنَ الْاَرْضِ سے مراد مکہ مکرمہ کی زمین ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ (یوسف:80) (سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو۔) اس میں مراد ارض مصر ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ (محمد:13) (اور بہت سی ایسی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں تمہاری اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے باشندوں نے) آپ کو نکال دیا) اس میں قریہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کا معنی ہے: اس کے باسیوں نے آپ کو نکالنے کا ارادہ کیا، اسی وجہ سے اضافت اس کی طرف کی اور فرمایا اَخْرَجَتْكَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تمام کفار نے یہ قصد کیا کہ وہ آپ پر غلبہ پا کر آپ کو حقارت اور رسوائی کے ساتھ سرزمین عرب سے نکال دیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی (اور آپ کو روک لیا) اور اگر وہ آپ کو عرب میں زمین سے نکال دیتے تو پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی، اور یہی معنی اس قول باری تعالیٰ کا ہے: وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ)۔ حضرت عطا ابن ابی رباح نے لَا يَلْبَثُوْنَ کو با مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ خِلٰفَكَ حضرت نافع، ابن کثیر، ابوبکر، اور ابو عمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس کا معنی ہے بعدك (یعنی آپ کے بعد وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے مگر تھوڑا عرصہ)۔ اور ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے خلافك پڑھا ہے (1) اور ابو حاتم نے اسے اختیار کیا ہے، اور انہوں نے اس قول پر قیاس کیا ہے: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (التوبہ:81) (خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 476

والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد)۔ اور اس کا معنی بھی بعدك ہے۔
جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

عَفَت الديار خلافهم فكأنما　　بسط الشَّواطِبُ بينهن حَصِيرا (1)

اس میں خلافهم، بعدهم (ان کے بعد) کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

ماوردی میں بسط البواسط ہے۔ کہا جاتا ہے: شطبت المرأة الجريد جب عورت ٹہنیاں چیرے تاکہ ان سے چٹائیاں بنائے۔ ابو عبید نے کہا ہے: پھر چیرنے والی اسے صاف کی ہوئی ٹہنیوں میں پھینک دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ خِلٰفَكَ بمعنی بعدك (آپ کے بعد) ہے۔ اور خِلٰفَكَ بمعنی مخالفتك (آپ کی مخالفت میں) ہے؛ اسے ابن الانباری نے ذکر کیا ہے۔ اِلَّا قَلِيْلًا اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے...... کہ اس مدت سے مراد وہ ہے جتنی مدت وہ آپ کو نکالنے کے بعد سے لے کر بدر کے دن اپنے قتل ہونے تک وہاں ٹھہرے رہے، اور یہ ان کا قول ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہاں مراد قریش ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ اس کے درمیان اور بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کے جلاوطن ہونے کے درمیان جو مدت ہے وہ مراد ہے، اور یہ ان کا قول ہے جنہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ مراد یہودی ہیں (2)۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝

"(یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر اور آپ نہیں پائیں گے ہمارے اس دستور میں کوئی ردوبدل۔"

قولہ تعالیٰ: سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا یعنی یہ عذاب دیئے جائیں گے جیسا کہ ان کے بارے ہمارا دستور ہے جنہیں ہم نے بھیجا، پس يعذبون کو مضمر کر کے سُنَّةَ کو نصب دی گئی ہے، پس جب جر دینے والا حرف (کاف، کسنة میں) ساقط ہو گیا تو فعل نے عمل کیا، یہ فراء نے کہا ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس معنی کی وجہ سے منصوب ہے سننا سنة من قد أرسلنا (ہم نے ان کے لئے دستور بنا رکھا ہے جنہیں ہم نے بھیجا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ کاف کے حذف کی تقدیر پر منصوب ہے؛ تقدیر کلام ہوگی: لا يلبثون خلفك إلا قليلا كسنة من قد أرسلنا (وہ نہیں ٹھہریں گے آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ جیسا کہ ان کے بارے ہمارا دستور ہے جنہیں ہم نے بھیجا)۔ پس اس تقدیر پر وقف اِلَّا قَلِيْلًا پر نہیں کیا جائے گا اور پہلے اور دوسرے قول کے مطابق وقف کیا جائے گا۔ قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا اس میں وقف اچھا ہے۔ وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا یعنی اس دستور اور وعدے میں کوئی خلاف اور ردوبدل نہیں ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝

"نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہونے تک (نیز ادا کیجئے) نماز صبح، بلاشبہ نماز صبح کا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 261　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 262-261　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477

مشاہدہ کیا جاتا ہے"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ جب مشرکین کے مکر وفریب کو ذکر کر چکے تو ساتھ ہی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے اور نماز کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا، اور اس میں دشمنوں کے خلاف مدد ونصرت کی طلب موجود ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ (الحجر) (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے تھے سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جایئے سجدہ کرنے والوں سے) اور اقامة الصلٰوة کے بارے میں بحث سورۃ البقرہ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ اور باجماع مفسرین یہ آیت فرض نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے دلوك کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد آسمان کے درمیان سے سورج کا ڈھل جانا، زوال پذیر ہو جانا ہے؛ یہ حضرت عمر، آپ کے صاحبزادے، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے سوا علماء تابعین وغیرہ کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ دلوك سے مراد سورج کا غروب ہونا ہے؛ یہ حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ ماوردی نے کہا ہے(1): جنہوں نے دلوك کو سورج کے غروب ہونے کا نام قرار دیا ہے وہ اس لئے ہے کیونکہ انسان سورج کے غروب ہونے کی حالت میں اس کے بالکل ظاہر اور بین ہونے کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ رگڑتا ہے، اور جنہوں نے اسے سورج کے زوال کا نام دیا ہے تو وہ اس لئے کیونکہ وہ سورج کی شعاؤں کی شدت اور تیزی کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو رگڑتا ہے(2)۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: سورج کے دلوك کا معنی اس کا غروب ہونا ہے۔ اور دلكت براحِ کا معنی ہے سورج غروب ہو گیا۔ جیسا کہ قطرب نے کہا ہے:

هذا مقامُ قدمي رَباحِ ذَبَّبَ حتى دَلكتْ براحِ (3)

اس میں براح (با کے فتحہ کے ساتھ) حذام، قطام اور رقاش کے وزن پر ہے اور یہ سورج کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور فراء نے اسے (با کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور یہ راحة کی جمع ہے اور اس کا معنی ہتھیلی ہے، یعنی وہ غائب ہو گئی حالانکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی ہتھیلی اپنی بھنوؤں پر رکھ لی۔

اور اسی سے عجاج کا قول بھی ہے:

والشمس قد كادت تكون دَنَفًا أدفعها بالراح كي تزحلفا(4)

ابن الاعرابی نے کہا ہے: الزُحلوفة سے مراد ملائم گرنے کی جگہ ہے، (یعنی ڈھلوان کی جگہ)، کیونکہ وہ اس میں لڑھکتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1219

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 263

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477

4۔ ایضاً

اور پھسلتے ہیں۔ مزید کہا: الزّحلفة دحرجة کی طرح ہے اور الدفع کی طرح، (یعنی لڑھکنا اور دھکا دینا)، کہا جاتا ہے: زحلفتُه فتزحَلَف (میں نے اسے دھکا دیا پس وہ پھسل گیا، لڑھک گیا۔) اور کہا جاتا ہے: دَلَکَتْ الشَّمْسُ جب سورج غروب ہو جائے۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

مصابیح لیست باللواتی تقودها نجومٌ ولا بالآفلات الدوالِك(1)

ابن عطیہ نے کہا ہے: دلوک کا لغوی معنی مائل ہونا، جھکنا اور ڈھلنا ہے پس دلوک کی ابتدا سورج کا زوال پذیر ہونا ہے اور اس کی انتہا اس کا غروب ہونا ہے۔ اور زوال کے وقت سے لے کر غروب ہونے تک کے وقت کو دلوک کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ ڈھلنے اور جھکنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان نمازوں کا ذکر کیا ہے جو دلوک کی حالت اور اس کے قریب ہوتی ہیں، پس اس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں داخل ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ مغرب کی نماز غسق اللیل میں داخل ہو(2)۔ اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر غروب آفتاب تک پھیلا ہوتا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کے واجب ہونے کو دلوک پر معلق کیا ہے، اور یہ سارے کا سارا دلوک ہی ہے، اور یہ امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے تفصیل میں کہا ہے۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حالت ضرورت میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ دلوک الشمس سے مراد سورج کا ڈھلنا ہے، اور غسق اللیل سے مراد رات کا جمع ہونا اور اس کا تاریک ہونا ہے(4)۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: الغسق سے مراد رات کی سیاہی ہے۔

جیسا کہ ابن قیس رقیات نے کہا ہے:

إن هذا الليل قد غَسَقَا واشتكيْتُ الهَمَّ والأَرَقَا(5)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: غسق اللیل سے مراد شفق کا غروب ہونا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد رات کی تاریکی کا آنا ہے۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

ظلت تجود يداها وهي لاهية حتى إذا جنح الإظلام والغسق

کہا جاتا ہے: غسق اللیل غسوقاً۔ اور الغَسَق یہ اسم سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور کلمہ کی اصل السیلان سے ہے۔ (یعنی اس کا معنی بہنا ہے)۔ کہا جاتا ہے: غسقت العین جب چشمہ بہہ پڑے، تَغْسِق۔ اور غَسَقَ الجرح غَسَقَاناً، یعنی زخم سے زرد پانی بہنے لگا۔ اور اغسق المؤذن یعنی مؤذن نے مغرب کو رات آنے تک مؤخر کر دیا۔ اور فراء نے بیان کیا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1221
4۔ مؤطا امام مالک، باب وقوت الصلوٰۃ، ما جاء فی دلوک الشمس، صفحہ 7
5۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 263

غسق اللیل و أغسق، ظلم و أظلم، دجا و أدجی، غَبَس و أغبَس، غَبِش و أغبش (ان تمام میں رات کے آنے اور اس کے تاریک ہونے کا معنی پایا جاتا ہے)۔ اور ربیع بن خثیم بادل کے دن اپنے مؤذن کو فرماتے ہیں: أغسق أغسق۔ وہ کہتے: مغرب کو مؤخر کرو یہاں تک کہ رات کی تاریکی چھا جائے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے مغرب کے آخری وقت میں اختلاف کیا ہے، پس کہا گیا ہے: اس کا وقت ایک ہی وقت ہے اور اس کا وقت نہیں ہے مگر اس وقت جب سورج غروب ہو جاتا ہے، اور یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی امامت میں بالکل بین اور واضح ہے، کیونکہ آپ نے یہ نماز دو دن ایک ہی وقت میں پڑھائی اور وہ غروب آفتاب کا وقت تھا، اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے اصحاب کے نزدیک ظاہر مذہب ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور آپ سے مشہور بھی ہے، اور اسی طرح ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں کہا ہے: پس جب شفق غائب ہو جائے تو مغرب کا وقت نکل جاتا ہے اور عشاء کا وقت داخل ہو جاتا ہے (1)۔ اور اسی طرح ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، حسن بن حی، احمد، اسحاق، ابوثور، اور داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، کیونکہ غروب سے لے کر شفق تک کا وقت سارے کا سارا غسق ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت کے بارے سوال کرنے والے کو دوسرے دن مغرب کی نماز پڑھائی اور اسے مؤخر کیا یہاں تک کہ وہ شفق غروب ہونے کے قریب تھی (2)؛ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث امامت جبرائیل علیہ السلام کی اخبار سے اولیٰ ہے، کیونکہ یہ حدیث متاخر ہے کیونکہ یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں پیش آیا اور جبرائیل علیہ السلام نے امامت مکہ مکرمہ میں کرائی، اور آپ کے فعل اور امر میں سے متاخر اولیٰ ہے، کیونکہ وہ اپنے ماقبل کے لئے ناسخ ہے۔ اور ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے مشہور ہے، اور آپ کا وہ قول جو آپ کی موطا میں ہے آپ نے وہ طویل عمر تک پڑھایا اور اپنی زندگی میں اسے املاء کروایا۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ وہ احکام جو اسماء سے متعلق ہوتے ہیں کیا وہ ان کے اوائل سے متعلق ہوتے ہیں یا ان کے آخر سے یا پھر حکم ان تمام سے متعلق ہوتا ہے؟ تو نظر و فکر میں اقویٰ یہی ہے کہ حکم کا تعلق ان کے اوائل سے ہوتا ہے تاکہ اس کا ذکر لغو نہ ہو جائے پس جب حکم ان کے اوائل سے مربوط ہو جائے تو پھر اس کے بعد اس کا تعلق تمام کے ساتھ آخر تک جاری رہے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس قول میں وسعت ہے وہ راجح ہے۔ تحقیق امام حافظ ابومحمد عبدالغنی بن سعید نے اجلح بن عبداللہ کندی کی حدیث بیان کی ہے، انہوں نے ابوزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسے نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے سورج غروب ہونے کے قریب نکلے اور آپ نے مغرب کی نماز ادا نہ فرمائی یہاں تک کہ آپ مقام سرف پر آ گئے۔ اور وہ نو میل سفر ہے۔ اور رہا نسخ کے بارے قول تو وہ بین اور واضح نہیں ہے اگرچہ تاریخ معلوم ہے، کیونکہ ان روایات میں تطبیق اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مغرب کے وقت کے بارے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی احادیث کو افضلیت پر محمول کیا جائے گا، اسی وجہ سے امت نے سورج غروب ہونے کے

1۔ موطا امام مالک، صفحہ 8
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب اوقات صلوٰۃ الخمسہ، جلد 1، صفحہ 223

وقت اس میں تعجیل کرنے اور اسے فوراً ادا کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہم مسلمانوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے جماعت والی مسجد میں غروب آفتاب کے وقت سے مغرب کی اقامت کو موخر کیا ہو۔ اور وسعت والی احادیث جواز کے وقت کو ظاہر کرتی ہیں، پس اس طرح تعارض ختم ہو جاتا ہے اور ان کو جمع کرنا صحیح ہوتا ہے، اور باتفاق اصولیین یہ ترجیح سے اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں دو دلیلوں میں سے ہر ایک پر عمل کرنا ثابت ہوتا ہے اور ترجیح یا نسخ کے قول میں ایک کو ساقط کرنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اس میں قُرْاٰنَ دو وجہوں سے منصوب ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ الصلوٰۃ پر معطوف ہو، اس کا معنی ہوگا: أقم قرآن الفجر یعنی صبح کی نماز قائم کرنا، یہ فراء نے کہا ہے۔ اور اہل بصرہ نے کہا ہے: یہ اغراء کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فعلیك بقرآن الفجر (تجھ پر صبح کی نماز لازم ہے)؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ خاص کر اس نماز کو قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے دوسری نمازوں کو نہیں، کیونکہ قرآن ان سے عظمت و شان والا ہے، جبکہ صبح کی نماز کی قرأت طویل اور بالجہر ہے جیسا کہ یہ مشہور بھی ہے اور لکھی ہوئی بھی؛ یہ بھی زجاج سے مروی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صبح کی نماز میں قرأت کو طویل کرنے کے مستحب ہونے پر اہل مدینہ کا پختہ عمل ہے اتنی مقدار تک جو پیچھے کھڑے ہونے والوں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو۔ وہ اس میں طوال مفصل پڑھتے ہیں، اور ظہر اور جمعہ کی نمازوں کو بھی اس میں اس کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور مغرب کی نماز میں قرأت میں تخفیف کرتے ہیں اور عصر اور عشاء میں متوسط قرأت کرتے ہیں۔ اور عصر کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ اس میں بھی مغرب کی طرح تخفیف کی جائے گی۔ اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ان نمازوں میں قرأت طویل کرنا جن میں مختصر قرأت پر استقرار ہے، اور ان نمازوں میں قرأت مختصر کرنا جن میں طویل قرأت کرنے پر عمل ہے، جیسا کہ فجر کی نماز میں معوذتین پڑھنا (1) ... جیسا کہ اسے نسائی نے روایت کیا ہے...... اور مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف، مرسلات اور طور کی قرأت کرنا، پس اس پر عمل متروک ہے اور اس وجہ سے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو قرأت طویل کرنے سے منع کیا تھا جس وقت آپ نے اپنی قوم کو عشاء کی نماز کی امامت کرائی اور اس میں سورۃ البقرہ پڑھی، اسے صحیح نے روایت کیا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ آپ نے ائمہ کو تخفیف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ فرمایا: ”اے لوگو! بے شک تم میں سے بھگانے والے بھی ہیں پس تم میں سے جو کوئی لوگوں کی امامت کرائے تو اسے چاہئے کہ وہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی، مریض بھی ہوتے ہیں اور درد والے بیمار بھی، اور ضعیف اور کمزور بھی ہوتے ہیں اور صاحب حاجت بھی (2)“۔ اور فرمایا: ”پس جب تم میں سے کوئی اکیلے نماز پڑھے تو وہ جتنی چاہے لمبی اور طویل پڑھے (3)۔“ یہ سب صحیح حدیث میں لکھا ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ یہ اس پر دلیل ہے کہ کوئی نماز بغیر قرأت کے نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 151

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، اذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء، جلد 1، صفحہ 98　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 97، مفہوم

نماز کو قرآن کا نام دیا ہے۔ علماء نے نماز میں قرأت کے بارے اختلاف کیا ہے پس جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ امام کے لئے اور اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے۔ اور آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ نماز کے بڑے حصے میں اس کی قرأت واجب ہے، اور یہ اسحاق کا قول ہے۔ اور آپ سے یہ بھی ہے کہ ایک رکعت میں اس کی قرأت واجب ہے؛ یہ مغیرہ اور سحنون نے کہا ہے۔ اور ان سے یہ بھی ہے کہ نماز میں سے کسی شے میں قرأت واجب نہیں ہوتی۔ اور یہ آپ سے انتہائی شاذ روایات میں سے ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرأت نصف نماز میں واجب ہوتی ہے، اور اسی طرف امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ بھی گئے ہیں۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اور ایوب سے بھی روایت ہے کہ امام پر، اکیلے نماز پڑھنے والے پر اور مقتدی پر ہر حال میں قرأت واجب ہوتی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے، مکمل بحث سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: **كَانَ مَشْهُوْدًا** ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: **وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا** کے بارے میں فرمایا: ''اس نماز میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے سبھی حاضر ہوتے ہیں (1)''۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسے علی بن مسہر نے اعمش سے انہوں نے ابوصالح سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جماعت کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کی فضیلت اکیلے آدمی کی نماز پر پچیس درجے ہے اور صبح کی نماز میں رات کے ملائکہ اور دن کے ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں (2)''۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: **وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا** (3) اسی وجہ سے اس نماز کو جلدی (صبح سویرے) پڑھا جاتا ہے، پس جس نے یہ نماز سویرے نہ پڑھی تو اس کی نماز میں ملائکہ کے دو گروہوں میں سے صرف ایک گروہ حاضر ہوگا۔ اور اس معنی کی بناء پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا افضل ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اندھیرے اور روشنی کو جمع کرنا (یعنی ان کے درمیان پڑھنا) افضل ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر روشن کر کے پڑھنا اندھیرے میں پڑھنے سے افضل ہے اور یہ اس کے مخالف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تغلیس پر مداومت اختیار کرتے تھے، اور یہ بھی کہ اس میں رات کے ملائکہ کی حاضری کو بھی فوت کرنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ بعض علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے اس پر استدلال کیا ہے: ''اس میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں (4)''۔ کہ صبح کی نماز نہ رات کی نماز میں سے ہے اور نہ دن کی نماز میں سے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 141۔ ایضاً، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3060، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، فضل صلاۃ الفجر فی الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 90 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 141

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عصر کی نماز بھی نہ رات کی نماز میں سے ہو اور نہ دن کی نماز میں سے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں: ''تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں، پس وہ عصر کی نماز میں اور فجر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں (1)''۔ الحدیث۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ عصر کی نماز دن میں سے ہے پس اسی طرح فجر کی نماز رات کی نماز میں سے ہوگی اور یہ اس طرح نہیں ہے، بلاشبہ یہ عصر کی نماز کی طرح دن کی نمازوں میں سے ہی ہے اور اس کی دلیل روزہ اور قسم وغیرہ ہے، اور یہ بالکل واضح ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝

''اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کے لئے یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الَّيْلِ یہ مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ اور فَتَهَجَّدْ میں فا مضمر کلام پر عطف کے لئے ہے ای قُم فتھجد (یعنی اٹھو اور نماز تہجد ادا کرو) بِهٖ یعنی تلاوت قرآن کریم کے ساتھ۔ اور التھجد ھجود سے ہے اور یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: ھجد بمعنی نام (وہ سو گیا) اور ھجد بمعنی سھر (وہ جاگ گیا)، تو یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

أَلا زارَتْ و أَهلُ مِنى هجود ۔۔۔ وليت خيالها بمِنى يعود

اور دوسرا کہتا ہے:

أَلَا طرقتنا والرفاق هجود ۔۔۔ فباتت بِعَلّات النوال تجود(2)

مراد نیام (سونا) ہے۔ اور ھجد اور تھجد دونوں ہم معنی ہیں۔ اور ھجدتہ أی أنمتہ (میں نے اسے سلا دیا)، اور ھجدتہ ای أیقظتہ (میں نے اسے جگا دیا) اور التھجد سے مراد سونے کے بعد جاگنا ہے، اور پھر یہ نماز کا نام ہو گیا ہے، کیونکہ آدمی اس نماز کے لئے نیند سے بیدار ہوتا ہے، پس تہجد کا معنی نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اس کا یہ معنی اسود، علقمہ اور عبد الرحمن بن اسود رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق قاضی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حجاج بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ جب اس نے ساری رات قیام کیا تو اس نے تہجد ادا کر لیے! بلاشبہ تہجد وہ نماز ہے جو نیند کے بعد ہو''۔ پھر فرمایا: ''وہ نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، فضل صلوٰۃ الفجر و العصر و المحافظۃ علیہا، جلد 1، صفحہ 227

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 478

ہے جو نیند کے بعد ہو"۔ پھر فرمایا: "وہ ہے جو سونے کے بعد ہو"۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی نماز ہوتی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الھجود کا معنی النوم (سونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: تھجد الرجل جب آدمی نیند سے بیدار ہو، اور القی الھجود و ھو النوم وہ اپنی نیند پھینک دے، دور کر دے۔ اور وہ آدمی جو نماز کے لئے اٹھا اسے متھجد کا نام دیا جائے گا؛ کیونکہ متھجد وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے اپنی نیند کو دور پھینک دیتا ہے۔ اور یہ فعل تحوب (گناہ سے بچنا)، تحرج (گناہ سے بچنا) تأثم، تحنث (گناہ سے نفرت کرنا، اسے چھوڑ دینا) تقذر اور تنجس (نجاست اور پلیدی سے بچنا) کے قائم مقام ہے جب آدمی انہیں اپنے آپ سے دور کر دے، پھینک دے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ (الواقعہ) اس کا معنی ہے تندمون (کئے پر پشیمان ہونا)، یعنی تم اپنے آپ سے فکاہت پھینک دو گے، دور کر دو گے اور اس سے مراد نفوس کا انتہائی فرحت و سرور میں ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل فکِہ جب آدمی بہت زیادہ خوش اور ہنسنے والا ہو۔ اور آیت میں اس کا معنی ہے: ووقتا من اللیل أسھرته فی صلاۃ و قرأۃ (اور رات میں کچھ وقت ہو جو اس کو نماز و قرأت کے لئے بیدار کرے)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: نَافِلَةً لَّكَ یعنی یہ آپ کے لئے اعزاز ہے؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور علماء نے حضور نبی مکرم ﷺ کی امت کو چھوڑ کر خاص طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرنے میں اختلاف کیا ہے، پس کہا گیا ہے کہ رات کی نماز آپ ﷺ پر فرض تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَافِلَةً لَّكَ یعنی یہ زائد فریضہ ہے اس فریضہ سے جو امت پر لازم کیا گیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل میں دو اعتبار سے بعد ہے: ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ فرض کو نفل کا نام دیا گیا ہے، اور یہ مجاز ہے حقیقت نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "پانچ نمازیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں۔" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ھن خمس و ھن خمسون لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (یہ پانچ ہیں (دراصل) یہ پچاس ہیں میرے نزدیک قول تبدیل نہیں کیا جائے گا)۔ اور یہ نص ہے، تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ پر پانچ سے کوئی زائد نماز فرض ہوئی، یہ وہ ہے جو صحیح نہیں ہو سکتا، اگرچہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: "تین چیزیں ہیں جو مجھ پر فرض ہیں اور میری امت کے لئے نفل ہیں رات کا قیام، وتر، اور مسواک کرنا (2)"۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رات کی نماز آپ کے لئے بھی نفل ہے اور ابتدا میں یہ تمام پر واجب تھی، پھر وجوب منسوخ ہو گیا اور رات کا قیام فرض ہونے کے بعد نفل ہو گیا، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا، اس کا مفصل بیان سورۃ المزمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس بنا پر نفل کے بارے امر ندب کے معنی میں ہو گا اور خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہو رہا ہے کیونکہ آپ کی مغفرت فرما دی گئی ہے (یعنی آپ معصوم ہیں) پس آپ وہ نفل ادا کریں گے جو آپ پر واجب نہیں ہیں تو وہ آپ کے لئے درجات میں اضافہ اور بلندی کا باعث ہوں گے اور آپ کے علاوہ امت کا نفل ادا کرنا فرائض میں واقع ہونے والے خلل کا تدارک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 478، مفہوم

2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 406، حدیث 19540، بتغیر یسیر

اور کفارہ ہوتے ہیں؛ اس کا یہ معنی حضرت مجاہد وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عطیہ ہے، کیونکہ کوئی بندہ سعادت میں سے عبادت کی توفیق سے افضل کوئی عطا نہیں پائے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا مقام محمود کے بارے میں چار مختلف قول ہیں۔

(۱) اور یہی زیادہ صحیح ہے ... کہ یہ قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت کا مقام ہے؛ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور صحیح بخاری میں (1) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک لوگ قیامت کے دن گروہ گروہ ہو جائیں گے اور ہر امت اپنے نبی علیہ السلام کی اتباع کرے گی اور یہ کہے گی: اے فلاں! تو شفاعت کر، یہاں تک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شفاعت انتہا کو پہنچ جائے گی، پس اس دن اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمائے گا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ ہمیں حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہوگا لوگ آپس میں بعض بعض سے اضطراب کا اظہار کریں گے اور پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے: اپنی اولاد کی شفاعت کیجئے، تو آپ فرمائیں گے: میں یہ نہیں کر سکتا، لیکن تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو آپ بھی فرمائیں گے: میں نہیں کر سکتا، البتہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، کیونکہ وہ کلیم اللہ ہیں، چنانچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور وہ بھی کہیں گے: نہیں میں شفاعت نہیں کر سکتا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ کیونکہ وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، چنانچہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ بھی فرمائیں گے: میں اس کے لئے تیار نہیں البتہ تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ چنانچہ وہ میرے پاس آئیں گے تو میں کہوں گا: میں اس لئے تیار ہوں (2)''۔ آگے حدیث ذکر کی۔ اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کے بارے فرمایا جب اس کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ (مقام) شفاعت ہے (3)''۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مقام محمود ہی اس شفاعت کا امر ہے جسے انبیا علیہم السلام ایک دوسرے کے ذمہ لگائیں گے، یہاں تک کہ یہ امر ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک انتہا کو پہنچ جائے گا۔ پس آپ اہل موقف کی یہ شفاعت کریں گے تاکہ ان کا حساب جلدی میں ہو جائے اور وہ اپنے موقف (ٹھہرنے کا محل، میدان حشر) کے ہول اور خوف سے راحت اور سکون پالیں، اور یہ شفاعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، اور اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں (4)''۔ نقاش نے کہا ہے (5): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین شفاعتیں ہیں:

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 2۔ صحیح مسلم، اثبات الشفاعة واخراج الموحدين من النار، جلد 1، صفحہ 110

3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب ومن سورة بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3062، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 434، حدیث 32040 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 479

شفاعت عامہ، جنت کی طرف سبقت لے جانے کی شفاعت، اور اہل کبائر کی شفاعت۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مشہور یہ ہے کہ یہ صرف دو شفاعتیں ہیں: شفاعت عامہ، جہنم سے گنہگاروں کو نکالنے کی شفاعت اور یہ دوسری شفاعت وہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام دور نہیں ہٹائیں گے اور نہ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالیں گے بلکہ وہ شفاعت کریں گے اور علماء بھی شفاعت کریں گے۔ اور قاضی ابوالفضل عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: قیامت کے دن ہمارے نبی مکرم ﷺ کی شفاعتیں پانچ ہیں! شفاعت عامہ، دوسری بغیر حساب کے قوم کو جنت میں داخل کرنے کے بارے، تیسری آپ کی امت کے موحدین کی ایک جماعت جنہوں نے اپنے گناہوں کے سبب جہنم واجب کر لی ہوگی پس ان کے بارے میں ہمارے نبی مکرم ﷺ شفاعت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ جس کے بارے چاہے گا کہ وہ شفاعت کریں اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور یہی وہ شفاعت ہے جس کا مبتدع خوارج اور معتزلہ نے انکار کیا ہے، اور انہوں نے اس کا انکار اپنے فاسد اصولوں کی بنا پر کیا ہے، اور وہ استحقاق عقلی ہے جس پر کسی کو حسین اور قبیح قرار دینے کا دارومدار ہے اور چوتھی ان گنہگاروں کے بارے میں ہے جو جہنم میں داخل ہوں گے اور انہیں ہمارے نبی مکرم ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور ان کے مومن بھائیوں کی شفاعت سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پانچویں شفاعت جنت میں اہل جنت کے درجات میں زیادتی اور ان کی بلندی کے بارے ہوگی۔ اور یہ وہ شفاعت ہے جس کا معتزلہ انکار نہیں کرتے اور نہ وہ حشر اوّل کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: سلف صالحین کا حضور نبی رحمت ﷺ کی شفاعت کی التجا کرنا اور ان کا اس میں رغبت رکھنا خبر مشہور اور مستفیض سے ثابت اور معلوم ہے، لہٰذا اس بنا پر اس کے قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا جس نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے میرا یہ دعا کرنا مکروہ ہے کہ وہ تجھے حضور نبی کریم ﷺ کی شفاعت عطا فرمائے، کیونکہ یہ تو فقط گنہگاروں کے لئے ہوگی، اس لئے کہ یہ حساب میں تخفیف اور درجات اور مراتب میں زیادتی اور بلندی کے لئے بھی ہوگی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر ہر عقلمند کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے اور وہ معافی کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اپنے عمل کے سبب سرکش اور حدود سے تجاوز کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں ہلاک ہونے والوں میں سے نہ ہو جائے، اور مذکورہ قول کرنے والے کے قول سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ مغفرت اور رحمت کی دعا ہی نہ مانگے کیونکہ یہ بھی گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔ اور یہ سب اس کے خلاف ہے جو کچھ سلف و خلف کی دعا سے معلوم ہوا ہے؛ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے اذان سن کر یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدَانِ ﷺ ...... الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدَانِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت حلال ہوگئی (1)''۔

دوسرا قول یہ ہے...... کہ مقام محمود سے مراد اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو قیامت کے دن لواء الحمد عطا کرنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول اور پہلے قول کے درمیان کوئی منافرت نہیں ہے، کیونکہ لواء الحمد آپ ﷺ کے دست

1۔ صحیح بخاری، الدعاء عند النداء، جلد 2، صفحہ 686

مبارک میں ہوگا اور آپ شفاعت کریں گے۔ ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ میں فخر سے نہیں کہہ رہا اور میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اور اس پر مجھے فخر نہیں اور اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے سوا کوئی نبی نہ ہوگا مگر وہ میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا (1)''۔ الحدیث۔

تیسرا قول یہ ہے ...... اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے، اس میں سے حضرت مجاہد بھی ہیں، اس جماعت نے یہ کہا ہے کہ مقام محمود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ اپنی کرسی پر بٹھائے گا اور اس بارے میں انہوں نے ایک حدیث بھی روایت کی ہے۔ اور علامہ طبری نے اس کے جواز کو ایک قول کی زیادتی سے تقویت دی ہے۔ اور وہ نہیں نکل سکتا مگر معنی میں حیلہ اور انتہائی نرمی برتنے کے ساتھ، اور اس میں حقیقت سے بہت بعد اور دوری ہے۔ اور اس کے باوجود روایت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اس کے معنی میں تاویل ہوگی (2)۔ اور نقاش نے ابو داؤد سجستانی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے اس حدیث کا انکار کیا تو وہ ہمارے نزدیک متہم ہوگا، اہل علم اس کے بارے مسلسل بیان کرتے رہے ہیں، جس نے اس کی تاویل کی بنا پر اس کے جواز کا انکار کیا ہے (3)۔ ابو عمر نے کہا ہے: حضرت مجاہد اگرچہ ائمہ میں سے ایک ہیں آپ قرآن کریم کی تاویل کرتے ہیں کیونکہ آپ کے دو قول ہیں جو اہل علم کے نزدیک چھوڑ دیئے گئے ہیں: ان میں سے ایک یہی ہے۔ اور دوسرا اس قول باری تعالیٰ کی تاویل میں ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ (القیامۃ) فرمایا: وہ ثواب کا انتظار کرے گا، یہ نظر (یعنی رب کریم کو دیکھنے) سے نہیں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن شہاب نے حدیث التنزیل کے باب میں اسے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے بھی اس آیت میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عرش پر بٹھائے گا (4)۔ اور یہ تاویل محال نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام اشیاء اور عرش کو پیدا کرنے سے پہلے اپنی ذات کے ساتھ قائم اور موجود تھا، پھر اس نے بغیر حاجت اشیاء کو تخلیق فرمایا مگر اسے ان کی حاجت اور ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قدرت اور حکمت کے اظہار کے لئے ایسا کیا، اور اس لئے تاکہ اس کا وجود، اس کی توحید، کمال قدرت اور تمام افعال محکمہ کے بارے اس کا علم معلوم ہو جائے، اور اس نے اپنے لئے عرش تخلیق فرمایا اور اپنی قدرت اور شان کے مطابق اس پر قرار پذیر ہوا بغیر اس کے کہ اللہ کریم نے اس کو مس کیا ہو، یا عرش اس کے لئے مکان بنا ہو۔ کہا گیا ہے: وہ اب بھی اسی صفت پر ہے جس پر وہ زمان و مکان کو پیدا کرنے سے پہلے تھا؛ پس اس بناء پر جواز میں یہ قول کرنا برابر ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش یا زمین پر بٹھایا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر قرار پذیر ہونا انتقال، زوال، احوال کا تبدیل ہونا مثلاً اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ اور وہ حالت جو عرش کو مشغول کردے، کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے عرش پر بلاکیف متمکن ہوا

1۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، ما جاء فی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 202

ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3073، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 479

3۔ ایضاً　4۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 168

جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں خبر دی ہے، اور الله تعالیٰ کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش پر بٹھانا نہ تو آپ کے لئے صفت ربوبیت کو ثابت کرتا ہے اور نہ آپ کو صفت عبودیت سے نکالنے کا سبب ہے، بلکہ یہ تو آپ کے مقام و محل کو بلند کرنا اور آپ کو اپنی مخلوق پر شرف و عزت عطا کرنا ہے۔ اور رہا اخبار میں آپ کا قول مَعَهٗ تو یہ الله تعالیٰ کے ان ارشادات کی طرح ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ (الاعراف: 126) (بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے) اور رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ (التحریم: 11) (اے میرے رب! بنا دے میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں۔) اور وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (العنکبوت: 69) (اور بلاشبہ الله تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے) اور اسی طرح کے دیگر ارشادات۔ یہ تمام بلند رتبہ، اور درجہ کی طرف عائد ہیں نہ کہ مکان کی طرف۔

چوتھا قول یہ ہے کہ آپ کا اپنی شفاعت کے ساتھ جہنم سے انہیں نکالنا ہے جو نکلیں گے؛ یہ حضرت جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اسے مسلم نے ذکر کیا ہے۔ ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ والله الموفق۔

مسئلہ نمبر 6۔ رات کے قیام کے مقام محمود کا سبب ہونے کے بارے میں علماء کے دو مختلف قول ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے ..... کہ الله تبارک وتعالیٰ اپنے فعل میں سے جسے چاہے اپنے فضل کا سبب بنا دیتا ہے چاہے تو اس میں وجہ حکمت کی پہچان نہ کرائے، یا وجہ حکمت کی معرفت عطا کر دے۔

دوسرا قول یہ ہے..... کہ رات کے وقت قیام کرنے میں لوگوں کو چھوڑ کر الله تعالیٰ کے ساتھ خلوت اختیار کرنا اور اس کی مناجات کرنا ہے، پس اس نے رات کے قیام میں اپنے ساتھ خلوت نشینی اور اپنی مناجات عطا فرما دی ہے اور یہی مقام محمود ہے اور اس میں مخلوق اپنے درجات کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت پاتی ہے اور مخلوق میں درجہ کے اعتبار سے سب سے اشرف و اعلیٰ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، کیونکہ آپ کو وہ کچھ عطا کیا جاتا ہے جو کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا اور آپ اس وقت شفاعت کریں گے جب کوئی شفاعت نہیں کرے گا۔

اور عَسٰۤی کی نسبت الله تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ واجب اور ثابت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور مَقَامًا ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی بمعنی فی مقام أو إلی مقام۔ اور طبری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مقام محمود یہ وہی مقام ہے جس میں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا(1)''۔ پس مقام وہ جگہ ہے جس میں انسان امور عظیمہ سرانجام دینے کے لئے کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ وہ مقامات جو بادشاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝۸۰

''اور دعا مانگا کیجئے کہ اے میرے رب! جہاں کہیں تو مجھے لے جائے سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کے ساتھ لے آ اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو۔''

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 168

کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تو مجھے موت عطا فرما سچائی کی موت، اور مجھے قیامت کے دن اٹھا سچائی کے ساتھ، تا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے متصل ہو جائے: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا گویا جب آپ کے ساتھ اس کا وعدہ فرمایا تو آپ کو حکم دیا کہ دعا مانگا کریں تا کہ آپ کے لئے وعدہ پورا کر دیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو مجھے ان امور میں داخل فرما دے جن کا حکم دیا گیا ہے اور ان سے مجھے نکال لے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کی تعلیم دی کہ آپ حالت نماز اور دیگر اوقات میں مشرکین کے درمیان سے نکالے جانے اور پر امن جگہ میں پہنچائے جانے کی دعا مانگا کیجئے، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالا اور آپ کو مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔ اس معنی کو ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے پھر آپ کو ہجرت کا حکم دیا گیا پس یہ آیت نازل ہوئی (1): وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ آپ کا مکہ مکرمہ سے نکلنا اور فتح کے دن حالت امن میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونا ہے۔ ابو سہل نے کہا ہے: جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو منافقین نے کہا تھا: لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (المنافقون: 8) (تو نکال دیں گے عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو)۔ تو اس ارشاد میں مراد عزت کے ساتھ داخل کرنا اور مدد و نصرت کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف نکالنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تو مجھے اس امر میں سچائی کے ساتھ داخل فرما دے جس کے ساتھ تو نے مجھے عزت و تکریم عطا فرمائی ہے (اور وہ) نبوت ہے، اور مجھے اس سے سچائی کے ساتھ نکال لے جب تو مجھے موت عطا فرمائے)، اس کا یہ معنی حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے۔ اور المُدخل اور المُخرج (میم کے ضمہ کے ساتھ) یہ بمعنی ادخال (داخل کرنا) اور اخراج (نکالنا) ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (المومنون: 29) (اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر۔) یعنی یہ بمعنی انزال ہے میں اس جگہ میں ایسی شے نہ دیکھوں جو میں ناپسند کرتا ہوں اور یہی قرأت عامہ ہے۔ حسن، ابو العالیہ، اور نصر بن عاصم رحمہم اللہ تعالیٰ نے مَدخل اور مَخرج دونوں میموں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بمعنی دخول اور خروج ہیں (یعنی داخل ہونا اور نکلنا)، پس پہلا رباعی ہے اور یہ ثلاثی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مجھے موت کے وقت سچائی کے ساتھ قبر میں داخل فرما اور دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت سچائی کے ساتھ وہاں سے نکال۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو مجھے سچائی کے ساتھ لے جا جہاں کہیں تو مجھے لے جائے اور سچائی کے ساتھ وہاں سے لے آ، یعنی تو مجھے ان سے نہ بنا جو من وجہ داخل ہوتے ہیں اور من وجہ خارج ہوتے ہیں، کیونکہ دو چہروں والا تیرے نزدیک وجیہ اور پسندیدہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ہر اس کے بارے میں عام ہے جو امور میں پائے جاتے ہیں اور سفروں اور اعمال میں سے جن کا قصد کیا جاتا ہے، اور موت و حیات میں تقدیر کے جس تصرف کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ پس یہ ایک دعا ہے، اور اس کا معنی ہے: اے میرے رب! تمام امور میں میرے داخل ہونے اور ان سے نکلنے کے بارے میری اصلاح فرما۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا شعبی

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور عکرمہ نے کہا ہے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا سے مراد حجة ثابتہ ہے۔ اور حسن اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد عزت، مدد و نصرت اور تمام دینوں پر آپ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا کہ وہ فارس اور روم وغیرہ کی سلطنتیں ان سے چھین لے گا اور اسے آپ کے حوالے کر دے گا۔

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

''اور آپ (اعلان) فرما دیجئے: آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل، بے شک باطل تھا ہی مٹنے والا۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام بخاری اور ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کی چھڑی سے انہیں کچوکے دینے لگے...... اور کبھی فرمایا: بِعُوْدٍ (لکڑی سے مراد چھڑی ہی ہے)...... اور ساتھ فرماتے: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل بے شک باطل مٹنے والا ہی تھا) حق آ گیا ہے اور باطل کبھی نہیں آئے گا (1)''۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ اور انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی طرح مسلم کی حدیث میں نُصُبًا ہے۔ اور ایک روایت میں صنما ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اس عدد کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دن میں ایک بت کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے اور ان کے بڑے (اور سردار) کو دو دنوں کے ساتھ خاص کرتے تھے۔ (یعنی اس کی پرستش دو دن کرتے تھے) اور آپ کا قول: فجعل یطعنها بعود فی یدہ (2) کہا جاتا ہے: بے شک وہ گچ کے ساتھ مضبوط اور پختہ کھڑے کئے گئے تھے اور جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی بت کے چہرے پر چھڑی لگاتے تو وہ گدی کے بل پیچھے گر جاتا یا گدی پر مارتے تو وہ اپنے چہرے کے بل گر پڑتا۔ اور آپ فرما رہے تھے: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اسے ابو عمر اور قاضی عیاض نے بیان کیا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: کوئی بت باقی نہیں بچا مگر وہ اپنے منہ کے بل گر گیا، پھر آپ نے ان کے بارے حکم دیا تو وہ توڑ دیئے گئے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں مشرکین کے بتوں اور دیگر تمام بتوں کو توڑنے پر دلیل ہے جب ان پر غلبہ پا لیا جائے۔ اور اس میں معنوی طور پر باطل کے تمام آلات کو توڑنا داخل ہے، اور ہر وہ شے جو صرف اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کے لئے استعمال ہو مثلاً آلات موسیقی جیسے ستار، سارنگی اور وہ مزامیر جن کا سوائے لہو و لعب اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کرنے کے اور کوئی مقصد اور معنی نہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: أصنام کے معنی میں وہ صورتیں بھی ہیں جو مٹی، لکڑی اور ان کے مشابہ چیزوں سے بنائی جاتی ہیں، اور ہر وہ شے جسے لوگ بناتے ہیں اور ان میں سوائے اس لہو کے جس سے منع کیا گیا ہے اور کوئی منفعت نہ ہو۔ ان میں سے کسی شے کو بیچنا جائز نہیں سوائے ان بتوں کے جو سونے، چاندی، لوہے اور تانبے وغیرہ سے بنائے گئے ہوں،

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3063، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ اسراء، جلد 2، صفحہ 686

جب انہیں موجودہ حالت سے تبدیل کر دیا جائے اور وہ پگھلا ہوا ٹکڑا یا کٹا ہوا ٹکڑا بن جائے تو پھر اس کو بیچنا اور اس کے عوض کوئی شے خریدنا جائز ہے۔ مہلب نے کہا ہے: باطل آلات میں سے جو توڑ دیئے جائیں اور انہیں توڑنے کے بعد روک کر محفوظ رکھنے میں منفعت اور فوائد ہوں تو پھر ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا ان کا مالک ہی زیادہ حقدار ہے، مگر یہ کہ امام وقت مالی سزا دینے اور اس میں مزید سختی اور شدت کے لئے انہیں آگ کے ساتھ جلانا مناسب سمجھتا ہو، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے جلانے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے گھروں کو جلانے کا ارادہ فرمایا جو نماز باجماعت سے پیچھے رہتے تھے (1)۔ اور یہی مالی سزا میں اصل اور بنیاد ہے، اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس اونٹنی کے بارے میں جس پر اس کی مالکہ نے لعنت کی ہو: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ اس پر لعنت کی گئی ہے (2)''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مالکہ کو ادب سکھانے کے لئے اس سے اس کی ملکیت ختم کر دی، اور یہ اس کے لئے اس قول کی سزا ہے جو اس نے اس کے خلاف کہا اس کے ساتھ جس کے ساتھ اس نے اسے پکارا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس دودھ کو جو پانی کے ساتھ ملایا گیا، اس کے مالک پر بہا دیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں سے ذکر کیا ہے اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں دیکھا جا سکتا ہے: ''قسم بخدا! حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ایک عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں گے اور ضرور صلیب کو توڑ دیں گے، اور خنزیر کو یقیناً قتل کریں گے، اور ضرور جزیہ لگائیں گے اور یقیناً نوجوان اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی اور انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی جائے گی'' (3) الحدیث۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے۔ اور اسی باب سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پردے کو پھاڑنا بھی ہے جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں، اور یہ بھی تصویروں اور آلات ملاہی کو فاسد اور خراب و برباد کرنے پر دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اور یہ سب ان کو بنانے سے روکتا ہے اور ان کے مالک پر انہیں تبدیل کرنے کو واجب قرار دیتا ہے۔ بے شک یہ صورتیں بنانے والوں کو (اور ان کے مالکوں کو) قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان کو کہا جائے گا: انہیں زندہ کرو جنہیں تم نے بنایا ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے، اور عنقریب اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ یعنی اسلام آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے، یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد جہاد ہے۔ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ کہا گیا ہے: باطل سے مراد شرک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد شیطان ہے؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور درست یہ ہے کہ لفظ میں ممکنہ حد تک تعمیم ہے، پس تفسیر یہ ہوگی کہ شریعت آ گئی تمام احکام کے ساتھ جن کو وہ متضمن ہے۔ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اور باطل باطل ہو گیا۔ اور اسی سے زهوق النفس بھی ہے یعنی اس کا باطل ہونا۔ کہا جاتا ہے: زهقت نفسه تزهق زهوقا، وأزهقتها (اس کا نفس باطل ہو گیا، اور میں نے اسے باطل کر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، وجوب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 89، مفہوم

2۔ سنن طبرانی الکبیر، جلد 18، صفحہ 190، حدیث 452

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، نزول عیسیٰ بن مریم، جلد 1، صفحہ 87

دیا)۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یعنی اس کے لئے بقا نہیں ہے، اور حق وہ ہے جو ثابت ہوتا ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝۸۲

''اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ نُنَزِّلُ جمہور نے اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے وَيُنْزِلُ یا اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے مروزی نے حفص سے روایت کیا ہے۔ اور مِنَ ابتداء غایت کے لئے ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ بیان جنس کیلئے ہو، گویا کہ یہ فرمایا: وَ نُنَزِّلُ ما فيه شِفَاءٌ مِنَ الْقُرْاٰنِ (اور ہم قرآن میں وہ نازل کرتے ہیں جو شفا ہے۔) اور حدیث میں ہے: ''جس نے قرآن کریم سے شفا طلب نہ کی تو اللہ تعالیٰ اسے شفا نہیں دے گا(1)''۔ اور بعض متاولین نے مِنَ کے تبعیضیہ ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ یہ اس سے محفوظ ہے کہ اسے یہ لازم آئے کہ اس کے بعض میں شفا نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسے یہ لازم نہیں آتا، بلکہ یہ صحیح ہے کہ مِنَ اس اعتبار سے تبعیض کے لئے ہو کہ اس کے نازل کرنے کو فقط بعض قرار دیا گیا ہے، تو گویا یہ فرمایا: وَ نُنَزِّلُ من القرآن شيئًا شِفَاء (اور ہم قرآن میں سے کچھ چیزیں باعث شفا نازل کرتے ہیں)، نہ کہ اس تمام میں شفا ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے اس کے شفا ہونے میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دلوں کے لئے ان سے جہالت دور کرنے، شک اور ریب کا ازالہ کرنے، اور معجزات اور وہ امور جو اللہ تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں انہیں سمجھنے کے لئے جہالت کے مرض سے دل کے پردے کھولنے کے اعتبار سے باعث شفا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ظاہری بیماریوں کے لئے دم اور تعوذ کے سبب باعث شفا ہے۔ تحقیق ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ دار قطنی کے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تیس سواروں کے ایک سریہ میں بھیجا آپ نے بیان کیا: پس ہم عرب کی ایک قوم کے پاس اترے اور ہم نے ان سے پوچھا (کیا) وہ ہماری مہمان نوازی کریں گے؟ تو انہوں نے انکار کر دیا، فرمایا: پھر قبیلے کے سردار کو ڈس لیا گیا، پس وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے: تم میں کوئی ہے جو بچھو کا دم کرتا ہو؟ اور ابن قتہ کی روایت میں ہے: بے شک بادشاہ مر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نے کہا: ہاں میں ہوں، لیکن میں دم نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم ہمیں کچھ دو، تو انہوں نے کہا: ہم تمہیں تیس بکریاں دیں گے۔ آپ نے فرمایا: پس میں نے اس پر سات مرتبہ(3) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔ اور سلیمان بن قتہ عن ابی سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: پس اسے افاقہ ہو گیا اور صحت یاب ہو گیا۔ تو اس نے ہماری طرف ضیافت کا کھانا بھی بھیجا اور بکریاں بھی ہماری طرف بھیجیں، پس ہم نے کھانا کھا لیا اور میرے ساتھیوں نے بکریوں میں سے

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 9، حدیث 28106 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 480 3۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 63، حدیث 243

کوئی کھانے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو گئے اور آپ کو میں نے ساری خبر گوش گزار کر دی تو آپ نے فرمایا: "تجھے کس نے بتایا کہ یہ دم ہے۔" میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ! ﷺ، یہ ایسی شے ہے جو میرے دل میں القا کر دی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کلوا و أطعمونا من الغنم(1) (تم خود بھی کھاؤ اور بکریوں میں سے ہمیں بھی کھلاؤ)۔ انہوں نے اسے کتاب السنن میں نقل کیا ہے۔ اور (کتاب المدبج) میں سری بن یحییٰ کی حدیث سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے معتمر بن سلیمان نے لیث بن ابی سلیم سے، انہوں نے حسن سے، اور انہوں نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے حکم سے برص، جنون، جذام، پیٹ چلنے، سل (پھیپھڑے کی بیماری، لاغری)، بخار اور سانس کی بیماری سے نفع اور فائدہ ہوتا ہے کہ تو زعفران یا سرخ مٹی (گیرو) کے ساتھ یہ کلمات لکھے أعوذ بكلمات الله التامة وأسمائه كلها عامة من شر السامة والعامة و من شر العين اللامة و من شر حاسد اذا حسد و من أبي فروة و ما ولد۔ اسی طرح کہا، اور من شر أبي قترة نہیں کہا۔ العین اللامہ سے مراد نظر بد کا لگنا ہے۔ تو کہتا ہے: میں اس کی پناہ مانگتا ہوں ہر زہریلے کیڑے سے اور نظر بد سے۔ اور رہا آپ کا یہ قول: أعيذه من حادثات اللمة تو کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد حوادثات زمانہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شدت اور سختی ہے۔ اور السامة کا معنی الخاصہ ہے۔ کہا جاتا ہے: كيف السامة و العامة (خاص و عام کیسے ہیں) اور السامة سے مراد زہر بھی ہے۔ اور من فروة و ما ولد۔ اور فرمایا: تینتیس ملائکہ اپنے رب کریم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: ہماری زمین میں درد اور بیماری ہے تو رب کریم نے فرمایا: اپنی زمین سے کچھ مٹی لے لو اور اپنی پیشانیوں پر مل لو۔ یا فرمایا: تمہاری پیشانیوں کے لئے محمد ﷺ کا دم ہے، وہ کامیاب نہیں ہوگا جس نے اسے ہمیشہ چھپائے رکھا یا اس پر کوئی ہدیہ وغیرہ لیا۔" پھر فاتحة الكتاب (الحمد شریف) سورۃ البقرہ کی پہلی چار آیات، اور وہ آیت جس میں ہواؤں کے چلنے کا ذکر ہے، آیۃ الکرسی اور اس کے بعد والی دو آیتیں، سورۃ البقرہ کی آخری آیات لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ سے لے کر اس کے آخر تک، سورہ آل عمران کی پہلی دس آیتیں اور اس کے آخر سے دس آیتیں، سورۃ النساء کی پہلی آیت، سورۃ المائدہ کی پہلی آیت، سورۃ الانعام کی پہلی آیت، سورۃ الاعراف کی پہلی آیت، اور وہ آیت جو سورۃ الاعراف میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ آیت کے آخر تک؛ اور وہ آیت جو سورہ یونس میں ہے اس جگہ سے قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ۝ اور وہ آیت جو سورہ طٰہٰ میں ہے۔ وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى۝ اور سورۃ الصافات کی پہلی دس آیات، اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝ اور معوذتین لکھیں۔ یہ پاک صاف برتن میں لکھی جائیں گی پھر انہیں پاک پانی کے ساتھ تین بار دھویا جائے گا پھر اس سے تین بار درد والی جگہ پر لگائے پھر اس سے اس طرح وضو کرے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے اور وہ نماز کے لئے وضو کرنے سے پہلے اس سے وضو کرے، یہاں تک کہ اس سے وضو کرنے سے پہلے پاکیزگی اور طہارت کی حالت پر

1۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 64، حدیث 246

ہو پھر وہ اپنے سر، اپنے سینے اور اپنی پیٹھ پر پانی انڈیلے اور اس کے ساتھ استنجا نہ کرے پھر وہ دو رکعتیں (نفل نماز) پڑھے پھر اللہ تعالیٰ سے شفا کی دعا مانگے، اسی طرح تین دن تک عمل کرے، اتنی مقدار جتنا ہر روز لکھا جا سکتا ہو۔ اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: ومن شہ ابی قترۃ وما ولد۔ اور فرمایا: ''پس اپنی پیشانیوں پر مل لو۔'' اور کوئی شک نہ کیا جائے۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس مرض میں آپ کا وصال ہوا اس میں معوذات پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکتے تھے اور جب یہ ثقیل ہو گیا (یعنی بیماری بڑھ گئی) تو میں یہ پڑھ کر آپ پر پھونکتی تھی اور میں آپ کا اپنا دست مبارک برکت کے لئے پھیرتی تھی۔ پس میں (مراد عروہ بن زبیر ہیں) نے زہری سے پوچھا آپ کیسے پھونکتے تھے؟ تو انہوں نے بیان کیا: آپ اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتے تھے پھر انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے تھے (1)۔ اور مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تکلیف ہوتی تو آپ اپنے اوپر معوذتین پڑھتے اور تھوکتے یا پھونک مارتے (2)۔ ابوبکر بن الانباری نے کہا ہے: علمائے لغت نے کہا ہے کہ نفث سے مراد ایسی پھونک مارنا ہے جس کے ساتھ تھوک نہ ہو۔ اور تفل کا معنی ایسی پھونک مارنا ہے جس کے ساتھ تھوک بھی ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فإن یَبرأ فلم أنفِث علیه وان یُفقد فحقَّ له الفقُود

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

و مِنْ جَوْف ماءٍ عَرْمَض الحَولِ فوقه متی یَحْسُ منه ماتحُ القوم یَتْفُل

اس سے مراد تھوک کے ساتھ پھونک مارنا ہے۔ اور النفث کے بارے علماء نے جو کہا ہے اس کا بیان سورۃ الفلق میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے: یہ ایسی حدیث ہے جس کی مثل سے دین میں حجت پکڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کے ناقلین میں وہ ہیں جو معروف نہیں۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو پھر بھی یا غلط ہے یا منسوخ ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ الفاتحہ کے بارے فرمایا: ''تجھے کس نے بتایا کہ یہ دم ہے (3)؟'' اور جب معوذتین کے ساتھ دم کرنا جائز ہے اور یہ دونوں قرآن کریم کی سورتیں ہیں تو پھر سارا قرآن کریم جواز میں ان دونوں کی مثل ہے کیونکہ سارے کا سارا قرآن ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میری امت کی شفا تین چیزوں میں ہے، کتاب اللہ کی آیت میں، یا شہد چاٹنے میں، یا اچھی طرح پچھ لگوانے میں (4)''۔ اور رجا الغنوی نے کہا ہے: جس نے قرآن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الرقی بالقرآن والمعوذات، جلد 2، صفحہ 854

2۔ مؤطا امام مالک، التعوذ والرقیۃ من المرض، صفحہ 720

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الرقی بالقرآن والمعوذات، جلد 3، صفحہ 854

4۔ ایضاً، الشفاء فی ثلاث، جلد 2، صفحہ 848، مفہوم

کے ساتھ شفا طلب نہ کی تو اس کے لئے شفا نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے نَشْرَہ کے بارے اختلاف کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے یا قرآن کریم میں سے کوئی شے لکھے پھر اسے پانی کے ساتھ دھوئے پھر اسے مریض پر ملے یا اسے پلائے، تو حضرت سعید بن مسیب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ آپ کو کہا گیا: وہ آدمی جسے اپنی بیوی سے لے لیا جاتا ہے (یعنی اس پر کوئی جادو، منتر کر دیا جاتا ہے) تو کیا وہ اس سے کھولا جائے گا اور اسے کوئی دم تعویذ کیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں، اور جو چیز نفع دیتی ہے اسے اس سے منع نہ کیا جائے۔ اور حضرت مجاہد کی یہ رائے نہیں کہ تو قرآن کریم کی آیات لکھے پھر انہیں دھوئے اور پھر اسے گھبراہٹ والے آدمی کو پلایا جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک برتن میں پانی پر معوذتین پڑھتی تھیں پھر آپ حکم دیتی تھیں کہ اسے مریض پر انڈیل دیا جائے۔ مازری ابو عبداللہ نے کہا ہے: اہل تعزیم (دم کرنے والے) کے نزدیک نشرہ (دم، تعویذ) امر معروف ہے، اور اسے یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ اپنے صاحب کی گرہ کھول دیتا ہے (بیماری ختم کر دیتا ہے۔) حسن اور ابراہیم نخعی نے اس سے منع کیا ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: مجھے خوف ہے کہ اسے کوئی مصیبت اور بلا آ پہنچے، گویا کہ آپ اس طرف گئے ہیں کہ یہ وہ ہے جس کے ساتھ قرآن کو مٹایا گیا ہے اور اس کا اپنے پیچھے کسی آزمائش اور مصیبت تک پہنچانا اس سے زیادہ قریب ہے کہ یہ شفا کا فائدہ دے۔ اور حسن نے کہا ہے: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اور ابو داؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نشرہ کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ شیطان کے عمل میں سے ہے(1)''۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے: یہ آثار لینہ ہیں اور ان کے لئے کئی وجوہ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے: بے شک یہ اس معنی پر محمول ہیں کہ جب یہ اس سے باہر ہو جو کچھ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے ہے، اور معروف علاج سے باہر ہو۔ اور نشرہ طب کی جنس سے ہے پس یہ ایک چیز کا دھوون ہے جو اس کے لئے بہتر ہے، پس یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی طرح ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دم کرنے میں کوئی حرج نہیں جب اس میں کوئی شرکیہ کلمہ نہ ہو اور تم میں سے جو کوئی اپنے بھائی کو نفع پہنچانے کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ (دم) کرے(2)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے نشرہ کے بارے مرفوع نص ذکر کی ہے اور یہ کہ وہ نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ سے پس چاہئے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس تحریر کو مریضوں کے گلے میں تبرک کے لئے لٹکانے میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھے ہوں جبکہ اسے لٹکانے والا اس کے لٹکانے کے ساتھ نظر کا دفاع کرنے سے نڈھال

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب النشرۃ، جلد 2 صفحہ 184۔ ایضاً، باب فی النشرۃ، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطب، استحباب الرقی بالعین، جلد 2، صفحہ 224-223

اور عاجز نہ ہو۔ اور یہی اس کا معنی ہے قبل أن ینزل بہ شئ من العین (یعنی نظر سے کوئی تکلیف اور مصیبت آنے سے پہلے)۔ اور اسی قول پر اہل علم کی ایک جماعت بھی ہے، ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ صحت مند جانوروں یا انسانوں کے گلوں میں نظر لگنے کے خوف سے کوئی چیز لٹکائی جائے، اور ہر وہ چیز جو مصیبت آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی کتاب میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے شفا اور کشادگی کی امید رکھتے ہوئے لٹکائی جاتی ہے، تو وہ اس مباح دم کی مثل ہے نظر وغیرہ کی صورت میں جس کا مباح ہونا سنت سے ثابت ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو حالت نیند میں خوف آئے تو اسے چاہئے کہ وہ یہ کہے: أعوذ بکلمات اللہ التامۃ من غضبہ و سوء عقابہ و من شر الشیاطین و أن یحضرون (1)۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے ان بچوں کو یہ سکھاتے تھے جو ادراک رکھتے تھے، اور جو ادراک نہ رکھتے تھے آپ ان کلمات کو لکھتے اور ان کے گلے میں لٹکا دیتے۔ اور اگر کہا جائے: تحقیق روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی شے لٹکائی تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا (2)''۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی ام ولد کے (گلے) میں ایک بندھا ہوا تعویذ دیکھا تو آپ نے اسے انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ کھینچا اور اسے توڑ دیا اور فرمایا: بے شک آل ابن مسعود اس شرک سے مستغنی ہے، پھر فرمایا: بے شک تعویذ، دم اور التولہ یہ سب شرک ہیں۔ پوچھا گیا: یہ التولہ کیا ہے؟ فرمایا: وہ جس کے ساتھ عورت اپنے خاوند کی محبوب ہو جائے (3)۔ اور عقبہ بن عامر جہنی سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے تعویذ لٹکایا تو اللہ تعالیٰ اس کو مکمل نہ کرے گا اور جس نے ودعہ (منکا) لٹکایا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اطمینان عطا نہیں کرے گا (4)''۔

خلیل بن احمد نے کہا ہے: کلام عرب میں تمیمہ سے مراد قلادہ ہے، اور اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ نظر یا مصائب کی انواع میں سے کسی کے خوف سے قلائد میں سے جو گلوں میں لٹکایا جائے تو گویا حدیث میں معنی یہ ہوا کہ جو کوئی اس تکلیف کے ڈر سے گلے میں لٹکاتا ہے جس کے نازل ہونے کی امید ہو یا یہ کہ وہ مصیبت نہ آئے اس کے آنے سے پہلے لٹکاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی صحت و عافیت کو مکمل نہ کرے۔ اور جس نے کوئی منکا وغیرہ لٹکایا...... اور یہ معنی میں اس کی مثل ہے...... پس اللہ تعالیٰ اسے اطمینان نہ دے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے برکت عطا نہ کریگا جس میں اس کے لئے عافیت ہو۔ واللہ اعلم۔ اور یہ سب اس سے ڈرانا ہے جو اہل جاہلیت تعویذات اور قلائد لٹکانے کا عمل کرتے تھے، اور یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ انہیں بچاتے ہیں اور ان سے آزمائش اور مصائب کو پھیر دیتے ہیں، حالانکہ انہیں اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا، وہی عافیت عطا فرمانے والا ہے اور وہی مبتلا کرنے والا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس عمل سے منع فرمایا جو دور

1۔ جامع ترمذی، ابواب الدعوات، جلد 2، صفحہ 191۔ ایضاً، باب ماجاء فی جامع الدعوات الخ، حدیث 3451، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابی داؤد، باب کیف الرقی، حدیث نمبر 3395۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی کراہیۃ التعلیق، حدیث 1998، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المستدرک للحاکم، کتاب الطب، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7503　3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7505
4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 240، حدیث 7501۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی تعلیق التمائم، حدیث نمبر 3385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جاہلیت میں وہ کرتے تھے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ جو آزمائش اور مصیبت آنے کے بعد لٹکایا گیا وہ تمائم (تعویذات) میں سے نہیں ہے، حالانکہ بعض اہل علم نے ہر حال میں آزمائش آنے سے پہلے اور اس کے بعد تعویذ لٹکانے کو مکروہ قرار دیا ہے، ناپسند کیا ہے۔ پہلا قول اثر و نظر میں زیادہ صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس میں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ آپ نے قرآن کے سوا ان چیزوں کو لٹکانا ناپسند کیا جو قیافہ شناسوں اور کاہنوں سے لی گئی ہوں، کیونکہ قرآن سے شفا طلب کرنا چاہئے اسے لٹکایا گیا یا نہ لٹکایا گیا ہو وہ شرک نہیں ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جس نے کوئی شے لٹکائی تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا (1)''۔ تو جس نے قرآن گلے میں لٹکا لیا تو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کا والی بن جائے اور وہ اسے کسی غیر کے حوالے نہیں کرے گا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رغبت رکھی گئی ہے اور قرآن سے شفا طلب کرنے میں اسی پر توکل کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ سے تعویذ کے متعلق پوچھا گیا: کیا یہ لٹکایا جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب وہ بانس کی لکڑی یا کپڑے کے ٹکڑے میں محفوظ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ اس بنا پر ہے کہ لکھا ہوا قرآن ہو۔ اور حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ وہ کوئی حرج نہیں جانتے کہ آدمی کتاب اللہ میں سے کوئی شے گلے میں لٹکائے بشرطیکہ وہ جماع اور بول و براز کے وقت اسے اتار دے۔ ابوجعفر محمد بن علی نے بچوں کو تعویذ پہنانے کے بارے رخصت دی ہے۔ اور ابن سیرین قرآن میں سے کسی شے کے بارے کوئی حرج نہ دیکھتے کہ انسان اسے لٹکائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی غموں اور تکلیفوں کو دور کرنے والی ہے، عیوب کو پاک کرنے والی ہے اور گناہوں کو مٹانے والی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب کی فضیلت بھی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لئے اس کے عوض ایک نیکی ہے اور وہ ایک نیکی دس نیکیوں کی مثل ہے میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ حرف ہے بلکہ الف علیحدہ حرف ہے، لام علیحدہ حرف ہے اور میم علیحدہ حرف ہے۔'' ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے (2)۔ اور یہ پہلے گزر چکی ہے۔ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اور یہ ظالموں کے لئے ان کی تکذیب اور جھٹلانے کی وجہ سے فقط خسارہ کو ہی بڑھاتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: جس نے بھی قرآن کے ساتھ مجالست اختیار کی تو وہ اس سے زیادتی یا کمی (نقصان) کے ساتھ ہی اٹھا، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ الآیہ اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى (فصلت: 44) (آپ فرمائیے: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفا ہے۔ اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے)۔ اور یہ بھی

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الطب، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7503

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، ما جاء فی من قرأ حرفا من القرآن، جلد 2، صفحہ 115۔ ایضاً، حدیث 2835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا گیا ہے کہ یہ فرائض واحکام میں باعث شفا ہے، کیونکہ اس میں ان کی وضاحت اور بیان ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

''اور جب ہم کوئی انعام فرماتے ہیں انسان پر تو (بجائے شکر کے) وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے اور جب پہنچتی ہے اسے کوئی تکلیف تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن میں قرآن کریم خسارہ اور نقصان بڑھا دیتا ہے ان کا طریقہ اور عمل یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر اور تدبر کرنے سے اعراض کرتے ہیں اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور نَاٰ بِجَانِبِهٖ کا معنی ہے وہ تکبر کرتا ہے اور دور ہوتا ہے۔ اور ناء اسی سے مقلوب ہے اور اس کا معنی ہے: وہ اللہ عزوجل کے حقوق قائم کرنے سے دور رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے: نأى الشئ یعنی شے دور ہوگئی۔ اور نأیته اور نایت عنه دونوں کا معنی بَعُدتُ (میں اس سے دور ہوا) ہے۔ اور أنأیته فانتأی یعنی میں نے اسے دور کیا اور وہ دور ہو گیا۔ اور تناءَوْا معنی تباعدوا (وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے) اور المنتأى بہت دور جگہ۔

النابغہ نے کہا ہے:

فإنك كالليل الذى هو مُدرِكي وإن خِلْتُ أن المنتأى عنك واسعُ

ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت میں ناء باع کی مثل پڑھا ہے، یعنی ہمزہ کو موخر کیا ہے، اور یہ نأی میں قلب کے طریقہ پر ہے، جیسے کہا جاتا ہے: راء و رأى۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ النوء سے ماخوذ ہے اس کا معنی اٹھنا اور قیام کرنا ہے۔ اور کبھی واقع ہونے اور بیٹھنے کے لئے بھی نوء کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اور وَنَئِی نون کے فتحہ اور ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ بھی یہ پڑھا گیا ہے۔ اور عام قراءت نأى، رأى کے وزن پر ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا یعنی جب اسے فقرو افلاس، بیماری یا محتاجی کی شدت کی وجہ سے کوئی تکلیف اور پریشانی لاحق ہو تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر یقین اور اعتماد نہیں رکھتا۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

''آپ فرما دیجئے کہ ہر شخص عمل پیرا ہے اپنی فطرت کے مطابق، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے۔''

قول تعالیٰ: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ہر شخص اپنی جہت پر عمل پیرا ہے، اور یہ ضحاک نے بھی کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ہر شخص اپنی طبیعت پر عمل پیرا ہے۔ اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص علیحدہ طور پر عمل پیرا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ہر شخص اپنے دین پر عمل پیرا ہے۔ حسن اور قتادہ نے کہا ہے(1): ہر شخص اپنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 481، مفہوم

نیت پر عمل پیرا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: ہر شخص اپنی فطرت پر عمل پیرا ہے۔ فراء نے کہا ہے: ہر شخص اپنے اس طریقہ اور مذہب پر عمل پیرا ہے جس پر اس کی فطرت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ فرما دیجئے ہر شخص اس پر عمل پیرا ہے جو اس کے نزدیک اس کے اعتقاد کے زیادہ مشابہ اور صواب وصحیح کے زیادہ قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ الشکل سے ماخوذ ہے؛ کہا جاتا ہے: لست علی شکلی ولا شاکلتی (تو میری شکل اور مزاج پر نہیں ہے)۔

شاعر نے کہا ہے:

كل امرئ يشبهه فعله　　　ما يفعل المرء فهو أهله

پس شکل سے مراد مثل، نظیر، اور ضرب (قسم) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ۝ (ص) (اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب)۔ اور الشِّکل (شین کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی ہیئت ہے۔ کہا جاتا ہے: جارية حسنة الشِّكل (ایسی لونڈی جو ہیئت اور شکل کے اعتبار سے خوبصورت ہو۔) یہ تمام اقوال باہم متقارب ہیں۔ اور اس کا معنی ہے کہ ہر کوئی اس کے مطابق عمل کرتا ہے جس پر اس کی وہ اصل اور اخلاق مترتب ہوتے ہیں جن سے وہ مرکب ہے، اور یہ کافر کی مذمت اور مومن کی مدح ہے۔ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت دونوں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں؛ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا یعنی مومن اور کافر اور جو کچھ ان میں سے ہر ایک سے حاصل ہوتا ہے (اس کے بارے تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر گامزن ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَهْدٰى سَبِيْلًا یعنی کون زیادہ تیزی سے قبول ہونے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کون دین کے اعتبار سے زیادہ حسین ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کے بارے میں باہم مذاکرہ اور گفتگو کی، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا اور میں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے زیادہ امید افزا اور احسن قول کوئی نہیں دیکھا: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کیونکہ بندے کی فطرت نہیں ہوتی مگر عصیان اور گناہ اور رب کریم کی فطرت نہیں مگر غفران اور بخشش۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا پس میں نے اس میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی امید افزا اور احسن قول نہیں دیکھا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ (غافر) (حا۔میم اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل و کرم فرمانے والا ہے)۔

اس میں گناہوں کی مغفرت کو توبہ کی قبولیت پر مقدم کیا گیا ہے، اور اس میں اشارہ مومنوں کے لئے ہے۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک سارا قرآن کریم پڑھا اور میں نے اس آیت سے زیادہ حسین اور امید افزا کوئی آیت نہیں دیکھی: نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الحجر) (بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے سارا قرآن اوّل سے لے

کر آخر تک پڑھا اور میں نے اس آیت سے زیادہ کوئی حسین اور امید افزا آیت نہیں دیکھی: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (الزمر) (آپ فرمائیے: اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو، بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا اور میں نے اس قول باری تعالیٰ سے زیادہ حسین اور امید افزا کوئی آیت نہیں دیکھی: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام) (وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لئے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔)

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا

"یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق، (انہیں) بتائیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم مگر تھوڑا سا۔"

امام بخاری، امام مسلم اور ترمذی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: اس اثنا میں کہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایک کھیت میں تھا درآنحالیکہ آپ کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ وہاں سے یہودی گزرے تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: تم ان سے روح کے بارے سوال کرو، تو آپ نے فرمایا: کون سی چیز تمہیں اس پر اکسا رہی ہے؟ اور ان میں سے بعض نے کہا: وہ تمہیں کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ نہیں کریں گے جسے تم ناپسند کرتے ہو، تو انہوں نے کہا: پس تم ان سے سوال کرو۔ چنانچہ انہوں نے آپ سے روح کے بارے سوال کر دیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکے رہے اور ان پر کوئی جواب نہ لوٹایا، تو میں جان گیا کہ آپ کی طرف وحی کی جائے گی، پس میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، تو جب وحی نازل ہوئی فرمایا: وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا یہ الفاظ بخاری کے ہیں (1)۔ اور مسلم میں ہے: پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا۔ اور اس میں: وَ مَا اُوْتُوْا ہے۔ تحقیق لوگوں نے اس روح کے بارے اختلاف کیا ہے جس کے بارے سوال کیا گیا کہ وہ کون سی روح ہے؟ تو کہا گیا ہے: وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے چھپاتے تھے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ قرآن ہے، اس کا بیان سورۂ شوریٰ کے آخر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں ہر زبان میں ستر ہزار لغات ہیں، وہ ان تمام لغات کے ساتھ اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 686۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180

تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ تخلیق فرماتا ہے جو یوم قیامت تک ملائکہ کے ساتھ اڑتا رہے گا (1)، اسے علامہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (2): میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ابوزکریا نے ابواسحاق سے خبر دی ہے کہ ہمیں ابوالحسن طرائفی نے خبر دی ہے کہ ہمیں عثمان بن سعید نے بتایا ہے انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن صالح نے معاویہ بن صالح سے انہوں نے علی بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے میں بتایا کہ آپ فرماتے ہیں: روح سے مراد فرشتہ ہے (3)۔ اور یہ اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ بن صالح سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا مجھے ابو ہران (ھا کے کسرہ کے ساتھ) یزید بن سمرہ نے اس سے بیان کیا جس نے اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ آپ نے قول باری تعالیٰ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اس کے ستر ہزار منہ ہیں ...... الحدیث۔ مذکورہ الفاظ اور معنی میں ہے۔

اور حضرت عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: روح ایک فرشتہ ہے جس کے گیارہ ہزار پر اور ایک ہزار منہ ہیں، وہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا رہے گا؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور آپ ہی سے روایت ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے ان کے ہاتھ اور پاؤں ہیں اور وہ کھانا بھی کھاتے ہیں؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور خطابی نے کہا ہے، اور بعض نے کہا ہے: یہ (روح) فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اور خلقت کے اعتبار سے ان کی نسبت عظیم صفت سے متصف ہے۔ اور اکثر اہل تاویل کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس روح کے بارے سوال کیا جس کے سبب جسم میں زندگی ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اہل نظر وفکر نے کہا ہے: بے شک انہوں نے آپ سے روح کی کیفیت اور بدن انسانی میں اس کے چلنے کے بارے پوچھا، اور اس کے بارے کہ وہ کیسے بدن کے ساتھ مل جاتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے اتصال کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ ایسی شے ہے جسے اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ابوصالح نے کہا ہے کہ روح ایک مخلوق ہے جیسا کہ بنی آدم ہے اور وہ بنی آدم میں سے نہیں ہیں، اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کا ابہام روح کے مخلوق ہونے پر دلیل ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ایک امر عظیم اور شان کبیر ہے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبہم رکھا ہے اور اس کی تفصیل چھوڑ دی ہے، تاکہ انسان بالیقین جان لے کہ وہ اپنے نفس کی حقیقت جاننے سے عاجز ہے اس کے باوجود کہ اسے اس کے وجود کا علم ہے۔ اور جب انسان اپنی ذات کی معرفت میں اس طرح ہے تو وہ حق کی حقیقت کا ادراک کرنے سے بدرجہ اولیٰ عاجز ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ مخلوق کی معرفت کے ادراک سے عقل کو عاجز قرار دینا اس کا مجاور ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنے خالق کے ادراک سے زیادہ عاجز ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا اس کے بارے اختلاف ہے جسے اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ پس

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 482 3۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180

ایک فرقہ نے کہا ہے: مراد فقط سوال کرنے والے ہیں۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: ان سے مراد سارے کے سارے یہودی ہیں (1)۔ اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت وَ مَآ اُوْتُوا ہے (2) اور آپ نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد سارا عالم ہے (3)۔ اور یہی صحیح ہے۔ اور اسی کے مطابق جمہور کی قرأت وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ ہے۔ تحقیق یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیسے ہمیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے حالانکہ ہمیں تورات عطا کی گئی ہے اور وہ سراپا حکمت ہے، اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ کیا تو وہ مغلوب ہو گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احادیث میں اپنے اس قول کے ساتھ نص بیان کی: كُلًّا یعنی وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ سے مراد جمیع عالم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے آپ کو کہا: ہم مراد لیے گئے ہیں یا آپ کی قوم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلًّا۔ اور اس معنی میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ (لقمان: 27) (اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں۔)

اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ روح کے متعلق سوال کرنے والے قریش تھے، یہودیوں نے ان کو کہا: تم ان سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے پوچھو، پس اگر یہ تمہیں دو کے بارے خبر دے دیں اور ایک سے رک جائیں تو پھر یہ نبی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے آگاہ کر دیا جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اور روح کے بارے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ یعنی روح وہ امر ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اسے مہدوی وغیرہ مفسرین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو سلب کر لیتے وہ وحی جو ہم نے آپ کی طرف کی ہے پھر آپ کوئی ایسا وکیل نہ پاتے جو آپ کے لیے اس کے متعلق ہماری بارگاہ میں وکالت کرتا۔ سوائے اپنے رب کی رحمت کے (کہ وہ ہمہ وقت آپ کے شامل حال ہے) یقیناً اس کا فضل (وکرم) آپ پر بہت بڑا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ مراد قرآن کریم ہے، یعنی جس طرح ہم اسے نازل کرنے پر قادر ہیں اسی طرح ہم اسے سلب کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں یہاں تک کہ مخلوق اسے بھول جائے اور یہ آیت اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ یعنی اگر میں چاہوں کہ میں اس قلیل اور تھوڑے علم کو سلب کر لوں تو میں اس پر قادر ہوں۔ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا پھر آپ کوئی ایسا مددگار نہ پاتے جو اسے آپ پر لوٹا سکتا۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لیکن ہم اسے نہیں چاہیں گے (اور یہ) آپ کے رب کی رحمت ہے؛ پس یہ استثناء پہلے سے نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مگر یہ کہ آپ کا رب آپ پر رحم فرمائے اور وہ اسے سلب نہ کرے۔ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (یقیناً اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 482 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کا فضل و کرم آپ پر بہت بڑا ہے) جبکہ اس نے آپ کو اولاد آدم کا سردار بنایا ہے، اور آپ کو مقام محمود اور یہ کتاب عزیز عطا فرمائی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اپنے دین میں سے جو چیز تم سب سے پہلے گم کرو گے وہ امانت ہے، اور آخر میں جو چیز تم سے مفقود ہوگی وہ نماز ہے، اور یہ قرآن گویا تم سے چھین لیا جائے گا، تم ایک دن صبح کرو گے اور تمہارے پاس اس سے کوئی شے نہ ہوگی۔ تو ایک آدمی نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! یہ کیسے ہوگا؟ حالانکہ ہم نے اسے اپنے دلوں میں راسخ کر رکھا ہے اور ہم نے اسے اپنے مصاحف میں لکھ رکھا ہے، ہم اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں اور ہمارے بیٹے اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیں گے اور یہ یوم قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔ تو آپ نے فرمایا: ایک رات میں وہ کوئی ایسی چیز بھیجے گا جس کے ساتھ وہ مصاحف اور دلوں میں جو کچھ ہے وہ سب لے جائے گا، اور لوگ چوپاؤں کی مثل صبح کریں گے۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ الآیہ۔ اس کو ابو بکر بن ابی شیبہ نے اس معنی کے ساتھ بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: ہمیں ابوالاحوص نے عبدالعزیز بن رفیع سے انہوں نے شداد بن معقل سے بیان کیا کہ انہوں نے بیان کیا، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک یہ قرآن کریم جو تمہارے درمیان ہے عنقریب تم سے چھین لیا جائے گا، سلب کر لیا جائے گا۔ انہوں (شداد بن معقل) نے بیان کیا: میں نے کہا: یہ ہم سے کیسے چھین لیا جائے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے دلوں میں راسخ کر رکھا ہے اور ہم نے اسے اپنے مصاحف میں ثابت اور محفوظ کر رکھا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ ایک ہی رات میں اس پر کوئی ایسی چیز چلائے گا اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ اسے چھین لے گا، سلب کر لے گا، اور جو کچھ مصاحف میں ہے اسے مٹا دے گا اور لوگ اس حال میں صبح کریں گے کہ وہ اس سے خالی اور محروم ہو چکے ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اور یہ اسناد صحیح ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ قرآن کریم ادھر لوٹ جائے گا جہاں سے نازل ہوا، اور اس کی بھنبھناہٹ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوگی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تجھے کیا ہوا ہے؟ تو وہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھ سے نکلا تھا اور تیری ہی طرف لوٹ آیا ہوں، میں تلاوت کیا جاتا رہا لیکن میرے مطابق عمل نہ کیا گیا، مجھے پڑھا جاتا رہا اور میرے ساتھ عمل نہ کیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق اس معنی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسلام مٹ جائے گا جیسے کپڑے کے نقش و نگار مٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ معلوم نہیں ہوگا کہ روزہ کیا ہے اور نہ ہی نماز، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے کوئی علم ہوگا پس ایک ہی رات میں کتاب اللہ پر کوئی چیز چلائی جائے گی تو زمین میں کوئی آیت باقی نہ رہے گی اور لوگوں کے کچھ گروہ باقی رہ جائیں گے، بوڑھے مرد اور عورتیں کہیں گے، ہم نے اپنے آباء و اجداد کو اس کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر پایا تھا۔ اور وہ یہ نہیں جانتے تھے نماز کیا ہے اور نہ وہ روزے، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے جانتے تھے''۔

صلہ (بن زفر عبسی) نے انہیں کہا! انہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کوئی فائدہ نہیں دے گا! درآنحالیکہ وہ یہ نہیں جانتے ہوں گے

نماز کیا ہے اور روزہ، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے بھی نہیں جانتے ہوں گے، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان سے منہ پھیر لیا، پھر انہوں نے یہی بات تین بار دہرائی، اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہر بار اس سے اعراض کرتے رہے۔ پھر آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے صلہ! یہ انہیں آتش جہنم سے نجات دلا دے گا اور آپ نے یہی جملہ (تنجیهم من النار)(1) تین بار فرمایا۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ آپ اپنے سر مبارک کو درد کی وجہ سے لپیٹے ہوئے تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: ”اے لوگو! کیا یہ تحریریں اور کتابیں جو تم لکھ رہے ہو کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سوا کوئی کتاب ہے؟ قریب ہے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی وجہ سے ناراض ہو جائے پس وہ کوئی ورق (کاغذ) نہیں چھوڑے گا اور نہ کوئی دل مگر اس سے سلب کر لے گا“۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو اس وقت مومن مرد اور مومن عورتوں کا حال کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ جس کے لئے اس کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اس کے دل میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ باقی رکھے گا“۔ اسے ثعلبی اور غزنوی وغیرہما نے تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝۸۸

”(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہیں لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ وہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار“

یعنی ظہیر کا معنی معاون و مددگار ہے، جس طرح شعراء شعر کے بیت میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور وہ اسے قائم کرتے ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کی مثل کہہ دیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلا دیا۔ قرآن کے اعجاز کے بارے میں بحث کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ اور لَا یَاْتُوْنَ، لَىِٕنِ میں موجود قسم کا جواب ہے اور شرط کے ارادہ پر اسے جزم دی جا سکتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

لئن كان ما حدثته اليوم صادقا أَقم فی نهار القيظ للشمس باديا

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ٘ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۸۹

”اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تاکہ وہ ہدایت پائیں) پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔“

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ یعنی ہم نے اس میں ہر مثال کے ساتھ قول کی توجیہ بیان

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، ذهاب القران والعلم، جلد 1 صفحہ 303۔ ایضاً، باب ذهاب القرآن والعلم، حدیث 4038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جس کے ساتھ اعتبار اور نظر وفکر واجب ہوتی ہے، مثلاً آیات، عبرتیں، ترغیب وترہیب، اوامر ونواہی، پہلے لوگوں کے قصص اور واقعات، جنت ودوزخ اور قیامت وغیرہ۔ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا اور ان سے مراد اہل مکہ ہیں، ان کے لئے حق واضح کر دیا اور ان کے لئے (اسے) کھول دیا اور انہیں مہلت دی یہاں تک کہ ان کے لئے ظاہر ہو گیا کہ یہ حق ہے، لیکن انہوں نے حق واضح اور ظاہر ہونے کے وقت سوائے کفر کے (ہر شے کا) انکار کر دیا۔ مہدوی نے کہا ہے: ان کے اس قول میں قدریہ کے لئے کوئی حجت نہیں ہے۔ اَبٰى (اس نے انکار کیا) کا لفظ نہیں بولا جاتا مگر اس کے لئے جو اسے کرنے سے انکار کرے جس پر وہ قادر ہو، کیونکہ کافر اگرچہ ایمان لانے پر الله تعالیٰ کے حکم سے اس سے اعراض کرنے اور اپنے دل پر اس کے مہر لگائے جانے کے سبب قادر نہیں ہے، لیکن وہ وسعت اور مہلت کے وقت میں تو حق کی طلب اور باطل سے اسے ممتاز کرنے پر قادر ہے۔

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۟ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۟ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۟ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۟۠

''اور کفار نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کر دیں ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ، یا (لگ کر تیار) ہو جائے آپ کے لئے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا پھر آپ جاری کر دیں ندیاں جو اس باغ میں (ہر طرف) بہہ رہی ہوں، یا آپ گرا دیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے، ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا آپ الله تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں، یا (تعمیر) ہو جائے آپ کے لئے ایک گھر سونے کا، یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں، بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہ لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں، آپ (ان سب خرافات کے جواب میں اتنا) فرما دیں کہ میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے میں کون ہوں مگر آدمی (الله کا) بھیجا ہوا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا یہ آیت رؤساء قریش کے بارے میں نازل ہوئی مثلاً عتبہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو سفیان اور نضر بن حارث، ابو جہل اور عبد الله بن ابی امیہ، امیہ بن خلف اور ابو البختری، اور ولید بن مغیرہ وغیرہم۔ اور وہ اس طرح کہ جب وہ قرآن کریم کا معارض لانے سے عاجز آ گئے اور وہ اس کے معجزہ ہونے پر بھی راضی نہ ہوئے، تو ابن اسحاق وغیرہ کے بیان کے مطابق وہ کعبہ معظمہ کے پاس غروب آفتاب کے بعد اکٹھے ہوئے، پھر ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلو اور ان سے گفتگو کرو، مباحثہ کرو یہاں تک کہ تمہیں اس بارے میں الزام سے بری کر دیا جائے، پس انہوں نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ کی قوم کے اشراف آپ کے لئے جمع ہیں تا کہ وہ

آپ کے ساتھ گفتگو کریں لہٰذا آپ ان کے پاس تشریف لائیے، رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے درآنحالیکہ آپ گمان کر رہے تھے کہ جس بارے میں آپ نے ان کے ساتھ گفتگو کی ہے اس بارے میں ان کے لئے کوئی چیز ظاہر ہوگئی ہے، اور رسول اللہ ﷺ حریص تھے آپ ان کی رشد و ہدایت کو پسند کرتے تھے اور ان کی سرکشی اور رعونت آپ پر گراں گزرتی تھی، یہاں تک کہ آپ ان کے پاس بیٹھ گئے تو انہوں نے آپ کو کہا: اے محمد! (ﷺ) بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف پیغام بھیجا ہے تا کہ ہم آپ سے گفتگو کریں، اور بلاشبہ قسم بخدا! ہم پورے عرب میں کسی آدمی کو نہیں جانتے جس نے اپنی قوم میں اس طرح مداخلت کی ہو جیسے آپ نے اپنی قوم میں مداخلت کی ہے، تحقیق آپ نے آباء و اجداد کو گالیاں دی ہیں، دین میں عیب اور نقص بیان کیا ہے، الٰہوں کو برا کہا ہے، جوانوں کو بے وقوف اور احمق قرار دیا ہے اور اجتماعیت کو تقسیم کر دیا ہے، نتیجتاً کوئی قبیح امر باقی نہیں مگر وہ ہمارے اور آپ کے درمیان ظاہر ہوا، یا اسی طرح کی کئی باتیں انہوں نے آپ سے کہیں، پس اگر آپ نے یہ بات اس لئے کی ہے کہ آپ اس کے بدلے مال چاہتے ہیں تو ہم آپ کے لئے اپنے اموال اکٹھے کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ ہم سے زیادہ مالدار ہو جائیں گے، اور اگر آپ اس سے شرف و سرداری کے طالب ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں، اور اگر آپ اس سے بادشاہی اور حکومت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنے اوپر حاکم تسلیم کرتے ہیں، اور اگر یہ آپ سے کسی جن کی اتباع کی وجہ سے ہو رہا ہے جسے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ پر غالب ہے تو ہم کثرت سے اپنے اموال آپ کے علاج کے لئے خرچ کرتے ہیں تا کہ ہم آپ کو اس سے برأت دلا سکیں یا آپ کو معذور قرار دے سکیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ''مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں جو تم کہہ رہے ہو جو کچھ میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں وہ اس لئے نہیں لایا کہ تم سے اموال کا مطالبہ کروں اور اس لئے کہ تم میں سردار بن جاؤں اور نہ اس لئے کہ تم پر حاکم بن جاؤں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس نے مجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہو جاؤں، چنانچہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیئے ہیں اور میں نے تمہیں نصیحت کر دی ہے پس اگر تم مجھ سے وہ قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تو وہی دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے باعث سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر لوٹا دو (رد کرو) تو میں اللہ تعالیٰ کے امر کی وجہ سے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔'' او کما قال رسول اللہ ﷺ۔ انہوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) جو چیزیں ہم نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں اگر آپ ان میں سے کوئی شے بھی قبول نہیں کرتے تو پھر آپ جان لیجئے کہ لوگوں میں سے کوئی نہیں جس کا شہر ہم سے زیادہ تنگ ہو، نہ کوئی ایسا ہے جس کے پاس ہم سے زیادہ پانی کی کمی اور قلت ہو اور نہ کوئی ایسا ہے جو ہم سے زیادہ زندگی کو سخت، تلخ اور تکلیف دہ گزارنے والا ہو، پس آپ اپنے اس رب سے التجا کیجئے جس نے آپ کو اس کے ساتھ بھیجا جس کے ساتھ آپ کو مبعوث فرمایا کہ وہ ہم سے ان پہاڑوں کو دور ہٹا لے جنہوں نے ہم پر ماحول تنگ کر رکھا ہے، اور چاہئے کہ وہ ہمارے شہر کو کھول دے، وسیع کر دے اور ان میں ہمارے لئے شام کی نہروں کی طرح نہریں جاری کر دے، اور ہمارے وہ آباء جو گزر چکے ہیں انہیں ہمارے لئے زندہ کر دے، اور چاہئے کہ وہ ہمارے لئے قصی

بن کلاب کو زندہ کر دے، کیونکہ وہ سچے شیخ تھے اور ہم ان سے اس کے بارے پوچھیں گے جو آپ کہتے ہیں: کیا وہ حق ہے یا باطل ہے؟ اور اگر انہوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ نے وہ کیا جو ہم نے آپ سے کہا ہے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور ہم اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کا مقام و مرتبہ پہچان لیں گے، اور یہ کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جیسے آپ کہتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''میں اس کے ساتھ تمہاری طرف نہیں بھیجا گیا بلا شبہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہاری طرف وہ لایا ہوں جس کے ساتھ اس نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اور میں نے تم تک وہ پیغام پہنچا دیا ہے جس کے ساتھ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں پس اگر تم اسے قبول کر لو تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر لوٹا دو (یعنی رد کر دو) تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔'' انہوں نے کہا: اور اگر تم یہ ہمارے لئے نہیں کرتے تو اپنے آپ کو ہی لے لیجئے! اپنے رب سے التجا کیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجے جو آپ کی اس بارے میں تصدیق کرتا ہو جو آپ کہتے ہیں اور ہمیں آپ سے واپس لوٹا دے، اور یہ سوال کیجئے کہ وہ آپ کے لئے باغات، محلات اور سونے، چاندی کے خزانے بنا دے اور وہ ان کے سبب آپ کو اس سے غنی کر دے جو ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ چاہتے ہیں؟ کیونکہ آپ بازاروں میں جاتے ہیں اور اسی طرح معاش، کاروبار تلاش کرتے ہیں جیسے ہم اسے تلاش کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم آپ کے رب کی طرف سے آپ کی فضیلت اور آپ کا مرتبہ جان لیں اگر آپ رسول ہیں جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''میں یہ کرنے والا نہیں اور نہ میں وہ ہوں جو اپنے رب سے یہ سوال کرے اور نہ میں تمہاری طرف اس کے ساتھ بھیجا گیا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے...... أو كما قال ..... پس اگر تم مجھ سے وہ قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہاری سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر واپس لوٹا دو تو میں اللہ تعالیٰ کے امر کے لیے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے''۔ انہوں نے کہا: پس وہ ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے جیسا کہ آپ کا گمان ہے کہ آپ کا رب اگر چاہے تو وہ یہ کر سکتا ہے، کیونکہ ہم ہرگز آپ کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے مگر تب کہ آپ ایسا کریں۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا کرنا چاہے تو کر لے۔'' انہوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کا رب جانتا نہیں کہ ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور ہم آپ سے اس بارے سوال کریں گے جو ہم نے آپ سے سوالات کئے ہیں اور ہم آپ سے وہ مطالبہ کریں گے جو اب ہم مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ پہلے ہی آپ کی طرف توجہ فرماتا اور آپ کو اس کے بارے آگاہ کر دیتا ہے جس کے ساتھ آپ ہمیں لوٹا سکتے ہیں اور وہ آپ کو اس کے بارے خبر دے دیتا جو کچھ وہ اس بارے ہمارے ساتھ کرنے والا ہے جب ہم آپ سے وہ قبول نہ کریں جو آپ ہمارے پاس لائے ہیں؟ بے شک ہمیں تو یہ خبر پہنچی ہے کہ یمامہ کا ایک آدمی آپ کو یہ سکھلاتا ہے اس کو رحمٰن کہا جاتا ہے، اور ہم قسم بخدا! رحمٰن کے ساتھ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، تحقیق ہم آپ کے بارے میں معذور ہیں۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قسم بخدا! ہم آپ کو اور جو کچھ ہماری طرف سے آپ کو پہنچا ہے اسے نہیں چھوڑیں گے یہاں تک کہ ہم آپ کو ہلاک کر دیں

گے یا آپ ہمیں ہلاک کر دیں گے۔ اور ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا: ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور بعض نے کہا: ہم آپ کے ساتھ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے بارے میں کوئی ضامن لے آئیں۔ پس جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہا، تو آپ ان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بھی کھڑا ہو گیا، اور یہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا تھا، اور وہ عاتکہ بنت عبدالمطلب تھیں، تو اس نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی قوم نے آپ پر وہ کچھ پیش کیا جو انہوں نے پیش کیا اور آپ نے اسے ان سے قبول نہ فرمایا، پھر انہوں نے آپ سے اپنے بارے میں چند امور کے بارے سوال کیا تا کہ وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کا مقام و مرتبہ پہچان لیں جیسا کہ تم کہتے ہو اور وہ تمہاری تصدیق کریں اور تمہاری اتباع کریں لیکن تم نے وہ نہیں کیا، پھر انہوں نے تم سے یہ سوال کیا کہ اپنے آپ کے لئے ایسی چیزیں لے لیں جن کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر آپ کی فضیلت اور مرتبہ ظاہر ہو جائے لیکن آپ نے وہ بھی نہیں کیا۔ پھر انہوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ انہیں جس عذاب وغیرہ سے ڈرا رہے ہیں اس میں سے کوئی چیز ان پر فوراً اور جلدی لے آئیں، آپ نے یہ بھی نہیں کیا...... یا جس طرح کی باتیں اس نے آپ سے کیں...... پس قسم بخدا! میں آپ کے ساتھ کبھی ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ آپ آسمان کی طرف ایک سیڑھی بنائیں، پھر اس میں چڑھیں اور میں دیکھتا رہوں یہاں تک کہ آپ اس (آسمان) تک پہنچ جائیں پھر آپ وہاں سے اپنے ساتھ تحریری عہد نامہ لائیں اس کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو آپ کی شہادت دیں کہ آپ اسی طرح ہیں جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ اور قسم بخدا! اگر آپ ایسا کر لیں تو میں گمان نہیں کرتا کہ میں آپ کی تصدیق کروں گا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منہ پھیر کر چلا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غمزدہ ہو کر اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹ آئے آپ کو اس پر شدید افسوس تھا کہ آپ اسے نہ پا سکے جو آپ اپنی قوم سے اس وقت طمع اور امید رکھتے تھے جس وقت انہوں نے آپ کو بلایا، اور اس وجہ سے کہ آپ نے انہیں اس سے بہت دور ہوتے ہوئے دیکھا؛ یہ تمام الفاظ ابن اسحاق کے ہیں۔

اور واحدی نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا، ینبوعا کا معنی چشمہ ہے (1)؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ یفعول کے وزن پر ہے، اور نَبَعَ يَنْبَعُ سے ماخوذ ہے۔ اور ائمہ نے تفجر الانہار کے مشدد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: پہلا بھی اسی کی مثل ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: پہلا اس کی مثل نہیں ہے، کیونکہ پہلے کے بعد ینبوع ہے اور وہ واحد ہے، اور دوسرے کے بعد الانہار ہے اور یہ جمع ہے؛ اسی طرح حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ینبوع کا معنی پانی کا چشمہ ہے، اور اس کی جمع ینابیع ہے۔ اور حضرت قتادہ نے او یکون لك جنة پڑھا ہے۔ خِلٰلَهَا یعنی اس کے درمیان۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ یہ قرأت عامہ ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے او یسقط السماء پڑھا ہے یعنی فعل کی نسبت آسمان کی طرف کی ہے۔ كِسَفًا اس کا معنی قطعہ یعنی ٹکڑا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے (2)۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 184
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 273

الکِسَف (سین کے فتحہ کے ساتھ) کِسفۃ کی جمع ہے، اور حضرت نافع، ابن عامر، اور عاصم کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے کِسْفاً (سین کے سکون کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: جنہوں نے کِسفاً من السماء پڑھا ہے، انہوں نے اسے واحد بنایا ہے، اور جنہوں نے اسے کِسَفاً پڑھا ہے انہوں نے اسے جمع بنایا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے سین کو ساکن قرار دیا ہے اس میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ کِسْفۃ کی جمع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ مصدر ہو، اور کسفت الشیٔ جب تو کسی شی کو ڈھانپ لے سے ماخوذ ہو، تو گویا انہوں نے یہ کہا: تو ایسا ٹکڑا ہم پر گرا جو ہمیں گھیرنے اور ڈھانپنے والا ہو۔

اور جوہری نے کہا ہے: الکِسْفۃ اس کا معنی ہے کسی شے کا ایک ٹکڑا، کہا جاتا ہے: أعطنی کسفۃ من ثوبك (اپنے کپڑے سے ایک ٹکڑا مجھے دے دو) اور اس کی جمع کِسَف اور کِسْف ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الکِسْف اور الکِسْفۃ یہ واحد ہیں۔ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا یعنی آپ الله تعالیٰ اور فرشتوں کو اس طرح سامنے لے آئیں کہ انہیں دیکھا جا سکے؛ یہ حضرت قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے۔ اور حضرت ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ قَبِيْلًا کا معنی کفیل (ضامن) ہے۔

حضرت مقاتل نے کہا: اس کا معنی شہیداً (گواہ، شاہد) ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قبیلۃ کی جمع ہے، یعنی آپ ملائکہ کی اصناف درآنحالیکہ وہ قبیلہ قبیلہ ہیں انہیں لے آئیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ضامن ہیں یعنی وہ ہمیں آپ کے اسے لانے کی ضمانت دیں۔ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ یعنی یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو جائے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے (2)۔ اور اس کا اصل معنی زینت ہے اور المزخرف کا معنی مزیّن (جس کو آراستہ کیا جائے) ہے۔ اور زخارف الماء سے مراد اس کے راستے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: میں نہیں جانتا تھا زخرف کیا ہے یہاں تک کہ میں نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں دیکھا بیتٌ مِنَ ذَهَبٍ (3) (سونے کا گھر) یعنی ہم اس فقر کی حالت میں جو ہم دیکھ رہے ہیں آپ کی اتباع اور پیروی نہیں کریں گے۔ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ یا آپ آسمان میں چڑھیں؛ کہا جاتا ہے: رَقِيتُ فی السُّلَّم اَرْقیٰ رَقْيًا وَ رُقِيًّا جب تو سیڑھی پر چڑھے۔ اور ارتقیت بھی اسی کی مثل ہے۔ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ یعنی آپ کے چڑھنے کی وجہ سے ہم ایمان نہیں لائیں گے، اور یہ مصدر ہے، جیسے مضی یمضی مُضِيا، اور ھوی یھوی ھُوِيًّا ہیں اسی طرح رقی یرقی رُقِيًّا ہے۔ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ یعنی یہاں تک کہ آپ الله تعالیٰ کی جانب سے ہم میں سے ہر آدمی کی طرف ایک کتاب (تحریر) اتار لائیں جسے ہم پڑھ سکتے ہوں؛ جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِیٴٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ (المدثر) (بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں۔)

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ اہل مکہ اور شام نے قال سبحان ربی پڑھا ہے یعنی قال کا فاعل حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے الله تعالیٰ کی پاکی بیان کی کہ وہ کسی شے سے عاجز ہو اور اس سے کہ اس پر کوئی کام پیش کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سارے کا سارا کلام ان کے کفر اور ان کی خواہشات میں افراط کے سبب اظہار تعجب کے لئے ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ امر کی بنا پر قُلْ پڑھا ہے: یعنی آپ انہیں فرما دیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم۔ هَلْ كُنْتُ یعنی میں نہیں ہوں اِلَّا

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 186، بمفہوم 2۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 187 3۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 188

بَشَرًا رَّسُوْلًا مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا۔ میں اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں میں سے جو انسان کی قدرت میں نہیں ہیں جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، کیا تم نے انسانوں میں سے کسی کے بارے سنا ہے کہ وہ یہ نشانیاں اور آیات لایا ہو؟ اور بعض ملحدوں نے کہا ہے: یہ ایسا جواب نہیں ہے جس پر قناعت کی جائے، اور انہوں نے غلط کہا ہے، کیونکہ آپ نے انہیں جواب یہ دیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ میں ایک آدمی ہوں میں ان میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتا جو تم نے مجھ سے مطالبات کئے ہیں، اور نہ میرے لئے یہ ہے کہ میں اپنے رب پر انہیں ڈال دوں (یعنی ان کا اپنے رب سے مطالبہ کروں)، کیونکہ مجھ سے پہلے انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی امتوں کے پاس ان تمام میں سے کوئی شے نہیں لائے جو مطالبات اور خواہشات وہ لوگ رکھتے تھے اور میرا طریقہ بھی انہیں کا طریقہ ہے، اور وہ انہیں آیات وعلامات پر اقتصار کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان علامات میں سے عطا فرمائیں جو ان کی نبوت کی صحت پر دلیل تھیں، پس جب وہ (انبیاء علیہم السلام) ان پر حجت قائم کر دیں تو پھر ان کی قوم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان کے سوا اور کی خواہش اور مطالبہ کریں، اور اگر اللہ تعالیٰ پر واجب ہو کہ وہ انہیں ان تمام علامات کے ساتھ بھیجے جن کی وہ خواہش اور مطالبہ کرتے ہیں تو پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ رسولوں میں سے وہ بھیجے جنہیں وہ اختیار اور پسند کریں گے، اور ہر آدمی کے لئے یہ کہنا لازم ہو جائے گا کہ میں ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ اس کے خلاف نشانی لائی جائے جس کا مطالبہ میرے سوا دوسرے نے کیا ہے۔ اور یہ اس طرف لوٹ جائے گا کہ تدبیر لوگوں کے پاس ہے، (حالانکہ) بلاشبہ تدبیر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

"اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب آئی ان کے پاس ہدایت مگر اس چیز نے کہ انہوں نے کہا کہ کیا بھیجا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو رسول بنا کر؟ (ایسا نہیں ہو سکتا)۔"

قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى یعنی جب اللہ تعالیٰ کے پاس سے اس کی طرف بلانے کے لئے رسل علیہم السلام اور کتابیں آ گئیں (تو لوگوں کو ایمان لانے سے نہیں روکا) اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا مگر اس چیز نے کہ انہوں نے اپنی جہالت کے سبب کہا۔ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا رسول انسانوں میں سے ہو، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی فرط عناد اور سرکشی کو بیان کیا کیونکہ انہوں نے کہا: آپ ہماری مثل ہیں پس آپ کی اطاعت اور پیروی ہم پر لازم نہیں، اور وہ معجزہ سے غافل ہو گئے، پس پہلا اَنْ حرف جر کے ساتھ ساقط ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور دوسرا اَنْ منع کی وجہ سے محل رفع میں ہے (تقدیر کلام اس طرح ہے) و ما منع الناس من انْ یؤمنوا اذ جآء ھم الھدی الاقولھم اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

''فرمایئے: اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر۔''

اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمادیا کہ فرشتے کو فرشتوں کی طرف بھیجا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر وہ آدمیوں کی طرف فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا تو وہ اسے اس ہیئت پر دیکھنے کی قدرت نہ رکھتے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے، اور بلاشبہ اس نے انبیاء علیہم السلام کو اس پر قدرت دے رکھی ہے اور ان میں وہ چیز پیدا فرمارکھی ہے جس کے ساتھ وہ قدرت رکھتے ہیں، تاکہ یہ ان کے لئے نشانی اور معجزہ ہوجائے۔ اور اس آیت کی نظیر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (الانعام) (اور بولے کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ اور اگر ہم اتارتے فرشتہ تو فیصلہ ہوگیا ہوتا ہر بات کا پھر نہ مہلت دی جاتی انہیں اور اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتے کو تو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں)) اس کے بارے پہلے بحث گزر چکی ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝

''فرمایئے: کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان، بے شک وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جاننے والا ہے اور ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔''

روایت ہے کہ کفار قریش نے جس وقت یہ قول سنا: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا تو انہوں نے کہا: پس کون آپ کی شہادت دے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝

''اور جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو آپ نہیں پائیں گے ان (گمراہوں) کے لئے کوئی مددگار اس کے سوا اور ہم اٹھائیں گے انہیں قیامت کے روز منہ کے بل اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب بھی سرد ہونے لگے گی (جہنم کی آگ) تو ہم ان کے لئے اس کی آنچ کو بڑھادیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے تو وہ یقیناً ہدایت یافتہ ہوجائیں۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ یعنی (جنہیں اللہ تعالیٰ گمراہ کردے) انہیں کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے ..... کہ اس سے مراد انہیں تیزی اور

جلدی کے ساتھ جہنم کی طرف لے جانا ہے، جیسا کہ عربوں کا قول ہے: قدم القوم علی وُجُوْهِهِمْ (یہ تب بولتے ہیں) جب وہ تیزی سے چل کر آئیں۔ اور دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں قیامت کے دن چہروں کے بل جہنم کی طرف گھسیٹا جائے گا جیسا کہ دنیا میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے جس کو انتہائی زیادہ ذلیل و رسوا کرنا اور عذاب دینا مقصود ہو۔ اور یہی معنی صحیح ہے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، وہ لوگ جنہیں منہ کے بل اٹھایا جائے گا، کیا کافر کو اس کے منہ کے بل اٹھایا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہ ذات جس نے اسے دو پاؤں پر چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ قیامت کے دن اسے منہ کے بل چلا دے۔'' جس وقت یہ خبر حضرت قتادہ تک پہنچی تو انہوں نے کہا: کیوں نہیں ہمیں اپنے رب کی عزت کی قسم! (وہ اس پر قادر ہے)۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے (1) اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے (2): یعنی وہ اندھے ہوں گے اس چیز سے جو انہیں خوش کر سکتی ہے، کوئی حجت اور دلیل بیان کرنے سے گونگے ہوں گے، اور اس شے سے بہرے ہوں گے جو انہیں نفع دے سکتی ہے؛ اس قول کی بناء پر ان کے حواس اپنی اس حالت پر باقی رہیں گے جس پر وہ پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہیں اسی صفت اور کیفیت پر اٹھایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بیان کی ہے (3)، تاکہ اس سے ان کے عذاب میں اضافہ ہو، پھر ان کے لئے وہ جہنم میں پیدا کر دیئے جائیں گے، پس وہ دیکھنے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف: 53) (اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔) اور گفتگو بھی کرنے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ (الفرقان) (تو پکاریں گے وہاں موت کو۔) اور سننے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ (الفرقان) (تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا)۔ اور مقاتل بن سلیمان نے کہا ہے: جب ان کو کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ)۔ تو وہ اندھے ہو جائیں گے دیکھ نہیں سکیں گے، بہرے ہو جائیں گے کچھ سنیں گے نہیں (4)، گونگے ہو جائیں گے کچھ سمجھ نہیں سکیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اندھے ہو جائیں گے جس وقت وہ جہنم میں داخل ہوں گے اس کی سیاہی کی شدت کی وجہ سے، اور ان کا بولنا ختم ہو جائے گا جس وقت انہیں کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) اور زفیر اور شہیق ان کے سننے کی قوت ختم کر دے گی اور پھر وہ کوئی شے نہ سن سکیں گے۔

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کا ٹھکانا اور ان کا مقام جہنم ہے۔ كُلَّمَا خَبَتْ جب بھی آگ ساکن (سرد) ہونے لگے گی (5)؛ یہ حضرت ضحاک وغیرہ سے مروی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آگ بجھنے لگے گی۔ کہا جاتا ہے: خبت النار تخبو خبوا أی طفئت (آگ بجھ گئی)، واخبیتها أنا (اور میں نے اسے بجھا دیا) زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (تو ہم ان کے لئے اس کی آنچ کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 701　　2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 193
3۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 531　　4۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 275　　5۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 195

بڑھا دیں گے) یعنی وہ آگ شعلے مارنے لگے گی۔ اور اس کے شعلوں کا ساکن ہونا، کم ہونا ان کی اذیت اور درد میں کمی کے بغیر ہوگا اور اس سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آگ سرد ہونے کے قریب ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ (النحل:98) (اور جب تو قرآن کریم پڑھنے کا ارادہ کرے)، (تو اسی طرح جب وہ آگ سرد ہونے کا ارادہ کرے گی تو اسے اور بڑھا دیا جائے گا)۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

''یہ سزا ہے ان کی کیونکہ انہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے از سر نو پیدا کر کے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ پیدا فرما دے ان کی مثل اور اس نے مقرر فرما دی ہے ان کے لئے ایک میعاد جس میں ذرا شک نہیں، پس انکار کر دیا ظالموں نے (اللہ کی قدرت کا) سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔''

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا یعنی وہ عذاب ان کے کفر کی جزا ہے۔ وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا (کیا جب ہم ہڈیاں اور) مٹی ہو جائیں گے۔ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا پس انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے (زندہ کئے جانے) کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا اور فرمایا: اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، ای أولم یروا أنّ اللہ الذی خلق السموات والأرض، وجعل لھم أجلا لا ریب فیہ قادر علی أن یخلق مثلھم (کیا انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اور اس نے ان کے لئے ایک میعاد مقرر فرما دی ہے جس میں ذرا شک نہیں وہ ان کی مثل پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔) اور الأجل سے مراد دنیا میں ان کے قیام کی مدت اور پھر ان کی موت ہے، اور یہ وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں کیونکہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے۔ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا یعنی مشرکوں نے انکار کر دیا (اللہ تعالیٰ کی قدرت کا) سوائے اس مدت اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنے کے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ مقررہ مدت وہی اٹھائے جانے کا وقت ہے، اور اس میں شک نہیں کیا جانا چاہئے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ

الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝

''فرمائیے: اگر تم مالک ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے تو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں، واقعی انسان بڑا تنگدل ہے۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ یعنی اگر تم رزق کے خزانوں کے مالک ہوتے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر تم نعمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے، اور یہ اعم ہے۔ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ تو تم بخل کے سبب ضرور ہاتھ روک لیتے، اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ (الاسراء) یہاں تک کہ ہم معیشت میں خوشحال اور وسیع ہو جائیں، یعنی اگر تم خوشحال ہو بھی جاؤ تب بھی ضرور بخل کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر مخلوق میں سے کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک بن جائے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے سخاوت کرنے کی طرح ان کے ساتھ سخاوت نہ کرے؛ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے...... کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے اپنے خرچ اور اپنی منفعت کے حصول کے لیے ہاتھ روک لے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ اسے فقر و افلاس کا خوف ہو اور ختم ہونے کا ڈر لاحق ہو جائے (لہٰذا وہ ہاتھ روک لے)۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں ان دونوں حالتوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اور اس آیت میں انفاق بمعنی فقر ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے(1)۔ اور اہل لغت نے انفق، أصرم، أعدم اور اقتر سبھی کو مال کم ہونے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ اور واقعی انسان بخیل اور تنگ دل ہے۔ کہا جاتا ہے: قَتَرَ علی عیالہ یَقْتُرُ و یَقْتِرُ قَتْرًا و قُتُوْرًا جب آدمی اہل و عیال پر نفقہ (خرچہ) تنگ کر دے (تو مذکورہ جملہ کہا جاتا ہے)، اور اسی طرح التقتیر اور الاقتار ہیں، اور یہ تینوں لغات ہیں۔ اور اس آیت کے بارے میں دو مختلف قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ صرف مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے...... کہ یہ عام ہے، اور یہ جمہور کا قول ہے؛ اور اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(2)۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝

''اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ (علیہ السلام) کو نو روشن نشانیاں آپ خود پوچھ لیں بنی اسرائیل سے جب موسیٰ آئے تھے ان کے پاس، پس فرعون نے آپ کو کہا: اے موسیٰ! میں تمہارے متعلق خیال کرتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ان آیات میں اختلاف ہے، پس یہ کہا گیا ہے کہ یہ کتاب کی آیات کے معنی میں ہیں، جیسا کہ ترمذی اور نسائی نے صفوان بن عسال مرادی سے روایت کیا ہے کہ دو یہودی تھے ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: ہمارے ساتھ چلو اس نبی کے پاس، ہم اس سے کچھ سوال کرتے ہیں، تو اس نے کہا: تو اسے نبی نہ کہہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 196

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 276

کیونکہ اگر اس نے ہمیں سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی وہ بہت زیادہ خوش ہو جائے گا)، پس وہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، نہ زنا کرو، حق کے سوا کسی ایسے نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، اور کسی بری الذمہ آدمی کو حاکم کی طرف لے کر نہ چلو کہ وہ اسے قتل کر دے، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن عورت پر تہمت اور بہتان نہ لگاؤ اور میدان جہاد میں لشکر سے نہ بھاگو...... شعبہ کو شک ہے...... اے گروہ یہود! تم پر خاص طور پر یہ لازم ہے کہ ہفتہ کے دن حد سے تجاوز نہ کرو۔'' پس ان دونوں نے آپ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسے دیئے اور کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔ فرمایا: ''کون سی چیز تم دونوں کو روک رہی ہے کہ تم اسلام لے آؤ۔'' ان دونوں نے کہا: بے شک حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں مسلسل نبی رہے اور بلاشبہ ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ہم اسلام لے آئے تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیات سے مراد معجزات اور دلائل ہیں۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا ہے: نو نشانیاں یہ ہیں عصا مبارک، حضرت موسیٰ علیہ السلام، لسان، سمندر، طوفان، مکڑی، قمل (جوئیں) مینڈک اور خون؛ یہ مفصل علامات اور نشانیاں ہیں(2)۔ حسن اور شعبی نے کہا ہے: پانچ سورۃ الاعراف میں مذکور ہیں، یعنی طوفان اور جو اس پر معطوف ہے، ید بیضاء، عصا، قحط سالی اور پھلوں میں نقصان اور کمی۔ اور اسی طرح حسن سے مروی ہے، مگر یہ قحط سالی اور پھلوں میں کمی کو ایک بناتے ہیں(3)، اور نویں علامت عصا مبارک کا پھینکی جانے والی رسیوں کو (جھوٹ کے سانپ) جلدی سے نگل جانے کو قرار دیتے ہیں، اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، مگر یہ کہ انہوں نے قحط سالی اور پھلوں میں نقصان کی جگہ سمندر اور پہاڑ کو رکھا ہے۔ اور محمد بن کعب نے کہا ہے: یہ وہی پانچ ہیں جو سورۃ الاعراف میں ہیں اور سمندر، عصا، پتھر، اور ان کے مالوں کو مٹا دینا۔ ان آیات کی مکمل شرح پہلے گزر چکی ہے والحمدللہ۔

فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ یعنی اے محمد! آپ ان سے پوچھیے جب موسیٰ علیہ السلام ان نشانیوں اور علامات کے ساتھ ان کے پاس آئے، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔ اور یہ سوال برائے استفہام ہے تاکہ یہودی اس کی صحت کو جان لیں جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا یعنی آپ تو اپنے افعال کی ندرت اور غرابت کے ساتھ جادو کرنے والے ہیں، یہ فراء اور ابو عبیدہ نے کہا ہے۔ پس اس میں مفعول کو فاعل کی جگہ رکھا گیا ہے، جیسے تو کہتا ہے: ھذا مشئوم و میمون، ای شائم و یامن (یہ نحوست ڈالنے والا، اور یہ مبارک بنانے والا ہے)، (یعنی اس میں مفعول کو فاعل کی جگہ رکھا گیا ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی مخدوعا (جس کو دھوکہ دیا گیا ہو۔) اور

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب فی قبلۃ الید والرجل، حدیث 2657، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 197 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 277

یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی مغلوباً ہے (جس پر غلبہ پالیا گیا ہو): یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابونہیک سے روایت ہے کہ ان دونوں نے اسے: فَسَالَ بَنِی اسرائیل خبر کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کردے اور ان کا راستہ چھوڑ دے اور وہ انہیں آپ کے ساتھ بھیج دے۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

"کلیم نے جواباً فرمایا: (اے فرعون!) تو خوب جانتا ہے کہ نہیں اتارا ان نشانیوں کو مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے یہ بصیرت افروز ہیں۔ اور اے فرعون! میں تیرے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہلاک کردیا جائے گا۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ یعنی اے فرعون! تو ان نو نشانیوں کو خوب جانتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہی نازل کیا ہے۔ اس میں انزل بمعنی أوجد (ایجاد کرنا) ہے۔ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ یعنی یہ ایسی دلالات ہیں جن سے اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اور قرأت عامہ عَلِمْتَ تا کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور یہ خطاب فرعون کو ہے۔ اور کسائی نے تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور فرمایا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کے دشمن نے نہیں جانا لیکن موسیٰ علیہ السلام وہ ہیں جنہیں اس کا علم ہوا، پس یہ خبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ یہ لَقَدْ عَلِمْتَ ہے، اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (النمل: 14) (1) (اور انہوں نے انکار کردیا ان کا حالانکہ یقین کرلیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا۔) اور فرعون کی نسبت عناد اور سرکشی کی طرف کی۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: اس سے جو معنی لیا گیا ہے ہمارے نزدیک اس میں تا کا فتحہ ہے، اور وہی اصح ہے اس معنی کی وجہ سے جس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استدلال کیا ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے قول علمت انا کے ساتھ استدلال نہیں کرتے، اور آپ تو دعوت دینے والے رسول ہیں، اس تمام کے باوجود اگر یہ قرأت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح ہوتی تو یقیناً حجت ہوتی، لیکن یہ آپ سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ تو کلثوم مرادی سے مروی ہے اور وہ مجہول ہے اس کی کوئی پہچان نہیں ہے، اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے کسائی کے بغیر اس طرح پڑھا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان معجزات کے بارے جاننے کی نسبت فرعون کی طرف کی ہے) کیونکہ فرعون اس مقدار کو جانتا تھا جس کا کرنا جادوگروں کے لئے ممکن تھا، اور اس کی مثل جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا کسی جادوگر کے لئے ممکن نہیں، اور یہ کہ کوئی اس کے کرنے پر قدرت نہیں رکھتا مگر وہی جو اجسام بناتا ہے اور آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایک سرد اور ٹھنڈے دن میں داخل ہوئے اور وہ اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھا، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 201

اپنا عصا مبارک ڈال دیا تو وہ اژدھا بن گیا، پس فرعون نے گھر کی دونوں اطراف کو اس کے جبڑوں کے درمیان دیکھا، تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور اپنی چادر میں داخل ہو گیا۔ [اللُقم ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی جبڑا ہے، اور حدیث میں ہے من حفظ ما بین لقميه(1) (یعنی جس نے اس کی حفاظت کی جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے (مراد زبان ہے)] وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۝ یہاں ظن بمعنی تحقیق ہے۔ اور الثبور کا معنی ہلاکت اور خسران (نقصان اٹھانا) بھی ہے۔

کمیت نے کہا ہے:

ورأت قضاعة فی الأیا　　من رأی مثبور و ثابر

ای مخسور و خاسر (یعنی جس کو خسارہ دیا گیا اور نقصان اٹھانے والا) یعنی یمن کی طرف اپنی نسبت کرنے میں (خسارے میں ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ملعون (جس پر لعنت کی گئی ہو) ہے۔ اسے منہال نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ ابان بن تغلب نے کہا ہے۔

اور یہ شعر بھی کہا ہے:

یا قومنا لا تروموا حربنا سفها　　ان السفاه وان البغی مثبور

اس میں مثبور بمعنی ملعون ہے۔ اور میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: کہ مَثْبُوْرًا سے مراد ناقص العقل ہے۔ اور مامون نے ایک آدمی کو دیکھا اور اس کو کہا: اے مثبور! تو اس سے اس بارے پوچھا گیا، اس نے جواب دیا: رشید نے کہا ہے کہ منصور نے ایک آدمی کو کہا: مثبور، تو میں نے اس سے اس کے بارے پوچھا تو اس نے کہا: مجھے میمون بن مہران نے بیان کیا ہے ... اور اس نے اس کا ذکر کیا۔ اور حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اس کا معنی ''ہلاک کیا گیا'' ہے (3)۔ اور الثبور کا معنی ہلاکت ہے، کہا جاتا ہے: ثبر اللہ العدو ثبورا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جس کو خیر سے روک دیا جائے۔ اہل لغت نے بیان کیا ہے: ما ثبرك عن كذا یعنی تجھے اس سے کس نے منع کیا ہے۔ اور ثبرہ اللہ ثبرۃ [ویثبرہ یہ دونوں لغتیں ہیں]۔

ابن الزبعری نے کہا ہے:

اذ أجاری الشیطان فی سنن الغی　　و من مال میله مثبور(4)

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مَثْبُوْرًا بمعنی مسحورا (جس پر جادو کر دیا گیا ہو) ہے۔ اختلاف الفاظ کے ساتھ اس کی مثل جو کسی نے کہا یہ اس کا جواب ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: مَثْبُوْرًا اس کا معنی مخبول ہے (5) جس کی کوئی عقل نہ ہو۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا۝ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا۝

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 399، حدیث 8063　2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 202　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 201　5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 489

''پس اس نے ارادہ کر لیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھاڑ کر پھینک دے، سو ہم نے غرق کر دیا اسے اور اس کے سارے ساتھیوں کو، اور ہم نے حکم دیا فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سرزمین میں پس جب آئے گا آخرت کا وعدہ تو ہم لے آئیں گے تمہیں سمیٹ کر''۔

قولہ تعالیٰ: فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی فرعون نے ارادہ کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو مصر کی زمین سے نکال دے یا قتل کر کے یا وہاں سے دور نکال کر، تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کر دیا۔ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ اور ہم نے حکم دیا اسے غرق کرنے کے بعد۔ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ بنی اسرائیل کو کہ تم شام اور مصر کی زمین میں آباد ہو جاؤ۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پس جب قیامت کا وعدہ آئے گا۔ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا تو ہم تمہیں تمہاری قبروں سے لے آئیں گے اس حال میں کہ ہر جگہ سے اکٹھے ہو گے، تحقیق مومن کافر کے ساتھ مل جائے گا اور ایک دوسرے کی پہچان نہیں کر سکیں گے، اور تم میں سے کوئی بھی اپنے قبیلہ اور اپنے محلہ کی طرف مائل نہ ہو گا۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ نے کہا ہے (1): ہم مختلف جہتوں سے تمہیں اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔ دونوں معنی ایک ہی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: اللفیف سے مراد لوگوں کا متفرق قبائل سے اکٹھا اور جمع ہونا ہے؛ کہا جاتا ہے: جاء القوم بلفّهم ولفیفهم، یعنی قوم مل جل کر آئی۔ اور قول باری تعالیٰ: جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا یعنی ہم تمہیں اکٹھا کر کے اور ملا جلا کر لے آئیں گے۔ اور طعام لفیف جب کھانا دو یا زیادہ جنسوں سے ملا جلا اور مخلوط ہو۔ اور فلان لفیف فلان یعنی فلاں فلاں کا دوست ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: اللفیف جمع ہے اور اس کی واحد نہیں ہے، اور یہ جمیع کی مثل ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ انہیں قبروں سے اٹھاتے وقت منتشر مکڑیوں کی طرح نکالا جائے گا، درآنحالیکہ وہ اس طرح ملے جلے ہوں گے کہ ایک دوسرے کی پہچان نہیں کر سکیں گے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اترنے کا وقت آ جائے گا۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝۱۰۵

''اور حق کے ساتھ ہی ہم نے اسے اتارا ہے اور حق کے ساتھ ہی وہ اترا ہے، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر (رحمت الٰہی کا) مژدہ سنانے والا اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ یہ آیت سابقہ معجزات اور قرآن کے ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ اور ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ میں تکرار کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہے پہلے کا معنی ہو، ہم نے اسے حق کے ساتھ اتارنے کو واجب کیا ہے۔ اور دوسرے کا معنی ہو: اور یہ نازل ہوا اور اس میں حق ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: خرج بثیابه (فلاں اپنے کپڑوں کے ساتھ نکلا) یعنی وعلیه ثیابه (اور اس پر اس کے کپڑے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلے وَ بِالْحَقِّ میں با بمعنی مع ہے یعنی حق کے ساتھ، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: رکب الامیر بسیفه ای مع سیفه (حاکم اپنی تلوار سمیت سوار ہوا) وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ای بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا، جیسا کہ تو کہتا ہے: نزلت بزید (میں زید کے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 278

پاس اترا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہو وبالحق قدرنا أن ینزل (حق کے ساتھ ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ نازل ہو)، اور اسی طرح تنزل بھی ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

''اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ سیبویہ کا مذہب ہے کہ قُرْاٰنًا فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر ظاہر فعل کر رہا ہے۔ اور جمہور لوگوں نے فَرَقْنٰهُ را کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کا معنی ہے ہم نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے، اور ہم نے اس میں حق اور باطل کے درمیان فرق کیا ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہم نے اسے مفصل بیان کیا ہے (1)۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت قتادہ، ابورجاء، اور شعبی رضی اللہ عنہم نے فَرَّقْنٰهُ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے (2)، یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا نہ کہ یکبارگی، مگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں فرقناہ علیک ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کریم کتنی مدت میں نازل ہوا، پس کہا گیا ہے کہ پچیس برس میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تیئس برس میں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بیس برس میں نازل ہوا۔ اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں اختلاف کی وجہ سے ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ آسمان دنیا کی جانب سارا ایک ہی بار نازل ہوا۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

عَلٰى مُكْثٍ یعنی طویل مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق یہ قرآن ترتیب وار نازل ہوتا رہا یعنی ہم نے اسے ایک ایک آیت کر کے اور ایک ایک سورت کر کے نازل کیا۔ اور رہا پہلا قول تو اس کے مطابق عَلٰى مُكْثٍ کا معنی ہوگا تلاوت اور ترتیل میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں؛ یہ حضرت مجاہد، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ پس قاری کو چاہئے کہ وہ قرأت میں اس کا حق ادا کرے اس طرح کہ وہ اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور حسن آواز کے ساتھ بغیر تلحین اور ایسی سر اور ترنم کے جو زیادتی یا کمی کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو تبدیل کر دے کیونکہ یہ حرام ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے، جہاں تک ممکن ہو وہ اسے حسین اور عمدہ بنائے۔ اور قراء نے ابن محیصن کے بغیر مُکث میں میم کے ضمہ پر اجماع کیا ہے اور ابن محیصن نے میم پر فتحہ پڑھا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: مَکث و مُکث اور مِکث؛ یہ تینوں لغات ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عَلٰى مُكْثٍ یعنی خوب تثبت اور ٹھہراؤ کے ساتھ۔ قولہ تعالیٰ: وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا یہ مصدر کے ساتھ سابقہ معنی میں مبالغہ اور تاکید پیدا کرتا ہے، یعنی ہم نے اسے یکے بعد دیگرے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، اگر وہ تمام فرائض کو ایک ہی وقت میں لے لیتے تو وہ یقیناً متنفر ہو جاتے اور بھاگ جاتے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 205 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 490

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾

''آپ (کفار کو) کہیے: خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ، بے شک وہ لوگ جنہیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے جب اسے پڑھا جاتا ہے ان کے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا یعنی قرآن کریم کے ساتھ تم ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ۔ اور یہ الله تعالیٰ کی جانب سے ان کے لئے بطور تبکیت اور تہدید ہے نہ کہ بطور تخییر ہے (یعنی یہ انہیں ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار نہیں دیا جا رہا بلکہ انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔) اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ بے شک وہ لوگ جنہیں قرآن کریم کے نازل ہونے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے علم دیا گیا ہے، اور وہ اہل کتاب ایمان لانے والے ہیں؛ یہ ابن جریج وغیرہ کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ کا معنی ہے جب ان کی کتاب پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب قرآن کریم ان پر پڑھا جاتا ہے۔ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا اور کہا گیا ہے: یہ اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے ایک قوم ہے انہوں نے دین کو مضبوطی سے تھامے رکھا یہاں تک کہ الله تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، ان میں سے زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل ہیں۔ اور اس معنی کی بنا پر مراد وہ نہیں جنہیں کتاب دی گئی بلکہ مراد وہ ہیں جنہیں علم دین عطا کیا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ جنہیں علم عطا فرمایا گیا وہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ یہود کے کچھ لوگ تھے (1)، اور قول باری تعالیٰ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے یہی ظاہر ہے۔ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق جب ان پر قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ جب وہ اسے سنتے جو قرآن کریم الله تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو وہ سجدہ میں گر جاتے اور کہتے: سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب وہ اپنی کتاب اور اس قرآن کی تلاوت کرتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے تو وہ خشوع کرتے، سجدے کرتے اور تسبیح بیان کرتے، اور کہتے: یہ وہی ہے جو تورات میں مذکور ہے، اور یہی اس کی صفت اور انداز ہے، اور لامحالہ اس کے ساتھ الله تعالیٰ کا وعدہ واقع اور پورا ہونے والا ہے، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (2)، اور قَبْلِهٖۤ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے جیسا کہ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ میں ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں ضمیریں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہیں، اور نئے سرے سے قرآن کریم کا ذکر اس قول باری تعالیٰ میں ہے: اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ۔(3)

وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

''اور کہتے ہیں: (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے ہمارا رب، بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔''

یہ سجود میں تسبیح کے جواز پر دلیل ہے۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 280　　2۔ ایضاً　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 491

رسول اللہ ﷺ اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے یہ کہتے تھے: سبحانك اللّٰهم [ربنا] و بحمدك اللّٰهم اغفرلی(1) (تیری ذات پاک ہے اے اللہ [اے ہمارے رب] اور حمد تیرے ہی لئے ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما۔)

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝

''اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ وزاری کرتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے (خضوع و) خشوع کو بڑھا دیتا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ یہ ان کی صفت کے بیان میں مبالغہ اور ان کی مدح ہے۔ اور ہر وہ آدمی جس کی پہچان علم کے ساتھ ہے اور اس نے اس سے کچھ حاصل کیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس مرتبہ پر فائز ہو، اور وہ قرآن کریم کے سماع کے وقت خشوع، تواضع اور عاجزی کا اظہار کرے۔ اور مسند دارمی ابو محمد میں تیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جسے علم عطا کیا گیا جس نے اسے نہ رلایا تو زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ اسے علم عطا نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی صفت یہ بیان فرمائی ہے، پھر یہی آیت تلاوت کی۔ اسے علامہ طبری نے بھی ذکر کیا ہے(2)۔ اور الاذقان، ذقن کی جمع ہے، اور یہ دو جبڑوں کو مجتمع ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: الأذقان یہ ڈاڑھی سے عبارت ہے(3)، یعنی وہ اسے سجدہ کی حالت میں زمین پر رکھ دیتے ہیں، اور یہ حد درجہ تواضع ہے۔ اور اس میں لام بمعنی علی ہے؛ آپ کہتے ہیں: سقط لِفیه ای علی فیه (وہ منہ کے بل گرا)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا یعنی وہ مونہوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں(4) اور اذقان (ٹھوڑیوں) کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ ٹھوڑی انسان کے منہ سے قریب ترشے ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ٹھوڑی پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں ذقن سے مراد الوجه (چہرہ) ہے، اور کبھی ایک شے کو اپنے مجاور (پڑوس والی شے) سے اور کل کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، پس کہا جاتا ہے: خرّلوجهه ساجدا (وہ اپنے چہرے کے بل سجدے میں گر گیا) اگرچہ اس نے اپنے رخساروں اور اپنی آنکھوں پر سجدہ نہیں کیا۔ کیا تو اس قول کی طرف نہیں دیکھتا۔)

فخرّ صَرِيعا لليدين و لِلفَم

تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے منہ اور ہاتھوں کے بل گر پڑا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَبْكُوْنَ حالت نماز میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کے جائز ہونے پر دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی معصیت پر رونے کے جواز پر دلیل ہے، اور یہ کہ یہ نہ نماز کو توڑتا ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ حضرت ابن مبارک نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ثابت بنانی سے انہوں نے مطرف بن عبد اللہ بن شخیر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، مایقول فی الرکوع والسجود، جلد 1، صفحہ 192　2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 209
3۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 208　4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 208-207

پڑھ رہے تھے اور رونے کے سبب آپ کے پیٹ میں اس طرح کھولنے کی آواز آرہی تھی جیسے ہانڈی کے کھولنے کی آواز آتی ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں ہے: رونے کے سبب آپ کے سینے میں اس طرح کی آواز تھی جیسے چکی کی آواز ہوتی ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ کراہنے کے بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے، پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کراہنا مریض کی نماز کو نہیں توڑتا، اور آپ نے صحت مند آدمی کے لئے کراہنا مکروہ قرار دیا ہے: اور یہی ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابن الحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: کھانسنا، کراہنا اور پھونک مارنا نماز کو نہیں توڑتا۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: اسے توڑ دیتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس کے حروف ہوں جو سنے اور سمجھے جاسکتے ہوں تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اگر اس کا کراہنا اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہو تو نماز نہیں ٹوٹے گی، اور اگر درد کی وجہ سے ہو تو نماز کو توڑ دیتا ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی نماز ان تمام صورتوں میں مکمل ہے؛ کیونکہ کوئی مریض اور ضعیف آدمی کراہنے سے خالی نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا خشوع کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور مزید آگے آئے گی۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝

"آپ فرمائیے: یا اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے اسے پکارو اس کے سارے نام (ہی) اچھے ہیں اور نہ تو بلند آواز سے نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو اسے اور تلاش کرو ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ۔"

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اللہ یا رحمٰن پکارتے ہوئے سنا تو کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں تو ایک اللہ کو پکارنے کا حکم دیتے ہیں اور خود دو کو پکارتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور مکحول نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات تہجد کی نماز پڑھی اور اپنی دعا میں یہ کہا: یا رحمٰن یا رحیم (2) اور مشرکین میں سے ایک آدمی نے اسے سن لیا۔ اور یمامہ کا ایک آدمی تھا جس کا نام رحمٰن تھا، تو اس سننے والے نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یمامہ کے رحمٰن کو پکار رہے ہیں؟ پس یہ آیت یہ بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی کہ یہ دونوں اسم ایک مسمّی کے ہیں، پس اگر تم نے اسے یا اللہ کے ساتھ پکارا تو وہ بھی ذات ہے اور اگر تم نے اسے یا رحمٰن کے ساتھ پکارا تو بھی وہی ذات مراد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تحریر کے شروع میں لکھتے تھے: باسمک اللّٰھم؛ پھر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (النمل) تب رسول اللہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، البکاء فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 130۔ ایضاً، باب البکاء فی الصلوٰۃ، حدیث 769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492

صلی اللہ علیہ وسلم نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا تو مشرکوں نے کہا: اس رحیم کو تو ہم پہچانتے ہیں تو یہ رحمن کون ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا: کیا ہے ہمیں کہ ہم قرآن کریم میں ایک اسم نہیں سنتے حالانکہ وہ تورات میں کثیر ہے۔ اور ان کی مراد رحمن ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور طلحہ بن مصرف نے اَیًّا مَنْ تَدْعُوْ فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى قرأت کی ہے، یعنی اسماء جو افضل اوصاف اور اشرف معانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور اسماء کا حسین ہونا شرع کی تحسین کی طرف متوجہ کرتا ہے، کیونکہ یہ آیت مطلق ہے اور اس پر نص ہے۔ اور اس کی طرف منسوب ہونا شریف اور خوبصورت معانی کا تقاضا کرتا ہے، اور یہ توقیف کے ساتھ ہے قرآن کریم یا حدیث یا اجماع کی توقیف کے بغیر محض نظر و فکر سے اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم وضع کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اسے ''الکتاب الاسنٰی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی'' میں بیان کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس کے سبب نزول میں پانچ مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایک وہ قول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے بارے بیان کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں روپوش تھے، اور جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تو بلند آواز سے قرآن کریم پڑھتے، اور جب مشرکین نے اسے سنا تو انہوں نے قرآن کریم، جس نے اسے نازل کیا اور جو اسے لے کر آیا تمام کے لئے غلیظ الفاظ استعمال کئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ (اور بلند آواز سے نماز نہ پڑھو) کہ مشرک آپ کی قرأت سنیں۔ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اور نہ اپنے اصحاب سے اسے چھپاؤ، یعنی آپ انہیں قرآن سنائیں اور بہت زیادہ آواز بلند نہ کریں۔ وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا فرمایا: آپ بلند آواز اور بالکل آہستہ آواز کے درمیان پڑھیے (1)، اسے امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ اور یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ اور المخافتة کا معنی آواز کو پست کرنا اور ساکن ہونا ہے) میت جب ٹھنڈی ہو جائے تو کہا جاتا ہے: خفت (وہ ساکن ہو گیا)۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لم یبق إلا نَفَس خافت و مُقْلَةٌ إنسانها باهت
رَثَّ لها الشامت مما بها یا وَیْحَ مَنْ یَرْثِی له الشامت

(۲) دوسرا وہ قول ہے جو امام مسلم نے ہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے بارے میں نقل کیا ہے ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دعا کے بارے میں نازل فرمائی ہے (2)۔

(۳) ابن سیرین نے کہا ہے: اعرابی لوگ اپنے تشہد بلند آواز سے پڑھتے تھے تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (3)۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر یہ آیت تشہد کو مخفی پڑھنے کو متضمن ہوگی، حالانکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تشہد کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 183۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، التوسط فی القرأۃ فی الصلوٰۃ الجهریۃ، جلد 1، صفحہ 183
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492

مخفی پڑھنا سنت سے ثابت ہے؛ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۴) یہ بھی حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آہستہ آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے پڑھتے تھے، تو اس بارے میں دونوں سے پوچھا گیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: بلاشبہ میں اپنے رب کی مناجات کرتا ہوں، اور وہ میری حاجت کو خوب جانتا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شیطان کو بھگاتا ہوں اور سونے والوں کو بیدار کرتا ہوں پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: تھوڑا سا آواز کو بلند کرلو، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: تم تھوڑا سا اپنی آواز کو پست کرلو؛ اسے طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے(1)۔

(۵) یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے آپ دن کی نماز میں بلند آواز سے قرأت نہ کریں، اور رات کی نماز میں آہستہ آواز سے قرأت نہ کریں(2)؛ اسے یحییٰ بن سلام اور زہراوی نے ذکر کیا ہے۔ پس یہ آیت نوافل اور فرائض میں قرأت بالجہر اور قرأت بالسر کے احکام کو متضمن ہے، پس رہے نوافل تو نمازی کو رات اور دن کے وقت آہستہ اور بلند آواز سے قرأت کرنے میں اختیار دیا گیا ہے، اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ دونوں امر اکٹھے کر لیتے تھے۔ اور جہاں تک فرائض کا تعلق ہے تو رات اور دن کے وقت قرأت کے بارے میں ان کا حکم معلوم ہے۔

(۶) حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تو اپنی نماز میں دکھاوا نہ کر کہ اعلانیہ میں تو انہیں خوب اچھا کرے اور سری نمازوں میں بھی تو انہیں خراب نہ کرے(3) (یعنی سری اور جہری دونوں قسم کی نمازوں میں بغیر کسی ریاکاری کے خشوع وخضوع قائم رہے اور قرأت خوب اچھی رہے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز نہ پڑھ اور نہ لوگوں کے خوف سے اسے چھوڑ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں قرأت کو صلوٰۃ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جیسا کہ اپنے اس ارشاد میں نماز (صلوٰۃ) کو قرأت کے ساتھ تعبیر کیا ہے: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (الاسراء) کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے، کیونکہ نماز قرأت، رکوع اور سجود پر مشتمل ہوتی ہے پس یہ قرأت من جملہ اس کے اجزاء میں سے ہے، اور جملہ کو جز سے تعبیر کرنا اور جز کو جملہ سے تعبیر کرنا مجازاً یہ عربوں کی عادت ہے اور یہ کثیر ہے، اور اسی معنی میں صحیح حدیث بھی ہے: قسمتُ الصلوٰۃ بینی وبین عبدی(4) یعنی قرأت فاتحہ کو میں نے اپنے درمیان اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۝

"اور آپ فرمائیے: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا اور نہیں ہے جس کا کوئی

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 214　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492　　3۔ ایضاً

4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، وجوب القراۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، جلد 1، صفحہ 170

شریک حکومت وفرمانروائی میں اور نہیں ہے اس کا کوئی مددگار درماندگی میں اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجہ کی بڑائی۔"

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا یہ آیت یہود و نصاریٰ اور عربوں کے مختلف اقوال کا رد کر رہی ہے(1): کہ حضرت عزیر، حضرت عیسیٰ اور ملائکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذریت اور اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ایسے اقوال سے پاک اور برتر ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ چونکہ وہ واحد و یکتا ہے لہٰذا اس کی حکومت اور اس کی عبادت میں کوئی شریک نہیں۔ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس نے کسی کو حلیف نہیں بنایا اور نہ کسی کی مدد چاہی ہے، یعنی اس کا کوئی مددگار نہیں جو اسے درماندگی سے پناہ دیتا ہو کہ وہ اس کا دفاع کرنے والا ہو۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہود و نصاریٰ میں سے اس کا کوئی ولی اور مددگار نہیں کیونکہ وہ لوگوں میں سے ذلیل ترین ہیں (2)، (گویا) یہ ان کے اس قول کا رد ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) (ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔) اور حسن بن فضل نے کہا ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ یعنی وہ (کمزور) اور درماندہ نہیں کہ وہ کسی ولی اور مددگار کا محتاج ہو اور نہ اس کی عزت و کبریائی کے لئے کوئی ناصر اور معاون ہے۔ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا یعنی مکمل طور پر اس کی عظمت و بڑائی بیان کرو۔ اور کہا جاتا ہے: عرب کلام میں تعظیم واجلال کے معنی میں بلیغ ترین الفاظ اللہ اکبر ہیں، یعنی اس کا وصف اس سے بیان کرو کہ وہ ہر شی سے بڑا اور عظیم ہے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

رأیتُ اللہ اکبر کل شیٔ　　محاولة و أکثرھم جنودا

میں نے یقین کیا کہ اللہ تعالیٰ ازروئے قصد وارادہ کے ہر شے سے بڑا اور عظیم ہے اور ازروئے لشکر کے سب سے زیادہ اور کثیر ہے۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں شروع ہوتے تھے تو کہتے: اللہ اکبر (3) اور یہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بندے کا اللہ اکبر کہنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور یہی آیت تورات کا خاتمہ ہے۔ مطرف نے عبداللہ بن کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا تورات کا آغاز سورۃ الانعام کے آغاز (یعنی پہلی آیت) سے ہے اور اس کا اختتام اس سورت کے خاتمہ کے ساتھ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ عزت اور غلبے والی آیت ہے؛ اسے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبدالمطلب میں سے جب کوئی بچہ فصیح بولنے لگتا تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 293-292　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 282

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، رفع الیدین إذا قام من الرکعتین، جلد 1، صفحہ 102

آپ اسے یہ آیت سکھا دیتے تھے وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ الآیہ۔ اور عبد الحمید بن واصل نے کہا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جس نے وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ اس کے لئے زمین اور پہاڑوں کی مثل اجر لکھ دے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے فرماتا ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ (مریم) (قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو حکم ارشاد فرمایا جس نے آپ سے قرض کے بارے شکایت کی کہ وہ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ آخر سورۃ تک پڑھے اور پھر تین بار یہ کہے۔ توکلتُ علی الحی الذی لایموت (1)۔

1۔ تفسیر ابو اللیث، جلد 2، صفحہ 287

سورۃ الکہف

آیاتہا ۱۱۰ ۱۸ سورۃ الکہف مکیۃ ۶۹ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمام مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ اور ایک جماعت سے مروی ہے کہ یہ سورت ابتدا سے لے کر قول باری تعالیٰ جُرُزًا ⊙ تک مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، لیکن پہلا قول اصح ہے۔ اور اس کی فضیلت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جس نے یہ سورت پڑھی اسے زمین و آسمان کے درمیان نور عطا کیا جائے گا اور اس کے سبب اسے قبر کے فتنہ سے بچا لیا جائے گا (1)۔ اور اسحاق بن عبد اللہ بن ابی فروہ نے بیان کیا ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہاری ایسی سورت پر راہنمائی نہ کروں جسے ستر ہزار فرشتوں نے منزل تک پہنچایا اور اس کی عظمتوں نے زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیا (اور) اس کی تلاوت کرنے والے کے لئے بھی اسی کی مثل ہے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سورت اصحاب الکہف ہے جس نے جمعہ کے دن اسے پڑھا تو دوسرے جمعہ تک اور مزید تین دنوں تک اس کی مغفرت کر دی جائے گی اور اسے ایسا نور عطا کیا جائے گا جو آسمان تک پہنچے گا اور فتنہ دجال سے اسے بچا لیا جائے گا۔'' اسے ثعلبی نے اور مہدوی نے بھی اسی معنی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور مسند دارمی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: جس نے جمعہ کی رات سورۃ الکہف پڑھی تو اس نے اپنے درمیان اور بیت عتیق کے درمیان ایک نور روشن کر لیا (2)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ (3) سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۃ الکہف کے شروع سے دس آیات یاد کر لیں اسے دجال سے بچا لیا جائے گا۔'' اور ایک روایت میں ہے ''سورۂ کہف کے آخر سے'' اور مسلم میں نواس بن سمعان کی حدیث بھی ہے ''جو کوئی دجال کو پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔'' اور اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ کہا ہے: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۃ الکہف کی دس آیات یاد پڑھیں فتنہ دجال اسے ضرر اور نقصان نہیں دے گا (4)''۔ اور جس نے ساری سورت پڑھی وہ جنت میں داخل ہوگا۔

1۔ الجواہر الحسان، جلد 2، صفحہ 286

2۔ السنن الکبری، للبیہقی، کتاب الجمعہ، ما یؤمر بہ فی لیلۃ الجمعہ، جلد 3، صفحہ 249

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل للقرآن، فضل سورۃ الکہف، جلد 1، صفحہ 271

4۔ ایضاً، کتاب الفتن، ذکر دجال، جلد 2، صفحہ 401

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی، (اور معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے تاکہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بے شک ان کے لئے بہت عمدہ جزا ہے۔ وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد''۔

قولہ تعالیٰ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہود کے علماء کی طرف بھیجا اور انہوں نے ان دونوں کو کہا: تم ان سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں پوچھو ان کے پاس جا کر آپ کی کیفیت اور حالت بیان کرو اور آپ کے قول کے بارے انہیں اطلاع کرو، کیونکہ ان کے پاس پہلی کتاب ہے اور ان کے پاس انبیاء علیہم السلام کے بارے وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، پس وہ دونوں نکلے یہاں تک کہ مدینہ طیبہ پہنچ گئے، اور انہوں نے یہودیوں کے علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے پوچھا، اور ان کے سامنے آپ کے معاملہ کو بیان کیا، اور آپ کے بعض اقوال کے بارے انہیں مطلع کیا، اور انہوں نے انہیں کہا: بلاشبہ تم اہل تورات ہو ہم تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تم ہمیں ہمارے اس صاحب کے بارے میں کچھ آگاہ کرو۔ تو یہودی علماء نے انہیں کہا: تم ان سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھو ہم تمہیں ان کے بارے بتاتے ہیں پس اگر انہوں نے تمہیں ان کے بارے خبر دے دی تو پھر وہ نبی مرسل ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ جھوٹ گھڑنے والا آدمی ہے، پھر تم اس بارے میں اپنی رائے دیکھ لو، تم ان سے ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھو جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں، ان کا معاملہ کیا تھا؟ کیونکہ ان کا واقعہ بہت عجیب بات ہے۔ اور پھر تم اس سے اس گھومنے اور چکر لگانے والے آدمی کے بارے میں پوچھو جو زمین کے مشارق و مغارب تک پہنچا، اس کی خبر کیا ہے؟ اور پھر تم اس سے روح کے بارے سوال کرو، وہ کیا ہے؟ پس جب تمہیں ان کے بارے بتا دے تو تم اس کی اتباع کرو کیونکہ وہ نبی ہے، اور اگر وہ نہ بتائے تو وہ محض جھوٹا آدمی ہے پھر تم اس کے بارے میں جو چاہو کرو۔ پس نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط دونوں قریش کے پاس مکہ مکرمہ آگئے اور آکر بتایا: اے گروہ قریش! تحقیق ہم تمہارے پاس ایسی چیز لائے ہیں جو تمہارے درمیان اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان فرق اور جدائی کر دے گی...... تحقیق ہمیں یہودی علماء نے حکم دیا ہے کہ ہم ان سے چند چیزوں کے بارے سوال کریں جن کے بارے انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے، پس اگر وہ تمہیں ان کے بارے خبر دے دیں تو وہ نبی ہیں، اور اگر نہ دیں تو وہ جھوٹا آدمی ہے، اور تم

اس بارے میں اپنی رائے دیکھ لو، چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ان جوانوں کے بارے میں بتائیے جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں۔ تحقیق ان کا قصہ بڑا عجیب ہے، اور اس آدمی کے بارے بتائیے جو چکر کاٹتا رہا یہاں تک کہ زمین کے مشارق و مغارب تک جا پہنچا، اور ہمیں روح کے بارے بتائیے وہ کیا ہے؟

راوی کا بیان ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''جو کچھ تم نے پوچھا ہے میں اس کے بارے کل تمہیں بتاؤں گا۔'' اور آپ نے ان شاء اللہ تعالیٰ نہ کہا۔ پس وہ آپ سے واپس چلے گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں پندرہ راتوں تک ٹھہرے رہے، انتظار کرتے رہے جو وہ گمان کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کی طرف کوئی وحی نہ بھیجی اور نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، یہاں تک کہ اہل مکہ لوگوں کو بھڑکانے کے لئے بری خبریں اڑانے لگے اور کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا، اور آج پندرہ راتیں گزر چکی ہیں، اور ہم نے صبح اس حال میں کی ہے کہ انہوں نے ہمیں ان چیزوں کے بارے کوئی خبر نہیں دی جن کے بارے ہم نے ان سے سوال کیا تھا، یہاں تک کہ وحی کے رکنے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غمزدہ کر دیا، اور آپ پر اس کے بارے اہل مکہ کی گفتگو گراں گزرنے لگی، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے سورۂ اصحاب کہف لے کر حاضر ہوئے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر غمزدہ ہونے کی وجہ سے عتاب بھی کیا گیا، اور اس کے بارے آپ کو خبر بھی دی گئی جو انہوں نے آپ سے جوانوں، گھومنے والے آدمی (1)، اور روح کے بارے پوچھا تھا۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: میرے سامنے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو فرمایا: اے جبرائیل! تو مجھ سے رک گیا یہاں تک کہ برا گمان کیا جانے لگا''۔ تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو عرض کی: وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ (مریم) (اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے، اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔) پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی حمد اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذکر کے ساتھ سورت کا آغاز کیا، کیونکہ انہوں نے اسی سے متعلق آپ کا انکار کیا تھا پس ارشاد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے (محبوب) بندے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب نازل فرمائی، بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف سے رسول ہیں، یعنی یہ اس کی تحقیق ہے جو انہوں نے آپ سے آپ کی نبوت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا (اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا بھی) یعنی معتدل ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ تاکہ ڈرائے دنیا میں اس جلدی آنے والی سزا سے اور آخرت میں عذاب الیم سے، یعنی (وہ سزا اور گرفت) آپ کے اس رب کی طرف سے ہوتی ہے جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا۔ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ یعنی وہ دار الخلد (ہمیشہ رہنے والا گھر) ہے وہ اس میں نہیں مریں گے، وہ لوگ جنہوں نے اس بارے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 221-220

آپ کی تصدیق کی جو آپ لے کر آئے ان امور میں سے جن کے سبب غیروں نے آپ کو جھٹلایا، اور انہوں نے اعمال میں سے ان پر عمل کیا جن کے بارے آپ نے انہیں حکم دیا۔

وَيُنْذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا یعنی قریش کو ان کے اس قول سے ڈرایا: بے شک ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ (نہ انہیں اللہ کی (ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو) جنہوں نے اپنے فراق اور جدائی کو اور اپنے دین کے عیب اور نقص کو بڑا کر دیا۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ (کتنی بڑی ہے وہ بات جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے)۔ مراد ان کا یہ قول ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔ تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ اس قرآن کریم پر ایمان نہ لائے افسوس کرتے ہوئے)۔ یعنی اپنے آپ کو ان پر اس وقت غمزدہ کرتے ہوئے جب وہ چیز حاصل نہ ہو جس کی وہ آپ سے امید رکھتے ہیں (آپ اپنی جان کو ضائع کر دیں گے) ایسا ہرگز نہ کریں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: بَاخِعٌ نَفْسَكَ یعنی کیا آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے؟ (مُهلك نفسك) یہ ابو عبیدہ نے مجھ سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح ذوالرمہ نے بھی کہا ہے:

أَلَا أَيُّهذا الباخِعُ الوَجْدُ نفسه بشئٍ نَحَتْه عن يَدَيْه المقادِرُ(1)

اور اس کی جمع باخعون اور بَخَعة ہے۔ اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے اور عرب کہتے ہیں: قد بَخَعْتُ له نُصْحِي و نفسي، یعنی میں نے اس کے لئے پوری کوشش کی۔ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔) ابن اسحاق نے کہا ہے: یعنی ان میں سے کون ہے جس نے میرے حکم کی اتباع کی ہے اور میری اطاعت کرتے ہوئے عمل کیا ہے۔ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا (اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان، غیر آباد۔) یعنی زمین، اور بے شک جو کچھ اس پر ہے وہ فناہ ہونے والا اور ختم ہو جانے والا ہے، اور بلاشبہ لوٹنا میری طرف ہی ہے اور میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دوں گا، پس آپ پریشان نہ ہوں اور نہ وہ آپ کو غمزدہ کرے جو آپ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الصعيد سے مراد سطح زمین ہے، اور اس کی جمع صُعُد ہے۔

ذوالرمہ چھوٹے ہرن کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

كأنه بالضُّحا ترمي الصعيدَ به دبابةٌ في عِظام الرأس خُرْطوم

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔ اور الصعيد کا معنی الطريق (راستہ) بھی ہے، تحقیق حدیث میں آیا ہے: اياكم

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 284

والقعود علی الصُّعُدات (1) (راستوں پر بیٹھنے سے بچو) اور الجرز سے مراد وہ زمین ہے جو کوئی شے نہ اگاتی ہو، اور اس کی جمع أجراز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: سَنَةٌ جُرُزٌ اور سِنُون أجرازٌ اور یہ وہ سال ہوتے ہیں جن میں کوئی بارش نہ ہو۔ اور ان میں قحط سالی، خشکی اور سختی ہو۔

ذوالرمہ نے اونٹ کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

طَوَى النحز والإجراز ما فی بطونها　فما بقیت إلا الضلوع الجراشِع

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر اللہ تعالیٰ نے ان نوجوانوں کی خبر کے بیان کی طرف توجہ فرمائی جن کے بارے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا۔ پس ارشاد فرمایا: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں۔) یعنی تحقیق میری وہ نشانیاں جو میں نے اپنے بندوں میں رکھی ہیں وہ میری ان حجتوں اور دلائل میں سے ہیں جو اس سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ کتاب اور تحریر ہے جو ان کی خبر کے بارے لکھی گئی اور اس کی جمع رُقُم ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

و مُسْتَقَرّ المصحف المُرَقَّمِ

(لکھا ہوا مصحف رکھنے کی جگہ) اور یہ شعر بحر رجز کے قصیدہ میں سے ہے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر فرمایا: اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۝ ((یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں پھر انہوں نے دعا مانگی: اے ہمارے رب! ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لئے اس کام میں ہدایت۔ پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔) پھر فرمایا: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ (اے حبیب!) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک) یعنی سچی خبر بیان کرتے ہیں۔ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ (بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا: ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔) یعنی انہوں نے میرے ساتھ شرک نہیں کیا جیسا کہ تم نے میرے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے بارے تمہیں علم نہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الشَّطَط کا معنی غلو کرنا اور حق سے تجاوز کرنا ہے۔

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الادب، الجلوس علی الصعید، جلد 8، صفحہ 119، حدیث 12935

جیسا کہ اعشٰی [بنی] قیس بن ثعلبہ نے کہا ہے:

أتنتهون ولا ينهى ذوي شطط　　كالطعن يذهب فيه الزيت والفتل

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ (یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا، کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو۔) ابن اسحاق نے کہا ہے: یعنی ایسی حجت جو کامل اور بلیغ ہو۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾ وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ (ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۔ اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اس کام میں آسانیاں۔ اور جو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے۔ اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں۔) ابن ہشام نے کہا ہے: تزاور کا معنی تمیل مائل ہونا (ایک طرف ہونا) اور یہ الزور سے ماخوذ ہے۔

اور ابو الزحف کلیبی نے شہر کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

جدب المندى عن هوانا أزور　　ينضي المطايا خمسه العشنزر

اور یہ دونوں بیت اس کے ارجوزہ میں ہیں۔ اور تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وہ اپنی بائیں جانب سے ان کے پاس سے گزر جاتا ہے اور انہیں چھوڑ دیتا ہے۔

جیسا کہ ذو الرمہ نے کہا ہے:

إلى ظعن يقرضن أقواز مشرف　　شمالا و عن أيمانهن الفوارس

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔ اور الفجوۃ سے مراد کشادہ جگہ ہے۔ اور اس کی جمع الفجاء ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ألبست قومك مخزاة و منقصة　　حتى أبيحوا و حلوا فجوة الدار

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ((سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔)

یعنی یہ ان پر حجت اور دلیل ہے اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کے امور میں سے اسے پہچانا جنہوں نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ سے ان کے بارے پوچھیں (کہ) ان کے بارے خبر کی تحقیق آپ کی نبوت کی صداقت کی علامت ہے۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ((حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائے گا اس سے کوئی مددگار (اور) راہنما، اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر۔) ابن ہشام نے کہا ہے: الوصید کا معنی دروازہ ہے۔

عبسی نے کہا ہے اور اس کا نام عبد بن وہب ہے:

بأرضِ فلاةٍ لا يُسَدُّ وَصِيدها　　عليَّ و معروفي بها غير منكرِ

اور یہ شعر اس کے اشعار میں ہے۔ اور الوصید کا معنی فناء بھی ہے، (یعنی صحن، گھر کے سامنے کھلی جگہ) اور اس کی جمع وصائد، وُصُد اور وُصْدان ہے۔ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝ وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ۝ إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَن تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ۝ وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ ۖ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۖ رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو...... کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر) یعنی جو ان میں سے اہل سلطنت اور حکمران تھے۔ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا (کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔) سَيَقُولُونَ (کچھ کہیں گے) یعنی وہ یہودی علماء جنہوں نے انہیں ان کے بارے سوال کرنے کا حکم دیا۔ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ (کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ کہیں گے: وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے: (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی، سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں)۔ یعنی تم ان کے بارے میں اختلاف نہ کرو۔ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا (بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے۔ اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔) کیونکہ انہیں ان کے بارے کوئی علم نہیں ہے۔ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ۝ (ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنے والا ہوں کل، مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے۔ اور یاد کرا پنے رب کو جب تو بھول جائے۔ (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ) یعنی کسی چیز کے متعلق ہرگز نہ کہنا جس کے بارے وہ آپ سے پوچھیں جیسے تم نے اس بارے میں کہا کہ میں تمہیں کل خبر دوں گا، اور ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور کہیئے۔ اور اپنے

رب کا ذکر کیجئے جب آپ بھول جائیں اور کہیئے: قریب ہے میرا رب اس خبر کے بارے میری راہنمائی فرمادے جس کے بارے تم نے مجھ سے پوچھا ہے ہدایت کی راہ، کیونکہ آپ نہیں جانتے جو کچھ میں اس بارے میں کرنے والا ہوں۔ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا (اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال)۔ یعنی عنقریب وہ یہ کہیں گے۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ٞ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (آپ فرمایئے: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اسی کے لئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا، وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے، نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست، اور نہیں وہ شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو) یعنی اس پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہیں جس کے بارے انہوں نے آپ سے پوچھا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصحاب کہف کی خبر کے بارے یہ سیرت میں واقع ہے جسے ہم نے ترتیب کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ اور ذوالقرنین کا واقعہ آگے آرہا ہے، پھر ہم سورت کے آغاز کی طرف لوٹتے ہیں اور کہتے ہیں: تحقیق اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور اخفش، کسائی، فراء، ابو عبید اور جمہور متاولین نے یہ خیال کیا ہے کہ اس سورت کے آغاز میں تقدیم و تاخیر ہے، اور اس کا معنی یہ ہے: الحمد لله الذی أنزل علی عبده الکتاب قیما ولم یجعل له عوجا۔ (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے محبوب بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی درآنحالیکہ یہ (معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے اور اس میں ذرا کجی نہیں پیدا ہونے دی) اور قَیِّمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: کلام بغیر تقدیم و تاخیر کے اپنے سیاق پر ہے، اور اس کا معنی ہے: ولم یجعل له عوجا ولکن جعلناه قیما (اور اس میں ذرا کجی نہیں پیدا ہونے دی لیکن ہم نے اسے درست کرنے والا بنایا۔)

اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں حسن ہے (وہ یہ) کہ قَیِّمًا کا معنی مستقیم ہے، یعنی یہ کتاب سیدھی اور صحیح حکمت کو بیان کرنے والی ہے اس میں کوئی خطا نہیں، نہ اس میں فساد ہے اور نہ کوئی تناقض ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَیِّمًا درست قرار دینے والی ہے سابقہ کتابوں کو (کیونکہ یہ) ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَیِّمًا یعنی یہ ہمیشہ دلائل کے ساتھ درست قرار دینے والی ہے۔ عِوَجًا مفعول بہ ہے۔ اور العِوج (عین کے کسرہ کے ساتھ) یعنی دین، رائے، حکم، اور طریق (انداز) میں پائی جانے والی کجی کو کہا جاتا ہے۔ اور عین کے فتحہ کے ساتھ اجسام مثلاً لکڑی اور دیوار وغیرہ میں پائی جانے والی کجی اور ٹیڑھے پن کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور قرآن کریم میں کوئی عوج یعنی عیب نہیں ہے، یعنی اس میں کوئی تناقض اور اختلاف نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾ (النساء) (اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی اسے مخلوق نہیں بنایا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ میں روایت کیا گیا ہے قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ (الزمر: 28) آپ نے

فرمایا: غیر مخلوق۔ اور مقاتل نے کہا ہے: عِوَجًا کا معنی اختلاف ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أدوم بودی للصدیق تکرما ولا خیر فیمن کان فی الود أعوجا

لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا یعنی تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کریم ڈرائے سخت گرفت سے۔ اور اس میں اضمار ہے، یعنی تاکہ (آپ یا قرآن کریم) کافروں کو اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرائے۔ اور یہ شدید عذاب کبھی دنیا میں ہوتا ہے اور کبھی آخرت میں ہوتا ہے۔ مِّنْ لَّدُنْهُ یعنی من عندہ۔ (اس کی جانب سے ہے) ابو بکر نے عاصم من لدنہ کو دال کے اسکان اور اسے ضمہ کے ساتھ اشمام کرنے اور نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور ہا کو یا کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور باقیوں نے لَدُنْهُ دال کے ضمہ، نون کے اسکان اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اور لَدُنْ میں تین لغات ہیں: لَدُنْ، لَدَی اور لَدْ اور کہا ہے: مِنْ لَدُ لِحْیَیْهِ الی مُنْحُورہ

المُنْحُور لغوی طور پر النَّحَر (نتھنے) کے معنی میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ، ای بأن لھم (اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کے بدلے ان کے لئے ہوگی اَجْرًا حَسَنًا (بہت عمدہ جزا) اور وہ جنت ہے۔ مّٰكِثِیْنَ وہ ہمیشہ رہیں گے۔ فِیْهِ اَبَدًا یعنی اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اگر تو بشارت دینے کو بیان پر محمول کرے تو پھر اَنَّ میں با کی ضرورت نہیں۔ اور اجر حسن سے مراد وہ عظیم ثواب ہے جو جنت تک پہنچا دے گا۔

وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۟ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

"اور تاکہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ نہ انہیں اللہ (کی ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو، کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے، وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔"

قولہ تعالیٰ: وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے کہا: حضرت عزیز اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور عیسائیوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور قریش نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ سورت کے آغاز میں ڈرانے کا ذکر عام ہے، اور یہ ان کے بارے میں خاص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، مِنْ صلہ ہے، یعنی انہیں اس قول کے بارے کوئی علم نہیں، کیونکہ وہ مقلد ہیں اور انہوں نے بغیر دلیل کے یہ کہہ دیا ہے: وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ اور نہ ان کے اسلاف کو (کوئی علم ہے)۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً، كَلِمَةً بیان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی از روئے قول کے وہ بات بہت بڑی ہے۔ حسن، مجاہد، یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ نے كَلِمَه (1) کو رفع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 496

کے ساتھ پڑھا ہے؛ أی عظمت کلمۃً۔ (وہ بات بہت بڑی ہے) مراد ان کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا بنالیا ہے۔ اور اس قرأت کی بنا پر اضمار کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے: کبر الشئ جب کوئی شے عظیم ہو جائے۔ اور کبر الرجل جب آدمی عمر رسیدہ ہو جائے۔ تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے) یہ صفت کے محل میں ہے۔ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۝

''تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ، بَاخِعٌ اس کا معنی ہے ہلاک کرنے والا اور قتل کرنے والا اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اٰثَارِهِمْ یہ أثر کی جمع ہے، اور کہا جاتا ہے: إثر (پیچھے) اور اس کا معنی ہے آپ سے ان کے اعراض کرنے اور ان کے پیٹھ پھیرنے کے پیچھے (کیا آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے)۔ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اگر وہ اس قرآن کریم پر ایمان نہ لائے۔ اَسَفًا یعنی ان کے کفر پر افسوس اور غصہ کرتے ہوئے اور یہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

''بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا، مَا اور زِیْنَةً یہ دونوں مفعول ہیں۔ اور الزینۃ سے مراد ہر وہ شی ہے جو سطح زمین پر ہے، پس یہ عام ہے، کیونکہ ہر شی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ آپ نے زینۃ سے مراد رجال (مرد) لئے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زینت سے مراد خلفاء اور امراء ہیں (1)۔ اور ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا کے بارے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: علماء زمین کی زینت ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس سے نعمتیں، لباس، پھل، سبزیاں، پانی اور اسی طرح کی اور چیزیں جو اس میں زینت کا باعث ہیں وہ مراد لی ہیں، اور اس میں بہرے پہاڑ اور ہر وہ شے جس میں زینت نہیں مثلاً سانپ اور بچھو وغیرہ یہ داخل نہیں ہیں۔ اور عموم کے بارے قول کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے، اور یہ کہ ہر وہ شے جو زمین پر ہے وہ اس میں اپنی خلقت، صنعت، اور اپنی پختگی کے اعتبار سے زینت ہے۔ اور آیت تسلی اور اطمینان دلانے کے لئے بیان کی گئی ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ دنیا اور اہل دنیا کے لئے غمزدہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 496

پریشان نہ ہوں کیونکہ ہم نے اسے دنیا والوں کے لئے امتحان اور آزمائش بنا دیا ہے، پس ان میں سے کچھ تدبر اور غور و فکر کر کے ایمان لے آئیں گے، اور ان میں سے کچھ کفر بھی کریں گے، پھر قیامت کے دن (وہ سب) ان کے سامنے ہوگا پس ان کا کفر اور انکار آپ پر گراں اور شاق نہ گزرے کیونکہ ہم انہیں ان کے کئے کی سزا اور بدلہ دیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کا معنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں دیکھا جا سکتا ہے: ''بے شک دنیا سرسبز و شیریں ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں خلیفہ اور نائب بنانے والا ہے پس وہ دیکھتا ہے تم کیسے عمل کرتے ہو (1)؟'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک زیادہ خوف دلانے والی وہ شے جس کے بارے میں تم پر خوف اور اندیشہ محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا کی رونق و خوشحالی (زھرة الدنيا) کو ظاہر کر دے گا۔'' پوچھا: زھرة الدنيا کیا ہے؟ فرمایا: ''دنیا کی برکتیں (2)'' ان دونوں روایتوں کو امام مسلم وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا اپنے ذائقہ میں بڑی لذیذ اور شیریں ہے اور اپنے دکھائی دینے میں بڑی عمدہ اور خوش کرنے والی ہے گویا یہ اس پھل کی طرح ہے جو بڑا میٹھا اور شیریں ہو اور دیکھنے میں بڑا خوبصورت ہو، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ از روئے عمل کے حسین کون ہے؟ یعنی کون اس میں زیادہ زھد اختیار کرنے والا اور اسے زیادہ چھوڑنے والا ہے اور بندوں کے لئے اس چیز سے بغض رکھنے اور اسے ناپسند کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے مزین اور آراستہ کیا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس بارے میں بندے کی مدد اور معاونت فرمائے''۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کہتے تھے جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے: اے اللہ! بے شک ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر اس کی کہ ہم اس سے فرحت و سرور حاصل کریں جسے تو نے ہمارے لئے آراستہ اور مزین فرمایا ہے، اے اللہ! بلاشبہ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ میں اسے اس کے حق میں خرچ کروں۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ اسے اس کے حق میں خرچ کرنے پر آپ کی مدد فرمائے۔ اور یہی معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ہے: ''پس جس نے اسے طیب نفس کے ساتھ پالیا اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی اور جس نے اسے نفس کی حرص اور طمع کے ساتھ لیا تو وہ اس کی طرح ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا (3)''۔ اور اسی طرح دنیا کو کثرت سے اکٹھا کرنے والا ہے کہ وہ اس پر قناعت نہیں کرتا جو اسے دنیا میں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کا ارادہ اسے جمع کرنے کا ہوتا ہے، اور یہ چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے؛ کیونکہ فتنہ اور آزمائش اس کے ساتھ لاحق ہو جاتے ہیں اور محفوظ اور سلامت نہ ہونا غالب ہوتا ہے، تحقیق کامیاب اور فلاح پانے والا وہ ہے جس نے اسلام قبول کیا گزارے کے لائق روزی حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قناعت عطا فرما دی جو اس نے اسے عطا کیا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے والد محترم قول باری تعالیٰ: اَحْسَنُ عَمَلًا کے بارے میں کہتے تھے: احسن عمل ایمان کے ساتھ حق کو پکڑنا اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والتوبة، فی قصة اصحاب النار الثلاثة، جلد 2، صفحہ 353

ایضاً، ابن ماجہ، باب فتنة النساء، حدیث نمبر 3989، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، التحذیر من الاغترار بزینة الدنیا، جلد 1، صفحہ 336

3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم اسلام آباد

حق میں خرچ کرنا ہے، فرائض کو ادا کرنا ہے اور محارم سے اجتناب کرنا ہے مندوبات کو کثرت سے کرنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اچھا ہے، اپنے الفاظ میں مختصر ہے اور اپنے معنی میں بلیغ ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک لفظ میں جمع فرما دیا ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کو اس وقت ارشاد فرمایا جب انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے بارے میں مجھے ایسی بات ارشاد فرمائیے کہ میں آپ کے بعد اس کے بارے کسی سے سوال نہ کروں؟...... اور ایک روایت میں: غیرك (آپ کے سوا) کے الفاظ ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قل امنتُ باللہ ثم أستقم (1)۔ کہو میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا پھر اس پر استقامت اختیار کر لے؛ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اَحْسَنُ عَمَلًا کا معنی ہے ان میں سے دنیا میں زیادہ زاہد کون ہے؟ اور اسی طرح ابو عصام عسقلانی نے کہا ہے: اَحْسَنُ عَمَلًا کون اسے زیادہ چھوڑنے والا ہے؟ اور زہد کے بارے میں علماء کی عبارات مختلف ہیں، پس ایک قوم نے کہا ہے: امید (اور خواہش) کو کم کرنا اور یہ خشک اور سخت کھانا کھانے اور گدڑی پہننے سے حاصل نہیں ہوتا؛ یہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور سچ کہا ہے کہ بے شک وہ جس کی امید اور آرزو کم ہو جائے وہ عمدہ اور اعلیٰ کھانوں کو تلاش نہیں کرتا۔ اور نہ وہ قسم قسم کے عمدہ لباس پہنتا ہے، وہ دنیا سے وہ کچھ لے لیتا ہے جو اسے میسر آئے، اور وہ اس میں سے اتنی چیز پر اکتفا کرتا ہے جو اس کے معاملات حیات کو جاری رکھ سکتی ہو۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد محمدۃ (حمد) کو ناپسند کرنا اور ثنا (تعریف) کو پسند کرنا ہے۔ اور یہی قول امام اوزاعی اور ان کے پیروکاروں کا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: دنیا کو مکمل طور پر چھوڑ دینا زہد ہے۔ کیا اس نے اس کے چھوڑنے کو پسند کیا ہے یا ناپسند؟ اور یہی فضیل کا قول ہے۔ اور بشر بن حارث نے کہا ہے: دنیا کی محبت سے مراد لوگوں کی ملاقات کو پسند کرنا ہے، اور دنیا میں زہد اور بے رغبتی کا اظہار کرنے سے مراد لوگوں کی ملاقات سے دور رہنا ہے، اور حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی منقول ہے: دنیا میں زہد کی علامت لوگوں سے دور رہنا ہے اور ان سے احتراز برتنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کوئی زاہد زاہد نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ دنیا کو چھوڑنا اس کے نزدیک اسے لینے سے زیادہ پسندیدہ ہو؛ یہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: زہد یہ ہے کہ تو دنیا میں اپنے دل سے رغبت نہ رکھے؛ یہ ابن مبارک نے کہا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: زہد سے مراد موت کو پسند کرنا ہے۔ اور پہلا قول معنوی اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے پس وہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۟ؕ

"اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان، غیر آباد۔"

اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو سہل نے کہا ہے: ایسی زمین جس میں نباتات اور سبزہ نہ ہو، گویا کہ اس کا سبزہ کاٹ دیا گیا ہو۔ اور الجرز کا معنی قطع کرنا، کاٹ دینا ہے اور اس سے سنة جرز (وہ سال جس میں بارش نہ ہو اور قحط سالی ہو) ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جامع اوصاف الاسلام، جلد 1، صفحہ 48

راجز نے کہا ہے:

قد جَرَّ فتهنّ السِّنُونُ الأجْرازُ

(قحط والے سالوں نے انہیں ختم کر دیا)

اور الأرض الجُرُز وہ زمین ہے جس میں نباتات نہ ہو اور نہ اس میں آبادی وغیرہ میں سے کوئی شے ہو، گویا کہ اسے مکمل طور پر کاٹ دیا گیا ہو اور زائل کر دیا گیا ہو۔ مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس دن زمین ہموار ہوگی اس میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں الجرز سے مراد وہ زمین ہے جس میں سبزہ نہ ہو۔ کسائی نے کہا ہے: جُرِزَت الأرضُ تَجْرَزُ اور جرزها القوم يَجْرُزُونها جب وہ زمین میں اگنے والی ہر شے سبزہ اور کھیتی وغیرہ کھا جائیں تو یہ کہا جاتا ہے پس وہ زمین مجروزۃ اور جُرُز کہلاتی ہے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

"کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں"۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ جب أَمْ مذکور ہو اور اس سے پہلے ہمزہ استفہام نہ ہو تو وہ بمعنی بل اور ہمزہ استفہام کے ہوتا ہے، اور وہ ام منقطعہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ أَمْ کا عطف استفہام کے اس معنی پر ہے جو لعلك میں پایا جا رہا ہے، یا یہ ہمزہ استفہام انکاری کے معنی میں ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے خیال پر پختہ کرنا ہے کہ اصحاب کہف تعجب خیز تھے، اس معنی میں کہ وہ واقعہ اتنا بڑا اور عظیم نہیں ہے جتنا سوال کرنے والے کافروں نے آپ پر اسے بڑا قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ساری نشانیاں ان کے قصہ کی نسبت بڑی، عظیم، اور عام ہیں، یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد، قتادہ اور ابن اسحاق رضی اللہ عنہم کا ہے(1)۔ اور خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، کیونکہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھا جو گم ہوئے تھے، اور ذی القرنین اور روح کے بارے پوچھا اور اللہ تعالیٰ نے وحی مؤخر فرمادی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وحی نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا تم نے گمان کیا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں؟ یعنی وہ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں، بلکہ ہماری نشانیوں میں سے ایسی ہیں جو ان کے واقعہ اور خبر سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنا ان کے واقعہ سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے غیب میں سے جس پر آپ کو اطلاع دی ہے وہ زیادہ تعجب خیز ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سفر معراج میں آپ کی شان اس سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ ماوردی نے کہا ہے(2): کلام کا معنی نفی ہے، یعنی آپ یہ خیال نہ کرتے اگر ہم خبر نہ دیتے۔ ابوسہل نے کہا ہے: استفہام برائے تقریر ہے، یعنی آپ یہ خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ تعجب خیز ہیں۔ اور الکھف سے مراد پہاڑ میں کھلا سوراخ ہے اور جو وسیع اور کھلا نہ ہو تو وہ غار کہلاتا ہے۔ نقاش نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الکھف سے مراد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 497

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 286، مفہوم

پہاڑ ہے اور یہ لغت میں مشہور نہیں (1)۔

لوگوں نے الرقیم کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: قرآن میں موجود ہر شے کے بارے اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے سوائے چار کے، یعنی غِسلین، حنّان، الاوّاہ اور الرقیم۔ حضرت مرہ سے رقیم کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کعب کا خیال ہے کہ یہ وہ گاؤں ہے جس سے وہ اصحاب نکلے تھے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وادی ہے۔ اور حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ چٹان ہے جو اس غار پر تھی (2)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الرقیم وہ کتاب ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہم پر غالب کر دیا، لیکن اس کے واقعہ کی ہمارے سامنے وضاحت نہ کی۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ تحریر ہے جو تانبے کی تختی میں لکھی ہوئی تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تانبے کی ایک تختی میں قوم کفار نے ان نوجوانوں کا واقعہ لکھا تھا جو ان سے بھاگ گئے تھے اور انہوں نے اسے ان کی تاریخ بنا دیا، انہوں نے ان کے گم ہونے کا وقت ذکر کیا، ان کی تعداد ذکر کی کہ وہ کتنے تھے اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ اور اسی طرح فراء نے کہا ہے، انہوں نے بیان کیا ہے: رقیم تانبے کی ایک تختی ہے جس میں انکے اسماء، ان کے نسب، ان کا دین اور جس سے وہ بھاگ گئے تھے سب لکھا ہوا تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسی قوم تھے جو واقعات اور حوادثات کی تاریخ لکھتے تھے، اور یہ مملکت کی فضیلت ہے اور یہ مفید کام ہے۔ اور یہ اقوال الرقیم سے ماخوذ ہیں اور اسی سے ''کتاب مرقوم'' (لکھی ہوئی کتاب) ہے۔ اور اسی سے الأرقم (زہریلے سانپ) وہ اپنے اوپر سیاہ و سفید نشانات اور لکیروں کی وجہ سے کہلاتا ہے۔ اور اسی سے رقمہ الوادی ہے، یعنی وہ جگہ جہاں پانی چلے اور وہ اس میں اکٹھا ہو جائے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے وہ متناقض نہیں، کیونکہ پہلا قول انہوں نے حضرت کعب سے سنا ہے، اور دوسرے قول میں یہ جائز ہے کہ انہوں نے اس کے بعد رقیم کو پہچان لیا ہو۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اصحاب کہف کا ذکر کیا اور فرمایا: بے شک یہ چند نوجوان تھے جو گم ہو گئے، مفقود ہو گئے تو ان کے گھر والوں نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ انہیں نہ پا سکے تو انہوں نے اسے بادشاہ وقت کے پاس پیش کر دیا تو اس نے کہا: یقیناً ان کی کوئی خبر ہو گی، اور اس نے تانبے کی ایک تختی منگائی اور اس میں ان کے نام لکھ لئے اور اسے اپنے خزانہ (ریکارڈ) میں رکھ دیا، پس وہی تختی ہی رقیم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بادشاہ کے گھر میں دو مومن تھے پس ان دونوں نے ان نوجوانوں کی حالت، ان کے اسماء، اور ان کے انساب تانبے کی تختی میں لکھے اور پھر اسے تانبے کے ایک تابوت میں رکھ دیا اور اسے عمارت میں رکھ دیا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے: الرقیم لکھی ہوئی کتاب ہے جو ان کے پاس تھی اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں سے وہ شریعت تھی جس پر وہ عمل پیرا تھے اور اسے تھامے ہوئے تھے۔ اور نقاش نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ الرقیم سے مراد ان کے دراہم ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک اور شعبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ الرقیم سے مراد ان کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 497　2۔ ایضاً

کتابہ ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: الرقیم دوات ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ الرقیم سونے کی وہ تختی ہے جو اس دیوار کے نیچے تھی جسے حضرت خضر علیہ السلام نے سیدھا کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم سے مراد وہ غار والے ہیں جن پر وہ بند ہو گئی تھی، پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنے اصلح عمل کا ذکر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں معروف خبر ہے جسے صحیحین نے ذکر کیا ہے، اور اسی طرف امام بخاری بھی مائل ہیں۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے بارے تو خبر دی ہے، اور اصحاب رقیم کے بارے کسی شے کا ذکر نہیں کیا۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم روم کا ایک شہر ہے اس میں ایک غار ہے اس میں اکیس آدمی داخل ہوئے گویا وہ اصحاب کہف کی ہیئت پر سو گئے، پس اس قول کی بنا پر وہ دوسرے جوان تھے جن کو وہی کچھ پیش آیا جو اصحاب کہف کو پیش آیا۔ واللہ اعلم

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم فلسطین کے قریب ایک وادی ہے اور اس میں ایک وسیع غار ہے، اور یہ رقمۃ الوادی سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد پانی جمع ہونے کی جگہ ہے؛ کہا جاتا ہے: علیك بالرقمۃ و دع الضِّفَّة (جہاں پانی جمع ہے اس کو لازم پکڑو اور کنارہ کو چھوڑو) اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شام میں ایک غار ہے جیسا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے اور اس میں مردے ہیں، اس کے پڑوس والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں اور وہاں مسجد اور عمارت بنی ہوئی ہے اور اس عمارت کو الرقیم کہا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ایک بوسیدہ کتا بھی ہے۔ اور اندلس میں غرناطہ کی طرف اس کے قریب ایک گاؤں ہے اس کا نام گوشہ ہے اس میں ایک غار میں مردے ہیں اور ان کے ساتھ ایک بوسیدہ (ہڈیوں والا) ایک کتا بھی ہے، اور ان میں سے اکثر کا گوشت اتر چکا ہے اور بعض آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، حالانکہ کئی صدیاں گزر چکی ہیں اور ہم نے ان کی شان اور حالت جاننے کے بارے کوئی آثار نہیں پائے۔ اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اصحاب کہف ہیں، میں ان کے پاس داخل ہوا اور میں نے ان کے پاس ۵۰۴ھ لکھا ہوا دیکھا اور وہ اسی حالت میں تھے، اور وہاں ایک مسجد ہے، اور ان کے قریب ایک رومی عمارت ہے اس کا نام الرقیم ہے، گویا وہ ایک پرانا اور بوسیدہ محل ہے اس کی بعض دیواریں باقی ہیں، اور وہ زمین کے ایک جنگل میں ایک کھنڈر سا ہے، اور غرناطہ کے اوپر کی جانب جو کہ قبلہ کے ساتھ ملتی ہے پرانے رومی شہر کے آثار ہیں اس کو مدینہ دقیوس کہا جاتا ہے، ہم نے اس کے آثار میں عجیب و غریب قبریں اور اس طرح کی چیزیں دیکھی ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو اندلس میں ان کے متعلق دیکھنے کا ذکر کیا گیا ہے بلاشبہ وہ ان کے سوا ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کے حق میں فرماتا ہے: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝ (الکہف) (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس وقت کہا جب انہوں نے انہیں دیکھنے کا ارادہ کیا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے منع کیا ہے جو تم سے بہتر ہے (2)؛ عنقریب قصہ کے آخر میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 511
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 2، صفحہ 293

كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا کے بارے میں کہا ہے: وہ تعجب خیز ہیں (هم عَجَبٌ)۔ اسی طرح ابن جریج نے ان سے روایت کیا ہے، آپ اس طرف جا رہے ہیں کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا انکار نہیں ہے کہ آپ کے نزدیک وہ تعجب خیز ہیں۔ اور ابن نجیح نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہماری آیات سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے (1)۔

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ⑩

''(یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب! ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لئے اس کام میں ہدایت۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ روایت ہے کہ شہر دقیوس کے اشراف کی اولاد میں سے ایک قوم اور جماعت تھی اس شہر کا حاکم کافر تھا، [اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دقلیوس تھا] اور اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دقنیوس تھا۔ اور روایت ہے کہ انہیں پگھلائے ہوئے سونے کا طوق اور کنگن پہنائے گئے تھے، وہ رومیوں میں سے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی اتباع اور پیروی کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جس کو دقیانوس کہا جاتا ہے اس نے روم کے شہروں میں سے ایک شہر پر غلبہ پالیا، قبضہ کر لیا اس کو افسوس کہا جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ طرسوس ہے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد ہوا ہے چنانچہ اس نے بتوں کی پرستش کا حکم دیا اور اس شہر کے باسیوں کو بتوں کی پوجا کی دعوت دی، اور وہاں سات نوجوان تھے جو چھپ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، پس ان کی خبر بادشاہ کے پاس پہنچادی گئی اور انہیں اس کا خوف لاحق ہوا تو وہ رات کے وقت بھاگ نکلے، اور ان کا گزر ایک چرواہے کے پاس سے ہوا اس کے ساتھ کتا تھا پس اس نے بھی ان کی اتباع کی اور انہوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ پس بادشاہ ان کے پیچھے غار کے منہ تک پہنچ گیا، پس اس نے ان کے اندر داخل ہونے کے نشانات تو پائے لیکن باہر نکلنے کا کوئی نشان نہ پایا، پس وہ اندر (تلاش کے لئے) داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور انہیں کوئی شے نظر نہ آئی، تو بادشاہ نے کہا: تم ان پر غار کا درواز بند کر دو یہاں تک کہ وہ اندر ہی بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ وہ جوان ایک ایسے بادشاہ کے دین میں تھے جو بتوں کی پوجا کرتا تھا اور ان کے لئے جانور ذبح کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتا تھا، اور اس بارے میں اہل شہر اس کی پیروی کرتے تھے، اور ان جوانوں کو بعض حواریوں کی جانب سے کچھ علم ہوا تھا...... جیسا کہ نقاش نے ذکر کیا ہے، یا ان سے پہلی امتوں کے مومنین کی طرف سے...... پس وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 228-227

اور انہوں نے اپنی بصیرت کے ساتھ لوگوں کے افعال کی قباحت کو دیکھ لیا، پس انہوں نے اپنے آپ کو دین اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ لازم کر لیا، اس کا پابند بنالیا؛ پس ان کا معاملہ بادشاہ کے پاس پیش کیا گیا، اور اس کو بتایا گیا کہ یہ جوان تیرے دین سے الگ ہو گئے ہیں اور یہ تیرے معبودوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ کفر کرتے ہیں، پس بادشاہ نے انہیں اپنی مجلس میں حاضر کیا اور انہیں اپنے دین کی پیروی کرنے اور اپنے الہوں کے لئے ذبح کرنے کا حکم دیا، اور علیحدہ ہونے کی صورت میں انہیں قتل کی دھمکی دی، تو انہوں نے اسے کہا جیسا کہ روایت کیا گیا ہے: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ (الکہف)

اور روایت ہے کہ انہوں نے اس کلام کی طرح کہا نہ کہ یہ کلام کیا، تو بادشاہ نے انہیں کہا: بلاشبہ تم نوجوان ہو، ناتجربہ کار اور جاہل ہو، تمہاری عقل سمجھ نہیں ہے، اور میں تمہارے بارے میں کوئی جلدی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ میں مہلت دیتا ہوں تم اپنے گھروں کو چلے جاؤ اور اپنے نظریہ میں تدبر کرو، خوب غور و فکر کرو اور میرے حکم کی طرف لوٹ آؤ (میرے دین کی طرف رجوع کرلو) اور اس نے اس بارے میں انہیں معین وقت دے دیا، پھر وہ اس مدت کے دوران سفر پر چلا گیا اور ان نوجوانوں نے اپنے دین سمیت بھاگنے کا مشورہ کیا، اور ان میں سے ایک نے انہیں کہا: بے شک میں فلاں پہاڑ میں ایک غار پہچانتا ہوں، میرا باپ اس میں اپنے ریوڑ لے جاتا تھا پس ہمیں چاہئے کہ ہم اس میں جائیں اور وہاں چھپ جائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کوئی راستہ کھول دے، پس روایت ہے کہ ہاکی اور گیند کھیلتے ہوئے نکلے، اور وہ اسے اپنے راستے کی طرف لڑھکاتے چلے گئے تاکہ لوگ ان کے بارے محسوس نہ کریں۔ اور روایت ہے کہ ان پر غلبہ پالیا گیا تھا پس ان کا ایک میلہ آ گیا وہ اس کی طرف نکلے اور وہ بھی تمام لوگوں میں سوار ہو کر گئے، پھر وہ ہاکی اور گیند کے ساتھ کھیلنے میں لگ گئے یہاں تک کہ وہ ان سے الگ ہو گئے۔ اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ ان کے معاملے کا آغاز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر کی طرف آیا وہ اس میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا پس اس نے اپنے آپ کو ایک حمام والے کے پاس اجرت پر دے دیا اور اس میں کام کرتا رہا، اور حمام کے مالک نے اس کے کاموں میں بہت بڑی برکت دیکھی، پس اس نے اپنا سارا کام اس کے سپرد کر دیا، اور اس آدمی کو اہل شہر میں سے چند نوجوانوں نے پہچان لیا۔ پس اس نے انہیں اللہ تعالیٰ کی پہچان کرائی اور وہ اس کے ساتھ ایمان لے آئے اور اس کے دین پر اس کی اتباع و پیروی کرنے لگے، اور ان کی اس کے ساتھ ملاقات اور میل جول مشہور ہو گیا پس ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو ساتھ لے کر اس حمام کی طرف آیا اور اس نے اس کے ساتھ خلوت کا ارادہ کیا تو اس حواری نے اسے منع کیا اور وہ باز آ گیا، پھر دوسری مرتبہ وہ آیا تو اس نے اسے منع کیا لیکن اس نے اسے گالی گلوچ دیں، اور اس نے حمام میں بدکاری کے ساتھ داخل ہونے کا اپنا عزم پورا کیا، پس وہ داخل ہو گیا اور وہ دونوں اکٹھے اس میں مر گئے اور اس حواری اور اس کے ساتھیوں پر ان دونوں کے قتل کی تہمت لگائی گئی، نتیجتاً وہ سارے کے سارے بھاگ گئے یہاں تک کہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ ان کے نکلنے کے بارے علاوہ ازیں بھی کئی اقوال کہے گئے

ہیں۔ اور رہا کتا! تو اس کے بارے روایت ہے کہ ان کا یہ شکاری کتا تھا، اور یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے اپنے راستے میں ایک چرواہے کو پایا اس کا کتا بھی تھا پس چرواہے نے ان کی رائے پر ان کی اتباع اور پیروی کی اور کتا بھی ان کے ساتھ چلا گیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور کتے کا نام حمران تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطمیر تھا (1)۔

اور رہے اہل کہف کے اسماء تو وہ عجمی تھے، اور ان کی معرفت کی سند انتہائی کمزور اور ضعیف ہے۔ اور وہ جو علامہ طبری نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے: مکسلمینا یہ ان میں سے بڑا تھا اور ان کی طرف سے بات کرتا تھا، محسیملنینا، یملیخا اور یہ وہ ہے جو چاندی لے کر شہر گیا تھا جس وقت وہ اپنی نیند سے اٹھے، مرطوس، کشوطوش، دینموس، یطونس اور بیرونس۔ مقاتل نے کہا ہے: کتا مکسلمینا کا تھا، اور یہ ان میں سے عمر کے لحاظ سے بڑا اور بکریوں کا مالک تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت دین کے لئے فرار اختیار کرنے اور گھر والوں، اولاد، رشتہ داروں، دوستوں، اوطان اور اموال کے چھوڑنے کے بارے صریح ہے جبکہ فتنہ کا خوف ہو اور آدمی کو مشقت اور تکلیف میں سے پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین کی خاطر اپنے شہر سے ہجرت فرما ہوئے، اور اسی طرح آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور غار میں جا کر بیٹھ گئے جیسا کہ سورۃ النحل میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ براۃ میں اس پر نص بیان کی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور انہوں نے اپنے اوطان سے ہجرت کی اور اپنی زمین، اپنے گھر، اہل خانہ، اولاد، اپنے رشتہ دار اور اپنے بھائی سب دین کی سلامتی کی امید پر اور کافروں کے فتنہ سے نجات پانے کی خاطر چھوڑ دیئے۔ اور پہاڑوں میں سکونت اختیار کی، غاروں میں داخل ہوئے، مخلوق سے علیحدگی اختیار کی اور خالق کے ساتھ انفرادی طور پر خلوت میں رشتہ جوڑا۔ اور ظالم سے راہ فرار اختیار کرنے کا جواز تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اور اولیاء کی سنت اور ان کا طریقہ ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہائی کو فضیلت دی ہے، اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسے فضیلت دی ہے بالخصوص جس وقت فتنے اور لوگوں کے درمیان فساد ظاہر ہو رہا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی کتاب میں نص بیان کی ہے اور فرمایا ہے: فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ۔ علماء نے کہا ہے: لوگوں سے جدائی اور علیحدگی کبھی پہاڑوں اور گھاٹیوں میں ہوتی ہے، اور کبھی سواحل اور سرحدوں کے قریب اور کبھی گھروں میں ہوتی ہے، تحقیق حدیث میں ہے: ''جب فتنہ برپا ہو تو اپنے رہنے کی جگہ کو مخفی رکھو اور اپنی زبان کو روک لو'' (2)۔ اور یہ کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں۔ اور علماء کی ایک جماعت نے عزلت اور تنہائی کو شر اور برائی سے علیحدگی قرار دیا ہے (اس طرح) کہ تو شر پھیلانے والوں سے اپنے دل اور اپنے عمل کے ساتھ علیحدہ اور جدا رہے اگرچہ تو ان کے درمیان رہ رہا ہو۔ اور ابن المبارک نے عزلت کی تفسیر میں کہا ہے کہ تو قوم کے ساتھ ہو پس جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مستغرق ہوں تو تو بھی ان کے ساتھ ذکر میں لگ جا، اور اگر وہ اس کے سوا کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں تو تو خاموش رہ۔ اور علامہ بغوی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور ان کی اذیت اور تکلیف رسانی پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے افضل ہے جو ان کے ساتھ میل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 499

2۔ سنن ابی داؤد، باب الامر والنہی، حدیث نمبر 3780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جول نہیں رکھتا اور ان کی اذیت رسانی پر صبر نہیں کرتا'' (1)۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مومنوں کے رہنے کی جگہیں ان کے گھر کتنے اچھے ہیں (2)''۔ یہ حسن وغیرہ کی مرسل روایات میں سے ہے۔ اور حضرت عقبہ بن عامر نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ نجات کس میں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عقبہ! اپنی زبان کو اپنے پاس روک کر رکھ، چاہیے کہ تیرا گھر تیرے لئے وسیع ہو اور تو اپنے گناہ اور خطا پر رویا کر (3)''۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا مسلمان آدمی کا بہترین مال ریوڑ ہوگا وہ ان کے پیچھے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور بارش کی جگہوں کی طرف جائے گا اور اپنے دین کو فتنوں سے بچالے گا (4)''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

اور علی بن سعد نے حسن بن واقد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب ۱۸۰ھ ہوگا تو میری امت کے لئے (شہروں سے) دور پہاڑوں کی چوٹیوں میں خلوت گزینی اور رہبانیت اختیار کرنا حلال ہو گا (5)''۔ اور علی بن سعد ہی عبداللہ بن مبارک سے انہوں نے مبارک بن فضالہ سے اور انہوں نے حضرت حسن سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ تک مرفوع روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا اس میں کسی دیندار کا دین سلامت نہیں رہے گا سوائے اس کے جو اپنا دین لے کر ایک بلند جگہ سے دوسری بلند جگہ کی طرف یا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف چلا گیا، فرار ہوگیا۔ پس جب ایسا ہوا تو معیشت نہیں پائی جائے گی مگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کے ساتھ۔ پس جب ایسا ہوا تو (شہروں سے) دور بھاگنا حلال ہوگا (6)''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ دور بھاگنا کیسے حلال ہوگا حالانکہ آپ تو ہمیں ترویج اور اشاعت کا حکم دیتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب ایسا ہوگا تو آدمی کا فساد اور اس کی بربادی اس کے والدین کے سامنے ہوگی اور اگر اس کے والدین نہ ہوئے تو اس کی ہلاکت اس کی بیوی کے سامنے ہوگی اور اگر اس کی بیوی نہ ہوئی تو اس کی ہلاکت اس کی اولاد کے سامنے ہوگی اور اگر اس کی اولاد نہ ہوئی تو اس کی ہلاکت رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے سامنے ہوگی۔'' انہوں نے عرض کی: یہ کیسے ہوگا یارسول اللہ ﷺ؟ فرمایا: وہ اسے معیشت کی تنگی کی عار دلائیں گے اور اسے ایسی چیز کا مکلف اور پابند بنائیں گے جس کی اس میں طاقت نہ ہوگی تو اس وقت اپنے آپ کو ایسی جگہوں میں لے آئے گا جہاں وہ ہلاک ہو جائے گا (7)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: لوگوں کے احوال اس باب میں مختلف ہوتے ہیں، پس کتنے لوگ ہوتے ہیں جن میں پہاڑوں کی غاروں اور کھوؤں میں سکونت اختیار کرنے کی قوت اور طاقت ہوتی ہے، اور یہ احوال میں سے سب سے ارفع اور اعلیٰ ہے کیونکہ یہ وہ حالت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لئے آپ کی نبوت کے آغاز اور شروع میں پسند فرمایا، اور اس پر جوانوں کے

1۔ جامع ترمذی، باب فی صفة أوانی الحوض، حدیث نمبر 2431۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، باب الصبر علی البلاء، حدیث 4021، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الصبر علی البلاء، صفحہ 301

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزهد، ماجاء فی حفظ اللسان، جلد 2، صفحہ 63۔ ایضاً، حدیث نمبر 2330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، من الدین الفرار من الفتن، جلد 1، صفحہ 7

5۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 5، صفحہ 448-447، حدیث 8697   6۔ ایضاً   7۔ ایضاً

بارے خبر دیتے ہوئے اپنی کتاب میں نص بیان فرمائی ہے، اور ارشاد فرمایا: وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ (اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اب پناہ لو غار میں۔) اور کئی لوگ ہوتے ہیں جن کے لئے اپنے گھر میں عزلت اور علیحدگی اختیار کرنا زیادہ آسان اور سہل ہوتا ہے، اہل بدر میں سے کتنے لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اپنے گھروں کو لازم پکڑ لیا اور پھر وہ اپنی قبروں کی طرف جانے سے پہلے اپنے گھروں سے نہیں نکلے۔ اور کچھ لوگ ان دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں اور ان میں اتنی قوت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے بھی ہیں اور ان کی اذیت رسانی پر صبر بھی کرتے ہیں۔ پس وہ بظاہر ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور باطن میں ان کے مخالف ہوتے ہیں۔ اور ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ وہیب بن الورد نے ہمیں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: بے شک لوگ اس میں واقع ہو گئے ہیں جس میں وہ واقع ہو گئے ہیں! اور میں نے اپنے دل میں خیال کیا ہے کہ میں ان سے نہیں ملوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: تو ایسا نہ کر۔ بلاشبہ تیرے لئے لوگوں سے کوئی چارہ نہیں ہے، اور نہ ہی ان کا تجھ سے کوئی چارہ ہے، تیری ان کے ساتھ حاجات وضروریات ہیں، اور ان کی تجھ سے حاجات ہیں، لیکن تو ان میں اس طرح رہ کہ تو سننے سے بہرہ ہو، دیکھنے سے اندھا ہو، اور بولنے کے اعتبار سے ساکن اور خاموش ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ہر جگہ جس میں آدمی لوگوں سے دور ہوتا ہے وہ پہاڑوں اور گھاٹیوں کے معنی میں ہے، مثلاً مساجد میں اعتکاف کرنا، ساحلوں کو رہائش اور ذکر کے لئے لازم پکڑنا، اور لوگوں کے شر سے بچنے کے لئے گھروں میں بیٹھ رہنا وغیرہ۔ اور احادیث میں گھاٹیوں، پہاڑوں، اور ریوڑ کے پیچھے جانے کا جو ذکر آیا ہے...... واللہ اعلم...... وہ اس لئے ہی ہے کہ یہ اغلباً وہ جگہیں ہیں جن میں خلوت اور علیحدگی اختیار کی جاتی ہے، پس ہر وہ جگہ جو لوگوں سے دور رکھتی ہے تو وہ اس معنی میں داخل ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ واللہ الموفق وبہ العصمة۔

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تیرا رب اس سے راضی اور خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چراتا ہے، نماز کے لئے اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: دیکھو میرے بندے کی طرف وہ اذان کہہ رہا ہے، اور نماز قائم کر رہا ہے، وہ مجھ سے ڈرتا ہے تحقیق میں نے اپنے بندے کو بخش دیا اور میں نے اسے جنت میں داخل کر لیا (1)''۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا جب وہ اس سے بھاگ نکلے جو انہیں تلاش کر رہا تھا تو وہ دعا میں مشغول ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لی اور عرض کی: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی جناب سے مغفرت اور رزق عطا فرما۔ وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا اور ہمیں ہدایت کی توفیق عطا فرما۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہمیں سلامتی کے ساتھ غار سے نکلنے کی راہ عطا فرما۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمارے اس کام میں درست (سمت) عطا فرما۔ اور اسی معنی کے مطابق جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشان کن اور غمزدہ کر دینے والا

1۔ سنن نسائی، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 108۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب الأذان فی السفر، حدیث نمبر 1017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امر پیش آتا، تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہوتے اور (اللہ کریم کی بارگاہ میں دعا کرتے۔)

فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۟ۙ

"پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے۔"

یہ ان پر اللہ تعالیٰ کے نیند مسلط کر دینے سے عبارت ہے۔ اور یہ قرآن کریم کی ان فصیح آیات میں سے ہے جن کی مثل لانے سے قاصر ہونے کے بارے میں عربوں نے اقرار کیا۔ زجاج نے کہا ہے: یعنی ہم نے انہیں اس سے روک دیا کہ وہ کوئی آواز سنیں، کیونکہ سونے والا جب کوئی سنتا ہے تو وہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہم نے ان کے کان نیند کے ساتھ بند کر دیئے، یعنی ہم نے ان کے کان بند کر دیئے اس سے کہ ان تک آوازیں پہنچیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ یعنی ہم نے ان کی دعا قبول کر لی، اور ان سے ان کی قوم کا شر پھیر دیا اور ہم نے انہیں سلا دیا۔ اور یہ تمام معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے ضرب الامیر علی ید الرعیۃ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ انہیں فساد اور بگاڑ سے روک دے، اور ضرب السید علی ید عبدہ الماذون لہ فی التجارۃ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ اسے تصرف سے روک دے۔

اسود بن یعفر نے کہا ہے اور وہ اندھا تھا:

ومن الحوادث لا أبالك أننی ضُرِبتُ علی الأرض بالأسدادِ

اور رہی کانوں کی ذکر کے ساتھ تخصیص تو یہ وہ عضو ہے جس کے ساتھ نیند میں بہت بڑا فساد اور خرابی لازم آتی ہے۔ اور اکثر اوقات سونے والے کی نیند اس کے کان کی جہت سے ہی ختم ہوتی ہے، اور نیند مستحکم اور پختہ نہیں ہوتی مگر اسی کی جس کا آواز کو سننا معطل اور بند ہو جائے۔ اور نیند میں کانوں کے ذکر کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ذاك رجل بال الشیطان فی أذنه (1) (وہ آدمی ہے جس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا) اسے صحیح نے نقل کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے طویل نیند سونے والے آدمی کی طرف اشارہ کیا ہے، جو رات کو نہیں اٹھتا۔ اور عَدَدًا یہ سنین کی صفت اور نعت ہے (2)، یعنی سال گنے ہوئے ہیں۔ اور اس سے مقصود کثرت کو بیان کرنا ہے، کیونکہ قلیل تو عدد کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ وہ معروف ہے۔ اور العَدُّ مصدر ہے، اور العدد معدود کا اسم ہے جیسا کہ النفض اور الخبط ہیں۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: عَدَدًا مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ پھر ایک قوم نے کہا ہے: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سالوں کی تعداد بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا: وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ (الکہف) (اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال۔)

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۟۠

1۔ صحیح بخاری، کتاب التہجد، إذا نام لم یصل بال الشیطان فی أذنه، جلد 1، صفحہ 153

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500

"پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ پھر ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا۔ اور جس آدمی کو نیند سے اٹھایا یا بیدار کیا جائے تو اسے مبعوث کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے اٹھنے اور تصرف کرنے سے روک دیا گیا تھا۔

قولہ تعالیٰ: لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی، لِنَعْلَمَ یہ اس شے کے وجود اور مشاہدہ کی طرف نکلنے سے عبارت ہے؛ اور یہ عرب کلام کے طریقہ پر ہے، یعنی تا کہ ہم جان لیں وہ موجود ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے۔ اور زہری نے لیعمم یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الحزبان کا معنی دو فریق ہیں۔ اور آیت سے یہ ظاہر ہے کہ ایک گروہ ان نوجوانوں کا ہے جنہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ تھوڑا سا ٹھہرے ہیں۔ اور دوسرا فریق ان شہر والوں کا ہے جن کے عہد میں ان جوانوں کو بیدار کیا گیا، اس وقت ان کے پاس جوانوں کے معاملے کی تاریخ تھی۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ کافروں کے دو گروہ ہیں، جنہوں نے اصحاب کہف کی مدت میں اختلاف کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں مومنین کے گروہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جن کا آیت کے الفاظ کے ساتھ کوئی ربط نہیں۔ اور اَحْصٰی فعل ماضی ہے۔ اور اَمَدًا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے(1)؛ یہ ابوعلی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی دو گروہوں میں سے کون سے گروہ نے ان کے ٹھہرنے کی انتہائی مدت شمار کی ہے، اور الامد کا معنی غایت اور انتہا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اَمَدًا اس کا معنی عددًا (گننا) ہے، اور یہ تفسیر قریبی معنی کے اعتبار سے ہے(2)۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اَمَدًا، لَبِثُوْا کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قابل توجہ نہیں ہے(3)۔ اور رہا وہ جس نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے تو اس نے اسے اس اختلال اور خرابی کے ساتھ ملا دیا ہے کہ اَفْعَل کا صیغہ فعل رباعی سے نہیں آتا مگر شاذ صورت میں، اور اَحْصٰی فعل رباعی ہے۔ اور اس کے لئے یہ کہہ کر استدلال کیا جاتا ہے: بے شک رباعی میں اَفْعَل کا صیغہ کثیر ہوتا ہے، جیسے تیرا یہ قول: ما أعطاہ للمال و آتاہ للخیر (اس نے اسے مال نہیں دیا اور اسے خیر اور بھلائی دی) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حوض کی صفت میں فرمایا: ماؤہ أبیض من اللبن(4) (اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہوگا)۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: فھو لما سواھا أضیع(5) (پس وہ اس کے ماسوا کو زیادہ ضائع کرنے والا ہے)۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی ﴿۱۳﴾

"(اے حبیب!) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک، بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، ذکر الحوض، صفحہ 328 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500

قولہ تعالیٰ: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ جب قول باری تعالیٰ: لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى نوجوانوں کے ٹھہرے رہنے کی مدت میں واقع ہونے والے اختلاف کا تقاضا کرتا ہے، اس کے پیچھے یہ خبر بیان کی کہ اللہ عزوجل ان کے بارے اس حق کو جانتا ہے جو امر واقع ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ یعنی وہ جوان اور نئی عمر کے لوگ ہیں ان کے لئے جوانی کا حکم تھا اس وقت جب وہ بلاواسطہ ایمان لائے، اسی طرح اہل زبان نے کہا ہے: الفتوۃ (سخاوت) اصل ایمان ہے۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الفتوۃ کا معنی سخاوت کرنا، اذیت کو روکنا اور شکایت کو ترک کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الفتوۃ کا معنی محارم سے اجتناب کرنا اور مکارم اور فیاضی میں جلدی کرنا۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال کہے گئے ہیں۔

اور یہ قول بہت اچھا ہے؛ کیونکہ یہ ان تمام معانی کو جامع ہے جو الفتوۃ کے ضمن میں کہے گئے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَزِدْنٰهُمْ هُدًى یعنی ہم نے ان کے لئے عمل صالح آسان کر دیا، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے، لوگوں سے دوری اختیار کرنے، اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کے سبب۔ اور یہی ایمان پر زیادتی ہے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ کریم نے چرواہے کے کتے کے ساتھ ان کے نور ہدایت میں اضافہ کر دیا جس وقت انہوں نے اسے بھگایا اور اس خوف سے اسے پتھر مارے کہ وہ ان پر بھونکے گا اور ان کے بارے آگاہ کر دے گا، پس کتے نے دعا مانگنے والے کی طرح اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قوت گویائی عطا فرما دی، تو اس نے کہا: اے قوم! تم مجھے کیوں بھگاتے ہو؟ تم مجھ پر کیوں پتھر پھینکتے ہو؟ تم مجھے کیوں مارتے ہو؟ قسم بخدا! تحقیق میں نے اللہ تعالیٰ کو تمہارے اسے پہچاننے سے چالیس سال پہلے پہچان لیا تھا، پس اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کے نور ہدایت میں اضافہ کر دیا۔

وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝

''اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یہ پختہ عزم اور قوت صبر سے عبارت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عطا فرمایا یہاں تک کہ انہوں نے کفار کے سامنے کہہ دیا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا اور جب گھبراہٹ اور سانس کا ٹوٹنا، کمزور ہو جانا تناسب کے اعتبار سے کھلنے کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے تو پھر سانس کی مضبوطی اور قوت ارادی کی شدت کا ربط (باندھنے) کے مشابہ ہونا زیادہ حسین ہے، اور اسی سے کہا جاتا ہے: فلان رابط الجاش، جب گھبراہٹ اور جنگ وغیرہ کے وقت اس کا سانس متفرق نہ ہو۔ اور اسی سے الربط علی قلب ام موسیٰ بھی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ بھی ہے: وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ (الانفال) (اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جما دے اس سے تمہارے قدموں کو)۔ اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا یہ تین معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ کافر بادشاہ کے سامنے ان کے کھڑے ہونے کا وصف اور بیان ہو...... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں دل کو مضبوط کرنے کی حاجت اور ضرورت تھی جہاں انہوں نے اس کے دین کی مخالفت کی، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی خاطر اس کے خوف اور ڈر کو چھوڑ دیا۔ اور اس میں دوسرا معنی یہ ہے جو کہا گیا ہے: بے شک وہ اس شہر کے اشراف کے بچے تھے، پس وہ نکلے اور اس شہر سے باہر بغیر کسی وعدہ کے اکٹھے ہوئے، تو ان میں سے عمر کے اعتبار سے جو بڑا تھا اس نے کہا: بلاشبہ میں اپنے دل میں یہ پا رہا ہوں کہ میرا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، تو انہوں نے کہا: ہم بھی اپنے نفسوں میں اسی طرح پاتے ہیں۔ پس وہ سارے کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا یعنی اگر ہم اس کے سوا کسی الٰہ کو پکاریں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ ظلم اور محال ہے۔ اور تیسرا معنی یہ ہے کہ ان کے پورے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے اٹھ کر راہ فرار اختیار کرنے اور لوگوں کو چھوڑ دینے کو قیام (کھڑا ہونے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: قام فلان إلی أمر کذا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب آدمی انتہائی کوشش کے ساتھ کسی کام کے لئے پرعزم ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: قیام اور قوم میں صوفیہ نے اس قول کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تعلق صحیح نہیں ہے۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر اس کا ذکر کیا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس دولت اور انعام و فضل کا شکر ادا کیا جو اس نے ان پر فرمایا، پھر انہوں نے لوگوں سے تعلق توڑ کر اپنے رب کی طرف اپنے چہروں کو موڑنے کا قصد کیا اس حال میں کہ وہ اپنی قوم سے خوفزدہ تھے، اور انبیاء و رسل علیہم الصلوات والتسلیمات اور اولیاء و فضلاء میں یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ یہ زمین پر پاؤں مارنے اور آستینوں کے ساتھ رقص کرنے سے کہاں حاصل ہوتا ہے اور بالخصوص اس زمانے میں بے ریش بچوں اور عورتوں کی حسین اور خوبصورت آوازیں سننے کے وقت (جو کیفیت ہوتی ہے)۔ قسم بخدا! ان دونوں کے درمیان اتنا بعد ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ پھر یہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک حرام ہے، اس کا بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور سورۂ سبحان میں قول باری تعالیٰ: وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (الاسراء: 37) کے تحت گزر چکا ہے۔ جو کافی ہے۔

اور امام ابو الطرسوی نے اس وقت کہا جب ان سے صوفیہ کے مذہب کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: رہا رقص اور وجد کرنا سب سے پہلے سامری کے ساتھیوں نے اس کا آغاز کیا، جب اس نے ان کے لئے بچھڑے کا جسم بنایا اور وہ ڈکارنے لگا تو وہ کھڑے ہوئے اور اس کے اردگرد رقص کرنے لگے اور مل کر وجد کرنے لگے، پس یہ کفار کا دین ہے اور بچھڑے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 501

کی پرستش کرنے والوں کا دین ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝

''یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا، کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو، ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: ہماری قوم ہے، یعنی یہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہر کے لوگ ہیں، بتوں کی عبادت کرتے ہیں بغیر حجت کے محض تقلید کرتے ہوئے۔ لَوْلَا یعنی ھلا (کیوں نہیں) يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ یعنی اپنے بتوں کی عبادت کرنے پر کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عَلَيْهِمْ یہ ضمیر ان کے الہوں کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی وہ بتوں کے الٰہ ہونے پر کوئی دلیل کیوں نہیں قائم کرتے، پس ان کا قول: لَوْلَا یہ تخصیص یعنی تعجیز ہے، اور جب ان کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر واجب نہیں کہ ان کے دعویٰ کی طرف توجہ کی جائے۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝

''اور جب تم الگ ہو گئے ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اس کام میں آسانیاں۔''

قولہ تعالیٰ: وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ کہا گیا ہے کہ یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، یعنی جب تم ان سے الگ ہو گئے تو غار میں پناہ لو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے سردار تملیخا کا قول ہے؛ جیسا کہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور غزنوی نے کہا ہے: ان کا رئیس مکسلمینا تھا، اس نے ان کو یہ کہا، یعنی جب تم ان سے الگ ہو گئے ہو اور تم ان سے الگ ہو گئے ہو جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ پھر استثنا کی اور کہا اِلَّا اللّٰهَ یعنی بے شک تم اس (اللہ تعالیٰ) کی عبادت کو نہ چھوڑو، پس یہ استثنا منقطع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ بے شک وہ لوگ جن سے اصحاب کہف فرار ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے، اور نہ انہیں اس کے بارے کوئی علم تھا اور وہ صرف بتوں کی خدائی کے بارے اعتقاد رکھتے تھے۔ اور اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے تھے جیسا کہ عرب کرتے ہیں لیکن وہ اپنے بتوں کو اس کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہراتے تھے تو پھر استثنا متصل ہوگا، کیونکہ جدائی ہر اس کے حق میں واقع ہوئی جس کی کفار عبادت کرتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے (1): یہ اس کی تفسیر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اس پر وہ دلالت کرتا ہے جو ابونعیم الحافظ نے عطا خراسانی سے قول باری تعالیٰ: وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَ مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ کے تحت ذکر کیا ہے انہوں نے کہا ہے: یہ اس قوم کے جوان تھے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر معبودان باطلہ کی بھی عبادت کرتے تھے پس وہ جوان ان معبودوں کی عبادت سے الگ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے الگ نہ ہوئے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے (1): پس اس بنا پر جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اِلَّا بمعنی غیر ہوگا، اور قول باری تعالیٰ: وَ مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ میں مَا محل نصب میں ہوگا اور اس کا عطف اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ کی ضمیر پر ہوگا۔ اور یہ آیت اس معنی کو متضمن ہوگی کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: جب ہم کفار سے جدا اور الگ ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے منفرد ہو گئے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم غار کو پناہ گاہ بنالیں اور ہم اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، کیونکہ وہ ہمارے لئے اپنی رحمت پھیلا دے گا، اور اسے ہمارے اوپر بکھیر دے گا اور ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں آسانی مہیا فرمادے گا۔ اور یہ سب کی سب دنیا کے اعتبار سے دعا ہے۔ اور انہیں اپنی آخرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور یقین تھا۔ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اصحاب کہف تلواریں صیقل اور تیز کرتے تھے اور اس غار کا نام حیوم تھا۔ مِّرۡفَقًا اسے میم کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ ٹیک لگائی جاتی ہے۔ اس طرح مِرفق الانسان اور مَرفِق الانسان ہے (آدمی کی کہنی) اور ان میں سے بعض المرفق میم کے فتحہ اور فا کے کسرہ کے ساتھ اس کو امر سے بناتے ہیں اور المرفق من الانسان کہا گیا ہے کہ اگر میم کے فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ ظرف مکان ہے جیسا کہ مسجد اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

وَ تَرَى الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ تَّزٰوَرُ عَنۡ كَهۡفِهِمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَ اِذَا غَرَبَتۡ تَّقۡرِضُهُمۡ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمۡ فِيۡ فَجۡوَةٍ مِّنۡهُ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ ۚ وَ مَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا ﴿۱۷﴾ وَ تَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّ هُمۡ رُقُوۡدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّ لَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا ﴿۱۸﴾

''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے، اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں، (سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائے گا اس کے لئے کوئی مددگار (اور) رہنما۔ اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502

(کبھی) بائیں جانب اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر، اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے۔''

قولہ تعالیٰ: وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ یعنی اے مخاطب! تو سورج کو دیکھے گا کہ وہ اپنے طلوع کے وقت ان کی غار سے جھک کر اور ہٹ کر گزرتا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے: بلاشبہ اگر تو انہیں دیکھے تو یقیناً تو انہیں اسی طرح دیکھے نہ یہ کہ مخاطب نے انہیں فی الحقیقت دیکھا۔ اور تَزٰوَرُ کا معنی دور ہٹ جانا اور مائل ہونا، جھک جانا ہے، یہ الازورار سے ماخوذ ہے۔ اور الزّوَر کا معنی جھکنا ہے۔ اور الأزور فی العین النظر سے ایک طرف ہٹ جانے والا، اور غیر عین میں بھی یہ استعمال ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابن ابی ربیعہ نے کہا ہے:

وَ جَنْبِى خِيفَةَ الْقَوْمِ أَزْوَرُ (میرا پہلو قوم کے خوف سے ایک طرف جھک گیا ہے)۔

اور عنترہ کے قول کے لفظ ہیں:

فازور من وقع القنا بلبانه(1) (وہ اپنے سینے کے بل گر پڑے جسے نیزہ لگا)

اور غزوہ موتہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی چارپائی کو حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی چارپائی سے دور ہٹا ہوا (ایک طرف پڑا ہوا) دیکھا۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأی فی سریر عبداللہ بن رواحہ ازورارا عن سریر جعفر وزید بن حارثہ(2)۔ اہل حرمین اور ابو عمر نے تَزَّاوَرُ تا کو زاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے، اور یہ اصل میں تتزاور ہے۔ اور عاصم، حمزہ اور کسائی نے تَزَاوَرُ زا کو مخفف پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نے تَزْوَرُّ، تحمر کی مثل پڑھا ہے۔ اور فراء نے تزوار، تحمار کی مثل بیان کیا ہے، تمام ایک ہی معنی میں ہیں۔ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ جمہور نے اسے تا کے ساتھ تترکھم کے معنی میں پڑھا ہے (اور جب وہ غروب ہوتا ہے تو وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے)! یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(3)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بمعنی تدعھم(4) (وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے) نحاس نے کہا ہے: یہی معنی لغت میں معروف ہے، بصریوں نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: قرضہ یقرضہ جب وہ اسے ترک کر دے اور اس کا معنی ہے کہ اس کی عزت و تکریم کے لئے انہیں دھوپ بالکل نہیں پہنچتی، اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، یعنی سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ان کی غار سے دائیں جانب ہٹ جاتا ہے، اور جب غروب ہوتا ہے تو غار کے بائیں جانب سے ہو کر ان سے گزر جاتا ہے، پس انہیں دھوپ نہیں لگتی نہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور نہ دن کے آخری حصہ میں اور ان کی غار سرزمین روم میں بنات نعش (قطب شمالی کے قریب سات ستارے) کے سامنے تھی۔ پس سورج طلوع و غروب اور چلتے وقت ان سے ہٹ جاتا تھا ان تک نہ پہنچتا تھا کہ انہیں اپنی گرمی اور حرارت سے اذیت پہنچائے، ان کے رنگوں کو متغیر کرے اور ان کے کپڑوں کو بوسیدہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ان کی غار کے لئے ایک پردہ جنوب کی جانب سے تھا اور ایک پردہ دبور (پچھوائی ہوا) کی جہت سے تھا اور وہ اس کے کونے میں تھے۔ اور زجاج اس طرف گئے ہیں کہ سورج کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 503 3۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 245 4۔ ایضاً

طرف سے ایک نشانی ہے، نہ یہ کہ غار کا دروازہ اس جانب تھا جو یہ ثابت کرتی ہے(1)۔ اور ایک گروہ نے یقْرِضهم یا کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ القرض سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی قطع کرنا، کاٹنا ہے، یعنی غار اپنے سائے کے ساتھ سورج کی روشنی سے انہیں بچاتی ہے(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ یعنی جب وہ ڈوبتا ہے تو اس کی تھوڑی سی دھوپ انہیں لگتی ہے، یہ قُراضة الذهب والفضة (سونے اور چاندی کے ریزے) سے ماخوذ ہے، یعنی سورج اپنی تھوڑی سی شعائیں انہیں پہنچاتا ہے۔ اور انہوں نے کہا: شام کے وقت دھوپ کے ان کو مس کرنے اور پہنچنے میں ان کے بدنوں کی اصلاح تھی۔ الختصر اس میں آیت اور علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی غار میں پناہ دی جس کی کیفیت اور حالت یہ تھی نہ کہ کسی دوسری غار میں جس میں بڑے دنوں میں سورج کی شعائیں پڑنے سے وہ اذیت اور تکلیف محسوس کرتے۔ اور اس پر یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سورج کا ان سے پھرنا، ایک طرف ہٹنا بادلوں کے سایہ کرنے یا کسی دوسرے سبب سے ہو، اور مقصود ان تک کسی بلا اور مصیبت کے راہ پانے، بدنوں اور رنگوں کے متغیر اور تبدیل ہونے، اور گرمی یا سردی کے ساتھ اذیت پہنچنے سے انہیں بچانے اور ان کی حفاظت کرنے کا بیان ہے۔ وَ هُمْ فِیْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ اور وہ غار کی ایک کشادہ جگہ میں سو رہے ہیں۔ اور الفجوة کا معنی وسیع اور کھلی جگہ ہے، اور اس کی جمع فجوات اور فِجَاء ہے، جیسا کہ رَكْوَة کی جمع رِكاء اور ركوات ہے۔

اور شاعر نے بھی کہا ہے:

و نحن ملأنا کل واد و فجوة رجالا و خیلا غیر میل ولا عزل

یعنی وہ ایسی جگہ تھے جہاں انہیں بادنسیم لگتی تھی۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا لطف و کرم ہے، اور یہ معنی زجاج کے قول کو تقویت دیتا ہے۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلی تھیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، پس اسی طرح انہیں دیکھنے والا بیدار گمان کر سکتا ہے(3)۔ اور کہا گیا ہے: تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا کثرت سے ان کے کروٹ بدلنے کے سبب (تو انہیں بیدار خیال کرے گا) جیسا کہ بیدار آدمی اپنے بستر پر پہلو بدلتا ہے۔ اور اَيْقَاظًا، یقظ اور یقظان کے جمع ہے، اور اس سے مراد بیدار ہونے والا ہے وَّ هُمْ رُقُوْدٌ (حالانکہ وہ سو رہے ہیں) اور یہ ان کے اس قول کی طرح ہے: وهم رکوع و سجود و قعود (درآنحالیکہ وہ رکوع، سجود اور قعدہ میں تھے۔) پس مصدر کے ساتھ جمع کی صفت بیان کی گئی۔ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تاکہ زمین ان کے گوشت کو نہ کھائے(4)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر سال میں دو بار ان کی کروٹ بدلی جاتی رہی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ ہر سال میں ایک بار۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہر سات سال میں ایک بار کروٹ بدلی جاتی تھی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بلاشبہ آخری نو سالوں میں ان کی کروٹ بدلی گئی، اور رہے تین سو سال تو ان میں کروٹ نہیں بدلی گئی(5)۔ اور مفسرین کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ کروٹ بدلنا اللہ تعالیٰ کے فعل میں سے ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی فرشتہ مقرر ہو، اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا رہی ہو۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 503 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 504 5۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ كَلْبُهُمْ حضرت عمرو بن دینار نے کہا ہے: بے شک اس میں سے جو بچھو کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی کو ضرر اور نقصان نہ پہنچائے تو (چاہیے کہ) وہ اپنی رات یا دن کے وقت یہ کہے: صلی اللہ علی نوح۔ اور بے شک جو کتے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کتا اسے نقصان نہ پہنچائے جو اس پر حملہ آور ہو تو (چاہیے کہ) وہ یہ کہے: وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ حقیقتاً کتا تھا، اور وہ ان میں سے کسی ایک کے شکار یا کھیتی کی حفاظت یا اس کے ریوڑ کے لئے تھا؛ جیسا کہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور اس کے رنگ میں بہت سا اختلاف کیا گیا ہے، اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے: جو رنگ بھی تو ذکر کر دے وہی صحیح ہے، یہاں تک کہ کہا گیا ہے: وہ پتھر کے رنگ کا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ آسمان کے رنگ کا تھا۔ اور اس کے نام میں بھی اختلاف کیا گیا ہے، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کا نام ریان تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قطمیر تھا۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مشیر تھا، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: بسیط تھا، حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: صہبا تھا، حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نقیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطفیر تھا؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور ان کے وقت میں کتا رکھنا جائز تھا، جیسا کہ ہمارے نزدیک آج ہماری شریعت میں جائز ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: وہ رات کے وقت بھاگ کر نکلے اور وہ سات آدمی تھے وہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا پس اس نے بھی ان کے دین میں ان کی اتباع کی۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: وہ ایک کتے کے پاس سے گزرے اور وہ انہیں بھونکنے لگا تو انہوں نے اسے بھگایا وہ پھر لوٹ آیا تو انہوں نے اسے بار بار بھگایا، تو کتا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ دعا مانگنے والے کی طرح آسمان کی طرف اٹھا دیئے، اور بول پڑا، اس نے کہا: تم مجھ سے نہ ڈرو! بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں پس تم سو جاؤ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ (لا تخافوا منی! أنا احب احباء الله تعالى فنا موا حتى أحرسكم)

مسئلہ نمبر 2۔ صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کتا رکھا سوائے شکاری کتے کے یا جانوروں کی حفاظت والے کتے کے تو ہر روز اس کے اجر سے دو قیراط کم ہو جائیں گے (1)''۔ اور صحیح میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی کتا رکھا سوائے جانوروں کی حفاظت یا شکار یا کھیتی کی نگرانی والے کتے کے تو ہر روز اس کے اجر سے ایک قیراط کم کر دیا جائے گا۔'' زہری نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو ہریرہ پر رحم فرمائے! وہ کھیت کے مالک تھے (2)، تحقیق شکار، کھیتی، اور جانوروں کی حفاظت کے لئے کتا رکھنے پر سنت ثابتہ دلالت کرتی ہے۔ اور جس نے اس کے سوا کسی منفعت کے لئے کتا رکھا انہوں نے اس کے اجر میں کمی رکھ دی ہے؛ یہ یا تو کتے کے مسلمانوں کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاة، الامر بقتل الکلاب، جلد 2، صفحہ 21	2۔ ایضاً

ڈرانے اور ان پر بھونکنے کے سبب ان کو پریشانی اور تشویش میں مبتلا کرنے کی وجہ سے ہے یا ملائکہ کو گھر میں داخل ہونے سے روکنے کی وجہ سے یا پھر اس کی نجاست کی وجہ سے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے یا اس نہی کی وجہ سے ہے جو بغیر کسی منفعت کے اسے رکھنے کے بارے ہے۔ واللہ اعلم۔ اور آپ نے دو روایتوں میں سے ایک میں دو قیراط اور دوسری میں ایک قیراط ذکر کیا ہے۔ اور اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ کتوں کی دو قسموں کے بارے میں ہو ان میں سے ایک دوسری کی نسبت زیادہ اذیت رساں ہو، جیسا کہ وہ سیاہ (کتا) جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل کر دینے کا حکم دیا اور اسے استثنا میں داخل نہیں کیا جس وقت ان کے قتل سے منع فرمایا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے؛ اسے صحیح نے نقل کیا ہے اور فرمایا: "تم پر دو نقطوں والے سخت سیاہ جانور کو (قتل کرنا) لازم ہے کیونکہ وہ شیطان ہے (1)"۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جگہوں کے اختلاف کی وجہ سے ہو، پس جو اسے مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں روکے رکھے گا اس کے دو قیراط کم ہوں گے اور ان کے سوا دوسرے شہروں میں ایک قیراط کم ہوگا۔ اور رہیں وہ صورتیں جن میں اسے رکھنا مباح ہے تو ان میں کچھ کم نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ گھوڑا اور بلی وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور جانوروں کے لئے کتا رکھنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مباح ہے وہ وہ ہے جو ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، نہ کہ وہ ہے جو گھروں میں چوروں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور کھیتی کا کتا وہ ہے جو رات یا دن کے وقت وحشی جانوروں سے اس کی حفاظت کرتا ہے نہ کہ چوروں سے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں نے جانوروں اور کھیتی کی چوروں سے حفاظت کے لئے بھی کتا رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں کتوں کے احکام پہلے گزر چکے ہیں جو کافی ہیں، والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن عطیہ نے بیان کیا ہے: میرے باپ رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا انہوں نے کہا میں نے ۴۶۹ھ میں جامع مصر میں ابوالفضل جوہری کو منبر پر وعظ کرتے ہوئے سنا: بے شک جس نے اہل خیر سے محبت کی اس نے ان کی برکت کو پا لیا، ایک کتے نے اہل فضل سے محبت کی اور ان کی سنگت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی محکم کتاب میں ذکر فرمایا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب کتوں میں سے بعض نے صلحاء و اولیاء کے ساتھ ملنے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کے سبب اتنا بلند درجہ پا لیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب جل وعلا میں اس کی خبر دی ہے تو ان موحد مومنین کے بارے تیرا کیا خیال ہے جو اولیاء اور صالحین سے ملتے اور ان سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اس میں درجہ کمال سے قاصر رہنے والے مومنین اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی بہترین آل سے محبت کرنے والوں کے لئے تسلی اور انس (کا پیغام) ہے۔

صحیح نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد سے باہر نکلے تو مسجد کے دروازے کے پاس ہمیں ایک آدمی ملا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کب آئے گی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟" راوی نے کہا: تو گویا وہ آدمی ساکن سا ہو گیا، پھر عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اس کے لئے کوئی زیادہ نمازیں، روزے اور صدقہ وغیرہ تیار نہیں کیا، لیکن میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، الامر بقتل الکلاب، جلد 2، صفحہ 20　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فأنت مع من أحببت (پس تو اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ تو محبت کرتا ہے)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اسلام کے بعد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے زیادہ کبھی کسی سے خوش نہیں ہوئے: فأنت مع من أحببت۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں تو میں امید رکھتا ہوں کہ میرا انجام ان کے ساتھ ہوگا اگرچہ میں نے ان کے اعمال کی مثل عمل نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس سے استدلال کیا ہے یہ مسلمانوں میں سے ہر ذی روح کو شامل ہے، پس اسی لئے ہماری حرص اور طمع اس کے ساتھ متعلق ہے اگرچہ ہم کوتاہی کرنے والے اور کمزور ہیں، اور ہم رحمٰن کی رحمت کے امیدوار ہیں اگرچہ ہم اس کی اہلیت نہیں رکھتے، ایک کتے نے ایک قوم سے محبت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان کے ساتھ کیا! تو ہمارے ساتھ اس کا کیسا سلوک ہوگا جبکہ ہمارے پاس ایمان کا معاہدہ اور کلمہ اسلام، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

(الاسراء) (اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت)۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ حقیقی کتا نہ تھا، بلکہ وہ ان میں سے ایک تھا (یعنی اصحاب کہف میں سے) وہ ان کی حفاظت کی خاطر غار کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تھا، جیسا کہ جوزاء کے پیچھے آنے والے ستارے کو کلب کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ وہاں انسانوں میں سے کتے کی مثل تھا اور اس کو کہا جاتا ہے: کلب الجبار۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): پس اسے اس حیوان کا نام دے دیا گیا ہے جو اس جگہ کو لازم پکڑنے والا ہے، لیکن اس قول کو بازوؤں کے پھیلا دینے کا ذکر کمزور کرتا ہے کیونکہ عرف میں یہ حقیقی کتے کی صفت میں ہے۔ اور اس سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے: ولا یبسط أحد کم ذراعیه انبساط الکلب (2) (تم میں سے کوئی اپنے بازو کتے کے پھیلانے کی طرح نہ پھیلائے)۔ ابو عمر مطرز نے کتاب الیواقیت میں بیان کیا ہے کہ اسے وکالبهم باسط ذراعیه بالوصید پڑھا گیا ہے۔ پس اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ کالب سے مراد وہ آدمی ہو جیسا کہ روایت کیا گیا ہے، جب اس نے بازو پھیلا دیئے اور زمین کے ساتھ چمٹ گیا اس کے ساتھ ساتھ چہرے کو اٹھائے رکھا اطلاع پانے کے لئے اور یہی حالت اس مشکوک کی ہوتی ہے جو اپنے آپ کو چھپانے والا ہوتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کالب سے مراد کلب (3) (کتا) ہو اور جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہ نے وکالبهم پڑھا اور مراد کتے کا مالک لیا۔

قولہ تعالیٰ: بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ اسم فاعل عمل کر رہا ہے اور یہ ماضی کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ حکایت حال ہے۔ کتے کے فعل کے بارے خبر دینا مقصود نہیں ہے۔ اور الذراع سے مراد کہنی کی طرف سے لے کر درمیانی انگلی کے کنارے تک کا حصہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، الاعتدال فی السجود، جلد 1، صفحہ 193

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

مقدار ہے۔ پھر کہا گیا ہے: اس نے طویل مدت کے لئے اپنا بازو پھیلائے رکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتا سو گیا، اور وہ بھی علامات میں سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ آنکھیں کھول کر سو یا رہا۔ اور الوصید سے مراد فناء (صحن) ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد اور حضرت ابن جبیر نے کہا ہے۔ مراد غار کا صحن ہے، اور اس کی جمع وصائد اور وُصُد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الوصید سے مراد دروازہ ہے۔ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (1)۔

اور شعر بھی ہے:

بأرض فضاء لا یُسَدّ و صِیدُها علیّ و معروفی بها غیر منکر(2)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: الوصید سے مراد دروازے کی دہلیز ہے، اور الباب الموصد سے مراد بند دروازہ ہے۔ اور أوصدت الباب و آصدته کا معنی ہے میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور الوصید سے مراد ایسی بوٹیاں بھی ہیں جن کی جڑیں باہم قریب قریب ہوں، پس یہ لفظ مشترک ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ جمہور نے واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اعمش اور یحییٰ بن وثاب نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا یعنی اگر تو ان پر جھانک کر دیکھے تو تو یقیناً ان سے بھاگ آئے۔ وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا یعنی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رعب سے گھیر رکھا ہے اور ہیبت اور خوف سے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی جگہ کی وحشت کی وجہ سے (تو بھاگ آئے) گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی جگہ میں پناہ دی ہے جو بظاہر وحشت ناک ہے تاکہ لوگ وہاں سے دور بھاگیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لوگوں کو ان سے رعب کے ساتھ روک دیا گیا تھا، ان میں سے کوئی بھی ان کے قریب جانے کی جسارت نہ کرتا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے فرار ان کے بالوں اور ان کے ناخنوں کے بڑھنے اور لمبا ہونے کی وجہ سے تھا؛ اسے مہدوی، نحاس، زجاج اور قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بعید از حقیقت ہے (3)، کیونکہ وہ جب بیدار ہوئے تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ان کے بال اور ان کے ناخن اپنی حالت پر تھے، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ناخنوں اور اپنے بالوں کی طرف دیکھنے سے پہلے یہ کہا ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ان کے معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ان کی اسی حالت پر حفاظت فرمائی جس پر وہ سوئے تھے تاکہ وہ ان کے لئے اور ان میں دوسروں کے لئے علامت اور نشانی ہو جائے۔ پس نہ ان کے کپڑے بوسیدہ اور پرانے ہوئے اور نہ ان کی کوئی حالت تبدیل ہوئی، اور شہر کی طرف اٹھ کر جانے والے نے زمین اور عمارتوں کے نشانات کے سوا کسی چیز کا انکار نہیں کیا (اور نہ اس پر تعجب کیا) اور اگر اس کی ذات میں کوئی ایسی حالت ہوتی جس کا وہ انکار کرتا (اور اسے عجیب سمجھتا) تو یقیناً یہ اس پر زیادہ اہم تھا (4)۔ نافع، ابن کثیر، حضرت ابن عباس اور اہل مکہ و مدینہ نے مُلِّئْتَ مِنْهُمْ مبالغہ و مضاعف کی بنا پر لام کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ملئت ثم ملئت (تجھے بھر دیا جائے پھر تجھے بھر دیا جائے) اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 292
4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 505-504

باقیوں نے لملئت تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور لغت میں تخفیف زیادہ مشہور ہے۔

اور مخبل سعدی کے قول میں بھی تثقیل (تشدید) آئی ہے۔

واذ فَتَكَ النُّعمان بالنَّاس مُحْرِمًا　فملئ من كعب بن عوف سلاسله (1)

اور جمہور نے رُعْبًا عین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوجعفر نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوحاتم نے کہا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور فِرَارًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور رُعْبًا مفعول ثانی یا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (2)۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝

''اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں، کہنے لگا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو۔ بعض نے کہا: ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے جتنی مدت تم ٹھہرے ہو، پس بھیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھے کہ کس کے ہاں عمدہ پاکیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ لے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے، اسے چاہئے کہ خوش خلقی سے کام لے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبراً) لوٹا دیں گے اپنے (جھوٹے) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پا سکو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ۔ البعث سے مراد سکون سے حرکت دینا ہے۔ اور اس کا معنی ہے: جیسا کہ ہم نے ان کے کان سننے سے بند کر دیئے، اور ہم نے ان کے لئے نور ہدایت میں اضافہ کیا، اور ہم نے ان کی کروٹیں بدلیں (اسی طرح) ہم نے انہیں ان کی نیند سے بیدار بھی کر دیا، درآنحالیکہ وہ اپنے کپڑوں اور دیگر احوال میں اپنی پہلی حالت پر ہی تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

و فِتْيَانِ صِدْقٍ قد بَعَثْتُ بِسُحْرَةٍ　فقاموا جميعا بين عاثٍ و نَشْوانِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 505

یعنی میں نے بیدار کر دیا۔ اور قول باری تعالیٰ: لِيَتَسَآءَلُوْا میں لام صیرورت ہے اور یہی لام عاقبت ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں لام عاقبۃ ہے: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص: 8) (تا کہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج و الم بنے)۔ پس اس کا بیدار ہونا باہم ایک دوسرے سے سوال کرنے کے لئے نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ اور وہ یہ کہ وہ صبح کے وقت اس میں داخل ہوئے اور دن کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بیدار کر دیا، تو ان کے رئیس تملیخا یا مکسلمینا نے کہا: مدت کے بارے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: ان کا سکہ موسم ربیع میں پیدا ہونے والے اونٹ کے پاؤں کی مثل تھا، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے، اور ابن کثیر، نافع، ابن عامر، کسائی اور حفص نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے بِوَرِقِكُمْ را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابو بکر نے عاصم سے بورقكم را کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے، انہوں نے ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور زجاج نے بِوِرْقِكُمْ واؤ کو کسرہ اور را کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ اور روایت کی جاتی ہے کہ وہ اس حال میں بیدار ہوئے کہ انہیں بھوک لگی ہوئی تھی، اور جسے (شہر کی طرف) بھیجا گیا تھا وہ تملیخا تھا، اور یہی ان میں (عمر کے اعتبار سے) چھوٹا تھا، جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور وہ شہر افسوس تھا۔ اور کہا جاتا ہے: کہ وہ طرسوس تھا، زمانہ جاہلیت میں اس کا نام اُفسوس تھا اور جب اسلام آیا تو انہوں نے اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ان کے پاس دراہم تھے ان پر اس بادشاہ کی تصویر تھی جو ان کے زمانے میں تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ ذبیحہ کو حلال قرار دے، کیونکہ ان کے شہر والے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ان میں ایک قوم تھی جو اپنا ایمان چھپا کر رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے عام مجوسی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَزْكٰى طَعَامًا یعنی جس میں برکت زیادہ ہو۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ اتنی مقدار میں خریدے جسے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ یہ دو یا تین آدمیوں کا کھانا ہے تا کہ وہ ان پر اطلاع نہ کر سکے، پھر جب اسے پکایا جائے تو وہ جماعت کو کافی ہو جائے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ کھانا چاول تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ کشمش تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ وہ کھجوریں تھیں۔ فاللہ اعلم۔

اور کہا گیا ہے کہ اَزْكٰى بمعنی اطیب (زیادہ پاکیزہ) ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی ارخص (سستا) ہے۔ فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ پس چاہئے کہ وہ تمہارے لئے خوراک لے آئے۔ وَلْيَتَلَطَّفْ اور چاہئے کہ وہ شہر میں داخل ہونے اور کھانا خریدنے میں خوش خلقی سے پیش آئے۔

وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا یعنی وہ قطعاً تمہارے بارے میں کسی کو خبر نہ ہونے دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر اس پر غلبہ پا لیا جائے (یعنی اگر اسے پکڑ لیا جائے) تو وہ اپنے بھائیوں کو اس آزمائش میں واقع نہ کرے جس میں وہ خود واقع ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 505

إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی پتھر ہے، اور یہ خبیث ترین اور انتہائی قبیح قتل کی صورت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمہیں سب وشتم، گالی گلوچ دیں گے؛ اور یہ پہلا معنی زیادہ صحیح ہے (یعنی وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے)، کیونکہ وہ ان کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا جیسا کہ ان کے واقعہ میں گزر چکا ہے۔ اور رجم جیسا کہ گزر چکا ہے یہ ایک سزا ہے جو لوگوں کے دین (اور رائے) کے خلاف تھی، جب کہ یہ اس دین کے ماننے والے تمام لوگوں کے لئے مناسب تھی اس حیثیت سے کہ وہ اس میں شریک تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ سکہ دے کر اس کو بھیجنے میں وکالت اور اس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ تحقیق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس وکیل بنا کر بھیجا اور اس میں فی الجملہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور وکالت جاہلیت اور اسلام میں معروف ہے، کیا آپ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف نہیں دیکھتے کہ انہوں نے امیہ بن خلف کو کیسے مکہ مکرمہ میں اپنے اہل خانہ اور اپنے رشتہ داروں کے لئے وکیل مقرر کیا، یعنی وہ ان کی حفاظت کرے گا۔ اور امیہ مشرک تھا، اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امیہ کے لئے اس کا انتظام کیا جو مدینہ طیبہ میں اس کے رشتہ داروں کی اسی طرح حفاظت کرے گا اور یہ اس کے عمل کی جزا اور بدلہ ہوگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ (1) سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں رحمن کو نہیں پہچانتا! میری طرف اپنا وہ نام لکھو جو جاہلیت میں تھا، چنانچہ میں نے عبد عمرو لکھا...... اور آگے حدیث ذکر کی۔ اصمعی نے کہا ہے: صاغیۃ الرجل سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس کے پاس آتے ہیں اور یہ صغا يَصْغُوْ اور يَصْغَى سے ماخوذ ہے۔ جب وہ مائل ہو، اور ہر وہ جو کسی شے کی طرف مائل ہو یا اس کے ساتھ ہو (تو اسی کے لئے کہا جائے گا) صغا الیہ و أصغى، یہ کتاب الافعال سے ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ وکالت عقد نیابت ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حاجت اور ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی ہے اور اس میں مصلحت رکھ دی ہے، کیونکہ ہر ایک اپنے امور سر انجام دینے پر قادر نہیں ہوتا مگر دوسرے کی معاونت کے ساتھ یا راحت اور سہولت دینے کے ساتھ پس وہ اسے اپنا نائب بنا لیتا ہے جو اسے راحت و سکون پہنچا سکتا ہے۔

تحقیق ہمارے علماء نے اس کے صحیح ہونے پر کتاب اللہ کی کئی آیات سے استدلال کیا ہے، ان میں سے ایک یہ آیت ہے، اور قول باری تعالیٰ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا (التوبہ: 60) اور اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا (یوسف: 93) (لے جاؤ میرا یہ پیراہن) ہیں۔ اور رہی سنت! تو وہ کثیر احادیث ہیں۔ ان میں سے عروہ البارقی کی حدیث ہے، اور وہ سورۃ الانعام کے آخر میں گزر چکی ہے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ میں نے خیبر کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی: میں خیبر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تو میرے وکیل کے پاس پہنچے تو اس سے پندرہ وسق لے لینا اور اگر وہ تجھ سے کوئی نشانی طلب کرے تو اپنا ہاتھ اس کے گلے پر رکھنا" (2)۔ اسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، إذا وکل المسلم حربیاً فی دار الحرب، جلد 1، صفحہ 308

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، باب فی الوکالۃ، جلد 2، صفحہ 155

ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس معنی میں کثیر احادیث ہیں، اور اس کے جواز کے بارے اجماع امت ہونا ہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہر اس حق میں وکالت جائز ہے جس میں نیابت جائز ہوتی ہے، پس اگر غاصب نے کسی کو وکیل بنایا تو یہ جائز نہیں، حالانکہ وہ وکیل ہے، کیونکہ ہر وہ کام جسے کرنا حرام قرار دیا گیا ہے اس میں نیابت جائز نہیں ہوتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں ایک عمدہ نکتہ ہے کہ وکالت بچاؤ کے ساتھ ساتھ خوف بھی ہے کہ کوئی انہیں اس کے بارے احساس دلاتا ہے جو انہیں اپنی جانوں پر خوف نہیں ہے۔ اور صاحب عذر کیلئے کسی کو وکیل بنانے کا جواز تو متفق علیہ ہے اور رہا وہ جس کو کوئی عذر نہیں تو جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: گویا سحنون نے اسے اسد بن فرات سے لیا ہے اور اس نے اپنے ایام قضا میں اس کا فیصلہ کیا، اور شاید وہ ظلم و جبر کرنے والوں کے ساتھ ایسا کرتے تھے، ان سے انصاف لینے کے لئے اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے، اور یہی حق ہے؛ کیونکہ وکالت تو معاونت اور مدد کرنا ہے اور یہ اہل باطل کے لئے نہیں ہو سکتی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا ہے، پس جہاں تک اہل دین اور اہل فضل کا تعلق ہے تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ وکیل بنائیں اگرچہ وہ حاضر اور صحتمند ہوں۔ اور وکالت کے جواز کے صحیح ہونے پر دلیل وہ شاہد صحیح ہے جسے صحیحین وغیرہما نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی کا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک سال کا اونٹ تھا پس وہ آیا اور اس کا تقاضا کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے عطا کرو"۔ پس انہوں نے اس کے لئے ایک سال کا اونٹ تلاش کیا لیکن انہوں نے نہ پایا مگر وہ جس کی عمر اس سے زیادہ تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے دے دو"۔ تو اس نے کہا: آپ نے میرا حق پورا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ آپ کا حق پورا کر دے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک تم میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جو تم میں سے قضا کے اعتبار سے اچھا اور حسین ہو(1)"۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ پس یہ صحیح حدیث صحیح البدن حاضر آدمی کے وکیل بنانے کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ آپ کی طرف سے اس عمر کا اونٹ دے دیں جو آپ پر لازم ہے اور یہ آپ کی طرف سے ان کو اس پر وکیل بنانا ہی ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مریض تھے نہ مسافر۔ اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون کے ان دونوں کے بارے میں اس قول کو رد کرتی ہے کہ صحیح البدن حاضر آدمی کے لئے اپنے خصم کی رضا کے بغیر کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں ہے اور یہ حدیث ان دونوں کے قول کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت شرکت کے جواز کو متضمن ہے کیونکہ وہ سکہ ان تمام کا تھا۔ اور وکالت کے جواز کو بھی متضمن ہے کیونکہ انہوں نے اسے بھیجا جسے انہوں نے خریدنے کے لئے وکیل بنایا اور یہ ساتھیوں کے کھانے اور ان کا ایک ساتھ اپنے کھانے کو ملانے اور جمع کرنے کو متضمن ہے، اگرچہ ان میں سے بعض دوسروں سے زیادہ کھانا کھائیں؛ اور اس کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرہ:220) (اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اسی لئے ہمارے اصحاب نے مسکین کے بارے میں کہا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، وکالۃ الشاهد والغائب جائزۃ، جلد 1، صفحہ 309

ہے اس پر صدقہ کیا جاتا ہے پھر وہ اسے غنی کے کھانے کے ساتھ ملا دیتا ہے پھر اس کے ساتھ مل کر کھاتا ہے، بلا شبہ یہ جائز ہے۔ اور انہوں نے مضارب کے بارے میں کہا ہے جو اپنا کھانا دوسرے کے کھانے کے ساتھ ملا دیتا ہے پھر اس کے ساتھ مل کر کھاتا ہے: بے شک یہ جائز ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وکیل بنایا جس نے آپ کے لئے قربانی کا جانور خریدا۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے وہ انفرادی طور پر دیا ہو تو پھر اس میں اشتراک نہیں ہوگا۔ اور اس مسئلہ میں تعویل نہیں کی جا سکتی مگر دو حدیثوں کی بنا پر: ان میں سے ایک یہ ہے ...... کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک قوم کے پاس سے گزرے۔ وہ کھجوریں کھا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اقتران اور ملنے سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ آدمی اپنے بھائی سے اجازت طلب کرے (1)۔ اور دوسری یہ ہے ...... ابو عبیدہ کی جیش الخبط کے بارے میں حدیث ہے۔ اور یہ ظہور میں پہلی سی کم ہے، کیونکہ اس میں احتمال ہو سکتا ہے کہ ابو عبیدہ انہیں اس خوراک میں سے حاجت اور ضرورت کے مطابق دیتا ہو اور وہ انہیں اس پر جمع نہ کرتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے جو اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرہ: 220) اور قول باری تعالیٰ ہے: لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور: 61) (نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب مل کر یا الگ الگ۔) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ لِیَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا ۚۛ اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْهِمْ بُنْیَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

''اور بستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (اصحاب کہف) پر تاکہ وہ جان لیں کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلا شبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، جب وہ بستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کر دو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے، کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا! ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ یعنی ہم نے ان پر اطلاع کر دی اور ہم نے ان پر ظاہر کر دیا۔ اور اَعْثَرَ یہ عَثَرَ سے ہمزہ کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہے۔ اور عثار کا اصل معنی تو پاؤں کا پھسلنا ہے۔ لِیَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یعنی تاکہ وہ امت مسلمہ جان لے جن کے عہد میں اصحاب کہف کو بیدار کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ دقیانوس فوت ہو گیا اور صدیاں گزر گئیں اور اس علاقے کا بادشاہ ایک صالح اور نیک آدمی بنا، اور وہاں کے باسیوں کا حشر اور قبروں سے جسموں کے اٹھائے جانے کے بارے اختلاف ہو گیا، اور بعض لوگ اس میں شک کرنے لگے اور انہوں نے اسے بعید از حقیقت سمجھا اور کہنے لگے: بے شک ارواح کو اٹھایا جائے گا اور جسم کو تو زمین کھا جائے گی۔ اور ان میں سے بعض نے کہا: روح اور جسم دونوں کو اکٹھا اٹھایا جائے گا؛ پس یہ اس بادشاہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، النہی عن قران التمر، صفحہ 247

پر گراں گزرا اور وہ حیران رہنے لگا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ان کے لئے اس معاملہ کی وضاحت کیسے کرے، یہاں تک کہ ٹاٹ پہن لیا اور وہ ریت پر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حجت و بیان کے لئے تضرع اور زاری کرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف پر آگاہ کر دیا، پس کہا جاتا ہے کہ جب انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو سکے دے کر شہر کی طرف بھیجا کہ وہ ان کیلئے وہاں سے کھانا لے آئے تو اس شخص کو اجنبی سمجھا گیا اور بہت طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے اس کے دراہم پر بھی اظہار تعجب کیا گیا، اور اسے بادشاہ کے پاس اٹھا کر لے جایا گیا اور وہ صالح آدمی تھا تحقیق وہ بھی ایمان لے آیا تھا اور جو اس کے ساتھ تھے وہ بھی ایمان لے آئے تھے۔ پس جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو کہا: شاید یہ ان جوانوں میں سے ہے جو بادشاہ دقیانوس کے زمانے میں نکلے تھے، تحقیق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا ہوں کہ وہ مجھے وہ دکھائے۔ پھر اس نے جوان سے پوچھا تو اس نے اسے اس کی خبر دی، پس بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا اور اس نے کہا: شاید اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نشانی بھیج دی ہے، پس ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے ساتھ غار کی طرف چلیں، چنانچہ وہ شہر والوں سمیت ان کی طرف سوار ہو کر گیا، اور جب غار کے قریب پہنچے تو تملیخا نے کہا: میں ان پر داخل ہوتا ہوں تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہو جائیں چنانچہ وہ اندر ان کے پاس گیا اور صورت حال سے انہیں آگاہ کیا اور یہ کہ یہ امت امت اسلام ہے، پس روایت ہے کہ انہیں اس سے از حد خوشی ہوئی، اور وہ بادشاہ کی طرف باہر آئے اور انہوں نے اس کی عزت و تکریم کی اور وہ ان کی تعظیم بجالایا پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے۔ اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تملیخا نے انہیں یہ بتایا تو اس وقت وہ حقیقی موت کے ساتھ فوت ہو گئے، جیسا کہ اس کا بیان آ رہا ہے۔ اور جنہیں جسموں کے اٹھائے جانے میں شک تھا انہیں اس کا یقین حاصل ہو گیا۔ پس اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ کا یہی معنی ہے یعنی تاکہ بادشاہ اور اس کی رعایا جان لے کہ قیامت حق ہے اور دوبارہ زندہ کیا جانا (یعنی بعث) بھی حق ہے۔ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ بلاشبہ انہوں نے اس ایک سے ان کی خبر پر استدلال کیا اور وہ ان پر داخل ہونے سے ڈر گئے تو بادشاہ نے کہا: تم ان پر (بطور یادگار) ایک عمارت تعمیر کر دو؛ اور جو ان جوانوں کے دین پر تھے انہوں نے کہا: ان پر مسجد بنا دو۔ اور روایت ہے کہ ایک کافر گروہ نے کہا: ہم ان پر اپنی عبادتگاہ یا مہمان خانہ بنا لیتے ہیں، تو مسلمانوں نے انہیں روک دیا اور کہا: ہم ان پر ضرور مسجد بنائیں گے۔ اور روایت ہے کہ بعض لوگ ان پر غار کو بند کرنے کے لئے گئے اور انہوں نے انہیں اس میں اس حال میں چھوڑا کہ وہ غائب کر دیئے گئے ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت لوگوں پر ان کے اثر اور نشان کو اوجھل کر دیا اور انہیں ان سے چھپا دیا، پس اسی لئے بادشاہ نے عمارت بنانے کے لئے کہا تاکہ وہ ان کی نشانی ہو جائے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بادشاہ نے ارادہ کیا کہ وہ انہیں سونے کے صندوق میں دفن کرے تو حالت خواب میں ان سے کوئی آنے والا اس کے پاس آیا اور کہا: تو نے ہمیں سونے کے صندوق میں دفن کرنے کا ارادہ کیا ہے پس تو اس طرح نہ کر، کیونکہ ہم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹ رہے ہیں پس تو ہمیں چھوڑ دے۔

یہاں کئی ممنوع اور جائز مسائل پیدا ہوتے ہیں، پس قبروں پر مساجد بنانا اور ان میں نماز پڑھنا اور ان پر کوئی عمارت بنانا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 507

اور علاوہ ازیں وہ جنہیں سنت کی نہی متضمن ہے وہ ممنوع ہیں اور جائز نہیں ہیں، جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبور کی زیارت کرنے والیوں پر اور ان پر مساجد بنانے والوں پر اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے (1)۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس باب میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے اور وہ حدیث حسن ہے۔ اور صحیحین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک کنیسہ (گرجا گھر) کا ذکر کیا۔ انہوں نے اسے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک یہ وہ لوگ ہیں جن میں کوئی صالح آدمی ہوتا اور وہ فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس کی تصویریں لگا دیتے تو قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ ہوں گے (2)'' یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور علماء کی قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) بنائیں۔ اور ائمہ نے ابو مرثد غنوی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم قبروں کی طرف (متوجہ ہو کر) نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو (3)''۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں، یعنی تم انہیں قبلہ نہ بناؤ کہ تم ان پر یا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا ہے، کیونکہ یہ قبر والوں کی عبادت تک پہنچا دیتا ہے جیسا کہ بتوں کی پرستش کا سبب یہی بنا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثل سے ڈرایا، اور اس تک پہنچانے والے ذرائع کو بند کر دیا۔ اور فرمایا: ''اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہوگا جنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی قبروں کو مساجد بنایا (4)''۔ اور صحیحین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ ان دونوں نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی آتی تو آپ اپنا جبہ اپنے چہرے پر ڈال لیتے اور جب اس کے سبب گرمی اور حدت محسوس کرنے لگتے تو اسے اپنے چہرے سے اتار دیتے ایسے معاملہ میں اسی طرح ہوتا ہے: ''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنا لیا ہے (5)''۔ تو آپ اس سے ڈرا رہے ہیں جو کچھ انہوں نے کیا۔

اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے کہ قبر پر چونا کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر کوئی عمارت بنائی جائے (6)۔ اور اسے ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کو چونا کرنے، ان پر کچھ لکھنے، ان پر عمارت

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، ماجاء فی کراهیة ان یتخذ وا القبر مسجداً، جلد 1، صفحہ 43

ایضاً، حدیث نمبر 294۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب زیارۃ النساء، حدیث نمبر 2817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النهی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

3۔ ایضاً، کتاب الجنائز، فصل فی تسویة القبر، جلد 1، صفحہ 312　　4۔ مؤطا امام مالک، فی قصر الصلوٰۃ، صفحہ 159

5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النهی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

6۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی تسویة القبر، جلد 1، صفحہ 312

بنانے اور انہیں روندنے سے منع فرمایا ہے۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اور صحیح نے ابو الہیاج اسدی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تجھے اس پر آگاہ نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آگاہ کیا: خبردار سنو کوئی بت نہ چھوڑ مگر تو اسے مٹا دے اور کوئی بلند قبر نہ چھوڑ مگر تو اسے ہموار کر دے ...... اور ایک روایت میں ہے ...... اور کوئی تصویر نہ چھوڑ مگر تو اسے مٹا دے (2)۔ اسے ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کا ظاہر تو اس پر دال ہے کہ آپ نے قبروں کو کوہان کی شکل بنانے اور ان کو بلند کرنے سے منع کیا ہے اور یہ کہ وہ (زمین کے ساتھ) چپکی ہوئی ہوں۔ اور بعض اہل علم نے یہی کہا ہے۔ اور جمہور نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ بلندی جسے زائل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہ ہے جو کوہان کی مثل سے زیادہ ہو، اور قبر کے لئے اتنی بلندی باقی رہے گی جس سے اسے پہچانا جا سکتا ہو اور اس کا احترام کیا جائے، اور یہی ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور اور آپ کے صاحبین رضی اللہ عنہما کی قبروں کی کیفیت اور حالت ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اسے ذکر کیا ہے ...... اور اسی طرح ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر بھی ہے، جیسا کہ اسے دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور رہی زمانہ جاہلیت کی طرز پر بنائی جانے والی کثیر عمارتوں کی بلندی جو ان کی تفخیم شان اور تعظیم کے لئے ہوتی ہے تو اسے گرا دیا جائے گا اور زائل کر دیا جائے گا، کیونکہ اس میں آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل میں دنیوی زینت کا استعمال ہے، اور ان کے ساتھ تشبیہ اور موافقت ہے جو قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں، اور ان معانی کے اعتبار سے اور نہی کے ظاہر کے اعتبار سے یہ کہا جانا چاہئے کہ یہ حرام ہے۔ اور قبر میں کوہان کی شکل میں اس کی بلندی ایک بالشت کی مقدار ہے، یہ سنام البعیر (اونٹ کی کوہان) سے ماخوذ ہے۔ اور اس پر پانی چھڑکا جائے گا تاکہ ہوا کے ساتھ وہ اڑ نہ جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قبر کو گارے کے ساتھ لیپ دینے میں کوئی حرج نہیں (3)۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قبر کو چونا نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے گارے کے ساتھ لیپ کیا جائے گا اور نہ اس پر کوئی عمارت بنائی جائے گی کہ وہ گر پڑے۔ اور پتھر رکھنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ وہ علامت بن جائیں، کیونکہ اسے ابو بکر الاثرم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں مسدد نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں نوح بن دراج نے اُبان بن تغلب سے اور انہوں نے جعفر بن محمد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی قبر کی زیارت کرتی تھیں اور آپ نے اسے پتھر کی نشانی اور علامت لگا رکھی تھی؛ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے (4)۔

اور رہے وہ امور جو جائز ہیں ...... پس تابوت میں دفن کرنا جائز ہے بالخصوص جب (قبر) نرم زمین میں ہو اور روایت ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام پتھر کے تابوت میں دفن ہوئے، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی کہ ان کے لئے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، فی کراھیۃ تجصیص القبور والکتابۃ علیھا، جلد 1، صفحہ 125۔ ایضاً، حدیث 972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی تسویۃ القبر، حدیث 2801، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، فی کراھیۃ تجصیص القبور، جلد 1، صفحہ 125 4۔ التمہید، جلد 3، صفحہ 233-234

شیشے کا تابوت بنایا جائے اور پھر انہیں کنوئیں میں ڈال دیا جائے اس خوف سے کہ کہیں ان کی عبادت (نہ) کی جائے، اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک اسی طرح باقی رہے، اور پھر ایک بڑھیا نے اس پر آپ کی راہنمائی کی تو انہوں نے آپ کو اٹھایا اور انہیں حضرت اسحاق علیہ السلام کے حظیرہ میں دفن کر دیا۔ اور صحیح میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے اس مرض میں کہا جس میں ان کا وصال ہوا کہ تم میرے لئے لحد بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں کھڑی کر کے لگانا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا گیا (1)۔ اللحد: یہ ہے کہ زمین میں گڑھا کھودا جاتا ہے پھر اس گڑھے میں قبلہ کی جانب سے دوسری قبر کھودی جاتی ہے اگر زمین سخت ہو تو اس میں میت کو داخل کر دیا جاتا ہے اور اسے کچی اینٹوں کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ ہمارے نزدیک شق سے افضل ہے، کیونکہ یہی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پسند فرمایا۔ اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سنت لحد بنانا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شق ہے۔ اور لحد میں پکی اینٹیں لگانا مکروہ ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی پتھر کی ایک قسم ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ پکی اینٹیں تو عمارت کو پختہ کرنے کے لئے ہیں، اور قبر اور جو کچھ اس میں ہے وہ آزمائش کے لئے ہے لہٰذا اس میں پختگی مناسب نہیں ہے اور اسی بنا پر پتھر اور پکی اینٹ کو برابر قرار دیا جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پکی اینٹ میں آگ کا اثر ہوتا ہے، پس وہ بطور فال مکروہ ہے، اور اسی بناء پر پتھر اور پکی اینٹ کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کچی اینٹیں اور کانے لگانا مستحب ہے جیسا کہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کانوں کا ایک گٹھا لگایا گیا۔ اور شیخ امام ابو بکر محمد بن فضل حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ان کے شہروں میں زمین کے نرم ہونے کی وجہ سے تابوت بنانے کو جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: اگر لوہے کا تابوت بنایا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ چاہئے کہ اس میں مٹی بچھائی جائے اور اوپر والا وہ حصہ جو میت کے ساتھ ملتا ہے اسے مٹی کے ساتھ لیپ کر دیا جائے۔ اور میت کی دائیں اور بائیں جانب پر ہلکی سے کچی اینٹیں رکھ دی جائیں تا کہ وہ لحد کے قائم مقام ہو جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں چادر رکھی گئی، کیونکہ مدینہ طیبہ کی زمین شور یلی ہے۔ شقران نے کہا ہے: قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیچے قبر شریف میں چادر رکھی گئی۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: شقران کی حدیث حسن [صحیح] اور غریب ہے (2)۔

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ یَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَیْبِ ۚ وَ یَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ ۫۬ فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی الدعاء للمیت، جلد 1، صفحہ 311

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، ما جاء فی الثوب الواحد یلقی تحت المیت فی القبر، جلد 1، صفحہ 124

''کچھ کہیں گے: اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ کہیں گے: وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی، سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے، اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔''

قولہ تعالیٰ: سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، سَيَقُولُونَ میں ضمیر سے مراد اہل تورات اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر ہیں۔ اور انہوں نے اصحاب کہف کی تعداد میں یہ اختلاف کیا جو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد نصاریٰ ہیں، کیونکہ ان کی ایک جماعت نجران سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور آپ نے اصحاب کہف کا ذکر چلا دیا تو یعقوبیہ نے کہا: وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور نسطوریہ نے کہا: وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ اور مسلمانوں نے کہا: وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان یہودیوں کے بارے خبر دی جا رہی ہے جنہوں نے مشرکین کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف کے بارے سوال کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور قول باری تعالیٰ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واو نحویوں کے طریقہ پر واو عطف ہے جو ان کی تعداد کے بارے اخبار کے آخر میں داخل ہے؛ تاکہ ان کا معاملہ جدا اور الگ ہو جائے، اور یہ اس پر دلالت کرے کہ یہ اس کی غایت ہے جو اس بارے میں کہا گیا ہے، اور اگر یہ ساقط بھی ہو جائے تو بھی کلام صحیح ہے۔ اور ایک فرقہ نے کہا ہے ان میں سے ابن خالویہ بھی ہیں: یہ واو ثمانیہ ہے۔ ثعلبی نے ابوبکر بن عیاش سے بیان کیا ہے کہ قریش ان کی تعداد بیان کرتے وقت کہتے تھے: ستة سبعة و ثمانية (چھ، سات اور آٹھ) پس وہ آٹھ کے عدد میں واؤ داخل کرتے تھے (1)۔ اور قفال نے بھی اسی طرح کہا ہے، پس انہوں نے کہا ہے: بے شک ایک قوم نے کہا ہے کہ عربوں کے نزدیک عدد کی انتہا سات پر ہو جاتی ہے، اور جب اس سے زیادہ کی ضرورت پیش آئے تو واؤ ذکر کر کے دوسری خبر نئے سرے سے لائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ (التوبہ: 112) پھر فرمایا وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ (التوبہ: 112) اور اس پر یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ جب جہنم کے دروازوں کا ذکر کیا تو بغیر واو کے فرمایا حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) اور جب جنت کا ذکر کیا تو فرمایا: فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) یعنی اسے واو کے ساتھ ذکر کیا۔ مزید فرمایا: خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ (التحریم: 5) پھر فرمایا: وَّاَبْكَارًا پس سات ان کے نزدیک آخری عدد ہے جیسا کہ اب ہمارے نزدیک دس آخری عدد ہے۔ علامہ قشیری ابونصر نے کہا ہے: اس کلام کی مثل لانا تحکم (یعنی مرضی کا فیصلہ) ہے، ان کے نزدیک سات کہاں آخری عدد ہے پھر یہ (کلیہ) اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (الحشر: 23) اور اس میں آٹھواں اسم واو کے ساتھ مذکور نہیں۔ اور ان میں سے ایک قوم نے کہا ہے جو اس طرف گئے ہیں کہ ان کی تعداد سات تھی کہ قول باری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 508

تعالیٰ: سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ میں واؤ ذکر کی گئی ہے تاکہ وہ اس پر آگاہ کرے کہ یہ عدد ہی حق اور صحیح ہے، اور یہ کہ یہ ان دوسرے اعداد سے جدا اور الگ کرنے والی ہے جو اس کے بارے میں اہل کتاب نے کہے ہیں، اسی لئے پہلے دو جملوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: رَجْمًا بِالْغَيْبِ (یہ بن دیکھے تخمینے ہیں) اور تیسرے جملے میں اسے ذکر نہیں کیا اور اس میں کسی شے سے کوئی قدح اور اعتراض نہیں، تو گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اور الرجم سے مراد قول بالظن (یعنی محض وہم وگمان اور اندازے سے بات کرنا) ہے، ہر وہ شے جس کے لئے اندازہ اور تخمینہ لگایا جاتا ہے اس کے لئے کہا جاتا ہے: رَجَمَ فیہ و مرجوم و مُرَجَّمٌ۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

وما الحرب إلّا ما علمتم و ذُقْتُمُ وما هو عنها بالحديث المُرَجَّم

میں (مفسر) کہتا ہوں: ماوردی اور غزنوی نے ذکر کیا ہے کہ ابن جریج اور محمد بن اسحاق نے کہا ہے: وہ آٹھ تھے، اور ان دونوں نے قول باری تعالیٰ: وَ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ کو صاحب کلبھم قرار دیا ہے(1) (یعنی آٹھواں کتے کا مالک تھا) اور یہ اس میں سے ہے جو واؤ کے بارے میں نحویوں کے طریقہ کو تقویت دیتا ہے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے انہوں نے کہا۔ اور قشیری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے قول: رَّابِعُهُمْ اور سَادِسُهُمْ میں واؤ ذکر نہیں کی، اور اگر اس کے برعکس بھی ہو تو یقیناً وہ جائز ہے، پس اس جیسی واؤ میں حکمت اور علت تلاش کرنا ایک ایسا تکلف ہے جو حقیقت سے دور ہے، اور یہ اسی قول کی طرح دوسرے مقام پر ہے: وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ۝ (الحجر) اور ایک اور مقام پر ہے: إِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ ذِكْرٰی (الشعراء) (یعنی ایک آیت میں واؤ مذکور ہے اور دوسری میں نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: قُلْ رَّبِّيْٓ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیں، بعد ازاں اس کی خبر دی کہ انسانوں میں سے اسے جاننے والے چند لوگ ہیں اور اس سے مراد اہل کتاب کا گروہ ہے؛ یہ حضرت عطا کے قول میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ان چند آدمیوں میں سے میں بھی ہوں، وہ سات آدمی تھے اور ان میں آٹھواں ان کا کتا تھا(2)، پھر آپ نے ان سات کے ناموں سمیت ذکر کیا۔ اور رہا کتا تو اس کا نام قطمیر کلب انمر ہے، جو قلطی سے بڑا اور کردی سے چھوٹا تھا۔ اور محمد بن سعید بن مسیب نے کہا ہے: وہ چینی کتا تھا۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ زبیری تھا۔ اور بیان کیا کہ نیشاپور میں کوئی محدث باقی نہیں رہا مگر اس نے یہ حدیث مجھ سے لکھی ہے سوائے اس کے جو اس پر قادر نہ ہو سکا۔ فرمایا: اسے ابو عمرو حیری نے مجھ سے لکھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا یعنی اصحاب کہف کے بارے میں آپ جھگڑا اور بحث نہ کریں مگر اسی کے ساتھ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کر دی ہے، اور وہ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المراء الظاہر کا معنی یہ ہے کہ آپ کہیں: ایسا نہیں ہے جیسے تم کہتے ہو، اور اسی طرح کی گفتگو، اور اس میں مقدار امر پر آپ استدلال نہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 297 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 508

کریں۔ اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کسی کے لئے بیان نہیں فرمائی پس اسی لئے فرمایا اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا یعنی اسے جانے دو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وتلك شكاةٌ ظاهرٌ عنك عارُها　　(وہ عیب ہے اس کی عار تجھ سے ظاہر ہے)

اس آیت میں کسی کے لئے مباح نہیں ہے کہ وہ شک کرے، لیکن قول باری تعالیٰ: اِلَّا مِرَآءً یہ استعارہ ہے اس حیثیت سے کہ اہل کتاب اس میں شک کرتے ہیں۔ اور آپ کے ان کی طرف رجوع کرنے کو مِرَآءً کا نام دیا گیا ہے پھر اسے ظاہر کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے، پس یہ مراد حقیقی سے جو کہ مذموم ہے جدا ہو گیا۔ اور قول باری تعالیٰ فِيْهِمْ میں ضمیر اصحاب کہف کی طرف لوٹ رہی ہے اور قول باری تعالیٰ: مِّنْهُمْ میں ضمیر معارض اہل کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ میں مراد فی عدتھم (پس آپ ان کی تعداد میں شک نہ کریں)؛ اور لفظ عدۃ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ظاہر قول اس پر دلالت کرتا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے ان کے بارے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سوال سے منع کر دیا۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی چیز کو جاننے کے لئے اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا ممنوع ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

''ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنے والا ہوں کل، مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت عتاب فرمایا جب کفار نے آپ سے روح، نوجوانوں اور ذوالقرنین کے بارے سوال کیا تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تمہارے سوالات کے جوابات کے بارے کل تمہیں آگاہ کروں گا اور آپ نے اس میں ان شاء اللہ تعالیٰ نہ کہا۔ پس پندرہ دن تک آپ سے وحی رک گئی یہاں تک کہ آپ پر یہ شاق اور گراں گزرا اور کفار بھی آپ کے بارے باتیں کر کے آپ کو پریشان کرنے لگے، پس اس اضطراب اور پریشانی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ سورت نازل فرمائی۔ اور اس آیت میں آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ کسی کام کے بارے یہ نہ کہا کریں کہ میں کل اس اس طرح کر دوں گا، مگر یہ کہ آپ اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کریں تاکہ آپ خبر کے حکم کو ثابت کرنے والے نہ ہوں، کیونکہ جب کوئی یہ کہے: میں یہ ضرور کروں گا اور پھر نہ کرے تو وہ جھوٹا ہوتا ہے، اور جب وہ یہ کہے میں ضرور اس طرح کروں گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ مخبر عنہ کو ثابت کرنے کے حکم سے نکل گیا۔ پس قول

باری تعالیٰ: لِشَایْءٍ میں لام قائم مقام فی کے ہے یا گویا کہ یہ کہا لأجل شئ۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): اس آیت میں لوگوں نے قسم میں ان شاء اللہ کہنے کے بارے گفتگو کی ہے، حالانکہ یہ آیت قسم کے بارے نہیں ہے بلکہ یہ قسم کے سوا عام کلام میں ان شاء اللہ کہنے کے بیان میں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس کلام میں حذف ہے ظاہر اس کا تقاضا کرتا ہے اور ایجاز (اختصار) اسے حسین بنا رہا ہے، تقدیر کلام یہ ہے: الا ان تقول اِلَّا أن یَشَاءَ الله یا اِلَّا أن تقول اِن شاء الله۔ پس اس کا معنی یہ ہے: مگر یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ذکر کریں۔ پس اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس قول سے نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جسے ابن عطیہ نے اختیار اور پسند کیا ہے وہی کسائی، فراء، اور اخفش کا قول ہے۔ بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الا بمشیئة الله۔ پس جب کوئی انسان کہے أنا أفعل هذا إن شاء الله تو اس کا معنی ہوتا ہے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ یہ کام کروں گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(2): اور ایک جماعت نے کہا ہے: اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ یہ قول باری تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلَنَّ سے استثنا ہے۔ انہوں نے کہا: اس قول کو علامہ طبری نے بیان کیا ہے اور اس کا رد بھی کیا گیا ہے، اور یہ فساد میں سے ہے اس حیثیت سے یہ لازم ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے۔ اور استثناء فی الیمین اور اس کے حکم کے بارے بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ اس میں ایک مسئلہ ہے، اور وہ ہے نسیان کے بعد ذکر کا امر اور مامور بہ کے ذکر میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا، محمد الکوفی مفسر نے کہا ہے: بے شک یہ اپنے الفاظ کے ساتھ ان میں سے ہے جس کے بارے حکم دیا گیا ہے کہ ہر وہ انہیں کہے جو ان شاء اللہ نہ کہے، اور بلاشبہ یہ ان شاء اللہ بھول جانے کا کفارہ ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: یہ دعا ہے جس کے بارے حکم دیا گیا ہے نہ کہ یہ تخصیص ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کا قول وہ ان شاء اللہ ہے جسے قسم کے وقت وہ بھول گیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ ان شاء اللہ بھول گیا پھر اسے یاد آگیا اگرچہ سال بعد تو وہ حانث نہیں ہوا اگر وہ قسم اٹھانے والا تھا(4)، اور یہی حضرت مجاہد کا قول ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق نے اسے ابو العالیہ سے قول باری تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ کے تحت بیان کیا ہے۔ فرمایا: وہ ان شاء اللہ کہہ دے جب اسے یاد آجائے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: (وہ کہہ دے) جب تک وہ مجلس ذکر میں ہو(5)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دو سال (بعد تک کہہ سکتا ہے)؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: پس اسے گناہ سے خلاصی پانے کے لئے ان شاء اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرنے کے تدارک پر محمول کیا جائے گا۔ اور رہا وہ ان شاء اللہ کہنا جو حکماً مفید ہو تو وہ صرف متصل کہنا ہی صحیح ہوتا ہے۔ سدی نے کہا ہے: مراد ہر وہ نماز ہے جسے آدمی بھول جائے جب وہ اسے یاد آجائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ استثنا کرتا کہ تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 509 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 509-508 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 509

4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

نہ بھولے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا ذکر کرو جب تک تم اسے بھول نہ جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے: جب تو کسی شے کو بھول جائے تو تو اس کا ذکر کر وہ تجھے اس کی یاد دلا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو اس کا ذکر کر جب تو اس کے غیر کو بھول جائے یا تو اپنے آپ کو بھول جائے، پس وہی ذکر کی حقیقت ہے۔ اور اس آیت میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اور اصح قول کے مطابق یہ استفتاح کلام (آغاز کلام) ہے، اور استثناء فی الیمین میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، اور یہ اس کے بعد آپ کی تمام امت کو عام ہے، کیونکہ یہ ایسا حکم ہے جو اپنے کثرت سے واقع ہونے کے سبب لوگوں میں متردد رہتا ہے۔ واللہ الموفق۔

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝

''اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے خبر ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں وَ قَالُوْا لَبِثُوا ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بیشک بنی اسرائیل نے اس مدت میں اختلاف کیا جو مدت ان پر ان کے اظہار کے بعد سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی مدت تک گزر چکی تھی، پس ان میں سے بعض نے کہا: بے شک وہ تین سو نو سال تک ٹھہرے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ یہ مدت ان کے سوئے رہنے کی ہے، اور وہ جو اس کے بعد ہے وہ آدمی کے لئے مجہول ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اس کا علم اس کی طرف لوٹا دے۔ (یعنی یہ کہ اس مدت کے بارے رب کریم بہتر جانتا ہے)۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): پس اس بنا پر قول باری تعالیٰ میں پہلا لَبِثُوْا غار میں سونے کی مدت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور دوسرے لَبِثُوْا سے مراد اظہار کے بعد سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی مدت تک کا بیان ہے، یا اس وقت تک جب تک وہ بوسیدہ ہو کر معدوم نہیں ہوئے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نزول قرآن کے وقت تک۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ان کے فوت ہونے کی مدت تک۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: بے شک جب فرمایا وَازْدَادُوْا تِسْعًا لوگوں کو معلوم نہ ہوا کہ یہ نو ساعتیں ہیں یا دن ہیں یا جمعے ہیں یا مہینے ہیں یا نو سال ہیں۔ اور بنی اسرائیل نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس نو کے بارے میں علم اپنی طرف لوٹانے کا حکم ارشاد فرمایا، پس یہ اس بنا پر مبہم ہے۔ اور ظاہر کلام عرب کے مطابق جو اس سے سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سال ہیں۔ اور ان کے معاملے میں سے ظاہر یہ ہے کہ وہ کھڑے ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تھوڑا بعد غار میں داخل ہوئے درآنحالیکہ حواریوں میں سے ابھی کچھ باقی تھے۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: التسع سے نو راتیں اور نو ساعتیں نہیں سمجھی جا سکتیں اس لئے کہ اس سے پہلے سنین (سالوں) کا ذکر ہے، جیسا کہ تو کہتا ہے: عندی مائة درهم و خمسة (میرے پاس ایک سو درہم اور پانچ ہیں) تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک سو پانچ درہم (یعنی پانچ سے مراد بھی درہم ہی ہیں)۔ اور ابو علی نے کہا ہے: وَازْدَادُوْا تِسْعًا یعنی ازدادوا لبث تسع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510

(انہوں نے ٹھہرنے میں نو زیادہ کیے) پس یہ (لبث) حذف کر دیا گیا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: جب آیت: وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ نازل ہوئی تو انہوں نے کہا: یہ تین سو سال ہیں یا مہینے ہیں یا جمعے ہیں (مراد ہفتے ہیں) یا دن ہیں تب اللہ تعالیٰ نے سِنِیْنَ نازل فرمایا(1) (یعنی یہ تین سو سال ہیں)۔ نقاش نے بیان کیا ہے: اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ دنوں کے حساب سے تین سو شمسی سال ٹھہرے رہے، کیونکہ جب یہاں عربی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی جارہی ہے اور تسع (نو) کا ذکر کیا گیا ہے، تو آپ کے نزدیک سنین سے بھی قمری سال ہی سمجھے گئے اور یہ زیادتی وہ ہے(2) جو دو حسابوں (شمسی اور قمری سالوں) کے درمیان واقع ہے، اسی طرح غزنوی نے ذکر کیا ہے، یعنی شمسی سال اور قمری سال کے اختلاف کے سبب، کیونکہ ہر تینتیس سال اور ایک سال کے ثلث میں ایک سال کا فرق بنتا ہے پس تین سو سال میں نو سال کا فرق ہو جائے گا۔

اور جمہور نے ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ، مائۃ کو تنوین کے ساتھ اور سنین کو نصب کے ساتھ تقدیم و تاخیر کی بنا پر پڑھا ہے، ای سنین ثلثمائۃ پس صفت کو موصوف پر مقدم کیا گیا، تو اس بنا پر سِنِیْنَ بدل یا عطف بیان بن جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تفسیر اور تمییز کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور سِنِیْنَ، سنۃ کے محل میں ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے مائۃ کو سنین کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے، اور تنوین کو ترک کر دیا ہے، گویا انہوں نے سنین کو بمنزلہ سنۃ کے بنایا کیونکہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہ وہ اعداد ہیں جو مشہور روایت کے مطابق آحاد کی طرف مضاف ہوتے ہیں، جیسے ثلثمائۃ رجل و ثوب اور کبھی جمع کی طرف بھی مضاف ہوتے ہیں۔ اور مصحف عبداللہ میں ثلثمائۃ سنۃ ہے(3)۔ اور ضحاک نے ثلثمائۃ سنون واؤ کے ساتھ قرآت کی ہے۔ اور ابو عمرو نے اس کے خلاف تَسْعًا کو تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے اسے تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(4)۔ اور فراء، کسائی اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ولبثوا فی کھفھم سنین ثلثمائۃ۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝

”آپ فرمائیے: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اسی کے لئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا، وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے، نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔“

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اس مدت کے بارے میں جوان کی موت کے بعد سے لے کر ان کے بارے میں قرآن کریم نازل ہونے تک ہے، یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی بنا پر ہے یا ان کے فوت ہونے تک کی مدت مراد ہے، یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یا بوسیدہ ہو کر ان کے متغیر ہونے کے وقت تک کی مدت مراد ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مدت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ غار میں ٹھہرے رہے۔ اور یہ وہ مدت ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یہود کی جانب سے کیا ہے اگرچہ انہوں نے زیادہ یا کم ذکر کی،

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 267 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے سوا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا علم دیا ہے، اس کے بارے کوئی نہیں جانتا، لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کا علم غیب ہے)۔

قولہ تعالیٰ: اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ یعنی وہ کتنا دیکھنے والا اور کتنا سننے والا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ سے زیادہ نہ کوئی دیکھنے والا ہے اور نہ سننے والا ہے۔ یہ ادراک سے متعلقہ عبارات ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اَبْصِرْ بِهٖ کا معنی ہو یعنی آپ دیکھیں اس کی وحی کے ساتھ اور اس کی راہنمائی کے ساتھ جو اس نے آپ کی طرف فرمائی اور آپ کو دلائل اور حجتیں عطا فرمائیں اور امور کے حقائق سے آپ کو آگاہ کیا، اور اسی کے ساتھ عالم کو سنائیں، تو اس صورت میں یہ دونوں امر کے صیغے ہوں گے نہ کہ یہ صیغہ تعجب ہوں گے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ انہیں دکھائیں اور انہیں وہ سنائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ یعنی اصحاب کہف کے لئے کوئی ولی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ان کی حفاظت کا ولی اور نگران ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ لَهُمْ کی ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمعصر کفار کی طرف لوٹ رہی ہو، اور اس کا معنی ہو: ان کے ٹھہرنے کی مدت میں ان اختلاف کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ولی نہیں جو ان کے معاملے کی تدبیر کر سکتا ہو، پس وہ اس سے زیادہ عالم کیسے ہو سکتے ہیں، یا اس کے انہیں سکھائے بغیر وہ اسے کیسے جان سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا اسے یا اور کاف کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر کے معنی پر ہے۔ اور ابن عامر، حسن، ابو رجا، قتادہ اور جحدری رحمہم اللہ تعالیٰ نے ولا تشرك تا کے ساتھ اور کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، اور اس کا قول ولا تشرك کا اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ پر عطف ہوگا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے یشرك یا اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعقوب نے کہا ہے: میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔

مسئلہ: اصحاب کہف کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ فوت ہو گئے اور فناہ ہو گئے، یا وہ سوئے پڑے ہیں اور ان کے جسم محفوظ ہیں، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنے کسی غزوہ میں لوگوں کے ساتھ اصحاب کہف کی جگہ اور ان کے پہاڑ کے پاس سے گزرے، تو لوگ آپ کی معیت میں اس کی طرف چل کر گئے تو انہوں نے وہاں ہڈیاں پائیں تو انہوں نے کہا: یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں کہا: وہ تو ایسی قوم ہے جو طویل مدت سے فناہ اور معدوم ہو گئے ہیں، پس یہ بات ایک راہب نے سنی تو اس نے کہا: میں عربوں میں سے کسی کے بارے میں یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ اسے جانتا ہو، تو اس کو بتایا گیا کہ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں۔ اور ایک گروہ نے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ضرور حج کریں گے اور ان کے ساتھ اصحاب کہف ہوں گے کیونکہ انہوں نے ابھی تک حج ادا نہیں کیا۔“ اسے ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ کہ آپ حج یا عمرہ کرنے کے لئے روحاء سے گزریں گے یا اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ان (دونوں) کو جمع کر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 511

دے گا۔ پس اللہ تعالیٰ اصحاب کہف اور رقیم کو آپ کا حواری بنا دے گا، پس وہ حج کرتے ہوئے گزریں گے کیونکہ نہ انہوں نے حج کیا ہے اور نہ وہ فوت ہوئے ہیں اور ہم نے یہ روایت مکمل طور پر کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہے۔ پس اس بنا پر تو وہ سوئے پڑے ہیں اور یوم قیامت تک نہیں مریں گے، بلکہ قیامت سے تھوڑا پہلے انہیں موت آئے گی۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝

''اور پڑھ سنائیے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے، کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا، اور نہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کہا گیا ہے: یہ اصحاب کہف کے تمام قصہ کے بارے ہے، یعنی آپ قرآن کریم کی اتباع اور پیروی کریں پس اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں اور نہ اس کے خلاف ہو سکتا ہے جو اس نے اصحاب کہف کے واقعہ کے بارے خبر دی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے جن کلمات کے ساتھ گنہگاروں اور اس کی کتاب کی مخالفت کرنے والوں کو وعید سنائی ہے(1) انہیں کوئی تبدیل کرنے والا نہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ اور آپ ہرگز نہیں پائیں گے مِنْ دُوْنِهٖ اس کے سوا (کوئی پناہ گاہ) اگر آپ نے قرآن کریم کی اتباع اور پیروی نہ کی اور آپ نے اس کی مخالفت کی۔ مُلْتَحَدًا یعنی پناہ گاہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے مائل ہونے کی جگہ۔ اور اس کی اصل المیل (مائل ہونا، جھکنا) ہے؛ اور یہ لجأت الیہ سے ہے یعنی میں اس کی طرف مائل ہوا۔ (میں نے اس کے پاس پناہ لی۔) قشیری ابو نصر عبد الرحیم نے کہا ہے: یہ اصحاب کہف کے قصہ کا آخر ہے، جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روم کی طرف غزوۃ المضیق پر گئے اور آپ کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے پس وہ اس غار کے پاس جا کر رکے جس میں اصحاب کہف تھے، تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر ہمارے لئے انہیں ظاہر کر دیا جائے تو ہم انہیں دیکھ لیں، ان کی زیارت کر لیں، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے روک دیا ہے جو آپ سے بہتر اور افضل ہے، اور ارشاد فرمایا: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو۔) تو انہوں نے کہا: میں باز نہیں آؤں گا یہاں تک کہ میں ان کے بارے جان لوں اور اس کام کے لئے انہوں نے ایک جماعت بھیجی، پس جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ہوا بھیج دی تو اس نے انہیں باہر نکال دیا(2)، اسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے اور یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ وہ آپ کو ان کی زیارت کرائے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہ آپ انہیں دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے بلکہ آپ اپنے اخیار صحابہ کرام میں سے چار کو ان کی طرف بھیجئے تا کہ وہ آپ کی رسالت کا پیغام ان تک پہنچائیں اور انہیں ایمان کی دعوت دیں؛ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ''میں انہیں کیسے بھیج سکتا ہوں؟'' تو انہوں نے کہا: آپ اپنی چادر بچھائیں اور اس کی اطراف میں سے ایک طرف

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 269　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 293، مفہوم

پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو، دوسری طرف پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور اس کی تیسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور چوتھی طرف پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیں، پھر اس نرم ہوا کو بلایئے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کی گئی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے حکم دے رہا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت اور پیروی کرے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو ہوا انہیں اٹھا کر غار کے دروازے تک لے گئی، پس انہوں نے اس کا ایک پتھر اکھیڑ دیا تو کتے نے ان پر حملہ کر دیا لیکن جب اس نے انہیں دیکھا تو وہ اپنا سر اور اپنی دم ہلانے لگا اور ان کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا کہ داخل ہو جاؤ چنانچہ وہ غار میں داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو اللہ تعالیٰ نے ان جوانوں کی طرف ان کی ارواح کو لوٹایا اور وہ تمام کے تمام کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو انہوں نے ان کو کہا: اے جوانوں کے گروہ! بے شک نبی محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو سلام فرماتے ہیں اور انہوں نے کہا: اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی سلام ہو جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اور تم پر بھی اس کے عوض جو تم نے پیغام پہنچایا ہے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا اور وہ اسلام لے آئے، پھر انہوں نے کہا: ہماری طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کرنا، انہوں نے اپنے بستر لے لئے اور آخر زمانہ میں امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک اپنی نیند میں ہو گئے۔ پس کہا جاتا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام انہیں سلام فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کر دے گا (بیدار کر دے گا) پھر وہ اپنی نیند کی طرف لوٹ جائیں گے اور پھر وہ قیامت قائم ہونے تک نہیں اٹھیں گے، پس حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ان کے متعلق تھا، پھر ہوا انہیں لوٹا لائی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے انہیں کیسے پایا ہے؟'' تو انہوں نے آپ کو پوری خبر سے آگاہ کیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''اے اللہ! میرے درمیان اور میرے اصحاب اور میرے سسرال کے درمیان تفریق نہ کرنا اور اسے بخش دے جس نے مجھ سے محبت کی اور میرے اہل بیت، میرے خواص اور میرے اصحاب کے ساتھ محبت کی (1)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اصحاب کہف حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے غار میں داخل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے بارے خبر دی پھر انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے درمیان زمانہ فترت میں اٹھایا گیا، بیدار کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے اور یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات میں ان کا ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے سوال کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد غار میں داخل ہوئے، پس ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور روکے رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طلب گار ہیں اس کی رضا

1۔ عرائس المجالس، صفحہ 431

کے اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے، کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت، اور نہ پیروی کیجئے اس (بدنصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:52) (اور نہ دور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام) یہ سورۃ الانعام میں ہے اور اس کے بارے کلام گزر چکی ہے۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مولفۃ قلوب آئے، یعنی عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس اور انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اگر آپ صدر مجلس میں تشریف رکھیں اور آپ ہم سے انہیں اور ان کے جبوں کی بو کو دور کریں ...... مراد حضرت سلمان، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما اور مسلمان فقراء ہیں، وہ اون کے جبے پہنے ہوئے تھے اور ان پر ان کے سوا کچھ نہ تھا...... تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے ہیں اور آپ سے گفتگو کرتے ہیں اور آپ سے کچھ لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ۝ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا یعنی اللہ تعالیٰ انہیں آگ سے ڈرا رہا ہے اور اس کی دھمکی دے رہا ہے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تلاش کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ جب آپ نے انہیں مسجد کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پایا تو کہا: ''سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے موت نہیں دی یہاں تک کہ مجھے حکم فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اپنی امت کے ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھوں، تمہارے ساتھ ہی جینا ہے اور تمہارے ساتھ ہی مرنا ہے۔''

(الحمد لله الذی لم یُمِتْنی حتی أمرنی أن أصبر نفسی مع رجال من امتی، معکم المحیا و معکم الممات)(1)

يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور نصر بن عاصم، مالک بن دینار، اور ابو عبد الرحمن نے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:52) پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ عام لوگوں میں واؤ کے ساتھ ہے۔ اور ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: یہ ان کے حیاۃ اور صلاۃ واو کے ساتھ لکھنے سے لازم نہیں آتا، اور نہ قریب قریب عرب الغدوۃ کہتے ہیں کیونکہ یہ معروف ہے۔ اور حسن سے روایت ہے وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ یعنی آپ کی آنکھیں ان کے سوا کی طرف تجاوز نہ کریں جو کہ دنیا کے بیٹے ہیں اور اس کی زینت کے طلبگار ہیں، اسے یزیدی نے بیان کیا ہے(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ کی آنکھیں انہیں حقیر نہ جانیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلان تنبو عنه العین یعنی فلاں کو حقیر جانتے ہوئے، آنکھ اس سے دور ہو گئی۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 272 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 302، بمفہوم

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی کیا آپ ان سرداروں کے ساتھ بیٹھنے کو زینت بخشیں گے جنہوں نے آپ کو اپنی مجلس سے فقراء کو دور ہٹانے کی تجویز دی ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح کرنے سے منع کر دیا، تو یہ اس قول سے زیادہ نہیں ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرک سے محفوظ اور بچا کر رکھا ہے۔ اور تُرِيْدُ فعل مضارع حال کے محل میں ہے، یعنی آپ کی آنکھیں تجاوز نہ کریں در آنحالیکہ آپ ارادہ رکھتے ہوں۔ (لا تعد عیناك مریدا)۔

جیسا کہ امرئ القیس کا قول ہے:

فقلتُ له لا تبكِ عَيْنُكَ إنّما   نحاولُ مُلْكًا أو نموتَ فنُعْذَرا

اور بعض نے کہا ہے کہ اصل کلام یہ ہے: لا تعد عینیك عنهم (یعنی آپ ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیریں) کیونکہ تعد بذات خود متعدی ہے۔ آپ کو کہا گیا ہے: وہ جس کے سبب رفع عینین کی آیت نازل ہوئی وہ دونوں میں معنی نصب کی طرف راجع ہے، کیونکہ لا تعد عیناك عنهم قائم مقام لا تنصرف عیناك عنهم کے ہے، تو لا تنصرف عیناك عنهم کا معنی ہے لا تنصرف عینیك عنهم، یعنی آپ کی آنکھیں ان سے نہ پھریں کا معنی ہے آپ ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیریں؛ پس فعل کی نسبت عینین (آنکھوں) کی طرف کی گئی ہے اور یہ فی الحقیقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کی گئی ہے: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ (التوبہ: 55) (سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال)۔ تو اس میں الاعجاب کی نسبت اموال کی طرف کی گئی ہے، اور اس کا معنی ہے: لا تعجبك یا محمد أموالهم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مال آپ کو تعجب میں نہ ڈالے) اور آپ کے لئے مزید وضاحت زجاج کا قول کرتا ہے: بے شک اس کا معنی ہے آپ اپنی نگاہیں ان سے ان کے غیر کی طرف نہ پھیریں جو کہ صاحب حیثیت وزینت ہیں۔ (لا تصرف بصرك عنهم إلى غيرهم من ذوي الهيئات والزينة)

قولہ تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا جو یبر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ یہ ارشاد امیہ بن خلف جمحی کے بارے نازل ہوا، وہ اس لئے کہ اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے امر کی دعوت دی جسے آپ نے ناپسند کیا اور وہ یہ کہ آپ فقراء کو اپنے آپ سے دور کر دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنے قریب کریں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا یعنی آپ اس کی پیروی نہ کریں جس کے دل پر ہم نے مہر لگا دی ہے اس سے کہ وہ توحید قبول کرے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے) یعنی شرک کرتا ہے(1)۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا کہا گیا ہے: کہ فُرُطًا اس تفریط سے ہے جس کا معنی تقصیر (کمی کرنا، کوتاہی کرنا) ہے اور ایمان ترک کرنے کے سبب عجز کو مقدم کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ افراط اور حد سے تجاوز کرنے سے ہے، اور اس قوم نے کہا تھا: ہم مضر کے

1۔ اسباب نزول، صفحہ 216، قدیمی کتب خانہ کراچی

اشراف اور سردار ہیں اگر ہم اسلام لے آئے تو بہت سے لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔ اور انہوں نے تکبر اور قول میں افراط اور زیادتی کے سبب یہ کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ فُرُطًا سے مراد شر میں واقع ہونا ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: فرط منہ أمر یعنی معاملہ اس سے بڑھ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ کا معنی ہے ہم نے اسے غافل پایا، جیسا کہ تو کہتا ہے: لقیت فلانا فأحمدته، یعنی میں نے اسے محمود (قابل تعریف) پایا۔ اور عمرو بن معدیکرب نے بنی حارث بن کعب کو کہا: قسم بخدا! ہم نے تم سے مانگا اور تمہیں بخیل نہ پایا، اور ہم نے تمہارے ساتھ قتال کیا اور ہم نے تمہیں بزدل نہ پایا، اور ہم نے تمہیں جوش دلایا اور تمہیں خاموش نہ پایا (واللہ لقد سألناکم فما أبخلناکم وقاتلناکم فما أجبناکم وھاجیناکم فما أفحمناکم یعنی ما وجدناکم بخلاء ولا جبناء ولا مفحمین) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عیینہ بن حصن فزاری کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، اور اسے نحاس نے حضرت سفیان ثوری سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝

”اور فرمایئے: حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے، بے شک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لئے آگ، گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوار نے۔ اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے چہروں کو یہ مشروب بڑا ناگوار ہے، اور یہ قرارگاہ بڑی تکلیف دہ ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اس میں الْحَقُّ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، ای قل ھو الحق۔ (فرمایئے وہ حق ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور اس کی خبر قول باری تعالیٰ مِنْ رَّبِّكُمْ ہے۔ اور آیت کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمایئے ان لوگوں کو جن کے دلوں کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے: اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے ہی حق ہے اور اسی کے پاس توفیق عطا کرنا اور رسوا کرنا ہے، اسی کے دست قدرت میں ہدایت دینا اور گمراہ کرنا ہے، وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس وہ ایمان لے آتا ہے اور وہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس وہ کافر ہو جاتا ہے، اس میں سے میرے پاس کوئی شے نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ حق عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے اگرچہ وہ ضعیف اور کمزور ہو، اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے اگرچہ وہ طاقتور اور غنی ہو، اور میں تمہاری خواہش اور پسند پر مومنین کو نہیں بھگا سکتا (انہیں اپنے سے دور نہیں ہٹا سکتا) لہٰذا اگر تم چاہو تو ایمان قبول کرلو اور اگر چاہو تو کافر رہو۔ اور یہ ایمان اور کفر کے درمیان کوئی اختیار دینا اور رخصت دینا نہیں، بلکہ یہ تو وعید اور جھڑک ہے، یعنی اگر تم نے کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے، اور اگر تم ایمان لے آئے تو تمہارے لئے جنت ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّآ اَعْتَدْنَا یعنی ہم نے تیار کر رکھی ہے۔ لِلظّٰلِمِیْنَ یعنی کفر کرنے والوں اور انکار کرنے والوں کے لئے نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا علامہ جوہری نے کہا ہے: السُّرَادِقُ السرادقات کی واحد ہے وہ جو گھر کے صحن میں پھیلائے جاتے ہیں (خیمے، ٹینٹ) اور ہر وہ گھر جو روئی سے بنایا جائے وہی سرادق کہلاتا ہے۔

جیسا کہ رؤبہ نے کہا ہے:

یا حَكَمَ بنَ المنذر بن الجارُود　　سُرادِقُ المجد علیك مَمْدُوْدُ

کہا جاتا ہے: بیت مُسَرْدَقٌ۔ اور سلامہ بن جندل اَبرویز کا ذکر کرتا ہے اور اسے نعمان بن منذر نے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روند کر قتل کر دیا تھا۔

هو المُدْخِل النعمانَ بیتاً سماؤہ　　صُدُوْرُ الفیول بعد بَیْتٍ مُسَرْدَقٍ

ابن اعرابی نے کہا ہے: سُرَادِقُهَا اس (آگ) کی فصیل۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا (1): آگ کی دیوار۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آگ سے ایک گردن سی نکلے گی اور وہ کفار کو باڑ کی طرح گھیر لے گی (2)۔ قتبی نے کہا ہے: السرادق سے مراد وہ رکاوٹ اور باڑ ہے جو خیمے کے ارد گرد لگائی جاتی ہے، اور یہی ابن عزیز نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے دن کافروں کو گھیر لے گا (3)، اور یہ وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المرسلات میں کیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ فرماتا ہے: اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ (المرسلات) (چلو اس سایہ کی طرف جو تین شاخوں والا ہے) اور ارشاد گرامی ہے: وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۝ (الواقعہ) (اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے)، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ سمندر ہے جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور یعلی بن امیہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: البحر وہ جہنم ہے۔۔۔۔۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔۔۔۔۔ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۔۔۔۔۔ پھر فرمایا: قسم بخدا! میں اس میں کبھی داخل نہیں ہوں گا جب تک میں زندہ رہا اور نہ اس سے کوئی قطرہ مجھے پہنچے گا۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن المبارک نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جہنم کے سرادق چار مضبوط اور موٹی دیواریں ہیں ہر دیوار چالیس برس کی مسافت کی ہے (4)'' اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے، اور کہا ہے: یہ حدیث حسن، صحیح، غریب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وضاحت اس پر دلالت کرتی ہے کہ سرادق سے مراد وہ دھواں یا آگ، اور وہ دیواریں ہیں جن کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے جو کفار پر غالب آ جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: المهل سے مراد گاڑھا پانی ہے جیسا کہ تیل کی تلچھٹ ہوتی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد پیپ اور خون ہے۔ حضرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 513　　2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 584　　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 303

4۔ جامع ترمذی، ابواب صفۃ جہنم، ما جاء فی صفۃ شراب اهل النار، جلد 2، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث نمبر 2508، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ کالے رنگ کا پانی ہے، بلاشبہ جہنم (تاریک) اور سیاہ ہے، اس کا پانی سیاہ ہے، اس کے درخت سیاہ ہیں اور اس کے باسی بھی سیاہ ہوں گے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: زمین کے جواہر میں سے ہر وہ شے جسے پگھلا دیا جائے مثلاً لوہا، سیسہ، تانبہ اور قذدیر (ایک دھات) اور وہ ابلنے کے سبب کھول رہی ہو، تو وہی مہل ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: مراد وہ ہے جس کی گرمائش اور حرارت انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور کہا ہے کہ المھل تارکول کی ایک قسم ہے، کہا جاتا ہے: مَھلت البعیر فھو ممھول (میں نے اونٹ پر تارکول ملا تو وہ تارکول والا ہوگیا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زہر ہے۔ اور ان تمام اقوال میں معنی قریب قریب ہے۔ اور ترمذی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: كَالْمُهْلِ کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''یہ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے پس جب کوئی اسے اپنے چہرے کے قریب کرے گا تو اس کے چہرے کی چمک اور رونق ختم ہو جائے گی (1)''۔ ابوعیسیٰ نے کہا ہے: اس حدیث کو ہم صرف رشدین بن سعد کی حدیث سے پہچانتے ہیں اور رشدین اپنی قوت حفظ کے اعتبار سے متکلم فیہ راوی ہے۔ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿ (ابراہیم) (پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا۔) کے بارے میں روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اسے اس کے منہ کے قریب کیا جائے گا تو وہ اسے ناپسند کرے گا پس جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو یہ اس کے چہرے کو بھون ڈالے گا اور اس کے سر کی کھال بالوں سمیت ادھڑ جائے گی اور جب وہ اسے پیئے گا تو یہ اس کی آنتوں کو کاٹ دے گا یہاں تک کہ اس کی دبر سے نکل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿ (محمد) (اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتوں کو)۔ مزید فرماتا ہے: وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ روایت ان اقوال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور اس پر کہ یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی طرح اہل لغت نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ صحاح میں ہے المھل سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: المھل سے مراد پگھلایا ہوا سیسہ ہے۔ اور ابوعمرو نے کہا ہے: المھل سے مراد تیل کی تلچھٹ ہے۔ اور المھل سے مراد پیپ بھی ہے، اور حضرت ابوبکر کی حدیث میں ہے: تم مجھے میرے انہی دو کپڑوں میں دفن کرنا کیونکہ یہ دونوں مہل اور مٹی کے لئے ہیں۔ اور مُرْتَفَقًا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (3): اس کا معنی ہے مجتمعا (جمع کیا ہوا)، گویا آپ مرافقت کے معنی کی طرف گئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس سے مراد منزل (ٹھکانا) ہے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اس کا معنی قرارگاہ ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی مھادًا (بچھونا) ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: مراد مجلس (بیٹھنے کی جگہ) ہے۔ اور یہ تمام معنی باہم متقارب ہیں، اور اس کی اصل المتکا (وہ شے جس سے ٹیک لگائی جائے) ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: ارتفقت

1۔ جامع ترمذی، ابواب صفۃ جہنم، ما جاء فی صفۃ شراب اهل النار، جلد 2، صفحہ 82

2۔ ایضاً۔ ایضاً، باب صفۃ شراب اهل النار، حدیث نمبر 2504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 514

یعنی میں نے کہنی پر ٹیک لگائی۔

شاعر نے کہا ہے:

قالت له وارتفقت ألاَفتَی　یسوق بالقوم غزالاتِ الضُّحا

اور کہا جاتا ہے: بات ارتفق الرجل جب آدمی اپنی کہنی پر سوئے اسے نیند نہیں آتی۔

ابوذؤیب ہذلی نے کہا ہے:

نام الخَلِیُّ و بتُّ اللیل مُرْتَفِقا　کأن عَیْنِی فیها الصَّاب مَذْبُوحُ(1)

اور الصاب سے مراد کڑوے درخت کا نچوڑ اور جوس ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۠﴿۳۱﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لئے ہیشگی کے جنت ہیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں کنگن سونے کے اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور موٹے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہوگا تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے وہاں مرصع پلنگوں پر کتنا اچھا ہے یہ اجر، اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ۔''

جب اللہ تعالیٰ نے اس ذلت و رسوائی کا ذکر کیا جو اس نے کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے تو پھر اس اجر و ثواب کا بھی ذکر کیا جو اس نے مومنوں کے لئے تیار کیا ہے۔ اور اس کلام میں اضمار ہے: یعنی لا نضیع أجر من أحسن منهم عملا، فأما من أحسن عملًا من غیر المؤمنین فعمله محبط۔ (ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو ان میں سے اچھا کام کرتا ہے اور رہا وہ جو مومنوں کے سوا کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا عمل ضائع اور رائیگاں چلا جاتا ہے۔) اور عَمَلًا تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور اگر تو چاہے تو اس پر اَحسن کو واقع کر کے اسے نصب دے دے۔ اور کہا گیا ہے کہ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا کلام معترض ہے، اور خبر قول باری تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ ہے۔ اور جَنّٰتُ عَدْنٍ جنت کے درمیان میں ہے اور باقی تمام جنات اس کے ارد گرد ہیں۔ اور اس کی وسعت کے سبب اسے لفظ جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا ہر حصہ اور ٹکڑا جنت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: العدن کا معنی اقامت اختیار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: عدن بالمکان

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 304

جب وہ اس جگہ اقامت اختیار کر لے۔ اور عَدَنَتِ البلد میں نے شہر کو وطن بنالیا۔ عَدَنَتِ الاِبلُ بمکان کذا یعنی اونٹ نے اسے لازم پکڑ لیا پس وہ مسلسل وہاں رہا۔ اور اسی سے جَنّٰتُ عَدْنٍ یعنی جنات اقامۃ ہے۔ اور اسی سے معدن (دال کے کسرہ کے ساتھ) نام رکھا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس میں موسم گرما اور موسم سرما میں مقیم ہوتے ہیں۔ اور ہر شے کا مرکز اس کا معدن ہوتا ہے۔ اور العادن وہ اونٹنی ہے جو چراگاہ میں مقیم ہو اور عدن شہر بھی ہے؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کئی مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ اس میں اساوِر سِوار کی جمع ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک تین کنگن پہنے ہوگا: ایک سونے کا ہوگا، ایک چاندی کا ہوگا، اور ایک موتیوں کا ہوگا (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے، یہاں فرمایا: مِنْ ذَهَبٍ سونے کا اور سورۃ الحج اور فاطر میں فرمایا: مِنْ فِضَّةٍ (چاندی کا) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے، میں نے اپنے خلیل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو (کا پانی) پہنچتا ہے (2)''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور فراء نے بیان کیا ہے: یحلون یہ یا کے فتحہ، حا کے سکون، اور لام کے فتحہ خفیفہ کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے: حَلِیَت المرأۃ تَحْلیٰ فھی حالیۃ جب عورت زیور پہن لے۔ اور حَلِیَ الشیٔ بعینی یَحْلیٰ (چیز میری آنکھوں میں بھلی معلوم ہوئی)؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور السِّوار سے مراد عورت کے کنگن ہیں۔ اور اس کی جمع أسورۃ اور الجمع أساورۃ ہے۔ اور فَلَوْ لَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (الزخرف: 53) بھی پڑھا گیا ہے اور کبھی جمع أساور آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور عزیز نے کہا ہے: أساور أسورۃ کی جمع ہے، اور أسورۃ سِوار اور سُوار کی جمع ہے، اور یہ سونے کا وہ زیور ہے جو بازوؤں میں پہنا جاتا ہے، اور اگر یہ چاندی کا ہو تو پھر یہ قُلْب کہلاتا ہے اور اس کی جمع قِلَبَۃ ہے، اور اگر یہ سینگ یا ہاتھی دانت وغیرہ کا بنا ہوا ہو تو پھر یہ مَسَکَۃ کہلاتا ہے اور اس کی جمع مَسَک ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اور قطرب نے الأساور کی واحد میں أسوار ذکر کیا ہے، اور قطرب شذوذ بیان کرنے والے ہیں، یعقوب وغیرہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اور اسے ذکر نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق صحاح میں ہے اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: اس کی واحد إسوار ہے۔ اور مفسرین نے کہا ہے: جب بادشاہ دنیا میں کنگن اور تاج پہنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل جنت کے لئے بنا دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ، السندس سے مراد باریک اور کمزور ریشم ہے۔ اس کا واحد سندسۃ ہے؛ یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور الاستبرق سے مراد موٹا ریشم ہے، یہ عکرمہ سے منقول ہے۔ اور یہ ریشم ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

تراهنّ يلبسن المشاعر مرّة　　واستبرقُ الديباج طَوْرًا لباسُها (3)

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 565　2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، فضل اسباغ الوضوء علی المکارہ، جلد 1، صفحہ 127

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 305

پس استبرق سے مراد الدیباج (ریشم) ہے۔ ابن بحر نے کہا ہے: وہ جو سونے کی تاروں کے ساتھ بنا گیا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: یہ لفظ فارسی سے معرب ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اس کی تصغیر اُبَیْرق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ البریق سے باب استفعال ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں لغتوں کے ساتھ موافقت رکھتا ہے، کیونکہ قرآن کریم میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو لغت عرب میں نہ ہو۔ جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور خاص طور پر سبز لباس کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نگاہوں کے موافق ہوتا ہے، کیونکہ سفید نظر کو بکھیر دیتا ہے، متفرق کر دیتا ہے اور درد پہنچاتا ہے۔ اور سیاہ رنگ کی مذمت کی گئی ہے، اور سبز رنگ سفید اور سیاہ کے درمیان درمیان ہوتا ہے، اور یہ شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: اس اثنا میں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے جب کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور اس نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں جنت کے کپڑوں کے بارے میں بتائیے، کیا وہ مخلوق ہے جسے پیدا کیا جائے گا یا بنا ہوا ہے جسے بنا جائے گا؟ تو بعض لوگ ہنس پڑے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو فرمایا: ''تم اس جاہل سے کیوں ہنس رہے ہو جو عالم (جاننے والے) سے سوال کر رہا ہے؟'' پس آپ تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے کپڑوں کے بارے سوال کرنے والا کہاں ہے؟'' تو اس نے عرض کی: یہ ہوں میں یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ ان سے جنت کا پھل کٹ جائے گا''۔ آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مومن کا گھر ایک موتی ہوگا جو درمیان سے خالی ہوگا اس کے درمیان ایک درخت ہے جو حلے اگاتا ہے اور آدمی ایک انگلی کے ساتھ یا فرمایا اپنی دو انگلیوں کے ساتھ ستر حلے پکڑ سکے گا درآنحالیکہ وہ موتیوں اور مرجان کے ساتھ آراستہ ہوں گے، یہ یحییٰ بن سلام نے اپنی تفسیر میں اور ابن مبارک نے اپنی رقائق میں ذکر کیا ہے۔ اور ہم نے اس کی اسناد کتاب ''التذکرۃ'' میں ذکر کی ہے۔ اور حدیث میں مذکور ہے کہ ان میں سے ہر پر ایک حلہ ہوگا اس کے دو منہ ہوں گے ہر منہ کا ایک رنگ ہوگا، وہ دونوں آواز کے ساتھ گفتگو کریں گے جسے سننے والا انتہائی مستحسن قرار دیگا، دونوں چہروں میں سے ایک دوسرے کو کہے گا: میں اللہ تعالیٰ کے ولی پر تجھ سے زیادہ مکرم و معزز ہوں، میں اس کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور تو اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے۔ اور دوسرا کہتا ہے: میں اللہ تعالیٰ کے ولی پر تجھ سے زیادہ مکرم و معزز ہوں، میں اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں اور تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ قولہ تعالیٰ: مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ، الْاَرَآىِٕكِ، أريكة کی جمع ہے۔ اور ان سے مراد وہ پلنگ ہیں جو حجلہ عروسی میں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ قالینیں ہیں جو حجلہ عروسی میں بچھی ہوتی ہیں، یہ زجاج نے کہا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ سونے کا پلنگ ہے، اور اسے حجلہ عروسی میں یاقوت اور موتیوں کے ساتھ مرصع اور آراستہ کیا جاتا ہے، الأريكة (ایک پلنگ) اتنا ہوگا جتنا صنعاء سے ایلہ تک کا سفر ہے اور جتنی عدن سے لے کر جابیہ تک کی مسافت ہے۔ اور متکئین کی اصل مُوتَكِئِين ہے، اور اسی طرح اتکا اصل میں اوتکأ ہے، اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 305

التُّکَاۃ کی اصل وُکَاۃ ہے، اور اسی سے التوکا کسی شے پر سہارا اور ٹیک لگانا، پس واؤ کو تا سے بدلا گیا اور پھر ادغام کر دیا گیا۔ اور رجل وُکَاۃ بہت زیادہ ٹیک لگانے والا آدمی نِعۡمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا یعنی جنات کتنا اچھا اجر اور کتنی اچھی آرامگاہ ہے، اور یہ وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا کا عکس ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور اگر یہ نِعۡمَتۡ ہوتا تو بھی جائز ہوتا کیونکہ یہ جنت کا نام ہے۔ اور اسی بنا پر وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ہے۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک اعرابی حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوا، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میدان عرفات میں اپنی ناقہ عضباء پر کھڑے تھے تو اس نے عرض کی: بلاشبہ میں مسلمان آدمی ہوں سو آپ مجھے اس آیت کے بارے آگاہ فرمائیے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیہ (البقرہ: 227) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان سے دور نہیں ہے اور نہ وہ تجھ سے دور ہیں وہ یہ چاروں یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں پس تو اپنی قوم کو یہ بتا کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)، اور نحاس نے اسے کتاب ''معانی القرآن'' میں مسند بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا، ہمیں ابو عبداللہ احمد بن علی بن سہل نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن حمید نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں یحییٰ بن ضریس نے زہیر بن معاویہ سے انہوں نے ابو اسحاق سے اور انہوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا: ایک اعرابی کھڑا ہوا، اور اسے مکمل ذکر کیا۔ اور سہیلی نے اسے ''کتاب الاعلام'' میں مسند بیان کیا ہے۔ اور ہم نے ان تمام کو بالا جازۃ روایت کیا ہے۔ والحمدللہ۔

وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَیۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِہِمَا جَنَّتَیۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّ حَفَفۡنٰہُمَا بِنَخۡلٍ وَّ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾ کِلۡتَا الۡجَنَّتَیۡنِ اٰتَتۡ اُکُلَہَا وَ لَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡہُ شَیۡئًا ۙ وَّ فَجَّرۡنَا خِلٰلَہُمَا نَہَرًا ﴿ۙ۳۳﴾ وَّ کَانَ لَہٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِہٖ وَ ہُوَ یُحَاوِرُہٗۤ اَنَا اَکۡثَرُ مِنۡکَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

''اور بیان فرمائیے ان کے لئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیئے تھے ان دونوں میں سے ایک کو دو باغ انگوروں کے اور ہم نے باڑ بنا دی ان دونوں کے ارد گرد کھجور (کے درختوں) کی اور اگا دی ان دونوں کے درمیان کھیتی۔ یہ دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کر دیں ان کے درمیان نہریں۔ اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے، تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَیۡنِ یہ مثال ہے اس آدمی کے لئے جو دنیا کے ساتھ عزت حاصل کرتا ہے اور مومنین کے ساتھ بیٹھنا ناپسند کرتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ کے ساتھ متصل ہے۔ اور ان دونوں آدمیوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 304

کے نام اور ان کی تعیین میں اختلاف ہے، پس کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اہل مکہ میں سے دو مخزومی بھائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان میں سے ایک مومن تھا اور وہ حضرت ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم تھے۔ ام سلمہ کے خاوند نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا تھا۔ اور دوسرا کافر تھا اور وہ اسود بن عبدالاسد تھا (1)، ان دونوں بھائیوں کا ذکر سورہ الصافات میں اس قول باری تعالیٰ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۙ (الصافات) کے تحت کیا گیا ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کو چار ہزار دینار وراثت میں ملے تھے، پس ان میں سے ایک نے اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا اور اس نے اپنے بھائی سے کسی شے کا مطالبہ کیا تو پھر اس نے کہا جو کہا .... ؛ اسے ثعلبی اور قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے والے تمام لوگوں اور کفر کرنے والے تمام لوگوں کی مثال ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ عیینہ بن حصن اور اس کے ساتھیوں کی حضرت سلمانؓ، حضرت صہیبؓ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مثال کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے وہ دونوں بھائی تھے ان میں سے ایک مومن تھا اور اس کا نام یہوذا تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ہے۔ اور حضرت مقاتل نے کہا ہے: اس کا نام تملیخا تھا، اور دوسرا کافر تھا (2) اور اس کا نام قرطوش تھا۔ اور یہی وہ دونوں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں بیان کیا ہے۔ اور اسی طرح محمد بن حسن مقری نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: ان دونوں میں سے جو نیک اور اچھا تھا اس کا نام تملیخا، اور دوسرے کا نام قرطوش تھا، اور یہ دونوں شریک تھے پھر انہوں نے مال تقسیم کر لیا تو ہر ایک کے حصہ میں تین ہزار دینار آئے، پس ان میں سے مومن نے ایک ہزار کے غلام خریدے اور انہیں آزاد کر دیا، اور دوسرے ہزار کے عوض کپڑے خریدے اور ننگوں کو پہنا دیئے، اور تیسرے ہزار کے عوض طعام خریدا اور بھوکوں کو کھلا دیا، اور مساجد بھی بنائیں اور نیکی اور خیر کا عمل کیا۔ اور رہا دوسرا تو اس نے اپنے مال کے عوض خوشحال اور مالدار عورتوں سے نکاح کیا اور چوپائے اور گائیں وغیرہ خریدیں اور ان سے ان کے بچے حاصل کئے تو اس طرح ان میں اس کے لئے خوب اضافہ ہو گیا، اور باقی ماندہ مال کے ساتھ اس نے تجارت کی اور اس سے نفع حاصل کیا یہاں تک کہ مال و دولت میں اپنے ہمعصروں سے سبقت لے گیا۔ اور پہلے آدمی کو کوئی حاجت پیش آ گئی، تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی باغ میں خدمت کے لئے خدمت پر دے دے کہ وہ اس کی خدمت کرتا رہے گا۔ تو اس نے کہا: اگر میں اپنے شریک اور اپنے ساتھی کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ وہ مجھے اپنے کسی باغ میں خدمت کے لئے اجرت پر رکھ لے تو مجھے امید ہے کہ وہ میرے لئے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو گا، چنانچہ وہ اس کے پاس آیا تو موٹے پردوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے وہ اس تک نہ پہنچ سکا، لیکن جب وہ اس پر داخل ہوا از راہ سے پہچانا اور اپنی حاجت اور ضرورت کا اس کے سامنے ذکر کیا تو اس نے اسے کہا: کیا میں نے تجھے مال نصف نصف کر کے دے نہیں دیا تھا، تو تو نے اپنے مال کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا: میں نے اس کے عوض اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ خرید لیا ہے جو اس سے بہتر اور اچھا ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ تو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 566 2۔ ایضاً

اس نے کہا: کیا تو یقینی تصدیق کرنے والوں میں سے ہے، میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے اور میں تجھے تو فقط احمق اور بے وقوف دیکھ رہا ہوں، اور میرے پاس تیری سفاہت اور بے وقوفی کی جزا سوائے محرومی اور پشیمانی کے اور کچھ نہیں، کیا تو دیکھتا نہیں جو کام میں نے اپنے مال کے ساتھ کیا یہاں تک کہ میں اس خوشحالی اور دولتمندی تک پہنچ گیا ہوں جو تو دیکھ رہا ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ میں نے کمایا اور تو نے بے توفی کی تو میرے پاس سے نکل جا۔ پھر اس غنا اور دولتمندی کے قصہ میں سے وہ ہے جو الله تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے کہ اس کے پھل کا احاطہ کیا اور اسے بالکل تباہ کر دیا اس عذاب کے ساتھ جو آسمان سے اس پر بھیجا گیا۔ اور ثعلبی نے یہ قصہ دوسرے لفظوں میں ذکر کیا ہے، اور معنوی اعتبار سے یہ دونوں قریب قریب ہیں۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: وہ دونوں شریک تھے اور ان کے آٹھ ہزار دینار تھے۔ اور کہا گیا ہے: وہ دونوں اپنے باپ کی طرف سے اس کے وارث بنے تھے اور وہ دونوں بھائی تھے اور انہوں نے اسے تقسیم کر لیا، تو ان میں سے ایک نے ایک ہزار کے بدلے زمین خرید لی، تو اس کے ساتھی نے کہا: اے الله! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت میں زمین خریدتا ہوں پس اس نے وہ صدقہ کر دیئے، پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار کے عوض گھر بنایا تو اس نے کہا: اے الله! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض گھر بنایا ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں، پھر ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے، پھر اس نے ایک عورت کے ساتھ شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کئے، تو اس نے کہا: اے الله! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض ایک عورت سے شادی کی ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار کے عوض جنت کی عورتوں کا رشتہ طلب کرتا ہوں، اور پھر ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے، پھر اس نے ایک ہزار دینار کے بدلے خدام اور ساز و سامان خریدا ہے، اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت کا ساز و سامان اور خادم خریدتا ہوں، چنانچہ ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ پھر اسے کوئی شدید حاجت پیش آ گئی تو اس نے کہا: شاید میرا ساتھی میرے ساتھ نیکی کرے گا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آیا تو اس نے کہا: تیرے مال کو کیا ہوا ہے؟ تو اس نے اسے سارے واقعہ کی خبر دی تو اس نے کہا: بلاشبہ تو تصدیق کرنے والوں میں سے ہے اس بات کے بارے، قسم بخدا! میں تجھے کوئی شے نہ دوں گا۔ پھر اس نے اسے کہا: تو آسمان والے خدا کی عبادت کرتا ہے، اور میں صرف بت کی پرستش کرتا ہوں، تو اس کے ساتھی نے کہا: قسم بخدا! میں یقیناً اسے نصیحت کروں گا، پس اس نے وعظ و نصیحت کی، اور اسے یاد دلایا اور اسے خوفزدہ کیا۔ تو اس نے کہا: ہمارے ساتھ چل ہم مچھلی کا شکار کریں گے۔ پس جس نے زیادہ پکڑ لیں تو وہ حق پر ہو گا، تو اس نے اسے کہا: اے میرے بھائی! بے شک دنیا الله تعالیٰ کے نزدیک بہت حقیر ہے اس سے کہ وہ اسے نیکی اور احسان کرنے والے کے لئے اجر و ثواب بنائے یا کافر کے لئے سزا۔ اس نے کہا: تو میں اس کے ساتھ نکلنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس الله تعالیٰ نے دونوں کو ابتلا میں ڈال دیا، پس کافر اپنا جال پھینکتا ہے اور ساتھ اپنے بت کا نام لیتا ہے۔ تو اس میں اچھلتی کودتی مچھلیاں آ جاتی ہیں، اور مومن اپنا جال پھینکتا ہے اور اس پر وہ الله تعالیٰ کا نام لیتا ہے تو اس کے لئے اس میں کوئی شے نہیں آتی، تو اس نے اس کو کہا: تو دیکھ رہا ہے! میں دنیا میں اپنے حصہ، مرتبہ اور افرادی قوت کے اعتبار سے تجھ سے زیادہ ہوں، اسی طرح

میں آخرت میں بھی تجھ سے افضل ہوں گا۔ اگر جو تو کہہ رہا ہے تیرے خیال کے مطابق وہ حق ہے، پس وہ فرشتہ جوان دونوں کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا اس نے شور مچایا، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اسے پکڑ لے اور اسے جنتوں کی طرف لے جائے اور اس میں اسے مومن کے مراتب اور گھر دکھائے پس جب اس نے دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا ہے تو اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! اسے کوئی نقصان نہیں دے گا جو کچھ اس نے دنیا میں پالیا ہے اس کے بعد کہ اس کا انجام اور ٹھکانہ یہ ہے، اور اس نے اسے جہنم میں کافر کی منازل بھی دکھائیں تو اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! اسے کوئی نفع نہیں دے گا جو کچھ دنیا میں اسے حاصل ہوا ہے اس کے بعد کہ اس کا ٹھکانہ یہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مومن کو موت دے دی اور کافر کو اپنے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا، پس جب مومن نے جنت میں اقامت اور ٹھکانا حاصل کر لیا اور وہ کچھ دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا تھا تو وہ اور اس کے ساتھی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ بس فرمایا: اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ الآیہ۔ (الصافات) (کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا وہ (مجھے) کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت پر) ایمان لانے والوں سے ہے۔) تو ایک ندا دینے والے نے ندا دی: اے اہل جنت! کیا تم جھانک رہے ہو پس وہ جہنم کی طرف جھانکا اور اسے سواء الجحیم میں دیکھ لیا، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا الآیہ (اور بیان فرمایئے ان کے لئے مثال)

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دو بھائیوں کا حال اس سورت میں بیان کیا، اور آخرت میں دو کا حال سورۃ الصافات میں اپنے اس قول میں بیان کیا: اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ …… تا قولہ …… لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ (الصافات) ابن عطیہ نے کہا ہے (1)؛ اور ابراہیم بن قاسم الکاتب نے اپنی کتاب فی عجائب البلاد میں ذکر کیا ہے کہ بحیرۂ تِنِیس یہ دو باغ تھے، اور یہ دو بھائیوں کے تھے تو ان میں سے ایک نے اپنا حصہ دوسرے کو بیچ دیا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اسے خرچ کر دیا یہاں تک کہ دوسرے نے اسے عار دلائی، اور ان دونوں کے درمیان گفتگو چلتی رہی تو اللہ تعالیٰ نے ایک رات میں اسے غرق اور تباہ کر دیا، اور وہی اس آیت سے مراد لیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے: بے شک یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے بیان فرمائی ہے، یہ کسی سابقہ حالت کی خبر نہیں ہے، اور اسے زجر و توبیخ اور ڈراوا بنایا ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے، لیکن سیاق آیت اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ یعنی ہم نے ان دونوں کو اطراف سے کھجور کے درختوں کے ساتھ گھیر دیا ہے اور الحِفاف کا معنی طرف اور جانب ہے، اور اس کی جمع اَحِفّة ہے؛ اور کہا جاتا ہے: حَفَّ القومُ بفلان یَحُفُّوْنَ حَفًّا، یعنی انہوں نے اسے گھیر لیا۔ اور اسی سے حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (الزمر:75) (حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے اردگرد) ہے۔ وَجَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا یعنی ہم نے انگوروں کے اردگرد کھجور کے درخت اگا دیئے، اور انگوروں کے درمیان میں کھیتی اگا دی۔ كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ یعنی دونوں باغوں میں سے ہر ایک اٰتَتْ اُكُلَهَا مکمل پھل لایا، اسی لئے آتتا نہیں کہا۔ اور لفظ کِلْتا اور کِلا میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 515

اختلاف ہے کیا یہ مفرد ہیں یا تثنیہ؟ پس اہل بصرہ نے کہا ہے: یہ مفرد ہیں، کیونکہ کِلا اور کِلتا دونوں تثنیہ کی تاکید کے لئے ہیں جیسا کہ جمع میں تاکید کے لئے کُلٌّ ہے اور یہ اسم مفرد ہے تثنیہ نہیں ہے، پس جب اس کے بعد اسم ظاہر ہو تو حالت رفعی نصبی اور جری میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے۔ تو کہتا ہے: رأیت کِلا الرجلین و جاء نی کِلا الرجلین اور مررتُ بِکلا الرجلین اور جب اس کے ساتھ ضمیر متصل ہو تو حالت نصبی اور جری میں الف کو یا سے بدل دیا جاتا ہے، جیسے تو کہتا ہے: رأیت کِلَیْهما اور مررت بِکلیهما، جیسے تو علیهما کہتا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ اسم تثنیہ ہے، اور یہ کُلّ سے ماخوذ ہے پس لام کو مخفف کیا گیا اور الف تثنیہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اسی طرح کلتا مونث کے لئے آتا ہے، اور یہ دونوں استعمال نہیں ہوتے مگر مضاف ہو کر اور واحد کے ساتھ کلام نہیں کی جاتی، اور اگر اس کے ساتھ کلام کی جائے تو کہا جائے گا: کِلٌ و کِلْت اور کِلان و کِلتان۔

اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا گیا ہے:

فی کِلْتِ رجلیها سُلامی واحدَة كِلتاهما مَقْرونةٌ بزائدہ

اس میں شاعر نے اس کے دو پاؤں میں سے ایک کا ارادہ کیا ہے پس اسے مفرد ذکر کیا ہے۔ اور اہل بصرہ کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ اگر یہ تثنیہ ہوتا تو پھر یہ واجب تھا کہ اس کا الف حالت نصبی اور جری میں اسم ظاہر کے ساتھ یا ہو جاتا، اور اس لئے بھی کہ کِلا کا معنی کُلٌّ کے معنی کے خلاف ہے کیونکہ کُلٌّ احاطہ کے لئے آتا ہے اور کِلا مخصوص شے پر دلالت کرتا ہے، اور رہا یہ شاعر تو اس نے ضرورت شعری کے تحت الف کو حذف کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے، اور جو چیز ضرورت کے تحت ہوتی ہے اس کو حجت بنانا جائز نہیں ہوتا، پس یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اسم مفرد ہے جیسا کہ کِمعی مگر اسے وضع کیا گیا ہے کہ یہ تثنیہ پر دلالت کرے، جیسا کہ ان کا قول نَحْنُ اسم مفرد ہے لیکن دو اور اس سے زیادہ پر دلالت کرتا ہے۔

اس پر جریر کا قول دلالت کرتا ہے:

كِلا يَومَیْ أمَامَةَ يومُ صَدٍّ وإن لم نأتها إلَّا لِماما

پس کِلا سے مفرد یوم کی خبر دی گئی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول: آتت کے ساتھ مفرد کی خبر دی ہے اور اگر تثنیہ ہوتا تو کہتا آتتا، و یوماً اور کِلْتَا کے الف کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ پس سیبویہ نے کہا ہے: کِلْتَا کا الف تانیث کے لئے ہے اور تا فعل کے لام کلمہ کا بدل ہے اور وہ واو ہے اور یہ اصل میں کِلوا ہے، بے شک واؤ کو تا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ تا میں تانیث کی علامت ہے، اور کِلتا میں الف مضمر کے ساتھ ملنے سے یا ہو جاتا ہے پس وہ تانیث کی علامت سے نکل جاتا ہے، پس واؤ کو تا سے بدلنے میں تانیث کے لئے تاکید ہو گئی، اور ابو عمرو الجرمی نے کہا ہے: اس میں تا ملحق ہے اور الف لام الفعل ہے، اور ان کے نزدیک اس کی تقدیر فِعْتَلٌ ہے، اگر معاملہ اس طرح ہو جیسے انہوں نے گمان کیا ہے تو پھر وہ اس کی نسبت میں کِلْتَوِیٌّ کہتے، اور جب انہوں نے کِلَوِیٌّ کہا اور تا کو ساقط کر دیا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے اسے اس تا کے قائم مقام قرار دیا ہے جو اُخت میں ہے جب تو اس کی طرف نسبت کرتا ہے تو کہتا ہے اَخَوِیٌّ، اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اور نحویوں نے قرآن کے علاوہ میں معنی پر محمول کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے کہ تو کہے: کلتا

الجنتین آتتا أکلھما، کیونکہ معنی مختار کلتا ھما آتتا ہے۔ اور فراء نے کلتا الجنتین آتی أکلہ کہنا بھی جائز قرار دیا ہے، انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس کا معنی کل الجنتین (دو باغوں میں سے ہر ایک) ہے۔ اور کہا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں کل الجنتین آتی أکلہ ہے۔ (دو باغوں میں سے ہر ایک اپنا پھل لایا) اس بنا پر فراء کے نزدیک اس کا معنی ہے: کل شیء من الجنتین آتی أکلہ۔ (دو باغوں میں سے ہر شے اپنا پھل لائی) اور الاُکُل (ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ) سے مراد کھجور کے درخت اور دیگر درختوں کا پھل ہے۔ اور ہر وہ شے جو کھائی جاتی ہے وہی اُکل ہے، اور اسی معنی میں یہ قول باری تعالیٰ ہے: اُکُلُهَا دَآئِمٌ (جنت کے پھل دائمی ہیں) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا یعنی اس سے کوئی چیز کم نہیں ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا یعنی ہم نے دونوں باغوں کے درمیان کو شق کیا اور نہر جاری کر دی وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ابو جعفر، شیبہ، عاصم، یعقوب اور ابن ابی اسحاق نے ثَمَرٌ ثا اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ یہ ثمرۃ کی جمع ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الثمرۃ، الثمر اور الثمرات کی واحد ہے، اور الثمر کی جمع ثمار ہے جیسا کہ جبل کی جمع جبال ہے۔ فراء نے کہا ہے: ثمار کی جمع ثُمُر ہے؛ جیسا کہ کتاب کی جمع کتب ہے، اور الثمر کی جمع اثمار ہے مثلاً عنق کی جمع اعناق ہے۔ اور الثمر سے مراد المال الثمر (نفع بخش مال) بھی ہے اس میں میم مخفف اور مثقل دونوں طرح ہے۔ اور ابو عمرو نے کان لہ ثُمْرٌ ثا کو ضمہ اور میم کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کی تفسیر انواع المال (طرح طرح کا مال) کی ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد سونا، چاندی اور دیگر اموال ہیں، سورہ الانعام میں اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔

اور نحاس نے ذکر کیا ہے: احمد بن شعیب نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عمران بن بکار نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں ابراہیم بن علاء زبیری نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں شعیب بن اسحاق نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا [ہمیں خبر دی ہے] ہارون نے انہوں نے کہا مجھے اَبان نے ثعلب سے انہوں نے اعمش سے بیان کیا ہے کہ حجاج نے کہا ہے: اگر تو کسی کو وکان لہ ثُمُر پڑھتے ہوئے سنے تو تو اس کی زبان کاٹ دے، تو میں نے اعمش کو کہا: کیا تو اسے پکڑ سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں ولا نُعْمَةَ عَيْن (اور آنکھ جیسی کوئی نعمت نہیں ہے) اور وہ ثُمُر پڑھتے تھے اور اسے الثمر کی جمع بناتے تھے۔ نحاس نے کہا ہے: پس اس قول کی بنا پر تقدیر یہ ہے کہ یہ ثمرۃ کی جمع ثمار ہے، اور پھر ثمار کی جمع ثُمُر ہے، اور عربی میں یہی احسن ہے مگر پہلا قول زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کیونکہ قول باری تعالیٰ: كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اس کا پھل ہے۔ قولہ تعالیٰ: فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ یعنی وہ اس کے ساتھ کلام میں سوال و جواب کرنے لگا۔ (بحث و مباحثہ کرنے لگا) اور المحاورۃ بمعنی المجاوبۃ (ایک دوسرے کو جواب دینا) ہے اور التحاور بمعنی التجاوب (باہم گفتگو کرنا) ہے، اور کہا جاتا ہے: کلمتہ فما أحار إلی جوابا، و ما رجع إلی حویرا ولا حِویرۃ ولا مَحُورۃ و لا حوارًا: یعنی میں نے اس کے ساتھ کلام کی اور اس نے کوئی جواب نہ لوٹایا۔ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا، النفر سے مراد وہ جماعت ہے جو دس سے کم ہو۔ اور یہاں اس سے مراد

اتباع کرنے والے، خدام اور بچے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

''اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ (یہ سرسبز وشاداب) باغ کبھی برباد ہوگا۔ اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی۔ اور بفرض محال اگر مجھے لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں پاؤں گا اس (نزہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ کہا گیا ہے: اس نے اپنے مومن بھائی کا ہاتھ پکڑا اور اسے باغ میں گھمانے لگا اور اسے وہ دکھانے لگا۔ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ درآنحالیکہ وہ اپنے کفر کے سبب اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، اور یہ جملہ حال کے محل میں ہے۔ اور جس نے اپنے آپ کو کفر کے سبب جہنم میں ڈال دیا تو وہ اپنے ساتھ ظلم کرنے والا ہی ہے۔ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا یعنی اس نے دار (باغ) کے فناہ ہونے کا انکار کیا۔ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً یعنی میں خیال نہیں کرتا کہ کبھی بعث یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا بھی ہوگا۔ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ یعنی اگر دوبارہ زندہ کیا گیا تو جس طرح اس نے مجھے دنیا میں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو وہ مجھے میری عزت افزائی کے لئے اس سے افضل اور بہتر نعمتیں عطا فرمائے گا؛ اور قول باری تعالیٰ: لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا کا یہی معنی ہے۔ اس نے یہ اس وقت کہا جب اس کے بھائی نے اسے حشر ونشر پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اور مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور شام کے مصاحف میں منهما ہے۔ اور اہل بصرہ وکوفہ کے مصاحف میں منها واحد ہونے کی بنا پر ہے، لیکن تثنیہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ ضمیر جنتین کے قریب تر ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

''اس کے ساتھی نے اسے بحث مباحثہ کے درمیان کہا: کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا۔ لیکن میں، (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ یعنی اس کے ساتھی یہوذا یا تملیخا نے کہا: یہ اس کے نام میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا یعنی اس نے اسے نصیحت کی اور اس کے لئے وضاحت کی کہ ان چیزوں میں سے جن کا اس نے اعتراف کیا ہوا ہے یہ وہ ہیں جن کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ یہ اعادہ کی نسبت عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ اور سَوّٰىكَ رَجُلًا یعنی اس نے تجھے معتدل قدوقامت والا، معتدل مخلوق، اور صحیح الاعضاء مرد بنایا ہے۔ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ اسی طرح اسے ابوعبدالرحمن سلمی اور ابوالعالیہ نے پڑھا ہے اور کسائی سے روایت کیا گیا ہے لکن ھو اللہ معنی

لکن الامر هو الله ربی (لیکن معاملہ یہ ہے وہ اللہ ہی میرا رب ہے۔) پس لکن کا اسم اس میں مضمر ہے۔ اور باقیوں نے لکنا الف کو ثابت رکھ کر پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر عبارت ہے لکن الله هو ربی أنا، (لیکن اللہ وہی میرا رب ہے) تو اس میں أنا سے کثرت استعمال اور تخفیف کے لئے ہمزہ حذف کر دیا گیا اور دونوں میں سے ایک کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ اور أنا کے الف کو حالت وصل میں حذف کر دیا گیا اور حالت وقف میں ثابت رکھا گیا۔ اور نحاس نے کہا ہے: کسائی، فراء اور مازنی کا مذہب یہ ہے کہ یہ اصل میں لکن أنا ہے پس ہمزہ کی حرکت لکن کی نون کو دے دی گئی اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا اور نون کو نون میں ادغام کر دیا گیا پس وقف اس پر ہے لکنا اور یہ الف حرکت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: اصل میں لکن أنا ہے، پس الف کو حذف کر دیا گیا اور دونوں نون مل گئیں اس لئے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا گیا۔

اور کسائی نے ہمیں یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

لَهِنَّكِ من عَبسِيَّة لَوَسِيمَةٌ ۔۔۔ على هَنَوَاتٍ كاذب من يقولها

ارادہ یہ کیا: لله إنك [لوسيمة]، پس لله سے دو لاموں میں سے ایک کو ساقط کر دیا اور إنك سے الف کو حذف کر دیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے اور اس نے اسے اصل کے مطابق ذکر کیا ہے:

وترميننى بالطَّرف اى أنت مذنب ۔۔۔ و تَقْلِيْنَنى لكنّ اِيَّاكِ لا أَقْلِي

ای لکن أنا۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے اور انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے: لکنا هو الله ربی اور گمان کیا ہے کہ یہ لحن (غلطی) ہے، یعنی درج کلام میں الف کو ثابت رکھنا۔

زجاج نے کہا ہے: درج کلام میں لکنا هو الله ربی میں الف کو ثابت رکھنا جید اور عمدہ ہے، کیونکہ کبھی أنا سے الف کو حذف کر دیا جاتا ہے پس وہ اسے بطور عوض لائے ہیں۔ فرمایا: اور حضرت ابی کی قرأت میں لکن أنا هو الله ربی ہے۔ اور ابن عامر اور مسیلی نے نافع اور رویس سے اور انہوں نے یعقوب سے لکنا حالت وقف اور حالت وصل دونوں میں اثبات الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور شاعر کا قول ہے:

أنا سيف العشيرة فاعرفونى ۔۔۔ حُمَيْدًا قد تَذَرَّيْتُ السَّناما

اور اعشی نے کہا ہے:

فكيف أنا و انتحال القوافى ۔۔۔ بعد المشيب كفى ذاك عارا

اور حالت وقف میں الف کو ثابت رکھنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ هُوَ اللهُ رَبِّي، هُوَ ضمیر قصہ اور شان اور اَمر ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا (الانبیاء: 97) اور قول باری تعالیٰ ہے: قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ (الاخلاص) (ان میں هی اور هو ضمیر قصہ و شان ہیں) وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا اس کا مفہوم اس پر دلیل ہے کہ دوسرا

بھائی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا تھا اور کسی اور کی عبادت کرتا تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس سے یہ ارادہ کیا ہو کہ میں غنا اور فقر کو نہیں دیکھتا مگر اسی کی طرف سے، اور میں یہ جانتا ہوں کہ اگر وہ کسی دنیا دار کی دنیا کو سلب کرنا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے اور وہی ہے جس نے مجھے فقر و افلاس دیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ ارادہ کیا ہو کہ تیرے دوبارہ زندہ کئے جانے کے انکار کا انجام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت نہیں رکھتا، اور یہ رب سبحانہ و تعالیٰ کو عاجز قرار دیتا ہے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو عاجز قرار دیا تو اس نے اسے مخلوق کے مشابہ قرار دیا، تو یہی شرک کرنا ہے۔

وَ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

”اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا: ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں) اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں، پس عجب نہیں کہ میرا رب مجھے عطا فرما دے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر (کوئی) آسمانی عذاب۔ تو ہو جائے یہ (سرسبز) باغ ایک چٹیل میدان، یا یوں جذب ہو جائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پا سکے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تو دل کے ساتھ (باغ میں داخل ہوتے وقت یہ الفاظ کہتا: مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)، اور یہ مومن کی جانب سے کافر کو جھڑک بھی ہے اور نصیحت بھی اور اس کے اس قول کا رد بھی ہے کہ جب اس نے کہا: مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا (میں یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی برباد بھی ہوگا) اور ”ما“ محل رفع میں ہے۔ تقدیر کلام ہے: ھذہ الجنۃ ھی ما شاء اللہ (یہ باغ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے) اور زجاج اور فراء نے کہا ہے: الأمر ما شاء اللہ، یا ھو ما شاء اللہ، یعنی امر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا جواب مضمر ہے، یعنی ما شاء اللہ کان، و ما لا یشاء لا یکون۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور وہ جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔) لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تیرے پاس جو مال بھی جمع ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قوت سے ہے نہ کہ تیری قدرت اور تیری قوت سے، اور اگر وہ چاہے تو اس سے برکت کھینچ لے تو پھر یہ جمع نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اشہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت یہ کہے...... اور ابن وہب نے کہا ہے: مجھے حفص بن میسرہ نے کہا ہے: میں نے وہب بن منبہ کے دروازہ پر یہ لکھا ہوا دیکھا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ”کیا میں تیری ایک ایسے کلمہ پر راہنمائی نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے...... یا فرمایا: جو جنت کے خزانوں میں سے ایک

خزانہ ہے۔" میں نے عرض کی: کیوں نہیں ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ جب کوئی آدمی یہ کہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے نے اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لی ہے اور وہ تابعدار ہو گیا ہے(1)"۔ اسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ فرمایا: "اے ابا موسیٰ! یا اے عبداللہ بن قیس! کیا میں تیری راہنمائی ایسے کلمہ پر نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے....." میں نے عرض کی: وہ کیا ہے یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ(2)۔ اور آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "کیا میں تیری راہنمائی ایسے کلمہ پر نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے یا جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے" میں نے عرض کی: کیوں نہیں (ضرور بتائیے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم(3) اور روایت ہے کہ جو کوئی اپنے گھر میں داخل ہوا یا اس سے باہر نکلا اور اس نے یہ کہا: بسم اللہ ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ تو شیاطین اس سے اس کے سامنے سے بھاگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر برکتیں نازل فرماتا ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: جب آدمی اپنے گھر سے باہر نکلے تو کہے باسم اللہ تو فرشتہ کہتا ہے تیری راہنمائی کر دی گئی، اور جب کہے ما شاء اللہ تو فرشتہ کہتا ہے تجھے بے نیاز کر دیا گیا، اور وہ کہے: لا قوۃ الا باللہ تو فرشتہ کہتا ہے: تو بچا لیا گیا، اسے ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے کہا جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ بسم اللہ توکلت علی اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو اسے کہا جاتا ہے: تجھے بے نیاز کر دیا گیا اور تجھے بچا لیا گیا اور اس سے شیطان دور ہو جاتا ہے(4)"۔ یہ حدیث غریب ہے میں اسے اس سند کے سوا نہیں جانتا۔ اسے ابوداؤد نے بھی ذکر کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے پس اس کے لئے فرمایا: "تیری راہنمائی کر دی گئی، تجھے بے نیاز کر دیا گیا اور تجھے بچا لیا گیا(5)"۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب آدمی اپنے گھر کے دروازے سے یا اپنے دار (حویلی) کے دروازے سے باہر نکلتا ہے تو اس کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ مقرر ہیں پس جب وہ کہے باسم اللہ وہ دونوں کہتے ہیں تیری راہنمائی کر دی گئی اور جب وہ کہے: لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو وہ کہتے ہیں تجھے بچا لیا گیا اور جب وہ کہے: توکلت علی اللہ تو وہ کہتے ہیں تجھے بے نیاز کر دیا گیا فرمایا پس اس کے دو ساتھی اس سے ملاقات کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: تم اس آدمی سے کیا ارادہ رکھتے ہو حالانکہ اسے ہدایت دے دی گئی ہے اور اسے بچا لیا گیا ہے اور اس کو بے نیاز کر دیا گیا ہے(6)"۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب لاحول ولا قوۃ، جلد 2، صفحہ 949

2۔ صحیح مسلم، کتاب الدعوات، استحباب خفض الصوت، جلد 2، صفحہ 346　　3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، لاحول ولا قوۃ، جلد 2، صفحہ 949

4۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ما یقول اذا خرج من بیتہ، جلد 2، صفحہ 180

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، ما یقول اذا دخل فی بیتہ، جلد 2، صفحہ 339

6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، ما یدعو الرجل اذا خرج من بیتہ، صفحہ 285

اور حاکم ابوعبداللہ نے علوم الحدیث میں کہا ہے، محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے پوچھا گیا: "جنت اور دوزخ نے باہم جھگڑا کیا تو اس یعنی جنت نے کہا مجھ میں ضعفاء داخل ہوں گے (1)" تو یہ ضعیف کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ ہے جو اپنے آپ کو دن میں بیس مرتبہ یا پچیس مرتبہ لاحول ولا قوۃ کے ساتھ بری کرتا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو کسی شے کو دیکھے اور وہ اسے اچھی اور خوبصورت لگے تو وہ کہے مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تو اسے نظر نقصان نہیں پہنچائے گی۔" اور ایک قوم نے کہا ہے: کوئی نہیں ہے جس نے ماشاء اللہ کہا تو پھر کوئی شے بھی اسے پہنچی مگر وہ اس کے ساتھ راضی ہوگا۔

اور روایت ہے کہ جس نے چار (قول) کہے وہ چار سے محفوظ رہے گا: جس نے یہ کہا وہ نظر بد سے محفوظ ہو گیا۔ اور جس نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (آل عمران) وہ شیطان کے مکر سے محفوظ ہو گیا، اور جس نے کہا وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (غافر: 44) وہ لوگوں کے مکر سے محفوظ رہے گا۔ اور جس نے کہا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) تو وہ غم سے محفوظ رہے گا۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا، اِنْ شرطیہ ہے تَرَنِ اسی کے سبب مجزوم ہے اور جواب شرط فَعَسٰى رَبِّيْۤ ہے اور اَنَا بطور فاصل ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اور نون اور یا کی تاکید کے لئے ہو۔ اور عیسیٰ بن عمر نے: ان ترنِ انا اقلُّ منك رفع کے ساتھ پڑھا ہے؛ وہ اَنَا کو مبتدا بنا رہے ہیں اور اَقَلُّ اس کی خبر ہے اور پھر مکمل جملہ دوسرے مفعول کے محل میں ہے، اور مفعول اول نون اور یا ہیں، مگر یہ کہ یا کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ اس پر دلالت کرتا ہے، اور اس کو ثابت رکھنا جید اور بلیغ ہے اور یہی اصل ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت اسم ہے۔ اور فَعَسٰى بمعنی لعل ہے۔ ای فلعل ربی۔ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ شاید میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے کوئی بہتر چیز آخرت میں عطا فرمادے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں (اس سے بہتر عطا فرمادے)۔ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا اور وہ تیرے باغ پر بھیج دے حُسْبَانًا آسمان سے عذاب، اس کا واحد حُسْبَانَۃ ہے؛ یہ اخفش، قتبی اور ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: الحسبانۃ کا معنی بادل ہے، اور الحسبانۃ کا معنی تکیہ ہے اور الحسبانۃ کا معنی صاعقہ (بجلی کی کڑک) ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: الحُسبان (ضمہ کے ساتھ ہو) تو اس کا معنی عذاب ہے۔ اور ابو زیاد الکلابی نے کہا ہے: أصاب الأرض حسبان یعنی زمین پر ٹڈی غالب آ گئی۔ اور الحسبان کا معنی حساب بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ (رحمن) اور یہاں حسبان کی یہی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: الحسبان، الحساب سے ہے، یعنی وہ اس پر حساب کا عذاب بھیج دے، اور یہ اس کا حساب ہے جو کچھ تیرے ہاتھوں نے کمایا (اعمال کئے)، پس یہ حذف مضاف کے باب سے ہے۔ اور الحسبان سے مراد چھوٹے تیر بھی ہیں جو ایک ہی بار میں پھینکے جاتے ہیں اور یہ اکاسرہ کے تیروں میں سے تھے۔

اور المرامی من السماء سے مراد عذاب ہے۔ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا یعنی ایسی سفید زمین ہو جائے جس میں نہ کوئی سبزہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، ماجاء احتجاج الجنۃ، جلد 2، صفحہ 80

اگتا ہے اور نہ اس پر قدم ثابت رہتا ہے، اور یہ سب سے زیادہ نقصان دہ زمین ہو جائے اس کے بعد کہ یہ ایک باغ تھا اور نفع بخش زمین تھی؛ اور زَلَقًا، صعید کے وصف کی تاکید کے لئے ہے، یعنی اس کی چکناہٹ کی وجہ سے اس سے پاؤں پھسلتے ہوں۔ کہا جاتا ہے: مکان زَلَق یعنی پھسلنی جگہ، اور یہ اصل میں مصدر ہے تیرے اس قول کا زلقت رجلہ تَزْلَق زَلَقًا، وأزلقها غیرہ (کسی غیر نے اسے پھسلا دیا) اور الزلق کا معنی عجز الدابۃ (جانور کا پچھلا حصہ) بھی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

كأنها حقباء بلقاء الزَّلَق

اور المَزْلَقَة والمُزْلَقَة: مراد وہ جگہ ہے جس پر پاؤں ثابت نہ رہتے ہوں (یعنی نہ جمتے ہوں بلکہ پھسل جاتے ہوں) اور اسی طرح الزَّلَّاقة بھی ہے۔ اور الزَّلَق کا معنی الحَلْق (مونڈنا) ہے، زَلَق رأسه يَزْلِقُهُ زلقا اس نے اس کا سر مونڈ دیا؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور الزَّلَق کا معنی المحلوق (مونڈا ہوا) ہے، جیسا کہ النَّقْض اور النَّقَض ہے۔ اور مراد یہ نہیں ہے کہ مونڈی ہوئی ہو جائے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی سبزہ باقی نہیں رہے گا جیسا کہ سر جب اسے مونڈ دیا جائے تو اس پر کوئی بال باقی نہیں رہتا؛ یہ قشیری نے کہا ہے: أَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا یعنی یہ غائرًا ذاهبًا کے معنی میں ہے۔ یا اس کا پانی بہت نیچے چلا جائے، تو یہ پانی نہ دینے والی زمین ہو جائے گی اس کے بعد کہ یہ پانی دینے والی زمین تھی۔ اور الغور مصدر ہے اسے اسم کی جگہ رکھا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل صَوْمٌ و فطرٌ و عدلٌ و رِضًا و فضلٌ و زَوْرٌ و نساءٌ نَوْحٌ (یہ تمام مصدر اسم کی جگہ مذکور ہیں) اس میں مذکر و مؤنث اور تثنیہ و جمع سب برابر ہوتے ہیں۔

عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

تظلّ جيادہ نَوحًا عليه مقلّدةً أعنّتها صُفُونا(1)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

هريقي من دموعهما سجاما ضُباع و جاوبي نوحا قياما

یعنی اس میں نوحا بمعنی نائحات ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: أو يصبح ماؤها ذا غور (اس کا پانی نیچے اترنے والا ہو جائے) پس اس سے مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: ماءٌ غَوْرٌ۔ وقد غار الماء يغور غورا و غُؤورا، یعنی پانی زمین میں نیچے چلا گیا، اور واؤ کے مضموم ہونے کی وجہ سے ہمزہ بھی جائز ہے۔ اور غارت عينه تَغُور غَوْرًا و غُؤورًا، یعنی اس کی آنکھیں سر میں دھنس گئیں۔ اور غارت تغار بھی اس میں لغت ہے۔ اور کسی شاعر کا قول ہے:

أغارت عينُه ام لم تَغَارَا

(اس کی آنکھ دھنسے یا نہ دھنسے) اور غارت الشمس تغور غيارا، یعنی سورج غروب ہو گیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 518

ابوذویب نے کہا ہے:

هل الدهر إلّا ليلة و نهارُها والاطلوعُ الشمس ثم غيارها

فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا یعنی تو ہرگز نیچے اترے ہوئے پانی کو واپس لانے کی استطاعت نہیں رکھے گا اور کسی حیلہ کے ساتھ اس پر قادر نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پس تو ہرگز اس کے بدلے کسی اور کی طلب کی استطاعت نہیں رکھے گا۔ اور اس بات پر اس کے بھائی کا مناظرہ اور اس کا ڈرانا ختم ہو گیا۔

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝

''اور اس کے (باغ) کا پھل برباد ہو گیا پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور (اب) وہ گر پڑا تھا اپنے چھپروں پر اور (بصد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ اس میں اسم مالم یسم فاعلہ مضمر ہے، اور وہ مصدر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں اسم مجرور محل رفع میں ہو۔ اور اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ کا معنی ہے اس کا سارے کا سارا مال ہلاک کر دیا گیا۔ اور یہ وہ پہلی چیز ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے بھائی کے ڈراوے کو ثابت کر دیا اور حقیقت بنا دیا۔ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ یعنی کافر ندامت کے سبب اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارنے لگا کیونکہ یہ فعل نادم سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی ملکیت الٹ پلٹ کرتا ہے اور جو کچھ اس نے خرچ کیا ہے اس کا عوض اور بدلہ اس میں نہیں دیکھتا، اور یہ اس اعتبار سے ہے کیونکہ ملک کو لفظ ید سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے قول میں سے ہے: فی یدہ مال، یعنی اس کی ملک میں مال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول: فَاَصْبَحَ اس پر دلیل ہے کہ یہ ہلاک کرنے کا عمل رات کے وقت ہوا؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ (القلم) (پس چکر لگا گیا اس باغ پر ایک چکر لگانے والا آپ کے رب کی طرف سے درآنحالیکہ وہ سوئے ہوئے تھے چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا۔) اور کہا جاتا ہے: أنفقتُ فی هذه الدار كذا و أنفقتُ عَلَيْهَا (میں نے اس گھر میں اتنا خرچ کیا اور میں نے اس پر اتنا خرچ کیا) وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا یعنی وہ خالی ہے تحقیق وہ بعض بعض پر گر گیا ہے) یہ خَوَتِ النجوم تخوی خيًّا اَمْحَلَتْ سے ماخوذ ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب وہ گر جائے اور کسی بھی سبزے پر بارش نہ برسائے۔ اور أَخْوَتْ بھی اسی کی مثل ہے۔ اور خَوَتِ الدار خواء أقْوَتْ (گھر گر گیا اور اپنے مکینوں سے خالی ہو گیا)، اور اسی طرح ہے جب وہ گر جائے) اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا (النمل: 52) (پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث)۔ اور کہا جاتا ہے: ساقطة (گرنے والا)، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فهی خاوية علی عروشها یعنی وہ اپنی چھت پر گرنے والا ہے، پس اسے پھل اور اصل کی تباہی اور بربادی کے درمیان جمع کیا گیا ہے، اور یہ بہت شدید اور بڑی آفتوں میں سے ہے، درآنحالیکہ یہ اس کے ظلم اور

نافرمانی کے مقابلہ میں ہے۔ وَيَقُولُ يٰلَيْتَنِي لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا یعنی اے کاش! میں نے ان نعمتوں کو پہچانا ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرمائی ہیں، اور میں نے یہ پہچانا ہوتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہیں اور میں اس کے ساتھ کفر نہ کرتا۔ اور یہ اس کی طرف سے اس وقت ندامت کا اظہار ہے جس وقت ندامت اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتی تھی۔

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

''اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، فِئَةٌ یہ تَكُنْ کا اسم ہے اور لَّهٗ اس کی خبر ہے۔ يَّنْصُرُوْنَهٗ یہ صفت کے محل میں ہے، ای فئة ناصرة (مدد کرنے والی جماعت)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ يَّنْصُرُوْنَهٗ خبر ہو۔ اور پہلی وجہ سیبویہ کے نزدیک اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ لَّهٗ مقدم ہے۔ اور ابو العباس ان کی مخالفت کرتے ہیں، اور اللہ عزوجل کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں: وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿﴾ (الاخلاص) اور سیبویہ نے دوسری وجہ کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور يَّنْصُرُوْنَهٗ، فِئَةٌ کے معنی کی وجہ سے (جمع کا صیغہ) ہے، کیونکہ اس کا معنی اقوام ہے، اور اگر لفظ کی بنا پر ہوتا تو فرماتا ولم تکن لہ فئة تنصرہ؛ یعنی ایسا گروہ اور ایسی جماعت جس کے پاس وہ پناہ لے سکتا ہو (وہ نہیں رہی) وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا یعنی اور نہ وہ روکنے والا تھا؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور نہ وہ اس کا بدل لوٹانے والا ہے جو اس سے ضائع ہو گیا ہے (جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے) اور الفئة کا مادہ اشتقاق سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور اس میں ھا اس یا کے عوض ہے جو اس کے درمیان سے کم ہوئی، اس کی اصل فِيئٌ ہے جیسا کہ فِيعٌ ہے کیونکہ یہ فا سے ہے، اور اس کی جمع فِئُون اور فئات آتی ہے، جیسے شِيات، لِدَات اور مئات وغیرہ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی جماعت نہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اس کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کے خدام اور اولاد میں سے وہ اس سے مفقود اور گم ہو گئے جن کے سبب وہ فخر کرتا تھا۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

''یہاں سے ثابت ہو گیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کے لئے ہے، وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے۔''

قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ اس میں قول باری تعالیٰ هُنَالِكَ ظرف ہے اور اس کے عامل میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے: اس میں عامل: وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ ہے اور کان ھنالك نہیں ہے؛ ای ما نُصر ولا انتصر ھنالك یعنی جب اسے عذاب پہنچے گا تو نہ اس کی مدد کی جائے گی اور نہ وہ وہاں بدلہ لینے کے قابل ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ: مُنْتَصِرًا ﴿﴾ پر کلام مکمل ہو گئی ہے اور هُنَالِكَ میں عامل الْوَلَايَةُ ہے، اور اس کی تقدیر تقدیم و تاخیر پر ہے: الولایة للہ الحق ھنالك یعنی قیامت میں سارا اختیار اللہ سچے کے لئے ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے الْحَقُّ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ الْوَلَايَةُ کی صفت ہے۔ اہل مدینہ اور حمزہ نے الحقِّ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ لفظ اللہ کی صفت ہے، اور تقدیر

کلام ہے: للہ ذی الحق (اس اللہ کے لئے جو صاحب حق ہے۔) زجاج نے کہا ہے: الحقُّ کو مصدر اور تاکید کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے: جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا لک حقًّا۔ اور اعمش، حمزہ، اور الکسائی نے لِولایة کو واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جیسا کہ رِضاعة اور رَضاعة۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الولایة فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ موالاۃ (محبت اور دوستی) سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ: 257) (اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا۔) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (محمد: 11) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے۔) اور کسرہ کے ساتھ ہو تو پھر اس کا معنی سلطنت، قدرت اور امارت ہے، جیسے قول باری تعالیٰ ہے: وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (الانفطار) یعنی اس دن اللہ تعالیٰ کی ہی بادشاہی اور حکم ہوگا، یعنی اس کا امر کسی اور کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا، ہر وقت میں بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن قیامت کے دن سارے دعوے اور توہمات ختم ہو جائیں گے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: بلاشبہ یہ لفظ خالق کے لئے واؤ کے فتحہ کیساتھ ہے۔ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ مخلوق کے لئے ہے۔

هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا یعنی دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی اسے بہترین اجر و ثواب عطا فرمانے والا ہے جو اس کے ساتھ ایمان لایا، اور وہاں اس کے سوا کوئی نہیں ہوگا جس سے امید رکھی جا سکتی ہو، لیکن اس انداز میں جاہلوں کے ظن کا ارادہ کیا ہے، یعنی ھو خیر مَن یُرجیٰ (وہی سب سے بہتر ہے جس سے امید رکھی جا سکتی ہے۔ وَّخَيْرٌ عُقْبًا عاصم، اعمش، حمزہ اور یحییٰ نے عُقْبًا قاف کو ساکن پڑھا ہے، باقیوں نے اسے مضموم پڑھا ہے، اور دونوں صورتوں میں معنی ایک ہے، یعنی اس کے ہاتھ میں بہترین انجام ہے اس کے لئے جس نے اس سے امید رکھی اور اس کے ساتھ ایمان لایا۔ کہا جاتا ہے: عاقبة أمر فلان و عقباه و عُقبُه، یعنی یہ فلاں کے معاملے کا انجام اور آخر ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝

"بیان فرمائیے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گنجان ہو کر اگتی ہیں اس پانی سے زمین کی انگوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی آپ ان تکبر کرنے والوں کے لئے جو آپ سے فقراء مومنین کو اپنے آپ سے دور ہٹانے کی درخواست کرتے ہیں دنیوی زندگی کی ایک مثال بیان فرمائیے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تشبیہ دی ہے۔ كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ کہ یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا ہے یعنی پانی کے ساتھ۔ نَبَاتُ الْاَرْضِ یعنی اس پانی سے زمین کی انگوریاں گنجان ہو کر اگتی ہیں، یہاں تک کہ زمین ہموار ہو جاتی ہے، برابر ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ انگوریاں بعض بعض کے ساتھ مل جاتی ہیں جس وقت اس پر پانی برستا ہے، کیونکہ نباتات گنجان ہو جاتی ہیں اور بارش کے سبب بڑھ جاتی ہیں، زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ معنی سورۃ یونس میں واضح طور پر گزر چکا

ہے۔ اور حکماء نے کہا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ پانی ایک جگہ نہیں ٹھہرتا، اسی طرح دنیا بھی ایک کے پاس باقی نہیں رہتی، اور اسی لئے پانی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا اسی طرح دنیا کی حالت بھی ہے، اور اس لئے بھی کہ یہ پانی باقی نہیں رہتا اور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح دنیا بھی فناہ ہو جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ پانی کے بارے میں کوئی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اس میں داخل ہو اور وہ اس سے تر نہ ہو اسی طرح دنیا بھی ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو وہ اس کے فتنہ و آزمائش اور اس کی آفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اور اس لئے کہ پانی جب خاص مقدار میں ہو تو وہ نفع پہنچاتا ہے اور نباتات اگاتا ہے، اور جب اس حد سے تجاوز کر جائے تو وہ نقصان دہ اور مہلک ہوتا ہے، اسی طرح دنیا بھی ہے کہ اس کی کفایت بھر مقدار نفع بخش ہوتی ہے اور اس کی فالتو مقدار نقصان پہنچاتی ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں چاہتا ہوں کہ میں کامیاب لوگوں میں سے ہو جاؤں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا کو چھوڑ دے اور اسے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح قرار دے (اور اس سے تھوڑی سی مقدار لے لے) کیونکہ اس کی قلیل مقدار کافی ہوتی ہے اور اس کی کثیر مقدار سرکش بنا دیتی ہے۔'' اور صحیح مسلم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: ''تحقیق وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسلام قبول کیا اور اسے کفایت بھر رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قناعت عطا فرما دی جو اس نے اسے عطا فرمایا (1)''۔ فَاَصْبَحَ یعنی وہ انگوریاں ہو جاتی ہیں هَشِيْمًا خشک ٹوٹی ہوئی اور بکھری ہوئی گھاس، یعنی اس سے پانی کٹ جانے کے سبب، پس اسے اختصار کے لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے، اور الهشم کا معنی ہے خشک چیز کا توڑ دینا۔ اور الهشيم سے مراد خشک ٹوٹی ہوئی گھاس ہے، اور وہ بوسیدہ درخت جسے ایندھن اکٹھا کرنے والا جیسے چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے۔ اور اس سے ان کا یہ قول بھی ہے: ما فلانٌ إلا هشيمة كَرْمٍ، جبکہ وہ خوب فیاض اور سخی ہو۔ اور رجلٌ هشيم: کمزور بدن والا آدمی۔ اور تَهَشَّمَ عليه فلان جب وہ اس پر مہربان ہو اور إهتشم مافي ضرع الناقة جب آدمی ناقہ کو دوہ لے۔ اور کہا جاتا ہے: هَشَمَ الثَّرِيْدَ اس نے ثرید تیار کیا اور اسی سے ہاشم بن عبد مناف کا نام رکھا گیا اور ان کا نام عمرو تھا۔

اور اسی بارے میں عبد اللہ بن زبعری کہتا ہے:

عَمْرُو العُلَا هَشَمَ الثَّرِيْدَ لقومه و رجالُ مكةَ مُسْنِتُونَ عجافُ

اور اس کا سبب یہ ہوا کہ قریش کو قحط نے آلیا اور اس نے ان کے اموال ہلاک و برباد کر دیئے پس ہاشم شام کی طرف گئے اور وہاں بہت سی روٹیوں کا حکم دیا پس وہ آپ کے لئے پکا دی گئیں، تو انہوں نے انہیں بوروں میں بند کر کے اونٹوں پر لاد دیا یہاں تک کہ آپ مکہ پہنچ گئے، اور آپ نے ان روٹیوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے بنا دیا اور ثرید بنایا، آپ نے انہی اونٹوں کو ذبح کیا، پھر پکانے والوں کو حکم دیا اور انہوں نے وہ گوشت پکایا، پھر ہانڈیوں کو بڑے بڑے پیالوں میں انڈیل دیا اور اہل مکہ کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا، اور یہ اس قحط کے بعد جوان پر مسلط ہوا پہلی بخشش اور عطا تھی، پس اسی وجہ سے آپ کا نام ہاشم پڑ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 337

گیا۔ تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ یعنی ہوائیں اسے اڑا لے جاتی ہیں، بکھیر دیتی ہیں؛ یہ ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے: وہ اسے اڑا لے جاتی ہیں۔ ابن کیسان نے کہا ہے: وہ اسے لے جاتی ہیں اور لے آتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ اسے پھراتی اور گھماتی ہیں؛ یہ تمام معانی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور طلحہ بن مصرف نے تُذْرِيْهِ الرِّيْحُ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں تُذْرِيْهِ یہ کہا جاتا ہے: ذَرَتْه الريح تَذْرُوْهُ ذَرْوًا اور تَذْرِيه ذَرْيًا اور أذرته تُذْرِيه إذْرَاءً، جب ہوا اسے اڑا لے جائے۔ اور فراء نے بیان کیا ہے: أذريت الرجل عن فرسه یعنی میں نے آدمی کو اس کے گھوڑے سے الٹ دیا۔

اور سیبویہ اور فراء نے یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

فقلتُ له صَوِّبْ ولا تجهدَنَّهُ　　فَيُذْرِكَ من أُخْرَى القَطَاةِ فَتَزْلَقِ

قولہ تعالیٰ: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے، فناہ کرنے اور پھر زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، اور اس کی ذات ہر کمزوری اور نقص سے پاک ہے۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ۝

"مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب و زینت ہیں، اور (در حقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس میں زینتا بھی جائز ہے اور یہ تثنیہ اور مفرد (دونوں حالتوں) میں مبتدا کی خبر ہے۔ اور بلاشبہ مال اور فرزند دنیوی زندگی کی زینت ہیں، کیونکہ مال میں حسن و خوبصورتی اور منافع ہیں، اور بیٹوں میں قوت اور دفاع ہے، تو اس طرح یہ دونوں دنیوی زندگی کے لئے زیب و زینت ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ صفت کا قرینہ مال اور فرزندوں کے لئے ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: المال و البنون زينة هذه الحياة المحتقرة فلا تتبعوها نفوسكم (یعنی مال اور فرزند اس حقیر زندگی کے لئے زیب و زینت ہیں پس تم اپنے آپ کو اس کا تابع نہ بناؤ۔) اور یہ عیینہ بن حصن اور اس جیسے دیگر لوگوں کا رد ہے جب انہوں نے دولت اور ظاہری شرف پر فخر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ یہ جو دنیوی زندگی کے لئے زینت ہے تو یہ ایسا غرور (اور فخر) ہے جو گزر جائے گا، ختم ہو جائے گا اور باقی نہیں رہے گا، جیسا کہ خشک ٹوٹی ہوئی گھاس ہوتی ہے کہ ہوا اسے اڑا لے جاتی ہے، بلاشبہ جو شے باقی رہتی ہے وہ زاد قبر اور آخرت کی تیاری ہے۔ اور کہا جاتا ہے: مال کے ساتھ اپنا دل نہ لگا کیونکہ یہ ختم ہو جانے والے سائے (کی طرح) ہے، اور نہ عورتوں کے ساتھ دل لگا، کیونکہ یہ آج تیرے ساتھ ہیں اور کل کسی دوسرے کے ساتھ ہیں، اور نہ سلطان کے ساتھ کیونکہ وہ آج تیرا ہے اور کل کسی اور کا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول کافی ہے: اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال: 28) (بیشک تمہارے مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں۔) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن: 14) (بے شک تمہاری

کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں، پس ہوشیار رہو ان سے۔)

قولہ تعالیٰ: وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ مراد طاعات کا وہ عمل ہے جو حضرت سلمان، حضرت صہیب اور دیگر مسلمان فقراء رضی اللہ عنہم کر رہے ہیں۔ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے افضل ہے۔ وَّخَيْرٌ اَمَلًا یعنی از روئے امید کے صاحب مال اور فرزندوں سے افضل ہیں نہ کہ عمل صالح سے، اور دنیوی زیب وزینت میں خیر اور بھلائی نہیں ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے محل میں ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) (اہل جنت کا اس دن اچھا ٹھکانا ہو گا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ فی الحقیقت اس سے بہتر ہیں جسے جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان کے گمان میں بہتر ہے۔

اور وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے؛ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، ابو میسرہ، اور عمرو بن شرحبیل نے کہا ہے: ان سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آدمی کے قول وفعل میں سے ہر عمل صالح ہے جو آخرت کے لئے باقی رہے گا۔ اور یہ ابن زید نے بھی کہا ہے اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے۔ اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ ہر وہ عمل جس کا ثواب باقی رہے جائز ہے کہ اس کے لئے یہ کہا جائے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: کھیتی دو قسم کی ہے پس دنیا کی کھیتی مال اور فرزند ہیں اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات (باقی رہنے والی نیکیاں) ہیں، تحقیق اللہ تعالیٰ انہیں اقوام کے لئے جمع فرمادے گا۔ اور جمہور نے کہا ہے: ان سے مراد وہ کلمات ہیں (1) جن کی فضیلت حدیث طیبہ میں مروی ہے: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اسے امام مالک نے اپنی موطا میں عمارہ بن صیاد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ان کو اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک ان سے مراد بندے کا یہ کہنا ہے: اللہ اکبر و سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ، اسے نسائی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کی کثرت کرو' عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں۔ فرمایا: ''تکبیر کہنا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا، سبحان اللہ کہنا اور الحمد للہ اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ، اسے ابو محمد عبد الحق رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح قرار دیا ہے۔

اور حضرت قتادہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹہنی پکڑی اور اسے جھنجھوڑا یہاں تک کہ اس کے پتے گر گئے اور فرمایا: ''بے شک جب مسلمان یہ کہتا ہے سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر تو اس کے گناہ گر جاتے ہیں جیسا کہ یہ پتے گر گئے ہیں اے ابا الدرداء! انہیں اپنے پاس محفوظ کر لو۔ اس سے پہلے کہ تیرے اور ان کے درمیان کوئی حائل ہو، کیونکہ یہ جنت کے خزانوں اور عمدہ اور خالص کلام میں سے ہیں اور یہ اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (باقی رہنے والی نیکیاں) ہیں''۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے، اور اسے ابن ماجہ نے اسی معنی میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (2)، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 520　　2۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل التسبیح، صفحہ 279۔ ایضاً، حدیث نمبر 3802، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھنا لازم ہے کیونکہ یہ گناہوں کو اس طرح گرا دیتے ہیں جس طرح درخت اپنے پتے گرا دیتا ہے۔ اور ترمذی نے اسے اعمش کی حدیث سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خشک پتوں والے درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اسے چھڑی ماری تو پتے گرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر آدمی کے گناہوں کو اس طرح گرا دیتے ہیں جیسے اس درخت کے پتے گر رہے ہیں (1)۔'' فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، اور ہم اعمش کا سماع حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نہیں جانتے، مگر یہ کہ انہوں نے انہیں دیکھا ہے اور انہوں نے ان کی طرف دیکھا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں شب معراج حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملا تو انہوں نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا اور انہیں یہ خبر دینا کہ جنت کی مٹی بڑی پاکیزہ اور زرخیز ہے، پانی بڑا عمدہ اور میٹھا ہے اور یہ کہ وہ بڑی ہموار اور نرم ہے اور اس کے پودے اور درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں''۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)، اسے ماوردی نے اسی معنی میں بیان کیا ہے۔ اور اس میں ہے ..... تو میں نے کہا: جنت کے درخت اور پودے کیا ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ (3)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے اور وہ پودے لگا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اباہریرۃ! (رضی اللہ عنہ) تم کیا لگا رہے ہو؟'' تو میں نے کہا: پودے لگا رہا ہوں، فرمایا: کیا میں تمہاری راہنمائی ایسے پودوں پر نہ کروں جو ان سے بہتر ہیں، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہر ایک کے بدلے تیرے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔'' تحقیق کہا گیا ہے: بے شک باقیات صالحات ہی نیتیں اور عزم و ارادے ہیں، کیونکہ انہی کے ساتھ اعمال قبول کئے جاتے ہیں اور بلند ہوتے ہیں؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: کہ ان سے مراد بیٹیاں ہیں، آیت کا اول حصہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** پھر فرمایا: **وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ** یعنی صالح اور نیک بیٹیاں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے آباء کیلئے بہترین اجر و ثواب ہیں، اور بہتر ہیں آخرت میں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے اس آدمی کے لئے جس نے ان کے ساتھ احسان اور نیکی کی، اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: میرے پاس ایک مسکین عورت آئی ...الحدیث، تحقیق ہم نے اسے سورۃ النحل میں قول باری تعالیٰ: **يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ** الآیہ (النحل: 59) میں بیان کیا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''تحقیق میں نے اپنی امت سے ایک آدمی دیکھا اسے جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دیا گیا تو اس کی بیٹیاں اس کے ساتھ چمٹ گئیں اور چیخ و پکار کرنے لگیں اور کہنے لگیں: اے ہمارے رب! بلاشبہ یہ دنیا میں ہمارے ساتھ احسان اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، فضل التسبیح، جلد 2، صفحہ 192۔ ایضاً، باب جامع الدعوات، حدیث نمبر 3456، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل التسبیح، حدیث نمبر 3384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل التسبیح، جلد 2، صفحہ 279-278

نیکی کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے وسیلہ سے اس پر رحم فرمادیا" (1)۔ اور حضرت قتادہ نے قول باری تعالیٰ: فَاَرَدْنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا (کہف) (پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو) کے تحت کہا ہے: ان کو اس کے بدلے بیٹی عطا فرمائی اور اس سے نبی علیہ السلام نے شادی کی اور اس نے بارہ بچوں کو جنم دیا اور وہ تمام انبیاء ہوئے۔

وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۚ

"اور (غور کرو) جس روز ہم ہٹادیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) اور تم دیکھو گے زمین کو کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو۔"

قولہ تعالیٰ: وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً بعض نحویوں نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے والباقیات الصالحات خیر عند ربك یوم نسیّر الجبال۔ نحاس نے کہا ہے: یہ واؤ کی وجہ سے غلط ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: اور اس دن کو یاد کرو جب ہم پہاڑوں کو ہٹادیں گے، یعنی ہم انہیں سطح زمین سے اپنی جگہوں سے زائل کردیں گے، اور ہم انہیں چلائیں گے جیسا کہ ہم بادلوں کو چلاتے ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَّ هِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل: 88) (حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال) پھر وہ ٹوٹ جائیں گے اور زمین کی طرف لوٹ آئیں گے، جیسا کہ فرمایا: وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (الواقعہ) (اور ٹوٹ پھوٹ کر پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے پھر غبار بن کر بکھر جائیں گے) ابن کثیر، حسن، ابو عمرو اور ابن عامر نے وَیَوْمَ تُسَیَّرُ تا کو ضمہ اور یا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الْجِبَالُ کو فعل مجہول کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ ابن محیصن اور مجاہد نے ویوم تَسِیرُ الجبال تا کو فتحہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور یہ سَارَ سے ہے۔ اور الجبال مرفوع ہے۔ ابو عمرو کی قرأت کی دلیل وَ اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ (التکویر) ہے۔ اور ابن محیصن کی قرأت کی دلیل وَّ تَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا (الطور) ہے۔ اور ابو عبید نے پہلی قرأت کو نسیّر یعنی نون کے ساتھ کو اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ حَشَرْنٰهُمْ اور بَارِزَةً کا معنی ظاهرة ہے، (یعنی) اس پر پہاڑوں، درختوں اور عمارتوں میں سے ایسی کوئی شے نہ ہوگی جو اسے ڈھانپے ہوئے ہو، یعنی اس کے درخت جڑ سے اکھیڑ دیئے جائیں گے، اس کے پہاڑ بھی اکھیڑ دیئے جائیں گے، اور اس کی عمارتیں گرادی جائیں گی، پس یہی اس کا ظاہر ہونا اور کھلا میدان بننا ہے۔ اہل تفسیر نے یہی قول کہا ہے۔ اور کہا گیا ہے: وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً یعنی زمین میں جو مخفی خزانے اور مردے ہیں سب ظاہر ہوجائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ (الانشقاق) (اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہوجائے گی۔) اور فرمایا: وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (الزلزال) (اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو) اور یہ قول حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ وَّ حَشَرْنٰهُمْ اور ہم انہیں موقف کی طرف جمع کرکے لے جائیں

1۔ سنن ابن ماجہ، باب برالوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے۔ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا یعنی ہم ان میں سے کسی کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے۔ کہا جاتا ہے: غادرتُ کذا یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا۔

عنترہ نے کہا ہے:

غَادَرْتُهُ مُتَعَفِّرًا اَوصالُه والقومُ بین مُجَرَّحٍ و مُجَدَّلِ

یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور المغادرۃ کا معنی ترک کرنا اور چھوڑنا ہے، اور اسی سے الغدر ہے، کیونکہ اس کا معنی وفا کو ترک کرنا ہے۔ اور پانی کے تالاب کو غدیر کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ پانی اس میں جاتا ہے اور وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسی سے غدائر المرأۃ (عورتوں کی گندھی ہوئی چوٹی) ہے کیونکہ وہ اسے پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ فرما رہا ہے: ہم ان کے نیکوں، فاجروں، جنوں اور انسانوں سبھی کو جمع کریں گے۔

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ⑱

''اور وہ پیش کئے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے، (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آ گئے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار، ہاں تم تو یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لئے وعدہ کا وقت۔''

قولہ تعالیٰ: وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا، صَفًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ پیش کئے جائیں گے درآنحالیکہ وہ یکے بعد دیگرے صفیں باندھے ہوں گے جیسا کہ نماز میں صفیں باندھی جاتی ہیں، ہر امت اور ہر گروہ صف بنائے ہوئے ہوگا نہ کہ وہ سارے ایک صف میں ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمام کے تمام (صف باندھے ہوئے) ہوں گے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا (طٰہٰ: 64) ای جمیعا (پھر آؤ پرے باندھے ہوئے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ پیش کئے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوں گے۔ اور حافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن مندہ نے کتاب التوحید میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ایسی بلند آواز سے ندا دے گا جو کہ خوفناک ہوگی: اے میرے بندو! میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں ارحم الراحمین ہوں اور أحکم الحاکمین ہوں اور بہت تیزی سے حساب لینے والا ہوں۔ اے میرے بندو! تم پر آج کے دن کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم اور حزن ہوگا اپنی دلیل اور حجت پیش کرو اور سہولت اور آسانی کے ساتھ جواب دو کیونکہ تم سے باز پرس کی جائے گی اور محاسبہ کیا جائے گا۔ اے میرے ملائکہ! میرے بندوں کو حساب کے لئے ان کے پاؤں کے پوروں کی اطراف پر صفوں میں کھڑا کر دو۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث اس آیت کی تفسیر میں انتہائی واضح اور بین ہے، اور مفسرین میں سے اکثر نے اس کا ذکر نہیں کیا، تحقیق ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں لکھا ہے، اور اسی سے ہم نے اسے نقل کیا ہے۔ والحمد للہ۔

لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ یعنی ان کو کہا جائے گا: آج تم ہمارے پاس ننگے پاؤں اور ننگے بدن آ گئے ہو، نہ تمہارے پاس مال ہے اور نہ اولاد۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آج تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آ گئے ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ (اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ) اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یعنی ہم تمہیں اسی طرح اٹھائیں گے جیسے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ یہ خطاب منکرین بعث کو ہے، یعنی تم دنیا میں یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تم ہرگز نہیں اٹھائے جاؤ گے اور یہ کہ ہم تمہارے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کے وعدہ کا وقت مقرر نہیں کریں گے۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''قیامت کے دن لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون اٹھائے جائیں گے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''اے عائشہ! اس دن امر اس سے کہیں زیادہ شدید اور سخت ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں (1)''۔ غُرۡلًا کا معنی ہے غیر مختون۔ اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔

وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا فِيۡهِ وَيَقُوۡلُوۡنَ يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا ۚ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

''اور رکھ دیا جائے گا (ان کے سامنے) نامۂ عمل پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے: صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہو گیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کر لیا ہے۔ اور (اس دن) وہ پالیں گے جو عمل انہوں نے کئے تھے اپنے سامنے اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا''۔

قولہ تعالیٰ: وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ، الۡكِتٰبُ یہ اسم جنس ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد نامۂ اعمال ہیں جو بندوں کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد حساب کو رکھنا ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، پس حساب کو کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ان کے لکھے ہوئے اعمال پر ان کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اور پہلا قول اظہر ہے؛ اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: ہمیں حکم یا ابوالحکم نے خبر دی ہے...... یہ نعیم کو شک ہے...... اسماعیل بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے اس نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب کو کہا: تجھ پر افسوس ہے اے کعب! آخرت کی حدیث میں سے کوئی ہمیں بیان کیجئے، انہوں نے کہا: ہاں یا امیر المومنین! جب قیامت کا دن ہو گا لوح محفوظ کو بلند کیا جائے گا تو مخلوق میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ اپنے عمل کی طرف دیکھ لے گا بیان فرمایا...... پھر وہ صحائف لائے جائیں گے جن میں بندوں کے اعمال ہیں اور وہ عرش کے اردگرد بکھر جائیں گے، اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفۃ الجنۃ، باب فناء الدنیا و بیان الحشر، جلد 2، صفحہ 384

اسی کے بارے یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا۔ اسدی نے کہا ہے: صغیرہ سے مراد وہ ہیں جو شرک سے کم ہیں، اور کبیرہ سے مراد شرک ہے، مگر اس نے ان سب کا شمار کرلیا ہے..... حضرت کعب نے بیان کیا: پھر مومن کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اس میں دیکھے گا پس ان کی نیکیاں تو لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گی اور وہ اپنے گناہ پڑھنے لگے گا تاکہ وہ یہ نہ کہے کہ میری اتنی نیکیاں تھیں اور وہ ذکر نہیں کی گئیں سو اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اسے اس کے سارے اعمال دکھادے یہاں تک کہ جب وہ اسے ناقص اور کم سمجھنے لگے گا جو کتاب میں ہوگا تو اس تمام کے آخر میں وہ پائے گا کہ اس کی مغفرت کردی گئی ہے، اسے بخش دیا گیا ہے اور یہ کہ تو اہل جنت میں سے ہے، پس اس وقت وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے گا اور کہے گا: هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿﴾ (الحاقہ) (لو پڑھو میرا نامۂ عمل مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) پھر کافر کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پھر اسے لپیٹ دیا جائے گا اور اسے اس کی پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا اور اس کی گردن کو موڑ دیا جائے گا، پس اسی کے بارے یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿﴾ (الانشقاق) (اور جس (بدنصیب) کو اس کا نامۂ عمل پس پشت دیا گیا۔) پس وہ اپنے نامۂ عمل میں دیکھنے لگے پس اس کی برائیاں اور گناہ تو لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گے اور وہ اپنی نیکیوں میں دیکھے گا تاکہ وہ یہ نہ کہے کہ میں اسے گناہوں کا بدلہ دے رہا ہوں۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ جب یہ آیت پڑھتے تو کہتے تھے: اے کاش! تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کبائر سے پہلے صغائر کے بارے چیخ و پکار کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: صغیرہ سے مراد تبسم کرنا ہے، اور کبیرہ سے مراد ہنسنا ہے، یعنی جب یہ اللہ عزوجل کی معصیت و نافرمانی کے عمل میں ہو؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ صغیرہ سے مراد ضحک (ہنسنا) ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ (ہنسنا) صغیرہ ہو جب وہ معصیت میں نہ ہو، کیونکہ معصیت کے سبب ہنسنا اس کے ساتھ رضا کا اظہار کرنا ہے اور معصیت کے ساتھ راضی ہونا بھی معصیت ہے، اور اسی بنا پر وہ کبیرہ ہوجاتا ہے، پس ان میں جمع اور تطبیق کی وجہ یہی ہوسکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ یا پھر ضحک کو تبسم پر محمول کیا جائے گا اس روایت میں جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (النمل: 19) (تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیئے اس کی اس بات سے) اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: بے شک صغائر سے مراد چھوٹے گناہ کرنا اور گناہ کے قریب ہونا ہے مثلاً چھونا اور بوسہ لینا وغیرہ، اور کبیرہ سے مراد گناہ میں واقع ہونا اور بدکاری کا ارتکاب کرنا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: قوم نے احصاء کی شکایت کی ہے، اور کسی نے ظلم کی شکایت نہیں کی، پس تم گناہوں کو حقیر سمجھنے سے بچو کیونکہ یہ اپنے کرنے والے پر جمع ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اسے ہلاک کردیتے ہیں۔ اس کا بیان بھی گزر چکا ہے۔ اور اَحْصٰىهَا کا معنی ہے اس نے انہیں شمار کرلیا ہے اور ان کا احاطہ کرلیا ہے؛ اور وسعت کے طور پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 49-48

احصاء کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے۔ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا یعنی اس دن وہ تمام اعمال کو اپنے سامنے حاضر پا لیں گے جو انہوں نے کئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان اعمال کی جزا کو اپنے سامنے پالیں گے جو انہوں نے کئے وَ لَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو کسی دوسرے کے جرم کے بدلے نہیں پکڑے گا، اور نہ اس کے بدلے کسی کو پکڑے گا جو عمل اس نے نہیں کیا؛ یہ ضحاک نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ کسی طاعت و فرمانبرداری کرنے والے کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا اور نہ کسی گنہگار کی سزا میں اضافہ کرے گا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ قوم جن سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی۔ (اے اولاد آدم!) کیا تم بناتے ہو اسے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں ایک سوال ہے، کہا جاتا ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ کا کیا معنی ہے؟ تو اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے...... اور یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے کہ اس کا معنی ہے جس کے بارے اسے حکم دیا گیا اس کے بارے اس نے فسق کا ارتکاب کیا پس اس نے نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب کیا، تو اس میں فسق کا سبب اس کے رب کا حکم ہوا، جیسے تو کہتا ہے: أطعمته عن جوع (میں نے بھوک کی وجہ سے اسے کھانا کھلایا۔) اور دوسرا قول ہے ...... اور یہ محمد بن قطرب کا مذہب ہے کہ اس کا معنی ہے: پس وہ اپنے رب کے حکم کو رد کرنے کے سبب فاسق ہو گیا۔ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو زجر و توبیخ کی طرز پر اپنے اس قول سے فرمایا: اے اولاد آدم! کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے، یعنی وہ تمہارے دشمن ہیں۔ پس یہ (عدو) اسم جنس ہے۔ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بدلے شیطان کی عبادت کرنا بہت برا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے بدلے شیطان بہت برا ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ابلیس کی اولاد اس کی صلب سے ہے؟ پس حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ سے کسی آدمی نے پوچھا: کیا ابلیس کی بیوی ہے؟ تو میں نے کہا: بے شک وہ عُرس (اگا ہوا) ہے میں نے دیکھا نہیں ہے، پھر مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آ گیا: اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ تو میں نے جان لیا کہ اولاد نہیں ہوتی مگر بیوی سے تب میں نے اسے کہہ دیا ہاں (اس کی بیوی ہے) اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (1): بے شک ابلیس نے اپنی شرمگاہ اپنی ہی شرمگاہ میں داخل کی تو اس نے پانچ انڈے دیئے، پس یہی اس کی اولاد کی اصل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 575

اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی دائیں ران میں ذکر پیدا کیا ہے اور بائیں ران میں فرج پیدا کی ہے، پس وہ اس کے ساتھ اس میں وطی کرتا ہے، اور ہر روز اس کے دس انڈے نکلتے ہیں، اور ہر انڈے سے ستر شیطان اور شیطانہ خارج ہوتے ہیں، پس وہ نکلتا ہے اور اڑ جاتا ہے، اور اپنے باپ کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے عظیم اور بڑا وہ ہے جو اولاد آدم میں فتنہ برپا کرنے کے اعتبار سے بڑا اور عظیم ہو۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی ذریت، (بلکہ) اس کی ذریت شیاطین میں سے اس کے معاون و مددگار ہیں۔ قشیری ابونصر نے کہا ہے: خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ابلیس کی اتباع کرنے والے اس کی ذریت ہے، اور یہ کہ وہ اولاد آدم میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور وہ اس کے دشمن ہیں، اور ہمارے نزدیک وہ کیفیت ثابت نہیں جس کیفیت میں اس سے توالد کا سلسلہ ہوتا ہے اور ابلیس سے اس کی ذریت پیدا ہوتی ہے، پس صحیح روایت کے مطابق اس بارے میں حکم متوقف فیہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں جو صحیح روایت سے ثابت ہے وہ ہے جسے حمیدی نے جمع بین الصحیحین میں امام ابوبکر رقانی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں ابو محمد عبدالغنی بن سعید الحافظ سے عاصم کی روایت سے مسنداً ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ابوعثمان سے اور انہوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو بازار میں سب سے اوّل داخل ہونے والا نہ ہو اور نہ اس سے سب سے آخر میں نکلنے والا ہو وہیں شیطان انڈے اور بچے دیتا ہے۔'' اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کی اپنی صلب سے ہے، واللہ اعلم۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): قول باری تعالیٰ وَذُرِّيَّتَهٗ میں ظاہر لفظ شیاطین میں سے وسوسہ اندازی کرنے والوں کا تقاضا کرتا ہے، جو برائی کا ارتکاب کرتے ہیں اور باطل پر ابھارتے اور برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ابلیس کی ذریت شیاطین ہیں، اور انہیں زَلَنْبُور بازاروں والا شمار کرتا ہے، وہ زمین و آسمان کے درمیان ہر بازار میں اپنا جھنڈا گاڑھ دیتا ہے، اور وہ اس جھنڈا کو سب سے پہلے دکان کھولنے والے اور سب سے آخر بند کرنے والے کی دکان پر لگاتا ہے۔ اور ثَبْر صاحب المصائب ہے، وہ چہروں پر مارنے اور گریبان چاک کرنے کا، اور ہلاکت اور جنگ کو پکارنے کا حکم دیتا ہے اور اَعور زانیوں کے دروازوں والا ہے اور مسوط خبریں دینے والا ہے، وہ انہیں لے کر آتا ہے اور انہیں لوگوں کے مونہوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ ان کی کوئی اصل نہیں پاتے۔ اور داسم وہ ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہو اور سلام نہ کہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر نہ کرے تو وہ اسے سامان میں سے وہ دکھا دیتا ہے جو اٹھایا نہیں گیا اور وہ جس کی جگہ صاف اور اچھی نہیں بنائی گئی، اور جب آدمی کھانا کھائے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہ کرے تو وہ اس کے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اعمش نے کہا ہے: میں بسا اوقات گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے سلام کیا، تو میں نے لوٹا دیکھا اور میں نے کہا: اسے اٹھا لو! اور میں ان سے جھگڑ پڑا، پھر مجھے یاد آتا ہے تو میں کہتا ہوں: داسم داسم! اَعوذ باللہ منہ (یعنی میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں) ثعلبی وغیرہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ زائد بھی ذکر کیا ہے: اور الابیض یہ وہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے لئے

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ کہف، جلد 3، صفحہ 522

وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور صخرا یہ وہ ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اچک لی تھی۔ اور الولھان یہ صاحب الطہارۃ ہے جو اس میں وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اور اقیس وہ ہے جو صاحب صلاۃ ہے یہ اس (نماز) میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ اور مُرّۃ یہ صاحب المزامیر ہے اور یہ اسی سے کنایہ ہوتا ہے۔ اور الھفاف یہ صحراؤں میں ہوتا ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور انہیں ضائع کر دیتا ہے۔ اور ان میں سے الغیلان بھی ہے۔ ابو مطیع مکحول بن فضل نسفی نے کتاب اللولویات میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ الھفاف صاحب الشراب ہے، اور لقوس انگیخت دینے والا ہے۔ اور الاعور سلطان کے دروازوں والا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ دارانی نے کہا ہے: بے شک ابلیس کا ایک شیطان ہے اس کو متقاضی کہا جاتا ہے، وہ ابن آدم سے تقاضا کرتا ہے اور اسے عمل کے بارے خبر دیتا ہے جو اس کا عمل بیس برس سے مخفی تھا، پس وہ اسے اعلانیہ کرنے لگتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت اور جو اس کی ہم جنس روایات ہیں ان کے بارے کوئی صحیح سند نہیں آئی، نقاش نے اس بحث کو طویل کیا ہے اور ایسی حکایات بیان کی ہیں جو صحت سے بہت دور ہیں، اس بارے میں میری نظر سے کوئی صحیح روایت نہیں گزری سوائے اس کے جو مسلم میں ہے (1) کہ نماز کے لئے ایک شیطان ہے وہ خنزب کہلاتا ہے۔ اور ترمذی نے ذکر کیا ہے کہ وضو کے لئے ایک شیطان ہے (2) اس کا نام الولہان ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہی نام کے بارے میں وہ تعیین جو ذکر کی گئی ہے تو وہ صحیح ہے اور رہی یہ بات کہ اس کے متبعین، معاونین اور لشکر ہیں تو اس بارے یہ مقطوع ہے، حالانکہ ہم نے اس بارے میں صحیح حدیث ذکر کی ہے کہ اس کی اولاد اس کی صلب سے ہے، جیسا کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: بے شک شیطان آدمی کی شکل بنالیتا ہے اور قوم کے پاس آجاتا ہے اور ان سے جھوٹی گفتگو کرتا ہے پس وہ متفرق ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے: میں نے ایک آدمی کو بات کرتے ہوئے سنا میں اس کے چہرے کو تو پہچانتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا اس کا نام کیا ہے۔ مسند بزار میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تو استطاعت رکھے تو سب سے پہلے بازار میں داخل ہونے والا نہ ہو اور نہ اس سے سب سے آخر میں نکلنے والا ہو کیونکہ وہ شیطان کا معرکہ ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنا جھنڈا نصب کرتا ہے۔" اور مسند امام احمد بن حنبل میں ہے انہوں نے کہا، ہمیں عبداللہ بن مبارک نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں سفیان نے عطا بن سائب سے انہوں نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے اور انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب ابلیس صبح کرتا ہے وہ اپنا لشکر پھیلا دیتا ہے اور کہتا ہے: جس نے کسی مسلمان کو گمراہ کیا میں اسے تاج پہناؤں گا۔ راوی نے بیان کیا پس ایک کہنے والا آکر کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ لگا رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، وہ کہتا ہے: قریب ہے کہ وہ شادی کرلے۔ اور دوسرا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے نافرمانی کی، اس نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من الشیطان، جلد 2، صفحہ 224

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، ماجاء کراھیۃ الاسراف، جلد 1، صفحہ 9

قریب ہے کہ وہ نیکی کرنے لگے۔ راوی کہتا ہے: پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے شراب پی لی، وہ کہتا ہے: تو نے کام کیا ہے! پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے زنا کر لیا، وہ کہتا ہے: تو نے کام کیا ہے! پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ لگا رہا یہاں تک کہ اس نے قتل کر دیا تو وہ کہتا ہے تو تو ہے! اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکر بھیجتا ہے پس رتبہ کے اعتبار سے ان میں سے اس کے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو فتنے کے اعتبار سے بڑا اور عظیم ہو پس ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اس اس طرح کیا، تو وہ کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا فرمایا: پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اسے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میں نے اس کے درمیان اور اس کے گھر والوں کے درمیان تفریق پیدا کر دی، جدائی ڈال دی پس وہ اسے قریب کرتا ہے یا کہا: پس وہ اس سے چمٹ جاتا ہے اور کہتا ہے: تو بہت اچھا ہے۔" اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور میں نے اپنے شیخ امام ابو محمد عبد المعطی کو اسکندریہ کی سرحد کے پاس یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک ایک شیطان ہے اس کو بیضاوی کہا جاتا ہے وہ لگاتار روزے رکھنے والے فقراء کے پاس مثالی شکل میں آتا ہے اور جب ان میں بھوک شدید ہو جائے اور ان کے دماغوں کو نقصان اور تکلیف دینے لگے تو ان کے لئے ایک روشنی اور نور ظاہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ ان کے گھروں کو بھر دیتا ہے تو وہ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ پہنچ گئے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اس طرح نہیں ہوتا جیسا وہ گمان کرتے ہیں۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور اس کے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے آج مورخہ ۸ ستمبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۷ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ بروز پیر بوقت دو بجے دن تفسیر قرطبی دسویں جز (پانچویں جلد) کا ترجمہ اپنے اختتام کو پہنچا میں رب کریم کی بارگاہ میں سراپا التجا ہوں کہ وہ اسے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ جلیلہ سے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور نفع عمیم کا باعث بنائے۔

امین بجاہ نبیہ الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین الی یوم الدین۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، تحریش الشیطان، جلد 2، صفحہ 376

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی

بھیرہ شریف

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر دُرِّ منثور 6 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین کی زیر نگرانی
بھیرہ شریف

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز